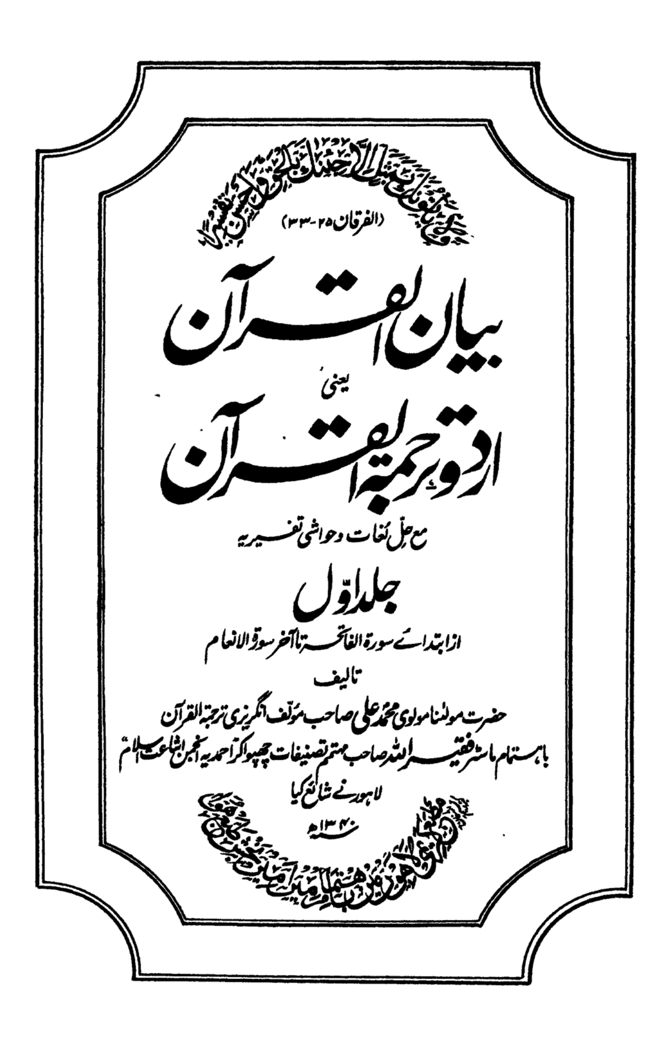
٢٩٧،١٣
م ح م



وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا

(الفرقان ۲۵-۳۳)

بیان القرآن

یعنی

اردو ترجمۃ القرآن

مع حل لغات و حواشی تفسیریہ

جلد اوّل

از ابتدائے سورۃ الفاتحہ تا آخر سورۃ الانعام

تالیف

حضرت مولنا مولوی محمد علی صاحب مؤلف انگریزی ترجمۃ القرآن

باہتمام ماسٹر فقیر اللہ صاحب مہتمم تصنیفات چھپوا کر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام
لاہور نے شائع کیا

سنہ ۱۳۴۰ھ

نشان دزمر ٢١٦٦
نمبر کتاب ١١٥
مصاحف عربی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تمہید

اللہ تعالیٰ نے قوموں کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں میں اپنے رسول بھیجے اور ان کی تعلیم نے مردہ دلوں پر وہی کام کیا جو آسمانی بارش مردہ زمین پر کر کے دکھاتی ہے وہ روشن چراغ تھے جنہوں نے ایک تاریک رات میں انسانوں کی مختلف بستیوں کو منور کیا۔ اور ان سب کے آخر اللہ تعالیٰ کے ظاہری قانون قدرت کے مطابق وہ آفتاب عالمتاب نمودار ہوا جس نے کل عالم کو منور کیا اور جس کے سامنے سب روشنیاں ماند پڑ گئیں۔ وہ سراج منیر حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہ نور ہدایت جو آپ لائے قرآن کریم ہے۔ آپ کے بعد کسی پیغامبر کی ضرورت نہ رہی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا آخری اور کامل پیغام لوگوں تک پہنچ گیا اور نہ کسی نبی کی ضرورت رہی اسلئے کہ تمام صفات الٰہی کا کامل مظہر آچکا۔ دنیا میں اب ایک ہی پیغام ہوگا اور ایک ہی پیغامبر یہ دونوں تا قیامت زندہ رہینگے ہاں اس پیغام کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے واقف ہونا اور اس پیغامبر کے حالات سے آگاہی حاصل کرنا ہر ایک مسلم کہلانے والے کا پہلا فرض ہے۔ وہ مقدس پیغام ان لوگوں کی زبان میں نازل ہوا جنہوں نے دنیا میں اس کے حامل بننا تھا۔ مگر آج اس عالم کے مختلف اطراف واکناف میں رہنے والے مسلمان اس زبان سے ناآشنا ہیں اور بہت ہیں کہ اس پیغام کو پڑھتے ہیں مگر انہیں علم نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے ظاہر ہے کہ اگر اس پیغام کی غرض یہ تھی کہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں اور غلط راہوں کو چھوڑ کر اپنی دینی اور دنیوی فلاح کا صحیح راستہ اختیار کریں تو اس کا مطلب سمجھے بغیر وہ غرض حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں نے جب تبلیغ اسلام کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریزی میں اس پاک کلام کے ترجمہ اور مطالب کو بیان کیا تو بہت سے احباب نے یہ اصرار کیا کہ اردو زبان میں بھی اپنے اہل ملک کے فائدہ کے لئے اسے شائع کیا جائے مگر یہاں کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے از سر نو یہ کام کرنا پڑا۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ ہر ایک مسلمان قرآن کریم کو پڑھے اور اس کے مطالب پر آگاہ ہو کر اپنی روزمرہ زندگی میں اور مشکلات پیش آمدہ میں اسے اپنا ہادی اور رہنما بنائے اس راہ کو اختیار کئے بغیر مسلمان کبھی موجودہ مشکلات سے باہر نہیں نکل سکتے ٭

انگریزی ترجمہ کی طرح اردو ترجمہ قرآن شریف مکمل ایک جلد میں شائع نہیں ہو سکا جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس ترجمہ و تفسیر میں انگریزی کی نسبت بہت زیادہ تشریح ہے۔ الفاظ کی لغت کی تشریح کے علاوہ حواشی تفسیریہ بھی زیادہ ہیں اور ان میں بسط بھی زیادہ ہے اور اس لئے اس کا حجم بھی قریب قریب انگریزی ترجمہ کے حجم سے (دیباچہ کو الگ کر کے) دوچند ہو جائے گا اور علاوہ بریں یہ وقت ہے کہ انگریزی کے لئے جو باریک کاغذ استعمال ہوا ہے ہندوستان میں دستیاب نہیں کہ جو اسے چھاپ سکیں اسلئے موٹا کاغذ لگانا پڑا اور قرآن کریم کو تین جلدوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ اس وقت پہلی جلد شائع ہوتی ہے جو قریباً ساڑھے سات سو صفحوں کی ہے اور گو اس میں صرف ساڑھے سات پارے ہیں مگر آئندہ جلدوں کا حجم جو قریباً گیارہ گیارہ پاروں کو لئے ہوئے ہونگی اسی کے قریب قریب ہوگا کیونکہ بیشتر مضامین پہلے پاروں میں تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں اسلئے آئندہ حواشی میں ان مضامین کے دوہرانے کی ضرورت نہ رہے گی اس جلد کے ساتھ صرف ان مضامین کی فہرست لگائی گئی ہے جو تفسیری حواشی میں آگئے ہیں اور ان الفاظ کی فہرست جن کی لغت بیان ہوئی ہے نہیں لگائی گئی اس لئے کہ ایسی فہرست اسی صورت میں مفید ہو سکتی جب وہ ترتیب وار لغت کی طرز پر تیار ہوتی اور یہ کام سوائے تکمیل کے ہو نہیں سکتا۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ مکمل فہرست آخری جلد کے ساتھ لگائی جائے گی۔ اس وقت تک لغت کی تشریح کی تلاش میں بلاشبہ ناظرین کرام کو وقت پیش آئیگی مگر یہ مجبوری ہے علاوہ ازیں آخری جلد کیساتھ مضامین کی انڈکس بھی ہوگی جس سے یہ تلاش کرنا آسان ہو جائیگا کہ کس مضمون پر کس مقام پر بحث ہے ٭

ترجمہ کے متعلق میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میری یہ کوشش رہی ہے کہ اصل الفاظ کو محاورۂ زبان پر کسی طرح قربان نہ کیا جائے بایں محاورہ کو مدنظر رکھا ہے اور لفظی ترجمہ کرتے ہوئے اسے اردو کے محاورہ کے مطابق ادا کیا ہے۔ ترجمہ کو عموماً الفاظ کی حد سے نہیں نکلنے دیا گو محاورہ اردو نے اسیات کیلئے مجبور کر دیا ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ اس لفظ کے نیچے نہیں آ سکا۔ ترجمہ میں اپنی طرف سے لفظ بڑھانے کے اصول کو قریباً بکلی ترک کیا گیا ہے۔ ہاں جہاں اردو زبان میں آ کر مطلب خبط ہوتا تھا زاید الفاظ کو خطوط وحدانی میں رکھدیا گیا جو کہ بہت ہی کم دیکھنے میں آئیگا ٭

حل لغت میں امام راغب کی نادر کتاب مفردات فی غریب القرآن کو مقدم کیا ہے جو لغت قرآن میں بہترین کتاب ہے اور اس کا بیشتر حصہ نوٹوں میں آ جائیگا۔ مگر اس کے ساتھ ہی تاج العروس اور لسان العرب جیسی ضخیم کتابوں کی طرف بھی بکثرت رجوع کیا ہے اور جہاں مفردات میں کسی لفظ کی تشریح میں کمی تھی اسے دوسری معتبر لغاتوں سے پورا کر دیا ہے۔ عام قارئین کو لغت کے حصے سے زیادہ دلچسپی نہ ہوگی اور مفردات کی فلسفیانہ بحث لغت الفاظ شاید ثقیل بھی معلوم ہو مگر اس کے بغیر تفسیری حواشی نامکمل ہوتے اور چونکہ میرا منشاء یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں قرآن کریم کے درس تدریس کا سلسلہ عام طور پر جاری ہو اور یہ غرض بغیر حل لغت حاصل نہ ہو سکتی تھی اس لئے میں نے اس اضافہ کو ضروری سمجھا۔ ہاں عام قارئین حصہ لغت کو ترک کر سکتے ہیں ہر لفظ جس کی تشریح کی ہے اس تشریح کے سامنے حاشیہ پر وہ لفظ حروف عربی میں دیدیا ہے۔ اور مضامین جن پر بحث ہے ان کی سرخیاں اردو حروف میں ہیں پس جن قارئین کو لغت کے حصہ کی ضرورت نہیں وہ اسے آسانی سے چھوڑ سکتے ہیں۔ حل لغت میں بہترین صورت یہ ہوتی کہ ایک لفظ کی مکمل تشریح اور قرآن شریف کے مختلف موقعوں پر اس کا استعمال ایک جگہ آ جاتا مگر اس طرح پر حجم بھی بہت بڑھ جاتا اور حل لغت کے حصہ میں ثقالت بھی بڑھ جاتی۔ اسلئے عموماً ملتے جلتے استعمال کا ایک جگہ ذکر کر دیا ہے اور جہاں کسی دوسرے معنی میں لفظ کا استعمال ہوا ہے اسے اپنے موقعہ پر بحث کیلئے چھوڑ دیا ہے۔ اس جگہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں الفاظ کے استعمال میں وسعت لغوی موجود ہے اور ایک جگہ ایک لفظ ایک معنی میں استعمال ہوا ہے تو دوسری جگہ کسی اور معنی میں استعمال ہو گیا ہے اور یہ صرف سیاق سے ہی فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کونسے معنی کس جگہ پر مراد ہیں۔ مثلاً کفار کا لفظ عموماً حق کا انکار کرنے والوں پر بولا گیا ہے مگر ایک جگہ اپنے لغوی معنی میں کسانوں پر بھی بولا گیا ہے اصحاب الجنۃ سے عموماً بہشتی ہی مراد ہیں مگر ایک جگہ اس دنیا کے ایک باغ کے مالک بھی مراد لئے گئے ہیں اصحاب النار دوزخی ہیں مگر ایک جگہ دوزخ کے داروغے بھی ہیں ۔

اصول تفسیر پر یہ مفصل بحث کی جگہ نہیں۔ میں نے جن اصول کو مدنظر رکھا ہے وہ یہ ہیں۔ اول یہ کہ قرآن کریم کے ایک موقعہ کا حل دوسرے موقعہ سے کیا جائے اور یہ اصول خود اس پاک کتاب نے بتایا ہے جہاں متشابہات کے ذکر میں کل من عند ربنا فرما کر بتا دیا کہ ایک مقام کی تفسیر قرآن کریم کے دوسرے مقام کے خلاف نہیں ہونی چاہئے جہانتک میں نے اس پاک کتاب پر غور کیا ہے یہی معلوم ہوا ہے کہ کوئی مضمون اس میں ایک جگہ بطور اشارہ یا برنگ اجمال ہے تو دوسری جگہ اس کی وضاحت اور اس کی تفصیل موجود ہے اور اس بات نے مجھے بہت سے مشکل مقامات کے حل کرنے میں مدد دی ہے اور جہاں معنی میں اشتباہ واقع ہو وہاں سب سے بڑھکر خود قرآن پاک اس اشتباہ کو دور کرتا ہے دوسری بات یہ مدنظر رکھی ہے کہ احادیث صحیحہ کو تفسیر میں اور باتوں پر مقدم کیا جائے اس غرض کے لئے میں نے امام بخاری کی کتاب التفسیر۔ تفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن کثیر کو سامنے رکھا ہے لیکن یہاں چند باتوں میں احتیاط ضروری ہے یعنی اول کوئی حدیث خواہ وہ صحاح کی ہو قابل قبول نہیں۔ اگر قرآن کریم کی صراحت کے خلاف ہو یا اصول دینی کے خلاف ہو۔ دوم تفاسیر میں بہت سی اسرائیلی روایات راہ پا گئی ہیں اور ان پر اس قدر اصرار ہو گیا ہے کہ ان کے خلاف اگر کہا جائے تو بعض لوگ ناواقفی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ حدیث کو رد کر دیا گیا۔ سوم قصص کی احادیث پر خود محدثین نے وہ تنقید نہیں کی جو اوامر و نواہی کی احادیث پر کی ہے اس لئے حدیث قصص بہت احتیاط سے قبول کرنے کے قابل ہیں چہارم جو باتیں احادیث میں واقعات یا مشاہدہ یا سلسلہ تاریخ کے خلاف ہوں وہ قابل قبول نہیں۔ اور ان سب امور کے علاوہ یہ بات مدنظر رکھنے کے قابل ہے کہ احادیث اور بالخصوص احادیث قصص میں روایت بالمعنی ہے تیسری بات جس کا میں بالخصوص ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ میں نے استعمال الفاظ کے متعلق لغت کو سب سے مقدم کیا ہے۔ جن معنوں کی اجازت لغات عربی نہیں دیتی ان معنوں کو قبول نہیں کیا۔ صحابہ کے اقوال کی میں بہت عزت کرتا ہوں لیکن کسی صحابی سے اختلاف کرنا جرم نہیں۔ صحابہ میں خود آپس میں بھی اختلاف تھے مفسرین نے بھی آپس میں اختلاف کیا ہے۔ اور سب سے آخر اقوال مفسرین کے متعلق اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ان بزرگوں کی محنت کی ان کے علم و فضل کی ان کے عشق قرآن کی میرے دل میں بیحد عظمت ہے اور ان کی خدمت قرآن کے سامنے میں اپنی اس ناچیز خدمت کو ہیچ سمجھتا ہوں لیکن حالات زمانہ کے اثر سے کوئی شخص خالی نہیں ہو سکتا۔ آج اس زمانہ میں نئے علوم نے قرآن کریم کی عظمت کو اور بھی بڑھا دیا ہے میرے خیالات حالات زمانہ سے متاثر ہو کر غلط ہو سکتے ہیں مگر خدا کے کلام کے ایک حرف کو بھی کوئی علم باطل نہیں کر سکتا۔ ہاں اپنے زمانہ کے مطابق جو علوم ہوں انکی روشنی میں ہی ہم جو کچھ خدمت کر سکتے ہیں کر سکتے ہیں ۔

اس ترجمہ اور ان حواشی میں ایک بات کیطرف بالخصوص توجہ دلانا چاہتا ہوں قرآن کریم سے اجنبیت نے جن دلوں میں یہ خیال پیدا کیا ہے کہ اس پاک کتاب کے مضامین میں کوئی ترتیب نہیں انہوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے موجودہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہے اور یہ ایک اعلیٰ و محکم ترتیب ہے مخالفین میں غور و خوض کی کمی نے بے ترتیبی کا خیال پیدا کیا یہانتک کہ اس زمانہ میں ایک مسلمان نے بھی ان خیالات سے متاثر ہو کر ایک ترتیب نزول اپنے

پاس سے بناکر قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہو ترتیب و نظم دکھانے میں پچھلے مفسرین نے قابل قدر خدمات کی ہیں مگر میں نے اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے اس حصہ کو خاص وقعت دی ہو اور تین قسم کی ترتیب کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہو یعنی اول آیات میں باہمی تعلق جو جگہ جگہ جہاں ضرورت تھی حواشی میں ظاہر کیا ہو دوم ہر سورت کے رکوعوں میں باہمی تعلق سوم سورتوں میں باہمی تعلق ان دونوں اغراض کیلئے ہر رکوع کا خلاصہ اس رکوع کے نیچے دیدیا ہو اور ہر سورت کے شروع میں ان تمام خلاصوں کی ترتیب اور نظم کو ظاہر کیا ہو جس کا عنوان خلاصہ مضمون ہو اور سورتوں کے باہمی تعلق کو عنوان تعلق کے ماتحت ظاہر کیا ہو اسکے علاوہ سورتوں کے اسماء میں بھی حکمت ہو اور نبی کریم صلعم نے یہ اسماء رکھے ہیں کسی نام کے رکھنے میں جو حکمت میری سمجھ میں آئی ہو اسے ابتدائے سورت میں ظاہر کیا ہے +

بعض خاص باتوں سے قارئین کرام کو آگاہ کردینا ضروری ہو. ہر سورت کی آیات کا شمار مسلسل چلتا ہو مگر آیت اور رکوع کا شمار اس آیت یا رکوع کے آخر پر نہیں دیا جیسا کہ عموماً مروج ہو بلکہ اس کے شروع میں دیا ہو مثلاً ۱۰/۱۴ع سے مراد ہو کہ یہاں سے دسواں رکوع سورت کا اور چودھواں رکوع پارے کا شروع ہوتا ہو اور اس رکوع میں گیارہ آیتیں ہیں آیات کے شمار کے لیے حاشیہ میں علیحدہ جگہ خالی چھوڑی ہو جہاں کسی سطر کے سامنے کوئی نمبر ہے اس سے مراد ہے کہ اس سطر کے کسی موقعہ پر اس نمبر کی آیت شروع ہوتی ہو. اور جہاں ایک سطر میں دو یا زیادہ آیتیں شروع ہوتی ہیں تو دو نمبر اسی ترتیب سے اوپر نیچے کردیئے ہیں اس سے حوالہ کی تلاش میں سہولت رہے گی. نوٹوں کا شمار سارے قرآن شریف میں مسلسل ایک ہی چلتا ہو تاکہ کسی نوٹ میں جب دوسرے نوٹ کا حوالہ آجائے تو اس کی تلاش میں سہولت رہے. نوٹوں کے اندر جہاں قرآن کریم کی کسی آیت کا حوالہ دیا ہے سورت کے نام کے اوپر سورت کا نمبر اور آگے آیت کا نمبر دیدیا ہے. جہاں اسی سورت کی دوسری آیت کا حوالہ ہو تو صرف خطوط ہلالی میں آیت کا نمبر دے دیا ہو جہاں [illegible] حوالہ ہو اس سے مراد اس نمبر کا نوٹ ہے حوالجات لغت و تفاسیر وغیرہ میں بجائے پورے نام کے اختصاراً حروف دے دیئے ہیں. ت تاج العروس ث ابن کثیر. ج تفسیر ابن جریر. ح تفسیر بحر المحیط. ر روح المعانی. ذ تفسیر کبیر امام رازی. ض تفسیر بیضاوی. غ مفردات راغب. غق تفسیر غرائب القرآن. ف تفسیر فتح البیان. ک تفسیر کشاف. ل لسان العرب. ن نہایہ ابن اثیر کی جگہ ہو +

بالآخر اس بات کا ظاہر کردینا بھی ضروری ہو کہ گو قرآن شریف کی اس ناچیز خدمت میں میں نے سلف صالحین کی محنت سے بہت فائدہ اٹھایا ہے مگر میری زندگی میں جس شخص نے قرآن کریم کی محبت اور خدمت قرآن کا شوق پیدا کیا وہ اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی ہیں اور ان کے بعد فہم قرآن میں جس شخص نے مجھے اس راہ پر ڈالا وہ استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب مرحوم ہیں اگر کسی شخص کو میری اس ناچیز خدمت سے کچھ فائدہ پہنچے تو وہ جہاں میرے لئے دعا کرے ان بزرگوں کے لئے بھی دعا کرے میں محض مٹی ہوں اگر اس میں کچھ خوشبو کسی کو معلوم ہو تو وہ کسی اور کی پھونکی ہوئی روح ہو ؎

جمال ہمنشیں در من اثر کرد

وگر نہ من ہماں خاکم کہ ہستم

پھر میں اکیلا کچھ نہ کرسکتا تھا اگر میرے وہ احباب جو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کے ممبر ہیں میرے معاون نہ ہوتے مجھ سے بڑھکر ان احباب کی کوششوں کا نتیجہ یہ ترجمہ ہے جزاہم اللہ خیرا. معمولی لغزشوں اور غلطیوں پر اگر کوئی صاحب چشم پوشی سے کام لیں تو اللہ تعالیٰ کی صفت ستاری ہے. قابل اصلاح غلطی نظر آئے تو مجھے اطلاع دیں اپنی سمجھ کے مطابق اصلاح کی کوشش کروں گا. اختلاف رائے پر صبر کریں تو آج اتحاد اسلامی کے لئے سب سے بڑھکر اسی کی ضرورت ہو و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الامین +

اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی صحت اور توفیق عطا فرمائی تو دوسری جلد ترجمہ کی انشاء اللہ تعالیٰ نومبر ۱۹۲۲ء میں اور تیسری جلد اپریل ۱۹۲۳ء میں شائع ہو جائے گی مقدمہ علیحدہ کتاب کی صورت میں ہوگا جو کسی وقت بعد میں شائع ہوگا +

خاکسار
محمد علی

احمدیہ بلڈنگس لاہور
۸ - مارچ ۱۹۲۲ء

خادم اسلام کاتبہ عبدالقادر احمدی - کاتب تفسیر القرآن

فہرست مضامین بیان القرآن جلد اول



نام۔ اس سورہ شریفہ کا سب سے مشہور نام الفاتحۃ یا فاتحۃ الکتاب ہے۔ سورتوں کے اسماء جن سے وہ مشہور ہیں بہت سے صحیح احادیث میں پائے جاتے ہیں اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مروی ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ سورتوں کے اسماء توقیفی ہیں یعنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ہونے کی وجہ سے منجانب اللہ ہیں چنانچہ اس سورت کا نام الفاتحۃ یا فاتحۃ الکتاب بھی حدیث میں مروی ہے جیسا کہ ابو داؤد اور ترمذی کی اس حدیث سے ثابت ہے جس میں فرمایا لا صلوٰۃ الا بقرأۃ فاتحۃ الکتاب یعنی فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی۔ اور بھی کئی حدیثوں میں یہ نام آتا ہے مثلاً صحیحین میں ابو ہریرہؓ کی روایت سے ہے قال رسول اللہ صلعم لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب جو شخص فاتحۃ الکتاب نہیں پڑھتا۔ اس کی نماز نہیں ہوتی۔ خود قرآن شریف میں سورۃ الحجر میں اس کا نام سبعًا من المثانی آیا ہے یعنی سات آیات جو بار بار دوہرائی جاتی ہیں اور حدیث صحیح میں اس کا نام امّ القرآن یا اُمّ الکتاب بھی آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت قرآن کریم کی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ اور بھی نام وارد ہیں۔ جیسے الدعاء۔ الصلوٰۃ۔ الشفاء۔ الکنز۔ الحمد۔ امام سیوطی نے پچیس نام اتقان میں لکھے ہیں۔

سورتوں کے نام توقیفی ہیں

فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی

فاتحہ کے اور نام

خلاصہ مضمون۔ اس سورت میں کل سات آیات ہیں جن میں سے پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی ان چار صفات کاملہ کا ذکر ہے جن پر اس دنیا کا کل نظام قائم ہے۔ یعنی پہلی آیت میں ربوبیت یا وہ صفت جو ہر ایک مخلوق کو اپنے دائرہ کے اندر کمال تک پہنچاتی ہے۔ دوسری آیت میں رحمانیت یا وہ صفت جو ہر شئے کے اپنے کمال تک پہنچنے کے لئے ضروری اسباب اس کے وجود میں آنے سے بھی پہلے مہیا فرماتی ہے۔ اور رحیمیت یعنی وہ صفت جو ان سامانوں سے فائدہ اُٹھانے پر اعلیٰ درجہ کے ثمرات مترتب فرماتی ہے۔ اور تیسری آیت میں مالکیت یا وہ صفت جو ان سامانوں سے فائدہ نہ اُٹھانے پر یا قوانین کی خلاف ورزی پر سزا دیتی ہے تاکہ نظام عالم قائم رہے اور چیزیں اپنے کمال کو پہنچتی رہیں۔ چوتھی آیت میں بندہ کا یہ اقرار ہے کہ صرف وہی ذات پاک جس کی محامد پہلی تین آیات میں مذکور ہیں لائق عبادت ہے اور صرف اسی سے ہر قسم کی مدد طلب کی جاتی ہے۔ آخری تین آیات میں راہ راست پر چلنے اور تفریط و افراط سے بچنے کی دعا ہے۔ پس پہلی تین آیات صرف محامد الٰہی کے لئے ہیں۔ آخری تین بندہ کے لئے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ انعامات کا وارث ہو اور درمیانی آیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے عبد کا تعلق ہے یعنی دونوں میں مشترک ہے اور اس کے پہلے حصہ یعنی اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا تعلق درحقیقت پہلی تین آیتوں سے ہے کیونکہ وہ کامل محامد جن کا ذکر ان آیات میں ہے اسے مستحق عبادت ٹھہراتی ہیں اور جب وہ مستحق عبادت ہوا تو اعانت کا طلب کرنا بھی اسی سے ضروری ہوا۔ اب اس پچھلے حصہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا تعلق پہلے حصہ سے قائم ہو گیا۔ اور پھر اس استعانت کی تشریح آخری تین آیات میں فرمائی اور یوں اس کا تعلق آخری تین آیات سے ہو گیا یہی معنی ہیں اس حدیث کے جس کو ترمذی نے حسن قرار دیا ہے کہ صلوٰۃ

اللہ تعالیٰ کی چار صفات

ربوبیت

رحمانیت

رحیمیت

مالکیت

فاتحہ کے دو حصے ان کا باہم تعلق



یعنی فاتحہ مجھ میں اور میرے بندہ میں نصف نصف ہے۔ قال اللہ قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین ولعبدی ما سأل۔

فاتحہ کی عظمت

فاتحہ کے ابتدا میں رکھا جائے صحیح احادیث میں اس کو اعظم السور فی القرآن کہا گیا ہے یعنی قرآن کریم کی وجہ اس کی عظمت ہے کی سب سے زیادہ عظمت والی سورت اس کی عظمت اول تو خود اس سے ظاہر ہے کہ نماز میں جسے مومن کا معراج قرار دیا گیا ہے ہر رکعت میں اس سورت کا پڑھنا ضروری ہے اس کے ساتھ اور جہاں سے چاہے پڑھ لے پھر اس کا نام اُمّ الکتاب بتاتا ہے کہ یہ سورت گویا قرآن کریم کی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔

خلاصہ تعلیم قرآنی

قرآن کریم کی اصل غرض محامد الٰہی کا بیان کرنا۔ اور انسان کو اپنے حقیقی کمال تک پہنچانا ہے چنانچہ اس سورت کے پہلے حصہ میں وہ محامد مذکور ہیں۔ اور پچھلے حصہ میں انسانی کمال کے حصول کا ذکر ہے۔ پھر اس سورت کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سے شروع کر کے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کا ہی ذکر کر دیا۔ بلکہ نسلِ انسانی کی بھی وحدت کی بنیاد رکھ دی۔ اور عَالَمِیْنَ کا لفظ استعمال فرما کر ساری تفریقات قومی کو دور کر دیا۔ اور یہی مذہب کا خلاصہ ہے۔ کہ وہ خدا کی ربوبیت اور انسانوں کی اخوت کو قائم کرے۔ اور ان الفاظ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سے بہتر الفاظ میں یہ خلاصہ نہیں ہو سکتا۔

فاتحہ میں عقاید باطلہ کی تردید

پھر اس سورت کے اندر جن صفات الٰہی کا ذکر ہے۔ وہ گو یا کل صفات الٰہی کے لئے بطور اُمّ یا جڑ کے ہیں۔ یعنی ربوبیّت۔ رحمانیّت۔ رحیمیّت۔ مالکیّت۔ انہی سے باقی صفات الٰہی بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان چار صفات میں دوسرا کمال یہ ہے۔ کہ مذاہب عالم کے کُل اصُولِ باطلہ کی ان میں تردید ہے۔ صفت ربوبیّت میں اس بات کا رد ہے کہ خدا کی ذات یا صفات میں کوئی شریک ہو سکتا ہے۔ وہ رُوح اور مادّہ کا بھی رب ہے۔ اس لئے رُوح اور مادّہ اس کی کسی صفت میں جیسے غیر مخلوق ہونا شریک نہیں ہو سکتے۔ ایسا ہی بُت پرستی اور ہر قسم کے شرک کی تردید ہے۔ کیونکہ مستحق حمد و عبادت وہی ذات ہو سکتی ہے جو دوسروں کی ربوبیّت کرے۔ اور ربوبیّت کرنے والی ذات صرف ایک ہی ہے۔ صفتِ رحمانیّت میں جس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ بلا بدل رحم کرتا ہے۔ کفارہ کے عقیدہ کی تردید ہے۔ کیونکہ کفارہ کے عقیدہ کی بُنیاد اس بات پر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ رحم بلا بدل نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کا بیٹا انسانوں کے گناہوں کا معاوضہ بنایا جاتا ہے۔ مگر رحمانیّت چاہتی ہے۔ کہ خدا کا رحم انسانوں پر بلا بدل بھی ہو۔ جیسا کہ اس کی مخلوق میں ہم کو نظر آتا ہے کہ انسانوں کے پیدا ہونے سے بھی پہلے وہ اُن کے لئے سامان مہیا فرماتا ہے۔ صفت رحیمیّت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے اعمال پر جو اس کے قوانین کی فرمانبرداری میں ہوں اللہ تعالیٰ بڑے بڑے اجر دیتا ہے۔ ایسے عقاید کی تردید ہے۔ جو انسان کے اعمال کے محدود ہونے کی وجہ سے ان کے اجر کو بھی محدود قرار دیتے ہیں۔ اور اس لئے نجات کو عارضی قرار دیتے ہیں۔ صفت مالکیّت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گو قوانین کی نافرمانی پر سزا دیتا ہے مگر اس کا معاملہ اپنی خلق کے ساتھ مالک کا معاملہ اپنے مِلک کے ساتھ ہے تناسخ وغیرہ عقاید کی تردید ہے جن کی رُو سے اللہ تعالیٰ کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ اور اس لئے ہر گناہ کی پاداش میں انسان کو بیشمار جونوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور جس طرح عقاید باطلہ کی تردید اس حصہ میں ہے پچھلے حصہ میں ہر ایک قوم کی افراط و تفریط کی تردید ہے

فاتحہ میں میانہ روی کی تعلیم

سوائے اسلام کے جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنی موجودہ حالت میں صرف ایک خاص شاخِ اخلاق انسانی پر ہی سارا زور دیتے ہیں۔ اور اس لئے اُن میں تفریط و افراط کی غلطیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ یعنی ایک شاخ



پرعد سے زیادہ زور دیا۔ اور دوسری کو بالکل نظرانداز کردیا۔ اسلام کی تعلیم کا خلاصہ یہاں اعتدال یا میانہ روی قرار دیا گیا ہے۔ جو ایک طرف تفریط سے بچاتا اور دوسری طرف افراط سے محفوظ رکھتا ہے پس یوں سورہ فاتحہ میں ہر ایک باطل کی تردید بھی موجود ہے۔ اور اس کے بالمقابل عقاید اور اعمال میں ان اصول حقہ کی تعلیم ہے۔ جو بطور بنیاد کے ہیں۔

بہترین دعا۔ عیسائی دعا سے مقابلہ

پھر جو دعا اس سورت میں سکھائی گئی ہے۔ وہ دعا بھی اعلیٰ سے اعلیٰ دعا ہے جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ عیسائیوں کو اپنے خداوند کی دعا کے متعلق بہت کچھ دعویٰ ہے۔ مگر فاتحہ کے بالمقابل یہ دعا کچھ بھی نہیں وہاں روز کی روٹی کی التجا ہے یہاں صراط مستقیم کی یعنی کمال انسانی کے حصول کی۔ اس سے دونوں دعاؤں کے مقاصد میں فرق ظاہر ہوتا ہے۔ پھر وہاں گناہوں کی معافی کی التجا ہے۔ یہاں اس مقام پر پہنچنے کی آرزو ہے جہاں گناہ ہی انسان سے سرزد نہ ہو اور نہ کسی قسم کے حقوق میں تفریط واقع ہو نہ افراط۔ گویا یہ بے گناہ یا معصوم بن جانے کی دعا ہے پس کامل اصول حقہ کے سکھانے میں اصول باطلہ کی تردید میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سکھانے میں اور کمال انسانی تک پہنچانے میں اس کی نظیر نہ تورات میں ملتی ہے نہ انجیل میں ایسا ہی جو تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے عبد میں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کے مختصر فقرہ میں قائم کیا گیا ہے وہ بھی بے نظیر ہے۔ جو لوگ وظائف کے پیچھے بھٹکتے پھرتے ہیں وہ اگر افضل الدعا سے کام لیں تو بہت جلد اپنے مقاصد کو پا سکتے ہیں۔ سورہ فاتحہ سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں اور یہ وہ وظیفہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کو سکھایا ہے ✦

بہترین وظیفہ

ابتدائی وحی۔ نماز با جماعت کی ابتدا

زمانۂ نزول ۔ نہ صرف اس بات پر اتفاق ہے۔ کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی بلکہ اس پر بھی کہ مکی وحی میں بھی نہایت ابتدائی زمانہ کی ہے۔ یہ سورت ابتدا سے نماز میں پڑھی جاتی تھی۔ اور نماز مکہ میں برابر پڑھی جاتی تھی۔ بلکہ بعثت نبوی کے چوتھے سال کا یہ واقعہ کہ سعدؓ مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ مکہ کے پاس ایک میدان میں نماز پڑھ رہے تھے جس پر کفار کے ساتھ جھگڑا ہوگیا۔ اور اس کے بعد ارقم کا گھر نماز پڑھنے کے لئے منتخب کیا گیا بتاتا ہے کہ چوتھے سال سے پیشتر نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی۔ اور اس لئے سورہ فاتحہ بھی پڑھی جاتی تھی۔ اس کے ابتدائی نزول کے متعلق صرف قیاس اور قرائن ہی نہیں بلکہ ایک روایت میں یوں بھی آیا ہے۔ کہ فاتحہ اول شئ انزل من القرآن ہے یعنی سب سے پہلے جو چیز قرآن سے نازل ہوئی۔ اس حدیث کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں بیان کیا ہے (فت) اس پر جرح یہ ہوئی ہے۔ کہ بالاتفاق اقرأ باسم ربك سب سے پہلے نازل ہوا ہے۔ مگر غالب مراد اول شئ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ پوری سورت جس کا نزول سب سے پہلے ہوا ہے فاتحہ ہے۔ کیونکہ سورۃ علق کی صرف پانچ آیتیں صدر کی پہلے نازل ہوئیں۔ اور بقیہ حصہ بعد میں نازل ہوا ✦

نزول میں سب سے پہلی مکمل سورت

بسم اللہ کا نزول ہر سورت کی ابتدا میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ قرآن کریم میں سوائے سورۂ براۃ کے سب سورتوں کی ابتدا میں لکھی جاتی ہے اور اس کا نزول ہر سورت کی ابتدا میں صحیح حدیث سے ثابت ہے ابو داؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سورۃ کی علیحدگی کو نہیں پہچانتے تھے یہاں تک کہ آپ پر بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نازل ہوتی۔ اس سے یہ ثابت ہے کہ ہر سورۃ کے شروع میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نبی کریم صلعم پر نازل ہوئی۔ البتہ یہ آیت قرآن کریم کی کسی سورۃ کی آیات کے اندر شمار نہیں ہوئی اور نہ ہی فاتحہ کے۔ ابن کثیر میں ہے۔ کہ داؤد نے کہا کہ ہر ایک سورۃ کی ابتدا میں یہ ایک مستقل آیت

ہر سورت میں مستقل آیت ہے



ہے اس سورۃ میں سے نہیں اور یہی امام احمد بن حنبل سے روایت ہے اور یہی امام ابو حنیفہ کا صحیح مذہب ہے ✦

بسم اللہ ہر سورۃ کا خلاصہ ہے

بسم اللہ ہر سورۃ کا خلاصہ ہے ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کیوں ایک مستقل آیت ہے ۔ اس لئے کہ جس طرح سورہ فاتحہ
خلاصہ ہے کل قرآن کریم کا ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم خلاصہ ہے سورہ فاتحہ کا ۔ اس لئے کل قرآن کریم کا بھی یہ خلاصہ ہے۔
اور چونکہ قرآن کریم کی ہر ایک سورۃ بجائے خود بھی ایک کتاب ہے کہ اس کے اندر ایک مستقل مضمون ہے ۔ اس لئے ہر سورۃ
کی ابتدا میں بھی اسے ایک مستقل آیت رکھا گیا ہے ۔ اور سورہ فاتحہ کا اس کا خلاصہ ہونا اس بات سے ظاہر ہے کہ فاتحہ

سورہ فاتحہ کا خلاصہ

میں جن چار صفات الٰہی کا ذکر ہے ان میں سے یہاں دو کا انتخاب کیا گیا ہے یعنی وہاں ربوبیّت ۔ رحمانیّت ۔ رحیمیّت
مالکیّت کی صفات ہیں ۔ جو کل صفات الٰہی کے لئے بطور امہات کے ہیں یہاں ان میں سے دو صفات رحمانیّت اور رحیمیّت

نظامِ عالم ۔ رحمانیت ورحیمیت پر ہے

کا انتخاب کر لیا گیا ہے ۔ اور اگر غور کیا جائے تو سامانوں کا مہیا ہونا اور جب ان سامانوں کو کام میں لایا جائے تو اس پر
اجر کا مترتب ہونا یہی سلسلہ نظامِ عالم ہے جس پر کل کاروبار کا دارومدار ہے جس قدر سامانِ زندگی اللہ تعالیٰ نے ہم کو دئے
ہیں جیسے ہوا پانی آگ سورج وغیرہ ایسا ہی اس کے قوانین یہ سب کچھ صفتِ رحمانیت کا ظہور ہے ۔ اور جب ان چیزوں
کو ہم اپنے کام میں لاتے ہیں تو ان سے نتائج کا پیدا ہونا صفتِ رحیمیت کا ظہور ہے ۔ پس ہماری جسمانی زندگی کے سلسلہ

نظام روحانی بھی رحمانیت ورحیمیت پر ہے

میں یہی دو صفات اصلی کام کرنے والی ہیں یہی حالت ہماری روحانی بقا کی ہے ۔ کہ اس میں اللہ تعالیٰ صفت رحمانیت کے
تقاضا سے ہمیں اپنی طرف سے قانون اور شرائع انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے عطا فرماتا ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ
اور جب ان شرائع اور قوانین کو ہم اپنے عمل میں لاتے ہیں تو ان پر نتائج مترتب فرماتا ہے پس نظامِ جسمانی اور نظامِ

اسم اعظم

روحانی دونوں کا قیام انہی دو صفات سے ہے ۔ اس لئے بعض نے اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم اللّٰہ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ قرار دیا
ہے (زرقانی) اور نہ صرف صفات الٰہی کا ہی بسم اللہ میں خلاصہ آگیا ہے بلکہ وہ نصف حصہ جو سورہ فاتحہ میں بندہ کے
لئے ہے اس کو یہاں ایک باء سے ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ وہ حصہ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے شروع ہوتا ہے ۔ اور یہاں بھی

بسم اللہ میں عملی توحید

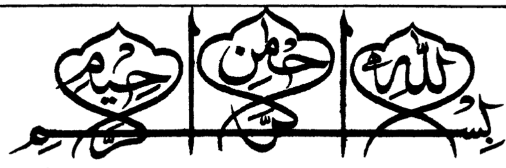
باء استعانت کے لئے ہے ۔ یوں بسم اللہ ہر مسلمان کی زندگی میں عملی توحید کا سبق ہے ✦

بسم اللہ کی ابتدا

بسم اللہ امر الٰہی کی تعمیل بھی ہے ۔ یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم درحقیقت اس امر الٰہی
کی بھی تعمیل ہے ۔ جو رسول اللہ صلعم کو سب سے پہلے ہوا بخاری میں ہے کہ جب آپ غار حرا میں حسب معمول عبادتِ الٰہی
میں مصروف تھے ۔ تو فرشتہ آیا ۔ اور کہا اقرأ یعنی پڑھ آپ نے کہا ما انا بقارئ میں تو پڑھنا نہیں جانتا ۔ فرشتہ نے پھر
وہی لفظ دوہرائے ۔ اور آپ نے بھی اس جواب کا اعادہ کیا اور اسی طرح تین مرتبہ ہوا ۔ چوتھی مرتبہ فرشتہ نے کہا
اقرأ باسم ربك الذى خلق الخ تو اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو سکھایا کہ باسم ربك الذى خلق کس طرح
پڑھا جاتا ہے چنانچہ بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد دوسری وحی جو نازل ہوئی وہ یہی تھی
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سورت کے آخر تک ۔ گویا اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو تعلیم دی

بسم اللہ سے کام میں برکت ہوتی ہے

کہ وہ خدا کی مدد کس طرح طلب کیا کرے ۔ اور ایک حدیث میں ارشادِ نبوی یوں ہے کل امر لا یبدأ فیه ببسم الله
الرحمن الرحيم فهو اجذم یعنی ہر ایک کام جسے بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے ۔ اور یقیناً جو شخص
اپنے کاموں میں اللہ تعالیٰ سے استعانت کا طالب ہوگا اسے برکت ملے گی ✦



اللہ بے انتہا رحم والے — بار بار رحم کرنے والے — کے نام سے ۱

با

ع ۱ بسم اللہ میں با استعانت کیلئے ہے یعنی اللہ کے نام کی مدد چاہتا ہوا پڑھتا ہوں اور یہ اِقْرَاْ کی تعمیل ہے (العلق ۹۶-۱)۔

اسم

اسم سمو سے ہے جس کے معنی بلندی ہیں پس اسم وہ ہے جس سے مسمّی کا ذکر بلند ہو اور وہ اس سے پہچانا جائے (غ) جوہر اور عرض یا ذات وصفات دونوں پر اس کا استعمال ہے۔ اللہ اسم ذات ہے اور الرحمٰن الرحیم صفاتی نام ہیں گویا پڑھنے والا اللہ کی صفاتِ رحمانیت ورحیمیت کی مدد چاہتا ہے۔

اللہ۔ اسم اعظم

اللہ باری تعالیٰ کا اسم ذات ہے اور یہی اسم اعظم ہے اور کل اسمائے الٰہی کے لئے یہ اسم جامع ہے۔ یہ اَلَہَ سے مشتق نہیں نہ اس کا اصل اِلٰہ ہے کیونکہ اِلٰہ غیر اللہ معبود پر بولا جاتا ہے۔ حالانکہ اَللہ کا لفظ نہ اسلام میں اور نہ اسلام سے پہلے کبھی دوسرے معبود پر بولا گیا ہے۔ نہ یہ اَلْاِلٰہ کا مخفف ہے کیونکہ یَا اَللہُ کہا جاتا ہے یا الالٰہ یا یَا اَلرَّحْمٰن نہیں کہا جاتا پس اَلْ اس میں زاید نہیں۔ عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں اللہ کا اسم ذات موجود نہیں۔

الرحمٰن الرحیم

فعلان اور فعیل کے مبالغہ میں فرق

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ دونوں رَحِمَ سے مشتق مبالغہ کے صیغے ہیں ایک فَعْلَان کے وزن پر دوسرا فعیل کے۔ فَعْلَان کا مبالغہ امتلا اور غلبہ کے لئے ہوتا ہے یعنی صفت کی زیادتی کے لئے فعیل کا مبالغہ تکرار کے لحاظ سے ہوتا ہے یعنی صفت کے بار بار تکرار سے (ح) اور بعض نے یوں فرق کیا ہے کہ رحمٰن کا لفظ اس صفت پر دلالت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات میں قائم ہے۔ اور رَحِیْم اس صفت پر جو اس شخص کے تعلق سے پیدا ہوتی ہے جس پر رحم کیا گیا پس رحمان وہ ذات ہے جس کا رحم بہت ہی بڑا ہے یہاں تک کہ انسان کی پیدائش سے پہلے وہ انسان کے لئے سامان مہیا کرتا ہے اور یہ صفت مومن اور کافر دونوں پر حاوی ہے۔ اور رَحِیْم وہ ذات ہے جس کا رحم بار بار عود کرتا ہے اور یہ صفت اس شخص کے فعل پر ظہور پذیر ہوتی ہے (اور ہر فعل پر بار بار ظہور پذیر ہوتی ہے) جس پر رحم کیا گیا

رحمان دنیا۔ رحیم آخرت

اسی لئے حدیث میں آتا ہے دنیا کا رحمان اور آخرت کا رحیم۔ کیونکہ رحمٰن نے انسان کی پیدائش سے پہلے محض اپنے رحم سے اس کے لئے سارے سامان پیدا کئے اور رحیم انسان کے صالح اعمال پر جزا دینے والا ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے گویا ابتدا میں جو سامان انسان کے لئے مہیا کرتا ہے وہ رحمٰن ہے اور ان ساماںوں سے فائدہ اُٹھانے پر جب انسان کوشش صرف کرتا ہے تو اس کا نتیجہ دینے والا رحیم ہے۔ زمین پانی آگ وغیرہ کا پیدا کرنا صفت رحمانیت کا تقاضا ہؤا۔ زمین میں ہل چلا کر پانی دے کر انسان ایک دانہ کا سو بنا لیتا ہے یہ تقاضائے رحیمیت ہے اسی طرح شرائع کا دینا نبوت کا عطا کرنا صفت رحمانیت کا تقاضا ہے۔ ان شرائع پر عمل کر کے فلاح حاصل کرنا صفت رحیمیت کے ماتحت ہے۔ اسیلئے قرآن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھانا بھی اَلرَّحْمٰن کا کام ہے۔

رحمان غیر اللہ پر نہیں بولا جاتا

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ رحمان اللہ سے مخصوص ہے غیر پر نہیں بولا جاتا اور رحیم بولا جاتا ہے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ (التوبة-۱۲۸) آنحضرت صلعم کی نسبت فرمایا ہے۔

کامل دعا ع ١

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ　　١ - ٢

سب تعریف اللہ کے لئے ہے (تمام) جہانوں کا رب ہے بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنے والا

ال۔ حمد، **مدح شکر میں فرق** — ١-٢ اَلۡحَمۡدُ میں اَلۡ استغراقی ہے یعنی سب محامد یا ہر جنس کی حمد مراد ہے حَمۡد وہ تعریف ہے جو فضیلت کی وجہ سے کی جاتی ہے یعنی ان خوبیوں کی وجہ سے جو دوسرے کو مسخر کر لیتی ہیں اور مدح وسیع ہے کیونکہ مدح اختیار سے بھی کی جاتی ہے اور تسخیر سے بھی اور شکر کسی خاص نعمت کے مقابل پر ہونے سے اور بھی محدود ہے (غ)

رب — رَبّ ۔ اصل مصدر ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشوونما دینا یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے (غ) اور اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے پس رَبّ وہ ذات ہے جو تدریجاً ایک چیز کو اپنے کمال تک پہنچاتی ہے یہاں سے مسئلہ ارتقا کی بھی اصلیت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کی رو سے بھی ہر چیز تدریجاً اپنے کمال کو پہنچتی ہے بطلق لفظ رب صرف ذات باری پر بولا جاتا ہے دوسرے کی طرف منسوب کرکے اوروں پر بھی بول سکتے ہیں جیسے رَبُّ الدّار گھر کا مالک ۔ حضرت یوسفؑ کا قول منقول ہے اذکرنی عند ربك (یوسف ١٢ - ٤٢) اس کی جمع ارباب آئی ہے ءارباب متفرقون خیر (یوسف ١٢ - ٣٩)

عالم — عَالَمِیۡنَ ۔ عَالَمۡ کی جمع ہے جو علم سے مشتق ہے کل مخلوق یا موجودات کو عَالَم اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ آلہ ہے جو صانع کے وجود پر دلالت کرتا ہے ۔ مخلوق کی ہر قسم کو بھی عَالَم کہا جاتا ہے ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار سے بھی زیادہ عالم ہیں (ت) کل انسان بھی ایک عَالَم ہیں اور ہر ایک قوم بھی ایک عالم ہے ۔ بلکہ ہر زمانہ کے لوگوں کو بھی ایک عالَم کہا جاتا ہے (ج) اس لئے جہاں بعض انسانوں یا قوموں کو عالمین پر فضیلت دینے کا ذکر ہے وہاں مراد اس زمانہ کے لوگ ہیں ۔ یہاں مراد جمع لانے سے موجودات کی سب اقسام کو شامل کرنا ہے ۔

الحمد میں رضا بالقضا کا سبق — اسلام کی تعلیم کی ابتدا اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ سے ہوتی ہے جس میں انسان کو رضا بالقضا کا اعلیٰ سے اعلیٰ سبق سکھایا گیا ہے کیونکہ یہ وہ سورت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ نمازوں میں کئی کئی بار پڑھتا ہے اور راحت میں ہو یا تکلیف میں اس کے مُنہ سے حمد اور شکر کے کلمات ہی نکلتے ہیں ۔ اس سے نبی کریم صلعم کے قلب مبارک کی بھی کیفیت معلوم ہوتی ہے جس پر اس وحی کا نزول ہوا

قلب نبوی کی وسعت — آپ کے دل میں اس قدر حمد الٰہی بھری ہوئی تھی کہ کسی حال میں خدا کی شکایت کا وہم بھی آپ کے دل میں نہ آسکتا تھا صبح اُٹھتے ہیں تو حمد ۔ دوپہر کو حمد ۔ سہ پہر کو حمد ۔ غروب آفتاب پر حمد ۔ رات سوتے وقت حمد ۔ رات کو اُٹھ کر حمد ۔ آپ کا سینہ حمد الٰہی سے

احمد — لبریز تھا ۔ اسی حمد کی وجہ سے جو آپ نے سب انبیاء سے بڑھ کر کی آپ کا نام احمد ہوا جو آپ سے پہلے کسی انسان کا نام نہیں ہوا

محمد — اور جب آپ نے سب سے بڑھ کر خالق کی حمد کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی مخلوق سے سب سے بڑھ کر آپ کی حمد کرائی اور اس لئے آپ کا نام محمد ہوا ۔ صلی اللہ علیہ وبارک وسلم ۔

اسلام کی تعلیم کی وسعت پر یہ دلالت ہے کہ اس کی ابتدا ہی تمام جہانوں کی ربوبیت سے ہوتی ہے نہ ایک قوم کی اور

وحدت نسل انسانی — اس ایک فقرہ الحمد للہ رب العالمین میں جہاں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی نسل انسانی کی وحدت بھی بیان کردی ۔ رب العالمین کا لفظ اختیار کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر پہلے متفرق طور پر نسل انسانی کی روحانی ربوبیت ہوتی رہی تو اب ان سب کی ربوبیت ایک ہی نبی کے ذریعہ سے ہوگی ۔ کیونکہ یہاں ربکم یا رب المسلمین یا اور کوئی ایسا لفظ اختیار نہیں کیا

ضرورت وحی — جس سے تفرقہ پیدا ہوتا ہو ۔ پھر رب العالمین میں وحی الٰہی کی ضرورت کی طرف بھی صاف اشارہ ہے کیونکہ اسم رب کا تقاضا ہے کہ ہر مخلوق کو اپنے کمال کو پہنچائے مگر انسان کا حقیقی کمال صرف جسم کی پرورش تک محدود نہیں بلکہ وہ اخلاق سے ہے پس

۳ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝

جزا کے وقت کا مالک ؎۳

مخلوق کی خدمت کا سبق

جس طرح جسم کے کمال کے لئے عالم جسمانی میں خارجی سامان رب نے پیدا کئے ہیں ضروری ہے کہ روحانی کمال کو حاصل کرنیکے لئے خارجی سامان عالم روحانی میں موجود ہوں یہی وحی الٰہی ہے۔ اسی چھوٹے سے فقرہ میں یہ عظیم الشان سبق بھی ہے کہ استحقاقِ حمد ربوبیت سے پیدا ہوتا ہے پس وہی انسان قابل حمد ہوگا جو دوسرے انسانوں کی خدمت گزاری کرے اور وہ بھی صرف اپنے عیال یا خاندان یا قوم کی نہیں بلکہ سب قوموں کی بلکہ انسانوں کو چھوڑ کر دوسری مخلوق کی بھی +

رب اور اب

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ جہاں دوسرے مذاہب نے خدا تعالیٰ کو اَب یا باپ کرکے پکارا ہے۔ قرآن کریم نے دعاؤں میں لفظ رَبّ اختیار کیا ہے۔ کیونکہ رَبّ کا تعلق اپنی مخلوق سے اس سے بہت بڑھکر ہے جو باپ کا تعلق بیٹے سے ہے۔

دعاؤں میں ربنا کا استعمال

قرآنی دعائیں عموماً رَبَّنَا سے شروع ہوتی ہیں گویا ہر دعا کا مقصد انسانوں کا کمال حقیقی تک پہنچنا ہے۔ کیونکہ رب وہ ہے جو ہر شے کو اس کے کمال تک پہنچاتا ہے مگر اَب انسان کو اس کے کمال تک نہیں پہنچاتا پس خدا کو اَب کرکے پکارنا بہت ادنےٰ مرتبہ ہے +

مالِك - مَلِك

ع ؎۳ مالك اور مَلِك یعنی بادشاہ میں فرق یہ ہے کہ مَلِك صرف بعض امور میں متصرف ہوتا ہے مالِك اپنی مِلک پر پورا تصرف رکھتا ہے۔ کیونکہ حرف کے بڑھنے سے معنی میں قوت بڑھ جاتی ہے۔ دوسرا مَلِك کا لفظ صرف انسانوں کی سیاست سے مخصوص ہے یعنی وہ جو جمہور میں امر و نہی کا تصرف رکھتا ہو جو ایک محدود تصرف ہے مَلِكِ النَّاس کہا جاتا ہے اشیاء کا یا یوم الدین کا مَلِك نہیں ہوگا مالك ہوگا +

یوم

یَوْم۔ سے عموماً مراد وہ وقت ہے جو طلوع آفتاب سے غروب تک ہے لیکن اکثر اس سے مراد زمانہ کی کوئی مدت ہوتی ہے خواہ وہ بہت ہی کم ہو یا بہت ہی زیادہ (غ) چنانچہ كل يوم هو في شان (الرحمٰن ۵۵-۳۰) میں یوم سے مراد ایک آن ہے اور فی يوم كان مقداره خمسين الف سنة (المعارج ۷۰-۴) میں ایک یوم پچاس ہزار سال کا فرمایا +

دین

دِین کے اصل معنی جزا ہیں (غ) بخاری میں ہے الدين الجزاء في الخير والشر یعنی یہاں دین سے مراد نیکی بدی کا بدلہ ہے۔ بطور استعارہ دِین کا استعمال شریعت پر ہوتا ہے۔ گویا شریعت کی تابعداری کا نام دِین ہے +

جزا و سزا اس عالم میں بھی ہے

پس مالك يوم الدين کے معنی ہوئے جزا و سزا کے وقت میں مالك جزا و سزا کا ایک عظیم الشان وقت وہ ہے جو قیامت یا محشر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر ایک رنگ جزا و سزا کا اس عالم میں بھی جاری ہے اور قرآن کریم کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کی جزا و سزا ایک کھلا کھلا رنگ ان نتائج کا ہے جو فی الحقیقت ہر فعل کے ساتھ ساتھ ہر آن یہاں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر وہ نظر انسانی سے بسا اوقات مخفی رہتے ہیں۔ بعض وقت بطور نمونہ ظاہر بھی ہو جاتے ہیں +

مالکیت میں گناہوں کی معافی کی طرف اشارہ

مالِك کا لفظ بجائے مَلِك کے اس لئے اختیار فرمایا کہ مَلِك محض ایک محدود اختیارات کا حاکم ہے جو فریقین میں انصاف کے لئے مامور ہے وہ کسی مجرم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ لیکن مَالِك کو اختیار ہے جسے چاہے معاف بھی کر دے اس میں کفارہ اور تناسخ کا ابطال ہے کیونکہ ان دونوں کی رو سے خدا گناہ کو معاف نہیں کر سکتا بلکہ سزا دینے کے لئے مجبور ہے یہ عقیدہ کس قدر خلاف واقعات ہے ایک نوکر کا آقا یا مالک جو حقیقت میں مالک نہیں اس کا گناہ معاف کر سکتا ہے مگر خدا جو مستجمع جمیع صفات کاملہ ہے وہ معاف نہیں کر سکتا۔ اور اگر معافی کی خواہش انسان میں ہے تو خالق میں کیوں نہیں۔ جو صفت خالق میں نہ ہو وہ مخلوق میں نہیں ہو سکتی +

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ ۴

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں ع ۴

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ ۵

تو ہم کو سیدھے رستے پر چلا ع ۵

عبودیت۔عبادت

ع ۴ نَعْبُدُ - عُبُوْدِيَّة اظہار تذلل کا نام ہے اور عِبَادَة اس سے بلیغ تر ہے یعنی انتہا درجہ کے تذلل اور انکساری کا نام ہے اور اس کا حقدار صرف وہی ہو سکتا ہے جس کی فضیلت انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی ہو یعنی اللہ تعالیٰ جس کے سوائے دوسرے کی عبادت جائز نہیں (غ)، یا عبادت وہ طاعت ہے جس کے ساتھ خضوع یعنی عاجزی ہو (ت)، پس عبادت اصل میں یہ ہے کہ اپنے آپ کو پوری عاجزی کے ساتھ خدا تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں لگا دے عبادت کو انسان کی زندگی کی غرض فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۵۱-۵۶) کیونکہ انسان اپنے کمال کو نہیں پاسکتا جب تک کہ اپنے قوٰی کو اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں نہ لگا دے عبادت انسان کی اپنی بہتری کے لئے ہے اللہ تعالیٰ کی ذات غنی ہے اس کو نہ کسی کی عبادت سے فائدہ پہنچتا ہے نہ عدم عبادت سے نقصان +

عبادت مقصد زندگی ۴

استعانۃ

نَسْتَعِينُ - استعانۃ کے معنی ہیں طلب عون یعنی مدد چاہنا +

عبادت استعانت پر مقدم ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا ذکر ہوا تو انسان بے اختیار بول اُٹھتا ہے کہ ہم اپنی طاقتوں کو تیری ذات کی کامل فرمانبرداری میں لگاتے ہیں اور اس کے سوائے کسی دوسرے کی عاجزانہ فرمانبرداری اختیار نہیں کرسکتے اور اس کے ساتھ ہی انسانی رُوح اپنے عجز کا اعتراف کرتی ہوئی پُکارتی ہے کہ اے خدا منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے تیری ہی مدد درکار ہے تو ہماری کمزوریوں کی اصلاح فرما اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہم کو منزل مقصود تک پہنچا۔ فطرت انسانی میں عبادت کی استعداد موجود ہونے پر ہم إِيَّاكَ نَعْبُدُ کہتے ہیں اور عملاً محتاج اعانت ہونے پر إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ کی خواہش موجزن ہوتی ہے جب تک انسان عبادت نہیں کرتا اپنے قوائے فطری کو کام میں نہیں لگاتا اس وقت تک وہ مدد کا مستحق بھی نہیں ہوتا +

هدایة

ع ۵ اِهْدِنَا - هدایة کے معنی ہیں الرشاد والدلالۃ بلطف الی ما یوصل الی المطلوب (ت) یعنی لطف کے ساتھ لے جانا اور رہنمائی کرنا اس کی طرف جو مطلوب یعنی منزل مقصود تک پہنچا دے۔ امام راغب نے ہدایت کو چار طرح پر بیان کیا ہے۔ اول فطری ہدایت ہے جو عام ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو خلق کے ساتھ ہی دے دی ہے اعطی کل شئ خلقه ثم هدی (طٰهٰ ۲۰-۵۰) یا فرمایا والذی قدر فهدی (الاعلٰی ۸۷-۳) یہ ہر چیز کی فطرت میں موجود ہے۔ دوسری وہ ہدایت ہے جو انسانوں کو نبیوں کے ذریعہ سے ملتی ہے یعنی انبیاء کی دعوت الی الحق۔ جعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا (السجدۃ ۳۲-۲۴) یہ سب انسانوں کے لئے عام ہے جس کے لحاظ سے قرآن شریف کو هدی للناس فرمایا (البقرۃ ۲-۱۸۵) انبیاء ایک رستہ دکھا دیتے ہیں انا هدينٰه السبيل اما شاكرا واما كفورا (الدھر ۷۶-۳) تیسری ہدایت وہ توفیق ہے جو اس شخص سے خاص ہے جو ہدایت پا گیا۔ والذين اهتدوا زادهم هدی (محمد ۴۷-۱۷) ومن يؤمن بالله يهد قلبه (التغابن ۶۴-۱۱) چوتھی ہدایت جنت ہے (یعنی منزل مقصود تک پہنچا دینا)، جیسے سیهدیهم ویصلح بالهم (محمد ۴۷-۵) یا جیسے یہاں یا هدی للمتقین میں جیسا کہ تاج العروس سے شروع میں حوالہ دیا گیا ہے +

ہدایت چار طرح پر ہے

٦ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ۙ

ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے انعام کیا ع٦

مستقیم

المستقیم۔ وہ راہ ہے جو ایک سیدھے اور ہموار خط پر ہو۔ اس سے طریق حق کو تشبیہ دی گئی ہے (غ)۔

دعائے فاتحہ کا مقصد

معترض کہتا ہے کہ صراط مستقیم پر چلنے کی دعا کرنے والے کو تا حال گمراہ ثابت کرتی ہے۔ پہلے الفاظ پر غور نہ کیا۔ یہ دعا کرنے والا تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کو پہچان چکا۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہہ کر اپنے قویٰ کو خدا کی کامل فرمانبرداری میں لگا چکا۔ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے ذریعہ اپنی کمزوری کو دور کرنے کی مدد اللہ سے طلب کر چکا۔ وان اعبدونی ھذا صراط مستقیم (یٰس ۳۶-۶۱) میری عبادت کرو یہ صراط مستقیم ہے پس اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہنے والا صراط مستقیم پر تو ہے اسلئے ان الفاظ میں اس راہ پر قائم رہنے کی دعا مانگتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ اسی راہ پر چلتا رکھے اور راہ کو پالینے کے بعد اس کا قدم نہ ڈگمگائے اور نہ سست ہو۔ یہانتک کہ وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے جیسا کہ ہدایت کے معنی سے ظاہر ہے۔ اصل مقصد اس دعا کا اس اعلیٰ منزل پر پہنچنا ہے جس کی تشریح آگے آتی ہے اور جس کی طرف ایک طرف رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور دوسری طرف اِھْدِنَا میں اشارہ ہے یعنی کمال انسانی کا معراج پس اصل مطلب یہ ہے کہ اے خدا ہمیں سیدھی راہ پر چلائے رہیو یہانتک کہ ہم اس کمال کو حاصل کریں جو انسان کی ترقی کی اصل منزل مقصود ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس

تمام عصمت سے اور پر کمال انسانی کا حصول ہے

دعا میں انسان کے سامنے وہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر وہ پہنچ سکتا ہے اور مذہب تو صرف گناہوں کی معافی کی دعا سکھانے تک رہ گئے اسلام نہ صرف گناہوں سے بچنے۔ لغزشوں سے محفوظ رہنے اور یوں مقام عصمت یا محفوظیت پر پہنچنے کی دعا سکھاتا ہے بلکہ اس سے بھی بہت آگے کمال انسانی پر پہنچنے کی یہ دعا ہے جس کے برابر کوئی دعا کسی آسمانی کتاب میں نہیں۔ بلکہ خود قرآن شریف کی دعاؤں میں بھی یہ دعا سب سے افضل ہے۔

انعام

ع٦ **اِنعام**۔ کے معنی ہیں انسان کو احسان پہنچانا غیر ناطق پر یہ لفظ نہیں بولا جاتا مثلاً یہ نہیں کہا جائے گا کہ میں نے

منعم علیہم کون ہیں

اپنے گھوڑے پر انعام کیا (غ) اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے کون مراد ہیں۔ قرآن کریم خود تشریح فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (النساء ۴-۶۹) یعنی وہ انبیاء اور صدیق اور شہید اور صالح ہیں۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباس سے لے کر تمام مفسرین نے قبول کی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اھدنا کی دعا کرنے والا اعلیٰ سے اعلیٰ منازل پر پہنچنے کی دعا کرتا ہے جہاں نبی صدیق شہید صالح پہنچے وہیں ہر مسلم پہنچنے کی

اسلام کس مقام پر پہنچاتا ہے

تڑپ اپنے اندر رکھتا ہے۔ عیسائیوں کی مشہور خداوند کی دعا میں گناہوں کی معافی کی التجا ہے۔ یہاں نہ صرف اس مقام کی دعا ہے کہ انسان سے گناہ ہی سرزد نہ ہو۔ بلکہ اس مقام پر پہنچنے کی دعا ہے جہاں بڑے بڑے برگزیدگان الٰہی پہنچے۔ یعنی بڑی بڑی خدمات کے بجا لانے اور بڑے بڑے کمالات کے حاصل کرنے کا اعلیٰ مقام یا اعلیٰ سے اعلیٰ مقام جس پر کوئی انسان پہنچا ہو۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دعا روپیہ مال مرتبہ کے ملنے کے لئے نہیں کمالات معرفت محبت کے حصول کیلئے ہے۔

انعمت علیہم میں مقام نبوت کی دعا نہیں

یہاں نبی کا لفظ آجانے سے بعض لوگوں کو یہ ٹھوکر لگی ہے کہ خود مقام نبوت بھی اس دعا کے ذریعہ سے مل سکتا ہے اور گویا ہر مسلمان ہر روز بار بار مقام نبوت کو ہی اس دعا کے ذریعہ سے طلب کرتا ہے۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے اس لئے کہ نبوت محض موہبت ہے۔ اور نبوت میں انسان کی جدوجہد اور اس کی سعی کو کوئی دخل نہیں۔ ایک

نبوت موہبت ہے

وہ چیزیں ہیں جو موہبت سے ملتی ہیں اور ایک وہ جو انسان کی جدوجہد سے ملتی ہیں۔ نبوت اول میں سے ہے جیسا کہ الرحمٰن علم القرآن سے بھی ظاہر ہے۔ دنیا میں کوئی شخص کوشش کرکے اور دعائیں مانگ مانگ کر

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ۷

نہ ان کا جن پر غضب ہوا ۷ے

اور خدا سے التجائیں کر کے نہ پہلے نبی بنا نہ آیندہ بنے گا۔ بلکہ خود اللہ تعالیٰ اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ کے ماتحت جب چاہتا کسی کو نبوت و رسالت کے منصب پر کھڑا کر دیتا تھا یہاں تک کہ اپنی کامل ہدایت کی راہیں آنحضرت صلعم پر کھول کر تمام آنے والی نسلوں کے لئے مقام نبوت و رسالت کو ایک برگزیدہ انسان کے نام کے ساتھ مخصوص کر دیا اور اس کو النبی اور الرسول کے نام سے پکار کر بتا دیا کہ اب دوسرا نبی اور رسول نہیں ہو گا کیونکہ اگر دوسرا نبی بھی آجائے تو یہ الفاظ مشتبہ ہو جائیں۔ پس مقام نبوت کے لئے دعا کرنا ایک بے معنی فقرہ ہے اور اسی شخص کے مُنہ سے نکل سکتا ہے جو اصول دین سے ناواقف ہے +

النبی۔الرسول

کن کمالات کی دعا ہے

ایسے بھی لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ اس دعا میں حصول بادشاہت کی دعا ہے کیونکہ بادشاہت کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام قرار دیا ہے (المائدۃ ۵۔ ۲۰) اور بعض نے اسے اور بھی وسیع کر کے دنیا کے تمام امور میں صراط مستقیم کی دعا قرار دیا ہے۔ ادنیٰ تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب باتیں دعا کے اصل مقصد سے دور ہیں۔ بیشک بادشاہت ایک انعام ہے۔ مال و دولت بھی ایک انعام ہے۔ مگر یہ وہ انعامات ہیں جن میں نیک و بد شریک ہیں۔ بادشاہت ایک انعام ہے۔ مگر ہر ایک بادشاہ منعم علیہ نہیں دولت ایک انعام ہے مگر ہر دولتمند منعم علیہ نہیں۔ اور یہاں منعم علیہم کی راہوں کا ذکر ہے نہ خاص خاص انعامات کا مطالبہ۔ پھر منعم علیہم کے مقابلہ پر مغضوب علیہم اور ضالین ہیں جو دولت اور بادشاہت سے محروم نہیں اور نہ دنیا کے کاموں کو سر انجام دینے سے محروم ہیں بلکہ نیکی سے محروم ہیں۔ اخلاق فاضلہ سے محروم ہیں۔ دعا صرف اس قدر ہو کہ جن راہوں پر نیک بندے چلتے رہے انہی راہوں پر چلنے کی ہمیں بھی توفیق دے بالفاظ دیگر یہ کہ ہمیں انبیاءؑ شہداء، صلحاء کے نقش قدم پر چلا۔ اس دعا کے مقابل پر امور دنیا کی خواہشات ایک نہایت پست مقام ہے +

اگر دعا حصول نبوت ہے تو امت کی محرومی لازم آتی ہے

اگر یہ دعا نبوت کے حاصل کرنے کے لئے ہوتی تو کم از کم آنحضرت صلعم کو ہی مقام نبوت پر کھڑا ہونے سے پہلے سکھائی جاتی۔ مگر قرآن کریم میں اس کا موجود ہونا بتاتا ہے کہ مقام نبوت ملنے کے بعد سکھائی گئی۔ نبوت عطا فرما کر اس دعا کا سکھانا صاف بتاتا ہے کہ حصول نبوت کے لئے یہ دعا نہیں۔ اور اگر حصول نبوت کی دعا مانا جائے تو ماننا پڑے گا کہ تیرہ سو سال میں کسی مسلمان کی دعا قبول نہ ہوئی حالانکہ مقربین اور محبوبین الٰہی تو ہزاروں کی تعداد میں ہو گذرے خدا خود دعا سکھائے اس کی غرض یہ ہو کہ دعا مانگنے والے کو نبوت ملے دعا کرنے والی اُمت کو خیر اُمۃ کہا جائے اور پھر تیرہ سو سال سب کے سب محروم رہیں حتیٰ کہ وہ بھی جن کے متعلق صریح سند ہے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے یہ نہیں ہو سکتا +

غضب

۷ے المغضوب علیہم۔ غضب کے اصل معنی ہیں سزا کے ارادہ سے خون کا جوش مارنا (غ) اور حدیث میں غضب سے بچنے کی تاکید ہے اور اس کو قلب ابن آدم میں ایک انگارا قرار دیا گیا ہے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے اس لئے جب اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ لفظ بولا جائے تو جو حصہ جسم سے تعلق رکھتا ہے یعنی فوران دم یا خون کا جوش مارنا وہ مراد نہیں ہوتا بلکہ صرف اصل غرض باقی رہ جاتی ہے جو ارادۂ سزا ہے۔ اور یہی حالت تمام الفاظ کی ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں کہ ان میں وہ حصہ جو جسم سے تعلق رکھتا ہے باقی نہیں رہتا تفصیل کے لئے دیکھو ۲۷ے۔ پس مغضوب علیہم وہ لوگ ہوئے جن کے متعلق ارادۂ الٰہی سزا کا ہوا +

غضب الٰہی

وَلَا الضَّآلِّیْنَ ○

اور نہ گمراہوں کا ۷

ضلال

۷ الضالین۔ ضالّ۔ ضلال سے اسم فاعل ہے۔ اور اس کے عام معنی ہیں سیدھی راہ سے ہٹ جانا عمداً ہو یا سہواً (غ) اور یہ ھدی کے مقابل پر ہے اس لئے اس کے معنی یوں بھی کئے گئے ہیں سلوک طریق لا یوصل الی المطلوب (ت) ایسی راہ پر چلنا جو مطلوب تک نہیں پہنچاتی۔ پس ضالین وہ لوگ ہوئے جو سیدھی راہ سے ہٹ گئے یا ایسی راہ چل پڑے جو مطلوب تک نہیں پہنچاتی۔ ضلال اور اضلال کے اور معانی اپنے اپنے موقعہ پر آئیں گے ◆

ضال

مغضوب علیہم اور ضالین کون ہیں

اس آیت میں کن لوگوں کا ذکر ہے؟ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ مغضوب علیہم یہود ہیں اور ضالین عیسائی۔ اور ایک حدیث میں جس کو ترمذی نے حسن غریب کہا ہے یہی معنی آنحضرت صلعم سے مروی ہیں۔ یہود کی صفات غالب جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے یہ ہیں کہ انہوں نے انبیاء کے بارہ میں تفریط کی راہ اختیار کی یعنی عموماً انبیاء کی تکذیب کرتے رہے اور ان کے قتل کے درپے رہے۔ اور شریعت کے احکام کی نافرمانی کی یعنی ان پر عمل نہ کیا چنانچہ بنی اسرائیل کے ذکر کے شروع میں ہی آتا ہے۔ وباؤا بغضب من اللہ ذٰلک بانہم کانوا یکفرون بآیات اللہ ویقتلون النبیین بغیر الحق ذٰلک بما عصوا وکانوا یعتدون۔ وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اس لئے کہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھتے تھے (البقرہ ۲: ۶۱) پس انبیاء کا انکار و تکذیب اور احکام الٰہی کی نافرمانی یہ وہ تفریط کی راہیں ہیں جن کی وجہ سے یہود پر غضب الٰہی آیا۔ باوجودیکہ وہ پہلے ایک ایسی قوم تھی جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا۔ اور مسلمان کو جب یہ دعا سکھائی گئی کہ اس کا قدم مغضوب علیہم کی راہ پر نہ پڑے تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ ان تفریط کی راہوں سے بچے۔ اور عیسائیوں کی صفات غالب جن کی وجہ سے وہ طریق مستقیم سے پھر گئے۔ قرآن کریم میں غلو اور افراط بیان کی گئی ہیں یعنی ایک نبی کو خدا بنا لینا جیسا کہ فرمایا۔ یاھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم غیر الحق ولا تتبعوا اھواء قوم قد ضلوا من قبل واضلوا کثیرا وضلوا عن سواء السبیل (المائدہ ۵: ۷۷) اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو پہلے گمراہ ہو گئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھے رستہ سے بھٹک گئے۔ گویا اب مسلم کی دعا یوں ہوئی اے اللہ ہم کو سیدھا رستہ دکھا ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے انعام کیا اور ان لوگوں کے رستہ پر چلنے سے بچا جو بوجہ تفریط غضب الٰہی کے نیچے آئے اور ان کے بھی جو بوجہ افراط و غلو گمراہ ہو گئے۔ بالفاظ دیگر اس صراط مستقیم پر چلا جو تفریط و افراط سے، تکذیب و غلو سے پاک ہے۔ یہ معنی بر بناءِ قرآن و حدیث ہیں۔ مگر یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تفریط و افراط تمام حقوق میں ہو سکتی ہے۔ اگر ایک نبی کا انکار تفریط اور اس کا خدا بنانا افراط ہے تو ہر ایک حق کا انکار یا اس کا ادا نہ کرنا تفریط ہے، اور ہر ایک حق کو اپنے مرتبہ سے بڑھانا اور اس قدر اس پر زور دینا کہ دوسرے حقوق کی فروگزاشت کا موجب ہو جائے افراط ہے ◆

حقوق میں تفریط و افراط

عملی اور علمی غلطیوں سے بچنے کی دعا

یہ بھی صحیح ہے کہ یہود عملی رنگ میں نافرمان ہوئے یعنی شریعت کے مانتے ہوئے پھر اس پر عمل نہ کیا، اور عیسائی علمی رنگ میں بھٹک گئے کہ ایک انسان کو خدا بنا لیا۔ پس یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اے خدا ہم کو یہود کی سی عملی اور نصاریٰ کی سی علمی غلطیوں سے بچا۔ کیونکہ انسان اپنے کمال حقیقی کو نہیں پہنچتا جب تک دونوں پہلو عمل اور علم کے صحیح نہ ہوں ◆

آمین

سورہ فاتحہ کے آخر پر آمین کا پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو (بخاری)، آمین اسم فعل ہے اور اس کے معنی ہیں استجب یعنی اے اللہ ہماری دعا کو قبول فرما ◆



البقرہ نام رکھا جانے کی وجہ

نام اس سورت کا نام البقرۃ اس تذکرہ سے لیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کو ایک گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیئے جانے کے متعلق اس سورت کے آٹھویں رکوع میں کیا گیا ہے۔ چونکہ اس سورت میں خاص طور پر یہودیوں کا ذکر ہے اور یہودی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ایک موحد قوم بنانا چاہتا تھا۔ گائے کی پرستش کا مرض مصر میں رہ کر پیدا ہو چکا تھا۔ اس لئے گائے کے ذبح کا تذکرہ اس سورت کے اہم ترین مضامین میں سے ایک مضمون ہے

خلاصہ مضمون سورہ بقرہ

خلاصہ مضمون - اس سورت کا خلاصہ مضمون یہ بتایا ہے کہ مسلمان کس طرح ایک کامیاب اور زندہ قوم بن سکتے ہیں۔ چنانچہ رکوع (۱) سب سے پہلے ان اصول کا ذکر کیا جو اسلام کی بنیاد ہیں اور بتایا کہ جو ان پر عمل پیرا ہونگے وہ کامیاب ہوں گے اور جو ان کی پرواہ نہ کریں گے دُکھ اٹھائیں گے (۲) پھر ایک اور گروہ (منافقین) کا ذکر کیا جو منہ سے تسلیم کرتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے (۳) پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر کیا اور اس سے اُس کی توحید کے دلائل دیئے۔ اور اس کی عبادت کو ضروری ٹھہرایا (۴) پھر انسان کے کمال کا ذکر فرمایا اور اس کمال تک پہنچنے کی راہ بتائی کہ بغیر نبوت کے وہ کمال حقیقی کو حاصل نہیں کر سکتا (۵) کمال کے بعد گر جانے کے خطرہ سے ڈرایا یہود کا ذکر کیا جو ایک منعم علیہ قوم تھی مگر وجہ اپنی نافرمانیوں کے رد کی گئی اور ان کو بتایا کہ اب بھی اگر اس نبی کو مان لو جو تمہاری اپنی پیشگوئیوں کے مطابق آیا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں شوکت و عظمت دے گا (۶ تا ۹) پھر ان پر جو جو انعامات کئے اور جو جو نافرمانیاں انہوں نے کیں ان کا ذکر فرمایا اور ضمناً مسلمانوں کو سمجھایا (۱۰) پھر بنی اسرائیل کے میثاق اور ان کی خلاف ورزی کا ذکر کر کے مسلمانوں کو سمجھایا کہ وہ ایسی غلطی نہ کریں (۱۱) پھر بنی اسرائیل کے ان اعتراضوں کا ذکر کیا جو انہیں اسلام پر تھے اور ان کا جواب دیا کہ کیوں بنی اسرائیل میں سے یہ نبی نہیں آیا (۱۲) پھر ان کے عداوت میں اور ترقی کر جانے اور آنحضرت صلعم کے خلاف نئی نئی سازشوں والے منصوبوں کا ذکر کیا (۱۳) پھر بتایا کہ اگر پہلی شرائع کو ہم نے منسوخ کیا ہے تو ان سے بہتر شریعت تم کو دے دی ہے۔ اور بتایا کہ نجات تو صرف اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور مخلوق کے ساتھ احسان سے ملتی ہے نہ برائے نام کسی مذہب کا پیرو ہو جانے سے (۱۴) پھر بتایا کہ تھوڑی بہت سچائی ہر مذہب میں ہے مگر اسلام کامل صداقتوں کا مجموعہ ہے (۱۵) پھر فرمایا کہ موسیٰ کی پیشگوئی سے اوپر چلو تو ابراہیم کے ساتھ بھی تو یہی وعدہ تھا۔ کہ اس کی اولاد کو برکت دی جائے گی اور وہ اپنی اولاد کے ایک حصہ کو مکہ معظمہ چھوڑ کر اور وہاں دعائیں کر کے یہ بتا گیا تھا۔ کہ آخر رحمت آلہی اس چشمہ سے پھوٹ کر تمام دنیا کو سیراب کرے گی اور کعبہ کو قبلہ قرار دیا (۱۶) پھر بتایا کہ اسی ابراہیمی مذہب پر یہود کی تفریط اور نصاریٰ کی افراط سے بچ کر یہ نبی کھڑا ہوا ہے (۱۷ و ۱۸) پھر بتایا کہ جب ابراہیم کی دعاؤں کی صداقت یوں ظاہر ہوئی تو یہ بھی ضروری تھا کہ اس نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قبلہ کعبہ قرار دیا جاتا اور مسلمانوں کو بھی سمجھایا کہ یہ ایک قبلہ تمہارے اتحاد کا مرکز ہے (۱۹) پھر بتایا کہ کامیابی کے لئے مسلمانوں کو مال و جان کی بہت سی قربانیاں کرنی پڑینگی۔ ان اصولی باتوں کو طے کر کے اور (۲۰) پھر خدا تعالیٰ کی توحید کے مضمون کو دوہرا کر (۲۱ تا ۳۱) شریعت کی تفصیلات کی طرف رجوع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

کیا یہ دکھانے کے لئے کہ یہ شریعت تفصیلات میں بھی ویسی ہی باتیں یا ان سے بہتر باتیں بتاتی ہے جو یہود کی شریعت میں تھیں۔ چنانچہ غذاؤں کے حرام و حلال قصاص۔ وصایا، روزوں۔ جنگ۔ حج۔ شراب۔ جوا۔ یتامٰی۔ زناشوئی کے تعلقات طلاق بیواؤں کا ذکر کرکے (۳۲ و ۳۳) پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا کہ جس طرح بنی اسرائیل ایک مردہ قوم تھی جہاد اور کوشش سے خدا نے اسے زندہ کر دیا اسی طرح مسلمانوں کو بھی اب جہاد اور کوشش کرنا ضروری ہے (۳۴) پھر خدا تعالیٰ کے حی و قیوم ہونے کا ذکر کرکے یہ اشارہ کیا کہ اب وہ اپنے نام لیواؤں کو زندگی بخشے گا۔ اور انہیں بڑی قوم بنائے گا مگر ان کو لا اکراہ فی الدین سے روکا۔ (۳۵) پھر بتایا کہ کیونکر وہ مردہ قوموں کو زندہ کیا کرتا ہے حضرت ابراہیم اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے دو واقعات کا ذکر کیا (۳۶ و ۳۷) پھر کھول کر بتایا کہ اصل جڑ ساری کامیابیوں کی انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اگر اس وقت ایک ایک دانہ ڈالوگے توکل کو سینکڑوں نہیں ہزاروں اور لاکھوں دانے تمہیں ملینگے (۳۸) پھر بتایا کہ قربانیاں کرکے جب دولتمند ہو جاؤ تو سود نہ کھانا کیونکہ سود خوار قوم آخر تباہ ہو جاتی ہے اور اخلاق فاضلہ سے عاری رہتی ہے (۳۹) ہاں ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنے حقوق کی خوب نگہداشت کیا کرو اور لین دین کے معاملات کو لکھ لیا کرو (۴۰) اور سب سے آخر سب رسولوں پر ایمان لانے کا تذکرہ کرکے بتایا کہ کامیابی اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ کامل اطاعت نہ کرو اور اس کے ساتھ خدا سے دعائیں نہ مانگو اپنا زور بھی پورا لگاؤ۔ پھر خدا کے حضور جھکے رہو تو ہم کافروں کے مقابلہ میں تمہاری نصرت کرینگے +

سورۂ بقرہ کا تعلق سورۂ فاتحہ سے

اس سورت کا تعلق ایک تو بلحاظ ترتیب سورۂ فاتحہ سے ہے چونکہ سورۂ فاتحہ میں یہ دعا سکھائی گئی تھی کہ اھدنا الصراط المستقیم تو اس کا ابتدا یوں فرمایا ذٰلك الكتاب لا ريب فيه هدى للمتقين گویا یہ اسی دعا کا جواب ہے۔ اور بتایا کہ قرآن کریم وہ صراط مستقیم بتاتا ہے اس سورت میں بتایا کہ انعمت علیہم کا گروہ وہ ہے جو ان اصول پر عمل پیرا ہوتا ہے جن کا ذکر صدر سورت میں ہے ساتھ ہی مغضوب علیہم یعنی یہود کا تذکرہ بالتفصیل اور ضالین یعنی نصاریٰ کا مجملاً کیا۔ لیکن چونکہ سورۂ فاتحہ ساری قرآنی تعلیم کا نچوڑ ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن شریف کی ابتدا اسی سورۂ بقرہ سے ہوتی ہے اور یہی سچ ہے چنانچہ یہاں شروع میں ہی اس پاک کتاب کی اغراض کو بیان فرمادیا ہے۔ اور اکمل و اتم طور پر وہ باتیں بتادی ہیں جو ایک قوانین کا واضع بطور تمہید بیان کر دیا کرتا ہے۔ کہ

سورہ بقرہ کے ابتدا میں رکھے جانے کی وجہ

اوّل یہ اس خدائے علیم کی طرف سے ہے۔ جو نہ صرف فطرت انسانی اور ضروریات بشری کو جاننے والا ہے۔ بلکہ گزشتہ اور آئندہ کی تمام باتوں کو بھی جانتا ہے۔ پھر یہ ایک کتاب ہے۔ پراگندہ الفاظ یا منتشر اوراق کا مجموعہ نہیں۔ پھر اس کی غرض ہدایت یا دنیا کو راہ راست پر لانا ہے۔ پھر وہ اصول بیان فرمادیئے ہیں جن پر چل کر انسان ہدایت کو پا سکتا ہے اور وہ کل پانچ اصول ہیں تین عقاید کے رنگ میں یعنی ایمان بالغیب (اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ پر ایمان) اللہ تعالیٰ کی وحی پر ایمان۔ اس پر جو نبی کریم صلعم پر نازل ہوئی اور اس وحی پر جو آپ سے پہلے انبیاء پر دنیا میں نازل ہو چکی۔ اور آخرت یعنی اعمال کی جزا و سزا پر یقین۔ اور دو عمل کے رنگ میں۔ صلوٰۃ یعنی نماز اور دعا جو حقوق اللہ کا خلاصہ ہے اور انفاق یعنی اپنی قوتوں اور مال کو مخلوق خدا کی بھلائی کے لئے خرچ کرنا جو حقوق العباد کا خلاصہ ہے۔ پھر اس کا آخری نتیجہ بتایا کہ وہ کامیاب اور بامراد ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ پہلے رکوع میں بیان فرمادیا۔ اور یہ سورت

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۚ فِيْهِ ۚ ۱ ۲

میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔ یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں۔

مع عند اللہ الخ — اصول اسلام کی قبولیت اور انکار کے نتائج

ابتدا کے لئے ایسی موزون ہے کہ اگر اس کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو دوسری کوئی سورت اس کی جگہ نہیں رکھی جاسکتی کیونکہ اور کسی سورت کی ابتدا میں اس طرح اصول اسلامی کو مکمل طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ اس سے قرآن کریم کی موجودہ ترتیب کا منجانب اللہ ہونا صاف ظاہر ہے ٭

زمانۂ نزول البقرۃ

زمانۂ نزول۔ اس سورت کا نزول مدینہ میں ہجرت کے بعد ہوا اور اس کا اکثر حصہ جنگ بدر سے پیشتر کا ہے بعض کے نزدیک یہ سب سے پہلی سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی بعض آیات کا نزول آنحضرت صلعم کی زندگی کے آخری حصہ کا ہے۔ اس کی خاص خاص آیات کو مکی قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ صرف بعض لوگوں کا خیال ہے گو اس میں شک نہیں کہ بعض سورتوں کا نزول ایک لمبے زمانہ پر ممتد رہا ہے مگر جب تک کوئی صریح اور بیّن شہادت نہ ہو مدنی سورتوں کی بعض آیات کو مکی اور پہلے کا نازل شدہ قرار دینا غلط طریق ہے ہاں یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ مکی سورتوں میں بعض آیات ایسی ہوں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہوں مگر یہ بھی محض قیاس کی بنا پر قبول نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ کوئی صاف اور واضح شہادت نہ ہو پس جس طرح یہ غلط ہے کہ جو آیت یاایہاالناس سے شروع ہوتی ہے وہ مکی ہے خواہ مدنی سورت میں ہو اور جو یاایہا الذین اٰمنوا سے شروع ہوتی ہے وہ مدنی ہے خواہ مکی سورت میں ہو اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ جن آیات میں یہود و نصاریٰ کا ذکر یا توریت و انجیل کا نام ہو وہ ضرور مدنی ہیں خواہ مکی سورت میں ہوں ٭

مدنی سورتوں میں مکی آیات

مقطعات

ع ۸ الٓمّٓ۔ یہ حروف جو بعض سورتوں کی ابتدا میں آتے ہیں مُقطّعات کہلاتے ہیں اور قرآن کریم کی ۲۹ سورتوں کی ابتدا میں آتے ہیں عام طور پر ترجموں میں ان کے معنی نہیں کئے جاتے۔ حالانکہ صحابہؓ سے ثابت ہیں یہ حروف الفاظ کے قایم مقام ہیں اور حروف سے الفاظ کی طرف اشارہ کرنا تمام زبانوں میں مروج ہے آج کل انگریزی میں تو یہ رواج بہت ہی بڑھا ہوا ہے۔ عرب میں بھی یہ دستور تھا چنانچہ اس مصرعہ میں قلت لہا قفی قالت قاف ق کے معنی قد وقفت ہیں یعنی میں ٹھہر گئی۔ اور بھی کئی مثالیں اس کی ہیں مگر عربی میں کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا کہ فلاں حرف سے فلاں لفظ کی طرف اشارہ ہوگا بلکہ سیاق و سباق سے معلوم کیا جاتا تھا۔ اس لئے قرآن کریم میں بھی یہ ضروری نہیں کہ ایک جگہ جو معنی ایک حرف کے لئے گئے ہیں۔ دوسری جگہ بھی وہی ہوں۔ ہاں جو مجموعہ ایک ہی طرح پر آیا ہے اس کا مفہوم ایک ہی ہے جیسے الٓمّٓ کہ اس سورت کے علاوہ پانچ اور سورتوں کی ابتدا میں ہے یعنی اٰل عمران جو البقرۃ کے بعد آتی ہے اور العنکبوت ۲۹۔ الروم ۳۰۔ لقمان ۳۱ السجدۃ ۳۲ جو چاروں مکی ہیں اور ترتیب قرآنی میں ایک جگہ ہیں گویا کل چھ سورتوں کے شروع میں الٓمّٓ ہے

الٓمّٓ

الٓمّٓ کے معنی حضرت ابن عباس سے انا اللہ اعلم مروی ہیں یعنی میں اللہ بہت جاننے والا ہوں ٭

ذٰلک

ع ۹ ذٰلک۔ یہ لفظ عموماً اشارہ بعید کے لئے آتا ہے مگر عظمت کے ظاہر کرنے کے لئے بھی لایا جاتا ہے۔ یہاں بلحاظ عظمتِ کتاب ہی بولا گیا ہے دوسری جگہ ھذا کے لفظ سے بھی اشارہ فرمایا ہے۔ جیسے ھذا کتاب انزلناہ مبارک (الانعام ۶-۱۵۶) یا ذالک سے اشارہ بعید کتاب موعود کی طرف بھی ہو سکتا ہے یعنی وہ کتاب جس کا وعدہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا تھا (ر) ٭

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

متقیوں کے لئے ہدایت ہے ؁

كتب — ١ الکتاب۔ کتاب مصدر ہے جو کتب سے مشتق ہے جس کے اصل معنی ایک دوسرے کیساتھ ملانا یا جمع کرنا ہیں۔ اور لکھنے کو بھی کہتے ہیں اس لئے کہ لکھنے میں حروف ایک دوسرے کیساتھ ملائے جاتے ہیں۔ اور کتاب اصل میں صحیفہ کا نام ہے مع اس کے جو اس میں لکھا گیا (غ) اور کلام اللہ کو کتاب کہا جاتا ہے گو وہ لکھی ہوتی ہو یا نہ (غ) یہ لفظ قرآن شریف میں قرآن پر بھی بولا گیا ہے جیسے یہاں کسی ایک سورت پر بھی پہلی شرائع پر بھی۔ ہر ایک نبی کی وحی پر بھی جملہ انبیاء کی وحی پر بحیثیت مجموعی بھی +

كتاب

ریب — ریب۔ وہ شک جس کے ساتھ تہمت ہو (ت)

نفی ریب کا دعوےٰ اور اس کی دلیل — یہاں اس کتاب میں ریب کی نفی کی ہے یہ ایک دعویٰ ہے جس کی صداقت کے لئے آگے چلکر فرمایا وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ اس سے کوئی مخالف آج تک عہدہ برآ نہیں ہو سکا۔ اسلئے یہ دعویٰ سچا اور ثابت شدہ قرار پایا +

؁ ھدی یہاں بمعنی ہادی ہے یعنی ایسی راہ پر چلانے والی جو منزل مقصود تک پہنچا دے۔ دیکھو ؁

اتقٰی — متقین۔ متقی۔ اِتَّقٰی سے اسم فاعل ہے۔ اور اتقی اصل میں اِوْتَقٰی ہے جو وقی یقی سے باب افتعال ہے۔ اور مصدر وِقَایَۃ کے معنی ہیں حِفْظُ الشَّیْءِ مِمَّا یُؤْذِیْهِ وَیَضُرُّهٗ (غ) ایک چیز کی حفاظت کرنا اس سے جو اس کو ایذا دے۔ اور نقصان پہنچائے اور تقویٰ کے اصل معنی ہیں جَعْلُ النَّفْسِ فِیْ وِقَایَةٍ مِّمَّا یُخَافُ (غ) یعنی اپنے آپ کو اس چیز سے بچانا جسکا خوف کیا جاتا ہے

تقوٰی — اسی وجہ سے اس کے معنی بعض وقت خوف بھی کر لئے جاتے ہیں اور اصطلاح شریعت میں تقویٰ اپنے آپکو گناہ میں پڑنے سے بچانا ہے حِفْظُ النَّفْسِ عَمَّا یُؤْثِمُ (غ) اور نبی کریم صلعم نے فرمایا لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع ما لا

متقی بروے حدیث — باس بہ حذرا لما بہ باس یعنی متقی ہونے کو انسان نہیں پہنچتا جبتک کہ ان چیزوں سے بچنے کیلئے جن میں برائی ہے ان چیزوں کو بھی چھوڑ نہ دے جن میں برائی نہیں۔ اور ایک حدیث میں توقہ نفس کے متعلق آتا ہے جس کے معنی ابن اثیر نے یوں کئے ہیں کہ اپنے نفس کو ہلاکت کیلئے پیش مت کرو اور آفات سے اس کی نگہداشت کرو اور تاج العروس میں ہے کہ

تقوی اللہ — توقی اور اتقی کے ایک ہی معنی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ تقوی اللہ کیا چیز ہے یا اتقوا اللہ سے کیا مراد ہے کیونکہ متقی وہی ہے جو تقوی اللہ اختیار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کوئی ایسی چیز تو نہیں کہ انسان اس سے خائف ہو کر بچے یا اس سے اپنے آپکو بچائے یا اس سے دور رہو بلکہ اللہ کی طرف آنا اور اس کا قرب حاصل کرنا تو عین انسانی زندگی کی غرض ہے قرآن شریف میں سورۃ النساء کے شروع میں آتا ہے واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام اور اللہ کا تقویٰ کرو جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحموں کا تقویٰ کرو۔ ان دو لفظوں کو اکٹھا کر کے قرآن شریف نے تقوی اللہ کے معنی پر روشنی ڈالی ہے۔ ظاہر ہے کہ رحموں کے تقویٰ سے مراد سوائے اسکے کچھ نہیں کہ رحموں

تقوی اللہ حقوق کی نگہداشت اور متقی حقوق کی نگہداشت کرنے والا ہے — کے حقوق کی حفاظت کرو پس اتقوا اللہ کے معنی بھی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حقوق اللہ کی حفاظت کرو۔ اور متقی وہی ہے جو حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو جو معنی امام راغب نے دئے ہیں وہ یہی ہیں۔ کیونکہ گناہ میں پڑنے سے انسان اپنے آپ کو اسی طرح بچا سکتا ہے کہ حفاظت حقوق کرے اور کوئی حق تلف نہ ہونے دے اور یہی معنی حدیث میں ہیں۔ کیونکہ نبی کریم صلعم نے متقی اسی کو قرار دیا جو اپنے آپ کو ہر قسم کی برائیوں سے بچاتا ہے اور بدی کا

الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ۳

جو غیب پر ایمان لاتے ہیں ملا

مفہوم حق تلفی ہے) یہاں تک کہ اگر برائی سے بچنے کے لئے کسی ایسے کام کو بھی چھوڑنا پڑے جس میں کوئی برائی نہیں تو وہ اسے بھی چھوڑ دیتا ہے پس متقی اپنے آپ کو گناہ یا حق تلفی سے بچانے والا ہے اور اتقوا اللہ کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حقوق اللہ کی حفاظت کرو اور چونکہ ہر قسم کے حقوق اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کے ذمے رکھے ہیں اس لئے تقوی اللہ میں تمام حقوق کی نگہداشت آجاتی ہے اور اگر ڈرنا بھی اس کے معنی کئے جائیں تو خدا سے ڈرنا یا خوف کرنا اس کے عذاب سے ڈرنا یا اس سزا سے ڈرنا ہے جو گناہ پر ملتی ہے پس اصلی غرض پھر بھی گناہ سے بچنا ہوئی اور گناہ حقوق اللہ یا حقوق العباد کے ضائع کرنے کا نام ہے +

قرآن ہدی للمتقین کس معنی سے ہے۔ ہدی للناس کس معنی سے

یہاں قرآن شریف کو ھدی للمتقین فرمایا یعنی متقیوں کے لئے ہدایت ۔ اور دوسری جگہ ھدی للناس فرمایا (۱۸۵) یعنی سب لوگوں کے لئے ہدایت ہدایت کے مختلف معنوں کے لحاظ سے یہ دونوں باتیں درست ہیں دیکھو ملہ۔ اس معنی سے سب لوگوں کے لئے ہدایت ہے کہ رستہ سب کو دکھا دیا ۔ اور کسی کے لئے کوئی روک نہیں جو چاہے اسے اختیار کرے جو نہ چاہے نہ کرے، اور متقیوں کے لئے اس معنی سے ہدایت ہے کہ ان کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے ۔ یہ کہنا کہ جو متقی ہے اسے ہدایت کی ضرورت نہیں ۔ لغو بات ہے ۔ متقی وہی ہے جو اپنے آپ کو حق تلفیوں سے ضرر دینے والی چیزوں سے گناہ سے بچاتا ہے ۔ اس کو ضرورت ہے کہ اسے بتایا جائے کہ یہ حقوق تمہارے ذمہ ہیں یہ چیزیں ضرر دینے والی ہیں حصول کمال کی یہ راہ ہے ۔ ہدایت منجانب اللہ کے بغیر اور محض اپنی جدوجہد سے کوئی انسان کمال کو حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اس جدوجہد کے ساتھ منجانب اللہ ہدایت بھی چاہئے تاکہ وہ اسے روشنی کا کام دے ھدی للمتقین میں دونوں پہلوؤں کو روشن کر دیا ۔ انسانی جدوجہد کی بھی ضرورت ہے اور وہ تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے ۔ خدا کی طرف سے روشنی کی بھی ضرورت ہے اسی سے منزل مقصود حاصل ہوتی ہے جس طرح الحمد للہ رب العالمین کہنے والا ایاک نعبد کا اقرار کرنے والا اھدنا کی دعا کا محتاج ہے اسی طرح متقی جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا اور دکھ دینے والی چیزوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اس کتاب اس نور کا محتاج ہے تاکہ منزل مقصود پر پہنچ سکے ۔ علاوہ ازیں یہ

متقی کیلئے غیر متناہی ترقی

بھی بتانا مقصود ہے کہ انسان جس قدر بھی چاہے تقویٰ میں ترقی کرتا چلا جائے ہمیشہ اپنے لئے اس کتاب میں نئی سے نئی روشنی آیندہ ترقیات کے لئے پائے گا کسی مقام پر پہنچ کر یہ کتاب عاجز نہیں ہو جاتی کہ اس سے بڑھکر کسی درجہ پر پہنچانے کے لئے میرے پاس کوئی سامان نہیں ۔ جس طرح ترقی انسانی غیر متناہی ہے ۔ اسی طرح اس کتاب کا نور بھی بڑھتا چلا جاتا ہے ۔ اور گو یہ سچ ہے کہ خود تقویٰ کے بھی مدارج ہیں اور جو شخص تقویٰ کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتا ہوا اس کتاب سے ہدایت کا طالب ہوتا ہے ۔ وہ اس کی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے تاہم اس آخری منزل کا نام یہاں فلاح اور کہیں صدیقیت اور کہیں شہید کا مرتبہ رکھا ہے ۔ تقویٰ یا دکھوں سے اپنے آپ کو بچانا ہی کمال انسانی نہیں بلکہ کمال انسانی کے حصول کی یہ پہلی سیڑھی ہے ۔ اس کے مقابل پر وہ لوگ ہیں جو دکھوں اور تکلیفوں سے بچنے کی پروا نہیں کرتے ان کا ذکر آیت ۶ میں ہے +

تقوی کمال کے حصول کی پہلی سیڑھی ہے

آمن

ع ۱۱ یومنون ۔ ایمان امن سے ہے اور امن کا استعمال دو طرح پر ہے ۔ متعدی جیسے امنتہ جس کے معنی

المؤمن

ہیں میں نے اس کے لئے امن کر دیا اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا نام المؤمن ہے یعنی امن عطا کرنے والا (اپنے بندوں کو)

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ

اور نماز قایم کرتے ہیں ۱۲

ایمان کا دوسرا مفہوم

اور اس کا دوسرا استعمال غیر متعدی ہے جب آمن کے معنی ہونگے وہ امن والا ہوگیا۔ اصطلاح میں اس کا استعمال بعض وقت صرف اقرار لسانی پر ہوتا ہے یعنی زبان سے یہ اقرار کرنا کہ محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لایا جیسے ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا (۶۲) یا جیسے یاایھا الذین اٰمنوا اٰمنوا باللہ ورسولہ (النساء-۱۳۶) اور بعض وقت اس سے مراد ہوتی ہے اپنے آپکو تصدیق کے طور پر حق کا کلی فرمانبردار کردینا اور اس کے لئے تین باتوں کا جمع ہونا ضروری ہے زبان سے اقرار کرنا دل سے حق جاننا اور اس کے مطابق اعضا سے کام کرنا جیسے والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ اولٰئک ھم الصدیقون والشھداء (الحدید-۱۹) اور پھر اسکا اطلاق اعتقاد اور سچے قول اور عمل صالح ہر ایک پر بھی ہوجاتا ہے (غ)۔

ایمان کے معنی بہ حدیث سے روشنی

احادیث نبوی سے بھی ایمان کے اس معنی پر شہادت ملتی ہے بعض جگہ ایمان میں صرف اعتقاد کا ذکر کیا ہے اور بعض جگہ صرف اعمال صالحہ کا اور بعض جگہ دونوں کو ملا کر۔ اول تو ظاہر ہے۔ دوسرے کی مثال ہے کہیں فرمایا کہ حیا ایمان سے ہے کہیں فرمایا ایمان کی ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں اسی طرح دوسرے اعمال کو ایمان میں داخل کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ زبان سے اقرار ایمان کا بیج ہے لیکن اس کی نشوونما اس کی تکمیل بغیر اعمال صالحہ کے نہیں ہوتی۔

ایمان کا مفہوم خاص اسلام میں

ایمان کا وہ مفہوم اسلام میں نہیں جو دوسرے مذاہب میں ہے جیسے مثلاً عیسائی مذہب میں کفارہ پر ایمان کہ محض ایک بات کے اقرار کرلینے کا نام ہے۔ اسلام میں ایمان ایک معنی رکھتا ہے اور اس کے مطابق ایک عمل ہے اللہ پر ایمان یہ ہے کہ انسان اپنے آپکو اخلاق اللہ کے رنگ میں رنگین کرے۔ اس کی محبت اور معرفت کے حاصل کرنے کو زندگی کی اصل غرض سمجھے۔ فرشتوں پر ایمان ان کی نیک تحریکوں کو قبول کرنا ہے رسولوں پر ایمان ان کے نقش قدم پر چلنا ہے کتابوں پر ایمان ان کی باتوں پر عمل پیرا ہونا ہے۔ آخرت پر ایمان یہ ہے کہ ہر ایک فعل کا ایک لازمی نتیجہ ہے کسی اپنے کام کو انسان لغو نہ سمجھے جلی ھذا القیاس

غیب

الغیب مصدر ہے۔ جو چیز انسان کی آنکھ سے چھپ جائے اس پر غائب کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ایسا ہی جو چیزیں حواس ظاہری سے مخفی ہوں اور غیب اور غائب کسی چیز کو بعض لوگوں کے لحاظ سے کہینگے اور اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشھادۃ ہے یعنی ان چیزوں کو جاننے والا جنکو انسان نہیں دیکھتا اور ان کو بھی جنہیں وہ دیکھتا ہے۔ اور یہاں الغیب سے مراد وہ امور ہیں جو حواس کے ماتحت نہیں آتے اور بدایت عقل ان کی متقضی نہیں اور ان کا علم انبیاء علیہم السلام کے خبر دینے سے ہوتا ہے (غ) مفسرین میں سے کسی نے الغیب سے مراد یہاں قرآن کو لیا ہے (ج) حالانکہ اس کا ذکر ملحوظ ما انزل الیک میں موجود ہے۔ اور بعض نے اللہ اور فرشتوں اور رسولوں پر ایمان (ف) اور بعض نے اللہ تعالیٰ (د۔ف) اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غیب در غیب اور نہاں در نہاں اور وراء الوریٰ ہے یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ ہاں ملائکہ بھی اس میں شامل ہوسکتے ہیں۔

ایمان بالغیب کی حقیقت

ابتدا میں بجائے اللہ پر ایمان کے الغیب کا لفظ کیوں اختیار فرمایا ایک یہ بتلانے کو کہ اسکی صفات پر آگہی انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے ہی ہوتی ہے۔ دوسرے تمام ترقیات کا مدار ایمان بالغیب پر ہے ہر ایک علم میں کچھ باتیں مانکر انسان چلتا ہے نتائج ان کی صحت کی تصدیق کردیتے ہیں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت پہلے دن حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ وہ ذات نہاں در نہاں ہے۔ ہاں یہی الغیب پر ایمان لاکر جب انسان قدم آگے بڑھاتا ہے تو آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کامل بھی حاصل کرلیتا ہے بلکہ اس سے ہمکلام بھی ہوجاتا ہے گویا یوں کہنا چاہئے کہ غیب سے شروع کرکے قرآن شاہدہ تک پہنچاتا ہے فلاح یا دینی اور دنیوی کامیابی کے لئے جو پانچ اصول اسلام نے یہاں ابتدائے سورت میں قرار دئے ہیں ان میں سے پہلا ایمان بالغیب یا ایمان باللہ ہے۔

اقام

صلوٰۃ کی اقامت کا مفہوم

۱۲ یقیمون۔ اقام کا مادہ قوم ہے اور اقام الامر کے معنی ہیں کام کو درست حالت میں رکھا۔ قرآن کریم میں جہاں مدح یا تحریض کے مقام پر صلوٰۃ کا ذکر آیا ہے وہاں اقام یا اس کے مشتقات کو استعمال کیا ہے جیسے اقیموا الصلوٰۃ۔ یقیمون الصلوٰۃ۔ المقیمین الصلوٰۃ اور صلوٰۃ کے ساتھ اقامت کو خاص کیا ہے متنبہ کرنے کو کہ مقصود اس کے حقوق اور شرائط کا پورا کرنا ہے نہ صرف ظاہری صورت کا ادا کرنا اور اسی لئے یہ روایت ہے کہ مصلی یعنی نماز پڑھنے والے بہت ہیں اور اس کے قائم کرنے والے تھوڑے (غ) اور یہی وجہ ہے کہ ذم کے مقام

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۱۳

اقامت کے حقوق

پر لفظ مصلی اختیار کیا ہے نہ مقیم الصلوٰۃ فویل للمصلین (الماعون ۱۰۷-۴) اقامت کے حقوق و شرائط کا ذکر خود قرآن شریف میں موجود ہے (۱) طہارت جسمانی۔ جیسے وضو غسل وغیرہ (المائدہ ۵-۶) (۲) اوقات مقررہ پر ادا کرنا ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتبا موقوتا (النساء ۴-۱۰۳) (۳) نماز پر دوام یعنی سب نمازوں کا ادا کرنا یہ نہیں کہ کوئی پڑھ لی کوئی چھوڑ دی علی صلاتہم دائمون (المعارج ۷۰-۲۳) (۴) نماز کی محافظت سفر ہو بیماری ہو جنگ ہو کوئی سی مشکلات ہوں نماز نہ چھوٹے ھم علی صلاتہم یحافظون (المعارج ۷۰-۳۴) (۵) نماز کی اصل حقیقت سے غافل نہ ہو عن صلاتہم ساھون (الماعون ۱۰۷-۵) (۶) ریا سے پاک ہو الذین ھم یراؤن (الماعون ۱۰۷-۶) (۷) نماز کی ادائیگی میں طبیعت میں کسل نہ ہو منافقوں کے ذکر میں ہے لا یاتون الصلوٰۃ الا وھم کسالی (التوبہ ۹-۵۴) رسول اللہ صلعم کی نسبت احادیث میں ہے کہ آپ نماز میں راحت محسوس کرتے تھے (۸) با جماعت ہو وارکعوا مع الراکعین (۴۳) (۹) نماز میں خضوع و خشوع ہو الذین ھم فی صلوٰتہم خاشعون (المومنون ۲۳-۲) (۱۰) بدیوں اور ناشائستہ امور سے رک جائے ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر (العنکبوت ۲۹-۴۵) +

صلی

الصلوٰۃ صَلّی آگ کے جلانے پر بولا جاتا ہے۔ اور آگ میں داخل ہونے پر یصلی النار الکبری۔ سیصلون سعیرا۔ اور صلوٰۃ

صلوٰۃ

کے اصل معنی دعا اور برکت دینا ہیں چنانچہ صلیت علیہ کے معنی دعوت لہ آتے ہیں یعنی میں نے اس کے لئے دعا کی اور شاعر کہتا ہے وصلّی علٰی دَنِّھَا وَارْتَسَمْ۔ اس کے مشکیزہ پر دعا اور التجا کرتا رہا۔ قرآن شریف میں ہے وصل علیہم ان صلوتک سکن لہم (التوبہ ۹-۱۰۳) ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی (الاحزاب ۳۳-۵۶) اولئک علیہم صلوات من ربہم (۱۵۷) اور عبادت کی جگہ کو بھی صلوٰۃ کہا جاتا ہے لہدمت صوامع وبیع وصلوات (الحج ۲۲-۴۰) اور وہ نماز مخصوص بھی اس سے مراد ہے جو نبی صلعم نے مسلمانوں کو سکھائی اور وہ اقامت کے ساتھ صرف اسی ہیئت خاص سے ہی مخصوص ہے (غ) یعنی اقامت صلوٰۃ سے مراد نماز پڑھنا ہی ہے +

نماز کی تفصیلات

نماز کے متعلق قرآن شریف میں یہ تو فرمایا کہ نماز کتبا موقوتا ہے یعنی اس کا اوقات مقررہ پر ادا ہونا ضروری ہے لیکن اس کی تفصیلات کتنی دفعہ دن میں نماز ہو۔ کون کون سے وقت پر ہو۔ رکعات کی تعداد۔ ان کے ارکان اور ارکان کی ترتیب۔ اذکار کا ذکر قرآن شریف میں کسی ایک

ارکان و اوقات میں اتحاد اسلامی

جگہ نہیں دیا۔ اشارۃ النص کے طور پر کوئی شخص کوئی نتیجہ نکال لے تو اور بات ہے۔ دوسری طرف ان تمام تفصیلات میں عالم اسلامی میں حیرت انگیز اتحاد پایا جاتا ہے۔ سنی۔ شیعہ۔ خوارج۔ مقلد۔ غیر مقلد۔ پھر وہ فرقے جو ایک دوسرے کے ہمیشہ دشمن رہے مشرق سے لیکر مغرب تک اور ابتداء سے لیکر آج تک ایک ہی نماز پڑھتے چلے آئے ہیں اور پڑھ رہے ہیں چین ہو یا افریقہ کا جنگل جزائر بحر ہند ہوں یا روس کے دور دراز مقامات جہاں چلے جاؤ۔ ایک ہی اوقات ایک ہی تعداد رکعات۔ ایک ہی ترتیب پاؤ گے جس طرح اللہ ایک۔ رسول ایک۔ قرآن ایک۔ قبلہ ایک ہے۔ اسی طرح نماز بھی ایک ہے

آنحضرتؐ کی نماز

یہ اتفاق کبھی پیدا نہ ہو سکتا اگر یقیمون الصلوٰۃ کے سب سے پہلے عامل حضرت محمد مصطفی صلعم نے یہی نماز نہ پڑھی ہوتی۔ اور پھر آپ کو دیکھ کر صحابہ اور ان کو دیکھ کر تابعین نے علیٰ ہذا یہی نماز پڑھی بس یہی وہ الصلوٰۃ ہے جس کی اقامت کا یہاں حکم ہے +

ایمان بالغیب اور صلوٰۃ کا تعلق

یہ نماز اللہ کا قرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اسلئے ایمان بالغیب کے بعد فوراً اس کا ذکر کیا اور ایمان کے ساتھ عمل کا ذکر اصول میں داخل کر کے اس کی اہمیت بتادی۔ خدا پر ایمان ایک منہ کی بات رہتی اگر اسکے ساتھ وہ ذریعہ نہ بتادیا ہوتا جس سے اس نہاں در نہاں ہستی سے انسان کا تعلق پیدا ہو سکتا ہے یعنی انسان اپنے کمال حقیقی کو پہنچ سکتا ہے صلوٰۃ چونکہ خدا کے آگے گرنے اور عاجزی کا نام ہے اسلئے جس قدر زیادہ انسان خدا کے حضور گریگا اسی قدر زیادہ اخلاق الٰہی میں تمکین ہوگا اور ایمان کی اصل غرض پوری ہوگی پس نماز دوسرا رکن ان پانچ ارکان میں سے ہے جو اسلام کی بنیاد قرار دئے گئے اور عملی ارکان میں سے یہ پہلا ہے +

رزق

۱۳۔ رزقنٰہم۔ رزق کا لفظ کبھی عطائے جاریہ پر استعمال ہوتا ہے دنیوی ہو یا آخرت کے متعلق کبھی حصہ یا نصیب پر کبھی غذا پر (غ)،

۴ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج

اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اُتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اُتارا گیا[۱]

اس لئے یہاں ممّا رزقنٰھم میں نہ صرف مال داخل ہے بلکہ جاہ اور علم بھی (غ) بلکہ جو کچھ قویٰ انسان کو دئے گئے ہیں سب اس میں شامل ہیں

نفق — ینفقون - انفاق نَفَقَ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز گزر گئی - اور نَفَق سرنگ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کے اندر

نفاق — چلی جاتی ہے - اور اسی سے نفاق ہے جس کے معنی ہیں ایک رستہ سے دین میں داخل ہونا اور دوسرے سے نکل جانا (غ) ÷

انفاق — اور أَنْفَقَ جب لازمی ہو تو اس کے معنی مال جاتا رہنے کے ہوتے ہیں جیسے اذا لامسکتم خشیۃ الانفاق (بنی اسرائیل ۱۷ - ۱۰۰) جہاں انفاق کے معنی فناء ہیں - اور متعدی ہو تو خرچ کرنا معنی ہوتے ہیں (فا)

انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم — یہ تیسرا اصول ہے اور عملی رنگ میں دوسرا جس کو اختیار کئے بغیر فلاح حاصل نہیں ہو سکتی - اور ماحصل اس کا یہ ہے کہ اپنی تمام طاقتوں کو اور مال کو اور علم کو خدا کی راہ میں یعنی مخلوق کی بھلائی کے لئے لگا دے - زکوٰۃ گویا دینی محض اس کا ایک حصہ ہے - نماز کے بعد اس کا ذکر ترتیب طبعی کے مطابق ہے اس لئے کہ مخلوق کی خیر خواہی صحیح رنگ میں وہی انسان کر سکتا ہے جس کا تعلق خالق سے پیدا ہو - اور خالق سے تعلق پیدا ہونے کا ذریعہ نماز ہے - پس جب نماز سے یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ انسان خدا سے تعلق پیدا کر کے اخلاق الٰہی کے رنگ میں رنگین ہوا اور صفات الٰہی میں سب سے پہلی صفت ربوبیت ہے تو انسان کے لئے مخلوق کی خدمت ضروری ٹھہری کیونکہ اگر بذریعہ نماز خدا سے تعلق پیدا کر کے مخلوق کی خدمت کا شوق پیدا نہیں ہوا - تو نماز

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے اکٹھے ذکر میں حکمت — کی اصل غرض ہی مفقود ہو گئی یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں ہمیشہ اقامت صلوٰۃ کے بعد زکوٰۃ کا یا خدمت مخلوق کا ذکر آتا ہے - اور یہی وجہ ہے کہ جہاں نماز کی حقیقت سے بے خبری کا ذکر کیا وہاں بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز صرف دکھاوے کی پڑھتے ہیں کیونکہ مخلوق خدا کی خدمت کے چھوٹے چھوٹے کام بھی نہیں کرتے الذین ھم یراؤن ویمنعون الماعون (الماعون ۶ و ۷) عملی طور پر تکمیل نفس انسانی کے یہ دو ہی پہلو ہیں - خدا کے حضور جھکنا اور مخلوق خدا کی خدمت - ایک کو حسن کہہ لو دوسرے

حسن و احسان — کو احسان جب نماز کے ذریعہ سے حسن پیدا ہوا تو ممّا رزقنٰھم میں احسان کی تعلیم دی ÷

انزال — ۱۴ انزل - نزول کے اصل معنی گو اوپر سے نیچے آنے کے ہوں - مگر استعمال میں اوپر سے نیچے آنا اس کے معنی میں ضروری جزو نہیں - اور انزال مطلق ایصال و ابلاغ ہے یعنی ایک چیز کا پہنچا دینا (غ) قرآن کریم میں ہے انزلنا علیکم لباسا یواری سوآتکم (الاعراف ۷ - ۲۶) وانزل لکم من الانعام ثمٰنیۃ ازواج (الزمر ۳۹ - ۶) انزلنا الحدید (الحدید ۵۷ - ۲۵)

وحی اور رسول کا نزول — حالانکہ لوہا چارپائے لباس اوپر سے نہیں اُترتے - تنزیل یا انزال کا لفظ نہ صرف انبیاء علیہم السلام کی وحی پر استعمال ہوا ہے بلکہ خود رسول اللہ صلعم کے مبعوث ہونے کو بھی انزل کے لفظ سے ہی تعبیر کیا ہے قد انزل اللہ الیکم ذکرا رسولا (الطلاق ۶۵ - ۱۰) جس کی تفسیر کرتے ہوئے امام راغب فرماتے ہیں کہ یہاں رسول اللہ صلعم کا نام ذکر رکھا جیسا حضرت عیسیٰ کا نام کلمۃ رکھا - اور لکھتے ہیں کہ انزال ذکر سے مراد بعثت آنحضرت صلعم ہے ÷

وحی الٰہی پر ایمان — اب چوتھا اصول بیان فرماتا ہے جس پر ایک متقی انسان کو عمل پیرا ہونا چاہئے - اور وہ ہے ایمان اس پر جو محمد رسول اللہ صلعم کی طرف اُتارا گیا اور اس پر جو آپ سے پہلے اُتارا گیا - اور اعتقادی اصول میں سے یہ دوسرا ہے گویا پہلا ایمان باللہ اور دوسرا وحی الٰہی پر ایمان - کیونکہ اللہ پر ایمان پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وحی پر ایمان نہ ہو - وحی الٰہی خالق اور مخلوق کے درمیان سچا تعلق پیدا کرتی ہے پس ایمان کامل اللہ تعالیٰ پر صرف وحی سے پیدا ہوتا ہے - اور خالی نظارۂ قدرت سے کبھی ایمان پیدا نہیں ہوتا ہاں انسان اقرار کر سکتا ہے کہ اس کا کوئی صانع ہے مگر ایمان جس سے عمل کی طاقت پیدا

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں ۱۵

ہوتی ہے وہ اس تعلق کے قیام سے پیدا ہوتا ہے جو فی الواقع خالق اور مخلوق میں ہے اور اس کا واحد ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ اسی کی طرف خود لفظ الغیب میں بھی اشارہ تھا۔

پہلی وحی پر ایمان میں حکمت

مگر یہاں وحی پر ایمان کی ضرورت میں صرف قرآن پر ایمان ہی ضروری قرار نہیں دیا بلکہ پہلے بھی وحی الٰہی انبیاء پر آتے رہنے کو جزو ایمان قرار دیا۔ تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ محمد رسول اللہ صلعم سے کوئی الگ معاملہ نہیں بلکہ خالق اور مخلوق کا یہ تعلق ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ اور اس لئے بھی ما انزل من قبلك کی ضرورت پیش آئی کہ قرآن کی وحی کل عالم کی طرف تھی اور کل قوموں کو اس پر اکٹھا کرنا تھا۔ اس لئے پہلی وحیوں کا ذکر کرنا اس کے لئے ضروری ہوا۔ غرض ما انزل من قبلك کہکر ایک عظیم الشان اتحاد کی بنیاد رکھی۔ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیت جسمانی سارے انسانوں کے لئے ہے اس کی ربوبیت روحانی بھی سب قوموں کے لئے ہے۔ ایک عرب کے اُمّی نے یہ اصول دنیا کو سکھلایا جس کو بڑے سے بڑے فلاسفر دریافت نہ کرسکے۔ ہاں جہاں

پہلی وحی پر عمل کی ضرورت نہیں

ما انزل الیك یعنی قرآن کریم پر عمل ضروری ہے پہلی کتابوں کے متعلق چونکہ دوسری جگہ قرآن شریف نے خود بیان فرمایا کہ ان میں تحریف ہو چکی ہے اس لئے ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں ان کی تعلیم وقتی ضرورت زمانہ اور ضرورت مکان کے لحاظ سے تھی جس کا بہت سا حصہ قابل عملدرآمد نہ رہا اور جو تعلیم ہمیشہ رہنے کے قابل تھی اسے قرآن شریف نے اپنے اندر کامل طور پر جمع کر لیا جیسا کہ فرمایا فیہا کتب قیمۃ (البینۃ ۹۸-۳) پس عمل کی ضرورت صرف قرآن پر ہے۔

اٰخِر۔ اٰخَر الاخرۃ

۱۵ اٰخرۃ۔ اٰخِر اوّل کے مقابلہ پر ہے اور اٰخَر واحد کے مقابلہ پر اور الدار الاٰخرۃ سے مراد النشأۃ الثانیۃ ہے یعنی دوسری زندگی اور کبھی دار کا لفظ محذوف کر کے الاٰخرۃ سے مراد دار الاٰخرۃ لیا جاتا ہے (غ)۔ یہ تو لغت کی شہادت ہے قرآن شریف کو دیکھا جائے تو اس میں الاٰخرۃ کا لفظ جہاں ایمان بالآخرۃ یا کفر بالآخرۃ کا ذکر ہو اس موقعہ کے سوائے اٹھارہ موقعہ پر آتا ہے اور کسی ایک جگہ بھی سوائے النشأۃ الثانیۃ کے کوئی دوسرے معنی مراد نہیں پس قطعی شہادت ہے۔ دیکھو انعام ۹۳ و ۱۱۳ و ۱۵۰۔ الاعراف ۵۔۴۔ یونس ۱۰-۲۰۔ یوسف ۱۲-۳۷۔ النحل ۱۶-۲۲ و ۶۰۔ بنی اسرائیل ۱۷-۴۵۔ المومنون ۲۳-۷۴۔ النمل ۲۷-۳ و ۴۔ لقمان ۳۱-۴۔ السبا ۳۴-۸ و ۲۱۔ الزمر ۳۹-۴۵۔ حم السجدۃ ۴۱-۷۔ النجم ۵۳-۲۷۔ پس الاٰخرۃ سے مراد الوحی الاٰخرۃ لینا اور پھر یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن کریم کے بعد کوئی اور وحی بھی نازل ہونے والی ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہوگا۔ خلاف قرآن کریم ہے۔

یقین

یوقنون۔ یقین علم کی وہ صفت ہے جو معرفت درایت وغیرہ سے بڑھ کر ہے (غ)

ایمان بالآخرۃ کا مفہوم

ایمان بالآخرۃ پانچواں اصول مذہب کا قرار دیا۔ الاٰخرۃ یا النشأۃ الثانیۃ وہ زندگی ہے جو انسان کے ان اعمال کا نتیجہ ہے جو وہ اس دنیوی زندگی میں کرتا ہے۔ اس زندگی پر یقین رکھنا یہی ہے کہ انسان اعمال کی جزا و سزا پر یقین کامل رکھے۔ جب ایک انسان ایک فعل کے نتیجہ کو برا جانتا ہے تو وہ عموماً اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب اچھا جانتا ہے تو اسے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اگر فوری نتیجہ ایک کام کا اچھا بھی ہو مگر آخر کار اس کا اثر برا ہو تو عقلمند انسان اس سے بھی بچتا ہے۔ کھیل کود کو ایک نادان بچہ پسند کرے گا مگر ایک عقلمند انسان آج سے دس بیس بعض وقت سو سو سال آیندہ کے نتائج پر نگاہ رکھتا ہے۔ یورپ کے مدبرین کی چالیس اسی اچھی صفت کا استعمال بدیں۔ جتنی وسیع نگاہ ہوگی اسی قدر زیادہ ایک شخص ضرر سے بچ سکے گا۔

مذہب کی اعلیٰ غرض

مذہب انسان کو یہ سکھاتا ہے۔ کہ اعمال کے نتائج صرف اسی انسانی زندگی تک محدود نہیں ہیں اور سو سال تک محدود

۵ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں ۱۶

نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں سالوں تک چلتے ہیں اور اس دنیا کی زندگی کے بعد بھی انسان پر اپنا اچھا یا بُرا اثر ڈالتے ہیں۔ بلکہ جس طرح یہاں بعض وقت فوری نتیجہ ایک فعل کا اچھا نظر آتا ہے مگر اس کا انجام بُرا ہوتا ہے اسی طرح اس دنیا میں ایک فعل کا نتیجہ اچھا نظر آتا ہے مگر دوسری زندگی میں اس کا نتیجہ بد ہوتا ہے پس جو عمل فی نفسہٖ بُرا ہے اس کا نتیجہ یہاں اچھا بھی نظر آتا ہو تو بھی وہ ترک کرنے کے قابل ہے اور جو عمل فی نفسہٖ اچھا ہو اس کا نتیجہ یہاں بُرا بھی نظر آتا ہو تو بھی وہ کرنے کے قابل ہے یوں ہر ایک عمل کی ذمہ داری اس عمل کے اچھا یا بُرا ہونے کے لحاظ سے انسان کو سمجھنی چاہئے نہ ان نتائج سے جو ممکن طور پر اس دنیا میں پیدا ہو سکتے ہیں ایک شخص جھوٹ بول کر دوسرے کا مال لے سکتا ہے اور سزا سے بھی بچ سکتا ہے ایک قوم بوجہ اپنی طاقت جسمانی کے دوسری پر ظلم کر سکتی ہے اور اس کا کچھ بگڑتا بھی نظر نہیں آتا مگر ایک متقی انسان جو کچھ کرے محض اس بات کو مدنظر رکھ کر کرے کہ یہ کام اچھا ہے یا بُرا ۔

آخرۃ کے ساتھ یقین کا لفظ بتاتا ہے کہ اعمال کی جزاء و سزا پر جب تک یقین کامل نہ ہو اس وقت تک انسان گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ بہت لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر چونکہ دل میں یقین نہیں اس لئے گناہ کی غلامی میں زندگی بسر کرتے ہیں جس شخص کو یقین ہو کہ فلاں سوراخ میں سانپ ہے وہ اس میں ہاتھ نہیں ڈالتا پس کس طرح اعمال کی جزاء و سزا پر یقین رکھتا ہوا اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر سکتا ہے ؟ — جزاء و سزا پر یقین گناہ سے بچاتا ہے

۱۶ علیٰ ھدًی یعنی ہدایت پر متمکن ہو گئے اور اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہونگے اور انکو ایک نور اور روشنی ملجاتی ہے یہ معنی ہدایت کے یہاں حضرت ابن عباس نے کئے ہیں (ج) — علٰی ھدًی

المفلحون۔ فلح کے اصل معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں زمین میں ہل چلانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس لئے کسان کو فلاح کہتے ہیں۔ اور فلاح کے معنی ظفر و ادراک بُغْیَۃ ہیں (غ) یعنی کامیابی اور مطلوب کا پالینا کیونکہ جس طرح ہل چلانے سے زمین کی مخفی طاقتیں اور اصلی جوہر باہر نکل آتے ہیں اسی طرح قوائے انسانی کا بھی حال ہے۔ ان کے مخفی جوہروں کا باہر نکل آنا ہی حقیقت میں کامیابی ہے پس فلاح سے مراد صرف دنیوی کامیابی نہیں بلکہ انسان کے مخفی قویٰ کا ظہور پذیر ہونا ہے محض دنیا کا مال کما لینا یا بادشاہت کا حاصل کر لینا فلاح نہیں ورنہ ایسا شخص مفلح کہلا سکتا ہے بلکہ فلاح کے معنی الفوز والخیر یعنی دنیوی اور دینی دونوں کامیابیوں کو شامل کرتے ہیں۔ چنانچہ تاج العروس میں ہے کہ ائمہ لسان کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی زبان میں فلاح کے لفظ سے بڑھ کر دینی اور دنیوی دونوں بھلائیوں کو شامل رکھنے والا لفظ اور کوئی نہیں ۔ — فلح / فلاح۔ فلاح

یہاں یہ فرمایا کہ ان پانچ اصولوں کو قبول کر کے قرآن کریم کو اپنا دستور العمل بنا لینے والے لوگ ہدایت پر ہیں۔ اور ان کے ہدایت پر ہونے کی یہ دلیل ہے کہ وہ فلاح حاصل کریں گے یعنی دینی و اُخروی کامیابی حاصل کریں گے۔ اور ان کے جسمانی اور روحانی قویٰ اعلیٰ درجہ کا نشوونما پالیں گے۔ چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کا ثبوت دنیا کو دے دیا۔ گویا علیٰ ھدًی دعویٰ تھا۔ ھم المفلحون اس کی دلیل ہے ۔ — مفلح کون ہیں

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ ۶

جنہوں نے انکار کیا (یہانتک کہ) ان کے لئے برابر ہے کہ تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے

لَا يُؤْمِنُونَ ○

وہ نہیں ماننے کے

کفر۔ کافر

حل لغات — کفروا۔ کُفر لغت میں سَتْرُ الشَّیْءِ یعنی ایک چیز کو ڈھانکنے کا نام ہے۔ چنانچہ رات کو کافر کہہ دیا جاتا ہے۔ اور کسان کو بھی کافر کہدیا جاتا ہے اس لئے کہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ اور کفر نعمت ناشکر گزاری ہے اس لئے کہ اس کا شکر ادا نہ کرنا گویا اس کو چھپانا ہے۔ اور سب سے بڑا کفر انکار توحید یا شریعت یا نبوت ہے (غ) اور

ہر فعل مذموم کفر میں داخل ہے

جس طرح ہر ایک فعلِ محمود یعنی قابل تعریف فعل ایمان سے ہے اسی طرح ہر ایک فعلِ مذموم کفر سے ہے (غ)۔ اور ابن

اصل اور فروع کا کفر

اثیر نے لکھا ہے کہ کفر دو قسم ہے: ایک اصل ایمان کا کفر اور اس کی ضد اور دوسرا فروع اسلام میں سے کسی فرع کا کفر اس سے انسان اصل ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ چنانچہ ازہری کا قول نقل کیا ہے قد یقول المسلم کفرا۔ پس اصطلاح شریعت میں کفر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار ہے۔ اور اس کے نیچے جو بعض افعال کا نام کفر رکھ دیا ہے جیسے سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر یا من رغب عن ابیہ فقد کفر وغیرہ تو یہ محض فرع کا کفر ہے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتا۔ اور اصل معنی میں وسعت ہے +

نذر۔ انذار

انذرت - نذر سے ہے جس کے معنی ہیں اپنے نفس پر کسی چیز کو واجب کر لینا (غ) اور اَنْذَرَ یا اِنْذَار کے اصل معنی قاموس میں صرف اَعْلَمَ ہیں یعنی ایک بات کا اس کو علم دے دیا (ت) اور یوں بھی کہا گیا ہے کہ انذار یہ ہے کہ ایک بات کے پہنچانے میں انسان کو محتاط کیا جائے اور ڈرایا جائے اور اصل معنی اِنْذَار کے اعلام ہی ہیں یعنی ایک بات سے

منذر

آگاہ کر دینا (ت)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مُنْذِر وہ ایسا علم دینے والا ہے جو قوم کو خطرات سے آگاہ کرے جیسے دشمن وغیرہ سے پس انذار کے اصل معنی دھمکانا نہیں بلکہ ایک علم دینا ہیں اور بالخصوص وہ علم جو کسی آنے والے خطرہ سے آگاہ کرتا ہے +

اضداد کا ذکر

قرآن کریم کا قاعدہ ہے کہ اضداد کا ذکر بالمقابل کر کے اصل مقصود کو ظاہر کرتا ہے جب متقیوں کا ذکر کیا۔ اور ان کے فلاح پانے یعنی اپنے کمال حقیقی کو پہنچ جانے کا تو اب ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے کہ جب ان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارے یہ افعال بُرے ہیں اور ان کا نتیجہ اچھا نہیں تو وہ پروا بھی نہیں کرتے۔ متقی تو وہ ہے جو ہر ایک دُکھ کی بات سے بچتا ہے اور اس کے مقابل پر وہ شخص ہے جس کو جب بتایا جاتا ہے کہ دکھ دینے والی چیز ہے تو پروا بھی نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں ھدی للمتقین کہنے سے جو شبہ وارد ہوتا تھا کہ جب یہ کتاب تمام دنیا کے لئے ہے تو کیا بعض قسم کے لوگ اس سے محروم بھی رہ جائیں گے اس کا جواب دیا ہے کہ محروم وہی رہیں گے جن کو پروا نہیں +

انذار کی پروا نہ کرنے والے

جملہ سواء علیہم ءانذرتہم ام لم تنذرہم جملہ معترضہ ہے جو ان الذین کفروا کی حالت کو بیان کرتا ہے بحر المحیط اور روح المعانی میں اس ترکیب کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ اور اس کو جملہ معترضہ نہ ماننے کی صورت میں کوئی معنی صحیح نہیں بنتے۔ کیونکہ اگر اسے ان الذین کفروا کی خبر قرار دیا جائے تو معنی یوں ہوں گے کہ جو کافر ہوئے ان پر تیرا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ حالانکہ یہ خلاف واقعات ہے اور خلاف واقعات معنی قرآن کریم کے قبول نہیں ہو سکتے۔ آنحضرت صلعم کفار کو ہی ڈراتے تھے۔ اور قرآن کریم میں بھی بار بار کفار کو ڈرانے کا حکم ہے۔ اور ان میں سے لوگ مسلمان بھی ہوتے

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِهِمۡ ؕ وَعَلٰۤی اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫

اللہ نے ان کے دلوں اور انکے کانوں پر مہر کردی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے ۱۸؎

گئے پس اصل معنی یوں ہیں کہ جنہوں نے کفر کیا اور ایسا کفر کہ ان پر تیرا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے وہ ایمان نہیں لاتے۔ اور یہ سچ بھی ہے جو شخص ڈرانے کی پرواہ نہیں کرتا وہ کبھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا ہاں جب دل کی اس حالت کو تبدیل کرلیتا ہے تو پھر وہ بھی فائدہ اُٹھا لیتا ہے۔ یہ حکم ایک خاص حالت پر ہے کسی خاص انسان پر نہیں +

ختم۔ طبع

دلوں پر مہر سے مراد

۱۸؎ ختم اور طبع کے لغت میں ایک ہی معنی ہیں یعنی ایک چیز کو ڈھانک دینا اور ایسا مضبوط باندھ دینا کہ دوسری چیز اس میں داخل نہ ہو سکے (ت) اور امام راغب نے مفردات میں دلوں پر ختم یا مہر کرنے کی تشریح یوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ جب ایک شخص اعتقاد باطل میں یا ارتکاب گناہ میں حد سے بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کسی طرح پر حق کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا تو یہ اس میں ایک ایسی کیفیت پیدا کردیتا ہے جو اس کو گناہ کے اچھا سمجھنے کا عادی کردیتی ہے گویا اس کے ساتھ اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ ایسا ہی استعارہ ہے جیسے جعلنا علٰی قلوبہم اکنۃ ان یفقھوہ (الانعام ۔ ۲۵) میں یا جعلنا قلوبہم قاسیۃ (مائدۃ ۔ ۱۳) میں استعارہ ہے +

غشی۔ غشاوۃ

غشاوۃ۔ غشی مادہ ہے جس کے معنی ڈھانکنا ہیں۔ اور غشاوۃ وہ ہے جس کے ساتھ کوئی چیز ڈھانکی جائے غَشِيَ یَغْشٰی۔ تَغَشّٰی۔ غاشیۃ۔ مغشی۔ اِسْتَغْشَوْا وغیرہ بہت سے مشتقات اس سے قرآن شریف میں آئے ہیں +

خدا کا مہر لگانا انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے

اس آیت میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کا پہلی آیت میں ہے۔ علٰی قلوبہم میں جو ضمیر ھم ہے وہ عام کافروں کی طرف نہیں جاتی بلکہ صرف انہی کفار کی طرف جن کے لئے ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے جو کفر کے کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ پس یہ مہر لگانا ابتدا کے طور پر نہیں کہ بعض انسانوں کو خدا نے پیدا ہی ایسا کیا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے بلکہ یہ مہر لگانا بطور نتیجہ کے ہے۔ جب ایک شخص اپنے دل سے غور و فکر کا کام نہیں لیتا تو وہ قوت سلب ہو جاتی ہے جس طرح اگر ہاتھ سے کچھ مدت تک بالکل کام نہ لے تو وہ ہاتھ بیکار ہو جاتا ہے۔ ہاں جس طرح یہ جسمانی قوتیں بھی خاص علاج سے لوٹ آتی ہیں اسی طرح دلوں کی مہر بھی جو اللہ تعالیٰ بطور سزا لگاتا ہے ٹوٹ جاتی ہے۔ قرآن کریم اس کا بھی علاج کرتا ہے کیونکہ شفاء لما فی الصدور ہے مگر علاج اسی کے لئے ہے جو علاج کرانا چاہے +

قرآن و حدیث کی شہادت کہ بدی کا اثر ساتھ ساتھ پیدا ہوتا رہتا ہے

اس معنی کی تائید خود قرآن شریف سے ہوتی ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ فرماتا ہے بل ران علٰی قلوبہم ما کانوا یکسبون (التطفیف ۔ ۱۴) انکے دلوں پر اسی نے زنگ لگا دیا ہے جو وہ کام کرتے تھے پس انسان کے اپنے عمل جس طرح دل پر زنگ لگاتے ہیں مہر بھی کردیتے ہیں۔ زنگ لگنا پہلا مرتبہ ہے مہر لگ جانا آخری مرتبہ۔ ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ داغ اس کے دل پر پڑجاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کرے تو اس کا قلب صاف ہو جاتا ہے (قلب سے مراد قلب روحانی ہے) اور اگر اور گناہ کرتا جائے تو وہ سیاہی بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ ران علٰی قلوبہم کا مصداق ہو جاتا ہے۔ گویا وہ روشنی جو خدا نے انسان کے اندر رکھی تھی وہ بالکل دب جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زنگ یا مہر کافر کے ساتھ خاص نہیں مسلمان بھی بدیوں کے ارتکاب کی عادت کرلے تو اس کے دل پر بھی مہر لگ جاتی ہے پس اس آیت نے ایک پُرحکمت فلسفہ بدی کا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ بدی کا اثر ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوتا چلا جاتا ہے +

مہر لگانے سے کیا مراد ہے حضرت ابن مسعود اور کئی صحابہ سے ختم اللہ علٰی قلوبہم وعلٰی سمعہم کی تفسیر

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

اور ان کے لئے بڑا دکھ ہے عہ ۱۹

عقل سے کام نہ لینا / دل پر مہر ہے

میں مردی ہے لا یعقلون ولا یسمعون وہ نہ عقل سے کام لیتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ خود قرآن کریم نے یہی تشریح فرمائی ہے۔ ومنهم من يستمع اليك حتى اذا خرجوا من عندك قالوا للذين اوتوا العلم ماذا قال آنفا اولئك الذين طبع الله على قلوبهم (محمدؐ ۔ ۱۶) اور ان میں ایسے لوگ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں یہاں تک کہ جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں کو جن کو علم دیا گیا کہتے ہیں ابھی اس نے کیا کہا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی۔ گویا مہر لگنا اس حالت کا نام ہے کہ انسان بات کو سنتا ہے سمجھتا نہیں۔ اور دوسری جگہ فرمایا لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم آذان لا يسمعون بها (الاعراف ۔ ۱۷۹) ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سننے کا کام نہیں لیتے جب انسان ایک برے کام کے ارتکاب پر قائم ہو جاتا ہے تو اس کی حالت آہستہ آہستہ ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ اس برے کام کو اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ یہ اس کے دل پر مہر ہے۔ کیونکہ پھر اس کا خیال بھی اس طرف نہیں جاتا کہ یہ جو میں کر رہا ہوں کوئی برا کام ہے ✦

برے کام کو اچھا سمجھنا دل پر مہر ہے

مہر لگانے کی نسبت اللہ کی طرف

مہر کا لگانا اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے منسوب کیا کہ انسان کے ہر فعل پر جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے جس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب ایک شخص اپنے گھر کے دروازے بند کرلے تو اللہ تعالیٰ اس پر اندھیرا کر دیتا ہے یا ہاتھ سے کام لینا چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ ہاتھ کو بیکار کر دیتا ہے اسی طرح جب ایک انسان کو بدی کے بد انجام سے ڈرایا جائے اور وہ پروا بھی نہ کرے بلکہ بدی میں ترقی کرتا چلا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔ اس میں زردشتیوں کے اس غلط عقیدہ کی تردید بھی ہے کہ نور خدا کی طرف سے ہے اور ظلمت شیطان کی طرف سے۔ اسلام تمام اسباب کا مسبب اللہ تعالیٰ کو قرار دیتا ہے ✦

زردشتی عقیدہ کی تردید

عذب / عذاب / تعذیب

عہ ۱۹ عذاب اس کا مادہ عذب ہے اور ماءٌ عَذْبٌ شیریں اور عمدہ پانی کو کہتے ہیں قرآن شریف میں ہے هذا عذب فرات (الفرقان ۲۵ ۔ ۵۳) اور عذاب سخت دکھ کو کہتے ہیں جس کی وجہ یوں بیان کی جاتی ہے کہ عَذَّبَ الرَّجُلُ کے معنی آتے ہیں اس نے کھانا پینا ترک کر دیا گویا تعذیب اصل میں یہ ہے کہ اس کو کھانے پینے نیند سے محروم کیا جائے۔ اور بعض کے نزدیک تعذیب میں ازالہ عذب ہے یعنی زندگی کی اچھی چیزوں کو دور کر دینا جیسے تمریض مرض کے دور کر دینے کو کہتے ہیں۔ گویا اچھی چیزوں سے محروم ہو جانے کا نام عذاب ہے۔ قرآن کریم نے ہر ایک سزا یا تکلیف کے پہنچنے پر اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ جہاں ایک باغ والوں کو اپنی محنت کا پھل نہیں ملا۔ اس کو بھی عذاب کہا۔ كذلك العذاب (ن ۶۸ ۔ ۳۳)۔ دنیا میں جو قوموں پر تباہیاں اور دکھ آتے ہیں ان کو بھی عذاب کہا ہے۔ کسی جرم پر جو سزا دی جاتی ہے اسکو بھی عذاب کہا ہے۔ وليشهد عذابهما (النور ۲۴ ۔ ۲) آخرت کی سزا کو بھی عذاب کہا ہے۔ انسان کا دل جو بدی کے بعد دکھ محسوس کرتا ہے وہ بھی عذاب ہے ✦

تمریض / عذاب کا استعمال قرآن میں

عذاب عظیم اور عذاب الیم

قرآن کریم میں کبھی عذاب کو بلحاظ اسکی ظاہری کیفیت کے عظیم کہا ہے یعنی بڑا عذاب اور کبھی بلحاظ اس دکھ کے جو انسان اندر ہی اندر اٹھاتا ہے الیم کہا ہے یعنی دردناک عذاب اسی مناسبت سے یہاں کفار کے عذاب کو جو ظاہر میں بھی واقع ہونیوالا تھا عذاب عظیم کہا ہے اور آیت ۱۰ میں منافقوں کے عذاب کو عذاب الیم کہا ہے۔

۹ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ يُخٰدِعُوْنَ

اور لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ ماننے والے نہیں عنہ ۲۰

اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

وہ اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے دھوکا دینا چاہتے ہیں اور سوائے اپنے آپ کے کسی کو دھوکہ نہیں دیتے اور وہ محسوس نہیں کرتے عنہ ۲۱

ع ۲ — منافق

اللہ اور آخرت پر ایمان مسلمان ہونے کے قایم مقام ہے۔

عنہ ۲۰ - یہاں اللہ اور آخرت پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے قائم مقام رکھا ہے۔ کیونکہ اللہ کی صفات اور آخرت کے مسئلہ کو کھول کر قرآن کریم نے ہی بیان کیا ہے اور دوسرے شروع میں جو اصول بیان کئے ان میں سے پہلا اصول اللہ پر ایمان اور آخری آخرت پر یقین ہے پس اول و آخر کو سب کا قائم مقام بنا لیا۔ یہاں منافقوں کے ذکر میں جو مُنہ سے اسلام کا اقرار کرتے تھے ایمان باللہ والیوم الآخر کو لا کر اس کے معنی کی وضاحت کر دی ہے یعنی اس سے مراد مسلمان ہونا ہے +

عبداللہ بن ابی

پہلے رکوع میں دو گروہوں کا ذکر کیا اول کامل طور پر ماننے والے دوسرے کلی طور پر انکار کرنے والے یہاں ایک تیسرے گروہ کا ذکر کیا ہے جو مُنہ سے کہتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے۔ مدینہ میں عبداللہ بن ابی قوم خزرج میں سے ایک بڑا سردار تھا جس کو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانے والے تھے۔ نبی کریم صلعم کی مدینہ میں آمد سے صورت معاملہ بدل گئی اور سب قوموں نے یہودیوں سمیت آنحضرت صلعم کو سب جھگڑوں کا آخری فیصلہ کرنے والا تسلیم کیا۔ عبداللہ بن اُبیؔ کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور جہاں اور کھلے دشمن اسلام کے پیدا ہوئے اس نے اپنے ارد گرد ایک چھپا ہوا دشمنِ اسلام گروہ پیدا کر لیا۔ ان لوگوں کو اسلام سے فی الواقع کوئی تعلق نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ ظاہرداری کے طور پر مسلمان ہونے کا اقرار کرتے تھے مگر اندرونی طور پر پورا زور اسلام کے استیصال کے لئے لگاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ان سب حالات میں بچا کر دکھا دیا کہ اسلام کو نہ اس کے کھلے دشمن کچھ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ چھپے ہوئے۔ کیونکہ خدا کا ہاتھ اس کی تائید میں ہے +

اسلام کے اندرونی دشمن

منافقین زمانہ حال

اس زمانہ میں بھی مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ ہے جو دشمنان اسلام کے ساتھ مل کر اسلام کو نقصان پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے گو بظاہر مسلمان کہلاتے ہیں ان کے حالات ان منافقین سے جو آنحضرتؐ کے وقت میں تھے بہت ملتے ہیں لیکن ان کے علاوہ بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو مُنہ سے قرآن کریم پر ایمان لانے کا اقرار کرتے ہیں مگر عمل کے وقت اپنے رسوم اور خواہشات کی پیروی کرتے اور قرآن کو پس پشت ڈالتے ہیں۔ یہ عملی نفاق ہے۔ اور اسی کا نتیجہ وہ ذلت و ادبار ہے جو آج مسلمانوں کے شامل حال ہے +

عملی نفاق

خداع — خادع

عنہ ۲۱ - یخٰدعون - خداع اس کا مادہ ہے جس کے معنی دھوکہ دینا ہیں یعنی ظاہر کچھ کرنا اور دل میں دوسری بات چھپا رکھنا اس ارادہ سے کہ دوسرے کو نقصان پہنچائے اور خادع کسی کو دھوکہ دینے کے قصد پر بھی بولا جاتا ہے (ت) یہی معنی یہاں مراد ہیں مفاعلہ کا باب بعض وقت صرف ایک کیلئے بھی آجاتا ہے جیسے عاقبت اللص ہیں پس یخٰدعون اللّٰہ کے معنی ہیں اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

شَعْر - شَعَر — شِعْر

یشعرون - شَعْر بال کو کہتے ہیں۔ اور اس کی جمع اشعار آتی ہے۔ واشعارھا (النحل ۱۶ - ۸۰) اور شَعَرتُ کے معنی ہیں ایک چیز کا ایسا دقیق علم حاصل کیا گویا کہ اس کے بالوں تک پہنچ گیا - اور شِعر بھی اصل میں دقیق کلام کو کہتے ہیں (غ) پس شعور علم سے زیادہ باریک بینی کو چاہتا ہے +

منافقوں کی دھوکہ بازی

منافقانہ چال سے ان کا مطلب تو یہ تھا کہ مسلمانوں کو دھوکہ دیں جو گویا خدا کو ہی دھوکا دینا تھا یعنی مسلمان ان کو اپنے مددگار اور حامی سمجھیں۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ خود نقصان اُٹھایا مسلمانوں کا ان کی شرارتوں سے کچھ نہ بگڑا یہی اپنے آپ کو دھوکہ دینا تھا۔

فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا ۱۰

ان کے دلوں میں بیماری ہے سو اللہ نے ان کی بیماری کو زیادہ کیا ۲۲ اور ان کے لئے دردناک دکھ ہے اس لئے کہ جھوٹ

يَكْذِبُونَ ○ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ ۱۱

بولتے تھے ۲۳ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو۔ کہتے ہیں ہم ہی تو اصلاح

مُصْلِحُونَ ○ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ○ ۱۲

کرنے والے ہیں دیکھو! یقیناً وہی مفسد ہیں لیکن محسوس نہیں کرتے ۲۴

مرض — **امراض روحانی**

۲۲ مرض۔ مرض اس حالت اعتدال سے خروج کا نام ہے جو انسان سے خاص ہے اور یہ دو طرح پر ہے ایک جسمانی جیسے لا علی المریض حرج (النور ۲۴-۶۱) اور دوسرے اس سے مراد رذائل لئے جاتے ہیں جیسے جہالت جبن بخل نفاق وغیرہ یعنی اخلاقی بیماریاں (غ) یہی معنی یہاں مراد ہیں اور قرآن شریف میں کثرت سے مرض کا ذکر اسی معنی میں آتا ہے۔ اور اخلاقی رذائل کو مرض اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ فضائل کے حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ جیسے بیماریاں ◆

منافقوں کی بیماری — **خدا کس طرح بیماری بڑھاتا ہے۔**

وہ بیماری نفاق ہے جس کا یہاں ذکر کر دیا یعنی منہ سے جو کچھ کہتے ہیں اس پر یقین نہیں رکھتے۔ اسی لئے عذاب الیم کو جھوٹ کا نتیجہ بتایا یا یہ بیماری اسلام کی عداوت ہے جو اپنے دلوں میں مخفی رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا اس بیماری کو بڑھانا یوں تھا کہ جوں جوں اللہ تعالیٰ اسلام کو قوت اور شوکت عطا کرتا گیا ان کا نفاق اور ان کی اسلام سے عداوت اور ترقی کرتی گئی اللہ تعالیٰ کی طرف بیماری کا بڑھانا منسوب کیا کیونکہ یہ بطور سزا تھا۔ یا اس لئے کہ وہ اسباب جن سے بیماری بڑھی اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کئے تھے۔ گو وہ چاہتے تو انہی اسباب سے ہدایت حاصل کر سکتے حضرت نوح کہتے ہیں فلم یزدھم دعاءی الا فرارا۔ (نوح ۷۱-۶) میرے بلانے نے انکو صرف بھاگنے میں زیادہ کیا۔ حالانکہ دعوت کی غرض تو ان کا بلانا تھا۔ نہ بھگانا۔ مگر چونکہ جس قدر وہ بلاتے تھے اُسی قدر وہ زیادہ دور ہوتے تھے۔ اس لئے بڑھانے کو دعا کی طرف منسوب کیا۔ گو وہ دعا کا مقصد نہ تھا ◆

کذب — **جھوٹ منافق کا نشان ہے** — **صحابی کی روایت پر جھوٹ کا احتمال نہیں**

۲۳ یکذبون۔ کذب صدق کی ضد ہے اور صدق کی طرح قول اور فعل دونوں پر بولا جاتا ہے (غ) جھوٹ بول کر انسان کو کبھی راحت نہیں ملتی۔ منافق کی جو چار علامتیں حدیث میں لکھی ہیں ان میں سے سب سے بڑی یہی ہے کہ اذا حدث کذب جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔ مسلمانوں میں اس زمانہ میں یہ بیماری بہت بڑھی ہوئی ہے۔ باتوں میں جھوٹ بولتے جھوٹی شہادتیں دیتے اور جھوٹے دعوے کرتے ہیں حکام کو خوش کرنے کے لئے بھی جھوٹ بول دیتے ہیں کسی قوم میں ایسے لوگوں کی زیادتی سے قوم کی عزت باقی نہیں رہ سکتی۔ ان کے بالمقابل صحابہ رضی اللہ عنہم کی حالت دیکھو تو وہاں عمداً جھوٹ کا وجود بھی نہیں پایا جاتا یہاں تک کہ جو روایت صحابی تک پہنچ جائے اس پر جھوٹ کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا ◆

فساد

۲۴ تفسدوا۔ فساد کسی چیز کا اعتدال سے نکل جانا ہے تھوڑا ہو یا بہت۔ اور اس کی ضد صلاح ہے اور اس کا استعمال نفس میں اور بدن میں اور اشیاء میں جو حد اعتدال سے نکل گئی ہوں ہوتا ہے (غ)

ارض — **زمین کا چکر کھانا**

الارض۔ اَرض کے مصدری معنی الرِعدۃ یعنی کانپنا یا الدّوار یعنی چکر کھانا آتے ہیں (ت)، اور اَرض زمین کو کہتے ہیں گویا اس کے معنی میں ہی چکر کھانے کی طرف اشارہ ہے۔ اور زمین کے خاص حصہ یا خاص ملک کو بھی کہتے ہیں مفردات میں ہے کہ ہر ایک چیز کے نیچے کے حصے کو اس کی ارض کہا جاتا ہے جس طرح ہر چیز کے اوپر کے حصہ کو اس کا سما کہدیا جاتا ہے چنانچہ

۱۳ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ [25]

اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے تو وہ کہتے ہیں کیا ہم (اس طرح) مان لیں جس طرح بیوقوفوں نے مانا

۱۴ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ۝ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا

دیکھو! یقیناً یہ خود ہی بیوقوف ہیں لیکن نہیں جانتے اور جب ان لوگوں کو ملتے ہیں جو ایمان لائے ہیں کہتے

آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ۝ [26]

ہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کی طرف خلوت میں جاتے ہیں کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں (ان سے) ہم صرف ہنسی کرتے ہیں

کو گھوڑے وغیرہ کی ٹانگوں کے نیچے کے حصہ کو جوتی کے تلوے کے نچلے حصہ کو جو زمین سے لگتا ہے اس کی رجل کہہ دیا جاتا ہے اور مجازاً قلب انسانی پر بھی یہ لفظ بول دیا گیا ہے (غ)

منافقوں کے فساد اور ان کے دعویٰ صلح سے مراد کیا ہے۔

یہاں زمین میں فساد کرنے سے مراد ان کے خفیہ تعلقات اور سازشیں ہیں جو وہ اسلام کو تباہ کرنے کے لئے کرتے تھے۔ یا ان کا اندر سے کفر پر قائم رہنا فساد ہے۔ ان کا اپنے آپ کو مصلح کہنا اس لحاظ سے تھا کہ ہم دونوں فریقوں سے صلح رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی شرارتوں سے متنبہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ فی الواقع مفسد ہیں لیکن اپنے آپ کو مفسد نہیں سمجھتے۔ یہ عموماً مفسدوں کا قاعدہ ہے کہ وہ کوئی امن سمجھوتہ کر کے اپنے فعل کا جواز کر لیتے ہیں۔ بہتیرے دوسروں کی جڑوں کو کاٹنا اصلاح خیال کرتے ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ ان کے مفسد ہونے پر کسی کو اطلاع مل جائے گی۔ اور یا یہ کہ ان میں جو عامۃ الناس ہیں ان کو یہی بتایا جاتا ہے کہ یہ کام اصلاح کا ہے۔ اس لئے وہ فساد کا کام کرتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ یہ فساد کا کام ہے۔

سفہ۔ سفیہ

[25] السفہاء سفیہ کی جمع ہے سفہ کے اصل معنی ہلکا پن ہیں کبھی عقل نفس انسانی کا ہلکا پن ہوتا ہے اس لئے کم عقل یا بیوقوف آدمی کو سفیہ کہا جاتا ہے جو لوگ اپنے اموال کو ٹھیک طور پر خرچ کرنا نہیں جانتے ان کو بھی قرآن کریم نے سفیہ قرار دیا ہے (النساء ۴-۵)

منافقوں کے مسلمانوں کو بیوقوف کہنے کی وجہ

منافق مسلمانوں کو بیوقوف اس لئے کہتے تھے کہ انہوں نے اپنے مال دولت گھروں رشتہ داروں کو ایک شخص کے پیچھے لگ کر چھوڑ دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کفار جلدی ان کو کچل ڈالیں گے۔

خلی

[26] خلوا خلاء مکان اور زمانہ دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے بلحاظ زمانہ اس کے معنی ہیں مضی وذھب یعنی گزر گیا چلا گیا۔ تلک أمة قد خلت (۲-۱۳۴) قد خلت من قبله الرسل (آل عمران ۳-۱۴۴) وغیرہ میں یہی مراد ہے اور

خلا الیہ خلا بہ

خلا الیہ یا خلا فلان بفلان کے معنی آتے ہیں اس کے ساتھ خلوت میں ہوا۔ یہی صورت اور معنی یہاں ہیں۔

شطن

شیطان۔ شطن سے ہے جس کے معنی ہیں دور ہوا۔ پس شیطان وہ ہستی ہے جو رحمت الٰہی سے دور ہوئی بعض نے شاط دیشیط سے مشتق کہا ہے جس کے معنی ہیں غضب میں جل گیا۔ قرآن شریف میں شیطان کی خلقت نار یعنی آگ سے بیان فرمائی ہے۔ قوت غضبیہ میں بڑھے ہوئے انسان بھی شیطان کہلاتے ہیں۔ ابو عبیدہ لکھتے ہیں کہ شیطان ہر ایک

انسانوں میں سے شیطان

سرکش کا نام ہے جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے یا حیوانوں میں سے قرآن شریف میں بھی شیاطین الانس والجن آتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ انسانوں میں سے بھی شیطان ہوتے ہیں (ت) امام راغب لکھتے ہیں کہ ہر ایک برے

برے اخلاق پر شیطان کا اطلاق

خلق کو بھی شیطان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حسد بھی ایک شیطان ہے اور غضب بھی ایک شیطان ہے

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ ۱۵

اللہ ان کو ذلیل کرے گا ۲۷ اور وہ ان کو مہلت دیتا ہے وہ اپنی سرکشی میں حیران پھر رہے ہیں ۲۸

شیطان کا انسان میں خون کی طرح پھرنا

ایک حدیث میں آتا ہے کہ شیطان انسان میں اس طرح پھرتا ہے جیسے خون پھرتا ہے صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ میں۔ فرمایا ہاں الا ان اللہ اعاننی علیہ فاسلم صرف یہ فرق ہے کہ اللہ نے اس کے خلاف مجھے مدد دی پس وہ فرمانبردار ہو گیا جس سے معلوم ہوا کہ شیطان کو انسان پر نہیں بلکہ انسان کو شیطان پر تصرف دیا گیا ہے۔ نہایت باریک راہوں سے بری تحریک کرنے والی ہستی شیطان ہے۔

بدی کا محرک شیطان ہے

اسی طرح بری تحریک کرنے والے انسان بھی شیطان ہیں۔ قیامت کے دن یہی عذر گنہگاروں کا مذکور ہے کہ ہمارے سرداروں نے ہم کو بری راہ پر ڈالا اور حدیث میں جو آتا ہے الواکب شیطان تو وہاں مراد صرف یہ ہے کہ جب آدمی اکیلا نکلتا ہے تو وہ اپنے آپکو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

شیطان صفت انسان

اس جگہ شیاطین سے مراد قریباً تمام مفسرین کے نزدیک انسان شیطان ہی ہیں۔ بخاری میں امام مجاہد سے مروی ہے کہ شیاطین سے مراد ان کے منافق اور مشرک دوست ہیں ابن عباس سے ہے رؤسا ئھم فی الکفر ان کے کافر سردار۔ اسی سورت کی آیت ۷ میں بجائے خلوا الی شیاطینھم کے ہے خلا بعضھم الی بعض جس سے معلوم ہوا کہ یہاں شیطان صفت انسان ہی مراد ہیں ÷

استہزاء

۲۷۔ استہزاء کے معنی کشاف نے لکھے ہیں انزال الھوان والحقارۃ یعنی ذلت اور حقارت کا نازل کرنا کیونکہ استہزا کرنے والے کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر کرنا ہوتا ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ مجازاً استہزا سے مراد تحقیر اور ذلت کا وارد کرنا ہے۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ استہزا ایسے طریق پر تحقیر کرنے کو کہتے ہیں جس پر ہنسی آجائے۔ بیضاوی میں ہے کہ استہزاء کی اصل ھزء ہے جس کے معنی خفت ہیں اور یہ معنی سرعت سے ماخوذ ہیں جس معنی میں یہ لفظ آتا ہے گویا استہزاء کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر ہے اور ہنسنا ایک ذریعہ ہے جس سے وہ تحقیر کی جاتی ہے محض ہنسنا جس کی غرض دوسرے کی تحقیر نہ ہو استہزاء نہیں کہلاتا ÷

ایک ہی لفظ کے اللہ تعالیٰ اور انسان پر بولنے کے مفہوم میں فرق

اب یہ ایک اصول کے طور پر یاد رکھنا چاہئے کہ جب کسی فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے تو وہی لفظ بولا جاتا ہے جو انسان کے لئے۔ مگر یہ فرق ہمیشہ ہوتا ہے کہ انسان چونکہ ہر فعل میں آلوں اور ذریعوں کا محتاج ہے اور خدا نہیں اس لئے اس لفظ میں جو آلہ یا ذریعہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوتا صرف فعل کی آخری غرض مقصود ہوتی ہے مثلاً انسان دیکھتا ہے تو آنکھ اور روشنی کا محتاج ہوتا ہے مگر جب کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے تو آنکھ اور روشنی جو ذریعہ انسان کے دیکھنے کا ہیں وہ مراد نہیں ہوں گے صرف جو غرض دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی۔ ایسا ہی انسان سننے میں کان اور ہوا کا محتاج ہے مگر اللہ تعالیٰ کے سننے میں یہ ذریعہ مفقود ہوگا اور اصل غرض جو سننے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی ۔ ایسا ہی انسان کا رحم یا غضب اس کے قلب پر خاص حالت کے وارد ہونے کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر خدا کا رحم اور غضب صرف نتیجہ کا نام ہے

اللہ کا استہزا

یہی صورت استہزاء کے متعلق ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا تو ہنسنا جو ذریعہ تھا وہ مفقود ہو گیا۔ اور ذلیل کرنا جو اصل غرض تھی وہ باقی رہ گئی پس اللہ تعالیٰ کا استہزا صرف ذلیل کرنے کا نام ہے نہ ہنسنے کا ÷

کسی فعل پر سزا کا ذکر انہی الفاظ میں

عربی زبان میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ کسی کے ایک فعل پر جو سزا دی جائے اس کو اسی فعل کے الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ جب ایک فقرہ جواب کے طور پر ہو تو اس سے مراد فی الواقع وہ فعل نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے کسی فعل کی سزا ہوتی ہے۔ خود قرآن شریف میں اسکی مثالیں ہیں جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا (الشوریٰ ۴۲-۴۰) حالانکہ سزا فی الواقع بدی نہیں فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ (۲-۱۹۴) حالانکہ دوسرے اعتداء سے مراد صرف سزا ہے نہ فی الواقع زیادتی۔ امام راغب نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے اور ایسا ہی لسان العرب میں ہے یہی لفظ کو سزا کیلئے

سزا کا فلسفہ

استعمال کرنے میں سزا کے فلسفہ کی طرف اشارہ ہے کہ اسکو ضرورت جائز کرتی ہے پس یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ ان کو ان کے استہزا کی سزا دیگا ÷

مد

۲۸۔ یمد۔ مد کے اصل معنی جر یعنی کھینچنا یا بسط یعنی پھیلانا ہیں جیسے لا تمدن عینیک (طٰہٰ ۲۰-۱۳۱) کیف مد الظل (الفرقان ۲۵-۴۵) پھر اس کے

۱۶ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَ

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی خریدلی سو ان کی تجارت فائدہ مند نہ ہوئی اور

۱۷ مَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ

نہ ہی وہ ہدایت پانے والے ہوئے ۲۹ ان کی مثال ایسی ہے جیسے اس شخص کی مثال جس نے آگ جلائی پھر جب اس

مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ۝

(آگ) نے جو کچھ اس کے اردگرد تھا روشن کردیا اللہ ان کے نور کو لے گیا اور ان کو سخت تاریکی میں چھوڑ دیا وہ کچھ نہیں دیکھتے ۳۰

معنی امہال یعنی مہلت دینا بھی آتے ہیں (ت) اور مدد کرنا بھی یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔ جب ایک انسان سرکشی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو اسی حالت میں چھوڑ دیتا ہے۔ جیسا جو شخص گمراہی اختیار کرے اسے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔ وہ کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ ابن مسعود اور دیگر صحابہ سے یہی معنی مروی ہیں واقعات بھی اسی معنی کے مؤید ہیں کیونکہ منافقوں کو سزا آنحضرت صلعم کے آخری ایام میں غزوہ تبوک کے بعد دی گئی ۔

طغیان — طغیان۔ طغی سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں نافرمانی میں حد سے گزر جانا (غ)

عمه — یعمھون۔ عمه کے معنی ہیں حیرانی کی وجہ سے کسی امر میں متردد ہونا۔ یہ لفظ صرف رائے کے متعلق استعمال ہوتا ہے

عمه اور عمی میں فرق — اور عمی یعنی اندھاپن ظاہری نابینائی اور رائے کی نابینائی دونوں پر استعمال ہوتا ہے ۔

اشتراء۔ بیع — ۲۹ اشتروا۔ شری سے ہے۔ عموماً شراء کے معنی خریدنا اور بیع کے معنی بیچنا آتے ہیں یعنی اول میں قیمت دینا اور چیز لینا اور دوئم میں چیز دینا اور قیمت لینا ہے لیکن جب چیز کے عوض چیز لی جائے تو دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں اس لئے اشتراء ہر معاملہ پر بولا جاتا ہے جس سے کچھ حاصل ہو (غ)

منافقوں کا انجام — ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لینا یہ ہے کہ ہدایت جو ان کے پاس آئی تھی اس کو رد کردیا اور اس کی جگہ گمراہی اختیار کرلی

ربح — پھر اس کو ایک تجارت قرار دیکر فرمایا فما ربحت تجارتھم۔ ربح اس فائدہ کو کہا جاتا ہے جو تجارت سے ملے جس فائدہ کو انہوں نے مدنظر رکھا تھا وہ دنیوی منفعت تھی مگر وہ بھی ان کو نہ ملی وما کانوا مھتدین اور ہدایت بھی نہ لی یعنی دنیا بھی ہاتھ سے گئی اور دین بھی برباد ہوا۔ یہ ایک پیشگوئی کے رنگ میں کہا گیا تھا کہ جس دنیا کی خاطر دین کو چھوڑتے ہیں وہ بھی انہیں نہ ملیگی اور ایسا ہی حال منافقوں کا ہوا ۔

مثل — ع ۳۰ مَثَل۔ مَثَل سے مراد کسی چیز کے متعلق کوئی بیان ہے جو کسی دوسری ملتی جلتی چیز کے بیان سے مشابہت رکھتا ہے تاکہ ان میں سے ایک دوسرے کو واضح کردے (غ)

ظلمة۔ ظلمات — ظلمات۔ ظلمة کی جمع ہے جو روشنی کے نہ ہونے کا نام ہے۔ یہ لفظ عموماً جمع میں لایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ تاریکیاں بہت قسم کی ہیں۔ جیسے جہالت۔ توہم وغیرہ یا شدت ظلمت مراد ہے ۔

آگ جلانے کی مثال — دو مثالیں بیان کی ہیں ایک اس آیت میں دوسری آیت (۱۹) میں۔ دونوں مثالیں بحیثیت کلی ہیں یعنی پہلی مثال میں آگ جلانے والا منافق نہیں بلکہ رسول ہے جیسا دوسری مثال میں بارش کی تشبیہ منافقت سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ہے۔ بخاری میں ہے مثلی کمثل رجل استوقد نارا یعنی نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ میری مثال اس شخص کی مثال ہے کہ اس نے آگ جلائی پس اس مثال کا ماحصل یہ ہے کہ رسول نے ایک آگ روشن کی جس کے ساتھ نور پیدا ہوا اور چیزیں نظر آنے لگیں۔ مگر منافقوں کی حالت یہ ہے کہ

صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡیٌ فَهُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ۝ اَوۡ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیۡهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعۡدٌ وَّبَرۡقٌ ۚ ۱۸ ۱۹

بہرے گونگے اندھے ہیں پس رجوع نہیں کرتے ۳۰ یا جیسے مینہ (جو) بادل سے (برسا) اس میں سخت تاریکی اور کڑک اور بجلی ہے

یَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِیۡطٌۢ بِالۡكٰفِرِیۡنَ ۝

ہولناک آوازوں سے اپنی انگلیاں موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں دیتے ہیں اور اللہ کافروں کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۳۱

انہوں نے وہ طاقت جس کے ساتھ انسان دیکھتا ہے۔ گنوادی۔ کیونکہ دیکھنے کے لئے دو نوروں کی ضرورت ہے۔ ایک انسان کے اندر کی روشنی۔ اور دوسری بیرونی روشنی سو جب وہ اندر کا نور رہا تا رہا تو ان کے لئے بیرونی روشنی بھی جو رسول نے روشن کی تھی کچھ فائدہ مند نہ ہوئی روشنی اسی کو فائدہ دے سکتی ہے جس کے اندر بھی نور رہو +

صم۔ بکم۔ عمی — ۳۰ صُمّ۔ اَصَمّ کی جمع ہے۔ بہرا بُکم آبکم کی جمع ہے۔ گونگا۔ عُمیٌ اَعمیٰ کی جمع ہے۔ اندھا۔ مجازی معنی مراد ہیں یعنی کلمہ حق سنتے نہیں نہ کہتے ہیں نشانات صداقت دیکھتے نہیں۔ یہ شدید نفاق والے ہیں جو حق کی شنوائی اور بینائی سے ہی محروم ہو چکے ہیں۔ یا منافقوں کے سردار ہیں اور دوسری مثال والے ان کے پیرو ہیں یا وہ جن کا نفاق محض بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے ہے +

صواب صیب — ۳۱ صیّب۔ صَوب سے مشتق ہے صَواب وہ امر ہے جو فی ذاتہ پسندیدہ ہو اور صَوب یا صیّب بارش کو کہتے ہیں جب وہ ایسے اندازے پر برسے جو موجب نفع ہو اور صیّب ایسے بادل کو بھی کہتے ہیں (غ)

سماء — السماء۔ سماء ہر چیز کا اس کا اوپر کا حصہ ہے (غ) اس لئے محض بلندی پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور سماء مینہ کو بھی کہتے ہیں جب تک زمین پر نہ آجائے اور سماء کے معنی سحاب یعنی بادل بھی ہیں السماء السحاب (ل)

صاعقۃ — الصواعق۔ صاعقۃ کی جمع ہے۔ جو صعق سے ہے۔ اور صاعقۃ اس ہولناک آواز کو کہتے ہیں جو گرج سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے مراد بعض وقت موت یا عذاب بھی ہوتا ہے۔ مگر امام راغب کہتے ہیں کہ یہ چیزیں اس کی تاثیرات میں سے ہیں۔ پس اصل معنی اس کے ہولناک آواز کے ہی ہیں اور زلزلہ کے ساتھ یا آندھی میں جو ہولناک آواز آتی ہے اس پر بھی قرآن شریف میں اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے +

بارش کی مثال — اس تمثیل میں صیب یا رحمت کی بارش سے مراد وحی الٰہی ہے۔ اندھیرے سے مراد وہ مشکلات ہیں جو وحی الٰہی کے قبول کرنے میں پیش آتی ہیں۔ کڑک سے مراد بعض خوفناک امور ہیں جیسے مثلاً دشمنوں کے حملے جن سے کمزور دل خائف ہو جاتے ہیں۔ چمک سے مراد وہ کامیابیاں ہیں جو مطلع کو روشن کر دیتی ہیں۔ یہ دوسری قسم کے منافق ہیں جو بالکل اپنی روشنی نہیں کھو چکے مگر ان کے اندر کچھ کمزوری ہے۔ کوئی مشکلات سامنے آجاتی ہیں تو فوراً گھبرا جاتے ہیں۔ دشمن کی طرف سے کچھ تیاری دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ بس اب مارے گئے۔ دوسری جگہ آتا ہے یحسبون کل صیحۃ علیہم (المنافقون ۶۳-۴) اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کا احاطہ کئے ہوئے ہے تو اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ مسلمانوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے +

۲۰ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ
قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لے جائے جب کبھی وہ ان کو روشنی دیتی ہے اس میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر تاریکی ہو جاتی

عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ⑳
ہے ٹھہر جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ضرور ان کی شنوائی اور ان کی آنکھوں کو لے جاتا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۲

۳۲ لَوْ بعض وقت محض حرف شرط کا کام دیتا ہے۔ یہاں بھی محض اگر کے معنی میں ہے ◆

لَوْ

شاء۔ مشیئۃ اور ارادہ بعض کے نزدیک یکساں ہیں مگر بعض کے نزدیک مشیت کسی چیز کو وجود میں لانے کا نام ہے اور اللہ کی مشیت ایجاد شے ہی ہے اور انسان کی مشیت اصابۃ الشیٔ ہے یعنی ارادہ کے ہم معنی۔ اسی معنی کی رو سے درست ہے جو کہا گیا ما شاء اللّٰہ کان جو اللہ چاہتا ہے ہوتا ہے پس اللہ کی مشیت وجود شے کی مقتضی ہے (غ)

شاء۔ مشیئۃ

شیٔ بعض کے نزدیک شیٔ وہ چیز ہے جو جانی جائے اور جس کی خبر دی جائے (ر) اور شیٔ اصل میں شاء کا مصدر ہے جو بمعنی مفعول ہے یعنی چاہی گئی چیز ◆

شیٔ

قدیر قدرۃ سے ہے اور جب یہ انسان کی صفت ہو۔ تو مراد اس سے ایسی حالت ہے جس میں انسان کسی چیز کے کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو مراد اس سے ہر قسم کے عجز یا کمزوری کی نفی ہوتی ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کے قدرت مطلقہ کا لفظ دوسرے پر بولا نہیں جا سکتا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلاں امر پر قادر ہے اور قدیر کے معنی ہیں الفاعل لما یشاء علی قدر ما تقتضی الحکمۃ لا زائدا علیہ ولا ناقصا عنہ یعنی کرنے والا اس کا جسے وہ چاہے اس اندازے پر جو حکمت کا اقتضا ہے نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم (غ)

قدرۃ
قادر۔ قدیر

پچھلی آیت میں جب یہ بیان کیا کہ کافر اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اسلام کامیاب ہو گا تو اب بتایا کہ اسلام کی کامیابیاں تو ایسی ہوں گی کہ آنکھوں کو چندھیا دیں گی۔ مگر منافقوں کی حالت یہ ہے کہ جب کوئی کامیابی دیکھتے ہیں تو کچھ قدم آگے اٹھانا چاہتے ہیں لیکن پھر مشکلات نظر آتی ہیں پھر ٹھہر جاتے ہیں۔ یہی حالت منافقوں کی تاریخی واقعات سے نظر آتی ہے کامیابی دیکھتے تو مسلمانوں کے ساتھ ملاپ زیادہ ظاہر کرتے تکلیف دیکھتے تو طرح طرح کی باتیں اسلام کے خلاف بنانے لگتے۔ ان کی روشنی پہلی مثال کے منافقوں کی طرح بکلی نہیں جاتی رہی۔ اس لئے یہ آخر کار راہ راست پر آجائیں گے ◆

کمزور دل منافق

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تمام صفات جو اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ اس کی مخلوق کی بھی صفات ہیں۔ مگر مخلوق کبھی کامل طور پر کسی اللہ تعالیٰ کی صفت میں شریک نہیں ہو سکتی کیونکہ اشتراک کامل سے شرک پیدا ہوتا ہے۔ مخلوق میں وہ صفات ناقص طور پر موجود ہیں۔ اور خالق میں کامل طور پر۔ مثلاً انسان میں بھی سننے کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ میں بھی اور انسان میں دیکھنے کی صفت ہے اللہ تعالیٰ میں بھی مگر انسان کے سننے اور دیکھنے کو اللہ تعالیٰ کے سننے اور دیکھنے سے کوئی نسبت نہیں۔ اسی طرح انسان میں بھی قدرت ہے مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے وہ ہیچ ہے۔ انسان میں بھی مشیت ہے مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اس پر غالب ہے انسان کی صفات ایک تنگ اور محدود دائرہ میں کام کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات تمام حد بندیوں اور تمام قیود سے پاک ہیں۔ یہ ایک اصول ہے جو صفات الٰہی کے سمجھنے میں بڑا کام دیتا ہے۔ ہم جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت کے ماتحت ہیں اسی طرح اس کی مشیت کے بھی ماتحت ہیں۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت نہ ہوں تو ہماری مشیت بھی اس کی مشیت کی طرح کامل ہو گی اور یہ شرک ہے ◆

صفات الٰہی و صفات مخلوق میں کامل و ناقص کا مابہ الامتیاز

خدا کی مشیت انسان کی مشیت پر غالب ہے

ع ۳ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۲۱

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور انہیں جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بنو ۳۳

توحید پر دلائل

قادر مطلق پر اعتراض اور اس کا جواب

اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس پر یہ اعتراض آریہ سماج کی طرف سے ہوا ہے کہ پھر وہ اپنے جیسا قادر مطلق خدا بنا سکتا ہے یا نہیں؟ اپنی مملکت سے کسی کو خارج کر سکتا ہے یا نہیں؟ یہ امور اس کی صفات کاملہ کے خلاف ہیں۔ اس لئے وہ ایسا نہیں کرتا۔ قدرت کا سوال ہی اس بات پر آتا ہے جو اس کی صفات کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ فلاں شخص اتنا امیر ہے کہ وہ جو چاہے کھائے اور جو چاہے پہنے تو یہ ایک احمقانہ سوال ہوگا کہ کیا وہ غلاظت کھا سکتا ہے یا گندے چیتھڑے پہن سکتا ہے علاوہ ازیں لفظ شئ کو اختیار کرکے قرآن شریف نے خود بتا دیا کہ اس کی قدرت ان چیزوں پر ہے جو وہ چاہتا ہے یعنی جو اس کی صفات کے تقاضا کے خلاف نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ دوسرے قادر مطلق خدا کا ہونا یا اس کی مملکت سے باہر کسی اور مملکت کا ہونا اس کی صفات کے تقاضا کے خلاف ہے اور اس لئے شئ کا اطلاق ہی اس پر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ آج سے سینکڑوں سال پیشتر جبکہ ان اعتراضات کا نام و نشان نہ تھا اس وقت بھی قدیر کے معنی ائمہ لغت نے یہی کئے کہ اس چیز کا کرنے والا جسے وہ چاہے اور اس انداز پر جو اقتضائے حکمت کے مطابق ہو نہ اس سے زیادہ ہوا ور نہ کم پس خود لغت ہی ان اعتراضات کا فیصلہ کرنے کیلئے کافی ہے

خلق

۳۳ خلق۔ خَلق کے اصل معنی التقدیر المستقیم ہیں یعنی صحیح اندازہ اور اس کا استعمال دو طرح پر ہے ایک فی ابداع الشئ من غیر اصل و لا احتذاء یعنی ایک چیز کا بالکل نیا وجود میں لانا جس کی نہ کوئی اصل ہے اور نہ کوئی نمونہ ہے جیسے فرمایا خلق السمٰوٰت والارض کیونکہ دوسری جگہ فرمایا ہے بدیع السمٰوٰت والارض (جس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ خلق ہے جو بغیر مادہ اور آلہ کے ہے) اور دوسرا۔ ایک چیز سے دوسری چیز کے وجود میں لانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے

خدا نیستی سے ہستی کرتا ہے

جیسے خلق الانسان من نطفۃ اور وہ خلق جو بمعنی اِبداع ہے یعنی نیستی سے ہستی کرنا وہ صرف اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص ہے۔ پس معلوم ہوا کہ لفظ خلق کا استعمال زبان عرب میں دونوں طرح پر ہے نیستی سے ہستی کرنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور ایک چیز سے دوسری چیز کے بنانے پر بھی چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو خالق کل شئ بھی کہا ہے اس لئے جہاں تک بھی یہ سلسلہ چلایا جائے کہ فلاں چیز فلاں سے بنی اور فلاں فلاں سے آخر جہاں تک علم انسانی پہنچ سکتا ہے اس کا خالق بھی وہی ہے پس وہ نیستی سے ہستی کرنے والا ہوا +

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عظمت کا ذکر ہے اور انسان کو اس عظمت کے سامنے سر جھکانے کا حکم ہے اور اس سے اگلے رکوع میں انسان کے مقام بلند کا ذکر ہے کہ اس کو کس قدر تسلط کائنات پر حاصل ہے بتایا کہ خدا کے آگے عاجزی اختیار کرکے وہ سب کائنات پر حکمراں ہوتا ہے +

عبادت و اطاعت میں فرق۔

سب سے پہلا حکم جو قرآن کریم میں دیا جاتا ہے وہ اللہ کی عبادت کرنا ہے یعنی اپنے قویٰ کو اس کی فرمانبرداری میں لگا دینا اس طرح پر کہ انسان کی عالت خضوع کی ہو۔ اطاعت کے لئے خضوع ضروری نہیں عبادت کے لئے ہے اس لئے اطاعت دوسروں کی بھی ہو سکتی ہے مگر عبادت سوائے اللہ کے اور کسی کی جائز نہیں پھر انسان کے وہ تمام کام جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہوں عبادت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ حفاظت دین کے لئے صحابہ کا جنگیں کرنا بھی عبادت میں داخل تھا +

خلق سے توحید الٰہی پر دلیل

جو پیدا کرنے والا ہے عبادت اسی کی ہونی چاہیئے نہ اس کے غیر کی اور سب مذاہب کا اتفاق ہے کہ پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے پس اس میں توحید الٰہی پر بھی دلیل ہے +

۲۲ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
وہ جس نے زمین کو تمہارے لئے قرارگاہ بنایا اور آسمان کو (بڑی) عمارت ۳۴ اور اوپر سے پانی اُتارا

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ؁
پھر اس کے ساتھ تمہارے لئے پھلوں سے رزق نکالا ۳۵ پس تم اللہ کے لئے ہمسر نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو ۳۶

عبادت سے حصول کمال

ربّ کی عبادت کرو۔ اور ربّ وہ ہے جو انسان کو اس کے کمالِ حقیقی تک اور اس کی پیدائش کی علت غائی کے حصول تک پہنچاتا ہے۔ اس کی عبادت کے حکم میں اشارہ یہ ہے کہ بدون عبادت الٰہی تم اس کمال کو حاصل نہیں کرسکتے۔ اور یہ کہ ایک اللہ کی عبادت ہی کمالات کے حصول تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس کا نتیجہ تتقون فرمایا اور اتقاء ضرررساں اشیاء سے بچنا یا حقوق کی نگہداشت کرنا ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے وہ کمال انسانی کو پہنچنا تو ایک طرف رہا حقوق انسانی کی بھی پوری نگہداشت نہیں کرسکتے۔ آج یورپ کی اقوام کیوں آدمی نسل انسانی کے حقوق کو پامال کر رہی ہیں اس لئے کہ خدا کی عبادت نہیں کرتیں۔ بلکہ سونے کی اور حکومت کی پرستش کرتی ہیں۔

فراش

۳۴ فِراش کے معنی مفروش یا پھیلائی ہوئی چیز ہیں کیونکہ فرش کے معنی بسط یا پھیلانا ہیں۔ راغب کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ ایسا بنایا جس پر انسان قرار پکڑ سکتا ہے۔

بناء

بناء بمعنی مَبْنِی یا بنائی گئی چیز کے ہے (غ) یعنی عمارت تنکیر عظمت کے لئے ہے۔

خلق سے دلیل

اگر خلقِ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت پر دال ہے تو زمین و آسمان کی بناوٹ اس عظمت کا اور بھی بلند احساس پیدا کرتی ہے بعض نے بناء کے معنی ڈیرہ یا خیمہ کئے ہیں۔ اس صورت میں ظاہری تشبیہ مراد ہے اور آسمان کو عمارت کہنے سے یہ مراد ہے کہ سب کچھ ایک نظم کے ماتحت ہے جیسے عمارت میں ایک ترتیب ہوتی ہے اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اس کے بنانے والی ایک مدبر بالارادہ ہستی ہے۔ زمین کے فراش یا بچھا یا ہوا ہونے یا انسان کی قرارگاہ ہونے میں اس کی کرویت کے خلاف کوئی دلیل نہیں۔

نظارۂ قدرت اور فطرت انسانی کا مقابلہ

۳۵ آسمان سے پانی کا برسنا اور اس کے ساتھ زمین سے پھلوں کا نکلنا۔ اس میں بتایا کہ زمین جو پستی کا مظہر ہے آسمان سے جو بلندی کا مظہر ہے کس طرح فائدہ اٹھاتی ہے اسی طرح جب انسان اپنے آپ کو عبادت میں لگا کر پستی کا مظہر بناتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے اور فطرت انسانی کی مخفی قوتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں گویا جو کچھ نظارہ قدرت میں نظر آتا ہے وہی فطرت انسانی میں موجود ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جب تک وحی الٰہی سے بندوں کو ہدایت نہ ملے جو اوپر کے پانی سے مشابہت رکھتی ہے اندرونی استعدادیں دبی کی دبی رہ جاتی ہیں۔ اسی تعلق کے لحاظ سے اگلی آیت میں کھول کر وحی الٰہی کا ذکر کیا ہے۔

انداد

۳۶ انداد۔ نِدّ کی جمع ہے اور نِدّ کسی چیز کا وہ ہے جو اس کے جوہر یعنی اصل میں شریک ہو (غ) یا اس کی مثل اور اس کی ضد ہو (ت)

شرک فی العبادت ہے شرک فی الذات

عبادت یا دیگر امور میں دوسروں کو شریک کرنا ان کو اللہ کی ذات میں ہی شریک کرنا ہے کسی شخص نے آنحضرت صلعم کے سامنے کہہ دیا تھا ما شاء اللہ و شئت جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں آپ نے فرمایا اجعلتنی للہ ندا کیا تم مجھے اللہ کا شریک کرتے ہو صرف ما شاء اللہ کہو کیونکہ اسی کی مشیت سب مشیتوں پر غالب ہے اور یہ جو فرمایا کہ تم جانتے ہو تو مراد یہ ہے کہ اس بات کو جانتے ہو کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے یہ بت وغیرہ نہیں ہیں پھر بتوں کو پرستش میں شریک کرتے ہو اور ایک اصول کو مان کر خود اس کے خلاف چلتے ہو۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا ۲۳

اور اگر تمہیں اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندہ پر اُتارا ہے تو ایک سورت اس جیسی لے آؤ اور اللہ کو

شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا ۲۴

چھوڑ کر اپنے مددگاروں کو بلا لو اگر تم سچے ہو ۳۷ے پھر اگر تم نے (ایسا) نہ کیا اور ہرگز نہ کر سکو گے

سورۃ ۳۷ے سورۃ - سورۃ اصل میں بلند منزل یا بلند مقام کو کہتے ہیں (غ) اور سُور شہر کی فصیل کو کہتے ہیں - قرآن کریم کی سورت کو سورت یا تو اس لئے کہا کہ اس کا مقام بلند ہے اور یا اس لئے کہ جس طرح فصیل شہر کا احاطہ کرتی ہے اسی طرح سورت مضامین کا احاطہ کرتی ہے (غ) اور ہر سورت بجائے خود ایک کامل کتاب ہے - اور عرف میں قرآن کریم کا ایک حصہ ہے جو دوسرے حصوں سے بسم اللہ کے ذریعہ ممیز ہو قرآن کریم میں کل ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ اسی مادہ سے قرآن کریم میں

اساور تسوروا اساور کڑوں کے معنی میں اور تسوّروا انہوں نے دیوار پھاندی کے معنی میں آئے ہیں +

شہود۔شہادت شھداء - شہید کی جمع ہے اور شہود اور شہادت حاضر ہونا ہے دیکھنے کے ساتھ - آنکھ سے ہو یا بصیرت سے

شہید صفات باری میں اور کبھی محض حاضر ہونے کو بھی کہتے ہیں لفظ شہید مختلف معنی میں آیا ہے اللہ کی صفات میں بھی شہید ہے اور یہ بلحاظ اپنے کمال کے ہے یعنی وہ جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہیں (ت) یا العلیم محض علم کے لحاظ سے ہے اور الخبیر امور باطنی کے لحاظ سے

شہید کون کون ہیں اور الشہید امور ظاہری کے لحاظ سے - انبیاء کو اپنی اپنی اُمتوں پر شہید کہا گیا ہے - کیونکہ جس قدر زیادہ کوئی شخص فضیلت رکھتا ہے اسی قدر زیادہ شہادت دینے کا اہل ہے جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں ان کو بھی شہید کہا گیا ہے اور بالآخر اسے بھی جو اللہ کی راہ میں مارا جائے بلکہ حدیث میں جلے ہوئے - مبطون - غرق وغیرہ کو بھی شہید کہا گیا ہے - یہاں شہداء کے معنی مختلف روایات ہیں بعض کے نزدیک مددگار مراد ہیں بعض نے معبودان باطل بعض نے حکام الفصحاء مراد لئے ہیں اور بعض کے نزدیک ائمہ یعنی پیشرو مراد ہیں +

راز توحید وحی نے کھولا ہے توحید الٰہی کا اصل راز وحی الٰہی نے ہی کھولا ہے - اس لئے پچھلی آیت میں وحی الٰہی کی طرف اشارہ کر کے اب اس کامل وحی کا ذکر کرتا ہے جس نے محمد رسول اللہ صلعم پر نازل ہو کر حقیقی توحید کی راہ دنیا کو دکھائی - اس آیت میں قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے

قرآن کی مثل کا مطالبہ پر یہ دلیل دی ہے کہ یہ ایک بے نظیر کتاب ہے جس کی مثل کوئی نہیں بنا سکتا - یہ دعویٰ قرآن مجید میں کئی جگہ ہے کہیں اس رنگ میں کہ اس قرآن کی مثل لاؤ کہیں یوں کہ دس سورتیں اس کی مثل بنا کر دکھاؤ اور آخری اور اقل مطالبہ یہ ہے کہ ایک ہی سورت اس کی

مثل تین باتوں میں ہے مثل بنا کر لے آؤ - یہ تصریح نہیں کہ کس بارہ میں مثل ہو ایک کتاب یا کلام کا بے مثل ہونا تین باتوں میں ہو سکتا ہے الفاظ کی ظاہری بندش کے لحاظ

فصاحت وبلاغت و تاثیر سے کمال و جامعیت مضامین اور اس اثر کے لحاظ سے جو اس کلام سے پیدا ہو - فصاحت و بلاغت میں قرآن کریم کا بے مثل ہونا خود اس سے ظاہر ہے کہ یہ زبان عربی میں فصاحت و بلاغت کا معیار مانا جاتا ہے حالانکہ اس وقت نازل ہوا جب عربی زبان میں نثر کا رواج نہ تھا - بلحاظ

جامعیت مضامین قرآن کمال مضامین یہ حالت ہے کہ نہ صرف تمام مذاہب کے اصول باطلہ کی تردید کرتا اور اصول حقہ کو کھول کر بیان کرتا ہے بلکہ تمدن اور معاشرت اور سیاست کے اصول کو بھی بیان کرتا ہے پھر جس بات کا دعویٰ کرتا ہے اس کے دلائل بھی ساتھ دیتا ہے - بلحاظ جامعیت مضامین چھوٹی

ہر سورت کتاب کے حکم میں سے چھوٹی سورت بھی اپنے اندر یہ کمال رکھتی ہے کہ ایک خاص مضمون کو کمال تک پہنچاتی ہو - اور ایک کتاب کا حکم رکھتی ہے مگر سب سے واضح معیار مثل ہونے یا نہ ہونے کا یہ ہے کہ جو کام اس کتاب نے کر کے دکھایا ہے وہ دوسری کسی کتاب نے کر کے نہیں دکھایا - اور چونکہ

ہدایت شیئے بے مثل کی اس سورت کی ابتدا اس دعویٰ سے کی تھی کہ یہ کتاب ہدایت ہے - پس اسی میں بے مثل ہونے کا بھی دعویٰ کیا یعنی کوئی ایسی کتاب بنا لو جو

۲۵ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾ وَ

تو اس آگ سے اپنا بچاؤ کرلو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں یہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے ۳۸ اور

بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ

ان لوگوں کو خوشخبری دیدو جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں کہ ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ۳۹

لاؤ جو دنیا کے لئے اسی طرح موجب ہدایت بنی ہو۔ قرآن کریم نے جو انقلاب دنیا میں پیدا کیا اور جس طرح نہایت پستی کی حالت سے ایک قوم کو اٹھا کر اوج کمال تک پہنچایا اس کے متعلق دنیا کو اعتراف ہے کہ ایسا کام کسی اور کتاب نے کرکے نہیں دکھایا +

۳۸۔ یہاں پیشگوئی کی ہے کہ اس کتاب کی مثل کبھی کوئی نہ بنا سکے گا۔ اور اس کی صداقت آج آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہے۔ باوجود ایسی کھلی دلیل کے جو شخص توحید کو چھوڑتا اور بت پرستی اختیار کرتا ہے۔ اس کا انجام آگ ہے۔ یہاں دوزخ کی آگ کے متعلق فرمایا کہ اس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ گویا شرک یا بت پرستی سے ہی یہ پیدا ہوتی ہے اور سارے گناہ شرک کی ہی فروع ہیں۔ جس طرح ساری نیکیوں کی جڑ توحید ہے۔ پتھروں سے مراد یہاں معبود ان باطل ہیں یا جیسا کہ امام راغب نے ایک قول نقل کیا ہے مراد ایسے لوگ ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سخت دل ہیں جیسے پتھر اسی کی طرف فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ (۲: ۷۴) میں اشارہ ہے۔ اور عربی میں بڑے ہیبتناک آدمی کو بھی حجر کہا جاتا ہے جس پر دوسرے کی بات کا اثر نہ ہو پس ہو سکتا ہے کہ یہاں الحجارۃ سے مراد وہ قسی القلب لوگ ہوں جو ختم اللہ علی قلوبہم کے مصداق ہیں۔ اور الناس سے مراد عام لوگ۔ لوگوں کا دوزخ کا ایندھن ہونا بتاتا ہے کہ دوزخ انسان کے ہی اعمال کا نتیجہ ہے حتیٰ کہ اس کا ایندھن یعنی جس سے یہ آگ جلتی ہے خود انسان ہیں کچھ اور نہیں +

پتھر کس معنی میں دوزخ کا ایندھن ہیں۔

حجارۃ

اعدت للکافرین میں بتایا کہ وہ کفر سے ہی تیار ہوتی ہے۔ مسلمان میں جس قدر حصہ کفر کا ہے اسی قدر اس کے لئے دوزخ ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہ اور تابعین اس بات کے قائل ہیں کہ دوزخ پر آخر فنا آجائے گی جیسا کہ ابن تیمیہ نے یہ قول ایک جماعت سے نقل کیا ہے کیونکہ روایات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ پر ایک ایسا زمانہ آئیگا جب اس میں کوئی نہ رہیگا پس جب کوئی انسان اس میں نہ رہا اور اس کا ایندھن ختم ہو گیا تو وہ آگ بھی فنا ہو جائے گی۔ اس پر مفصل بحث سورہ ہود میں آئے گی +

دوزخ پر فنا

۳۹۔ جنات۔ جنۃ کی جمع ہے جو جن سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا حواس ظاہری سے مخفی رکھنا (غ) اور جنۃ اس باغ کو کہتے ہیں جس کے درختوں نے اس کی زمین کو ڈھانک لیا ہو (غ) لفظ جنت صرف باغ کے معنی میں بھی قرآن شریف میں آیا ہے۔ اور بہشت کو بھی جنۃ کہا ہے۔ یا تو اس لئے کہ اس کو دنیا کے باغوں سے تشبیہ دی ہے (غ) اور بہشت کا نقشہ جو قرآن کریم نے کھینچا ہے وہ گویا بطور مثال ہے جیسا کہ خود الفاظ قرآنی مثل الجنۃ التی وعد المتقون (الرعد ۱۳: ۳۵ – محمد ۴۷: ۱۵) سے بھی ظاہر ہے۔ اور یا اس لئے کہ جنت کی نعمتیں انسان کے حواس ظاہری سے مخفی رکھی گئی ہیں (غ) جیسا کہ لفظ جن کے اصل معنی بتاتے ہیں۔ اور قرآن کریم نے اس اخفا کو دوسری جگہ خود بیان فرمایا ہے فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین (السجدۃ ۳۲: ۱۷) +

جن۔ جنۃ

الانہار۔ نہر کی جمع ہے یعنی وہ مقام جہاں سے پانی بافراط بہتا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک مثال کے طور پر بیان فرمایا ہے اس کے لئے جو جنت میں لوگوں کو اس کے فیض اور فضل سے بافراط ملیگا۔ اور تجری من تحتہا الانہار میں اور ان المتقین فی جنات ونہر میں ان کے نزدیک یہی مراد ہے +

نہر۔ انہار جنت

جب آگ کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ یہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے تو اس کے مقابل پر مومنوں کا اور ان کی آئندہ حالت کا ذکر کیا اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے۔ اس کے احکام کی فرمانبرداری سے بجائے آگ کے باغ اور نہریں بنتی ہیں +

ربط

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَ

جب کبھی ان کو ان میں سے کوئی پھل رزق دیا جائے گا۔ کہینگے یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے دیا گیا اور

أُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

انہیں ملتا جلتا رزق دیا جائیگا اور ان کے لئے ان میں پاک ساتھی ہونگے اور وہ انہی میں رہیں گے ۱۳۹

بہشت کے باغ اور نہریں قرآن کریم نے بہشتی زندگی کا نقشہ بسا اوقات ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ وہ جنات یعنی باغوں میں ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یا کہیں فرمایا کہ وہ باغوں میں اور نہر میں ہوں گے۔ اس سے کیا مراد ہے پہلی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ آیندہ زندگی کے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے وہ محض بطور تمثال بیان ہوا ہے۔ اور مثل الجنة التي وعد المتقون (محمد ۱۵، الرعد ۳۵) میں یہ صراحت موجود ہے اور ابن عباس سے ابن کثیر میں روایت موجود ہے لا یشبه شئ مما في الجنة ما في الدنيا الا في الاسماء یعنی جو چیزیں جنت میں ہیں وہ دنیا کی کسی چیز سے سوائے نام کے مشابہت نہیں رکھتیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جنت کی نعماء انسان کی اس آنکھ سے اور اس کے ظاہری حواس سے مخفی رکھی گئی ہیں۔ اس پر اول تو خود لفظ جنت کے معنی سے شہادت ملتی ہے جیسا اوپر بیان ہوا۔ پھر قرآن شریف میں صراحت سے ہے فلا تعلم نفس ما اخفي لهم من قرة اعين (السجدة ۳۲-۱۷) یعنی کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کے لئے کیا آنکھوں کی ٹھنڈک یعنی نعمت مخفی رکھی گئی ہے اور حدیث صحیح میں اس سے بھی زیادہ صراحت ہے جہاں اسی آیت کی تفسیر میں آنحضرت صلعم نے فرمایا قال الله اعددت لعبادي الصالحين ما لا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر (بخاری)۔ اللہ فرماتا ہے میں نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ کچھ تیار کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا اور نہ کسی بشر کے دل پر وہ گزرا۔ جنت کی نعماء کا جہاں ذکر ہو اس میں ان دونوں باتوں کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ فی الواقع جنات سے مراد ایسے باغ تو نہیں جیسے یہاں ہیں اور نہ نہروں سے مراد ایسی ہی پانی کی نہریں ہیں۔ وہ کیا ہیں۔ اس حقیقت کا علم وہیں ہوگا۔

متشابه ۱۳۹ متشابه۔ شبه سے ہے اور اس کے معنی ہیں۔ ایک دوسرے سے ملتے جلتے۔

زوج ازواج۔ زَوج کی جمع ہے۔ حیوانات میں جن کے جوڑے ہوتے ہیں جوڑے کے ہر فرد کو دوسرے کا زوج کہا جاتا ہے۔ اور غیر حیوانات میں اور حیوانات میں بھی ہر ایک کو جو دوسرے کا قرین یعنی ساتھی ہو اس کا زوج کہا جاتا ہے (غ)۔ چنانچہ احشروا الذين ظلموا وازواجهم (والصّٰفّٰت ۳۷-۲۲) میں اور هم وازواجهم في ظلل (یٰسٓ ۳۶-۵۶) میں امام راغب نے ازواج کے معنی کئے ہیں ان کے ساتھی جنہوں نے ان کے افعال میں ان کا اقتدا کیا۔

مطهرة مطهرة۔ طهارة بمعنی پاکیزگی سے ہے اور طہارت دو طرح پر ہے جسم کی اور نفس کی (غ)۔ چنانچہ یہاں ازواج مطهرة کے معنی انہوں نے یوں کئے ہیں کہ دنیا کی آلائشوں اور اس کی نجاستوں سے پاک یا بُرے اخلاق سے پاک کئے گئے۔ قتادہ سے ہے گناہ اور اذی سے پاک کئے گئے (ج)۔

خالدون خالدون۔ خلد سے ہے اور خلود کے معنی ہیں کسی چیز کا فساد کے واقع ہونے سے بری رہنا اور اس کا بقا اس حالت پر جس پر وہ ہو (غ) اور خلود فی الجنة کے معنی امام راغب کے نزدیک یہی ہیں یعنی اشیاء کا بقا اس حالت پر جس پر وہ ہیں بغیر اس کے کہ ان میں فساد واقع ہو۔ بالفاظ دیگر وہاں تنزل نہیں جس طرح اس دنیا میں ہے۔ اور ہمیشگی کے معنی اس میں بطور استعارہ کے ہیں (غ)، اور روح المعانی میں ہے کہ خلود معتزلہ کے نزدیک بقائے دائم یا ہمیشہ رہنا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوتا اور اہل سنت

۲۶ إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا

بیشک اللہ اس بات سے شرم نہیں کرتا کہ کوئی سی مثال بیان کرے مچھر کی اور اس سے بڑھکر ۴۰

نزدیک بقائے طویل یعنی زمانہ دراز تک رہنا ہے خواہ منقطع ہو جائے خواہ نہ ہو +

جنت کے پھل — جنت کے پھلوں کے متعلق یہ کہنا کہ یہ وہ ہے جو ہمیں پہلے یعنی دنیا میں دیا گیا۔ مراد جسمانی پھل تو ہو نہیں سکتے کیونکہ وہ پھل تو سب مومنوں کو دنیا میں ملتے نہیں پس مراد اعمال حسنہ کے ثمرات ہیں جن کو روحانی طور پر مومن یہاں بھی پالیتا ہے اور متشابہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ گو وہ آخرت کے پھل الگ ہوں گے مگر اعمال حسنہ کے مشابہ ہوں گے جس طرح بدی کی سزا اس کی شکل ہے اسی طرح نیکی کا پھل بھی اس عمل نیک سے ملتا جلتا ہے +

جنت میں ازواج — جنت میں ازواج بھی ہوں گے۔ ازواج کے صاف معنی تو ساتھی ہیں جیسے احشروا الذین ظلموا وازواجہم۔ (الصفٰت ۳۷۔ ۲۲) میں یہ مومن مرد اور مومن عورتیں دونوں الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت میں شامل ہیں دونوں کے لئے بہشت کی نعماء ہوں گی دونوں کے لئے باغ اور نہریں ہوں گی دونوں کے لئے ازواج مطہرہ یعنی پاک ساتھی ہونے چاہئیں۔ اگر بیبیاں بھی مراد لی جائیں تو بہشت میں ان کا ہونا کوئی امر قابل اعتراض نہیں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے ہیں جیسا فرمایا ومن کل شیء خلقنا زوجین (الذاریٰت ۵۱۔ ۴۹) اور گو جوڑے پیدا کرنے کی ایک غرض اس دنیوی زندگی میں سلسلہ توالد و تناسل بھی ہے مگر مرد و عورت کے جوڑے کی اور اغراض بھی ہیں وہ ایک دوسرے کے لئے تسکین و راحت کا موجب ہیں وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔ ان پاک تعلقات کے جنت میں ہونے پر کسی عقلمند کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور بہر حال اس بات کو تو سب نے مانا ہے کہ جنت کی نعماء کی حقیقت وہ نہیں جو اس دنیا کی ہے گو ناموں میں اشتراک ہو۔ اور ازواج کے ساتھ مطہرۃ کا لفظ بڑھا کر بتایا کہ یہ رفاقت تمام آلایشوں سے پاک ہے اس پاک رفاقت پر اعتراض کرنا ناپاکوں کا کام ہے

حیاء۔ استحیا — ۴۰۔ یستحیی اس کا مادہ حیی ہے جس سے حیاۃ بمعنی زندگی بھی ہے اور حیاء کے اصل معنی ہیں بری باتوں سے رکنا اور ان کا ترک کرنا اور یہی معنی استحیا کے ہیں (غ)۔ اسی لئے حیا کو ایمان سے کہا ہے کیونکہ وہ بری باتوں یعنی معاصی سے روکتا ہے۔ اچھے کام سے رکنے کا نام حیا نہیں +

بعوضۃ — بعوضۃ۔ بعض سے مشتق ہے دوسرے حیوانات کے مقابل میں اس کے جسم کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بعوضۃ کہا جاتا ہے (غ) عربی زبان میں غایت درجہ کی کمزور چیز کی مثال مچھر سے دی جاتی ہے ان کی امثال میں ہے اضعف من بعوضۃ یعنی مچھر سے بھی زیادہ کمزور +

مچھر کی مثال — اصل مضمون رکوع کا اللہ تعالیٰ کی توحید اور عظمت ہے۔ اسی کی تائید میں قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کا اثبات کیا گیا ہے۔ رکوع کے اول و آخر میں یہی مضمون ہے اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو معبودان باطل کی مثالیں کہیں مکڑی سے اور کہیں مکھی سے دی ہیں تو یہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ حق کے بیان کرنے سے نہیں رکتا۔ مکڑی کی مثال سورہ عنکبوت میں دی ہے جہاں فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے سوائے اولیاء بناتے ہیں تو ان کی مثال مکڑی کے گھر کی ہے جو سب گھروں میں کمزور ہے یعنی ادھر بنتا ہے اُدھر بگڑتا ہے (العنکبوت ۲۹۔ ۴۱) اور مکھی کی مثال یوں دی ہے کہ سارے معبودان باطل ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ مکھی ان سے کچھ لے جائے تو اسے بھی واپس نہیں لے سکتے۔ (الحج ۲۲۔ ۷۳) معبودان باطل کی ان مثالوں کو کفار برا مناتے تھے تو فرمایا کہ کمزور سے کمزور شے کی مثال بھی باطل معبودوں کی عاجزی کے اظہار کے لئے غیر محل نہیں حتیٰ کہ مچھر کی مثال بھی جس کو سب سے زیادہ کمزور سمجھا جاتا ہے اور یا چونکہ اوپر جنت کا ذکر تھا اور وہ بھی ایک مثال ہے اس لئے فرمایا کہ ان نعماء کو سمجھانے کے لئے اس دنیا کی چیزوں سے ان کی مثال دینے میں حرج نہیں +

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ

سو وہ لوگ جو ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے سچ ہے اور وہ جنہوں نے

كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا

انکار کیا وہ کہتے ہیں اللہ نے اس مثال سے کیا چاہا ہے وہ بہتیروں کو اس سے گمراہی میں چھوڑتا ہے

وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ

اور بہتیروں کو اس سے ہدایت دیتا ہے اور وہ اس سے سوائے فاسقوں کے کسی کو گمراہی میں نہیں چھوڑتا ۲۶

اضلال

۲۶ یضل۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ اضلال دو طرح پر ہے۔ ایک یہ کہ اضلال نتیجہ ہو گمراہ ہو جانے کا مثلاً اگر کسی کا اونٹ گم ہو جائے تو وہ کہے گا اضللت البعیر۔ اب اس کے یہ معنی نہیں کہ میں نے اونٹ کو گمراہ کر دیا۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ میرا اونٹ گمراہ ہو گیا یعنی گم ہو گیا۔ اسی طرح کسی پر گمراہ ہونے کا حکم لگایا جائے یعنی اس کے متعلق کہا جائے کہ وہ گمراہ ہو گیا تو بھی اضللتہ کہہ دینگے۔ جیسے اس شعر میں۔ فمازال شربی الراح حتی + اضلنی صدیقی وساءنی بعض ذٰلک یعنی میں شراب پیتا رہا یہاں تک کہ میرے دوست نے مجھے گمراہ قرار دیا۔ حالانکہ لفظ اضلّ استعمال کیا ہے۔ مگر مراد یہ نہیں کہ گمراہ کر دیا بلکہ گمراہ کہا۔ اور دوسرا یہ کہ اضلال کا نتیجہ گمراہی ہو یعنی ایک شخص دوسرے کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگا رہے یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو جائے مثلاً باطل کو اچھے اچھے پیرایوں میں بیان کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ لفظ اضلال پہلے معنی میں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہو سکتا ہے یا دوسرے معنی میں۔ دوسرے معنی میں منسوب کرنے سے یہ مراد ہوگی کہ خدا تعالیٰ انسانوں کے سامنے باطل باتوں کو اچھے اچھے پیرائوں میں بیان کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو جاتے ہیں یہ بالبداہت باطل ہے اللہ تعالیٰ اعمال حسنہ کو اچھے پیرائوں میں بیان کرتا ہے اور ان کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے پس لازماً پہلے معنی میں لفظ لیا جائے گا اور مراد صرف اس قدر ہوگی کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو گمراہ پاکر گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے یا ان پر گمراہ ہونے کا فتویٰ لگاتا ہے یعنی ان کی گمراہی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر بطور سزا گمراہ ہونے کا فتویٰ لگ جاتا ہے لغتِ حدیث میں بھی ہے کہ اضللتہ کے معنی اس طرح پر بھی آتے ہیں جیسے احمدتہ کے معنی ہیں میں نے اس کو محمود پایا۔ اور ابخلتہ کے معنی ہیں میں نے اس کو بخیل پایا۔ اسی طرح اضللتہ کے معنی ہیں میں نے اسے گمراہ پایا۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے ان النبی صلعم اتی قوماً فاضلھم جس کے معنی ہیں کہ نبی صلعم ایک قوم کے پاس آئے اور ان کو گمراہ پایا۔ یہ معنی نہیں کہ ان کو گمراہ کر دیا (ن) +

فاسق

الفاسقین۔ فاسق فَسَقَ سے ہے جس کے معنی ہیں شریعت کی روک سے نکل گیا گویا ایک عہد کر کے اس سے پھر گیا کیونکہ قبولیت شریعت ایک عہد ہے۔ اور فسق تھوڑے اور بہت ذنوب دونوں پر بولا جاتا ہے مگر عرف شریعت میں کثرت پر بولا جاتا ہے یعنی جب ایک شخص بہت زیادہ خروج عن الشریعت کرے تو اسے فاسق کہا جاتا ہے۔ اور کفار کو جو فاسق کہا ہے تو وہ بھی اسی لحاظ سے کہ وہ زیادہ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور اس عہد کو توڑتے ہیں جو انسان کی فطرت میں مرکوز ہو (غ)۔ اور یہ شرعی اصطلاح ہے فاسق کا لفظ کلام عرب میں انسان کی وصف میں نہ بولا جاتا تھا (ج)۔ یہاں ما یضل بہ الا الفاسقین کہہ کر بتا دیا کہ اضلال کے معنی گمراہ پانا یا گمراہی میں چھوڑنا ہیں کیونکہ فاسق تو خود ہی پہلے گمراہ ہوا ہے اور گمراہ کیا کرتا ہے کیونکہ فاسق اس کو کہتے ہیں جو شریعت یعنی قانون کی حدود سے باہر نکل جاتا ہے تو وہ خود گمراہ ہو چکا ہوا ہے یہ دوسرا قرینہ ہے کہ اضلال کے معنی یہاں گمراہ ٹھہرانا یا گمراہی میں چھوڑ دینا ہیں +

۲۷ الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن

جو اللہ کے عہد کو اس کے پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اسے کاٹتے ہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے کہ

۲۸ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ كَيْفَ تَكْفُرُونَ

ملایا جائے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں ۴۲ تم کس طرح اللہ کا انکار

بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے ۴۳ پھر اس نے تمہیں زندگی دی پھر وہی تم کو مارے گا پھر تم کو زندہ کریگا پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے

عہد - عہد اللہ

۴۲ عہد اللہ - عہد وہ اقرار موثق ہے جس کی حفاظت کرنی ضروری ہو راغب لکھتے ہیں کہ عہد اللہ یعنی اللہ کا عہد کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس نے ایک بات ہماری عقل میں ودیعت کر رکھی ہے اور کبھی یہ کہ اس کے رسول کتاب و سنت سے ایک بات کا حکم دیتے ہیں (تیسری صورت یہ بھی لکھی ہے کہ انسان خود اپنے اوپر ایک امر کو واجب کرے جسے نذر کہا جاتا ہے) پہلے کی مثال الست بربکم قالوا بلیٰ (الاعراف ۱۷۲) ہے جس کو قرآن کریم نے خود عہد فرمایا ہے۔ اللہ کا سب سے بڑا عہد یہی ہے جس کو ہر انسان کی فطرت میں رکھ دیا کہ وہ اپنے خالق کی عبادت کرے۔

میثاق عہد

من بعد میثاقہ میثاقہ میں ضمیر عہد کی طرف بھی جا سکتی ہے اور اللہ کی طرف بھی۔ اور اللہ کا عہد کو مضبوط کرنا یا تو یہ ہے کہ وہ عہد خود مضبوط ہوتا ہے جیسے عقل و فطرت کی شہادت کہ وہ ایک نہایت مضبوط شہادت ہے۔ اور یا جب رسولوں کے ذریعہ سے کوئی حکم دیا جاتا ہے تو اس کو بذریعہ نشانات و دلائل کے مضبوط کیا جاتا ہے اور میثاق عہد سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک شخص اس عہد کو قبول کر کے پھر اسے توڑتا ہے جیسے منافق ہو گیا +

قطع ما یوصل

یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ان باتوں کو قطع کرنا جن کے ملانے کا حکم اللہ نے دیا ہے یعنی جن حقوق کے ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے ان کا ادا نہ کرنا۔ اس میں قطع رحمی بھی آ جاتی ہے اور مخلوق کے تمام حقوق بھی آ جاتے ہیں گو یا حقوق مخلوق کا ادا نہ کرنا بھی فسق ہے۔ خواہ وہ اپنے عزیزوں دوستوں کے حقوق ہوں خواہ اپنے ہمقوموں اور ہموطنوں کے خواہ دوسری اقوام کے۔

فساد فی الارض

یفسدون فی الارض۔ وہ نہ صرف اللہ کے عہد کو توڑتے اور اللہ کی عبادت سے انحراف کرتے ہیں نہ صرف مخلوق کے حقوق کو ادا نہیں کرتے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زمین میں فساد پھیلاتے اور ظلم کرتے ہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ادا نہ کرنے کا نتیجہ فساد فی الارض ہے اور آخر کار وہ ایک کھلی صورت اختیار کر لیتا ہے ایسی قوم کی آخری حالت کی تصویر اولٰئک ھم الخاسرون ہے یعنی وہ سخت نقصان اس دنیا میں بھی اٹھاتے ہیں +

خسران

خاسرون خسر اور خسران راس المال کے گھاٹے کا نام ہے اور اس کا اکثر استعمال مال و جاہ کے نقصان پر ہوتا ہے مگر قرآن شریف میں عموماً عقل ایمان ثواب کے نقصان پر بولا گیا ہے (غ)

۴۳ اس آیت میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا ذکر ہے پہلی موت سے مراد عدم ہے یعنی نیستی کی حالت سے عالم وجود میں آنا جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئا مذکورا (الدھر ۷۶-۱) یہی معنی ابن مسعود اور ابن عباس سے ثابت ہیں +

نیستی سے ہستی دلیل الوہیت ہے۔

پس یہاں اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یہ دلیل دی ہے کہ نیستی سے تم کو ہستی کی حالت میں لایا۔ اگر آریوں کی طرح محض یہ مانا جائے کہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال ہوتا ہے اور نیستی سے ہستی کوئی نہیں تو الوہیت پر دلیل پیدا نہیں ہوتی۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ ۲۹

وہی ہے جس نے سبھی کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کیا پھر وہی آسمان کی طرف متوجہ ہوا

فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۠

تو انہیں ٹھیک سات آسمان بنایا اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ۴۲

ثم یمیتکم ثم یحییکم بطور دلیل نہیں بلکہ اس میں آئندہ کی ایک خبر بتائی کہ موت کے بعد وہ تمہیں پھر ایک زندگی عطا فرمائے گا۔ اور ثم الیہ ترجعون میں اس دوسری زندگی کی غرض بتائی کہ تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے بالآخر سب کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہوگا +

اللہ کی طرف رجوع

ثم — ۴۲ ثم کے معنی میں ترتیب شرط نہیں (مغنی) بعض وقت صرف فا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہاں یہی معنی ہیں کیونکہ دوسری جگہ صاف فرمایا والارض بعد ذٰلک دحٰھا (النٰزعٰت ۷۹-۳۰) یعنی زمین بعد میں بنی +

استویٰ — استوٰی الی۔ استوٰی جب دو فاعل رکھتا ہو تو مساوی ہونے کے معنی میں ہوتا ہے جیسے لا یستوون اور جب ایک ہی فاعل ہو تو ایک چیز کے اپنی ذات میں اعتدال کی حالت میں ہونے پر دلالت کرتا ہے جیسے ذو مرۃ فاستوٰی (النجم ۵۳-۶) اور جب اس کا صلہ الیٰ ہو جیسے یہاں تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی طرف پہنچنا اپنی ذات سے یا تدبیر سے (غ) +

سماء — السماء۔ لغت میں ہے سماء کل شیء اعلاہ ہر ایک چیز کے اوپر جو ہو وہ اسکا سماء ہے۔ یہاں تک کہ وہی چیز اپنے سے اوپر والی چیز کے لحاظ سے ارض ہے اور اپنے سے نیچے والی چیز کے لحاظ سے سماء ہے (غ) +

سبع — سبع۔ یا سات کو اعداد تامہ میں سے سمجھا گیا ہے۔ اور لسان العرب میں ہے کہ عرب لوگ سات اور ستر اور سات سو کے اعداد کو کثرت کے موقعہ پر استعمال کرتے ہیں۔ ابن اثیر نے بھی ایسا ہی لکھا ہے اور مثال دی ہے کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل (۲-۲۶۱) گویا سات خوشوں سے مراد بہت سے خوشے ہیں ان تستغفر لھم سبعین مرۃ (التوبہ ۹-۸۰) گویا ستر مرتبہ سے مراد کئی دفعہ ہے +

سوّی — سوّٰھن۔ تسویۃ کے معنی ہیں کسی چیز کا ٹھیک بنانا۔ یا حالت اعتدال پر یا حکمت کے بموجب بنانا (غ) خلقک فسوّٰک (الانفطار ۸۲-۷) میں یہی معنی مراد ہیں۔ اور یہاں بھی +

علم۔ علیم — علیم۔ علم سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اس کی حقیقت کے ساتھ پالینا (غ) اور عالم اور علیم اور علام اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں یعنی جاننے والا اس کا جو ہے اور جو اس کے ہونے سے پہلے ہے اور جو ہو گا اور جو اس کے بعد ہوگا اور اس کا علم تمام اشیاء پر محیط ہے ان کے ظاہر پر اور ان کے باطن پر اور چھوٹی پر اور بڑی پر (ت) +

زمینی مخلوق انسان کے فائدے کے لئے ہے — زمین میں جو کچھ ہے اس کو انسان کے فائدے کے لئے بنایا۔ اس آخری آیت میں اس اور اگلے دونوں رکوعوں کے مضمون کی طرف اشارہ ہے بنانے والے کی عظمت کی طرف بھی اور اس کے مقام بلند کی طرف بھی جس کے فائدے کے لئے یہ چیزیں بنائیں رکوع کو اس بات سے شروع کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا اور اس پر ختم کیا کہ زمین میں سب کچھ انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کیا۔ اس میں یہ بھی سکھایا کہ تم ان چیزوں کو اپنے فائدے کیلئے اپنے کام میں لگانا سیکھو +

آسمان — آسمان دخان ہے — سماء کیا ہے اور سبع سمٰوات سے کیا مراد ہے لغت میں محض بلندی کا نام سماء ہے پس مراد ہے کہ اس کی طرف متوجہ ہوا جو زمین سے اوپر ہم کو نظر آتا ہے۔ وہ کیا چیز ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا ثم استوٰی الی السماء وھی دخان (حٰم السجدہ ۴۱-۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دخان سے یعنی دھواں ہے۔ پس سماء کوئی ٹھوس چیز نہیں۔ بلکہ محض ایک دخان ہے

۳۰ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ

اور جب تیرے رب نے فرشتوں کو کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں ۴۵

ع ۴ — شرف انسانی اور ضرورت نبوت

سائنس کہتا ہے ایتھر ہے ہاں اس میں ستارے اور سیارے ہیں +

ساتُ آسمان

سبع سماوات میں ممکن ہے محض تکثیر مراد ہو یعنی کئی آسمان۔ یوں جو اوپر کوئی عالم ہم کو نظر آتا ہے ایک تو خود ہمارا نظام شمسی ہے جس میں زمین کے علاوہ سات بڑے سیارے ہیں۔ وہ سب چونکہ ہم کو زمین کے اوپر نظر آتے ہیں اس لئے بلحاظ ہماری زمین کے وہ سما ہیں۔ اور ایک جگہ ان کو سبع طرائق (المومنون ۲۳۔ ۱۷) یعنی سات رستے بھی کہا ہے۔ اور کل فی فلك یسبحون (یٰس ۳۶۔ ۴۰) میں یہی بتا دیا کہ سیارے اپنے اپنے فلک میں گردش بھی کرتے ہیں پس ایک تفسیر سبع سماوات کی ہمارا نظام شمسی بھی ہو سکتا ہے اور دوسری تفسیر کل ستارے جو ہم کو نظر آتے ہیں۔ اب تک سائنس دانوں نے ان ستاروں کے جو کھلی آنکھ سے نظر آتے ہیں سات طبقے کئے ہیں اس لحاظ سے کہ کوئی ان میں سے بڑا اور کوئی چھوٹا نظر آتا ہے۔ ممکن ہے آیندہ جب افلاک کا علم اور بڑھ جائے تو کوئی اور سات تقسیمیں معلوم ہو جائیں۔ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ صدیوں بعد سچ ثابت ہوا ہے مثلاً فرمایا وجعلنا من الماء کل شیء حی (الانبیاء ۲۱۔ ۳۰) یعنی زندگی پانی سے پیدا ہوئی ہے۔ یا فرمایا کہ ہم نے حیوانات نباتات ہر ایک قسم کے جوڑے پیدا کئے ہیں۔ ان دونوں باتوں کا علم سائنس دانوں کو پہلے نہ تھا۔

صفات علم و قدرت

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر کیا اور خاتمہ کمال علم الٰہی پر کیا اس لئے کہ قدرت کاملہ اور علم کامل ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو ہیں اور انہی دو صفات پر ایمان لانے سے انسان گناہ سے بچ سکتا ہے۔ جب اس کا علم کامل ہے تو انسان دوسروں سے کتنا بھی چھپ کر کچھ کرے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہو گا۔ پھر ہر ایک فعل کی جزا و سزا پر اس کو قدرت بھی ہے +

قول

۴۵ قال مفردات میں ہے کہ قول سے مراد نطق بھی ہوتا ہے یعنی زبان سے الفاظ کا ادا کرنا اور جو دل میں تصور کر لیا جائے قبل اس کے کہ لفظوں میں اس کا اظہار ہو اسے بھی قول کہدیتے ہیں۔ ویقولون فی انفسہم لولا یعذبنا اللہ (المجادلۃ ۵۸۔ ۸) اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ اور اعتقاد پر بھی قول کا لفظ بول دیتے ہیں۔ کسی چیز کی حالت کسی بات پر دلالت کرے تو اسے بھی قول کہدیتے ہیں امتلأ الحوض وقال قطنی یعنی حوض بھر گیا اور اس نے کہا مجھے بس ہے۔ قرآن کریم میں ہے قالتا اتینا طائعین (حٰم السجدۃ ۴۱۔ ۱۱) راغب کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی تسخیر سے تھا نہ ظاہر خطاب سے قلنا یا نار کونی بردا میں بھی یہی توجیہ کی ہے ابن اثیر کہتے ہیں کہ عرب لوگ قول سے تمام افعال مراد لیتے ہیں اور جہاں زبان سے کلام نہ ہو اس پر بھی اس کا اطلاق کرتے ہیں۔ قال بیدہ یعنی پکڑ لیا قال برجلہ چلا گیا۔ قالت لہ العینان یعنی آنکھوں نے اشارہ کیا۔ قال بالماء علی یدہ پانی ہاتھ پر ڈالا۔ قال بثوبہ۔ کپڑا اٹھا لیا۔ احادیث میں قال بمعنی آرام کیا۔ آگے ہوا۔ مائل ہوا۔ مارا۔ غالب آیا ہے +

اللہ تعالیٰ کا قول

پھر اللہ تعالیٰ کا قول یا کچھ فرمانا بندوں سے ایک رنگ رکھتا ہے اور فرشتوں سے دوسرا حیوانات سے تیسرا زمین و آسمان سے چوتھا پھر خود انسانوں میں الگ الگ رنگ ہیں۔ ایک بات فطرت میں رکھ دیتا ہے وہ بھی اس کا ارشاد ہے ایک کی طرف عقل کے ذریعہ ہدایت فرماتا ہے وہ بھی اس کا قول ہے۔ انبیاء کی وحی اور ہی رنگ رکھتی ہے۔ بذریعہ الہام اور خواب بھی کچھ فرماتا ہے۔ باقی مخلوق کو وہ کس طرح فرماتا ہے اس کو انسان سمجھ نہیں سکتا کیونکہ وہ اس کے تجربہ سے باہر چیز ہے۔ ایسا ہی ان کا خدا کے حضور کچھ عرض کرنا یہ بھی نہیں سمجھ سکتا ہے +

ملٰئکۃ

ملٰئکۃ۔ ملائک کی جمع ہے جس کی دوسری صورت ملك ہے اور اس کا مادہ ألك ہے اور ألوكة بمعنی رسالت ہے۔ گویا ملك بمعنی رسول ہے اور یا یہ ملك سے مشتق ہے۔

فرشتوں کا وجود

ملائکہ نورانی ہستیاں ہیں جن کو یہ آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول یعنی وسائط ہیں۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ ملائکہ صرف قوتوں اور طاقتوں کا نام ہے حتیٰ کہ نبوت کو بھی ایک ملکہ یا طاقت قرار دیکر اس کا نام جبرئیل قرار دیا ہے اس عقیدہ کی رو سے یہ بھی عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ وحی الٰہی انسان کے اندر سے ہی ایک آواز کے پیدا ہونے کا نام ہے اور وہ کوئی خارجی شے نہیں۔

وحی الٰہی خارجی شے ہے

حالانکہ قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ کے انسان سے کلام کرنے کا ذکر ہے وہاں اگر کلام کی ایک صورت یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ دل میں

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ

اُنہوں نے کہا کہ کیا تو اس میں ایسی (مخلوق) بنائیگا جو اس میں فساد کرے اور خون گرائے ۴۶

ایک بات ڈال دیتا ہو تو دوسری صورت من و راء حجاب فرمائی اور تیسری یہ کہ وہ رسول بھیجکر اپنا کلام پہنچاتا ہے جہاں رسول سے مراد جبرئیل ہی ہے پس اگر یہ محض اندر کی شے ہوتی تو یہ تیسری صورت قطعاً ناممکن تھی۔ اور اگر وحی اندر کی آواز نہیں بلکہ خارجی شے ہے تو ملک یا

فرشتے قوی کا نام نہیں

فرشتہ بھی قوائے عالم یا قوائے انسانی کا نام نہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ ملائک وہ وسائط ہیں جو ان قوائے عالم یا قوائے انسانی کے عمل میں آنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ وہ ان قوے پر ایک گونہ حاکم ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ جب انسان کے قوائے ظاہری کے لئے ظاہری وسائط موجود ہیں۔ اور ان کے بغیر وہ قوتیں کام نہیں دیتیں مثلاً دیکھنے کے لئے نہ صرف انسان کے اندر ایک قوت ہے بلکہ باہر ایک واسطہ روشنی ہے جس کے بغیر وہ قوت کام نہیں دیتی اور سننے کے لئے نہ صرف انسان کے اندر ایک سننے کی قوت ہے بلکہ باہر ایک واسطہ ہوا ہے جس کے بغیر وہ قوت کام نہیں دیتی۔ اسی طرح اس کے قوائے باطنی کے لئے باطنی وسائط کی ضرورت ہے۔ اور یہ وسائط یا نیکی کی قوتوں کو تحریک میں لاتے ہیں اور ملک کہلاتے ہیں اور یا بدی کی قوتوں کو تحریک میں لاتے ہیں اور جن یا شیاطین کہلاتے ہیں۔ اسی لئے ملائک کی پیدائش نور سے اور جن کی پیدائش نار سے مانی گئی ہے۔ علاوہ ازیں دنیا کے بڑے بڑے راستبازوں کی شہادت اس بات پر ہے کہ ملائکہ علیحدہ ہستیاں ہیں۔ اور اگر غور کیا جائے تو جن لوگوں کا اس بات پر اعتقاد ہے کہ نیکی کے کوئی محرک ہیں جن کو ہم ملک کہتے ہیں انہی میں اعلیٰ درجہ کی نیکیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور فلسفی جو اس بات پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ عملاً بھی ان نیکی کے محرکات سے فائدہ نہیں اُٹھاتے جس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ کا علیحدہ ہستیاں ہونا ہی صحیح خیال ہے کیونکہ اس پر عملی شہادت ملتی ہے۔

خلیفۃ

خلیفۃ۔ خلف سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پیچھے آنا۔ اور خلافۃ کے معنی دوسرے کی نیابت کرنا ہے یا اس کے قائم مقام ہونا بوجہ اس کی غیر حاضری کے یا اس کے مرجانے کے یا کام کی قابلیت کے مگر بعض وقت جس کو خلیفہ بنایا جانے اسکی عزت افزائی کے لئے ہوتا ہے اور اسی آخری وجہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین میں اپنا خلیفہ فرمایا ہے (غ) یہاں خلیفہ کے معنی میں مفسرین نے عموماً اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اس سے مراد خود حضرت آدم علیہ السلام نہیں بلکہ حضرت آدم کی ذریت ہے۔ ایک اس لئے کہ آگے فساد اور خونریزی کا ذکر ہے۔ اور وہ

ذریت آدم خلیفہ ہے

نسل انسانی کی طرف ہی اشارہ ہے نہ خود آدم کی طرف اور دوسرے اس لئے کہ قرآن کریم میں نسل انسانی کو خلیفہ فرمایا ہے ھو الذی جعلکم خلائف الارض (الانعام ۲۔۱۶۶) ویجعلکم خلفاء الارض (النمل ۲۷۔۶۲) اللہ تعالیٰ کی نیابت یہ ہے کہ اسکے علم سے اور اسکی قدرت سے کچھ حصہ انسان کو ملا ہے

ضرورت نبوت

اس رکوع میں انسان کے مقام بلند کا ذکر کیا اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ جسمانی رنگ میں وہ اس مقام بلند کو حاصل کرسکتا ہے مگر اخلاقی اور روحانی رنگ میں بغیر اللہ تعالیٰ کی وحی کے کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس طرح شرف انسانی کے ساتھ ضرورت نبوت کو وابستہ کردیا +

انسان کے خلیفہ ہونے سے مراد

سب سے پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ ملائکہ کو کچھ فرماتا ہے۔ ملائکہ چونکہ وسائط ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کا ان کو فرمانا یہ معنی رکھتا ہے کہ ارادہ الٰہی ظہور میں آئے۔ وہ ارادہ الٰہی یہ ہے کہ کوئی اس کی مخلوق زمین میں خلیفہ کا حکم رکھے۔ یہ مخلوق انسان ہے جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے۔ یا جیسا کہ دوسری جگہ فرماتا ہے انی خالق بشرا (الحجر ۱۵۔۲۸) میں ایک بشر کو پیدا کرنے والا ہوں۔ اور انسان کے خلیفہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت سے حصہ ملے گا چنانچہ آگے انہیں دو باتوں کا ذکر ہے۔ ایک علم آدم الاسماء میں انسان کو علم دینے کا اور دوسرا ملائکہ کو فرمانبرداری کا حکم دیکر اپنی قدرت سے اس کو حصہ دینے کا۔ اور دوسری جگہ قرآن شریف میں آتا ہے سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض جمیعا منہ (الجاثیۃ ۴۵۔۱۳) قدرت کی بہت سی طاقتیں ہیں وہ ایک دوسری پر حکمران نہیں ہوسکتیں۔ مگر انسان ان سب پر حکمران ہوسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کو ملک سے بھی بڑھ کر شرف حاصل ہے +

سفک

۴۶ یسفک۔ سفک سیال چیز کے گرانے پر بولا جاتا ہے (غ) اور عموماً اس کا استعمال خون گرانے پر یا آنسو بہانے پر ہوتا ہے (ل)

۳۱ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا

اور ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں[۴۷] فرمایا میں یقیناً وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے[۴۸] اور آدم[۴۹] کو سب نام سکھائے[۵۰]

الدماء۔ دَمٌ کی جمع ہے جس کے معنی خون ہیں ◆

دم

فرشتوں کا ذکر فساد

فرشتوں کا یہ کہنا نہ بطور مشورہ ہے اس لئے کہ مشورہ دینا ان کا کام نہیں یخلق ما یشاء اور نہ بطور اعتراض ہے اس لئے کہ وہ یفعلون ما یؤمرون کا مصداق ہیں۔ نہ وہ مشورہ دے سکتے ہیں نہ اعتراض کرسکتے ہیں نہ انکار کرسکتے ہیں وہ وسائط ہیں جب ارادہ الٰہی ایک امر کا ہو تو وہ اس کو عمل میں لے آتے ہیں۔ پھر اُن کا کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ ملائکہ کا کہنا فی الحقیقت اس رنگ کا نہیں جس رنگ کا انسان کا کہنا ہے بلکہ یہ محض ایک حالت کا اظہار ہے کہ انسان سے فساد اور خونریزی وقوع میں آئے گی۔ اور یہ بالکل سچ ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ کیا ایک حاکم کی ضرورت اس لئے ہے کہ زمین میں فساد کرنے والے لوگ ہوں گے ◆

ملائکہ کو انسان کی خونریزی کا علم کس طرح ہوا

دوسرا سوال ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا؟ اس لئے کہ انسان کے کمالات تو تدریجاً ظہور پذیر ہونے والے تھے لیکن فساد خونریزی پہلے ہی ظہور پذیر ہو جاتے ہیں مگر ابھی انسان پیدا ہی نہیں ہوا تو ملائکہ کو یہ علم کس طرح ہو گیا کہ فساد اور خونریزی ہو گی؟ دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا پہلے معنی کے لحاظ سے دو جواب ہیں۔ اول اللہ تعالیٰ ہمیشہ خلق کرتا رہا ہے پہلے کوئی ایسی مخلوق گزر چکی تھی۔ دوم خلیفہ کے لئے ضروری تھا کہ متضاد طاقتوں پر حکومت کرے اور یہ نہ ہو سکتا تھا جب تک خود اس کے اندر متضاد طاقتیں جمع نہ ہوں اور متضاد طاقتوں کے ایک ہی مخلوق میں جمع ہونے کا نتیجہ فساد اور خونریزی کو چاہتا ہے۔ سوال ملائکہ کی زبان سے انسان کو سمجھایا ہے کہ کس بلند مقصد کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا اور کس طرح وہ فساد اور خونریزی سے اس مقصد کو ترک کر رہا ہے

سبح

تسبیح

[۴۷] نسبح بتسبیح۔ سبح سے ہے جس کے معنی ہیں پانی میں اور ہوا میں تیزی سے گزرنا۔ کل فی فلک یسبحون (یٰس ۳۶: ۴۰)، اور عمل میں تیزی سے گزرنے پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے ان لک فی النہار سبحا طویلا (المزمل ۷۳: ۷) اور تسبیح کے معنی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں تیزی سے گزرنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی تنزیہ (غ)، یا عیب سے پاک ہونا بیان کرنا سُبْحَانَ اسی سے مصدر ہے اور سبحانک کے معنی ہیں تیری تنزیہ ہو۔ اور بحمدک ساتھ بڑھایا کہ تیری ذات صرف عیوب سے پاک نہیں بلکہ انعامات کی وجہ سے حمد کی مستحق بھی ہے ◆

تقدیس

تسبیح و تقدیس میں فرق

نقدس لک۔ قُدس کے معنی طہارت اور تقدیس کے معنی تطہیر ہیں (ل)، نقدس لک کے معنی بعض نے یوں بھی کئے ہیں کہ ہم تیرے لئے اپنے آپ کو اور ان کو جو تیری اطاعت کرتے ہیں پاک رکھتے ہیں (ل)، مگر القدوس اسمائے الٰہی میں سے ہے اور تسبیح اور تقدیس دونوں صلہ ل کے ساتھ اور اس کے بغیر بھی آتے ہیں پس مراد یہ ہے کہ ہم تیری نسبت طہارت کی طرف کرتے ہیں۔ اور تسبیح اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بلحاظ اسکی ذات کے ہے جسم، بیٹ وغیرہ سے پاک ہونا۔ اور تقدیس اسکی تنزیہ بلحاظ صفات یا افعال ہے اور تسبیح و تقدیس کے ذکر سے مراد ہے کہ یہ کہنا بطور اعتراض نہیں کیونکہ تیری ذات اور صفات سب نقائص و عیوب سے مبرا ہیں ◆

[۴۸] اعلم ما لا تعلمون یعنی اس کے اندر کمالات ہیں جن کا علم ملائکہ کو ابھی نہیں دیا گیا۔ اور وہ کمالات ابھی ظاہر ہونے والے تھے ◆

آدم

[۴۹] آدم۔ ابو البشر کے لئے اسم معرفہ ہے مگر بعض وقت مورث اعلیٰ کا نام لیا جاتا ہے مراد اس کی نسل بھی ہوتی ہے یہاں نسل انسانی شامل ہے کیونکہ علم صرف آدم کو نہیں دیا گیا بلکہ نسل انسانی کو بھی۔ امام راغب کہتے ہیں آدم کو آدم اس لئے کہا گیا کہ اسکو عقل و فہم دے کر جسے دوسری جگہ روح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تمام مخلوقات پر فضیلت دی گئی۔ کیونکہ اُدم کے معنی ہیں فضیلت ہے۔ یا آدم نام اس لئے رکھا کہ اس میں مختلف عناصر اور متفرق قویٰ رکھے گئے جیسے فرماتا ہے امشاج نبتلیہ (الدھر ۷۶: ۲) کیونکہ اُدمۃ کے معنی تخلیط یعنی ملانا جلانا آتے ہیں اور حدیث میں جہاں منسوبہ کو دیکھ لینے کی ہدایت فرمائی ہے تو اس کی وجہ بتائی ہے یؤدم بینکما

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

پھر ان کو فرشتوں کے سامنے کیا اور کہا مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو ۵۰

جس کی تشریح ابن اثیر نے کی ہے تاکہ تمہارے درمیان محبت اور اتفاق ہو +

الاسماء سے مراد

الاسماء ۔ اِسم کی جمع ہے دیکھو سلسلہ بخاری میں اس کی تفسیر میں حدیث شفاعت نقل کی ہے جس میں حضرت آدم کے ذکر میں آتا ہے وعلمك اسماء كل شئ یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب چیزوں کے اسماء سکھائے پس الاسماء کلہا سے مراد سب چیزوں کے اسماء ہیں یعنی سب چیزوں کے نام یا سب چیزوں کی صفات یعنی ان کے خواص ۔ اور امام راغب کہتے ہیں کہ الاسماء سے یہاں الفاظ اور معانی مفردات اور مرکبات سب مراد ہیں اور پھر وہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کا محض نام کسی زبان میں جاننا مفید نہیں ہوتا جبتک کہ اس نام کے ساتھ اس چیز کی صورت کیطرف ذہن منتقل نہ ہو پس محض نام کا جاننا ایک صوت یعنی آواز ہے اور کسی چیز کے نام کی معرفت تب ہی حاصل ہوتی ہے جب اس چیز کی معرفت حاصل ہو اور بعض نے الاسماء کلہا سے مراد اسمائے ملائکہ لئے ہیں اور بعض نے اسمائے ذریت آدم (ج) +

بنی آدم اور علم اسماء

اب جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے حضرت آدم کے ذکر میں بنی آدم بھی شامل ہیں یعنی نسل انسانی کا بھی ذکر ہے ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خلق الانسان علمه البیان میں ہر ایک انسان کا ذکر ہے نہ صرف حضرت آدم کا ۔ کیونکہ بیان سب کو سکھایا ۔ تو پس چیزوں کے اسماء یعنی ان کے صفات یعنی خواص بھی سب کو ہی سکھائے اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ انسان ان باتوں کو خود تدریجاً سیکھتے ہیں ۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کے سیکھنے کی استعداد انسان کے اندر رکھ دی ہے وہ گویا اس نے انسان کو سکھا ہی دی ہیں اللہ تعالیٰ کا ایک طرف چیزوں کے اندر خواص رکھ دینا دوسری طرف انسان کے اندر یہ استعداد رکھ دینا کہ وہ ان کو معلوم کرے یہ انسان کو علم دے دینا ہے گو انسانی جد و جہد کی اس میں ضرورت باقی رہے ۔ بعینہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا انسانوں کو رزق دے دینا یہ ہے کہ ایک طرف اس رزق کے سامان عالم میں پیدا کر دئے ہیں اور دوسری طرف انسان کے اندر استعداد رکھ دی ہے کہ ان کو حاصل کرے اور قرآن کریم نے خود تعلیم یا علم دینے کا استعمال ایسے موقعوں پر کیا ہے ۔ جیسے علم بالقلم (العلق ۹۶ : ۴) میں جو علوم قلم کے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں وہ تدریجاً ہی انسان کی جد و جہد سے حاصل ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف ہی منسوب کیا ہے ۔ اسی طرح کاتب کے متعلق فرمایا کہ وہ لکھ دیا کرے ۔ کما علمه الله (۲ : ۲۸۲) جس طرح اللہ نے اسے سکھایا حالانکہ کاتب خود اپنی محنت سے سیکھتا ہے ۔ اسی طرح شکاری کتوں کو جو انسان سکھاتا ہے تو اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تعلمونهن مما علمكم الله (المائدة ۵ : ۴) گویا یہ علم بھی اسی علم میں سے ہے جو خدا نے تم کو تعلیم کیا ہے پس ان تمام موقعوں سے صاف ظاہر ہے کہ نسل انسانی بھی علم آدم الاسماء کلہا میں شامل ہے کیونکہ ان کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی

خواص اشیاء کا علم

ذات اور ان کے خواص کو جاننے کی استعداد رکھدی ہے اور بیضاوی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اجزائے مختلف اور قوائے متفرق سے پیدا کیا اور اس میں یہ استعداد رکھی کہ وہ ہر قسم کے مدرکات کو معقولات ہوں یا محسوسات یا تخیلات یا موہومات ادراک میں لا سکے اور اشیاء کی ذات کی معرفت اور ان کے خواص اور ان کے اسماء اور علم کے اصول اور صنعتوں کے قوانین اور آلات کی کیفیت اسکے دل میں ڈالی +

ملائکہ پر اشیاء کا پیش کیا جانا

۵۰ ۔ عرضهم میں ضمیر مسمیات یعنی اشیاء کی طرف جاتی ہے جیسا کہ اگلے الفاظ باسماء هٰؤلاء سے ظاہر ہے اور ضمیر مذکر بوجہ تغلیب ہے یا اس لئے کہ عقلاء کو ان میں غلبہ حاصل ہے (ر) چیزوں کے پیش کرنے سے مراد قلوب ملائکہ میں ان کی صورت کا آنا یا ان پر ان کا اظہار عالم مثال میں ہے (ر) +

نبأ

انبئونی ۔ انباء ۔ نبأ سے ہے اس خبر کو کہتے ہیں جس میں عظیم الشان فائدہ ہو جس سے علم یا غلبۂ ظن حاصل ہو (غ) اس لفظ کے اختیار

انبئونی میں خطاب

کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ ان اسماء پر اطلاع پانے میں کوئی فائدہ عظیم حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ مجھے خبر دو اس سے مراد صرف اظہار عجز ملائکہ ہے ۔ اور یہ بتانا ہے کہ وہ صفات یا خواص اشیاء کا علم نہیں رکھتے ۔ گویا اصل مراد ایک حالت کا اظہار ہے اور قول

۳۲ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ قَالَ

انہوں نے کہا تو پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں مگر وہی جو تو نے ہمیں سکھایا بیشک تو علم والا حکمت والا ہے ۵۰ کہا

۳۳ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ

اے آدم ان کے نام انہیں بتادو پس جب اس نے ان کے نام انہیں بتادیئے فرمایا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ

غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے تھے ۵۱

کا اس معنی میں آنا اوپر دکھایا جاچکا ہے +

صادق ہونے سے مراد — ان کنتم صادقین صدق ضد کذب ہے اور مراد صادق ہونے سے اس خبر کے دینے میں صادق ہونا ہے جس کی طرف اینبؤنی میں اشارہ تھا مطلب یہ ہوا کہ ملائکہ اٹکل پچو ایک بات کے کہنے پر تو جرات نہیں کرتے پس کیا تم ان اشیاء کے خواص سے واقف ہو یا اِنْ بمعنی اِذْ لیکر یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ جب تم حق وصدق کہنے والے ہی ہو تو بتاؤ کہ تم ان اشیاء کے خواص پر آگہی رکھتے ہو اور ایک تفسیر ان الفاظ کی حضرت ابن عباس سے یوں مروی ہے کہ ملائکہ نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے اعلم اور افضل مخلوق پیدا نہیں کریگا۔ تو ان کو اس خیال کی غلطی پر آگاہ کیا اور صدق بمعنی صواب بھی آسکتا ہے جس طرح کذب بمعنی خطا آجاتا ہے۔ اور مراد یہ ہوسکتی ہے کہ اگر تم اپنے خیال میں صواب پر ہو کہ وہ فساد اور خونریزی کریگا۔ اور مراد اس سے نفی فساد و خونریزی نہیں بلکہ اس کے کمالات کی طرف توجہ دلانا ہے +

حکم ۔ الحکمۃ الحکیم — ۵۰ الحکیم حکم کے معنی ہیں اصلاح کیلئے روکا اور حکمۃ اللہ تعالیٰ میں اشیاء کی معرفت اور ان کا غائت درجہ کی مضبوطی پر وجود میں لانا ہے اور انسان میں حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کا کرنا ہے (غ) اور اسمائے الٰہی میں الحکیم سے مراد وہ ہے جس میں حکمت علی وجہ الکمال پائی جاتی ہو +

ملائکہ اور علم خواص اشیاء — ملائکہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں صفات اشیاء کا علم نہیں اور اس سے پہلے سبحانک کو پھر دوہرایا ہے یعنی ایسا علم نہ دینے میں اللہ تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہیں اور آخر پر العلیم الحکیم کہکر بتایا کہ کامل علم تو اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اور وہ اپنی حکمت سے جسقدر اس میں سے چاہتا ہے کسی کو دیتا ہے ملائکہ کو جو وسائط ہیں خواص اشیاء کا علم نہ دینا اسکی حکمت پر مبنی ہو کیونکہ وسائط کو ایسے علم کی ضرورت نہیں +

آدم کا ملائکہ کو اسماء بتانا — ۵۱ آدم کا ملائکہ کو اسماء بتانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ آدم نے ان کو وہ علم دیدیا جو اللہ تعالیٰ نے نہ دیا تھا۔ بلکہ یہ خبر دینا عمل سے ہو انسان کے اشیاء پر تصرف سے پتہ لگ جاتا ہے کہ اسکو ان کی صفات پر اطلاع ہے کیونکہ بغیر صفات پر اطلاع کے تصرف نہیں ہوسکتا +

کتم — ما تبدون وما کنتم تکتمون ۔ کتم کے معنی چھپانا ہیں مگر ایک چیز جب کسی کے عمل سے ظاہر نہ ہو تو اس پر بھی کتم کا لفظ بول دیا جاتا ہے جیسے بخل کرنیوالوں کے بارہ میں ہے ویکتمون ما اتٰھم اللہ من فضلہ (النساء ۴ ۔ ۳۷) جس کی تفسیر امام راغب نے کفران نعمت سے کی ہے ۔ ایسا ہی لا یکتمون اللہ حدیثا (النساء ۴ ۔ ۴۲) نہ چھپا رکھنے سے مراد عملاً اس کا اظہار ہوجانا ہے۔

ملائکہ کے کتمان سے مراد — پس ما تبدون وہ باتیں ہیں جو ملائکہ نے ظاہر کیں یعنی انسان کا فساد اور خونریزی کرنا اور ما کنتم تکتمون وہ جو ان سے مخفی رہا یعنی انسان کا علم خواص اشیاء اور اس کا کمال اور یہی کا جاننا ان کی غرض تھی جب اتجعل فیھا کہا تھا کہ انسان کے خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے +

قوائے عالم پر انسان کے تصرف کی غرض — اس مضمون پر اتنا زور اس لئے دیا کہ معلوم ہوجائے کہ قوائے عالم پر جو حکمران ہستیاں یعنی ملائکہ ہیں ان سے بڑھکر علم اور کمال انسان کو دیا گیا ہے پس انسان کو قوائے عالم کے سامنے جھکنا نہیں چاہئے بلکہ ان پر تصرف حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے +

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۳۴

اور جب ہم نے فرشتوں کو کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو تو انہوں نے فرمانبرداری کی ۵۲ مگر ابلیس ۵۳ نے نہ کی ۵۴

سجد

۵۲ اسجدوا ۔ سجود کے اصل معنی جھک جانا اور فرمانبرداری اختیار کرنا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی اور

سجدۂ اختیار و تسخیر

اس کی عبادت کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے، اور وہ دو طرح پر ہے ایک سجدہ اختیار سے جو انسان کے لئے خاص ہے اور دوسرا تسخیر سے جو انسان حیوان نباتات غرض ہر مخلوق اپنے خالق کو کرتی ہے (غ) اسجدوا لآدم کے معنی امام راغب نے دو طرح پر کئے ہیں ایک یہ کہ آدم کو بمنزلہ قبلہ رکھکر اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے کا حکم تھا۔ اور دوسرا یہ کہ ان کو اس کی فرمانبرداری کا حکم دیا گیا اور اس بات کا کہ وہ اس کے اور اس کی اولاد کے مصالح کو قائم کریں۔ اصطلاح شریعت میں سجدہ عبادت کے اس خاص رکن کا نام ہے جب پیشانی زمین پر رکھ دی جاتی ہے اور یہ سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کے لئے جائز نہیں

لغوی معنی میں سجدہ

لیکن یہاں سجدہ کا لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی محض فرمانبرداری کے معنی میں جیساکہ شاعر کے اس قول میں قلنا لہ اسجد للیلی فاسجدا جہاں اونٹ کے سر جھکانے پر اسجد کا لفظ بولا گیا ہے ◆

ملائکہ کے سجدہ سے مراد

آدم (انسان) کے کمال کا پہلا مرتبہ تعلیم اسماء ہے یعنی اس میں استعداد علمی کا رکھنا اب یہ اس کے کمال کا دوسرا مرتبہ آتا ہے جس میں ملائکہ کو آدم کی فرمانبرداری کا حکم دیا جاتا ہے۔ ملائکہ چونکہ قوائے عالم پر حکمران ہستیاں ہیں اس لئے ملائکہ کی فرمانبرداری سے مراد سارے عالم پر حکمرانی ہے۔ دوسری جگہ اسی کے مطابق فرمایا سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعا منہ (الجاثیۃ ۴۵ - ۱۳) یعنی جو کچھ آسمانوں اور زمین کے اندر ہے سب کا سب تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ اس سے بھی مراد ایسی استعداد کا انسان کے اندر رکھنا ہے جس سے وہ کل عالم کو اپنے کام میں لگا سکتا ہے یہی معنی بیضاوی نے لکھے ہیں او التذلیل والانقیاد بالسعی فی تحصیل ما ینوط بہ معاشہم ویتم بہ کمالہم یعنی یا مراد اس سے فرشتوں کا جھک جانا اور فرمانبردار ہونا ہے بذریعہ کوشش کے ان چیزوں کے حاصل کرنے میں جن سے ان کی معاش کا تعلق ہے اور جن سے ان کا کمال پورا ہوتا ہے جمع کے صیغہ میں اشارہ ہے کہ آدم میں نسل آدم بھی شامل ہے جیساکہ فرمایا ولقد خلقنٰکم ثم صورنٰکم ثم قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لآدم (الاعراف ۷ - ۱۱) ہم نے تم کو پیدا کیا پھر ہم نے ہی تمہاری تصویریں بنائیں پھر ہم نے فرشتوں کو کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو۔ گویا ہر بشر کے لئے وہی ہوتا ہے جو ابو البشر کے لئے ہوا ◆

الّا

۵۳ الّا بعض وقت استثنائے منقطع کے طور پر آتا ہے یعنی جس چیز کا استثنا کیا جاتا ہے وہ ان میں شامل نہیں ہوتی جن سے اس کا استثنا کیا جاتا ہے کیونکہ لفظ کا اصل مفہوم صرف مابعد کی ماقبل سے مخالفت ظاہر کرنا ہے ◆

بلس

ابلیس

ابلیس ۔ بلس سے ہے اور ابلاس اس حزن یعنی غم کو کہتے ہیں جو شدت ناامیدی سے پیدا ہو (غ) یبلس المجرمون (الروم ۳۰ - ۱۲) پس ابلیس کو ابلیس اس کی شدت ناامیدی کی وجہ سے کہا ہے جو وہ رحمت الٰہی سے رکھتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے الم تر الجن وابلاسہا ! ابلیس جیساکہ قرآن شریف میں صاف لکھا ہے ملائکہ یا اعلیٰ نورانی ہستیوں میں سے نہیں بلکہ وہ جن یا ناری ہستیوں میں سے ہے۔ کان من الجن (الکہف ۱۸ - ۵۰) یہ باتیں کہ ابلیس ملائکہ سے تھا اور وہ سب سے بڑھکر علم رکھتا تھا اور آدم کی صورت سے یوں کیا کرتا تھا یہودیوں سے سُنے سُنائے ہوئے قصے ہیں جو تفاسیر میں درج ہو گئے ہیں چنانچہ ابن کثیر ایک اس قسم کی روایت کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس میں بہت سے اسرائیلی قصے درج کر دیئے گئے ہیں جو کلام صحابہ سے نہیں ◆

ابلیس و شیطان

ابلیس کو ہی شیطان بھی کہا گیا ہے جب تک وہ خود انکار کرتا ہے ابلیس ہے جب دوسروں کو ورغلاتا ہے شیطان ہے اور بلحاظ لغت بھی یہی درست ہے کیونکہ ابلیس وہ ہے جو خود رحمت الٰہی سے مایوس ہے اور شیطان جو شطن بمعنی بُعد یعنی دوری سے ہے۔ وہ ہے

اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ۝

اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا ۵۳

جو دوسروں کو رحمت الٰہی سے دور کرتا ہے۔

ابلیس قوت وہمیہ — ابلیس سے مراد بعض لوگوں نے قوت وہمیہ کو لیا ہے چنانچہ سرسید احمد خاں کا یہی خیال تھا اور اس کی تائید میں انہوں نے شرح فصوص سے بعض حکما کا ایک قول نقل کیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ابلیس بس قوت وہمیہ کلیہ کا نام ہے جو عالم کبیر میں پائی جاتی ہے اور اشخاص انسانی میں جو قوت وہمیہ پائی جاتی ہے یہ اسی کے افراد ہیں مگر ہمارے نزدیک جس طرح ملائکہ کو محض قوائے عالم یا قوائے انسانی قرار دینا غلطی ہے اسی طرح ابلیس اور اس کی ذریت کو محض قوائے انسانی قرار دینا غلطی ہے بلکہ درحقیقت جس طرح ملائکہ ایک وجود رکھتے ہیں ابلیس اور اس کی ذریت بھی ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے اور ان کو جن اسی لحاظ سے کہا گیا ہے کہ وہ آنکھوں سے مستور ہیں پس ہر انسان سے تعلق رکھنے والی ایک تو وہ ہستیاں ہیں جن کو ہم ملائکہ کہتے ہیں جو اس کے اعلیٰ قویٰ کو یا نیکی کے میلان کو تحریک میں لاتی ہیں اور دوسرے وہ جن کو ہم جن یا شیاطین کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو اس کے قوائے بہیمیہ یا نفس امارہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اس کے بدی کے میلان کو تحریک میں لانے کا موجب ہوتی ہیں۔ انسان میں ایک قسم کی خواہشات وہ ہیں جو سفلی کہلاتی ہیں۔ کیونکہ اس سفلی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک وہ جن کا تعلق اس کے اخلاق اور روحانیت سے ہے جو اس کو ایک بلند مقام کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ انسان کی ترقی کے لئے دونوں قسم کی خواہشات کا اس میں ہونا ضروری تھا سفلی خواہشات کا اس لئے کہ اس زندگی کے بغیر وہ ترقی حاصل نہیں ہو سکتی اور ملکی خواہشات کا اس لئے کہ ان کے بغیر ترقی کی طرف قدم نہیں اٹھ سکتا۔ یہ کہنا کہ شیطان کو خدا نے پیدا ہی کیوں کیا گویا اس کا مرادف ہے کہ انسان کو یہ زندگی ہی کیوں عطا فرمائی حیوانی زندگی میں سے ہو کر ہی روحانی زندگی مل سکتی ہے۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے الشیطان یجری من بنی اٰدم مجری الدم شیطان بنی آدم کے ساتھ ایسا ہی لگا ہوا ہے جیسے خون کا بہنا یعنی جیسے اس کی حیوانی زندگی۔

شیاطین محرک بدی ہیں

شیطان کو کیوں پیدا کیا

نوری ناری مخلوق — اور ملائکہ کو جو نور سے مخلوق اور جنوں کو نار سے مخلوق قرار دیا گیا ہے تو وہ بھی اسی پرحکمت فلسفہ کی طرف اشارہ ہے ملائکہ کی تحریک سے انسان کے اندر نور پیدا ہوتا ہے اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجہم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیائہم الطاغوت یخرجونہم من النور الی الظلمات (۲۵۷) کیونکہ وہ نار جس کے اندر نور نہ ہو وہ نرا دھواں ہونے کی وجہ سے ظلمت کے قائم مقام ہے۔

ابیٰ — **۵۳** ابیٰ۔ اِباء شدت امتناع کو کہتے ہیں یعنی نہایت سختی سے ایک بات سے رکنا۔ یا سختی سے انکار کرنا (ل)۔

کبر — استکبر۔ کِبر سے ہے۔ اور یہ انسان کی وہ حالت ہے کہ وہ اپنے نفس پر فخر کرے اور اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھے اور سب سے بڑا تکبّر قبول حق سے رکنا ہے

استکبار — اِستِکبار دو طرح پر ہے ایک یہ کہ انسان یہ قصد کرے اور چاہے کہ بڑا ہو جائے اور یہ اگر ایسی حالت اور ایسے مکان اور ایسے وقت میں ہو جو واجب ہے تو محمود ہے یعنی اچھی چیز ہے اور دوسرا یہ کہ اپنی بڑائی کے خیال سے بھر کر اپنے نفس کے لئے وہ کچھ ظاہر کرے جو اس کے لئے نہیں ہے اور یہ مذموم ہے اور اسی معنی میں

تکبر — قرآن شریف میں یہ لفظ آیا ہے (غ)۔ اور تکبّر کا استعمال بھی دو طرح پر ہے ایک یہ کہ کسی کی خوبیاں غیروں پر بہت بڑھی ہوئی ہوں

المتکبر — اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں المُتَکَبِّر ہے دوسرا یہ کہ تکلف سے اور اپنی بڑائی کے خیال سے بھر کر اپنے آپ کو بڑا بنائے اور یہ مذموم ہے (غ)۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۳۵

اور ہم نے کہا اے آدم تو اور تیری بی بی باغ میں رہو اور اس میں سے تم دونوں بافراغت کھاؤ جہاں سے چاہو[۵۴]

حکم تو ملائکہ کو تھا کہ سجدہ کریں۔ ابلیس کا ذکر درمیان میں کیونکر آگیا؟ انسان میں امتیاز کا رکھنا اور ایک حد تک اسے اختیار

شیطان کو حکم فرمانبرداری

نیک و بد دینا انسان میں دو قسم کے قویٰ ضروری ٹھہراتا ہے ایک اعلیٰ یا ملکی قویٰ اور دوسرے ادنیٰ یا بہیمی قویٰ جس طرح ان اعلیٰ یا ملکوتی قویٰ کو تحریک میں لانے والے ملائکہ ہیں۔ اسی طرح ادنیٰ یا بہیمی قویٰ کے محرک شیاطین ہیں تو جب اعلیٰ ہستیوں کو انسان کی فرمانبرداری کا حکم ہوا تو ادنیٰ ہستیاں خود اس حکم میں شامل ہو گئیں یہی وجہ ہے کہ حالانکہ سارے قرآن شریف میں شیطان کو یہ حکم نہیں کہ تو سجدہ کر لیکن ایک جگہ اس کے متعلق لفظ اذ امرتک (الاعراف ۱۲) آگیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ بسبب ایک ادنیٰ ہستی ہونے کے وہ بھی اس حکم میں شامل تھا جو اعلیٰ ہستیوں کو دیا گیا +

ابلیس کا انکار سجدہ

جس طرح ملائکہ کے سجدہ کرنے سے مراد ان کا انسان کی تکمیل نفس میں معاون ہونا ہے جیسا کہ مفسرین نے بھی مانا ہے اسی طرح ابلیس کا انکار یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ انسان کی ترقی کی راہ میں حارج ہوگا اور یہ وہ قوت بہیمیہ کو اکسا کر یا نفس امارہ کو تحریک میں لا کر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان اس کو اپنا فرمانبردار بنا لیتا ہے یعنی اسکے قوائے بہیمیہ حالت اعتدال پر آجاتے ہیں اور وہ کبھی ان کو غیر محل پر استعمال نہیں کرتا چنانچہ جب نبی صلعم نے شیطان کا مجری الدم ہونا بیان فرمایا تو صحابہ نے عرض کیا

شیطان کی فرمانبرداری

یا رسول اللہ آپ سے بھی۔ فرمایا ہاں مگر اللہ تعالےٰ نے مجھے اس پر مدد دی سو وہ فرمانبردار ہو گیا ہے اور کمال انسانی کا پہلا مرتبہ یہی ہے کہ وہ شیطان کو اپنا فرمانبردار بنالے اور اس کے قوائے بہیمی اور اس کا نفس امارہ اس کی ترقی کی راہ میں روک نہ ہوں۔ اور شیطان کو جو من الکافرین کہا ہے تو اس لحاظ سے کہ وہ ان نعماء کو ان اعلیٰ ملکوتی صفات کو جو اللہ تعالےٰ نے انسان کو دئے ہیں۔ دبانا چاہتا ہے اور کفر کے معنی دبانا ہیں +

سکون

۵۴ اسکن۔ سکون کے اصل معنی حرکت کا جاتے رہنا یا ٹھہر جانا اور استقرار ہے (ت)، اس لئے اضطراب نہ ہونے سے جو حالت اطمینان پیدا ہوتی ہے اس پر بھی لفظ سکون بولا جاتا ہے +

خلق آدم میں تیسرا مرتبہ

خلق آدم میں یہ تیسرا مرتبہ ہے۔ پہلے مرتبہ پر اسے علم دیا جاتا ہے دوسرے مرتبہ پر اسے مسجود ملائک بنا کر طاقت دی جاتی ہے تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ اسے جنت ملے یعنی راحت و آرام کی زندگی۔ اور یہاں آدم کے ساتھ اس کی بی بی بھی شامل ہو جاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ راحت اور آرام کی زندگی اکیلا انسان حاصل نہیں کر سکتا علم اور طاقت حاصل کر سکتا ہے چنانچہ دوسری

بہشت میں بیبیاں

جگہ فرمایا خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا (الروم ۳۰-۲۱) تمہارے نفسوں سے تمہارے لئے بیبیاں پیدا کردیں تاکہ تم ان سے راحت پاؤ یہی وجہ ہے کہ جنت دار الخلد میں بھی بیبیوں کے موجود ہونے کا ذکر ہے اس پر اعتراض کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہاں سکون نہ ہو +

آدم کی پہلی جنت

کیا اس جنت سے مراد وہ بہشت ہے جس کا وعدہ اعمال صالحہ پر ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ نہیں۔ کیونکہ وہ جنت جو بعد موت حاصل ہوتی ہے اس سے انسان کبھی نکالا نہیں جاتا وما ھم منھا بمخرجین (الحجر ۱۵-۴۸) اور اس سے آدم کو نکلنا پڑا پس یہ جنت اس دنیا کی زندگی کی جنت ہے اور مفسرین نے اسے مانا ہے۔ اور یہاں اس جنت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ تم اس سے جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ۔ اور سورہ طٰہٰ ۲۰ ۱۱۸ و ۱۱۹ میں اس جنت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ تمہارے لئے اس میں یہ حاصل ہے کہ نہ تم اس میں بھوکے رہو نہ ننگے رہو اور نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ میں رہو۔ پس جسمانی لحاظ سے تو انسان کو جنت یوں حاصل ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ نے وہ سب سامان پیدا کر رکھے ہیں جن سے انسان کی بھوک دور ہوتی ہے اور پیاس دور ہوتی ہے اور جن سے لباس ملتا ہے اور مکان ملتا ہے اور یہی انسان کی ضرورت کی چار چیزیں ہیں جو کوشش سے حاصل ہو جاتی ہیں۔

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝

اور اس درخت کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے ۵۵

سکون روحانی کی جنت

اس کے معنی ظاہر ہیں ایک طرف عالم میں سامان موجود ہیں دوسری طرف انسان میں وہ طاقت ودیعت کی گئی ہے جس سے وہ ان کو اپنے کام میں لاتا ہے یا مسجود ملائکہ بنتا ہے جوں جوں اس کا علم بڑھتا ہے توں توں اس کی طاقت بڑھتی ہے اور اسی طرح ہی تدریجاً اس کی راحت کے سامان بڑھتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ انسان کے لئے آرام اور راحت یا حالت سکون صرف خورد و نوش اور لباس و رہائش سے پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے لئے ایک روحانی سکون کی بھی ضرورت ہے اور وہی اس کی حقیقی جنت ہے۔ کھانے پینے کے سب سامان ہوں مگر سکون قلب نہ ہو تو ان سے کوئی راحت نہیں پہنچ سکتی۔ اطمینان قلب میسر ہو تو بھوک پیاس اور ہر قسم کی تکلیف انسان خوشی سے برداشت کر لیتا ہے بس اصل وہ جنت جہاں سکون ملتا ہے گو سامان خورد و نوش کی بھی اس کے لئے ضرورت ہے اور اس کے دینے کا ذکر بھی موجود ہے اس دنیا کی زندگی میں ایک روحانی جنت یا اطمینان قلب ہے اب ظاہر ہے کہ روحانی سکون یا اطمینان قلب اس وقت تک رہتا ہے جب تک انسان بدی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ بدی کے ارتکاب کے ساتھ سکون روحانی دور ہو جاتا ہے پس وہ جنت روحانی یہ ہے کہ انسان معصومیت کے مقام پر ہو سو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک انسان کو فطرتاً بیگناہ پیدا کرکے وہ مقام دے دیا ہے۔ اس لئے حکم ہوتا ہے کہ فطرتاً ہم نے تم کو جنت دے دی ہے۔ اب تم نے خود اس کو ضائع نہ کر دینا ومن اعرض عن ذکری فان له معيشة ضنكاً (طٰہٰ ۲۰-۱۲۴) جو شخص میرے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اس کیلئے تنگی کی روزی ہے جس سے مراد اسی سکون روحانی کا جاتے رہنا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قصہ عیسائیت سے لیا گیا ہے جب اس کی بنیاد ہی انسان کے فطری طور پر معصوم ہونے پر ہے حالانکہ عیسائی مذہب نے اسی کو انسان کے پیدائشی گنہگار ہونے کی دلیل ٹھہرایا ہے +

شجرۃ

۵۵ الشجرۃ۔ شَجَر یا شَجَرَۃ اس نبات کو کہتے ہیں جس کا تنہ ہو (غ) یعنی درخت۔ اور شِجَار (ماضی شَجَرَ) اور مُشَاجَرَۃ اور تَشَاجُر کے معنی تنازع اور اختلاف کرنے کے آتے ہیں بعض لوگوں نے جو شجرۃ کے معنی جھگڑا کئے ہیں وہ لغت سے ثابت نہیں +

ظلم

الظالمین ظُلْم کے اصل معنی اہل لغت کے نزدیک وَضْعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَوْضِعِهِ الْمُخْتَصِّ بِهٖ (غ) ہیں یعنی ایک چیز کا اس مقام سے جو اس کے لئے خاص ہے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنا کمی سے ہو یا زیادتی سے یا اس کے وقت سے ہٹکر یا مکان سے ہٹا کر اس لئے ظَلَمْتُ الْاَرْضَ کے معنی ہیں ایسے مقام سے اسے کھودا جو کھودنے کی جگہ نہ تھی۔ اور حق سے مجاوزت کا نام بھی ظُلْم ہے خواہ وہ نہایت ہی قلیل ہو اور خواہ بہت زیادہ ہو (غ) اور ظُلْم کو تین قسم پر تقسیم کیا ہے اول بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اور اس میں کفر و شرک سب سے بڑھکر ہے۔ اور دوسرا لوگوں پر ظلم۔ اور تیسرا اپنے نفس سے ظلم۔ اور یہاں یہی اپنے نفس سے ظلم مراد ہے (غ) یعنی اپنے آپ کو کوئی نقصان پہنچانا +

هذہ الشجرۃ

هٰذِهِ الشَّجَرَةَ سے کونسا درخت مراد ہے بعض مفسرین نے گیہوں۔ کھجور۔ کافور۔ انجیر۔ حنظل وغیرہ نام گنے ہیں۔ مگر ان کا یہاں کیا مطلب؟ هٰذِهِ میں اشارہ قریب موجود ہے بس اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور ابھی آچکا ہے اور قریب ترین جو ذکر ہے وہ ابا اور استکبار کا ذکر ہے اور وہ سب سے بڑی بدی ہے جس کی وجہ سے شیطان خود گمراہ ہوتا ہے بلکہ اس کی تفسیر دوسری جگہ موجود ہے دیکھو سورہ اعراف آیت ۱۱ سے ۱۹ تک جہاں پہلے شیطان سجدہ سے انکار کرتا ہے تو اس کو حکم ہوتا ہے کہ اس حالت سے نکل جا تب وہ کہتا ہے میں نسل انسانی کو سیدھی راہ سے پھیر دوں گا اور ان کے آگے پیچھے سے آؤں گا اور وہ شکر گزار نہیں رہیں گے یعنی بدیوں میں مبتلا ہوں گے۔ اس کے بعد آدم کو حکم ہوتا ہے اسکن انت وزوجك الجنة اور ولا تقربا هذه الشجرة (الاعراف ۷-۱۹)

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا ۳۶

پس شیطان نے ان دونوں کو اس سے پھسلا دیا۔ سو اس نے ان دونوں کو اس سے نکال دیا جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا نکل جاؤ

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○

بعض تم میں سے بعض کے دشمن ہیں اور تمہارے لئے زمین میں ایک وقت تک ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے ۵۶

تو یہاں سے صاف معلوم ہوا کہ ھٰذہٖ میں اشارہ اسی شیطان کے ورغلانے کی طرف ہے جو انسان کی ترقی کی راہ میں روک بننا چاہتا ہے۔ اور ھٰذہِ الشَّجَرَۃ سے مراد سوائے بدی کے اور کچھ نہیں۔ اور یہی ذکر نسل انسانی کو گمراہ کرنے کا انکار سجدہ کے بعد الحجر[۱۵] - ۳۹ و ۴۰ اور بنی اسرائیل[۱۷] - ۶۲ - ۱ور صٓ[۳۸] - ۸۲ و ۸۳ میں موجود ہے۔ اور بدی کو خود قرآن شریف نے ایک اور درخت سے تشبیہ دی ہے مثل کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ (ابراہیم[۱۴] - ۲۶) اور ظاہر ہے کہ جس درخت سے آدم کو روکا اسی درخت سے بنی آدم کو بھی روکا ہوگا۔ اور بنی آدم کو فرمایا لا تقربوا الفواحش (الانعام[۶] - ۱۵۲) بیحیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ +

ولا تقربا کا حکم فطری ہے
اس آیت کا سارا نقشہ حالت اور فطرت کا نقشہ ہے۔ اور لا تقربا کا حکم بھی فطرت کے رنگ کا حکم ہے۔ یہ الہام نہیں وحی نہیں۔ کیونکہ الہام اور وحی اس فطری حکم کی خلاف ورزی کا علاج ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ پھر یہ میاں بی بی دونو کو حکم ہے جہاں وحی کا ذکر آتا ہے وہاں خلقی ادم ہے یعنی آدم کو وہ کلمات سکھلائے گئے پس یہ فطری حکم ہے اور اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ فطری حکم بھی اللہ تعالیٰ کے عہد میں داخل ہے دیکھو ۴۲ مگر انسان کمزور ہے اس لئے اس فطری حکم کی تقویت کے لئے وہ ذکر کا محتاج ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اسے عطا فرماتا ہے +

بائبل کی غلطی کی اصلاح
بائبل نے ھٰذہِ الشَّجَرَۃ کو نیکی اور بدی کی تمیز کا شجرہ کہا ہے ظاہر ہے کہ آدم کو اس سے روکنے کے یہ معنی ہوئے کہ اس کو تمیز کا جوہر خدا نے عطا نہ کیا تھا پھر حیوانوں پر اس کی فضیلت کیا؟ اور یہ کس قدر بیہودہ بات ہے کہ وہ عجیب جوہر جس سے انسان حیوان پر ممتاز ہوتا ہے۔ خدا کے حکم کی نافرمانی کر کے انسان نے زبردستی حاصل کر لیا۔ قرآن کریم اس خیال کی تردید کرتا ہے +

اس فطری حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہو گے یعنی اس اطمینان قلب اور راحت روحانی کو کھو دو گے جو فطرت نے تمہیں دی ہے۔ جس طرح اس کو کھو دیا اس کا نقشہ سورہ اعراف میں کھینچا ہے +

زلّة **ازلّ**
۵۶ ازلّ - زلّ سے ہے اور زَلَّة کے معنی اِسْتِرْسَالُ الرِّجْلِ مِنْ غَيْرِ قَصْدٍ (غ) ہیں یعنی بلا ارادہ پاؤں کا ڈگمگا جانا اور اس لئے زَلَّة اس قصور کو کہا جاتا ہے جو بلا ارادہ سرزد ہو (غ) پس ازلّهما کے معنی ہوئے ان سے زَلَّة کا ارتکاب کرایا یعنی شیطان کے پھسلانے کی وجہ سے مگر بغیر عمد اور ارادہ کے آدم اور اس کی زوجہ سے کوئی قصور ہو گیا +

عنہا میں ضمیر شجرۃ کی طرف بھی جا سکتی ہے یعنی اس درخت کی وجہ سے ان سے لغزش کرا دی اور جنت کی طرف بھی یعنی ایسی لغزش کرا دی کہ جنت سے نکلوا دیا +

ھبط
اھبطوا۔ ھَبَطَ کے وہی معنی ہیں جو نَزَلَ کے ہیں (ت) اوپر سے گرنے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے یھبط من خشیۃ اللہ میں (۷۴) اور کسی مقام پر اترنے کے معنی میں بھی اھبطوا مصرا (۶۱) امام راغب ھبط اور نزل میں یہ فرق کرتے ہیں کہ ھبوط استخفاف کے رنگ میں ہوتا ہے اور نزول اکرام کے رنگ میں اور حدیث میں آتا ہے اللّٰھم غَبْطًا لا ھَبْطًا جس کے معنی ابن اثیر یوں کرتے ہیں کہ ہم تجھ سے اچھی حالت کی التجا کرتے ہیں اور ذلت اور انحطاط سے تیری پناہ چاہتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ نقل مکانی کے علاوہ اس کے معنی ایک حالت سے دوسری کی طرف نکلنا بھی ہیں اور ھبط کے معنی نقصان بھی ہیں چنانچہ ھبط القوم

٣٧ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ باتیں سیکھ لیں پس وہ اس پر (رحمت سے) پھرا بیشک وہ (رحمت سے) پھرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

کے معنی لکھے ہیں پستی کی حالت میں ہو گئے اور نقصان اُٹھایا (ت) روح المعانی میں بھی ہے کہ ھبط مرتبہ میں گر جانے پر بولا جاتا ہے۔

شیطان کی وسوسہ اندازی

یہاں پر مفسرین نے بہت سے قصے اسرائیلیات سے داخل کر دیئے ہیں کہیں شیطان کو سانپ بنا کر اور کہیں چار پایہ بنا کر جنت میں داخل کیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے خود فرما دیا ہے کہ یہ بذریعہ وسوسہ اندازی کے تھا فوسوس لھما الشیطان (الاعراف ۷-۲۰) اور ہر ایک انسان کے دل میں شیطان وسوسہ اندازی سے ہی کام کرتا ہے یوسوس فی صدور الناس (الناس ۱۱۴-۵) چونکہ آدم جس جنت میں تھے وہ اطمینان قلب کی جنت ہے۔ اور وہ دار الخلد نہیں جو انسان کو موت کے بعد بطور جزائے اعمال عطا کی جاتی ہے جہاں شیطان کا گزر نہیں اس لئے شیطان کے وسوسہ ڈالنے پر کوئی اعتراض نہیں فطری بیگناہی گو ایک اطمینان قلب کی حالت ہے مگر وہ کامل اطمینان کی حالت نہیں جہاں شیطان وسوسہ اندازی نہیں کر سکتا۔ یہی دوسری حالت پر انسان کو صرف وحی الٰہی پہنچاتی ہے جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔

آدم کی لغزش

یہاں لفظ ازل یا زلّۃ اختیار کر کے بتا دیا کہ آدم سے جو کچھ ہوا بلا قصد ہوا اسی کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے فنسی ولم نجد لہ عزما (طٰہٰ ۲۰-۱۱۵) مطلب یہ ہے کہ گو فطری بیگناہی حاصل ہے مگر فطری کمزوری بھی ساتھ ہی لگی ہوئی ہے جب تک اللہ تعالیٰ سے وہ تعلق خاص حاصل نہ ہو جو وحی الٰہی سے پیدا ہوتا ہے اس وقت تک انسان کو ٹھوکریں لگتی رہتی ہیں۔

مما کانا فیہ سے مراد وہ حالت جنت یا حالت اطمینان قلبی ہے جس میں وہ تھے اس سے نکلوا دیا۔ کیونکہ جب گناہ آیا تو اطمینان قلب گیا۔

ھبوط آدم سے مراد

قلنا اھبطوا۔ یہ کہنا بلحاظ اس حالت کے ہے جو پیدا ہو گئی۔ گویا پہلے فعل کا نتیجہ یہ ہوا نتیجہ بھی چونکہ حکم الٰہی سے وارد ہوتا ہے اس لئے اس پر قلنا کا لفظ فرمایا دیکھو قول کے معنی ہیں ۲۵ اھبطوا میں ضمیر جمع ہے اس لئے خطاب آدم اور اس کی ذریت سب سے ہے یعنی سب انسانوں سے جیسا کہ فراء نے کہا ہے (ر) اور آدم اور حواء اور ہر ایک انسان کو یہ وحی تو ہوئی نہیں اس لئے قلنا اظہار حالت کیلئے ہی ہے۔ چونکہ یہ حالت نقصان کی تھی اس لئے ھبط کا لفظ استعمال کیا ہے۔

بعضکم لبعض عدو۔ اس میں شیطان کی عداوت کا ذکر نہیں۔ کیونکہ اس کی عداوت کو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے پہلے ہی جتلا دیا تھا ان ھذا عدو لک ولزوجک (طٰہٰ ۲۰-۱۱۷) پس یا تو انسانوں کی باہمی عداوت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تم فطرت کی حالت کو چھوڑتے ہو تو پھر ایک دوسرے کے دشمن بھی بن جاتے ہو اور یسفک الدماء کے مصداق بن جاتے ہو اور یا یہ مراد ہے کہ ہر انسان کے اندر دونوں قسم کی تحریکات ہیں وہ جو اس کو بلند مقام کی طرف لے جاتی ہیں اور وہ جو اس کو پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔ یوں گویا انسان کا اپنا ہی ایک حصہ دوسرے کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس معنی سے وجود شیطان کی نفی نہیں ہوتی۔

نفس انسانی اور شیطان

کیونکہ جس طرح انسان کا نفس بھی وسوسہ اندازی کرتا ہے ونعلم ما توسوس بہ نفسہ (ق ۵۰-۱۶) اور شیطان بھی وسوسہ اندازی کرتا ہے الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس (الناس ۱۱۴-۵،۶) اور نفس بھی بدی کا حکم دیتا ہے ان النفس لامارۃ بالسوء (یوسف ۱۲-۵۳) اور شیطان بھی بدی کا حکم دیتا ہے ولاٰمرنھم فلیغیرن خلق اللہ (النساء ۴-۱۱۹) اسی طرح شیطان بھی دشمن انسان ہے جیسا کہ بار بار قرآن میں فرمایا اور انسان کا نفس بھی جس پر حدیث بھی شاہد ہے اعدی عدوک نفسک التی بین جنبیک سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے شیطان کا تعلق نفس امارہ سے ہے اور اسی کا وہ جوش ہے۔

لقاء، تلقی۔

۵۷۔ تلقی۔ لقی سے ہے اور لقاء کے معنی کسی چیز کا سامنے آجانا اور اسے پالینا ہیں (غ) اور تلقی الشیء کے معنی لقیہ یعنی

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ ۳۸

ہم نے کہا سب اس (حالت) سے نکل جاؤ ۵۸ پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری

هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

ہدایت کی پیروی کی سو نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہونگے ۵۹

اس کو ملا گویا کلمات کو لے لینے اور قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے سے ان کا استقبال کیا ✦

کلم — کلمات۔ کلمۃ کی جمع ہے اور کلم وہ تاثیر ہے جو دو حاسوں میں سے کسی ایک کے ساتھ پائی جائے یعنی شنوائی کے حاسہ

کلمۃ — سے کلام یا بات اور بینائی کے حاسہ میں کلم یا زخم (غ)، اور کلمۃ سے مراد صرف لفظ مفرد نہیں بلکہ کلام بھی ہوتا ہے کبرت کلمۃ (الکہف ۵)،

تاب — تاب۔ توب سے ہے جس کے معنی رجوع ہیں اور جب بندہ کے لئے استعمال ہو تو مراد اللہ کی طرف لوٹ آنا اور جھک جانا اور

توبۃ — رجوع کرنا ہوتا ہے (ت)، یہ ضروری نہیں کہ پہلی حالت بری ہو بلکہ ایک اچھی حالت سے اس سے بہتر حالت کی طرف رجوع کرنا بھی توبہ ہے ایک خدا پرست بھی جب خدا کی طرف اور زیادہ فرمانبرداری سے جھکتا ہے تو وہ اس کی توبہ ہے۔ اور جب اللہ کے لئے ہو تو مراد اس سے

تواب — بندہ کی طرف مغفرت کے ساتھ عود کرنا ہوتا ہے (ت)، اسی سے تواب مبالغہ کا صیغہ ہے جو اسمائے الٰہی میں سے ہے ✦

فطری کمزوری کا علاج — جب آدم نے اپنے رب سے کلمات سیکھے تو اللہ نے اس پر رجوع برحمت فرمایا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو نقص اس میں تھا وہ دور کر دیا۔ گویا فطری کمزوری کے نقص کا علاج وحی الٰہی سے کیا گیا پس بندہ کی روحانی ربوبیت کا سامان خدا کے کلام میں ہے۔ اس

وحی الٰہی خارجی شے — سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کلام الٰہی انسان کے اندر کی آواز نہیں جیسا کہ سرسید نے غلطی سے خیال کر لیا۔ کیونکہ اگر یہ بات پہلے فطرت میں ہی موجود تھی تو فطرت کی کمزوری کا علاج خود فطرت کی آواز کس طرح کر سکتی ہے۔ علاج صرف خارجی ہو سکتا ہے اور خدا کے کلام سے یہ علاج ہوا۔ اس آیت میں ذکر صرف ابوالبشر حضرت آدم کا ہے کیونکہ کلمات صرف اس نے سیکھے دوسرے انسان سیکھ سکتے ہیں یا نہیں اور کس طرح؟ اس کا ذکر آگے آتا ہے ✦

اولاد آدم کا ہبوط اور اس کا علاج۔ — ۵۸ اھبطوا کا حکم تو پہلے بھی ہو چکا تھا دوبارہ کیوں فرمایا؟ پہلے آدم اور اس کی اولاد کا ذکر مشترک تھا۔ اس کے بعد فتلقی آدم من ربہ کلمات میں آدم کے ذکر کو الگ کر دیا۔ آدم ابوالبشر کو وحی عطا فرمائی مگر اس کے بعد ہر ایک انسان کو وحی نہیں دی جاتی تھی۔ اس لئے ان کے متعلق یہاں قانون بیان فرمایا کہ اس حالت ہبوط کا علاج یہ ہے کہ نسل انسانی میں وقتاً فوقتاً منجانب اللہ ہدایت آتی رہے گی۔ اس کی پیروی سے پھر انسان اس کھوئی ہوئی جنت کو اس اعلیٰ مقام روحانیت کو اس راحت و سکون کو حاصل کر سکتا ہے جس سے پھر وہ نکلے گا نہیں۔ پہلے آدم میں ابن آدم بھی شامل تھا یہاں آکر آدم نبی اللہ کو ابن آدم سے الگ کر کے دکھا دیا ✦

اِمّا — ۵۹ اِمّا مرکب ہے اِنْ حرف شرط سے اور ما سے جو تاکید کے لئے ہے اور اس کے بعد اکثر فعل تاکید آتا ہے ✦

ھدی — ھدی کے معنی پر دیکھو ع۵۔ یہاں وہ ہدایت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ انبیاء کے ذریعہ سے دنیا میں بھیجتا ہے ✦

تبع — تبع۔ کے معنی نقش قدم پر چلنا ہیں اور یہ کبھی حکم پر عمل کرنے سے ہوتا ہے جیسے یہاں (غ) ✦

خوف — خوف۔ کے معنی کسی مکروہ امر کی توقع جس کے مقابل پر جاء ہے جو کسی محبوب امر کی توقع ہوتی ہے خوف امن کی ضد ہے (غ)،

حزن — حزن، حُزْن اور حَزَن اصل میں زمین میں خشونت یعنی سختی کا ہونا ہے۔ پھر غم سے جو نفس میں خشونت پیدا ہوتی ہے اس کو بولا گیا ہے (غ) ✦

۳۹ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ع

اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہینگے ع۶۰

نسل انسانی میں نزول وحی کا قانون

جب آدم پر وحی کے نزول کا ذکر فرمایا تو اب نسل آدم کے لئے بھی قانون بتایا کہ ہر ایک پر وحی نہیں آئے گی بلکہ انسانوں میں کبھی کبھی کوئی ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آجایا کرے گی دوسری جگہ فرمایا اما یاتینکم رسل منکم (الاعراف ۷-۳۵) تمہارے پاس کبھی رسول آجایا کریں گے۔ یہ نسل انسانی کے ہادی ہوں گے اس طرح پر کہ جو شخص اس ہدایت کی جو وہ لائیں پیروی کرے گا (لفظ تبع یہاں قابل توجہ ہے ایمان نہیں بلکہ اس ہدایت کی پیروی کی ضرورت ہے) وہ اس اصل حالت پر قائم ہو جائے گا جہاں نہ شیطان کے حملے کا خوف ہے کہ وہ وسوسہ اندازی سے پھسلا دے اور نہ یہ غم ہوگا کہ یہ راہ اختیار کی یہ نہ کی کیونکہ انہوں نے صحیح راہ پر قدم مارا اس میں آخری کامیابی کی طرف اشارہ ہے گویا پہلی فطری حالت اس مقام امن تک نہ پہنچا سکتی تھی جہاں شیطان حملہ ہی نہ کر سکے مگر وحی الٰہی کے اتباع سے انسان اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق پیدا کرتا ہے کہ پھر وہ کبھی پھسلتا نہیں جیسا کہ فرمایا ان عبادی لیس لک علیھم سلطان (الحجر ۱۵-۴۲)، فطری حالت بھی ایک بیگناہی کی حالت ہے مگر چونکہ اس میں اللہ تعالیٰ سے وہ تعلق پیدا نہیں ہوا جس کی طاقت اس کمزوری کا علاج ہو جائے اس لئے وہ ابھی خوف کی حالت ہے کہ شیطان حملہ آور ہو کر اس جنت سے نہ نکال دے لیکن جس حالت امن و اطمینان پر وحی الٰہی کا اتباع پہنچاتا ہے وہ شیطان کے حملہ سے محفوظ ہے۔ اور یوں بتایا کہ وحی الٰہی کی ضرورت دنیا میں کیا ہے۔ فطرت انسانی کی کمزوری کا علاج صرف اللہ تعالیٰ کے طاقتور ہاتھ سے ہو سکتا ہے اور وہی انسان گرنے سے بچ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں اپنے آپ کو دیدیتا ہے۔ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون نجات کامل ہے جس کے متعلق دوسری جگہ فرمایا یایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (الفجر ۸۹-۲۷ تا ۳۰) +

فطری بیگناہی اور کامل عصمت

وحی کی ضرورت

تکذیب

ع۶۰ کذبوا۔ کذب سے ہے کَذَّبتہ کے معنی ہیں میں نے اس کی طرف جھوٹ منسوب کیا یعنی یہ کہا کہ تو جھوٹ کہتا ہے (غ) +

آیۃ

اٰیات۔ اٰیۃ کی جمع ہے اور یہ تایّ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی بات پر ثابت قدم ہونا اور اٰیۃ کے معنی ظاہر نشان ہیں اس لئے بلند عمارت کو بھی اٰیۃ کہتے ہیں اتبنون بکل ریع اٰیۃ (الشعراء ۲۶-۱۲۸) اور اٰیۃ رسالت یعنی پیغام الٰہی کو بھی کہتے ہیں اور دلیل اور معجزہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (ت)، اور یہی معنی اٰیۃ کے عموماً زیادہ تر موزون ہیں اس لئے آیات سے یہاں بعض مفسرین نے کتب منزلہ مراد لی ہیں (ر) اور قرآن کریم کے ہر ایک جملہ کو جو کسی حکم پر دلالت کرتا ہے آیت کہا جاتا ہے خواہ وہ ایک سورت ہو یا اس کی کئی فصلیں یا ایک فصل ہو (غ)، اور بعض کے نزدیک آیت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آیت کے معنی جماعت ہیں۔ اور ہر آیت میں الفاظ و حروف کی ایک جماعت ہوتی ہے اور یا یہ وجہ ہے کہ آیت کے معنی نشان ہیں اور کلام الٰہی کی آیات بطور اعجاز کے نشان ہیں +

اصحاب

اصحاب۔ صَاحِبٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں مُلَازِمٌ یعنی کسی شے کے ساتھ لگ جانے والا۔ خواہ مصاحبت جسم سے ہو خواہ عنایت و ہمت سے (غ) اصحاب النار وہ لوگ ہوئے جنہوں نے نار سے تعلق پیدا کر رکھا ہے گویا آگ کے ساتھ اُن کا ہر وقت تعلق ہے یہی تعلق آخرت میں کھلا رنگ اختیار کر لیتا ہے

اس دنیا کا دوزخ

اصل غرض تو انسان کو اس کے کمال کی راہ بتانا تھا مگر جب وہ بتا دی تو جو لوگ ان کے مقابل پر ہیں ان کا بھی ذکر کر دیا کہ وہ جب الٰہی پیغام آتا ہے تو نہ صرف اس کا انکار کرتے ہیں بلکہ اس کو جھوٹا بھی کہتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے اقوال و افعال میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں اور اس امن و اطمینان کی بجائے جو اتباع آیات کرنے والوں کو حاصل ہے لاخوف علیھم، ان کا تعلق نار کے ساتھ ہو جاتا ہے گویا ایک جلن اور قلق اور اضطراب ان کے اندر رہتا ہے یہ تو اس دنیا کی حالت ہے۔ اور آخرت میں وہی جنت و نار ایک ظاہری صورت اختیار کریں گے +

ع بنی اسرائیل اور کوئی ہوئی عظمت

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ۴۰

اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کی ع ۶۱

ابن

ع ۶۱ بنی - بَنُوْ - اَبْنَاء اِبْن کی جمع ہے - اور یہ لفظ بناء سے مشتق ہے جس کے معنی بنائی ہوئی چیز ہیں یا مصدر بنانا کے معنی ہیں - چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے والسماء بنیٰنٰہا (الذاریات ۵۱ - ۴۷) لایزال بنیانہم الذی بنوا ریبۃ (التوبۃ ۹ - ۱۱۰) قالوا ابنوا لہ بنیانا (والصٰفٰت ۳۷ - ۹۷) کانہم بنیان مرصوص (الصف ۶۱ - ۴) اور بیٹے کو اِبْن اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا وجود باپ سے ہوا - پھر ہر چیز کو جو کسی شے کی جہت سے یا اس کی تربیت سے یا اس کے تعاہد سے یا کثرت خدمت سے یا اس کے قیام امر سے حاصل ہو اس کا اِبْن کہا جاتا ہے - ابن حرب ابن العلم وغیرہ ابن السبیل مسافر ہے (غ)

اسرائیل - اسر ایل

اسرائیل عبرانی ہے اَسْر بمعنی عَبْد ہے عربی میں اَسْر کے معنی قید کرنا ہیں جس سے اسیر اور جمع اُسَارٰی اور اَسْرٰی ہے - اور اِیل اللہ تعالیٰ کا نام ہے اسی نام سے اللہ تعالیٰ کو حضرت مسیح نے صلیب پر پکارا پس اِسرائیل کے لفظی معنی عبداللہ یا اللہ کا بندہ ہوئے اور یہ حضرت یعقوب کا دوسرا نام ہے +

بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل

توحید الٰہی اور ضرورت نبوت کا ذکر کرکے اب ایک قوم کا ذکر نمونہ کے طور پر کیا ہے - بنی اسرائیل سے مراد وہ قوم ہے جو حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کی اولاد ہے - حضرت ابراہیم کی اولاد کی دوسری شاخ بنی اسمٰعیل ہیں یعنی حضرت اسمٰعیل کی اولاد پس بنی اسرائیل قوم جس کو یہاں خطاب کیا ہے اور بنی اسمٰعیل جن میں سے حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کا ظہور ہوا دو بھائی بھائی قومیں ہیں - بنی اسمٰعیل پہلے سے ملک عرب میں آباد ہوئے اور بنی اسرائیل کوئی ڈیڑھ سو سال کنعان میں رہ کر حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر میں چلے گئے - کوئی چار سو برس وہاں رہ کر حضرت موسٰی کے ساتھ ارض مقدس میں واپس آئے اور حضرت موسیٰ کے بعد حضرت یوشع کے ماتحت ارض مقدس کو فتح کیا - آنحضرت صلعم کے ظہور سے کئی سو

عرب میں یہودی

سال پیشتر بہت سے یہودی عرب میں آکر آباد ہوئے اغلب یہ ہے کہ نبی آخر الزمان کی پیشگوئیوں کی بنا پر انہوں نے یہاں سکونت اختیار کی - ان میں سے تین قومیں خاص مدینہ میں آباد تھیں بنو نضیر بنو قریظہ بنو قینقاع - خیبر میں بھی یہودی آباد تھے اور ان کی وہاں حکومت تھی +

بنی اسرائیل کے ذکر سے اصل مقصود

قرآن شریف میں کسی انسان کا ذکر ہو یا کسی قوم کا سب مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ہے - قصہ کے طور پر نہیں - بنی اسرائیل کا ذکر سب سے پہلے کیا ایک اس لئے کہ اس کا خاص تعلق بنی اسمٰعیل سے ہے پھر اس لئے کہ یہ قوم تمام نعمتوں کی وارث بھی ہوئی انبیاء ان کو کمال روحانی پر پہنچانے کے لئے مبعوث ہوئے ظاہری کمال ان کو فتوحات کی صورت میں عطا فرمایا چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ اس نعمت کا ذکر کیا ہے اذجعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا (المائدۃ ۵ - ۲۰) یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی نعمتوں سے اور اعلیٰ سے اعلیٰ جسمانی نعمتوں سے متمتع فرمایا - پھر تمام نعمتوں کے بعد اپنی بدعملیوں سے غضب کے نیچے بھی آئے - یہ سب کچھ مسلمانوں سے بھی ہوا - گویا انہی کی تاریخ بنی اسرائیل کے قصہ میں بطور ایک پیشگوئی کے لکھی گئی ہے اور یہ تفسیر زبان نبوی سے ہی سمجھنی چاہئے اس لئے کہ متفق علیہ حدیث میں ہے آپ نے فرمایا لتتبعن سنن من قبلکم تم بھی پہلوں کے طریق پر قدم بقدم چلو گے اور جب دریافت کیا گیا الیہود والنصارٰی یا رسول اللہ تو فرمایا ہاں اور کون - تو گویا اس آیت میں مسلمانوں کو وہ اعلےٰ سے اعلیٰ روحانی اور جسمانی نعمتیں یاد دلائی جاتی ہیں جو ان کو دی گئی تھیں اور جن دونوں سے وہ آج محروم ہیں ہاں اول اپنے آپ کو اپنے عمل سے نعمت روحانی سے محروم کیا تو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو ان پر مسلط کرکے نعمت جسمانی سے ان کو محروم کر دیا - اے کاش ہم قرآن سے کچھ سبق لیتے +

۴۱ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ○ وَاٰمِنُوْا

اور میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو ح ۶۲ اور اس پر ایمان

بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠

لاؤ جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے منکر نہ ہو ح ۶۳

ح ۶۲ ارھبون ۔ رَھْب کے معنی ایسا خوف ہے جس میں احتیاط طلبی ہوتی ہو اور اضطراب (غ) لانتم اشد رھبۃ (الحشر ۵۹-۱۳) ترھبون بہ عدو اللہ (الانفال ۸-۶۰) وغیرہ ۔ اسی سے تَرَھُّبْ یعنی عبادت ہے اور رَھْبانِیَّۃ عبادت میں غلو کا نام ہے ۔ فارھبو اصل میں فارھبونی ہے یعنی مجھ سے ہی خوف کرو ایای حصر کے لئے بڑھا دیا یعنی اور کسی کا ایسا خوف نہ ہو ۔ (حاشیہ: رھب — ترھب ۔ رھبانیۃ)

دونوں عہدوں کا ذکر کتاب استثناء ۲۶: ۱۷ و ۱۸ و ۱۹ میں ہے "تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کی شرعوں اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا اور خداوند نے بھی آج کے دن تجھ سے اقرار فرمایا جیسا کہ اس نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو اس کی خاص گروہ ہووے اور تو اس کے سب احکام کی محافظت کرے اور تجھے سارے گروہوں سے جنہیں اس نے پیدا کیا صفت اور عزت اور نام میں بالا کرے"۔ خداوند کی آواز کا شنوا ہونے کا یہ مطلب تھا کہ نبی آخر الزمان کو تسلیم کریں ۔ ایسا عہد مسلمانوں سے بھی لیا گیا تھا ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ (التوبۃ ۹-۱۱۱) اللہ نے مومنوں سے ان کے مالوں اور ان کی جانوں کو خرید لیا ہے اور اس کا معاوضہ جنت ہے اب مسلمان اس عہد پر قائم نہیں ہے ۔ اور یہی ان کی مصیبتوں کی اصل وجہ ہے ۔ (حاشیہ: بنی اسرائیل کا خدا سے عہد — مسلمانوں کا عہد)

ح ۶۳ مصدقا صِدْق سے ہے اور صدقت فلانا کے معنی ہیں میں نے اسے صدق کی طرف منسوب کیا (غ) ۔ (حاشیہ: صدق)

مصدقا لما معکم اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے ۔ تصدیق کے معنی ہیں کسی کو سچا قرار دینا ۔ اور مصدق کے بعد صلہ ل لانے سے یہ غرض ہے کہ یہ تصدیق اس کے فائدہ کے لئے ہے جس کی تصدیق کی گئی ہے ۔ قرآن کریم کو صرف بنی اسرائیل کی کتب کا مصدق ہی نہیں کہا گیا بلکہ دوسری جگہ کل کتب منزلہ کا مصدق بھی کہا گیا ہے مصدقا لما بین یدیہ من الکتٰب (المائدۃ ۵-۴۸) قرآن کریم ہی ایک کتاب ہے جس نے نہ صرف انبیائے بنی اسرائیل کو سچا قرار دیا بلکہ تمام دنیا کے انبیاء پر ایمان لانا ضروری قرار دیا مصدقا لما معکم کے ایک اور معنی بھی ابن جریر میں مروی ہیں کہ آنحضرت صلعم کی پیشگوئیاں ان کے پاس تھیں پس آپ کے ظہور سے ان پیشگوئیوں کی تصدیق ہوئی ورنہ ان کے غلط ہونے میں کوئی شبہ ہی نہ تھا مثال کے طور پر خود حضرت موسیٰ کی پیشگوئی کو لو "میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا" استثناء ۱۸: ۱۸ ۔ اب موسیٰ جیسا ایک نبی آنا اس پیشگوئی کی رو سے ضروری ہے ۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ بنی اسرائیل کے کسی نبی نے موسیٰ کی مثل نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی بنی اسرائیل کا کوئی نبی موسیٰ جیسا ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا کیونکہ وہ سب ایک رنگ میں حضرت موسیٰ کے خلفاء تھے یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک برابر یہودیوں کو اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا انتظار چلا آتا ہے ۔ چنانچہ حضرت یحییٰ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا ۔ تو لوگوں نے ان سے دریافت کیا ۔ کہ کیا تو مسیح ہے اس نے کہا نہیں ۔ پھر دریافت کیا گیا تو الیاس ہے اس نے کہا نہیں ۔ پھر دریافت کیا گیا تو وہ نبی ہے ۔ اس نے کہا نہیں ۔ یہاں وہ نبی پر تمام بائیبلوں میں استثناء ۱۸: ۱۸ کا حوالہ موجود ہے یعنی مثیل موسیٰ نبی (یوحنا ۱: ۲۱) اب ظاہر ہے کہ اس وقت تک (حاشیہ: مصدق لہ — قرآن کا سب کتابوں کا مصدق ہونا اور اس سے مراد — مثیل موسیٰ کی پیشگوئی — حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک تین نبیوں کا انتظار)

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۘ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ ۴۲

اور میری باتوں کے بدلے تھوڑا مول نہ لو اور میرا ہی تقویٰ اختیار کرو ۶۴ اور سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ اور (نہ)

تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ ۴۳

سچ کو چھپاؤ اور تم جانتے ہو ۶۵ اور نماز کو قایم کرو اور زکوٰۃ دو اور جھک جانے والوں کے ساتھ جھکے رہو ۶۶

یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت
یہود کو تین نبیوں کی انتظار تھی ان میں سے حضرت یحییٰ کو الیاس کی آمد کا مصداق خود حضرت عیسیٰ نے قرار دیا اور مسیح ہونے کا خود دعویٰ کیا مگر وہ مثیل موسیٰ نبی ابھی باقی رہ گیا۔ اور حضرت عیسیٰ کے بعد کوئی نبی ہوا نہیں پس اگر آنحضرت صلعم ظاہر ہو کر مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہ کرتے تو اس پیشگوئی کو ہی غلط ماننا پڑتا پس آنحضرتؐ کے ظہور سے اس پیشگوئی کی سچائی ظاہر ہوئی۔ اور دوسری طرف یہ عجیب بات ہے کہ آنحضرت صلعم کی بعثت ہی ابتدائی وحی میں یہ لفظ آتے ہیں کہ یہی وہ موسیٰ جیسا نبی ہے جیسا کہ سورہ مزمل سے ظاہر ہے کما ارسلنا الی فرعون رسولا اور یہ یہودیوں اور عیسائیوں پر آنحضرت صلعم کی صداقت کی ایسی اتمام حجت ہے جس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں۔ ایسا ہی اور کئی پیشگوئیاں ہیں جن کا مصداق ان میں کوئی نبی نہیں ہوا اور نبی صلعم کے ظہور سے ہی ان پیشگوئیوں کی سچائی ثابت ہوئی۔ یہی بالخصوص یہاں مراد ہے یعنی تم کو اس نبی کے ماننے میں کیا عذر ہے جو ان پیشگوئیوں کو پورا کرتا ہے جو تمہاری اپنی کتابوں میں ہیں +

ثمن قلیل
۶۴ تھوڑے مول سے مراد دنیوی زندگی کے فوائد ہیں۔ ان کی خاطر ہی اکثر انسان حق کو قبول کرنے سے رک جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے قل متاع الدنیا قلیل (النساء ۷۷) دنیا کا سارا سامان ہی ایک قلیل شے ہے +

لَبس
۶۵ تلبسوا۔ لَبس کپڑا پہننا ہے یا کپڑے سے اپنے آپ کو چھپا لینا۔ اسی سے لباس ہر دیکھو ۲۳۳ پھر ظاہر سے باطن کی طرف معنی چلے گئے ہیں اور لَبَسْتُ عَلَيْهِ اَمْرَهٗ کے معنی ہیں میں نے اس کا امر اس پر مخفی کر دیا (غ) +

حق
الحق۔ راغب کہتے ہیں کہ حق کے اصل معنی مطابقت اور موافقت ہیں۔ اور کئی وجہ پر اس کا استعمال ہے۔ اللہ تعالیٰ کو

الحق
بھی الحق کہا گیا ہے اس وجہ سے کہ وہ چیزوں کا اس کے مطابق جو اقتضائے حکمت ہے وجود میں لانے والا ہے ثم ردوا الی اللہ مولٰہم الحق (الانعام ۶۲) اور خدا کی پیدا کی ہوئی اشیاء کو اس لحاظ سے حق کہا جاتا ہے کہ وہ اقتضائے حکمت کے مطابق وجود میں آئی ہیں۔ اور ہر فعل و قول کو حق کہا جاتا ہے جو اس کے مطابق جو واجب ہے اور اس اندازہ سے جو واجب ہے اور اس وقت پر جو واجب ہے ہو (غ) اور حق کے بہت سے معنی میں سے صدق بھی ایک معنی ہیں (ت) اور حق نقیض باطل ہے +

باطل
باطل نقیض حق ہے وہ چیز جس کے لئے جب تحقیق کیا جائے تو کوئی ثبات نہ ہو +

حق و باطل کی ملاوٹ
یہاں حق سے مراد وہ پیشگوئیاں ہیں جو اب تک ان کی کتابوں میں چلی آتی تھیں اور باطل ان کی اپنی خواہشات جن کے ساتھ پیشگوئیوں کو خلط کرتے تھے۔ پیشگوئیوں کو چھپانے کا ذکر دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے قالوا اتحدثونہم بما فتح اللہ علیکم (۷۶) اپنے پیروؤں کو کہتے ہیں تم ان سے وہ باتیں کرتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں +

زکوٰۃ
۶۶ الزکوٰۃ۔ زکا سے مشتق ہے اور کھیتی میں نمو آنے یا اس کے بڑھنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اسی سے زکوٰۃ ہے اور یہ وہ مال ہے جو فقراء کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوٰۃ اس لئے کہا گیا کہ حقیقۃً اس سے برکت ہوتی ہے یعنی مال بڑھتا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ اس سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے (غ)

رکوع
ارکعوا۔ رکوع کے اصل معنی جھک جانا ہیں۔ اور ایسی فرمانبرداری پر بولا جاتا ہے جب انسان دوسرے کے آگے جھک

۴۴ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو پس کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے [۹۶]

جائے۔ اور اصطلاح شریعت میں ارکان نماز میں سے ایک رکن ہے جب انسان دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر اس قدر جھکتا ہے کہ پیٹھ اور گردن بالکل سیدھی ہو جائے یہاں اصل معنی ہی مراد ہیں +

نماز و زکوٰۃ — پہلے ایمان کی طرف بلایا تھا اب بتایا کہ صرف مُنہ سے مان لینا ہی کافی نہیں بلکہ ان دو باتوں کو بطور اصول قبول کرنا ضروری ہے جن کو اسلام نے پاکیزگی نفس یا کمال نفس کا ذریعہ قرار دیا ہے یعنی نماز کا قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔ اول کمال حسن کے لئے ہے دوئم کمال احسان کے لئے کیونکہ نماز سے زیادہ تر غرض ان کمالات انسانی کا حصول ہے جو اپنے نفس سے تعلق رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے +

وارکعوا میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے انسان کی گردن جھکی رہنی چاہئے +

بِرّ۔ بَرّ — **۹۶** البرّ۔ بِرّ نیکی میں وسعت یا بڑی نیکی کو کہتے ہیں (غ) کیونکہ بَرّ خشکی کے وسیع قطعہ کو کہتے ہیں +

نسیان — تنسون۔ نِسیان انسان کا اس چیز کے ضبط کو چھوڑ دینا ہے جس کی اسے ودیعت کی گئی ہو۔ خواہ ضعف قلب سے یا لاپروائی سے یا ارادۃً یہاں تک کہ اس کی یاد دل سے جاتی رہے (غ)، وہ نسیان قابل مواخذہ ہے جو عمداً ہو۔ جیسے فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم ھذا (السجدۃ ۳۲ : ۱۴) یہاں بھی وہی نسیان مراد ہے جو عمداً ہو کیونکہ دوسروں کو نصیحت کرنے والا عمداً ہی ترک کرتا ہے +

تلی۔ تلاوت — تتلون۔ تلی کے اصل معنی ہیں اس کی پوری پوری پیروی کی خواہ جسم سے ہو یا اقتدائے حکم سے (غ)، اور تلاوت کتب منزل من اللہ سے مخصوص ہے خواہ قرأت سے ہو اور خواہ ان پر عمل کرنے سے (غ)، اس لفظ کو اللہ کی کتابوں سے مخصوص کر کے یہ بتا دیا کہ ان کی تلاوت کی اصل غرض ان کی پیروی ہے +

عقل — تعقلون۔ عَقل کے اصل معنی روکنا اور پکڑ لینا ہیں جیسے عقال (اونٹ کا گھٹنا باندھنے کی رسی) سے اونٹ کا روک لینا (غ)، حدیث میں ہے اعقل وتوکل جہاں اعقل کے معنی گھٹنا باندھ دو ہیں۔ امام راغب کہتے ہیں عقل کا استعمال دو طرح پر ہے ایک اس قوت کو عقل کہا جاتا ہے جو قبول علم کے لئے انسان کو تیار کرتی ہے اور دوسرے اس علم کو بھی عقل کہا جاتا ہے جو اس قوت کے ذریعہ سے انسان حاصل کرتا ہے اور لکھتے ہیں کہ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے عدم عقل کے لئے کفار کی مذمت کی ہے وہاں یہ دوسرے معنی ہی مراد ہیں۔ اور یہ بات صاف بھی ہے قوت تو اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کے اندر رکھی ہے قابل الزام وہی ہیں جو اس قوت سے کام نہیں لیتے +

واعظ کیلئے ضرورت عمل — یہاں بالخصوص خطاب علما سے ہے جو دوسروں کو لمبے چوڑے وعظ کرتے ہیں اور اپنی اصلاح نہیں کرتے۔ اگر خطاب بنی اسرائیل کے علما سے لیا جائے تو رسول اللہ صلعم کی پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلائی ہے مگر میرے نزدیک خطاب مسلمانوں سے ہے۔ اس طرح دونوں خطابوں کو ملانے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کہا گیا ہے جب تک واعظ خود عامل نہ ہو اس کا وعظ دوسروں پر بھی اثر نہیں کرتا +

مذہب میں عقل سے استعمال کی ضرورت — افلا تعقلون اس قسم کے فقرات قرآن شریف میں بکثرت آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل اللہ تعالیٰ نے انسان کو بڑا جوہر دیا ہے اور اس سے کام لئے بغیر انسان صداقت کو بھی نہیں پا سکتا اور نہ سچے مذہب کی اور سچے طریق کی اسے شناخت حاصل ہو سکتی ہے مفردات میں حدیث نقل کی ہے ما خلق اللہ خلقا اکرم علیہ من العقل۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کی نگاہ میں عقل سے زیادہ عزت والی ہو۔ اسی سے انسان کی فضیلت حیوان پر ہے یہ کہنا کہ مذہب میں

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ ۴۵

اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگتے رہو اور یقیناً یہ بڑی مشکل ہے مگر عاجزی کرنے والوں کے لئے (نہیں) ۶۸

الربع

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ ۴۶

جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور کہ وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ۶۹

عقل اور وحی

عقل کا دخل نہیں صحیح قرآن شریف کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ملزم کرتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وحی سے وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کو عقل خود دریافت نہیں کرسکتی لیکن عقل کا عجز ان باتوں کے معلوم کرنے سے اور چیز ہے اور ان باتوں کا عقل کے مطابق ہونا اور ان کی صداقت کو عقل سے معلوم کرلینا بالکل الگ ہے۔ وحی فطرت کی روشنی یعنی عقل کو جلا دینے والی اور تیز کرنے والی چیز ہے ایک کو دوسرے کا مخالف بنانا دونوں کی حقیقت سے بیخبر ہونے کا نتیجہ ہے۔

صبر

۶۸ الصبر۔ صبر اصل میں تنگی کے اندر روک رکھنے کا نام ہے اور پھر اپنے آپ کو روک رکھنے کا نام ہے اس چیز پر جس کو عقل اور شریعت چاہتی ہوں (غ)، بالفاظ دیگر طاعت پر قائم رہنے اور معصیت سے رُکے رہنے کا نام صبر ہے پس صبر ایک عام لفظ ہے اور مصیبت میں استقلال جنگ میں ثبات اور روزہ کو صبر کہا ہے۔

کبیرۃ۔کبُر

کبیرۃ۔ کبیر کے اصل معنی بڑا ہیں مگر کبیرۃ کا استعمال اس چیز پر بھی ہے جو سخت اور دشوار ہو۔ کبُر بھی اس معنی میں آیا ہے۔ وان کان کبر علیک اعراضھم (الانعام۶۔ ۳۵)

خشوع

خاشعین۔ خشوع عاجزی۔ فروتنی (غ)، سکون اور فرمانبرداری (ت) ہے۔ آواز کی پستی کے لئے اور نگاہ کے نیچا ہونے کے لئے یہ لفظ بالخصوص بولا جاتا ہے۔ قرآن شریف میں ہے خشعت الاصوات (طٰہٰ۲۰۔ ۱۰۸) خاشعۃ ابصارھم (القلم۶۸۔ ۴۳)۔

طریق استعانت

قرآن کریم نے مومن کو مشکلات کے وقت جو طریق استعانت بتایا ہے۔ وہ صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ ہے صبر اصول حقہ پر مضبوط رہنے کا نام ہے۔ اور صلوٰۃ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا۔ صبر تو یہ چاہتا ہے کہ انسان ایک بات پر ایسا اڑا رہے کہ کسی مخالفت کی اور کسی روک کی اسے کچھ پروا نہ ہو تمام دنیا بھی اس کے خلاف ہو تو ایک مضبوط پہاڑ کی طرح اس کے قدم میں جنبش نہ آئے۔ اور صلوٰۃ یہ چاہتی ہے کہ وہ اس قدر عاجز ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گرا رہے اور اپنے آپ کو کچھ بھی نہ سمجھے۔ جب انسانوں کے سامنے حد درجہ کی مضبوطی اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں حد درجہ کی عاجزی انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ تب کامیابی کی راہیں سہل ہوجاتی ہیں۔ اور مشکلات کے پہاڑ بھی ہوں تو اُڑ جاتے ہیں۔

مصائب میں توجہ الی اللہ کی ضرورت

انھا میں ضمیر بعض مفسرین نے استعانت کی طرف لی ہے یعنی صبر و صلوٰۃ سے مدد چاہنا عام لوگوں کو دشوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر بعض نے اسے صرف صلوٰۃ کی طرف لیا ہے اور میرے نزدیک یہی درست ہے جیسا کہ سیاق عبارت بتاتا ہے۔ کیونکہ خدا کے حضور عاجزی اختیار کرنا مصائب میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا یہ انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایسا یقین کامل رکھتے ہیں کہ اس سے ملاقی ہونے کا بھی انہیں یقین حاصل ہوتا ہے۔ یہاں استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا حکم دے کر صلوٰۃ کے ذکر کو جاری رکھا ہے کیونکہ یہاں نبی کی شناخت یا اس پر ایمان کا ذکر ہے اور یہ مقصد دعا سے ہی زیادہ حاصل ہوتا ہے اور دوسری جگہ بعینہٖ یہی حکم دیکر (دیکھو آیت ۱۵۳) صبر کے ذکر کو جاری رکھا ہے کیونکہ وہاں جنگ کا ذکر ہے اور دشمن کے مقابلہ کا۔ جہاں گو دعا کی بھی ضرورت ہے مگر مقدم استقلال ہے۔

ظن

۶۹ یظنون۔ ظن اس چیز کا نام ہے جو نشانات سے حاصل ہو اور جب یہ مضبوط ہو تو علم کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور جب بہت ہی کمزور ہو تو توہم کی حد سے آگے نہیں بڑھتا (غ)، ظن شک اور یقین دونوں پر بولا جاتا ہے جب یقین مراد ہو تو ایسا یقین ہوتا ہے

ركوع ۶

بنی اسرائیل پر انعام اور ان کی نافرمانی

۴۷ يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ

اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کی اور یہ کہ میں نے تمہیں

۴۸ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ

قوموں پر فضیلت دی [۴۷] اور اس دن سے بچاؤ کرلو جب کوئی جی کسی جی کے کچھ کام نہیں

شَيۡـًٔـا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ۝

آئے گا اور نہ اس سے سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس سے معاوضہ لیا جائیگا اور نہ انہیں مدد دی جائیگی [۴۸]

جو تدبر سے حاصل ہو نہ وہ جو دیکھنے سے حاصل ہو کیونکہ جو یقین دیکھنے سے حاصل ہو اس پر صرف لفظ علم بولا جاتا ہے (ت)۔ یہاں ظن سے مراد یقین ہی ہے اور اس پر مفسرین کا قریباً اتفاق ہے ✦

لقاء — ملٰقوا۔ لقاء کسی چیز کے سامنے آجانے اور اسے پالینے دونوں کو کہا جاتا ہے لیکن الگ الگ دونوں مضمونوں کے ادا کرنے پر بھی بولا جاتا ہے ✦

رجوع — راجعون۔ رُجُوع لوٹ کر جانے کا نام ہے اس کی طرف جس سے ابتدا ہو یا تقدیراً ابتدا خواہ بلحاظ مکان کے ہو یا فعل کے یا قول کے (غ)۔

لقاء اللہ — رب کی ملاقات سے کیا مراد ہے۔ یہ ذکر قرآن شریف میں بار بار آتا ہے اور کافروں کو ملزم کیا ہے کہ وہ لقاء اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔ ان الذین لا یرجون لقاءنا ورضوا بالحیٰوۃ الدنیا (یونس ۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ محض دنیا کی زندگی کو غرض وغایت سمجھ لینا انکار لقاء اللہ ہے سورہ کہف کے آخر میں ان لوگوں کا ذکر کرکے جو سارا زور دنیا کی زندگی پر ہی صرف کردیتے ہیں فرمایا اولٰئک الذین کفروا بآیات ربھم ولقائہ اور ایک جگہ فرمایا انک کادح الی ربک کدحا فملٰقیہ (الانشقاق ۶)۔ پس لقاء اللہ سے مراد وہ اعلیٰ زندگی ہے جو مومنوں کو میسر آتی ہے۔ اور گو کامل رنگ لقاء اللہ کا بعد موت یا قیامت میں ہی میسر آئے گا لیکن جو لوگ اسی زندگی میں جنت کو پالیتے ہیں یعنی نفوس مطمئنہ وہ یہاں بھی خدا کے حضور ہی زندگی بسر کرتے ہیں پس لقاء اللہ یا اللہ کو پالینا اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد انسانی زندگی کا ہے ✦

رجوع الی اللہ — الیہ راجعون۔ موت کے بعد سب انسانوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جانا آیت ۲۸ میں بیان ہوچکا ہے۔ پس اس سے مراد حساب وکتاب کے لئے اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے ✦

بنی اسرائیل کی فضیلت — [۴۷] جیسا کہ [۲] میں دکھایا جاچکا ہے۔ ہر زمانہ کے لوگ ایک عالم کہلاتے ہیں پس مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو اپنے زمانہ کی قوموں پر فضیلت دی گئی۔ اس کے مقابل پر مسلمانوں کے متعلق فرمایا کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تم تمام قوموں میں سے جن کو لوگوں کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا بہترین قوم ہو۔ بنی اسرائیل کو یہاں دوسری مرتبہ خطاب کیا ہے پہلی مرتبہ خطاب کرکے ان کو وہ پیشگوئیاں یاد دلائی تھیں جو ان کی کتابوں میں رسول اللہ صلعم کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ اب دوسری مرتبہ خطاب کرکے ان کو وہ نعمتیں یاد دلائی جاتی ہیں جو خدا تعالیٰ نے ان کو دی تھیں ✦

جزا — [۴۸] تجزی۔ جزا کے اصل معنی کام آنا کافی ہونا (غ) یا ادا کرنا اور عوض دینا (ج) ہیں۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جو حق ایک کے ذمہ ہے اسے دوسرا کوئی ادا نہ کرسکے گا ✦

شفع — شفاعۃ۔ شفع (جفت) سے مشتق ہے شفع کے اصل معنی ہیں ایک شے کو اس جیسی دوسری شے سے ملا دینا (غ)، اور

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ ۴۹

اور جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے چھڑا لیا جو تمہیں بڑے بڑے دُکھ پہنچاتے تھے تمہارے بیٹوں کو مار

اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝

ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی نعمت (یا آزمائش) تھی[۴۲]

شفاعة شفاعت کے معنی ہیں کسی دوسرے سے مل جانا اس کی مدد کرتے ہوئے اور اس کا حال دریافت کرتے ہوئے۔ اور اکثر استعمال اس کا اس طرح ہے کہ ایک اعلیٰ عزت اور مرتبہ والا اس کے ساتھ ہو جائے جو ادنیٰ ہے۔ اور اسی سے قیامت کی شفاعت ہے (غ) ◆

مسئلہ شفاعت شفاعت کا مسئلہ شریعت اسلامی میں مسلّم ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ بعض گناہ ایک انسان کے پاک لوگوں کے ساتھ تعلق کی وجہ سے معاف کر دیئے جائیں۔ اسلام کی اصل تعلیم یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے افعال کا ذمہ وار نہیں ہو سکتا۔ نہ ایک کی ذمہ داری کو دوسرا ادا کر سکتا ہے شفاعت کا مسئلہ اس اصول کو باطل نہیں کرتا اور اس کے یہ معنی نہیں کہ جس کی سفارش چل گئی وہ بچ گیا۔ بلکہ جس طرح ہم اس دنیا میں شفاعت کو کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں کہ مثلاً نبی کریم صلعم کے ساتھ تعلق رکھنے والے کس طرح گناہوں سے پاک ہو گئے اور یہ محض آپ کی شفاعت یا آپ سے تعلق کا نتیجہ تھا۔ اور آپ کی دعاؤں نے جو اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے حق میں آپ کرتے تھے یہ انقلاب پیدا کر دکھایا۔ اسی سے قیامت کی شفاعت کا قیاس ہو سکتا ہے حق یہ ہے کہ انسان کی نجات اللہ کے رحم اور فضل پر موقوف ہے پھر یہ فضل و رحم اولاً انسان کے اعمال پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ پھر بعض نیکوں کے ساتھ سچے تعلق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جب انسان نیک نیتی سے بعض غلطیاں کر بیٹھتا ہے۔ یا اپنی غفلت کی وجہ سے معذور ہوتا ہے گو دل میں نیکی کی تڑپ رکھتا ہے تو صلحا کی دعا سے اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کا رحم خالق و مالک ہونے کی حیثیت سے خود بھی جوش مار کر اپنی مخلوق کی دستگیری فرماتا ہے چنانچہ شفاعت کی حدیث ذیل جو بخاری اور مسلم میں آئی ہے اس کی تصدیق کرتی ہے اور وہ حدیث یہ ہے شفعت الملٰئکۃ وشفع النبیون وشفع المومنون ولم یبق الا ارحم الراحمین فیقبض قبضۃ من النار فیخرج منها قوما لم یعملوا خیرا قط یعنی اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ فرشتوں نے بھی شفاعت کی نبیوں نے بھی شفاعت کی مومنوں نے بھی شفاعت کی اور سوائے ارحم الراحمین کے کوئی باقی نہیں رہا پس وہ آگ میں سے ایک مٹھی بھر لیگا اور ایسے لوگوں کو باہر نکالیگا جنہوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔ یہاں تین شفاعتوں کا ذکر ہے ایک ملائکہ کی۔ ایک انبیاء کی ایک مومنوں کی۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ کا تعلق بہت وسیع ہے یعنی کل نیکی کرنے والوں سے۔ انبیاء کا تعلق صرف اپنی اپنی اُمتوں سے اور مومنوں کا تعلق بہت ہی محدود ہے پس ملائکہ ہر ایک نیکی کرنے والے کی شفاعت کرینگے انبیاء اپنی اپنی اُمتوں اور مومن اپنے ساتھ خاص تعلق رکھنے والوں کی اور جنہوں نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی یعنی نہ ان کا تعلق کسی مومن سے ہوا نہ کسی نبی سے نہ ملائکہ سے جو نیکیوں کے محرک تھے ان پر خود اللہ تعالیٰ کا رحم جوش ماریگا۔ اس میں مفہوم شفاعت بتایا ہے کہ اصل غرض گنہگاروں پر رحم ہے جس کیلئے ایک یا دوسرا سامان خدا تعالیٰ نے پیدا کر دیا ہے۔ یہاں عیسیٰ مسیح والی شفاعت نہیں کہ صلیب اور کفارہ پر ایمان لانیوالے تو سب بچ جائیں خواہ کچھ ہی کرتے رہے ہوں اور دوسرے لوگوں نے خواہ کتنی بھی نیکی کی ہو ان پر رحم قطعاً نہ ہوگا۔ اور نہ یہ شفاعت سفارش ہے جو ایک انسان پیش کر سکے بلکہ محض کامل مومنوں اور انبیاء کے اور خود خالق عالم کے رحم کے جوش میں آنے کا نتیجہ ہے ◆

اس آیت میں بنی اسرائیل کو توجہ دلائی ہے کہ ان کی نافرمانی کی حالت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ خدا کے رحم سے وہ بالکل دور جا پڑے ہیں۔ انسان کے بچاؤ کے سامان یہی ہوتے ہیں کہ کوئی دوسرا کام آ جائے۔ کوئی سفارشی ہو۔ کوئی معاوضہ لے لیا جائے کوئی رحم کر کے مددگار بن جائے مگر ان کو بتایا کہ انہوں نے اپنے آپ کو ان سب سامانوں سے محروم کر لیا ہے آج یہی حالت مسلمانوں کی ہے اور سبق لینے کا مقام ہے

نجاۃ ۴۲ نجّینا۔ نجات کا مادہ نجو ہے اور نجوۃ بلند زمین کو کہتے ہیں پس نجات کے معنی الارتفاع من الهلاك ہیں یعنی ہلاکت سے بلند ہو جانا (ت) یا جس چیز میں خوف ہو اس سے مخلصی پا لینا۔ راغب کہتے ہیں کہ نجاء کے اصل معنی کسی چیز سے الگ ہو جانا ہیں پس

۵۰ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝

اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو الگ کر دیا پس ہم نے تمہیں بچا لیا اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے[۴۳]

نجات کے معنی اسلام میں گناہ سے جو ہلاکت پیدا کرتا ہے بلند ہو جانا یا اس سے بالکل الگ ہو جانا اور مخلصی پالینا ہے +

آل۔ اھل

آل۔ اھل کی بدلی ہوئی صورت ہے آل اور اھل میں فرق یہ ہے کہ آل صرف معرفہ کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اھل عام ہے۔ نکرہ کی طرف یا مکان یا زمانہ کی طرف بھی منسوب ہو سکتا ہے اور دوسرے آل کا لفظ اشرف اور افضل لوگوں کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اھل ہر ایک کی طرف منسوب ہو سکتا ہے اور بعض کے نزدیک اس کا استعمال سوائے خصوصیت ذاتی کے نہیں ہوتا۔ خواہ وہ قریبی قرابت کے لحاظ سے ہو یا دوستی اور تعلق کے لحاظ سے ہو۔ اس لئے آل محمد صلعم اور اُمت محمد صلعم میں یہ فرق ہے کہ اُمت محمد صلعم میں سب نام لیوا داخل ہیں مگر آپ کی آل میں وہی لوگ کہلائیں گے جو علم یقینی اور عمل مضبوط کی خصوصیت رکھتے ہوں (غ)

آل محمد اور اُمت محمد

فرعون رعمیس

فرعون۔ مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا وہ خاص فرعون جس کا یہاں ذکر ہے رعمیس ثانی تھا +

سام

یسومون۔ سوم کے اصل معنی کسی چیز کی طلب میں نکلنا ہیں۔ پھر خالی جانے پر اور صرف طلب پر بھی اس کا استعمال ہو جاتا ہے اور یہاں طلب کے معنی میں ہی ہے (غ) اور سامہ کے معنی یہ بھی آتے ہیں کہ ایک سخت کام اس پر ڈال دیا (ر)

ذبح

یذبحون۔ ذبح کے اصل معنی جاندار چیز کا حلق کاٹنا ہے۔ مگر محض کاٹنے یا محض ہلاکت پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے +

بلی۔ بلاء

بلاء۔ بلی سے ہے جو کپڑے کے پُرانا ہونے پر بولا جاتا ہے۔ اور بلی کے معنی آزمانا اس لئے آتے ہیں کہ گویا کثرت آزمائش سے اسے بڑھا کر دیا غم اور تکلیف کو بھی اسی لئے بلاء کہتے ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش بعض وقت بذریعہ مصائب کے ہوتی ہے اور بعض وقت خوشی اور راحت پہنچانے سے اس لئے انعام کو بھی بلاء کہا جاتا ہے حضرت عمرؓ کا قول ہے بُلِيْنَا بِالضَّرَّآءِ فَصَبَرْنَا وَبُلِيْنَا بِالسَّرَّآءِ فَلَمْ نَصْبِرْ اور قرآن شریف میں بھی ہے وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (الانبیاء ۲۱-۳۵) اور یہاں بلاء میں اس تکلیف و مشقت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جس کا ذکر یذبحون میں ہے اور اس انعام کی طرف بھی جس کا ذکر نجات دینے میں ہے +

بنی اسرائیل سے ذلیل کام کروانا۔

بنی اسرائیلی لڑکوں کا مارنا۔

سوء العذاب یا بڑا دُکھ جس کا یہاں ذکر ہے۔ بائبل میں اس کے متعلق ہے "اور مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی" (خروج ۱: ۱۳ و ۱۴) لڑکوں کے مارنے کا حکم بھی فرعون نے دیا تھا "تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائی جنائیوں کو ...... یوں کہا کہ ... اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو اور بیٹی ہو تو جینے دو" (خروج ۱: ۱۵ و ۱۶) فرعون اور اس کی قوم نہ چاہتی تھی کہ ایک دوسری قوم ان کے ملک میں قوت پکڑے اس لئے ذلت اور بیگار کے کام سب ان سے لینے شروع کئے۔ لڑکوں کو مارنے اور لڑکیوں کو جیتا رکھنے سے بھی یہ منشاء تھا کہ قوم نابود ہو جائے کیونکہ لڑکیاں مجبور ہو کر مصریوں کے نکاح میں آئیں۔ حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان تمام مصیبتوں سے چھڑایا +

فرق۔ فلق

[۴۳] فرقنا۔ فرق اور فلق کے ایک ہی معنی ہیں لیکن فرق علیحدہ ہونے کے لحاظ سے اور فلق پھٹ جانے کے لحاظ سے کہا جاتا ہے (غ)، مگر پانی کے پھٹ جانے سے مراد بھی اس کا ہٹ جانا ہی ہے دوسری جگہ فرمایا فانفلق۔ دریا پھٹ گیا (الشعراء ۲۶-۶۳)

بَحْر

البحر بحر۔ اصل میں اس وسیع جگہ کا نام ہے جس میں بہت سا پانی جمع ہو (غ) اس لئے دریا سمندر سب پر بولا جاتا ہے پھر بلحاظ معنی وسعت پر بولا جاتا ہے جیسے تبحّر فی العلم یعنی علم میں وسعت اور گھوڑے کو جو بہت چلنے والا ہو بحر کہدیتے ہیں

وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوسٰى أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ۵۱

اور جب ہم نے موسےٰ سے چالیس رات کا وقت مقرر کیا ۷۴

بحَرَ جیسے آنحضرت صلعم ابوطلحہ کے ایک گھوڑے پر سوار ہوئے تو فرمایا انا وجدناہ لبحرًا۔ اور اسی لئے بَحَرَ کے معنی زیادہ پھاڑ دیا بھی ہیں جس سے **بَحِیرۃ۔ بِحار** بَحِیرۃ آتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا اور شہروں اور بستیوں کو بھی بِحار کہا جاتا ہے (ن)۔

بنی اسرائیل کا عبور دریا قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے دریا پار ہونے کا ذکر کئی جگہ ہے۔ مگر کہیں یہ ذکر نہیں کہ دریا میں بارہ رستے بن گئے تھے اور پانی کی دیواریں کھڑی رہ گئی تھیں اور ان میں دریچے بن گئے تھے۔ نہ کسی صحیح حدیث میں یہ مضمون ہے۔ یہاں فرقنا بکم البحر فرمایا یعنی دریا کو تم سے الگ کر دیا۔ دو جگہ فرمایا وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر (الاعراف ۱۳۸۔ یونس ۹۰) یعنی بنی اسرائیل کو ہم نے دریا پار کر دیا۔ ایک جگہ فرمایا فانفلق (الشعراء ۶۳) یعنی دریا پھٹ گیا۔ دریا پھٹنے سے مراد یہی ہوتی ہے کہ خشک راستہ ہو گیا اور ایک جگہ فرمایا فاضرب لھم طریقا فی البحر یبسا (طٰہٰ ۷۷) دریا میں ان کو خشک راستہ پر لے جاؤ۔ اور ایک جگہ فرمایا۔ واترک البحر رھوا (الدخان ۲۴) دریا کو ٹھہرا ہوا یا درمیان میں چھوڑ کر پار ہو جاؤ نہ کہیں بارہ رستوں کا ذکر ہے نہ پانی کی دیواروں کا۔ ہاں خشک راستہ کس طرح ہو گیا یا دریا کس طرح پھٹ گیا یہ قرآن شریف نے بیان نہیں فرمایا۔ بائبل میں صرف اس قدر ہے کہ "خداوند نے بہ سبب پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلایا اور دریا کو سکھا دیا" (خروج ۱۴: ۲۱)

اس قدر صاف ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر دشت سینا میں لائے دریا درمیان میں کہاں حائل ہوا۔ بائبل اور مفسرین بائبل نے اسے بحیرہ قلزم کا شمالی حصہ موجودہ شہر سویز سے کچھ اوپر قرار دیا ہے ممکن ہے وہاں کوئی تنگ حصہ سمندر کا اس زمانہ میں ہو جہاں سے پانی کے آندھی سے جیسا کہ بائبل کہتی ہے یا جوار بھاٹے سے ہٹ جانے سے خشک راستہ نکل آیا ہو۔ مگر زیادہ تر قرین قیاس یہ ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو اتنی دور آنے کی مہلت نہیں دی اور شاید یہ واقعہ دریائے نیل سے تعلق رکھتا ہو یا کسی اور دریا سے جو درمیان میں حائل ہوا ہو۔ دریاؤں میں یہ بسا اوقات ہو جاتا ہے کہ ایک وقت دریا پایاب ہوتا ہے اور آناً فاناً ایک ایسی خطرناک رَو آتی ہے کہ سیلاب آ جاتا ہے۔ جو دریا پہاڑوں سے نکلتے ہیں ان میں یہ واقعات اکثر پیش آ جاتے ہیں خود دریائے نیل کے متعلق یہ امکان ہے کہ پرانے زمانے میں یہ اس قدر بڑا نہ ہو۔ اور کوئی حصہ اس کا پایاب ہو اور فرعون نے جوش تعاقب میں کہ بنی اسرائیل کو پکڑ لیں یہ خیال نہ کیا ہو کہ رَو کا پتہ لے۔ بہر حال وہ اسباب جو اس طرح پر گزارنے اور فرعونیوں کو غرق کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیئے معمولی ہوں یا غیر معمولی۔ اس سے احسان میں فرق نہیں آتا۔ اگر نبی کریم صلعم کو دشمنوں سے غار میں چھپا کر بچا لینا۔ اگر مدینے کے گرد محاصرہ کی ہوئی فوج کو ایک آندھی سے ہٹا دینا انعامات الٰہی ہیں تو معمولی اسباب سے ایک نتیجہ کا پیدا ہو جانا کسی طرح احسان کی نوعیت کو نہیں بدل سکتا ۷۴۔

واعدنا واعدنا۔ وعد سے باب مفاعلہ ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا اور حضرت موسیٰ کی طرف سے اسکا قبول کرنا

موسیٰ موسیٰ۔ عبرانی نام ہے۔ ہمارے مفسر اس کو مو بمعنی ماء یعنی پانی اور شیٰ بمعنی شجر سے مرکب بتاتے ہیں اور بعض اس کو ماس یمیس سے فعلی کا وزن بتاتے ہیں مفسرین بائبل اس کو ماشہ (نکلنا) سے مشتق بتاتے ہیں اور تازہ تحقیقات یہ ہے کہ یہ مصری لفظ ہے جس کے معنی بچہ یا بیٹا ہیں۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل میں سے نہایت اولوالعزم نبی ہیں آپ کے والد کا نام عمران تھا اور مصر میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کی بہن مریم آپ سے بہت بڑی تھیں اور ہارون آپ سے تین سال بڑے تھے۔ آپ کا زمانہ

رعمیس ثانی کا زمانہ عموماً پندرہ سو قبل مسیح سمجھا گیا ہے مگر تازہ تحقیقات یہ ہے کہ آپ کا زمانہ تیرہ سو قبل مسیح کے قریب ہے کیونکہ رعمسس ثانی کا زمانہ جس کے ساتھ آپ کو معاملہ پیش آیا ساڑھے تیرہ سو سال قبل مسیح ہے۔ آپ کا عظیم الشان کام بنی اسرائیل کو فرعون کی

۵۲ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

پھر تم نے اس کے پیچھے بچھڑا بنالیا اور تم ظالم تھے ۵۵ پھر ہم نے تم کو اس کے بعد معاف

۵۳ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

کر دیا تاکہ تم شکر کرو ۵۷ اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان دیا تاکہ تم ہدایت پاؤ ۷۶

غلامی سے آزاد کرنا اور ایک شریعت اپنی قوم کو دینا ہے۔ قرآن کریم میں آپ کا ذکر بہت آتا ہے جس کی وجہ آپ سے آنحضرت صلعم کی مماثلت ہے +

لیلۃ — لیلۃ عموماً غروب آفتاب سے صبح صادق تک کے وقت کو کہا جاتا ہے۔ یوں تو چالیس راتوں میں چالیس دن بھی شامل ہیں۔ مگر عبادت کے لئے چونکہ رات زیادہ موزون ہے شاید اس مناسبت سے لیلۃ کا لفظ اختیار کیا۔ الاعراف ۱۴۲ میں چالیس کی جگہ تیس اور دس کہا وواعدنا موسیٰ ثلٰثین لیلۃ واتممنٰھا بعشر +

نزول شریعت موسیٰ — بائبل میں حضرت موسیٰ کا چالیس دن پہاڑ پر رہنا مذکور ہے "اور موسیٰ بدلی کے درمیان چلا گیا اور پہاڑ پر چڑھ گیا اور موسیٰ پہاڑ پر چالیس دن رات رہا" (خروج ۲۴: ۱۸) یہ وہ خلوت کا زمانہ تھا جب حضرت موسیٰ پر توریت کے احکام نازل ہوئے۔ اور یہ واقعہ مصر سے آنے کے بعد کا ہے۔ پہلا کام حضرت موسیٰ کے سپرد صرف یہی کیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے نکال لائیں جب وہ نکال لائے تب شریعت نازل ہوئی +

اتخاذ — ۵۵ اتخذتم۔ اتخاذ کا جب ایک مفعول ہو تو بنانے کے معنی میں آتا ہے (ز) پس مراد یہ ہے کہ انھوں نے ایک بچھڑے کی مورت بنائی

بنی اسرائیل اور گائے کی پرستش — مصر میں جہاں بنی اسرائیل چار سو سال رہے تھے گائے کی پرستش ہوتی تھی اس کا اثر بنی اسرائیل پر ہوا جیسے ہندوستان میں ہندوؤں کی بہت سی باتوں کا اثر مسلمانوں پر ہوا ہے۔ پیر پرستی قبر پرستی کی ترویج عام کا یہ بھی ایک موجب ہے اور بہت سے رسوم ورواج ہندوؤں کے مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ چالیس دن کے لئے پہاڑ پر گئے تو بنی اسرائیل نے ایک بچھڑے کا بت بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی اس کی تفصیل قرآن شریف میں سورۂ طٰہٰ میں اور بائبل میں کتاب خروج کے ۳۲ باب میں ہے

عفو — ۵۶ عفونا۔ عفو کے اصل معنی کسی چیز کے لے لینے کا قصد کرنا ہیں (غ)، اس لئے وہ دو متخالف معنوں پر بولا جاتا ہے یعنی مٹانا اور بڑھانا اسی دوسرے معنی کی رو سے حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے اعفاء اللحی کا حکم دیا جس کے معنی ابن اثیر نے کئے ہیں ھو ان یوفر شعرہ ولا یقص کالشوارب (ت) یعنی یہ کہ ڈاڑھی کے بالوں کو زیادہ کیا جائے مونچھوں کی طرح چھوٹا نہ کیا جائے، اور عفوت عنہ کے معنی ہیں میں نے اسکے گناہ کے دور کرنے کا قصد کیا (غ)، گویا اسے مٹا دیا +

شکر — تشکرون۔ شکر کے معنی ہیں نعمت کا تصور اور اس کا ظاہر کرنا (غ) پس ایک شکر قلب یعنی دل کا شکر ہے جو محض تصور نعمت ہے اور ایک شکر لسان یعنی زبان کا شکر ہے جو دینے والے کی ثنا ہے اور ایک شکر بالجوارح یعنی اعضا سے شکر ہے جس سے مراد نعمت کی مکافات اس کے استحقاق کے مطابق دینا ہے (غ)، اور شکر نعمت کفر نعمت کے مقابل پر ہے یعنی نعمت کو چھپانے کے (غ)، اس لئے

شکور۔ شاکر — شکر احسان یعنی نعمت کا پہچاننا اور اس کا پھیلانا ہے (ت)، اور اللہ تعالیٰ شکور ہے یعنی تھوڑے عمل پر بہت بڑی جزا دینے والا (ت) اور یہی معنی شاکر کے ہیں جب اللہ تعالیٰ کی صفت ہو +

فرقان — ۷۶ فرقان حق و باطل میں فرق کو کہتے ہیں (غ)، فرق عام ہے قرآن شریف میں جنگ بدر کو بھی فرقان کہا ہے۔ یوم الفرقان یوم التقی الجمعٰن (الانفال ۴۱)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ ٥٤

اور جب موسےٰ نے اپنی قوم کو کہا اے میری قوم بچھڑا بنا کر تم نے اپنے نفسوں پر

الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

ظلم کیا ہے پس اپنے پیدا کرنے والے کی طرف پھر آؤ اور اپنے نفسوں کو مار ڈالو یہ تمہارے لئے تمہارے پیدا کرنیوالے

عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

کے حضور بہتر ہے پس وہ تم پر رحمت سے پھر آیا بیشک وہ رحمت سے پھرنے والا رحم کرنے والا ہے

خود قرآن شریف کو بھی فرقان کہا ہے تبارك الذی نزل الفرقان علی عبدہ (الفرقان ۲۵ - ۱) مومن کو جو نور حق و باطل میں فرق کرنیکا دیا جاتا ہے اسے بھی فرقان کہا ہے ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقاناً (الانفال ۸ - ۲۹) پس موسیٰ کو فرقان دینے سے مراد وہ معجزہ بھی ہو سکتا ہے جس سے بنی اسرائیل کے دشمن تباہ ہو گئے اور فرقان توریت کا نام بھی ہو سکتا ہے اس لحاظ سے کہ وہ حق و باطل میں فرق کرنے والی چیز ہے۔ اور وہ نور بھی مراد ہو سکتا ہے جس سے انبیاء حق و باطل میں فرق کرتے ہیں +

قوم — یٰقومِ قوم۔ قام یقوم سے ہے جس کے معنی کھڑا ہونا ہیں۔ اور یہ اسم جمع ہے۔ زبان عربی میں قوم کا لفظ صرف مردوں کی جماعت پر بولا جاتا تھا جس میں عورتیں شامل نہ ہوں کیونکہ وہی متکفل امور سمجھے جاتے تھے مگر قرآن شریف نے عموماً مردوں اور عورتوں دونوں کو اس لفظ قوم میں شامل کیا ہے (غ) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی حیثیت کو قرآن شریف نے کس طرح بڑھایا ہے +

البارئ / **خلق برأ میں فرق** — بارئ۔ البارئ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے بَرَأَ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں ایسے طور پر پیدا کیا جس کی پہلے مثال یا نمونہ نہ ہو (ت) خلق اور بَرَأَ میں یہ فرق ہے کہ خلق عام ہے اور برأ حیوانات سے مخصوص ہے (ل) گویا البارئ روح کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہاں بعض وقت جواہر اور اعراض کے پیدا کرنے پر بھی بولا جاتا ہے (ل) قرآن کریم میں مصیبت کے متعلق آتا ہے من قبل ان نبرأها (الحدید ۵۷ - ۲۲)

قتل — اقتلوا قتل کے اصل معنی روح کا جسم سے دور کرنا ہیں (غ) یا موت کا وارد کرنا مارنے سے یا پتھر سے یا زہر سے یا اور کسی طرح پر (ت) مگر بعض وقت یہ معنی مراد نہیں ہوتے مثلاً حدیث سقیفہ میں قتل اللہ سعداً کے معنی ابن اثیر نے لکھے ہیں ای دفع اللہ شرہ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے شر کو دور کرے اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا اقتلوا سعداً قتلہ اللہ یعنی سعد کو قتل کر دو مطلب یہ نہ تھا کہ فی الواقع قتل کر دو بلکہ ایسا کر دو گویا کہ وہ قتل ہو گیا ہے اور مر گیا ہے۔ ایسا ہی دوسری حدیث میں جہاں دو خلیفوں کی بیعت کا ذکر ہے وہاں لفظ آتے ہیں فاقتلوا الاخر دوسرے کو قتل کر دو جس کے معنی ابن اثیر لکھتے ہیں ابطلوا دعوتہ واجعلوہ کمن مات (ن) یعنی اس کی دعوت کو باطل کر دو اور ایسے اس کی طرح کر دو جو مر گیا ہے اور قتلت فلاناً کے معنی ذَلَّلْتُهٗ آتے ہیں (غ) یعنی میں نے اس کو فرمانبردار بنا لیا

قتل نفس — ایسی فاقتلوا انفسکم میں امام راغب نے یہ معنی بھی قبول کئے ہیں قیل عنی بقتل النفس اماطۃ الشہوات یعنی قتل نفس سے مراد شہوات کا دور کرنا یا مارنا ہے +

نفس — انفس۔ نَفْس کی جمع ہے۔ اور نَفْس کے معنی روح بھی ہیں اور ایک چیز کے کل کے کل یا اس کی حقیقت پر بھی بولا

۵۵ وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم تیری بات کبھی نہ مانیں گے جبتک کہ کھلا کھلا اللہ کو (نہ) دیکھ لیں پس تم کو ہولناک

الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝

آواز نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے ۸۵

جاتا ہے (ت) جیسے ظلمتم انفسکم یعنی اپنے آپ پر ظلم کیا اور آخ یا بھائی بند کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے فسلموا علیٰ انفسکم (النور ۶۱) میں ایسا ہی ظن المومنون والمومنات بانفسھم خیرا (النور ۱۲) میں انفس سے مراد اہل ایمان اور اہل شریعت لئے گئے ہیں فاقتلوا انفسکم میں مراد بھائی بند بھی ہو سکتے ہیں اور اپنے نفس بھی جیسا ظلمتم انفسکم میں مراد ہے۔

قتل نفس سے مراد کیا ہے

توریت میں ہے کہ بنی لاوی کو حضرت موسیٰ نے حکم دیا تھا کہ "تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے۔ اور ہر مرد تم میں اپنے بھائی کو اور ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر ایک آدمی اپنے قریب کو قتل کرے چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریب تین ہزار مرد مارے پڑے" (خروج ۳۲: ۲۷ و ۲۸) پس ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ درست ہو اور قرآن کریم نے فاقتلوا انفسکم میں اسی طرف اشارہ کیا ہو یعنی اپنے لوگوں کو جو اس شرک کے بانی مبانی اور قوم کو گمراہ کرنے والے ہیں قتل کر دو۔ مگر دوسرے معنی جو امام راغب نے بھی نقل کئے ہیں کہ قتل نفس سے مراد اماطۃ الشھوات ہے۔ بلحاظ سیاق و سباق بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اول تو ظلمتم انفسکم میں نفسوں پر جس ظلم کا ذکر ہے اس سے مراد بھی ذلیل خواہشات میں مبتلا ہونا ہے۔ اور پھر توبہ کا یہاں صاف طور پر ذکر بھی ہے اور اس کے بعد گویا بتایا کہ توبہ ایسی ہو کہ دوبارہ اس قسم کی ذلیل حرکت تم سے سرزد نہ ہو اس لئے اپنے نفسوں کو بہت فرمانبردار بناؤ۔ اور اگلے الفاظ فتاب علیکم بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں اور سورہ اعراف میں جہاں اس واقعہ کا زیادہ تفصیل سے بیان ہے صرف توبہ ہی کا ذکر ہے دیکھیو (الاعراف ۱۵۳) یوں یہ دوسرے موقعہ کی تفصیل بھی دوسرے معنی کو ترجیح دیتی ہے۔

بنی اسرائیل کا اللہ کو دیکھنے کا سوال

۸۵ لن نؤمن لك سے مراد یہ ہے کہ محض آپ کے کہہ دینے سے ہم یہ نہ مانیں گے کہ خدا آپ سے کلام کرتا ہے جبتک کہ خود بھی خدا کو نہ دیکھ لیں۔ یہ کہنے والے سارے بنی اسرائیل نہیں بلکہ وہ ستر آدمی ہیں جن کو حضرت موسیٰ قوم میں سے منتخب کر کے ساتھ لے گئے تھے جیسا کہ سورہ اعراف میں ہے واختار موسیٰ قومه سبعین رجلا لمیقاتنا (الاعراف ۱۵۵) اور موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر آدمی ہمارے میقات کے لئے چن لئے یہ میقات اور واعدنا اور والاموعد ایک ہی ہیں۔ یہ ستر آدمی حضرت موسیٰ کے ساتھ طور پر گئے۔ اور انہوں نے یہ لفظ کہے کہ جبتک ہم خدا کو اس طرح نہ دیکھ لیں جس طرح ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اس وقت تک محض تمہارے کہنے سے نہیں مان سکتے۔ حضرت موسیٰ نے ان کی ضد دیکھ کر آخر یوں سوال کیا رب ارنی انظر الیك (الاعراف ۱۴۳)

حضرت موسیٰ کا ان کی درخواست پر سوال رب ارنی کرنا

جیسے حضرت مسیح نے حواریوں کی درخواست پر نزول مائدہ کیلئے التجا کی حالانکہ اس کو ناپسند بھی فرماتے تھے جیسا کہ ان کے قول اتقوا اللہ ان کنتم مومنین (المائدۃ ۱۱۲) سے ظاہر ہے خدا تعالیٰ نے اپنی ایک تجلی دکھائی جس سے پہاڑ میں زلزلہ آگیا جعله دکا میں یہی اشارہ ہے اور یوں سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے کاموں اور عجیب قدرتوں سے پہچانا جاتا ہے ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اسی کو

صاعقہ اور رجفہ ایک ہی ہیں

یہاں صاعقة کہا ہے۔ سورہ اعراف میں اسی کو الرجفة یعنی زلزلہ بھی کہا ہے فلما اخذتھم الرجفة (الاعراف ۱۵۵) جب ان کو زلزلے نے آلیا۔ اسی طرح قرآن شریف میں ثمود کے عذاب کو ایک جگہ رجفة یعنی زلزلہ کہا ہے فاخذتھم الرجفة (الاعراف ۷۸) اور دوسری جگہ اسی کو صاعقة کہا ہے فاخذتھم الصاعقة (الذٰریٰت ۴۴) پس صاعقة کے صحیح معنی ہولناک آواز

ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۝ وَظَلَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡغَمَامَ ۵۷

پھر ہم نے تم کو تمہاری موت کے بعد اٹھایا تاکہ تم شکر کرو ۷۹ اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا ۸۰

ہیں اور شاید زلزلہ سے پہلے بھی ایک ہولناک آواز آتی ہے اس لئے زلزلہ کو صاعقہ کہا گیا ہے۔ اور بائیبل میں بھی زلزلہ کا ذکر ہے "اور پہاڑ سرا سر ہل گیا" (خروج ۱۹: ۱۸)

بعث

۷۹ بعثنا۔ بعث کا لفظ موت سے اٹھانے اور نیند سے اٹھانے دونوں پر بولا جاتا ہے (ت)۔ ایسا ہی بیہوشی سے ہوش میں لانے پر بولا جاتا ہے (ص) ✦

موت کے مختلف معنی

موت۔ امام راغب نے موت کے کئی معنی بیان کئے ہیں اول قوت نامیہ کا نہ ہونا جیسے یحیی الارض بعد موتہا (الحدید ۵۷: ۱۷) دویم قوت حسی کا زائل ہونا یعنی بیہوش ہو جانا یہی معنی یلیتنی مت قبل ھذا (مریم ۱۹: ۲۳) میں لئے گئے ہیں سوئم قوت عقلی کا زائل ہونا یعنی جہالت جیسے اومن کان میتا فاحیینٰہ (الانعام ۱۲۲) ہیں چہارم وہ غم جو زندگی کو مکدر کر دیتا ہے جیسے ویأتیہ الموت من کل مکان وما ھو بمیت (ابراھیم ۱۴: ۱۷) پنجم اس کے معنی نیند ہیں چنانچہ نیند کو موت خفیف اور موت کو نوم ثقیل یعنی بھاری نیند کہا جاتا ہے اور حدیث میں ہے الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا جو سو کر اٹھنے کی دعا ہے یعنی سب تعریف اس کے لئے ہے جس نے ہم کو زندہ کیا بعد اس کے کہ ہم کو مار دیا تھا۔ احیا اور اماتت دونوں کا ذکر ہے مگر مراد صرف بیداری اور نیند ہیں ششم معمولی معنی یعنی روح کی جسم سے مفارقت۔ اور لسان العرب میں ہے کہ موت کا لفظ کبھی استعارۃً احوال شاقہ پر بولا جاتا ہے جیسے فقر اور ذلت اور سوال اور بڑھاپا اور معصیت وغیرہ۔ اور موت کے معنی غشی بھی ہیں

بنی اسرائیل کی موت کے بعد زندگی

یہاں کون سے معنی مراد ہیں۔ اوپر ذکر تھا کہ ان کو صاعقہ نے آلیا۔ صاعقہ سے موت کا نہ واقع ہونا ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ فرمایا وانتم تنظرون۔ جب صاعقہ نے آپکڑا تو تم دیکھ رہے تھے۔ اور دیکھنا حالت زندگی پر دلالت کرتا ہے مفسرین نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے کہہ دیا ہے کہ نصف پہلے مر گئے اور دوسرے نصف ان کو دیکھتے رہے پھر وہ پہلے مرے ہوئے زندہ ہو گئے اور دوسرے نصف مر گئے یہ بیفائدہ تکلف ہے۔ موت کے معنی یہاں قوت حسی کا جاتے رہنا ہے زلزلہ کی شدت سے ان کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ پھر اللہ نے ان کو ہوش و حواس دیدیئے۔ یا قوت عقلی کا جاتے رہنا ہے یعنی یہ سوال تمہارا جہالت کا سوال تھا اور تم ایک جہالت کی موت میں تھے خدا نے تمہیں اس سے باہر نکالا اور تم کو نور ایمان عطا فرمایا۔ جیسے اومن کان میتا فاحیینٰہ وجعلنا لہ نورًا یمشی بہ فی الناس (الانعام ۱۲۳) میں جہاں ایک مردہ کو زندہ کرنے کا ذکر کرکے فرمایا کہ ہم نے اس کو ایک نور دیا ہے جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے۔ گویا یہی نور ایمان کا ملنا ہی حیات ہے۔ یہ معنی روح المعانی میں بھی دیئے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ نظم و نثر میں یہ معنی مروج ہیں جیسا کہ شاعر کے اس قول میں۔ اخو العلم حی خالد بعد موتہ۔ واوصالہ تحت التراب رمیم ✦ وذو الجہل میت وھو ماش علی الثریٰ یظن من الاحیاء وھو عدیم۔ اور ابن جریر میں ایک قول ثم بعثنٰکم کی تفسیر میں مروی ہے ثم بعثنٰکم انبیاء یعنی تم میں سے نبی بنائے کیونکہ لفظ بعث نبیوں کے بھیجنے پر بھی بولا جاتا ہے ✦

ظل فیٔ

۸۰ ظللنا ظل سے ہے جس کے معنی سایہ ہیں فیٔ بھی سایہ کو کہتے ہیں مگر فیٔ صرف اس سایہ کو کہتے ہیں جو دھوپ سے رکاوٹ ہو اور ظل عام ہے جہاں سورج نہ پہنچے اس لئے ظل اللیل اور ظل الجنۃ کہا جاتا ہے (غ) ✦

غم۔ غمامہ

غمام غمامۃ کی جمع ہے یعنی بادل۔ غمّ سے ہے جس کے اصل معنی ڈھانکنا ہیں بادل سورج کی روشنی کو ڈھانکتا ہے (غ)۔ اَمرٌ غُمّۃ مشتبہ یا تاریک امر ثم لا یکن امرکم علیکم غمۃ (یونس ۷۱)

وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن

اور من اور سلوی تم پر اُتارا ۸۱ ان ستھری چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان

كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ ۵۸ وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا ۸۳

نہیں کیا بلکہ اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتے تھے ۸۲ اور جب ہم نے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس سے جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ

بادل کا سایہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کو دشت سینا میں سے گزرنا پڑا جہاں شدت کی گرمی پڑتی ہے اور خیموں میں رہائش ناقابل برداشت ہوتی ہے شدت گرمی کے وقت ایسے بیابان میں بادل بڑی نعمت الٰہی ہے۔ قرآن شریف نے بائبل کے عجیب وغریب بادل کا ذکر نہیں کیا جو دن کے وقت سایہ کا کام دیتا ہو اور رات کے وقت روشنی کا +

منّ ۸۱ منّ اصل میں مَنّ ایک مشہور وزن ہے۔ اور اس لئے بھاری نعمت کے دینے پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے گویا نعمت کے بوجھ کے نیچے دبا دیا۔ اور مَنّ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو شبنم کی طرح ایک درخت پر اُترتی ہے اور اس میں مٹھاس ہوتی ہو (غ) جیسے ترنجبین بخاری میں ہے الکمأة من المن یعنی کھمبی بھی من سے ہے +

سلوی سَلْوٰی اس کا مادہ سلا ہے اور سَلْوٰی کے اصل معنی وہ چیز ہیں جو انسان کو تسلی دے (غ) اور سَلْوٰی ایک پرندہ ہے جو بٹیر سے مشابہ ہے +

من وسلوی کا اترنا راغب نے ایک قول نقل کیا ہے کہ من اور سَلْوٰی ایک ہی چیز ہیں مَنّ اسکو اس لئے کہا کہ اس کے ساتھ ان پر احسان کیا اور سَلْوٰی اس لئے کہ اس کے ساتھ ان کو تسلی دی اور ابن عباس کا قول سلا کے ماتحت نقل کر کے کہ مَنّ وہ تھا جو اوپر سے اُترتا تھا اور سلوی پرندہ ہے بعض محققین کا قول نقل کیا ہو کہ اس سے ابن عباس نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو گوشت اور نبات یعنی سبزیوں سے رزق دیا ہے اور یہ صرف بطور ایک مثال کے ہے +

طیب ۸۲ - طیبٰت ـ طیب وہ چیز ہے جس سے حواس کو لذت حاصل ہو اور جس سے نفس کو لذت حاصل ہو اور شریعت میں طعام طیب وہ ہے جو اس طرز سے لیا جائے جو جائز ہے اور اس اندازہ سے لیا جائے جو جائز ہے اور اس مکان سے لیا جائے جو جائز ہے (غ) ہتری ہُبسی چیزوں پر لفظ طیب نہیں بولا جا سکتا +

طیبات کا حکم بائبل میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل نے لالچ کر کے ان چیزوں کا ذخیرہ کرنا شروع کیا تو وہ چیزیں سڑ کر خراب ہو جاتیں ستھری چیزوں کے کھانے کے حکم میں بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ طیب وہ چیز ہے جو سڑی گلی یا مضر صحت نہ ہو۔ یہاں ایک عام اصول سمجھایا ہے کہ خلاف ورزی احکام الٰہی سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا وہ غنی ہے بلکہ انسان خود ہی نقصان اُٹھاتا ہے ایسا ہی فرمانبرداری سے انسان خود ہی فائدہ اُٹھاتا ہے +

قریۃ ۸۳ القریۃ - قری سے ہے جس کے معنی جمع کرنا ہیں۔ اور قریۃ اس مقام کو جس میں لوگ جمع ہوں مع ان لوگوں کے جو جمع ہوں کہتے ہیں مگر ان دونوں معنوں پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے کبھی مراد صرف موضع ہوتا ہے اور کبھی صرف لوگ (غ)

ھذہ القریۃ ھذہ القریۃ کسی مشہور بستی کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے اور وہ مشہور بستی بیت المقدس ہی ہے جس میں داخل ہونیکا دوسری جگہ صاف حکم ہے یٰقوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم (المائدۃ ۵ - ۲۱) انکو کہا گیا تھا کہ بیت المقدس کو فتح کر کے اس میں داخل ہوں۔ جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ میں بھی یہی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت فاتح داخل ہوں۔ اگلی آیت بتاتی ہے کہ انھوں نے اس حکم کو نہ مانا جیسا کہ مائدہ میں بھی ان کا انکار موجود ہے۔ اور یا سلیم مراد ہے (گنتی ۲۵ - ۱) +

وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ

اور دروازے میں فرمانبرداری سے داخل ہو۸۴ اور کہو ہماری خطائیں معاف ہوں ہم تمہاری خطائیں تمہیں معاف کر دینگے۸۵ اور

الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ ۵۹

احسان کرنیوالوں کو اور زیادہ بھی دینگے۔ پھر ان لوگوں نے جو ظالم تھے بات کو بدل کر اسکے خلاف بنا دیا جو انہیں کہا گیا تھا۸۶

فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

پس ہم نے ان پر جو ظالم تھے اوپر سے ایک عذاب بھیجا اس لئے کہ وہ بدعہدی کرتے تھے۸۷

سجدًا — ۸۴ امام راغب نے سجدا کے معنی کئے ہیں متذللین منقادین یعنی فرمانبرداری اور اطاعت اختیار کرتے ہوئے یا تعمیل حکم کرتے ہوئے یہی معنی یہاں درست ہیں۔ اسی کے مطابق سورہ مائدہ میں ہے ادخلوا علیھم الباب (المائدۃ ۵-۲۳) یہ مراد نہیں کہ سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔

حطّۃ — ۸۵ حِطّۃ حط کے معنی اوپر سے نیچے اُتارنا ہیں (غ) اور حِطّۃ کے معنی ہیں حُطّ عنا ذنوبنا (غ) یعنی ہمارے گناہ دور کئے جائیں۔ اسی کے قریب قریب معنی حسن قتادہ وغیرہم سے مروی ہیں۔ ابن عباس سے مغفرت مانگنا معنی مروی ہیں۔ نغفر لکم خطایاکم جو حطۃ کی دعا کا جواب ہے اس سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔

بنی اسرائیل کا جنگ میں جانے سے انکار — ۸۶ بات کے بدل دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسے قبول نہ کیا۔ فاتح بن کر داخل ہونے سے انکار کیا۔ اس کی تفصیل مائدہ میں ہے اور اس کی بجائے زراعت وغیرہ کو چاہا کہ کھانے کی چیزیں ملیں (۹۱) بخاری کی حدیث میں جو آتا ہے کہ حطۃ کی جگہ انہوں نے حبۃ فی شعرۃ کہا یعنی بال میں دانا جو زراعت کی طرف اشارہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو تبدیلی انہوں نے چاہی وہ یہی تھی کہ بجائے جنگ میں جانے کے ہم زراعت کریں گے اور یوں جنگ کو ناپسند کیا۔ چنانچہ اسی کے مطابق دوسری جگہ ہے فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون (المائدۃ ۵-۲۴) یعنی ہم جنگ نہیں کریں گے تم اور تمہارا رب جنگ کرو۔

رجز — ۸۷ رِجز کے اصل معنی اضطراب ہیں۔ اور اس عذاب کو رجز کہا جاتا ہے جو اپنی شدت کی وجہ سے قلق پیدا کرے (ت)، اور ایسے عمل کو بھی جو ایسا عذاب پیدا کرے۔ رجز کہا جاتا ہے۔ اور نسائی کی حدیث میں طاعون کو بھی رجز کہا ہے۔

من السماء — من السماء۔ یا اوپر سے آنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ قضاء و قدر اٹل ہوگی۔ روح المعانی میں ہے اشارۃ الی الجھۃ التی یکون منھا القضاء او مبالغۃ فی علوہ بالقھر والاستیلاء یعنی من السماء میں اشارہ ہے اس جہت کی طرف جہاں سے قضا آتی ہے یا مبالغہ ہے اس کے علو میں قہر اور غلبہ کے ساتھ۔ دوسری جگہ ہے کہ وہ

رجز کا عذاب — چالیس سال جنگل میں بھٹکتے پھرتے رہیں گے۔ یہی وہ قلق پیدا کرنے والا عذاب ہے۔ اور اگر ھذہ القریۃ سے شلیم مراد لیا جائے تو عذاب طاعون ہوگا جس سے اسرائیلی وہاں ہلاک ہوئے (گنتی ۲۵-۹)

ع ۷ بنی اسرائیل پر انعام اور ان کی نافرمانی

۶۰ وَاِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ ؕ فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ ؕ كُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ اللّٰهِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ۝

اور جب موسےٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنا عصا چٹان پر مارو پس اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے سب قبیلوں نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا اللہ کے دیئے سے کھاؤ اور پیؤ اور فساد پھیلانے زمین میں حد سے نہ بڑھو ۸۸

ضرب — ۸۸ اضرب ـ ضرب ایک چیز کے دوسری پر مارنے کو کہتے ہیں اور ضرب فی الارض کے معنی زمین میں چلنا ہیں (غ) بلکہ تاج العروس میں ضرب بمعنی ذھب لکھا ہے یعنی چلا گیا۔ اسی لئے ضرب الغائط کے معنی ہیں قضائے حاجت کے لئے گیا اور ضرب کے معنی مارنا بھی آتے ہیں +

عصاً — عصا۔ ائمہ لغت نے عصا کے اصل معنی اجتماع اور ائتلاف لکھے ہیں (ل) یعنی اکٹھا ہونا۔ بلکہ اصمعی کہتے ہیں کہ عصا کے معنی سونٹا اس لئے آتے ہیں کہ اس پر انگلیوں کا اجتماع ہوتا ہے (ل) اس لئے عصا کے معنی جماعت اور عصوت کے معنی میں نے جمع کیا لغت میں آتے ہیں۔ خوارج کے متعلق آتا ہے شقوا عصا المسلمین یعنی انہوں نے مسلمانوں کی جماعت میں اختلاف ڈال دیا۔ ایسا ہی ایاک وقتیل العصا کے معنی ہیں کہ جماعت اسلام میں تفرقہ ڈالنے والوں سے بچو پس عصا کے معنی سونٹا اور جماعت دونوں ہو سکتے ہیں +

اضرب بعصاک الحجر — اس لئے اضرب بعصاک الحجر کے معنی تین طرح ہو سکتے ہیں اپنا سونٹا چٹان پر مارو۔ اپنے سونٹے سے چٹان پہ چلے جاؤ۔ اپنی جماعت کے ساتھ چٹان پر چلے جاؤ +

فجر — انفجرت۔ فجر سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا فراخ پھٹ جانا اور فجر صبح کو کہتے ہیں کہ وہ رات کو پھاڑ دیتی ہے (غ)

تفجیر۔ انفجار — تفجیر اور انفجار میں وسعت پائی جاتی ہے۔ سورہ اعراف میں اسی موقع پر انبجست ہے اس کے معنی بھی پھوٹ نکلنا ہیں مگر یہ

انبجاس — اول خروج پر بولا جاتا ہے (وہ تھوڑا ہوتا ہے) اور تفجیر یا انفجار اس پر بھی بولا جاتا ہے جو منبع سے نکل کر باہر آجاتا اور وسعت

فجور — اختیار کر لیتا ہے۔ اور فجور جس سے فاجر ہے دیانت کے پردے کو پھاڑنا ہے (غ)

عین — عین۔ اصل معنی آنکھ ہیں۔ پانی نکلنے کی جگہ کو اسی لحاظ سے عین کہا جاتا ہے کیونکہ آنکھ سے بھی پانی نکلتا ہے۔ جاسوس کو عین کہتے ہیں اس لئے کہ وہ خصوصیت سے ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ سونے کو عین کہتے ہیں اس لئے کہ افضل الجواہر ہے جس طرح آنکھ افضل الاعضا ہے کسی چیز کی ذات کو بھی اس کا عین کہتے ہیں (ع) +

اناس — اناس۔ الناس کی دوسری صورت ہے اناس یا الناس بعض وقت بمعنی قبیلہ اور طائفہ بھی آجاتا ہے (ت) یہاں یہی معنی لئے گئے ہیں بنی اسرائیل کے بارہ ہی قبیلے تھے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بارہ قبیلے علیحدہ علیحدہ چشموں پر خیمہ زن ہوئے تھے۔ اس لئے وہ بارہ چشمے الگ الگ مقامات پر اور ایک دوسرے سے فاصلہ پر ہوں گے +

عثی۔ عیث — تعثوا۔ عثی سے ہے عثی اور عیث دونوں کے معنی فساد ہیں (غ) یا اس کے معنی حد سے گزر جانا ہیں اور پھر فساد میں حد سے گزر جانے پر بولا گیا ہے +

ابتدائی مذاہب میں دعائیں۔ — اس آیت میں بنی اسرائیل کے پانی مانگنے کا ذکر ہے اگلی آیت میں کھانا مانگنے کا۔ تمام ابتدائی مذاہب میں کھانے پینے کی دعائیں زیادہ پائی جاتی ہیں حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ کی سب سے بڑی دعا بھی روزانہ روٹی کے لئے ہے۔ بیابان میں

بارہ چشموں کا معجزہ — پانی کی ضرورت ایک اہم ضرورت تھی۔ قوم کا ٹھکانا سوائے پانی کے نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسےٰ

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا ۶۱

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے پس اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے ان چیزوں سے

تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ

نکالے جو زمین اُگاتی ہے۔ اسکی ترکاریوں میں سے اور اسکی ککڑیوں سے اور اسکے لہسن سے اور اسکے مسور سے اور اسکے پیاز سے ۸۹ اس نے کہا

اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ

کیا تم وہ چیز جو ادنے ہے اس کے بدلے میں لینا چاہتے ہو جو بہتر ہے شہر میں اُتر پڑو تو جو تم مانگتے ہو تمہیں مل جائے گا ۹۰

کو کسی خاص پہاڑ پر جانے کی ہدایت فرمائی جہاں ان کو بارہ چشمے مل گئے۔ ایلیم ایک مقام ہے جہاں بارہ چشمے تھے (خروج ۱۵:۲۷، ۲۵) اور آجتک یہ عیون موسےٰ کے نام سے مشہور ہے (بائیبل ڈکشنری مطبوعہ اکسفورڈ پریس) ممکن ہے یہ یا اس کے قریب کوئی مقام ہو یا کسی خاص چٹان پر سونٹا مارنے کی ہدایت کی جہاں سے پانی کا چشمہ بہ نکلا اور پھر اس کے بارہ چشمے بن گئے کسی پتھر کے شق ہو جانے سے پانی کے چشمے کا نکل آنا بھی ایک معمولی واقعہ ہے لیکن بارہ قبیلوں کے ان چشموں پر آباد ہونے کے لئے یہی معنی زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں کہ اپنی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چلے جاؤ۔ مفسرین کے اس قصے کی بنیاد کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ تین گز مربع کا ایک پتھر رہتا تھا جہاں اسے جنگل میں رکھکر سونٹا مارتے اس سے بارہ چشمے نکل پڑتے۔ قرآن و حدیث پر نہیں ہے۔ جو معنی ہم نے کئے ہیں وہ اس لحاظ سے بھی زیادہ موزوں ہیں کہ اگلی آیت میں جب کھانا مانگنے کا ذکر آتا ہے تو یہ ہدایت ہوتی ہے کہ شہر میں اُتر پڑو۔ اور کھیتی باڑی کرو۔ اور دونوں واقعوں کا یکجا بیان بتاتا ہے کہ دونوں کی ایک ہی نوعیت ہے +

بقل — **۸۹** بقل۔ بقل کے معنی ہیں ظاہر ہوا۔ ہر ایک چیز جس سے زمین سرسبز ہو بقل ہے۔ مگر یہاں مراد وہ ادنیٰ درجہ کی ترکاریاں ہیں جو انسان کھاتا ہے +

فوم — فوم کے معنی لہسن بھی آتے ہیں اور گیہوں بھی یہاں مراد لہسن ہی معلوم ہوتی ہے ابن مسعود کی قرأت ثوم ہے اور قرینہ بھی اسی معنی کو چاہتا ہے +

بلا محنت مانگنے کی عادت بنی اسرائیل اور مسلمان۔ — بنی اسرائیل کے سارے واقعات میں یہ بات خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ ہر چیز بلا محنت مانگتے ہیں۔ اسی لئے جنگ کا حکم ہوا۔ تو وہاں بھی کام سے دل چرایا فاذھب انت وربك فقاتلا انا ھھنا قاعدون۔ تو اور تیرا رب جاؤ اور جنگ کرو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ چاہتے تھے کہ فتح ہوا ہوا یا ملک مفت مل جائے یہی حالت آج مسلمانوں کی ہے۔ محنت سے دل چراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بادشاہت کے مالک ہوں یا امام مہدی علیہ السلام آئیں اور وہی سب کچھ کر کے دے جائیں اور مسلمانوں کو خزانوں کے مالک بنا دیں۔ اسکا جواب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہود کو دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قوانین پر عمل کرو تو یہ چیزیں ملیں گی اور اھبطوا مصرا میں یہی ہدایت ہے۔ دیکھو اگلا نوٹ +

ادنیٰ — **۹۰** ادنیٰ۔ دنو سے ہے جس کے اصل معنی قرب ہیں۔ ادنیٰ سے مراد بعض وقت اصغر یعنی چھوٹی چیز بمقابلہ بڑی کے اور بعض وقت ارذل یعنی زیادہ حقیر بمقابلہ بہتر کے اور بعض وقت اقرب یعنی زیادہ قریب بمقابلہ دور کے ہوتی ہے (غ)۔ یہاں خیر کا مقابلہ ہے اسلئے مراد ہے ارذل

مصر — مصرا۔ مصر کے اصل معنی حد ہیں اس لئے ہر ایک ممصود یعنی محدود شہر کو مصر کہتے ہیں۔ اور مصر مشہور ملک کا نام

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا

اور ان پر ذلت اور محتاجی ڈالی گئی اور وہ اللہ کے غضب کا محل بن گئے یہ اس لئے (ہوا) کہ وہ اللہ کی

يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ

باتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق مارتے تھے یہ اس لئے (ہوا) کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے بڑھ گئے ۹۱

بھی ہے مگر یہاں نکرہ ہے اور مراد شہر ہے ۔

زراعت اور فتوحات ملکی کا مقابلہ ادنیٰ اور خیر سے مراد یہاں ادنیٰ اور بہتر حالت معلوم ہوتی ہے ۔ وہ سبزیاں ترکاریاں چاہتے ہیں وہ بغیر کاشتکاری اختیار کرنے کے پیدا نہیں ہو سکتیں جو قوم زراعت میں لگ جائے گی وہ فاتح نہیں بن سکتی ۔ اس لئے ان کو سمجھایا کہ گو تم کو کھانے کی مشکلات ہیں ۔ مگر یہ حالت انجام کار تمہارے لئے زیادہ مفید ہے زراعت میں لگ جاؤ گے تو فتوحات تمہیں میسر نہیں آ سکتیں ۔ پھر اس کی طرز بھی بتادی کہ شہری زندگی اختیار کر لو وہ کھیتی باڑی کرو یہ چیزیں مل جائیں گی ۔ ان کی خواہشات کا میلان اس قسم کے کاموں کی طرف اس لئے بھی زیادہ تھا کہ مصر میں وہ ایسے ہی کام زیادہ تر کرتے تھے ۔ مصر کے معنی شہر ہیں ۔ اور یہاں ملک مصر ہرگز مراد نہیں ۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک شہر کی صورت میں رہائش اختیار کر لو ۔

ضرب ۹۱ ضربت علیہم ۔ یہ محاورہ ضَرَبَ الْخَيْمَةَ سے لیا گیا ہے یعنی اس نے خیمہ لگایا ۔ مراد یہ ہے کہ ذلت نے ان کو اس طرح اپنے اندر لپیٹ لیا جیسے خیمہ اس شخص کو جس پر وہ لگایا جاتا ہے ۔

ذُلّ ۔ ذِلّۃ ذِلّ الذلۃ ۔ ذُلّ اور ذِلّۃ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی مقہور یا محکوم ہونے کی حالت اور ذِلّ وہ ہے جو صعوبت کے بعد ہو (غ) مگر ذلۃ ایسی محکومی کی حالت ہے جس کے ساتھ قتل و غارت بھی لگی ہو جیسا کہ آل عمران ۱۱۱ میں مفسرین نے لکھا ہے ۔ کیونکہ یہ محکومیت کی ذلیل ترین حالت ہے ۔

سکن المسکنۃ ۔ سکن سے ہے جو حرکت کے بعد ٹھہر جانے کا نام ہے (غ) اور مَسْكَنٌ کے معنی زوال رعب بھی ہیں (غ) اور **مسکنۃ** اس کے معنی میں جھکنا اور ذلت اور حال بد داخل ہیں اور کبھی مسکنۃ سے مراد ضعف یعنی کمزوری ہوتی ہے (ل) گویا مسکنت کی حالت وہ ہے کہ پھر حکمران ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں نہ مار سکیں پس یہ محکومیت کا دوام ہے ۔

بآء باؤ ۔ بواء اصل میں مکان کے اجزا میں مساوات یعنی ہمواری کو کہتے ہیں ۔ اور باء بغضب من اللہ کے معنی ہیں ایسے مکان میں اُترا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب تھا (غ) ، اسی لئے یتبوأ جگہ بنانے کے معنی میں ہے یا باء کے معنی اِحْتَمَلَ ہیں گویا وہ اس گناہ یا غضب کی جگہ بن گیا (ت) ، اور باء کے معنی رجع بھی آتے ہیں یعنی لوٹ آیا ۔

قتل بمعنی اشراف علی القتل یقتلون ۔ قتل کے معنی ۵۴ میں بیان ہو چکے ہیں ۔ روح المعانی میں آیت ۸۷ میں فریقا تقتلون (انبیاء کے ایک گروہ کو تم قتل کرتے ہو) کی تفسیر میں قتل کے معنی یوں کئے ہیں والمراد من القتل مباشرۃ الاسباب الموجبۃ لزوال الحیوٰۃ سواء ترتب علیہ اولا یعنی قتل سے مراد ان اسباب کا حصول ہے جن سے حیات زائل ہو سکتی ہے خواہ اس پر زوال حیات مرتب ہو یا نہ اور یہ فی الواقع سچ ہے کہ ایک فعل کے اشراف پر عام طور پر وہ لفظ بول دیا جاتا ہے جو اصل فعل پر دلالت کرتا ہے خود قرآن شریف میں اس کی کئی مثالیں ہیں جیسے فبلغن اجلھن آیت ۲۳۱ میں بلغ سے مراد واقعی پہنچ جانا نہیں بلکہ پہنچنے کے قریب ہو جانا ہے پس یقتلون النبیین میں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ نبیوں کے قتل کے درپے ہوتے تھے ۔ اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ نبیوں کو قتل کر دیتے تھے ۔

ع ۸ — إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ ۶۲

جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابی جو کوئی بھی اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتا

الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○

ہے اور اچھے کام کرتا ہے تو ان کے لئے ان کا بدلہ اپنے رب کے ہاں ہے اور ان کو کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ غمگین ہونگے ۹۲

بنی اسرائیل کی خلاف ورزی عہد

نبی

النبیین. نبی کی جمع ہے جو نبأ سے مشتق ہے جس کے معنی خبر ہیں یا وہ خبر جو اپنے اندر عظیم الشان فائدہ رکھتی ہو اور نبی فعیل بمعنی فاعل ہے مگر ہمزہ ترک کر دیا گیا اس لئے نبی اللہ صحیح نہیں نبی اللہ ہے جیسا حدیث میں مذکور ہے اور بعض کے نزدیک نبی نُبُوَّۃ سے مشتق ہے جس کے معنی رفعت یعنی بلندی ہیں اور نبی کو اس کے مقام بلند کے لحاظ سے نبی کہا گیا (غ) اور نُبُوّت سفارت ہے (یعنی پیغام رسانی) اللہ اور اس کی مخلوق میں سے ذوی العقول کے درمیان (غ) اور قاموس میں ہے کہ نبی اللہ تعالیٰ کے متعلق خبر دینے والے کو کہتے ہیں جس کی مزید تشریح تاج العروس میں یوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی توحید کی خبر دیتا ہے اور اس کو غیب کی باتیں بتاتا ہے اور اسے علم دیتا ہے کہ وہ اس کا نبی ہے پس لفظ

نبی کے لغوی معنی اور اصطلاح شریعت

نبی کے لغوی معنی صرف خبر دینے والے کے ہیں. مگر اصطلاح شرعی میں یہ لفظ صرف ان رفیع القدر انسانوں پر بولا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان سفارت کا کام انجام دیتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں کو انسانوں تک پہنچاتے اور ان کو ان پر چلنے کی راہ بتاتے ہیں لغوی معنی کی رو سے ہر ایک خواب بین یا الہام پانے والے پر یہ لفظ بولا گیا ہے مگر چونکہ شریعت نے خاص اصطلاح قرار دی ہے پس جو شخص سفارت کے کام پر مبعوث نہ ہو گو وہ کتنے بھی الہام پائے یا رویا دیکھے وہ نبی نہیں کہلا سکتا یہی وجہ ہے کہ حالانکہ نبی کریم صلعم کثرت سے سچے خواب

نبی تعلیم کتاب خود دیتی

دیکھتے تھے. مگر جب تک اقرأ کا حکم نہیں پہنچا اس وقت تک اپنے آپ کو نبی نہیں سمجھا. اور وہ احکام الٰہی جو نبی پہنچانے کیلئے مامور ہوتا ہے وہی اس کی کتاب ہے. اس لئے آیت ۲۱۳ میں فرمایا کہ نبی کو جو خدا مبعوث کرتا ہے تو وہ بشارت بھی دیتا اور ڈراتا بھی ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کتاب بھی نازل کرتا ہے وانزل معھم الکتاب تاکہ اس کتاب کے ساتھ وہ ان کے اختلافوں کا فیصلہ کرے پس نبی بغیر کتاب نہیں ہو سکتا. اور

آنحضرت کے بعد نبی نہیں

چونکہ قرآن کے بعد کسی کتاب کی ضرورت نہیں اس لئے آنحضرتؐ کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں +

بنی اسرائیل کی ذلت و مسکنت

یہاں جو نقشہ ذلت اور مسکنت کے بنی اسرائیل کے لازم حال ہونے کا کھینچا ہے. اس کا تعلق پہلے مضمون سے صرف اسی قدر ہے کہ ان کی کجروی کا آخری نتیجہ یہ ہوا ورنہ یہ مراد نہیں کہ حضرت موسیٰ کے وقت میں ہی ایسا ہو گیا تھا. بلکہ یہ ایک زمانہ دراز کے بعد کا آخری نقشہ ہے. اور اس کی وجہ بھی پیچھے نہیں بلکہ اگلے الفاظ میں بیان کی ہے اس لئے کہ انہوں نے آیات اللہ کا انکار کیا. اور نبیوں کو ناحق مارتے تھے. خدا کی نافرمانی ہی نہیں کی بلکہ نافرمانی میں حد سے بڑھ گئے +

قتل انبیاء سے مراد قتل کی کوشش یا ابطال دعوت بھی ہو سکتی ہے

نبیوں کے قتل سے کیا مراد ہے. بائیبل کے بعض حوالجات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فی الواقع بھی بعض نبیوں کو قتل کیا مگر قتل کے معنی ابطال دعوت بھی آتے ہیں یعنی اس کی دعوت کو باطل کر دینا چنانچہ اس روایت کے اذا بویع خلیفتین فاقتلوا الآخر منھما کی تشریح میں ابن اثیر لکھتے ہیں. ای ابطلوا دعوتہ واجعلوہ کمن مات یعنی اس کی دعوت کو باطل کر دو اور اسے ایسا سمجھو جیسے کہ وہ شخص جو مر چکا ایسا ہی قتل کا لفظ زبان عربی میں ان اسباب کے جمع ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے جن سے موت واقع ہو سکتی ہے خواہ واقع ہو یا نہ ہو پس ان دونوں معنی کے لحاظ سے بھی الفاظ قرآنی کی تفسیر ہو سکتی ہے یعنی انبیاء کی دعوت کو باطل کرنا یا ان کو قتل کرنے کی کوشش کرنا. روح المعانی میں ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کی حالت ایسی ہو کہ اگر کوئی مانع نہ ہو تو قتل ہی کر دیں زیادہ وضاحت کے لئے دیکھو ۷۷ و ۹۱ +

ھود — ھاد

۹۲ ھادوا ھَوْد کے اصل معنی نرمی کے ساتھ رجوع کرنا ہیں (غ) اور انا ھدنا الیک (الاعراف: ۱۵۶) میں ھدنا کے معنی تبنا ہیں یعنی ہم نے توبہ کی اور ھاد فلان کے معنی ہیں فلاں شخص نے دین میں یہود کا طریقہ اختیار کیا +

۶۳ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ

اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تمہارے اوپر پہاڑ بلند کیا جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھو

نصاریٰ

النصاریٰ۔ نصرانی کی جمع ہے۔ اور یہ نام حضرت عیسیٰ کے گاؤں ناصرہ سے مشتق ہے بعض نے اس کو عربی مادہ نصر سے ملانے کی کوشش کی ہے مگر یہ تاویل بعید ہے ؛

صابی صباء

الصابئین۔ صابی کی جمع ہے جو صباء سے ہے جس کے معنی ہیں ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں چلا گیا (ت) اور اسکے اصل معنی ہیں ظاہر ہوا (غ)، اسی وجہ سے کفار آنحضرتؐ کو صابی کہتے تھے۔ صابی کون لوگ ہیں اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں بعض کے نزدیک وہ ملائکہ کی عبادت کرتے تھے بعض کے نزدیک ستاروں کی بعض کہتے ہیں وہ دین نوح پر تھے بعض کہتے ہیں یہود و نصاریٰ کے بین بین ایک فرقہ تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں ہے کہ یہ ایک نیم عیسائی فرقہ تھا جو یوحنا بپتسمہ دینے والے کے مریدوں سے بہت ملتا جلتا تھا۔ یہ رائے آخری خیال کے ساتھ ملتی ہے اور یہود و نصاریٰ کے ذکر کے ساتھ قرین قیاس ہے ؛

ایمان باللہ والیوم الآخر۔

ایمان باللہ والیوم الآخر کو قرآن کریم نے مسلمان ہونے کے مرادف رکھا ہے۔ دیکھو نوٹ نمبر ۲۰ سورہ مجادلہ کے آخر میں یہ ذکر کرتے ہوئے کہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے والی قوم اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت نہیں رکھ سکتی فرمایا اولئک کتب فی قلوبہم الایمان وایدھم بروح منہ یعنی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی روح کے ساتھ ان کی تائید کرتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ کامل مومنین کی جماعت ہے۔ پھر ان کے متعلق فرمایا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ یہ بھی کامل مومنین کے لئے ہی ہے ؛

وسعت دائرہ اسلام

پچھلے رکوع کے خاتمہ پر یہ بتایا تھا کہ نافرمانیوں کی وجہ سے ذلت اور مسکینی یہود کے اوپر لازم کر دی گئی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے نیچے آ گئے۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ رحمت الٰہی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کسی قوم پر بند نہیں ہوتا اعمال کی سزا ہوتی ہے اور یہود اب بھی نجات حاصل کر سکتے ہیں اور قوموں میں ممتاز ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اسلام لائیں اصل غرض تو یہودیوں کو رحمت کی راہ بتانے کی ہے مگر اس کو عام اصول کے رنگ میں بیان کیا اس لئے کہ یہود سمجھتے تھے کہ نجات یہودی کو ہی مل سکتی ہے اور دنیا کی دوسری قومیں سب کی سب محروم کی گئی ہیں پس یہاں یہ اصول بیان کر دیا کہ کوئی قوم بحیثیت قوم نہ نجات کی ٹھیکیدار ہے نہ نجات سے محروم ہے۔ اسلام کا دائرہ وسیع ہے۔ ہر ایک قوم اس میں داخل ہو سکتی ہے۔ ایمان اور اعمال صالحہ شرط ہیں۔ الذین اٰمنوا سے مراد منہ سے دعویٰ ایمان کرنے والے ہیں اور ان کو یہودیوں اور نصرانیوں کے ساتھ رکھ کر یہ بتا دیا کہ نرے دعویٰ ایمان سے چنداں فائدہ نہیں ؛

کامل نجات صرف اسلام میں ہے

اسلام اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ دوسرے مذاہب میں بھی صداقت ہے۔ ہاں اس صداقت میں باطل کی آمیزش ہو گئی ہے۔ مگر وہ صداقت اپنے کمال میں صرف اسلام میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے لاخوف علیہم ولاھم یحزنون کی حالت جو اس دنیا میں ہی انسان کو بہشتی بنا دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کامل قرب عطا فرماتی ہے۔ صرف اسلام سے ہی مخصوص ہے۔ ان الفاظ سے یہ مطلب نکالنا کہ عیسائی رہ کر اور تثلیث اور کفارہ پر ایمان رکھ کر بھی انسان نجات پا سکتا ہے قرآن کریم کی تمام تعلیم کے خلاف ہے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام (آل عمران ۳ - ۱۸) ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ (آل عمران ۳ - ۸۴) اور بیسیوں آیات نجات کامل کے لئے آنحضرت صلعم پر ایمان کو ضروری ٹھہراتی ہیں بدوں شناخت خاتم النبیین اب کوئی شخص خدا کے قرب کو حاصل نہیں کر سکتا۔ گو ایک حد تک گناہ سے پاک ہو جاتا ہو۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ

وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ ۶۴

اور جو اس میں ہے اس کو یاد رکھو تاکہ تم متقی بنو ۹۳ پھر اس کے بعد تم پھر گئے

فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ○ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ ۶۵

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے اور بیشک تم ان لوگوں

الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ○

کو جانتے ہو جو تم میں سے سبت کے معاملہ میں حد سے نکل گئے پس ہم نے ان کو کہا کہ تم ذلیل بندر ہو جاؤ ۹۴

ایمان باللہ سے مراد توحید الٰہی پر ایمان لانا ہے تو اول تو یہ یہاں لکھا نہیں بس دوسری جملہ سے یہ قید لگائی جائے گی۔ دوسری جگہ سے ہی قید لگانا ہے تو پھر وہی قید کیوں نہ لگائیں جو خود قرآن شریف نے لگائی ہے کہ ایمان باللہ والیوم الآخر سے مراد مسلمان ہونا ہے۔ اور دوسرے پھر بھی بڑے اعمال صالحہ تو کافی نہ ہوئے۔ کروڑہا ئی متعدد ادیان میں وہ لوگ ہیں جو یا تین خدا مانتے ہیں یا بت پرستی کے ساتھ خدا مانتے ہیں یا بدھ مذہب کے پیروؤں کی طرح خدا کے منکر ہیں یا دھریہ ہیں پس ایمان باللہ سے مراد صرف توحید الٰہی لینے سے حاصل بھی کچھ نہ ہوا اور قرآن کریم کے دوسرے مقامات کی بھی مخالفت لازم آتی جہاں چاروین اور خدا تعالیٰ تک پہنچنے کی حقیقی راہ صرف اسلام کو قرار دیا ہے۔

اخذ میثاق — **۹۳** اخذنا میثاقکم۔ اخذ میثاق یا عہد لینے سے مراد بذریعہ نبی کے بعض احکام کا دیا جانا ہے۔ نبی پر ایمان لانا یہ اقرار کرنا ہے کہ ہم اس کے احکام کی تعمیل کریں گے۔

رفع — رفعنا و غیرہ کا استعمال امام راغب نے چار طرح پر بیان کیا ہے۔ ۱۔ اجسام کے متعلق جب ان کو اپنی جگہ سے اوپر اٹھایا جائے۔ ۲۔ عمارت کے متعلق جب اسے اونچا کیا جائے جیسے واذ یرفع ابراھیم القواعد (۱۲۷) ۳۔ ذکر کے متعلق جب اسے شہرت دی جائے۔ ۴۔ مرتبہ کے متعلق جب اسے شرف دیا جائے۔ رفعنا فوقکم الطور کے معنی یہ نہیں کہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے اٹھا کر اونچا کیا بلکہ یہ کہ تم نیچے تھے اور پہاڑ تمہارے اوپر اٹھا ہوا تھا۔ بخاری کتاب المناقب میں آتا ہے فرفعت لنا صخرۃ جس کے معنی بخاری الانوار میں کئے گئے ہیں ظہرت لابصارنا یعنی ہماری آنکھوں کے سامنے چٹان ظاہر ہوئی حالانکہ عام معنی کی رو سے یوں کہنا چاہیے تھا کہ ہمارے لئے صخرہ اونچا کیا گیا۔ مگر فی الحقیقت صخرہ اونچا نہیں ہوا بلکہ اس کی اونچائی آنکھوں کے سامنے آگئی۔

طور — طور۔ پہاڑ کو کہتے ہیں (ت)، ایک خاص پہاڑ کا نام بھی ہے۔

پہاڑ اٹھانے سے مراد — اس آیت کے یہ معنی کرنا کہ بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ کو لا کر معلق کر دیا گیا تھا کہ اگر تم ان احکام کو نہ مانو گے تو ابھی پہاڑ تمہارے سروں پر گرا دیا جائے گا قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے لا اکراہ فی الدین جب انسان کو حکم ہے کہ دین میں جبر نہ کرے تو خود خدا کا جبر کرنا کیا معنی علاوہ ازیں اس جبر کا تو یہی جواب بنی اسرائیل کی طرف سے کافی ہے کہ ہم نے اقرار کوئی نہیں کیا۔ ڈرا کر اقرار لیا گیا۔ ایسا اقرار تو کسی عدالت میں بھی تسلیم نہیں ہو سکتا بلکہ صرف انکو یاد دلایا ہے کہ جب حضرت موسیٰ پر احکام نازل ہوئے تو اس وقت بنی اسرائیل کے بزرگ پہاڑ کے نیچے موجود تھے اس لئے حکم ہوتا ہے کہ اس کو مضبوطی سے پکڑ رکھو یعنی اس پر عمل کرو۔ توریت میں یہ الفاظ ہیں "اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملاوے اور وے پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے" (خروج ۱۹: ۱۷) اور انکو حکم تھا کہ نیچے ہی رہیں اور حضرت موسیٰ کے ساتھ اوپر نہ آئیں (خروج ۱۹: ۲۴)

عدو - اعتداء — **۹۴** اعتدوا۔ عدا سے ہے اور عدو کے معنی تجاوز یعنی حد سے نکل جانا ہیں۔ اور اعتدا الحق

۶۶ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ۝

سو ہم نے انہیں عبرت بنایا ان کے لئے جو ان کے سامنے تھے اور جو انکے پیچھے ہیں اور متقیوں کے لئے نصیحت بنایا ۹۵

سے تجاوز کا نام ہے ٭

سبت — سبت کے اصل معنی کاٹنا ہیں (غ) اور اصطلاح میں ایک خاص دن تھا یہودیوں کو ہفتہ میں ایک دن یعنی شنبہ کو کاروبار بند رکھنے کا حکم تھا اس لئے وہ دن کاروبار کے قطع ہونے کی وجہ سے سبت کہلایا۔ اعتداء فی السبت سے مراد سبت کے حکم کو توڑنا ہے ہفتہ میں ایک دن ان کی عبادت کے لئے مقرر تھا جب اس دن بھی خدا کی طرف دھیان نہ لگایا اور اپنی دنیا میں ہی مبتلا رہے۔ تو اخلاق فاضلہ سے آہستہ آہستہ عاری ہوتے چلے گئے ٭

قردة — قردة۔ قِرد کی جمع ہے بندر

خساء خاسیء — خاسئین خساء سے ہے جس کے معنی ذلیل ہو کر پیچھے ہٹ جانا ہیں (غ)۔ دوزخیوں کے متعلق آتا ہے۔ قال اخسئوا فیہا (المومنون ۲۳-۱۰۸) اور سورۃ ملک میں ہے ینقلب الیک البصر خاسئا (الملک ۶۷-۴) جہاں متحیراً معنی لئے گئے ہیں ٭

بنی اسرائیل کا بندر بننا — کونوا قردۃ خاسئین۔ امام مجاہد سے اس کی تفسیر یوں مروی ہے۔ قال مسخت قلوبہم ولم یمسخوا قردۃ یعنی ان کے دل مسخ ہو گئے تھے اور صورتیں مسخ ہو کر بندر نہیں بنے مفردات میں بھی منقول ہے قیل بل جعل اخلاقہم کاخلاقہا یعنی ان کے اخلاق بندروں کے سے ہو گئے۔ اس تفسیر کی تائید قرآن کریم کے دیگر مقامات سے ہوتی ہے۔ النساء ۴۷ میں ہے او نلعنہم کما لعنا اصحاب السبت یعنی ہم ان پر لعنت کریں جیسا سبت والوں پر لعنت کی۔ اب رسول اللہ صلعم کے دشمنوں پر جو لعنت واقع ہوئی وہی لعنت اصحاب سبت پر ہوئی لیکن اول الذکر بندر نہیں بنائے گئے بلکہ ذلیل کئے گئے۔ اسی طرح دوسری جگہ فرمایا جعل منہم القردۃ والخنازیر وعبد الطاغوت اولئک شر مکانا واضل عن سواء السبیل (المائدۃ ۵-۶۰) یعنی ان میں سے بندر اور سؤر بنائے اور وہ جنہ شیطان کی پرستش کی یہ لوگ بہت بری حالت میں ہیں اور سیدھے رستہ سے بہت دور بھٹکے ہوئے۔ اب جو لوگ بندر اور سؤر بنے انہی کے متعلق فرمایا کہ ان کی حالت بہت خراب ہے اور وہ سیدھی راہ سے دور چلے گئے۔ یہ انسان کو ملزم کرنے کا طریق ہے نہ حیوان کو۔ اور قرآن کریم ایسے محاورات سے بھرا پڑا ہے کسی کو گدھے سے مثال دی ہے کمثل الحمار کسی کو کتے سے کمثل الکلب بندر ایک نقال جانور ہے یعنی انسان کے فعل کی نقل کرتا ہے مگر اس کے نیچے حقیقت نہیں ہوتی۔ پس ان کو بندر کہنے سے مراد یہ ہے کہ وہ محض نقالی کے طور پر رسوم ادا کرتے ہیں اور ان کے افعال حقیقت سے خالی ہیں یا ذلت کے لحاظ سے ان کو بندر کہا ہے اور اس کی طرف خاسئین میں اشارہ ہے۔ عربی زبان میں بندر کی مثال زنا کی کثرت کے لئے دی جاتی ہے ازنی من قرد۔ اور یہودیوں میں اس بدی کی کثرت پر بائیبل گواہ ہے "تیرے بیچ وے ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں تیرے بیچ باپ کو بھی انہوں نے بے ستر کیا۔۔۔۔ کسی نے دوسرے کی جورو سے برا کام کیا ہے اور دوسرے نے اپنی بہو سے بدذاتی کی ہے اور کسی نے اپنی بہن اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے درمیان خراب کیا ہے" (حزقیل ۲۲: ۹-۱۱) ان تمام باتوں کے لحاظ سے یہ لوگ بندر بن گئے ٭

نکل۔ نکال — ۹۵ نکال عبرتناک سزا کو کہا جاتا ہے کیونکہ نکل کے معنی قید کرنے کے ہیں (غ) اور نکال سے مراد وہ سزا ہے جو دوسرے کو ایسا کام کرنے سے روک دے (غ) ما بین یدیہا سے مراد اس زمانہ کے لوگ۔ اور ما خلفہا سے پیچھے آنے والی نسلیں ہیں ٭

وعظ — موعظة — موعظة۔ وعظ ایسا روکنا ہے جس کے ساتھ تخویف ہو یعنی برے کام سے اس کا برا انجام بتا کر روکنا یا وہ اچھی باتوں کا یاد دلانا ہے جس سے قلب میں رقت پیدا ہو (غ) موعظة اسی سے اسم ہے ٭

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا ۶۷

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کو کہا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کرو انہوں نے کہا کیا آپ ہم سے

هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ ۶۸

ہنسی کرتے ہیں (موسیٰ نے) کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں ۹۶ انہوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لئے

يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ

دعا کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے وہ کیسی ہے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جو نہ بوڑھی ہے اور نہ بچہ جوان ہے

بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ ۶۹

اُن کے بین بین پس کرو جو کچھ تمہیں حکم دیا جاتا ہے ۱۹۶ انہوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ اس کا رنگ کیا ہے

بقرۃ - بقر ۹۶ بقرۃ۔ اس کی جمع بقر ہے اور بقرۃ گائے کو اور ثور بیل کو کہتے ہیں۔ اور بقر کے معنی شق یعنی پھاڑنا آتے ہیں۔

باقر اس لئے باقر خطاب ہے اسی معنی کے لحاظ سے کہ وہ علوم کے دقائق کے پھاڑنے میں وسعت رکھتا ہے +

ھزو ھزوا۔ ایسی مزاح کو کہتے ہیں جو خفیہ طور پر کی جائے +

جہل - جاہل جاھلین۔ امام راغب نے جہل کی تین قسم بیان کی ہیں۔ اول نفس کا علم سے خالی ہونا یعنی ایک چیز کا علم نہ ہونا۔ یحسبہم الجاھل اغنیاء (۲ : ۲۷۳) میں جاھل سے مراد یہ شخص ہے جو حالات سے ناواقف ہے۔ دوسرے ایک چیز پر خلاف اس کے اعتقاد رکھنا جس حالت میں وہ ہو۔ تیسرے ایک کام کرنا خلاف اس کے جو اس کا حق ہے کہ اس طرح کیا جائے۔ یہاں یہی تیسرے معنی مراد ہیں +

گائے ذبح کرنے کا حکم گائے کی پرستش ایک خاص قسم کا شرک تھا جو بنی اسرائیل میں سرایت کر گیا تھا۔ اس کا علاج ضروری تھا۔ موسوی شریعت میں اس قسم کی گائیوں کی قربانی کرنے کا حکم خاص خاص موقعوں پر تھا جو ہل میں نہ لگائی جاتی تھیں۔ دیکھو استثناء ۲۱ : ۱-۹ ''ایک بچھیا جس سے ہنوز کچھ خدمت نہ لی گئی ہو۔ اور جوئے تلے نہ آئی ہو'' اس قسم کی گائے کا قاتل کا پتہ لگانے کے لئے ذبح کرنے کا حکم ہے۔ اور گنتی ۱۹ : ۱-۱۹ میں ایک لال گائے کے ذبح کرنے کا حکم ہے ''جو بے داغ اور بے عیب ہو اور جس پر کبھی جوا نہ رکھا گیا ہو'' یہ عام احکام بتلاتے ہیں کہ گائے کی پرستش کے شرک کو دور کرنا بھی ان کا مقصود تھا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں آیا انہی عام احکام کی طرف اشارہ ہے یا یہ کسی خاص واقعہ کا ذکر ہے؟ میں دوسری توجیہ کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ آیت کے آخری الفاظ بتلاتے ہیں کہ ایک خاص گائے کے ذبح کرنے کا حکم تھا معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں کسی خاص خوبصورت گائے کی عظمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ بچھڑے کی پرستش کی طرح اس کی پرستش کا خطرہ ہو گیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا +

۱۹۶ ما ھی۔ سوال اس کی حالت اور صفت سے ہے یعنی وہ کیسی ہے +

فرض فارض۔ فرض سے ہے جس کے معنی سخت چیز کا کاٹنا ہیں اور احکام میں وہ حکم فرض ہے جس کے متعلق حکم قطع ہو چکا

فارض اور فارض اس بوڑھی گائے کو کہتے ہیں جس کی ولادت بوجہ بڑھاپے کے منقطع ہو چکی ہو (غ)

بکرۃ - بکر بکر۔ بکرۃ۔ اول النہار یعنی دن کے پہلے حصہ کو کہتے ہیں اور پہلے بچہ کو بکر کہتے ہیں اور یہاں بکر سے مراد وہ ہے جس نے ابھی بچہ نہیں جنا (غ)

عون عوان عوان۔ عون کے معنی مدد ہیں۔ اور عوان حیوانات میں اس کو کہتے ہیں جو اپنی عمر کے نصف حصہ کو پہنچ چکا ہو۔ نہ بہت چھوٹا نہ بہت بڑا (ت)

۷۰ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا

کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک زرد گائے ہے اس کا رنگ گہرا زرد ہے دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے ۹۶ب انہوں نے کہا اپنے

رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝

رب سے ہمارے لئے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتلائے کہ وہ کیسی ہے کیونکہ بیلے ہمارے لئے گائیں ایک سی ہی ہیں اور اگر اللہ چاہے تو ہم یقیناً ہدایت پانیوالے ہونگے

۷۱ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ

کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جو کام میں نہیں لگائی گئی کہ زمین کو پھاڑتی ہو اور نہ کھیت کو پانی دیتی ہے صحیح سالم ہے

لَّا شِيَةَ فِيْهَا قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ ع

اس میں کوئی داغ نہیں۔ انہوں نے کہا اب آپ نے ٹھیک ٹھیک بتایا ہے سو انہوں نے اسے ذبح کیا اور وہ کرنا نہ چاہتے تھے ۹۷

فاقع

۹۶(ب) فاقع۔ گہرے زرد رنگ کو اصفر فاقع یا صفراء فاقع کہتے ہیں۔ گویا زردی کی گہرائی پر یہ لفظ دلالت کرتا ہے۔ ایسا ہی گہرے سیاہ کو اسود حالک کہتے ہیں۔ گہرے سرخ کو احمر قان گہرے سفید رنگ کو ابیض ناصع گہرے سبز کو اخضر ناض +

ذلول

۹۷ ذلول۔ ذُلّ یعنی مقہور ہونے سے سے اور اس جانور کو کہتے ہیں جو کام میں لگایا گیا ہو اور اس کی سختی توڑ دی گئی ہو یعنی اسے ماتحت کر لیا گیا ہو +

ثار۔ ثار۔ اثارۃ

تثیر۔ ثار غبار یا بادل کے پھیل جانے پر بولا جاتا ہے اور اثار کے معنی ہیں اس میں ہیجان پیدا کیا واثاروا الارض (الروم ۳۰۔ ۹) اور اثارۃ زراعت کے لئے زمین کے اوپر نیچے کرنے کو کہتے ہیں (غ) +

شیۃ

شیۃ۔ اس کا اصل وِشیۃ ہے اور وشی کے معنی ہیں ایک چیز پر ایسا داغ کرنا جو اس کے کھلے رنگ کا مخالف ہو

کاد

کادوا۔ یکاد۔ افعال مقاربہ سے ہے۔ ایک قول کے رو سے اس کی نفی اثبات ہوتی ہے اور اس کا اثبات نفی گویا کاد یفعل کے معنی ہیں گو کرنے کے قریب تھا مگر کیا نہیں۔ اور ما کاد یفعل کے معنی ہیں گو قریب تھا کہ نہ کیا ہوتا مگر کر لیا (غ)، مگر کاد کے معنی بعض وقت اراد بھی آتے ہیں یعنی اس نے ارادہ کیا۔ اور اس کی مثال دی ہے کذٰلک کدنا لیوسف (یوسف ۱۲۔ ۷۶) اسی طرح ہم نے یوسف کے لئے ارادہ کیا۔ یا فرمایا اکاد اخفیہا (طٰہٰ ۲۰۔ ۱۵) جس کے معنی ہیں میں ارادہ کرتا ہوں کہ اسے ظاہر کر دوں اور اشعار عرب میں ہے کادت وکدت وتلک خیر ارادۃ۔ جہاں کادت کے معنی ہیں اس نے ارادہ کیا اور کدت کے معنی ہیں میں نے ارادہ کیا (ت) +

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص گائے تھی اور چونکہ قوم کے دل میں اس کی محبت اور عظمت تھی اس لئے ذبح نہ کرنا چاہتے تھے بار بار کی ہیرا پھیری کا مطلب بھی یہی تھا کہ کسی طرح یہ حکم ٹل جائے۔ بعض مفسرین نے لکھ دیا ہے کہ یہ کوئی معمولی گائے نہ تھی بلکہ آسمان سے اتری تھی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وانزل لکم من الانعام ثمٰنیۃ ازواج (الزمر ۳۹۔ ۶) سب چارپائے خدا نے ہی اتارے ہیں سو جس طرح دوسرے چارپائے اترے اسی طرح یہ گائے اتری یعنی اسی زمین پر پیدا ہوئی +

ع ۹

بنی اسرائیل کی قساوت قلبی

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ ٧٢ ٧٣

اور جب تم نے ایک شخص کو (اپنی طرف سے) قتل کر دیا پھر آپس میں اس (قتل) میں اختلاف کیا اور اللہ ظاہر کرنیوالا تھا جو تم چھپاتے تھے پس ہم نے کہا اسکو

بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝

اسکے بعض سے مارو۔ اس طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنے نشان دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو ۹۸

قتل

۹۸ قتلتم۔ جیسا کہ یقتلون النبیین کی تفسیر میں مانا گیا ہے قتلتم کے معنی یا تو یہاں یہ ہیں کہ تم نے ان تمام اسباب کو جمع کر دیا جو زندگی کے منقطع کرنے کا موجب ہو سکتے ہیں اور یا یہ کہ تم نے اپنی طرف سے قتل کر دیا گو کوئی اور مانع ہو گیا ہو دیکھو ۹۱

دراء

ادّارأتم

ادّارأتم۔ درء سے ہے تفاعلتم کے وزن پر پس اس کا اصل تدارأتم ہے (ج) اور درء کے معنی نشوز یعنی جھگڑا کرنا اور اختلاف ہیں (ت)۔ خلع کی حدیث میں ہے اذا کان الدرء من قبلہا جہاں درء کے معنی خلاف اور نشوز ہیں اس لئے ادّارأتم کے معنی اختلفتم و تنازعتم کئے گئے ہیں یعنی تم نے اختلاف کیا اور جھگڑا کیا (ج۔ ل) اور درء کے معنی دفع بھی آتے ہیں جس کی مثال دوسری جگہ قرآن شریف میں ہو ویدرؤا عنہا العذاب (النور ۲۴-۸) فادرءوا عن انفسکم الموت (آل عمران ۳-۱۶۷) (غ ر)

گائے کے ذبح کے مقابل یہ ایک اور واقعہ

استثناء ۲۱: ۱-۹ میں جو عام حکم ہے کہ جب مقتول کا پتہ نہ لگے تو ایک ایسی بچھیا لیکر جو جوئے تلے نہ آئی ہو۔ اسے ذبح کیا جائے اور اس پر ہاتھ دھوئے جائیں ممکن ہے کہ ان آیات میں اس کی طرف اشارہ ہو۔ مگر بظاہر جس طرح سارے واقعات جن کا ذکر پچھلے رکوعوں میں واذ کے ساتھ شروع ہوتا ہے الگ الگ واقعات ہیں۔ اسی طرح یہ بھی الگ واقعہ ہے۔ اس کا تعلق گائے کے ذبح کے واقعہ سے کچھ نہیں۔ بلکہ اس کے مقابلہ پر ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے اور قرآن کریم میں اضداد کا ذکر بہت آتا ہے اس لئے جب پہلے رکوع کو اس آیت پر ختم کیا کہ ایک گائے کے ذبح کرنے میں تم نے کس قدر پس و پیش سے کام لیا۔ تو اب یہ بتاتا ہے کہ اس کے مقابل پر تم اس حالت پر غور کرو جب تم نے ایک عظیم الشان انسان کو قتل کر دیا +

قتلتم نفسا میں کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے

مفسرین کہتے ہیں ایک بھتیجے نے چچا کو قتل کر دیا تھا تا کہ اس کی بیٹی سے شادی کر کے اس کی جائداد کا وارث ہو۔ مگر اس قسم کے قتل کے واقعات تو قوموں میں ہر روز ہوتے ہیں اگر ایسا ہوا ہو تو قرآن کریم کو اس کے ذکر کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ قرآن سے یہ شہادت ملتی ہے کہ ان الفاظ میں کسی نبی کے قتل کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ اول تو جو دو جرم ان کے بیان کئے تھے ایک کفر آیات اللہ اور دوسرا قتل انبیاء ان میں سے اول کی مثالیں کئی ایک بیان کر دیں مگر دوسرے کی مثال کوئی بیان نہ کی تھی۔ دوسرے نفسًا میں تنکیر عظمت کے لئے ہے کسی عظیم الشان انسان کا ذکر ہو سکتا ہے تیسرے تمام قوم ایک معمولی انسان کے قتل پر ملزم نہیں ہو سکتی۔ ہاں انبیاء کے قتل پر کل قوم کو ملزم کیا جاتا ہے اگر بھتیجے نے چچا کو قتل کر دیا تھا تو قوم پر الزام بے معنی ہے لیکن اگر کوئی نبی قتل ہوا تو قوم پر الزام درست ہے کیونکہ خود قرآن کریم نے قوموں کو انبیاء کے قتل کے لئے ملزم کیا ہے پس یہ قرائن بتاتے ہیں کہ کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے +

یہ نبی حضرت مسیح ہیں

اب اس کے متعلق چند اور باتیں قابل توجہ ہیں۔ اول یہ کہ اپنی طرف سے قتل کر دینے کے بعد پھر ان لوگوں میں اختلاف ہوا ہے جیسا فادّارأتم فیہا سے ظاہر ہے۔ دوسرے وہ قتل میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ فرمایا کہ جو کچھ تم چھپانا چاہتے تھے اللہ نے اسے ظاہر کرنا تھا۔ اب ایسا قتل یا قتل کی کوشش جس میں اختلاف ہوا ہو اور پھر وہ قتل بھی کسی نبی کا ہو حضرت مسیح کے صلیب پر چڑھانے کا واقعہ ہے اور کوئی واقعہ اس قسم کا تاریخ بنی اسرائیل میں نہیں پایا جاتا۔ قرآن کریم میں دوسری

مسیح کے قتل کی کوشش

جگہ صاف فرمایا وقولہم انا قتلنا المسیح عیسی ابن مریم یعنی وہ تو یہی کہتے ہیں کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا۔ مگر

۷۴ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ

پھر تمہارے دل اس کے بعد سخت ہو گئے سو وہ پتھروں کی طرح بلکہ سختی میں اس سے بھی بڑھ کر ہو گئے

فرمایا وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لہم ۔ انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر مارا بلکہ ان کے لئے وہ مشابہ بالمقتول کر دیا گیا ۔ اور پھر فرمایا وان الذین اختلفوا فیہ لفی شک منہ (النساء ۴ - ۱۵۷) جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا وہ اس کے متعلق شک میں ہیں پس اگر ایک طرف قرائن صفائی سے بتاتے ہیں کہ ان الفاظ میں کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے تو دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسا نبی جس کے قتل میں اختلاف ہوا ہو اور کامیابی نہ ہوئی ہو وہ مسیح علیہ السلام ہیں ۔ گویا قوم یہود کی بے اعتدالیوں کا نقشہ کھینچا ہے کہ ایک طرف تو گائے تک کو ذبح کرنے میں اس قدر لیت ولعل کرتے ہیں اور دوسری طرف ایک عظیم الشان نبی کو قتل کرنے میں اس قدر دلیری ہے ۔ حضرت مسیح کی طرف اشارہ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فوراً بعد فرمایا ثم قست قلوبکم من بعد ذٰلک پھر تمہارے دل اس کے بعد سخت ہو گئے اور قرآن شریف سے ہی ثابت ہے فطال علیہم الامد فقست قلوبہم (الحدید ۵۷ - ۱۶) یعنی ایک لمبا زمانہ گزرنے کے بعد انکے دل سخت ہو گئے تو پس یہ کوئی ایسا قتل ہے جو حضرت موسیٰ سے لمبا زمانہ گزرنے کے بعد وقوع میں آیا ۔

قرآن کریم آپ اپنی تفسیر کرتا ہے

قرآن کریم بعض بعض کی تفسیر کرتا ہے ۔ ان واقعات کا جو ذکر یہاں ہے ۔ وہی ذکر سورۃ النساء میں بھی ہے دیکھو آیت ۱۵۳ جہاں خدا کو دیکھنے کی درخواست ہے ۔ پھر بچھڑا بنانے کا ذکر ہے ۔ اور آیت ۱۵۴ جہاں میثاق کا ذکر ہے اور شہر میں فرمانبرداری سے داخل ہونے کا حکم ہے اور سبت کے معاملہ میں زیادتی سے روکا ہے ۔ اور آیت ۱۵۵ جہاں نقض میثاق اور قتل انبیاء کا ذکر ہے ۔ یہ سب کچھ اس کے مطابق ہے جو یہاں سورہ بقرہ میں بیان ہوا ۔ اس قدر فرق ہے کہ یہاں تفصیل ہے سورۃ النساء میں انہی واقعات کا ذکر اختصار سے ہے اور پھر آیت ۱۵۷ میں حضرت مسیح کے قتل کی کوشش اور اس میں ناکامی اور اختلاف کا ذکر ہے ۔ گویا جو کچھ یہاں سورہ بقرہ میں اشارۃً بیان فرمایا اس کو سورۃ النساء میں کھول کر بیان کر دیا ۔ یہ کمال قرآن پاک کا ہے کہ یہ دو سورتیں کئی سال کے فرق پر نازل ہوتی ہیں لیکن ایک میں جو اختصار ہے اس کی دوسری میں تشریح کر دی ہے اور جس کو پہلے تفصیل سے بیان کر دیا تھا اس کا دوسرے موقعہ پر اختصاراً ذکر کر دیا ۔ یہ مقابلہ بھی اس بات کا مؤید ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی کوشش کی طرف ہی اشارہ ہے ۔

نفس کا استعمال مذکر و مؤنث پر

رہا یہ سوال کہ فقلنا اضربوہ ببعضہا سے کیا مراد ہے ؟ اضربوہ میں ضمیر نفس کی طرف جاتی ہے ۔ کیونکہ بعض وقت نفس کی ضمیر بلحاظ معنی مذکر آجاتی ہے اور بعضہا کی ضمیر فعل قتل کی طرف جاتی ہے یعنی بعض قتل سے اس کو مار دو یا فعل قتل اس پر پورا وارد نہ ہونے دو ۔ چنانچہ ضمیر کا قتل کی طرف جانا جو مصدر فعل سے مفہوم ہے ۔

حضرت مسیح اور واقعات صلیب ۔

بحر المحیط میں بھی تسلیم کیا گیا ہے اور یہی سچ ہے کہ حضرت مسیح پر پورا فعل قتل وارد نہیں ہوا ۔ صلیب پر آپ صرف تین گھنٹے رہے اور اتنی تھوڑی دیر میں کوئی شخص صلیب کی موت سے مر نہیں سکتا ۔ آپ کے ساتھ جو چور صلیب دئے گئے تھے ان کی ہڈیاں توڑی گئیں آپ کی ہڈیاں نہیں توڑی گئیں یہی فاضربوہ ببعضہا ہے ۔ اور کذٰلک یحی اللہ الموتیٰ کہکر بتا دیا کہ جس کو تم مردہ خیال کر بیٹھے تھے اسے خدا نے یوں زندہ رکھا یا زندہ کر دیا ۔ اور یہ جو فرمایا ہے یریکم اٰیاتہ لعلکم تعقلون تو بتایا کہ مسیح جو تم کو مردہ معلوم ہوتا تھا جس طرح اسے خدا نے زندہ کر دیا کیونکہ اللہ کے نام کو بلند کرنا اس کی زندگی کا مقصد تھا اسی طرح اگر تم بھی اعلائے کلمۃ اللہ کا کام اختیار کرو تو گو تم ایک مردہ قوم ہو اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی عطا فرمائے گا ۔

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ

اور یقیناً پتھروں میں ایسے بھی ہیں کہ ان سے نہریں بہتی ہیں اور بیشک ان میں ایسے بھی ہیں کہ پھٹتے ہیں تو ان میں سے

مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ

پانی نکلتا ہے اور بیشک ان میں ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر جاتے ہیں اور اللہ اس سے بے خبر نہیں

عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۷۵

جو تم کرتے ہو ۹۹ پس کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے اور ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے

يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

جو اللہ کے کلام کو سنتے پھر اس میں تحریف کرتے بعد اس کے کہ اسے سمجھ لیا اور وہ جانتے ہیں ۱۰۰

قسوۃ ۔ اَوْ
بنی اسرائیل کی قساوت قلبی

۹۹ قست ۔ حجر قاس سخت پتھر کو کہتے ہیں اس لئے قسوۃ کے معنی دل کی سختی ہیں ۔ اَوْ ۔ یہاں بمعنی بَلْ ہے +

ان کی سخت دلی کو پہلے پتھروں سے مثال دی ہے لیکن بایں امید دلائی ہے ! یوس نہیں ہونے دیا جب پتھروں میں سے بھی نہریں نکل آتی ہیں تو پتھر جیسے سخت دلوں میں سے علوم کی نہریں کیوں نہ نکلیں جو ایک عالم کو سیراب کر دیں اس سے نچلے درجہ پر وہ ہیں جن سے پھوٹ کر تھوڑا ہی پانی نکل آتا ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا نفع بہت وسیع نہیں اور بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کا نفع اگر دوسروں تک نہ پہنچے تو اپنی ذات میں ہی فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے جلال کے

مسلمانوں کی حالت

سامنے جھک جاتے ہیں ۔ بنی اسرائیل کی تاریخ تو سب اسلامی تاریخ کا نقشہ ہے پس بنی اسرائیل سے بڑھ کر مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ باوجود قساوت قلبی کے بھی انہیں نا امید نہیں ہونا چاہئے ۔ جیسا کہ فرمایا لم یان للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم (الحدید ۵۷ : ۱۶) کیا ان لوگوں کے لئے جو مومن ہیں وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کیلئے اور جو حق اترا اسکے لئے جھک جائیں اور وہ ان لوگوں کی مثل نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی پھر ان پر لمبا زمانہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ قساوت قلبی کے بعد علوم سے قوم ترقی کر سکتی ہے +

طمع

۱۰۰ تطمعون ۔ طمع نفس کا اشتیاق ہے کسی چیز کے لئے اس کو چاہتے ہوئے (غ) ، اور اس کا اکثر استعمال ذلیل خواہشات پر ہوتا ہے مگر اس کے معنی صرف رجا بھی ہیں یعنی کسی چیز کی امید رکھنا (ت) +

کلام
کلام اللہ مع مفہوم
بلا لفظ نہیں

کلام اللہ ۔ کلام کلم سے ہے جس کے لئے دیکھو ۵۷ اور کلام ان الفاظ کو کہتے ہیں جو ایک نظم میں ہوں مع اس معنی کے جو ان کے نیچے ہوں (غ) یعنی صرف لفظ بغیر معنی یا معنی بغیر لفظ پر کلام نہیں بولا جاتا پس کلام اللہ الفاظ مع معانی ہیں اور یہ عقیدہ کہ وہ صرف مفہوم ہے جو صاحب وحی کے قلب میں ڈالا جاتا ہے لفظ کلام کے معنی سے غلط ٹھہرتا ہے +

حرف ۔ تحریف
تحریف لفظی

یحرفون ۔ تحریف حرف سے ہے جس کے معنی کنارہ یا حد ہیں ۔ اور تحریف کے معنی التغییر والتبدیل ہیں (ت) یعنی تغیر و تبدل کرنا ۔ تغیر و تبدل لفظی بھی ہو سکتا ہے اور معنوی بھی مگر اول مراد لفظی ہی لی جائے گی اور یہی جمہور کا مذہب ہے اور اسی کی تائید قرآن شریف کی اس آیت سے ہوتی ہے جو آگے آتی ہے یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من

۷۶ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا

اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ اور جب تنہائی میں ایک دوسرے کیساتھ ہوتے ہیں کہتے ہیں

بائبل میں تحریف لفظی

عند اللہ اپنے ہاتھوں سے کچھ لکھکر کہدیتے ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تحریف لفظی ہو پس یہاں تحریف لفظی ہی مراد ہو۔ قرآن کریم کے اعجازوں میں سے ایک یہ اعجاز ہو کہ بائبل میں تحریف ہونے کا دعویٰ اس وقت کیا جب دنیا اس سے بیخبر تھی۔ اور آج تیرہ سو سال بعد خود عیسائی محققین کو یہ اعتراف ہو کہ بائبل میں تحریف ہوئی ہو۔ ایک اُمّی کو یہ علم تیرہ سو سال پیشتر کس نے دیا جب تحریف کا نام کوئی نہ جانتا تھا؟

سوالات کا جواب کہ تحریف شدہ کتاب کا نام تورات و انجیل کیوں رکھا۔

عیسائیوں کو قرآن کریم کے اس بیان پر کچھ اعتراض ہیں۔ اگر یہ کتابیں تحریف شدہ تھیں اصلی نہ تھیں۔ تو ان کا نام وہی کیوں رکھا۔ توریت اور انجیل ان کو کیوں کہا؟ یہ نہایت ہی لغو اعتراض ہو تحریف ہو جانے سے کتاب کا نام بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسرا اعتراض ہو کہ ان پر عمل کے لئے کیوں بُلاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ سے اول مطالبہ ہے کہ جو کچھ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے جسے تم خدا کا کلام سمجھتے ہو اسی پر عمل کرو ورنہ تمہارے سارے دعوے نرے لاف و گزاف ہیں۔ جیسا کہ فرمایا قل یا اھل الکتاب لستم علی شئی حتّٰی تقیموا التوراة والانجیل (المائدہ ۶۸) تیسرا اعتراض ہے

قرآن کریم کن معنوں میں مصدق ہو

کہ قرآن کریم ان کا مصدق ہے تصدیق کے معنی اوپر بیان ہو چکے ہیں کہ ان کی پیشگوئیوں کو پورا کرکے ان کی سچائی کی شہادت دیتا ہو۔ یا زیادہ سے زیادہ اصول کا مصدق ہو۔ اگر ان کے سارے رطب و یابس کا مصدق ہوتا تو خود ان کے غلط خیالات کی تردید کیوں کرتا؟ پھر اعتراض ہو کہ ان کو ہدایت و نور کیوں کہا؟ اس لئے کہ باوجود تحریف کے ان میں ہدایت و نور ہو۔ خود پیشگوئیاں ہدایت و نور ہیں۔ اب جبکہ بائبل میں تحریف ایک مسلم امر ہے۔ یہ اعتراض حضرت عیسیٰ پر آتا ہو کہ انہوں نے کیوں اس تحریف کو نہ سمجھا۔ وہ بات جو حضرت عیسیٰ کو خدا نے نہیں بتائی وہ رسول اللہ صلعم کو بتا دی۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ اب ہم خود ایک مفسر بائبل کا اقرار دکھاتے ہیں کہ بائبل میں تحریف لفظی ہوئی ہو۔ یہ مفسر پادری ڈملو صاحب ہیں جنہوں نے ایک جلد میں بائبل کی مکمل تفسیر انگریزی میں لکھی ہو وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ موسیٰ کی کتابیں حضرت موسیٰ کی اپنی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اصل تحریروں میں کمی بیشی کرکے یہ بنائی گئیں لکھتے ہیں:

ایک مفسر بائبل کا اقرار تحریف لفظی۔

کتب خمسہ میں تحریف لفظی کی مثالیں۔

"مگر غور سے تحقیق کرنے پر ماننا پڑتا ہے کہ کتب خمسہ میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اس پرانے خیال سے کہ موجودہ صورت میں یہ موسیٰ کی کتابیں ہیں مطابقت نہیں کھاتیں مثلاً یہ اطمینان سے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ استثناء باب ۳۴ میں موسیٰ نے اپنی موت کا حال خود نہیں لکھا۔ استثناء باب ۱۔ ۱ میں یہ بیان کہ یہ وہ باتیں ہیں جو موسیٰ نے یردن کے اس پار بیابان کے میدان میں ..... اسرائیل کو کہیں کسی ایسے شخص کے نقطۂ خیال سے لکھا گیا ہو جو کنعان میں رہتا تھا مگر موسیٰ کنعان میں کبھی نہیں گئے"

اس قسم کی بہت سی مثالیں دیکر پادری صاحب کئی وجوہات اس بیان کی تائید میں دیتے ہیں کہ موسیٰ کی پانچ کتابیں اصل میں ایک شخص کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ پہلی تحریروں کی بنا پر تالیف کی گئی ہیں"۔

اناجیل اور مسیح کی زبان کا اختلاف

نئے عہد نامہ یا اناجیل کی حالت اس سے بھی بدتر ہو۔ وہی مفسر لکھتا ہو:۔

اناجیل کے متعلق پہلے بزرگوں کا خیال۔

اناجیل کے لکھنے والے یسوع مسیح کے اقوال کو یونانی میں لکھتے ہیں حالانکہ وہ اغلباً اکثر ارمی زبان میں گفتگو کرتا تھا نہ ہی یہ اغلب ہو کہ ان کاتبوں کا کبھی یہ خیال تھا کہ ان کی تحریریں ابتدائی کلیساؤں سے آگے جائیں گی جن سے وہ خود آشنا تھے یہی حال پولوس کی تحریروں کا ہو۔ اس کے خطوط جن کی اب اس قدر عزت کی جاتی ہے۔ وہ اصل میں صرف انہی کلیساؤں کے لئے لکھے گئے تھے جن کے نام وہ تھے جنہوں نے ان کو پہلے نقل کیا وہ ہرگز انکو ان معنوں میں پاک نوشتے

أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ

کیا تم ان سے وہ باتیں کرتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ وہ اسکے ذریعہ تمہارے رب کے حضور تم سے جھگڑ سکیں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے

نہ سمجھتے تھے جن معنوں میں ہم سمجھتے ہیں"۔

پھر اس سے بھی واضح الفاظ میں وہی مفسر لکھتا ہے۔

اناجیل میں تحریف لفظی کا اقرار

"پچھلی صدیوں میں ہم مقدس الفاظ کی حفاظت میں وہ احتیاط کا خیال نہیں پاتے جو عہدنامہ قدیم کے پہنچانے میں پایا جاتا ہے ایک نسخہ کا نقل کرنے والا بعض وقت وہ الفاظ درج نہ کرتا تھا جو اصل عبارت میں موجود ہوتے تھے۔ بلکہ وہ درج کر دیتا جو اس کے خیال میں درج ہونے چاہیئے تھے۔ وہ ایک ناقابل اعتبار حافظہ پر بھروسہ کرتا یا بعض وقت اصل عبارت کو بدل کر اس فرقہ کے خیالات کے مطابق کر دیتا جس میں وہ خود ہوتا۔ ابتدائی عیسائی بزرگوں کی عبارات اور حوالجات کے علاوہ قریباً چار ہزار سے عہدنامہ کے یونانی نسخے موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اختلاف عبارات بہت زیادہ ہے"۔

اناجیل میں تحریف کی مثالیں

بہت سی مثالیں موجودہ اناجیل سے دی جاسکتی ہیں جہاں صاف طور پر تحریف تسلیم کی گئی ہے۔ اور نئے ترجموں میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے مگر یہ مقام تفصیل نہیں۔ متی باب ۱۷ کی اکیسویں آیت "مگر اس طرح کے دیو بغیر دعا و روزہ کے نہیں نکالے جاتے" ترمیم شدہ ترجموں میں سے نکال دی گئی ہے۔ اسی انجیل کے اُنیسویں باب میں جہاں کوئی شخص مسیح کو نیک اُستاد کہکر مخاطب کرتا ہے۔ اور مسیح جواب میں کہتا ہے "تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے" ترمیم شدہ ترجموں میں یہ لفظ ہیں "تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے" (متی ۱۹: ۱۷) اس پر پادری ڈملو مفسر مذکور مرقس ۱۰: ۱۷ کی تفسیر میں لکھتا ہے "متی کے مصنف نے یا کسی پہلے کاتب نے عبارت میں تھوڑی سی تحریف کر دی تاکہ قاری یہ خیال نہ کرے کہ مسیح اپنے نیک ہونے سے انکار کر رہا ہے" مرقس کے آخری باب کی آیت ۹-۲۰ تک کے متعلق اسی مفسر کو یہ اعتراف ہے کہ یہ بعد میں بڑھائی گئیں۔ مرقس کا نسخہ ایک زمانہ کے بعد جب تلاش کیا گیا تو نامکمل ملا۔ اس لئے ضرورت پورا کرنے کے لئے اس قدر آیات بعد میں بڑھا دی گئیں۔ غرض تحریف بائبل اب ایک اظہر من الشمس صداقت ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآن کریم کا یہ اعجاز بھی کہ تیرہ سو سال پیشتر اس وقت تحریف بائبل کی خبر دی جب دنیا میں کسی کو خبر تک نہ تھی کہ بائبل میں تحریف ہوئی ہے نہ کسی یہودی کو یہ علم تھا نہ عیسائی کو مگر آج سب مانتے ہیں۔ یہ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کا نہایت بدیہی ثبوت ہے۔

فتح

حلّ لغات۔ فَتْحٌ کے معنی زنجیر اور بیڑی کا دور کرنا ہے۔ جیسے دروازہ کا کھولنا پھر برکات یا علوم کے کھولنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور فتح علیہ کے معنی ہیں ایک چیز کا اسے علم دیا (غ)۔

حج — حُجّة ۔ مُحاجّة

یحاجوکم۔ حج زیارت کے قصد کو کہتے ہیں (اور عرف شریعت میں بیت اللہ کی زیارت کے قصد کے لئے مخصوص ہے) اور حُجَّة دلیل کو کہتے ہیں جو مقصد مستقیم کو واضح کر دیتی ہے اور مُحَاجَّة یہ ہے کہ دو شخصوں میں سے ہر ایک دوسرے کی دلیل کو رد کرنا چاہے (غ)۔

منافق یہودی

منافق طبع یہودی جب مسلمانوں سے ملتے تو کہدیتے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں اور ہماری کتابوں میں ان کی پیشگوئیاں ہیں لیکن جب اپنے علماء کے پاس آتے (یہاں انکو بعضہم کہا ہے شروع سورت میں شیاطینہم کہا ہے) تو وہ علماء

آنحضرت صلعم کے ظہور کی پیشگوئیوں کی عام شہرت۔

ان کو کہتے کہ تم مسلمانوں سے پیشگوئیوں کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ اس سے انکے ہاتھ میں ایک دلیل آجاتی ہے جس کی بنا پر وہ یہودیوں کو ملزم کر سکتے ہیں۔ اس کا جواب اگلی آیت میں دیا ہے کہ خدا تو سب کچھ جانتا ہے تمہارے چھپانے سے کیا بنے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیشگوئیاں اس وقت یہودیوں میں عام طور پر مشہور تھیں۔

۷۷ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ○ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ

بھلا کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہو جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں اور کچھ ان میں سے جاہل ہیں جو کتاب کا کچھ

۷۹ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ○ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ

علم نہیں رکھتے مگر جھوٹ دیارث لینا ہی جانتے ہیں، اور وہ نرے توہمات میں ہیں ۱۰۲ سو ان کیلئے حسرت ہو جو اپنے ہاتھوں سے کتاب

بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا

لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہو تاکہ اس کے عوض تھوڑی قیمت لے لیں پس ان کیلئے حسرت ہو اسکی وجہ سے جو انکے

۸۰ كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ○ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً

ہاتھوں نے لکھا اور ان کیلئے حسرت ہو اسکی وجہ سے جو وہ کماتے ہیں ۱۰۳ اور کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئے گی۔

اُمّی

۱۰۲ اُمّیون۔ اُمّی کی جمع ہو اُمّی اُس کو بھی کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو یعنی اُمّ کی طرف منسوب شخص گویا جیسا کہ ماں کے پیٹ سے نکلا تھا ویسا ہی ہو اور اکتساب سے علم حاصل نہیں کیا (د) یا اس لئے کہ عورتیں ابتدا میں لکھنے پڑھنے سے محروم رہتی تھیں اور عرب کے لوگوں کو بھی اُمّی کہتے ہیں یعنی منسوب بہ اُم القریٰ (غ) کیونکہ اُم القریٰ مکہ کا نام ہے۔ یہاں اَن پڑھ یہودی بھی مراد ہو سکتے ہیں اور جو اہل عرب یہودی ہو گئے تھے وہ بھی مراد ہو سکتے ہیں +

منی

تمنی

امنیۃ

امانی۔ اُمْنِيَّة کی جمع ہو۔ اور یہ مَنی سے ہے جس کے معنی تقدیر یا اندازہ کرنا ہیں اور مَنی جس سے حیوانات پیدا ہوتے ہیں اسی مادہ سے ہے گویا حیوانات کا اندازہ اس سے ہوتا ہے (غ) اور اسی سے تمنّی ہے جس کے معنی خواہش کرنا ہیں کیونکہ یہ بھی دراصل کسی چیز کا دل میں اندازہ کرنا ہے اور تمنی کا لفظ اکثر ان چیزوں پر بولا جاتا ہو۔ جن کی حقیقت کوئی نہ ہو (غ) اور اُمْنِيَّة وہ صورت حاصلہ ہے جو نفس میں کسی چیز کی تمنی سے پیدا ہوتی ہو۔ اور چونکہ جھوٹ بھی ایک ایسا تصور ہو جس کی حقیقت کوئی نہیں اس لئے تمنی جھوٹ کے لئے بمثل مبدأ کے ہو گیا ہے یعنی تمنی سے جھوٹ پیدا ہوتا ہے (غ) مجاہد نے یہاں تمنی کے معنی اسی بنا پر جھوٹ مراد لئے ہیں۔ بعض نے بغیر معنی جاننے کے لفظوں کو پڑھ لینا بھی مراد لیا ہو۔ آج مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے کہ بغیر معنی جاننے کے قرآن کریم کو پڑھ لینا کافی سمجھتے ہیں۔ یہودیوں پر ایک وقت وہ آگیا کہ عوام الناس علم دین سے بالکل بیخبر ہو گئے اور جو کچھ ان کے علماء یا سجادہ نشین کہتے اُسے مانتے چلے جاتے معلوم ہوا کہ قرآن کریم اس کو پسند نہیں کرتا کہ علم دین صرف خاص لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ بلکہ چاہتا ہو کہ ہر ایک شخص بجائے خود علم حاصل کرے تاکہ اندھا ہو کر دوسروں کے پیچھے نہ لگے بلکہ خود بھی کچھ بصیرت سے کام لے سکے۔ رسول اللہ صلعم کا ایک کام یعلمہم الکتاب والحکمۃ بھی ہو اور آپ نے تمام ہی صحابہ کو کتاب وحکمت سکھائی کسی خاص گروہ کو نہیں۔ اسی لئے ایک اُمّی قوم دنیا میں علوم کی مشعل بردار ہو گئی۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت ان آیات کی روشنی میں قابل عبرت ہو وہ نہ صرف علوم سے بے بہرہ اور توہمات میں مبتلا ہیں۔ بلکہ ان کے دنیوی اور دینی لیڈر بھی انکا علوم سے مستفیض ہونا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے کہ اس سے ان کی جھوٹی سرداری میں فرق آتا ہو +

یہود کے ذکر میں اشارہ کہ سب مسلمان علم حاصل کریں۔

۱۰۳ پچھلی آیت میں عوام الناس کا ذکر تھا اس میں علماء کا ذکر ہے جب عوام میں علم کتاب نہ رہا تو تحریف کا موقع خوب ملگیا یہ آیت بائبل کی تحریف لفظی پر قطعی شہادت ہو۔ آخری الفاظ میں علماء کی بدعملیوں کی طرف اشارہ ہو +

قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ أَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

کہو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لیا ہے پس اللہ اپنے عہد سے ہرگز خلاف نہیں کریگا یا اللہ پر وہ بات بناتے ہو جو تم نہیں جانتے ۱۰۴

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّأَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا ۸۱

ہاں! جو بدی کماتا ہے اور اس کی بُرائیاں اسے گھیر لیتی ہیں وہی آگ والے ہیں اسی میں

خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ۸۲

رہینگے ۱۰۵ اور جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں وہی جنت والے ہیں اسی میں رہینگے

یہودیوں اور عیسائیوں کا دعویٰ کہ عذاب چندروزہ ہوگا

۱۰۴ یہود کہتے تھے ہم کو صرف چالیس دن عذاب ہوگا اور بعض کہتے تھے سات دن بیل کہتا ہے یہودیوں میں مسلم ہے کہ کوئی یہودی خواہ کیسا ہی بدکار ہو گیارہ ماہ یا ایک سال سے زیادہ دوزخ میں نہ رہیگا عیسائیوں نے اس پر یہ ترقی کی ہے کہ مسیح کا تین دن دوزخ میں رہنا تمام بدکاریوں کے لئے کفارہ ہوگیا۔ خدا کا کوئی حکم ایسا نہیں بلکہ انجیل میں بھی اعمال کو نجات کے لئے ضروری قرار دیا ہے متی ۷: ۲۲۔۲۳ میں معجزات دکھانے والوں کو مسیح کہتا ہے "اے بدکارو میرے پاس سے چلے جاؤ" پس نجات بدکار کیلئے نہیں +

سوء

۱۰۵ سیئۃ۔ سوء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو انسان کیلئے غم لاتی ہے خواہ امور دنیوی سے ہو یا امور اُخروی سے اور خواہ وہ حالت نفس کے متعلق ہو یا بدن کے یا خارجی امر ہو جیسے مال وجاہ کا جاتے رہنا (غ) اور

سیئۃ حسنۃ

سیئۃ اس فعل قبیح کو کہا جاتا ہے جو حسنۃ یعنی بھلائی کی ضد ہے پھر ہر سیئۃ اور حسنۃ دو قسم ہے اول جو حسب اقتضائے عقل و شریعت ہو اور وہی یہاں مراد ہے اور دوسری وہ جو باعتبار موافقت طبیعت ہو یعنی جو چیز طبیعت کو اچھی معلوم ہو اور طبیعت اس کو ہلکا سمجھے اس پر حسنۃ کا لفظ بول دیا جاتا ہے اور جو طبیعت پر گراں ہو اس کو سیئۃ کہہ دیا جاتا ہے (غ)، اس معنی میں بہت جگہ قرآن شریف میں یہ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں +

خطیئۃ خطاء

خطیئۃ۔ خطاء سے ہے جس کے اصل معنی العدول عن الجہۃ ہیں یعنی ٹھیک سمت سے ایک طرف ہو جانا۔ اور یہ کئی قسم ہے اول یہ کہ ارادہ کرے اس کے غیر کا جس کا ارادہ مستحسن ہے پھر اس کو کرے یہ خطاء تام ہے۔ اور اس پر انسان ماخوذ ہوتا ہے اور یہی یہاں مراد ہے دوسرے یہ کہ ارادہ ایسی چیز کا کرے جس کا ارادہ مستحسن ہے لیکن جو کچھ ارادہ کیا ہے اس کے خلاف اس سے واقع ہو جائے یہ وہ خطاء ہے جس کے متعلق آتا ہے رفع عن امتی الخطاء والنسیان من اجتھد فاخطاء فلہ اجر یعنی جو شخص اجتہاد کرے اور اس کا اجتہاد غلط ہو جائے اسے ایک اجر ملتا ہے (غ) یہی خطاء

سیئۃ اور خطیئۃ

ان نسینا او اخطانا میں مراد ہے اور سیئۃ اور خطیئۃ میں امام راغب نے یہ فرق کیا ہے کہ خطیئۃ کا لفظ اکثر اس امر پر بولا جاتا ہے جو فی نفسہٖ مقصود الیہ نہیں ہوتا +

بدی کا مقابلہ

بدی کے لئے کسب کا لفظ اختیار کرکے بتا دیا کہ انسان جب ہمہ تن ہی بدی کے پیچھے لگ جاتا ہے تو چاروں طرف سے بدیاں اس کو گھیر لیتی ہیں پھر اس کے لئے نکلنے کا رستہ نہیں رہتا۔ جو شخص بدی کے مقابلہ کی کوشش کرتا ہے وہ بدیوں میں گھرتا نہیں بلکہ آخر کار غالب آتا ہے۔ بدی کی کشش گو بہت سخت معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں وہ ایک کمزور چیز ہے

نیکی کی قوت بدی سے زبردست ہے

اور نیکی کی قوت زبردست ہے کیونکہ فطرت نیکی کی معاون ہے اس لئے نیکی اور بدی میں جب مقابلہ ہوگا نیکی غالب آئے گی +

۸۳ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ ع۱۰

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ سوائے اللہ کے تم کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ

بنی اسرائیل کی عہد شکنی

اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا

اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیکی کرنا اور لوگوں کو اچھی بات کہو اور نماز

الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

قایم کرو اور زکوٰۃ دو پھر تم میں سے تھوڑوں کے سوائے تم پھر گئے اور تم دور نکل جانے والے ہو ۱۰۶

حُسن

۱۰۶ احسان حُسن۔ وہ شے ہے جو خوش کرتی ہے یا جس میں رغبت کی جاتی ہے۔ بروئے عقل یا بروئے خواہشات یا بروئے حِس اور اس کا اکثر استعمال قرآن شریف میں اس پر ہے جو عقل کی رو سے اچھا لگے (غ) یہاں حسن سے مراد کلمہ حسنہ ہے یعنی اچھی بات اور احسان ایک اپنے فعل میں ہوتا ہے جیسا اچھا علم یا اچھا عمل۔ جیسے حدیث میں آیا ہو کہ احسان یہ ہے۔ کہ تم اللہ کی عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ یا کم از کم یہ کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے اور اکثر استعمال اسکا دوسرے پر انعام پر ہے۔ گویا انسان کا حسن متعدی ہو جاتا ہے ✦

احسان

قرب

ذی القربیٰ۔ قرب کئی لحاظ سے ہوتا ہے بنسبت کے لحاظ سے جیسے یہاں پھر نسبت بھی یا باپ کے لحاظ سے ہوگی یا ماں کے۔ پھر قرب مکان و زمانہ کے لحاظ سے ہوتا ہو یا مرتبہ کے لحاظ سے جیسے من المقربین میں۔ رعایت یعنی نگہداشت کے لحاظ سے جیسے ان رحمت اللّٰہ قریب من المحسنین میں۔ قدرت کے لحاظ سے جیسے نحن اقرب الیہ من حبل الورید (غ) مگر یہ علم کے لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے ✦

یتیم

الیتامیٰ۔ یتیم کی جمع ہے۔ اور یُتم کے معنی انقطاع یعنی کٹ جانا ہیں اور یتیم انسانوں میں سے وہ ہے جو بلوغ سے پہلے باپ سے منقطع ہو گیا ہو یعنی اس کا باپ مر گیا ہو (غ) اور ہر ایک منفرد کو یتیم کہتے ہیں جیسے دُرّۃ یتیمۃ ✦

تولیٰ

تولیتم۔ تولیٰ کا اصل ولی سے ہے جس کے معنی قرب ہیں اور جب اس کا صلہ عن ہو خواہ لفظاً یا تقدیراً جیسے یہاں تو اس کے معنی اعراض اور ترک قرب کے ہوتے ہیں (غ) ✦

اعرض

معرضون۔ اعرض۔ عرض سے ہو جو طول کے خلاف ہے اور غیر اجسام میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے فذو دعاء عریض (حمٰ ۴۱: ۱۵) اور اعوض عنہ کے معنی ہیں اس سے پھر گیا۔ تولیٰ اور اعراض میں یہ فرق کیا گیا ہو کہ تولی یہ ہے کہ جدھر سے آیا تھا ادھر واپس چلا گیا یعنی محض پیٹھ پھیر دی۔ اور اعراض یہ کہ اس رستہ کو چھوڑ کر اس کی چوڑائی میں چلا گیا۔ گویا نہ صرف حق پر پیٹھ پھیر دی بلکہ باطل کو اختیار کر لیا ✦

تولی اور اعراض

توریت کے احکام

پہلے جب اخذ میثاق کا ذکر کیا تو تفصیل نہ فرمائی تھی اب اسی میثاق کی تھوڑی سی تفصیل کر دی ہے کہ کیا کیا حکم تھے یہ احکام گویا اصل الاصول کے رنگ میں ہیں۔ ایک خدا کی عبادت دوسرے مخلوق خدا سے نیکی۔ توریت میں خدائے تعالیٰ کی توحید پر بڑا زور تھا اس تاکید کو ظاہر کرنے کے لئے اخباری صورت اختیار کی ہے۔ دوسرے حصہ میں سب سے پہلے والدین پھر رشتہ دار پھر یتیم پھر مسکین پھر عام لوگ۔ پھر اس کی دو نمایاں صورتیں بیان کیں۔ نماز اور زکوٰۃ توریت میں یہ سب احکام موجود ہیں۔ ایک خدا کی عبادت کے لئے دیکھو خروج ۲۰: ۳۔ ماں باپ کی عزت خروج ۲۰-۱۲ قریبی استثناء ۱۵: ۱۱

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ ۸۴

اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا کہ تم اپنے خون نہ گراؤ گے اور نہ اپنے لوگوں کو اپنے گھروں سے باہر

دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ ۸۵

نکالو گے پھر تم نے اقرار کیا اور تم گواہ ہو ۱۰۷ پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے لوگوں کو قتل کرتے ہو

وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے گھروں سے باہر نکالتے ہو ان کے خلاف گناہ اور زیادتی سے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو ۱۰۸

وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ

اور اگر وہ قید ہو کر تمہارے پاس آئیں فدیہ دیکر انہیں چھڑاتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام کیا گیا تھا تو کیا تم کتاب کے ایک

الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ کا انکار کرتے ہو پس جو شخص تم میں سے ایسا کرتا ہو اس کی سزا سوائے اس کے کیا ہو کہ دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ ۸۶

اور قیامت کے دن زیادہ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائینگے اور اللہ اس سے بیخبر نہیں جو تم کرتے ہو ۱۰۹ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے

یتامیٰ استثنا ۱۴: ۲۹ مسکین استثناء ۱۵: ۱۱ عام لوگ خروج ۲۳ باب کا شروع نماز استثنا ۱۳: ۴ زکوٰۃ خروج ۲۳: ۱۰ و ۱۱۔ احبار ۲۵: ۱ ✦

اپنی قوم کے خلاف جنگ نہ کرنے کا حکم

۱۰۷ یہاں خطاب براہ راست کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ بات یہود عرب سے خاص تعلق رکھتی تھی۔ اور ان کی ایک نمایاں عہد شکنی کا ذکر اس میں ہے، اور اس لئے بھی کہ اس کی طرف خصوصیت سے مسلمانوں کو متوجہ کرنا مقصود ہے۔ اپنے خون نہ گرانے سے مراد ہے کہ اپنی قوم کے خلاف جنگ نہ کرو گے یہ حکم خروج ۲۰: ۱۳ میں ہے۔ اپنی بھائیوں کو گھروں سے نکالنے سے مراد یا تو یہ ہے کہ ان کے گھروں پر قابض ہونے کا لالچ کرنا۔ دیکھو خروج ۲۰: ۱۷۔ اور یا مراد فساد ہے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ بعض لوگوں کو گھروں سے نکلنا پڑے ✦

تظاھر

۱۰۸ تظٰھرون۔ تظاھُر ایک دوسرے کی اعانت کرنا ہے اور ظَہر بمعنی پیٹھ سے مشتق ہے گویا ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی پیٹھ کی ٹیک اپنے ساتھی سے لگاتا ہے ✦

اثم۔ آثام

اثم۔ اِثم اور آثام ان کاموں کو کہتے ہیں جو ثواب سے پیچھے رکھیں گویا اس کے اصل معنی میں تاخیر ہے (غ) اور حدیث میں اثم کی تعریف کی ہے ما حاك فی نفسك یعنی جو چیز تیرے اندر اثر کر جائے اور راسخ ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی وکرھت ان یطلع الناس علیه اور تو ناپسند کرے کہ لوگ اس کی اطلاع پائیں ✦

عدوان۔ عداوۃ

عدوان۔ عَدْو بمعنی تجاوز سے ہے۔ اور یہ تجاوز کبھی دل سے ہوتا ہے تو اس کو عداوت یا معاودت کہا جاتا ہے اور کبھی چلنے میں ہوتا ہے تو اس کو عَدْو یعنی تیز رفتاری کہتے ہیں اور کبھی معاملہ میں میانہ روی مدنظر نہ رکھنے سے ہوتا ہے تو اسکو عُدوان کہا جاتا ہے

اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۸۶

آخرت کے بدلے اس دنیا کی زندگی کو خرید لیا پس نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائیگا اور نہ وہ مدد دیئے جائیں گے ۱۰۹

اثم اور عدوان

اور اثم اور عدوان میں فرق یہ ہو کہ اثم اپنی ذات میں ایک فعل ہو اور عدوان دوسرے پر ظلم ہو پس ان کا فعل حکم الٰہی کے مخالف ہونے کی وجہ سے اثم ہے اور اپنے بھائیوں پر ظلم کی وجہ سے عدوان ہو ✦

اسیر

اسارٰی ۔ اسیر کی جمع ہو یا اسْرٰی کی جمع جو اسیر کی جمع ہو ۔ اور اَسْر کے معنی زنجیر سے باندھنا ہیں اور ہر شخص جو پکڑا جائے خواہ زنجیر سے باندھا جائے یا نہ اسیر ہے

فداء

تفادوا ۔ فِداء اور فِدٰی کے معنی ہیں انسان کو کسی مصیبت سے اس کی طرف سے کچھ خرچ کرکے محفوظ کرنا (غ) ✦

دنیا

الدُّنیا ۔ دُنُوّ سے ہے جس کی معنی قرب ہیں اور دنیا قریب کی زندگی یا قریب کی منفعت ہے بمقابلہ آخرت کے ✦

قیامة

القیامة ۔ قیام ۔ قام یقوم سے مصدر ہو اور پھر ۃ کے اضافہ سے قیامۃ بن گیا ہو ۔ اور اس کے معنی ہیں انسان کا ایک ہی مرتبہ کھڑا ہو جانا اور اس کے اچانک واقع ہونے کے لئے ہائے تنبیہ داخل کی گئی ہے (غ) اور قیامت یوم بعث ہو جس میں مخلوق حی و قیوم کے سامنے کھڑی ہو جائے گی (ت) ، اور مفردات میں لفظ ساعۃ کے نیچے ہو کہ وہ ساعات جو قیامت ہیں تین

تین قیامتیں ۔ کبریٰ وسطیٰ ۔ صغریٰ

ہیں کُبریٰ یا حساب کتاب کیلئے لوگوں کا بعث وُسطیٰ ایک نسل کا گزر جانا جیسا کہ حدیث میں ہو کہ آنحضرت صلعم نے عبداللہ بن انیس کو دیکھکر فرمایا ان یَطُل عُمُر ھٰذا الغلام لم یمُت حتی تقوم الساعۃ اگر اس لڑکے کی عمر لمبی ہو تو یہ نہیں مریگا یہانتک کہ قیامت قایم ہو جائیگی روایت ہو کہ وہ صحابہ میں سے آخری بزرگ ہیں جو فوت ہوئے اور صغریٰ جو ہر انسان کی موت کے ساتھ قایم ہوتی ہو ✦

اوس اور خزرج کی جنگوں میں یہودیوں کی شرکت

مدینہ میں خزرج اور اوس دو بڑی قومیں تھیں جن کی باہم جنگ رہتی تھی ۔ اور یہودیوں کی دو بڑی قوموں میں سے ایک یعنی بنو نضیر خزرج کے حلیف بن گئے تھے ۔ اور دوسرے یعنی بنو قریظہ اوس کے ۔ یوں یہ اپنے اپنے حلیف سے ملکر اپنے ہی بھائی بندوں کو قتل کرتے اور گھروں سے نکلواتے ۔ مگر جب ایک فریق غالب آکر دوسرے کے قیدی لے لیتا تو پھر دونوں قومیں ملکر چندہ کرکے انہیں چھڑاتیں اس پر انہیں ملزم کیا ہو اور فرمایا ہے کہ اپنی قوم سے جنگ کرنے کا آپس میں فساد ڈالنے اپنے بھائی بندوں کو وطن سے بیوطن کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں بھی ذلیل ہو جاؤ گے اور آخرت میں بھی جنت کی اُمید نہ رکھو بلکہ دنیا سے بدتر عذاب ملیگا ۔ یہود کا قصہ بیان کرکے توجہ مسلمانوں کو دلائی تھی مگر وہ بھی انہیں کے نقش قدم پر چلے اور جو نقشہ یہاں کھینچا ہے وہ پیشگوئی کے رنگ میں مسلمانوں کا نقشہ ہو ایک طرف

یہودیوں کی نظیر دیکر مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرنے سے روکا ہو ۔

تو ہمدردی کا اظہار اس قدر ہے کہ جنگوں میں دنیا کے ایک حصہ میں مسلمان زخمی ہو جائیں تو دوسرے حصہ دنیا میں چندہ ہوتا ہو ۔ اور دوسری طرف ایک ملک دوسرے اسلامی ملک کو تباہ کرنے کی فکر میں ہو کبھی دوسروں سے ملکر کبھی خود بخود ایک طرف خود مسلمان عیسائیوں کے ساتھ ملکر خلافت اسلامی کو تباہ کرتے ہیں ۔ اور دوسری طرف اس کے قیام کیلئے اپیلیں اور مظاہرے کرتے ہیں ✦

مسلم کی تعریف

یہود کا قصہ بیان کرکے سمجھایا ہو کہ کچھ بھی حالات ہوں مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرکے ان کے خون گرانا اور انکے ملک چھیننا جائز نہیں ۔ حدیث میں ہو المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ مسلم وہ ہو جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان دکھ نہ اٹھائیں ۔ ہاتھ سے دکھ دینا یہ ہو کہ ان کو قتل کریں ۔ ان کا مال لوٹیں ان کے ملک چھینیں ۔ زبان سے یہ کہ ان کی عزت پر حملہ کریں

فساد باہمی کفرِ قوم کی تباہی

گالیاں دیں کافر کہیں ۔ باہم جنگ کرکے باہم فساد کرکے دنیا کی زندگی میں پوری رسوائی حاصل کر چکے ہیں لیکن اس رسوائی میں بھی زندہ رہنا نہیں چاہتے اور جب حکومت گئی تو اب ویسے ایک دوسرے کو کافر بناکر اپنی قوم کی تباہی کے درپے ہیں ۔ علماء اور مشائخ کو یہ فکر نہیں کہ کافروں کو مسلمان بنائیں یا اسلام پر جو حملے ہو رہے ہیں ان کا جواب دیں بلکہ مسلمانوں کو کافر بنانا ان کا شیوہ ہو ✦

۱۰۹ اب کلام کا رُخ اس طرف پھیرا ہو ۔ کہ یہ لوگ جنہوں نے عہد شکنیاں کیں ۔ اب جب ان کی ہدایت کا سامان پھر آیا تو انہوں نے دنیا کی خاطر پھر دین کو ترک کر دیا ۔ اگر وہ ہدایت کو اختیار کر لیتے تو ان کا عذاب دور کر دیا جاتا ۔ ان کی نصرت ہوتی مگر اب ایسا نہیں ہوگا ✦

ع ۱۰ | ۸۷ | وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَ

اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے کے پیچھے رسول بھیجے ؏۱۱۰ اور

بنی اسرائیل سے نبوت کے جانے پر اعتراض اور اس کا جواب

اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط

ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلے دلائل دیئے اور روح القدس کے ساتھ اس کی تائید کی ؏۱۱۱

قفا — ؏۱۱۰ قفینا۔ قفا کے معنی پیٹھ ہیں اور قفیتہ کے معنی اس کو اس کے پیچھے رکھا +

رسول — الرسل۔ رسول کی جمع ہے۔ اور رسول اصل میں وہ ہے جو کسی قول اور رسالت کا متحمل ہو (غ)۔ پس بغیر کسی رسالت کے رسول کا لفظ حقیقی معنی میں اطلاق نہیں پا سکتا۔ اللہ کے رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغام اس کی مخلوق کیلئے لاتے

لفظ رسول کا اطلاق مجاز کے طور پر — ہیں مگر مجازاً اس کا اطلاق دوسرے پر جائز ہے جیسے یاایھا الرسل کلوا من الطیبات (المومنون ۲۳۔۵۱) میں رسول اللہ صلعم اور آپ کے برگزیدہ صحابہ شامل ہیں دیکھو مفردات راغب۔ اور ایسا ہی لفظ مُرسل مجازاً حضرت عیسیٰ کے حواریوں پر بولا گیا ہے واضرب لھم مثلاً اصحاب القریۃ اذجاء ھا المرسلون (یٰسٓ ۳۶۔۱۳) پس مجازاً اس کا اطلاق اس اُمت کے مجددین پر جو مامور بھی ہوتے ہیں جائز ہے نہ حقیقتاً۔ ملائکہ پر جو اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان وسائط ہیں اور انبیاء پر جو خدا کی طرف سے مخلوق کے لئے کوئی خبر لاتے ہیں یہ لفظ بالخصوص بولا گیا ہے۔ اور ایک فرستادہ یا قاصد پر بھی بولا جاتا ہے جیسے جاعل الملٰئکۃ رسلا (الفاطر ۳۵۔۱)۔ فلما جاءہ الرسول (یوسف ۱۲۔۵۰) +

سلسلہ رسل بنی اسرائیل — سلسلۂ بنی اسرائیل میں انبیاء کے آنے کو اب بطور نعمت بیان کیا ہے۔ اور اول سلسلہ حضرت موسیٰ اور آخر سلسلہ حضرت عیسیٰ کا نام لیکر باقی ناموں کو چھوڑ دیا۔ کتاب سے مراد یہاں شریعت کی کتاب ہے۔ جو حضرت موسیٰ کو دی گئی۔ یہ شریعت سب انبیاء کے لئے ایک ہی رہی۔ ہاں اپنے اپنے وقت اور ضرورت کے لحاظ سے اس میں انبیاء کچھ کمی بیشی کرتے رہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم (آل عمران ۳۔۴۹) چنانچہ خود قرآن شریف میں حضرت عیسیٰ کو انجیل اور حضرت داؤد کو زبور دیا جانے کا ذکر ہے۔

رسول کیلئے ہدایت لانا ضروری ہے — اسی لئے آیت کے آخر پر فرمایا کہ جو کچھ کوئی رسول تمہارے پاس لاتا تھا تم اس کو قبول نہ کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہر ایک رسول کچھ نہ کچھ ہدایت بھی لاتا تھا جسے لوگ قبول نہ کرتے تھے جس کو بینات یعنی معجزات یا پیشگوئیوں سے الگ کر کے بیان کیا ہے۔ اور معجزات یا پیشگوئیاں محض تائید کے لئے ہوتی ہیں +

عیسیٰ — ؏۱۱۱ عیسیٰ۔ اس کا اصل عیس اور وزن فعلی ہے (ل)۔ اور عرب کے لوگ اس اُونٹ کو اَعیس کہتے ہیں جس کی سفیدی پر کچھ تاریکی ہو اور عَیس ماء الفحل کو کہتے ہیں اور ممکن ہے کہ اسی سے لفظ عیسیٰ کا اشتقاق ہو (غ)۔ مگر بعض اہل لغت کے نزدیک عجمی ہے حالانکہ عبرانی میں یہ لفظ عیسیٰ نہیں بلکہ الیسوع ہے۔ اور انجیل میں یسوع آیا ہے جس کے معنی سید یا مبارک ہیں (ل) +

مریم — مریم کے معنی عبرانی میں خادمہ یا عابدہ ہیں مگر قاموس میں ہے کہ مریم عربی لفظ ہے اور اس عورت کو کہتے ہیں التی تحب محادثۃ الرجال ولا تفجر +

بینات — بینات۔ بینۃ کی جمع ہے جو بان (ظاہر ہوا) سے ہے۔ اور اس کے معنی ہیں کھلی دلیل خواہ عقلی ہو یا محسوس (غ) اس میں معجزات پیشگوئیاں دلائل سب شامل ہیں +

روح — روح القدس مفردات میں ہے کہ روح نفس کے معنی میں بھی آتا ہے اور اشراف الملائکہ کو بھی کہا ہے جبرئیل کو

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا

پس کیا جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس وہ چیز لایا جسکو تمہارے دل نہیں چاہتے تھے تو تم نے تکبر ہی کیا پس ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو

تَقْتُلُونَ ۝ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ۝ ۸۸

قتل کرنے لگے ۱۱۲ اور کہتے ہیں ہمارے دل پردوں میں ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی پس وہ بہت ہی کم مانتے ہیں ۱۱۳

روح القدس

بھی جیسے روح القدس اور روح الامین کے نام سے یاد کیا ہے خود قرآن یعنی کلام الٰہی کو بھی روح کہا گیا ہے۔ جیسے وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا (الشوریٰ ۴۲ - ۵۲) کیونکہ اسی سے زندگی ملتی ہے۔ یہاں روح القدس سے مراد بعض کے نزدیک جبرئیل ہیں اور بعض کے نزدیک انجیل (ح) +

ابن مریم نام کی وجہ

حضرت عیسیٰ کے نام کے ساتھ قرآن کریم نے لفظ ابن مریم بڑھایا ہے۔ یہ عیسائیوں پر اتمام حجت کے لئے ہے کہ وہ جسے تم خدا اور بے گناہ بناتے ہو وہ ایک عورت کا بیٹا تھا۔ اور انہی کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے اور وہ جو عورت سے پیدا ہوا ہے کیونکر پاک ٹھہرے (ایوب ۲۵ - ۴) پھر عیسائیوں کے خیال کے مطابق گناہ مرد دنیا میں نہیں لایا بلکہ عورت لائی۔ کیونکہ عورت نے ہی آدم کو ممنوع پھل کھلایا پس یہ بتایا ہے کہ جب اس کی ماں موجود ہے۔ تو تم اسے دوسرے انسانوں سے بیگناہی کا امتیاز اس بنا پر کیونکر دے سکتے ہو کیونکہ جب اصلی گنہگار حوا ہوئی اور اس کے ورثہ میں گناہ کا چلنا ضروری ہے جیسا کہ عیسائیوں کا اعتقاد ہے تو مریم اس سے کیونکر پاک ٹھہری علاوہ ازیں حضرت عیسیٰ کی والدہ کو جو شہرت دنیا میں حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی ان کے خاوند کو حاصل نہیں اس لئے بھی مریم کی طرف منسوب کرنا اولیٰ تھا۔ جیسے حضرت فاطمہ کی فضیلت کی وجہ سے بنی فاطمہ +

روح القدس کا تعلق حضرت عیسیٰ سے

حضرت عیسیٰ سے روح القدس کا تعلق وہی ہے جو ہر نبی کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ مومنوں کو بھی روح القدس کی تائید ملتی ہے فرمایا ایدهم بروح منه (المجادلہ ۵۸ - ۲۲) جہاں صحابہ کا ذکر ہے یعنی اپنی روح سے ان کی تائید کی۔ اور حدیث میں ہے اللّٰهم ایده بروح القدس اے اللہ تو حسان کی تائید روح القدس سے فرما۔ حضرت مسیح کی بینات اور تائید روح القدس کا خصوصیت سے ذکر اس لئے کیا کہ یہودی ان کا انکار کرتے اور ان کو ناپاک قرار دیتے تھے +

یہودیوں کا شیوہ تکذیب وقتل انبیاء

۱۱۲ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ نبی کریم صلعم سے تمہاری عداوت اس وجہ سے نہیں کہ تم کو دلائل نہیں ملتے بلکہ تم ایسے قسی القلب ہو گئے ہو کہ ہمیشہ ہی خدا کے رسولوں کی تکذیب کرتے رہے بلکہ ایک گروہ کے قتل کے بھی درپے ہوئے چنانچہ کذبتم کو ماضی رکھکر اور تقتلون کو مضارع رکھکر یہ بتایا ہے کہ تم اس وقت بھی ایک رسول کے قتل کے درپے ہو اور اپنی طرف سے تو تم نے اسے قتل کر ہی دیا تھا اگر اللہ تعالیٰ اس کا بچانے والا نہ ہوتا چنانچہ روح المعانی میں ہے انكم الآن فيه فانكم حول قتل محمد صلى الله عليه وسلم ولولا انى اعصمه لقتلتموه۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کے قتل کے درپے ہونے پر یا اس کے اسباب قتل کے جمع کر دینے پر بھی قتل کا لفظ بول دیا جاتا ہے گو وہ شخص فی الواقع مقتول نہ ہو +

غُلف

۱۱۳ غُلف۔ یا اَغلف کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو غلاف میں ہو اور اس سے ان کی مراد علوم توریت کے غلاف ہیں اور یا غِلاف کی جمع ہے یعنی ہمارے دل خود علم کے غلاف یا علم کے وعاء ہیں (غ) یعنی علم ان کے اندر بھرا ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ ہم تم سے کچھ سیکھنے کے محتاج نہیں +

لعنة

لعن کے اصل معنی ہیں ناراضگی کی وجہ سے نکال دینا اور دور کر دینا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں لعنت کے ہونے سے مراد سزا کا دینا ہے اور دنیا میں لعنت یہ ہے کہ ایک شخص اس کی رحمت اور اس کی توفیق سے کٹ جائے (غ)، اور

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ ۸۹

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب آئی اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو ان کے پاس ہے اور پہلے وہ ان پر جو کافر تھے

يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ

فتح مانگا کرتے تھے۔ مگر جب ان کے پاس وہ آیا جسے انہوں نے پہچانا اس کا انکار کر دیا پس انکار کرنے والوں

اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ ۹۰

پر اللہ کی لعنت ہے مبتلا کیا ہی برا ہے جس کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا کہ اس کا انکار کرتے ہیں جو اللہ نے اتارا

اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ

اس حسد سے کہ اللہ اپنے فضل میں سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اتارے

شلخ بن ضرار کے شعر میں آتا ہے مقام الذئب کالرجل اللعین جہاں الرجل اللعین سے مراد دور پھینکا گیا انسان ہے (ج) +

ما قلیلاً ما۔ ما قلیل کے لئے بطور تاکید بڑھایا گیا ہے یعنی بہت ہی کم +

دلوں کے پردے یہودیوں کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے دل ایسے پردوں کے اندر ہیں کہ آپ کی بات ان میں داخل نہیں ہو سکتی۔ جیسے دوسری جگہ ہے قلوبنا فی اکنۃ مما تدعونا الیہ (حم السجدہ ۴۱: ۵) گویا یہ خلقی پردے ہیں اور یا یہ کہ ہمارے دلوں میں پہلے ہی علم بھرا ہوا ہے ہم تم سے کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اصل وجہ یہ ہے کہ تم رحمت اور توفیق الٰہی سے دور جا پڑے ہو یہی وجہ ہے کہ تم بہت کم ہی ماننے رہے ہو +

استفتاح ۱۱۴ یستفتحون۔ استفتاح فتح سے ہے اور اس کے ایک معنی ہیں کہ آنحضرت صلعم کی بعثت کے ذریعہ سے خدا کی مدد مانگا کرتے تھے۔ اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اس کی خبر چاہتے تھے کبھی لوگوں سے پوچھتے کبھی کتابوں سے استنباط کرتے تھے یا یہ کہ دوسری قوموں پر اس ذریعہ سے غلبہ مانگتے تھے (غ) اور یستفتحون بمعنی یفتحون بھی ہو سکتا ہے (ض) یعنی نبی آخر الزمان کے آنے کی خبریں بت پرستوں کو سنایا کرتے تھے +

بنی اسرائیل اور نبی موعود چونکہ ان کے ساتھ وعدہ تھا کہ نبی موعود پر ایمان لائیں گے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں انہیں ممتاز قوم بنائے گا۔ استثناء ۲۸: ۱۲ و ۱۸: ۱۵ تا ۱۸۔ اس لئے جب دنیا میں بوجہ انبیاء کے انکار کے ذلیل ہو گئے تو پھر خدا سے یہ دعائیں مانگنے لگے کہ وہ موعود نبی آئے تو ہمیں کافروں پر غلبہ ملے لیکن جب وہ کتاب آگئی جو ان کی وحی کی تصدیق کرتی تھی اور یہی اس موعود نبی کی سب سے بڑی علامت تھی کہ وہ دنیا کے کل انبیاء کی تصدیق کرے گا تو اسے رد کر دیا +

موعود نبی کی شناخت یہاں یہی دعویٰ کیا ہے کہ وہ آنحضرت کی صداقت کو خوب پہچانتے ہیں اسلئے کہ نہایت بین اور موٹے نشان آپکی صداقت کے ان پر کھل چکے تھے مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ اب تک کسی نبی نے نہ کیا تھا صرف آنحضرت نے کیا۔ دوسرے انبیاء کی تصدیق کسی نبی نے نہ کی تھی صرف آپنے کی +
اس موعود نبی کا انکار اللہ کی جناب سے دوری ہے۔ صرف اس کی ہدایات پر عمل کر کے وہ خدا تک رسائی حاصل کر سکتے تھے جب اس کو رد کر دیا تو خود ہی دوری یا لعنت کو خرید لیا +

۹۱ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ

پس وہ غضب پر غضب کا محل بن گئے اور کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا دکھ ہے ۱۱۵ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس

اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۤ

ایمان لاؤ جو اللہ نے اتارا ہے کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر اتارا گیا اور اس کا انکار کرتے ہیں جو اس کے سوا ہے۔

وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۭ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ

حالانکہ وہ حق ہے اس کی تصدیق کرنے والا جو ان کے پاس ہے۔ کہو تو پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے تھے اگر تم

۹۲ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

مومن تھے ۱۱۶ اور بیشک موسیٰ تمہارے پاس کھلی دلیلیں لایا پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑا بنا لیا اور تم ظالم تھے ۱۱۷

بئس۔ نعم

۱۱۵ بئس۔ بؤس سے ہے جس کے معنی شدت اور مکروہ ہیں۔ اور بئس ہر ایک مذمت کے مقام پر بولا جاتا ہے جیسے نعم ہر ایک مدح کے مقام پر (غ) بائس، اور بأساء اسی مادہ سے ہیں۔

بغی

بغیا بغی کے معنی ہیں میانہ روی سے تجاوز کرنے کی خواہش کرنا (غ) اور بغی مذموم بھی ہے اور محمود بھی مگر اکثر استعمال اس کا محل ذم میں ہے۔ یہاں بغی سے مراد حسد ہے (غ)۔

ھون۔ اھان

مھین۔ اھان سے اسم فاعل ہے۔ اور ھوان دو طرح پر ہے ایک انسان کا اپنے آپ میں تذلل اختیار کرنا اس سے پستی اس کے لاحق حال نہیں ہوتی اور مدح کے مقام پر بولا جاتا ہے۔ جیسے یمشون علی الارض ھونا (الفرقان ۲۵-۶۳) یا حدیث میں ہے المؤمن ھین لین مومن انکسار اختیار کرنے والا نرم ہوتا ہے دوسرا یہ کہ دوسرا انسان اس پر متسلط ہو کر اس کی خفت کرنا چاہتا ہے (غ) اور یہ ذلت ہے گویا دوسرے کا محکوم ہونے کی حالت خود ایک ذلت یا عذاب مہین ہے۔

یہودیوں کا حسد آنحضرت سے

جس انکار کا ذکر پچھلی آیت میں ہے۔ اس کی وجہ بتائی کہ وہ صرف حسد ہے۔ کہ اللہ نے اپنے فضل کا حصہ سوائے بنی اسرائیل کے کسی اور قوم پر کیوں اتارا۔ چنانچہ اگلی آیت میں اس کی اور بھی تشریح فرمائی ہے جہاں ان کا قول نقل کیا ہے کہ ہم صرف اسی پر ایمان لائیں گے جو بنی اسرائیل پر اترے۔ غضب پر غضب اس لئے فرمایا کہ ایک غضب کے نیچے تو وہ پہلے ہی آئے ہوئے تھے اب آنحضرت صلعم کے انکار سے اور غضب کے نیچے آ گئے۔ عذاب مہین یا رسوا کرنے والا عذاب یہ ہے کہ دوسرے کے ماتحت رہیں۔

اس کا جواب کہ نبی کا بنی اسرائیل سے ہی آنا کیوں ضروری تھا

۱۱۶ ان کے اس قول کا کہ سوائے بنی اسرائیل کے کسی دوسری قوم کے آدمی پر اگر وحی نازل ہو تو اس کو ہم نہیں مانیں گے ایک جواب تو یہ دیا ہے کہ یہ وحی تمہاری وحی کی مصدق ہے۔ اور یہی اس موعود نبی کا نشان تھا۔ دوسرا یہ کہ تمہارا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ بنی اسرائیل میں سے یہ نبی ہوتا تو تم ایمان لے آتے پہلے تم اسرائیلی نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے۔ پہلے جواب میں یہ بھی بتا دیا کہ اگر بنی اسرائیل کے باہر سے یہ نبی نہ آتا تو تمہاری پیشگوئیاں غلط ٹھہرتیں کیونکہ پیشگوئیوں میں بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے آنے کا وعدہ ہے اور پھر عرب کا نام بھی موجود ہے پھر موسیٰ کی مثل نبی موسیٰ کے خلفاء میں سے تو ہو نہ سکتا تھا اس لئے اس کا دوسری قوم سے آنا ضروری ہوا۔

۱۱۷ ان کے انکار کے سارے قصہ کو پھر دوہرایا ہے اور ملزم کیا ہے کہ اور انبیاء تو ایک طرف تم خود موسیٰ کے زمانہ میں تم نے شرک کا ارتکاب کیا جب بچھڑا بنا کر اس کی عبادت کرنے لگے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا ۹۳

اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تمہارے اوپر پہاڑ بلند کیا جو ہم نے تم کو دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑو اور سُن لو

قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا

انہوں نے کہا ہم نے سُن لیا اور نافرمانی کی ۱۱۸ اور ان کے کفر کی وجہ سے انکے دلوں میں بچھڑا رچ گیا ۱۱۹ کہہ وہ بری بات ہے جسکے

يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ ۹۴

کرنے کو تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے اگر تم ایمان والے ہو کہو اگر آخرت کا گھر اللہ کے

عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

ہاں اور لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے لئے ہے تو موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو ۱۲۰

وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝ ۹۵

اور کبھی اس کی آرزو نہ کرینگے بسبب اس کے جو ان کے ہاتھوں نے پہلے بھیج رکھا ہے اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے

سمع

ع ۱۱۸ اسمعوا۔ سمع کے اصل معنی سننا ہیں مگر علاوہ شنوائی کے قرآن شریف میں کبھی اس سے مراد فہم اور کبھی طاعت لی گئی ہے (غ) یہاں سُن لینے سے مراد سمجھ لینا یا فرمانبرداری ہی ہے کیونکہ یہی سننے کی اصل غرض ہوتی ہے ‎+

منہ سے دعویٰ ایمان اور عملی نافرمانی

باوجود سخت عہد کے تم نے اس کی ایسی نافرمانی کی کہ گویا تم نے منہ سے ہی کہہ دیا کہ ہم نافرمانی کرتے ہیں۔ فی الحقیقت سمعنا یعنی ہم نے سُن لیا۔ منہ سے کہا اور عصینا یعنی ہم نے نافرمانی کی دل سے کہا۔ یا زبان قال سے کہا سمعنا اور زبان حال سے کہا عصینا آج یہی حالت مسلمانوں کی ہے منہ سے قرآن پر ایمان کا دعویٰ ہے مگر عملی حالت میں نافرمانی۔

شرب

ع ۱۱۹ اشربوا۔ شرب پانی یا دوسری سیال چیزوں کے پینے پر بولا جاتا ہے (غ) جب کسی چیز کا اندر سرایت کر جانا بتانا ہو تو اس کو پینے کی چیز سے مشابہت دیتے ہیں کیونکہ پانی فوراً روم روم میں پہنچ جاتا ہے اور بچھڑا رچ جانے سے مراد بچھڑے کی محبت کا رچ جانا ہے (غ) مراد یہ ہے کہ وہ شرک کی بیماری جو بچھڑے کی پرستش میں تم سے ظاہر ہوئی وہی تمہارے اندر چلی آتی ہے ‎+

توریت کی غلطی کی اصلاح

توریت میں یہ ذکر ہے کہ بچھڑے کو جلا کر خاکستر کو پانی میں ملا کر بنی اسرائیل کو پلا دیا تھا۔ خروج ۳۲: ۲۰ مگر یہ ایک بے معنی سی بات ہے۔ قرآن کریم نے فی قلوبھم بڑھا کر بتا دیا کہ یہ بھی یہود کو کوئی ظاہر الفاظ سے غلطی لگی ہے اور تحریف ہوگئی ہے۔ اسی لئے دوسری جگہ فرماتا ہے۔ کہ خاکستر کو دریا میں ڈال دیا۔ لنحرقنہ ثم لننسفنہ فی الیم نسفا (طٰہٰ ۲۰: ۹۷)

یہودیوں سے مباہلہ

ع ۱۲۰ موت کی آرزو کرنے سے مراد جھوٹے کی موت کی دعا کرنا ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں عیسائیوں کو مباہلہ کے لئے بلایا یہاں یہودیوں کو ایک قسم کے مباہلہ کے لئے بلایا جیسا کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے ادعوا بالموت علی ای الفریقین اکذب دعا کرو کہ جو فریق جھوٹ پر ہے اس کو موت آ جائے۔ اگر تم مقبولان

عذاب الناسخین

۹۶ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ

اور یقیناً تو ان کو سب لوگوں سے بڑھکر (یعنی) زندگی پر حریص پائیگا اور ان سے بھی جنہوں نے شرک کیا ان میں سے ہر ایک چاہتا

لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيرٌۢ بِمَا يَعْمَلُونَ ع

ہے کہ کاش اسے ہزار برس کی عمر دی جائے اور یہ بات اسے دکھ سے دور رکھنے والی نہیں کہ اسے لمبی عمر دیجائے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں [۱۲۱]

بارگاہ الٰہی ہو جیساکہ تمہارا دعوی ہے تو خدا تعالیٰ تمہاری دعا کو قبول کرے گا۔ اگلی آیت میں بتا دیا کہ اپنی بدعملیوں کی وجہ سے وہ ایسی دعا کی کبھی جرأت نہ کریں گے۔ **آرزوئے موت** بعض نے موت کی آرزو کرنے سے اپنی ہی موت کی آرزو مراد لی ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مومن موت سے خائف نہیں ہوتا۔ مگر تم موت سے خائف ہو۔ مگر یہ معنی کچھ موزوں نہیں۔ اور دوسرے معنی کی تائید خود قرآن شریف سے ہوتی ہے۔ اور حضرت ابن عباس جیسا مفسر بھی وہی معنی کرتا ہے ✦

حرص ۱۲۱ع احرص۔ حریص سے افعل ہے۔ اور حِرص کے معنی ہیں بہت زیادہ ایک چیز کو چاہنا (غ)

شرک اشرکوا۔ شِرْکۃ یہ ہے کہ ایک چیز دو یا دو سے زیادہ کے لئے پائی جائے اور دین میں شرک دو قسم ہے اول شرک عظیم یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ دوئم شرک صغیر یعنی کسی امر میں غیر اللہ کی رعایت ملحوظ رکھنا (غ)، حدیث میں ہے الشرك في هذه الامة اخفى من دبيب النمل على الصفا یعنی اس اُمت میں شرک چیونٹی کے صاف جگہ پر چلنے سے بھی زیادہ خفی ہے ✦

بصر۔ بصیرۃ بصیر۔ بَصَر آنکھ کو کہتے ہیں اور دیکھنے کی قوت کو بھی اور دل میں جو قوت مدرکہ ہے اس کو بَصِیْرَۃ بھی کہتے ہیں اور بَصَر بھی (غ)، **البصیر** اور اَلْبَصِیر اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے۔ اور اس سے مراد ہے کہ وہ تمام اشیاء کو دیکھتا ہے ظاہر کو بھی اور مخفی کو بھی بغیر کسی آلہ کے اور بَصَر اس کے حق میں وہ صفت ہے جس سے تمام اشیاء کے کمال اوصاف کا انکشاف ہوتا ہے (ت) ✦

زحزح مزحزح۔ زَحْزَحَ۔ زَحَّ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا ✦

عمارۃ عُمْر۔ عَمْر یُعَمَّر۔ عِمَارۃ آباد کرنا ہے یعنی ویرانی کا نقیض۔ اس لئے عَمْر اور عُمُر وہ مدت ہے جس میں جسم زندگی کے ساتھ آباد رہتا ہے اور قسم میں عَمْر کا لفظ آتا ہے جیسے لعمرك انهم لفي سكرتهم (الحجر ۱۵-۷۲) **تعمیر** اور تعمیر جس سے یُعَمَّر مضارع ہے عمر کا عطا کرنا ہے (غ)

ہزار سال کی زندگی یہاں یہ بیان کیا ہے کہ ان یہودیوں کو تم دنیا کی زندگی کیلئے سب لوگوں سے زیادہ حریص پاؤ گے یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی بڑھکر حریص پاؤ گے اور مشرکوں سے مراد بعض لوگوں نے محض مشرک لئے ہیں اس لئے کہ وہ بعث بعد موت کے قائل نہیں اس لئے اس دنیا کی زندگی کو ہی وہ سب کچھ سمجھتے ہیں اور بعض نے مجوس کو مراد لیا ہے جو جیساکہ ابن جریر میں ہے چھینک پر ہزار سال زندگی کی دعا دیتے تھے یعنی ہزار سال زندہ رہو۔ اور ابن عباس سے روایت ہے کہ اس سے مراد عجمی لوگ ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ومن الذين اشركوا سے نیا بیان شروع ہوتا ہو۔ اور ان مشرکوں سے مراد اہل کتاب کے مشرک یعنی عیسائی لوگ ہیں بمقابلہ یہود کے گویا فرمایا کہ یہودی تو دنیا میں مبتلا ہو کر اس دنیا کی زندگی پر حریص ہیں ہی مگر انکے مشرک بھائی یعنی عیسائی تو ایک ہزار سال کی زندگی چاہتے ہیں۔ **عیسائیت کی مخالفت اسلام۔** اس صورت میں ہزار سال کی زندگی سے مراد ایک قوم کی مخالفت اسلام کی ہزار سال کی زندگی ہوگی جیساکہ دوسری جگہ ہے ان یوماً عند ربک کالف سنۃ (۲۲:۴۷) اور یوم بھی خدا کے ہاں ہزار سال کا ہو تو مراد ہو گی کہ عیسائی اگرچہ ہزار سال بھی اسلام کی مخالفت کرلیں اور غالب رہیں تو بھی آخر ناکام ہو جائیں گے

ع ۱۲ — یہود کا عناد اور تعصب۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۹۷

کہو جو کوئی جبریل کا دشمن ہے ۱۲۲ سو بیشک اس نے اللہ کے حکم سے اس کو تیرے دل پر اتارا

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اس کی تصدیق کرتا ہوا جو اس سے پہلے ہے اور مومنوں کے لئے ہدایت اور خوشخبری (ے، ۱۲۳)

جبرئیل میکائیل، اسرافیل — جبر — ائل

۱۲۲ جبریل۔ بخاری میں عکرمہ کا قول ہے کہ جبر، میک، اسراف سب بمعنی عبد اللہ میں جبر یا میک یا سراف کے معنی عبد اور ایل بمعنی اللہ۔ مگر جبریل جبر اور ائل سے مرکب ہو سکتا ہے جبر کے معنی کسی قسم کے غلبہ سے کسی چیز کی اصلاح کرنا ہے۔ اور اس لئے جبر سلطان یعنی بادشاہ کو بھی کہتے ہیں (غ) اور ائل اَوْل سے ہے یعنی رجوع کرنے والا پس جبرئیل وہ ہے جو اصلاح کرنے والے بادشاہ کی طرف بار بار رجوع کرتا ہے۔

جبرئیل اور یہودی

کئی ایک صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے وقت میں یہودی جبریل کو اپنا دشمن سمجھتے تھے چنانچہ بخاری میں آنحضرت صلعم کے سامنے عبد اللہ بن سلام کا قول ہے ذاك عدو الیہود من الملئکۃ اور بعض روایات میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ وہ جبریل کو ملك التشدید والعذاب یعنی سختی اور عذاب کا فرشتہ سمجھتے تھے۔ حالانکہ بائبل

جبرئیل کا وحی لانا

سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ فرشتہ ہے جو وحی لاتا تھا۔ چنانچہ دانیال ۸ : ۱۶ میں جبرئیل کو حکم ہوتا ہے کہ دانیال کو اس کی رویا کے معنی سمجھا دے۔ اور لوقا ۱ : ۱۹ و ۲۶ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور قرآن کریم میں بھی یہی فرمایا ہے کہ جبرئیل اللہ تعالیٰ کی وحی آنحضرت صلعم پر لاتے تھے۔ جیسا کہ یہاں بھی صاف فرمایا۔ اور احادیث سے حضرت جبرئیل کا آنحضرت صلعم کے ساتھ رمضان میں قرآن کریم کا دور کرنا ثابت ہے۔ اور بخاری سے ہی یہ بھی ثابت ہے کہ وہی فرشتہ جو آنحضرت صلعم پر وحی لایا حضرت موسیٰ پر بھی وہی وحی لاتا تھا۔ دیکھو ورقہ کا قول کتاب کیف کان بدء الوحی میں۔ ھذا الناموس الذی نزل اللّٰہ علی موسیٰ۔ معلوم ہوتا ہے یہودیوں کا یہ عقیدہ اس لئے ہو گیا کہ جب جبرئیل کسی نبی پر وحی لاتا تو وہ اپنی قساوت قلبی کی وجہ سے انکار کرتے اور ان پر عذاب آتا اس لئے وہ عذاب کو جبرئیل کی طرف منسوب کرنے لگ گئے۔

پچھلے رکوع میں یہود اور عیسائیوں کی اسلام کے ساتھ عداوت کا اشارۃً ذکر کیا تھا اس رکوع میں ان کی عداوت کا کھول کر ذکر کیا ہے کہ یہاں تک ان کی عداوت ترقی کر گئی ہے کہ خود جبرئیل سے بھی دشمنی کرتے ہیں۔

تنزیل۔ انزال

۱۲۳ نزّل۔ تنزیل اور انزال میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ تنزیل اس موقعہ کے ساتھ خاص ہے جہاں اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آنے کی طرف یا سورتوں اور آیات کے یکے بعد دیگرے نزول کی طرف اشارہ ہو اور انزال عام ہے (غ)۔

قلب

قلب کے اصل معنی ہیں ایک چیز کا ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف پھیرنا (غ)، قلب دل کو کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ خون کو پھیرتا ہے یا اس لئے کہ خیالات کو پھیرتا ہے۔ اور قلب کے معنی کسی چیز کا اصل یا اس کا لُبّ بھی ہیں (ت) حدیث میں ہے ان لکل شیٔ قلب و قلب القرآن یٰس۔ ہر چیز کا ایک قلب ہے اور قرآن کا قلب یٰس ہے۔ یہاں

قلب پر نزول قرآن سے مراد

ابن اثیر نے قلب کے معنی لُبّ اور اصل ہی کئے ہیں۔ بس انسان کے جسمانی قلب کے مقابلہ پر ایک قلب اس کی روحانیت کا مرکز ہے اور اسی کا یہاں ذکر ہے۔ نزول وحی اسی قلب پر ہوتا ہے بعض نے نزلہ علی قلبك سے یہاں مراد لی ہے جعل قلبك متصفا باخلاق القرآن (ر) تیرے دل کو اخلاق قرآنی سے متصف کیا۔

۹۸ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ

جو کوئی اللہ اور اسکے فرشتوں اور اسکے رسولوں اور جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہے تو بیشک اللہ کافروں کا دشمن ہے ۱۲۴

۹۹ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۱۰۰ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ

اور بیشک ہم نے تیری طرف کھلی باتیں اُتاری ہیں اور سوائے نافرمانوں کے کوئی ان کا انکار نہیں کرتا ۱۲۵ اور کیا جب کبھی وہ کوئی عہد باندھتے ہیں ان میں کا ایک فریق اسے پھینک دیتا ہے

اُذُن۔ اِذن۔

اذن۔ اُذُن کان کو کہتے ہیں اور اِذن یا اذان وہ چیز ہے جو سُنی جائے اور علم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ سماع کے ذریعہ سے اسے حاصل کرتے ہیں۔ اور کسی چیز میں اِذن اس کی اجازت کا علم دینا ہے اس لئے اذن اللہ سے مراد یہاں اس کا ارادہ اور اس کا امر ہے۔ اور جہاں اِذن بمعنی علم آتا ہے۔ تو وہ ایسا علم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی ہو۔ اس لئے یہ خاص ہے اور علم عام ہے (غ) +

اذن علم میں فرق

بشرۃ۔ اُدمۃ

بَشَر۔ بشرٰی

بشرٰی۔ بَشَرَۃ چہرے کے ظاہر کو یعنی اوپر کے حصہ کو کہتے ہیں جیسے اَدَمَۃ اس کے اندر کی طرف کو کہتے ہیں۔ اور اسی لحاظ سے انسان کو بَشَر کہا جاتا ہے اور بشرٰی اور بشارۃ خوش کرنے والی خبر کو کہتے ہیں (غ)، اس لئے کہ اس سے انسان کے چہرہ کے بشرہ میں بسط پیدا ہوتا ہے +

جبرائیل کا آنحضرتؐ پر وحی لانا

جیسا کہ پچھلے نوٹ سے ظاہر ہے۔ بائبل سے یہی ثابت ہے کہ حضرت جبرئیل انبیاء پر وحی لاتے تھے۔ گو یہودیوں نے غلطی سے جبرئیل کو عذاب کا فرشتہ سمجھ رکھا تھا۔ اس لئے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لئے جب جبرائیل کا ذکر آیا تو فرمایا کہ جس طرح وہ پہلے انبیاء پر وحی لاتا تھا اسی طرح تیرے قلب پر بھی وہی وحی الٰہی کا لانے والا ہے۔ اور یہ وحی پہلی وحی کی مصدق بھی ہے اور مان لینے والوں کے لئے اس میں بشارت بھی ہے پس وہ ملک عذاب نہیں بلکہ ہدایت اور بشارت لانے والا ہے +

عَدْو عَدَاوۃ

عُدْوان

عَدُوّ

۱۲۴ عدوّ۔ عَدْو کے معنی تجاوز یعنی حد سے گزرنا اور موافقت کا نہ ہونا ہیں۔ بلحاظ دل ہو تو عَدَاوَۃ اور مُعَادَاۃ یعنی دشمنی ہے چلنے کے لحاظ سے ہو تو عَدْو ہے۔ معاملہ میں یا عدالت میں خلل کے لحاظ سے ہو تو عُدْوان اور عَدْو یعنی زیادتی ہے۔ اور عَدُوّ یعنی دشمن دو طرح پر ہوتا ہے ایک ارادہ اور قصد سے جیسے من قوم عدو لکم (نساء ۹۲) اور ایک وہ جو ارادہ اور قصد سے نہیں بلکہ دوسرے کے لئے ایسی حالت پیش کرے جس سے اس کو تکلیف پہنچے جس طرح دشمن سے پہنچتی ہے جیسے بتوں کے متعلق حضرت ابراہیم کا فانہم عدو لی الا رب العالمین (الشعراء ۷۷) یا جیسے فرمایا ان من ازواجکم و اولادکم عدوا لکم (التغابن ۱۴) (غ) اور اللہ تعالیٰ کا کافروں کا دشمن ہونا اسی لحاظ سے ہے یعنی ان کے ساتھ اس کا معاملہ ایسا ہوگا یا اس کی طرف سے ان کو نقصان پہنچے گی +

میکائیل

اللہ کی عداوت کا مفہوم

یہاں بتایا کہ جبرئیل کے ساتھ دشمنی اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ سب سے دشمنی ہے (میکائیل کا نام اس لئے لیا کہ یہود میکائیل کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ چنانچہ دانیال ۱۲: ۱ میں میکائیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے " وہ بڑا سردار جو تیری قوم کے فرزندوں کی حمایت کیلئے کھڑا ہے") اور جو شخص اللہ اور ملائکہ سے دشمنی کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ایسے شخص کے ساتھ ویسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ عداوت سے اللہ تعالیٰ پاک ہے اور اس لفظ کا استعمال محض اُنکی عداوت کی سزا کے اظہار کیلئے ہے اس معنی میں دیکھو نوٹ ۱۲

۱۲۵ فاسق یہاں ان کو اس لئے کہا کہ ان سے نبی آخر الزمان کے متعلق عہد لیا گیا تھا اس عہد کو زیادہ واضح الفاظ میں اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔ فاسق کے معنی کیلئے دیکھو نوٹ ۴۷

بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۱۰۱

بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے اور جب اللہ کی طرف سے ان کے پاس ایک رسول آیا اس کی تصدیق کرنے والا جو ان کے پاس ہے

نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

تو ان میں سے جنہیں کتاب دی گئی تھی ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں ہے[۱۲۶]

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ ۱۰۲

اور ان باتوں کی پیروی کی جو شیطان سلیمان کی نبوت پر افترا کرتے تھے [۱۲۷] حالانکہ سلیمان نے کفر نہیں کیا [۱۲۸]

نبذ

۱۲۶ نبذ۔ نبذ کسی چیز کا پھینک دینا ہے جب اس کی کچھ قدر و قیمت نہ سمجھی جائے (غ)۔ اور بھی زیادہ تصریح فرمائی کہ ان لوگوں نے خدا کی کتاب توریت کی بھی پروا نہ کی کیونکہ اس میں نبی صلعم کے متعلق عہد مذکور تھا۔

تلا علیہ

۱۲۷ تتلوا الشیاطین علیٰ تلی یا تلاوت کا لفظ کتب منزل من اللہ کے لئے خاص ہے دیکھو ۶۷ تلی علیہ کے ایک معنی تو یوں ہونگے کہ اس کو پڑھکر سُنایا جیسے یتلوا علیہم ایاتہ میں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ معنی یہاں نہیں ہو سکتے کیونکہ شیاطین ملک سلیمان کو تو کچھ پڑھکر نہ سناتے تھے اس لئے یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یتلوا علی فلان کے معنی ہیں یکذب علیہ یعنی اس پر جھوٹ بولا یا اس پر افترا کیا۔ گویا ملک سلیمان کی طرف جھوٹ باتیں منسوب کرکے ان کا کلام الٰہی ہونا ظاہر کرتے تھے ✦

ملک

ملک۔ ملک اور جتنے مادے ان حروف کو مقلوب کرکے بنتے ہیں ان سب میں قوت اور شدت کے معنی پائے جاتے ہیں (ت)

مُلک

اور مُلک اصل میں حکم کے ساتھ کسی چیز کا ضبط ہے جس میں تصرف حاصل ہو اور عام معنی اس کے بادشاہت ہیں۔ یہاں مراد نبوت ہے جیسا کہ اللّٰھم مالک الملک کی تفسیر میں مجاہد سے ملک کے معنی نبوت مروی ہیں حضرت سلیمان کا اصل ملک یہی نبوت ہی تھی

سلیمان

سلیمان ابن داؤد۔ ان کا زمانہ حضرت مسیح سے ۹۷۰ سال پیشتر ہے اور بنی اسرائیل میں شان و شوکت کے لحاظ سے اور وسعت مملکت کے لحاظ سے ان کے برابر کوئی نہیں ہوا آپ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی ✦

سلیمان پر یہودیوں کا افترا

یہ بتا کر کہ محمد صلعم کے ظہور پر یہودیوں نے کس طرح کتاب اللہ کو پس پشت پھینک دیا اب بتاتا ہے کہ بجائے کتاب اللہ کی پیروی کے یہ لوگ ان جھوٹی باتوں کے پیچھے لگ گئے ہیں جو شریر اور مفسد لوگ حضرت سلیمان پر افترا کرکے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور ان باتوں کے ذریعہ سے حق کو مٹانا چاہتے ہیں بہت سی جھوٹی باتیں یہودی سلیمان کی طرف منسوب کرتے تھے جن میں سے کچھ حصہ مسلمانوں نے بھی لیکر سحر سلیمانی اور نقش سلیمانی بنائے ہیں۔ شیاطین سے مراد وہی لوگ ہیں جو اس قسم کی باتیں حضرت سلیمان کی طرف منسوب کرتے تھے ✦

سلیمان کی طرف کفر و شرک کی نسبت بائبل میں

۱۲۸ یہ اس لئے فرمایا کہ یہودیوں کی بعض اقوام کو حضرت سلیمان سے اس قدر بغض ہو گیا تھا کہ انہوں نے سلیمان کی طرف کفر و شرک کو منسوب کر دیا یہانتک کہ یہ باتیں بائبل میں بھی داخل ہو گئیں چنانچہ ۱ سلاطین ۱۱: ۴ میں ہے "جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا۔ اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کی طرف مائل نہ تھا" پھر آگے آتا ہے کہ سلیمان کا دل خداوند سے برگشتہ ہو گیا اور خداوند اس پر غضبناک ہوا۔

بائبل میں تحریف اور قرآن کریم کا اس کی اصلاح کرنا

یہ اگر ایک طرف بائبل میں تحریف کا قطعی ثبوت ہے کہ ایک نبی کی طرف ایسی بیہودہ باتوں کو منسوب کیا ہے تو دوسری طرف قرآن کریم کے ان کتابوں پر محافظ ہونے کا ثبوت ہے کہ ان کی غلطی کو ظاہر کر دیا۔ آج عیسائی محققین بھی اسی بات کے معترف ہیں کہ بائبل کا یہ بیان غلط ہے۔

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ

مگر شیطانوں نے کفر کیا لوگوں کو سحر سکھاتے ہیں ۱۲۹ اور وہ بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نہیں اتارا گیا ۱۳۰

چنانچہ انسکلو پیڈیا ببلیکا میں ہے "غالباً یہ توضیح ہے کہ سلیمان کی بہت سی بیبیاں تھیں جن میں سے کچھ اسرائیلی قوم کی اور کچھ غیر اسرائیلی تھیں. مگر اس نے ان سب کے لئے قربانگاہ نہیں بنائے تھے۔ نہ ہی اس نے ان بیبیوں کے دیوتاؤں کی پرستش کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ملانے کا کبھی ارتکاب کیا" قرآن کریم کی صداقت کی کیسی عظمت نظر آتی ہے کہ جو بات تیرہ سو سال پیشتر بغیر بائبل کو پڑھنے کے ایک اُمی کے منہ سے نکلی۔ آج تحقیق کے بعد وہی درست ثابت ہوتی ہے۔ اور بائبل کا اپنا بیان غلط ثابت ہوتا ہے پس قرآن بائبل سے نقل نہیں کرتا۔ بلکہ بائبل کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے +

سحر

۱۲۹ السحر۔ اَلسِّحْرُ الْخِدَاعُ وَتَخْيِيْلَاتٌ لَاحَقِيْقَةَ لَهَا (غ) سحر ان دھوکے کی باتوں اور تخیلات کو کہتے ہیں۔ جن کی حقیقت کچھ نہ ہو۔ اور جوہری کا قول ہے کل ما لطف ودق ماخذہ فہو سحر (ت) وہ امر جس کی اصل دقیق اور لطیف ہو وہ سحر ہے۔ اور حدیث میں ہے ان من البیان لسحرا یعنی بعض بیان سحر کا حکم رکھتا ہے مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پس شیطانوں کے لوگوں کو سحر سکھانے سے دھوکے کی باتیں اور تخیلات سکھانا مراد ہے جن کی اصلیت کچھ نہ تھی جیسا کہ اب بھی بہتیرے شیطان ایسی باتیں لوگوں کو بتاتے رہتے ہیں سحر کے معنی جو قلب ماہیت عام لوگوں نے بنا رکھے ہیں۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں +

یہاں بتایا کہ شیاطین یعنی شریر لوگ ایک تو حضرت سلیمان پر کچھ افترا کر کے لوگوں کو سناتے ہیں اور یہودی اس کی پیروی کرتے ہیں اور دوسرے یہ لوگ اس سحر کی پیروی کرتے ہیں جس کی تعلیم دینے والے بھی شریر لوگ ہیں۔ پس سحر کو وہ کس کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کا ذکر آگے آتا ہے +

بابل

۱۳۰ بابل۔ ایک نہایت قدیم اور بہت بڑا شہر تھا جو مدت تک عراق عرب کا دار الخلافہ رہا۔ دریائے فرات پر واقع تھا جس کے دونوں طرف اب اس کے کھنڈرات باقی ہیں۔ مسیح سے ۲۲۰۰ سال پیشتر بھی یہ دار الخلافہ تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس کے گرداگرد کی فصیل ۵۶ میل تھی۔ بخت النصر کے زمانہ میں بھی یہ عروج پر تھا بعد میں تباہ ہو گیا +

ہاروت ماروت کا قصہ یہودیوں نے ایرانیوں سے لیا

ما انزل میں ما نافیہ ہے ابن جریر نے اس معنی کی روایت کی ہے۔ کیونکہ فرشتوں کو کبھی رسول بنا کر دنیا میں نہیں بھیجا جاتا چہ جائیکہ ان پر سحر نازل ہو۔ یہودیوں کے تعلقات ایرانیوں سے بھی تھے جن کو وہ اب اسلام کے خلاف اکسا بھی رہے تھے۔ اور ایرانیوں سے ہی انہوں نے ہاروت ماروت کا قصہ لیا تھا جن میں یہ مشہور تھا جیسا کہ سیل نے لکھا ہے کہ بابل میں ہاروت ماروت نام دو فرشتوں پر کچھ نازل ہوا تھا۔ اور کہ وہ لوگوں کو کچھ سحر کی باتیں سکھاتے تھے پس اللہ تعالیٰ نے یہاں دو قسم کی باتوں کی نفی کی ہے ایک ان کی جو سلیمان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں دوسرے ہاروت ماروت کے قصہ کی۔ اور ان پر سحر نازل ہونے کی اور جس طرح پہلے سلیمان کی طرف منسوب شدہ باتوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ سلیمان نے کفر نہیں کیا یہاں سحر کا ذکر کر کے فرمایا کہ یہ یہودی یہ کہہ کر اس کا اتباع کرتے ہیں کہ یہ دو فرشتوں ہاروت ماروت پر اترا تھا۔ اس کی نفی کی ہے کہ دو فرشتوں ہاروت ماروت پر سحر اتارا گیا ہو +

ہاروت ماروت کے قصے محققین اہل اسلام کے نزدیک بیہودہ خیال

ہاروت ماروت کے جس قدر بے سر و پا قصے بعض مفسرین نے لکھ دیئے ہیں ان کی اصل یا مجوسیوں میں کچھ ملتی ہے یا یہودیوں میں۔ قرآن و حدیث ان خرافات سے پاک ہیں۔ امام رازی نے ان قصوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ یہ تو

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا

اور نہ وہ دونوں کسی کو سکھاتے تھے یہاں تک کہ کہتے ہم صرف فتنہ ہیں پس کافر نہ ہو[۱۳۱] سو وہ ان دونوں (ذریعوں)

مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ

سے وہ باتیں سیکھتے ہیں[۱۳۲] جن سے مرد اور اس کی بی بی کے درمیان تفریق کرتے ہیں[۱۳۳] اور اس سے وہ کسی کو ضرر پہنچانے والے

مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ

نہیں ہونگے سوائے اس کے جو اللہ کے حکم سے ہو[۱۳۴] اور وہ باتیں سیکھتے ہیں جو انہیں ضرر دیتی ہیں اور انہیں نفع نہ دیں گی۔

فاسد مردود ہے۔ شہاب عراقی نے کہا ہے کہ جو شخص ان باتوں کو مانتا ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتے ہیں جن کو زہرہ کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔ وہ اللہ کا کافر ہے۔ کیونکہ ملائکہ معصوم ہیں وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرسکتے۔ روح المعانی میں ہے کہ ان قصوں میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی ثابت نہیں۔ اے کاش اسلام کی کتابوں میں ان خرافات میں سے کچھ نہ ہوتا جن کو کوئی عاقل قبول نہیں کرسکتا۔ غرض یہ قصے اہل علم کے نزدیک مردود ہیں۔

تعلیم سحر

[۱۳۱] ہاروت ماروت کا قصہ بنانے والوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ فرشتے جو اوندھے منہ بابل کے کنوئیں میں لٹکے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں مگر پہلے یہ کہہ لیتے ہیں کہ ہم ایک آزمائش ہیں پس ہم سے جادو نہ سیکھو اس سارے بے سروپا قصہ کا انکار کیا ہے اور فرمایا کہ وہ کچھ سکھاتے ہی نہیں جو یہ کہنے کی نوبت آئے۔ کہ ہم فتنہ ہیں تم ہم سے جادو سیکھ کر کافر نہ بنو۔ قرآن شریف نے سحر کا سیکھنا سکھانا شیاطین کا کام بیان فرمایا ہے مسلمانوں کو ان خرافات سے بچنا چاہئے۔

[۱۳۲] منہما میں ضمیر ان دو ذریعوں کی طرف جاتی ہے جن کا ذکر اوپر ہے یعنی ایک وہ کفر کی باتیں جو سلیمان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں حالانکہ سلیمان کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ اور دوسرے وہ سحر جس کا بابل میں ہاروت و ماروت پر نازل ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

فری میسنری

[۱۳۳] اس ایک فقرہ میں اس کل منصوبہ کی ماہیت کو بیان کردیا ہے جو آنحضرت صلعم کے خلاف کیا جاتا تھا۔ دنیا میں صرف ایک ہی سوسائٹی رنگ مذہب ایسی ہے جس نے مرد اور عورت میں تفرقہ کیا ہے یعنی مردوں کو اس کا ممبر بنایا جاتا ہے مگر عورتوں کو نہیں۔ اور یہ فری میسنوں کا طریق ہے پس یہاں بتادیا کہ فری میسن یعنی خفیہ سوسائٹیوں کے ذریعہ سے اسلام کو تباہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کی طرف اگلے الفاظ میں اشارہ ہے اور یہودی فری میسنوں سے ملکر خفیہ منصوبے آنحضرت صلعم کے خلاف کررہے ہیں۔

اسلام کے خلاف خفیہ منصوبے

[۱۳۴] یہاں یہ بتایا کہ ان کی غرض اسلام کو اور آنحضرت صلعم کو نقصان پہنچانا ہے مگر وہ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے کہ اہل کتاب خفیہ منصوبے مومنوں کو نقصان پہنچانے کے لئے کرتے ہیں انما النجوٰی من الشیطان لیحزن الذین اٰمنوا ولیس بضارھم شیئًا الا باذن اللہ (المجادلۃ ۵۸-۱۰) خفیہ مشورے شیطانی کام ہیں جن کی غرض یہ ہے کہ وہ یعنی شیطان مومنوں کو غم میں ڈالے اور وہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا ہاں اللہ کے اذن سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ پہنچے گا۔ سو دونوں جگہ لفظ قریباً

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۭ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ

اور یقیناً وہ جانتے ہیں کہ جس نے اس کو مول لیا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ۱۳۵ اور وہ چیز یقیناً بری ہے جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچا

۱۰۳ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

کاش وہ جانتے۔ اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے تو یقیناً اللہ کی طرف سے بدلہ بہتر تھا۔ کاش وہ جانتے ۱۳۶

ایک ہو رہی ہیں۔ پس درحقیقت ان الفاظ میں بھی انہی خفیہ منصوبوں کی طرف اشارہ ہے جو فریمیسنوں کے ساتھ مل کر یہود آنحضرت صلعم کو ہلاک کرنے کے لئے کر رہے تھے۔ فریمیسن ایک سوسائٹی ہے جو بہت قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے حضرت سلیمان کے زمانہ کی طرف اس کو منسوب کیا جاتا ہے یہ لوگ اپنے حالات کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرتے نہ یہ بتلاتے ہیں کہ ان کی تعلیم کیا ہے۔ اس زمانہ میں اس سوسائٹی کی باگ ان قوموں کے ہاتھ میں ہے جن کو دنیا میں سیاسی غلبہ حاصل ہے اور اس کی آخری منزل عیسائیت ہے بعض بھولے بھالے مسلمان بھی اس جال میں پھنس کر اپنے دین و ایمان کو تباہ کر لیتے ہیں

(فریمیسنری کی حقیقت)

یہاں چار باتیں بتا دی ہیں۔ اول یہ کہ کچھ خفیہ منصوبے ہیں جو شیطان صفت لوگ کر رہے ہیں دوسرا یہ کہ وہ ان باتوں کا جواز اس طرح کرتے ہیں کہ انبیاء (سلیمان) اور ملائکہ (ہاروت ماروت) کی طرف ان کو منسوب کرتے ہیں تیسرا یہ کہ یہ منصوبے ان لوگوں کے ہیں جو مرد اور عورت میں تفرقہ کرتے ہیں یعنی فریمیسن چہارم یہ کہ ان کی غرض اسلام کو تباہ کرنا ہے مگر وہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے +

(مومن کو تکلیف پہنچنے کی وجہ)

الا باذن اللہ۔ اِلَّا یہاں استثنائے منقطع کے طور پر ہے یعنی اس سے ایک نیا کلام شروع ہوتا ہے یعنی وہ تو تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے۔ ہاں اللہ کے اذن سے کچھ تکلیف مومنوں کو پہنچ بھی جائے گی۔ اور یہاں اس قسم کے استثناء کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ مومنوں کو بھی کچھ نہ کچھ تکلیفیں کچھ خوف کچھ بھوک کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی ضرور ہے کہ پہنچیں کیونکہ بغیر تکالیف کے مومن کمال کو حاصل نہیں کر سکتے (۱۵۵) پس مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ جو تکلیف یہ دشمن پہنچانا چاہتے ہیں۔ اور وہ منصوبۂ ہلاکت ہے وہ تو یہ نہیں پہنچا سکیں گے۔ ہاں مومنوں کو ان کے کمال تک پہنچانے کے لئے جو علم الٰہی میں بعض تکالیف کا پہنچنا ضروری ہے وہ پہنچیں گی +

(خَلق۔خُلق)

۱۳۵ اخلاق خَلق پیدا کرنا ہی یعنی ظاہری بناوٹ اور خُلق خصائل سے تعلق رکھتا ہے گویا وہ اندرونی بناوٹ ہے اور خلاق وہ فضیلت ہے جو انسان اپنے خُلق سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اس کے معنی حظ یا حصہ ہو گئے ہیں (غ) +

(خلاق)

(منصوبہ کرنے والوں کا انجام)

یہاں بتا دیا کہ نہ صرف وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے بلکہ یہ باتیں خود ان کے نقصان کا موجب ہوں گی وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے بلکہ نقصان ہی اٹھائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی واقع ہوا کہ یہ اسلام کے خلاف منصوبے آخر ان کی تباہی اور جلاوطنی کا موجب ہوئے +

(مثوبة۔ثواب)

۱۳۶ مثوبة۔ اور ثواب۔ دونوں ثَوب سے ہیں جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اس اصل حالت کی طرف رجوع کرنا جس پر وہ تھی اور مثوبة یا ثواب کسی عمل کی جزا کو اس خیال سے کہا جاتا ہے کہ گویا وہی عمل ہی واپس آگیا (غ) +

اس آیت میں قرآن شریف پر ایمان کو پیش کیا اور اس طرح سے آخر رکوع کا تعلق اگلے رکوع سے کیا جس میں قرآن شریف کی عظمت کا ذکر ہے اور یہ ذکر ہے کہ پہلی شرائع اس سے منسوخ ہوئیں اس لئے اس پر ایمان لانا ضروری ہے +

ع ۱۳ ۹ ۱۴ — نسخ شرائع سابقہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ ۱۰۴

اے لوگو جو ایمان لائے ہو "راعنا" نہ کہو اور "انظرنا" کہو اور سنو اور کافروں کے لئے دردناک

اَلِيْمٌ ۝ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ ۱۰۵

دکھ ہے ۱۳۷ اہل کتاب میں سے جو کافر ہیں پسند نہیں کرتے اور نہ ہی مشرک کہ تمہارے رب کی طرف سے

عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ

تم پر کوئی بھلائی اُتاری جائے اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے ۱۳۷

رعی ۔ راع — ۱۳۷ راعنا ۔ راعَ ۔ رعْی سے مشتق ہے جس کے معنی حفاظت کرنا ہیں چنانچہ حدیث میں ہے کلکم راعٍ پس راعنا کے معنی ہیں ہماری بات سنئے۔

نظر — انظرنا نَظَرَ آنکھ کے پھیرنے کا نام ہے کسی چیز کے دیکھنے کیلئے کبھی اس سے غور و تحقیق مراد ہوتی ہے اور نظر کے معنی انتظار کرنا بھی آتے ہیں (غ) یہاں انظرنا کے معنی ہیں ہمارا انتظار کیجئے یا ہمیں مہلت دیجئے تا کہ ہم آپ کی بات سمجھ لیں +

یہودیوں کی شرارتیں — راعنا کہنے کی ممانعت کی وجہ دوسری جگہ یوں دی ہے کہ یہودی کہتے ہیں راعنا لیا بالسنتہم (النسآء ۴-۴۶) راعنا کا لفظ اپنی زبانیں مروڑ کر بولتے ہیں یعنی راعنا کی بجائے رعن کہہ دیتے ہیں اور یہ لفظ رعونت سے ہے جس کے معنی جہالت حماقت ہیں۔ یہودیوں کی شرارتوں میں یہ ادنیٰ قسم کی ایک شرارت تھی کہ بات بات میں استہزا کرتے تھے اور پھر فخر کرتے تھے کہ دیکھو ہم انہیں کیسا بناتے ہیں مسلمانوں کو اس لفظ سے اس لئے روکا کہ گو ان کا منشاء بُرا نہ ہو مگر یہودی اس قسم کی باتوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ اور یوں بتایا کہ ان باتوں سے بھی اجتناب ضروری ہے جن کا گو منشاء بُرا نہ ہو مگر نتیجہ بُرا ہو +

یہودیوں کی مخالفت نیک نیتی سے نہ تھی — مضمون کا تعلق پہلے مضمون سے ظاہر ہے وہاں بھی یہودیوں کی کچھ شرارتوں کا ذکر تھا مگر وہ ایسی شرارتیں تھیں جو خفیہ طور پر منصوبوں کے رنگ میں اسلام کو تباہ کرنے کے لئے وہ کرتے تھے۔ یہاں ان کی اس قسم کی شرارتوں کا ذکر ہے جو معمولی بول چال میں وہ استہزا کے رنگ میں کرتے تھے ان کا اس طرح استہزا کرنا صاف بتاتا ہے کہ ان کے اندر نیک نیتی کوئی نہ تھی مخالفت بعض وقت انسان نیک نیتی سے بھی کر لیتا ہے مگر یہودیوں کی مخالفت بربنائے شرارت تھی اور یہی ان کے منصوبوں اور استہزا کا ذکر کرنے سے مقصود ہے +

ودّ — ۱۳۷ یود وُدّ کسی چیز کی محبت رکھنا اور اس کے ہونے کی خواہش کرنا ہے اور دونوں معنوں میں سے ہر ایک پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ)

اھل — اھل الکتاب ۔ اھل کسی شخص کے وہ ہیں جن میں اور اس میں ایک اتحاد یا جمعیت کا رنگ ہو بوجہ نسب کے یا دین کے یا اور

اھل الکتاب — کسی چیز کے جو ان دونوں کے قائم مقام ہو جیسے صنعت یا گھر یا شہر (غ) پس اھل الکتاب سے مراد وہ لوگ ہوئے جو ایک کتاب پر مجتمع ہیں اس لئے چونکہ کتاب کا لفظ بعض وقت صرف حضرت موسٰی کی وحی پر بولا گیا ہے اور بعض وقت حضرت عیسٰی کی وحی پر اور بعض وقت کل انبیاء کی وحی پر تو اہل کتاب سے مراد کبھی صرف یہود کبھی صرف نصاریٰ کبھی یہود و نصاریٰ دونوں ہوتے ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر جس طرح کتاب میں بعض وقت عمومیت ہوتی ہے اسی طرح اہل کتاب میں بھی عمومیت مراد ہو سکتی ہے +

خیر — خیر خَیرٌ اصل میں وہ چیز ہے جس میں سب لوگ رغبت کریں (غ) یہاں مراد وحی الٰہی ہے (ر) +

رحمۃ — رحمتہٖ رَحْمَۃٌ رِقّت ہے جس کا اقتضاء مرحوم پر احسان ہو ۔ اور کبھی اس کا استعمال صرف رقت پر ہوتا ہے ۔ اور کبھی صرف احسان پر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت صرف انعام و افضال کا نام ہے (غ) +

فضل فضول — الفضل ۔ فَضْل ۔ اقتصاد یعنی درمیانہ حالت سے زیادہ کا نام ہے مگر جہاں محل ذم ہو وہاں فُضول کہا جاتا ہے اور فضل

۱۰۶ مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَۃٍ اَوۡ نُنۡسِہَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡہَاۤ اَوۡ مِثۡلِہَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝

جو کوئی بات ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آتے ہیں ۱۳۸؎ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے

کا اکثر استعمال محل مدح میں ہے اور ہر ایک عطیہ جسکا دینا دینے والے پر لازم نہیں بفضل کہلاتا ہے (غ) اور یہاں مراد ایسا ہی فضل ہے گو بعض وقت ان چیزوں پر اس کا استعمال ہو جاتا ہے جو بذریعہ اکتساب حاصل ہوتی ہیں جیسے مال وجاہ و قوت (غ)

یہاں الفاظ خیر اور رحمت اور فضل سب میں اس وحی کی طرف ہی اشارہ ہے جو نبی کریم صلعم پر نازل کی گئی ✦

نسخ — ۱۳۸؎ ننسخ ۔ نسخ کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز سے ازالہ کرنا ۔ اس لئے یہ لفظ لکھنے یا اثبات کے معنی میں بھی آتا ہے اور صرف ازالہ کے معنی میں بھی اور ایک چیز کا ازالہ کرکے دوسرے کا اثبات کرنے کے معنی میں بھی ۔ یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں یعنی ایک حکم کا دوسرے حکم سے ازالہ کرنا جو اس کے پیچھے آتا ہے (غ) اور نسخ کتاب صرف کتاب لکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے قرآن شریف میں اس معنی میں

استنساخ نسخۃ — استنساخ بجائے نسخ آیا ہے جیسے انا کنا نستنسخ ما کنتم تعملون (الجاثیۃ ۴۵-۲۹) اور نسخۃ بمعنی تحریر ہے وفی نسختہا ھدی (الاعراف ۷-۱۵۴) ✦

اٰیۃ — اٰیۃ ۔ کے مشہور معنی العلامۃ الظاہرۃ یعنی ظاہر نشان ہیں ۔ مگر تاج العروس میں ہے الاٰیۃ الرسالۃ وتستعمل بمعنی الدلیل والمعجزۃ یعنی اٰیۃ کے معنی رسالت یا پیغام الٰہی ہیں اور دلیل اور معجزہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے حضرت آدم کے ذکر کے بعد آتا ہے فاما یاتینکم منی ھدی (۳۸) میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آتی رہے گی پس جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ حزن ہوگا ۔ اور اس کے مقابل پر ہے والذین کفروا وکذبوا بایاتنا اور جو لوگ ہماری آیات کا انکار کریں اور انہیں جھٹلائیں ۔ یہاں صاف طور پر آیات کے معنی الٰہی پیغام ہیں ایسا ہی ۳؎ ۔ ۴ میں ہے وما تاتیہم من اٰیۃ من اٰیات ربہم الا کانوا عنہا معرضین ۔ کوئی آیت ان کے رب کی آیات میں سے ان کے پاس نہیں آتی مگر اس سے اعراض کرتے ہیں ۔ جہاں اٰیات کے معنی روح المعانی میں ہیں الکتب المنزلۃ یعنی وہ کتابیں جو خدا کی طرف سے نازل ہوئیں یہی وسیع معنی یہاں مراد ہیں ✦

یہود کا اعتراض کہ شریعت موسوی کیوں منسوخ ہوئی ۔ — یہاں نسخ آیات یا ان کے فراموش کرا دینے سے کیا مراد ہے ۔ سیاق مضمون یوں ہے کہ یہودی قرآن پر ایمان اس لئے نہیں لاتے کہ یہ بنی اسرائیل پر نازل نہیں ہوا ۔ اگر موعود نبی بنی اسرائیل میں سے ہوتا ۔ تو شریعت موسوی کلیۃً منسوخ نہ ہوتی اسی بات کا جواب قرآن کریم نے یہاں دیا ہے ۔ چنانچہ پہلی آیت میں اصل مضمون کی طرف پھر توجہ دلائی ہے کہ یہ اہل کتاب تم پر یعنی مسلمانوں یا بنی اسمٰعیل پر وحی الٰہی کا آنا پسند نہیں کرتے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ہم نے شریعت موسوی کو منسوخ کر دیا یا فراموش کرا دیا تو اس سے بہتر یا اس کی مثل شریعت ہم نے تم کو دی ہے ۔ بہتر یا مثل اس لئے کہا کہ بعض احکام

یہ شریعت کس معنی میں موسوی شریعت کا مثل ہے — تو وہی رہتے ہیں لیکن اس کی تعلیم کا اکثر حصہ شریعت موسوی سے بہتر ہے وہ ایک قوم کے لئے تھی یہ کل قوموں کیلئے ہے وہ ایک زمانہ کے لئے تھی یہ کل زمانوں کے لئے ہے ۔ ایسا ہی بہت سی باریک باتیں ابتدائی زمانہ کے لحاظ سے پہلے ظاہر نہ کی گئی تھیں اب جب عقل انسانی میں پختگی بڑھ گئی تو زیادہ باریک باتیں نازل کی گئیں بخیر منہا او مثلہا کی ایک توجیہ یوں بھی ہو سکتی ہے کہ حقیقت کے لحاظ سے تو یہ شریعت موسوی شریعت سے افضل ہے مگر پیشگوئی میں بلحاظ ایک نئی شریعت ہونے کے اسے مثل بھی کہا گیا ہے جیسا کہ استثناء ۱۸ : ۱۸ والی پیشگوئی ہے ✦

وجوہات کہ یہاں نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے نہ نسخ آیات قرآن کا — سیاق وسباق کے لحاظ سے ان معنوں کی صحت پر کچھ شک نہیں ہو سکتا ۔ مگر مفسرین نے اس آیت سے قرآن کریم کی بعض آیات کا بعض سے منسوخ ہونا مراد لے لیا ہے ۔ جو بالکل بے تعلق مضمون ہے ۔ یہاں نہ پہلے نہ پیچھے کوئی ایسی

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۱۰۷

کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ کی ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے

آیت ہے جو دوسری سے منسوخ ہوئی ہو یا دوسری کی ناسخ ہو۔ بلکہ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ اس وقت تک کسی ایسی آیت کے نازل ہونے کا ثبوت نہیں ملتا جس نے کسی پہلی نازل شدہ آیت کو منسوخ کر دیا ہو پس جب یہ جھگڑا ہی اب تک پیش نہیں آیا جب کسی کا اعتراض کرنا ہی ممکن نہ تھا تو یہاں نسخ آیات قرآنی کے مضمون کو بیان کرنا بالکل بےمعنی بات ہے۔ یہ دوسری قطعی دلیل اس بات پر ہے کہ یہاں نسخ آیات قرآنی کا ذکر نہیں بلکہ نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے +

قرآن کریم کا معجزہ کہ آنحضرت کبھی اسے بھولے نہیں

تیسری قطعی دلیل یہ ہے کہ یہاں نسخ کے ساتھ فراموش کرا دینے کا ذکر ہے لیکن قرآن کریم کے متعلق قطعی طور پر فرمایا سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى (الاعلیٰ ۶) ہم جو کچھ تجھ کو پڑھائیں گے تو اسے نہیں بھولے گا۔ اور اس کے آگے جو یہ فرمایا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ مگر جو اللہ چاہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ کچھ حصہ بھول بھی جاؤ گے۔ کیونکہ اس طرح عبارت بالکل بےمعنی ہو جاتی ہے ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہیں بھولے گا مگر بھول جائے گا۔ یوں کوئی معمولی آدمی بھی گفتگو نہیں کر سکتا چہ جائیکہ قرآن جیسی پر حکمت کتاب کی طرف یہ بات منسوب ہو۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کے معنی صاف ہیں کہ اور بعض باتیں تو تم بھول بھی جاتے ہو مگر ہمارے پڑھانے کا یہ اثر ہے کہ جو ہم پڑھائیں گے اسے ہرگز نہ بھولو گے۔ اور امر واقع بھی یوں ہی ہے نبی کریم صلعم پر بیس بیس رکوع کی سورت ایک وقت نازل ہوئی ہے اور آپ کو کبھی اس کا ایک لفظ نہیں بھولا۔ پھر بفرض محال اگر آنحضرت بھول جائیں تو ساتھ ساتھ جو لوگ حفظ کرتے چلے جاتے تھے اور جن کی تعداد گو پہلے تھوڑی تھی مگر اب مدینہ آکر سینکڑوں تک پہنچ چکی تھی وہ سب کے سب کس طرح بھول جاتے اور ایک بھولتا تو دوسرا فوراً اسے درست کر دیتا جس طرح آج بھی جب ایک حافظ قرآن ایک لفظ کو غلط پڑھتا ہے تو دوسرا اس کے پیچھے درست کرنے کو کھڑا ہوتا ہے پھر سب سے بڑھکر یہ کہ نہ صرف ہر ایک آیت حفظ ہی کی جاتی تھی بلکہ لکھی بھی جاتی تھی۔ اس تحریر کو کون محو کر دیتا تھا نہ اس کے محو کرنے کا یہاں کوئی ذکر ہے یہاں صرف فراموش کرانے کا ذکر ہے۔ ہاں فراموش پہلی شرائع کی بعض باتیں ہو گئیں جو مرور زمانہ سے بالکل دنیا سے نابود ہو گئیں۔ پس اس لحاظ سے بھی نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے۔ نہ نسخ آیات قرآنی کا +

نسخ کی کوئی روایت آنحضرت تک نہیں پہنچتی

رہا یہ سوال کہ قرآن کریم کی کوئی آیت جو اس وقت بین الدفتین موجود ہے آیا وہ منسوخ ہے؟ کچھ روایات ضرور ایسی ہیں مگر عجیب بات ہے کہ ان میں سے کوئی روایت نبی کریم صلعم تک نہیں پہنچتی یعنی کسی روایت میں یہ نہیں کہ نبی کریم صلعم نے کسی آیت کو منسوخ فرمایا حالانکہ اگر نسخ آیات قرآنی کا مسئلہ درست ہوتا تو کوئی نہ کوئی روایت نبی کریم صلعم تک بھی پہنچ جاتی۔ پس جب خود نبی کریم صلعم کسی آیت کو منسوخ قرار نہیں دیتے اور ہر آیت کا قابل عمل ہونا خود رسول اللہ صلعم کے منہ سے ثابت ہے۔ تو محض کسی صحابی کے قول سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی صحابی کا قول تو ویسے بھی حجت نہیں چہ جائیکہ آیات قرآنی کے بارہ میں جو قرآن شریف میں موجود ہیں کسی آیت کو محض ایک صحابی کے قول کی وجہ سے منسوخ مانا جائے

صحابی کا قول نسخ پر حجت نہیں

روایات نسخ میں ایک دوسرے کی تردید

دوسری بات روایات نسخ کے متعلق یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں اکثر ان روایات کی یہ حالت ہے کہ جہاں ایک صحابی کی رائے ایک آیت کے منسوخ ہونے کے متعلق ہے وہیں دوسرے صحابی کی رائے اس کے غیر منسوخ ہونے کے متعلق ہے پس معلوم ہوا کہ خود روایات ایک دوسری کی تردید کرتی ہیں پس نسخ کا مسئلہ اور بھی کمزور ہو جاتا ہے +

روایات نسخ ضعیف ہیں

تیسری بات یہ ہے کہ ایسی کل روایات ضعیف ہیں چنانچہ طبرسی کا قول ہے الروایات فی النسخ کلہا ضعیفۃ +

تعداد آیات منسوخ میں بھاری اختلاف

چوتھی بات یہ ہے کہ بعض نے صرف پانچ آیات کو منسوخ کہا اور بعض نے کئی سو آیات کو منسوخ کہہ دیا ہے اس قدر

۱۰۸ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا

اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں اور نہ کوئی مددگار ہے ۱۳۹ بلکہ تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کرو جس طرح پہلے

سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝

موسیٰ سے سوال کیا گیا تھا اور جو کوئی ایمان کے بدلے کفر لیتا ہے وہ ضرور سیدھی راہ سے گمراہ ہو گیا ۱۴۰

۱۰۹ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ

اہل کتاب میں سے بہت سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں لوٹا کر کافر بنا دیں اپنے حسد کی وجہ سے

مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

اس کے بعد کہ ان کے لئے حق کھل گیا سو عفو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم دے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۱۴۱

اختلاف قبول کر کے نسخ کہنا قرآن کے خلاف ہے۔

اختلاف بتاتا ہے کہ یہ محض ایک رائے کی بات ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب ایک شخص ایک آیت کو دوسری کے ساتھ تطبیق نہیں دے سکا تو اس نے اسے منسوخ کہہ دیا۔ اور یہ بھی نہیں سوچا کہ آیا فی الواقع جسے منسوخ کہہ دیا ہے وہ پہلے کی نازل شدہ ہے بھی یا نہیں۔ تو تطبیق دینے کی بجائے منسوخ کہنا گویا قرآن کریم میں اختلاف قبول کرنا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اختلاف نہ ہونے کو بطور دلیل پیش کیا ہے ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (النساء ۴-۸۲) پس اگر قرآن کریم میں اختلاف قبول کیا جائے تو وہ من عند اللہ نہیں اور اگر اختلاف نہیں تو نسخ کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنے اپنے موقعہ پر دکھایا جائے گا کہ جہاں تطبیق نہ دے سکنے کی وجہ سے نسخ مانا گیا ہو وہاں تطبیق دی جا سکتی ہے پس نسخ آیات قرآنی کا مسئلہ بالکل باطل ہے۔ اور یہاں سابقہ شرائع کے نسخ کا ذکر ہے ۔

ع۱۳۹ یہاں ملک کے لفظ میں نبوت دینے کی طرف اشارہ ہے دیکھو ع۱۲ دوسری جگہ فرمایا فقد اٰتینا اٰل ابراھیم الکتاب والحکمۃ واٰتینٰھم ملکا عظیما (النساء ۴-۵۴) یعنی اب بھی ہم نے آل ابراہیم (محمد رسول اللہ صلعم) کو ہی کتاب اور حکمت دی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کو بڑا ملک دیا ہے۔ تو میں ہر مخاطب مراد ہے جیسا کہ ضمیر جمع نے بتایا اگرچہ حرف کر دیا

یہودیوں کے گستاخانہ سوالات

ع۱۴۰ یہاں یہودی مخاطب ہیں۔ رسولکم سے مراد وہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا۔ ایسے گستاخانہ سوال یہودی ہی کرتے تھے جیسا کہ قرآن شریف میں دوسری جگہ صاف فرمایا یسئلک اھل الکتاب ان تنزل علیھم کتابا من السماء فقد سالوا موسٰی اکبر من ذٰلک (النساء ۴-۱۵۳) اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے کتاب اتارے سو موسیٰ سے انہوں نے اس سے بھی بڑھ کر سوال کیا۔ ایمان کے بدلے کفر لینے سے مراد یہی ہے کہ ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کرے جیسا کہ یہودیوں نے کیا ۔

حسد

ع۱۴۱ حسد۔ حسد یہ ہے کہ ایک شخص سے ایک نعمت کے زوال کی خواہش کی جائے جس نعمت کا وہ مستحق ہو اور بسا اوقات اس میں اس کے دور کرنے کی بھی کوشش ہوتی ہے (غ) اور جو دوسرے جیسی نعمت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ

غبط

غبط ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ المؤمن یغبط والمنافق یحسد یعنی مومن غبط کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے نہایہ میں ہے کہ حسد یہ ہے کہ دوسرے کی نعمت کا زوال چاہتا ہو اس کے خود حاصل کرنے کی خواہش نہ ہو۔ اور غبط

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ ۱۱۰
اور نماز کو قایم کرو اور زکوٰۃ دو اور جو کوئی بھلائی اپنے لئے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ ۱۱۱
بیشک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھتا ہے ۱۴۲ اور کہتے ہیں کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا سوائے ان کے جو یہودی ہوں یا

نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝
عیسائی یہ ان کی آرزوئیں ہیں کہو اپنی روشن دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو ۱۴۳

یہ ہے کہ صرف یہ خواہش کرے کہ اسے بھی دوسرے جیسی نعمت مل جائے اور دوسرے سے زوال کی خواہش نہ کرے اور حدیث میں جو آتا ہے لاحسد الا فی اثنتین تو اس کے معنی کئے ہیں کہ کوئی حسد نہیں جو نقصان نہ پہنچائے مگر دو باتوں میں۔ مگر یہاں حسد کا استعمال غبط کے معنی میں ہے ✦

صفح اصفح۔ صفح کے معنی ہیں ترک ملامت کرنا اور یہ عفو سے بڑھکر ہے (غ) ✦

یہود کا بت پرستی کو توحید سے اچھا قرار دینا یہاں بتایا کہ یہود بھی گمراہ ہوتے ہوتے اس حد تک پہنچے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان حالت کفر کی طرف لوٹ جائیں یہ محض حسد ہے ورنہ کم ازکم توحید کے مذہب کو بت پرستی سے تو اچھا سمجھتے۔ دوسری جگہ اہل کتاب کا قول کفار کے متعلق نقل کیا ہے۔ ھٰؤلاء اھدٰی من الذین اٰمنوا سبیلا (النسآء ۴ - ۵۱) یہ مومنوں سے زیادہ ہدایت کی راہ پر ہیں۔ کفار قریش اور یہود کی اسلام کی بیخکنی کے لئے غرض واحد تھی۔ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمان دین اسلام پر نہ رہیں اور اسی غرض کے لئے جنگ کرتے تھے۔ ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا (۲۱۷)

جنگوں میں مسلمانوں کا عفو پر عمل اللہ کے اپنا امر یا حکم لانے سے منشاء یہ ہے کہ اسلام کی بادشاہت قائم ہو جائے فرمایا اس سے پہلے یہ تو نہیں ٹلیں گے پس تم ہی عفو و درگزر سے کام لو۔ مسلمانوں کا جنگ کرنا صرف اپنی حفاظت کے لئے اور اسلام کی حفاظت کے لئے تھا انتقام کے طور پر کبھی جنگ نہیں کی عین جنگ کے اندر پھر فتح کے بعد اسی تعلیم عفو و درگزر پر عمل رہا۔ فتح مکہ کے بعد لاتثریب علیکم الیوم اسی حکم کی تعمیل میں فرمایا پس اس آیت کو منسوخ کہنا صریح غلطی ہے ✦

نماز بطور علاج ۱۴۲ کیا اس سے پہلے مسلمان نماز نہ پڑھتے تھے؟ کسی حکم کے دینے کا منشاء لازماً یہ نہیں ہوتا کہ اس سے پہلے اس کے خلاف ہو رہا تھا۔ یہاں اوپر کی آیت میں مسلمانوں کی مشکلات کا ذکر کیا کہ اہل کتاب اس قدر دشمن ہو رہے ہیں کہ اسلام سے ہی برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان مشکلات کا علاج یہاں بتایا کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ مصیبت میں نماز بہترین علاج ہے۔ گویا انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مگر صرف نماز سے انسان اپنے کمال کو حاصل نہیں کرتا جبتک کہ زکوٰۃ کی صورت میں ہمدردی مخلوق ساتھ نہ ہو۔ آخر پر فرمایا کہ نماز پڑھکر تم خدا کا کچھ نہیں بناتے اپنی ہی جان کی بھلائی کے لئے کچھ کام کرتے ہو جس کا نتیجہ بعد میں ظاہر ہوتا ہے۔ ضائع کچھ نہیں ہوتا اللہ کے ہاں محفوظ ہے ✦

برھان ۱۴۳ ابرہ (روشن ہوا) سے برھان وہ دلیل ہے جو دعویٰ کو روشن کردے جو نہایت مضبوط اور لامحالہ سچی ہو (غ) ✦

ھود الامن کان ھودا او نصارٰی۔ ھود جمع ھائد ہے اور ھاد کیلئے دیکھو ۹۲ قالوا میں یہود و نصاریٰ دونوں شامل

۱۱۲ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

ہاں جس نے اپنے آپ کو اللہ کا فرمانبردار بنایا اور وہ احسان کرنے والا ہے تو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور ان کو کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۱۴۴

ہیں اور یہ اصل ہیں دو جملوں کا اختصار کر کے ایک کر دیا ہے یعنی یہودی کہتے تھے کہ یہودیوں کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا عیسائی کہتے تھے عیسائیوں کے سوائے کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا جیسا کہ آیت ۱۱۳ سے ظاہر ہوا انکے اسی قول کو امانی یعنی آرزو یا دعوی باطل قرار دیا ہے اور ان سے دلیل مانگی ہے یہودی کہتے تھے بغیر شریعت موسوی کے نجات نہیں عیسائی کہتے تھے بغیر کفارہ کے نجات نہیں مگر کوئی دعوی بلادلیل قبول نہیں ہو سکتا۔ دونوں کے پاس کوئی دلیل نہ تھی۔ اسی لئے عیسائیوں نے تو آخر مذہب ہی یہ بنا لیا کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں یہودی بھی محض کورانہ تقلید کے طور پر مذہب کو پیش کرتے ہیں دونوں کے خلاف اسلام روشن دلائل و احکام بتاتا ہے یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام ہر دعوی کی دلیل بھی پیش کرتا ہے +

قران دعوی کی دلیل دیتا ہے

۱۴۴ اسلم۔ سَلِمَ سے ہے جس کے معنی ہیں ظاہری اور باطنی آفات سے بچے رہنا اور اِسْلام کے معنی ہیں سلامتی میں داخل ہونا اور اَسْلَمْتُ الشَّیْءَ اِلٰی فُلَانٍ کے معنی ہیں میں نے چیز دوسرے کو سونپ دی اور اسلام شریعت میں دو طرح پر ہے ایک محض زبان کیساتھ اقرار کرنا اور یہ ایمان سے کمتر ہے مگر اس کے ساتھ اسلام کے ظاہری احکام جاری ہو جاتے ہیں جیسے قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا الحجرات ۴۹ - ۱۴ میں اور دوسرا یہ کہ اقرار لسان کے ساتھ دلی اعتقاد اور عمل کے ساتھ وفا یعنی اقرار کو پورا کرنا اور اللہ تعالی کے حضور اپنے آپکو بکلی سپرد کر دینا بھی ہو ان تمام باتوں میں جو اس کے قضا و قدر میں ہوں (غ) یہی دوسرے معنی یہاں مراد ہیں +

اسلام سلامتی میں داخل ہونا ہے شریعت میں اسلام دو طرح پر ہے۔

وجہ

وجه ۔ مُنہ ہے ۔ اور چونکہ وجہ پہلی چیز ہے جو سامنے آتی ہے اور ظاہر بدن میں سب سے اشرف چیز ہے۔ اس لئے ہر سامنے آنے والی چیز پر اور ہر اشرف چیز پر اور اس کے آغاز پر اس کا استعمال ہوتا ہے ۔ اور بسا اوقات وجہ کہکر ذات یعنی خود وہ چیز مراد لی جاتی ہے اور اس کے معنی توجہ بھی ہیں (غ) +

نجات عمل سے ہے نہ الفاظ سے۔

یہود و نصاری کا دعوی تھا کہ ان کے سوائے دوسرے لوگ جنت میں داخل نہ ہونگے جب آیت ماقبل میں اس کو دعوی بلادلیل کہکر رد کیا تو اب یہ بتایا کہ مذہب دعوے کا نام نہیں بلکہ طریق عمل کا نام ہے اور جنت میں وہی داخل ہوتا ہے جو اس طریق عمل کو اختیار کرتا ہو جو جنت تک پہنچانے والی ہو منہ سے ایک یا دوسری بات کہدینا جنت میں نہیں پہنچاتا۔ اس میں ایک مسلمان کو تو یہ سمجھایا کہ نرا دعوی اسلام بھی جنت تک نہیں پہنچاتا جب تک وہی طریق عمل پر چلنے کیلئے پورا زور نہ لگائے۔ جو اسلام نے بتایا ہے اور دوسرے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ وہ طریق عمل جو خدا تک پہنچاتا تھا وہ تم میں باقی نہیں رہا۔ وہ طریق عمل کیا ہے اپنی ساری توجہ کو اللہ تعالی کی فرمانبرداری میں لگا دینا اپنے آپ کو بکلی خدا کو سونپ دینا مگر نہ اس شخص کی طرح جو دنیا سے انقطاع کر لے۔ بلکہ خدا کی ایسی فرمانبرداری جس کا نتیجہ بنی نوع انسان کے ساتھ احسان اور مخلوق خدا کی خدمتگزاری ہو۔ اللہ تعالی کی کامل فرمانبرداری جو نفس انسانی کا اپنی ذات میں کمال ہے اور مخلوق خدا کی خدمتگزاری جو دوسروں کی تکمیل میں معاون ہوتا ہے یہ سچے مذہب کے دو ستون ہیں اور انکو کمال تک صرف اسلام پہنچاتا ہے

طریق عمل جو جنت میں پہنچاتا ہے

خوف وحزن سے نجات

اور آخر پر جو فرمایا کہ لاخوف علیہم ولاہم یحزنون تو اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ جنت جو آخرت میں ملتی ہے اس کی ابتدا اسی زندگی سے ہوتی ہے اور اس زندگی میں وہ جنت یہ ہے کہ انسان پر خوف نہ رہے نہ وہ غمگین ہو جسکی تشریح کیلئے دیکھو ۹۰ یعنی وہ لوگ اللہ کی کامل فرمانبرداری جب کرتے ہیں تو شیطان بھی انکا تابع ہو جاتا ہے اسلئے اس کے پھسلانے کا خوف انکو باقی نہیں۔ اور چونکہ انکا وقت مخلوق خدا کی بہتری میں صرف ہوتا ہے اسلئے گزشتہ کے متعلق انکو حزن بھی نہیں ہوتا۔ پس اس مقام پر پہنچ جانا یعنی ایک طرف گناہ کی غلامی سے آزاد ہونا اور شیطان کو فرمانبردار بنا لینا اور دوسری

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ ۱۱۳
اور یہودی کہتے ہیں عیسائی کسی سچائی پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں یہودی

الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ
کسی سچائی پر نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں اسی طرح انہی کے قول کی مانند وہ لوگ کہتے ہیں جو علم نہیں

قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۞ وَمَنْ اَظْلَمُ ۱۱۴
رکھتے پس اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن ان باتوں میں فیصلہ کریگا جن میں وہ اختلاف رکھتے تھے[۱۲۵] اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے

مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ
جو اللہ کی مسجدوں سے روکتا ہے کہ ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے اور ان کے ویران کرنے کی کوشش کرتا ہو ان کو مناسب نہ تھا

اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞
کہ ان میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں بڑا دکھ ہے[۱۴۶]

(حاشیہ: ع ۱۳ — صداقت کو کمال اسلام میں ہے۔)

طرف مخلوق خدا کی بھلائی میں لگ جانا اس دنیا کی جنت ہے اور یہی آخرت کی جنت کی دلیل ہے ۔

(حاشیہ: ہر مذہب میں سچائی کے ہونے کی تعلیم)

۱۲۵ جب اس بات کو بیان کیا کہ نجات کس طرح حاصل ہوتی ہے تو ساتھ ہی اب یہ بھی بتادیا کہ کسی مذہب کے متعلق یہ نہ کہنا چاہئے کہ اس میں کوئی بھی سچائی نہیں ۔ یہود اور نصاریٰ ایک ہی کتاب بائبل کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ مگر پھر بھی مذہب میں آکر یہی کہتے ہیں کہ دوسرے فریق کے مذہب میں کچھ بھی صداقت نہیں ۔ یہ جاہل لوگوں کا کام ہے کہ جب اپنے مذہب کی صداقت کو بیان کرنا شروع کیا تو دوسرے سب کو سراسر باطل اور تمام قسم کی خوبیوں سے خالی کہدیا ۔ نجات کا ! ۔ بیشک اسی میں ہے کہ کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگ جاتے اور مخلوق خدا کے ساتھ احسان اس کی زندگی کا مقصد ہو مگر تاہم کچھ نہ کچھ صداقت ہر مذہب میں پائی جاتی ہے ۔ ہاں عقاید مذہبی کے اختلافات کا فیصلہ یہاں نہیں ہوگا ۔ یعنی یہ نہیں کہ کسی کا عقیدہ ذرا غلط ہوا تو اللہ تعالیٰ اُسے فوراً ہلاک کردے یا کسی دکھ میں مبتلا کردے جو کمی غلط عقاید کی وجہ سے رہ جاتی ہے اس کا کھلا ظہور قیامت کے دن ہی ہوگا اور وہیں اس کے پورا کرنے کا سامان بھی ملیگا ۔ اگلی آیت میں فرمایا کہ جو لوگ عبادتگاہوں کو ویران کرتے ہیں اور خدا کی عبادت سے روکتے ہیں انکے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے ۔

(حاشیہ: غلط عقاید پر اس دنیا میں گرفت نہیں)

(حاشیہ: مسجد)

۱۴۶ اَلْمَسْجِد ۔ سجدہ کرنے کی جگہ یعنی عبادتگاہ کا نام ہے (ت) ۔ بیت المقدس کو بھی مسجد ہی کہا ہے ۔ مگر دوسری عبادتگاہوں کے بالمقابل خصوصیت سے یہ لفظ اسلام کی عبادتگاہ پر بولا جاتا ہے جیسے لہدمت صوامع و بیع وصلوٰت ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا (الحج ۲۲ – ۴۰)

(حاشیہ: خراب) خراب ۔ عمارۃ یعنی آباد کرنے کی ضد ہے ۔

(حاشیہ: خزی) خزی ۔ انکسار کا پہنچنا ہے خواہ اپنی طرف سے ہو یا غیر کی طرف سے (غ) ، پس محض رہ کنے میں آخر کار ناکامی بھی خزی ہے اور دوسرے کا مغلوب ہو جانا بھی ۔

۱۱۵ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کا ہے پس جدھر تم متوجہ ہو گے ادھر ہی اللہ کی توجہ بھی ہوگی بیشک اللہ وسعت دینے والا جاننے والا ہے[۱۴۷]

خدا کی عبادت سے روکنے کی سزا اسی دنیا میں ملتی ہے۔

پہلی آیت میں اختلاف عقاید کا ذکر کیا تھا کہ اس کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا۔ یہاں فرمایا کہ جو لوگ دنیا میں شرارت میں حد سے بڑھ جاتے ہیں یہاں تک کہ مسجدوں میں خدا کی عبادت کو روکنے لگ جاتے ہیں اور ان کو ویران کرتے ہیں۔ ان کو سزا بھی دنیا میں ہی مل جاتی ہے یہودیوں اور عیسائیوں نے جس طرح ایک دوسرے کے مذہب کو ہر قسم کی خوبی سے عاری بتایا اسی طرح ایک دوسرے کو ان کی عبادتگاہوں سے بھی روکا اور ایک [illegible] کے دشمن ہو گئے کہ ہر فریق دوسرے کی بیخکنی کے درپے رہا جب اس کو طاقت ملی۔ اسی لئے [illegible] مسجدوں سے روکنے کا ذکر کیا مگر اس کو نبی کریمؐ کے اعدا کی حالت پر چسپاں کر کے بطور پیشگوئی ان اعدا کی ناکامی کا ذکر کیا۔ نبی کریم صلعم کو اگر مشرکین نے مسجد حرام سے روکا (جس کی طرف لفظ مساجد میں اشارہ ہے اس لئے کہ وہ تمام دنیا کی مساجد کا مرکز ہے) تو یہود و عیسائی بھی انہی کے معاون ہو گئے اس لئے ان کا انجام بھی اس پیشگوئی میں مذکور ہے اور جس طرح پہلی آیت میں یہ بتایا کہ کسی مذہب میں صداقت سے انکار نہیں کرنا چاہئے یہاں یہ بتایا کہ تمام مذاہب کے پیروؤں کو عبادت میں آزادی دینی چاہئے۔

مساجد حرام

مسلمانوں کا مسلمانوں کو مساجد سے روکنا

آنحضرت صلعم کے زمانہ میں تو کافر ہی مساجد سے روکتے تھے۔ مگر آج تو مسلمان خود بھی اپنے مسلمان بھائیوں کو مساجد سے روکتے ہیں اور ایک فرقہ کا مسلمان دوسرے فرقہ کے مسلمانکو اپنی مسجد میں آنے نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں ذلت اٹھا رہے ہیں +

دنیا کی سزا آخرت کی سزا پر بطور دلیل

یہاں دنیا کی سزا کو آخرت کی سزا کے لئے بطور پیش خیمہ اور ثبوت بیان فرمایا ہے جس وقت یہ لفظ نازل ہوئے اس وقت دشمنان اسلام کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی طاقت اور قوت کا خاتمہ ہو کر ان کو ذلت کا منہ دیکھنا پڑے گا مگر تھوڑے ہی دنوں میں یہ غیر متوقع امر صفائی سے پیش آیا۔ اور یہودیوں اور دوسرے دشمنان اسلام کا چند ہی سال میں ذلیل ہو جانا قرآن شریف کی صداقت پر ایک بڑا بھاری نشان ٹھہرا +

ثَمَّ

۱۴۷ ثَمَّ۔ ظرف ہے اور اس سے دور کے مکان کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے +

سعۃ۔ واسع

واسع۔ سَعَة فراخی ہے خواہ بلحاظ مکان ہو یا بلحاظ حالت یا فعل اور واسع اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک ہے۔ اور اس کی قدرت اور علم اور رحمت اور فضلوں کی فراخی پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے و رحمتی وسعت کل شئ (الاعراف۔۱۵۶) اور فرمایا وسع ربی کل شئ علما۔ (الانعام۔۸۱) (غ) +

خانہ کعبہ سے روکا جانے پر مسلمانوں کو تسلی۔

یہاں قبلہ کا ذکر سمجھ کر جس پر کوئی قرینہ نہیں بعض نے اسے قبلہ بیت المقدس کے ناسخ اور بعض نے قول و جہلت سے منسوخ بتایا ہے مگر اس آیت میں قبلہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ چونکہ پچھلی آیت میں بتایا تھا کہ مسلمانوں کو مساجد سے یا خدا کی عبادت سے روکا جاتا ہے تو یہاں مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ اگر ان کو خانہ کعبہ سے روکا گیا ہے تو اللہ تعالےٰ کی توجہ خانہ کعبہ پر محدود نہیں بلکہ اے مسلمانو! اگر تم مسلمان ہو تو جہاں جاؤ گے اللہ کی توجہ وہیں تمہارے ساتھ ہوگی۔ اور دوسرے جس طرح پہلی آیت میں پیشگوئی کی تھی کہ مسجدوں سے روکنے والوں یعنی اعدائے اسلام کیلئے بالآخر ناکامی ہے۔ یہاں اسی کی مزید وضاحت یوں کی کہ مسلمانوں کو

بشارتِ فتوحات

غالب کیا جائیگا۔ اور جن مسجدوں سے ان کو روکا جاتا ہے صرف یہی نہیں کہ ان پر ان کا تصرف ہوگا بلکہ ان کو اس قدر فتوحات دی جائینگی کہ وہ جدھر منہ پھیرینگے ادھر ہی فتح و ظفر ان کے ساتھ ہوگی اور ادھر ہی اللہ کی توجہ بھی ہوگی کیونکہ مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے ہمارے لئے اس میں یہ تسلی ہے کہ وہ خدا جس نے ایک زمانہ میں مشرق میں اسلام کو غالب کیا۔ وہی اب مغرب میں بھی اسے غالب کریگا

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۱۱۶

اور کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنالیا وہ پاک ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے سب اس کے فرمانبردار ہیں ۱۴۸

ولد
لفظ ولد کا استعمال مجازی

۱۴۸ ولد بمعنی مولود ہے جو جنا گیا۔ اور واحد جمع چھوٹے بڑے پر استعمال ہوتا ہے۔ اور متبنّٰی کو بھی وَلَد کہا جاتا ہے اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا (یوسف ۱۲-۲۱) (غ) اور مجازاً کہا جاتا ہے ارض البلقاء تلد الزعفران یعنی بلقاء کی سرزمین سے زعفران پیدا ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے اللیالی حبالی لیس یدری مایلدن۔ راتیں حاملہ ہیں کوئی نہیں جانتا ان سے کیا ظاہر ہونے والا ہے۔ اور کہا جاتا ہے صحبة فلان ولادة للخیر فلاں کی صحبت سے خیر پیدا ہوتی ہے (ت)، اور تولید بمعنی تربیت آتا ہے اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰیؑ کو فرمایا تھا انا ولدتك جس کے معنی ہیں میں نے تمہاری تربیت کی ہے نصاریٰ نے اسے وَلَّدتُّكَ سمجھ لیا اور تحریف کی (ت)۔

قنوت۔ قانت

قانتون۔ قُنُوت خضوع کے ساتھ طاعت کو لازم کرلینا اور محض خضوع اور محض طاعت پر بھی بولا جاتا ہے (غ)۔

عیسائی عقیدہ کی بنیاد

یہاں عیسائیوں کے عقیدہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سورت میں زیادہ تر بحث یہود کی غلطیوں سے کی ہے اور کسی قدر عیسائیوں کی اور آل عمران میں عیسائیت پر مفصل بحث ہے۔ یہود سے کم۔ اتمام حجت کے لئے یہاں عیسائیوں کے عقیدہ کی اصل بنیاد کو لیا ہے یعنی مسیح کی ابنیت کا عقیدہ۔ کیونکہ کفارہ کا مدار بھی ابنیت مسیح پر ہی ہے۔

ابنیت مسیح کا عقیدہ

عیسائی کہتے ہیں کہ قرآن نے عیسائیوں کی طرف اتخاذ ولد کا عقیدہ منسوب کیا ہے حالانکہ وہ ابن مانتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ولد کا لفظ صرف حقیقت پر بولا جاتا ہے اور ابن مجازاً بھی بولا جاسکتا ہے۔ یوں تو قرآن شریف نے دونوں لفظ بولے ہیں یعنی یوں بھی فرمایا ہے وقالت النصاری المسیح ابن الله (التوبہ ۹-۳۰) مگر اکثر ذکر اس عقیدہ کا لفظ اتخاذ ولد میں ہی کیا ہے۔ اس لئے کہ اس میں ان کے عقیدہ کی نامعقولیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ظاہر ہے

خدا کا بیٹا بطور مجاز

کہ اگر عیسائی مسیح کو مجاز کے رنگ میں خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ تو مجازاً یہ لفظ اوروں پر بھی بولا گیا ہے اسرائیل خدا کا بیٹا بلکہ نخست زادہ کہلایا (خروج ۴: ۲۲) اور خود مسیح کہتے ہیں "مبارک وے جو صلح کرنے والے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائینگے۔" (متی ۵: ۹) اور پھر کہتے ہیں "اور جو تمہیں دکھ دیں اور ستاویں ان کے لئے دعا مانگو تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ہو" (متی ۵: ۴۴ و ۴۵) یعنی ہر ایک شخص راستباز بن کر خدا کا بیٹا بن سکتا یا کہلا سکتا ہے اور

انجیل کی شہادت کہ مسیح مجازاً خدا کا بیٹا کہلایا

یہی مجازاً استعمال اس لفظ کا ہے اور انجیل گواہ ہے کہ مسیح نے اپنے لئے بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا تھا جن معنوں میں دوسروں پر اس کا بولنا جائز ہے چنانچہ جب یہودیوں نے اسے کہا کہ ہم تجھے پتھراؤ کریں گے اس لئے کہ تو کفر بکتا اور اپنے آپ کو خدا کہتا ہے تو حضرت مسیح نے یوں جواب دیا "اور کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا کہ میں نے کہا۔ تم خدا ہو جبکہ اس نے انہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا...... تم اس شخص سے جسے باپ نے مخصوص کرکے دنیا میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے اس لئے کہ میں نے کہا میں خدا کا بیٹا ہوں" (یوحنا ۱۰: ۳۳-۳۶) پس مجاز کے رنگ میں خدا کا بیٹا بننے سے تو مسیح کی کوئی خصوصیت نہ رہی۔ اور اگر اس کی خصوصیت قایم کی جائے جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں تو پھر اسے حقیقی طور پر خدا کا بیٹا ماننا پڑے گا۔ اسی لئے قرآن کریم نے اتخذ الله ولدا کو ان کی طرف منسوب کیا۔ اور اسی لئے اس پر یہ اعتراض کیا ولم تكن له صاحبة حقیقی بیٹا تو بغیر بی بی کے ہو نہیں سکتا۔ اور تم خود بی بی کے قائل نہیں ہو۔

ابنیت کے عقیدہ سے خدا میں نقص ماننا پڑتا ہے

عیسائیوں کی اس خطرناک غلطی کا جہاں کہیں ذکر ہے اس کے بعد لفظ سبحان اللہ تعالیٰ کی شان میں بولا ہے۔ سبحان کے معنی ہیں کہ وہ ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔ اور بیٹا بنانے میں نہ صرف اس کی طرف ایک ظاہری عیب ہی

۱۱۷ بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۞ ۱۱۸ وَقَالَ الَّذِيۡنَ

آسمانوں اور زمین کا عجیب بنانیوالا ہے ۱۴۹ اور جب کوئی حکم جاری کرتا ہے تو صرف اسے کہدیتا ہے کہ ہو سو وہ ہوجاتا ہے ۱۴۹الف اور جو لوگ

لَا يَعۡلَمُوۡنَ لَوۡلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوۡ تَاۡتِيۡنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ؕ

علم نہیں رکھتے کہتے ہیں کیوں اللہ ہم سے کلام نہیں کرتا یا کیوں ہمارے پاس نشان نہیں آتا اسی طرح انہی کے قول کی مانند ان لوگوں نے کہا جو ان سے پہلے تھے

منسوب کرنا پڑتا ہو۔ کہ جس طرح باپ بیٹے کا محتاج ہوتا ہے خدا بھی بیٹے کا محتاج ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی عیب ماننا پڑتا ہے کیونکہ بیٹے کی ضرورت یہ بتائی جاتی ہے کہ خدا باپ میں عدل ہے رحم نہیں۔ اور بیٹے میں رحم ہے پس خدا کی صفات ناقص ہوئیں جہاں رحم جیسی چیز ہی موجود نہیں۔ اس لئے جواب دیا کہ وہ عقیدہ صحیح نہیں ہو سکتا جو خدا کی طرف عیب منسوب کرتا ہے +

ابنیت کے تعلق سے بڑھکر مخلوق سے خدا کا تعلق

اس کے بعد یہ فرمایا کہ زمین اور آسمان میں سب کچھ اسی کا ہے اور سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔ یہاں بھی ابنیت کی تردید کی ہے اس لئے کہ فرمایا کہ خدا تو سب کا خالق اور سب کا مالک ہے اور سب اس کے پورے پورے فرمانبردار ہیں۔ حالانکہ باپ بیٹے کا نہ خالق ہوتا ہے نہ مالک اور نہ ہی بیٹا باپ کا کامل فرمانبردار ہو سکتا ہے پس جب خدا میں اور اس کی مخلوق میں باپ اور بیٹے کے تعلق سے بڑھ کر تعلق پہلے ہی موجود ہے تو پھر بیٹا بنانا لاحاصل ہوا +

بدیع۔ ابداع

بدعت

۱۴۹ بدیع یا ابداع کے معنی ہیں ایسا بنانا جس کا پہلے نمونہ موجود نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے لئے جب یہ لفظ استعمال ہو تو معنی ہوتے ہیں بغیر آلہ اور مادہ اور زمانہ اور مکان کے کسی چیز کا وجود میں لانا (غ) اور بدعت شریعت میں نئی بات داخل کرنے کا نام ہے +

بغیر مادہ کے پیدا کرنے والا بیٹے کا محتاج نہیں

یہ آیت بھی ابنیت کے عقیدہ کی تردید کرتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ صاف فرمایا بدیع السمٰوات والارض انی یکون له ولد ولم تکن له صاحبة وخلق کل شیء وھو بکل شیء علیم (الانعام۔ ۱۰۲) جب خدا چیزوں کا ایسا خالق ہے کہ اس کو آلہ اور مادہ کی ضرورت نہیں اور بیٹے کے لئے ان چیزوں کی ضرورت ہے تو بیٹے کا تجویز کرنا خدا کی طرف پھر کمزوری کا منسوب کرنا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی درست نہیں کہ وحدت سے کثرت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ خدا ایک مدبر بالارادہ ہستی اور متصرف کامل ہے بیجان قانون کی طرح نہیں +

قضاء

۱۴۹الف قضیٰ۔ قضاء کے معنی ہیں ایک امر کا فیصلہ کر دینا قول سے ہو یا فعل سے اور اعلام یعنی اطلاع دیدینے اور حکم کے قطع کر دینے کو بھی قضاء کہا جاتا ہے پس قضیٰ امرا کے معنی ہوئے کسی بات کا فیصلہ کر دیتا ہے یا کسی حکم کو جاری کرنا چاہتا ہے۔

قضاء اور قدر میں فرق

اور قضاء اور قدر میں یہ فرق ہے کہ قدر کے معنی اندازہ کرنا ہیں اور قضاء اس پر اجرائے حکم کر دینا یا اس کا قطع کر دینا (غ) یا قدر اندازہ ہے اور قضاء اس کا نفوذ ہے گویا ہر ایک معاملہ قضاء سے پہلے حالت قدر میں ہوتا ہے لکھا ہے کہ نبی صلعم ایک غار کے پاس سے گزر رہے تھے جہاں کچھ پتھر گرنے کو تھے تو آپ بھاگ کر آگے نکل گئے کسی نے کہا افر من قضاء اللہ کیا آپ اللہ کی قضاء سے بھاگتے ہیں فرمایا افر من قضاء اللہ الی قدر اللہ میں اللہ کی قضاء سے اس کی قدر کی طرف بھاگتا ہوں

حکم کن

مادہ کے غیر مخلوق ہونے کے قائل اعتراض کرتے ہیں کہ کن کا حکم کس کو دیتا ہے جواب ظاہر ہے کہ اس امر یا چیز کو جو علم الٰہی میں موجود ہو حکم ہوتا ہے۔ کیونکہ قضاء سے پہلے قدر ہے اور وہ چیز اندازہ الٰہی میں آچکی ہے گو ظاہر میں اس کا وجود

تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ ۱۱۹

ان کے دل ایک ہی جیسے ہیں بیشک ہم نے ان لوگوں کیلئے کھول کر باتیں بیان کردی ہیں جو یقین سے کام لیتے ہیں ۱۵۰ بیشک ہم نے تجھے حق کیساتھ بھیجا خوشخبری

نَذِيْرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى ۱۲۰

دینے والا اور ڈرانے والا اور تجھ سے دوزخ والوں کے متعلق باز پرس نہ کی جائیگی ۱۵۱ اور یہودی تجھ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے اور نہ ہی عیسائی

نہیں۔ مادہ کا مخلوق ہونا تو خود بدیع لا کر بتا دیا۔ یہاں یہ بتانا ہے کہ جو کچھ انسانوں کے نزدیک ناممکن ہے اللہ تعالیٰ وہ بھی کر دکھائے گا اس کے ہاں ناممکن کچھ بھی نہیں اور انسان کی محدود طاقت پر اللہ تعالیٰ کی غیر محدود طاقت کا اندازہ کرنا غلط ہے ؞

یقین — ۱۵۰ یوقنون۔ یقین کے معنی ۱۵ میں بیان ہو چکے ہیں۔ تاج العروس میں ہے کہ یقین شک کے دور ہونے اور علم اور تحقیق امر کو کہتے ہیں۔ پس ایقن یا یوقن کے معنی یہ نہیں کہ ایک بات کو یوں ہی مان لے بلکہ اس کے لئے اس امر کا علم حاصل ہونا اور اس کی تحقیق بھی ضروری ہے یعنی قطعی طور پر اس کو درست پاتا پس قوم یوقنون سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس قوت یقین سے کام لیتے ہیں جو انسان کے اندر رکھی گئی ہے جس طرح قوم یعقلون سے مراد وہ لوگ ہیں جو قوت عقل سے کام لیتے ہیں اور قوت یقین سے کام لینا یہ ہے کہ جب انسان ایک امر کو تحقیق کے بعد درست پاتا ہے تو پھر چھوٹے چھوٹے شبہات اس کے دل میں نہیں اُٹھتے۔ اکثر لوگ جو حق سے محروم رہ جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں قوت یقین نہیں ہوتی یا اس سے کام نہیں لیتے۔ اور چھوٹے چھوٹے شبہات میں مبتلا رہتے ہیں ؞

خدا کے عام لوگوں سے کلام نہ کرنے کا اعتراض — مطالبہ نشان ہلاکت — نصاریٰ کی غلطی کے ذکر کے بعد اب جاہل لوگوں کی ایک غلطی کا ذکر کیا ہے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ خدا ان سے خود اس طرح کلام کرے جس طرح رسولوں سے کلام کرتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ان کا قول نقل کیا ہے حتی نؤتی مثل ما اوتی رسل اللہ (الانعام ۱۵-۶) یعنی کہتے ہیں کہ ہم ایمان نہیں لائینگے جب تک کہ ہم کو بھی وہی کچھ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں پر نازل کیا جاتا ہے۔ اور یا اگر ان سے کلام نہیں کرتا تو ان پر ایک عظیم الشان نشان بھیجے۔ اٰیۃ کی تنکیر اس کی عظمت کے لئے ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ ہلاکت کا نشان نازل ہو جیسا کہ دوسری جگہ صاف مذکور ہے فلیاتنا بایۃ کما ارسل الاولون (الانبیاء ۲۱-۵) یعنی جب پہلوں کی ہلاکت کا ذکر بار بار قرآن شریف میں ہے تو وہی ہلاکت کا نشان ہم پر کیوں نہیں اُترتا۔ دونوں باتوں کا جواب اگلی آیت میں دیا ہے ؞

بالحق — ۱۵۱ بالحق۔ حق کے معنی کے لئے دیکھو ۶۵ یہاں بالحق سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اقتضائے حکمت کے مطابق یعنی ضرورت حقہ کے پیش آنے پر تجھے بھیجا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حق یعنی صداقت دے کر تم کو بھیجا ہے کیونکہ وہ چیز جو رسول اللہ صلعم لائے حق ہی ہے ؞

بشیر — بشیر۔ بشارت دینے والا۔ بشارت کے لئے دیکھو ۱۲۳ سب سے بڑی بشارت جو انبیاء اللہ لاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قرب کا پیدا ہونا ہے جو انسان کا کمال حقیقی ہے ؞

نذیر — نذیر کے معنی منذر ہیں یعنی انذار کرنے والا (انذار کے معنی کے لئے دیکھو ۱۰) یعنی ایسی خبر دینے والا جس میں انسان کو انجام بد سے ڈرایا جائے ؞

جحیم — جحیم جحمۃ۔ آگ کے شعلوں کی شدت کو کہتے ہیں۔ اسی سے جحیم ہے ؞

حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ

یہانتک کہ تو ان کے مذہب کی پیروی کرے کہہ اللہ کی ہدایت وہی (کامل) ہدایت ہے اور اگر تو ان کی گری ہوئی خواہشوں کی پیروی کرے

الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

اسکے بعد جو تیرے پاس علم آیا تو تیرے لئے اللہ (کی سزا) سے بچانے والا نہ کوئی ولی اور نہ مددگار ہوگا ۱۵۲

خدا کس سے کلام کرتا ہے۔

پہلی آیت کے سوال کا جواب دیا ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا۔ اس کا جواب دیا ہے کہ ہم نے پیغمبر کو حق کے ساتھ خوشخبری دے کر بھیجا ہے۔ اور وہ خوشخبری یہ ہے کہ اس کی اتباع سے انسان خدا کے قرب کو حاصل کر سکتا ہے۔ اور جو خدا کے قرب کو حاصل کرلے گا خدا اس سے کلام بھی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ قدوس ہے ناپاک لوگوں سے جو طرح طرح کے گندوں میں مبتلا ہیں وہ کس طرح کلام کر سکتا ہے۔ ہاں اگر وہ رسول کی بشیر کی حیثیت سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں تو اس کا اتباع کریں۔ اور دوسرا سوال تھا کہ ہم پر وہ نشان ہلاکت کیوں نہیں آتا جیسا پہلی قوموں پر آیا تو اس کا جواب دیا کہ اسی سے ان کو ڈرانے کے لئے تو ہم نے تمہیں بھیجا ہے۔ وہ تو آخر آئیگا آخری الفاظ میں بتایا کہ راہ راست پر لانے کی ذمہ داری تم پر نہیں +

نشان ہلاکت کا آنا

املال

ملۃ

ملۃ اور دین میں فرق

۱۵۲ ملۃ۔ ملۃ کا اصل اَمْلَلْتُ الْکِتَابَ سے ہے یعنی میں نے کتاب لکھوائی۔ قرآن کریم میں ہے ولیملل الذی علیہ الحق (۲۸۲: ۲) اور مِلّۃ دین کی طرح ہے یعنی وہ رستہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ سے لوگوں کو بتایا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں اور اس میں اور دین میں فرق یہ ہے کہ مِلّۃ صرف اس نبی کی طرف مضاف ہوتی ہے جس سے وہ مذہب چلتا ہے جیسے مِلّۃ ابراھیم یا واتبعت ملۃ اٰبائی اور اللہ کی طرف یا احاد اُمت کی طرف یہ لفظ مضاف نہیں ہوتا اور بحیثیت مجموعی کل قوم کی طرف مضاف ہو جاتا ہے جیسے یہاں ہے ملتھم اور دین خدا کی طرف یا احاد اُمت کی طرف جیسے دین اللہ یا دینی مضاف ہوتا ہے۔ اور مِلّۃ اس لحاظ سے کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے رستہ بتایا اور دین جس کے معنی طاعت ہیں اس کے لحاظ سے جو اس کو قائم کرتا ہے (غ) +

ھوی

اھواء۔ ھَوٰی کی جمع ہے جس کے معنی ہیں نفس کا میلان شہوت یا خواہشات کی طرف (غ)، ھَوٰی کے اصل معنی نفس کا ارادہ ہیں اور خیر اور شر دونوں میں اس کا استعمال ہے (ت)، مگر چونکہ اس کے معنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا بھی ہیں (ت) اس لئے اکثر استعمال اس کا ان خواہشات پر ہے جو معاصی میں داخل ہیں۔ یا گری ہوئی خواہشات +

علم

عِلم۔ کے معنی ہیں ادراک الشئ بحقیقتہ (غ) یعنی کسی چیز کا اپنی حقیقت کے ساتھ ادراک خواہ اس کی ذات کا ادراک ہو اور اس صورت میں ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے لا تعلمونھم اللہ یعلمھم اور خواہ کسی چیز کے لئے صرف یہ حکم ہو کہ اس کے لئے ایک دوسری چیز موجود ہے یا موجود نہیں جیسے فان علمتموھن مومنات (الممتحنۃ۔ ۱۰)۔ پھر عِلم کی ایک تقسیم نظری اور عملی ہے۔ نظری وہ ہے جو صرف علم حاصل کر لینے سے کامل ہو جاتا ہے۔ جیسے موجودات عالم کا علم اور عملی وہ جو بغیر عمل میں آنے کے کامل نہیں ہوتا جیسے عبادات کا علم۔ اور ایک تقسیم علم کی عقلی اور سمعی ہے یعنی وہ جو غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے اور وہ جو سماعت سے حاصل ہوتا ہے (غ) یہاں اھواء کے مقابل پر عِلم کا لفظ اختیار کرکے بتایا ہے کہ حقیقی مذہب ایک علم یا سائنس

مذہب علم ہے

الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۱۲۱

جنکو ہمنے کتاب دی ہے وہ اسکی پیروی کرتے ہیں جیسا اسکی پیروی کرنیکا حق ہے وہی اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی اسکا انکار کرتا ہے سو وہی نقصان اٹھانیوالے ہیں

ہے اس کی کوئی بات دلائل سے خالی نہیں۔ اور وہ ایک قاعدہ اور قانون کا رنگ اپنے اندر رکھتا ہے۔ ڈھکوسلہ کا نام مذہب نہیں ؎

اسلام ایک علم اور کامل ہدایت نامہ ہے

یہاں ہر ایک شخص مخاطب ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہود اور نصاریٰ حقیقت کی طرف تو غور نہیں کرتے کہ اسلام میں کیا کیا صداقتیں ہیں اور کس طرح مذہب کو کمال تک پہنچا دیا ہے۔ وہ صرف اسی شخص سے خوش ہو سکتے ہیں جو ان کے مذہب کو اختیار کرلے۔ مگر ان کا مذہب کیا ہے؟ اس کا نام یہاں اھواء رکھا ہے۔ اپنی چند خواہشات ہیں جن کو دین میں داخل کرلیا ہے۔ اور بالمقابل اسلام ایک علم ایک سائنس ہے جس نے مذہب کے سارے اصول کو کمال صفائی کے ساتھ بیان کیا۔ اور ان کے باہم تعلقات قائم کئے اور ان کی حقانیت کے دلائل دیئے۔ اسی کو یہاں الھدیٰ کہا ہے یعنی کامل ہدایت نامہ پس صرف یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لئے ایک مسلم اس کامل ہدایت نامہ کو کیونکر چھوڑ سکتا ہے۔ آج بہتیرے لوگ محض عیسائیوں کو خوش کرنے کے لئے دین اسلام کے پاک اصول کو چھوڑ کر جو کچھ عیسائی کہتے ہیں ان کا تتبع کرتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ ایک اللہ کو راضی کرنے کی کوشش چاہیئے تھی ؎

الکتاب

۱۵۳ الکتاب سے مراد یہاں قرآن کریم ہے ؎

تلاوۃ

یتلونہ حق تلاوتہ کے معنی مجاہد سے مروی ہیں یعملون بہ حق عملہ یعنی اس پر عمل کرتے ہیں جیسا عمل کرنے کا حق ہے۔ تلاوت کے معنی کے لئے دیکھو ۶۷ ؎

کامل علم کے بعمل کی ضرورت

یہ رکوع قرآن کریم کے کامل ہدایت ہونے پر تھا۔ سو آیت ماقبل میں بالصراحت یہ ذکر کرکے اب رکوع کی آخری آیت میں عمل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بمقابلہ یہود و نصاریٰ کے اپنی کتابوں پر عمل نہ کرنے کے۔ اور بتایا ہے کہ کامل ہدایت نامہ ہونے سے اسی صورت میں فائدہ ہو سکتا ہے جب اس پر عمل کیا جائے۔ اس لئے فرمایا کہ یہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے یعنی آنحضرت صلعم کے صحابہ یہ اس کی پیروی کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں جیسا پیروی اور عمل کرنے کا حق ہے۔ اولئک یومنون بہ کہکر بتایا کہ اصل ایمان تو یہی ہے کہ انسان اس پر عمل کرے اور فی الواقعہ اگر غور کیا جائے تو جس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم پر عمل کیا کبھی کسی قوم نے کسی آسمانی کتاب پر اس طرح عمل کرکے نہیں دکھایا ہزاروں سالوں کی بدیوں اور ہزاروں سالوں کے رسم و رواج سے قرآن کی آیات کے نزول پر وہ یوں پاک ہوتے جاتے تھے کہ گویا کبھی ان میں یہ چیزیں تھی ہی نہیں۔ کوئی حکم قرآن شریف کا نازل نہیں ہوا جس کو انہوں نے فوراً عمل میں لاکر نہیں دکھایا۔ آج بھی لوگ مسلمان ہی کہلاتے ہیں۔ مگر بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک بھی حکم قرآن شریف کا نہیں جس پر عمل ہو۔ الا ما شاء اللہ معدودے چند اشخاص کو کچھ توجہ ہو تو الگ بات ہے۔ پس آج مسلمانوں کا شمار عملاً اس دوسرے حصہ میں ہے جو فرمایا ومن یکفر بہ فاولئک ھم الخاسرون کیونکہ جب حق عمل ادا نہیں کرتے تو اولئک یومنون بہ میں بھی داخل نہیں ہو سکتے ؎

صحابہ کا بےنظیر عمل قرآن پر

مسلمانوں کی موجودہ حالت

۱۲۲ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ

اے بنی اسرائیل! میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم کو دی اور یہ کہ میں نے تم کو قوموں پر

۱۲۳ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ

فضیلت دی ۱۵۴ اور اس دن سے بچاؤ کرو جب کوئی جی کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی

۱۲۴ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ

معاوضہ قبول کیا جائیگا اور نہ اسے سفارش نفع دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے

رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ

چند احکام سے آزمایا تو اس نے ان کو پورا کیا فرمایا میں ضرور تجھے لوگوں کے لئے پیشوا بنانے والا ہوں ۱۵۵

ع ۱۵
۱۵

وعدہ ابراہیمی اور خانہ کعبہ

بنی اسرائیل کو تین دفعہ خطاب

۱۵۴ یہ تیسری مرتبہ بنی اسرائیل کو خطاب ہے۔ پہلے ان کو ان کی حالت موجودہ پر توجہ دلائی اور بتایا کہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ ہو جانے سے وہ دنیا میں معزز بن جائینگے۔ دوسری مرتبہ ان کو حضرت موسیٰ اور بعد کے زمانہ اور حضرت موسیٰ اور انبیائے بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلائی اب تیسری مرتبہ حضرت موسیٰ سے بھی پہلے کا زمانہ اور ابراہیمی وعدہ یاد دلاتا ہے اور یہی اس کا تعلق پہلے مضمون سے ہے۔ گویا اس طرح تین دفعہ خطاب کر کے اور ابتدائی وعدے یاد دلا کر بنی اسرائیل پر اتمام حجت کیا ہے ✦

ابتلیٰ

۱۵۵ ابتلیٰ بلیٰ سے ہے جس کے لئے دیکھو ۴۹ ابتلیٰ اور ابتلیٰ کے معنی میں امام راغب نے لکھا ہے کہ دو مفہوم شامل ہیں ایک اس کے حال سے واقفیت حاصل کرنا دوسرے اس کی خوبی او نقص کا ظاہر کر دینا۔ اور بسا اوقات یہ دونوں باتیں مقصود ہوتی ہیں اور بسا اوقات ان میں سے ایک ہی مقصود ہوتی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ فاعل ہو تو صرف دوسرے معنی مراد ہوتے ہیں یعنی خوبی یا نقص کا ظاہر کر دینا۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ حالات سے تو واقف ہی ہے (غ) اور چونکہ اصل غرض ابتلا یا امتحان کی صرف خوبیوں یا نقصوں کا اظہار ہی ہوتا ہے اور حال سے واقفیت حاصل کرنا صرف ایک ذریعہ ہے جس کے بغیر انسان دوسرے کی جودت یا ردأت کا اظہار کرنے کے قابل ہی نہیں ہو سکتا اس لئے ۴۹ میں جو اصول قائم کیا گیا ہے اس کے مطابق بھی ابتلیٰ کے یہی معنی ہیں یعنی مراد حضرت ابراہیم کے کمالات کا ظاہر کرنا ہے

ابراهیم

ابراهیم۔ عبرانی نام ہے اور بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دو عظیم الشان قوموں کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان کا زمانہ غالباً کوئی ۲۰۰۰ سال قبل مسیح ہے۔ اور یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے نزدیک ایک عظیم الشان پیغمبر تھے۔ بلکہ مشرکین عرب بھی آپ کی اسی طرح عزت کرتے تھے۔ بائبل کے محرف ثابت ہونے کی وجہ سے یہ خیال بھی ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم کوئی تاریخی انسان نہ تھے مگر عرب کی روایات اور عرب کا آپ سے تعلق اور خانہ کعبہ میں آپ کے نشانات اس خیال کو باطل ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں ✦

عرب سے تعلق

کلمات

کلمات کے معنی ۵۸ میں بیان ہو چکے کلمات اللہ سے مراد احکام الٰہی ہیں (غ) حضرت ابن عباس سے ایک روایت ہے۔ کہ تیس احکام ہیں جن میں سے دس مومنوں کی صفت میں سورہ برأت میں ہیں دس احزاب میں دس معارج میں (ر)

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝

(ابراہیم نے) کہا۔ اور میری اولاد ؟ فرمایا میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا ۱۵۶

اتم — اتم۔ کسی چیز کا تمام اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اپنے سے باہر کسی کی محتاج نہ رہے دوسری جگہ فرمایا وابراھیم الّذی وفّی (النجم ۵۳-۳۷) اور یہاں آگے آتا ہے اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین (۱۳۱)+

ام۔امام — امام۔ اَمّ سے ہے جس کے معنی ہیں اس نے قصد کیا۔ اور امام وہ ہے جس کی پیروی کی جائے خواہ وہ انسان ہو جس کے قول یا فعل کی پیروی ہو یا کتاب یا اس کے سوائے کچھ اور وہ حق پر ہو یا باطل پر (غ)۔ باطل پیشرووں پر بھی یہ لفظ قرآن شریف میں آیا ہے وجعلناھم ائمۃ یدعون الی النار (القصص ۲۸-۴۱) اور یوم ندعوا کل اناس بامامھم (بنی اسرائیل ۱۷-۷۱) میں امام کے معنی کتاب ہی لئے گئے ہیں +

کلمات سے حضرت ابراہیم کی تکمیل نفس — وعدہ ابراہیمی کے ذکر سے پہلے حضرت ابراہیم کی عظمت کا ذکر کیا ہے۔ جو تینوں قوموں۔ یہود عیسائی اور مشرکین عرب کے نزدیک مسلّم راستباز تھے۔ پہلے احکام جو آپ کو دیئے گئے وہ اپنی ذات کے کمال کے لئے تھے جب آپ ان میں پورے اُترے تو پھر آپ کو امام بنایا گیا یعنی دوسروں کا پیشرو مقرر کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی احکام الٰہی کا کامل فرمانبردار ہوتا ہے اسی لئے وہ دوسرے لوگوں کا پیشوا بنایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو شھداء علی الناس یعنی دوسری قوموں کا پیشرو بنایا گیا تھا۔ مگر جب وہ اپنی تکمیل نفس سے ہی غافل ہو گئے تو دوسروں کے پیشرو بننے کے بھی اہل نہ رہے +

ذریۃ — <u>۱۵۶</u> ذریتی۔ ذریۃ اصل میں چھوٹی اولاد کو کہتے ہیں مگر چھوٹوں بڑوں سب پر بولا جاتا ہے۔ یہ یا ذرأ سے مشتق ہے جس کے معنی پیدا کرنا ہیں اور ہمزہ متروک ہو گیا ہے اور یا ذرّ سے مشتق ہے جس کے معنی پھیلانا ہیں (غ)

وعدہ ابراہیمی — چونکہ اصل مقصد وعدہ ابراہیمی کو یاد دلانا ہے اس لئے حضرت ابراہیم کی اولاد کے متعلق جو وعدے تھے ان کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ حضرت ابراہیم کے اصل صحیفے تو اب نابود ہیں ہاں حضرت موسیٰ کی کتاب پیدائش میں کچھ ذکر حضرت ابراہیم کا اور آپ کی اولاد کے ساتھ وعدوں کا اب بھی موجود ہے۔ ان کئی بابوں کے مضمون کو بیان چند پُرمعنی الفاظ میں جن میں سے ایک ایک اپنے اندر وہ حکمت کی باتیں لئے ہوئے ہے جو کتاب پیدائش میں مفقود نظر آتی ہیں بیان کیا ہے۔

قرآن بائبل سے نہیں لیا گیا کیونکہ بائبل کی اصلاح کرتا ہے۔ — بائبل کے کئی بابوں کے قائم مقام یہ چند لفظ ہیں "کہا اور میری اولاد سے فرمایا میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا" یعنی تیری اولاد کو بھی ہم دنیا میں پیشرو بنائینگے عزت دینگے برکت دینگے لیکن اگر یہ لوگ ظلم کی طرف جھک جائیں تو پھر وہ اس وعدہ کے مستحق نہ رہینگے۔ کیا حق وحکمت کی بھری ہوئی بات کہدی ہے۔ مگر بائبل میں یہ مفقود ہے وہاں لفظ عام ہیں" تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہو گی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پاویگی (پیدائش ۲۲: ۱۷ و ۱۸) پس یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے بیانات بائبل سے نہیں لئے گئے۔ کیونکہ بائبل کے نقصوں کا وہ علاج کرتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی ان الفاظ میں بتایا ہے کہ جب وہ ظلم اختیار کرینگے تو وہ بھی وعدہ الٰہی کی برکات سے محروم کر دیئے جائینگے +

وعدہ ابراہیمی میں اسمٰعیل و اسحاق دونوں شامل ہیں — من ذریتی کا لفظ یہاں لا کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس وعدہ میں حضرت اسمٰعیل اور اسحاق دونوں شامل تھے۔ اور گو یہود اور عیسائی اس کا انکار کرتے ہیں۔ مگر بائبل سے اب بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اول اسمٰعیل اور اسحاق دونوں کی پیدائش سے پہلے حضرت ابراہیم کو فرمایا "میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا" پیدائش (۱۲: ۲ و ۳) یہاں برکت دینے کے لفظ

۱۲۵ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ

اور جب ہم نے خانہ (کعبہ) کو لوگوں کے لئے مرجع اور امن بنایا ۱۵۷

قابل غور ہیں۔ کیونکہ ابراہیم کو برکت دینے والے مسلمان ہی ہیں جو پانچوں نمازوں میں کما بارکت علیٰ ابراھیم و علیٰ اٰل ابراھیم پڑھتے ہیں۔ پھر حضرت ہاجرہ کے ساتھ وعدہ ہے "میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے نہ گنی جائے" (پیدائش ۱۶: ۱۰) پھر اسمٰعیل کا نام لیکر فرمایا "اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دونگا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤنگا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہونگے اور میں اسے بڑی قوم بناؤنگا" (پیدائش ۱۷: ۲۰) یہی برکت دینے کا وعدہ حضرت ابراہیم سے تھا وہی اسمٰعیل سے بالخصوص ہے پس بائبل یہودیوں اور عیسائیوں کو جھوٹا ٹھہراتی ہے جو حضرت اسمٰعیل کو ابراہیمی وعدہ میں شامل نہیں کرتے +

وعدہ ابراہیمی میں حضرت اسمٰعیل کی شمولیت پر ایک شہادت

اگر تاریخ پر نگاہ کی جائے تو بھی وعدہ ابراہیمی جس طرح بنی اسرائیل پر صادق آتا ہے۔ اسی طرح بنی اسمٰعیل پر بھی صادق آتا ہے "اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے"۔ دوسرا عہد اللہ تعالیٰ کا ابراہیم کے ساتھ ہے "میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے ملک ہو" (پیدائش ۱۷: ۷ و ۸) اب ایک طرف اگر بنی اسرائیل ختنہ کراتے ہیں اور اس عہد ابراہیمی کا نشان قائم رکھتے ہیں تو دوسری طرف بنی اسمٰعیل یعنی عرب کے لوگ بھی ختنہ کراتے اور اس عہد ابراہیمی کے نشان کو قائم رکھتے ہیں اور دنیا کی کسی اور قوم میں یہ نشان نہیں پایا جاتا۔ اور ان سب سے بڑھکر یہ کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم اصل موعود وعدہ ابراہیمی کے ظہور پر ایک ایسی قوم پیدا ہوتی ہے جو آپ کی روحانی اولاد ہونے کی وجہ سے اس عہد ابراہیمی کے نشان کو تا قیامت زندہ رکھتی ہے۔ دوسری طرف خدا کا عہد ابراہیم کے ساتھ یہ تھا کہ کنعان کا ملک اس کی نسل کو ہمیشہ کے لئے دیا گیا۔ مگر وہ ملک اول یہود پھر عیسائیوں پھر مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اپنے وقت میں وہ اس وعدے کے صحیح مصداق تھے صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے اسی لئے بیت المقدس چھیننے کی کوشش کی گئی مگر آخرکار عیسائی ناکام رہے اور قریبًا ایک سو سال کے بعد پھر مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ اب پھر بظاہر یہ ملک مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ مگر ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ پھر کوئی سامان پیدا کردے کہ یہ ملک مسلمانوں کو واپس ملے یا اس کے مالک مسلمان ہو جائیں۔

بیت المقدس کا دو مرتبہ اصل حقداروں کے ہاتھ سے نکلنا

بنی اسرائیل کی تاریخ میں بھی دو ہی دفعہ بیت المقدس ان کے قبضہ سے نکلتا ہے پہلی مرتبہ وہ خود ہی دوبارہ اس میں آباد کر دئے جاتے ہیں جب خورس شاہ ایران نے بابلیوں کو تباہ کیا دوسری مرتبہ جب حضرت عیسٰی کے ظہور کے بعد بیت المقدس تباہ ہوا تو اس کے تباہ کرنے والے یعنی رومی آخر خود عیسائی ہو گئے اسی طرح پہلی مرتبہ مسلمانوں نے اپنی قوت بازو سے بیت المقدس کو عیسائیوں کے ہاتھ سے لیا دوسری مرتبہ شاید یونہی مقدر ہو کہ جس قوم نے اس کو لیا ہے وہ مسلمان ہو جائے۔

بیت

۱۵۷ البیت۔ بیت اصل میں اس مقام کو کہتے ہیں جو رات کو جائے پناہ کا کام دے کیونکہ بات کے معنی ہیں رات کاٹی

بیّت - البیت

اور بیّت کے معنی ہیں رات کو مشورہ کیا یا کام کیا فرمایا بیت طائفۃ منھم (النساء ۴ - ۸۱) مطلق البیت سے مراد بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ ہے۔ اور قرآن کریم میں اس کو اوّل بیت وضع للناس (اٰل عمران ۳ - ۹۵) فرمایا یعنی سب سے

دنیا کی پہلی عبادتگاہ

پہلا گھر جو لوگوں کی بھلائی کے لئے مقرر کیا گیا یعنی سب سے پہلی عبادتگاہ۔ اور ایک جگہ اس کو البیت العتیق (الحج ۲۲ - ۲۹) بھی فرمایا یعنی قدیم گھر۔ ان دونوں ناموں کے علاوہ اس کا البیت کے نام سے مشہور ہو جانا صاف بتاتا ہے کہ اس گھر کو کوئی ایسی

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى

اور ابراہیم کے مقام کو قبلۂ نماز بناؤ ۱۵۸

خصوصیت دنیا میں حاصل ہونے والی ہے جو کسی دوسرے گھر کو حاصل نہیں ہوئی۔

ثوب۔ مثابۃ مثابۃ۔ ثوب سے ہے جس کے معنی کسی چیز کا پہلی حالت کی طرف رجوع کرنا ہیں (غ)، اور اس کا مادہ وہی ہے جو ثواب اور مثوبۃ وغیرہ کا مادہ ہے اور مثابۃ وہ جگہ ہے جہاں لوگ بار بار لوٹ لوٹ کر آئیں اور بعض کے نزدیک اس کے معنی ہیں تفرقہ کے بعد لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ (ت)، دونوں معنی کے لحاظ سے خانہ کعبہ اس لفظ کا مصداق ہے کیونکہ لوگ تا قیامت وہاں حج کیلئے آتے رہینگے اور کیونکہ مذاہب عالم میں تفرقہ پیدا ہو جانے کی وجہ سے یہ مقام پھر ان کے اجتماع کا اور کل نسل انسانی کو ایک نیک کرنے کا موجب ہوا۔

تفرقہ کے بعد اجتماع مذاہب

امن امن۔ مصدر ہے بطور مبالغہ یہاں لایا گیا ہے اور مراد مقام امن ہے۔

خانہ کعبہ کی قدامت پر میور کی شہادت البیت یا بیت اللہ یا خانہ کعبہ وہ پاک گھر ہے جس کی شہرت اور عزت عرب میں ایسے قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے جس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ سر ولیم میور ایک مخالف اسلام یہ تسلیم کرتا ہوا لکھتا ہے "مکہ کے مذہب کی نمایاں خصوصیات کیلئے ایک نہایت ہی قدیم زمانہ تجویز کرنا پڑتا ہے۔ ڈائیڈورس سکولس سنہ عیسوی سے بھی نصف صدی پیشتر لکھتا ہوا عرب کے ذکر میں لکھتا ہے کہ اس ملک میں ایک معبد ہے جس کی عرب لوگ بہت ہی عزت کرتے ہیں۔ ان الفاظ میں یقیناً خانہ کعبہ کا جو مکہ میں ہے ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اور کسی معبد کا عرب میں نام بھی نہیں جس کی عزت عرب میں عام طور پر ہوئی ہو۔ زبانی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ترین زمانہ سے خانہ کعبہ کا حج عرب کے ہر گوشہ کے لوگ کرتے رہے ہیں۔ یمن اور حضر موت سے خلیج فارس کے کنارہ سے۔ شام کے بادیہ سے۔ حیرہ اور عراق عرب سے لوگ ہر سال مکہ میں جمع ہوتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اس قدر عام طور پر سارے ملک میں اس عزت کا حاصل ہونا یقیناً ایک ایسے قدیم زمانہ سے ہونا چاہیے جس کے پرے اور کوئی قدیم زمانہ تجویز نہیں ہو سکتا"۔

بائبل میں بیت ایل اور اس سے مراد بائبل میں بھی بیت ایل کا ذکر آتا ہے جس کا تعلق ابراہیم کے ساتھ ہو مگر بائبل کا بیان بیت ایل کے مقام کی تعیین میں قابل اعتبار نہیں اور اس پر بعد کے خیالات کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ دنیا میں آج صرف ایک ہی مقام ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جس پر بیت ایل یا بیت اللہ کا نام بولا گیا ہے اور وہ خانہ کعبہ ہے۔

کعبہ کے متعلق دو پیشگوئیاں یہاں اسکے متعلق دو پیشگوئیاں بھی ہیں اول یہ کہ یہاں لوگ تا قیامت جمع ہوتے رہینگے۔ یہ کبھی متروک نہ ہوگا نہ برباد ہوگا نہ دنیا کی کوئی طاقت لوگوں کو وہاں جمع ہونے سے روک سکے گی۔ اور تفرقہ کے بعد لوگوں کا یہاں اجتماع ہوگا۔ دوسرا یہ کہ یہ ہمیشہ امن کا مقام رہیگا چنانچہ اس کا نام ہی حرم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا اولم یروا انا جعلنا حرما اٰمنا ویتخطف الناس من حولھم (العنکبوت ۲۹۔ ۶۷) کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم کو مقام امن بنایا ہے اور انکے اردگرد کے لوگ زبردستی اُچک لئے جاتے ہیں یعنی اسکے اردگرد دن رات جنگیں ہوتی ہیں اور لوگوں کیلئے امن نہیں مگر اس مقام میں ایسا امن ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ اسکو توڑ سکے۔ عرب کی خونخوار طبائع کو جن میں دن رات جنگیں رہتی تھیں اس مقدس گھر کے سامنے اللہ تعالیٰ نے ایسا جھکا یا کہ اسکی حدود کے اندر انکی خونریزی کبھی ظاہر نہ ہوتی تھی۔ یہ خدائی تصرف تھا ورنہ اتنے بڑے ملک کا خود اتفاق کر کے اس بات کو عمل میں لانا اور عین جنگ کے جوش کے وقت میں اس پر قائم رہنا محال تھا۔ جب مہذب سے مہذب قومیں بھی خونریزی کو اپنے انتہا تک پہنچا کر چھوڑتی ہیں مقام امن کہنے میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ اس کا دشمن کبھی اس پر قابض نہ ہوگا بلکہ یہ انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہیگا جو دل سے اس کی عزت و احترام کرنے والے ہیں چنانچہ ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہے اور گو بت پرست بھی اس پر قابض رہے مگر وہ بھی دل سے اس کا احترام کرنے والے تھے اور جب ایک عیسائی بادشاہ نے اسے منہدم کرنے کی نیت سے حملہ کیا تو وہ اور اس کا لشکر تباہ ہو گئے۔ حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ اس میں دجال اور طاعون کبھی داخل نہ ہونگے۔

خانہ کعبہ پر کبھی اسکے دشمن قابض نہ ہونگے

مقام ابراہیم۔ ع ۱۵۸ مقام ابراہیم۔ خانہ کعبہ میں ایک معروف مقام ہے جو چھ ستونوں پر قایم اور آٹھ فٹ بلند ہے یہاں طواف

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝

اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا کہ میرے گھر کو پاک کرو طواف کرنیوالوں کیلئے اور اعتکاف کرنیوالوں اور رکوع کرنیوالوں سجدہ کرنیوالوں کیلئے ۱۵۹

کے بعد دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے۔ مگر یہاں مقام ابراہیم سے مراد بعض کے نزدیک مواقف حج بعض کے نزدیک عرفات مزدلفہ وغیرہ ہیں۔ اور بعض کے نزدیک سارا حرم بعض کے نزدیک خود خانہ کعبہ اور یہی درست ہے +

مصلّٰی

مصلّٰی۔ نماز کی جگہ کو کہتے ہیں اور مجازاً قبلہ مراد ہے (ر) جیسا حدیث مسجدی آخر المساجد میں مسجد یا نماز کی جگہ سے مراد قبلہ ہے یہاں مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز ادا کرنا ہے بعض نے مزدلفہ عرفات وغیرہ میں ذکر مراد لیا ہے۔

خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم

مگر بخاری میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا یا رسول اللہ لو اتخذت من مقام ابراھیم مصلّٰی یا رسول اللہ اگر آپ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنائیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اب یہ سورت مدنی ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے عرض کرنے کا یہ منشاء نہ ہو سکتا تھا کہ خانہ کعبہ میں چل کر آپ دو رکعت نماز پڑھیں یا مزدلفہ عرفات میں ذکر کریں کیونکہ خود حج ہی رُکا ہوا تھا پس اس سے مراد سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا تھا کہ خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا جائے کیونکہ آنحضرت صلعم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اور سیاق مضمون بھی یہی چاہتا ہے کہ جب یہ ذکر ہوا کہ خانہ کعبہ کو ہم نے لوگوں کے لئے مرجع اور امن بنایا ہے تو ساتھ ہی اس کے قبلہ بنانے کا ذکر ہو۔ یہی حکم یہاں دیا گیا ہے۔ اور اس پر جو اعتراض ہوئے ان کا جواب سیقول السفہاء سے شروع ہوتا ہے +

عہدنا

۱۵۹ عہدنا الٰی۔ عہد فلانٌ الٰی فلانٍ کے معنی ہیں کہ اس کے سامنے ایک عہد پیش کیا اور اس کی حفاظت کی تاکید کی (غ) یعنی عہد کا صلہ الٰی ہو تو اس کے معنی حکم دینا ہوتے ہیں +

اسمٰعیل اور ہاجرہ

اسمٰعیل حضرت ابراہیم کے سب سے بڑے فرزند کا نام ہے جو حضرت ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوئے اور گو بائبل میں ان کو لونڈی کہا گیا ہے مگر وہ مصر کے شاہی خاندان میں سے تھیں۔ شاید قومی امتیاز کی وجہ سے ان کو لونڈی کہا گیا ہے۔ اسمٰعیل ان کا نام ان کی والدہ کو فرشتہ نے بتایا تھا جیسا کتاب پیدایش میں مذکور ہے۔ اور یہ سمع اور ایل سے مرکب ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ نے سن لیا۔

اسمٰعیل اور ہاجرہ حکم خدا سے مکہ میں چھوڑے گئے۔

حضرت ابراہیم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ کو کسی دوسرے مقام پر چھوڑ آئیں۔ چنانچہ اسی حکم کے مطابق (جیسا حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ جب حضرت ہاجرہ نے حضرت ابراہیم سے پوچھا کہ کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے تو انہوں نے فرمایا ہاں) نہ حضرت سارہ کے کہنے سے جیسا بائبل میں ہے حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل اور ہاجرہ کو خانہ کعبہ کے قریب چھوڑا جس کی صحیح شہادت قرآن کریم کے ان الفاظ میں موجود ہے ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم (ابراھیم ۱۴ع ۳) بائبل میں ہے کہ فاران میں ان کو چھوڑا۔

فاران

عیسائی اس سے مراد ملک شام کا ہی کوئی جنگل لیتے ہیں جو واقعات سے غلط ثابت ہوتا ہے اور نہ صرف قرآن کریم اس کی تردید کرتا ہے بلکہ عرب کا اسمٰعیل کی اولاد سے ہونا ایک امر مسلم ہے جس کا کوئی عیسائی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

عرب کا اسمٰعیل کی اولاد سے ہونا۔

چنانچہ قیدار جو حضرت اسمٰعیل کے بڑے بیٹے کا نام ہے (پیدایش ۲۵: ۱۳) اس کا استعمال بائبل میں قوم عرب کی جگہ پایا جاتا ہے (زبور ۱۲۰: ۵۔ یسعیاہ ۴۲: ۱۱ و ۶۰: ۷ وغیرہ) دوسری طرف عرب کی روایات حضرت اسمٰعیل کے یہاں آنے کو یقینی ٹھہراتی ہیں۔ خود خانہ کعبہ میں حضرت ابراہیم کی یادگار موجود ہے۔ صفا اور مروہ میں حضرت ہاجرہ کی۔ اور عرب کا نہ صرف اپنا دعویٰ ہے کہ وہ اولاد اسمٰعیل ہیں بلکہ حضرت اسمٰعیل تک برابر ان کے نسب نامے چلتے ہیں +

تطہیر

طہرا۔ تطہیر کے معنی میں ظاہری طور پر اور باطنی طور پر پاک کرنا دونوں شامل ہیں یہاں بتوں کی ناپاکی سے اور شرک باللہ

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَھْلَهٗ مِنَ ۱۲۶

اور جب ابراہیم نے کہا میرے رب اس کو امن والا شہر بنا دے اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق

الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَمَنْ کَفَرَ

دے جو کوئی ان میں سے اللہ اور پیچھے آنے والے دن پر ایمان لائے ع۱۶۰ فرمایا اور جو کافر ہوگا تو اسے

فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ

بھی تھوڑے دن فائدہ اٹھانے دونگا پھر اسے آگ کے عذاب کی طرف بے بس کر دونگا اور وہ بُرا ٹھکانا ہے ع۱۶۱

سے تطہیر مراد ہے (ج)

طائفین طائفین۔ طائف۔ طوف سے ہے جس کے معنی کسی چیز کے گرد پھرنا ہیں پس طائفین وہ ہیں جو اسکے طواف کے قصد سے آتے ہیں۔

عکوف عاکفین۔ عاکف۔ عکوف سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا اور اس کی تعظیم کے لحاظ سے اس کے ساتھ

اعتکاف عاکفین تعلق پیدا کرلینا (غ)، اسی سے اعتکاف ہے جو آخری عشرہ رمضان میں مسجد میں رہنے کا نام ہے عاکفین سے مراد بعض لوگوں نے مقیمین مکہ کو لیا ہے مگر مراد صرف عبادت کے لئے بیٹھنے والے ہیں۔ بحالت طواف طائف ہیں بحالت عبادت عاکف بحالت رکوع راکع (جمع رُکّع) بحالت سجدہ ساجد (جمع سُجُود) +

تطہیر کعبہ یہاں حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل کو خانہ کعبہ کی تطہیر کا حکم دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ وہاں پہلے سے موجود تھا مگر وہاں بت وغیرہ رکھ دیئے گئے تھے جس طرح آنحضرت صلعم کے زمانہ سے پہلے۔ اور تطہیر سے مراد بتوں سے پاک کرنا اور بت پرستی اور شرک کو دور کرنا ہی ہے۔ ہاں اس کی کامل تطہیر نبی کریم صلعم کے ہاتھ سے ہونی مقدر تھی۔ حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل نے اسکی دوبارہ تعمیر بھی کی ہے جیسا آگے ذکر آتا ہے +

بلد ع۱۶۰ بلد۱۔ بَلَد وہ مکان ہے جو خطوط سے محدود ہو اور اس کے ساکنوں کے اجتماع اور ان کی اقامت سے

البلد اس کے اندر انس کی حالت پائی جائے (غ)، جس طرح مطلق لفظ البیت خانہ کعبہ پر بولا گیا ہے اسی طرح مطلق البلد مکہ معظمہ پر بولا گیا ہے لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ (البلد ۹۰-۱) +

مکہ کیلئے دعائے ابراہیم حضرت ابراہیم کی دعا دو باتوں کے لئے ہے ایک یہ کہ اس مقام کو بَلَد یعنی شہر بنا دے کیونکہ پہلے وہاں شہر نہ تھا گو خانہ کعبہ تھا اور دوسرے امن والا۔ اور پھر اس جنگل میں اس کے رہنے والوں کے لئے پھل مہیا فرما دے وادی غیر ذی زرع یعنی بے آب و گیاہ جنگل میں رکھکر یہ دعا بتاتی ہے کہ کس قدر ایمان اللہ تعالیٰ کی قدرت پر تھا۔ اور آج فی الواقع دنیا بھر کے پھل مکہ میں ملتے ہیں۔ مگر دعا میں صرف مومنوں کی شرط رکھی یعنی آپ یہ چاہتے تھے کہ یہاں صرف مومن ہی آباد ہیں +

متاع ع۱۶۱ امتع۔ مَتاع اس نفع کا حاصل کرنا ہے جو ایک وقت تک ممتد ہو (غ) پس امتعہ کے معنی ہوئے ایک وقت تک نفع اٹھانے دوں گا یعنی کفر یہاں ہمیشہ نہیں رہے گا +

اضطرار اضطر۔ اضطرار کے معنی ہیں انسان کو اس بات میں ڈالنا جو اس کے ضرر کا موجب ہو۔ اضطرار خارجی سبب سے بھی ہو سکتا ہے جیسے مغلوبیت سے بے بس ہونا اور داخلی سبب سے بھی بھوک وغیرہ سے (غ)، مزید تشریح کے لئے دیکھو ع۲۱۱ +

صار مصیر و صیر کے معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں اور صار کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کیا اور

۱۲۷ وَ اِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ

اور جب ابراہیم اس گھر کی بنیادیں اُٹھاتا تھا اور اسمٰعیل (بھی) اے ہمارے رب ہم سے قبول فرما بیشک تو

۱۲۸ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً

سننے والا جاننے والا ہے ۱۶۲ اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنے فرمانبردار (بنا) اور ہماری نسل سے ایک گروہ اپنا فرمانبردار (بنا)

۱۲۹ لَّکَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَ تُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ

اور ہمیں ہمارے حج کے اعمال بتا اور ہم پر رحمت سے توجہ فرما بیشک تو رحمت سے توجہ فرمانے والا الرحم کرنے والا ہے ۱۶۳ اے ہمارے رب! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول اُٹھا

مصیر — مَصِیر وہ آخری حالت ہے جس میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کر کے انسان آخر کار پہنچتا ہے (غ)۔

ورثے کفر جانے کیلئے تھوڑے — اللہ تعالیٰ کا رزق تو کافر و مومن کیلئے یکساں ہی اسلئے فرمایا دنیا کا رزق سب کو یکساں ملے گا کافر ہو یا مومن۔ ہاں کافر کیلئے یہ تھوڑے دن کا رزق ہے یعنی حیات دنیا کا اور آخرت کے ثمرات سے جو اعمال کا نتیجہ ہیں وہ محروم رہ جاتا ہے۔ یا تھوڑے دن کے فائدہ سے مراد یہ ہو کہ کفر آخر کار اس ملک سے مٹ جائیگا جیسا کہ آنحضرت صلعم کی تشریف آوری سے ہوا +

قواعد — ۱۶۲ قواعد۔ قَاعِدَۃ کی جمع ہے جس کے معنی بنیادیں ہیں اور یہ قعد سے ہے جس کے معنی بیٹھنا ہیں (غ)

قبل — تقبل۔ قَبْل سے ہے جس کے معنی پہلے ہیں اور قَبِلَ کے معنی ہیں اس نے قبول کیا۔ ولا یقبل منھا شفاعۃ (۴۸) ولا یقبل منھا

تقبل — عدل (۱۲۳) اور تَقَبُّل کے معنی ہیں ایسے رنگ میں کسی چیز کا قبول کرنا جس کا مقتضے ثواب ہو جیسے ہدیہ کا قبول کرنا۔ اولئک الذین نتقبل عنھم احسن ما عملوا (الاحقاف ۴۶-۱۶) فتقبلھا ربھا بقبول حسن (آل عمران ۳-۳۷) انما یتقبل اللہ من المتقین (المائدۃ ۵-۲۷)

سمع — السمیع۔ سمع اس قوت کا نام ہے جس سے سنا جاتا ہے اور سُننے کے فعل کو بھی (غ) اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے جو سمیع ہے

سمیع — وہ بمعنی سامع ہے یعنی سننے والا۔ ہاں اس کا سُننا اس سے پاک ہے کہ وہ انسان کی طرح کان کا یعنی آلہ کا محتاج ہو (ت) اور یہی بات اس کی سب صفات میں پائی جاتی ہے +

ابراہیم کا خانہ کعبہ کو تعمیر کرنا — اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے خانہ کعبہ کو بنایا۔ مگر یہ اس کے منافی نہیں کہ خانہ کعبہ ان سے پہلے بھی موجود تھا اس لئے کہ قرآن شریف اور احادیث سے اور خود تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ یہ دنیا میں خدا تعالےٰ کی عبادت کا سب سے پہلا گھر ہے دیکھو ۵۰۶ پس چونکہ ہدایت و رشد کے اول معلم حضرت آدم ہیں۔ اول مرتبہ یہ انہی کے ہاتھ سے بنا۔ اور دوسری

خانہ کعبہ پانچ مرتبہ بنایا گیا۔ — مرتبہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے اس کو بنایا تیسری مرتبہ قریش نے آنحضرت صلعم کی بعثت سے کچھ پہلے اسے بنایا جب حجر اسود سرور عالم نے نصب فرمایا۔ اس کے بعد دو دفعہ پھر یہ بنایا گیا ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے بنایا اور ایک دفعہ حجاج نے گویا کل پانچ مرتبہ بنایا گیا دو دفعہ آنحضرت صلعم سے پیشتر اور دو دفعہ آپ سے بعد اور ایک دفعہ آپ کی زندگی میں جیسے معمار خانہ کعبہ کو ملے ایسے

خانہ کعبہ بنانے والے مزدور — کبھی کسی اور گھر کو نہیں ملے بیت المقدس کو حضرت سلیمان نے بنوایا مگر جس طرح حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل اور محمد رسول اللہ جیسے پاک اور فخر بنی نوع انسانوں نے خود کعبہ کے بنانے میں مزدوروں کا کام کیا۔ ایسے مزدور نہ بیت المقدس کو نصیب ہوئے اور نہ کسی اور گھر کو۔

سلم — ۱۶۳ مسلمین۔ مسلم کا تثنیہ ہے۔ اسلام کے معنی کے لئے دیکھو ۱۴۴ مسلم اس لئے مسلم کہلاتا ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے لئے اپنے آپ کو سپرد کر دیتا ہے یا شیطان کی غلامی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یا حق کا پورا پورا فرمانبردار ہو جاتا ہے (غ) +

اُمم — اُمَّۃ۔ اُمّ کے معنی ماں ہیں مگر اس کا استعمال بہت وسیع ہے یعنی ہر ایک چیز کو جو کسی شے کے وجود یا تربیت یا اصلاح

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک کرے بیشک تو غالب حکمت والا ہے ۱۲۴

اُمّة یا آغاز کے لئے بطور اصل ہو اُمّ کہا جاتا ہے اور اُمّة کے معنی ہیں ہر ایک جماعت جن کو ایک امر جمع کرے خواہ ایک دین ہو یا ایک مکان یا ایک زمانہ اور خواہ یہ امر جامع تسخیر سے ہو یا اختیار سے (غ) جمع اُمم ہے اصطلاح شریعت میں اُمّة وہ ہے جسے ایک دین ایک جماعت بنائے +

روية اَرِ رُؤیة کا لفظ صرف آنکھ سے ادراک پر نہیں بلکہ وہم و تخیل یا تفکر یا عقل کے ساتھ ادراک پر بھی آتا ہے (غ) +

نسك منسك مناسِك ـ مَنْسِكْ اور مَنْسَكْ کی جمع ہے ـ اور نُسُكْ کے اصل معنی عبادت یا بہت عبادت ہیں اور مناسك بالخصوص اعمال حج پر بولا جاتا ہے ـ کیونکہ ان میں عبادت کے لئے معمولی حالت سے بہت کچھ بعد اختیار کرنا پڑتا ہے ـ اور مَنْسَكْ

نسيكة وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور اس کا قرب تلاش کیا جائے اور نَسِيكة ذبیحہ کو کہتے ہیں اور نہایہ میں ہے کہ نُسُكْ وہ امور ہیں جن کا شریعت حکم دیتی ہے اور ورع وہ جن سے وہ روکتی ہے +

اُمّة مسلمة اس دعا میں دو امور کی طرف اشارہ ہے ایک اُمّة مسلمة کی طرف کہ یہ حضرت ابراہیم کی دعاؤں کے پورا کرنے والی ہے ـ اور یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں ایک ہی اُمت مسلم کہلائی گو سب انبیاء اللہ مسلم ہی تھے ـ ہاں جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت مسلمان معدودے چند آدمی تھے جو گھروں سے بھاگ کر دوسری جگہ پناہ گزین ہوئے تھے ـ اور دشمن ان کو چاروں طرف سے تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے ـ پس اس آیت کے نزول کے وقت یہ ایک پیشگوئی تھی ـ آج خدا کے فضل سے وہ اُمّة مسلمة چاروں طرف دنیا میں پھیلی ہوئی ہے ـ دوسرے یہاں یہ بتایا

اعمال حج ابراہیم کے قائم کردہ ہیں کہ اعمال حج حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل کے ذریعہ سے قائم کئے گئے ـ یہ اعمال حج ہزارہا سال سے آج تک وہی چلے آتے ہیں پس یہ مشرکانہ رسوم نہیں بلکہ موحدین کے جد اعلیٰ کے قائم کردہ ہیں +

زکا ـ تزکیة ۱۲۴ یُزَکِّیْ ـ زکا کھیتی پر بولا جاتا ہے جب اس میں نمو اور برکت حاصل ہو ـ اور تزکیة نفس کا خیرات اور برکات سے بڑھانا ہے ـ اور فعل تزکیہ کبھی بندہ کی طرف منسوب ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کے لئے اکتساب کرتا ہے جیسے قد افلح من زکّٰىها (الشمس ۹۱ ـ ۹) اور کبھی خدا کی طرف کیونکہ فی الحقیقت وہی مزکی ہے ولٰکن اللہ یزکّی من یشاء (النور ۲۴ ـ ۳۱) اور کبھی نبی کی طرف اس لئے کہ وہ واسطہ ہوتا ہے یعنی اس کی باتوں اور اس کے نمونہ سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے جیسے یہاں +

اعلام اور تعلیم میں فرق یعلّم ـ اعلام اور تعلیم میں یہ فرق ہے کہ اِعلام اخبار سریع کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جلدی سے یا ایک دفعہ ایک بات کا علم دے دینا اور تعلیم میں تکرار اور تکثیر پائی جاتی ہے یہاں تک کہ اس سے متعلم کے نفس پر اثر باقی رہ جائے اور بعض نے کہا ہے کہ تعلیم یہ ہے کہ معانی کے تصور کے لئے نفس کو آگاہ کیا جائے (غ) اور یہاں

تعلیم کتاب تلاوت سے الگ رسول کا کام ہے ـ کتاب کے پڑھ دینے سے تعلیم کو الگ کرکے بتا دیا کہ تعلیم کتاب سے مراد اس کے معانی پر آگاہ کرنا ہے اور یہ رسول کے کاموں میں سے ایک کام ہے کہ وہ مومنوں کو کتاب کے معانی سمجھائے اور اس کی تشریح کرے جن لوگوں نے رسول کا کام صرف کتاب کا پڑھ دینا سمجھ لیا ہے انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے +

حکیم حکمة حکمة ـ حکم سے ہے جس کے اصل معنی ہیں اصلاح کے لئے روک دینا ـ اور حِکمة کے معنی ہیں علم و عقل سے حق کو پالینا (غ) یہاں حکمة سے مراد سنت ـ معرفت دینی ـ فقہ لی گئی ہے (ج) یہ ظاہر ہے کہ حِکمة کتاب سے علٰحدہ کوئی چیز ہے

١٦
ع
١٦

١٣٠ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ
اور کون ابراہیم کے مذہب سے منہ موڑتا ہے سوائے اس کے جس نے اپنے آپ کو احمق بنایا اور یقیناً ہم نے

اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○
اسے دنیا میں برگزیدہ کیا اور بیشک وہ آخرت میں اچھے لوگوں میں سے ہے ١٦٥

ملت ابراہیمی کا عملی اور اعتقادی حصہ الاصول

اور اسکی تعلیم بھی رسول دیتا ہے اور وہ چیز وہی ہے جس کو سنت کہا جاتا ہے یعنی تفصیلات شریعت کیونکہ دوسری وہی چیز ہے جسکی تعلیم رسول دیتا ہے +

عِزّۃ۔العزیز

العزیز۔ اسمائے الٰہی میں سے ہے عِزّۃ انسان کی وہ حالت ہے جو اسے مغلوب ہونے سے بچاتی ہے پس العزیز وہ ہے جو غالب ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں +

دعائے ابراہیم

حضرت ابراہیم کی اسی دعا کی طرف جو اس آیت میں مذکور ہے اشارہ کرتے ہوئے نبی کریم صلعم نے فرمایا انا دعوۃ ابی ابراھیم۔ میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں یعنی اس دعا کی قبولیت میرے ذریعہ ظاہر ہوئی ہے۔ اس دعا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح بعض وقت اللہ تعالیٰ ایک دعا کا اثر ہزار ہا سال بعد ظاہر کرتا ہے۔ اس میں یہ سبق ہے کہ دنیا کی بہبودی اور بہتری ایک دن کا کام نہیں۔ بڑے کام ایک لمبے وقت کو چاہتے ہیں +

دعا کا اثر

امت مسلمہ اور تزکیہ کا ذکر پیشگوئی کے طور پر

قرآن کریم نے یہ دعا دنیا کو اس وقت یاد دلائی جب ابھی نہ اُمت مسلمہ کا وجود تھا۔ اور نہ اس اُمت مسلمہ کی تعلیم و تزکیہ کا۔ صرف چند مسلمان تھے جن کی جانیں معرض خطر میں تھیں۔ اور سارا جزیرہ نمائے عرب کفر و شرک فسق و فجور سے بھرا ہوا تھا۔ اور پھر یہ دعا کس طرح پوری ہوئی کہ نہ صرف سارا عرب ہی اُمت مسلمہ بنا بلکہ یہ اُمت مسلمہ دنیا کے سارے ملکوں میں پھیلی۔ اور ان کا ایسا تزکیہ ہوا کہ پھر یہ دنیا کے مزکی بنے اور ان کو ایسی تعلیم کتاب و حکمت دی گئی کہ پھر یہ دنیا کے معلم بنے جیسا کہ آگے اسی مطلب کو ظاہر کرنے کے لئے فرمایا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا یعنی رسول اللہ صلعم کی تعلیم اور تزکیہ کا یہ نتیجہ ہے کہ تم دنیا کے معلم اور مزکی بننے کے اہل ہو گئے ہو اور اس لئے ہم نے تم کو دوسرے لوگوں کا پیشرو بنایا ہے +

رسول کے چار کام

یہاں رسول کے چار کام بیان فرمائے ہیں۔ اول ان آیات کی تلاوت اپنی اُمت پر کرتا ہے جو اس پر نازل ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ کتاب جو اس پر نازل ہوتی ہے اپنے پیروؤں کو سکھاتا ہے۔ تیسرے ان کو حکمت سکھاتا ہے یعنی وہ باریک باتیں جو اس پر وحی خفی سے ظاہر ہوتی ہیں۔ چوتھے وہ ان کے لئے نمونہ بن کر اور اپنی قوت قدسی سے ان کو آلائشوں سے پاک کرتا ہے جو شخص یہ چار کام نہیں کرتا وہ رسول نہیں۔ ہاں علمائے ربانی اور اُمت کے لوگ بھی ایک رنگ میں یہ کام کرتے ہیں مگر وہ رسول صلعم پر جو آیات نازل ہوئیں ان کی تلاوت کرتے ہیں اور رسول پر نازل شدہ کتاب کی تعلیم دیتے ہیں ان کی حکمت بھی رسول سے مستعار ہے اور ان کی قوت قدسی اسی رسول متبوع سے حاصل کی جاتی ہے +

علمائے ربانی

رغب

١٦٥ یرغب۔ رغب کا اصل مفہوم کسی چیز میں وسعت ہے اور رغبۃ رغبی رغب ارادہ میں وسعت ہے۔ رغب کا صلہ الی یا فی ہو تو مراد اس چیز کی خواہش اور آرزو ہوتی ہے جیسے انا الی ربنا راغبون (القلم ۳۲) میں اور صلہ عن ہو تو مراد اس سے خواہش اور ارادہ کا پھر جانا ہوتا ہے جیسے یہاں (غ) +

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ ۱۳۱ ۱۳۲

جب اس کے رب نے اسے کہا فرمانبردار ہو کہا میں جہانوں کے رب کا فرمانبردار ہوا[۱۶۶] اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو یہی وصیت کی

بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝

اور یعقوب نے (بھی) اے میرے بیٹو! بیشک اللہ نے یہ دین تمہارے لئے چن لیا ہے پس نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم فرمانبردار ہو[۱۶۷]

سفہ — سفہ نفسہ۔ سفہ جسمانی ہلکاپن پر بولا جاتا ہے۔ اور کم عقلی کی وجہ سے جو ہلکاپن نفس میں پیدا ہوتا ہے اس پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ سَفِہ لازمی ہے اور سَفِہ نَفْسَہ اصل میں سَفِہ نفسُہ تھا دغ، یا نَفْسَہ بطور تمیز ہے۔

صفو۔ اصطفاء — اصطفینا۔ اصطفیٰ کا اصل صفو ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا ملاوٹ سے پاک ہونا اور اصطفاء کے معنی ہیں ایک چیز کے خالص حصہ کو لینا۔ اللہ تعالیٰ کا اصطفا دو طرح پر ہے ایک ملاوٹ اور کھوٹ سے پاک رکھنا۔ دوسرے چن لینا اور برگزیدہ کرنا۔

مصطفیٰ — ہمارے نبی کریم صلعم کا نام مصطفیٰ ہے کیونکہ آپ کو تمام کھوٹوں اور ملاوٹوں سے پاک پیدا کیا گیا۔

فیصلہ کیلئے ملت ابراہیمی کا اصل — چونکہ حضرت ابراہیم کا تقدس بہت سی قوموں میں مسلم تھا اس لئے اب ملت ابراہیمی کے اصل الاصول کو بیان کیا اور بتایا کہ اس کو ایک امر مشترک کے طور پر قبول کرلو تو مذہبی جھگڑا آسان ہو جاتا ہے اور اس کو رد کرنا خود اپنے مذہب کے اصل الاصول کے خلاف چلنا ہے۔

عملی اصول — [۱۶۶] پہلے ملت ابراہیمی کا اصل عملی رنگ میں بیان کیا اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا کامل فرمانبردار ہو جو احکام الٰہی ہوں ان کے خلاف دنیا کے کسی مال عزت۔ شہرت آرام جان تک کی پروا نہ کرے۔ اسلام یعنی فرمانبرداری کے ساتھ ربوبیت عالمین، کا ذکر اس بات کے بتانے کے لئے ہے کہ وہ فرمانبرداری مخلوق خدا کی بھلائی کے لئے ہے۔ گویا جس خیال کو ایک جگہ اسلم وجہہ للہ وھو محسن سے ظاہر کیا ہے۔ اسی کی طرف یہاں اسلمت لرب العالمین میں اشارہ کیا ہے۔

مسلم کا مقام بلند — اسلام جس کو یہاں ملت ابراہیمی کا عملی اصل الاصول قرار دیا گیا ہے کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی وہ کامل فرمانبرداری جس کو اسلام کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے اس امر کی مقتضی ہے کہ انسان کسی اور چیز کے آگے نہ جھکے خواہ دنیوی مال وعزت کا لالچ ہو خواہ خدا کے نیچے کسی دوسری طاقت کا خوف۔ سارے لالچوں اور ساری مشکلات کے ہوتے ہوئے اپنے فرض کا بجا لانے والا حقیقی معنی میں مسلم ہے۔ اور یہی اعلیٰ سے اعلیٰ مقام ہے جس پر انسان کھڑا ہو سکتا ہے۔

وصیۃ — [۱۶۷] وصّی۔ وصیۃ کے معنی ہیں دوسرے کے سامنے کوئی بات پیش کرنا جس پر وہ عمل کرے اس کو وعظ کے ساتھ ملاتے ہوئے (غ)، اصل معنی کے لحاظ سے یہ ضروری نہیں کہ حالت احتضار میں یا بستر مرگ پر بات کہی جائے۔

یعقوب — یعقوب حضرت ابراہیم کے پوتے اور حضرت اسحاق کے بیٹے کا نام ہے۔ ان کا دوسرا نام اسرائیل ہے۔ بائبل میں ہے کہ حضرت اسحاق کے ہاں عیسو اور یعقوب توام پیدا ہوئے اس طرح کہ یعقوب کا ہاتھ عیسو کی ایڑی پر تھا اس لئے ان کا نام یعقوب ہوا۔ اسحاق کے ساتھ جو برکات کے وعدے تھے وہ صرف یعقوب کی نسل میں پورے ہوئے اور بنی اسرائیل یعقوب کی ہی اولاد ہیں۔

ابراہیم کا توحید پر قایم ہونا — اس میں یہی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حضرت ابراہیم کیسے توحید الٰہی کے شیدا تھے کہ یہی وصیت انہوں نے اپنے بیٹوں کو کی اور ایسا ہی ان کے خاندان میں یہی اثر چلا یہاں تک کہ یعقوب نے بھی اپنی اولاد کو یہی نصیحت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ

۱۳۳ أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُوا

یا کیا تم موجود تھے جب یعقوب کے سامنے موت آئی جب اس نے اپنے بیٹوں کو کہا۔ کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟ انہوں نے کہا

نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ○

ہم تیرے خدا کی عبادت کرینگے اور تیرے بڑوں ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق کے خدا کی جو ایک ہی خدا ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں [۱۶۸]

۱۳۴ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○

یہ ایک جماعت ہے جو گزر چکی ان کیلئے ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لئے ہے جو تم کماتے ہو اور اسکے متعلق تم سے باز پرس نہ کیجائیگی جو وہ کرتے تھے [۱۶۹]

۱۳۵ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ○

اور کہتے ہیں یہودی ہو جاؤ یا عیسائی تم ہدایت پالوگے کہو بلکہ (ہم) ابراہیم کے مذہب پر ہیں) جو بہت رو تھا اور وہ شرک کرنیوالوں میں سے نہیں تھا [۱۷۰]

وصیت انبیاء بھی دین کے لئے ہوتی ہے۔ — انبیاء کی وصیت بھی امور دینی کے متعلق ہوتی ہے۔ یہ برگزیدہ وجود دنیا میں نیکی قائم کرنے آتے ہیں وہی ان کا ترکہ اور وہی ان کا ورثہ ہوتا ہے مال و دولت کا ورثہ نہیں چھوڑتے اسی لئے مخبر صادق نے فرمایا ماترکناہ صدقۃ +

اب۔ اٰبآء — **۱۶۸** اٰبآء۔ اب کی جمع ہے اور وہ والد ہے مگر اُمّ کی طرح اَبْ کا استعمال بھی ہر ایک اس چیز پر ہوتا ہے جو کسی چیز کے وجود میں لانے یا اصلاح یا ظہور کا باعث ہو (غ) اور چچا اور باپ کو اکٹھے اَبَوَین کہہ دیتے ہیں اسی طرح باپ اور دادا کو بھی اور باپ اور ماں کو بھی۔ یہاں حضرت اسمٰعیل کو جو یعقوب کے چچا تھے آباء میں شامل کیا ہے +

اسحاق — اسحاق۔ حضرت ابراہیم کے دوسرے بیٹے کا نام ہے جو حضرت سارہ کے بطن سے تھے +

جوارح کی عبادت — یہاں عبادت کا لفظ اختیار کیا جو اسی عملی اصل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ عبادت خود عمل سے ہے اور اصلی عبادت جوارح کی عبادت ہی ہے +

خلی — **۱۶۹** خلت۔ جب زمانہ کے لحاظ سے خلی بولا جائے تو اس سے مراد ہوتی ہے مضی و ذھب یعنی وہ گزر چکا (غ) گویا دنیا سے ان کا تعلق منقطع ہو چکا اور وہ خدا سے جاملے +

انبیاء سب ایک امت ہیں — یہاں ان سب انبیاء اور برگزیدوں کو ایک اُمت کہا ہے۔ کیونکہ وہ سب ایک ہی طریق کے پیرو تھے۔ گو شرائع کی فروعات میں اختلاف ہو۔ مگر یہاں چونکہ عملی اصل الاصول اسلام کا ذکر ہے اور سب انبیاء یقیناً اس اصول پر قائم تھے۔ اس لئے ان کو ایک اُمت کہا ہے۔ اور یہ کہکر کہ یہ اُمت گزر چکی بتایا ہے کہ ان کے اعمال اب تم کو فائدہ نہیں دے سکتے گو تم ان کی اولاد ہو +

حنف جنف — **۱۷۰** حنیفاً۔ حنف سے ہے جس کے معنی ہیں گمراہی سے استقامت کی طرف مائل ہونا (غ) اس کے خلاف جنف ہے جس کے معنی ہیں

حنیف — استقامت سے گمراہی کی طرف مائل ہونا پس حنیف وہ ہے جو استقامت کی حالت پر قائم ہے۔ نہ افراط کی طرف جھکتا ہے نہ تفریط کی طرف +

ملت ابراہیمی کا اعتقادی اصل — ملت ابراہیم کے عملی اصل الاصول کا ذکر کرنے کے بعد اب اعتقادی اصل الاصول کا ذکر کرتا ہے۔ اور پہلے مخالفوں کا قول نقل کرتا ہے کہ یہود تو کہتے ہیں کہ اعتقادات یہود کو قبول کرنے سے ہدایت ملتی ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی مذہب کے اعتقادات کو قبول کرنے سے ہدایت ملتی ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ نہیں تم دونوں شرک کی طرف جھک گئے ہو۔ اصل الاصول ملت ابراہیمی کا یہی ہے کہ شرک سے اجتناب کلی ہو پس اعتقادی رنگ میں مذہب کی بنیاد یہ قرار دی جائیگی کہ خدا تعالیٰ کی توحید کو ہر قسم کے شرک کی آمیزش سے خالص کر کے قبول کیا جاوے

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۱۳۶

تم کہو ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس پر جو ہماری طرف اُتارا گیا اور اس پر جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اسکی اولاد

وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ

کی طرف اُتارا گیا اور اس پر جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور اس پر جو نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی میں تفریق

بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۱۳۷

نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں [۱۷۱] پس اگر وہ ایمان لائیں اس کی مثل جو تم ایمان لائے تو یقیناً انہوں نے ہدایت پالی

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

اور اگر پھر جائیں تو وہ صرف مخالفت پر ہیں پس اللہ ہی ان کے مقابلہ میں تیرے لئے کافی ہوگا اور وہ سننے والا جاننے والا ہے [۱۷۲]

سِبط - اسباط

[۱۷۱] اسباط - سِبط کی جمع ہے جس کے معنی قبیلہ ہیں یعنی وہ لوگ جو ایک آدمی کی نسل سے ہوں - یہ لفظ بالخصوص اولاد اسرائیل پر بولا گیا ہے - کیونکہ اسرائیل کے بارہ بیٹوں میں سے ہر ایک ایک قبیلہ کا جد بنا ✦

تفریق

نفرق - تفریق - فرق سے تکثیر کے لئے ہے انبیاء میں تفریق نہ کرنے سے یہ مراد کہ بعض کو مانا جائے بعض کو نہ مانا جائے مطلب یہ نہیں کہ سب کا مرتبہ یکساں ہے کیونکہ اس کے خلاف فضلنا بعضھم علیٰ بعض (۲۵۳) موجود ہے ✦

احد نفی میں لفظ اَحَد جمع کا فائدہ دیتا ہے اس لئے تفریق کو احد کی طرف منسوب کیا گیا ✦

جامعیت مذہب اسلام

اس آیت میں نہ صرف مذہب کے اصل الاصول ایک اللہ پر ایمان کا ذکر کیا ہے بلکہ سچے اور کامل مذہب کی جامعیت کا ذکر بھی کیا ہے اور اس کی غرض یہی ہے کہ یہ اصل الاصول ایک خدا پر ایمان ملت ابراہیمی کا ہی نہیں بلکہ دنیا میں جس قدر بھی نبی ہوئے سب کے مذہب کا اصل الاصول یہی تھا اس لئے ایک مسلمان سب انبیاء پر ایمان لاتا ہے - کیونکہ وہ سب ایک ہی اصول پر قائم تھے اور ایک ہی غرض کو پورا کرنے آتے تھے - یہاں اول تو چار بڑے انبیاء کا ذکر کیا یعنی ابراہیم - اسمٰعیل - اسحاق یعقوب - پھر سب انبیائے بنی اسرائیل کا مجمل ذکر اسباط کے لفظ میں کیا - پھر یہود کے سب سے بڑے نبی موسیٰ کا ذکر کیا پھر عیسائیوں کے نبی عیسیٰ کا ذکر کیا - اور ان سب کے بعد ما اوتی النبیون کہکر یہ بتا دیا کہ سلسلہ ابراہیمی یا سلسلہ موسوی کے سوائے اور بھی دنیا میں نبی ہوئے ہیں انکی بھی یہی تعلیم اصلی تھی ان کو بھی ہم انبیائے برحق مانتے ہیں - اور یوں جو ابتدائے سورۃ میں فرمایا تھا کہ اس پر ایمان لائیں جو تجھ سے پہلے اُتارا گیا اس کی تشریح خود ہی فرما دی کہ اس سے مراد وہ کلام ہے جو انبیاء پر نازل کیا گیا خواہ وہ ایک قوم کے نبی ہوں یا دوسری کے ✦

دنیا کے کل نبی ایک ہی مذہب پر تھے۔

ما انزل من قبلک کی تفسیر

شق - شِقّۃ

شقاق

شِق

[۱۷۲] شقاق - شَقّ سے ہے یعنی شگاف جو کسی چیز میں ہو شققنا الارض شقا (عبس - ۲۶) اور شِقّۃ اس ٹکڑے کو کہا جاتا ہے جو الگ ہو جائے اور اسی سے شقاق بمعنی مخالفت ہے - گویا شقاق میں شِقّ مخالف اختیار کر لی ہے - اور شِق بمعنی مشقت بھی آتا ہے الا بشق الانفس (النحل - ۷)

کفایۃ

سیکفیکھم اللہ - کفایۃ کے معنی ہیں مشکلات کا سدباب کر دینا اور کسی معاملہ میں مراد کو پہنچ جانا - اور اس

۱۳۹ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا

اللہ کا رنگ اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں ۱۷۳ کہو کیا تم اللہ کے بارہ میں ہم سے

فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝

جھگڑتے ہو اور وہ ہمارا رب اور تمہارا رب ہے اور ہمارے لئے ہمارے عمل اور تمہارے لئے تمہارے عمل ہیں اور ہم اسی کیلئے اخلاص رکھنے والے ہیں ۱۷۴

جملہ کے معنی ہیں کفاک اللہ شرھم یعنی اللہ ان کی شرارتوں سے بچا کر تمہیں مراد کو پہنچائے گا اور ان کی مخالفت تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی ۔

اسلام کسی بزرگ کو جھوٹا نہیں کہتا — یہاں یہ بتایا کہ ایسے صاف اور جامع مذہب پر ایمان نہ لانے والے وہی لوگ ہوں گے جو حق کے دشمن ہیں ۔ کیونکہ اس مذہب کو مان لینا جو دنیا کے سارے انبیاء کو راستباز ٹھہراتا ہے ۔ عین اقتضائے عقل و انصاف ہے ۔ اور یہ مذہب کسی بزرگ کو جھوٹا اور مفتری قرار نہیں دیتا ۔ اگر یہ سیدھی سیدھی بات نہ مانیں تو سمجھ لو کہ صرف حق کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں مگر ان کی مخالفت کی پروا نہ کرو ان کی شرارتوں سے خدا تعالیٰ تم کو محفوظ رکھے گا ۔

صبغۃ — **۱۷۳** صبغۃ ۔ صِبْغَۃ اصل میں رنگ کو کہتے ہیں ۔ اور یہاں مراد دین ہے ۔ کیونکہ جس طرح رنگ کا اثر کپڑے پر ہوتا ہے اسی طرح مذہب کا اثر انسان پر ہوتا ہے ۔ بعض نے اس کے معنی فطرت کئے ہیں ۔ اور مفردات میں ہے کہ صبغۃ اللہ میں اشارہ اس چیز کی طرف ہے جو انسانوں میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے یعنی عقل جس سے بہائم سے ان کی تمیز ہوتی ہے ۔ اور تاج العروس میں صبغۃ کے معنی دین دیئے ہیں اور رہ ایک وہ راہ جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو ۔ اور قرآن شریف میں وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (المومنون ۲۳ ۔ ۲۰) آتا ہے جہاں مراد سالن ہے ۔ اور عیسائیوں کے بپتسمہ کو یعنی جو وہ بچے کو پانی میں غوطہ دیتے ہیں ۔ صبغۃ یا اصطباغ کہا جاتا ہے (غ) ۔

صبغ
اصطباغ

دین اسلام کا مقابلہ عیسائی بپتسمہ سے — یہاں دین الٰہی کا جس کو رنگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے لفظ صبغۃ اختیار کر کے عیسائیوں کے اصطباغ سے گویا اشارۃً مقابلہ کیا ہے کہ ایک طرف خدائی بپتسمہ یعنی دین الٰہی یا دین اسلام ہے جس کو لینے سے انسان کل انبیائے عالم کو راستباز قرار دیتا ہے اور دوسری طرف ایک انسانی بپتسمہ یعنی عیسائی مذہب ہے جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ سوائے مسیح کے دنیا میں کوئی راستباز نہیں یہ گویا سب کو جھوٹا قرار دیتا ہے ۔ ایسا مذہب دنیا میں کبھی غالب نہیں ہو سکتا صبغۃ اللہ میں نصب یا تو اس لئے ہے کہ یہ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ الآیۃ میں اٰمَنَّا کے لئے مصدر مؤکد ہے ۔ یا اس لئے کہ تحریص ولانے کے لئے ہے اور بعض نے اس کو ملۃ ابراہیم سے بدل کہا ہے ۔

خالص اور صافی — **۱۷۴** مخلصون ۔ خالص اور صافی یکساں ہیں یعنی کھوٹ وغیرہ سے پاک ۔ مگر صافی ابتدا سے ہی ایسا ہے اور خالص جو بعد میں صاف ہو جائے (غ) مسلمانوں کا اخلاص یہ ہے کہ وہ یہودیوں کی تشبیہ سے اور نصاریٰ کی تثلیث سے بری ہیں (غ) اور دوسری جگہ فرمایا مخلصین لہ الدین (البینۃ ۹۸ ۔ ۵) گویا فرمانبرداری کو اس کیلئے خالص کرنیوالے یہی معنی یہاں ہیں یعنی ایمان اور طاعت دونوں کو اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کرنے والے اور ہر قسم کے

دن
مخلص

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرٰهٖمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا ۱۴۰

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد یہودی یا

أَوْ نَصٰرٰى قُلْ ءَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللّٰهُ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهٰدَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ

عیسائی تھے کہو کیا تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ اور اس سے بڑا ظالم کون ہو جو اس شہادت کو چھپاتے جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے

وَمَا اللّٰهُ بِغٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ ۱۴۱

اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو ۱۷۵ یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی ان کیلئے ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لئے

مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْـَٔلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ ع

ہے جو تم نے کمایا اور تم سے اسکے متعلق باز پرس نہ ہوگی جو وہ کرتے تھے ۱۷۶

کھوٹ اور آمیزش سے پاک رکھنے والے +

خدا کی ربوبیت کی وسعت

دنیا میں ہر ایک قوم اللہ تعالیٰ کی روحانی ربوبیت کو اپنے تک محدود کرتی ہے مگر اسلام اس خدا کو پیش کرتا ہے جو ربنا و ربکم ہے یعنی ہم جو مسلمان ہیں وہ ہماری ربوبیت بھی فرماتا ہے۔ اور عیسائی اور یہودی جو مسلمانوں کی مخالفت کر رہے ہیں ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وہ تمہارا بھی رب ہے۔ یہ گویا رب العالمین کی کھلی تفسیر کر دی اور ایک مسلمان کو سمجھا دیا کہ جو تمہارے دشمن ہیں جو تمہارے دین کے مخالف ہیں ان کا رب بھی وہی خدا ہے پس جب اللہ تعالیٰ ان کی بھی ربوبیت فرماتا ہے اور ایک مسلمان جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے یعنی صفات الٰہی کو اپنے اندر لینے کی کوشش کرتا ہے اور جس کا مذہب تخلق باخلاق اللہ ہے اس کے لئے بھی ضروری ہوا کہ وہ اپنے قلب میں اس قدر وسعت پیدا کرے کہ اس میں اپنے دشمنوں کے لئے بھی سچی ہمدردی اور خیر خواہی موجود ہو۔ یہ نہایت ہی مشکل مقام ہے۔ مگر ربنا و ربکم کی تعلیم دینے والی کتاب اسی مقام پر مسلمانوں کو پہنچانا چاہتی ہے اور یہی نقشہ نبی کریم صلعم کی زندگی میں اور صحابہ کی زندگی میں نظر آتا ہے کہ کس طرح عملی طور پر دشمنوں سے محبت اور پیار کر کے دکھایا اور کس طرح ان کے سارے مظالم پر یکسر قلم پھیر دیا۔ لنا اعمالنا و لکم اعمالکم میں بتایا کہ اصل کامیابی تو اعمال سے ہے پس تم بھی اچھے عمل کرو مگر یاد رکھو کہ خالص نیکی کی راہیں صرف اسلام میں ہی ہیں اور وہ قوم جس کے اعمال صرف خدا کے لئے ہوں ضرور کامیاب ہو جاتی ہے۔ چونکہ ایمان سے عبادت اور عمل پیدا ہوتے ہیں۔ اسلئے یہ ذکر بھی کر دیا +

مسلمانوں کو تعلیم کہ اپنے دشمنوں سے ہمدردی کریں۔

کفارہ مسیح اور انبیائے سابق۔

۱۷۵ قرآن کریم نے یہاں یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ الزام دیا ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ یہ پہلے نبی یہودی یا عیسائی تھے یعنی ان خاص عقاید کے پیرو تھے جن کی تعلیم تم دیتے ہو۔ یہ واقعات پر مبنی ہے۔ آج بھی عیسائی کہتے ہیں کہ یہ پہلے انبیاء کفارہ مسیح پر ایمان لاتے تھے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ نجات یافتہ نہیں ٹھہر سکتے اس سے بڑھکر کیا ظلم اور کیا اخفائے شہادت ہے کہ تمام انبیاء کی اصولی تعلیم یہ جو خدائے واحد پر ایمان اور اعمال صالحہ کا بجا لانا ہے یوں پردہ ڈالا جائے یہی حالت یہود کی تھی کہ وہ بھی بوجہ انبیاء کی اولاد ہونے کے اپنے آپ کو اعمال سے مستغنی خیال کرتے تھے +

۱۷۶ ایمان صحیح سے ہی چونکہ عمل خالص پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے پھر وہ دہرایا کہ گزشتہ لوگوں کے اعمال تمہارے کام نہ آئینگے +

رکوع ۱۷ ع ۱ جواب اعتراضات قبلہ

۱۴۲ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ

بیوقوف لوگ بول اُٹھیں گے کس چیز نے انکوان کے قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ تھے کہو

۱۴۳ لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ

مشرق اور مغرب اللہ کا ہی ہے وہ جسے چاہتا ہے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے ۱۷۷ اور اسی طرح ہم نے تمہیں

قبلہ

۱۷۷ قبلة - مقابلة سے لیا گیا ہے۔ اور اصل میں اس خاص حالت کا نام ہے جس پر سامنے کھڑا ہونے والا ہو (غ) چنانچہ دو آدمی جو ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوں ان میں سے ہر ایک دوسرے کا قبلہ کہلائیگا۔ (ج) اور اس کے مقابل دبرۃ ہے جو پیٹھ کی طرف کی چیز کو کہتے ہیں۔ اور عرف میں اس مکان مقابل کا نام ہو گیا ہے جس کی طرف نماز میں منہ ہو۔

تحویل قبلہ

یہاں سے وہ مضمون شروع ہوتا ہے جو تحویل قبلہ کے نام سے موسوم ہے یعنی بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کا قبلہ قرار دیا جانا اس کا تعلق پچھلے مضمون سے ظاہر ہے۔ کیونکہ وہاں حضرت ابراہیم اور خانہ کعبہ کا ہی ذکر ہے۔ گو الفاظ قرآنی

تحویل قبلہ پر احادیث

کی ہم اور تاویل بھی کر سکیں مگر روایات صحیحہ میں تحویل قبلہ کا کھلا ذکر ہے چنانچہ بخاری میں ہی متعدد روایات طرق مختلفہ سے اس بارہ میں آئی ہیں یعنی حضرت ابن عمر کی روایت عبد اللہ بن دینار کی روایت سے کہ مسجد قباء میں لوگ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے جب ایک شخص نے ان کو اطلاع دی کہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہو چکا ہے اور لوگوں نے حالت نماز میں ہی شام سے مکہ کی طرف منہ پھیر لیا یہ روایت کتاب التفسیر میں امام بخاری نے پانچ مختلف طریقوں سے بیان کی ہے۔ اور براء کی روایت کہ نبی کریم صلعم نے مدینہ میں آکر سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی تب آپ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا۔ یہ بھی دو طریق پر آئی ہے۔ اور حضرت انس کی روایت کہ انہوں نے فرمایا کہ اب ان لوگوں میں سے جنہوں نے دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی میرے سوا کوئی زندہ نہیں رہا اور پھر اس کی مؤید حضرت عمرؓ کی وہ روایت ہے جو واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی کے ماتحت امام بخاری کتاب التفسیر میں لائے ہیں کہ آپ نے فرمایا تین باتوں میں میری رائے کا توافق اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہوا جن میں سے پہلی بات یہ ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ لو اتخذت من مقام ابراھیم مصلی۔ اگر آپ مقام ابراہیم یعنی کعبہ کو مصلی یعنی قبلہ بنائیں۔ پس اس قدر روایات کے ہوتے ہوئے اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نبی کریم صلعم پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے ہجرت کے سولہ یا سترہ ماہ بعد خانہ کعبہ صریح وحی الٰہی کے ماتحت قبلہ قرار پایا۔

تحویل قبلہ دو دفعہ نہیں ہوئی

البتہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تحویل قبلہ دو دفعہ ہوئی وہ صریح غلطی پر ہیں۔ اس کے لئے نہ قرآن میں کوئی دلیل ہے نہ کسی حدیث صحیح میں۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں بھی آنحضرت صلعم بیت المقدس کی طرف ہی منہ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے۔ البتہ وہاں خانہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کو سامنے رکھ لیتے تھے۔ مدینہ میں جب تشریف لائے تو یہ دقت پیش آئی کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے میں خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ ہوتی تھی۔ اس لئے آپکا دل یہ چاہتا تھا جیسا کہ روایات میں صاف آیا ہے کہ آپ کا قبلہ خانہ کعبہ ہو جس کا تعلق حضرت ابراہیم سے تھا۔ مگر چونکہ آپ سے پہلے انبیاء جو گزرے ان کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا اس لئے آپ نے بھی اسی کو قبلہ رکھا یہاں تک کہ وحی الٰہی

وحی الٰہی قلب نبوی سے نہ پھوٹتی تھی۔

سے تحویل قبلہ ہوئی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کا سرچشمہ نبی صلعم کا اپنا قلب نہ تھا۔ ورنہ سولہ سترہ ماہ تک آپ کا دل تو یہ چاہے کہ خانہ کعبہ قبلہ ہو مگر وحی نازل نہ ہو۔ یہ بے معنی بات ہے۔

أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا

ایک اعلیٰ درجہ کا گروہ بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے پیشرو بنو اور رسول تمہارا پیشرو ہو ۱۴۸

ماولّٰھم کے معنی
اس تحویل قبلہ میں کیا راز تھا۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ رہا یہ کہ آیا الفاظ ما ولّٰھم میں اسی تحویل قبلہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ علیحدہ سوال ہے ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے جس پر یہ پہلے تھے یعنی بیت المقدس کس چیز نے پھیر دیا۔ یہ توضیح تحویل قبلہ کا ذکر ہو گیا۔ اور یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو ان انبیاء کے قبلہ سے (جن کا ذکر ابھی نام لے کر ہوا ہے) جس پر وہ انبیاء تھے یعنی بیت المقدس کس چیز نے پھیر دیا جس میں تحویل قبلہ ضروری نہیں ٹھہرتی۔ اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے یعنی خانہ کعبہ کس چیز نے بھگا دیا۔ اور یہ اشارہ ہو گا ہجرت کی طرف کہ جب ان کا قبلہ خانہ کعبہ تھا تو وہاں سے بھاگ کر یوں آئے لله المشرق والمغرب. جو جواب دیا ہے آخری معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا وہاں سے چلا آنا قبلہ ہونے کے منافی نہیں اس لئے کہ مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے وہ ان کو اس قبلہ کا مالک بھی بنا دیگا پہلے دو معنی اختیار کرنے کی صورت میں لله المشرق والمغرب سے یہ مراد ہو گی کہ اللہ کا تعلق تو کسی خاص سمت سے نہیں۔ سب سمتیں اسی کی ہیں۔ اگر ایک زمانہ میں قبلہ بیت المقدس تھا اور اب کعبہ ہے تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہاں یہ ضروری تھا کہ آخری نبی کا قبلہ وہ مقرر کیا جاتا جو دنیا پر خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر تھا اور اسی کی طرف الفاظ صراط مستقیم میں اشارہ ہے یا یہ اشارہ ہو کہ یہ صحیح تعلیم کہ خدا کا تعلق کسی خاص سمت سے نہیں ہم نے مسلمانوں کو دی ہے ۱۴۸

وسط
وسطاً۔ وسط کسی چیز کا درمیان ہے۔ اور بعض اوقات بلحاظ اطراف کے جو افراط و تفریط کو ظاہر کرتی ہیں اعلیٰ اور اشرف چیز کو بھی وسط کہا جاتا ہے (غ) چنانچہ بخاری میں الوسط کے معنی العدل لکھے ہیں اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ محاورہ عرب میں خیار یعنی بہترین لوگ وسط کہلاتے ہیں۔ اور یہاں مراد ایسا گروہ ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہونے کی وجہ سے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچا ہوا ہے ✦

شہداء
شہداء۔ شہید کے معنی کے لئے دیکھو ۳۲۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ شہداء سے مراد ایسے لوگ ہیں جو جس بات کو سنتے ہیں اس کو اپنے دل میں حاضر رکھتے ہیں۔ اور گواہ ہونے سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو علم انہوں نے رسول اللہ صلعم سے حاصل کیا ہے اسے لوگوں کو پہنچائیں۔ اس لحاظ سے شہداء کے معنی مزکی بھی ہو سکتے ہیں اور پیشرو یا امام بھی۔ اور یہاں یہی مراد ہے ✦

قبلہ کے مضمون میں ختم نبوت کی طرف اشارہ
کذٰلك میں اشارہ پچھلی آیت کے مضمون کی طرف ہے یعنی خانہ کعبہ کو جو توحید کا اصل مرکز ہے قبلہ مقرر کرنے میں ہم نے یہ بتا دیا ہے کہ یہ نبی آخری نبی ہے۔ اور اب اسی کے پیرو دنیا میں علم دین کو پھیلانے والے اور دنیا کے حقیقی پیشوا اور امام ہونگے جس طرح رسول اللہ صلعم ان کے پیشوا اور امام ہیں ویکون الرسول علیکم شہیداً کو پیچھے رکھ کر یہ صاف طور پر سمجھا دیا ہے کہ جس قدر نیکی کی تعلیم اور نفوس انسانی کے تزکیہ کرنے والے اب دنیا میں ہوں گے۔ ان سب کے پیشوا اور سردار اور مزکی محمد رسول اللہ صلعم ہوں گے۔ اور یوں وہ سب ایک ہی سردار کے ماتحت ہونے کی وجہ سے

کمالات اُمت محمدیہ
دنیا میں اتحاد قومی اور وحدت انسانی کی بنیاد رکھنے والے ہوں گے۔ اس آیت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے کمالات کی طرف بلکہ کل اُمت محمدیہ کے کمالات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو کام دنیا میں انبیاء علیہم السلام کرتے تھے وہ اب محمد رسول اللہ صلعم کے نام لیوا کرینگے۔ اور یا کذٰلك کہکر یہ اشارہ کیا کہ جس طرح یہ تعلیم کہ خدا کا تعلق کسی خاص سمت سے نہیں۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن

اور ہم نے اسے جس پر تو تھا قبلہ نہ بنایا تھا مگر اس لئے کہ ہم اس شخص کو جو رسول کی پیروی کرتا ہے اس سے

يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ

الگ کر دیں جو اپنی ایڑیوں پر واپس ہوتا ہے اور بیشک یہ ایک بھاری بات تھی مگر نہ ان لوگوں پر جنہیں اللہ نے ہدایت کی ۱۷۹

تاہم ایک قبلہ یعنی سب کا ایک طرف منہ کرنا اتحاد کے لئے ضروری ہے ایک میانہ روی کی تعلیم ہے جو ہم نے تم مسلمانوں کو دی ہے اسی طرح ہر امر میں ہم نے تم کو میانہ روی کی تعلیم دی ہے تاکہ تم ہمیشہ کیلئے دنیا کے پیشرو بنو ✦

تحویل قبلہ کے ذریعہ سے تمحیص

۱۷۹ع وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیہا۔ ان الفاظ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ ہم نے اسے قبلہ نہیں بنایا تھا جس پر تم اب تک تھے مگر اس لئے کہ کھرے کھوٹے کی تمیز ہو یعنی بیت المقدس جو کچھ دیر تک قبلہ رہا اور اس کے بعد اب خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا گیا۔ تو یہ تمحیص کے لئے تھا۔ اور یہاں جعلنا کا مفہوم ایسا ہی ہے جیسے وما جعلنا الرؤیا التی ارینٰک الا فتنۃ للناس (بنی اسرائیل ۶۰) میں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا تھا کہ رویا فتنہ ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم نہ دیا تھا۔ نہ ایسی کوئی وحی قرآن میں موجود ہے نہ کسی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی طرف آپ نے وحی الٰہی کے حکم سے منہ کیا ہو۔ ہاں جب آپ کو مدینہ میں آ کر خانہ کعبہ اور بیت المقدس میں سے ایک کو انتخاب کرنا پڑا تو آپ نے بیت المقدس کی طرف منہ کیا اور کعبہ کی طرف پیٹھ۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایک مدت تک آپکو اسی حالت پر چھوڑ دیا اور وحی الٰہی نازل نہ کی اور اس کی غرض جیسا آگے آتا ہے تمحیص تھی۔ اور دوسرے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ کنت بمعنی صرت لیا جائے یعنی ہم نے اسے جس پر تو اب ہوا ہے قبلہ نہیں بنایا مگر اسی غرض کے لئے اور اس صورت میں مراد خانہ کعبہ ہو گا اور کنت علیہا سے مراد معتقدا لاستقبالہا بھی ہو سکتی ہے یعنی جسکی طرف تمہاری توجہ کا عقد تھا ✦

علم بمعنی تمیز

لنعلم کے معنی تاہم الگ الگ کر دیں کئے گئے ہیں۔ کیونکہ علم بمعنی تمیز بھی آتا ہے خصوصاً جب اس کا صلہ مِنْ ہو جو تمیز کے لئے آتا ہے (ح) اور بعض نے علم بمعنی رویۃ لیا ہے (ج) یعنی تاہم دیکھیں کہ کون ایسا ہے۔ اور کون ایسا۔ اور رویۃ معنی اس لئے صحیح ہیں کہ یہ وہ علم الٰہی ہے جو ایک واقعہ کے ظہور کے بعد ہوتا ہے اور یہ فی الحقیقت رویۃ کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم انسانوں کے متعلق دو قسم کا ہے ایک آئندہ کا علم جب ابھی تمام امور پردہ غیب میں ہیں۔ ایک وہ علم جو اظہار واقعہ کے بعد ہوتا ہے جس پر ایک فعل کے واقعہ ہو جانے کیوجہ سے جزا و سزا مترتب ہوتی ہے۔

علم الٰہی دو طرح پر

ضرورت تمحیص

اس حصہ آیت میں تحویل قبلہ کی غرض بتائی ہے۔ کہ کھرے کھوٹے الگ الگ ہو جائیں۔ ایک سچے دین کو تمحیص کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ تا گریزد ہر کہ بیرونی بود۔ اگر کچے پکوں کے ساتھ ملے رہیں تو دین کی اصل غرض پوری نہیں ہوتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ تمحیص کے لئے بعض واقعات ایسے پیدا کر دیتا ہے۔ یہ تمحیص کوئی چھوٹی سی نہ تھی کہ جب رسول اللہ صلعم مکہ میں تھے تو بیت المقدس قبلہ رہا۔ حالانکہ وہاں مشرک ہی مشرک تھے جو خانہ کعبہ کی عزت کرتے تھے مگر بیت المقدس کی عزت نہ کرتے تھے۔ اور جب مدینہ میں آئے جہاں یہودیوں کا زور تھا تو خانہ کعبہ قبلہ ہوا۔ تاکہ وہی لوگ مسلمان ہوں جن کے دلوں میں صداقت اسلامی مرکوز ہو چکی ہے۔ اور کوئی ابتلا ان کے قدم کو تنزلزل نہیں کر سکتا۔ ایک اور غرض تحویل قبلہ میں یہ بھی تھی۔ کہ قبلہ کوئی پرستش کی چیز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو شروع سے ایک ہی قبلہ ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ

قبلہ پرستش کی چیز نہیں

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝

اور اللہ (ایسا) نہ تھا کہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے بیشک اللہ لوگوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے ع۱۸۰

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ ۱۴۴

ہم یقیناً تیرے آسمان کی طرف توجہ کرنے کو دیکھتے ہیں پس ضرور ہم تجھے اس قبلہ کا متولی بنا دینگے جسے تو پسند کرتا ہے سو تو اپنے منہ

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ

کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے اور جہاں کہیں تم ہو اپنے مونہوں کو اسی کی طرف پھیر دو ع۱۸۱ اور وہ لوگ

توحید کے احکام تو ابتدا میں ہی دیئے گئے پھر خانہ کعبہ کو قبلہ اس وقت بنایا جاتا ہے جب مشکلات کا زمانہ گزر گیا ہے اگر ابتدا میں ہی خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا جاتا تو شاید عرب کے لوگ یہ سمجھ کر بھی ساتھ شامل ہو جاتے کہ کیا حج ہمارے آبائی دین کے ہی یہ ارکان ہیں۔ مگر نہ صرف اس کو ابتدا میں قبلہ قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ مدینہ میں سولہ مہینے اس کی طرف پیٹھ بھی کروائی تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ پرستش کی چیز نہیں ◆

ایمان — قبلہ اصل مقصود نہیں

ع۱۸۰ ایمان کے معنی یہاں حضرت ابن عباس سے بخاری میں صلوٰۃ مروی ہیں یعنی یہ منشاء ہے کہ جو نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں۔ وہ ضائع نہیں ہوئیں۔ کیونکہ نماز تو خدا کی ہے اس کو قبلہ سے کوئی ایسا تعلق نہیں کہ اگر اس طرف منہ کرکے نہیں پڑھی گئی تو نماز ہی نہیں ہوئی۔ اس میں بھی اس غلط خیال کی تردید ہے کہ قبلہ مسلمانوں کی عبادت میں کوئی اصلی مقصود ہے جیسا کہ مخالفین اسلام نے غلطی سے خیال کر لیا ہے۔ ایمان کا لفظ لانے میں بھی یہی اشارہ ہے کہ قبلہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس سے ایمان میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہو ◆

رؤف — رأفۃ

رؤف کے معنی میں اشد درجہ کی رحمت پائی جاتی ہے جو اپنے الطاف کے ساتھ خود ہی اپنے بندوں پر مہربانی کرتا ہے (ل) اور رأفۃ جس سے یہ مشتق ہے رحمت سے زیادہ خاص اور زیادہ رقت والی شے ہے (ل)

تقلب — منہ کا آسمان کی طرف پھیرنا

ع۱۸۱ تقلب وجهك في السماء۔ تقلّب۔ قلب سے ہے اور اس کے معنی بار بار پھیرنا ہیں۔ فی یہاں بمعنی الی ہے وجہ۔ توجہ یا منہ۔ توجہ یا منہ کے بار بار آسمان کی طرف پھیرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرنا یا اس کی طرف سے کسی امر کا انتظار کرنا ہے۔ مگر یہاں مراد اس حکم کا انتظار نہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا جائے۔ کیونکہ وہ حکم نازل ہو چکا۔ اور اس پر اعتراضات کا جواب بھی ہو چکا۔ بلکہ یہ انتظار یا توجہ یا دعا اس لئے ہے کہ خانہ کعبہ جو مشرکین کے قبضہ میں ہے اور جسے اب قبلہ بنایا جاتا ہے کب بت پرستی سے پاک ہوگا اور مسلمانوں کا اس پر کب قبضہ ہوگا ◆

ولی

فلنولّينك۔ ولّيته كذا کے معنی ہوتے ہیں میں نے اسے فلاں چیز کا والی یا متصرف بنا دیا (غ۔ ر) یہی معنی یہاں مراد ہیں۔ منہ پھیرنے کے معنی نہیں اس لئے کہ یہ آیندہ کے متعلق ہے اور منہ پھیرنے کا حکم پہلے ہو چکا۔ (ولّی مصدر تولیۃ کبھی اقبال کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے فول وجهك يالكل وجهة هو موليها یعنی اس طرف متوجہ ہونا اور کبھی انصراف کے معنی ہیں جیسے ثم وليتم مدبرين یا ما ولّٰهم عن قبلتهم

شطر

شطر کسی چیز کے نصف یا وسط کو کہتے ہیں اور یہاں مراد اس کی جہت ہے (غ)

حرام

الحرام۔ حرام کے معنی ہیں الممنوع منه وہ جس سے روکا جائے خواہ بذریعہ تسخیر آلہی ہو جیسے حرام على قرية اهلكنٰها

أُوتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ۝

جنہیں کتاب دی گئی ہے یقیناً جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے سچ ہے اور اللہ اس سے بےخبر نہیں جو وہ کرتے ہیں ۱۸۲

(الانبیاء ۹۵) میں دجہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہی ایسا ہے کہ جن پر موت وارد ہو جائے وہ اس دنیا میں واپس نہیں آسکتے) یا عقل یا شریعت کی رو سے یا کسی حکم کی وجہ سے جس کی اتباع ہوتی ہے یا غلبہ کی وجہ سے

حَرَم — اور حَرَم کو حرم اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے رو سے اس میں بہت سی باتیں ممنوع ہیں جو دوسری جگہ

محروم — کرنی جائز ہیں (غ) اسی مادہ سے محروم ہے گویا وہ شخص جو ایک چیز کے حصول سے روک دیا گیا ہے محروم ہے ؛

المسجد الحرام — المسجد الحرام۔ اس وسیع احاطہ کا نام ہے جس کے اندر خانہ کعبہ ہے۔ یہ احاطہ کوئی دو سو پچاس قدم لنبائی میں اور دو سو قدم چوڑائی میں ہے۔ اور خانہ کعبہ اس کے قریباً وسط میں واقع ہے جو لنبائی میں اٹھارہ قدم اور چوڑائی میں چودہ قدم ہے۔ اور اس کے شمال مشرقی کونہ پر حجر اسود ہے۔ مگر بعض وقت المسجد الحرام کل حَرَم پر بول دیا جاتا ہے جس کے اندر خود مکہ معظمہ اور میدان منیٰ اور عرفات واقع ہیں اور جس کے اندر جنگ کرنا یا ہتھیار اٹھانا یا شکار کرنا یا گھاس وغیرہ (سوائے اذخر کے) کاٹنا منع ہے۔ جیسے لمن لم یکن اهله حاضری المسجد الحرام (۱۹۶) میں یا لا تقاتلوهم عند المسجد الحرام حتی یقاتلوکم فیه (۱۹۱) میں ؛

خانہ کعبہ کی تولیت — خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا۔ مگر کعبہ کے اندر جو توحید کا مرکز تھا بت بھرے ہوئے تھے تو لازماً یہ خیال رسول اللہ صلعم کے قلب مبارک میں پیدا ہوتا ہوگا کہ اس آلایش سے یہ مرکز توحید کب اور کس طرح پاک ہوگا اس لئے اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ ہم تم کو ہی اس قبلہ کا متولی بنائیں گے جسے تم چاہتے ہو۔ اور اس کے بعد جو فرمایا • کہ فول وجهك تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ حکم ابھی ملتا ہے۔ کیونکہ یہ عبارت تو بےمعنی سی ہو جاتی ہے کہ ہم تیرا منہ اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ پس تو بھی اپنا منہ پھیرلے۔ بلکہ اصل مراد اسی خیال کا ازالہ ہے کہ خانہ کعبہ میں بت ہیں تو فرمایا کہ اس وجہ سے مضائقہ نہ کرو۔ کیونکہ ہم تم کو اس کا متولی بنا دیں گے۔ اور یہ مرکز توحید موحدین کے ہاتھ میں ہی رہے گا اس لئے بغیر کسی خیال کو دل میں لانے کے اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیرلو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب خانہ کعبہ کا متولی کوئی غیر مسلم نہیں ہو سکتا ؛

اہل کتاب اور آنحضرت صلعم — ع۱۸۲ اہل کتاب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پوری طرح کھل چکی تھی۔ پیشگوئیاں ان کی کتاب میں موجود تھیں جن کے پورا ہونے کا ابھی تک ان کو انتظار تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسمٰعیل کے ساتھ وعدہ تھا۔ حضرت اسمٰعیل کو عرب میں چھوڑا گیا۔ بیت ایل سوائے عرب کے اور کہیں نہ تھا۔ یعنی خانہ کعبہ کے سوائے کوئی گھر بیت اللہ نہیں کہلایا۔ حضرت ابراہیم کا تعلق اسی گھر سے تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگاریں یہاں موجود تھیں۔ پس جب ابراہیم کی دعاؤں کا موعود نبی آیا تو ضروری تھا کہ اس کا قبلہ بھی کعبہ ہوتا اس لئے بھی کہ وہ جانتے تھے کہ نبی موعود عرب میں ظاہر ہونے والا ہے بلکہ یہی وجہ تھی کہ آنحضرت کی بعثت سے پہلے یہودی ملک عرب میں کثرت سے آکر آباد ہو گئے تھے اور انکی پیشگوئیوں میں اب تک بھی صراحت سے عرب کا نام پایا جاتا ہے چنانچہ یسعیاہ ۲۱ : ۱۳ میں ان الفاظ کے بعد "عرب کی بابت الہامی کلام" آنحضرت صلعم کی ہجرت کی صاف پیشگوئی ہے تو اس قدر روشن نشان آپ کی صداقت کے جمع تھے کہ دل صداقت کا انکار نہ کر سکتے تھے۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ ۱۴۵

اور اگر تو ان لوگوں کے پاس جنہیں کتاب دی گئی ہے سب نشان بھی لے آئے وہ تیرے قبلہ کی تابعداری نہ کرینگے اور نہ تو ان کے

بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ

قبلہ کا تابع ہے اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع ہیں اور اگر تو ان کی گری ہوئی خواہشوں کی پیروی کرے

مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۘ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ ۱۴۶

اس کے بعد جو تیرے پاس علم سے آچکا تو بیشک اس وقت تو ظالموں میں سے ہوگا ۱۸۳ وہ لوگ جنہیں ہم نے

الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۗ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ

کتاب دی ہے اسے اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں سے ایک فریق یقیناً حق کو چھپاتا ہے

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۘ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۱۴۷

اور وہ جانتے ہیں ۱۸۴ (یہ) حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس ہرگز جھگڑنے والوں میں سے نہ ہو ۱۸۴ الف

قبلہ سے مراد دین

۱۸۳ قبلہ یہاں دین کے قایم مقام ہے۔ کیونکہ یہ ایک ظاہر اور کھلا نشان دین کا تھا۔ اور حدیث لاتکفروا اھل قبلتک میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں تو حضرت موسیٰ کے پیرووں میں یہودیوں کا قبلہ اور تھا سامریوں کا اور۔ پھر یہودیوں کا قبلہ بیت المقدس تھا تو عیسائیوں نے بجائے اس کے مشرق کو اپنا قبلہ قرار دیا۔ مسلمانوں میں بہت سے اختلافات کے باوجود قبلہ کا اختلاف نہیں ہوا۔ اور وہ اصول دین پر بھی مجتمع ہیں۔

یہودیوں، سامریوں عیسائیوں کے قبلے

اہل کتاب کا آنحضرت کو شناخت کرنا

۱۸۴ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت بوجہ ان پیشگوئیوں اور وعدوں کے جو اہل کتاب کو دیئے گئے تھے ان پر واضح ہو چکی تھی۔ مگر محض اس حسد کی وجہ سے قبول نہ کیا کہ نبی اسرائیل میں سے نہیں۔ دوسری جگہ بھی ہے فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ۔ تمام علامات شناخت یقینی طور پر ظاہر ہو چکی تھیں۔ اس لئے آپ کی طرح آپ کا نبی موعود ہونا پہچانتے تھے جس طرح ایک انسان اپنے بیٹے کو پہچانتا ہے۔ یا ابناءھم سے مراد انبیاء بنی اسرائیل ہیں یعنی جن نشانات سے ان کی صداقت کو پہچانتے تھے۔ وہ سب نشانات یہاں بھی موجود ہیں۔

مِرْيَة
امتراء

۱۸۴ الف الممترین۔ مِرْيَة کسی امر میں تردد کو کہتے ہیں۔ جیسے فلا تکن فی مریۃ من لقائہ (السجدۃ ۳۲ - ۲۳) وغیرہ مقامات پر۔ اور اِمْتِرَاء کے معنی ہیں المحاجۃ فیما فیہ مِرْيَة (غ) یعنی اس امر میں جھگڑنا جس میں تردد ہو۔

یہاں خطاب مخالف کو ہی کیونکہ ابھی فرمایا تھا کہ یہ اہل کتاب جانتے ہیں انہ الحق من ربھم تو اس لئے اب فرمایا ہے کہ یہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہی ہے پس جھگڑے کو چھوڑ دو اور حق کو قبول کرلو۔ اور یا یہ خطاب عام ہے مگر اس صورت میں بھی مراد مخالف ہی ہے۔

ع ۱۸/۲

قبلہ ابراہیم پر قایم کرنیکی وجوہات

۱۴۸ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ؕ

اور ہر ایک کے لئے ایک طرف ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے پس نیکیوں کو ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر لو ۱۸۵

۱۸۵ لِكُلٍّ سے مراد ہر ایک قوم یا ہر ایک اہل مذہب یا ہر ایک شخص ہے +

وجہۃ جہۃ

وِجهۃ ۔ وَجْہ قصد کو اور جِہَۃ اور وِجہَۃ مقصد کو کہا جاتا ہے اور اصل میں جِہَۃ یا وِجہۃ وہ ہے جس کی طرف ہم کسی چیز کے لئے توجہ کرتے ہیں (غ) +

سبق۔استباق

استبقوا۔ سَبْق اصل میں چلنے میں آگے ہونے کو کہا جاتا ہے۔ اور اِستِباق کے معنی ہیں تسابق یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنا۔ اور چلنے کے علاوہ اس قسم کے تقدّم پر بھی بولا جاتا ہے جیسے بزرگی میں سبقت ۔ اور السابقون السابقون میں اور کئی دوسرے مقامات پر یہی سبقت مراد ہے (غ) +

وجوہات تقرر قبلہ

اس رکوع میں ایک قبلہ اور پھر خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کرنے کی وجوہات بیان فرمائی ہیں۔ مسلمانوں کا اگر ایک ظاہری قبلہ ہے تو ایک ان کے لئے باطنی قبلہ بھی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ دنیا کی ہر قوم نے اپنا ایک مقصد قرار دے لیا ہے اور وہ محض دنیا تک محدود ہے۔ پس اے مسلمانو! تم خیرات اور نیکیوں میں قدم بڑھاؤ اسی کو اپنا مقصد اسی کو قبلہ ہمت قرار دو۔ اور ظاہری معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوا کہ ہر ایک قوم نے اپنے لئے ایک قبلہ ٹھہرایا ہوا ہے پس تم اس قبلہ کی طرف سبقت کرو جو توحید کا مرکز اصلی ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی خیرات اور نیکیوں کا تم کو حقدار بناتا ہے۔ کیونکہ جس طرح شرک تمام بدیوں کی جڑ ہے۔ توحید سے تمام نیکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اگر لِکُلٍّ میں مراد ہر شخص لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ نماز پڑھنے میں ہر شخص کسی نہ کسی طرف منہ کرے گا۔ اور الگ الگ طرف منہ کرنے میں سب کی توجہ ایک طرف نہیں رہ سکتی۔ اس لئے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو ایک طرف مُنہ کرنے کی ہدایت کر کے ان میں یکجہتی اور اتحاد کی بنیاد رکھ دی اور اس پر قایم ہو جانا بہت سی نیکیوں کو لے لینا ہے درحقیقت ایک قبلہ پر اتفاق اسلام کی اخوت عالمگیر کی بنیاد ہے اسی لئے حدیث میں آتا ہے۔ لا تکفروا اھل قبلتک اپنے اہل قبلہ کی تکفیر مت کرو +

مسلمان کعبہ کی پرستش نہیں کرتے

خانہ کعبہ کی جو کچھ عزت مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ یہ توحید کا اصل مرکز ہے۔ اور نسل انسانی کے اتحاد کا بھی اصلی مرکز یہی ہے بعض کوتہ اندیش مخالفین نے اس عزت کو پرستش کے قایم مقام قرار دے کر اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ کسی چیز کی عزت کرنا اور امر ہے اور اس کی پرستش امر دیگر ہے۔ پرستش یا عبادت میں تین باتوں کا پایا جانا ضرور ہے۔ اول اس چیز کی عظمت سے اس قدر متاثر ہونا کہ اس کی طرف توجہ تام ہو۔ دوسرے اس کی حمد و ستایش کرنا تیسرے اس سے دعا مانگنا۔ اب جب ایک مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کرتا ہے تو ان تینوں باتوں میں سے ایک بات کا بھی وہم تک اس کے دل میں نہیں ہوتا۔ وہ اللہ اکبر کہتا ہوا خدا تعالیٰ کی عظمت کے سامنے کبھی دست بستہ کھڑا ہوتا کبھی جھکتا کبھی زمین پر گرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ہی حمد و ستایش کرتا ہے اور جو کچھ مانگتا ہے اپنے مالک حقیقی سے ہی مانگتا ہے۔ اس وقت نہ اس کے دل پر خانہ کعبہ کی عظمت کا کوئی اثر ہوتا ہے نہ اس کی طرف اس کی توجہ ہوتی ہے۔ نہ وہ خانہ کعبہ کی حمد و ستایش کرتا ہے۔ نہ خانہ کعبہ سے کوئی دعا مانگتا ہے پس صرف حالت نماز میں خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کو خانہ کعبہ کی پرستش قرار دینا محض ایک جاہلانہ اور متعصبانہ خیال ہے۔ پھر اس وقت بھی تو مسلمانوں کی نماز اسی طرح ہوتی تھی۔ جب خانہ کعبہ کی

اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یَاۡتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝

جہاں کہیں تم ہو گے اللہ تم کو اکٹھا کر کے لائے گا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۱۸۶

طرف پیٹھ کئے ہوئے ہوتے تھے اور بیت المقدس کی طرف منہ۔ تو کیا اس وقت وہ بیت المقدس کی پرستش کرتے تھے +

حجر اسود کا بوسہ

خود خانہ کعبہ کی مشرکین عرب نے بھی باوجود اس کی اس عظمت کے جو ان کے دلوں میں تھی کبھی پرستش نہیں کی۔ وہ ان بتوں کو ضرور پوجتے تھے۔ جو انہوں نے اس کے اندر رکھے ہوئے تھے مگر اس گھر کی پرستش کبھی نہیں کی۔ بلکہ حجر اسود کی بھی جسے بوسہ دیا جاتا ہے۔ عرب میں کبھی پرستش نہیں ہوئی کیونکہ یہ بن گھڑا پتھر تھا۔ نہ اس سے کبھی انہوں نے مرادیں مانگیں۔ نہ اس کو اپنا معبود سمجھا۔ ہاں صرف طواف میں بوسہ دینا ثابت ہے اور مسلمان بھی بوسہ دیتے ہیں مگر محض ایک نشان محبت کے طور پر ہے کیونکہ وہ پتھر خود وہاں ایک نشان کے طور پر لگایا گیا ہے۔ یہی وہ پتھر ہے جس کی طرف حضرت داؤد نے اپنی زبور میں بھی اشارہ کیا ہے۔ "وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا ہے کونے کا سرا ہو گیا ہے یہ خداوند سے ہوا جو ہماری نظروں میں عجیب ہے" (زبور ۱۱۸: ۲۲ و ۲۳) یہی وہ بن تراشا پتھر ہے "جیسا کہ تو نے دیکھا کہ وہ پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے اس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے آپ سے آپ نکلا" (دانیال ۲: ۴۵) اب یہ رد کیا ہوا پتھر جو کونے کا سرا ہو گیا ہے۔ ساری مقدس تاریخ کو تلاش کرو تو سوائے بنی اسمٰعیل کے اور کسی کے لئے نشان نہیں ہو سکتا۔ مسیح کو یہودیوں کا رد کرنا ایک معمولی واقعہ ہے جو سارے انبیاء کے ساتھ پیش آیا۔ مگر بنی اسمٰعیل کو بنی اسرائیل نے جن کی قوم مدت تک حکمران رہی بالکل رد کر دیا۔ یہاں تک کہ اس قوم کو عہد ابراہیمی سے بھی اپنی طرف سے خارج کر دیا۔ وہ نہ صرف اپنے ملک سے نکال کر ایک ریگستان میں رکھے گئے بلکہ ان کو ہمیشہ کے لئے رد شدہ تصور کر لیا گیا پس یہی وہ پتھر تھا جس کو معماروں نے رد کر دیا۔ اور اسی کی یادگار میں خانہ کعبہ کا وہ پتھر ہے جو حجر اسود کے نام سے موسوم ہے اور اس کو بوسہ دینا اسی بات کی یادگار ہے کہ وہ رد کیا ہوا پتھر کونے کا سرا ہوا اسی کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی انگورستان

انگورستان کی تمثیل

والی تمثیل میں اشارہ کیا ہے۔ جہاں یہ کہا ہے کہ انگورستان کا مالک جب آئیگا تو انگورستان کو اور باغبانوں کے سپرد کر دیگا یہ انگورستان کیا ہے وہی خدا کی بادشاہت ہے جسکا ذکر خود حضرت مسیح نے تمثیل کو واضح کرنے کے لئے ان الفاظ میں کیا ہے "یسوع نے انہیں کہا کہ تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو راج گیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہے اور ہماری نظروں میں عجیب اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لیجائیگی اور ایک قوم کو جو اس کے پھل لائے دیجائیگی جو اس پتھر پر گرے گا چور ہو جائے گا پر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا" (متی ۲۱: ۴۲ و ۴۳) یہاں مسیح نے بنی اسرائیل کو صاف طور پر کہہ دیا کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے کر ایک اور قوم کو دی جائے گی اور وہ قوم کونسی ہے وہ وہی قوم ہے جس کا نشان وہ پتھر ہے جسے راج گیروں نے ناپسند کیا یعنی قوم بنی اسمٰعیل۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے حجر اسود کو بوسہ دیا جاتا ہے +

کعبہ کی طرف منہ اتحاد پیدا کرتا ہے۔

۱۸۶ ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جہاں کہیں تم ہو اللہ تعالیٰ تم سب کا حشر ایک جگہ کریگا اور یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جہاں کہیں تم ہو تم سب پر موت وارد کرے گا۔ اور یوں بھی کہ جہاں کہیں تم ہو اللہ تعالیٰ تمہاری نماز کو ایک ہی جہت کی طرف کرے گا (ض) فیأت بکم مجازا عن جعل الصلوٰۃ متحدۃ الجھۃ (د) اور مضمون کے لحاظ سے یہی آخری معنی ہی زیادہ موزون ہیں۔ یعنی تم خواہ مشرق میں ہو خواہ مغرب میں خواہ شمال میں خواہ جنوب میں جہاں بھی دنیا میں پھیلے ہوتے ہو جب تم سب ایک خانہ کعبہ کی طرف منہ کرو گے۔ تو تمہاری نمازیں اور اس کے ساتھ

۱۴۹ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن
اور جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے اور یقیناً یہ تیرے رب کی طرف سے

۱۵۰ رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ
حق ہے اور اللہ اس سے بیخبر نہیں جو تم کرتے ہو اور جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ
طرف پھیر دے اور جہاں کہیں تم ہو اپنے مونہوں کو اس کی طرف پھیر دو تا کہ لوگوں کے لئے کوئی دلیل

عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي
تمہارے خلاف نہ رہے ۱۸۸ مگر وہ جو ان میں سے ظالم ہیں سو ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو ۱۸۹

ہی تم میں ایک اتحاد ہوگا +

اس میں ظاہر طور پر تو اسی قدر کہا ہے کہ جہاں کہیں تم ہو گے تم سب کی نماز ایک ہی جہت کی طرف ہوگی۔ مگر اس میں ایک عظیم الشان پیشگوئی بھی ہے کہ اے مسلمانو! تم جہاں کہیں دنیا میں ہوگے اللہ تعالیٰ اس اتحاد ظاہری کے ساتھ ایک اور اتحاد قائم رکھے گا اور اگر مذاہب کی تاریخ کو دیکھا جائے تو اسلام کا یہ ایک امتیازی نشان ہے کہ قومیت اور ملک کی حدبندیوں کو بالکل توڑ دیتا ہے۔ اور مسلمانوں کو وہ کہیں بھی ہوں ایک کرتا ہے +

قبلہ کی طرف منہ کرنے کے حکم کو تین دفعہ دہرانے میں حکمت

۱۸۷ یہ حکم کہ جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے تین دفعہ دوہرایا گیا ہے۔ اول آیت ۱۴۴ میں۔ دوم آیت ۱۴۹ میں تیسرے اس آیت میں مگر یہ تین دفعہ لانا تین مختلف غرضوں کیلئے ہے۔ پہلی مرتبہ تو اس اطمینان کے لئے کہا تھا کہ خانہ کعبہ بت پرستوں کے تصرف میں نہ رہے گا بلکہ ہم تم کو اس کا متولی بنا دیں گے اس لئے تم اپنا منہ بیشک ادھر پھیر دو۔ دوسری دفعہ آیت ۱۴۸ میں یہ بتا کر کہ ایک قبلہ پر قائم کرنے سے اصل غرض یکجہتی پیدا کرنا ہے پھر فرمایا کہ جہاں سے نکلو اس کی طرف منہ پھیر لو۔ اور اصل غرض کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ تیسری مرتبہ یہاں فرمایا کہ تم اس کی طرف منہ پھیر لو تا کہ لوگوں کے لئے تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ رہے یعنی یہ درحقیقت ان پر ایک اتمام حجت ہے۔ اگر خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر نہ کیا جاتا تو یہ اعتراض ہوتا تھا کہ جب دعائے ابراہیمی کا موعود نبی آگیا تو اس کا قبلہ بھی وہی گھر چاہئے جہاں حضرت اسمٰعیل کو بطور نشان کے چھوڑا گیا تھا چنانچہ آیت ۱۵۱ میں صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ یہ وہی رسول ہے جس کے لئے حضرت ابراہیم نے دعا کی تھی +

اہل کتاب کا اعتراض کہ کعبہ کو قبلہ بنانا عربوں کو ساتھ ملانے کیلئے تھا

۱۸۸ الا یہاں استثنائے منقطع ہے۔ مراد یہ ہے کہ لوگوں کے لئے حجت تو اب کوئی باقی نہیں رہی اور اتمام حجت ہو گیا مگر ظالم تو اب بھی نہیں ٹلیں گے۔ یا یہ کہ اب بھی حجت کریں تو یہ ظلم ہے۔ اور ایسا کرنے والے ظالم ہیں یہودی اس وقت کہتے تھے۔ اور عیسائی آج تک کہتے ہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنانا عربوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے تھا۔ یہ اس شخص کی نسبت کہا جاتا ہے جس نے ہزارہا سال کی بت پرستی شراب خوری قمار بازی زنا کاری جنگ وجدال رسوم قبیحہ کو یوں ملک عرب سے مٹا دیا کہ گویا ان کا نام ونشان ہی نہ تھا۔ کیا اس کو ایک خانہ کعبہ چھڑانا مشکل تھا؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ بلکہ اس نے

وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکُمۡ وَلَعَلَّکُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ۞ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ١٥١

اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور تاکہ تم ہدایت پا لو ١٨٩ جیساکہ ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا

مِّنۡکُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیۡکُمۡ وَیُعَلِّمُکُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ وَیُعَلِّمُکُمۡ

جو تم پر ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور تم کو وہ کچھ سکھاتا

مَّا لَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ۞ فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ وَاشۡکُرُوۡا لِیۡ وَلَا تَکۡفُرُوۡنِ ۞ ١٥٢

ہے جو تم نہیں جانتے تھے ١٩٠ پس مجھے یاد کرتے رہو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو ١٩١

خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کرکے نماز پڑھی تو کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور ڈیڑھ سال تک برابر نمازوں میں خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کرتے رہے۔ اور سبھی مسلمان بھی کرتے رہے۔ اور اس عرصہ میں اسلام کی ترقی کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا پس یہ ناحق کی حجت بازی ہے ✦

عبادت الٰہی کا پہلا اور آخری گھر

١٨٩ دوسری غرض یہ بیان فرمائی کہ تا تم پر اتمام نعمت ہو اور تاکہ تم کامل ہدایت کے پانے والے بنو ۔ ان سب چیزوں کا تعلق علم الٰہی میں خانہ کعبہ سے تھا جو خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر دنیا پر تھا۔ اول را بآخر نسبتے است۔ جو سب سے پہلا گھر تھا اسی کو دنیا کا آخری قبلہ قرار دیا۔ جہاں سے لوگ روئے زمین پر منتشر ہوئے وہیں پر پھر ان کا اجتماع ضروری ہو مکہ یوں بھی ناف زمین ہے ۔ کیونکہ ملک عرب پرانی دنیا کے عین مرکز میں واقع ہوا ہے ۔ دنیا توحید کو بھی بھول گئی تھی اور خانہ کعبہ کو بھی۔ دونوں کو آنحضرت صلعم واپس لائے ✦

دعائے ابراہیمی کا رسول اور قبلہ ابراہیمی

١٩٠ یعنی تمہارا قبلہ خانہ کعبہ کو اسی طرح قرار دیا ہے جیساکہ تم میں دعائے ابراہیمی والا رسول بھیج دیا چنانچہ انہی الفاظ کو یہاں دوہرایا ہے جو حضرت ابراہیم کی دعا میں اوپر آچکے ہیں یہ اسی طرف اشارہ کرنے کو ہے کہ جب وہ دعا پوری ہو کر وہ رسول آگیا تو ضروری ہوا کہ وہ گھر بھی اس کا قبلہ قرار دیا جائے تاکہ تم دنیا میں نیکی کے معلم بنو۔ اسی لئے تحویل قبلہ پر اعتراض کا ذکر کرکے فرمایا تھا لتکونوا شھداء علی الناس ✦

ذکر

١٩١ اذکرونی ۔ ذِکۡر کے معنی حفظ الشئ ہیں (ت)، یعنی کسی چیز کا یاد رکھنا اور یہ دو طرح پر ہو دل سے اور زبان سے اور ان میں سے ہر ایک دو قسم ہو ایک بھولنے کے بعد کسی چیز کا ذکر دوسرے ہمیشہ اس کا محفوظ یعنی یاد رکھنا (غ)، اور ذِکۡر کے معنی ثناء بھی ہیں یعنی تعریف کرنا اور شرف بھی یعنی بزرگی دینا (ت)، انه لذکر لك ولقومك (الزخرف ٤٣ - ٤٤) میں اور ص والقرآن ذی الذکر (ص ٣٨ - ١) میں یہی آخری معنی مراد لئے گئے ہیں۔ اور الذکر قرآن شریف کا بھی نام ہے۔

الذکر

یہاں اذکرونی میں بندہ کا اللہ کی ثناء کرنا مراد ہے اور اذکرکم میں بندہ کو اللہ کا شرف یا بزرگی دینا دوسرے لفظوں میں مخلوق خدا میں اس کا ذکر پھیلا دینا یا جس طرح قرآن کریم نے بدی کی سزا کا ذکر انہی الفاظ میں کر دیا ہے دیکھو ٣٤ اسی طرح نیکی کی جزا کا ذکر بھی انہی الفاظ میں کر دیا ہے اور مراد ذکر اللہ کی جزائے خیر دینا ہے یہاں کفر سے مراد ناشکر گزاری یا نعمت کا اخفا ہے دیکھو ١٧ ✦

اعلائے کلمۃ اللہ سے ہی مسلمان بڑے بن سکتے ہیں

یہ مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ تم میرا ذکر کرو یعنی میرے نام کو دنیا میں پھیلاؤ تو میں تمہیں بڑا بناؤں گا۔ اور اگر تم اس نعمت کو چھپاؤ تو پھر تمہارے لئے سزا بھی ہے چنانچہ اگلے رکوع کے دو حصے کئے ہیں ایک حصہ میں ہدایت کے پھیلانے میں مشکلات کے مقابلہ کا اور دوسرے حصہ میں کتمان ہدایت کا ذکر ہے کاش آج مسلمان بڑا بننے کیلئے اس ارشاد الٰہی کی تعمیل کرکے اشاعت اسلام کے کام کو اپنا نصب العین بنالیں

۱۹ ع ۱۱ ۴

۱۵۳ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

اے لوگو جو ایمان لائے ہو صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۱۹۲

تبلیغ ہدایت کی مشکلات اور کتمان ہدایت کی مضرات

صبر

۱۹۲ صبر۔ صبر کے معنی کے لئے دیکھو ع ۶۸ اور یہ دو قسم ہے۔ ایک صبر حرام اور گناہ کی چیزوں کے ترک کرنے پر اور دوسرا صبر طاعات اور قربانیوں کے بجالانے پر۔ یہاں یہی دوسری قسم کا صبر مراد ہے۔ کیونکہ جیسا کہ پچھلے رکوع کی آخری آیت سے ظاہر ہے یہاں مضمون یہ ہے کہ ہدایت کے پھیلانے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کا مقابلہ ضروری ہے ؛

مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اور اس کے حصول میں مشکلات

مسلمانوں کو یہ وعدہ دیا تھا کہ خانہ کعبہ بت پرستوں کے ہاتھ میں نہیں رہے گا بلکہ ہم تم کو اس کا متولی بنا دیں گے یہ ایک بڑا بھاری مقصد تھا ہدایت کا دنیا میں پھیلانا۔ شہداء علی الناس یعنی دنیا میں مزکی اور پیشرو بننا۔ لوگوں کو نیکی کی تعلیم دینا یہ عظیم الشان کام مسلمانوں کے سپرد کیا گیا تھا اب بتاتا ہے کہ ان مقاصد کا حاصل ہونا آسان نہیں۔ بلکہ اس میں بڑی بڑی مشکلات پیش آئیں گی۔ ان مشکلات کے اندر مدد اللہ تعالےٰ سے چاہو۔ مگر دو ذریعوں سے ایک صبر کے ساتھ یعنی طاعات اور قربانیوں کے بجالانے پر مضبوط رہو۔ اور جو تکلیفیں ان میں پیش آئیں ان کی پروا نہ کرو۔ اور دوسرے نماز کیساتھ یا دعا یعنی توجہ الی اللہ کیساتھ کیونکہ نماز بھی اصل میں دعا ہی ہے

صبر اور صلوٰۃ

صبر اور صلوٰۃ کا مفہوم دو ضدوں کا ظاہر کرنے والا ہے۔ صبر کمال درجہ کی مضبوطی کا نام ہے۔ یہاں تک کہ انسان کسی مشکل اور رکاوٹ کی پروا نہ کرے۔ صلوٰۃ کمال درجہ کی عاجزی اور توجہ تام کا نام ہے یہاں تک کہ انسان اپنے مالک کے سامنے گر جائے۔ صبر اس علو کے مقام کو ظاہر کرتا ہے جو انسان کل دنیا کے مقابلہ پر اختیار کر سکتا ہے۔ صلوٰۃ اس انتہائی عاجزی کے مقام کو ظاہر کرتی ہے جو انسان کو اللہ تعالےٰ کے سامنے اختیار کرنا چاہئے ان دونوں صفات کو اپنے اندر جمع کرنے سے ہی انسان کمال کو حاصل کر سکتا ہے یعنی دنیا اور دنیا کی مشکلات اور دنیا کے جبارین کے سامنے علو اور مضبوطی دکھائے اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی دکھلائے۔ عاجزی اور توجہ الی اللہ سے اس کے سامنے راہیں کھل جاتی ہیں۔ مضبوطی اختیار کر کے ان راہوں پر چل سکتا ہے۔ اگر راہ ہی نہ کھلے تو مضبوطی کس کام کی۔ اگر راہ کھل جائے اس پر مضبوطی سے قدم مارنے والا نہ ہو تو راہ کھلنے سے فائدہ کیا اس لئے نہ خالی صبر کمال انسانی تک پہنچاتا ہے نہ نری صلوٰۃ ؛

دو موقعوں پر استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا ذکر اور مدعاؤں میں فرق

یہی حکم صبر اور صلوٰۃ سے مدد چاہنے کا پہلے بھی سورۃ کے شروع میں آچکا ہے۔ وہاں بنی اسرائیل کو کہا تھا کہ صبر اور صلوٰۃ سے مدد چاہو تو پیغمبر کی صداقت تم پر کھل جائے گی۔ مگر اس موقعہ پر صلوٰۃ کے ذکر کو جاری رکھا۔ وانہا لکبیرۃ۔ اور یہاں صبر کے ذکر کو جاری رکھا۔ ان اللہ مع الصابرین۔ یہ فرق اس لئے ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی شناخت میں زیادہ ضرورت عاجزی اور دعا کی ہے۔ اور کامیابیوں کے حصول میں زیادہ ضرورت صبر یعنی مضبوطی کی ہے اس لئے ہر موقعہ پر جس کی زیادہ ضرورت تھی اس کے ذکر کو جاری رکھا۔ چنانچہ اس رکوع میں بلکہ آگے دور تک صبر کا ذکر ہی چلتا ہے۔ دیکھو والصابرین فی الباساء والضراء وحین الباس (۱۷۷) اس سے قرآن کریم کا اعجازی کلام ہونا ثابت ہوتا ہے کہ کس طرح ہر موقعہ پر اس کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ہاں یہ باریک فرق بہت تدبر کو چاہتے ہیں۔ اور اس کیلئے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا بچہ بچہ قرآن شریف کو پڑھے اور اس پر غور کرے ؛

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۱۵۴

اور جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم محسوس نہیں کرتے ۱۹۳ء

سبیل

۱۹۳ء سبیل اللہ۔ سَبِیْل اس رستہ کو کہتے ہیں جس میں سہولت ہو اور اس کی جمع سُبُل آتی ہے پھر ہر ایک اس ذریعہ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے جس کے ساتھ کسی چیز کی طرف پہنچ سکیں جیسے ادع الی سبیل ربك (النحل ۱۶-۱۲۵) اذا لابتغوا الی ذی العرش سبیلا (بنی اسرائیل ۱۷-۴۲) پس سبیل اللہ وہ راہ ہے جس پر چل کر انسان خدا کو پہنچ سکتا ہے اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (العنکبوت ۲۹-۶۹) یہ راہ جہاد ہے اسی لئے امام رازی نے لکھا ہے کہ فی سبیل اللہ عرف قرآن میں جہاد کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ جہاد قتال نہیں مگر اس جہاد کے لئے بعض وقت قتال کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور یہ اس وقت جب ان راہوں پر چلنے سے تلوار کے ذریعہ سے روکا جاتا ہے +

سبیل اللہ

اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے مردہ نہیں

جب صبر کی ضرورت بتائی تو اب ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو صبر میں کمال دکھاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں۔ کہنے والے کون تھے؟ دوسری جگہ منافقوں کا قول مذکور ہے۔ لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا (آل عمران ۳-۱۵۵) اور مراد چونکہ صرف ایک امر کا ظاہر کرنا ہے۔ اس لئے ہر مخاطب مراد ہے +

ان کی زندگی کا مفہوم

اس سے کیا مراد ہے کہ ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں؟ امام راغب نے اس کے ایک معنی یوں کئے ہیں کہ یہاں نفی موت سے مراد غم اور ناکامی کی موت ہے موت کے اس معنی کی تائید میں انہوں نے یہ آیت پیش کی ہے ویاتیه الموت من کل مکان وما ھو بمیت (ابراہیم ۱۴-۱۷) اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں کام کرتے ہوئے مارے جائیں۔ ان پر حزن و ناکامی کی موت نہیں آئی اس لئے ان کو ناکام مت کہو بلکہ وہ کامیاب ہوں گے اس صورت میں یہ استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا نتیجہ بتایا کہ ایسے لوگ ناکام کبھی نہیں ہونگے +

کافر کی بعد موت زندگی حیات نہیں۔

اگر عام معنی لئے جائیں تو ظاہر ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے۔ حالانکہ کافر موت کے بعد مطلق نیستی سمجھتے تھے۔ وہ زندگی بیشک سب کے لئے ہے نیکوں کیلئے بھی اور بدوں کے لئے بھی۔ مگر بدوں کے لئے چونکہ اس زندگی میں عذاب ہے جس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے لایموت فیها ولا یحیی (طٰہٰ ۲۰-۷۴) وہ زندگی تو ضرور ہے اس لحاظ سے کہ نیستی نہیں مگر اس کو حیات یا زندگی بھی نہیں کہہ سکتے پس زندگی حقیقت میں نیکوں کے لئے ہی ہے۔

شہداء کی زندگی

پھر بالخصوص وہ لوگ جو یہاں شہید کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جیسے انبیاء علیہم السلام یا ان کے کامل متبعین جن کو صدیق اور شہید کہا گیا ہے یا وہ لوگ جو اپنی جانیں خدا کی راہ میں دیدیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مشاہدہ یا یقین سے گویا عینی گواہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ حجاب جو اکثر اہل دنیا کی صورت میں اس عالم میں رہتا ہے ان کی صورت میں اُٹھ جاتا ہے وہ اسی زندگی میں ایک نئی زندگی پا لیتے ہیں۔ اور موت کے ساتھ ہی ان کی وہ نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کو خصوصیت سے احیاء یعنی زندہ کہا گیا ہے +

شہداء کی موت اور ان سے استمداد کا ناجائز ہونا

جن لوگوں نے ظاہر الفاظ پر زور دے کر اس آیت کے یہ معنی کرنے چاہے ہیں کہ شہداء کبھی مرتے ہی نہیں۔ اور پھر اس خیال کو شرک کی حد تک پہنچایا ہے یہاں تک کہ ان سے استمداد کرتے ہیں۔ بلکہ بعض بیہودہ باتوں کا اعتقاد بھی ان کے متعلق رکھتے ہیں وہ قرآن شریف کے منشاء سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ انبیاء صدیق شہید صالح سب مرتے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلعم کو ارشاد ہوتا ہے انك میت وانھم میتون (الزمر ۳۹-۳۰) اور صحیح احادیث

۱۵۵ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ

اور ضرور ہم کسی قدر ڈر اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے تمہارا امتحان کریں گے

۱۵۶ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دو ۱۹۴ وہ جنہیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے کہتے ہیں ہم اللہ کے ہی ہیں اور ہم اسکی طرف لوٹ کر جانیوالے ہیں ۱۹۵

۱۵۷ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝

یہی وہ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے اور یہی وہ ہیں جو ہدایت پانے والے ہیں ۱۹۶

سے ثابت ہے کہ شہداء کی روحیں (نہ جسم) جنت میں سبز پرندوں کی صورت میں ہوں گی چنانچہ صحیح مسلم میں ہے ان ارواح الشھداء فی حواصل طیور خضر تسرح فی الجنۃ حیث شاءت اور ایک حدیث میں بجائے حواصل کے صور کا لفظ ہے۔ اور دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ مر کر انسان عالم الغیب نہیں بن جاتا کہ اس عالم میں کوئی شخص کچھ دعا کرے تو اس کا علم ایک ولی یا شہید کو ہو جائے عالم الغیب صرف ایک اللہ کی ذات ہے وہی سب کی دعائیں سُنتا ہے۔ اور وہی حاجات کو پورا کرتا ہے۔ نیک لوگ ہمارے لئے شفیع ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت کو ہمارے حق میں قبول بھی فرماتا ہے۔ مگر موت کے بعد وہ عالم برزخ میں جاتے ہیں اور اُس عالم کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ اور نہ قرآن و حدیث سے بعد موت ان سے استمداد جائز ثابت ہوتی ہے ◆

مصائب میں حکمت

۱۹۴ خدا کی طرف سے بلی اظہار کمالات کا نام ہے دیکھو ۵۵ انیکوں پر جو تکالیف آتی ہیں جن میں اظہار صبر کی ضرورت پیش آتی ہے ان کی حکمت یہاں بیان کی ہے کہ ان کے ساتھ ان کے اندرونی کمالات کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کوئی قوم بڑی نہیں بنتی اور نہ کوئی انسان بڑا بنتا ہے جبتک کہ مصائب کی کٹھالی میں نہ پڑے پس قضاء و قدر کے مصائب انسان کو بڑا بنانے کے لئے ہیں۔ نہ عذاب کے طور پر۔ اصطفا کے رنگ میں نہ ہلاکت کے طور پر ◆

صحابہ کا کمال صبر

اس آیت سے صحابہ کے کمال صبر پر شہادت ملتی ہے۔ وطن گھر بار اموال جانداد سب کچھ چھوڑ کر اور صرف دین کو لے کر مدینہ میں پہنچے مگر یہاں ابھی اور مصائب کی خبر سُنائی جاتی ہے کس قدر کمال صبر ہے کہ اس سے گھبراتے نہیں بلکہ ان نئے مصائب کو خدا کی راہ میں خوش دلی سے برداشت کرتے ہیں ◆

انا للہ کا مفہوم

۱۹۵ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مصیبت کے وقت اس کلمہ کا منہ پر آنا رضا بالقضاء اور مقام توحید کا نہایت بلند مقام ہے۔ اس میں یہ بتایا کہ اگر مال و جان کا کچھ نقصان ہوا تو یہ چیزیں انسان کی زندگی کا اصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے آپ کو لگا دینا ہے۔ دنیا کی چیزیں جن سے ہم فائدہ اُٹھاتے ہیں محض خدا کی امانتیں ہیں وہ جب چاہے اپنی امانتوں کو واپس لے لے ہم خود بھی اس کی امانت ہی ہیں ◆

اللہ کی صلوٰۃ بندہ پر

۱۹۶ صلوٰت۔ صلوٰۃ کی جمع ہے جس کے معنی دعا ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ اپنے بندہ کے حق میں اسکا تزکیہ یعنی گناہوں سے پاک کرنا ہے (غ)۔ یا بندہ یا فرشتہ کی صلوٰۃ بندہ کے حق میں دعائے مغفرت ہے۔ اور اللہ کی صلوٰۃ خود مغفرت ہے۔ علاوہ صلوٰۃ کے رحمت کا لفظ بھی فرمایا یعنی صرف حفاظت ہی نہیں فرماتا بلکہ انعام و احسان بھی کرتا ہے ◆

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ ۱۵۸

بیشک صفا اور مروہ اللہ کے نشانوں میں سے ہیں ۱۹۷ پس جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں

عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ۝

کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے اور جو کوئی شوق سے نیکی کرتا ہے تو یقیناً اللہ بڑا قدر دان جاننے والا ہے ۱۹۸

صفا۔ مروۃ — **۱۹۷** الصفا والمروۃ۔ صفا (صفاۃ کی جمع) صاف پتھروں کو کہتے ہیں۔ اور مروۃ چھوٹے کنکروں کو۔ مکہ معظمہ کے پاس دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے نام ہیں ✦

شعائر — شعائر۔ شعیرۃ کی جمع ہے اور یہ شعر سے ہے جس کے معنی ہیں باریک علم حاصل کیا دیکھو ۱۲۲ اور شعائر سے مراد ہر ایک وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے علم بنائی گئی ہو۔ اس لئے اعمال حج کو شعائر اللہ کہا گیا ہے یا شعائر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ معالم یعنی نشان ہیں جن کے قیام کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس لئے قربانیوں وغیرہ کو بھی شعائر اللہ فرمایا ہے (ت)

صفا و مروہ کے ذکر میں اشارہ — صفا اور مروہ کے ذکر میں یہاں دوہرا اشارہ ہے ایک تو صبر کے مضمون کے متعلق۔ کیونکہ صفا اور مروہ وہ مقام ہیں جہاں حضرت ہاجرہ حضرت اسمٰعیل کے لئے پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں ان کے عظیم الشان صبر کا یہ ثمرہ اللہ تعالیٰ نے دیا کہ ان دو پہاڑیوں کو الٰہی نشان قرار دیا۔ اور ہمیشہ کے لئے اس صبر کے نمونہ کی یادگار بنایا۔ جب حضرت ہاجرہ کو حضرت ابراہیم نے اس بے آب وگیاہ بیابان میں چھوڑا تو انہوں نے صرف اس قدر دریافت کیا ءاللہ امرك بهذا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ حکم آپ کو دیا ہے کہ ہمیں یہاں چھوڑ دو۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا ہاں۔ تو انہوں نے کہا اذا لا یضیعنا۔ پھر اللہ تعالیٰ ہم کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس کی طرف یہاں اشارہ کرکے یہ بھی بتا دیا کہ حضرت ابراہیم کا ہاجرہ کو یہاں چھوڑنا حضرت سارہ کی خوشی کے لئے نہ تھا جیسا کہ بائیبل میں مذکور ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت تھا پس دوسرا اشارہ صفا اور مروہ کے ذکر میں یہ بھی ہے کہ یہی وہ مقام ہے جس کا تعلق حضرت اسمٰعیل سے ہے اور آپکو یہاں چھوڑنے کے یہی معنی تھے کہ اس مقام سے ان کا کوئی خاص تعلق ہے ✦

حج — **۱۹۸** حج۔ حج کے معنی ۱۰۱ میں بیان ہو چکے۔ عرف شریعت میں قصد بیت اللہ کا نام ہے ✦

عمر۔ عُمُر — اعتمر۔ عمارۃ آباد کرنا ہے وعمروها اکثر مما عمروها (الروم ۳۰۔۹) اور عُمُر گویا وہ مدت ہے جس میں روح سے

اعتمار۔ عمرہ / **حج اور عمرہ میں فرق** — جسم آباد رہتا ہے اور اعتمار اور عُمرۃ کے معنی ہیں زیارت کرنا جس میں محبت کی عمارۃ یعنی اس کا قائم رکھنا ہے اور شریعت کی اصطلاح میں بیت اللہ کا قصد ہے اور حج اور عمرہ میں فرق یہ ہے کہ حج صرف خاص ایام ماہ ذی الحج میں ہوتا ہے اور عمرہ ہر وقت ہو سکتا ہے اور حج میں میدان عرفات میں اجتماع ہوتا ہے۔ عمرہ میں نہیں ✦

جناح — جناح۔ جَناح پرند کے بازو کو کہتے ہیں۔ اور ہر چیز کے دو طرفوں کو اس کے جَناح کہا جاتا ہے۔ واضمم یدك

جُناح — الی جناحك (طٰہٰ ۲۰۔۲۲) میں جناح سے مراد جانب ہے۔ اور جنح کے معنی ہیں مائل ہوا وان جنحوا للسلم فاجنح لها (الانفال ۸۔۶۱) اور گناہ کو جو انسان کو حق سے ایک جانب مائل کردے جُناح کہا جاتا ہے ✦

طواف — یطوف۔ طواف کسی چیز کے گرد گھومنے کا نام ہے۔ یہاں صفا اور مروہ کے طواف سے مراد سعی بین الصفا والمروۃ ہے

طوع — تطوع۔ طوع کے معنی انقیاد یعنی فرمانبرداری کے ہیں اور اسی سے اطاعت اور استطاعت ہے اور اسی سے ہی

۱۵۹ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا

جو لوگ اس کو چھپاتے ہیں جو ہم نے کھلی باتوں اور ہدایت سے اُتارا ہے اس کے بعد کہ ہم نے اسے

بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝

لوگوں کیلئے کھول کر کتاب میں بیان کر دیا یہی ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں ۱۹۹

تطوع — فطوعت له نفسه قتل اخیه (المائدة ۳۰) ہے جو اطاعت سے ابلغ ہے اور تطوع کے معنی ہیں تحمّلہ طوعًا یعنی برضا و رغبت ایک بوجھ اُٹھایا (غ) اس لئے تطوع وہ عبادت ہے جو انسان خوشی سے اختیار کرتا ہے ۔

سعی بین الصفا و المروة — بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار سعی بین الصفا والمروة میں کچھ مضائقہ کرتے تھے ۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صفا اور مروہ پر دو بت اساف اور نائلہ تھے اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس رکن حج کو بجالانے میں حرج نہیں گویا یہ ایک پیشگوئی تھی کہ وہ بت نہیں رہیں گے ۔ اور اس کے یہ معنی نہیں کہ سعی بین الصفا والمروة نہ کرے تو بھی حرج نہیں کیونکہ اس کا ارکان حج میں سے ہونا احادیث صحیحہ اور تعامل اُمت سے ثابت ہے ۔ پس اشارہ صرف یہی ہے کہ سردست ان حالات میں بھی ارکان حج کو نہ چھوڑو ۔ عروہ نے جب حضرت عائشہ سے کہا کہ اس آیت کی رو سے اگر سعی بین الصفا والمروة نہ کی جائے تو کوئی حرج نہیں ۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں اگر یہ منشاء ہوتا ۔ تو عبارت یوں ہوتی فلا جناح علیه ان لا یطوف حضرت ہاجرہ کے قصہ کیطرف اشارہ کر کے پھر مضمون کو عام کر دیا کہ جو کوئی بھی شوق سے نیکی کرتا ہے اسی کو بہتر بدلہ ملتا ہے کسی انسان سے اس کی خصوصیت نہیں ۔

کتمان — ۱۹۹ یکتمون ۔ ایک چیز کے اظہار کو عمداً ترک کر دینا باوجودیکہ اس کی حاجت معلوم ہوتی ہو کتم یا کتمان کہلاتا ہے

کتمان ہدایت اور اس کے نتائج — کتمان ہدایت سے وہی مراد ہے جو پچھلے رکوع کے آخر میں کفران نعمت سے مراد ہے ۔ تعلق مضمون کے لئے دیکھو ۱۹۱ ن ہدایت کا چھپانا یہ ہے کہ انسان اس پر عمل نہ کرے دوسروں کو اس کی طرف نہ بلائے ۔ اشارہ بالخصوص یہود کی طرف ہے جو اس زمانہ میں کتمان ہدایت کرتے تھے مگر مسلمانوں کا بھی نقشہ کھینچ دیا ہے ۔ آج مسلمان نہ خود قرآن پر عامل ہوتے ہیں نہ دوسروں کو قرآن کی طرف بلاتے ہیں ۔ اس لئے وہی بلائیں جن کے مستحق یہود تھے آج مسلمانوں کے لاحق حال ہو رہی ہیں ۔ خدا کی رحمت سے دور پڑے ہوئے ہیں ۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جس شخص سے علم کی بات پوچھی جائے اور وہ اسے چھپائے قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام دی جائیگی ۔ یہاں اللہ کے لعنت کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کا ان کو اپنی رحمت سے اور اپنی جناب سے دور کر دینا ہے ۔ اور دوسرے لعنت کرنے والوں کی لعنت اپنی اپنی حالت کے مطابق ہے مثلاً فرشتوں کی لعنت یہ ہے کہ وہ نیکی کی تحریک سے دور ہو جائیں لوگوں کی یہ کہ انکو گھروں سے نکال دیں ۔ یہودیوں کے لئے ان لعنتوں کا ذکر استثناء ۲۸ : ۱۵ - ۲۰ میں ہے "تو شہر میں لعنتی ہوگا اور تو کھیت میں بھی لعنتی ہوگا ..... تیرے بدن کا پھل تیری زمین کا پھل ..... لعنتی ہو جائیں گے ۔ تو بھیتر آنے کے وقت لعنتی ہوگا ۔ اور تو باہر جانے کے وقت لعنتی ہوگا" صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہود کے ان تذکروں سے بڑا فائدہ اُٹھایا جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہنچایا تھا اسے انہوں نے ایک عظیم الشان امانت کے طور پر دوسرے لوگوں تک پہنچانے میں کمال احتیاط اور مستعدی سے کام لیا

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ ۱۶۰

مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور کھولکر بیان کردیا ان پر میں (رحمت کے ساتھ) متوجہ ہوتا ہوں اور میں توبہ قبول کرنیوالا

الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ ۱۶۱

رحم کرنیوالا ہوں۔ وہ لوگ جو کافر ہوئے اور مرگئے درانحالیکہ وہ کافر ہی تھے یہی ہیں کہ ان پر اللہ اور فرشتوں

وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ ۱۶۲

اور لوگوں کی۔ سب کی۔ لعنت ہے ع۲۰۰ اسی میں رہینگے نہ ان کا دکھ ہلکا کیا جائیگا

وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝ وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ۝ ۱۶۳

اور نہ ان کو مہلت دی جائیگی اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں وہ رحمان رحیم ہے ع۲۰۱

ایک طرف اگر اس میں کچھ گھٹانے بڑھانے میں ایسی احتیاط کی جس کی نظیر نہیں تو دوسری طرف اس کے پہنچانے میں جانوں تک دیدیں +

ع۲۰۰ پچھلی آیت میں توبہ کرنے والوں کا ذکر ہے اس میں ان کا جو توبہ نہیں کرتے یعنی وہی لوگ جن کا ذکر گزشتہ سے پیوستہ آیت میں ہے اور وہ توبہ نہیں کرتے۔ اللہ کی لعنت رحمت الٰہی سے دور ہو جانا۔ ملائکہ کی لعنت نیکی کے محرکوں سے بُعد یعنی نیکی کی توفیق چھن جاتا ہے۔ لوگوں کی لعنت دربدر کیا جانا ہے +

الٰہ ع۲۰۱ إِلٰه۔ اس کا اشتقاق أَلَهَ سے ہے جس کے معنی ہیں اس نے عبادت کی اور إِلٰه کے معنی معبود ہیں۔ اس کی جمع آلِهة آتی ہے۔ (غ) معبودان باطل پر اس لفظ کا اطلاق ان کے معتقدین کے نقطہ خیال سے ہوا ہے +

واحد واحد۔ وَحْدَةٌ کے معنی اِنْفِرَاد یا اکیلا ہونا ہیں اور وَاحِدٌ فِی الْحَقِیْقَت وہ ہے جس کی کوئی جزو نہ ہو مگر اس کا استعمال بہت وسیع ہے۔ جس کو کوئی نظیر نہ ہو اس کو بھی واحد کہہ دیتے ہیں جیسے یگانہ کہدیتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی صفت میں واحد ہو تو اس کے معنی ہیں وہ جس کا نہ کوئی جزو ہو سکتا ہے اور نہ ہی جس میں کثرت ہو سکتی ہے۔ (غ) اور أَحَدٌ مطلق سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے پر نہیں بولا جاتا (غ)

احد

تعلیمات کا اصل اصول کیا ہے جس طرح پچھلے رکوع کی آخری آیت میں اس رکوع کے مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اسی طرح اس رکوع کی آخری آیت میں اگلے رکوع کے مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی توحید الٰہی۔ اور اس رکوع میں چونکہ صبر کی تعلیم تھی اور صبر کے معنی طاعات پر قایم رہنا ہے اور نیز ہدایت کے پھیلانے کی تعلیم تھی اس لئے بتا دیا کہ ہدایت کا اصل الاصول توحید الٰہی ہے اور اسی پر سب سے پہلے انسان کو قایم ہونا چاہئے۔ توحید کی تعلیم جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے۔

توحید کیا ہے کیا ہے؟ اگر ایک طرف واحد کہکر یہ بتا دیا کہ نہ اس کا کوئی جزو ہو سکتا ہے نہ اس کی ذات میں کثرت ہے اور نہ اس کی صفات میں اسکا کوئی شریک ہے تو دوسری طرف اِلٰهُكُمْ إِلٰه واحد کہکر بتا دیا کہ وہی انسان کا حقیقی محبوب اور مطلوب اور مقصود ہے۔ اسی لئے وہ ایک ہی عبادت کے لائق ہے' اور دوسری کوئی چیز اس کے ساتھ عبادت کے لائق نہیں۔ وہ ذات میں بھی واحد ہے اور صفات میں بھی اور عبادت میں بھی مگر وہ انسانوں سے بے تعلق بھی نہیں۔ کیونکہ وہ رحمان و رحیم ہے +

۲۰ ع ہدایت کا اصل الاصول توحید ہے

۱۶۴ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے ادل بدل میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کو نفع پہنچانے کو چلتی ہیں اور پانی میں جو اللہ بادل سے اُتارتا ہے پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اسکے اندر ہر قسم کے جانور پھیلاتا ہے اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان کام میں لگایا گیا ہے ان لوگوں کیلئے یقینی نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں ۲۰۲

اختلاف ع ۲۰۲ اختلاف۔ خلف کے معنی پیچھے ہیں اور اختلاف کے معنی یہاں ایک کا دوسرے کے پیچھے آنا ہے اور اختلاف یہ بھی ہے کہ ہر ایک دوسرے سے الگ رستہ اختیار کرے (غ)

نہار نہار۔ نھر کے معنی ع ۳۹ میں بیان ہوچکے۔ نہار وہ وقت ہے جس میں روشنی کا انتشار ہو جو طلوع آفتاب سے غروب تک ہے۔ مگر اصطلاح شریعت میں طلوع فجر سے غروب آفتاب تک نہار ہے +

فلک۔ فلک فُلک کشتی۔ واحد اور جمع دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور فلک وہ ہے جس میں سیارے چلتے ہیں اور کشتی کی مشابہت کے لحاظ سے ہے (غ) +

بث بث۔ کسی چیز کو پراگندہ کرنا اور اسے اُٹھانا ھبآء منبثا (الواقعۃ ۵۶-۶) اور بث غم کو بھی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ فکر کو پراگندہ کرتاہے (غ) اور بث فیہا میں یہاں اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے وجود میں لانے اور ظاہر کرنے کی طرف اسے جو موجود نہ تھا (غ) +

دب۔ دابۃ دابۃ۔ دَبّ اور دَبِیب ہلکا چلنے کا نام ہے اور دابّۃ کا استعمال ہر حیوان پر ہوتا ہے (غ) یا ہر ایک زمین پر چلنے والے پر (ت)

صرف۔ تصریف تصریف۔ صَرَف کے معنی ہیں ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا اور یہی معنی تصریف کے ہیں۔ مگر اس میں کثرت پائی جاتی ہے +

ریح۔ ریاح ریاح۔ اس کا واحد ریح ہے اور یہ اس ہوا کو کہتے ہیں جو حرکت میں ہو۔ عموماً قرآن شریف میں جہاں بلفظ واحد آیا ہے وہاں مراد عذاب ہے اور جہاں جمع ریاح آیا ہے وہاں مراد رحمت ہے (غ) واحد کی مثالیں ہیں انا ارسلنا علیہم ریحاً صرصراً (القمر ۵۴-۱۹) کمثل ریح فیہا صر (اٰل عمرٰن ۳-۱۱۷) اشتدت بہ الریح (ابراھیم ۱۴-۱۸) اور جمع کی مثالیں ہیں وارسلنا الریاح لواقح (الحجر ۱۵-۲۲) یرسل الریاح مبشرات (الروم ۳۰-۴۶) اور یرسل الریاح بشرا (النمل ۲۷-۶۳) اسی لئے ایک روایت میں نبی کریم صلعم کی یہ دعا ہے اللّٰھم اجعلھا ریاحا ولا تجعلھا ریحا (ر) +

سحب۔ سحاب سحاب۔ سَحْب کے اصل معنی جَرّ یعنی کھینچنا ہیں یوم یسحبون فی النار علی وجوھھم (القمر ۵۴-۴۸) اور سحاب

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۱۷۵

اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے سوا اوروں کو ہمسر بنا لیتے ہیں ان سے اللہ کی طرح محبت کرتے ہیں

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ

اور جو ایمان لائے وہ اللہ کی محبت بہت بڑھکر رکھتے ہیں اور اگر وہ جو ظالم ہیں دیکھیں جب عذاب کو دیکھینگے

الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ

کہ سب طاقت اللہ کے لئے ہی ہے اور کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے ۲۰۳

بادل کو کہتے ہیں اس لئے کہ وہ پانی کو کھینچ لاتا ہے ؁

تسخیر — مسخر ۔ تسخیر یہ ہے کہ بوجہ غلبہ کے خاص غرض کی طرف چلائے یعنی خاص کام میں لگا دے (غ) پس مُسَخَّر وہ چیز ہے جو خاص کام میں لگا دی گئی ۔ اور اس کا مادہ سخر ہے جس کے معنی ہیں دوسرے کی تحقیر کیلئے اس پر ہنسنا ؁

مناظر قدرت سے توحید باری کی شہادت — جب ہدایت کے پھیلانے کے لئے مصائب کے مقابلہ کو بھی ضروری قرار دیا تو اب بتاتا ہے کہ ہدایت کی جڑ خدا کی ہستی اور اس کی توحید ہے ۔ اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس پر اگر ایک طرف مناظر قدرت سے شہادت ملتی ہے تو دوسری طرف فطرت انسانی بھی اس پر گواہی دے اٹھتی ہے ۔ چنانچہ پہلی آیت میں مناظر قدرت کی شہادت کو پیش کیا ۔ مگر مناظر قدرت بھی وہ پیش کئے ہیں جن سے دنیا کا کوئی حصہ خالی نہیں ۔ پہلے خود زمین و آسمان کی پیدائش ہے جو کچھ زمین و آسمان کے اندر ہے وہ اس میں آگیا ۔ پھر تغیرات زمانہ ہیں ۔ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات مناظر قدرت تو سب اس میں آگئے ۔ پھر ان کی تفصیل کی ہے ۔ اور اس تفصیل میں سب سے پہلے کشتی کا سمندر پر چلنا ہے جو بتاتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیگر مخلوق پر حکومت عطا کی ہے یہاں تک کہ وہ سمندروں پر بھی حکومت کرتا ہے ۔ جب مخلوق پر حاکم ہوا تو پھر مخلوق کو معبود بنانے کے کیا معنی ۔ پھر اس سمندر کو مردہ زمین پر جگہ جگہ پانی برسانے کا ذریعہ بنایا ۔ اور اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کیا ۔ پانی سے سبزیاں اگتی ہیں اور یہی پانی جانوروں کی زندگی کا مدار ہے ۔ پھر ان ہواؤں میں جو اس پانی کو جگہ جگہ پہنچاتی ہیں ۔ اس بادل کے ذریعہ سے جو آسمان و زمین کے درمیان کام میں لگایا گیا ہے ۔ ان تمام اختلافات کے اندر ایک ہی قانون کام کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ اور بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک ہی مدبر بالارادہ ہستی کے تصرف میں ہے یہ ہو نہیں سکتا کہ سارے عالم میں ایک ہی قانون کام کر رہا ہو یہاں تک کہ آسمان کے ستاروں میں وہی قانون کام کرتا ہو جو زمین کے اندر کر رہا ہو اور اس قانون کے بنانیوالے دو ہوں ؁

حبّ محبّ — ۲۰۳ حُبّ حَبّ اور حَبَّۃ دانہ کو کہتے ہیں ۔ اور حَبَّۃ القلب قلب انسانی کا مرکز ہے پس حُبّ اصل میں حَبَّۃ القلب میں اثر کر جانے کا نام ہے (غ)

رأی — یریٰ ۔ رَاٰی جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو تو اس کے معنی عِلْم یعنی جاننا ہوتے ہیں (غ) یہاں جملہ ان القوۃ للہ جمیعا دو مفعولوں کے قایم مقام ہے

لو یریٰ ۔ کا جواب محذوف ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں وہ شرک اختیار کرنے کی جرأت نہ کرتے ؁

فطرت انسانی کی شہادت توحید باری پر — مناظر قدرت سے فطرت انسانی کی طرف توجہ دلاتی ہے انسان کے دل میں محبت اس چیز کی ہوتی ہے جس سے

۱۶۶ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ۝

جب وہ جو پیشوا بنائے گئے تھے ان سے بیزار ہو جائینگے جو انکے پیرو تھے اور عذاب کو دیکھینگے اور ان کے تعلقات کٹ جائینگے ۲۰۳

اسے منفعت پہنچتی ہے۔ اور مناظر قدرت ہیں جہاں تک غور کرو سب منفعت کے سامان انسان کے لئے خدا تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں پس فطرت انسانی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ایک خدا کی محبت سے ہی قلب لبریز ہوتا مگر مشرک نہ مناظر قدرت پر غور کرتا ہے نہ فطرت کی شہادت کی پرواکرتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہمسر قرار دے کر ان سے ایسی محبت کرتا ہے جیسی اسے خدا سے کرنی چاہئے تھی۔ انداد یا ہمسروں سے مراد یہاں وہ بڑے لوگ ہیں جن کی فرمانبرداری کرکے لوگ معصیت میں پڑتے ہیں (ج)۔ ہاں مومن کی محبت جو وہ اپنے مالک سے رکھتا ہے اس سے بھی بڑھکر ہے جس قدر مشرک کو اپنے جھوٹے معبود سے ہوتی ہے۔

عقل اور محبت کا مقام

پہلی آیت میں، اصول کی صحت معلوم کرنے کے لئے عقل کی طرف توجہ دلائی تھی اس آیت میں کام کرنے کا اصول محبت بیان فرمایا۔ چنانچہ فرمایا والذین آمنوا اشد حبا للہ یعنی جب عقل سے کام لے کر انسان ایمان لے آئے تو پھر کام کرنے کیلئے اپنے اندر وہ محبت کا ولولہ پیدا کرے جو تمام ولولوں سے بڑھ کر ہو۔ دنیا میں جس قدر لوگ کام کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی جذبہ محبت کے ماتحت ہی کرتے ہیں۔ مگر فرمایا کہ مومنوں کا جذبۂ محبت خدا کی راہ میں کام کرنے کے لئے سب جذبات محبت سے بڑھکر ہونا چاہئے۔ اگر حب وطن یا حب قوم یا کسی بیر یا لیڈر کی محبت کوئی جذبہ محبت پیدا کرسکتی ہے اور انسان سے بڑے بڑے کام کرا سکتی ہے تو ان تمام ولولوں سے بڑھکر خدائی محبت کا جذبہ ہونا چاہئے۔ اور صرف اللہ کی محبت کے لئے کام کرنا جس کے سامنے دوسری تمام محبتیں ہیچ ہوں۔ انسان کی زندگی کی اصل غرض ہونی چاہئے اشد حبا للہ کا نظارہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی میں عملی طور پر نبی کریم صلعم نے پیدا کرکے دکھا دیا کہ یہ کوئی خیالی مقام نہیں۔ بلکہ ایک قوم نے اس اصول پر کام کیا اور دنیا اور دین کی خیرات ان کے اندر جمع ہوگئیں اور کامیابی کے اعلیٰ سے اعلیٰ منازل پر وہ پہنچ گئے۔ آج مسلمان اسی جذبہ محبت سے خالی ہیں۔ قوم اس وقت بنے گی۔ کامیابی کا منہ اس وقت دیکھیں گے جب خدا کی محبت کے جذبہ کے سامنے تمام دوسرے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ کیسا پر حکمت کلام ہے پہلے بتایا کہ صحیح راہ کو معلوم کرنے کے لئے عقل سے کام لو اور جب اسے معلوم کرلیا جب خدا کی ہستی کا یقین دل میں بیٹھ گیا تو پھر بتایا کہ محبت کے رنگ میں کام کرو۔ اکثر لوگ دنیا میں عقل اور محبت میں فرق نہیں کرتے اور عقل کی جگہ محبت سے اور محبت کی جگہ عقل سے کام لیتے ہیں۔ اصول دین کو عقل سے نہیں جانچتے۔ بلکہ اندھا دھند مان لیتے ہیں اور کام کرتے وقت عاشقانہ جوش سے کام نہیں کرتے بلکہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔

براء۔ تبری

۲۰۳ تبرأ۔ بُرْء اور بَرَاء اور تبرّی کے معنی ہیں اس چیز سے الگ ہو جانا جس کے پاس ہونا ناپسند ہو (غ)، پس بیماری سے اچھا ہونے پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اور کسی چیز یا شخص سے علیحدگی یا بیزاری پر بھی جیسے براءۃ من اللہ ورسولہ (التوبۃ ۹-۱) ان اللہ بریء من المشرکین ورسولہ (التوبۃ ۹-۳) (انا برآؤ منکم (الممتحنۃ ۶۰-۴) انی براء مما تعبدون (الزخرف ۴۳-۲۶)۔

سبب

اسباب۔ سبب کی جمع ہے۔ اور سبب وہ چیز ہے جس کے ذریعہ دوسری چیز تک پہنچا جائے (غ)

یہاں اسباب سے مراد تعلقات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ اپنے کام نکالتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ ۱۶۷

اور وہ جو پیروی کرتے تھے کہینگے کاش ہمارے لئے پھر کر جانا ہوتا تو ہم ان سے اسی طرح بیزار ہوتے جس طرح وہ ہم سے بیزار ہیں۔ اسی طرح

يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۝

اللہ ان کو ان کے عمل ان پر حسرتیں کرکے دکھائیگا اور وہ آگ سے باہر نکلنے والے نہ ہونگے ۲۰۵

جھوٹے پیشواؤں اور پیروؤں کی ایک دوسرے سے بیزاری

یہاں بتایا کہ جن کی محبت کی خاطر یہ لوگ خدا کی نافرمانی کرتے تھے وہ خود ان سے بیزار ہو جائیں گے۔ قیامت کے دن تو اس بیزاری کا اور قطع تعلق کا نقشہ کامل طور پر ظہور پذیر ہوگا جو جھوٹے پیشواؤں اور ان کے پیروؤں میں واقع ہوگا مگر اس دنیا میں بھی بسا اوقات یہ نقشہ نظر آجاتا ہے۔ ایک بدمعاش بعض وقت دوسرے کو دلخوش کن نقشے دکھا ان کو بدی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن جب اس بدی کے بدنتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ خود بھی گرفتار بلا ہوتا ہے تو پھر اپنے دام افتادوں سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اور وہ جو اس کے دام تزویر میں آگئے تھے۔ وہ بھی جب بدی کے بدنتائج کو دیکھتے ہیں تو ان پیشواؤں پر لعنت بھیجتے ہیں جنہوں نے ان کو غلط راہ پر ڈالا تھا اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے۔ بدی کا نتیجہ چونکہ لابد ہے اس لئے جب اس بدنتیجہ کا اثر اپنی ذات پر پڑتا ہے تو اس وقت بدی سکھانے والے اور سیکھنے والے ایک دوسرے سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اسکے بالمقابل جو شخص دوسرے کو نیکی کی تعلیم دیتا ہے اسکے ساتھ تعلق محبت ہمیشہ بڑھتا ہے۔

عمل ۲۰۵ اعمال۔ عَمَل کی جمع ہے اور عَمَل ہر اس فعل کو کہتے ہیں جس کو کوئی جاندار قصد سے کرتا ہے (غ) فعل بلا قصد ہو سکتا ہے۔ مگر عمل نہیں +

حسرۃ حسرات۔ حَسْرَۃ کی جمع ہے اور حَسَر کے معنی ہیں جس چیز پر کوئی دوسری چیز اُڑھائی گئی ہے اس کا اس سے اُتار دینا یعنی ننگا کر دینا۔

حاسر محسور اور حاسِر یا حَسِیر یا مَحْسُور تھکے ماندہ کو کہتے ہیں۔ گویا اس کی توتوں پر سے پردہ اُٹھ گیا ہے یا وہ ظاہر ہو گئی ہیں۔ فتقعد ملومًا محسورًا (بنی اسرائیل ۱۷ - ۲۹) ینقلب الیک البصر خاسئاً وھو حسیر (الملک ۶۷)

حسرۃ اور حَسْرَۃ غم اور ندامت کا اظہار ہے اس چیز پر جو ہاتھ سے جاتی رہی ہو گویا اس کے قویٰ شدت غم سے ننگے ہو گئے یا قصور کے تدارک کے مقابلہ میں اس پر درماندگی کی حالت طاری ہو گئی (غ) +

بدی پر حسرت عذاب بن جاتی ہے

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال بد ایسی ندامت کا موجب ہوتے ہیں کہ وہی حسرت ہی اس کے لئے موجب عذاب اور ایک آگ ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا لیجعل اللّٰہ ذٰلک حسرۃ فی قلوبھم (آل عمران ۳ - ۱۵۵) اور ایک جگہ فرمایا انہ لحسرۃ علی الکافرین (الحاقۃ ۶۹ - ۵۰) اور پھر اس دلوں کی حسرت کی طرف ہی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا نار اللّٰہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ (الھمزۃ ۱۰۴ - ۶، ۷) خدا کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں پر بھڑک اُٹھتی ہے۔

نیکی پر ندامت نہیں ہوتی بدی پر ہوتی ہے

یہ بھی فطرت انسانی کی شہادت ہے کہ نیکی پر خواہ اس کی وجہ سے کتنا ہی دُکھ کیوں نہ اُٹھانا پڑے انسان کے دل میں ندامت پیدا نہیں ہوتی۔ مگر بدی پر خواہ اس سے کتنا ہی وقتی حظ کیوں نہ ملے آخر فطرت صحیحہ ملامت کرتی ہے۔ یہانتک کہ انسان اس بدی کا اس قدر عادی ہو جائے کہ اس کی فطرت ہی مسخ ہو جائے مگر ہاں ایں بھی فطرت ملامت کرتی ہے خواہ وہ ملامت بدی کے غلبہ کی وجہ سے کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو +

۱۶۸ يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ

اے لوگو! اس سے جو زمین میں ہے حلال اور پاکیزہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں کے پیچھے

۱۶۹ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ○ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ

نہ چلو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے ۲۰۶ وہ تمہیں صرف بدی اور بیحیائی کا حکم دیتا ہے

غذاؤں کی صحت و حرمت — ۲۱ ع

حَلّ — ۲۰۶ حلالاً ۔ حَلّ کی اصل گرہ کھولنے سے ہے ۔ واحلل عقدۃ من لسانی (طٰہٰ ۲ ۔ ۲۷) اور کسی جگہ اُترنے کے وقت بوجھ کے اُتارنے پر حَلّ الاَحمال بولا جاتا ہے اس سے مطلق نزول پر حُلول کا لفظ بولا جاتا ہے

حلول — جیسے او تحل قریباً من دارھم (الرعد ۱۳ ۔ ۳۱) اور احلّہ کے معنی دوسرے کو اُتارا واحلوا قومھم دار البوار (ابراہیم ۲۸) اسی سے لفظ مَحَلّۃ ہے جس کے اصل معنی اُترنے کی جگہ ہیں اور حـل عُقدۃ سے ہی حَلَال کے معنی لئے گئے ہیں۔ گویا وہ چیز اس کے لئے کھول دی گئی یا آزاد کر دی گئی۔ اور جو شخص حالت احرام سے باہر نکل آئے اُسے بھی اسی لئے حَلَال یا مُحِلّ کہا جاتا ہے (غ) اور اصطلاح شریعت میں حلال وہ ہے جس کی اجازت شریعت نے دی ہے یا جس سے روکا نہیں ۔

اَحَلّ، حلال

خطوۃ — خطوات خُطوۃ کی جمع ہے جو چلنے والے کے دونوں قدموں کے درمیانی فاصلہ کا نام ہے (غ) شیطان چونکہ نافرمانی کی راہوں پر چلتا ہے اس لئے اس کے خطوات سے مراد ہر ایک اللہ تعالیٰ کی معصیت ہے ۔

غذاؤں کا اثر اخلاق پر — جب ہدایت کے اصل الاصول توحید کا ذکر کیا تو اب کسی قدر ذکر ہدایت کی تفصیلات کا کیا ہے اور بتایا ہے کہ کھانے پینے تک کے احکام بھی شریعت میں دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ غذاؤں کا اثر اخلاق و روحانیت دونوں پر پڑتا ہے ۔ یہاں سے لیکر اکتیسویں رکوع تک یہ ذکر چلے گا مگر عموماً انہی احکام کو بیان کیا ہے جن کا تعلق صبر سے ہے کیونکہ یہی اصل مضمون ہے جس پر بحث شروع ہے ۔ اس میں سب سے پہلی ضرورت حلال کھانے کی بتائی ۔ جو مال باطل طریق پر حاصل کیا جائے وہ حلال نہیں ہو سکتا دوسری ضرورت طیب کھانے کی بتائی یعنی ستھری چیز ۔ اس ایک لفظ کو لاکر بہت تفصیلات سے مستغنی کر دیا اور کسیقدر اختلاف رواج سے بھی طیب کا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے اسلئے عام لفظ رکھا ۔ یا ایھا الناس میں جو حکم دیا ہے وہ عام ہے حرام خوری کو ترک کرنے سے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے ایک حدیث میں ہے کہ سعد بن ابی وقاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں کس طرح مستجاب الدعوات بنوں تو آپ نے فرمایا اطب مطعمك تكن مستجاب الدعوۃ ستھرا کھانا کھاؤ مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے ۔ دنیا اور دین ۔ ظاہری اور باطنی طہارت کے احکام کو کس طرح ملایا ہے ۔

ظاہری اور باطنی طہارت کا تعلق — خود قرآن شریف نے بھی غذا کے حکم کے بعد یہ لفظ لاکر کہ شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو ۔ باطنی طہارت کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ غذا بھی اچھی کھاؤ ۔ اخلاق بھی اچھے دکھاؤ ۔ جیسا کہ اگلی آیت میں شیطان کی پیروی نہ کرنے کی وضاحت کر دی کہ بدی اور بیحیائی کی باتوں سے بچو ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسان کی جسمانی اور روحانی حالتوں میں ایک تعلق بتاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات جسمانیات کی طرف سے مضمون کو روحانیات کی طرف اور روحانیات سے جسمانیات کی طرف منتقل کرتا ہے ۔

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۱۷۰

اور یہ کہ تم اللہ پر وہ بات بناؤ جو تم نہیں جانتے ۲۰۷ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اسکی پیروی کرو جو

قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْـــًٔـا وَّ

اللہ نے اُتارا ہے کہتے ہیں بلکہ ہم تو اسکی پیروی کرینگے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا کیا خواہ انکے بڑے نہ کچھ عقل سے کام لیتے ہوں اور

لَا يَهْتَدُوْنَ ○ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّ ۱۷۱

نہ ہدایت پر ہوں! ۲۰۸ اور ان لوگوں کی مثال جو کافر ہوئے ایک شخص کی مثال کی طرح ہے کہ وہ اسے آواز دے رہا ہو جو بجز پکار اور

نِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۱۷۲

آواز کے کچھ نہیں سنتا بہرے گونگے اندھے ہیں سو وہ عقل سے کام نہیں لیتے ۲۰۹ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تمکو دی ہیں

فحشاء ۲۰۶ الفحشاء فحش اور فحشاء اور فاحشۃ کے معنی ہیں وہ اقوال یا افعال جن کی قباحت بہت بڑی ہو (غ) یا ہر ایک قبیح خصلت فاحشۃ ہے (ت) سوء کے معنی کے لئے دیکھو ۱۰۵ اور سوء اور فحشاء میں فرق یہ ہے کہ سوء

سوء اور فحشاء میں فرق وہ ہے جو اس کے کرنے والے کو نقصان پہنچائے۔ اور فحشاء وہ ہے جس کا ذکر کرنا یا سننا برا معلوم ہو (ج)

قال علیہ تقولوا علی اللّٰہ۔ قال علیہ کے معنی ہیں اس پر افترا کیا ۔

بدی اور بیحیائی کا تعلق غذاؤں سے یہاں یہ اشارہ ہے کہ حرام غذاؤں کے استعمال سے سوء اور فحشاء پیدا ہوتے ہیں جیسے مثلاً مردار اور خون کے کھانے سے صحت جسمانی پر برا اثر اور گندے اخلاق۔ خنزیر کھانے سے بیحیائی اور افترا علی اللّٰہ اسے اس لئے کہا کہ وہ لوگ خود چیزوں کو حلال و حرام قرار دے کر اللّٰہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ آج یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک قسم کی غذا اسی قسم کی صفات انسان کے اندر پیدا کرتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر اس حقیقت کی طرف توجہ دلا کر ایسی چیزوں سے روکا ۔

تقلید ۲۰۷ قرآن کریم نے بسا اوقات کفار کا نقشہ پیش کر کے مسلمانوں کو سمجھایا ہے۔ آنکھیں بند کر کے تقلید بھی انہی کا طریق فرمایا غرض تھی کہ مسلمان اس راہ پر نہ چلیں کیونکہ فلاں بات ہمارے بزرگ مانتے آئے ہیں اسلئے اسکے خلاف ہم نہیں سن سکتے مگر آج اندھا دھند تقلید کرنے میں مسلمان سب قوموں پر سبقت لے گئے ہیں یہانتک کہ اپنے خیالات کے خلاف بات سن بھی نہیں سکتے غور کرنا تو ایک طرف رہا ۔

نعق ۲۰۸ ینعق۔ نعق چرواہے کے بھیڑوں بکریوں کو آواز دینے پر بولا جاتا ہے (غ۔ت) ۔

دعاء۔ نداء دعاء و نداء۔ دعاء محض پکارنا یا بلانا ہے اور نداء آواز کا بلند کرنا ہے اور مطلق صوت پر بھی بولا جاتا ہے اور ندی اصل میں رطوبت کو کہتے ہیں۔ اور نداء کا استعارہ اس سے لیا گیا ہے کہ جس کے منہ میں رطوبت زیادہ ہو اس کی آواز اچھی ہوتی ہے (غ) ۔

عقل سے کام لینے کی ہدایت اس تمثیل میں کفار کو جو عقل اور ہدایت کی پروا نہیں کرتے چارپایوں سے تشبیہ دی ہے اور آنحضرت صلعم کو راعی سے۔ فی الحقیقت انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز عقل ہے پس جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ حیوانوں کے حکم میں ہی ہیں۔ اس لئے آخر پر ان کو بہرے گونگے اندھے کہا ہے ۔

۱۷۲ وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ

اور اللہ کا شکر کرو جب تم اسی کی عبادت کرتے ہو ۲۰۹ اس نے تم پر صرف مردار

الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ

اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے پکارا جائے حرام کیا ہے ۲۱۰

ف ۲۰۹ اِنْ ۔مغنی میں ہے کہ اِنْ بعض وقت بمعنی اِذْ بھی آتا ہے یعنی جب یہاں یہی معنی ہیں ۔ جیسے فاتقوا اللہ ان کنتم مومنین میں ۔ دیکھو ۲۳ف ۵ ۔ — *اِن*

ف ۲۱۰ اِنّما ۔ کلمۂ تخصیص ہے ۔ صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں مطلب یہ ہے کہ جو تم نے خود اپنے اوپر حرام کر رکھی ہیں جیسے بحیرہ وغیرہ وہ خدا نے حرام نہیں کیں ۔ — *اِنّما*

المیتة ۔ میتة حیوانات میں سے وہ ہے جس کی روح بغیر ذبح کرنے کے نکل جائے (غ) خواہ وہ اپنی موت مرے یا گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا گر جانے سے یا سینگ مارنے سے (ث) قرآن کریم نے یہ تصریح سورہ مائدہ آیت ۳ میں کر دی ہے ۔ — *میتة*

اھل ۔ ہلال پہلی اور دوسری رات کے چاند کو کہتے ہیں ۔ اور اِھلال چاند دیکھنے کے معنی میں آتا ہے ۔ پھر اس کا استعمال اس آواز پر ہوا جو چاند دیکھنے کے وقت بلند کی جاتی ہے ۔ پھر ہر آواز پر (غ) پس ما اھل بہ لغیر اللہ وہ ہوا جس پر اللہ کے سوائے کسی دوسرے کا نام پکارا جائے ۔ یعنی ذبح کرتے وقت بجائے اللہ کا نام لینے کے غیر اللہ کا نام لیا جائے جیسے کسی بت کا یا اور کسی کا سوائے اللہ کے ۔ — *ھلال ۔ اِھلال ۔ ما اھل بہ لغیر اللہ*

یہاں ان چیزوں کی حرمت کا ذکر کیا جو اخلاق و روحانیت پر بُرا اثر ڈالتی ہیں ان کی حرمت کا حکم اس سے پہلے مکہ میں ہی سورہ الانعام اور سورہ النحل میں نازل ہو چکا تھا اور چوتھی بار زیادہ تصریح کے ساتھ اس کے بعد سورہ المائدہ میں نازل ہوا ہے ۔ ان چار چیزوں میں سے اول الذکر تین چیزوں کی حرمت کا ذکر یہود کی شریعت میں بھی ہے چنانچہ مردار کی حرمت احبار ۱۷ : ۱۵ میں خون کی حرمت احبار ۷ : ۲۶ میں سؤر کی حرمت احبار ۱۱ : ۷ میں ہے اور گو عیسائیوں نے سؤر کو حلال کر کے اسے اپنی محبوب ترین غذا بنا لیا ہے مگر حضرت مسیح کے کلام میں سؤر کو پلید ہی قرار دیا گیا ہے جیسے اپنے موتیوں کو سؤروں کے آگے مت پھینکو (متی ۷ : ۶) سؤروں کے چرانے کا بھی بُرے پیرایہ میں ذکر ہے (لوقا ۱۵ : ۱۵) پلید روحیں انسان سے نکل کر سؤروں کے گلہ میں داخل کی جاتی ہیں (متی ۸ : ۳۲) حضرت عیسیٰ نے جہاں بعض احکام شریعت موسوی میں ترمیم کی ہے وہاں سؤر کے گوشت کو ہرگز حلال قرار نہیں دیا بلکہ خود پطرس بھی سؤر کے ساتھ ان لوگوں کو مشابہت دیتا ہے جو بار بار گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں یعنی اس کو ناپاک قرار دیتا ہے (۲ پطرس ۲ : ۲۲) ۔ — *مردار وغیرہ کی حرمت شریعت یہود میں ۔ مسیح کا سؤر سے اظہار نفرت*

اسلام نے ان تین چیزوں کے علاوہ جن کا اثر صحت جسمانی کے علاوہ اخلاق پر بھی بُرا پڑتا ہے ایک چوتھی چیز حرام قرار دی ہے یعنی ہر جانور جو ویسے حلال ہو مگر ذبح کرتے وقت اس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور یوں شرک کو عملی رنگ میں جڑ سے کاٹا ہے ان چیزوں کی حرمت کی وجہ دوسری جگہ خود کلام پاک میں دی ہے دیکھو الانعام ۱۴۵ جہاں پہلی تین چیزوں کو رجس کہا ہے یعنی پلیدی گویا ان کا اثر جسم اور اخلاق پر بُرا ہے اور ما اھل بہ لغیر اللہ کو فسق کہا ہے مردار اور خون اور سؤر کے گوشت میں زہر کا ہونا آج ایک مسلم امر ہے اور اخلاق پر جو بد اثر پڑتا ہے اس پر خود واقعات شاہد ہیں ۔ مردار خوار قومیں جیسے ہمارے ملک میں چوہڑے ہمیشہ سے نہایت ذلیل حالت میں رہی ہیں خون پینا درندوں کا کام ہے اور اس سے درندگی پیدا ہوتی ہے اسی لئے اسلام نے ذبح کرنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے — *حرمت کی وجہ*

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ ۱۷۳

مگر جو شخص مضطر ہو جائے نہ خواہش کرنے والا ہو اور نہ حد سے گزرنے والا تو اس پر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے ۲۱۱ وہ لوگ

يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَـمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰۗىِٕكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ

جو اسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب سے اُتارا ہے اور اس کے عوض تھوڑی سی قیمت لیتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے

بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ښ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

کچھ نہیں ڈالتے اور اللہ قیامت کے دن ان سے کلام نہیں کریگا اور نہ انکو پاک کریگا اور ان کے لئے دردناک دکھ ہے ۲۱۲

تاکہ خون بہ جائے۔ سؤر کے گوشت کے کھانے سے جو دیوثی اور بے غیرتی انسانوں میں پیدا ہوتی ہے وہ آج کل کی مہذب قوموں کے فحش تعلقات اور عورتوں کے ننگے جسموں سے خود ظاہر ہے۔

سؤر کا گوشت عرب کے لوگ اسی طرح محبوب رکھتے تھے جس طرح آج یورپ اور امریکہ کی عیسائی اقوام محمد لحم الخنزیر اسی لئے کہا ہے ورنہ جس طرح اس کا گوشت حرام ہے اسی طرح دوسری اشیاء بھی۔ میتۃ سے مچھلی کو حدیث میں مستثنےٰ کیا ہے۔ اس لئے کہ اس میں خون نسبتاً اس قدر کم ہوتا ہے کہ اس کا اثر بدصحت پر نہیں پڑ سکتا۔

ضرورۃ۔ اضطرّ — **۲۱۱** اضطر۔ ضُرّ سے ہے اسی سے ضرورۃ بمعنی حاجت ہے اور اِضْطِرار باب افتعال ہے جس کی تا کو طا سے بدل دیا ہے اور اس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف حتیٰ بیارج اور اضطرہ کے معنی ہیں اس کو کسی چیز کا محتاج اور اس کی طرف مجبور کر دیا (ت) اور اضطرار انسان کی اپنی بے اختیاری اور دوسرے کے مجبور کرنے سے بھی ہوتا ہے اور ایسی صورت میں بھی کہ خود انسان اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا جیسے غذا (غ)

بغی۔ غیر باغ — غیر باغ۔ باغ بغی سے ہے جس کے معنی ہیں میانہ روی سے تجاوز کی خواہش کرنا ۱۵۸ پس غیر باغ سے مراد یہ ہوئی کہ وہ اپنے نفس میں اس کیلئے خواہش نہیں پاتا جیسا کہ مفردات میں ہے غیر طالب ما لیس لطالبہ گویا دل کراہت کرتا ہے۔

عاد — لا عاد۔ عاد۔ عدو بمعنی تجاوز سے ہے ۵۸ پس لا عاد سے مراد ہوئی کہ جس قدر کی ضرورت بقائے نفس کے لئے ہے اس سے تجاوز نہ کرے۔

حرمت غذا اور تقوی کا تعلق — **۲۱۲** اس رکوع کا خاتمہ پھر کتمان ہدایت پر کیا ہے۔ گویا ہدایت کے اصول و فروع کو بیان کر کے پھر اصل مضمون کی طرف توجہ دلادی ہے۔ اور ساتھ ہی پھر ظاہر سے باطن کی طرف رجوع کیا ہے۔ یہ قرآن کریم کا کمال ہے کہ برابر ظاہر سے باطن کی طرف اور باطن سے ظاہر کی طرف مضمون کا انتقال کرتا رہتا ہے۔ توحید کے بعد غذاؤں کا ذکر کیا تا معلوم ہو کہ غذائیں بھی انسان کے خیالات پر اثر ڈالتی ہیں۔ غذاؤں کا ذکر کرتے ہوئے پھر کلام کا انتقال باطن کی طرف کیا اور آگ کھانے والوں کا ذکر کیا تا مسلمان قوم یہودیوں کی طرح ظاہر پرست نہ ہو جائے اور حقیقی نیکی اور تقویٰ کو صرف چند ظاہری امور کی پابندی پر محدود نہ کر دے اور اندرونی پاکیزگی اور حقیقی تقویٰ کی راہوں سے غافل ہو جائے۔ آگ کھانے کا محاورہ اسی مناسبت سے اختیار کیا گیا ہے تا جسمانی غذاؤں کی حرمت کو ہی کافی نہ سمجھ لیا جائے۔

خدا کا دوزخیوں سے کلام نہ کرنا — اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا تو کلام سے مراد محبت کا کلام ہے جو ایک نعمت کے رنگ میں انسان کو دیا جاتا ہے۔ اور یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو پاک نہیں کرے گا اور رضوان سے

۱۷۵ أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَٰلَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ أَصْبَرَهُمْ

یہی وہ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اور مغفرت کے بدلے عذاب کو خرید لیا سو ان کا آگ پر جرأت کرنا

۱۷۶ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَٰبِ

کیسا عجیب ہے ۲۱۳ یہ اس لئے ہے کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اُتارا ہے اور جو لوگ کتاب کا خلاف کرتے ہیں وہ

۱۷۷ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝ لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ

ع ۲۲ الربع — قصاص اور وصیت کے احکام

یقیناً دور کی مخالفت میں ہیں ۲۱۴ بڑی نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے مونہوں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو لیکن بڑا نیک

الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَٰٓئِكَةِ وَالْكِتَٰبِ وَالنَّبِيِّنَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ

وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لئے قریبیوں

حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَٰمَىٰ وَالْمَسَٰكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّآئِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَ

اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلاموں کو آزاد کرنے میں مال دے اور

أَقَامَ الصَّلَوٰةَ وَآتَى الزَّكَوٰةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَٰهَدُوا ۖ وَالصَّٰبِرِينَ فِي الْبَأْسَآءِ

نماز کو قایم کرے اور زکوٰۃ دے اور اپنے اقراروں کو پورا کرنے والے جب وہ اقرار کریں اور صبر کرنے والے تنگی

کلام کرے گا یہ بھی بتا دیا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ہی گناہوں سے پاک کر دیتا ہے اور ان سے کلام کرتا ہے وہ گویا اسی عالم میں جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کتمان ہدایت میں دونوں باتیں داخل ہیں خود ہدایت پر عامل نہ ہونا اور دوسروں کو اس کا نہ پہنچانا ۔

صبر

۲۱۳ ما اصبرھم۔ صَبر کے اصل معنی اپنے آپ کو روک رکھنا ہیں۔ مگر بعض وقت جیسے یہاں یہ لفظ جرأت کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (غ) اسی کے مطابق مجاہد سے اس کے معنی مروی ہیں کیونکہ صبر اپنے حقیقی معنی میں تو ان کو میسر نہیں صبر تو یہ تھا کہ وہ معصیت سے رُکتے۔ مراد یہ ہے کہ وہ ایسے اعمال کر رہے ہیں جو ان کو آگ کی طرف لے جا رہے ہیں پس ان اعمال کی جرأت آگ پر جرأت ہے مَا یہاں تعجب کے لئے ہے استفہامیہ یا موصولہ بھی ہو سکتا ہے ۔

اختلاف فی الکتاب

۲۱۴ اختلفوا فی الکتاب۔ اختلاف کے معنی کے لئے دیکھو ۲۰۲ اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے جیسا کہ نزل الکتاب بالحق سے ظاہر ہے۔ اور ان کا اختلاف فی الکتاب یہ ہے کہ اس کے بارہ میں طریق حق پر چلنے سے پیچھے رہ گئے (ر) یعنی طریق حق پر نہ چلے اور کتاب کے بارہ میں اختلاف سے مراد اس کا رد کرنا بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ انکم لفی قول مختلف (الذاریات ۵۱ - ۸) سے ظاہر ہے اور یہ اختلاف ان کا یہ تھا کہ کبھی اس کو سحر کہتے کبھی کہانت کبھی شعر کبھی افترا۔ چونکہ یہ امر حق تھا اس لئے اس کے رد کرنے میں وہ کسی ایک قول پر قائم نہ رہ سکتے تھے ۔

وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○

اور تکلیف میں اور مقابلہ کے وقت یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اور یہی متقی ہیں ع۲۱۵

بر — ع۲۱۵ البر من اٰمن ۔ بِرّ کے اصل معنی التوسع فی الخیر ہیں یعنی نیکی میں وسعت اختیار کرنا۔ اس جملہ کی ترکیب ایسی ہے جیسے کہتے ہیں الجود حاتم۔ مراد ہوتی ہے الجود جود حاتم یعنی سخاوت حاتم کی سخاوت ہے۔ اسی طرح یہاں مراد ہے کہ راستبازی اس کی راستبازی ہے جو ایمان لاتا ہے وغیرہ۔ یا چونکہ زبان عربی میں مبالغہ کے وقت صفت کو بطور اسم استعمال کر لیتے ہیں جیسے بڑے سخی کو الجود کہدیتے ہیں۔ اور جیسے قرآن کریم میں حضرت نوح کے بیٹے کو کہا گیا انہ عمل غیر صالح۔ اسی طرح یہاں بِرّ بطور مبالغہ بڑے راستباز کو کہا گیا ہے ◆

علی حبہ — علی حبہ ۔ میں ضمیر عموماً مال کی طرف لی گئی ہے اور گو یہ سچ ہے کہ حقیقی ایثار یہی ہے کہ جس چیز سے محبت کرتا ہے اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرے جیسے فرمایا لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون (اٰل عمران ۳-۹۱) مگر یہاں یہ ضمیر اللہ کی طرف بھی جاسکتی ہے جیسے دوسری جگہ یطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیماً واسیرا (الانسان ۷۶-۸) فرما کر علی حبہ کی تفسیر اُس سے اگلی آیت میں خود ہی یوں کر دی انما نطعمکم لوجہ اللہ پس دونوں جگہ علی حبہ سے مراد اللہ کی محبت کیلئے ہے گویا یہ بتایا کہ خدا پر ایمان یہ ہے کہ اس کی محبت کیلئے اس کی مخلوق کی خدمت میں مشغول ہو جائے اور اپنے مال کو دوسروں کیلئے خرچ کرے اسلئے کہ وہ بھی اسی خدا کی مخلوق ہیں جس نے اسکو دیا ہے ◆

ابن السبیل — ابن السبیل ۔ ابن کے معنی کے لئے دیکھو ع۴۱ اور سبیل کے لئے ع۱۹۳ ابن السبیل مسافر کو کہتے ہیں ◆

سؤال — سائلین ۔ سُؤال کسی چیز کے جاننے کی استدعا ہے یا مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا جو معرفت یا مال کی طرف پہنچائے (غ)، اور کسی شے کی معرفت کا سوال بعض وقت اس غرض کے لئے ہوتا ہے کہ ایک بات کا علم لیا جائے اور بعض وقت اسلئے کہ دوسرے کو ملزم کرکے خاموش کیا جائے (غ)، اور اللہ تعالیٰ کا سوال بندوں سے کرنا اسی دوسری غرض سے ہے۔ اور قرآن شریف میں اکثر استعمال لفظ سُؤال کا معرفت کی استدعا ہی ہے جیسے یسئلونك ۔ سأل سائل ۔ سلھم ۔ یسئلون وغیرہ

سائل — اور سائل فقیر کو بھی کہتے ہیں (غ) یہاں سائلین سے مراد دونوں قسم کے سوال کرنے والے ہو سکتے ہیں ◆

رقبۃ ۔ رقاب — الرقاب ۔ رَقَبَۃ کی جمع ہے جس کے معنی گردن ہیں مگر اس سے مراد کل بھی لے لیا جاتا ہے اور تعارف میں مملوک یعنی غلاموں اور لونڈیوں کو رقاب کہا جاتا ہے جیسے راس یعنی سر اور ظہر یعنی پیٹھ سواری پر بولا جاتا ہے فتحریر رقبۃ مؤمنۃ

فی الرقاب — (النساء ۴-۹۲) (غ) اور یہاں جو فی الرقاب فرمایا تو اس لئے کہ وہ مال انکو نہیں دیا جاتا بلکہ انکے آزاد کرنے کیلئے یا انکے بارہ میں صرف کیا

رقب — جاتا ہے اور چونکہ انسان کو عموماً گردن سے مارا جاتا ہے اس لئے رَقَبَ کے معنی آتے ہیں اس کی حفاظت کی جیسے لا

رقیب — یرقبون فی مومن الا ولا ذمۃ (التوبۃ ۹-۱۰) اور اسی سے رقیب حفاظت کرنے والے کے معنی میں صفات الٰہی میں سے ہے

بأس ۔ باساء — البأساء ۔ بُؤس اور بأس اور بأساء تینوں کے معنی شدت اور مکروہ ہیں یعنی سختی اور امر ناپسندیدہ (غ)، اور بأس عذاب اور جنگ کی سختی کو بھی کہتے ہیں چنانچہ حدیث میں ہے کنا اذا اشتد البأس اتقینا برسول اللہ صلعم اور بأس کے معنی صرف حرب یعنی جنگ بھی ہیں اور بأساء کے معنی بھوک ہیں (ت) ◆

ضُر ۔ ضراء — الضراء ۔ ضُرّ سے ہے جس کے معنی سوء حال ہیں نفس کے متعلق ہو جیسے علم و فضل کی کمی سے یا بدن میں مثلاً کسی عضو کے نہ ہونے کی وجہ سے یا ظاہری حالت میں جیسے مال وجاہ کی کمی سے (غ)، اور بأساء کے مقابلہ پر نعماء ہے اور ضراء کے مقابلہ پر سراء اور بأساء کے ساتھ ضراء میں بأساء سے مراد فقر یا بھوک ہے اور ضراء سے مراد بیماری یا اور تکالیف ◆

۱۷۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو

صدق

صدقوا۔ صدق اور کذب کا اصل استعمال قول میں ہے صدق یہ ہے کہ قول ضمیر کے مطابق ہو اور جس بات کی خبر دی ہے وہ بھی سچ ہو اور یہ دونوں افعال جوارح پر بھی استعمال ہوتے ہیں جیسے رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ (الاحزاب ۳۳۔ ۲۳) میں صدقوا کے معنی ہیں عہد کو سچا کر دکھایا ان افعال کے ذریعہ سے جو کئے (غ) یہی معنی یہاں ہیں ۔

تفصیلات شریعت کے ذکر میں اصل اصول کی طرف توجہ دلانا

پچھلے رکوع سے تفصیلات شریعت کا ذکر شروع کیا تھا اور اسی ذکر کو آگے بھی جاری رکھا ہے جیسے اس رکوع میں بھی قصاص اور وصیت کا ذکر ہے۔ چونکہ بعض قوموں نے تفصیلات شریعت پر اس قدر زور دیا کہ اصل غرض کو جو باطنی طہارت تھی بھول گئے اس لئے ان تفصیلات کے ذکر میں ایک خاص اصول سمجھا دیا اور وہ یہ کہ صرف ظاہری تفصیلاتِ شریعت پر زور دینے سے جبکہ مغز شریعت کو مدنظر نہ رکھا جائے کوئی انسان حقیقی راستبازی کو حاصل نہیں کر سکتا۔ تفصیلات شریعت میں سب سے بڑا

کعبہ کی طرف منہ کرنیکو اسلام نے کیا اہمیت دی ہے۔

حکم کعبہ کی طرف منہ کرنے کا ہے یہاں تک کہ اس کو اسلام کا ظاہری نشان قرار دے کر فرمایا کہ اہل قبلہ کی تکفیر مت کرو۔ مگر باایں فرمایا کہ وہ راستبازی جس کی طرف اللہ تعالیٰ تم کو بلاتا ہے ان تفصیلات شریعت پر عمل کر لینے کا نام نہیں۔ یہاں تک کہ ایک خاص سمت کی طرف منہ کر لینا بھی وہ نیکی نہیں۔ یہاں پھر ان معترضین کا بھی جواب ہے جو کہتے ہیں کہ مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے ایک مشرکانہ فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔ کیونکہ فرمایا کہ کسی خاص سمت میں منہ کر لینا تو کوئی بڑی عظیم الشان نیکی بھی نہیں چہ جائیکہ اس سمت کی عبادت ہو یہ آیت ان آیات قرآنی میں سے ایک ہے جنہوں نے اپنی علو مرتبت کا خراج سخت ترین دشمنوں سے بھی وصول کیا ہے ۔

تکالیف میں صبر قوم کی کامیابی کا اصل گر ہے

اس آیت میں قوم کی کامیابی کا اصل گر یہ بتایا ہے کہ وہ مشکلات کے مقابلہ کے وقت گھبرائے نہیں۔ اسی لئے اس کا خاتمہ والصابرین فی الباساء والضراء وحین الباس پر کیا ہے۔ اور حالانکہ من اٰمن سے لے کر والموفون تک رفع ہے مگر والصابرین کو منصوب کر دیا ہے۔ اور یہ نصب علی المدح ہے یعنی خصوصیت سے توجہ دلانا اس کی طرف مقصود ہے کہ یہی بڑا مہتم بالشان امر ہے یعنی تنگی اور تکلیف میں اور مقابلہ کے وقت نہ صرف انسان استقلال رکھے بلکہ قدم آگے بڑھانے اور یہی اصل مضمون اس سورت کا چلتا ہے ۔

ایمان کا مفہوم

جن امور کو یہاں راستبازی صدق اور تقویٰ کی جزو قرار دیا ہے وہ یہ ہیں۔ اول اصول صحیحہ کا قبول کرنا جن میں سے پہلے اللہ پر ایمان ہے اللہ تعالیٰ کے علم کامل اور قدرت کاملہ پر ایمان لانے سے انسان کے اندر نیکیوں کی قوت پیدا ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو سرچشمہ قدوسیت جانتا ہوا خود پاک ہونے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اللہ پر ایمان لا کر سارے اخلاق الٰہی کو اپنے اندر لینے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح ہر ایک قسم کی بری باتوں سے رکتا اور ہر ایک قسم کی نیکی کی طرف قدم اٹھاتا ہے دوسرے آخرت پر ایمان یعنی ہر ایک عمل کی جزا و سزا کا قائل ہونا اور اس لئے اپنے ہر ایک عمل میں اپنی ذمہ واری کو مد نظر رکھنا تیسرے فرشتوں پر ایمان یعنی نیکی کی تحریک کو جب دل میں پیدا ہو فوراً قبول کر لینا۔ چوتھے کتاب پر ایمان یعنی اللہ تعالےٰ نے جو ہدایات انسان کی بہتری کے لئے نازل کی ہیں ان پر عمل پیرا ہونا۔ پانچویں نبیوں پر ایمان یعنی جس طرح پر انبیاء نے ان تعلیمات پر عمل کر کے دکھایا ان کے نمونہ اور نقش قدم پر چلنا ۔

ایثار

دوسرا عظیم الشان اصل کامیابی کا عملی رنگ رکھتا ہے اور وہ ایثار ہے یعنی اپنے مال کا دوسروں کی بہبودی کے لئے خرچ کرنا۔ ان میں مقدم انسان کے اپنے قریبی ہیں۔ اولاد۔ ماں باپ۔ بھائی بہن اور رشتہ دار۔ پھر یتیم ہیں جن کا خبر

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى

مقتولوں کے بارے میں تم پر قصاص مقرر کیا گیا ہے [۲۱۶]

کوئی نہیں۔ اس لئے ہر ایک قوم کے فرد سے وہ ذوی القربیٰ کا ہی تعلق رکھتے ہیں۔ پھر مسکین ہیں جو خود کام کاج کرنے سے

دشمنوں سے پیار کا عملی رنگ

عاجز ہیں یا جن کے پاس کام کرنے کا ضروری سامان نہیں۔ پھر مسافر ہیں۔ پھر سائل ہیں۔ پھر گردنوں کا آزاد کرنا۔ یا غلامی کی حالت میں پڑے ہوئے لوگوں کو اس حالت سے باہر نکالنا۔ غلامی کی حالت میں وہی لوگ آتے تھے جو جنگوں میں قید ہوجاتے تھے۔ اور وہ گویا دشمن ہیں پس یہاں دشمنوں سے پیار اور محبت کی نری مُنہ سے تعلیم نہیں بلکہ عملی رنگ میں ان سے نیکی کا حکم دیا کہ ان کی آزادی کا فکر کیا جائے۔ اس زمانہ میں تو کم ہی مسلمان ہیں جن کی گردنیں آزاد ہیں اور جو غلامی کی حالت میں نہیں پس مسلمانوں کی بہتری پر ان کی تعلیم پر ان کی ترقی پر روپیہ خرچ کرنا بھی اس کے اندر آجاتا ہے ✦

نماز اور زکوٰۃ

اس کے بعد تیسرا اصل فرمایا نماز قائم کرے جو انسان کے اپنے نفس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے اور زکوٰۃ دے جو دوسروں کی بہبودی کے لئے ہے ✦

ایفائے عہد

اس کے بعد چوتھا اصل فرمایا کہ عہد کرے تو اس عہد کو پورا کرے خواہ اس کی وجہ سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اُٹھانا پڑے اور خواہ وہ اقرار کافر سے ہو یا مسلمان سے۔ آج مہذب ممالک میں اقرار کی پابندی اس وقت تک ضروری سمجھی جاتی ہے جب تک اپنا مطلب نکلتا ہو اور بس۔

صبر سب سے بڑا اصل کامیابی کا ہے

اور آخر میں پانچواں اور سب سے ضروری اصل بیان کیا اور وہ صبر ہے تنگی میں جب فقر و فاقہ اُٹھانا پڑے۔ دُکھ درد اور تکلیف کی حالت میں جب انسان کو جسمانی طور پر دکھ پہنچ رہا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر حین الباس۔ مشکلات سے مقابلہ کے وقت میں یا دشمن سے مقابلہ کے وقت میں جیسے جنگ کی حالت میں یہی اصل گر کامیابی کا ہے۔ اسی لئے اس کو آخر پر رکھا اور منصوب علی المدح کیا جن قوموں میں پہلی چار چیزیں نہیں وہ بھی صبر سے کامیاب ہوجاتی ہیں مگر حقیقی نیکی اور راستبازی ان کے اندر پیدا نہیں ہوتی ✦

آخر پر فرمایا کہ دعویٰ ایمان میں یہی لوگ سچے ہیں اور متقی بھی یہی ہیں ✦

کتاب

۲۱۶ کتب۔ کتاب کے معنی کے لئے دیکھو ۹۔ مگر کتابۃ کے معنی اثبات یعنی ایک چیز کا قائم کرنا اور تقدیر یعنی اندازہ کرنا اور ایجاب یعنی واجب کرنا اور فرض کردینا اور عزم بھی آتے ہیں کیونکہ پہلے ایک چیز کا ارادہ کیا جاتا ہے پھر کہی جاتی ہے پھر لکھی جاتی ہے گویا اس کا مبداء ارادہ ہے اور اس کا منتہا لکھنا (غ)۔ اس لئے مقرر کرنے یا فرض کرنے کے معنی میں کثرت سے یہ لفظ قرآن شریف میں آیا ہے جیسے یہاں اور آیت ۱۸۰ میں كتب عليكم..... الوصية اور آیت ۱۸۳ میں كتب عليكم الصيام اور آیت ۱۸۷ میں وابتغوا ما كتب الله لكم اور آیت ۲۱۶ میں كتب عليكم القتال اور بہت سے دیگر مقامات پر اور اسی لئے

کتاب اللہ

کتاب اللہ سے مراد اللہ کا حکم بھی ہوتا ہے جیسے اولوا الارحام بعضهم اولى ببعض فى كتاب الله (الانفال ۸۔ ۷۵) میں کتاب اللہ سے مراد اللہ کا حکم ہے۔ (غ) ✦

قص

قصاص۔ قصّ سے ہے جس کے معنی نقش قدم کے پیچھے چلنا ہے فارتدا على آثارهما قصصا (الكهف ۱۸۔ ۶۴) وقالت

قصص

لاخته قصيه (القصص ۲۸۔ ۱۱) اسی سے قصص اخبار بیان کرنے کے معنی میں ہے نحن نقص عليك احسن القصص

قصاص

(یوسف ۱۲۔ ۳) اور قصاص کے معنی ہیں تتبع الدم بالقود (غ) یعنی خون کا پیچھا کرنا اس طرح پر کہ قاتل کو قتل کیا جائے اور حدیث میں ہے من قتل عمداً فهو قود جس کے معنی ہیں کہ جو شخص عمداً قتل کرے اسکو مقتول کے بدلہ میں قتل کیا جائے (ل۔ ت۔ د)۔ پس قصاص فى القتلى یہ ہی کہ جس شخص نے کسی دوسرے کو قتل کیا ہو اسے قتل کیا جائے قصاص کے اس معنی کو مدنظر رکھکر اگلے الفاظ کے معنی میں کوئی دقت نہیں رہتی ✦

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ

آزاد ہو تو آزاد غلام ہو تو غلام عورت ہو تو عورت ۲۱۷ مگر جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے

اَخِيْهِ شَىْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ

کچھ معافی دی گئی ہے تو عمدگی سے پیروی کرنا چاہئے اور نیکی کے ساتھ اس کی ادائیگی کی جائے یہ

تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور مہربانی ہے پس جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے گا اس کے لئے دردناک دکھ ہے ۲۱۸

حکم قصاص کی مناسبت

اس آیت میں مقتول کے بارہ میں قصاص کا حکم دیا ہے یعنی قاتل کو قتل کر دیا جائے۔ اس کا ذکر یہاں اس مناسبت سے کیا ہے کہ مسلمانوں کے اب اپنے دکھ دینے والوں اور قتل کرنے والوں سے قصاص لینے کا وقت آگیا تھا۔ قرآن کریم

زخموں میں قصاص

میں قصاص کا حکم صرف قتل کی صورت میں ہے۔ زخموں میں قصاص کا حکم نہیں۔ صحابہ نے ضرورت زمانہ کے لحاظ سے کر لیا ہو تو جزاء سیئة سیئة مثلہا کے ماتحت ہے۔ اور اسی کے ماتحت ایک بدی کے مناسب حال اور سزا دی جا سکتی ہے۔ مگر قتل میں صراحت سے قصاص کا حکم ہے پس اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں قاتل کے لئے قتل کی سزا کو ہی ضروری قرار دیا ہے اس سزا کو دنیا سے اٹھانے کے لئے جتنی کوششیں کی گئی ہیں سب ناکام ہوئی ہیں۔ فرانس میں کچھ عرصہ کے لئے سزا قتل موقوف کی گئی تھی جس کا نتیجہ جرائم قتل میں خطرناک اضافہ ہوا پس یہ بتایا ہے کہ قتل میں قصاص تمدن و تہذیب کی ضروریات میں سے ہے +

قصاص میں کوئی امتیاز حیثیت یا مرتبہ کا نہیں

۲۱۷ جب اوپر قصاص کا حکم صاف الفاظ میں بیان کر دیا یعنی یہ کہ قتل کا حکم قاتل پر ہے نہ کسی دوسرے پر تو یہاں ایک ایسے امر کی طرف توجہ دلائی جس میں ایک رسم قبیح کی بیخکنی مقصود تھی۔ عرب میں رواج تھا کہ بعض قومیں اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتی تھیں اس لئے ان کا غلام قتل ہو جائے تو وہ کہتے تھے کہ ہم اس کی جگہ آزاد کو قتل کرینگے۔ ایسا ہی یہ بھی رواج تھا کہ آزاد غلام کو قتل کر دے تو اس آزاد کو قتل نہ کیا جاتا تھا۔ ایسا ہی اب بھی رواج ہے کہ بعض قومیں جو اپنے آپ کو زیادہ مہذب خیال کرتی ہیں ان کا کوئی آدمی کسی ماتحت قوم کے آدمی کو قتل کر دے تو وہ اس سے قصاص نہیں لیتیں پس جب اسلام نے قصاص کا حکم دیا یعنی یہ کہ قاتل کو قتل کیا جائے تو ساتھ ہی تمام امتیازات کو بھی اٹھا دیا۔ اور فرمایا کہ قاتل آزاد ہو تو وہی قتل کیا جائے۔ عورت قاتل ہو تو وہی قتل کی جائے۔ غلام قاتل ہو تو وہی قتل کیا جائے۔ اور سارے امتیازات قومی و امتیازات مرتبہ کو اٹھا دیا چنانچہ حدیث میں بھی آتا ہے المسلمون تتکافأ دماءھم یعنی سب مسلمانوں کے خون برابر ہیں اور قاتل خواہ کوئی ہو یہ عذر نہیں کر سکتا کہ اس کا خون مقتول سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس لئے امام ابو حنیفہ کے مذہب میں آزاد غلام کو قتل کر دے تو آزاد قتل کیا جائے گا اور یہی قرآن شریف کا مذہب ہے +

خون بہا

۲۱۸ اس حصہ میں یہ اجازت دی ہے کہ اگر مستغیث یعنی وارث قاتل خونبہا پر راضی ہو جائے تو دیت کا لے لینا جائز ہے اس زمانہ میں بھی بعض حالات میں خون بہا کے لینا جائز ہے جیسے ایک سلطنت کا باشندہ دوسری سلطنت کی کسی رعایا کو خاص حالات میں قتل کر دے تو ہرجانہ ہی کافی معاوضہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے اس لئے ہر قسم کی گنجایش اس کی تعلیم میں موجود ہے +

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ ۱۷۹

اور اے عقل والو تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم بچے رہو ۲۱۹

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ ۱۸۰

تم پر جب تم میں سے کسی کے لئے موت آموجود ہو عمدگی کے ساتھ وصیت کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ہے

لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ○

اگر وہ بہت سا مال ماں باپ کے لئے اور قریبیوں کے لئے چھوڑے یہ متقیوں پر لازم ہے ۲۲۰

قصاص قوم کی زندگی کی بنیاد ہے۔

۲۱۹ اگر دنیا میں قتل کی سزا قتل نہ ہوتی تو کسی قوم کے لئے بھی امن کی زندگی نہ ہوتی جن قوموں نے قتل میں قصاص کو اُڑانے کی کوشش کی ہے۔ ان میں قتل کے واقعات ان میں اس قدر بڑھتے ہیں کہ مجبوراً پھر اسی سزا کی طرف رجوع کرنا پڑا ہے یہ بھی اشارہ ہے کہ مسلمانو جب تم کو تلوار سے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اب قصاص لئے بغیر تم بھی زندہ نہیں رہ سکتے ◆

خیر

۲۲۰ خیر کے معنی لغت میں اور صحابہ سے مال کثیر مروی ہیں چنانچہ مفردات میں ہے کہ بعض علما کا یہ قول ہے کہ مال کو خیر نہیں کہا جاتا جبتک کہ وہ کثیر نہ ہو اور مکان طیب سے نہ ہو ◆

حکم وصیت منسوخ نہیں

یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جن پر منسوخی کا حکم قطعی سمجھا جاتا ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ پہلے وصیت کا حکم دیا گیا پھر سورہ نساء میں وراثت کا حکم نازل کرکے اسے منسوخ کیا گیا۔ مگر اس کے متعلق غیر منسوخ ہونے کے اقوال بھی موجود ہیں چنانچہ ابن جریر میں ہے کہ ایک جماعت نے قائلین منسوخی کی مخالفت کی ہے۔ اور انہوں نے اسے غیر منسوخ قرار دیا ہے۔ بیضاوی میں بھی اس کے منسوخ نہ ہونے کا قول موجود ہے ◆

قرآن و حدیث کی شہادت

حق یہ ہے کہ اس کے غیر منسوخ ہونے کی قرآن شریف اور حدیث صحیح سے کھلی کھلی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف سے تو یوں تائید ہوتی ہے کہ وراثت کے حکم میں ہر جگہ ساتھ ساتھ من بعد وصیۃ کا لفظ موجود ہے یعنی تقسیمِ ترکہ وصیت کے نفاذ کے بعد ہو پس وہ وصیت اور کونسی ہے اگر یہ منسوخ ہے؟ اور دوسرے سورہ مائدہ میں جو آخری سورتوں میں سے ایک ہے صاف طور پر وصیت لکھا جانے اور اس پر عملدرآمد کرنے۔ گواہی لینے وغیرہ کا حکم موجود ہے۔ دیکھو المائدہ آیت ۱۰۶ و ۱۰۷ ◆

حدیث سے اس کا غیر منسوخ ہونا قطعی طور پر ثابت ہے۔ سعد بن ابی وقاص سے متفق علیہ حدیث ہے کہ میں فتح مکہ کے سال بیمار ہو گیا (یعنی آیت وراثت کے نزول کے مدت بعد) رسول اللہ صلعم میری عیادت کے لئے تشریف لائے۔ تو میں نے کہا یا رسول اللہ میرے پاس بہت سا مال ہے اور ایک ہی بیٹی میری وارث ہے میں سب مال کی وصیت کر دوں آپ نے فرمایا نہ پھر میں نے دو تہائی کے لئے عرض کی۔ پھر نصف کے لئے آپ نے انکار ہی کیا پھر میں نے ایک تہائی کے لئے عرض کیا تو آپ نے ایک تہائی کی وصیت کرنے کو قبول کیا اور فرمایا اگر تم اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ دو تو اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو غریب چھوڑو۔ اس حدیث سے جو نبی کریم صلعم کی زندگی کے آخری ایام کی ہے صاف ظاہر ہے کہ حکم وصیت اس وقت تک غیر منسوخ سمجھا جاتا تھا اور نہ صرف ایک صحابی نے ہی اسے غیر منسوخ سمجھا بلکہ خود آنحضرت صلعم نے بھی اسے غیر منسوخ قرار دیا۔ اور وصیت کرنے کو جائز رکھا۔ ہاں نبی کریم صلعم نے یہ ضروری قرار دیا

۱۸۱ فَمَنۡۢ بَدَّلَهٗ بَعۡدَمَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثۡمُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ يُبَدِّلُوۡنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ

پھر جو کوئی اسکے بعد جو اسے سُن لیا ہو اسے بدل دے تو اسکا گناہ انہی پر ہے جو اسے بدلتے ہیں یقیناً اللہ سننے والا جاننے والا

۱۸۲ عَلِيۡمٌ ؕ فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا فَاَصۡلَحَ بَيۡنَهُمۡ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ④

ہے۔ مگر جسے وصیت کرنیوالے کیطرف سے طرفداری یا گناہ کا خوف ہو پھر وہ انکے درمیان صلح کرائے تو اسپر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے ۲۲۱ع

ایک تہائی مال کی وصیت

کہ ورثا کو بالکل محروم نہ کیا جائے اس لئے ایک تہائی تک مال کی وصیت کردی جائے۔ دوسرے اس سے معلوم ہوا کہ اس وصیت سے مراد خیراتی کاموں کے لئے وصیت ہے۔ نہ رشتہ داروں اور قریبیوں کے لئے۔ اسی لئے

خیراتی کاموں کیلئے وصیت

میں نے آیت کے معنی کرنے میں یہ ترکیب اختیار کی ہے کہ للوالدین والاقربین کا تعلق ان ترک خیرا سے ہے یعنی جو شخص مال کثیر ماں باپ اور قریبیوں کے لئے چھوڑے وہ وصیت کرے۔ ماں باپ اور قریبیوں کے لئے وصیت کرنا مراد نہیں تیسرے معلوم ہوا کہ خیر سے مراد آنحضرتؐ کے سامنے بھی مال کثیر ہی لیا گیا کیونکہ خود حضرت سعدؓ نے یہ کہا کہ میرا مال کثیر ہے اور اسی بنا پر وصیت کی اجازت چاہی ✦

پس اس حدیث متفق علیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کے معنی یوں سمجھے جاتے تھے اور خود آنحضرت صلعم نے بھی لئے کہ جب ایک شخص کا ترکہ بہت سا ہو تو وہ کچھ حصہ کی وصیت خدا کی راہ میں کر دیا کرے ورثا کے لئے

ورثا کیلئے وصیت نہیں

وصیت کی ضرورت تو اس لئے بھی نہیں کہ ان کے حصے خود قرآن شریف نے مقرر کروئے۔ اور حدیث لا وصیۃ لوارث گو احاد میں سے ہے۔ مگر قرآن کریم کے مطابق ہے۔ ہاں بعض صورتوں میں جب اقربا کو وراثت کا حصہ نہ ملتا ہو تو وہ بھی

حضرت علی کا فیصلہ

وصیت میں شریک ہو سکتے ہیں دوسری روایات سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے متعلق روایت ہے کہ جب ان کے ایک آزاد کردہ غلام نے جس کا ترکہ سات سو درہم تھا وصیت کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے

حضرت عائشہ کا فیصلہ

اسے روک دیا اور فرمایا یہ خیر یعنی مال کثیر نہیں ہے اور حضرت عائشہؓ سے کسی شخص نے پوچھا کہ میرے پاس تین ہزار درہم ہے اور چار وارث ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ تھوڑی سی چیز ہے اپنے عیال کے لئے چھوڑ دو۔ یہ خیر یعنی مال کثیر نہیں ہے پس ایک حدیث متفق علیہ میں رسول اللہ صلعم کا اپنا فیصلہ دوسرے حضرت علیؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کا فیصلہ جن کا فہم قرآن مسلم امر ہے۔ اس آیت کے معنی کا قطعی فیصلہ کرتے ہیں اور اسے غیر منسوخ قرار دیتے ہیں اور مراد اس سے صرف اسی قدر ہے کہ جو شخص اپنے ورثا کے لئے مال کثیر چھوڑے وہ کچھ حصہ اس مال کا فی سبیل اللہ بھی وصیت کرے مسلمانوں میں آج اس پر عمل متروک ہے مگر دوسری قومیں ایسی وصیتیں کرتی ہیں کس قدر مصیبت ہے کہ پیروان قرآن قرآن پر عامل نہیں منکرین قرآن اس پر عامل ہیں ✦

اور اگر یوں بھی معنی کئے جائیں کہ اگر کوئی شخص مال کثیر چھوڑے تو اس کے لئے اپنے والدین اور قریبیوں کیلئے وصیت کرنا مقرر کیا گیا ہے تو بھی آیت کو منسوخ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں وصیت پر عملدرآمد کرانے والے والدین اور اقربین مراد لئے جائیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ بعض صورتوں میں والدین کو ورثہ نہ ملتا ہو تو ان حالات پر یہ حاوی ہو جیسے مثلاً والدین کافر ہوں اور قریبی تو بہتیرے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو حصہ نہیں پہنچتا ان کے لئے وصیت ہو سکتی ہے یا اگر کوئی اور صورت تسلیم نہ کی جائے تو حدیث لا وصیۃ لوارث کو آیت کے مقابلہ میں منسوخ قرار دیا جائے گا ✦

جنف

۲۲۱ جنف حکم یعنی فیصلہ کرنے میں ایک طرف جھک جانے کا نام ہے حق سے باطل کی طرف جھکنا (غ)،

ع ۲۳ روزہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ ۱۸۳

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے لئے روزے ضروری ٹھہرائے گئے ہیں جیسے کہ ان لوگوں کیلئے

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

ضروری ٹھہرائے گئے جو تم سے پہلے تھے ۲۲۲ تاکہ تم متقی بنو ۲۲۳

وصیت کے وقت صلح

اثم سے مراد عمداً خلاف ورزی حکم الٰہی ہے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر وصیت کرنے والا کسی وارث کے حق کو تلف کر رہا ہو یا خلاف ورزی حکم الٰہی میں کوئی مال وصیت کرنے لگے تو دوسروں کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کرد جیسا کہ سعد بن ابی وقاص کے معاملہ میں رسول اللہ صلعم نے کیا ۔

صوم

۲۲۲ الصیام ۔ صَوم اصل میں ایک فعل سے رکنے کا نام ہے کھانا ہو یا کلام یا چلنا انی نذرت للرحمٰن صوماً (مریم ۱۹ ۔ ۲۶) کلام سے رکنے کو صوم کہا ہے جیسے فلن اکلم الیوم انسیا سے خود ظاہر ہے ۔ اصطلاح شریعت میں اس شخص کا جو احکام شریعت کا مکلف ہو چکا ہے صبح کی سفیدی کے نمودار ہونے سے رات کی سیاہی کے نمودار ہونے (یعنی غروب آفتاب) تک ارادۃً کھانا کھانے پانی پینے اور جماع سے رکا رہنا ہے (غ) اور اس کے ساتھ جیسا کہ احادیث نے وضاحت کر دی ہے ہر ایک لغو یا ناجائز فعل یا قول کا ترک بھی شامل ہے ۔

روزہ سب قوموں میں پایا جاتا ہے

روزہ کا دنیا کی سب قوموں میں پایا جانا جس کی طرف یہاں قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے ایک حقیقت ہے اور دنیا کی کوئی قوم نہیں جس نے روزہ کو عبادات میں نہ رکھا ہو ۔ صرف عیسائیوں نے شریعت کو جواب دے کر روزوں کا انکار کیا ہے گو اب ان کے حکما بھی کسی نہ کسی رنگ میں روزہ کی ضرورت کے کو جسمانی فوائد کی خاطر ہی سہی قائل ہو رہے ہیں ۔ مگر تعجب یہ ہے

حضرت عیسیٰ کا روزہ رکھنا اور روزہ کی تعلیم دینا

کہ حضرت عیسیٰ کا انا جیل سے نہ صرف خود روزے رکھنا ثابت ہے بلکہ اپنے پیرووں کے لئے روزے رکھنے کی تعلیم موجود ہے اور عیسائیت کا موجودہ خیال کہ شریعت پر عمل کرنے کا فائدہ نہیں پولوس کا خیال ہے متی ۴: ۲ سے مسیح کا روزہ رکھنا ثابت ہے "اور جب چالیس دن اور چالیس رات روزہ رکھ چکا آخر کو بھوکا ہوا" اور متی ۶: ۱۶ میں ہے "جب تم روزہ رکھو ریا کاروں کی مانند اپنا چہرہ اُداس نہ بناؤ" اور متی ۶: ۱۸ میں روزہ کے ثواب کا ذکر ہے ۔ "اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکارا تجھے بدلہ دے" اگر عبادت پر ثواب ملتا ہے اور مسیح کی تعلیم بھی یہی ہے تو کفارہ کا عقیدہ باطل ہے ۔ اور لوقا ۵: ۳۳-۳۵ سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح نے کہا تھا کہ ان کے شاگرد ان کے بعد بہت روزے رکھینگے "پر وے دن آوینگے کہ دولہا ان سے جدا کیا جائے گا ان دنوں میں وے البتہ روزہ رکھیں گے "۔

روزہ کی غرض

۲۲۳ یہ روزہ کی علت غائی ہے پہلی قوموں میں جو روزہ رکھنے کا رواج تھا وہ جیسا کہ پادری کروڈن نے بحوم بائبل میں لکھا ہے غم اور رنج و مصیبت کے وقت تھا گویا ظاہر صورت میں غم اور مصیبت اختیار کی جاتی تھی اسلام نے روزہ کی غرض یہ بیان کی ہے کہ تم متقی بنو یعنی تمہارے اندر بدی کی طاقتیں کمزور اور نابود ہوں اور نیکی کی قوتیں نشوونما پائیں کیونکہ انسان کی ہر ایک قوت اپنے کمال تک پہنچنے کے لئے اس بات کی محتاج ہے کہ اسے نشوونما دی جائے اور روزہ میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری کیلئے حلال چیزوں کو ترک کیا جاتا ہے پس روزہ سے خواہشات کو ترک کرنے کی قوت انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے اور یہی قوت انسان کو اپنے نفس پر حاکم بنا کر اعلیٰ سے اعلیٰ پاکیزگی اور نیکی کے مقام پر پہنچاتی ہے ۔ اسلام نے ہر ایک چیز کو ایک قاعدہ اور ضبط کے ماتحت کیا ہے اور وقت پر کھانا عین تعلیم اسلامی کے مطابق ہے ۔ روزہ میں اس ضبط کو توڑنا مقصود

۱۸۴ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ

چند دن ۲۲۴ پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اور دنوں میں گنتی (پوری) کرلی جائے ۲۲۵

خواہشات پر حکومت کی تعلیم

نہیں بلکہ انسان کے اندر یہ قوت پیدا کرنا مقصود ہے کہ خواہشات حیوانی جو کھانے پینے اور زوج کی طرف رجوع کرنے سے تعلق رکھتی ہیں انسان کے اقتدار کے نیچے ہوں اور ایسا نہ ہو کہ انسان ان کا غلام اور ان کا محکوم بن جائے۔ روزہ میں خواہشات حیوانی پر قابو پانے کی عملی راہ بتائی ہے پس اسلام دوسرے مذاہب سے یہ امتیاز رکھتا ہے کہ روزہ کو انسان کے زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول کا ذریعہ بنا دیتا ہے ✦

عدّ

۲۲۴ معدودات آیت ۸میں ایاما معدودۃ آیا ہے عدّ کے معنی اعداد کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانا یا گنتی کرنا ہے وعدھم عدًّا (مریم ۱۹-۹۴) فسئل العادین (المومنون ۲۳-۱۱۳) یعنی گننے والے یا حساب رکھنے والے الف سنۃ مما تعدّون (السجدۃ ۳۲-۵) اور پھر محض گنتی سے تجاوز کر کے کئی طرح پر عدّ کا استعمال ہوتا ہے مثلاً کسی چیز کو معدود کہا جاتا ہے جب قلت

معدود

ظاہر کرنا مقصود ہو اور اس صورت میں اس کا مقابلہ اس سے ہوتا ہے جو اپنی کثرت کی وجہ سے گنتی میں نہیں لائی جاسکتی (غ)، اور یہی یہاں مراد ہے چنانچہ مقاتل کہتے ہیں کہ معدود یا معدودات کا لفظ جہاں جہاں قرآن شریف میں آیا ہے تو اس سے مراد چالیس سے کم ہے دس خواہ چالیس ہوں جیسے آیت ۸۰ میں یا تیس جیسے یہاں آگے شہر رمضان کہکر بتا بھی دیا ہے یا تین جیسے واذکروا اللہ فی ایام معدودات (آیت ۲۰۳) میں اور آگے آتا ہے عدۃ من ایام اُخر اور لتکملوا

عِدّت

العدۃ۔ تو عِدّۃ کے معنی الشئ المعدود ہیں یا گنی گنی چیز اور محض گننا بھی جیسے وما جعلنا عدتھم (المدثر ۷۴-۳۱) اور عورت کی عِدّۃ وہ دن ہیں جن کے گزرنے پر اس کا نکاح کرنا جائز ہے (غ) ✦

عاشورا کا روزہ

یہاں ایاما معدودات سے مراد رمضان کا مہینہ ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ عاشورا کا روزہ یا بعض اور روزے جو نبی کریم صلعم اس حکم کے آنے سے پہلے رکھتے تھے وہ محض نفل کے طور پر تھے نہ وحی الٰہی کے حکم سے اور اس لئے ایاما معدودات میں ان کی طرف اشارہ نہیں چنانچہ ابن جریر نے دونوں قسم کے اقوال نقل کر کے لکھا ہے کہ میرے نزدیک درست قول اسی شخص کا ہے جو کہتا ہے کہ ایاما معدودات سے اشارہ شہر رمضان کی طرف ہے۔ کیونکہ کوئی حدیث ایسی نہیں جس سے حجت قائم ہوسکے کہ کبھی اہل اسلام پر کوئی روزے سوائے رمضان کے فرض کئے گئے ہوں اور پھر وہ رمضان کے روزوں سے منسوخ ہوگئے ہوں (ج)، اور بخاری میں جو عاشورا کا روزہ رکھنے کا حکم ہے تو یہ یا نزول آیت سے پہلے تھا یا صرف بطور نفل ✦

مریض۔ مرض

۲۲۵ مرضیٰ۔ مَرِیض کی جمع ہے۔ اور مَرَض اس اعتدال سے خروج کا نام ہے جو انسان سے خاص ہے۔ اور یہ جسم میں بھی ہوسکتی ہے اور اخلاق میں جہل بخل نفاق بزدلی وغیرہ کو بھی مَرَض کہا جاتا ہے (غ)، اور مَرَض کے اصل معنی نقصان ہیں اس لئے ارض مریضۃ اس زمین کو کہتے ہیں جو کمزور ہو اسی طرح شمس مریضۃ جب سورج پوری روشنی نہ دے (ت) ✦

سفر۔ سافر
سفرۃ۔ سِفر
اسفار

سفر۔ سَفر کے اصل معنی کشف الغطاء ہیں یعنی پردہ کا اٹھا دینا (غ)، اسی لئے سَافِر لکھنے والے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک چیز کو کھول دیتا ہے اور واضح کر دیتا ہے اس کی جمع سفرۃ ہے بایدی سفرۃ (عبس ۸۰-۱۵) (ت)، اور سِفر کتاب کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ حقائق کا انکشاف کرتی ہے اس کی جمع اسفار ہے کمثل الحمار یحمل اسفارا (الجمعۃ ۶۲-۵) (غ)، اور حدیث میں اسفروا بالفجر آتا ہے یعنی فجر کو اچھی طرح روشن ہو جانے دو (ت)، اور مسافر کو مسافر اس لئے کہا

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ

اور جو اس میں مشقت پاتے ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں ۲۲۶

جاتا ہے کہ وہ مکان سے الگ ہو گیا اور مکان اس سے (غ) پس سفر مکان سے دور ہو جانے کا نام ہے ✦

روزہ چھوڑنے کیلئے بیماری کی حد

بیماری کیسی ہو۔اس میں افراط و تفریط دونوں سے بچنا چاہئے یہ کہنا کہ مرض ایسا خطرناک ہو کہ انسان کے فوراً مر جانیکا خطرہ ہو یا یہ کہ ادنیٰ سے ادنیٰ تکلیف ہو تو روزہ ترک کر دیا جائے دونوں غلط راہیں ہیں۔ اگر روزے رکھنے سے دوائی کا نہ پینا۔ یا بار بار ہلکی غذا کا نہ پہنچنا یا اور کوئی وجہ بیماری کے بڑھانے کا موجب ہو تو روزہ ترک کرنا چاہئے۔ ہاں بخاری میں عطا کا قول ہے یفطر من المرض کلہ یعنی ہر ایک بیماری میں روزہ چھوڑ دے مگر اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ ادنےٰ سے ادنےٰ شکایت پر روزہ چھوڑ دے کیونکہ کچھ نہ کچھ شکایت تو ہر ایک انسان کو رہتی ہے ✦

سفر کی حد

سفر کس قدر ہو؟ بعض نے کہا لفظ عام ہے خواہ کسی قدر ہو۔ بعض نے ایک دن رات اس کی حد قرار دی ہے۔ امام شافعی نے ۱۶ فرسخ اور امام ابو حنیفہ نے تین منزل یعنی تین دن کا سفر یا ۲۴ فرسخ۔ قول اول قرآن کریم کے عام الفاظ پر مبنی ہے امام شافعی نے ایک حدیث پر بنیاد رکھی ہے جس میں آتا ہے کہ چار برد سے کم میں قصر صلوٰۃ نہ کرو۔ اور برید بعض کے نزدیک چار فرسخ اور بعض کے نزدیک دو فرسخ ہے۔ پس ۲۴ میل یا ۴۸ میل کی حد اس حدیث کی رو سے ہوئی۔ مگر قرآن کریم کے ظاہر الفاظ سے قول اول کو ہی ترجیح ہے۔ کیونکہ بعض وقت ۴۸ میل سے کم سفر میں بھی روزہ چھوڑنا ضروری ہو سکتا ہے ہاں سیر اور سفر میں ہر شخص فرق کر سکتا ہے۔ پھر سفر خواہ پیدل ہو خواہ کشتی پر خواہ گھوڑے پر خواہ ریل پر سفر ہی ہے ان چیزوں سے سفر کے سفر ہونے کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا ✦

رخصت یا وجوب

سفر اور بیماری میں روزہ ترک کرنے کی رخصت ہے یا وجوب۔ اس پر بہت بحث ہوتی ہے۔ صحابہ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ سفر میں روزہ ترک کرنا ضروری سمجھتے تھے اور بعض اگر قابل برداشت پاتے تو رکھ بھی لیتے تھے۔ لیکن اگر رخصت بھی اسے تصور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی رخصتیں فائدہ اُٹھانے کے لئے ہی ہیں۔ اور محتاط مذہب یہی ہے کہ سفر اور بیماری میں روزہ نہ رکھا جائے۔ لیکن بایں اگر کوئی شخص رکھ لے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے گناہ کیا ہے یا یہ کہ اس کا روزہ نہیں ہوا ✦

طاقۃ

۲۲۶ یطیقون۔ طاقۃ کے معنی میں مفردات میں ہے الطاقۃ اسم لمقدار ما یمکن للانسان ان یفعلہ بمشقۃ یعنی طاقت اس مقدار کا نام ہے جو انسان کے لئے ممکن ہے کہ اس کو مشقت کے ساتھ کر سکے۔ کیونکہ یہ لفظ طَوق سے مشتق ہے اور طوق وہ چیز ہے جو گردن میں ہو یعنی اس کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔ اسی تشبیہ کے لحاظ سے طاقۃ کے یہ معنی ہیں (غ)۔ اس لئے یطیقونہ کے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ جن کو روزہ رکھنے میں سخت مشقت اُٹھانی پڑے اور تفسیروں میں ایک قول اس کے مطابق ہے یصومونہ بجھدھم وطاقتھم اور دوسری قرائتیں جیسے یُطَیِّقونہ یا یطّوقونہ اس معنی کی مؤید ہیں کیونکہ اول کے معنی یتکلفونہ ہیں اور دوئم کے معنی بھی یہی ہیں یعنی یکلفونہ یا یقلّدونہ ہیں جو طوق سے ہے اور مراد ہر صورت میں یہی ہے کہ ان کے لئے روزہ رکھنے میں سخت مشقت یا تکلیف ہے اور یطیقونہ کے معنی یتجشمونہ عبداللہ سے مروی ہیں (ث) یعنی تکلیف سے روزہ رکھ سکتے ہوں ✦

طوق

یطیقونہ

فداءٌ

فدیۃ۔ فدی اور فداء کے معنی ہیں انسان کا کسی مصیبت سے اپنی حفاظت کر لینا اس مال کے ذریعہ سے جو اس کے لئے خرچ کرے (غ) ✦

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

پھر جو کوئی تکلف سے نیکی کرتا ہے وہ اس کے لئے بہتر ہے اور اگر تم روزے رکھو تو تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو ۲۲۷

آیت فدیہ صیام کی منسوخی میں اختلاف

بخاری میں ایک روایت حضرت ابن عمرؓ سے ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور سلمہؓ کی روایت میں ہے کہ جب یہ نازل ہوئی تو جو چاہتا روزہ رکھ لیتا اور جو چاہتا فدیہ دیدیتا۔ اور بخاری میں ہی حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ منسوخ نہیں بلکہ اس سے مراد بہت بوڑھے ہیں تو اختلاف کی اصل وجہ صرف یہ ہے کہ جو بزرگ اس آیت کے معنی کو دوسری آیت کے ساتھ تطبیق نہیں دے سکے انہوں نے اسے منسوخ کہہ دیا اور جن کے نزدیک تطبیق ہو گئی انہوں نے کہا غیر منسوخ ہے اور جب معنی میں تطبیق ہو سکتی ہے تو آیت کو منسوخ کہنا بے معنی ہے +

روزہ کا فدیہ کون لوگ دے سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یطیقونہ میں ضمیر اُسی کی طرف ہی جا سکتی ہے جس کا ذکر پہلے چلا آتا ہے نہ فدیہ یا طعام کی طرف جس کا ذکر ابھی نہیں آیا۔ پس یہ معنی کرنا ٹھیک نہیں کہ جو فدیہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ فدیہ دیدیا کریں اور نہ یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں اور پھر روزہ نہیں رکھتے وہ فدیہ دیدیا کریں کیونکہ یہ لفظ قرآن شریف میں نہیں ہاں یطیقون ہے جس کے اس معنی پر جس کی تائید دوسری قراءتوں سے ہوتی ہے غور نہیں کیا گیا۔ پس اصل معنی یوں ہونگے کہ جو اسکو مشقت کیساتھ کر سکتے ہیں وہ فدیہ دیدیا کریں۔ اوپر ساتھ ہی ذکر بیمار اور مسافر کا ہے پس صاف اور واضح منشاء الفاظ قرآنی کا یہ ہے کہ بیمار اور مسافر پیچھے گنتی پوری کر لیا کریں لیکن وہ جن کو پیچھے گنتی پورا کرنے میں مشقت ہے وہ فدیہ دیدیا کریں ظاہر ہے کہ بعض لوگ اپنی عمر کا بڑا حصہ سفر میں ہی گزار دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ دائم المریض ہوتے ہیں اور اسی حکم میں بہت بوڑھے لوگ بھی ہیں کیونکہ بڑھاپا بھی حالت اعتدال سے انسان کو نکال دیتا ہے۔ اور ابو داؤد کی حدیث کی رو سے اسی حکم میں حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت ہیں کیونکہ اس میں حمل یا بچہ کے ضائع ہونے کا خوف ہو گا۔ اور وہ بھی حالت اعتدال میں نہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ فدیہ دیدیا کریں پس اصل بات یہ ہے کہ یہ حکم صرف مریض اور مسافر کے لئے ہے جن کو رمضان کے روزوں کی جگہ پچھلے دنوں میں روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے کہ جب ان کی حالت ایسی ہو کہ وہ پچھلے دنوں میں بھی تعمیل حکم میں مشقت پاتے ہوں تو فدیۃ طعام مسکین دیدیا کریں اور حدیث نے یہ بتا دیا کہ بوڑھے مرد اور عورتیں بھی مریض کے حکم میں ہی داخل ہیں۔ چنانچہ بخاری میں ہے کہ حضرت انسؓ جب بہت بوڑھے ہو گئے تو روزہ کی بجائے فدیہ دیدیا کرتے تھے +

ہمیشہ سفر میں رہنے والے دائم المریض شیخ فانی حاملہ دودھ پلانے والی کا حکم

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان الفاظ کو منسوخ صرف اس لئے کہا جاتا ہے کہ شہر رمضان والی آیت میں یہ دوہرائے نہیں گئے۔ حالانکہ یہ محض ایک رخصت کا رنگ ہے اور ضروری نہیں کہ اس کو بار بار دوہرایا جاتا محض دوبارہ یہ لفظ نہ آنے سے ان کو منسوخ سمجھنا بالکل غلط استدلال ہے +

صدقۂ فطر

اور ایک معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔ اور یہ فدیہ صدقۂ فطر کی صورت میں بروئے حدیث ضروری ہے۔ اور یہ معنی بھی اس آیت کو دوسری آیات کے خلاف نہیں رہنے دیتے اور یہاں ذکر بھی ایک مسکین کے کھانے کا ہے +

تطوع

۲۲۷ تطوع۔ تَطَوَّعَ کے معنی گو عام طور پر شوق سے یا نفل کے طور پر نیکی کرنا ہیں۔ مگر اس کے اصل معنی تکلف الطاعۃ ہیں (غ) یعنی طاعت بطور تکلف اختیار کرنا۔ اور یہی معنی یہاں مراد ہیں اور بطور نفل نیکی اختیار کرنا خود اسی سے ماخوذ ہے +

روزہ سے نیکی کی قوت ترقی پکڑتی ہے

یہاں روزے کی علت غائی کی طرف پھر توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ روزہ رکھنا بطور تکلف اطاعت اختیار کرنا ہے۔

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰی ۱۸۵

رمضان کا مہینہ ۔ جس میں قرآن اُتارا گیا لوگوں کے لئے ہدایت اور ہدایت کی کھلی دلیلیں اور حق و باطل کو الگ الگ کردینے

وَالۡفُرۡقَانِ ۚ فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡیَصُمۡهُ ؕ وَمَنۡ كَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ

والی دلائل، ۲۲۸ پس جو کوئی تم میں سے اس مہینہ کو پائے تو چاہئے کہ اس کے روزے رکھے ۲۲۹ اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اور

فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ ۫ وَلِتُكۡمِلُوا

دنوں میں گنتی (پوری) کر لی جائے ۔ اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے تنگی نہیں چاہتا اور کہ تم گنتی کو

الۡعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ○

پورا کرو اور اللہ کی بڑائی کرو اس لئے کہ اس نے تمہیں ہدایت کی اور تاکہ تم شکر کرو ۲۳۰

اس لئے فرمایا کہ بطور تکلف اطاعت اختیار کرنا تمہارے لئے بہتر ہی ہے۔ اسلئے اگر تم روزہ رکھو تو تمہارے لئے بہتر ہی ہے۔ کیونکہ اس سے نیکی کی قوت ترقی پکڑتی ہے اور اگر شوق سے نیکی اختیار کرنا معنی لئے جائیں تو مراد یہ ہو سکتی ہے کہ زیادہ مسکینوں کو کھانا دیدے ۔

شُهرۃ ۔ شہر — ۲۲۸ شہر ۔ شُہرۃ کسی امر کی وضاحت ہے اور شَہر مہینہ کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایک مشہور مدت ہے یا چاند دیکھنے کے وقت اس کی شہرت ہو جاتی ہے (غ) ۔

رمضان ۔ رمض — رمضان ۔ مہینہ کا نام ہے اور رمض سے مشتق ہے جس کے معنی دھوپ کی گرمی کی شدت ہیں (غ)۔ مہینوں کے نام جب دوبارہ رکھے گئے تو اس مہینہ میں گرمی کی شدت تھی ۔

قرآن ۔ قرأ — قرآن ۔ قرأ سے مصدر ہے جس کے معنی پڑھنا ہیں ۔ اور قرأ کے اصل معنی جمع کرنا ہیں ۔ اور پڑھنے میں حرف ایک دوسرے کے ساتھ

قرآن نام کی وجہ — ملائے جاتے ہیں (غ) پس ایک معنی کے لحاظ سے قرآن نام اس لئے رکھا گیا کہ یہ تمام علوم کو یا تمام کتب سماوی کی خوبیوں کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے (غ)، اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ ایک پیشگوئی تھی کہ دنیا کی تمام کتابوں میں پڑھا جانیکے لحاظ سے اسکو خاص امتیاز حاصل ہوگا چنانچہ یہ ایک امر واقع ہے جس کا اقرار مخالفین اسلام کو بھی ہے کہ قرآن کے برابر دنیا کی کوئی کتاب نہیں پڑھی جاتی (دیکھو انسکلو پیڈیا بریٹینیکا) لاکھوں انسان اس کے حافظ ہیں جو دن رات اسے پڑھتے ہیں اور کسی کتاب کے اتنے حافظ دنیا میں نہیں پھر ہر مسلمان پانچ مرتبہ ہر روز نماز میں اس کا کچھ نہ کچھ حصہ پڑھتا ہے ۔

ابتدائے نزول قرآن رمضان میں — یہاں بتا دیا کہ گنتی کے دن جن کے روزے رکھنے کا حکم دیا رمضان کا مہینہ ہے ۔ اور اس مہینہ کو خاص فخر یہ حاصل ہے کہ اس میں قرآن اتارا گیا یعنی نزول قرآن اس میں شروع ہوا ابن اسحاق کی روایت پر روح المعانی میں انہی معنوں کو ترجیح دی ہے ۔ ای ابتدئ فیہ انزاله وکان ذلك لیلة القدر

قرآن کے تین کمالات — یہاں قرآن کریم کے تین کمالات کا ذکر فرمایا اول یہ کہ یہ ھدی ہے یعنی لوگوں کو سیدھی راہیں بتاتا ہے ۔ دوسرا یہ کہ بینات من الھدیٰ ہے یعنی دلائل بھی دیتا ہے کہ کیوں فلاں راہ پر چلنا چاہئے یا فلاں راہ سے بچنا چاہئے تیسرا یہ کہ اس کے دلائل حق و باطل میں فیصلہ کر دینے والے ہیں یعنی فی الواقع ایک انسان کو حق الیقین کے مقام پر پہنچا دیتے ہیں ۔

۲۲۹ ان الفاظ کی رو سے ان مقامات کو خارج کر دیا جہاں بہت لمبے دنوں کی وجہ سے بارہ مہینوں کی تقسیم مشاہدہ میں نہیں آتی نہ ہلال نظر آتا ہے کیونکہ شھد میں مشاھدہ ضروری ہے خواہ کسی طرح پر ہو دیکھو ۲۴۷ ایسی صورت کے لئے دیکھو ۲۳۵ ۔

۲۳۰ بیمار اور مسافر کے پیچھے روزے رکھنے کے حکم کو اس لئے دوہرایا ہے کہ رمضان کی خاص برکات کے ذکر کی وجہ سے لوگ

۱۸۶ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو بیشک میں قریب ہوں۔ میں دعا کرنے والے کی دعا کو جب وہ مجھے پکارتا

اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ۝

ہے قبول کرتا ہوں پس چاہئے کہ میری فرمانبرداری کریں اور چاہئے کہ مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں ع ۲۳۱

تکلیف مالایطاق میں نہ پڑیں یرید اللہ بکم الیسر سے بھی ظاہر ہے کہ بیمار اور مسافر کے لئے رخصت سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے +

قرب اللہ کا بندہ سے اور بندہ کا اللہ سے

ع ۲۳۱ قریب۔ لفظ قرب مکان و زمانہ کے لحاظ سے بھی استعمال ہوتا ہے اور نسبت، مرتبہ، علم و قدرت کے لحاظ سے بھی۔ اللہ تعالیٰ کا قرب بندہ سے جیسا کہ نحن اقرب الیہ من حبل الورید میں علم و قدرت کے لحاظ سے ہے اور کبھی بندہ کے اللہ تعالیٰ سے قرب کا ذکر ہوتا ہے اولئک المقربون وہ بلحاظ مرتبہ یا رعایت ہے انی قریب میں اس قرب مخصوص کا ذکر ہے جو خاص بندوں کو اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے اس کی طرز بھی آگے بتائی ہے کہ کس طرح ہو سکتا ہے وہ بذریعہ دعا ہے +

جَوب

جَواب

اجیب۔ جوب کے معنی جَوبۃ یعنی پست زمین کا قطع کرنا ہے۔ چنانچہ قطع کرنے یا تراشنے کے معنی میں ہی ہے جابوا الصخر بالواد (الفجر ۸۹-۹) اور کلام کا جَواب اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بھی جَوب کو قطع کرتا ہے اور کہنے والے کے منہ سے سننے والے کے کان تک پہنچتا ہے لیکن ابتدائی خطاب کو جواب نہیں کہا جاتا۔ پھر جواب دو طرح پر ہے اگر سوال میں کسی بات کا مطالبہ ہے تو اس کا جواب بات ہے اور اگر سوال میں کسی فائدہ کا مطالبہ ہے تو وہ فائدہ پہنچانا جواب ہے (غ) پس اُجیب کے

احابۃ۔ استجابۃ

معنی جواب دیتا ہوں بھی ہو سکتے ہیں اور قبول کرتا ہوں بھی۔ اور استجابۃ اور اجابۃ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی قبول کرنا۔ اس فرق سے کہ اجابت میں ایسا جواب بھی ہو سکتا ہے جو درخواست کی نامنظوری لئے ہوئے ہو اور استجابت میں قبولیت ضروری ہے یہ فراء کا قول ہے (ر) پھر بندہ کی طرف سے استجابت یا اجابت فرمانہ داری کا اختیار کرنا ہے +

رشد

یرشدون۔ رُشد کے معنی ہدایت پانا ہیں (غ) +

رمضان میں قرب الٰہی کی راہیں

اس آیت کو جس میں قرب الٰہی کا ذکر ہے رمضان کے احکام میں لانے سے یہ اشارہ ہے کہ رمضان میں قرب الٰہی کی راہیں بہت کھل جاتی ہیں۔ اس کا طریق یہ بتایا کہ دعا کرو تو میرا قرب مل سکتا ہے۔ رمضان میں نبی کریم صلعم کا طرز عمل بھی یہی بتاتا ہے کہ آپ عبادت اور دعا پر بہت زیادہ زور دیتے تھے اور سخاوت بھی دیگر ایام سے بڑھ کر کرتے تھے گویا یہی مہینہ مسلمان کے لئے مجاہدات کا مہینہ ہے جس کے اندر تزکیہ نفس ہو کر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔ اور انسانی زندگی کی اصل غرض پوری ہو سکتی ہے۔ اذا سألك عبادی عنی میں اس تڑپ کا ذکر ہے جو مومنوں کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور دعوۃ الداع سے مراد اسی تڑپ کا اظہار ہے جب انسان دعا میں اسے اختیار کرتا ہے پس یہاں

قرب الٰہی کے حصول کی دعا

جس دعا کی قبولیت کا ذکر ہے وہ صرف قرب الٰہی کو حاصل کرنے کی دعا ہے۔ اور جو انسان ایسی دعا کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ بھی ضرور قبول فرماتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ میری فرمانبرداری کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ سیدھی راہ پالینگے یعنی وہ راہ جو میرے قرب میں پہنچا دیتی ہے۔ فی الواقع فطرت انسانی جب صفائی پر ہوتی ہے اور روزہ سے اس میں صفائی ضرور آتی ہے تو اس کے اندر یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ قرب الٰہی کو حاصل کرے اس قرب کو حاصل کرنے کے لئے بتایا کہ نرے روزے سے ہی نہیں بلکہ پھر دعا بھی ساتھ کرو۔ گویا واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ میں روزہ اگر صبر کا پہلو ہے

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ ۱۸۶

تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رغبت کرنا حلال کیا گیا ہے ۲۳۲ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کیلئے لباس ہو ۲۳۳

تو صلوٰۃ دعا کا پہلو ہے۔ پس یہ مہینہ عبادات کیلئے مخصوص ہے ۔

معمولی دعائیں اور ان کی قبولیت

سیاق و سباق عبارت سے ظاہر ہے کہ یہاں انہی دعاؤں کی قبولیت کا ذکر ہے جو قرب الٰہی کے حصول کے لئے کی جائیں عام دعاؤں کا یہاں ذکر نہیں جو بندہ اپنی مصائب کے لئے کرتا ہے۔ ان کا ذکر دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے فیکشف ما تدعون الیه ان شاء (الانعام-۴۱) یعنی جس مصیبت کے دور کرنے کے لئے تم اسے پکارتے ہو اسے اگر چاہے تو دور کر دے یعنی یہ ضروری نہیں کہ دنیوی معاملات میں اللہ تعالیٰ ساری دعاؤں کو قبول کرے۔ جسے چاہے اسے قبول کرے۔ اسی لئے دوسری جگہ فرمایا ولنبلونکم بشیٔ من الخوف الآیۃ یعنی آزمائش کے طور پر اللہ تعالیٰ کچھ تکلیف انسانوں پر وارد بھی کرتا رہتا ہے۔ ہاں قرب الٰہی کی راہیں اس قدر کھلی ہیں کہ جب انسان اس کے لئے قدم اٹھاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی پکار کو سن لیتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (العنکبوت ۲۹-۶۹) ۔

اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر بعض دعائیں قبول نہیں ہوتیں تو دعا ایک لغو امر ہی ایسا ہی ہے جیسا کوئی کہے کہ بعض وقت دوا مفید نہیں پڑتی تو دوا کرنا ہی لغو امر ہے جس قدر اسباب دنیا میں ہیں وہ ایک حد تک ہی فائدہ پہنچاتے ہیں اور ہر دعا کو قبول کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ خدا حاکم نہیں بلکہ بندہ حاکم ہے کہ جو وہ مانگے خدا کو مجبوراً دینا پڑتا ہے۔ ہاں دعا کی قبولیت کا یقین اس سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض وقت اپنے خاص بندوں کو قبل از وقت نتیجہ سے اطلاع دے دیتا ہے ۔

رفث

۲۳۲۔ رفث ازہری کہتے ہیں کہ یہ ایک کلمہ جامع ہے ان تمام باتوں کے لئے جو مرد عورت سے چاہتا ہے اور مفردات راغب میں ہے کہ اس کا استعمال جماع اور اس کے محرکات پر ہے جن کا کھلا ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں مراد جماع ہے ۔

رمضان میں عورت سے رغبت

بخاری میں براء کی روایت سے ہے کہ جب رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا تو لوگ سارا مہینہ عورتوں کے پاس نہ جاتے تھے اور بعض روایتوں میں ہے کہ اگر سو جاتے تو پھر اس کے بعد کھانا پینا عورتوں کے قریب جانا جائز نہ سمجھتے تھے پس یہ حکم نازل ہوا کہ رات کو بی بی کو بلانا جائز ہے ۔

لباس

۲۳۳۔ لباس وہ ہے جو انسان کے قبیح امر کو ڈھانک دے (غ)، امام راغب کہتے ہیں کہ میاں کو بی بی کا اور بی بی کو میاں کا لباس اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی محافظت کرتے اور ایک دوسرے کو امر قبیح کے ارتکاب سے بچاتے ہیں۔ مجاہد اور دیگر سلف سے اس کے معنی سکن مروی ہیں یعنی عورتیں مردوں کے لئے سکون و اطمینان کا موجب ہیں مرد عورتوں کے لئے۔ اور قرآن کریم نے خود اس معنی کو واضح کر دیا ہے جہاں فرمایا وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا (الاعراف-۱۸۹) اسی سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا تاکہ وہ اس سے سکون پکڑے۔ اور دوسری جگہ ہے خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا (الروم-۲۱) تمہاری جنس سے تمہاری بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون پکڑو۔ رات کو بھی ایک جگہ سکون اور ایک جگہ لباس کہا ہے۔ اور خود لباس کی غرض قرآن شریف میں یوں بیان کی ہے یواری سوآتکم وریشا (الاعراف-۲۶) وہ تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانکتا ہی اور تمہارے لئے زینت کا موجب ہے پس ایک لطیف استعارہ میں بتایا کہ میاں بی بی کا تعلق کس طرح ایک دوسرے کے لئے تسکین کا موجب ہے اور

میاں بی بی کا تعلق

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ

اللہ جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے سو اس نے تم پر رجوع برحمت کیا اور تم کو معاف کیا

فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ

پس اب ان سے میل جول کرو اور جو اللہ نے تمہارے لئے مقرر کیا ہے چاہو ۲۳۴ اور کھاؤ اور پیو یہانتک کہ تمہارے لئے

لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ

صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ ہو جائے پھر رات تک روزے کو پورا کرو ۲۳۵

کس طرح ایک کی کمی دوسرے سے پوری ہوتی ہے ✦

اختیان

۲۳۴ تختانون۔ اختیان سے ہے امام راغب اختیان اور خیانۃ کے معنی میں یہ فرق کرتے ہیں کہ اختیان کے معنی ہیں خیانت کا ارادہ کرنا گویا خیانت ابھی وقوع میں نہیں آئی ✦

نزول حکم قرآنی سے پہلے روزہ میں تشدد

چونکہ بعض صحابہ کا یہ خیال تھا کہ روزہ میں رات کے وقت بھی بی بی کے پاس نہیں جانا چاہئے گو کوئی حکم الٰہی نازل نہ ہوا تھا اور خواہش طبعی چاہتی تھی تو اس صورت میں اس تحرک خواہش کو اختیان کہا ہے۔ جو روایتیں اس موقعہ پر بیان کی جاتی ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ایک شخص بغیر کھائے پیئے سو گیا اور اسی بھوک کی حالت میں روزہ رکھا تو اگلے دن اسے غش آگیا۔ دوسری روایت حضرت عمرؓ کے متعلق ہے کہ وہ اپنی بی بی کے پاس گئے بعد اس کے کہ وہ سو گئی تھیں۔ یہ دونوں روایتیں کسی پہلے حکم کی موجودگی کو ظاہر نہیں کرتیں۔ بلکہ اس حکم سے ایک غلط خیال کی تردید ہوئی۔ توبہ اور عفو کا لفظ عام ہیں ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پہلے کوئی برا فعل خلاف حکم الٰہی ہو چکا ہے۔ ایک سخت پابندی کی جگہ ایک نرم حکم دے دیا یہ توبہ ہے دیکھو ۳۵ نیز النساء ۲۶ جہاں کھول کر بیان کر دینے کو یا شریعت عطا فرمانے کو یتوب علیکم سے ظاہر کیا ہے اور عفو اس کو اس لئے کہا کہ ایک سختی جو مسلمانوں نے اپنے اوپر لازم کر لی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے دور کر دیا ✦

خیط۔خیاط

۲۳۵ الخیط الابیض۔ خیط دھاگے کو کہتے ہیں اور خیاط سوئی کو حتی یلج الجمل فی سم الخیاط (الاعراف۔۴۰) اور الخیط الابیض صبح کی سفید دھاری کا نام ہے اور الخیط الاسود اس کی سیاہی کا۔ یہ معنی خود نبی کریم صلعم سے مروی ہیں چنانچہ بخاری میں عدی کہتے ہیں کہ میں نے رات کو ایک سفید دھاگا اور ایک سیاہ دھاگا اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور جب آنحضرت صلعم کو یہ واقعہ سنایا تو آپ نے فرمایا ان وسادک اذا لعریض تمہارا تکیہ بڑا فراخ ہے۔ گویا یوں سمجھا دیا کہ وہ خیط ابیض اور خیط اسود تکیہ کے نیچے نہیں آسکتے ✦

روزہ کی حدود

یہاں روزہ کی حدود بیان کی ہیں صبح صادق کے نمودار ہونے تک کھانا پینا جائز ہے اور آفتاب غروب ہوتے ہی افطار کر دینا چاہئے۔ سحری کے وقت میں حتی الوسع تاخیر کی اور افطار میں حتی الوسع تعجیل کی تاکید نبی کریم صلعم نے فرمائی ہے۔

جہاں دن لمبے ہوں وہاں روزے کا حکم

ان حدود پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ بعض جگہ کئی کئی ماہ کا دن ہوتا ہے۔ سو اول تو یہ مقام آبادی بہت کم ہیں دوسرے وہاں رمضان کا مہینہ ممیز نہیں ہوتا پس شهد منکم الشهر میں وہ لوگ نہیں آتے۔ ہاں جہاں اٹھارہ انیس ۱۹ گھنٹے کا دن ہو وہاں روزہ رکھا جا سکتا ہے جن کے لئے تکلیف مالایطاق ہو وہ فدیۃ طعام مسکین پر عمل کریں

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا

اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو تو ان سے میل جول نہ کرو ۲۳۶ یہ اللہ کی حدیں ہیں پس تم انکے

تَقْرَبُوْھَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ وَلَا تَاْكُلُوْٓا ۱۸۸

قریب مت جاؤ ۲۳۷ اس طرح اللہ اپنی باتیں لوگوں کے لئے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ کریں ۲۳۵ اور اپنے مالوں کو

اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا

آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔ اور (نہ) ان کے ذریعہ حاکموں تک پہنچو تاکہ لوگوں کے مال کا ایک

مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ حالانکہ تم جانتے ہو ۲۳۸

بشرۃ۔ مباشرۃ — ملامسۃ

۲۳۶ تباشروا۔ بَشَرَۃ ظاہر جلد کو کہتے ہیں یعنی چمڑے کے اوپر کا حصہ اور مُباشَرۃ دو انسانوں کے چمڑے کا ایک دوسرے کو لگنا ہے یعنی مرد اور عورت کے لمس بشرۃ الرجل بشرۃ المرأۃ (ت)، اور اسکے اور ملامسۃ کے جو لَمْس (چھونے) سے ہو ایک ہی معنی ہیں (ن)، اور کنایۃً جماع مراد ہے جیسے اس قسم کے دوسرے الفاظ سے بھی۔ اور یہی معنی یہاں مراد ہیں۔ نہ مطلق چھونا +

عاکف

عاکفون۔ عَاکِف مقیم کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد اعتکاف ہے جو آخری عشرہ رمضان میں کیا جاتا ہے یعنی دس دن تک انسان بالکل مسجد میں رہے +

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماہ رمضان کو مسلمان کا اصلی مجاہدہ قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کے آخری دس یوم کو اور بھی اس مجاہدہ کے لئے خاص کیا گیا ہے ان ایام میں جو اعتکاف کرتا ہے اسے بی بی سے علیحدہ رہنا چاہئے مگر کسی ضرورت کے لئے بی بی کا اس کے پاس آنا منع نہیں +

حدّ — حادّ — حدید — حدود اللہ

۲۳۷ حدود حدّ کی جمع ہے اور یہ اس روک کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان ہو اور انکو ایک دوسرے سے ملنے سے روکے اس لئے حدّ کسی چیز کا وہ وصف ہے جو اسے دوسری چیزوں سے ممیز کردے (غ)، اسی مادہ سے حادّ ہے ان الذین یحادون اللہ ورسولہ (المجادلۃ ۵۸-۲۰) اور اسی سے حَدِید لوہا ہے اور حَدِید بمعنی تیز فبصرك الیوم حدید۔ (ق ۵۰-۲۲) اور حدود اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں اس لئے کہ وہ حق و باطل میں حاجز یعنی روک ہیں +

یہاں حدود کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے فمن رتع حول الحمی یوشك ان یقع فیہ جو شخص رکھ کے اردگرد پھرتا ہے قریب ہے کہ اس کے اندر چلا جائے +

ادلاء

۲۳۸ تدلوا۔ اِدلاء سے ہے جس سے مراد ڈول کا ڈالنا یا نکالنا ہے اور استعارۃً کسی چیز کو ذریعہ بنانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے +

روزہ اور حرام خوری سے اجتناب

اس حکم کو رمضان کے حکم کے ساتھ لانے کا منشاء یہ ہے کہ جب تم میں یہ قوت پیدا ہوگئی کہ تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے حلال چیزوں کو بھی جب وہ ترک کرنے کا حکم دے ترک کر دیتے ہو تو حرام اور باطل کو ترک کرنا کس قدر آسان ہے زیادہ تر مال کی محبت ہی انسان سے گناہ کراتی ہے اس لئے روزہ گناہ سے بچانے کا بڑا موجب ہے۔ کیونکہ

۱۸۹ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ

تجھ سے ہلالوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہو یہ لوگوں کے فائدہ کیلئے اور حج کے لئے مقرر وقت ہیں ۲۳۹ اور یہ بڑی نیکی نہیں

بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ

کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں کی طرف سے آؤ لیکن بڑا نیک وہ ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور گھروں میں ان کے

۱۹۰ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

دروازوں سے آؤ اور اللہ کا تقویٰ کرو تاکہ تم کامیاب ہو ۲۴۰ اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو

ع ۲۴ / ۸ — احکام جنگ

روزہ سے انسان کے اندر وہ قوت نشو نما پاتی ہے جس سے وہ مال کے ناجائز کھانے کو ترک کر سکتا ہے ⁕

ہلال — **۲۳۹** اھلۃ۔ ھلال کی جمع ہے۔ پہلی اور دوسری رات کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے اس کے بعد قمر (غ) ہلال کی رؤیت کے ساتھ قمری مہینہ کا آغاز ہوتا ہے ⁕

میقات — مواقیت۔ میقات کی جمع ہے اور یہ وہ وقت ہے جو کسی چیز کے لئے مقرر کیا جائے یا وہ وعدہ جس کے لئے کوئی وقت مقرر کیا جائے (غ)، ان یوم الفصل کان میقاتا (النبأ ۷۸-۱۷)، الیٰ میقات یوم معلوم (الواقعۃ ۵۶-۵۰)

سوالات کی غرض — ہلالوں کے متعلق سوال سے کیا مطلب ہے۔ ایسے جس قدر سوال ہیں ان سب میں احکام دریافت کئے ہیں یسئلونک عن الیتامیٰ۔ یسئلونک عن الخمر والمیسر۔ یتیموں کے احکام دریافت کرتے ہیں شراب اور جوئے کے احکام دریافت کرتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ یتیم کس طرح بنتا ہے۔ شراب کس طرح بنتی ہے۔ جوا کس طرح کھیلا جاتا ہے۔

حج کے مہینے — پس ہلالوں کے بھی احکام دریافت کرتے ہیں اور ہلالوں سے مراد مہینے ہیں۔ یہ سوال خاص مہینوں یا ہلالوں کے متعلق ہے۔ جیسا کہ جواب سے ظاہر ہے ھی مواقیت للناس والحج اور یہ خاص مہینے فی الواقع رمضان کے اختتام کے ساتھ ہی شروع ہو جاتے ہیں یعنی شوال ذیقعدہ اور دس دن ذی الحج کے یہ حج کے مہینے ہیں۔ عرب میں یہ مشہور مہینے تھے۔ جن کا نام لینے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ جیسا کہ فرمایا الحج اشھر معلومات جب رمضان کے اس قدر فضائل کا ذکر ہوا۔

حرمت کے مہینے — تو ان مہینوں کا سوال بھی پیدا ہوا۔ جو رمضان کے ساتھ شروع ہو جاتے ہیں مگر چونکہ حج کے مہینوں میں وہ مہینے حرمت والے بھی ہیں ان کا ذکر بھی ساتھ ہی کر دیا۔ حرمت کے مہینے کل چار ہیں یعنی محرم۔ رجب۔ ذیقعدہ۔ ذی الحج۔ عرب میں ان ایام میں جنگ بالکل بند ہو جاتی تھی۔ راستے کھل جاتے تھے۔ تجارتیں شروع ہو جاتی تھیں انہی میں حج کے ایام بھی آجاتے تھے۔ اسی لئے مواقیت للناس فرمایا یعنی لوگوں کی بھلائی کے لئے اوقات مقررہ ورنہ عرب جیسی جنگجو قوم بھی اگر ان مہینوں کی وجہ سے ان کی تجارتیں وغیرہ سال میں چار ماہ نہ کھلی رہتیں تو بالکل برباد ہو جاتے اگر کل مہینوں کے متعلق سوال ہو تو بھی ہرج نہیں کیونکہ سبھی مہینے لوگوں کے لئے وقت مقرر ہیں ⁕

باب — **۲۴۰** ابواب۔ باب کی جمع ہے۔ دروازہ کو کہتے ہیں شہر کا ہو یا مکان کا یا کوٹھڑی کا۔ اور کسی چیز کا باب وہ ذریعہ ہے جس ذریعہ سے اس چیز تک پہنچ سکیں جیسے حدیث میں ہے انا مدینۃ العلم و علیٌّ بابھا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فتحنا علیھم ابواب کل شیء (الانعام ۶-۴۴) اور والملٰئکۃ یدخلون علیھم من کل باب (الرعد ۱۳-۲۳) جس کے

ابواب جنت و ابواب جہنم — معنی کئے ہیں ہر ایک قسم کی خوش کرنے والی چیزوں سے (غ)، امام راغب کے نزدیک ابواب الجنۃ اور ابواب

الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں سے پیار نہیں کرتا[۲۴۱]

جہنم سے وہ اسباب مراد ہیں جو انسان کو جنت یا دوزخ میں پہنچاتے ہیں +

بیت - بات بیت - بَاتَ کے معنی ہیں رات کاٹی اور اس لئے بَیْت اصل میں وہ مکان ہے جہاں انسان رات کاٹے پھر عام ہر ایک مسکن کو کہتے ہیں (غ) اور مجازاً دل کو جیسا کہ امام راغب نے اس حدیث کے معنی میں قول نقل کیا ہے

فرشتوں کا کتے والے گھر میں داخل نہ ہونا لاتدخل الملئکۃ بیتا فیہ کلب ولا صورۃ - فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا اور تصویر ہو - کہ بیت سے مراد یہاں دل اور کلب سے مراد حرص ہے - اور بعض کے نزدیک گھر کے دروازہ سے داخل ہونا کنایہ ہے سیدھی راہ اختیار کرنا اور پچھواڑے کی طرف سے آنا کنایہ ہے سیدھی راہ سے انحراف کرنے سے +

عرب کی توہم پرستی حسن اور صم کا قول ہے کہ اہل عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص کسی مقصد کو سامنے رکھ لیتا اور اسکا حاصل کرنا مشکل ہوتا تو وہ ایک سال تک گھر کے پچھواڑے کی طرف سے داخل ہوتا - اور اسکو کامیابی کا ذریعہ سمجھتا مسلمانوں کو بتایا ہے کہ تمہاری کامیابی کا مدار ایسی توہم پرستیوں پر نہیں - بلکہ تقویٰ پر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق اور ذمہ داریوں کی حفاظت پر - چونکہ اصل مضمون استعانت بالصبر والصلوٰۃ تھا - اس لئے اس سے روکا ہے کہ کامیابی کا مدار توہم پرستی پر رکھا جائے بخاری میں ہے کہ احرام کی حالت میں حمس کے سوائے دوسرے لوگ گھر کے پچھواڑوں سے داخل ہوتے تھے - چونکہ حج کا ذکر آیا تھا اس لئے اس رسم کو دور کرنے کا حکم یہاں دیا ہے - چونکہ رمضان کو حج کے ساتھ خاص تعلق ہے

ذی الحج کی دس راتیں یعنی جیسے رمضان کی دس راتیں بڑی فضیلت والی ہیں جنکا ذکر آخری سے پہلی آیت رکوع گزشتہ میں کیا ہے - اسی طرح ذی الحج کی دس راتیں بھی خاص فضیلت رکھتی ہیں - اس لئے حج میں جو توہم پرستی کی باتیں تھیں ان کو دور کر دیا اور جو ارکان روحانی معنی رکھتے تھے ان کو باقی رکھا +

مقاتلۃ **۲۴۱** قاتلوا - مُقَاتَلَۃ کے معنی مُحَارَبَۃ ہے یعنی ایک دوسرے سے جنگ کرنا یا ایک دوسرے کو قتل کرنے کا قصد کرنا

حج اور جنگ کے ذکر میں حکمت یہاں سے جنگ کا ذکر شروع ہوتا ہے اور اس کا تعلق ماسبق سے دو طرح پر ہے ایک تو پہلے صاف کہا گیا تھا کہ تم کو خانہ کعبہ کا متولی بنایا جائے گا - مگر اس کے لئے صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ خدا کی مدد چاہو اور اس راہ میں تم میں سے لوگ شہید بھی ہونگے پس اب اسی مضمون کو کھول کر بیان کیا ہے کہ جنگ کی اجازت کس حد تک ہے - دوسرے جب حرمت والے مہینوں کا سوال آیا اور ان میں جنگ کے بند رہنے کو لوگوں کے فائدہ کی بات قرار دیا - تو اب جنگ کے احکام کو بھی بیان کر دیا - جو در اصل یسئلونک کا جواب ہے - اور خود حج کا ذکر بھی چاہتا تھا کہ بتایا جائے کہ اسلام کا یہ عظیم الشان رکن کس طرح ادا ہو سکتا ہے جب خانہ کعبہ کافروں کے ہاتھ میں ہے اسی لئے آگے آتا ہے واخرجوھم من حیث اخرجوکم یعنی مکہ سے تو یہ کافر وز نکالے جائیں گے - مگر وہ بغیر جنگ کے ناممکن تھا - اس لئے احکام جنگ کا ذکر ضروری ہوا - سورہ حج میں بھی بعینہٖ اسی کے مطابق حج کے ذکر کے ساتھ جنگ کے اذن کا ذکر شروع ہوتا ہے - اذن للذین یقاتلون (الحج ۲۲ - ۳۹)

فی سبیل اللہ جنگ کا مراد یہاں حکم فی سبیل اللہ جنگ کرنے کا ہے - اس سے کیا مراد ہے ؟ فتوحات ملکی کے لئے یہ جنگ نہیں - حفاظت قومی کے لئے بھی نہیں بلکہ اس لئے کہ اللہ کا نام یہ کافر نہ مٹا دیں اور مسلمانوں کو خدا کی عبادت سے جو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہے نہ روکیں - چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے بدر کے دن جو آپ کی پہلی جنگ تھی - ان الفاظ

۱۹۱ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

اور جہاں انکو پاؤ مار دو[242] اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے اور فتنہ قتل سے بڑھکر سخت ہے[243]

میں دعا کی اللھم ان اھلکت ھذہ العصابۃ فلن تعبد فی الارض ابدا اے خدا اگر تو نے اس چھوٹی سی جماعت کو ہلاک کر دیا تو زمین میں تیری پرستش پھر کبھی نہ ہوگی اور خود قرآن شریف میں دوسری جگہ اسی جنگ کی غرض کو یوں بیان کیا ہے ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوٰت و مساجد (الحج ۲۲-۴۰) اگر اللہ بعض لوگوں (یعنی کفار) کو بعض (یعنی مسلمانوں) کے ذریعہ سے نہ روک دیتا تو راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجا گھر اور دیگر مذاہب کے عبادتخانے اور مسجدیں سب ویران کر دی جاتیں اور یوں اللہ کا ذکر دنیا سے مٹا دیا جاتا پس اسی مذہبی آزادی اور امن کا قائم کرنا ہی فی سبیل اللہ ہے۔ اور اسلامی جنگوں کی پہلی شرط یہی ہے +

(حاشیہ: اس کی غرض مذہبی آزادی کا قیام تھی)

مگر اسی آیت میں جنگ کرنے کے متعلق دو اور شرائط بھی لگا دی ہیں۔ ایک یہ کہ ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں۔ جو فی الواقع جنگ میں شامل نہ ہوں یا جو جنگ میں ابتدا نہ کریں ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ حد سے نہ بڑھو یعنی حالت جنگ میں اپنے حق سے یا ضرورت جنگ سے تجاوز نہ کیا جائے۔ خواہ مخواہ اتلافِ جان و مال نہ ہو جہاں کہیں قرآن شریف میں کسی قوم سے قتال کا حکم یا اجازت ہے وہ انہیں تین شرائط کے ماتحت ہے اور بغیر اسکے جائز نہیں

(حاشیہ: اسلامی جنگ کی شرائط)

ان تین شرائط نے اسلامی جنگوں کو نہ صرف یہودی جنگوں کے مقابلہ پر رحمت ہی رحمت کر دیا کیونکہ یہودی غیر قوم کے بوڑھوں بچوں عورتوں تک کو تہ تیغ کر دیتے تھے۔ مویشیوں کو فنا کر دیتے تھے اور مکانوں کھیتوں باغوں اموال کو آگ میں جلا دیتے تھے۔ بلکہ اس بیسویں صدی کی مہذب اقوام کی جنگ کے مقابل میں بھی اسلامی جنگ نری رحمت نظر آتے ہیں۔ پھر ساتھ تقوٰے اور اعتدال اور انصاف اور عفو کا حکم بھی موجود ہے +

۲۴۲ ثقفتموھم۔ ثَقِفَ کے اصل معنی کسی چیز کے پانے یا کرنے میں دانائی ہیں (غ) اور گو اصل معنی سے تجاوز کر کے مطلق پا لینے پر بھی اسی لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ مگر یہاں اصل معنی ہی مراد ہیں جیسا کہ ابن جریر نے کہا ہے فی ای مکان تمکنتم من قتلھم وابصرتم مقاتلھم یعنی جہاں ان کو قتل کرنے کی قدرت ہو اور ان کے جنگ کرنے کو دیکھو +

(حاشیہ: ثقف)

واقتلوھم میں ضمیر انہی لوگوں کی طرف جاتی ہے جن کا پیچھے ذکر ہے یعنی الذین یقاتلونکم وہ لوگ جو تم سے جنگ کرتے ہیں ان کو جہاں پاؤ مارو۔ یہ نہیں کہ کسی غیر مسلم کو جہاں پاؤ مارو۔ اور ثقفتموھم کا لفظ اختیار کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اندھا دھند مارنا مراد نہیں صرف جنگ میں مارنا جائز ہے +

(حاشیہ: ہر کافر کے قتل کا حکم نہیں)

دوسرے فقرہ میں جنگ کی حد کو بیان کیا ہے کہ کفار نے مسلمانوں کو بلا وجہ مکہ سے نکالا تھا اور اب وہ وہاں اغراض مذہبی کے لئے یعنی حج کے لئے بھی نہ جا سکتے تھے۔ اس لئے بتایا کہ جنگ ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے تم کو مکہ سے نکالا ہے اس وقت تک جاری رہے گی جبتک کہ یہ مکہ سے نکالے جائیں اس میں آخری فتح کی صریح پیشگوئی بھی ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ تمہاری جنگ اپنے حقوق کو واپس لینے کے لئے ہے +

(حاشیہ: جنگ کی حد)

۲۴۳ فتنۃ۔ اصل معنی فَتْن کے سونے کا آگ میں ڈالنا ہے تاکہ کھرا پن اس کے کھوٹ سے الگ ہو جائے۔ اس لئے محض آگ میں ڈالنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے یوم ھم علی النار یفتنون (الذاریٰت ۵۱-۱۳) اس لئے فتنۃ عذاب اور دکھ وغیرہ دینے کے معنی میں آتا ہے (غ)، قرآن شریف میں ان دکھوں اور تکلیفوں پر اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ جو کفار مومنین کو دیتے رہے ان الذین فتنوا المومنین والمؤمنات (البروج ۸۵-۱۰) فاذا اوذی فی اللہ جعل فتنۃ الناس کعذاب اللہ

(حاشیہ: فتن — فتنۃ — فتنہ سے مراد کفار کی ایذا رسانی ہے۔)

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ

اور مسجد حرام کے قریب ان سے جنگ نہ کرو جبتک کہ وہ اس کے اندر تمہارے ساتھ جنگ (نہ) کریں پھر اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم انکو مارو

كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى ۱۹۲ ۱۹۳

کافروں کی یہی سزا ہے ۲۴۴ پھر اگر وہ رک جائیں تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۴۵ اور ان سے جنگ کرو

لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝

یہانتک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔ پھر اگر وہ رک جائیں تو سزا ظالموں کے سوائے اور کسی کے لئے نہیں ۲۴۶

(العنکبوت ۲۹ - ۱۰) جہاں صاف اللہ کی راہ میں ایذا دیا جانے کو فتنہ قرار دیا ہے اور بخاری میں ابن عمرؓ کی روایت ہے کان الاسلام قلیلا فکان الرجل یفتن فی دینہ اما قتلوہ واما یعذبوہ حتی کثر الاسلام فلم تکن فتنۃ۔ اسلام حالت غربت میں تھا اس لئے ایک شخص کو اس کے دین کی وجہ سے دُکھ دیا جاتا تھا۔ یا اس کو قتل کر دیتے یا عذاب دیتے یہاں تک کہ اسلام بڑھ گیا پھر فتنہ نہ رہا اور مفردات میں ہے کہ فتنۃ بلاؤں اور مصیبتوں اور قتل اور عذاب وغیرہ افعال کریہہ پر بولا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے اور وہ بمقتضائے حکمت الٰہی ہوتا ہے پس مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو دین کی وجہ سے دُکھ دیئے جاتے ہیں اور ملک میں بے امنی کی حالت ہے وہ قتل سے بڑھکر ہے +

مسجد حرام میں جنگ کی ممانعت

۲۴۴ باوجودیکہ یہ بھی بتا دیا کہ مسجد حرام یعنی مکہ سے یہ لوگ نکال دیئے جائیں گے پھر بھی اس کی حرمت کی وجہ سے اس کے قریب بھی جنگ کرنے سے روک دیا۔ ہاں اگر کافر حدود حرم کے اندر جنگ میں ابتدا کریں تو پھر مسلمانوں کو بھی اجازت دی گئی +

نہی

انتہیٰ

۲۴۵ انتہوا۔ نہی کسی چیز سے روکنا۔ تنہون عن المنکر (آل عمران ۳ - ۱۰۹) ارایت الذی ینہی عبدا اذا صلی (العلق ۹ و ۱۰) اور انتہاء کے معنی اس چیز سے رک جانا جس سے روکا گیا ہے (غ) فمن جاء کا موعظۃ من ربہ فانتہی (۲۷۵) لئن لم تنتہ لارجمنک (مریم ۱۹ - ۴۶) +

کفار کے جنگ سے رک جانے کی صورت میں حکم

چونکہ اصل حکم جنگ کا اس لئے دیا تھا کہ یہ تم سے جنگ کرتے ہیں پس مطلب یہ ہے کہ اگر جنگ سے رک جائیں یا چونکہ اوپر فتنہ کا ذکر ہے یعنی مسلمانوں کو دکھ دینے کا تو مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو دکھ دینا چھوڑ دیں تو تم بھی جنگ نہ کرو اللہ ان کے پہلے قصور بخش دے گا +

یکون الدین للہ سے مراد یہ نہیں کہ اسلام کے سوا دوسرا دین نہ ہو

۲۴۶ فتنہ کے معنی ابھی لغت سے قرآن سے حدیث سے بیان ہو چکے (۲۴۳) پس قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ سے مراد یہ ہے کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ مسلمانوں کو دین کی وجہ سے دکھ نہ دیا جائے لیکن اسکے آگے جو الفاظ آتے ہیں ویکون الدین للہ اور دین اللہ کے لئے ہو۔ ان سے یہ غلط نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام ہی اسلام ملک میں ہو۔ مگر یہ معنی اول تو خود لا تکون فتنۃ کے خلاف ہیں۔ اور دوسرے قرآن شریف کی ان آیات کے بھی خلاف ہیں جن میں کفار سے صلح کر لینے کا حکم ہے وان جنحوا للسلم فاجنح لہا (الانفال ۸ - ۶۱) پھر نبی کریم صلعم کے عمل کے خلاف ہیں کہ آپ نے اس وقت تک جنگ نہیں کی کہ اسلام ہی اسلام ہو صلح حدیبیہ میں کفار کی پیش کردہ شرائط پر صلح کی یہاں تک کہ جو کافروں میں سے مسلمان ہو کر آپ کے پاس آئے۔ ان کو بھی واپس کر دینا منظور کیا۔ پھر فتح مکہ میں اہل مکہ کو حالت

۱۹۴ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے بدلے ہے اور تمام حرمت والی چیزوں میں بدلہ ہے ۲۴۷ پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم اسکو

عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝

اسی کے مطابق سزا دو جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے ۲۴۸ اور اللہ کے تقویٰ پر رہو اور جان لو کہ اللہ ان کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں

کفر پر چھوڑ کر معاف کر دیا حتیٰ کہ کفر کی حالت میں ان میں سے بعض لوگ مسلمانوں کے ساتھ جنگوں میں شامل ہوتے رہے پھر آپ کے پاس نویں اور دسویں سال ہجرت میں وفد پر وفد مشرکوں کے آتے تھے۔ اگر مشرکوں سے جنگ کا حکم ہوتا تو یہ لوگ کس طرح حالت شرک میں رہ کر مدینہ آ سکتے تھے۔ پھر آپ کی وفات کے وقت بھی یہود و نصاریٰ عرب میں موجود تھے دین اسلام تو پھر بھی اکیلا عرب میں نہ تھا۔ پھر لا اکراہ فی الدین میں تو اس کے بعد چل کر یہ کہا کہ دین میں جبر نہیں تو یہاں بجبر مسلمان کرنے کی تعلیم کیونکر ہو سکتی ہے پس جو معنی خلاف سیاق و سباق خلاف قرآن خلاف عمل نبوی ہیں کسی طرح قابل قبول نہیں ۔

مراد مذہبی آزادی کا قیام

یکون الدین للہ کے معنی صاف ہیں دین اللہ کے لئے ہو۔ جب دین کے لئے کوئی دکھ دینے والا نہ ہو تو دین اللہ کے لئے ہوگا۔ یہی معنی لہدمت صوامع الآیہ میں ہیں کہ جنگ کی غرض دنیا میں مذہبی آزادی کا قائم کرنا ہے۔ اور یہی معنی لا اکراہ فی الدین کے ہیں دین میں کوئی جبر نہ رہے۔ بخاری کی حدیث سے بھی یہی معنی ثابت ہیں جہاں یکون الدین للہ کے ماتحت امام بخاری حضرت ابن عمرؓ کی اس حدیث کو لائے ہیں کہ جب ان سے ابن زبیر کے معاملہ میں شامل ہونے کے لئے کہا گیا۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ قاتلنا حتی لم تکن فتنۃ وکان الدین للہ وانتم تریدون ان تقاتلوا حتی تکون فتنۃ ویکون الدین لغیر اللہ یعنی ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ نہ رہا اور دین اللہ کے لئے ہو گیا اور تم جنگ کرنا چاہتے ہو یہاں تک کہ فتنہ ہو اور دین غیر اللہ کے لئے ہو جائے جس کے صاف معنی ہیں کہ ہم نے جنگ کرکے مذہبی آزادی کو قائم کیا تم جنگ کرکے مذہبی آزادی کو دور کرنا چاہتے ہو۔ کیونکہ ابن زبیر کے معاملہ میں دو مسلمان گروہ جنگ کرنے والے تھے۔ اور کافروں کے غلبہ کا کوئی سوال نہ تھا ۔

عدوان

عدوان کے معنی یہاں زیادتی کی سزا ہے۔ دیکھو ۲۴۸ ۔

حرمت کے مہینوں میں جنگ سے رکنے کا حکم

۲۴۷ یہاں صاف حکم دیا کہ حرمت والے مہینوں اور تمام حرمت والی اشیاء کا مسلمانوں کو پاس کرنا چاہئے یہاں تک کہ کفار ان میں ابتدا کریں تب قصاص کے طور پر وہ بھی جنگ کریں۔ امام احمد نے جابر سے روایت کی ہے کہ نبی صلعم حرمت والے مہینوں میں جنگ نہ کرتے تھے۔ اور جنگ کرتے کرتے حرمت والا مہینہ آ جاتا تو وقفہ کر دیتے چنانچہ واقعہ حدیبیہ میں آپ نے جنگ کرنے سے انکار کیا۔ اور جنگ ہوازن میں حرمت والے مہینہ کی وجہ سے جنگ کو روک دیا (ث) ۔

اعتداء

۲۴۸ اعتداء کے اصل معنی مجاوزۃ الحق ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب دشمن نے حق سے تجاوز کیا ہے تو اب اس کے خلاف کارروائی حق سے تجاوز نہیں بلکہ عین حق ہے۔ اس لئے دوسرے اعتداء کے معنی مجازاۃ عدوان ہیں یعنی زیادتی کا بدلہ یا اس کی سزا۔ اور یہ اسی کے مطابق ہے جو جزاء سیئۃ کو قرآن کریم نے خود سیئۃ کہا ہے حالانکہ سزا فی الواقع برائی نہیں ہے۔ اسی لئے مفردات میں فاعتدوا علیہ کے معنی کئے ہیں قابلوہ بحسب اعتدائہ اس کی زیادتی کے مطابق اس کا مقابلہ کرو ۔

مع
غیر النفقۃ میں

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ ۚۖۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ ۱۹۵

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالو[۲۴۹] اور احسان کرو

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ لِلّٰہِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ ۱۹۶

کیونکہ اللہ احسان کرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔ اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو پھر اگر تم روکے جاؤ

فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْھَدْیِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَکُمْ حَتّٰی یَبْلُغَ الْھَدْیُ مَحِلَّہٗ ؕ

تو جو کچھ قربانی آسانی سے میسر آئے کرو اور اپنے سروں کو نہ منڈواؤ یہاں تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے[۲۵۰]

ھلاک

۲۴۹ التھلکۃ۔ ھلاک سے ہے اور ھلاک موت کو بھی کہتے ہیں اور کسی چیز کے ہاتھ سے جاتے رہنے کو بھی گو وہ دوسرے کے پاس موجود ہو جیسے ھَلَکَ عَنِّیْ سُلْطَانِیَہْ (الحاقۃ۔۲۹) اور بگاڑ اور فساد سے بھی ہلاک ہوتا ہے یہلک الحرث والنسل (۲۰۵) اور تہلکۃ وہ ہے جو ہلاکت کی طرف لے جائے۔

تہلکۃ

فی سبیل اللہ اموال کا خرچ نہ کرنا ہلاکت ہے

اپنے ہاتھوں سے اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالو۔ بخاری میں اس کے متعلق ہے نزلت فی النفقۃ یعنی یہ آیت خرچ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی پس مراد اس سے یہ ہوئی کہ خدا کی راہ میں جب جنگ کروگے تو اموال کی ضرورت بھی پیش آئے گی اس لئے اپنے اموال کو بھی خدا کی راہ میں خرچ کرو یا یہ مراد ہے کہ حفاظت دین کے لئے اگر اس وقت تلوار اٹھانے کی ضرورت ہے تو کبھی وہ وقت بھی آئے گا کہ صرف مال خرچ کرنیکی ضرورت ہوگی اُس وقت مال خرچ کرنا اور ہلاکت سے بچنا قسطنطنیہ کے حملہ میں جو صحابہ کے زمانہ میں ہوا ایک شخص صفوں کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا۔ تو بعض نے کہا القی بیدہ الی التھلکۃ اپنے آپ کو اپنے ہاتھ سے ہلاکت میں ڈال دیا۔ حضرت ابو ایوب انصاری نے فرمایا اس آیت کے یہ معنی نہیں فکانت التھلکۃ فی الاقامۃ فی الاھل والمال وترک الجھاد۔ ہلاکت تو اس میں تھی کہ ایک شخص اپنے اہل اور مال میں بیٹھا رہے اور جہاد کو ترک کر دے۔ اسی کے مطابق آیت کا خاتمہ احسان کی ترغیب پر کیا ہے۔ آج بھی گھروں میں بیٹھ رہنے میں ہلاکت ہے۔ اور اشاعت اسلام پر اموال کو خرچ کرنے کی ضرورت ہے اور اسی میں مسلمانوں کا بچاؤ ہے۔

احصار حصر

۲۵۰ احصرتم۔ اِحصار دشمن کے روکنے پر اور بیماری کے روکنے پر دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اور حصر صرف آخر الذکر پر (غ)

ھدیۃ ھدی

الھدی۔ ھَدِیَّۃ کی جمع ہے جس کے معنی تحفہ ہیں بل انتم بھدیتکم تفرحون (النمل[۲۷]۔۳۶) اور ھَدْی خاص ہے قربانی کے جانوروں کے لئے جو خانہ کعبہ کو لے جاتے جاتے ہیں۔ اونٹ ہو یا گائے بکری یا بھیڑ (غ)۔

مَحِلّ

مَحِلّ۔ حَلَّ سے ظرف مکان بھی ہوسکتا ہے اور ظرف زمان بھی قربانی کے اپنے مَحِلّ پر پہنچنے سے کیا مراد ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک محلھا الی البیت العتیق (الحج[۲۲]۔۳۳) کے ماتحت قربانی کا بہرحال خانہ کعبہ میں پہنچانا ضروری ہے۔ مگر نبی کریم صلعم نے دشمن کے روکنے پر حدیبیہ کے مقام پر جو مکہ سے نو میل ہے قربانیاں کردی تھیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ وہ جگہ بھی حرم میں داخل تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دشمن روک دے اور قربانیاں حرم میں نہیں پہنچائی جاسکتیں تو کیا کرے پھر اس علم کا حاصل ہونا جیساکہ امام صاحب نے شرط لگائی ہے کہ قربانی حرم میں پہنچ گئی ہے نہ صرف قرآن شریف میں مذکور نہیں بلکہ دینے بھی مشکل ہے۔ پس ایسی صورت میں مَحِلّ وہی ہے جہاں روکا گیا یعنی وہیں قربانی کردے ہاں بیماری کی صورت میں قربانی خانہ کعبہ میں بھی پہنچائی جاسکتی ہے تو اس صورت میں مَحِلّ بھی وہی ہوگا آیت ماقبل سے تعلق

حج میں روکا جانیکی صورت

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ

پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ دُکھ ہو تو اس کا فدیہ روزوں سے یا صدقہ سے

اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۥ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ

یا قربانی سے دے [251] پھر جب تم امن میں ہو تو جو شخص حج کے ساتھ عمرہ کا فائدہ اُٹھائے تو جو قربانی آسانی سے میسر آئے کردے اور جو

لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذٰلِكَ لِمَنْ

نہ پائے تو تین دن کے روزے حج میں رکھے اور سات جب تم لوٹ کر آؤ یہ پورے دس ہیں یہ اس کیلئے ہے جسکے

لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۧ

اہل مسجد حرام میں موجود نہ ہوں [252] اور اللہ کے تقویٰ پر رہو اور جان لو کہ اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے۔

ہو کہ وہاں جنگوں کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ دشمن حج کرنے سے روکتے تھے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ جنگ کا ذکر یہاں بطور جملہ معترضہ آگیا ہے اصل مضمون حج ہی جس سے رکوع شروع کیا تھا اور حج پر ہی ختم کیا ہے اور اگلے رکوع میں بھی حج کا ہی ذکر ہے چونکہ حج میں اس وقت رکاوٹ بھی اس لئے درمیان میں جنگوں کا ذکر کرنا پڑا۔ اور سر منڈوانے سے مراد حالت احرام سے باہر نکلنا ہے یعنی اس حالت سے جب انسان احرام باندھتا اور صرف دو بن سلی چادروں میں ملبوس ہوتا ہے اور جب ارکان حج پورے ہو جاتے ہیں تو اس وقت سر منڈوا کر یا بال چھوٹے کرا کر حاجی حالت احرام سے باہر نکلتا ہے اسلئے سر منڈوانا گویا حالت احرام کو کھل آنا ہے۔ — سر منڈوانا

ع [251] نُسُك کے اصل معنی ع۱۳۶ میں بیان ہو چکے ہیں یہ نَسِيكَة کی جمع بھی ہے جس کے معنی قربانی ہیں۔ — نُسُك

یعنی بیماری کی وجہ سے سر کے بال کٹوانے پڑیں یا اور کوئی فعل حالت احرام کے خلاف کرنا پڑے۔ جیسے لباس کے معاملہ میں تو اس کا فدیہ دے دے صحیح بخاری میں تین دن کے روزے یا چھ مسکینوں کا کھانا یا قربانی سے اس کی تفسیر کی ہے۔

ع [252] تمتع بالحج الی العمرۃ۔ متاع کے معنی ع۱۶۱ میں بیان ہو چکے ہیں اور مُتعۃ الحج خاص اصطلاح ہے یعنی عمرہ کا حج کے ساتھ خاص طریق پر ملانا اور حج تین قسم پر ہے۔ افراد۔ قران۔ تمتع۔ افراد یہ ہے کہ حج اور عمرہ علیحدہ علیحدہ کرے مثلاً حج کے بعد عمرہ کے لئے احرام باندھے یا حج کے مہینوں سے پہلے عمرہ کرے۔ اور پھر اسی سال حج کے مہینوں میں حج کرے قران یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ اور حج کی اکٹھی نیت کرے اور دونوں کے لئے احرام باندھے اور جب تک دونوں نہ کرلے احرام نہ کھولے۔ یا حج کے مہینوں میں عمرہ کے لئے احرام باندھے اور احرام کھولنے سے پہلے حج کو ساتھ ملائے۔ اور تمتع یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کے لئے احرام باندھے۔ پھر عمرہ کرکے احرام کھول دے اور حج کے دنوں میں حج کے لئے احرام باندھے۔ گویا یوں عمرہ کو ساتھ ملا کر انسان فائدہ اٹھالیتا ہے۔ اس کے لئے بھی فدیہ قربانی یا دس روزے قرار دیئے۔ — متعۃ الحج / حج تین طرح پر

رکوع ۲۵

احکام حج اور مفسدوں کی روک

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ ۱۹۷

حج (کے) معلوم مہینے ہیں پس جس شخص نے ان میں اپنے اوپر حج لازم کیا تو حج میں نہ فحش کلام اور

لَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ

نہ گالی گلوچ اور نہ کوئی جھگڑا ہو اور جو کچھ نیکی تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے ۲۵۳

فرض

۲۵۳۔ فَرَضَ۔ فرض سخت چیز کے کاٹنے اور اس میں اثر کرنے کو کہتے ہیں اور اس لئے کسی چیز میں حکم کے قطع کرنے کو بھی فرض کہا جاتا ہے اور وہ ایجاب کی طرح ہے مگر ایجاب یا واجب کرنا بلحاظ وقوع اور ثبات بولا جاتا ہے۔ اور فرض قطع حکم کے لحاظ سے (غ) پس فَرَضَ کے معنی لازم کر دیا یا واجب کر دیا اور سورۃ انزلنہا و فرضنہا (النور ۱) میں فرضنا کے معنی ہیں ہم نے تجھ پر اس پر عمل کرنا واجب کر دیا۔ اور یہی معنی ان الذی فرض علیک القرآن (القصص ۸۵) میں ہیں یعنی وہ جس نے قرآن پر عمل کرنا تجھ پر واجب کر دیا۔

فسوق

فسوق۔ فَسَقَ کے معنی کے لئے دیکھو ۴۱ مگر ابن عباس ابن عمر مجاہد وغیرہ سے یہاں سباب یعنی گالی دینا معنی مروی ہیں بئس الاسم الفسوق سے ظاہر ہے کہ فسوق ہر وہ نام ہے جسے انسان ناپسند کرے۔ چنانچہ یہی معنی تاج العروس میں دیئے ہیں۔ حدیث میں بھی ہے سباب المسلم فسوق پس یہاں گالی مراد ہے۔

حج کے مہینے

حج کا ذکر گزشتہ رکوع سے چلتا ہے۔ یہاں اول فرمایا کہ حج کے مہینے مشہور ہیں شوال۔ ذیقعد اور دس دن ذی الحج کے۔ حج کا احرام صرف انہی دو ماہ اور دس دن میں باندھا جا سکتا ہے۔

حج کی غرض

حج میں تین باتوں سے خصوصیت سے روکا ہے۔ ایسی کلام سے جو مرد و عورت کے تعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ گالی دینے سے۔ جھگڑا کرنے سے۔ ان تینوں باتوں میں یہ اشارہ ہے کہ حج کی غرض کیا ہے اور وہ انسان کو کس مقام پر پہنچاتا ہے۔

جذبہ عشق الٰہی

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حج مومن کا عاشقانہ فعل ہے یعنی جذبہ عشق الٰہی اس میں پایا جاتا ہے۔ اپنے محبوب کے کوچہ کی زیارت کے لئے وطن سے بیوطن ہوتا ہے۔ لباس بھی آسایش والا ترک کر دیتا ہے وہاں جا کر اس گھر کے گرد گھومتا ہے۔ دوڑتا ہے پس جب حج میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جذبہ عشق الٰہی کے سامنے سارے جذبات اور محبتیں ٹھنڈی پڑ جائیں تو عشق و محبت دنیوی میں جو اعلیٰ سے اعلےٰ درجہ کی محبت ہے یعنی مرد اور عورت کا تعلق اس کے متعلق کلام کرنے سے بھی روکا تاکہ اس اصل جذبہ عشق میں کسی اور محبت کی آمیزش نہ ہو۔

مساوات نسل انسانی

دوسری غرض حج کی مساوات انسانی کو دکھانا ہے جہاں بادشاہ سے لے کر گدا تک ایک ہی لباس میں ملبوس کھڑے ہوں۔ کیونکہ خدا کے حضور سب انسان یکساں ہیں اس لئے گالی دینے سے بھی روکا۔ مساوات انسانی مبنی ہے حفاظت خون پر حفاظت مال پر حفاظت عزت پر۔ اسی آخری بات کو لوگ جلد بھول جاتے ہیں۔ اس لئے بتایا کہ حج میں کوئی ایسا فعل بھی نہ ہو جو مساوات نسل انسانی کے نقیض ہو۔

روحانیت کا آخری مقام

اور حج چونکہ روحانیت کی منزل کا آخری مقام ہے۔ اور جھگڑے اطمینان قلبی کو تباہ کرنے والی چیز ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ حج میں جھگڑا بھی نہ کرو تاکہ تمہارے اس اطمینان روحانی میں جو حج میں حاصل ہونا چاہئے کوئی امر مخل نہ ہو۔ اور آخر پر فرمایا کہ نیکی بھی کرو تاکہ اللہ جو تمہاری نیکیوں کو جانتا ہے تمہیں اجر دے گویا صرف چند ناپسندیدہ امور سے رکنا ہی ترقی کی آخری منزل نہیں بلکہ ان سے رکتے ہوئے ساتھ ہی نیکی میں ترقی کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت میں ترقی کرے دوسرے لوگوں کی خدمت کرے اور محبت اور الفت کے تعلقات کو جو محض خدا کے لئے ہوں بڑھائے۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰاُولِى الْاَلْبَابِ

اور زاد (راہ) لے لیا کرو البتہ بہترین زاد تقویٰ ہے اور اے عقل والو میرا تقویٰ اختیار کرو ۲۵۴

۱۹۸ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ

تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے رب سے فضل کی طلب میں لگو ۲۵۵ پھر جب تم عرفات سے

عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ

پھرو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کا ذکر کرو ۲۵۶ اور اسے یاد کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت دی

---

۲۵۴ تزوّدوا۔ اس کا مادہ زاد ہے اور زیادۃ بڑھانے کو کہتے ہیں (غ) ونزداد کیل بعیر (یوسف ۱۲-۶۵) مازادھم الا ایمانا وتسلیما (الاحزاب ۳۳-۲۲) فزادھم اللہ مرضا (۱۰) اور زاد اس ذخیرہ کی گتی چیز کو کہا جاتا ہے جو احتیاج وقتی سے زیادہ ہو اور تزوّد کے معنی زاد راہ لے لینا +
(زیادۃ — زاد - تزوّد)

حج میں عاشقانہ رنگ تو سکھایا مگر وہ امور جن کو بعض لوگوں نے عاشقانہ فعل تصور کرکے اختیار کیا ہوا تھا اور حقیقت میں وہ نقص تھے ان سے روک بھی دیا۔ ابو داؤد میں ہے کہ اہل یمن حج کرتے تو زاد راہ نہ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں۔ اور ایک روایت ابن عمرؓ کی ہے کہ بعض لوگ حالت احرام میں سفر خرچ کو پھینک دیتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یا سوال کرتے یا چوری یا کسی اور ناجائز ذریعہ سے مال لیتے کیونکہ اس کے بغیر تو زندہ رہنا ناممکن تھا۔ اس لئے فرمایا کہ زاد راہ ساتھ لے لیا کرو ورنہ کم از کم سوال تو کرنا پڑے گا اس میں مسلمان کو اعلیٰ درجہ کی خودداری سکھائی ہے +
(حج میں زاد راہ کی ضرورت)

اس کے ساتھ ہی ظاہر سے باطن کی طرف کلام کو پھیر کر فرمایا کہ اس چھوٹے سے سفر کے لئے زاد راہ کی ضرورت ہے تو اس بڑے سفر کے لئے جو سفر آخرت درپیش ہے کس قدر زاد راہ کی ضرورت ہے اور وہ زاد راہ تقویٰ ہے +
(آخرت کا زاد راہ)

۲۵۵ تبتغوا۔ اس کا مادہ بغی ہے جس کے معنی میانہ روی سے آگے نکل جانے کو چاہنا ہیں مگر ابتغاء میں تجاوز نہیں پایا جاتا بلکہ صرف کسی چیز کے طلب کرنے کی کوشش سے یہ لفظ مخصوص ہے (غ) +
(ابتغاء)

فضل کے اصل معنی زیادۃ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل بغیر اکتساب بھی ملتا ہے لیکن جیسا کہ مفردات میں ہے ایک فضل وہ بھی ہے جو اکتساب سے ملتا ہے۔ اور ابتغاء کے ساتھ لانے سے یہ بتا دیا کہ وہ فضل طلب کرنے سے ملتا ہے جیسے فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (الجمعۃ ۶۲-۱۰) یا۔ واخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ (المزمل ۷۳-۲۰) ان تمام مقامات میں فضل سے مراد وہ مال ہے جو تجارت سے حاصل ہوتا ہے +
(فضل)

بخاری میں ابن عباس کی روایت ہے کہ جاہلیت میں عکاظ اور مجنہ اور ذوالمجاز میں منڈیاں لگتی تھیں مسلمانوں نے خیال کیا کہ حج میں تجارت کرنا شاید منافی اغراض حج ہو۔ اس لئے فرمایا کہ اصل نیت حج ہو خصوصاً فی مواسم الحج اور اس کے احکام کو بھی مدنظر رکھو تو تجارت کر لینے میں حرج نہیں۔ ابومسلم نے کہا ہے کہ یہ اجازت حج سے فراغت کے بعد ہے (۱) اگر حج روحانی ترقی کا کمال ہے تو تجارت دنیوی ترقی کا کمال ہے اور مسلمانوں کو دونوں قسم کی ترقی اپنے اندر جمع کرنی چاہئے حج کے ساتھ بھی تجارت کی اجازت دیکر تجارت کی ضرورت کو بتایا مسلمانوں نے اگر روحانی ترقی کی راہوں کو چھوڑا ہی تو ساتھ ہی دنیوی ترقی کی راہوں کو بھی چھوڑا ہے۔ اور تجارت ان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسری قوموں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے
(حج میں تجارت — دینی اور دنیوی ترقی پہلو بہ پہلو)

۲۵۶ افضتم۔ فاض الماء کے معنی ہیں پانی زور سے بہا۔ تری اعینھم تفیض من الدمع (المائدۃ ۵-۸۳) اتنزو
(فاض)

وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ ۱۹۹

اور گو اس سے پہلے تم یقیناً گمراہوں میں سے تھے ۲۵۷ پھر تم وہاں سے ہو کر آؤ جہاں سے

اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

لوگ ہو کر آتے ہیں اور اللہ کی حفاظت مانگو بیشک اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۵۸

کے جاری ہونے پر بولا گیا ہے اور لوگوں کے کثرت کے ساتھ ایک مقام سے آنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ گویا پانی کے بہنے کے ساتھ تشبیہ ہے (غ) جیسے یہاں اور اگلی آیت میں اور افاضۃ فی الحدیث بات میں لگ جانے پر بھی بولا جاتا ہے جیسے لمسکم فیما افضتم فیہ (النور ۲۴-۱۴) ھو اعلم بما تفیضون فیہ (الاحقاف ۴۶-۸) +

افاضۃ فی الحدیث

عرفات۔ عرف سے ہے مَعرِفَۃ اور عرفان کسی چیز کے نشان میں تفکر اور تدبّر سے اس کا پا لینا ہے۔ اور یہ علم سے زیادہ خاص ہے اور معرفۃ کے مقابلہ میں انکار ہے اور علم کے مقابلہ میں جہل اور عرفات اس میدان کا نام ہے جہاں یوم حج یعنی نویں ذی الحج کو تمام حاجی اکٹھے ہوتے ہیں جس طرح یوم عَرَفَۃ اس دن کا نام ہے۔ کیا اسم بامسمّی میدان ہے کیونکہ واقعی اس میدان میں اور اس دن میں بندوں کو اللہ تعالیٰ کی ایک خاص معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اور سخت سے سخت دل بھی اللہ تعالیٰ کے حضور پگھل جاتے ہیں۔ لاکھوں انسان ایک لباس میں ایک ہیئت میں صرف خدا کی عظمت کے نعرے لگاتے ہوئے لبیك اللّٰھم لبیك لا شریك لك لبیك سارے فرق مراتب کو فرق رنگ کو فرق قومیت کو پاؤں تلے روند دیتے ہیں۔ اور نہ صرف خدا کی معرفت حاصل کرتے ہیں بلکہ نفس انسانی کی صحیح معرفت بھی یہاں حاصل ہوتی ہے میدان عرفات مکہ سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسی میں وہ جگہ ہے جس کو جبل رحمت کہتے ہیں جس پر کھڑا ہو کر خطیب خطبہ پڑھتا ہے +

معرفۃ۔ عرفان
عرفات
یوم عرفۃ
میدان عرفات
جبل رحمت

مشعر الحرام۔ مشعر کے معنی ظاہری نشان ہیں اور مشعر الحرام۔ مُزدلِفہ کا نام ہے جہاں عرفات سے واپس ہو کر رات کاٹی جاتی ہے۔ وہیں نماز مغرب و عشاء جمع کر کے اور پھر فجر کی نماز پڑھی جاتی ہے +

مشعر الحرام

۲۵۷ وہ جھگڑا جس نے صرف میلے کا رنگ اختیار کر لیا تھا اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اسلام نے ایسا داخل کیا کہ ایک اللہ ہی اللہ کا نام وہاں سنا جاتا ہے +

اسلام نے کیا انقلاب پیدا کیا

۲۵۸ استغفروا۔ اِستِغْفار کا مادہ غَفْر ہے جس کے معنی ہیں اِلْبَاسُ مَا یَصُوْنُهٗ عَنِ الدَّنَسِ (غ) اس کا پہنا دینا جو اسے میل سے (یا برائی سے یا معیوب ہونے سے) بچا رکھے اور اسی لئے کہتے ہیں اِغْفِرْ ثَوْبَكَ فِی الْوِعَاءِ یعنی اپنے لباس کو صندوق میں محفوظ رکھ اور کہا جاتا ہے کہ کپڑے کو رنگ لو فَاِنَّهٗ اَغْفَرُ لِلْوَسَخِ کیونکہ وہ میل سے زیادہ محفوظ رکھنے والا ہے (غ) پس غَفْر کے اصل معنی بروئے لغت محفوظ رکھنا ہیں اور اِستِغفار کے معنی حفاظت چاہنا۔ اور لسان العرب میں ہے کہ غَفْر کے معنی ہیں تَغْطِیَۃ اور سِتْر یعنی ڈھانکنا اور غَفَرَ اللّٰہُ ذُنُوْبَهٗ کے معنی ہیں اللہ نے اس کے گناہوں کو ڈھانک لیا (دبا دیا) اور مِغْفَر خود کو کہتے ہیں کہ وہ حفاظت کا کام دیتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ گناہ سے حفاظت دو طرح پر ہو سکتی ہے ان گناہوں سے جو انسان کر چکا ہے حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ ان کی سزا سے بچ جائے مگر اس سے بڑھ کر حفاظت گناہ سے یہ ہے کہ انسان گناہ کرنے سے ہی بچ جائے اس لئے غفر اور اِسْتِغْفَار میں گناہ سے حفاظت دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے اور کہیں اس سے مراد گناہ کی سزا سے بچنا ہوتا ہے اور کہیں خود گناہ سے بچنا چنانچہ قسطلانی شرح بخاری میں قد غفر لك ما تقدم من ذنبك کی تشریح میں لفظ غَفْر کے معنی ہر ماوی سے یوں نقل

غفر
استغفار
مِغْفَر

۲۰۰ فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ

پھر جب تم اپنی عبادتوں کو پورا کر لو تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح تم اپنے بڑوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔

کہتے ہیں الغفر الستر وھو ما بین العبد والذنب و ما بین الذنب و عقوبتہ یعنی غفر کے معنی بچانا ہیں اور وہ یا بندہ اور اس کے ذنب کے درمیان ہے یعنی بندہ کو قصوروار ہونے سے بچایا جانے اور یا گناہ اور اس کی سزا کے درمیان ہے یعنی جو گناہ ہو چکا ہے اس کی سزا سے بچایا جائے اور غفار اور غفور اور غافر جو اللہ تعالیٰ کی صفت میں ہیں تو وہ بھی ان دونوں معنوں پر مشتمل ہیں اور ان کے معنی محفوظ رکھنے والا بچانے والا اور اول الذکر دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور نہایہ میں ان کے معنی میں لکھا ہے الساتر لذنوب عبادہ و عیوبہم المتجاوز عن خطایاھم و ذنوبہم یعنی اپنے بندوں کے قصوروں اور عیبوں کو ڈھانک دینے والا (یعنی ان سے قصور اور عیب ظاہر نہ ہونے دینے والا) اور ان کی خطاؤں اور قصوروں سے درگزر کرنے والا۔ جہاں ساتر کے مقابلہ پر متجاوز لا کر بتا دیا ہے کہ پہلے حصہ میں ان قصوروں اور عیبوں کا ذکر ہے جو سرزد نہیں ہوئے اور خود قرآن شریف میں ہے فانہ کان للاوابین غفورا (بنی اسرائیل ۱۷-۲۵) اور اواب وہ ہے جو ہر وقت خدا کی طرف رجوع کرتا رہتا ہے اس کے لئے خدا کا غفور ہونا یہی معنی رکھتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچاتا رہتا ہے اور ان میں مبتلا ہونے نہیں دیتا۔ اور اگر غفر کے معنی عذاب کے چھونے سے بچانا بھی لئے جائیں جیسا کہ بعض اہل لغت نے لکھ دیا ہے تو عذاب کے چھونے سے بھی انسان دونوں طرح سے بچتا ہے یعنی یہ کہ وہ بات ہی اس سے سرزد نہ ہو جو عذاب لاتی ہے یا اگر سرزد ہو گئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی سزا سے بچالے ✦

غفار۔غفور۔غافر

خود قرآن شریف میں اس لفظ کا استعمال دونوں معنوں میں یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہے۔ اول جہاں عفو اور غفر کا اکٹھا ذکر کیا ہے وہاں ہمیشہ عفو کو پہلے رکھا ہے اور غفر کو پیچھے اور عفو کے معنی گناہ کو مٹانا ہیں یعنی اس کی سزا سے بچا لینا پس غفر کے معنی اس صورت میں سوائے گناہ سے حفاظت کے اور ہو ہی نہیں سکتے دیکھو ۳۶۵ دوسرے استغفار کا مرتبہ تمام نیکیوں میں بلند تر رکھا ہے الصابرین والصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین بالاسحار (آل عمران ۳-۱۶) جہاں پہلے مرتبہ پر صبر کرنے والے ہیں یعنی جو اپنے آپ کو مشکلات میں روک رکھتے ہیں دوسرے پر صدق دکھانے والے تیسرے پر عاجزی کے ساتھ فرمانبرداری اختیار کرنے والے چوتھے پر اپنی قوتوں اور طاقتوں کو اللہ کی راہ میں لگانے والے اور سب سے اوپر صبح کے وقتوں میں استغفار کرنے والے دیکھو ۳۸۸ تیسرے استغفار کی ضرورت جنت میں بھی بتائی ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ محض بلندی درجات کی دعا ہے کیونکہ جنت میں تو داخل ہی تب ہو گا جب گناہ بخشے جائیں گے۔ اس لئے جب جنتیوں کی اس دعا کا ذکر کیا ربنا اتمم لنا نورنا واغفر لنا (التحریم ۶۶-۸) تو معلوم ہوا کہ غفر اور استغفار سے یقیناً مراد اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہنا ہے ✦

غفر عفو پر ترقی ہے

استغفار کا بلند رتبہ

جنت میں استغفار کی ضرورت

آیت کے پہلے حصہ میں جو ذکر ہے کہ جہاں سے لوگ لوٹیں وہاں سے لوٹو تو یہ بعض قوموں نے جو اپنے لئے امتیاز قائم کر رکھا تھا اس کو دور کیا ہے۔ قریش اور کنانہ جو حمس کے نام سے موسوم تھے۔ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کرنے کے لئے میدان عرفات میں نہ جاتے تھے اور مزدلفہ سے واپس آجاتے تھے۔ ایسے امتیازات کو دور کر کے مساوات کو قائم کیا اور حکم دیا کہ سب لوگ عرفات میں جائیں اور وہاں سے لوٹیں ✦

امتیاز قومی کو دور کیا

اس کے بعد استغفار کا ذکر ہے۔ بخاری میں اس کی تفسیر میں ہے واستغفروا اللہ ان اللہ غفور رحیم حتی ترموا الجمرۃ گویا رمی جمار یا کنکریوں کا پھینکنا اسی استغفار کے ذکر میں ہی آگیا۔ اور یوں رمی جمار کی اصل حقیقت بتا دی۔ انسان میں اپنے

رمی جمار یعنی کنکریوں کا پھینکنا

ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ ۲۰۱

بلکہ اس سے بھی بڑھکر ۲۵۹ پھر لوگوں میں سے کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں (ہی) دیدے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں اور کوئی ان

مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

میں سے کہتا ہے اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں (بھی) بھلائی (دے) اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا ۲۶۰

ہونے کے لئے عاشقانہ حالت پیدا کرنا اور اس کی عملی تصویر کھینچ دینا تاکہ قلب پر دیرپا اثر ہو حج کی اصل غرض ہے اسی لئے سب لباس اُتروا کر دو چادروں کے لباس میں ملبوس کر دیا۔ اور عزت وجاہت امارت فیشن کے سارے امتیازات کو یکسر مٹا دیا۔ کنکریں پھینکنے میں ایک مسلمان کی یہ تصویر دکھانا مقصود ہے کہ وہ بدی کے ساتھ کبھی صلح نہیں کر سکتا۔ نہ بدی کی طاقتوں کی طرف سے لاپروا ہو سکتا ہے بلکہ ہمیشہ ان کے مقابلہ کے لئے تیار رہے۔ اور ہر وقت ان کو اپنے آپ سے دور کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے کسی چیز کی طرف کنکر پھینکنے سے مراد ہوتی ہے کہ انسان اسے اپنے پاس پھٹکنے نہیں دے گا۔ اور اس کے خلاف جنگ کریگا۔ اسی طرح ارکان حج میں دوڑنا اور تیز چلنا ہے جس میں بتایا ہے کہ ہر قسم کی ترقی روحانی ہو یا دنیوی جدوجہد سے ہے۔ نہ حجروں میں بیٹھنے سے۔ توحید کے گھر کے گرد گھومنا کیا ہے نیکیوں کے اصل مرکز کے گرد پھرتے رہنا۔ یہاں بھی استغفار کے معنی گناہوں سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہنا ہی ہیں +

حج میں دوڑنا اور تیز چلنا طواف

ع ۲۵۹ زمانہ جاہلیت میں حج سے فارغ ہو کر میلے لگاتے اور ان میں اپنے اپنے باپ دادوں کی بڑائی کا ذکر کرتے اس کی بجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر سکھایا جو حقیقی ترقی کی راہ ہے۔ باپ دادوں کی بڑائی کا ذکر شاہراہ مقصود میں رکاوٹ ہے۔ اس سے روکا آج مسلمانوں نے بڑا کمال اسی کو سمجھا ہوا ہے پدرم سلطان بود۔ اپنی بڑائی کے لئے یہی کافی سمجھا ہوا ہے کہ ہم بادشاہوں اور سیدوں کی اولاد ہیں۔ اللہ کے ذکر سے انسان ان راہوں پر چل سکتا ہے جو خود اس کو مقام عظمت پر پہنچاتی ہیں جیسا کہ فرمایا فاذکرونی اذکرکم (۱۵۲) +

باپ دادوں کی بڑائی کرنے سے روکا ہے

ع ۲۶۰ اس آیت میں اور اس سے پہلی میں دو دعاؤں کا ذکر ہے پہلی دعا ان لوگوں کی ہے جن کی ہمتیں دنیا تک محدود ہیں خدا سے بھی کچھ مانگتے ہیں تو اس دنیا کی زندگی کے لئے ہی مانگتے ہیں۔ آج کل کی مہذب دنیا کا یہ نقشہ ہے۔ مگر مسلمان کو اللہ تعالیٰ یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم کو دین و دنیا دونوں کے کمال پر پہنچنا اپنے مدنظر رکھنا چاہئے۔ صرف ایک کا کمال مت چاہو۔ حج کے ذکر کے ساتھ اس دعا کا لانا جو دینی اور دنیوی ترقیات کو مسلمان کے اندر جمع کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ نہایت موزون ہے حج بھی کرو تجارت بھی معراج روحانی بھی حاصل کرو معراج دنیوی بھی +

دعائے جامع دین و دنیا

حدیث بخاری میں ہے کہ نبی کریم صلعم کی دعا ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ تھی اور امام احمد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت انس سے پوچھا گیا کہ آنحضرت صلعم اکثر کونسی دعا مانگا کرتے تھے تو آپ نے یہی دعا بتائی اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ایک شخص کی بیمار پرسی کو گئے اور اس کی حالت پوچھی تو اس نے کہا میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اے خدا جو سزا تو مجھے آخرت میں دینے والا ہے وہ دنیا میں ہی دے لے تو آپ نے فرمایا بلکہ یوں دعا کیا کرو:۔

ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار +

دنیا کی حسنات کی طلب

۲۰۲ ۲۰۳ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ

یہی ہیں جن کے لئے اس سے بہرہ ور ہونا ہے جو انہوں نے کمایا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے[261] اور گنتی کے دنوں میں اللہ کو یاد کرو پھر جو کوئی جلدی کر کے دو دن میں چلا جائے اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کوئی پیچھے رہے اس پر

۲۰۴ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝ وَمِنَ النَّاسِ

(بھی) کوئی گناہ نہیں[262] (یہ) اس کیلئے ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور اللہ کے تقویٰ پر رہو اور جان لو کہ تم اسکے حضور اکٹھے کئے جاؤ گے اور لوگوں میں سے

سریع

حساب

حسیب

سریع الحساب

۲۶۱ سریع الحساب ۔ سریع سرع سے ہے اور سُرْعَۃ ضد ہے بطاء کی یعنی ایک کام میں تاخیر یا دیر یا سستی نہ کرنا ۔ اور سریع وہ ہے جو سستی یا تاخیر نہیں کرتا ۔ انہم کانوا یسارعون فی الخیرات (الانبیاء ۲۱ - ۹۰) یعنی نیکیوں کے کرنے میں تاخیر یا سستی نہ کرتے تھے ۔ وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم (آل عمران ۳ - ۱۳۲) اپنے رب کی مغفرت حاصل کرنے میں دیر نہ کرو ۔ اور حساب کے معنی مشہور ہیں ۔ اور معاملات میں حساب کو حساب اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے وہ اندازہ معلوم ہوتا ہے جس میں کفایت ہے نہ اصل مقدار پر زیادتی ہے ۔ نہ کمی (دت) اسی لئے حسیب جو اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اس کے معنی کافی ہیں ۔ اور یہ جو فرمایا کہ اللہ سریع الحساب ہے ۔ تو اس کا جلدی حساب لینا یہی ہے کہ جو فعل انسان کرتا ہے اس کا حساب ساتھ ساتھ ہی ہوتا جاتا ہے ۔ اور اس کو ایک کا حساب لینا دوسرے کے حساب لینے سے روکتا نہیں کہ ایک کے معاملہ میں تاخیر کرنی پڑی صرف یہ معنی نہیں کہ قیامت کے دن حساب لینے میں اسے بہت دیر نہ لگے گی ۔ اسے دنیا میں بھی دیر نہیں لگتی ۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ الٰہی محاسبہ ہر آن جاری ہے ۔ کوئی فعل نہیں مگر اس کا نتیجہ ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوتا چلا جاتا ہے ۔ ہاں قیامت کے دن وہ محاسبہ جو بوجہ اپنی لطافت کے یہاں نظر نہیں آتا کھلے طور پر محسوس ہونے لگے گا ۔ اسی کی طرف اشارہ ہے ان الفاظ میں لقد کنت فی غفلۃ من ھذا فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید (ق ۵۰ - ۲۲) یعنی نتائج تو ساتھ ساتھ ہی ظاہر ہو رہے تھے مگر اے انسان تو ان کی طرف سے غافل تھا آج وہ غفلت کا پردہ ہم نے دور کر دیا اور تیری نظر تیز ہو گئی ان نتائج کو اب تو دیکھ سکتا ہے ۔ پس حساب تو ساتھ ساتھ ہو رہا ہے وہاں اس کا رنگ نیا ظاہر ہو گا جو کھلا محسوس ہو گا ۔ اور یہ اسی کے مطابق ہے جو فرمایا وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ ونخرج لہ یوم القیامۃ کتابا یلقاہ منشورا (بنی اسرائیل ۱۷ - ۱۳) یعنی ہر ایک انسان کے عمل کو ہم نے اس کے ساتھ لگا دیا ہے اور قیامت کے دن ایک کتاب ہم اس کے لئے نکال دیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا ۔ گویا نتیجہ ہر عمل کا تو یہیں سے اس کے ساتھ لگا ہوا ہے ۔ ہاں قیامت میں وہ اس نتیجہ کو کھلا کھلا دیکھ لے گا ۔ اسی لئے اس کے بعد فرمایا کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا (بنی اسرائیل ۱۷ - ۱۴) یعنی آج کسی اور حساب کرنے والے کی ضرورت نہیں تیرا اپنا نفس ہی تجھ پر حساب کے لئے کافی ہے ◆

خدا کا محاسبہ اس دنیا میں اور قیامت میں

ایام تشریق

۲۶۲ یہ ایام تشریق کی طرف اشارہ ہے جو یوم النحر یعنی عید کے دن کے بعد تین دن ہیں ۔ ہاں وہ دو دن میں بھی کوئی چلا جائے تو ہرج نہیں ◆

مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝

وہ بھی ہے کہ جس کی بات دنیا کی زندگی میں تجھے تعجب میں ڈالتی ہے اور وہ اللہ کو اس پر گواہ بناتا ہے جو اسکے دل میں ہے اور وہ جھگڑا کرنے میں سخت ہے[۲۶۳]

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ ۲۰۵

اور جب حاکم بنتا ہے تو ملک میں کوشش کرتا ہے کہ اس میں فساد ڈالے اور کھیتی اور نسل کو ہلاک کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا[۲۶۴]

عجب۔تعجب — **۲۶۳** یعجب عَجَبْ اور تَعَجُّبْ اس حیرت کی حالت کا نام ہے جو انسان کو اس وقت پیش آتی ہے جب وہ کسی چیز کے سبب سے ناواقف ہو اور اَعْجَبَ کے اصل معنی ہیں اسے تعجب میں ڈالا اور خوش کرنا بھی آتے ہیں (ت) +

اعجب

الدّ۔لُدّ — اَلَدّ۔اس جھگڑنے والے کو کہتے ہیں جو انکار میں نہایت سخت ہو جمع لُدٌّ ہو وتنذر بہ قوما لدّا (مریم ۱۹-۹۷) اور اللّٰد گویا شَدِیدُ اللَّدَدِ ہے یعنی جس کی گردن کی دونوں طرفیں سخت ہوں یا اکڑی ہوئی جس چیز کا ارادہ کرلیتا ہے اس سے پھرتا نہیں (غ)

خصام — خِصَام۔مصدر بمعنی مُخَاصَمَۃ ہے یا خَصْم کی جمع۔جھگڑا یا لڑائی کرنے والا +

مذہب مفسدین — مفسرین کہتے ہیں اس میں شریق بن اخنس کا ذکر ہے۔مگر قرآن شریف کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ یہ ذکر عام ہے مفسدین کا ذکر ہے اب بھی بہتیرے ایسے مفسد ہیں۔بہتیرے مہذب دل میں ایک قوم کی تباہی کو مدنظر رکھکر ان کی جڑیں کاٹتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی یقین دلاتے جاتے ہیں کہ ہم تمہارے خیرخواہ ہیں اور یہ تجاویز تمہاری بہتری کے لئے ہیں۔قرآن کریم کے عام الفاظ کو خاص خاص لوگوں پر محدود کرنا کلام الٰہی کی بیوقری کرنا ہے۔اس مضمون کا تعلق پچھلے مضمون سے اس لحاظ سے ہے کہ پہلے ذکر جنگ کا تھا اور یہاں سمجھایا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ وہ باتیں توچکنی چپڑی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو نسل انسانی کا بڑا ہمدرد ظاہر کرتے ہیں لیکن دل میں ظلم اور فساد ہوتا ہے گویا اسلام کے دشمنوں کا نقشہ کھینچا ہے اور ایک یہ بھی تعلق ہے کہ ابھی حج کے احکام کا ذکر ہو رہا تھا۔اور حج میں رکاوٹ پیدا کرنیوالے ایسے ہی لوگ تھے کہ اپنے آپ کو مصلح بھی بتاتے تھے۔مگر فی الحقیقت فساد پھیلا رہے تھے +

تولّٰی — **۲۶۴** تولّٰی کے معنی ضحاک سے غلب وصار والیا مروی ہیں یعنی غالب آئے اور حاکم بنے معمولی معنی پھر جانا یہاں مراد نہیں +

حرث — حَرْث۔زمین میں بیج ڈالنے اور اسکو زراعت کے لئے تیار کرنے کو کہتے ہیں۔اور جو چیز اس طرح ڈالی جائے یعنی کھیتی اس کو بھی حرث کہا جاتا ہے۔استعارۃً یہ لفظ عورت پر بھی استعمال ہوا ہے اس لئے کہ جس طرح دانہ کا بقا زمین سے ہے نوع انسان کا بقا عورت سے ہے۔بعض لوگوں نے نسل کے قرینہ کی وجہ سے یہاں عورت مراد لی ہے۔اور امام صادق سے منقول ہے کہ حرث سے مراد دین اور نسل سے مراد لوگ ہیں۔مگر ظاہر معنی زیادہ قرین قیاس ہیں +

نسل — نسل کے اصل معنی انفصال عن الشئ کے ہیں یعنی کسی چیز سے علیحدہ ہو جانا۔اسی سے تیزی سے نکل آنا بھی اس کے معنی ہیں وھم من کل حدب ینسلون (الانبیاء ۲۱-۹۶) اور نَسْل اولاد کو بھی کہتے ہیں اس لئے کہ وہ باپ سے نکلتی ہے (غ) +

حکومت کی اصل غرض — پچھلی آیت کے مضمون کو مکمل کیا ہے کہ باتیں کرنے والے تو بہت ہیں۔اور بڑے بڑے اصول بھی نسل انسانی کی خیرخواہی کے قائم کرتے ہیں لیکن جب حکومت ملتی ہے تو بجائے ہمدردی مخلوق کے خواپنی یا اپنی قوم کی بہتری کے لئے زمین کو ویران کر دیتے اور نسل کو تباہ کر دیتے ہیں۔اسی کو فساد قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ حکومت کی اصل غرض زمین کو سرسبز و شاداب بنانا اور لوگوں

مہذب اقوام کا نقشہ — کی بھی خواہی کرنا ہے آج کل کی مہذب قومیں لفظوں میں بڑے بڑے لمبے چوڑے اصول باندھتی ہیں اور اپنے آپ کو نسل انسانی کا سچا بہی خواہ ظاہر کرتی ہیں لیکن جب موقعہ ملتا ہے تو دوسری قوموں کو ذلیل کرتے ہیں اور ان کو انسانیت کی صفات سے محروم

۲۰۶ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ وَمِنَ

اور جب اسے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کر تو جھوٹی شیخی اسے پکڑ کر گناہ میں لگا دیتی ہے سو اس کیلئے دوزخ بس ہے اور یقیناً وہ بری جگہ ہے [۲۶۵]

۲۰۸ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

لوگوں میں سے وہ (بھی) ہے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کیلئے اپنے آپ کو بیچ ڈالتا ہے اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے [۲۶۶] اے لوگو جو ایمان

آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝

لائے ہو! تم سارے کے سارے فرمانبرداری میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ بلا شبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے [۲۶۷]

مسلمانوں کا حکومت کی اصل غرض کو بھلا دینا

کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے قرآن پر توجہ نہ کی اور حکومت کی اصل غرض کو نظر انداز کر کے اس حالت پر پہنچے کہ حکومت ان سے لے لی گئی کیونکہ وہ نفس پرست بن گئے اور قوم کی بہتری ان کی اصلی غرض نہ رہی بلکہ خود حیاشی کر لینے کو حکومت کی اصل غرض سمجھ لیا اور آج بھی بہتیرے ایسے ہیں کہ قوم پرستی اور وطن پرستی کے بڑے بڑے جذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن کسی بلند مرتبہ پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور اپنی ہی قوم کی جڑیں کاٹنا شروع کر دیتے ہیں +

عزۃ

۲۶۵ عزۃ کے اصل معنی وہ حالت ہے جو انسان کو مغلوب ہونے سے بچانے والی ہو مگر کبھی اس کا استعمال مذموم حمیۃ اور انفۃ پر ہوتا ہے یعنی جھوٹی شیخی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا بغیر اس کے کہ بڑا ہو (غ) یہاں یہی معنی ہیں +

مھد۔ مھاد

مِہاد۔ مَہد اور مِہاد وہ مکان ہے جو تیار کیا گیا ہے اور جس پر چلا جاتا ہے (غ) اور یا یہ دونوں مصدر ہیں (ت) اور مَہَدَ کے معنی ہیں تیار کیا +

جھوٹی شیخی حصول کمال میں مانع ہے

یہاں تو کفار کا نقشہ کھینچا ہے اور یہ سچ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے جو صحیح معنی میں تقویٰ اللہ ہے روکنے والی چیز جھوٹی شیخی اور انفۃ ہے۔ ناک رکھنے کے لئے بہت سی بیہودگیوں کا ارتکاب ہوتا ہے مگر آج کل اکثر مسلمانوں میں یہی جھوٹی شیخی پائی جاتی ہے ذلیل ہیں مگر اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھتے ہیں کہ گویا ان کے برابر عزت ہی کسی کی نہیں اور اسی جھوٹی شیخی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ اخلاق انسانی کے کمال کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی بڑائی کے خیال کو دل سے نکال دے +

صحابہ کا بلند مقام

۲۶۶ پہلے مفسد گروہ کے مقابل پر یہ دوسرے گروہ کا ذکر ہے۔ جو اللہ کی رضا کے حصول کو اپنا مقصد قرار دے کر اپنی ساری خواہشات کو اس ایک مقصد کے سامنے قربان کر دیتے ہیں۔ ان کو بادشاہت بھی مل جائے تو ان میں اس سے کوئی شیخی اور بڑائی پیدا نہیں ہوتی بلکہ مخلوق الٰہی پر مہربانی کرنا یہ ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ اسی کی طرف واللہ رؤف بالعباد میں اشارہ ہے جب وہ اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے تو لازماً ان کا شیوہ بھی مخلوق خدا پر مہربانی ہے۔ اس آیت میں بھی کسی خاص آدمی کا ذکر نہیں۔ ہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کی حالت عامہ کا بیان کیا ہے جیسا دوسری جگہ فرمایا ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ (التوبۃ ۹-۱۱۱) اور پھر یہ سند بھی اس گروہ کو عطا فرمائی رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ (المجادلۃ ۵۸-۲۲) پس یہی وہ گروہ ہے جس نے اللہ کی رضا کے حصول کے لئے اپنی ساری خواہشات کو قربان کر دیا +

سِلم

۲۶۷ سِلم کے اصل معنی صلح بھی ہیں اور اتفیاد و استسلام بھی آتے ہیں یعنی فرمانبرداری صلح میں داخل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہاری صلح ہو۔ اور اس کا مطلب بھی فرمانبرداری ہے +

کافۃ

کافّۃ۔ کَفّ سے ہے جس کے معنی ہتھیلی ہیں اور روکنا بھی اس کے معنی آتے ہیں اس لئے کہ ہاتھ سے روکا جاتا ہے۔ اور

فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا أَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ ۲۰۹

پھر اگر تم اس کے بعد جو تمہارے پاس کھلے دلائل آچکے پھسل جاؤ تو جان لو کہ اللہ غالب حکمت والا ہے ۲۶۸ وہ کسی بات کے منتظر نہیں

إِلَّآ أَنْ يَّأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ ۚ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ ۝ ۲۱۰

مگر یہ کہ اللہ بادلوں کے سایوں میں اور فرشتے اُن کے پاس آئیں۔ اور اس امر کا فیصلہ ہو چکا ہے اور سب کام اللہ کی طرف ہی لوٹائے جاتے ہیں ۲۶۹

کاف اور کافّۃ (جس میں تا مبالغہ کے لئے ہے) روکنے والے کے معنی میں ہے اور جماعت کو بھی کافّۃ کہا جاتا ہے یعنی سب کے سب (غ)۔ اور ایک چیز کے کل کے کل کو بھی کافّۃ کہا جاتا ہے اس لئے کہ اس کے اجزا کو پراگندگی سے روکنے والا ہے (ف) +

اسلام میں کامل طور پر داخل ہونے کی ضرورت

ادخلوا فی السلم کافّۃ سے مراد یہ ہے کہ کلی طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ تمہارے ظاہر و باطن سے کوئی چیز نہ ہو جو اسلام کے جوئے کے ماتحت نہ ہو یا یہ کہ پورے پورے فرمانبرداری میں داخل ہو جاؤ کسی قسم کا نفاق تم میں باقی نہ رہے۔ یہاں سب ایمان لانے والوں کو۔ سب مسلمانوں کو۔ توجہ دلائی ہے کہ اسلام کو اپنا مذہب کہتے ہو تو پھر اس میں پورے داخل ہو یہ نہیں کہ ایک حصہ کو مان لیا اور ایک کو ترک کر دیا +

۲۶۸ یعنی اگر تمہاری زلّت سے تم کو نقصان پہنچے تو یہ مت سمجھو کہ مسلمانوں کا خدا کمزور ہے۔ ہاں تمہاری مصیبت بھی کسی حکمت پر مبنی ہے +

ھل

۲۶۹ ھَلْ۔ حرف استخبار ہے کبھی استفہام کے لئے آتا ہے کبھی تنبیہ کے لئے یا نفی کے لئے یا دوسرے کو ملزم کرنے کے لئے (غ) یہاں نفی مراد ہے +

ظلۃ۔ ظلل

ظُلَل۔ ظُلَّۃ کی جمع ہے۔ اور ظُلَّۃ وہ بادل ہے جو سایہ کرے (ظِلّ سایہ کو کہتے ہیں)۔ مگر اس کا اکثر استعمال ایسے موقعہ پر ہے جسے ناپسند کیا جاتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں اس کا استعمال عذاب کے موقعہ پر ہی ہوا ہے۔ عذاب یوم الظُلّۃ (الشعرآء ۲۶-۱۸۹) لہم من فوقہم ظلل من النار (الزمر ۳۹-۱۶) واذا غشیہم موج کالظلل (لقمان ۳۱-۳۲) +

بادلوں کے سایہ

اس آیت میں کلام کا رجوع پھر کفار کی طرف کیا ہے جو اسلام کی تباہی کے درپے تھے اور کہتے تھے کہ اگر اسلام سچا ہے تو ہم اس قدر مخالفت کے باوجود تباہ کیوں نہیں ہوتے۔ اور یہ بات کہ یہاں عذاب کا ذکر ہے خود لفظ ظلل کے استعمال سے ظاہر ہے رہا یہ کہ اللہ کے آنے سے کیا مراد ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے ہم قرآن کریم کے دوسرے مقامات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سورہ نحل میں ہے ھل ینظرون الا ان تاتیہم الملائکۃ او یاتی امر ربک کذٰلک فعل الذین من قبلہم (النحل ۱۶-۳۳) اس آیت کا مضمون آیت زیر بحث سے بہت ملتا ہے۔ صرف یاتیہم اللہ فی ظلل من الغمام کی بجائے الفاظ یاتی امر ربک اختیار کئے ہیں اور یوں قرآن کریم نے اپنی تفسیر آپ کر دی ہے یعنی بادلوں کے سایوں میں آنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے امر کا آنا ہے یعنی اس کی سزا جو وہ کفار پر وارد کرے (اور خود اس آیت میں قضی الامر کہکر بتا دیا ہے کہ مراد اللہ کے امر کا آنا ہے) اور ان الفاظ نے کہ کذٰلک فعل الذین من قبلہم اس کی اور بھی تشریح کر دی ہے اسی طرح پہلے لوگوں نے کیا کیونکہ پہلے لوگ بھی حق کی مخالفت کر کے عذاب استیصال مانگتے تھے۔ یہ مانگنا منہ سے ہو یا اپنے افعال سے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے آنے سے مراد اس کا خود آنا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ آنے جانے سے پاک ہے بلکہ اس کے آنے سے مراد اس کی اس سزا کا آنا ہے جس سے کفار کی کوششیں اسلام کے خلاف نیست و نابود ہو جائیں اور مسلمان مظفر و منصور ہوں۔ جیسے کہ سورہ الحشر میں ہے فاتٰہم اللہ من حیث لم یحتسبوا (الحشر ۵۹-۲) اللہ ان کے

اللہ کا آنا

ع ۲۶ ۱۰

حق کی مخالفت اور اس کا مقابلہ

۲۱۱ سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

بنی اسرائیل سے پوچھو کہ کس قدر کھلے نشان ہم نے ان کو دیئے اور جو اللہ کی نعمت کو بدل دے اس کے بعد کہ وہ اس کے پاس آجاتی ہے تو پھر اللہ بھی سخت سزا دینے والا ہے ۲۷۰

پاس ایسی طرف سے آیا جدھر سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ حالانکہ وہاں ذکر سزائے استیصال کا ہے جیساکہ پہلے الفاظ سے ظاہر ہے هو الذی اخرج الذین کفروا من دیارهم لاول الحشر ما ظننتم ان یخرجوا وظنوا انهم مانعتهم حصونهم من الله فاتىهم الله من حیث لم یحتسبوا۔ پس یہود کے مدینہ سے نکالے جانے کو یعنی عذاب استیصال کو اور اسلام کے خلاف ان کی کوششوں کے نابود کردینے کو اللہ کے آنے سے تعبیر کیا ہے اور یہی مراد یہاں ہے یعنی اللہ کے آنے سے مراد اس امر الٰہی کا آنا ہے جو ان کی مخالفت کا استیصال کلی کردے۔ اور ترکیب میں یا مضاف حذف ہے جیساکہ اکثر کلام میں آیا ہے اور مراد یاتیهم امر الله ہے اور یا مفعول محذوف ہے اور مراد ہے یاتیهم الله بما وعدهم به یعنی اللہ ان پر وہ چیز لائے جس کا ان کے ساتھ وعدہ کیا ہے ✦

ملائکہ کا آنا

ملائکہ کے آنے سے مراد بھی کفار پر عذاب کا آنا اور مومنوں کی نصرت ہی ہے۔ سورہ فرقان میں ہے یوم یرون الملائکة لا بشری یومئذ للمجرمین (الفرقان ۲۵-۲۲) یعنی فرشتوں کا آنا تو مجرموں کی سزا کیلئے ہی ہوا کرتا ہے۔ اور قرآن کریم میں ان تینوں جنگوں میں جن میں قریش کا مقابلہ رسول اللہ صلعم سے ہوا ہے ملائکہ کے آنے کا ذکر ہے جس میں یہی اشارہ ہے دیکھو ع ۵۱۱ اور ملائکہ کے آنے کی غرض کیا تھی اس کے لئے دیکھو ع ۵۱۲ ✦

جنگوں میں نزول ملائکہ

پس ملائکہ کے آنے سے مراد کسی قدر ان کو سزا کا مل جانا یا انکی تھوڑی مغلوبیت ہے۔ اور اللہ کے آنے سے مراد ان کی مخالفت کا آخری استیصال ہے یہی وجہ ہے کہ تینوں جنگوں میں یعنی بدر۔ اُحد۔ احزاب میں نزول ملائکہ کا ذکر ہے۔ جب دشمن مسلمانوں پر چڑھکر آیا۔ مگر فتح مکہ کو جس میں نبی کریم صلعم خود مکہ پر چڑھکر گئے اور کفار کی مخالفت کا پورا استیصال کیا گویا اللہ کے آنے سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ اس میں اسلام کا کامل غلبہ دکھایا گیا۔ اور کفر کی طاقت ملک عرب میں ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی۔ ان باتوں کو جنگوں کے نام سے ظاہر نہیں کیا اس لئے کہ اگر اسلام کا غلبہ ایک وقت جنگ سے مقدر تھا تو دوسرے وقت دوسری راہوں سے ہوسکتا ہے اور امر اللہ میں دونوں باتیں آجاتی ہیں ✦

فتح مکہ

غلبہ اسلام کی پیشگوئی

وقضی الامر کے یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ معاملہ کا فیصلہ ہو جائے اور یوں بھی کہ وہ انتظار کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو ہو چکا ہے۔ اور یہ ہو کر رہے گا۔ دوسرے معنی زیادہ موزون ہیں۔ اور اس میں گویا اسلام کے آخری غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کی کھلی پیشگوئی ہے ✦

ع ۲۷۰ سَلْ میں ہر ایک مخاطب مراد ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ضرور ہر شخص سوال کرے بلکہ خود بنی اسرائیل کو اور ضمناً سب کو جتانا مقصود ہے کہ وہ غور کریں کتنے نشان ان کو دیئے گئے ✦

آنحضرتؐ کی صداقت کے کھلے نشان

اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ۔ یہ کھلے نشان کیا تھے؟ اول وہ کھلی پیشگوئیاں جو آنحضرت صلعم کے ظہور کے متعلق ان کی کتابوں میں تھیں اور جو خود ان میں مشہور چلی آتی تھیں۔ دوسرے نبی کریم صلعم کی صداقت کے نشان جو وہ خود دیکھ سکتے تھے کیونکہ یہ اہل کتاب تھے اور سنت انبیاء سے واقف تھے ✦

رکوع ۲۶

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا م ۲۱۲

جو کافر ہیں ان کو دنیا کی زندگی عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ ان سے ہنسی کرتے ہیں جو ایمان لائے اور

وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

جو تقوٰی کرتے ہیں وہ قیامت کے دن ان سے اوپر ہونگے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے ع ۲۷۱

تبدیل نعمت اللہ

یبدل نعمۃ اللہ۔ اللہ کی نعمت اسلام ہے (ج) اس کی تبدیلی سے مراد اس کا انکار ہے ...... اس انکار کا نام تبدیلی اس لئے رکھا کہ بنی اسرائیل نے پہلے جس بات کو عقیدتاً قبول کیا ہوا تھا یعنی نبی آخر زمان کا آنا اب اس کا سرے سے انکار ہی کر دیا۔ آج مسلمانوں نے بھی اس اللہ کی نعمت کو تبدیل کر رکھا ہے منہ سے اقرار اور عمل سے انکار ہے +

تباہی چاہنے والوں کو جواب

پچھلے رکوع کے آخر پر ذکر تھا کہ مخالف نشان استیصال مانگتے ہیں کہتے ہیں کہ اگر یہ رسول سچا ہے تو ہم جو اس کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں تباہ کیوں نہیں ہوتے۔ اس لئے اس رکوع کی ابتدا اس آیت سے کی کہ نشانات صداقت تو بہتیرے ظاہر ہو چکے ہیں ان کو کیوں قبول نہیں کرتے۔ اور اپنی تباہی کیوں چاہتے ہیں +

زان۔ زین

ع ۲۷۱ زُیِّنَ۔ زان یا زین۔ ایک چیز کے حسن کو ظاہر یا نمایاں کرنے کو کہتے ہیں قول سے ہو یا فعل سے (غ) فعل کے مجہول لانے سے یہ ظاہر کرنا مراد ہے کہ ان لوگوں کو یہ چیز اچھی معلوم ہوتی ہے اور اسی کی طرف ان کے دل کھنچے چلے جاتے ہیں اس سے اوپر نہیں اٹھتے۔ کون اچھی کر کے دکھاتا ہے؟ ان کی اپنی گری ہوئی خواہشات اور پست خیالات۔ قرآن کریم میں اچھی چیز کی زینت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے جیسے ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم (الحجرات ۴۹-۷) اور بری باتوں کے زینت دینے کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے وزین لہم الشیطان ما کانوا یعملون (الانعام- ۴۳) زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاءھم (الانعام- ۱۳۸)

بری چیز دکھانا اچھا کر کے شیطان کا کام ہے

سخر

کافروں کا مومنوں پر ہنسنا

یسخرون۔ سخر کے معنی کسی پر ہنسنا اور اس کو اپنے ماتحت کر لینا یا اپنے کام میں لگا لینا دونوں آتے ہیں۔ کافروں کا مومنوں پر ہنسنا تحقیر کے رنگ میں تھا۔ اس لئے کہ انہوں نے دین کی خاطر دنیوی عزت مال۔ جائدادیں سب کچھ چھوڑ دیا تھا جن کی نظر میں دنیا کا مال و متاع ہی سب کچھ ہو وہ ایک قوم کو غربت کی حالت میں دیکھ کر کہاں ان کی عزت کر سکتے ہیں۔ ہنستے بھی ہنستے ہونگے کہ مومنوں سے ساتھ بڑی بڑی فتوحات کے وعدے تھے اور یہاں حالت دگرگوں نظر آتی تھی۔ آخری الفاظ میں پھر فرمایا کہ ہم اس قدر اموال و فتوحات سے ان کو متمتع کریں گے جس کو یہ حساب میں بھی نہیں لا سکیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ عرب جن کے ہاں ایک ہزار سے آگے گنتی نہ تھی۔ ان میں سے ایک ایک لاکھوں اور کروڑوں کا مالک ہو گیا +

فوقیت اخلاق سے ہے نہ مال سے

والذین اتقوا فوقہم یوم القیامۃ اس بڑے دن جب سب حقائق آشکارا ہو جائیں گے معلوم ہوگا کہ فوقیت مال دنیا سے نہیں۔ بلکہ تقوٰی سے یعنی رعایت حقوق الٰہی و حقوق العباد سے ہے صحیح اصول پر چلنے سے ہے۔ حق و انصاف کی پیروی کرنے سے ہے۔ قرآن شریف محض دنیا کی زندگی کو اور اس دنیا کی چیزوں کو برا نہیں کہتا۔ قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ (الاعراف- ۳۲) زینت کے سامان جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کے لئے پیدا کئے ہیں ان کو کس نے حرام کیا۔ ہاں جب دنیا کی زندگی ہی غایت مقصد بنا لی جاتی ہے اور خورد و نوش کو ہی زندگی کی اصل غرض سمجھ لیا جاتا ہے تو یہ وہ دنیا کی زندگی ہے جس کی مذمت کلام الٰہی کرتا ہے جن لوگوں کو دنیا کی زندگی یہاں تک پیاری معلوم ہوتی ہے کہ حق اور انصاف کی پیروی کرنے والوں پر وہ محض ان کی غربت کی وجہ سے ہنسنے لگتے ہیں وہ اصل مقصد زندگی سے بہت دور نکل گئے۔ اس لئے

قرآن شریف کس دنیا کی زندگی کی مذمت کرتا ہے

۲۱۳ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ

سب لوگ ایک ہی جماعت ہیں پس اللہ نے نبیوں کو بھیجا خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ

مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ

حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے اور جنہیں وہ کتاب دی

اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

گئی تھی انہی نے آپس کی ضد سے اس میں اختلاف کیا اسکے بعد کہ انکے پاس کھلی دلیلیں آچکی تھیں پس اللہ نے اپنے حکم سے انکو جو ایمان لائے

لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

اس حق کی طرف ہدایت دی جس میں (لوگ) اختلاف کرتے تھے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ ۲۷۲

بتایا کہ حقیقی فوقیت اخلاق فاضلہ کے حاصل کرنے سے ہے۔ نہ مال دنیا سے آج عیسائی اقوام اسی غلطی میں پڑکر مسلمانوں کے ہاتھ سے ہر قسم کے سامان دنیا کو چھیننے پر تلی ہوئی ہیں لیکن اگر مسلمان اخلاق قرآنی اپنے اندر پیدا کرلیں تو اس دنیا میں بھی اپنی فوقیت کا مشاہدہ کریں +

كان — ۲۷۲ کان کا استعمال کئی طرح پر ہے۔ گزرے ہوئے زمانہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے اوصاف کے بیان میں ازلیت پر دلالت کرتا ہے جیسے کان اللہ بکل شئی علیما اور جب کسی شے کی جنس میں اس کے وصف کے متعلق استعمال کیا جائے جو اس میں موجود ہو تو یہ ظاہر کرنے کے لئے ہوتا ہے کہ وہ وصف اس میں لازم ہے جیسے کان الانسان کفورا۔ کان الانسان اکثر شئی جدلا جن کے معنی یوں ہوں گے انسان ناشکرگزار ہے۔ انسان اکثر جھگڑالو ہے (غ) اسی طرح کنتم خیر امۃ میں حال کے معنی مراد ہیں یعنی تم بہترین اُمت ہو یہی معنی یہاں مراد ہیں +

حکم — لیحکم۔ حُکم کے اصل معنی ہیں اصلاح کے لئے روکنا۔ اور کسی چیز پر حکم کے معنی یہ ہیں کہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ یہ چیز یوں ہے یوں نہیں خواہ دوسرے پر ایسا فیصلہ لازم کیا جائے یا نہ (غ) +

انبیاء کی بعثت کا عام قانون — اس آیت کا مطلب بعض نے یوں بیان کیا ہے کہ پہلے سب لوگ نیک تھے پھر ان میں اختلاف شروع ہوئے جن کے مٹانے کو نبی آئے اور بعض نے یوں کہ پہلے سب گمراہی پر جمع تھے تب اللہ تعالیٰ نے نبی بھیج کر نیکوں کو بدوں سے الگ کردیا۔ مگر یہ دونوں باتیں قرآن شریف کے خلاف معلوم ہوتی ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے سلسلہ رشد و ہدایت کا جو انبیاء کے ذریعہ سے قایم ہوتا ہے آدم کے ساتھ ہی شروع ہونا صاف الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ کان کے وہ معنی لے کر جو اوپر بیان ہوئے اس آیت کے معنی بالکل صاف ہوجاتے ہیں۔ سب لوگ ایک ہی جماعت ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ان سے یکساں ہی معاملہ ہوتا رہا یعنی ان سب میں اللہ تعالیٰ نبی بھیجتا رہا۔ یہ نہیں کہ بعض قوموں کو محروم رکھا اور ایک کو نبی بھیجنے کے لئے خاص کرلیا جیسا کہ بنی اسرائیل سمجھتے تھے۔ اور فرمایا کہ سب نبی ہی حق کے پیرووں کو کامیابی کی بشارت دینے والے اور حق کے مخالفوں کو ناکامی اور دکھ کے انجام سے ڈرانے والے تھے۔ اور ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے کتاب بھی دی تھی تاکہ وہ اس کے ذریعہ لوگوں کے باہمی اختلافوں کا فیصلہ کرے۔

سب اختلافوں کے فیصلہ کیلئے محمد صلعم کی بعثت — باایں نبیوں کے آنے کے بعد پھر لوگوں نے باہم اختلاف کیا۔ اس اختلاف کے فیصلہ کے لئے محمد رسول اللہ صلعم کو مبعوث کیا گیا۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ۲۱۴

کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تمہیں ان لوگوں کی سی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے گزر چکے

مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا

ان کو سختی اور دکھ پہنچے اور وہ سخت مصائب میں ڈالے گئے یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے

مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ۝ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ ۲۱۵

تھے بول اٹھے کہ اللہ کی نصرت کب آئیگی. سنو اللہ کی نصرت یقیناً قریب ہے [۲۷۳] تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔

اور آپ پر ایمان لانے والوں کو صحیح راہ کی ہدایت دی گئی اور ایک عظیم الشان حق کا قایم کرنا ان کے سپرد کیا گیا۔ اس مطلب کی صحیح حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے چنانچہ بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم جب رات کو اٹھتے تو ان الفاظ میں دعا کرتے اللّٰھم رب جبریل و میکال و اسرافیل فاطر السموات والارض عالم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادك فیما کانوا فیه یختلفون اھدنی لما اختلف فیه من الحق باذنك انك لتھدی من تشاء الی صراط مستقیم اے اللہ جبرئیل اور میکائیل اور اسرافیل کے رب آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے ان دیکھے اور ظاہر کے جاننے والے تو ہی اپنے بندوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ تو مجھے اپنے اذن سے اس بارہ میں ہدایت فرما جو حق کے متعلق اختلاف کیا گیا ہے بیشک تو جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت فرماتا ہے آیت اور حدیث کے پچھلے حصہ کے الفاظ بہت ملتے جلتے ہیں اور اسی سے یہ پتہ لگتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گویا ان الفاظ قرآنی کا اپنے آپ کو اور اپنی امت کو مصداق قرار دے رہے ہیں پس آیت کے معنی یوں ہوئے کہ نبی سب قوموں میں آتے رہے تا اختلاف کو دور کریں پھر ان کے پیرووں نے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلعم کو ان اختلافوں کے مٹانے کے لئے بھیجا اس لئے اس کی مخالفت تم کیوں کرتے ہو۔

ہر نبی کے ساتھ کتاب آتی ہے

ایک اور امر جس پر یہ آیت قطعی شہادت دیتی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک نبی کو خوشخبری دینے والا بھی بنایا ڈرانے والا بھی اور ہر ایک نبی کے ساتھ کتاب بھی اُتاری پس بغیر کتاب کے کوئی نبی نہیں ہو سکتا جس طرح بغیر بشارت و انذار کے نہیں ہو سکتا اور انزل معھم یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ہر نبی کے ساتھ ایک کتاب نازل ہوتی ہے اور یہ بھی یہی آیت فیصلہ کرتی ہے کہ ہر نبی صاحب حکم ہوتا ہے یعنی تمام اختلافات میں وہ خود اپنی وحی سے جو اس کی کتاب کہلاتی ہے فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ اسی لئے دوسری جگہ فرمایا لیطاع باذن اللہ یعنی وہ مطاع ہوتا ہے مطیع نہیں ہوتا ✦

مثل

[۲۷۳] مَثَل کے معنی ۳۰ میں بیان ہو چکے مگر کبھی مراد اس سے کسی چیز کا وصف ہوتا ہے (غ) یہی معنی یہاں مراد ہیں یعنی حالت ✦

زلزلہ

زلزلوا۔ زلزال کے اصل معنی سخت حرکت دینا ہیں اور مراد مصائب کا آنا ہے (ت) لسان العرب میں اصابت القوم زلزلۃ الفظی یعنی قوم پر زلزلہ آیا) کے معنی تخویف و تحذیر کا آنا لکھے ہیں۔ اور تاج العروس میں زلازل کے معنی بلایا شدائد اہوال لکھے ہیں یعنی بلائیں مصیبتیں خوفناک حالات۔ حدیث میں ہے اللّٰھم اھزم الاحزاب و زلزلھم جہاں زلزلھم کے معنی ابن اثیر نے کئے ہیں کہ ان کے امر کو گھبراہٹ اور پریشانی کی حالت میں اور ناقابل قیام کر دے خود قرآن کریم میں جنگ احزاب کے ذکر میں ہے ھنالك ابتلی المؤمنون و زلزلوا زلزالا شدیدا (الاحزاب ۳۳ : ۱۱) پس زلزلہ سے مراد یہاں شدائد و تکالیف کا آنا ہی

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ؕ

کہو جو کچھ بھی اچھے مال سے خرچ کرو وہ ماں باپ اور قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لئے ہے

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ کُرْهٌ لَّکُمْ ۚ وَعَسٰۤی اَنْ تَکْرَهُوْا ۲۱۶

اور جو کچھ بھی نیکی تم کرو اللہ اسے ضرور جانتا ہے ۲۷۴ تم پر جنگ کرنا لکھا گیا اور وہ تم کو ناگوار ہے اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں ایک چیز

شَیْـًٔا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۚ وَعَسٰۤی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ناگوار ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے اچھی ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے بُری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۲۷۵

ہے۔ بالخصوص وہ شداید جو جنگوں میں پیش آتی ہیں +

حق کے قیام میں مشکلات

جب یہ بتایا کہ کتنا بڑا کام تم مسلمانوں کے سپرد کیا گیا ہے کہ کل دنیا کے اختلافات کو دور کرو۔ تو یہ بھی بیان کر دیا کہ حق کا دنیا میں قائم کرنا کس قدر مشکل کام ہے اور کس قدر دکھوں کا سامنا ہے چھوٹے پیمانہ پر حق قائم کرنے کے لئے بھی کیا کیا مصائب اُٹھانے پڑے تو اب اس عظیم الشان امر کے قیام کے لئے کن کن تکالیف کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ مصائب ہی کامیابی کی کنجی ہیں ان میں پڑنے کے بغیر انسان پختہ نہیں ہوتا تو جنت میں کس طرح جا سکتا ہے۔ سوال تھا جنت میں داخل ہونے کے متعلق اور جواب میں فرمایا کہ اللہ کی نصرت قریب ہے پس مومنوں کے لئے جب خدا کی نصرت آتی ہے اور ان کو کامیاب کر کے منزل مقصود پر پہنچاتی ہے تو وہ بھی ان کے لئے ایک جنت ہی ہے۔ اس آیت میں صاف اشارہ جنگوں کی طرف ہے +

نصرت الٰہی کیا ہے

یہ بھی بتایا کہ اللہ کی نصرت اسی کا نام ہے جب اسباب سے مایوسی ہو جائے اور چاروں طرف ناکامی ہی ناکامی نظر آئے اور دشمن کا غلبہ بڑھتا چلا جائے۔ یہاں تک کہ وہ مومن جو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں بول اُٹھتے ہیں کہ اللہ کی نصرت کب آئیگی تب نصرت الٰہی آتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے کوئی ایسے سامان پیدا کر دیتا ہے کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ اور جو بات ان ہونی معلوم ہوتی تھی وہ ہو جاتی ہے +

خیر

۲۷۴ اَلْخَیْرُ کے معنی مال کثیر نمبر ۲۲۰ میں بیان ہو چکے۔ مگر خیر اس مال کو بھی کہتے ہیں جو محمود طریق پر جمع کیا گیا ہو (غ) +

انفاق مال کی ترغیب

جب حق کی خاطر دکھ تکلیفیں اُٹھانے کا ذکر کیا اور جنگوں کی طرف اشارہ کیا تو ساتھ ہی انفاق یعنی مال خرچ کرنے کی ضرورت بھی بتائی۔ اور پہلے حصہ آیت میں مال خرچ کرنے کا ذکر کر کے اور دوسرے میں نیکی کرنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ اپنے قویٰ کو اچھے موقعہ پر لگانا بھی انفاق میں ہی داخل ہے۔ کیا خرچ کریں؟ اس کا جواب یہ دیا کہ جو کچھ بھی خرچ کرو وہ ماں باپ وغیرہ کے لئے ہی ہے۔ گویا فرمایا کہ جو کچھ خرچ کر سکتے ہو کرو۔ آخر یہ خرچ کرنا تمہارے اپنے لوگوں کی بھلائی کے لئے ہی ہے یا تو یوں کہ انفاق کا پہلا مصرف والدین اور قریبیوں یتیموں وغیرہ کی خبر گیری ہی ہے۔ اور یا یوں کہ تمہارے بہت سے قریبی اور بہت سے ضعیف لوگ تمہارے جلد مال خرچ کرنے سے مصائب سے باہر نکل آئیں گے۔ کیونکہ جو مسلمان بھاگ آئے تھے ان کے عزیز و اقربا ابھی مکہ میں کافروں کے تسلط میں ہی تھے بعض لوگوں نے یہ خیال کر کے کہ کیا خرچ کریں کا کوئی جواب یہاں نہیں مَاذَا کے معنی کَیْفَ کئے ہیں یعنی کس طرح خرچ کریں۔ مگر جیسا کہ میں نے کہا ہے جواب موجود ہے اور آیت ۲۱۹ میں اسی کی وضاحت ہے۔ یا مکرر سوال کی یعنی ایک یہاں اور ایک آیت ۲۱۹ میں۔ یہ غرض ہے کہ یہاں اقربا یتامیٰ پر خرچ کرنے کا ذکر ہے وہاں دشمن کے مقابل پر +

کُرْہ

۲۷۵ کُرْہ کے معنی مشقت ہیں۔ یا وہ مشقت جو انسان کو خارج سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے ہی پہنچتی ہے یعنی ایک چیز کا ناگوار

ع ۲۷

بعض مسائل متعلق جنگ

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ۲۱۷

تجھ سے حرمت والے مہینہ کی نسبت پوچھتے ہیں (یعنی) اس میں لڑائی کی نسبت کہہ اس میں جنگ کرنا بہت برا ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور

كُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ

اسکے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا) اور اسکے لوگوں کا اس سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی برا ہے اور فتنہ قتل سے بڑھکر برا ہے ۲۷۶

کرہ

خاطر ہونا اور کُرہ وہ مشقت ہے جو خارج کی طرف سے پہنچتی ہے (غ)، اور کَرہ کُرہ کا استعمال دونوں معنی پر ہوتا ہے مگر کُرہ پر زیادہ ہے (غ)

مسلمان جنگ کو ناپسند کرتے تھے

لطیف اشارہ سے صراحت کی طرف انتقال کیا۔ اور فرمایا کہ دشمنان دین اس قدر حق کی مخالفت پر تُلے ہوئے ہیں کہ تم کو چار و ناچار حق کی حفاظت کے لئے جنگ کرنی پڑے گی۔ مگر وہ کیسی جنگ ہے؟ وہ تمہارے لئے مشقت ہے۔ وہ تم کو ناگوار ہے۔ تم اسے پسند نہیں کرتے۔ وجہ ظاہر ہے چاروں طرف پھیلے ہوئے دشمنوں کے ساتھ ایک مٹھی بھر مسلمان کیونکر جنگ کر سکتے تھے پھر بے سروسامانی کمال کی اور بالمقابل قوم وہ جس کا پیشہ ہی جنگ کرنا چلا آیا ہے پھر اصل غرض تو توحید الٰہی کا پھیلانا تھی یہ دین میں ایک نئی بات پیش آگئی اس لئے ناپسند تھی۔ اسلام پر یہ الزام دینے والے کہ لُوٹ کی خاطر جنگ کی غور کریں کہ قرآن شریف کیسے صاف الفاظ میں ان کی تردید کرتا ہے لُوٹ مار کرنے والوں کے لئے تو جنگ کا حکم خوشی کا موجب ہوتا نہ ایک امر ناگوار ✦

موجودہ حالت اور جنگ

ساتھ ہی مسلمانوں کو سمجھایا کہ ایک وقت ایک چیز تم کو ناگوار ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی اسی میں ہوتی ہے۔ ایک بات کو تم پسند کرتے ہو وہ آخر کار نقصان کا موجب ثابت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دو فقروں میں یہ اشارہ ہو کہ اس وقت تم جنگ کو ناپسند کرتے ہو مگر تمہاری بھلائی جنگ کرنے میں ہے کیونکہ اس کے بغیر تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ ایک وقت آئے گا کہ تم جنگ کو پسند کرو گے اس وقت وہ تمہارے لئے نقصان کا موجب ہوگی یہ دوسری حالت آج مسلمانوں پر ہے واقعات یہی بتاتے ہیں کہ ہر جگہ جنگوں میں مسلمانوں کا قدم پیچھے ہٹتا ہے ✦

کبیر

ع ۲۷۶ کبیر۔ اصل معنی صرف بڑا ہیں مگر برائی کے بڑا ہونے پر یہ لفظ خصوصیت سے بولا گیا ہے جیسے کبرت کلمۃ (الکہف ۵:۱۸) میں اسی لحاظ سے کبیرۃ بہت بڑے گناہ کو کہتے ہیں (غ) ✦

صدّ

صَدّ کے معنی دونوں آتے ہیں یعنی پھرنا اور رُک جانا یا دوسرے کو پھیرنا اور روک دینا ✦

حرمت کے مہینوں میں جنگ

پچھلی آیت میں جنگ کے مسلمانوں پر فرض کرنے کا ذکر کیا تو یہاں چار حرمت والے مہینوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان میں جنگ ممنوع ہے اور جب یہ بتایا کہ اسلام اس حرمت کا پاس کرتا ہے۔ تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ کافر جنکی طرف سے یہاں سوال

کفار کی مسلمانوں پر زیادتی

ہوتا ہے خود سب حرمت والی چیزوں کی بے حرمتی کر چکے ہیں اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکا مسجد حرام سے روکا بلکہ آخر کار مسلمانوں کو مسجد حرام سے نکال دیا۔ حالانکہ مسجد حرام کی حدود میں ان کے ہاں امن کا دیا جانا ایک مسلّم امر تھا۔ پھر ان سب

فتنۃ

باتوں کو لفظ فتنہ سے تعبیر کیا ہے جب فرمایا کہ فتنہ قتل سے بڑا ہے۔ اس سے فتنہ کے معنی پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ قرآن شریف میں کم سے کم چار اور موقعوں پر یہ لفظ صراحت سے ان دکھوں اور تکلیفوں پر استعمال ہوا ہے جو مسلمانوں کو دین اسلام اختیار کرنے کی وجہ سے دی جاتی تھیں۔ سورہ عنکبوت ۲۹ - ۱۰۔ النساء ۴ - ۱۰۱۔ البروج ۸۵ - ۱۰ ✦

ابن حضرمی کا قتل

کفار کا اعتراض عبداللہ بن جحش کے ابن حضرمی کو قتل کرنے پر تھا۔ ہجرت کے دوسرے سال میں جب کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ کے رنگ میں چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی نبی کریم صلعم نے عبداللہ بن جحش کو چند آدمیوں کے ساتھ قریش کی خبر لانے کیلئے بھیجا تھا۔ اور جو ہدایت ان کو دی تھی اس میں صاف اسی قدر ذکر تھا کہ ان کی خبر لاؤ۔ اتفاق سے ان لوگوں نے تین قریش کے

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ

اور وہ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے لوٹا دیں اگر انہیں طاقت ہو ۲۷۷

وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ

اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھرے پھر مر جائے ۲۷۸ حالانکہ وہ کافر ہی ہے۔

آدمیوں کو دیکھا۔ اور ان پر حملہ کیا ان میں سے ایک یعنی عبداللہ ابن الحضرمی قتل ہوا دو قید ہوئے یہ جمادی الثانی کا آخری دن تھا اور یہ امر مشتبہ رہا کہ آیا رجب کا چاند دیکھنے کے بعد انہوں نے حملہ کیا یا پہلے۔ مگر خود عبداللہ بن جحش کا بیان ہے کہ ہم نے ابن حضرمی کے قتل کے بعد رجب کا چاند دیکھا۔ انا قتلنا ابن الحضرمی ثم مسینا فنظرنا الی ھلال رجب فلا ندری افی رجب اصبناہ ام فی جمادی پس اس واقعہ سے حرمت کے مہینوں میں جنگ کا جائز ہونا ثابت نہیں ہوتا اس لئے حرمت کے مہینوں میں حرمت قتال کا حکم قایم ہے اور منسوخ نہیں ہوا۔ چنانچہ جب ہجرت کے چھٹے سال آنحضرت صلعم حج کی نیت سے نکلے تو ہتھیار ساتھ لیکر نہیں نکلے۔ ہاں جب کفار کی طرف سے تیاری دیکھی تو اس وقت مجبوراً تیاری کی۔ ایسا ہی ایک اور موقعہ پر بھی آپ سے ثابت ہے کہ حرمت کے مہینوں میں جنگ کو روک دیا +

رَدّ — **۲۷۷** یَرُدُّوا۔ رَدّ کے معنی کسی چیز کا اپنی ذات میں پھیرنا یا ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا آتے ہیں (غ) + استطاعوا۔ طَوع سے ہے جس کے معنی انقیاد یعنی فرمانبرداری ہیں۔ اور استطاعت میں نیت اور تصور فعل اور مادہ قابلہ اور آلہ کا ہونا ضروری ہے (غ) ان استطاعوا (اگر طاقت رکھتے ہوں) سے یہاں یہ مراد ہے کہ باقی چیزیں تو موجود ہیں اور وہ اپنا زور لگا رہے ہیں مگر مادہ قابلہ نہیں یعنی مسلمان اپنے دین کو کبھی چھوڑ نہیں سکتے۔ معلوم ہوا کہ کفار مسلمانوں کے ساتھ اس لئے جنگ کرتے تھے کہ ان کو دین اسلام سے پھیر دیں پہلے تکلیفیں دیں پھر گھروں سے نکالا آخر تلواریں لے کر کھڑے ہوگئے کہ اس کے زور سے مسلمانوں کو دین سے پھیر دیں گے کس قدر خلاف واقعہ اتہام ہے کہ مسلمان کافروں کو مسلمان بنانے کیلئے جنگ کرتے تھے جس قدر صبر مسلمانوں نے جنگ سے رُکنے میں دکھایا ہے اگر آج اس کا دسواں حصہ بھی مہذب قوموں میں ہو تو دنیا میں امن اور آشتی پھیل جائے مسلمانوں نے جنگ اس لئے کی کہ ان کو دین اسلام سے پھیرنے کی کوشش کی جاتی تھی نہ اس لئے کہ وہ دوسروں کو ان کے دین سے پھیرنا چاہتے تھے +

طوع۔ استطاع — کفار کی مسلمانوں سے جنگ میں غرض

ارتداد — **۲۷۸** یرتدد۔ ارتداد کے اصل معنی ہیں اس طریق پر لوٹ جانا جس سے ایک شخص آیا تھا جیسے فارتدا علیٰ آثارھما قصصا (الکہف ۱۸۔ ۶۴) ہیں۔ اور اسلام سے کفر کی طرف لوٹ جانے اور اسلام کو چھوڑ کر کفر میں داخل ہونے پر بالخصوص یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور رِدّۃ صرف اسی معنی کے لئے خاص ہے (غ) +

رِدّۃ

ہر مرتد کا حکم قتل نہیں — یہاں مرتد کے حالت کفر پر مرنے کا ذکر ہے۔ نہ اس کے قتل کرنے کا۔ سورہ مائدہ کی آیت ۵۴ میں بھی مرتد کا ذکر ہے مگر وہاں بھی اس کو قتل کرنے کا حکم نہیں۔ نہ قرآن کریم میں کسی دوسری جگہ قتل مرتد کا حکم ہے۔ احادیث میں صرف ایک حدیث ہے حضرت ابن عباس کی روایت سے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے زمانہ میں جب بعض زنادیق کو جلایا گیا تو یہ فرمایا کہ ان کو قتل کرنا چاہئے تھا کیونکہ نبی کریم صلعم نے فرمایا تھا من بدّل دینه فاقتلوہ جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کرو۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ اس حدیث کے الفاظ میں جو عمومیت ہے وہ قایم نہیں رہ سکتی کیونکہ اس کی رو سے کوئی شخص کوئی سا ایک دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرے اسے قتل کرنا چاہئے مثلاً یہودی عیسائی ہو جائے یا عیسائی مسلمان ہو جائے تو واجب القتل ہوگا مگر یہ بالبداہت باطل ہے اس لئے حدیث کے الفاظ کو مقید کرنا پڑے گا اور چونکہ

فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

سو یہی ہیں جن کے عمل دنیا اور آخرت میں کام نہ آئے ۲۷۹ء اور یہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہینگے

اس کے راوی حضرت ابن عباس ہیں جو سن شعور کو اس وقت پہنچے جب لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں اس لئے ماننا پڑے گا کہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو اسلام کو چھوڑ کر ساتھ ہی مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار سے جا ملتے تھے۔ اور ان کا قتل ضروری تھا چنانچہ اس قید کی تحدید اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ نے عورتوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ عورتیں جنگ میں حصہ نہ لیتی تھیں اور نبی کریم صلعم نے اسی بنا پر ان کے قتل کرنے کی ممانعت کر دی تھی اور عکل کی سزا والی حدیث سے بھی مرتد کے قتل کا حکم اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ ان لوگوں نے آنحضرت صلعم کے پاس اسلام کا اظہار کر کے بعد میں بیماری کا عذر کیا تو آپ نے ان کو مدینہ سے باہر رہنے کی اجازت دی جہاں بیت المال کے اونٹ تھے تاکہ کھلی ہوا میں رہنے سے صحت ہو اور دودھ پئیں۔ مگر انہوں نے چرواہے کو قتل کیا اور اونٹ لیکر چلتے بنے پس ان کی سزا اس قتل اور ڈاکہ کی وجہ سے تھی نہ ارتداد کی وجہ سے۔ علاوہ ازیں اگر مدینہ میں کسی مرتد کو واجب القتل قرار دیا گیا ہو تو اس وجہ سے کہ جو شخص اس وقت اسلام کو ترک کرتا وہ دشمن سے جا ملتا جو اس وقت اسلام کی تباہی پر تلا ہوا تھا گویا مسلمان اس وقت میدان جنگ میں ایک فوج کی صورت میں پڑے تھے۔ اور ایک حدیث میں صاف لفظ ہیں کہ صحابہ نے شکایت کی کہ ہم کو دن رات ہتھیار باندھ کر رہنا پڑتا ہے پس اس وقت ارتداد کے معنی دشمن کے ساتھ جا ملنا تھا۔ اور جو شخص اپنی فوج کو چھوڑ کر دشمن کے ساتھ جا ملتا ہے وہ آج بھی واجب القتل ہی سمجھا جاتا ہے صلح کے وقت واجب القتل قرار نہ دینا خود اس سے ظاہر ہے کہ صلح حدیبیہ میں آنحضرت صلعم نے یہ شرط قبول کی تھی کہ کوئی مسلمان کفار کے ساتھ جا ملے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔ اگر قرآن میں مرتد کی سزا قتل ہوتی تو آپ اس کے خلاف شرط کبھی قبول نہ کرتے پس من بدل دینہ فاقتلوہ بھی انہی واقعات سے مخصوص العلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے معنی کی عمومیت کو کوئی شخص بھی قبول نہیں کر سکتا۔

مرتد کا نکاح فسخ نہیں ہوتا

پس مرتد کے لئے سزائے قتل ازروئے قرآن و حدیث صحیح نہیں۔ اور جس طرح وہ صحیح نہیں اسی طرح وہ احکام جو فقہاء نے اس پر متفرع کئے ہیں وہ بھی آج ان حالات میں جب مسلمان غیر مسلم سلطنتوں کے ماتحت ہیں درست نہیں مثلاً یہ کہ مرتد کے سارے حقوق زائل ہو جاتے ہیں پھر اس پر یہ حکم متفرع کیا گیا کہ اس کا نکاح بھی باقی نہیں رہتا۔ اب انگریزی عدالتوں نے باقی فتویٰ کو تو حالات ملکی کے لحاظ سے قبول نہیں کیا یعنی مرتد کے حقوق کو زائل نہیں کیا مگر نکاح فسخ ہو جانے کو اس فتویٰ کی بنا پر مان لیا ہے حالانکہ حالات ملکی کے لحاظ سے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا سارا فتویٰ مانا جائے یا سارا چھوڑا جائے اور چونکہ پہلی صورت پر عمل نہیں ہو سکتا دوسری اختیار کرنی چاہیئے مگر ہمارے علماء کی حالت بھی عجیب ہے۔ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح محض طلاق حاصل کرنے کے لئے آئے دن مسلمان عورتیں عیسائی ہو جاتی ہیں اور خاموش ہیں کیونکہ فقہاء کا فتویٰ ایسا ہی ہے یہ نہیں سوچتے کہ فقہاء کا فتویٰ تو ہندوستان میں ناممکن العمل ہو چکا اسکے ایک جزو پر جس سے قوم کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے عمل کے کیا معنی ہیں قرآن و حدیث میں کوئی حکم نہیں کہ مرتد کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے فقہاء کا فتویٰ ہے لیکن اس کی اصل کو انگریزی عدالتیں قبول نہیں کرتیں یعنی مرتد کے حقوق کو زائل قرار نہیں دیتیں پھر اسی کی فرع کو کہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے قبول کرنا محض مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ کیا علماء کا یہ فرض نہیں کہ جب اصل کو قابل قبول نہیں سمجھا گیا تو فرع پر عمل کے خلاف آواز بلند کریں۔ عام حالات میں ظاہر ہے کہ اگر عورت عیسائی ہو جائے تو نکاح نہیں ٹوٹتا کیونکہ عیسائی عورت کا نکاح مسلمان مرد سے جائز ہے لیکن مرد عیسائی ہو جائے تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ مسلمان عورت کا نکاح عیسائی مرد سے جائز نہیں۔

حبط

۲۷۹ء حبطت۔ حبط کے اصل معنی ہیں کہ جانور بہت سا کھالے یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھول جائے (غ) گویا اس کا کھانا ہوا کام نہ آیا پس حبط عمل سے مراد عمل کا بے نتیجہ رہنا یا کام نہ آنا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں حبط عمل تین طرح پر ہے۔ اول یہ کہ دنیوی

حبط عمل تین طرح پر

۲۱۸ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ

جو لوگ ایمان لائے ۔ اور جنہوں نے ہجرت کی ۔ اور اللہ کی راہ میں ۔ زور

اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

لگایا ۔ وہی اللہ کی رحمت کے اُمید وار ہیں ۔ اور اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ؏۲۸۰

کام ہوں ۔ تو یہ آخرت میں کام نہ آئینگے ۔ انسان تجارت کرتا ہے صنعتیں بناتا ہے تاکہ روپیہ کمائے اس کی مثال دی ہے وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناہ ھباء منثورا (الفرقان ۲۵ ۔ ۲۳) اس کی دوسری مثال عیسائی اقوام کی حالت ہے جو قرآن شریف نے بیان کی ہے الذین ضل سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا اور اس کے آگے آتا ہے فحبطت اعمالھم (الکہف ۱۸ ۔ ۱۰۴ و ۱۰۵) جہاں خود ضل سعیھم کہکر بتا دیا کہ ان کی کاریگریاں دنیا تک محدود ہیں دنیا میں کام آگئیں ۔ آخرت میں ان کا نتیجہ کچھ نہیں کیونکہ تکمیل نفس انسانی سے ان کو کچھ تعلق نہیں ۔ دوسری صورت حبط عمل کی امام راغب نے یہ بیان کی ہے کہ عمل تو آخرت کے ہوں لیکن ان کے کرنے والے کی نیت ان میں اللہ تعالیٰ کی رضا نہ ہو جیسا حدیث میں ہے کہ ایک شخص کو کہا جائیگا کہ تو قرآن اس لئے پڑھتا تھا کہ لوگ تجھے قاری کہیں سو انہوں نے کہا اب یہ تمہارے کسی کام نہیں آسکتا تیسری صورت یہ ہے کہ اعمال بھی صالح ہوں نیت بھی ٹھیک ہو لیکن ان کے مقابل پر بُرے کام بڑھے ہوئے ہوں (غ) تو اس صورت میں اعمال صالح کی بوجہ ان کے ناکافی ہونے کے غرض پوری نہ ہوئی جس طرح پانی کے ایک قطرہ سے پیاس نہیں بجھ سکتی ۔ ان کے علاوہ حبط عمل کی دو اور صورتیں ہیں ۔ ایک وہ حبط عمل جو انبیاء کے مخالفین کے لئے خاص ہے ۔ کیونکہ انبیاء دنیا میں حق پھیلانے کے لئے آتے ہیں ان کے مخالف اس کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں ان کی کوششیں رائگان جاتی ہیں کیونکہ ضرور ہے کہ حق آخرکار دنیا میں غالب آئے ۔ جیسا سورہ آل عمران ۲۱ میں نبیوں اور نیک لوگوں کے قتل کرنے والوں کا ذکر کرکے فرمایا اولٰئک الذین حبطت اعمالھم فی الدنیا والاٰخرۃ ۔ دوسری صورت وہ ہے جس کا ذکر یہاں ہے مسلمان تھا اچھے عمل کرتا تھا پھر کافر ہو گیا بدی کی راہ اختیار کرلی ۔ پہلی نیکیاں بھی ضائع ہوئیں کیونکہ زندگی کا رخ ہی پلٹ گیا ۔

(حاشیہ: حبط عمل کی دو اور صورتیں)

۲۸۰ ھاجروا ۔ ھَجْر اور ھِجْران انسان کا دوسرے سے الگ ہو جانا ہے جسم سے ہو یا زبان سے یا دل سے (غ) اور مہاجرۃ ایک دوسرے سے قطع تعلق کرلینا ہے اور ظاہر معنی اس کے دارالکفر سے دارالایمان کی طرف خروج ہے (غ) جیسے آنحضرت صلعم اور صحابہ کا مکہ کو چھوڑ کر مدینہ میں آجانا ۔ کیونکہ گو کافر تو دونوں جگہ موجود تھے مگر مکہ دارالکفر اس لئے ہوا کہ وہاں مسلمانوں کو دکھ دیا جاتا تھا ۔ اور امام راغب کہتے ہیں کہ ظاہری ہجرت کا اقتضائے اصلی یہی ہے کہ شہوات اور بُرے اخلاق اور خطاؤں کو چھوڑا جائے یہ وہ ہجرت باطنی ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ ہے المھاجر من ھجر ما نھی اللہ عنہ ۔ مہاجر وہ ہے جو ان باتوں سے الگ ہو گیا جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے ۔

(حاشیہ: ھجر ھجران مہاجرۃ ہجرت)

جاھدوا ۔ جَہْد اور جُہْد طاقت اور مشقت کو کہتے ہیں اور جِہاد اور مجاھدۃ کے معنی ہیں دشمن کی مدافعت میں وسعت و طاقت کا لگا دینا اور خرچ کر دینا (غ) امام راغب کہتے ہیں جہاد تین قسم ہے ظاہری دشمن سے جہاد شیطان سے جہاد نفس سے جہاد اور وجاھدوا فی اللہ حق جھادہ (الحج ۲۲ ۔ ۷۸) میں وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ (التوبۃ ۹ ۔ ۴۱) میں اور یہاں تینوں قسم کا جہاد شامل ہے ۔ اور آنحضرت صلعم کا ارشاد نقل کیا ہے جاھدوا اھواءکم کما تجاھدون اعداءکم اپنی خواہشات سے جہاد کرو جس طرح اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو ۔ اور لفظ ھجر کی بحث میں ایک حدیث نقل کی ہے رجعتم من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے ہو ۔ جہاں چھوٹے جہاد سے مراد دشمن کی جنگ اور بڑے جہاد سے مراد مجاہدہ نفس ہے ایسا ہی قرآن کریم میں ہے وجاھدھم بہ جھادا کبیرا (الفرقان ۲۵ ۔ ۵۲) اس قرآن کے ذریعہ سے ان کفار کے ساتھ جہاد کبیر کرو یعنی

(حاشیہ: جہد جُہد جہاد مجاہدۃ ۔ جہاد کی تین قسمیں)

(حاشیہ: جہاد اصغر جہاد اکبر)

۲۱۹ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ط

تجھ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں[۲۸۱]

منافقوں سے جہاد

منافقوں سے جہاد کا حکم ہے حالانکہ کوئی جنگ منافقوں سے نہیں ہوئی ◆

مقدم کونسی ہجرت اور جہاد ہیں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ نرا ایمان کافی نہیں۔ خدا کی رحمت کے اُمیدوار وہ لوگ ہیں جو ایمان کے ساتھ بدیوں کو ترک کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا سارا زور لگا دیتے ہیں۔ یہ ہجرت اور جہاد ہمیشہ ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ دارالکفر سے خروج یا دشمن سے جنگ کبھی کبھی پیش آنے والی باتیں ہیں اور جب اللہ کی رحمت کی ہر وقت ضرورت ہے تو یہاں مراد بھی یہی ہجرت اور جہاد ہیں۔ اسی ہجرت اور جہاد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمان اپنی اصلاح اور دین اسلام کی اشاعت کی طرف سے غافل ہو رہے ہیں اور تلوار اُٹھانے یا وطن چھوڑ جانے پر ہی سارا زور ہے۔ مسلمانوں کی زندگی اگر باقی رہ سکتی ہے تو اسی ہجرت اور جہاد کو اختیار کرکے صحابہؓ نے بھی پہلے اس کو اختیار کیا تب ہجرت ظاہری اور جہاد سیف کی اجازت ان کو ملی۔ مؤخر کو مقدم کرکے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

خمار

خمر

۲۸۱ الخمر۔ خمر کے اصل معنی کسی چیز کا ڈھانک دینا ہے۔ اسی لئے خمار اوڑھنی کو کہتے ہیں جس کی جمع خُمُر قرآن شریف میں آتی ہے ولیضربن بخمرھن (النور ۲۴-۳۱) اور خمر شراب کو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ عقل کی جائے قرار پر پردہ ڈال دیتی ہے (غ) یعنی انسان عقل سے کام لینے کے قابل نہیں رہتا۔ پھر مفردات میں ہی ہے کہ بعض کے نزدیک خمر ہر ایک نشہ دینے والی چیز کا نام ہے اور بعض کے نزدیک صرف انگور اور کھجور کی شراب کا نام ہے اور یہ قیاس اس سے کیا گیا ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ خمر ان دو درختوں سے ہے یعنی کھجور اور انگور سے مگر ظاہر ہے کہ ارشاد نبوی الخمر من ھاتین الشجرتین میں حصر مراد نہیں صرف دو زیادہ مروج قسموں کا نام لے دیا ہے۔ تاج العروس میں الخمر ما اسکر یعنی خمر وہ ہے جس سے نشہ ہو اصل قرار دے کر اس کے معنی کے اختلاف کا ذکر کیا ہے یعنی حضرت امام ابوحنیفہ کا قول کہ خمر صرف انگور سے ہے اور جمہور کا قول ہے کہ جس سے نشہ ہو وہ خمر ہے اور جمہور کے قول کو صحیح کہا ہے اور اس پر ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ شراب مدینہ میں حرام ہوئی حالانکہ وہاں انگور کی شراب قطعاً نہ ہوتی تھی صرف بُسر اور تمر کی ہوتی تھی یعنی تازہ اور خشک کھجور کی، اور اسی کے مطابق حضرت عمرؓ کا قول بخاری سے نقل کیا ہے۔ پس خمر کے اصل معنی ہر ایک نشہ دینے والی چیز ہیں ◆

میسر

المیسر۔ مَیسر مصدر ہے جس کے معنی جوا ہیں یا اس لئے کہ یُسر کے معنی سہولت ہیں اور جوئے میں مال آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے اور یا اس لئے کہ یسر کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہیں اور میسر ان کے ہاں یہ تھا کہ اونٹ ذبح کیا جاتا اور اس کے ۲۸ یا ۱۰ حصے کئے جاتے اور دس تیر ہوتے جن میں سے سات کے حصے ایک سے لیکر سات تک ہوتے اور تین خالی ہوتے پھر جس شخص کے لئے جو تیر نکلتا اس کے مطابق اس کا حصہ قرار پاتا۔ یہ بعینہٖ آج کل کی لاٹری ہے میسر کے لفظ میں لاٹری اور ہر قسم کا جوا داخل ہے ◆

خمر و میسر کا تعلق

خمر و میسر کا جنگ سے تعلق

خمر و میسر کا آپس میں کیا تعلق ہے اور مضمون جنگ سے جو شروع ہے کیا تعلق ہے؟ خمر عقل کو تباہ کرنے والی چیز ہے میسر مال تباہ کرنے والی چیز اور دونوں عداوت اور فساد پیدا کرنے والی چیزیں ہیں اس لئے دونوں کا اکٹھا ذکر کیا۔ اور جنگ سے یہ تعلق ہے کہ فی الحقیقت تو جنگ کے لئے عقل اور مال دونوں کی حفاظت بکار ہے مگر عموماً جنگوں میں بکثرت شراب پی اور پلائی جاتی ہے تاکہ سپاہی اندھے ہو کر لڑیں مگر شراب سے جو وقتی جرأت پیدا ہوتی ہے وہ حقیقی جوہر شجاعت کو تباہ کرنے والی چیز ہے اس لئے شراب سے روکا اور عرب کے لوگ اخراجات جنگ کا روپیہ جمع کرنے کے لئے اکثر جوا کھیلتے تھے جیسے آج بھی لاٹری کا رواج ہے۔ اسی لئے جوئے کی ممانعت کے بعد فوراً یہ سوال ہے کہ پھر کیا خرچ کریں ◆

قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا

کہ ان دونوں میں بڑی بُرائی ہے اور لوگوں کیلئے فائدے (بھی) ہیں اور ان کی بُرائی ان کے فائدے سے بڑھکر ہے[۲۸۱]

عیسائی اقوام کی خاص بیماریاں اور انکا علاج

۲۸۱ شراب اور جوا ہمذہب قوموں کی اور بالخصوص عیسائی اقوام کی دو خطرناک بیماریاں ہیں اور ان کا علاج سوائے اسلام کے اور کسی مذہب نے نہیں کیا بعض بدیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے بدنتائج تک سب کی نظر پہنچ جاتی ہے اور بعض کے بدنتائج چونکہ ایک مدت کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک کی نظر ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ شراب مؤخر الذکر بدیوں میں سے ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے لئے کامل مذہب نے ہی شراب کے بدنتائج کو دیکھ کر اس سے روکا یہودیوں میں شراب کی حرمت قطعی نہ

یہودیوں میں حرمت شراب قطعی نہ تھی

تھی بعض اوقات اس کی تعریف بھی کر دی ہے دیکھو قاضیون ۹: ۱۳۔ ۲ سموئیل ۱۶: ۲۔ امثال ۳۱: ۶ حکمائے یہود نے بعض

ہندوؤں میں شراب

یہاں تک کہدیا ہے کہ جہاں شراب نہ ہو وہاں دوائیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہندوؤں میں بھی شراب کا استعمال کتب مقدسہ کی بنا پر جائز مانا گیا ہے۔ یجروید میں جو چیزیں دیوتاؤں کو پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک شراب بھی ہے منوسمرتی میں ہے کہ "ماس اور شراب ان دونوں کے کھانے میں کچھ دوش نہیں"۔ منوسمرتی سے ہی یہ ثابت ہے کہ بعض مذہبی تیوہاروں میں شراب

عیسائیت اور شراب

پینے میں کچھ دوش نہیں۔ عیسائیت نے تو حد ہی کر دی کہ مذہب کی بنیاد ہی شراب پر گویا رکھ دی۔ انجیل (یوحنا ۲: ۱-۱۱) میں حضرت مسیح کا سب سے پہلا معجزہ ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شادی میں جب شراب کچھ کم ہوگئی اور لوگ پورے بدمست نہ ہوئے تھے تو حضرت مسیح نے پانی کے مٹکوں کو شراب میں تبدیل کر کے اس کمی کو پورا کیا۔ یوں کہنا چاہئے کہ اس معجزہ میں عیسائی مذہب کی آیندہ تاریخ کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ قوم پانی کی جگہ شراب ہی پئے گی مگر اس سے بھی بڑھکر یہ ہے کہ کوئی شخص عیسائی رہ نہیں سکتا جبتک سال بھر میں ایک دفعہ شراب نہ پئے۔ کیونکہ عید فسح میں شراب جزو لازم ہے بلکہ اسی شراب کے گھونٹ کو مسیح کے خون کا قائمقام قرار دے کر اتحاد عیسائیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ گویا عیسائیت کا اجتماع روٹی کے ٹکڑے اور شراب کے پیالہ پر ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ عیسائیت کو چھوڑ کر سب مذاہب میں نیک اور راستباز لوگ شراب سے مجتنب رہے ہیں گو وہ دوسروں کو اس سے نہ روک سکے ہوں۔ اور یہودیوں میں تو دو فرقے ایسے تھے جو شراب نہ پیتے تھے۔ مگر

شراب اور آنحضرت کی قوت قدسی

شراب کے خطرناک دیو کو ہلاک کرنے کے لئے اسی عظیم الشان قوت قدسی کی ضرورت تھی جو محمد رسول اللہ صلعم کے سوائے اور کسی کو نہیں دی گئی۔ اور آپ کی یہ قوت قدسی اس کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ چیز جس کی خطرناک گرفت سے ایک انسان کا بچانا بھی مشکل ترین کام ہے اس سے آپ نے آناً فاناً ایک قوم کی قوم اور ملک کے ملک کو ایسا پاک کر دیا کہ شراب تو کیا وہ برتن بھی باقی نہ رہے جن میں شراب بنائی جاتی تھی۔ حالانکہ آپ کے ظہور کے وقت عرب کے ملک میں اس قدر کثرت سے شراب پی جاتی تھی کہ اس کی نظیر سوائے موجودہ زمانہ کے یورپ کے اور کہیں نہیں ملتی۔ ادھر حرمت شراب کے حکم کا نازل ہونا تھا ادھر شراب مدینہ کی گلیوں میں بارش کے پانی کی طرح بہ رہی تھی۔ لوگ خارق عادت امور میں معجزات تلاش کرتے ہیں۔ اس سے بڑھکر اور کون سا اعجاز ہوگا جس نے آن کی آن میں نسل انسانی کو اس خبیث چیز سے آزاد کر دیا۔ آج امریکہ بھی تیرہ سو سال بعد رسول اللہ صلعم کے اس فعل کی نقل کرنے لگا ہے مگر کہاں نبی کی قوت قدسی جو فوراً قوم کو پاک صاف کر دیتی ہے کہاں دنیاداروں کے رزولیوشن جن سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حیلے ابھی سے نکالے جا رہے ہیں +

حرمت شراب کی تدریج میں حکمت

ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے جو فطرت انسان کو پہچانتا ہے حرمت شراب کا حکم تدریجاً پہنچایا حالانکہ اور کسی بدی کی بیخکنی میں تدریج روا نہیں رکھی۔ چنانچہ اول یہ سمجھایا کہ اس میں کچھ فوائد تو ضرور ہیں جن کی وجہ سے دنیا آج تک اس میں مبتلا رہی مگر اس کا نقصان نفع سے بہت بڑھکر ہے اور پھر فرمایا کہ نشہ کی حالت میں نماز میں مت آؤ لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہو جو کچھ (حاجت سے) بڑھ رہے ۲۸۲ اسی طرح اللہ تمہارے لئے کھول کر باتیں بیان کرتا ہے

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ ۲۲۰

تاکہ تم فکر کرو۔ دنیا اور آخرت میں اور تجھ سے یتیموں کی نسبت پوچھتے ہیں کہو

اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ

ان کی اصلاح کرنا اچھا ہے اور اگر تم ان سے میل جول کرو تو تمہارے بھائی ہیں اور اللہ بگاڑنے والے کو اصلاح کرنے

مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

والے سے (الگ) پہچانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈالتا بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے ۲۸۳

(النساۤء ۴۔ ۴۳) یعنی شراب نوشی کے ساتھ اللہ تعالےٰ سے تعلق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور بالآخر قطعی حکم حرمت سورہ مائدہ میں نازل فرمایا اس کو رجس (پلیدی) قرار دیا اس کو شیطان کا کام کہا۔ فاجتنبوہ (اس سے بچو) کا حکم دیا اور آخر میں فھل انتم منتھون میں تاکید کے ساتھ زجر فرمایا۔ پس اس تدریجی مگر قطعی حکم حرمت شراب میں بھی ایک حکمت تھی

شراب تھوڑی اور بہت یکساں حرام ہے

یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ گو خمر کی حرمت اسی وجہ سے ہے کہ اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح دیگر نشہ پیدا کرنے والی اشیاء بھی اس حرمت کے اندر آجاتی ہیں مگر یہ حرمت عام ہے یعنی یہ مطلب نہیں کہ تھوڑی شراب جس سے نشہ نہ ہو پی لینا جائز ہے۔ خصوصیت وجہ سے عمومیت حکم پر اثر نہیں پڑتا۔ اور حدیث میں صاف ہے حرمت الخمر لعینھا قلیلھا وکثیرھا۔ یعنی شراب فی ذاتہ حرام ہے تھوڑی ہو یا بہت۔ اور یہ بھی ہے ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام جس چیز کی زیادہ مقدار سے نشہ ہو جائے یعنی انسان بدمست ہو جائے وہ تھوڑی بھی حرام ہے۔ اسی طرح خاص قسم کی شرابوں کا جواز نکالنا حکم قرآنی کا ابطال ہے

شراب کا استعمال بطور دوا

ہاں البتہ دوائی کے طور پر شراب کا استعمال ناجائز نہیں کہلا سکتا اس لئے کہ دوائی کے طور پر تھوڑی مقدار میں زہر بھی دی جا سکتی ہے حدیث میں ہو کہ حرام سے دوا نہ کرو۔ مگر حالت اضطرار میں سؤر بھی جائز ہو اس لئے حالت اضطرار اس سے مستثنیٰ ہے +

عفو

۲۸۲ العفو۔ عفو کے اصل معنی ہیں کسی چیز کے لینے کا قصد اور اسلئے جس چیز کا قصد آسان ہو اس پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے یہاں عفو کے معنی امام راغب نے مایسھل انفاقہ کئے ہیں یعنی وہ چیز جس کا خرچ کرنا سہل ہو اور ابن عمرؓ اور اکثر مفسرین تابعین نے اس کے معنی کئے ہیں وہ مال جو تمہارے اہل کی حاجت سے زیادہ ہو۔ اور ابن کثیر میں ہے کہ بعض نے اس کے معنی افضل اور اطیب مال کئے ہیں۔ اور جوئے کی ناپاک کمائی کے مقابل پر یہ معنی نہایت موزون ہیں۔ اور حاجت سے بڑھا ہوا مال بھی صحیح معنی ہیں جس کی تائید میں صحیح مسلم کی ایک حدیث بھی ہے کہ جب ایک شخص نے ایک دینار کا ذکر کیا۔ تو آنحضرت صلعم نے فرمایا اپنے نفس پر خرچ کرو۔ اور دوسری کا ذکر کیا تو فرمایا اپنے اہل پر خرچ کرو اور تیسرے کا ذکر کیا تو فرمایا اپنی اولاد پر خرچ کرو۔ اسلام کی تعلیم عملی رنگ کی ہے ضروریات انسانی کو وہ نظر انداز نہیں کرتا۔ ہاں بقدر حاجت اپنے نفس اور اہل اور اولاد اور اقارب پر خرچ کر کے اگر باقی کو خدا کی راہ میں خرچ کیا جائے تو وہ بھی بہت بڑی بات ہے مسلمان اس پر عامل ہوں تو آج کروڑوں نہیں اربوں روپیہ انکے قبضہ میں ہو سکتا ہے جو ضروریات دینی پر وہ خرچ کر سکتے ہیں +

نفس اور اہل اور اولاد پر خرچ

۲۸۳ تخالطوھم۔ خلط سے ہے جس کے معنی دو یا زیادہ چیزوں کے اجزا کو باہم ملا دینا ہیں اور دوست اور شریک اور ہمسایہ

۲۲۱ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہانتک کہ وہ ایمان لائیں اور یقیناً ایک مومن لونڈی ایک مشرک (بی بی) سے بہتر ہے گو وہ تمہیں اچھی لگتی ہو

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ

اور مشرکوں کو (عورتیں) نکاح میں نہ دو یہانتک کہ وہ ایمان لائیں اور یقیناً ایک مومن بندہ مشرک سے بہتر ہے گو وہ تمہیں اچھا لگے۔ یہ آگ کی طرف

اِلَى النَّارِ ۚۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے جنت اور حفاظت کی طرف بلاتا ہے اور وہ اپنی باتیں لوگوں کیلئے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں

مخالطۃ — کو خَلِیط کہتے ہیں (غ) پس مخالطت سے مراد شرکت یا باہم مل جل کر رہنا ہے ۔

اخ — اخوان اَخ کی جمع ہے ۔ وہ جو ولادت میں ماں یا باپ یا دونوں کی طرف سے شریک ہو مگر استعارۃً قبیلہ یا دین یا صنعت یا معاملہ یا محبت کے شریک پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ) ۔

معانتۃ — اعنتکم ۔ مُعَانَتۃ اور مُعَانَدۃ ایک ہی ہیں ۔ مگر معانتۃ زیادہ شدت کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ وہ ایسی معاندۃ ہے

عنت — جس میں خوف اور ہلاکت ہو ۔ اور عَنَت کسی ایسے امر میں مبتلا ہونے کا نام ہے جس میں ضائع ہو جانے کا خطرہ ہو (غ) اور عنت مشقت فساد ہلاکت گناہ غلطی خطا زنا سب پر بولا جاتا ہے (ق) ذٰلک لمن خشی العنت منکم (النساء ۴-۲۵) ودوا ما عنتم (اٰل عمران ۳-۱۱۷) عزیز علیہ ما عنتم (التوبۃ ۹-۱۲۸) وعنت الوجوہ للحی القیوم (طٰہٰ ۲۰-۱۱۱) میں عنت بمعنی ذلّت

علم — خضعت ہے (غ) یعنی ذلیل ہو گئے ۔ یعلم المفسد من المُصلح ۔ چونکہ علم کے معنی میں تمیز یا دو چیزوں کا الگ الگ کرنا بھی داخل ہے اس لئے اس کا صلہ مِن بھی آتا ہے اور ایسے موقعہ پر علم کا معنی تمیز کرنے کے ہوتے ہیں ۔

یتیموں سے میل جول — یتیموں سے مخالطت یہ ہے کہ ان کو کھانے پینے میں رہنے میں تجارت میں شریک کر لیا جائے ۔ یہ اس لئے کہا گیا کہ دوسری طرف یتیم کے مال کی حفاظت کی سخت تاکید تھی ۔ چونکہ یتامیٰ کے بالکل علیحدہ رکھنے میں بھی نقصان تھا اور یتیم کے ولی کے لئے بھی سخت مشکلات ہوتیں اس لئے مخالطت کی اجازت دی ۔ کھانے پینے اور معمولی میل جول کی تجارت کی شراکت سے بھی بڑھکر ضرورت ہے ۔ تاکہ ان کے اندر اعلیٰ اخلاق پیدا ہوں ۔ ابو مسلم کے نزدیک مخالطت سے مراد مصاھرات ہے یعنی وہ تعلقات جو نکاح

انجمنیں اور یتامیٰ — کے ذریعہ قایم ہوتے ہیں ۔ آج کل جو اسلامی انجمنیں کچھ یتامیٰ کی خبرگیری اپنے ذمہ لیتی ہیں تو ان کو ایسی صورت میں رکھا جاتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ ان کا میل جول بہت کم ہوتا ہے اور ایسا رنگ اختیار کیا جاتا ہے جس سے ان کو اپنے یتیم ہونے کا احساس تازہ ہوتا رہتا ہے اور اس کا اثر آخرکار اخلاق پر بہت بُرا ہوتا ہے ۔ کیا اچھا ہو کہ یتیموں کو بصورت طالب علمی وغیرہ دوسرے طالب علموں کے اندر ملا کر رکھا جائے ۔ اس سے بدتر حالت یہ ہے کہ یتیموں کو گداگری پر مقرر کیا جاتا ہے کہ اپنا یتیم ہونا پیش کر کے ریلوے اسٹیشنوں پر اور بازاروں میں چندہ جمع کرتے پھریں ۔ یہ اسلام کی تعلیم کے سراسر منافی ہے ۔

نکاح — ۲۲۱ تنکحوا ۔ نکح اس کا اصل ہے اور نِکاح کے اصل معنی عقد زوجیت ہیں یعنی مرد اور عورت کا عقد ۔ اور زناشوئی کے تعلق پر بھی بطور استعارہ بولا گیا ہے (غ) ۔

اَمَۃ — امۃ ۔ مادہ امو ہے ۔ اور اَمَۃ مملوکہ عورت یعنی لونڈی کو کہتے ہیں ۔

عَبۡد — عَبۡد ۔ عُبُودِیَّۃ کے معنی تذلّل ہیں یعنی عاجزی اختیار کرنا ۔ اور عَبۡد چار طرح پر بولا جاتا ہے اول بمعنی مملوک یعنی غلام

ع ۲۸ ۱۲

مسائل طلاق

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۲۲۲

اور تجھ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں کہو یہ ضرر کی بات ہے پس حیض میں عورتوں سے الگ رہو

وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ

اور ان کے نزدیک نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ صاف ہو جائیں پھر جب وہ غسل کریں تو ان کے پاس آؤ جس طرح تمہیں

اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝

اللہ نے حکم دیا ہے۔ بیشک اللہ (اپنی طرف) رجوع کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے اور وہ پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے ۲۸۵

اور اس کی جمع عَبِيد آتی ہے۔ دوئم وجود میں لایا جانے کے لحاظ سے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے ان کل من فی السمٰوات والارض الا آتی الرحمٰن عبدا (مریم ۱۹ - ۹۳) تیسرا عبادت اور خدمت سے عَبْد اور یہ دو قسم ہیں ایک اللہ کے عَبْد یعنی خالص اس کی عبادت کرنے والے جیسے عَبْدَنا ایوب۔ نزل الفرقان علیٰ عبدہ۔ انہ کان عبداً شکورا جہاں کہیں نیک بندوں کا عَبْد ہونا بیان کیا ہے وہ بمعنی عابد ہے لیکن عَبْد۔ عابد سے ابلغ ہے اور دوسرے وہ جو دنیا کے بندے بن جاتے ہیں جن کی غرض دنیا اور اس کا مال ہوتا ہے جیسے آنحضرتؐ نے فرمایا تعس عبد الدرھم تعس عبد الدینار اور عبد بمعنی عابد کی جمع عباد آتی ہے۔ یہاں عَبْد بمعنی غلام ہے (ع)

مغفرت

مَغْفِرت غفر کے لئے دیکھو ۲۵۸ یہاں مَغْفِرۃ بمعنی حفاظت ہے۔ کیونکہ جنت کے بعد مغفرت کو رکھا ہے اللہ جنت کی طرف بلاتا ہے اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے جس سے مغفرت کا بلند مقام معلوم ہوتا ہے یقیناً اللہ کی مغفرت گناہوں کی معافی سے بہت بڑھ کر مقام ہے کیونکہ گناہوں کی معافی سے انسان جنت میں داخل ہو جاتا ہے مگر مغفرت کی ضرورت جنت میں داخل ہونے کے بعد بھی ہے +

مشرکین سے تعلقات نکاح کی ممانعت

جنگوں کی وجہ سے یہ ضرورت پیش آگئی تھی کہ کفار سے نکاح کے تعلقات جو باہم مودت و محبت کو چاہتے ہیں قطع کئے جائیں۔ مگر اس ضرورت پر جو حکم دیا گیا وہ اپنے اندر عمومیت کا رنگ رکھتا ہے اور سب مشرکوں کے متعلق ہے کیونکہ جنگ مشرکوں سے تھی یعنی مسلمان مرد کا مشرک عورت سے اور مسلمان عورت کا مشرک مرد سے نکاح منع کر دیا گیا۔ جو پہلے نکاح ہو چکے ہوئے تھے ان کا حکم دوسری جگہ سورہ ممتحنہ میں ہے اور گو مسلمان مردوں کا اہل کتاب کی عورتوں سے دوسری جگہ نکاح جائز قرار دیا گیا ہے۔ مگر مشرک عورت سے کسی صورت میں نکاح جائز نہیں۔ قرآن کریم نے شرک کو تمام بدیوں کی جڑ قرار دیا ہے۔ اس لئے شرک کی تمام رسومات کی ایک ایک کر کے بیخ کنی کی ہے یہاں تک کہ

شرک سے بیزاری عملی زندگی میں

ان کھانے کی چیزوں کو بھی حرام قرار دیا ہے جو دیوتاؤں وغیرہ کے نام پر مخصوص کی گئی ہوں اسی طرح مشرکین کے ساتھ تعلقات معاشرت کو بھی روکا ہے یعنی نہ مشرک عورت مسلمان مرد کے گھر میں ہو نہ مسلمان عورت مشرک مرد کے گھر میں۔ اور یوں شرک سے کامل بیزاری کی تعلیم عملی رنگ میں مسلمان کی زندگی میں داخل کر دی ہے۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ مشرک ہیں۔ عیسائی جو حضرت مسیح کو خدا مانتے ہیں وہ بھی اسی حکم میں

مشرکین اہل کتاب سے نکاح

داخل ہیں۔ مسیح پرست عیسائی عورتوں سے نکاح کا نتیجہ ہی ترک قوم کی تباہی ہے یہ دنیوی نار ہے جس میں اس خلاف ورزی حکم الٰہی نے مسلمانوں کو ڈالا ہے۔ اور اس کے بالمقابل وہ جنت و مغفرت ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ بلاتا ہے یعنی شرک سے کامل بیزاری بعض فقہا کے نزدیک مشرک میں اہل کتاب شامل نہیں بلکہ خاص عرب کے مشرک مراد ہیں اور اس لئے ان کے نزدیک عیسائی عورتوں سے نکاح جائز ہے خواہ وہ مشرک ہوں (ع)

مسلمان اور مشرکانہ رسوم

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ مسلمان جن کو شرک اور مشرکانہ امور سے اس قدر قطع تعلق کی تعلیم دی گئی تھی آج سرتاپا خود مشرکانہ رسوم میں غرق ہیں۔ اور قطع تعلق تو ایک طرف رہا خود ان تمام امور میں ملوث ہو گئے ہیں جن سے نہ صرف دور رہنا بلکہ جن کا رد کرنا ان کا کام تھا +

حیض

۲۸۵ المحیض۔ حیض وہ خون ہے جو خاص ایام میں خاص طور پر رحم سے جاری ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں ان کو ماہواری ایام کہا

۲۲۳ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ط

تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتی ہیں پس جب چاہو اپنی کھیتی میں آؤ اور اپنی جانوں کیلئے (کچھ) آگے بھیجو

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۲۲۴ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ

اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ تم اس کو ملنے والے ہو اور مومنوں کو خوشخبری دو ۲۸۶ اور اللہ کو اپنی قسموں کی وجہ

محیض — جاتا ہے۔ اس لئے کہ عموماً انتیس تیس دن میں ایک دفعہ یہ دن عورتوں پر آتے ہیں۔ اور محیض حیض پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کے وقت پر بھی اور موضع پر بھی ✦

اذی — اذی۔ المکروہ الیسیر (ت) یعنی چھوٹی سی مکروہ یعنی ناپسندیدہ بات یا الشئ الخفیف یعنی تھوڑی تکلیف اور جب زیادہ ہو تو اس کو مرض کہا جاتا ہے (ت) ✦

اعتزال — اعتزلوا۔ اعتزال عزل سے ہے کسی چیز سے الگ ہو جانا یہاں عورتوں سے الگ ہونا بطور کنایہ ہے یہ مراد نہیں کہ اس گھر میں نہ رہو یا ان کو چھوؤ نہیں جس طرح ہماری زبان میں کہتے ہیں عورت کے پاس نہ جانا ✦

طہر۔ طاہر **طاہرۃ۔ طہرت۔ اطہر** — یطہرن۔ طہر نقیض نجاست بھی ہے اور نقیض حیض بھی۔ اور عورت کو جب حیض سے نکل جائے تو طاہر کہا جاتا ہے اور پلیدی اور عیب سے پاک ہو تو طاہرۃ کہا جاتا ہے اور طَہُرَت کے معنی ہیں خون حیض بند ہو گیا اور تطہّرت اور اطّہرت کے معنی ہیں اس نے غسل کیا (ت) جس طرح انسان کی طہارت کی حالت وہ ہے جس میں وہ ترقی اور نشوونما کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ کیونکہ نجاست مانع ترقی ہے۔ اسی طرح عورت میں حالت طہر وہ ہے جس میں استقرار حمل ہو سکتا ہے اس لئے گو حالت حیض میں عورت بذاتہ نجس نہیں ہوتی لیکن اس حالت پر طہر کا لفظ اس لئے نہیں بولا گیا کہ وہ اس حالت میں نسل انسانی کی ترقی کی اس غرض کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہوتی جس کے لئے قدرت نے اسے بنایا ہے۔ زبان بھی پرحکمت ہے ✦

مسائل طلاق کا تعلق جنگ سے — یہاں سے اکتیسویں رکوع کے آخر تک حیض طلاق اور بیوہ عورتوں کے متعلق مسائل کا ذکر ہے۔ یہ چند ایک فروعی مسائل ہیں جن کا باہم بھی تعلق ہے اور جنگ سے بھی۔ جنگ سے عورتیں بیوہ ہوتی ہیں اور ان کے نکاح اور عدت کے احکام کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ احکام مطلقہ عورتوں کی عدت وغیرہ کے احکام سے ملتے جلتے ہیں اس لئے طلاق کے مسائل کا ذکر آیا۔ اور مسئلہ طلاق کا تعلق ایام ماہواری سے ہے۔ کیونکہ ان ایام میں طلاق ناجائز ہے۔ اس لئے یہاں سے ابتدا کی پھر طلاق کے مسائل بتانے پھر بیوہ عورتو کے علاوہ ازیں جنگ کی حالت میں قومیں اپنے عامہ قوانین کو درست نہیں کر سکتیں۔ اس کے برخلاف اسلام کی قریباً ساری شریعت حالت جنگ میں ہی نازل ہوئی گویا اگر ایک طرف جنگ درپیش ہے اور اس کا ایک لمبا سلسلہ کئی سالوں پر پھیلا ہوا ہے تو دوسری طرف کل اصلاح قومی کے کام بھی انہی ایام میں تکمیل پاتے ہیں۔ اور کون قوم اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے ✦

ایام حیض میں مقاربت — یہاں سوال ایام حیض میں مقاربت کا ہی جیسا کہ جواب سے ظاہر ہے اس لئے ھو اذی میں اشارہ مقاربت کی طرف ہے یعنی ایام حیض میں عورت سے مقاربت ضرررساں ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ حیض خود ضرررساں ہے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جب تک عورت حالت حیض سے نکل کر غسل نہ کرے یا بوجہ کسی مجبوری کے تیمم کے ذریعہ سے طاہر نہ ہو جائے اس کے قریب جانا منع ہے۔ اور قرآن کریم ..... نے بھی لفظ تطہرن اختیار کر کے غسل کی طرف اشارہ کیا ہے مگر امام ابوحنیفہ کے نزدیک جب حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت گزر جائے جو دس دن ہے تو پھر محض خون کا بند ہونا کافی ہے آیت کے آخری الفاظ میں کہ اللہ تعالیٰ پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے ظاہری طہارت کے ساتھ باطنی طہارت کی طرف توجہ دلائی ہے

انی — ۲۸۶ انی۔ مفردات میں ہے کہ انّٰی میں حالت اور مکان دونوں کا تعلق ہوتا ہے اس لئے وہ اَیْنَ یعنی جہاں اور کَیْفَ یعنی جس طرح

عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

سے اسباب کی آڑ نہ بنالو کہ نیکی کرو اور تقویٰ کرو اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرو اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۲۸۷

دونوں معنی میں آتا ہے ضحاک سے یہاں انّٰی کے معنی متی یعنی جب مروی ہیں اور روح المعانی میں ہے کہ یہ تینوں معنی جم غفیر سے ثابت ہیں ابن عباس کہتے ہیں انی شئتم من اللیل والنہار جب چاہو رات کو یا دن کو یہی معنی ترجمہ میں اختیار کئے گئے ہیں ؎

قرآن کریم میں مرد و عورت کے تعلقات کا ذکر — قرآن کریم ایک کامل کتاب ہے اور اس کے لئے ضروری تھا کہ تمام حالات انسانی کے متعلق ضروری ہدایات دیتا۔ انہی میں مرد اور عورت کے تعلقات بھی ہیں۔ مگر قرآن شریف کا یہ کمال ہے کہ ان تعلقات کے اظہار میں بھی ایسے لفظ استعمال کئے ہیں جو نازک سے نازک کان پر گراں نہیں گزرتے۔ اور یہاں سب باتیں بھی بتا دی ہیں۔

بائبل میں فحش قصے — بائبل جسے عیسائی دنیا مقدس کتاب کہکر اسے تمام عالم سے منوانا چاہتی ہے اس کے اندر ایسے مضامین بعض قصوں کے رنگ میں ہیں کہ جن کو تنہائی میں بھی ایک شخص پڑھکر شرم سے پسینہ پسینہ ہوجائے۔

ستیارتھ پرکاش میں مرد و عورت کے تعلقات کا ذکر — اس تہذیب کے زمانہ میں سوامی دیانند جی نے جو کچھ نیوگ کے بارہ میں ستیارتھ پرکاش کے چوتھے باب میں لکھا ہے اور پھر اسی باب کی دفعہ ۱۴۳ میں جن خیالات کا اظہار گربھادان سنسکار کے نیچے کیا ہے۔ وہ مرد اور عورت کے تعلقات میں ایسے ننگے الفاظ ہیں جن کو ایک عامی آدمی بھی کسی مہذب مجلس میں ہرگز استعمال نہیں کر سکتا۔ مگر زمین عرب کا ایک اُمی آج سے تیرہ سو سال پیشتر کس طرح ان نازک تعلقات کو پاک اور شستہ الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ یہ بجائے خود اس کا معجزہ ہے۔ حالانکہ اسی زمانہ کے عربی اشعار میں انہی تعلقات کا ذکر نہایت فحش الفاظ میں پایا جاتا ہے اور عام مذاق یہانتک بگڑا ہوا ہے کہ ان اشعار کو فخریہ مجلسوں میں دوہرایا جاتا ہے۔

عورت کے بمنزلہ کھیتی ہونے سے مراد — ایسا ہی یہ بھی ایک مضمون ہے جسے نجاست پسند لوگ خواہ مخواہ محل اعتراض بناتے ہیں۔ یہاں فرمایا کہ عورت تمہارے لئے بمنزلہ ایک کھیتی کے ہے۔ گویا مرد و عورت کے تعلقات کا حقیقی مقصود نسل انسانی کا بڑھانا ہے۔ تو چونکہ ایام حیض میں علاوہ بیماری اور ضرر کے اندیشہ کے یہ مقصود بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

انی شئتم سے مراد — اس لئے ایام حیض میں جو عورتوں کے قریب جانے سے منع کیا تھا کہ وہ ایک دکھ اور ضرر کی بات ہے۔ اسی کی ایک دوسری وجہ یہاں بیان فرمائی کہ جب اصل غرض نسل انسانی کی نشو و نما ہے جس طرح کھیتی میں اصل غرض بیج کی نشو و نما ہے تو ایام حیض میں عورت کے قریب جانا درست نہیں بیشک ان کے پاس جاؤ مگر اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اس کی کوئی غرض ہے۔ اس غرض کو مدنظر رکھو تو جب چاہو یا جس طرح چاہو یا جہاں چاہو ان کے پاس جاؤ۔ اور اس سے پہلی آیت میں صاف فرما دیا کہ ان کے پاس جس طرح تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے جاؤ۔ اللہ کا حکم فطرت انسانی کے مطابق ہے اور مذہب اسلام کو اسی لئے فطرت کا مذہب بتایا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا (الروم ۳۰:۳۰) پس خلاف فطرت کی تو خود یہاں تردید موجود ہے۔ ایسی پاک کتاب پر محض اس لئے کہ الفاظ میں کنایہ اختیار کیا گیا ہے وہ اعتراض کرنا جو اس کے صریح منطوق اور منشا کے خلاف ہے ایک ذلیل حرکت ہے ؎

عرضۃ — ۲۸۷ عُرْضَۃً عَرَضَ سے ہے دیکھو ۱۰۲ اور عُرْضَۃ وہ چیز ہے جو کسی چیز کے سامنے حائل کر دی جائے (غ) ڈھال کو بھی عرضۃ کہتے ہیں۔

یمین — ایمان یَمِین کی جمع ہے۔ اصل معنی دایاں ہاتھ۔ استعارۃً قسم کیلئے استعمال ہوتا ہے باعتبار اس فعل کے جو حلف اُٹھانے والا یا معاہدہ کرنے والا کرتا ہے (غ) ؎

برّ — تبروا ۔ بِرّ کے معنی کے لئے دیکھو ۱۷۷ اور بِرّ الوالدین کے معنی ہیں ان کے ساتھ احسان میں توسّع یعنی فراخی (غ) یہی معنی تبروا کے یہاں ہیں اور یہی الممتحنۃ ۶۰:۸ میں جہاں غیر مسلموں سے سلوک کا ذکر ہے ؎

ایلاء — طلاق کے مسائل کے لئے ہی ایک امر کا ذکر ہو چکا اب اسی ذکر میں ایک دوسرے تمہیدی امر کا ذکر فرماتا ہے۔ طلاق کی ایک قسم عرب میں ایلاء کے نام سے مشہور تھی جس کا ذکر اگلی سے اگلی آیت میں آتا ہے جس میں مرد قسم کھا لیتا تھا کہ وہ عورت کے پاس نہیں جائیگا

۲۲۵ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا

اللہ تمہاری بے حقیقت قسموں کی وجہ سے تمہیں نہیں پکڑتا لیکن وہ اس کی وجہ سے تمہیں پکڑتا ہے جو تمہارے

۲۲۶ كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ

دلوں نے کمایا ہے اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے ۲۸۸ ان لوگوں کے لئے جو اپنی عورتوں کے حق ضائع کرنے کی قسم کھاتے ہیں

تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَاۗءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

چار ماہ کا انتظار ہے پھر اگر وہ رجوع کریں تو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۸۹

نیکی سے رکنے کی قسم یا عہد — چونکہ سب سے پہلے اسی قسم طلاق کا ذکر قرآن شریف نے کیا ہے اس لئے تمہیداً قسم پر کچھ فرمایا۔ اور اس قسم کو ان قسموں میں سے ایک قرار دے کر جن میں انسان ایک نیکی یا نگہداشت حقوق یا اصلاح کے کام سے رک جاتا ہے اس سے روکا ہے اور ساتھ ہی ایک عام اور وسیع تعلیم دیدی ہے کہ کبھی اپنے آپ کو ایسے امر کا پابند نہ کرو جس میں اچھے کام سے رُک جاؤ۔ یا جو حقوق تمہارے ذمہ ہیں انکی رعایت نہ کر سکو یا اصلاح کی بات کو ترک کرنا پڑے خواہ اللہ کی قسم ہی کیوں نہ کھائی ہو یعنی اپنی طرف سے ایسا عہد اللہ کے ساتھ ہی کیوں نہ کر لیا ہو جب ایسا عہد اللہ کے ساتھ جائز نہیں۔ کیونکہ وہ تو نیکی سکھاتا اور رعایت حقوق کی تاکید کرتا ہے تو دوسروں کے ساتھ کیونکر جائز ہو سکتا ہے جن ملازمتوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے حقوق چھیننے یا ان کو دکھ دینے کی نوبت پہنچے وہ بھی اس کے ماتحت آجاتی ہیں +

لغو — ۲۸۸ اللغو۔ لغو کلام وہ ہے جو شمار کے قابل نہ ہو یعنی غور و فکر سے نہ کی جائے +

حِلم حلیم — حلیم حِلم کے معنی نفس اور طبیعت کو غضب کے جوش میں آنے سے روکنا ہے (غ) اور حلیم جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں آیا ہے اس کے معنی لسان العرب میں الصبور دیتے ہیں جس کی تشریح یوں کی ہے کہ اسے نافرمانوں کی نافرمانی ہلکا نہیں بناتی نہ ان پر غضب اسے اپنے آپ سے باہر کر دیتا ہے۔

لغو قسمیں — لغو قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو انسان معمولی بات چیت میں عادت کے طور کھا لیتا ہے۔ عرب کے لوگ بات بات پر کہدیا کرتے تھے لا واللہ بلی واللہ ہمارے بعض فاضل بھی اپنی فضیلت کے اظہار کے لئے واللہ باللہ تم تاللہ کے سوائے گفتگو نہیں کر سکتے بما کسبت قلوبکم سے مراد وہ قسمیں ہیں جو انسان قصداً و ارادہ سے کھائے اس طرح کی قسم کے لئے دوسری جگہ کفارہ کا دینا مذکور ہے (المائدہ ۵۔ ۸۹) مگر لغو قسم پر جب سوچ سمجھ کھائی جائے سختی نہیں

لغو قسم کھانے کی ممانعت — رکھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لغو قسمیں کھانے سے نہیں روکا بلکہ والذین ھم عن اللغو معرضون (المومنون ۲۳۔ ۳) میں ہر لغو بات اور فعل سے روکا ہے اور لغو قسم کی حفاظت کا ذکر دوسری جگہ ہے واحفظوا ایمانکم (المائدہ ۵۔ ۸۹) +

اِلی۔ آلی — ۲۸۹ یؤلون۔ اِلی حرف ہے جو ہر شش جہات میں کسی نہایت کو ظاہر کرتا ہے اور اَلَوتُ فی الامر کے معنی ہیں میں نے اس امر میں کوتاہی کی۔ گویا اس میں کام کرنے والا انتہا کو دیکھ لیتا ہے اور آگے نہیں چلتا لا یالونکم خبالا (آل عمران ۳۔ ۱۱۷) اور ایلاء

ایلاء — وہ قسم ہے کہ جس کی غرض کسی کام میں یعنی کسی حق کی ادائگی میں کوتاہی کرنا ہو۔ اصطلاح شریعت میں ایلاء یہ ہے کہ مرد قسم کھائے کہ میں اپنی بی بی کے پاس نہ جاؤں گا یعنی ایسی قسم جس میں عورت کے حقوق کی ادائگی میں کمی واقع ہو (غ) +

فاء — فاؤ۔ فَیٔ سے ہے جس کے معنی ہیں اچھی حالت کی طرف لوٹ آنا (غ) +

عورت کے پاس نہ جانے کی قسم — سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی آدمی کسی عورت کو نہ چاہتا اور یہ بھی پسند نہ کرتا کہ وہ

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۲۲۷

اور اگر طلاق کا پختہ ارادہ کریں تو یقیناً اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۲۹۰

کسی دوسرے سے نکاح کرے تو قسم کھا لیتا کہ میں اس کے قریب نہ جاؤں گا اور اس طرح پر اسے معلقہ چھوڑ دیتا نہ وہ خاوند والی ہوتی نہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی۔ اور اس کی غرض صرف عورت کو دکھ پہنچانا تھا۔ اس لئے طلاق کے مسائل میں سب سے پہلے اس بد رسم کا علاج فرمایا۔ قرآن کریم نے اول تو ایلاء کو ان قسموں میں داخل کر کے جو نیکی اور نگہداشت حقوق سے رُکنے کی قسمیں ہیں منع فرمایا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا کر بیٹھے تو پھر صرف چار ماہ کی مہلت دی ہے۔ یا اس عرصہ میں رجوع کرے اور رجوع کو اچھی حالت ٹھہرایا ہے جیسا کہ لفظ فاؤ کے استعمال سے ظاہر ہے۔ چار ماہ گزرنے کے بعد بعض کے نزدیک طلاق واقع ہو جاتی ہے لیکن دوسری جگہ نکاح کرنے کے لئے اسے پھر عدت پوری کرنی چاہیئے اور بعض کے نزدیک چار ماہ گزرنے پر عورت بذریعہ حاکم خاوند کو مجبور کر سکتی ہے کہ یا وہ رجوع کرے اور یا طلاق دیدے الفاظ قرآنی پہلے خیال کے مؤید ہیں +

۲۹۰۔ عزموا۔ عزم کسی کام کے کر گزرنے پر دل کو مضبوط کر لینا ہے +

عزم

الطلاق۔ طلاق کے اصل معنی بندش سے آزاد کرنا ہیں اور معاہدہ نکاح سے آزاد کرنے پر بالخصوص بولا گیا ہے +

طلاق

عربوں میں طلاق

یہاں سے طلاق کا مضمون شروع ہوتا ہے۔ عربوں میں طلاق کے متعلق حد درجہ کی آزادی تھی۔ عورت کی کوئی منزلت نہ تھی نہ معاہدہ نکاح کو کچھ وقعت دی جاتی تھی جب چاہا طلاق دیدی جب چاہا واپس لے لیا۔ یہودیوں کی شریعت میں بھی نسبتاً طلاق میں زیادہ آزادی تھی بالمقابل بعض اقوام مثلاً ہندوؤں میں نکاح کا فسخ ہونا کسی حالت میں بھی جائز قرار نہیں دیا

یہودیوں اور ہندوؤں میں طلاق

عیسائیت اور طلاق

ہے۔ عیسائی مذہب کی جو بنیادی اینٹ طلاق کے مسئلہ میں ہے وہ ایسا تنگ قانون ہے کہ آج عملاً تمام عیسائی اقوام خود اسے ترک کر چکی ہیں۔ انجیل میں ہے "یہ بھی کہا گیا کہ جو کوئی اپنی جورو کو چھوڑ دے اسے طلاق نامہ لکھ دے پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی جورو کو زنا کے سوائے کسی اور سبب سے چھوڑ دیوے اس سے زنا کرواتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرے زنا کرتا ہے" (متی ۵: ۳۱۔ ۳۲) اس بنیاد پر جو عمارت عیسائی اقوام نے قانون طلاق کی بنائی تھی آج اسے زمانہ نے پاش پاش کر دیا۔ کونسا عیسائی ملک ہے جس میں آج ان الفاظ کو ردی کی ٹوکری میں نہیں پھینکا گیا۔ آئے دن انکے خلاف قانون بنتے ہیں اور مسیح کو خدا خدا کر کے پکارنے والے پارلیمنٹوں میں اکٹھے ہوتے اور ان الفاظ کو ناممکن العمل قرار دیتے ہیں۔ کیوں نہ ہو خدائے خود آ کر یہ تھوڑی سی شریعت بنائی تھی۔ پھر اس مذہب کو دنیا میں پیش کرنا کیا شرم کی بات نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں نے جب طلاق کے معاملہ میں افراط کی تو حضرت مسیح نے جن کی تعلیم خود مختص القوم اور مختص الزمان تھی وقتی علاج کے طور پر یہ ہدایت دی تھی۔ اور ہمیشہ تک رہنے والی شریعت جو تمام معاملات میں اعتدال کی راہ پر چلاتی بعد میں آنے والی تھی +

اسلام نے طلاق میں اعتدال قائم کیا۔

چنانچہ اسلام نے طلاق کے مسئلہ کو صحیح بنیاد پر قائم کیا نہ تو یہودیوں اور عربوں والی آزادی باقی رکھی نہ ہندوؤں اور عیسائیوں کی تنگی کو ممکن العمل قرار دیا اور ایک ایسے میانہ راہ کی ہدایت کی جس کی طرف آج خود ساری دنیا کا رجحان ہو رہا ہے یعنی ایک طرف اگر طلاق کی اجازت دی تو دوسری طرف بہت سی قیود اور شرائط کے ماتحت اسے کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے اصل منشاء کو سمجھ کر فرمایا اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ تمام حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسند چیز خدا کو طلاق ہے۔ یہ لفظ ہر ایک مسلمان کے لئے سوائے اشد ضرورت کے کافی روک ہیں۔ طلاق کے مسئلہ میں جس قدر حد بندیاں قرآن شریف نے قائم کی ہیں ان کا ذکر آگے آتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اسلام نے ان وجوہ کو معین و

وجوہ طلاق کو کیوں معین نہیں کیا۔

۲۲۸ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ

اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں ۲۹۱ اور ان کے لئے جائز نہیں کہ

يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

اسے چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتی ہیں ۲۹۲.

مخصوص نہیں کیا جن پر طلاق دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اسلام کا وسیع قانون سب زمانوں اور سب قوموں کے لئے تھا ایسی وجوہات کا تعین کرنا درست نہ ہوتا۔ آج عیسائی اقوام کی جو سب ایک ہی مذہب کے پیرو ایک ہی درجہ تعلیم و ترقی پر یکساں قوانین معاشرت و تمدن کے پیرو ہیں یہ حالت ہے کہ ان میں سے کوئی دو قومیں اس بات پر متفق نہیں کہ وجوہات طلاق کن کن امور کو رکھا جائے پس اسلام نے ایک ایسی راہ بتائی ہے جو تمام نقصوں سے خالی ہے۔ آج سے تیرہ سو سال پیشتر ہو کا ایک اُمی اپنے ذہن سے یہ قانون نہ بنا سکتا تھا جب آج بڑے بڑے مہذب اور تعلیم یافتہ بھی اس سے عاجز ہیں +

قروء

۲۹۱ قروء ۔ قرء کی جمع ہے ۔ اور قُرء حقیقت میں حالت طہر سے حالت حیض میں داخل ہونے کا نام ہے ۔ اور چونکہ دونوں باتوں کا جامع ہے یعنی طہر اور حیض کا اس لئے بعض وقت دونوں پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے (غ)۔ مفردات میں ہے کہ ہر ایک اسم جو دو صفتوں کو اکٹھا چاہتا ہو وہ الگ الگ بھی ہر ایک پر بولا جاسکتا ہے پس ثلٰثة قروء یہ ہے کہ عورت تین دفعہ حالت طہر سے حالت حیض میں داخل ہو +

طلاق حالت طہر میں ہو سکتی ہے

ان الفاظ میں گو بظاہر عدت کا ہی ذکر ہے مگر لفظ قروء کو لا کر یہ بتا دیا ہے کہ طلاق دینے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ حالت طہر میں دی جائے ۔ کیونکہ عدت شروع نہیں ہو سکتی جبتک حالت طہر موجود نہ ہو جس سے حالت حیض کی طرف انتقال ہو (برخلاف بیوہ کے کہ وہاں عدت دنوں اور مہینوں کی گنتی سے ہوتی ہے) طلقوھن لعدتھن میں اسی طرف اشارہ ہے اور صحیح

طلاق پر پہلی حد بندی

حدیث میں ہے کہ جب حضرت ابن عمر نے حالت حیض میں طلاق دی تو آنحضرت صلعم سخت ناراض ہوئے اور رجوع کا حکم دیا۔ یہ شرط درحقیقت طلاق پر ایک روک ہے ۔ کیونکہ حالت حیض میں تو مرد اور عورت الگ الگ ہوتے ہیں اس وقت طلاق کا دینا سہل ہے مگر حالت طہر میں میاں بی بی میں تعلقات محبت قائم ہوتے ہیں اس وقت طلاق دینا زیادہ مشکل ہے +

طلاق پر دوسری حد بندی عدت ہے

دوسری حد بندی جو انہی الفاظ میں طلاق پر رکھی ہے وہ عدت یا زمانہ انتظار ہے ۔ اس کی ایک بڑی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ تھوڑی علیحدگی میں ایک دوسرے کی قدر معلوم ہو جائے اور خیالات محبت اگر اس تعلق میں فی الواقع موجود ہیں تو ان خیالات منافرت پر جو عارضی طور پر پیدا ہو گئے ہیں غالب آجائیں ۔ گویا طلاق دینے کے ساتھ فوراً واقع نہیں ہوتی بلکہ قریباً تین ماہ کا وقفہ دیا جاتا ہے جس میں اگر ممکن ہو تو اصلاح ہو جائے ۔ نکاح تو بغیر میاں بی بی میں مودت و محبت کے اصل غرض کو پورا ہی نہیں کرسکتا ۔ اور اگر محبت نہ ہو تو نہ صرف میاں بی بی کے اخلاق ہی تباہ ہوتے ہیں ۔ بلکہ اولاد کے اخلاق بھی بگڑ جاتے ہیں ہاں بعض وقت اصل محبت تو موجود ہوتی ہے مگر عارضی طور پر کوئی اسباب منافرت کے پیدا ہو جاتے ہیں ۔ ان کے دور ہونے اور خیال محبت کے پھر غالب آنے کے لئے یہ وقفہ رکھ دیا ۔ عدت کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ اگر عورت حاملہ ہو تو اس مدت میں حمل ظاہر ہو جائے جیسا کہ اس سے اگلے الفاظ میں ذکر بھی کر دیا ہے +

رحم

۲۹۲ ارحام ۔ رَحِم کی جمع ہے اور یہ معروف ہے +

عدت کی ایک غرض تو ظاہر تھی جس کی طرف اوپر کے نوٹ میں توجہ دلائی گئی ہے اور وہ طلاق کی آزادی پر ایک حد بندی

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ

اور اس (اثناء) میں ان کے خاوند انکو واپس لینے کے زیادہ حقدار ہیں اگر وہ اصلاح چاہیں ۲۹۳ اور ان کیلئے

مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

پسندیدہ طور پر (حقوق) ہیں جیسے ان پر (حقوق) ہیں ۲۹۴ اور مردوں کو ان پر ایک فضیلت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے

عدت کی دوسری غرض — ہو۔ یہاں عدت کی ایک دوسری غرض کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی یہ کہ اگر عورت کو حمل ہو تو اس میعاد میں وہ بھی ظاہر ہو جائے گا۔ چونکہ اولاد میاں بی بی کے تعلقات محبت میں ایک بڑا واسطہ بن جاتی ہے اس لئے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ اکثر حالات میں بی بی کا صاحب اولاد ہونا طلاق کے لئے مانع ہو جاتا ہے ۔

بعل — ۲۹۳ بعولۃ بَعْل کی جمع ہے۔ بَعْل اصل میں وہ ہے جو دوسرے پر فوقیت رکھتا ہو اور خاوند کو بھی بَعْل کہتے ہیں ۔

طلاق پر تیسری حدبندی — یہ طلاق پر تیسری حدبندی ہے یعنی اس وقفہ عدت کے اندر اگر اصلاح چاہیں (اور اصلاح کا تو حکم ہے) تو خاوند اس بات کا حقدار ہے کہ بی بی کو اس کی طرف لوٹایا جائے اس میں ہر ایک قسم کی جلد بازی کا جو طلاق کے معاملہ میں اختیار کی جاسکتی ہے علاج منظور ہے تین ماہ کے عرصہ میں انسان کو خوب غور و فکر کا موقعہ مل سکتا ہے۔ اور عارضی رنجشیں دور ہو کر انسان ٹھنڈے دل سے غور کر سکتا ہے۔ اور اگر میاں بی بی میں کچھ بھی حقیقی محبت ہے تو وہ چنگاری ہی تمام عارضی رنجشوں کو جلا کر اصلی تعلق کو قایم کر دے گی۔ اور یہاں اصلاح کا ذکر کر کے اور حق کا لفظ لا کر بتا دیا کہ جہاں تک ممکن ہو پہلے تعلق کو قایم رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے ۔

معروف — ۲۹۴ معروف عرف سے ہے دیکھو ۲۵۶ اور معروف اس امر کو کہتے ہیں جس کا اچھا یا پسندیدہ ہونا شریعت کی رو سے پہچانا جا سکے (غ)

درجہ — دَرَجَة۔ منزلۃ یا بلندی کا مرتبہ ۔

عورتوں اور مردوں میں مساوات حقوق اور مردوں کی فوقیت — ان الفاظ میں قرآن کریم نے دو مشکلات کو کمال خوبی سے حل کیا ہے یعنی اول تو اس اصول کو قایم کیا کہ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ گویا بلحاظ حقوق مرد و عورت میں مساوات ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تمام مذاہب بےخبر معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ آج تک مہذب اقوام نے بھی پورا پورا اس اصول کو قبول نہیں کیا۔ لیکن دوسری طرف مساوات حقوق سے ایک نقص پیدا ہوتا تھا۔ کہ پھر امور خانگی میں نظم کیونکر قایم رہے۔ کیونکہ کوئی نظم قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس میں ایک کو دوسرے پر کچھ فوقیت نہ دی جائے

معاشرت اور تمدن — اور معاشرت یا خانہ داری جس پر نسل انسانی کی ساری بہبودی کا دار و مدار ہے۔ تمدن انسانی کی پہلی کڑی ہے کیونکہ تمدن باہم مل جلکر رہنے کا نام ہے اور اس کی ابتدا معاشرت یا خانہ داری سے ہوتی ہے جس طرح تمدن میں مساوات کے ساتھ ایک فوقیت کی ضرورت ہے اسی طرح معاشرت میں یا گھر کے انتظام میں مساوات کے ساتھ ایک فوقیت کی ضرورت ہے تاکہ نظم قایم رہے۔ پس مساوات حقوق کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی فرمایا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک فوقیت بھی ہے۔ اگر نری مساوات ہوتی تو خانہ داری تباہ ہو جاتی۔ اگر سلسلہ نظام عالم پر غور کیا جائے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ مرد کو عورت پر ایک فوقیت حاصل ہے۔ مرد میں قوت و شجاعت کے جوہر عورت سے بڑھکر ہیں گو عورت میں رحم و محبت کے جوہر مرد سے زیادہ ہوں مگر نظام عالم میں قوت و شجاعت حکومت کرنے کے لئے فوقیت دیتی ہے پس نہ تو مردوں کو عورتوں کے حقوق کی مساوات کا انکار کرنا چاہئے نہ عورتوں کو مردوں کی اس فوقیت کا جو قدرت نے ان کو دی ہے یہ ایک توازن ہے جس کے بغیر نظم خانگی برباد ہو جائیگا جس طرح تمدن میں ایک طرف مساوات حقوق قایم کی اور دوسری طرف حقوق حکام پر قایم کئے ہیں۔ اسی طرح معاشرت میں مرد و عورت کے حقوق کی مساوات قائم کر کے عورت کے حقوق مرد پر قایم کئے ہیں ۔

طلاق پر چوتھی حدبندی — طلاق کے مضمون میں عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ دلانا اس غرض سے ہے کہ مرد یہ نہ سمجھیں کہ چونکہ طلاق کا دینا ان کے اختیار

ع ۲۹ / ۳ / ۱۳

۲۲۹ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ

طلاق دو دفعہ ہے — پھر پسندیدہ طور سے رکھنا — یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرنا ہے ۲۹۵

(مسائل طلاق)

میں دیا گیا ہے اس لئے عورتوں کے کوئی حقوق ہی نہیں ان کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں اور یوں یہ چوتھی حد بندی طلاق پر ہے ✦

۲۹۵ امساک کسی چیز سے تعلق رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے (غ) ✦ (امساک)

تسریح ۔ سَرَحَ ۔ اونٹ کو چرنے کیلئے آزاد چھوڑنا ہے ۔ اور عقدہ نکاح سے آزاد کرنا تسریح ہے (غ) حِیۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ (النحل [16]-۶) (تسریح ۔ سرح)

(طلاق پر پانچویں حد بندی طلاق صرف دو دو دفعہ دی جا سکتی ہے ۔)

طلاق دو دفعہ ہے ۔ مفسرین کہتے ہیں وہ طلاق مراد ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہے جس کی عدت میں خاوند رجوع کر سکتا ہے جس کو اصطلاح میں طلاق رجعی کہا جاتا ہے مگر حق یہ ہے کہ قرآن شریف نے دوسری کسی طلاق کا ذکر ہی نہیں کیا ۔ اور نہ قرآن شریف میں اور نہ حدیث صحیح میں کہیں یہ حکم ہے کہ طلاق دینے کے لئے تین دفعہ طلاق کا کہنا ضروری ہے ۔ تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت ان تکالیف کو دور کرنے کے لئے نازل ہوئی جو عورتوں کو بار بار طلاق دیکر اور پھر عدت کے اندر رجوع کر کے پہنچائی جاتی تھیں ترمذی میں اس مضمون کی حدیث بھی ہے کہ ایک شخص طلاق دیتا پھر رجوع کر لیتا گو ہزار مرتبہ ایسا کرے اس کا علاج قرآن شریف نے ان الفاظ میں کیا کہ طلاق اور پھر عدت کے اندر رجوع بار بار نہیں ہو سکتا بلکہ صرف دو دفعہ ہو سکتا ہے ۔ اس کے بعد اگر تیسری دفعہ طلاق دے تو پھر عدت کے اندر رجوع کا اختیار نہیں ۔ اور یہ طلاق پر پانچویں حد بندی ہے ✦

(تین دفعہ طلاق کہنے کا کوئی حکم نہیں)

(طلاق رجعی و طلاق بائن)

پس الطلاق مرتان میں صرف عرب کی اس بیماری کا علاج ہے جو بار بار طلاق دیکر رجوع کرتے تھے لیکن اس سے لوگوں نے طلاق رجعی اور طلاق بائن کی تفریق نکالی ہے اور وہ اس طرح کہ قرآن شریف جو دو مرتبہ طلاق کے بعد رجوع کی اجازت دیتا ہے تو اس کو باطل کرنے کے لئے لوگ عورت پر تین طلاق اکٹھی کہہ دیتے ہیں یعنی بجائے ایک دفعہ کہنے کے کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں تین دفعہ طلاق ایک ہی وقت میں کہہ دیتے ہیں ۔ اور اس کو طلاق بائن قرار دے لیا ہے یعنی اس کے بعد خاوند نہ عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے جیسا کہ آیت ۲۲۸ کا منشاء تھا ۔ اور نہ بعد عدت کے دوبارہ اسے اپنے نکاح میں لا سکتا ہے جیسا آیت ۲۳۲ کا منشاء ہے فقہاء کے ایک گروہ نے اس قسم کی طلاق کو طلاق بائن قرار تو دیا لیکن فی الواقع یہ بتلانے کو کہ یہ طریق اسلامی کے خلاف ہے اس کا نام طلاق بدعی رکھا ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس بدعت کو دور کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ اس کو تسلیم کر لیا حالانکہ نبی کریم صلعم نے اسے تسلیم نہیں کیا ۔ ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ رکانہ نبی کریم صلعم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بی بی کو طلاق بتہ دی ہے ۔ تو آپ نے فرمایا کہ تیرا ارادہ کیا تھا تو کہا کہ میرا ارادہ ایک ہی طلاق دینے کا تھا جس پر آپ نے رجوع کی اجازت دی ۔ اور نسائی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلعم کو کسی شخص کے متعلق خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بی بی کو تین مرتبہ اکٹھی طلاق دی ہے فقام غضبان ثم قال ایلعب بکتاب اللہ عز وجل و انا بین اظہرکم (مشکوٰۃ) آپ سخت ناراض ہو کر اٹھے اور کہا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ ہنسی کی جاتی ہے اور میں تمہارے درمیان ہوں پس آنحضرت صلعم اس کو کتاب اللہ کے ساتھ ہنسی قرار دیں اور آج یہ حالت ہے کہ مسلمانوں میں جب کوئی طلاق دے تو اس کا پہلا لفظ یہی تین طلاق ہوتا ہے ۔ اور یہ سارا الزام علماء کے ذمہ ہے کہ وہ عوام کو اس سے آگاہ نہیں کرتے کہ یہ طریق طلاق وہ ہے جسے رسول اللہ صلعم نے کتاب اللہ کے ساتھ ہنسی قرار دیا ہے ۔ اگر مسلمانوں کو یہ علم ہو تو وہ کبھی جرأت نہ کریں کہ جب طلاق ایک مرتبہ کہنے سے بھی ہو سکتی ہے تو خواہ مخواہ وہ طریق اختیار کریں جسے محمد رسول اللہ صلعم کتاب اللہ کے ساتھ ہنسی قرار دیں ۔ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تین دفعہ اکٹھی طلاق دینے کا رواج جاہلیت میں تھا ۔ اور نبی کریم صلعم نے تعلیم قرآنی کے ماتحت اسے روکا تھا مگر یہ بیماری آہستہ آہستہ پھر زور پکڑ گئی ۔ یہاں تک کہ آج شاذ و نادر ہی کوئی مسلمان اس کے اثر سے خالی رہا ہے ✦

(طلاق بدعی)

(تین طلاق کتاب اللہ سے ہنسی ہے)

(تین طلاق ایام جاہلیت کا بقیہ ہے ۔)

(تین طلاق اور حضرت عمر کا فیصلہ)

اس بارہ میں حضرت عمر کے فیصلہ سے بھی ایک غلط نتیجہ نکالا جاتا ہے ۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم اور ابوبکر کے زمانے

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ

اور تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم اس (مال) سے کچھ لو جو تم نے انہیں دیا ہو ۲۹۶ سوائے اسکے کہ وہ دونو ڈرتے ہوں کہ اللہ کی حدوں کو قایم نہیں رکھ سکینگے

اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے پہلے دو سال میں تین طلاق کو ایک ہی طلاق سمجھا جاتا تھا لیکن (لوگوں نے جب یہی طریق اختیار کر لیا تو) حضرت عمرؓ نے فرمایا ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لہم فیہ اناۃ فلو امضیناہ علیہم فامضاہ یعنی لوگ اس معاملہ میں جلدی کرتے ہیں جس میں انہیں ڈھیل دی گئی تھی بہتر ہو کہ ہم ان پر اسی طرح حکم لگا دیں سو ایسا ہی لگا دیا۔ اول تو ایک صحابی کا فعل حجت شرعی نہیں۔ دوسرے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم بطور سزا جاری کیا تھا تاکہ لوگ تین دفعہ اکٹھی طلاق دینے سے رک جائیں جب ان کی اصل غرض بھی اس بدعت سے لوگونکو روکنا تھا تو ان کے فعل سے اس کا جواز کیونکر نکالا جا سکتا ہے۔ اور ترمذی میں ہے فروی عن عمر بن الخطاب انہ جعل البتۃ واحدۃ یعنی عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ انہوں نے طلاق بتہ یعنی تین طلاق کو ایک ہی قرار دیا پس ممکن ہے کہ آپ نے وہ حکم صرف عارضی طور پر جاری کیا ہو۔ بہر حال ان کا یہ فعل کسی صورت میں تین اکٹھی طلاق کو تین علیحدہ علیحدہ طلاقوں کا قایم مقام نہیں بنا سکتا جب نبی کریم صلعم سے اس کے خلاف مروی ہے ♦

طلاق کے تین اقسام

فقہا نے طلاق کو تین قسم قرار دیا ہے۔ طلاق بدعی یہی جس کا ذکر اوپر ہوا اور کسی صورت میں جائز نہیں مسلمانوں کو اس سے رکنا چاہئے۔

طلاق حسن

دوسری قسم کی طلاق وہ ہے جسے وہ حسن کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مرد تین طہروں میں الگ الگ تین طلاقیں دے اس کو بھی بائن قرار دیا ہے اسکی کوئی سند بھی صراحت سے نہیں ملتی قرآن شریف میں تو قطعاً یہ ذکر نہیں کہ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں بلکہ صاف الفاظ ہیں فطلقوھن لعدتھن یعنی جب ایک طلاق دی تو اب اس کیلئے ایک عدت ہے جو تین قرء ہے۔ اور جب ایک طلاق کے بعد تین قرء انتظار کا حکم صراحت سے قرآن شریف میں موجود ہے تو پھر دوسری تیسری طلاق کیا ہوئی؟ اور اس کے بعد وہ انتظار بموجب حکم قرآن کیوں نہ ہو؟ کسی حدیث میں بھی جہانتک میں نے تحقیق کی ہے کوئی ایسا حکم موجود نہیں کہ طلاق اس طرح دی جائے کہ ہر طہر میں ایک طلاق ہو۔ اس لئے یہ صورت بھی اختیار کرنے کے قابل نہیں ♦

طلاق احسن

تیسری قسم طلاق کی وہ ہے جسے احسن کہا جاتا ہے یعنی یہ کہ مرد عورت کو طہر میں بغیر اس کے کہ اس کے پاس گیا ہو طلاق دے یعنی ایک ہی مرتبہ اور یہی وہ طلاق ہے جو قرآن کریم کی آیات سے صاف معلوم ہوتی ہے اور جس کا پتہ احادیث سے بھی لگتا ہے۔ اور یہی وہ طریق طلاق ہے جسے اختیار کرنا چاہئے دوسرے طریق اختیار کر کے مسلمانونکو اس قدر ذلت دیکھنی پڑی ہے کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا اور قرآن شریف کی صراحت کے یہ خلاف ہے کہ مرد عورت کو طلاق دے تو اسے عدت میں رجوع کا اختیار نہ رہے۔ دوسرے طریقونکو اختیار کرنے کا نتیجہ ہی وہ حیوانیت کا طریق ہے جسے حلالہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ♦

طلاق ایک ہی ہے خواہ سو دفعہ کہے یا تین دفعہ اور خواہ اسے ہر روز کہتا جائے یا ہر ماہ میں ایک دفعہ کہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ ہاں جب پہلی دفعہ طلاق کا لفظ منہ سے نکالا ہے اس وقت سے عدت شروع ہو جاتی ہے بشرطیکہ عورت کی حالت طہر میں ایسا کہا ہو اور اگر طہر میں ایسا نہیں کہا تو جیسا کہ

حالت حیض کی طلاق طلاق نہیں

حضرت ابن عمرؓ کا واقعہ صحیح احادیث میں بتاتا ہے رجوع کرنا پڑیگا جیسا کہ نبی کریم صلعم نے خود ابن عمرؓ سے کرایا۔ باقی رہا یہ کہ حالت حیض کی طلاق ایک طلاق گنی جائیگی یا نہ سو نبی کریم صلعم کے فیصلہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ طلاق نہیں گنی جائیگی کیونکہ فرض کرو ایک شخص نے دو دفعہ اپنی بی بی کو طلاق دیکر رجوع کیا تیسری دفعہ حالت حیض میں وہ طلاق دیتا ہے تو اگر یہ طلاق گنی جائے تو رجوع ہو نہیں سکتا حالانکہ نبی صلعم نے رجوع کو ضروری ٹھہرایا۔ کہ سوائے حالت طہر کے طلاق نہیں

طلاق میں حسن سلوک کا حکم

طلاق کے مسئلہ میں فامساک بمعروف نہایت اعلیٰ درجہ کا قانون ہے اس میں خاوند کی طرف سے بی بی کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا حسن سلوک ضروری ٹھہرایا ہے۔ اور حدیث میں ہے خیرکم خیرکم لاھلہ پس اگر طبائع میں کوئی ایسی ناموافقت ثابت ہو یا کوئی ایسے تنازعات پیدا ہو جائیں جن کی اصلاح نہیں ہو سکتی تو یہ چونکہ امساک بمعروف کے خلاف ہے اس لئے تسریح باحسان ضروری ہے یعنی عورت کے ساتھ کچھ احسان کر کے رخصت کر دینا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے اسکے کہ عورت کی طرف سے کسی فحش وغیرہ کا ارتکاب ہو اسکے ساتھ طلاق میں حسن سلوک کو قرآن کریم نے ضروری ٹھہرایا ہے نبی کریم صلعم کو خود بھی ایک موقعہ پر جب بیبیوں نے کچھ زیادہ اخراجات طلب کئے یہی حکم ہوا تھا کہ یہ دنیا کا مال چاہتی ہیں تو انہیں کچھ دو اور متعکن کرو اسرحکن سراحا جمیلا (الاحزاب ۲۸)

مہر کی ادائگی ضروری ہے

۲۹۶ مما اٰتیتموھن سے مراد مہر ہے۔ کیونکہ مہر عورت کو دیدیا جاتا تھا اور قرآن کریم نے جہاں کہیں مہر کا ذکر کیا ہے اس سے صاف معلوم

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ ؕ

پس اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو پھر ان پر اسکے بارے میں کچھ گناہ نہیں جو عورت فدیہ دیدے ۲۹۷

ہوتا ہے کہ مہر کی رقم عورت کو ادا کر دی جاتی تھی آج کل کی طرح ایک فرضی رقم نہ تھی۔ البتہ یہ جائز ہے کہ انسان کسی مجبوری کی وجہ سے فوراً اس رقم کو ادا نہیں کر سکتا تو اسے بطور قرضہ اپنے ذمے سمجھے اور جس قدر جلد ممکن ہو ادا کرے۔ اور یہ طلاق پر چھٹی حد بندی ہے کیونکہ عموماً مہر کی رقم اس قدر ہوتی ہے کہ خاوند کو بلا وجہ طلاق دینے میں مانع ہوتی ہے۔ اور مہر امیر اور غریب کی حیثیت کے مطابق علیحدہ علیحدہ ہے آج کل جو لوگوں نے ایک فرضی شرعی مہر بتیس روپیہ کا تجویز کیا ہوا ہے اس سے بہت قباحت پیدا ہو رہی ہے کیونکہ اس طرح پر جو ایک بڑا منشاء مہر کا تھا کہ وہ طلاق کی آزادی پر روک رہے وہ باطل ہو گیا ہے اور مرد عورتوں کو جس طرح چاہتے ہیں تکالیف دیتے ہیں۔ مہر کا کوئی حصہ واپس لینے کی صرف دو صورتیں ہیں جن میں سے ایک کا ذکر تو آگے آتا ہے۔ اور دوسری کا ذکر سورہ نساء میں ہے الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ (النساء ۴-۱۹)

طلاق پر چھٹی حد بندی ادائگی مہر سے

خلع

۲۹۷ جس صورت طلاق کا ذکر یہاں ہے اسے اصطلاح شرعی میں خلع کہتے ہیں یعنی وہ صورت جہاں عورت طلاق حاصل کرنا چاہتی ہے مگر الفاظ یہ ہیں کہ دونوں حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب عورت کی طرف سے خواہش طلاق ہوگی تو یہ خطرہ ہے کہ مرد اس پر دباؤ ڈالنے کے لئے زیادتی کرے اور یوں گویا دونوں حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکے عورت اس لئے کہ وہ طلاق چاہتی ہے اور مرد اس لئے کہ وہ زیادتی کرے گا اور اسے روکنے کی کوشش کریگا۔ برخلاف پہلی صورت کے جہاں زیادتی صرف مرد کی طرف سے ہے۔ یا خواہش طلاق صرف اسی کی طرف سے ہے فان خفتم میں حکام مراد ہیں یعنی اگر عورت طلاق حاصل کرنا چاہے تو اسے قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہئے وہ اگر دیکھے کہ خلع ہونا چاہئے تو خلع کرا دے۔ گویا جس طرح مرد پر ایک بھاری روک مہر کی رقم ہے عورت پر طلاق حاصل کرنے میں روک یہ ہے کہ اسے قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

عورت بذریعہ قاضی طلاق حاصل کر سکتی ہے

جمیلہ کی طلاق کا واقعہ

صحیح حدیثوں میں جمیلہ بنت عبداللہ بن ابی اور اس کے خاوند ثابت بن قیس بن شماس کا ذکر موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کو طلاق حاصل کرنے کا حق اسی طرح ہے جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق ہے۔ جمیلہ طلاق چاہتی تھی اور قیس طلاق دینا نہ چاہتا تھا جمیلہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تم اس کا باغیچہ جو اس نے مہر میں دیا تھا واپس کر دو گی اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ تو آپ نے قیس کو حکم دیا کہ طلاق دیدو۔ حدیث میں اس بی بی کے یہ لفظ موجود ہیں ما اعیب علیہ فی خلق ولا دین میں نہ اس کے اخلاق پر عیب لگاتی ہوں نہ دین پر۔ اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں لا اطیقہ یعنی بغضاً میں اس کی برداشت نہیں کرتی یعنی مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو مرد سے طلاق حاصل کرنے کا حق نہ صرف اس صورت میں حاصل ہو کہ اسکے اخلاق پر وہ عیب لگا سکے یعنی وہ اس سے بدسلوکی کرتا ہو یا دین پر عیب لگا سکے بمثلاً جو زانی ہو یا فاسق فاجر ہو بلکہ محض ناموافقت طبع کیوجہ پر بھی طلاق مل سکتی ہے چونکہ عورت کو اسقدر وسیع حق طلاق حاصل کرنیکا دیا گیا۔ اسلئے جسطرح مرد کو طلاق دینے میں جلدی کرنیکے متعلق فہمائش کی گئی ہے عورت کو بھی خصوصیت سے طلاق میں جلدی کرنے سے روکا گیا ہے۔ ابو داؤد ترمذی وغیرہ میں حدیث ہے ایما امراۃ سألت زوجہا طلاقاً فی غیر ما باس فحرام علیہا رائحۃ الجنۃ یعنی جو عورت اپنے خاوند سے بلا کسی تکلیف کے طلاق مانگتی ہے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ناموافقت طبع خود ایک تکلیف ہے۔

عورت کن وجوہات پر طلاق لے سکتی ہے؟

بلا وجہ طلاق پر زجر

ناموافقت طبع کو کیوں وجہ طلاق قرار دیا گیا

بظاہر خیال ہوگا کہ اسلام نے اس طرح پر عورتوں کو طلاق حاصل کرنے میں بہت آزادی دے رکھی ہے کیونکہ وہ محض ناپسندیدگی اور ناموافقت پر بھی ایک عورت کو طلاق دلا دیتا ہے۔ مگر اسلام کی تعلیم فطرت انسانی کے صحیح علم پر مبنی ہے اگر مرد اور عورت میں ناموافقت ہو تو وہ نکاح کی غرض کو پورا نہیں کر سکتے کیونکہ ایک غرض نکاح کی یہ بھی ہے کہ میاں بی بی ایک دوسرے کا لباس بنیں ایک دوسرے

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ ۲۳۰

یہ اللہ کی حدیں ہیں پس ان سے آگے نہ بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہی ظالم ہیں ۲۹۸ پھر اگر وہ

طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ

اسے (تیسری بار) طلاق دے تو وہ عورت اسکے بعد اس کیلئے حلال نہیں یہانتک کہ وہ اسکے سوائے کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے پھر اگر وہ اسے طلاق دیدے تو ان دونو پر کچھ گناہ نہیں

يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

اگر وہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں اگر انکو یقین ہو کہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھینگے ۲۹۹ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں وہ انہیں ان لوگوں کیلئے کھول کر بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں

کے لئے تسکین اطمینان راحت کا موجب ہوں جیسا ھن لباس لکم وانتم لباس لھن (۱۸۷) اور لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ (الروم ۲۱) سے ظاہر ہے۔ وہ بصورت ناموافقت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اولاد کا پیدا کرنا اور اس کی تربیت جو ایک اور غرض ہے وہ بھی پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ ماں باپ کے جھگڑوں کا اثر اولاد کے اخلاق پر بہت برا ہوتا ہے +

ہندوستان میں عورت کی حق طلاق سے محرومی اور اس کے بد نتائج

۲۹۸ طلاق کے مسئلہ میں ایک بڑا بھاری ظلم جو ہندوستان میں عورتوں پر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کا حق طلاق حاصل کرنے کا سوائے بہت ہی محدود صورتوں کے تسلیم نہیں کیا گیا۔ عورتوں کے ان حقوق سے جو قرآن شریف نے ان کو دیئے ہیں محروم کرنے کا یہ نتیجہ ہے کہ ہزارہا عورتیں بلکہ لاکھوں مصیبت اور درماندگی کی حالت میں ہیں جن کو خاوند نہ بساتے ہیں نہ چھوڑتے ہیں۔ پھر سینکڑوں عیسائی اور آریہ بن جاتی ہیں یا کوئی اور مذہب اختیار کر لیتی ہیں محض اس لئے کہ خاوند کے ظلم سے نجات حاصل ہو۔ مگر ہمارے علماء اور لیڈروں کے کان پر جوں نہیں چلتی اور مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے تباہ ہوتا دیکھکر خاموش ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عورت کے حق طلاق کے بعد کس قدر زجر کے الفاظ بھی فرمائے ہیں یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور ان سے آگے بڑھنے والے ظالم ہیں۔ مسلمان ان الفاظ پر غور کریں کہ خدائے تعالیٰ ان کو ان کے رویہ کے لحاظ سے کس گروہ میں داخل کرتا ہے +

طلاق پر ساتویں حد بندی طلاق بائن ہو

۲۹۹ یہ طلاق کی آزادی پر ساتویں حد بندی ہے اصل میں پہلی دو طلاقیں عارضی علیحدگی ہیں کیونکہ ان کے بعد میاں بی بی پھر پہلی صورت پر رہ سکتے ہیں لیکن اس عارضی علیحدگی کا فائدہ صرف دو دفعہ دیا ہے۔ کیونکہ اگر عارضی جدائی پر حد بندی قایم نہ کی جاتی تو یہ خود ایک بیماری بن جاتی اس لئے فرمایا کہ تیسری مرتبہ طلاق کا لفظ انسان خوب سوچ کر منہ سے نکالے کیونکہ پھر وہ ہمیشہ کے لئے اس تعلق کو دوبارہ قائم کرنے سے محروم کر دیا جائیگا۔ سوائے ایک صورت کے کہ وہ بی بی کسی اور خاوند سے نکاح کرے پھر وہ خاوند بھی اسے طلاق دیدے۔

حلالہ

ان الفاظ سے جو ایک مسئلہ حلالہ کا اخذ کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کی جہالت کی وجہ سے اسلام پر ایک اور بدنامی کا دھبہ ہو رہا ہے عام رواج یہ پڑا ہوا ہے کہ جہاں کوئی شخص بیوی پر ناراض ہوا جھٹ تین طلاق کہدی بعد میں پچھتایا تو ملا صاحب نے حلالہ کا مسئلہ پیش کر دیا یعنی ایک رات کے لئے کسی دوسرے شخص سے ایک فرضی نکاح ہو جائے اور صبح کو وہ طلاق دیدے یہ ایک لعنت ہے جو مسلمانوں کے گلے پڑی ہے اس لئے کہ وہ خلاف قرآن چلتے ہیں۔ حلالہ کی رسم بھی دراصل ایک جاہلیت کی رسم تھی اور حدیث میں صاف آتا ہے

حلالہ رسم جاہلیت ہو

حدیث اور عمل صحابہ میں اس سے اظہار نفرت۔

کہ رسول اللہ صلعم نے حلالہ کرنے والے پر اور اس پر جس کے لئے حلالہ کیا گیا ہے لعنت کی ہے (مشکوٰۃ) اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس حلالہ کرنے والا اور کرانے والا لایا جائیگا تو میں دونوں کو سنگسار کروں گا۔ اور حضرت عثمانؓ سے روایت ہے ایک مقدمہ آپ کے سامنے لایا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا ہے تاکہ اس کے خاوند کے لئے حلالہ کرے تو آپ نے نکاح کو فسخ کر کے دونوں کو الگ الگ کر دیا۔ اور فرمایا کہ وہ پہلے خاوند کے پاس نہیں جا سکتی جبتک کہ خوشی سے نکاح

۲۳۱ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو (یا) انہیں اچھی طرح سے رکھو یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت

بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ

کردو اور ان کو دکھ دینے کیلئے نہ روک رکھو تاکہ تم زیادتی کرو۔ اور جو ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے

وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ

اور اللہ کی باتوں سے ہنسی نہ کرو اور اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے یاد کرو اور اس کو بھی جو تم پر کتاب اور حکمت

وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ع الثلثة

اُتاری جس کے ساتھ تمہیں نصیحت کرتا ہے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۳

نہ کرے اور اس نکاح میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو (روح المعانی) تو جس لعنت کو رسول اللہ صلعم اور صحابہ نے دور کیا تھا۔ وہ آج مسلمانوں کے گلے پڑی ہوئی ہے۔ اور اس کو اتارنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔

نکاح عارضی نہیں ہو سکتا۔

اگر کسی شخص کا یہ خیال ہو کہ قرآن شریف کے الفاظ سے اس مسئلہ کی تائید ہوتی ہے تو وہ اصول قرآنی سے بے خبر ہے۔ قرآن شریف ایک رات یا مقررہ وقت کے نکاح کو جائز ہی نہیں رکھتا۔ نکاح تو قرآن کریم کی اصطلاح میں وہی ہے جو زندگی بھر کے لئے ہو۔ پھر مرد و عورت کی رضامندی نکاح کے لئے ضروری ہے وہ حلالہ کے لعنتی طریق میں کہاں پائی جاتی ہے یہ صحیح زناکاری ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کو دور کرنے کے لئے پورا زور لگائے۔

بلوغ

۳۰۰ بلغن۔ بُلوغ یا بلاغ۔ اصل میں تو کسی مقصد کے انتہا کو پہنچ جانے کا نام ہے مگر کبھی اس کے قریب پہنچ جانے پر بھی بولا جاتا ہے (غ)۔

یہاں ختم میعاد کے قریب پہنچنا ہی مراد ہے کیونکہ اگر واقعی میعاد کو پورا کریں تو پھر امسکوھن یعنی روک رکھنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔

اجل

اجل کسی چیز کے لئے جو وقت مقرر کر دیا جائے وہ اس کی اجل کہلاتا ہے (غ) یہاں مراد عورت کی عدت ہے۔ یہاں سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک طلاق ایک ہی ہے کیونکہ اس میں رجوع کا اختیار باقی ہے ورنہ عدت گزرنے کو ہو تو روک رکھنا بے معنی ہے۔

عورت کو خاوند کی طرف سے دکھ ہو تو قاضی طلاق دلوا سکتا ہے

دوسری بات جو اس آیت سے ظاہر ہے یہ ہے کہ عورت کو دکھ دینے کے لئے روک رکھنا ناجائز ہے پس وہ تمام حالات جن میں عورتوں کو محض دکھ دینے کے لئے روک رکھنا ثابت ہو ایسے ہیں کہ قرآن شریف کے ماتحت قاضی طلاق دلوا سکتا ہے۔ کثرت سے ایسے واقعات ہیں کہ جن میں خاوند یہ کہہ کر عورتوں کو معلقہ چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم نہ تمہیں طلاق دیں گے نہ بسائیں گے۔ یہ قرآن شریف کے ساتھ ہنسی ہے جیسا کہ اس آیت میں صاف فرمایا۔

ع ۳۰

مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے متعلق احکام

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا ۲۳۲

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو انہیں (اس بات سے)[۳۰۱] مت روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں جب

تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

آپس میں پسندیدہ طور پر راضی ہوں اسکے ساتھ تم میں سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتا

الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۞ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ ۲۳۳

ہے۔ یہ تمہارے لئے بہت پاکیزگی اور بہت صفائی (کی بات) ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے [۳۰۲] اور مائیں اپنی اولاد کو پورے

اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ

دو سال دودھ پلائیں اس کیلئے جو دودھ پلانے کے زمانہ کو پورا کرانا چاہتا ہے اور جس کا بچہ ہے اس پر اچھے طور پر ان کا کھانا اور

كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ

ان کا کپڑا ہے کسی شخص پر بوجھ نہیں ڈالا جاتا مگر جہاں تک اس کی طاقت ہو نہ ماں کو اپنے بچہ کی وجہ سے تکلیف دی جائے نہ باپ کو اپنے بچہ

بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ

کی وجہ سے اور وارث پر بھی ایسی ہی (ذمہ داری) ہے پھر اگر وہ دونوں آپس کی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں

عضل — ع[۳۰۱] تعضلوھن۔ عَضَل کے اصل معنی ہیں عَضَلَۃ (سخت گوشت جو پٹھے میں ہوتا ہے) کے ساتھ باندھنا اس لئے سختی کے ساتھ روکنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ)۔

زکی اور اطہر — ازکی۔ اطہر۔ زکا کے معنی میں برکت اور نشوونما کا خیال غالب ہے۔ اور طہر کے معنی میں نجاست وغیرہ مانع ترقی اشیاء سے پاک ہونا دیکھو ع۶۲ و ع۲۰۵۔

طلاق میں عدت گزرنے پر پہلے خاوند اور بیوی کا نکاح جائز ہے — جس طرح طلاق کے بعد عدت کے اندر رجوع کا حق حاصل ہے اسی طرح عدت گزر جانے پر پھر اسی خاوند اور بی بی کا نکاح بھی جائز ہے۔ چنانچہ یہی معنی حضرت ابن عباس سے مروی ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت ایسے شخص کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جو اپنی بی بی کو ایک بار یا دو بار طلاق دے چکا ہو۔ پھر اس کی عدت گزر جائے تب وہ یہ چاہے کہ پھر اس سے نکاح کرے۔ صحیح بخاری میں معقل بن یسار کا واقعہ بھی اسی معنی کی وضاحت کرتا ہے۔ معقل کی ہمشیرہ کو ان کے خاوند نے طلاق دیدی جب اس کی عدت گزر گئی تو پھر دوبارہ اس سے نکاح کی خواہش ظاہر کی معقل نے انکار کیا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی تو معقل نے اپنی ہمشیرہ کا نکاح پہلے خاوند سے کر دیا۔ بی بی رضامند تھی۔

تین طلاقوں کا عدم جواز — یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ اکٹھی تین طلاقیں ناجائز ہیں کیونکہ طلاق کے بعد جو میاں بی بی کو پھر دوبارہ نکاح کر لینے کی اجازت اس آیت سے ملتی ہے وہ اکٹھی تین طلاقوں سے باطل ہو جاتی ہے اور اس کو جو ازکی اور اطہر کہا تو یہ بھی ظاہر ہے کیونکہ اس کے خلاف کر کے حلالہ کا گند قبول کرنا پڑا۔

ارضع۔ استرضع — ع[۳۰۲] یرضعن۔ تسترضعوا۔ اَرْضَعَ دودھ پلایا اور اِسْتَرْضَعَ دودھ پلانے والی کو رکھا۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ

اور اگر تم چاہتے ہو کہ اپنی اولاد کیلئے (اور) دودھ پلانے والی رکھ لو تو تم پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ جو تم نے دینا تھا عمدگی

اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

سے پورا دیدو اور اللہ کا تقویٰ کرو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے ؁۳۰۲

مضادۃ — تضارّ۔ گو باب مفاعلہ ہے مگر اس باب میں بعض وقت ایک ہی مراد ہوتا ہے پس اس کے معنی ضرر پہنچانا ہی ہیں +

وعلی الوارث۔ عطف ہے وعلی المولود له پر اور وارث سے مراد باپ کا وارث ہے یعنی باپ مرگیا ہو تو کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری اس کے وارث پر ہے +

فصال — فصالاً۔ فصل ایک چیز کو دوسری سے علیحدہ کرنا اور فِصال بچہ کو دودھ پینے سے علیحدہ کرنا ہے +

تشاور۔ مشورۃ — تشاور۔ اس کا اصل شِرْتُ الْعَسَلَ سے ہے یعنی میں نے شہد نکالا پس تشاوُر اور مَشْوَرَۃ کے معنی ہیں بات کو ایک دوسرے کی طرف لوٹا کر استخراج رائے کرنا یعنی رائے کا نکالنا (غ) +

طلاق کے مسائل میں اولاد کو دودھ پلانے کا سوال بالخصوص پیدا ہوتا ہے۔ مگر مسئلہ عام طور پر بیان کر دیا ہے گو روٹی

دودھ پلانے کی مدت — اور کپڑا بوجہ دودھ پلانے کے دینا صاف بتاتا ہے کہ اصل ذکر مطلقہ عورتوں کا ہی ہے۔ دودھ پلانے کی مدت دو سال بیان فرمائی۔ مگر یہ حکم نہیں کہ ضرور اس عمر تک دودھ پلایا جائے کیونکہ خود اس آیت میں ہی فرمایا کہ اگر دونوں چاہیں تو دو سال سے پہلے دودھ چھڑا دیں۔ جیسے کہ مجاہد سے یہ معنی مروی ہیں دو سال کی مدت دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ ہے اور دودھ پلانے سے جو حرمت رشتوں کی پیدا ہوتی ہے یہ اس کی میعاد ہے۔ دو سال سے زیادہ کے بچے کو دودھ پلانے سے حرمت پیدا نہیں ہوتی گویا ضمناً یہاں اس طرف اشارہ کر دیا ہے +

اور دوسری جگہ جو فرمایا وحمله وفصاله ثلثون شهرا جس میں حمل اور دودھ چھڑانے کی میعاد اڑھائی سال قرار دی ہے تو یہ اس کے خلاف نہیں اس لئے کہ ادنیٰ مدت حمل چھ ماہ ہے اور اس لئے بھی کہ وہاں ماں کی تکلیف کا ذکر ہے اور حمل کا بوجھ چوتھے مہینہ میں ہی شروع ہوتا ہے۔ اور یوں حمل کی تکلیف چھ ماہ اور دودھ پلانا دو سال کل اڑھائی سال ہوئے +

تسلیم — ؁۳۰۲ سلمتم۔ تَسْلِیم کا مادہ بھی اِسْلام کی طرح سَلْم ہے اور سَلْم اور سَلَامَة ظاہری اور باطنی آفات سے محفوظ ہونا ہے (غ)۔ اور سَلَّمَ کے معنی وقاہ ہیں یعنی اسے بچایا (ت)، جیسے ولکن الله سَلَّم (الانفال ۸ - ۴۳) اور سلمته الیه کے معنی ہیں میں نے اس کو دیدیا (ت)، اور یہی معنی سَلَّمْتُم کے یہاں ہیں اور تَسْلِیم اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر راضی رہنے کو بھی کہتے ہیں۔ اور حکم کی پوری پوری فرمانبرداری کو بھی۔ جب اس پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے (ت)، جیسے ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (النساء ۴ - ۶۵) اور تسلیم سلام کہنے کو بھی کہتے ہیں اور وہ دعا ہے کہ ایک شخص اپنے دین اور نفس میں آفات سے بچا رہے (ت)، فاذا دخلتم بیوتا فسلموا علی انفسکم (النور ۲۴ - ۶۱) +

ما اٰتیتم — اٰتیتم۔ ایتاء کے اصل معنی دینا ہیں۔ ما اٰتیتم سے مراد عورت کا مہر ہے دیکھو ؁۲۹۶ خواہ دیدیا ہو یا ابھی دینا ہو مراد یہ ہے کہ کسی دوسری دودھ پلانے والی کے رکھنے سے مطلقہ کے حقوق میں کوئی کمی نہ ہو یا اس کے مہر کا کوئی حصہ واپس نہ لیا جائے +

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ ۲۳۴

اور تم میں سے جن کی وفات ہو جائے اور وہ بیبیاں پیچھے چھوڑیں وہ اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن

وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

انتظار میں رکھیں پھر جب اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے بارہ میں پسندیدہ طریق پر کریں

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ ۲۳۵

اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے ۳۰۳ اور اس کیلئے تم پر کوئی گناہ نہیں جو تم اشارۃً (بیوہ) عورتوں کو پیغام نکاح دو

اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ

یا اپنے دلوں میں چھپا رکھو اللہ جانتا ہے کہ تم ان کا خیال کرو گے لیکن ان سے خفیہ وعدہ مت

سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ

کرو ہاں پسندیدہ بات بیشک کہو اور نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو یہاں تک کہ مقرر کیا ہوا وقت اپنی انتہا

اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

کو پہنچ جائے اور جان لو کہ اللہ اسے جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے پس اس سے خبردار رہو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا بردبار ہے ۳۰۴

وفی۔ توفیۃ — استیفاء — توفّی

۳۰۳ یتوفون۔ مادہ وفی جس کے معنی ہیں بلوغ التمام (غ) یعنی انتہا کو پہنچ جانا۔ وفی العہد اور اوفی کے معنی ہیں عہد کو پورا کیا اور توفیۃ کے معنی پورا دینا اور استیفاء کے معنی پورا لینا ہیں (غ) چنانچہ وفیت کل نفس ما کسبت۔ توفون اجورکم۔ توفی کل نفس میں وفی کے معنی (جو توفیۃ یعنی باب تفعیل سے ہے) پورا دیا ہے وقد عُبّر عن الموت والنوم بالتَّوَفِّي (غ) یعنی توفّی (باب تفعّل) سے مراد موت اور نیند ہے۔ اور موت اور نیند میں امر مشترک قبض روح ہے سو یہی معنی توفی کے ہیں اور اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ توفاہ اللہ کے معنی قبض روحہ ہی ہیں یعنی اس کی روح قبض کر لی نہ کچھ اور ۔

وذر

یذرون۔ مادہ وذر ہے۔ مگر اس سے ماضی نہیں آتی مضارع اور امر ہی آتے ہیں۔ اور اس کی مصدر بھی استعمال میں نہیں آتی بلکہ اس کی جگہ لفظ ترک استعمال کرتے ہیں جو اس کے ہم معنی ہے یعنی چھوڑ دینا ۔

کچھ مسائل طلاق کا ذکر ابھی باقی ہے اور درمیان میں تعلق دکھانے کے لئے بیوہ عورتوں کا ذکر کر دیا ہے۔ اور کچھ ذکر بیوہ عورتوں کا پھر بعد میں آئیگا۔

بیوہ کی عدت — بیوہ کا نکاح

بیوہ کی عدت چار ماہ اور دس یوم ہے لیکن حمل ہو تو اس کی عدت دوسری جگہ مذکور ہے اور وہ وضع حمل تک ہے خواہ چار ماہ سے کم ہو یا زیادہ (الطلاق ۶۵-۴) اپنے بارہ میں پسندیدہ طریق سے کچھ کرنے سے مراد یا نکاح ہے یا نکاح کی غرض سے زینت وغیرہ کرنا۔ یہاں بیوہ عورت کے نکاح کرنے کو امر معروف قرار دیا گیا ہے جو مسلمان ہندوؤں کی طرح اس سے عار کرتے ہیں وہ قرآن کریم کے صریح حکم کے خلاف کرتے ہیں۔ فیما فعلن میں فعل کو خود ان کی طرف منسوب کرنے میں اشارہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے نکاح کی خود مختار ہیں ۔

تعریض

۳۰۴ عرضتم بعض سے ہے تعریض ذو وجہین کلام کو کہتے ہیں جو صدق پر بھی محمول ہو سکتی ہو اور کذب پر بھی یا ظاہر پر بھی

۲۳۶ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ

تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دیدو (حالانکہ) ابھی تم نے انکو چھوا نہ ہو نہ مہر مقرر کیا ہو اور انکو کچھ سامان دو

عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۝

فراخی والا اپنی قدر کیمطابق اور تنگدست اپنی قدر کے مطابق پسندیدہ طور پر نفع پہنچانا (چاہئے) یہ نیکی کرنے والوں پر ایک حق ہے[۳۰۵]

ع ۱۵ — مطلقہ اور بیوہ سے احسان۔

محمول ہو سکتی ہو اور باطن پر بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر لفظوں میں پیغام نہ دے کہ میں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں البتہ ایسے لفظ کہے جیسے یہ کہ تم جمیلہ ہو یا مرغوب ہو جس سے اشارہ پایا جاتا ہو تو حرج نہیں۔ اور یہ حکم صرف ایام عدت کیلئے ہے ✦

خُطبة۔ خِطبة

خِطبة۔ خَطَب کلام میں مراجعت کو کہتے ہیں۔ اور خُطبة وہ کلام ہے جس میں وعظ ہو اور خِطبة وہ جس کا مقصد نکاح کے لئے عورت سے درخواست کرنا ہو (غ) ✦

کن۔ اکنان — مکنون — اکنان۔ اکنة

اکننتم۔ کِنّ وہ ہے جس میں ایک شے کی حفاظت کی جائے۔ اور اس کی جمع اکنان ہے وجعل لکم من الجبال اکنانا (النحل ۱۶-۸۱) اور کَنَنْتُ کے معنی ہیں کِنّ میں کر دیا یا محفوظ کر دیا۔ جیسے لؤلؤ مکنون (الطور ۵۲-۲۴) بیض مکنون (الصّٰفّٰت ۳۷-۴۹) کتاب مکنون (الواقعة ۵۶-۷۸) اور اَکْنَنْتُ دل میں چھپانے سے مخصوص ہے۔ وجعلنا علی قلوبہم اکنة ان یفقہوہ۔ (الانعام ۶-۲۵۔ بنی اسرائیل ۱۷-۴۶۔ الکہف ۱۸-۵۷) میں اور قلوبنا فی اکنة (حم السجدة ۴۱-۵) میں اَکِنّة کِنان کی جمع ہے اور وہ وہ پردہ ہے جس میں ایک چیز چھپائی جائے (غ) ✦

ذکر

ستذکرونہن۔ ذِکر کے ایک معنی کسی چیز کا خیال دل میں کرنا بھی ہیں (غ) ✦

کتاب

کتاب۔ یہاں بمعنی ما کُتِبَ ہے اور کُتِبَ کے معنی فُرِضَ ہیں کیونکہ کتاب کے معنی فرض کر دینا بھی آتے ہیں۔ اور مراد عدت ہے جو فرض کی گئی ہے ✦

عدت میں بیوہ کو پیغام

بیوہ کی عدت کے اندر نہ اس سے صراحتاً نکاح کا ذکر کرنا جائز ہے نہ نکاح کا فیصلہ کرنا اشارہ کے طور پر جتا دینا جائز ہے ✦

مس

۳۰۵ تمسوھن۔ مَسّ چھونا اور کنایۃً عورت کے پاس جانے پر بولا جاتا ہے (غ)

فرض۔ فریضة — او

تفرضوا۔ فریضة۔ چونکہ کسی چیز پر عمل واجب کر دینا بھی فرض ہے دیکھو ۲۵۳ پس فریضة وہ مہر ہے جو واجب کر دیا گیا اور تفرضوا اس کے مقرر کرنے پر کہا گیا ہے اَوْ تفرضوا میں اَوْ بمعنی و یا حتی ہے ✦

متاع

متعوھن۔ متاع ایک لمبے وقت تک نفع پہنچانا ہے۔ یہاں مراد اس سے وہ چیز ہے جس سے مطلقہ اپنی عدت میں فائدہ اُٹھائے ✦

قتر — مقتر

مُقْتِر۔ قَتْر۔ اِسراف کے مقابل پر ہے تھوڑا خرچ کرنے کو کہتے ہیں جیسے لم یسرفوا ولم یقتروا (الفرقان ۲۵-۶۷) کان الانسان قتورا (بنی اسرائیل ۱۷-۱۰۰) یعنی بخیل اور مقتر تنگدست کو کہتے ہیں اور قَتَر دھوئیں کو کہتے ہیں جو بھنے ہوئے گوشت یا لکڑی وغیرہ سے اُٹھتا ہے اور وہ بھی ایک قلیل یا غیر نافع چیز ہوتی ہے (غ) ✦

طلاق قبل از تقرر مہر — نکاح بغیر تقرر مہر

یہاں اس حالت کا ذکر ہے جب میاں بی بی میں خلوت نہیں ہوئی بلکہ مہر بھی مقرر نہیں ہوا۔ (اس سے معلوم ہوا کہ اگر مہر مقرر نہ ہوا ہو تو نکاح باطل نہیں ہوتا البتہ خلوت سے پہلے مہر کا مقرر ہو جانا یا دیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ہے) اس صورت میں اگر طلاق دینے کی ضرورت پیش آئے تو مہر نہیں دیا جائے گا (اور عدت بھی کوئی نہیں جیسے دوسری جگہ مذکور ہے یعنی عورت کا نکاح دوسری جگہ فوراً طلاق کے بعد ہو سکتا ہے) لیکن ایسی صورت میں بھی کچھ سامان دینا ضروری

۲۳۷ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً

اور اگر تم ان کو طلاق دیدو اس سے پہلے کہ تم نے انکو چھوا ہو اور تم ان کے لئے مہر مقرر کر چکے ہو

فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ

تو اس کا آدھا (دیدو) جو مقرر کیا ہے مگر یہ کہ وہ معاف کردیں یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (اپنا حق) معاف کرے

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

اور یہ کہ تم (مرد) معاف کرو تقویٰ سے بہت نزدیک ہے اور آپس میں نیک سلوک کرنا نہ چھوڑو بیشک جو تم کرتے ہو اللہ اسے

۲۳۸ بَصِيْرٌ ○ حٰفِظُوْا عَلَي الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۤ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ○

دیکھتا ہے ع۳۰۶ تم اپنی نمازوں اور وسط کی نماز کی محافظت کرو اور اللہ کے فرمانبردار بن کر کھڑے ہو جاؤ ع۳۰۷

ہے وہ رقم حالات کے لحاظ سے ہوگی امیر کے لئے زیادہ غریب کے لئے کم خواہ انسان خود دیدے یا حاکم مقرر کردے یہ محسنوں یا نیکی کرنے والوں پر بالخصوص ایک حق ہے اور گویا عورت کی دلشکنی کے لئے ایک معاوضہ ہی لکھا ہے کہ نبی کریم صلعم چونکہ طلاق دینے سے بہت کثرت سے روکتے تھے اس لئے لوگوں کو گمان ہوا کہ ایسی صورت میں تو طلاق ناجائز ہوگی تو یہ آیت اُتری کیونکہ فی الواقع حالات انسانی کے بیحد اختلافات میں ایسی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے +

(آنحضرتؐ کا طلاق سے کثرت روکنا)

ع۳۰۶ الذی بیدہ عقدۃ النکاح۔ چونکہ طلاق دینے یا عقدہ نکاح کو کھولنے کا مجاز خاوند ہے اس لئے اس سے مراد خاوند ہی ہے اور یہی تفسیر نبی کریم صلعم سے مروی ہے (ث۔ج) +

(عقدۃ النکاح)

الفضل۔ وہ عطیہ جس کا دینا دینے والے پر لازم نہیں دیکھو ع۱۳۷ پس یہاں فضل ترک نہ کرنے سے مراد ہوئی ایسے عطایا کا دینا جس کو ہماری زبان میں سلوک کرنا کہتے ہیں +

(فضل)

خلوت نہیں ہوئی اور مہر مقرر ہو چکا ہے تو طلاق پر نصف مہر ادا کرنا ہوگا۔ لیکن اس صورت میں عورت کو اختیار ہے کہ بغیر خلع کے بھی چاہے تو مہر چھوڑ سکتی ہے لیکن زور اسی بات پر دیا ہے کہ رعایت حقوق یہ چاہتی ہے کہ مرد ہی اپنا حق معاف کریں یعنی اس صورت میں نصف نہیں بلکہ پورا مہر دیدیں جیسا جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک بی بی سے نکاح کیا اور قبل خلوت کے طلاق دیدی تو سارا مہر ادا کیا اور فرمایا کہ مجھ پر زیادہ حق ہے کہ میں اپنے حق کو چھوڑ دوں +

(طلاق قبل از خلوت جب مہر مقرر ہو چکا ہو)

ع۳۰۷ حافظوا۔ باب مفاعلہ سے ہے۔ مفردات میں ہے کہ باب مفاعلہ کے استعمال میں یہ تنبیہ ہے کہ نماز پڑھنے والے نماز کی حفاظت کرتے ہیں اس کے اوقات کو نگاہ رکھتے ہوئے اور اس کے ارکان کی رعایت کرتے ہوئے اور پورے زور کے ساتھ اس کے قیام میں کوشش کرتے ہوئے اور نماز ان کی حفاظت کرتی ہے۔ وہ حفاظت جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز بیحیائی اور بدی سے بچاتی ہے ان الصلوٰۃ تنہٰی عن الفحشاء والمنکر (العنکبوت ۲۹۔ ۴۵) +

(محافظۃ)

الوسطیٰ۔ وسط کا استعمال کبھی مکان کو لحاظ سے ہوتا ہے اور کبھی درجہ کے لحاظ سے یعنی جو چیز افراط و تفریط سے محفوظ ہو کر میانہ ہو (غ)، گویا اعلیٰ درجہ کی چیز پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور اس چیز پر بھی جو دوسری دو چیزوں کے درمیان ہو +

(وسطیٰ)

مسائل طلاق کے ذکر میں نماز کا ذکر بے ربط خیال کیا جاتا ہے۔ ذیل کے امور ربط بتاتے ہیں۔ اول اصل ذکر جنگ کا تھا اور

(مسائل طلاق کا ملجا کر نماز سے)

۲۳۹ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا

پھر اگر تم کو ڈر ہو تو پیدل یا سوار (جس طرح ہو نماز پڑھ لو) ۳۰۸

طلاق کے مسائل بھی اسی ذیل میں آئے تھے اور یہاں بھی بالخصوص جنگ کی نماز کا ذکر ہے۔ جیسے اگلی آیت سے ظاہر ہے دوئم طلاق کے مسائل میں بار بار تقویٰ کی ہدایت کی ہے۔ نماز تقویٰ اللہ کی کنجی ہے اس لئے اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر اس کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہے۔ سوئم۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ نکاح طلاق وغیرہ سب فروعی مسائل ہیں۔ اصل جڑ نیکیوں کی نماز ہے پس تعلقات دنیوی میں پھنس کر ذکر الٰہی سے غافل نہیں ہو جانا چاہئے۔

صلوٰۃ وسطیٰ نماز عصر ہے — الصلوٰۃ الوسطیٰ کے متعلق بہت بحث ہوئی ہے۔ بخاری میں نبی کریم صلعم سے مروی ہے حبسونا عن الصلوٰۃ الوسطیٰ حتیٰ غابت الشمس یعنی (خندق کے دن کفار نے) ہمیں وسطیٰ کی نماز سے روک رکھا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے نماز عصر کو صلوٰۃ وسطیٰ فرمایا ہے یہ بلحاظ وقت بھی درمیان میں ہے اور بلحاظ مرتبہ بھی اعلیٰ وجہ کی ہے کیونکہ کاروبار کا وقت ہی یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازیں پانچ ہیں کیونکہ صلوات جو جمع ہے تین یا زائد پر بولا جائیگا مگر ایک نماز کے وسط میں ہونے کیلئے تعداد جفت چاہئے یعنی کم از کم چار نمازیں اور ہونی چاہئیں۔

نماز کی تعداد پانچ ہے

راکبا۔ رکوب — ۳۰۸ رکبانًا۔ رُکبان۔ راکب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں سوار اور رُکُوب اصل میں حیوان کی پیٹھ پر چڑھنے کا نام ہے اور پھر ہر سواری پر بولا جاتا ہے جیسے کشتی یا ریل۔ رجالًا۔ رجال۔ رَجِل یا راجل کی جمع ہے جسکے معنی پیادہ چلنے والا۔ کیونکہ رِجل پاؤں کو کہتے ہیں۔

راجل۔ رَجِل

حالت خوف میں نماز — جب نماز کی حفاظت کے لئے تاکید فرمائی تو یہ بھی بتا دیا کہ نماز ترک کسی صورت میں نہیں ہو سکتی یہاں تک کہ کسی قسم کا خوف ہو۔ دشمن کا خوف ہو یا کوئی اور مثلاً یہی کہ انسان ریل پر سوار ہے اور خوف ہے کہ اتر کر نماز پڑھے تو ریل چلی جائے تو فرمایا کہ حالت خوف میں بھی نماز ترک نہ کرو ہاں جس حالت میں ہو اسی حالت میں پڑھ لو۔ یہاں تک کہ اگر انسان پیدل چل رہا ہے اور ٹھہرنے میں خوف ہے تو اسی حالت میں نماز پڑھ لے اور گھوڑے یا گاڑی یا کشتی یا ریل پر سوار ہے تو اسی حالت میں پڑھ لے۔ مگر نماز ترک نہ کرے۔ کتنے مسلمان ریل میں سفر کرتے ہیں اور بالکل فارغ ہوتے ہیں مگر نماز نہیں پڑھتے۔ جو حکم اس قدر موکد تھا اس کی آج کیا گت بنی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک نماز سے بڑھ کر غیر ضروری چیز ہی کوئی نہیں۔

خوف میں نماز باجماعت — دشمن سے خوف کی حالت بھی یہاں آ جاتی ہے۔ گو سورۃ النساء ۴: ۱۰۱ میں دشمن کے فتنہ کا صریح الفاظ میں ذکر ہے مگر ان دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں پھر بھی جمع ہو کر نماز پڑھنے کی صورت باقی ہے۔ یہاں ایسی صورت نہیں جس سے معلوم ہوا کہ یہ خوف اس سے بھی زیادہ ہے۔ بالفاظ دیگر جب تک دشمن سے خوف کی صورت میں اجتماع کی حالت میں نماز پڑھنا ممکن ہو سورۃ النساء کی آیت ۱۰۱ کے مطابق پڑھی جائے اگر اس طرح ممکن نہ ہو تو پھر جس طرح انسان پڑھ سکے پڑھے۔ پیدل چلتا ہوا۔ سوار سواری کی حالت میں۔ اسی کی تائید میں بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر کے الفاظ ہیں جو اس حدیث کے آخر میں جس میں ایک ایک رکعت نماز باجماعت پڑھنے کا اور دوسری اپنی جگہ پوری کرنے کا ذکر ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو تو پھر پیدل یا سوار قبلہ کی طرف یا غیر قبلہ کی طرف جس طرح ہو نماز پڑھ لو۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ ۲۴۰

پھر جب امن میں ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے ۳۰۹۔ اور تم میں سے جن کی وفات ہو جائے

امن

ع ۳۰۹ امنتم ۔ امن کے اصل معنے ہیں خوف کا جاتے رہنا اور اطمینان نفس یعنی بے آرامی کے بعد سکون کا ملنا (غ) ✦

نماز ذکر اللہ کی بہترین صورت ہے ۔

اذکروا اللہ ۔ ذکر کے معنی کے لئے دیکھو ۱۹۱ ع اللہ کی یاد یا اللہ کی ثناء کو یہاں نماز کے قایم مقام رکھا ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی اصطلاح میں نماز ہی اللہ تعالیٰ کے ذکر کی اعلےٰ سے اعلیٰ صورت ہے ✦

اہل قرآن کی غلطی

جب خوف کی حالت کا ذکر کیا کہ اس میں جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو تو ساتھ ہی امن کی نماز کا بھی ذکر فرمایا کہ پھر وہ اس تعلیم کے مطابق ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہے جس سے معلوم ہوا کہ امن میں نماز کی صورت اللہ تعالیٰ اس سے پہلے مسلمانوں کو سکھا چکا تھا۔ مگر تعجب ہے کہ جو لوگ اہل قرآن کہلاتے ہیں وہ اس ارشاد خداوندی کے صریح خلاف نماز خوف سے نماز امن کے احکام کا قیاس کرتے ہیں ۔ حالانکہ نماز تو مکہ میں ہی فرض ہوئی تھی جہاں بہرحال اس قسم کا خوف دشمن سے کوئی نہ تھا ۔ اور یہ ناممکن ہے کہ نماز کی فرضیت تو مکہ میں ٹھہرائی گئی ہو لیکن یہ نہ بتایا گیا ہو کہ وہ نماز کس طرح ادا کرنی ہے بلکہ اس کے لیے مسلمانوں کو اس وقت تک انتظار کرنا تھا جب جنگ شروع ہو جائیں اور پھر خدائے تعالیٰ نماز خوف کی صورت بتائے تب وہ اس سے نماز امن کا قیاس کریں لیکن اس آیت نے فیصلہ کر دیا۔ کیونکہ فرمایا کہ نماز امن تو ہم تم کو سکھلا چکے ہیں مگر اس کی تفصیلات تو قرآن شریف میں موجود نہیں ۔ پس ثابت ہوا کہ یہ تعلیم اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی خفی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی

وحی خفی سے نماز کا سکھایا جانا

اور آپ نے آگے لوگوں کو یہ تعلیم دی ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کو اللہ تعالیٰ کا اپنی طرف منسوب کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہ بھی وحی الٰہی سے تھی ۔ مگر چونکہ وہ وحی متلو قرآن شریف میں تو ہے نہیں اس لئے اسے وحی خفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ بہرحال یہ خدا کی وحی سے تھا۔ وحی کی اقسام کے لئے دیکھو الشوریٰ ۴۲ ۔ ۵۱ ✦

نماز کی تفصیلات قرآن میں بزنگ اشارہ

اور اگر یہ کہا جائے کہ اشارات کے رنگ میں نماز کی رکعات ارکان وغیرہ کا ذکر قرآن شریف میں پہلے بھی ہو چکا تھا۔ تو اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن ان اشارات سے کوئی شخص نماز کی ایک صورت قایم نہیں کر سکتا اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشا ہوتا کہ نماز کی ساری تفصیلات کو قرآن کریم میں ہی بیان فرما دے تو جس طرح روزوں کا ذکر ایک جگہ کر دیا ۔ طلاق وغیرہ کے احکام کا ذکر ایک جگہ کر دیا ۔ اور ان باتوں کو اشاروں پر نہیں چھوڑا اسی طرح نماز اس کے ارکان اس کی رکعات اس کے اوقات اس کی ترتیب کا بھی ذکر بصراحت ایک جگہ کر دیتا ۔ اور یا اگر اشارات ہی دینے تھے تو باقی احکام کے متعلق بھی اشارات ہی ہوتے ۔ حالانکہ اگر دوسرے احکام اشارات میں بھی ہوتے تو حرج نہ تھا وہ فروعی امور تھے ۔ اور نماز کو تو عملی رنگ میں اصول دین میں سے قرار دیا ہے ۔ اور یہ ہر مومن کو روزانہ پانچ وقت پڑھنی ضروری ہے اور کوئی حکم ایسا نہیں جس کا اس قدر تعلق ہر انسان کی زندگی سے ہو کہ بار بار روز دوہرایا جائے پس حق یہی ہے کہ نماز کی اصل ہیئات چونکہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں اور اس کی تفصیلات بہت بسط کی محتاج تھیں ۔ اس لئے ان تمام باتوں کو اپنی وحی خفی سے نبی کریم صلعم پر ظاہر کر کے تمام اُمت کو اس طریق پر تعلیم دیدی ۔ اور پھر یہ بھی بتا دیا کہ یہ نماز ہماری سکھائی ہوئی نماز ہے محمد رسول اللہ صلعم کی تجویز کردہ نہیں ہے ✦

وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ

اور وہ بیبیاں پیچھے چھوڑیں اپنی بیویوں کیلئے سال تک فائدہ اٹھانے کی (گھر سے) نکالے بغیر وصیت کریں۔

فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ ۗ

پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں جو انہوں نے بھلائی سے اپنے حق میں کیا ہے

وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ ۲۴۱

اور اللہ غالب حکمت والا ہے ۳۱۰ اور طلاق دی ہوئی عورتوں کو پسندیدہ طور پر فائدہ پہنچانا چاہیئے یہ متقیوں پر ایک حق ہے

---

۳۱۰ وصیۃ یصب کی تقدیر یوں ہے۔ یوصون وصیۃ یا کتب اللہ علیہم وصیۃ۔ اور ایک قرأت کتب علیکم الوصیۃ ہے جو اس کی موید ہے۔

اس آیت کے معنی ایسے صاف ہیں کہ اس کو منسوخ قرار دینے پر تعجب آتا ہے۔ اس رکوع کا اصل مضمون مطلقہ اور بیوہ عورتوں سے احسان ہے۔ پہلی اور آخری آیتوں میں مطلقہ کو متاع دینے یا اس کے ساتھ احسان کا حکم ہے اس میں بیوہ کو متاع دینے یا اس کے ساتھ احسان کا حکم ہے یہ قیاس کہ اس کو ورثہ کی آیت نے بیوہ کو حصہ وراثت دیکر منسوخ کر دیا اس لئے غلط ہے کہ جب مطلقہ کو مہر سے علاوہ متاع یا سامان دینے کا حکم ہی جیسا آگے آتا ہے تو بیوہ کو حصہ وراثت کے ساتھ متاع دینے کے حکم میں کیا حرج ہے مطلقہ کا متاع عدت تک کا خرچ ہے بیوہ کی حالت اس سے زیادہ بیکسی کی ہوتی ہے اسلئے اسکو عدت سے کچھ زیادہ متاع کا حکم دیا اور اسکی وجہ یہ بھی ہے کہ ممکن ہے حمل ہو تو اس صورت میں نو دس ماہ حمل کے اور ایک دو ماہ بعد تکلیف کے کل ایک سال بن جاتا ہے اور مطلقہ کیلئے بھی تو حکم ہے کہ اگر حمل ہو تو وضع حمل تک اسکے اخراجات برداشت کئے جائیں (۶۵ الطلاق ۶)

اسی طرح یہ آیت آیت ۲۳۴ کے مضمون کے بھی خلاف نہیں کیونکہ وہاں بیوہ کی عدت چار ماہ دس یوم بتائی ہے تو یہاں عدت کو منسوخ نہیں کیا بلکہ یہاں متاع کا ذکر ہے جو بیوہ کو دیا جائیگا ہاں یہ سچ ہے کہ وہ متاع اسی صورت میں ہے جب بیوہ نکاح نہ کرے کیونکہ جب نکاح کریگی تو پھر اس کا دوسرا کفیل پیدا ہو جائیگا۔ اسی لئے اس آیت میں صاف فرما دیا ہے کہ اگر بیوہ عدت پوری کر کے خود نکل جائے اور نکاح کرے تو پھر اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔ فی ما فعلن فی انفسہن من معروف میں صاف نکاح کی طرف اشارہ ہے پس وصیت صرف عورت کی ضرورت کیلئے ہے۔ اگر اس کو ضرورت نہیں تو وہ اختیار رکھتی ہے کہ اس سے فائدہ نہ اٹھائے۔

رہا یہ کہ احادیث میں اس آیت کی منسوخی کا ذکر ہے تو ساتھ ہی اس کی عدم منسوخی کا بھی ذکر ہے۔ اول تو جب تطبیق ممکن ہوگئی تو خواہ کسی صحابی کا بھی قول ہو کہ یہ آیت منسوخ ہے وہ روایت صحیح نہیں مانی جائیگی اور اگر اس کو صحیح مانا جائے تو صحابی کی غلط فہمی ہو سکتی ہے دوسرے جب دو متضاد اقوال موجود ہوں تو کیا وجہ ہے کہ منسوخی کے قول کو صحیح مانا جائے اور غیر منسوخی کے قول کو صحیح نہ مانا جائے چنانچہ جہاں ابن زبیر کا قول منسوخی کے متعلق ہے وہیں بخاری میں مجاہد کا قول غیر منسوخی کا موجود ہے جو فرماتے ہیں کہ پہلے آیت ۲۳۴ نازل ہوئی اور وہ عدت اس کے خاوند کے اہل کے نزدیک گنی جاتی تھی فانزل اللہ والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیۃ لازواجہم متاعا الی الحول غیر اخراج یعنی اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی پس جب یہ آیت بعد میں نازل ہوئی تو اس کا منسوخ ہونا بے معنی ہے۔ پھر اس کا نزول ہی بے معنی ہے کیونکہ جس آیت کو ناسخ کہا جاتا ہے وہ پہلے نازل ہو چکی تھی۔ پھر مجاہد نے صاف الفاظ میں اسے غیر منسوخ بھی قرار دیا ہے جس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ محض عورت کو اختیار دیا گیا ہے وہ چاہے اس سے فائدہ اٹھائے چاہے نہ اٹھائے۔ پس یہ منسوخ کیونکر ہوئی۔ بلکہ نسخ کے قول کو لا کر پھر عدم منسوخی کے دلائل لانے سے امام بخاری نے اپنا مذہب بھی عدم نسخ کا ہی ظاہر کیا ہے۔

اور حدیث لا وصیۃ لوارث بھی جو خود احادیث میں سے ہے قرآن کریم کی اس صریح تعلیم کی ناسخ نہیں ہو سکتی بلکہ خود اس حد بندی

ع ۳۲ — قوم کی زندگی کیلئے ضرورت جنگ

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا ۲۴۲ ۲۴۳

اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے لئے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو ۳۱۲ کیا تو نے ان کے حال پر غور نہیں کیا جو

مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ

موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل پڑے اور وہ ہزاروں تھے پس اللہ نے ان کو فرمایا کہ تم مر جاؤ پھر ان کو زندہ کیا

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

یقیناً اللہ لوگوں پر بڑے فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ۳۱۲

کے ماتحت مانی جانے گی جو قرآن شریف نے یہاں کردی یعنی بیوہ کے لئے ایک سال تک نان ونفقہ اور مکان کی وصیت جائز ہے البتہ تعالٰی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم کے رنگ میں نہیں بلکہ محض سفارش کے رنگ میں فرمایا گیا ہے یا اجازت کے رنگ میں کہ اگر خاوند ایسی وصیت کرے تو جائز ہے ٭

۳۱۱ ان آیات سے ثابت ہے کہ ہر قسم کی مطلقہ عورتوں کو سامان دینا چاہئے اور یہ مزید بطور احسان ہے۔ جو لوگ خاوند کے حقوق کی پوری رعایت کرنے والے ہیں ان پر یہ بھی ایک حق ہے۔ اسلئے فرمایا حقاً علی المتقین ٭

المرتر — رویۃ

۳۱۲ المرتر تعجب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس واقعہ پر استعمال ہوتا ہے جو کمال شہرت حاصل کر چکا ہو اور مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ مخاطب اس امر پر غور کرے کیونکہ رؤیت جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے کئی طرح پر ہے۔ آنکھ سے۔ تخیل سے۔ فکر سے عقل سے اور لکھا ہے کہ صلہ الیٰ ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ایسی نظر جس سے اعتبار یعنی غور کرنا مقصود ہو۔ ابن جریر نے بھی اس کو رویۃ القلب ہی قرار دیا ہے ٭

دار۔ دیار

دیار۔ دار کی جمع ہے اور دار منزل کو کہتے ہیں یعنی جہاں کوئی شخص رہتا ہے ٭

الف الوف

الوف۔ اَلف کی جمع ہے جس کے معنی ہزار ہیں کیونکہ الف ایسے اجتماع کو کہتے ہیں جس میں اتحاد ہو۔ اور ہزار میں گویا اعداد کا اجتماع ہوتا ہے (غ) ابن زید اُلوف کو اِلف کی جمع قرار دیکر اس کے معنی مؤتلفی القلوب کرتے ہیں (د) یعنی ھم الوف کے معنی ہوئے وہ اجتماع و اتحاد کی حالت میں نکلے یا قوم کی قوم یا جماعت کی جماعت نکل پڑی ٭

بنی اسرائیل کا مصر سے خروج اور اس کا ذکر قرآن کریم میں

اصل مضمون ضرورت جنگ پر ہے۔ اگلی آیت میں یہ صراحت ہے اور سارے رکوع کا مضمون یہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی قوم تھی جو گھروں سے نکلی؟ مفسرین کہتے ہیں داوردان کے رہنے والے تھے طاعون سے بھاگ گئے تھے اللہ تعالٰی نے ان کو مار کر پھر زندہ کیا تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالٰی کی قضا و قدر سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ دوسرا قول ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک قوم تھی ان کے بادشاہ نے ان کو جہاد کی طرف بلایا انہوں نے انکار کیا خدا نے انہیں آٹھ دن تک مار کر پھر زندہ کیا۔ تاریخی ثبوت ان میں سے کسی کا نہیں۔ البتہ دوسری توجیہ مضمون رکوع کے مطابق ہے۔ مگر المرتر بتاتا ہے کہ یہ کوئی بڑا مشہور واقعہ ہے۔ اور یہ واقعہ جو مفسرین نے لکھا ہے نہ صرف غیر مشہور ہے۔ بلکہ اس کی اصلیت ہی کوئی نہیں۔ وہ واقعہ جس کی طرف قرآن کریم نے توجہ دلائی ہے کوئی مشہور تاریخی واقعہ ہونا چاہئے فی الحقیقت ایسا ہی ہے اور خرجوا کا استعمال اس کی تعیین کرتا ہے۔ کیونکہ ساری تاریخ میں خروج کا ایک ہی واقعہ ہے جس کو سب لوگ جانتے ہیں یعنی بنی اسرائیل کا خروج مصر سے جس کا ذکر حضرت موسیٰ کی کتاب میں ہے جس کا نام ہی خروج ہے قرآن کریم نے وہی لفظ خرجوا اختیار کرکے اس مشہور واقعہ کا صاف

۲۴۴ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۲۴۵ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ

اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۳۱۳ کون ہے جو اللہ کیلئے اچھا عمل کرے

قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ

تو وہ اسے اسکے لئے کئی گنا بڑھاتا ہو اور اللہ لیتا ہو اور بڑھاتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ۳۱۴

پتہ بتا دیا ہے۔ دوسری تعیین اس کی لفظ الوف سے ہوتی ہے کیونکہ بنی اسرائیل کے سوائے جن کی تعداد بائبل میں چھ لاکھ لکھی ہے ہزاروں کی تعداد میں اور کسی قوم کا خروج ثابت نہیں۔ الوف کے دوسرے معنی جماعت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بنی اسرائیل پر ہی صادق آتا ہے کیونکہ کتاب خروج میں ان کو بار بار جماعت کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اور یہ امر کہ یہ حضرت موسیٰ کے زمانہ کے بنی اسرائیل کا ذکر ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دو آیتیں چھوڑ کر جو اس مضمون کے متعلق ہیں پھر صاف الفاظ میں "موسے کے بعد کے بنی اسرائیل" کا ذکر کیا ہے۔ یہ تیسرا قرینہ ہے۔ اور چوتھا یہ کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ کے ساتھ نکل کر جنگ کرنے سے انکار کیا اور چالیس سال جنگل میں بھٹکتے رہے جو قومی موت تھی پس یہ جہاد کا انکار تھا اور یہی مضمون رکوع کا ہے ✦

آیت کے دوسرے الفاظ بھی اس مفہوم کے خلاف نہیں بلکہ موافق ہیں مصر کو جہاں سے بنی اسرائیل نکلے تھے دیارھم کہا اس لئے کہ چار سو سال سے وہاں ان کی بود و باش تھی بلکہ وہ تو ان کے لئے بمنزلہ وطن ہی تھا۔ الوف کی تشریح ہو چکی ہے حذر الموت موت کے خوف سے نکلے وہ موت فرعون کی غلامی تھی جو ان کو کمزور کرکے ادنیٰ اور بیگار کے کام لیکر ان کو ذلت کی موت مارنا چاہتا تھا۔ جعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃ منھم یذبح ابناءھم و یستحی نساءھم (القصص ۲۸: ۴) اور شروع سورۃ میں یسومونکم سوء العذاب آہی چکا ہے پس یقیناً وہ موت کے خوف سے نکلے تھے۔ تو پھر فقال لھم اللہ موتوا کس طرح ہوا؟ جب انہوں نے حضرت موسیٰ کے ساتھ ہو کر جنگ کرنے سے انکار کیا تو حکم ہوا۔ فانھا محرمۃ علیھم اربعین سنۃ یتیھون فی الارض (المائدۃ ۵: ۲۶) چالیس سال تک اس سرزمین وعدہ سے جو ان کی حیات قومی کا موجب ہونے والی تھی محروم کر دیئے گئے بیابان میں بھٹکتے رہے اور بائبل میں لکھا ہے کہ وہ نسل ہلاک ہو گئی گنتی ۱۴: ۲۹-۳۲ اور اس کے ساتھ ہی ہے کہ تمہاری دوسری نسل یعنی تمہارے بچے اس زمین میں داخل ہونگے۔ سو یہ ان کی موت تھی ثم احیاھم پھر ان کو زندہ کیا کیونکہ آخر کار وہ اس موعود سرزمین میں داخل ہوئے اور ایک بڑی قوم بنے۔ فاتح اور حکمران ہوئے اعلیٰ اخلاق سے متصف ہوئے۔ یہی قوم کی موت اور زندگی ہوتی ہے ✦

بنی اسرائیل کی موت اور زندگی۔

۳۱۳ بنی اسرائیل کے واقعات کے اندر مسلمانوں کو یہ حکم دینا بتاتا ہے کہ یہ ذکر کہانیوں کے طور پر نہیں بلکہ بتایا کہ تم بھی اگر خدا کی راہ میں جنگ کرنے سے انکار کرو گے تو موت وارد ہوگی۔ سو مسلمان جب غافل ہو گئے تو دوسری قوموں نے انہیں دبانا شروع کر دیا جس کا نتیجہ موجودہ موت ہے۔ نبی کریم صلعم کے صحابہ نے قرآن کریم سے فائدہ اٹھایا۔ اور جنگ کے موقعہ پر گو وہ بہت تھوڑے تھے اور دشمن بہت زبردست عرض کیا کہ ہم حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کی طرح نہیں کہتے بلکہ ہم آپ کے حکم کے ماتحت چلیں گے جہاں آپ لے جائیں ✦

تاریخ اسرائیل سے مسلمانوں کے لئے سبق

۳۱۴ یقرض۔ قرضا۔ قرض اصل میں ایک قسم کا کاٹنا یا قطع کرنا ہے۔ تقرضھم ذات الشمال (الکھف ۱۸: ۱۷) میں سورج کے غار کو سایہ میں چھوڑ کر آگے نکل جانے پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔ قرض جس کو ہماری زبان میں ادھار کہتے ہیں اس کے معنی ہیں وہ مال جو انسان کو دیا جائے اس شرط پر کہ اس کا بدل لوٹایا جائیگا (غ)، اس لئے اس کا استعمال ہر اس فعل پر ہوتا ہے جس کا بدلہ دیا جائے۔ تاج العروس میں ہے کہ قرض جو اصل میں قطع کرنے کو کہتے ہیں اس سے حسب مراتب بہت سے معانی نکل آئے ہیں اقد

قرض

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ ۲۴۶

کیا تو نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں (کے حال) پر غور نہیں کیا جب انہوں نے اپنے ایک نبی کو کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں اس نے کہا کہ تم سے کچھ بعید نہیں کہ اگر جنگ کرنا تم پر ضروری ٹھیرایا گیا تو جنگ نہ کرو انہوں نے کہا کہ ہمارا کیا عذر ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں حالانکہ ہم اپنے گھروں سے اور اپنے بیٹوں سے علیحدہ کئے گئے ہیں پھر جب ان کیلئے لڑائی کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ان میں سے تھوڑوں کے سوائے (باقی) پھر گئے اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے [۳۱۵]

جوہری کا قول نقل کیا ہے کہ قرض وہ ہے نیکی سے ہو یا بدی سے جسے تم نے پہلے کیا ہے یعنی جس کا کوئی بدلہ ملنے والا ہے۔ اس پر امیۃ بن ابی الصلت کا شعر بطور شہادت پیش کیا ہے کل امرئ سوف یجزی قرضہ حسنا + او سیئا مدینا مثل ما دانا۔ اور لکھا ہے کہ عرب

قرض حسن

کا محاورہ ہے وہ کہتے ہیں لک عندی قرض حسن و قرض سیئ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ تم نے مجھ سے کوئی اچھا یا برا فعل کیا ہے جس کا اچھا یا برا بدلہ تمہیں ملیگا۔ واصل القرض ما یعطیہ الرجل او یفعل لیجازی علیہ یعنی اصل قرض یہ ہے جو آدمی دے یا کرے تاکہ اسے اس پر بدلہ ملے اور اس آیت میں لفظ قرض کے معنی ابو اسحاق سے نقل کئے ہیں کہ وہ ہر وہ فعل ہے جس پر جزا چاہی جائے۔ اور اخفش سے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع اور اسکی فرمانبرداری میں نیک کام کرے۔ کیونکہ جب کوئی شخص دوسرے کے ساتھ کوئی بھلائی کرے تو عرب کے لوگ کہتے ہیں قد احسنت قرضی قد اقرضتنی قرضا حسنا اور بیضاوی میں ہے کہ اللہ کا قرض مثال ہے ایسے عمل کے آگے بھیجنے سے جس پر ثواب کی امید ہو اور اسی میں ہے کہ قرض حسن مجاہدہ اور انفاق فی سبیل اللہ ہے +

ضعف اضعاف

یضاعف۔ اضعاف ضِعف کی جمع ہے اور کسی چیز کا ضِعف وہ ہے جو اسے دو چند کردے اور ضاعف کے معنی ہیں ایک چیز کے ساتھ اس کی ایک مثل یا کئی مثلیں زیادہ کردیں یا دو چند کیا یا کئی گنا کیا (غ)، اور ضَعف اور ضُعف کے معنی کمزوری ہیں +

ضعف

قبض

یقبض۔ قَبض کے اصل معنی ہیں پورے ہاتھ کے ساتھ کسی چیز کا لے لینا۔ اور اس کا استعمال دونوں طرح پر ہے یعنی ایک چیز کو دوسرے سے لیکر اپنے پاس رکھنا یا ایک چیز دوسرے کو دینے سے ہاتھ روک لینا۔ امام راغب نے یقبض ویبصط کی کئی توجیہات کی ہیں۔ اللہ کبھی ایک چیز لے لیتا ہے کبھی دیدیتا ہے۔ یا ایک قوم سے لے لیتا ہے ایک کو دیدیتا ہے۔ یا کبھی مارتا ہے کبھی زندہ کرتا ہے اور ایک معنی یوں بھی ہوسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکی کو اپنی طرف لے لیتا ہے پھر اس کو بڑھاتا ہے +

بسط

یبصط۔ اصل بسط ہے جس کے معنی ایک چیز کا پھیلانا اور اس کو وسعت دینا ہیں +

انفاق فی سبیل اللہ

پہلی آیت میں جنگ کا حکم دیا اب انفاق فی سبیل اللہ کا مجاہدات کا نیک عمل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فرماتا ہے کہ جو اعمال للٰہی ایثار کے رنگ میں کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں کبھی ضائع نہیں کرتا بلکہ انہیں بہت بڑھاتا ہے اضعافا کثیرۃ کا بڑھانا۔ گویا بیحد و حساب اجر دینا ہے۔ اسلام کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے مفصل ذکر انفاق کا آگے آتا ہے۔ آخر پر والیہ ترجعون اسلئے فرمایا کہ مال کمانے کو زندگی کی غرض نہ سمجھ لینا +

ملاء

۳۱۵ الملاء۔ ملاء: کے اصل معنی بھرنا ہیں ملء الارض ذھبا (آل عمران ۔ ۹۰) اور ملاء اس جماعت کو کہتے ہیں جو ایک رائے پر جمع ہوں

۲۴۷ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

اور ان کے نبی نے انہیں کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہو انہوں نے کہا اسے ہم پر بادشاہی کسطرح مل سکتی ہے اور ہم اسکی نسبت بادشاہی کے زیادہ حقدار ہیں اور اسے مال کی فراخی نہیں دی گئی۔ (نبی نے) کہا بلا شبہ اللہ نے اسے تم پر برگزیدہ کیا ہے اور علم اور جسم میں اس کو بہت بڑھایا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا ملک دیتا ہے اور اللہ بہت دینے والا جاننے والا ہے۔[۳۱۶]

پس آنکھوں کو تازگی اور نظارے سے بھر دیں اور نفسوں کو خوبصورتی اور جلال سے (غ) +

بعث — ابعث۔ بعث کے اصل معنی کسی چیز کا اٹھانا اور سامنے لانا ہیں۔ مردوں کے اٹھنے نیند سے اٹھنے نبیوں کے بھیجا جانے کسی کسی کام پر مقرر کیا جانے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ) +

مَلِك — مَلِكًا۔ مَلِك وہ ہے جو لوگوں کے معاملہ میں امر و نہی پر متصرف ہو اور یہ انسانوں کی سیاست سے مخصوص ہے مَلِكُ النَّاس کہا جاتا ہے مَلِكُ الاشیاء نہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بادشاہ کا تصرف لوگوں پر ایک محدود تصرف ہے مالک کی طرح نہیں جسکا تصرف نامحدود ہے دیکھو

عسیٰ — عسیتم عسیٰ خواہش اور اُمید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے طمع اور ترجّی کے لئے (غ) اور یہ افعال مقاربہ میں سے ہے امر محبوب میں اُمید دلانے کے لئے اور امر مکروہ میں ڈرانے کے لئے آتا ہے (ت) +

سموئیل کا ذکر اور مسلمانوں کو نصیحت — یہاں سے بنی اسرائیل کی ایک مثال شروع کی ہے جو حضرت داؤد کے ذکر پر ختم ہوتی ہے یہ نبی جس کی طرف یہاں اشارہ ہے سموئیل تھے دیکھو ا سموئیل ۸: ۱۸ و ۱۹۔ اس وقت بنی اسرائیل فلستیوں سے مغلوب ہو چکے تھے اور کئی دفعہ شکستیں کھا کر ان کے ہزارہا آدمی کٹ چکے تھے قد اخرجنا من دیارنا سے مغلوب ہو کر ملک دے بیٹھنا اور من ابناءنا سے آدمیوں کا کٹ جانا یا غلامی میں بیاجانا مراد ہے۔ یہ تاریخی مثال اس رکوع کے باقی حصہ میں اور کچھ اگلے رکوع میں مذکور ہے غرض مسلمانوں کو سمجھانا تھا جو اپنے گھروں سے نکل چکے اور اپنے عزیز و اقارب سے الگ ہو چکے تھے کہ اب سوائے جنگ کے تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ بھی سمجھایا کہ دشمن کی کثرت سے مرعوب نہ ہونا +

بسطة — [۳۱۶] بسطۃ کے معنی سعۃ یا فراخی ہیں۔ بخاری میں بسطۃ کے معنی زیادۃ و فضلا دئے ہیں +

طالوت یا ساؤل — طالوت۔ بائبل میں اس بادشاہ کا نام ساؤل لکھا ہے قرآن شریف نے طالوت استعمال کیا ہے جو طول سے مشتق ہونے کی وجہ سے قد کی لنبائی پر دلالت کرتا ہے۔ اور ساؤل قد میں بھی سب سے لنبا تھا۔ ا سموئیل ۱۰: ۲۳ ساؤل پر اعتراضات کا ہونا بھی بائبل سے معلوم ہوتا ہے ا سموئیل ۹: ۲۱۔ اور ۱۰: ۲۷ +

بادشاہ کے انتخاب کے اصول — لوگوں کا اعتراض یہ ہے کہ یہ بادشاہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اس کا کوئی خاص حق بادشاہت کے لئے نہیں یعنی بادشاہت کے خاندان سے نہیں اور نہ مال و دولت اس کے پاس زیادہ ہے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ان اللہ اصطفٰہ علیکم یعنی اللہ نے نیکی کی وجہ سے اسے تم پر برگزیدہ کیا ہے۔ اور دوسرے اس کو علم زیادہ دیا ہے تیسرے اس کو جسمانی قوت میں فضیلت ہے۔ اس سے

بادشاہت وراثت سے نہیں — معلوم ہوا کہ بادشاہت کے انتخاب میں قرآن کریم ان اصول کو مدنظر رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور وراثت کی بادشاہت یا دولتمند ہونے کے لحاظ سے بادشاہت کا انتخاب اس کے نزدیک ٹھیک نہیں۔ مسلمانوں نے بالکل خلاف تعلیم قرآن اور نمونہ خلفاء کے

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ ۲۴۸

اور ان کے نبی نے انہیں کہا کہ اسکی بادشاہی کا نشان یہ ہے کہ تمہارے پاس تابوت آئے جس میں تمہارے رب کی طرف سے تسکین اور

رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ط ۳۱۷

اس کا بقیہ ہوگا جو موسیٰ کے سچے تابعداروں اور ہارون کے سچے تابعداروں نے چھوڑا ہو فرشتے اسے اُٹھائے ہوئے ہونگے

راشدین بادشاہت کو وراثت قرار دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ بجائے قوت کا موجب ہونے کے کمزوری کا موجب ہو گئے۔ کیونکہ

بادشاہت کی غرض — اس آیت سے یہ بھی ثابت ہے کہ بادشاہ بنانے کی اصل غرض یہ ہے کہ وہ قوم کو دشمن کے مقابل میں قوی بنائے لیکن بادشاہت جب بطور وراثت آجاتی ہے تو عیش پسندی کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے اور اصل غرض مفقود ہو جاتی ہے پس بادشاہت یا امارت انتخاب سے ہے وراثت سے نہیں۔ اور انتخاب کے اصول یہ ہیں کہ جو شخص نیکی میں بڑھکر اور علم میں زیادہ اور طاقتور ہو اسے بادشاہ بنایا جائے۔

بادشاہت کی ضرورت — یہ بھی معلوم ہوا کہ نظم و نسق ملکی کے لئے بادشاہت کی ضرورت بھی ہے یعنی ایک ایسے شخص کی جو نظام حکومت کو قائم رکھنے والا ہو۔ نبوت اور بادشاہت چونکہ عموماً دو الگ الگ منصب رہے ہیں۔ اس لئے باوجود نبی کی موجودگی کے بادشاہ کی ضرورت پڑی +

تابوت — **۳۱۷** التابوت۔ تابوت کے ایک معنی صندوق مشہور ہیں اور اسے توب سے مشتق کہا گیا ہے کیونکہ چیزیں اس میں لوٹ کر آتی ہیں۔ مگر دوسرا قول یہ ہے کہ تابوت کے معنی پسلیاں اور جو کچھ ان کے اندر آگیا ہے جیسے دل وغیرہ ہیں۔ اور صندوق پر بھی اس کا اطلاق ہو گیا ہے (ت)۔ لسان العرب میں بھی تابوت کے معنی قلب یعنی دل دیئے ہیں اور مثل نقل کی ہے ما اَوْدَعْتُ تابوتی شیئاً فَقَدْتُہ میں نے اپنے تابوت یعنی دل کے سپرد کبھی کوئی شے نہیں کی جسے گم کر دیا ہو۔ اور مفردات میں بھی یہ قول منقول ہے کہ تابوت سے مراد قلب اور سکینت ہے اور جو علم اس میں ہے۔ اور لکھا ہے کہ قلب کو سَفَطُ العِلْم کہا گیا ہے یعنی علم کا ڈبہ اور اسے حکمت کا گھر اور اس کا برتن اور اس کا صندوق کہا گیا ہے۔ اور قلب کا نام تابوت رکھا جانے کی وجہ یہی حضرت عمر نے ابن مسعود کے متعلق کہا کہ وہ ایک برتن ہے جو علم سے بھرا ہوا ہے۔ تفسیروں میں بھی تابوت کے معنی قلب منقول ہیں۔

یاتیکم التابوت — بیضاوی میں ہے کہ ایک قول ہے کہ تابوت کے معنی قلب ہیں اور سکینۃ وہ علم ہے جو اس میں ہے اور ایسے تابوت یا دل کے آنے سے منشاء یہ ہے کہ اس کا قلب علم اور وقار کی جگہ ہو جائیگا حالانکہ پہلے ایسا نہ تھا +

سکینۃ۔ سکون — سکینۃ۔ سکن سے ہے اور حرکت کے بعد کسی چیز کے ٹھہر جانے کو سُکُون کہتے ہیں پس سکینۃ اطمینان قلب ہے یا مرعوب نہ ہونا۔ اور یہ جو بعض مفسرین نے یوں ہی لکھدیا ہے کہ وہ ایک شے ہے جس کا سر بلی کے سر کی طرح ہے۔ امام راغب کہتے ہیں یہ صحیح نہیں۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ سکینت اس حالت کا نام ہے جب انسان کا میلان شہوات کی طرف سے رک جائے +

بقیۃ۔ بقاء — بقیۃ۔ بقاء کسی چیز کی پہلی حالت پر رہنا ہے اور باقیات سے مراد وہ عمل ہیں جن کا ثواب انسان کے لئے باقی رہ جاتا ہے اور بقیۃ اور باقیات کے معنی کل عبادۃ یقصد بہا وجہ اللہ بھی دیتے ہیں (غ) یعنی ہر ایک عبادت جس کے ساتھ اللہ کی رضا چاہی جائے۔ اور بقیۃ کے معنی تاج العروس میں الحالۃ الباقیۃ من الخیر بھی دیتے ہیں یعنی خیر کی حالت جو باقی رہنے والی ہو +

موسیٰ اور ہارون دونوں صاحب امت اور صاحب کتاب ہیں۔ — آل موسیٰ و آل ھارون آل کے معنی کے لئے دیکھو ۷۲ حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں کی علیحدہ علیحدہ آل کا ذکر بتاتا ہے کہ قرآن شریف دونوں کو صاحب اُمت نبی قرار دیتا ہے موسیٰ کی آل وہ لوگ ہوئے جو حضرت موسیٰ کی خاص برکات سے حصہ لیتے ہیں اور حضرت ہارون کی آل وہ لوگ ہوئے جو حضرت ہارون کی برکات سے حصہ لیتے ہیں اور دوسری جگہ دونوں کو صاحب کتاب نبی بھی قرار دیا ہے واٰتینٰھما الکتٰب المستبین (الصّٰفّٰت ۱۱۷)

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

یقیناً اس میں تمہارے لئے نشان ہے اگر تم مومن ہو ۳۱۷

بائبل کا تابوت

توریت و انجیل کا باہم اختلاف

۳۱۷ تابوت جس کے یہاں بطور نشان آنے کا ذکر ہے وہ کیا تھا؟ ایک مشہور تابوت وہ ہے جس کا ذکر بائبل کے دونوں مجموعوں یعنی پرانے اور نئے عہد ناموں میں پایا جاتا ہے جو لنبائی میں اڑھائی ہاتھ اور چوڑائی اور اونچائی میں ڈیڑھ ڈیڑھ ہاتھ تھا اور اوپر سے خالص سونے میں منڈھا ہوا تھا۔ اور اس کے اوپر سونے کا کلس تھا (خروج ۲۵ : ۱۰۔ ۱ اور ۳۷۔ ۱) اور اس صندوق میں سلاطین ۸ : ۹ کے مطابق تو پتھر کے ان دو لوحوں کے جنہیں موسیٰ نے حوریب پر اس میں رکھا تھا" اور کچھ نہ تھا۔ مگر عبرانیوں ۹ : ۴ کے مطابق "اس میں ایک سونے کا برتن من سے بھرا ہوا اور ہارون کا عصا جس میں شاخیں پھوٹی تھیں اور عہد نامہ کی تختیاں اور اس پر جلالی کروبی تھے" (اب یہ فیصلہ عیسائی کریں کہ ان دونوں الہامی کتابوں میں سے کونسی غلط ہے) یہ تابوت یا صندوق ایک مرتبہ بنی اسرائیل کے قبضہ سے نکل کر فلستیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ اور کچھ مدت بعد انہوں نے اسے واپس کر دیا اور آخر کار حضرت داؤد اسے یروشلم میں لے آئے اور حضرت سلیمان کے زمانہ میں بیت المقدس میں رکھا گیا اس کے بعد اس کا پتہ نہیں چلتا ✤

قرآن میں کس تابوت کا ذکر ہے

عیسائیوں کا اعتراض

بعض مفسرین نے یہی مذکورہ بالا تابوت مراد سمجھا ہے بعض کہتے ہیں کوئی اور تابوت تھا جو حضرت آدم پر اترا بعض کہتے ہیں وہ تابوت ہے جس میں حضرت موسیٰ کی والدہ نے حضرت موسیٰ کو رکھ کر دریا میں ڈال دیا تھا۔ ان میں سے قول اول کو لیکر عیسائیوں نے بزعم خود قرآن شریف کی بڑی بھاری تاریخی غلط بیانی ثابت کی ہے کیونکہ انہوں نے سمجھا ہے کہ یہ تابوت بروے تاریخ مذکورہ بائبل طالوت سے بہت پیشتر واپس آچکا تھا پس قرآن الہامی نہ ہوا۔ حالانکہ اسی تابوت کے قصہ میں پرانے اور نئے عہد نامہ میں اتنا بڑا اختلاف موجود ہے اور وہ دونوں الہامی مانے جاتے ہیں اور کبھی کوئی ایماندار عیسائی سوال نہیں کرتا کہ ان میں سے کس کو جھوٹا کہا جائے۔ بہر حال اگر الٹا بوت سے مراد یہی تابوت لیا جائے تو بائبل میں جہاں فلستیوں کے اس تابوت کو لے جانے اور پھر

سموئیل کی کتابیں

واپس کرنے کا ذکر ہے۔ وہاں سے ہرگز پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے چنانچہ پادری ڈملو کی تفسیر بائبل میں اس کا صاف اعتراف موجود ہے۔ اول تو سموئیل کی دونوں کتابوں کے متعلق یہ مسلم ہے کہ یہ خود کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ ان کا ماخذ کوئی اور ابتدائی تحریر ہے دوسرے تابوت کا ذکر اسموئیل کے پانچویں چھٹے باب میں ایسے بے ربط طریق پر ہے کہ پادری ڈملو اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "تابوت کا ذکر جو پانچویں اور چھٹے باب میں ہے اس سے اسبات کا پتہ نہیں ملتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے سوائے اس کے

تابوت کی تاریخ

کہ یہ جنگ افیک کے بعد کا ہے" چھٹے باب کی پہلی آیت میں لکھا ہے کہ "صندوق سات مہینے تک فلستیوں کے ملک میں رہا" اور ساتویں باب کی دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تابوت بیس برس تک قریت یعاریم کے لوگوں کے پاس رہا "اور سارے بنی اسرائیل نے خداوند کے لئے نالے کئے" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی وہ مغلوب تھے حالانکہ تابوت کا ان کے درمیان آنا بطور نشان تھا کہ وہ مظفر و منصور ہونگے پس یہ واقعات ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ اگر قرآن کریم میں اسی تابوت کا ذکر سمجھا جائے تو چونکہ اس کی واپسی بنی اسرائیل کی فتح و ظفر کی نشانی تھی۔ اور فلستیوں پر ان کا فتحیاب ہونا ساؤل یعنی طالوت کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے اس بنا پر قرآن شریف کا بیان ہی صحیح قرار پاتا ہے ✤

قرآن میں تابوت بمعنی قلب ہے

لیکن لغت اس بات پر شاہد ہے کہ تابوت کے معنی قلب یعنی دل ہیں۔ اور مفسرین نے ان معنوں کو لیا ہے پس قرآن کریم کے الفاظ کا منشاء صرف طالوت کے قلب کی طرف اشارہ کرنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس پر معترض تھے ان کو بتایا گیا کہ اس کا قلب وہ پہلا سا نہیں۔ خدا نے اس میں سکینت وغیرہ عطا کردی ہیں گویا اسے ایک دوسرا دل دیدیا ہے خود اسموئیل ۱۰ : ۹ میں ہے "اور ایسا ہوا کہ جونہی اس نے سموئیل سے رخصت ہو کے پیٹھ پھیری وہیں خدا نے اسے دوسری طرح کا دل دیا" خود الفاظ قرآنی اسی معنی کے تائید

ع ۳۳

رفع فساد کے لئے ضرورت جنگ اور فضیلت آنحضرت صلعم

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ ۲۴۹

پھر جب طالوت فوجوں کے ساتھ روانہ ہوا اس نے کہا کہ اللہ نہر کے ذریعہ تمہارا امتحان کرنے والا ہے پس جو شخص اس میں سے

مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ

پی لیگا وہ مجھ سے نہیں ہے اور جو اسے نہ چکھے وہ ضرور مجھ سے ہے مگر وہ جو اپنے ہاتھ سے چلو بھر لے لے

فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ

پھر ان میں سے تھوڑوں کے سوائے (باقیوں نے) اس سے پیا ۳۱۸ پس جب وہ اس سے گزر گیا اور وہ جو ایمان لائے اسکے ساتھ تھے

یہ تابوت وہ نہیں جس میں الواح ہوں یا من کا طشت ہو۔ بلکہ وہ ہے جس میں سکینت تھی اور سکینت قلب پر ہی نازل ہوا کرتی ہے جیسے فرمایا ھوالذی انزل السکینۃ فی قلوب المومنین (الفتح ۴۸-۴) وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی۔ اور اسی سکینت نے ہی دشمن کا رعب ان کے دلوں سے دور کر دیا۔ پھر فرمایا کہ اس میں وہ اچھی باتیں تھیں جو آل موسیٰ یعنی موسیٰ کے برگزیدہ پیروؤں اور آل ہارون یعنی ہارون کے برگزیدہ پیروؤں نے چھوڑیں۔ موسیٰ قوم کے سردار تھے اور ان کے متبعین کامل اسی سرداری کے حقدار۔ ہارون عبادات وغیرہ کراتے تھے خدا نے طالوت کو دونوں اچھی باتوں کا وارث بنادیا۔ پھر فرمایا تحملہ الملائکۃ اس تابوت کو فرشتے اُٹھائے ہوئے تھے۔ حالانکہ بائبل میں اس تابوت کے ذکر میں ہے کہ گائے رتھ میں جوڑ کر اس پر وہ صندوق واپس کیا گیا۔ اور یہ سنت اللہ نہیں کہ فرشتے لکڑی کا صندوق اُٹھائے پھرتے ہوں ہاں قلب کے حامل ملائکہ ہی ہوتے ہیں چنانچہ لسان العرب میں حدیث کا یہ ٹکڑا درج کیا گیا ہے نزلت علیھم السکینۃ تحملھا الملائکۃ یعنی ان پر سکینت نازل ہوئی جس کو فرشتے اُٹھائے ہوئے تھے +

سکینت کا تعلق قلب سے ہے

جُند

۳۱۸ جُنُود۔ جُند کی جمع ہے لشکر کو کہتے ہیں اور ہر ایک جماعت کو بھی۔ جنود ابلیس۔ جنود ربک۔ اور یہ جَنَد سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں سخت زمین جس میں پتھر ہوں +

نَھَر۔ نَھْر نَہار

نَھَر۔ نَھَر اور نَھْر پانی بہنے کی جگہ اور نَھَر کے معنی فراخی یا وسعت بھی ہیں (غ) فی جنات ونھر (القمر ۵۴-۵۴) کی تفسیر میں ہے کہ اس سے مراد فراخی اور روشنی بھی ہو سکتی ہے (ل) اور نَہار دن وہ ہے جس میں روشنی پھیل جاتی ہے (غ) +

مِنّی

مِنّی سے مراد ہے وہ میرے ساتھیوں میں سے ہے۔ حدیث میں ہے لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا +

طعم

یطعمہ۔ طعم کا لفظ چکھنے پر بولا جاتا ہے خواہ کھانے کی چیز ہو یا پینے کی +

غرف۔ غرفۃ

اغترف۔ غرفۃ۔ غَرْف کے معنی ہیں کسی چیز کا اُٹھانا اور لے لینا۔ اور غُرفۃ وہ ہے جو اس طرح لیا جائے یعنی چلو بھر۔ اور غُرفَۃ کے معنی عِلّیّۃ یعنی چوبارہ یا بلند عمارت بھی ہیں (غ) اولئک یجزون الغرفۃ (الفرقان ۲۵-۷۵)، لنبوئنھم فی الجنۃ غرفاً (العنکبوت ۲۹-۵۸) وھم فی الغرفات آمنون (السبا ۳۴-۳۷) جو دونوں غرفۃ کی جمع ہیں +

نہر سے آزمایش

یہ آزمایش ہو سکتا ہے محض اس لئے کی گئی ہو کہ کون شخص بھوک اور پیاس کی شدت پر صبر کر سکتا ہے اگر مراد اس سے پانی کی نہر لی جائے۔ اور اس طرح پر بہادروں اور دل کے کمزوروں کو الگ الگ کرنا ہو اور ہو سکتا ہے کہ نَھَر سے مراد وسعت اور فراخی ہو کیونکہ یہاں طالوت کی اس فوجکشی کا ذکر ہے جب جالوت کے مقابلہ میں وہ نکلا اور اس سے پہلے ان کو عمالیقوں پر فتح حاصل ہو چکی تھی اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا تھا جسکا ذکر اسموئیل کے باب ۱۵ میں ہے۔ اور حالانکہ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ مال غنیمت کو حرم کریں

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ

انہوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے جنہیں یقین تھا کہ وہ اللہ سے ملنے والے

مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ

ہیں وہ بولے بسا اوقات چھوٹا گروہ بڑے گروہ پر اللہ کے حکم سے غالب آگیا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کیساتھ ہے ۳۱۹

(یعنی تباہ کردیں اور اپنے استعمال میں نہ لائیں) مگر طالوت کی فوجوں نے اس وقت عمدہ عمدہ مال غنیمت کو لے لیا اور اپنے تصرف میں لائے اور اس کے بعد یہ لوگ پھر فلستیوں کے مقابلہ میں بہت کمزور ہو گئے ✦

لیکن اگر نہر سے مراد پانی کی نہر بھی ہو تو بھی عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ اس واقعہ کو یہاں لکھنے میں قرآن کریم نے تاریخی غلطی کی ہے صحیح نہیں۔ یہ سچ ہے کہ بروئے بائبل طالوت کے زمانے سے کوئی ڈیڑھ سو سال پیشتر جدعون کو پانی کے ذریعہ سے لشکر کو آزمانے کا حکم ہوا تھا جس کا ذکر قاضیوں کی کتاب کے ساتویں باب کے شروع میں ہے "سو تو انہیں پانی پاس نیچے لا کر وہاں میں تیری خاطر انہیں آزماؤں گا۔ .... اور خداوند نے جدعون کو فرمایا کہ جو شخص پانی چپڑ چپڑ کے کتے کی مانند پیوے تو ہر ایک ایسے کو علیحدہ رکھ اور ویسے ہر ایک کو بھی جو اپنے گھٹنوں پر جھک کے پیوے"۔ اب قاضیوں کی کتاب جس میں یہ واقعہ درج ہے اس کے متعلق بھی یہ امر مسلم ہے کہ یہ اصلی نہیں بلکہ پرانے مسودات کی بنا پر لکھی گئی ہے۔ اس لئے اس کے بیان واقعہ پر اس قدر وثوق نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی تاریخی صحت پر شبہ نہ ہو سکے۔ خود اسی واقعہ میں کئی ایک غلط بیانیاں ہیں۔ پادری ڈملو اپنی تفسیر بائبل میں اقرار کرتے ہیں کہ "بعض مقامات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ مشتبہ ہیں" اور کوہ جلعاد کے ذکر پر لکھتے ہیں "جلعاد یردن کے مشرق کو ہے یہاں مراد کوئی اور مقام ہونا چاہئے"۔ پس جب یہ واقعات اس قدر مشتبہ ہیں تو ان کی بنا پر قرآن کریم کے بیان کی تردید کس طرح ہو سکتی ہے ✦

جدعون کے ذریعے پہلی آزمائش ✦

علاوہ ازیں خود بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اور پچھلے لوگوں میں امتیاز کے لئے اور بھی امتحان ہوئے ایک کا ذکر استثناء ۲۰: ۸ میں ہے۔ اس لئے اگر جدعون کے وقت بھی ایسا واقعہ ہوا ہو اور طالوت کے وقت بھی تو کونسا امر بعید ہے۔ ایک کا ذکر بائبل نے کر دیا ایک کا قرآن شریف نے یہ تو شاید کسی عیسائی کو دعویٰ نہیں کہ بنی اسرائیل کی ایسی مکمل تاریخ بائبل میں ہے کہ جس واقعہ کا وہاں ذکر نہ ہو وہ تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ بائبل میں یہ ذکر ہے کہ کتے کی طرح چپڑ چپڑ کے پانی پیئے۔ قرآن شریف میں ہے کہ ایک چلو بھر پانی پیئے پیٹ بھر کر نہ پیئے۔ یہ کلام زیادہ پر حکمت ہے ✦

جالوت

۳۱۹ جالوت۔ جال سے ہے اور جال فی الحرب کے معنی ہیں جنگ میں شدت سے حملہ کیا۔ بائبل میں اس کا نام جاتی جولیت دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اس قدر شدت سے حملہ آور ہوتا تھا کہ باوجود اس کے بار بار للکارنے کے بنی اسرائیل میں سے کوئی اس کے سامنے نہ نکلتا تھا ✦

فئۃ

فئۃ۔ فیٔ سے ہے جس کے معنی ہیں اچھی حالت کی طرف لوٹ آنا اور فئۃ وہ گروہ ہے جو ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں اور ان کے بعض بعض کی مدد کے لئے لوٹ لوٹ کر آئیں (رغ) ✦

تھوڑوں کا بہتوں پر غالب آنا

چھوٹا گروہ بڑے گروہ پر بسا اوقات دنیا میں غالب آتا رہتا ہے۔ یہ لوگ ایک بڑے امتحان میں سے ہو نکلے اور حکم کے ماتحت ہر طرح کی تکلیف کے اٹھانے کیلئے عزم کر چکے تھے اس لئے اسبات کے اہل تھے کہ تھوڑے ہونے کے باوجود بھی بہتوں پر غالب آئیں اصل غرض مسلمانوں کو تسلی دینا تھا اور یہ بشرطیکہ وہ صابر بنیں پھر جس صفائی سے تھوڑوں کے بہتوں پر غالب آنے کا نقشہ آنحضرت صلعم کی زندگی میں نظر آتا ہے اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ہمیشہ دشمن کی کثرت رہی اور مسلمان تھوڑے رہے ہمیشہ سامان زیادہ دشمن کے پاس رہا مگر مسلمانوں میں قوت ایمانی صبر اور کی طاقت ان کو نصرت الٰہی کا حقدار ٹھہراتی رہی۔ آج مسلمانوں کی مغلوبیت قوت ایمانی اور صبر ہی کی کمی کا نتیجہ ہے ✦

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهٖ قَالُوا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا ۲۵۰

اور جب جالوت اور اسکی فوجوں کے سامنے نکلے اُنہوں نے کہا اے ہمارے رب ہمیں بہت صبر عطا فرما اور ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ

وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۛ وَقَتَلَ ۲۵۱

اور کافر لوگوں پر ہمیں نصرت عطا فرما ۳۲۰ پس اللہ کے حکم سے انہوں نے انکو بھگا دیا اور داؤد نے

دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ

جالوت کو قتل کیا اور اللہ نے اسے بادشاہی اور حکمت دی اور جو کچھ چاہا اسے سکھایا ۳۲۱

برازـبرز

۳۲۰ برزوا۔ براز کھلے میدان کو کہتے ہیں۔ اور برز کے معنی ہیں کھلے میدان میں آ گیا بعض وقت کسی شخص کی جو حالت پہلے چھپی ہوئی ہو اس کے ظاہر ہو جانے پر بھی برز بولا جاتا ہے جیسے وبرزوا للہ الواحد القہار (ابراہیم۔ ۴۸) وبرزوا للہ جمیعا (ابراہیم۔ ۲۱) یوم ھم بارزون (المومن۔ ۱۶) (غ) +

فراغ

افرغ۔ فراغ خلاف شغل ہے اور افرغت الدلو کے معنی ہیں جو پانی اس میں تھا بہا دیا اسی سے افراغ کے معنی بہا دینا لئے گئے ہیں (غ)، اور مفرغ کے معنی فراخی اور بہانے کے بھی آتے ہیں (ل) یہاں افراغ صبر سے مراد صبر کا بہتات کے ساتھ عطا فرمانا ہوا

صبر

اور صبر سے مراد یہاں استقلال ہے +

تثبیت

ثبت۔ ثبات اصل میں خلاف زوال ہے۔ اور بعض وقت ثبوت یا اثبات دلائل سے ہوتا ہے اور تثبیت کے معنی قوت دینا ہیں یعنی قوی یا مضبوط کرنا (غ) +

جنگ میں صبر

یہاں سے معلوم ہوا کہ دشمن کے مقابلہ میں غلبہ صبر اور ثابت قدمی سے ملتا ہے۔ اس لئے یہ دعا سکھائی جو لوگ ذرا ذرا مقابلہ پر ہمت ہار دیتے اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں وہ غالب نہیں ہو سکتے۔ جنگ میں بالخصوص صبر ہی سب سے زیادہ کام دینے والی چیز ہے +

داؤد

۳۲۱ داؤد۔ بنی اسرائیل میں ایک عظیم الشان نبی ہیں جو نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی رکھتے تھے ان کا زمانہ ۱۰۰۰ قبل مسیح ہے آپ کے والد کا نام یسی تھا جو بیت اللحم کا رہنے والا تھا +

حکمۃ

الحکمۃ۔ حکمۃ کے اصل معنی تو علم و عقل کے ساتھ حق کو پا لینا ہیں (غ)، یا علم و عمل کے ساتھ (ت)، اور مختلف موقعوں پر مختلف معنی میں اس کا استعمال ہوا ہے کبھی کتاب کے مقابلہ پر اس کا استعمال ہوا ہے تو اس سے مراد کتاب کا فہم یا تفصیلات شریعت یا سنت ہیں دیکھو ۱۶۴ یہاں ملک یا بادشاہت کے مقابلہ پر مراد اس سے نبوت و رسالت ہے۔ کیونکہ اس کے معنی نبوت و رسالت بھی آئے ہیں (ت)، اور فی الحقیقت نبوت اور رسالت سے بھی انسان حق کو پاتا ہے اور اللہ کی طاعت تفقہ فی الدین اور عمل فہم، خشیت۔ ورع امر اللہ میں تفکر اور اس کا اتباع ان سب معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور حلم کے معنی میں بھی آیا ہے اور قرآن شریف اور توریت اور انجیل پر بھی بولا گیا ہے (ت)، اور سدی سے بھی حکمۃ کے معنی نبوت مروی ہیں (غ) +

بائبل میں طالوت کے متعلق متضاد بیان

بائبل میں حضرت داؤد کے ساؤل یعنی طالوت کے پاس جانے کے متعلق دو متضاد بیان ہیں دیکھو اسموئیل ۱۶: ۱۴ سے ۲۳۔ اور ۱۷: ۲۶ و ۵۵۔ ۵۸ پہلا بیان یہ ہے کہ ساؤل نے داؤد کو بلا کر بربط بجانے پر رکھا تھا اور دوسرا یہ کہ جالوت کے مقابلہ میں دیکھا تو اسے معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے

داؤد میں بادشاہت اور نبوت کا اجتماع

اور یہ امر بائبل کی رو سے مسلم ہے کہ داؤد نے ہی جالوت کو قتل کیا اور ملک اور حکمت دونوں داؤد کو دینے سے منشاء یہ ہے کہ بادشاہت اور نبوت دونوں دیئے

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعہ دور نہ کردے تو ملک تباہ ہو جائے لیکن اللہ

ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ۲۵۲ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ

جہانوں پر فضل کرنے والا ہے ۳۲۲ یہ اللہ کی باتیں ہیں جن کو ہم حق کے ساتھ تجھ پر پڑھتے ہیں اور یقیناً تو

لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ ۲۵۳ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ الجزء الثالث ۳

مرسلوں میں سے ہے ۳۲۳ ان رسولوں میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے ۳۲۴

۳۲۲ دفع۔ دَفْع کا صلہ جب اِلٰی ہو تو اسکے معنی اِزالۃ یعنی دوسرے کو کسی چیز کا پہنچا دینا ہوتے ہیں جیسے فادفعوا الیھم اموالھم (النساء۔ ۶) جہاں مراد ہے کہ ان کے مال ان کے حوالے کردو اور جب صلہ عن ہو تو اس کے معنی حمایت ہوتے ہیں جیسے ان اللہ یدافع عن الذین امنوا (الحج ۲۲۔ ۳۸) (ر)۔ یہاں دفع اپنے اصل معنی میں ہے الازالۃ بقوۃ دل یعنی قوت سے دور کردینا۔ ب سے مراد لوگوں کی شرارت کا دور کرنا ہے۔ یہاں مذہبی جنگ کی حکمت بیان فرمائی۔ جب شریر لوگ دنیا میں زور پکڑ جاتے ہیں اور حق اور انصاف کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو تباہ کر دیتا ہے۔ اور ذو فضل کہکر بتا دیا کہ جنگ ایک وقت فضل ہوتا ہے اس میں نبی کریم صلعم کی جنگوں کی طرف اشارہ ہے اس اصول کی تعلیم کہ جنگ کبھی فضل ہوتی ہے پہلے قرآن شریف نے ہی دی +

عیسائیوں کے اعتراض اور قرآن کی حقانیت

۳۲۳ اس اور گزشتہ رکوع کی بیشتر باتوں پر عیسائیوں نے تاریخی طور پر غلط ہونے یا گڈمڈ ہونے کا اعتراض کیا ہے۔ مگر کیسی حقانیت قرآن شریف کی نظر آتی ہے کہ جہاں اعتراض ہونا تھا۔ وہیں خود ہی ان باتوں کا ذکر کرکے فرما دیا کہ یہ جو کچھ پڑھا گیا۔ بالحق ہے یعنی یہ واقعات صحیح بھی ہیں اور ایک ضرورت حقہ کے لئے بیان کئے گئے ہیں اور جس قدر ضرورت تھی اسی قدر بیان کئے گئے ہیں ضرورت یہ تھی کہ مسلمانوں کو جنگ درپیش تھی وہ تھوڑے تھے۔ ان کو سمجھانا مقصود تھا کہ وہ بہتوں پر کس طرح غالب آئینگے۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ منافق یا کچے لوگ تم سے جنگوں میں الگ ہو جائیں تو یہ تمہارے لئے کمزوری نہیں بلکہ قوت کا موجب ہوگا اور پھر فرمایا کہ ان جنگوں کی ضرورت اب فساد کو دور کرنے کے لئے ہے۔ یقیناً تو مرسلوں میں سے ہے یعنی خود ان باتوں کو بیان نہیں کرتا بلکہ خدا کی بتائی ہوئی باتیں ہیں اور پھر پہلے بھی رسولوں کو جنگ کرنی پڑی تو اب اس رسول کی جنگوں پر کیا اعتراض ہے +

تلک الرسل

۳۲۴ تلک۔ یہ اشارہ ان رسولوں کی طرف ہے جن کا ذکر اسی سورت میں ہو چکا ہے۔ اور غور کیا جائے تو ما انزل من قبلک میں اور ما اوتی النبیون من ربھم میں کل دنیا کے انبیاء کا ذکر ہو چکا پس تلک الرسل میں کل دنیا کے رسولوں کی طرف اشارہ ہے

تفضیل

فضلنا۔ تَفْضِیل۔ فَضِیلَۃ فضل میں درجہ بلند ہے اور تفضیل فضیلت کا عطا کرنا یا کسی ایسی صفت یا خصلت کا ایک میں رکھ دینا ہے جو اس کو دوسروں سے ممیز کردے (ت) +

رسولوں کی فضیلت کا ذکر یہاں کس تعلق سے شروع کیا؟ پیچھے فرمایا تھا تم رسولوں میں سے ایک ہو اور یہاں فرمایا ان رسولوں کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت دی تھی۔ گویا یوں فرمایا کہ تم رسولوں میں سے ایک ہو اور سب پر فضیلت رکھتے ہو اور یہ کوئی امر مستبعد نہیں اس لئے کہ رسولوں کو ایک دوسرے پر فضیلت ہونے میں کوئی ہیچ نہیں۔ بغیر اس کے سلسلہ مضمون ٹھیک نہیں رہتا اسی کے مطابق روح المعانی میں ہے استئناف مشعر بالترقی کانہ قیل انک لمن المرسلین وافضلھم فضلا اور اصل میں یہ اشارہ یہاں اس لئے کیا کہ متعدد موقعوں پر رسول کریم صلعم کی فضیلت کا ذکر ہو چکا تھا مثلاً کل جہانوں کی طرف مبعوث ہونے

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ

ان میں سے وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کو مراتب میں (اور) بلند کیا ۳۲۵

آنحضرت میں اجتماع نبوت و بادشاہت

فضیلت سے دوسرے میں نقص لازم نہیں

میں پھر قرآن کریم کی سب کتابوں پر فضیلت ہیں۔ پھر اس کے پہلی ساری شرائع کے ناسخ ہونے اور ان سے بہتر ہونے میں پھر آنحضرت صلعم کے تمام مذاہب عالم کے جھگڑوں میں فیصلہ کرنیوالا ہونے میں اسلئے فرمایا کہ تم جو ان سب رسولوں کی جگہ لیتے ہو یہ تمہاری فضیلت لا نفرق بین احد منھم (۱۳۶) کے خلاف نہیں۔ کیونکہ پہلے رسولوں کو بھی ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور یہاں چونکہ حضرت داؤد کو بادشاہت اور نبوت دونوں دینے کا ذکر آیا تھا۔ جو دوسرے انبیائے بنی اسرائیل پر ان کی ایک فضیلت تھی اس لئے رسول اللہ صلعم کی فضیلت کا ذکر کیا کیونکہ آپ کو بھی نبوت کے ساتھ اب بادشاہت مل رہی تھی۔ اور ایک کو دوسرے پر فضیلت دینے سے یہ منشاء نہیں کہ وہ دوسرا ناقص ہے۔ بلکہ دو کامل انسانوں میں جو چیز ایک کو دوسرے سے ممیز کرتی ہے یا جو کوئی زائد بلند مرتبہ دیا جاتا ہے وہی اس کی فضیلت ہے۔ گویا کمال انسانی کے بھی مختلف مدارج ہیں ✦

آنحضرت کا جامع کمالات انبیائے بنی اسرائیل ہونا

حضرت داؤد اور مسیح کی پیشگوئیوں میں آنحضرت کی آمد کو خدا کی آمد قرار دیا ہے

ایک اور بات اس جگہ یاد رکھنے کے قابل ہے بنی کریم صلعم کی اس فضیلت کا ذکر سلسلہ موسویہ کے دو عظیم الشان انبیاء داؤد اور عیسیٰ کے درمیان کیا ہے۔ حضرت داؤد ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے ان انبیاء میں سب سے بڑھکر ہیں تو حضرت عیسیٰ اخلاقی اور روحانی تعلیم کے لحاظ سے۔ بنی کریم صلعم ان دونوں پہلوؤں سے دونوں سے بلند تر ثابت ہوئے علاوہ بریں ان دونوں نبیوں نے آنحضرت صلعم کے متعلق جو پیشگوئیاں کی ہیں ان میں آپ کی آمد کو خدا کی آمد قرار دیا ہے دیکھو زبور (۔ ۱۱) اور متی ۲۱ : ۳۳۔۴۴ گویا باوجود اپنے اپنے کمالات ظاہری و باطنی کے انہوں نے آنحضرت صلعم کے کمالات ظاہری و باطنی کو اس بلند مرتبہ پر پایا کہ آپ کی ہر دو شانوں میں ان کو خدا کی شان نظر آئی ✦

احادیث جن میں ذکر ہے کہ مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو

آنحضرت صلعم کی یہ فضیلت جس کا ذکر اس لطیف پیرایہ میں کلام الٰہی میں پایا جاتا ہے اس کے برخلاف وہ احادیث نہیں جن میں ایسے الفاظ آتے ہیں کہ مجھے موسیٰ پر فضیلت مت دو یا یونس پر فضیلت مت دو۔ کیونکہ اصل میں وہ خاص موقعہ کی باتیں ہیں بخاری کی اس حدیث میں جس میں موسیٰ پر فضیلت نہ دینے کا ذکر ہے۔ یہ واقعہ درج ہے کہ ایک صحابی کا ایک یہودی کے ساتھ اسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا اور آپ کو غالباً یہ خیال گزرا ہوگا کہ ایسا نہ ہو کہ اس طرح مقابلہ میں ایک نبی اللہ کی تحقیر ہو جائے ✦

کلام

اللہ کا کلام بندہ کے ساتھ صرف تین طرح پر ہے

۳۲۵ کلم اللہ۔ کلام۔ الفاظ منظومہ کا نام ہے جو معنی رکھتے ہوں دیکھو نوٹ ۱ اللہ کا کلام کرنا کس طرح ہوتا ہے اس کی تصریح خود قرآن کریم نے الشوریٰ ۴۲ - ۵۱ میں فرمائی ہے جہاں فرمایا کہ صرف تین طرح پر اللہ تعالیٰ کا کلام بندہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک دل میں ڈال کر یعنی وحی خفی۔ ایک پردہ کے پیچھے سے یعنی رویا کشف الہام کی صورت میں۔ ایک ملک یعنی جبرئیل کو بھیج کر۔ ان کے علاوہ اور کوئی طریق کلام کا نہیں۔ امام راغب نے بھی دنیا میں اللہ کے انسان کے ساتھ کلام کرنے کو انہی تین طریقوں پر قرار دیا ہے ✦

رفع

رَفَعَ۔ رَفع کے چار معنی ۹۳ میں بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے یہاں شرف منزلت مراد ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کو رفع کرنا صرف اسی معنی میں آتا ہے۔ اس کو نیچی جگہ سے اٹھا کر بلند جگہ پر رکھ دینے میں جس پر خود اللہ تعالیٰ کا اسم الرافع شاہد ہے جس کے معنی ہیں الذی یرفع للمومن بالاسعاد واولیاءہ بالتقریب (ل)، وہ جو مومن کو نیک بخت بنا کر اور اپنے اولیاء کو قرب عطا فرما کر رفع کرتا ہے ✦

درجات

خدا کا کلام بلا واسطہ ملک

درجات کے پہلے یا کچھ محذوف ہے جیسے فی اور یا درجۃ بمعنی دفعۃ لیکر انتصاب علی المصدر ہے یا حال ہے اور مراد ذو درجات ہے۔ ان الفاظ کا کیا منشاء ہے بصورت کلام سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف بعض رسولوں کے ساتھ کلام ہوا اور بعض کے مرتبے بلند ہوئے ان سے کلام نہیں ہوا۔ اس لئے کسی نے کہا یہاں کلام بلا واسطہ ملک مراد ہے جیسے طور پر حضرت موسیٰ

وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ

اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلے دلائل دیئے اور روح القدس سے اسکی تائید کی ۳۲۶ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ جو ان کے بعد

مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَٰكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ

ہوئے آپس میں نہ لڑتے اسکے بعد کہ انکے پاس کھلے دلائل آچکے تھے لیکن انہوں نے اختلاف کیا پس انمیں سے وہ ہیں جو ایمان لایا اور انمیں سے وہ ہیں جنہے

كَفَرَ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ۝

انکار کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ جو کچھ ارادہ کرتا ہے کر دیتا ہے ۳۲۷

سے اور معراج کی رات آنحضرت صلعم سے۔ مگر یہ ماکان لبشر (الشوریٰ ۴۲-۵۱) کے حصر سے خارج ہے۔ اس لئے وہ کلام بھی ان تینوں اقسام میں سے ایک قسم کا ہو سکتا ہے جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے۔ اور کسی نے کہا کلم اللہ سے مراد حضرت موسیٰ اور رفع بعضہم درجات سے مراد آنحضرت صلعم ہیں۔ مگر یہ تخصیص بلا وجہ ہے۔ کلام تو سب سے ہوا۔ اصل میں یہ ترکیب ایسی ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا ففریقاً کذبتم وفریقاً تقتلون (۸۷) ایک فریق کو تم نے جھٹلایا اور ایک فریق کو قتل کرتے ہو یہ مراد نہیں کہ جن کو قتل کرتے ہو ان کو جھٹلایا نہیں بلکہ وہ پہلا مرتبہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک کے ساتھ تو اسی قدر مخالفت کی کہ ان کے جھٹلانے پر بس کی مگر دوسرے کے لئے قتل کے منصوبے بھی کئے۔ اسی طرح یہاں مراد یہ ہے کہ کلام تو پہلا مرتبہ ہے بعض رسولوں کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ نے کلام ہی کیا یعنی ان کو صرف تعلیم اور ہدایت کے ساتھ بھیجا اور بعض کو کچھ اور مراتب بھی دیئے جیسے بادشاہت جس کا اوپر حضرت داؤد کے ذکر میں بیان ہوا۔ نبوت اور بادشاہت دونوں اکٹھی بہت کم کو ملی ہیں اور ان سب کے سرتاج ہمارے حضرت محمد مصطفیٰ صلعم ہیں +

حضرت عیسیٰ کے ذکر کی وجہ

۳۲۶ ان الفاظ کی تشریح پہلے ہو چکی ہے ۱۱۱۔ یہاں حضرت عیسیٰ کا نام اس لئے لیا کہ جب ایک طرف حضرت داؤد کی فضیلت اس رنگ میں بیان کی کہ ان کو نبوت کے ساتھ بادشاہت دی تو حضرت عیسیٰ جو بادشاہت سے بالکل خالی گزرے ان کا نام بھی لیا کہ ان کو اور رنگ کے کمالات دیئے گئے۔ یا اس لئے کہ حضرت عیسیٰ قومی نبیوں میں سے آخری نبی ہیں اور اس سے اگلے الفاظ میں اس نبی کی طرف اشارہ ہے جو کل دنیا کی طرف آیا +

اقتتال

۳۲۷ اقتتل۔ اقتتال اور مُقاتَلہ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی باہم جنگ کرنا +

سب قوموں کی طرف ایک رسول کے آنے کی ضرورت

یہاں فرماتا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو پہلے جو رسول قوموں قوموں کی طرف بھیجے گئے تھے ان کے بعد ان کے پیرو باہم جنگ نہ کرتے۔ لیکن چونکہ ارادہ الٰہی یہی ہو چکا تھا کہ سب نبیوں کے آخر میں ایک نبی آئے اور وہ سب دنیا کی قوموں کو بھائی بھائی بنائے اس لئے اہل مذاہب نے باہم جھگڑے کئے۔ اور گو مشیت کا بمعنی ارادہ بھی استعمال ہو جاتا ہے مگر اصل میں اللہ کی مشیت اس کا چیزوں کو خاص رنگ میں وجود میں لانا ہے چونکہ اس نے انسان کو بنایا ہی ایسا ہے کہ اس کے اندر قوائے مختلفہ جمع ہوں جن سے اس کی تمام ترقیات پیدا ہوتی ہیں اور قوائے مختلفہ کے غلط استعمال سے ہی جھگڑا پیدا ہوتا ہے اس لئے لوشاء اللہ ما اقتتلوا کے معنی صرف یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو انسان کو ایسا بناتا کہ اس کے اندر قوائے مختلفہ نہ ہوتے مگر اس کی مشیت نے یہی چاہا کہ وہ دوسری مخلوق سے بڑھکر ترقی کرے اس لئے قوائے مختلفہ اس کے اندر رکھے یفعل ما یرید میں یا تو یہی اشارہ ہے کہ انہی قویٰ کے اچھے استعمال سے وہ نیک نتیجہ پالیتا ہے اور بد استعمال سے برا اور یا یہ کہ ارادہ الٰہی یہ ہے کہ کل دنیا کے جھگڑوں اور اختلافوں کے فیصلہ کے لئے ایک رسول کل دنیا کی قوموں کی طرف بھیجے +

ع ۳۴ ۲

اسلام کی کامیابی کی بشارت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا ۲۵۴

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اس میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے خرچ کرو اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں

بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور نہ ہی کوئی سفارش اور کافر ہی ظالم ہیں ۳۲۸

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ ۲۵۵

اللہ اسکے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہمیشہ زندہ خود قائم قائم رکھنے والا ہے ۳۲۹

خلل - خُلّة

۳۲۸ خُلَّة - خَلَل دو چیزوں کی درمیانی کشادگی کو کہتے ہیں اور خُلَّة محبت ہے یا اس لئے کہ وہ دل کے وسط میں ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ وہ دل کے اندر گھس جاتی ہے محبت کو بھی محبت اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حَبَّة القلب کے اندر داخل ہوتی ہے (غ) +

قیامت میں بیع خلت شفاعت کے نہ ہونے کیا مراد ہے

قیامت کے دن جن تین چیزوں کے نہ ہونے کا ذکر کیا ہے یعنی تجارت ۔تعلقات محبت ۔سفارش ۔وہ وہی ہیں جو انسان کیلئے خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے میں روک ہو جاتی ہیں ۔ایک شخص اپنی تجارت میں اس قدر غرق ہوتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا ایک پیسہ بھی اس تجارت سے باہر نکلے ۔اس لئے خدا کی راہ میں دینے سے رکتا ہے ۔یا جہاں تعلق محبت ہوتا ہے وہیں سارا مال خرچ کر دیتا ہے اور خدا کی راہ میں نہیں دیتا ۔یا سفارش یعنی کسی بڑے آدمی کا تعلق مانع ہو جاتا ہے اس لئے جب ضرورت جنگ کا مضمون ختم ہوا تو اسلام کی کامیابی کی بشارت دیتے ہوئے انفاق کی ضرورت اول ظاہر کی جس مضمون کو آگے دو رکوعوں میں بسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور مال کے خدا کی راہ میں دینے میں جو چیزیں مانع ہیں ان کے متعلق فرمایا کہ یہ قیامت کے دن تمہارے کسی کام نہ آئیں گی ۔اور تلافیٔ مافات نہ کرینگی ۔یہاں اصل مقصد بیان کرنے کا صرف اسی قدر ہے کہ اس دنیا کی تجارت ۔اس دنیا کی دوستی اس دنیا کی سفارش وہاں نہ ہوگی کیونکہ یہی چیزیں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے سے روک ہیں ۔اس عالم کی خُلّت اور شفاعت اور چیزیں ہیں جیسا

قیامت کی خلت و شفاعت

کہ دوسری جگہ فرمایا الاخلاء یومئذ بعضھم لبعض عدو الا المتقین (الزخرف ۴۳ - ۶۷) دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہونگے سوائے متقیوں کے معلوم ہوا کہ وہ خُلّت جو اتقاء سے پیدا ہوتی ہے اور جو درحقیقت اس عالم کی چیز نہیں ۔وہ باقی رہے گی یہ دنیا کی دوستی نہ رہیگی ۔اسی طرح فرمایا لا تغنی شفاعتھم شیئا الا من بعد ان یاذن اللہ لمن یشاء ویرضی (النجم ۵۳ - ۲۶) پس وہ شفاعت جس کی بنا اللہ تعالیٰ کی رضا ہے وہ اس کے اذن سے وہاں ہوگی ۔مگر وہ شفاعتیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف ہیں اور جن کا تعلق محض اس دنیا سے ہے وہ باقی نہ رہیں گی +

کفار سے مشابہت

آیت کے آخری الفاظ ۔کافر ہی ظالم ہیں ۔دو باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں ۔اول یہ کہ مومنوں کو جو یہ ضرورت جنگ پیش آئی تو یہ ان کی خواہش سے نہیں بلکہ ظلم کافروں کی طرف سے ہے کہ وہ حق کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں ۔دوسرے یہ کہ خدا کی راہ میں مال نہ خرچ کرنا بھی ظلم ہے کیونکہ اس کا حق ادا نہیں ہوتا یہ کافروں کا کام ہے ۔مومن کے لئے یہ شایاں نہیں یا ڈرایا کہ انفاق سے انکار کر کے کافروں سے مشابہت پیدا نہ کریں +

۳۲۹ الحی ۔وہ جس کے لئے ہمیشہ کی زندگی ہے (ج) یعنی نہ اسکے اول کی کوئی حد بندی ہے نہ آخر کی ۔امام راغب نے جو اقسام حیات بیان کی ہیں ان میں سے چھٹی قسم جو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص کی ہے وہ ہے جس پر موت کا لفظ کبھی صادق نہیں آسکتا پھر بعض لوگوں نے توجیہات کی ہیں کہ وہ حی بالتدبیر ہے یعنی جس طرح چاہتا ہے امور میں تصرف کرتا ہے اور جو اندازے چاہتا ہے مقرر کرتا ہے مگر حق یہ ہے

لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا

اسے اونگھ غالب آتی ہے اور نہ نیند اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کون ہے جو اسکے پاس سوائے اسکی اجازت کے

بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۲۲۹

سفارش کرے وہ جانتا ہے جو کچھ انکے سامنے ہے اور جو کچھ انکے پیچھے ہے اور وہ اسکے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اسکے جو وہ چاہے

کہ اگر حیات مخلوق کی ایک صفت ہے تو خالق کی صفت حیات ضرور ہے کیونکہ جو صفت خالق میں نہیں وہ مخلوق میں پیدا نہیں ہو سکتی وہ حی ہے اور حیات کا سرچشمہ ہے +

قیوم

القیوم، قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ القائم الحافظ لکل شئی والمعطی لہٗ مابہ قوامہ (غ) یعنی خود قایم اور ہر چیز کا حافظ اور اس کو وہ اسباب عطا فرمانے والا جن کے ساتھ اس کا قیام ہے۔ اس کے معنی میں دونوں باتیں شامل ہیں القائم بذاتہ والمقوم لغیرہ یعنی اپنی ذات میں قایم دوسروں کو قائم رکھنے والا +

اخذ

۲۲۹ لا تاخذہ۔ اَخْذ یعنی پکڑنا کبھی قہر یعنی غلبہ کے ساتھ ہوتا ہے (غ) تاخذ کے معنی یہاں یہی ہیں یعنی اس پر غالب آتی ہے

وسن، سِنَة

سِنَة۔ اس کا مادہ وَسَن ہے دونوں کے معنی غفلت اور خواب ہیں (غ) یا سِنَة اونگھ ہے جو نیند تک نہ پہنچے جس پر یہ

سنۃ کو نوم پر مقدم کرنے کی وجہ

شعر بطور شہادت ہے فی عینہ سِنَةٌ ولَیْسَ بنایم (ل) اس کی آنکھ میں اونگھ ہے وہ سویا ہوا نہیں۔ نیند سے پہلے اونگھ کا ذکر اس لئے کیا کہ تاخذہ کے معنی میں غلبہ ہے۔ اونگھ اس پر غالب نہیں آتی بلکہ نیند جو اس سے شدید تر ہے وہ بھی اس پر غالب نہیں آسکتی۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص پر اونگھ تو غالب نہ آئے مگر نیند سے وہ مغلوب ہو جائے +

شفاعت کے لئے ضرورت اذن

یشفع عندہٗ الا باذنہ۔ شفاعت پر دیکھو ۴۸ یہاں شفاعت کیلئے اذن الٰہی کو ضروری قرار دیا ہے اور اس اذن کی ضرورت نہ صرف شفاعت کرنے والے کے لئے ہی بتلائی ہے بلکہ جس کیلئے شفاعت کی جائے اس کے متعلق بھی فرمایا لا یشفعون الا لمن ارتضیٰ (الانبیاء ۲۱ - ۲۸) شفاعت کرنے والے بھی اسی کے متعلق شفاعت کرینگے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرے۔ پس شفاعت نہ تو شفاعت کرنے والے کے اختیار کی کوئی چیز ہے کہ جب چاہے شفاعت کرے اور نہ جس کے لئے شفاعت کی جائے اسے کوئی حق ہے کہ وہ اپنا شفیع پیش کرے۔ شفاعت میں اذن کا مفہوم اصل میں کیا ہے۔ اس کی حقیقت حدیث شفاعت سے منکشف ہوتی ہے اس میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم فرماتے ہیں کہ میں قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں سجدہ میں گر جاؤنگا یہانتک کہ

شفاعت اور دعا

مجھے حکم ہوگا کہ کہو تمہاری بات قبول کی جائیگی اور شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائیگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کی یہ شفاعت بھی درحقیقت قیامت کے دن دعا کا ہی ایک رنگ ہے جس طرح اس دنیا میں آپ نے اپنے صحابہؓ کے لئے اور اپنی اُمت کے لئے دعائیں کر کے ان کو گناہوں سے پاک وصاف کیا۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی آپ ان کیلئے دعا کرینگے اور وہ آپ کی دعا قبول ہو کر آپ کی شفاعت قبول کی جائیگی۔ جو لوگ اس بات کے قایل ہیں کہ اس دنیا میں نیک لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں وہ اس رنگ کی شفاعت کا انکار نہیں کر سکتے۔ اور یہ بات بالکل صاف ہے کہ جب ہمارے نبی کریم صلعم کی شفاعت اس دنیا میں بھی ظاہر ہوئی یہانتک کہ صحابہ کو نہ صرف روحانی طور پر تزکیہ کے مقام پر ہی پہنچایا بلکہ ظاہری طور پر بھی بادشاہت ان کو عطا فرمائی۔ تو قیامت کے دن آپ کی شفاعت کا ظہور ہونا خود ایک ثابت شدہ امر ہے۔ اسلام نے ہر ایک سچائی پر ایسی کامل روشنی ڈالی ہے کہ اس کے کسی پہلو کو تاریکی میں نہیں چھوڑا +

مابین ایدیھم وما خلفھم

ما بین ایدیھم وما خلفھم۔ جو کچھ سامنے ہے وہ امر دنیا ہے اور جو پیچھے ہے وہ امر آخرت ہے (ج) یا اسکے خلاف (غ)

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ○

اس کا علم آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے ۳۲۹ب اور ان دونوں کی حفاظت اس پر بوجھ نہیں اور وہ بہت بلند عظمت الاہے ۳۲۹ج

یا مراد ہیں پہلی گزری ہوئی باتیں اور آیندہ ہونے والی یا محسوس اور غیر محسوس ٭

احاطۃ علم و اجسام یحیطون ۔ احاطۃ دو طرح پر ہے ۔ ایک اجسام میں دوسرا علم میں ۔ علم میں احاطہ سے مراد ہے کہ ایک چیز کے وجود اور جنس اور کیفیت اور غرض کو جو اس سے مقصود ہے پوری طرح جانا جائے ۔ اور یہ بات سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو حاصل نہیں (غ) حتیٰ کہ ایک ریت کے ذرہ کے پورے علم کا بھی انسان احاطہ نہیں کرسکتا ٭

کرسی ۳۲۹ب کُرْسِیّ عرف عام میں وہ چیز ہے جس پر بیٹھا جاتا ہے ۔ مگر یہاں ابن عباس نے کرسی کے معنی علم کئے ہیں اور بعض نے ملک (غ) ابن عباس کی روایت بخاری میں ہے ۔ اس معنی پر ذیل کے اعتراض کئے گئے ہیں ۔ اول ۔ لغت عرب میں کرسی کے معنی علم نہیں آئے ۔ جواب کرسی کے مادہ کرس میں علم کا مفہوم پایا جاتا ہے بلکہ ابن جریر کہتے ہیں کہ کرسی کا اصل مفہوم علم ہے اس لئے ایسے صحیفہ کو جس میں علم کی بات لکھی ہوئی ہو کراسۃ کہا جاتا ہے ۔ اور ایسا ہی تکرس کے معنی علم یعنی جان لیا پر ایک راجز کا قول نقل کیا ہے ۔ اسی وجہ سے علماء کو کراسی (کرسی کی جمع) کہا جاتا ہے (ت) اور زمخشری نے قطرب سے یہ ضرب المثل نقل کی ہے خیر هذہ الحیوان الاناسی وخیر الاناسی الکراسی (ت) یعنی حیوانوں میں سے سب سے بہتر انسان ہیں اور انسانوں میں سب سے بہتر علماء پس جب اصل معنی میں علم موجود ہے تو قرآن شریف کا اس لفظ کو صفات الٰہی میں استعمال کرنا بالکل درست ہے ۔ کیونکہ اس نے مفہوم کو نئے الفاظ میں ہی ادا کرنا تھا ۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کرسی بمعنی علم کی روایت صحیح نہیں اور ابن عباس سے موضع قدمیہ کے معنی ثابت ہیں ۔ جواب وہ معنی بلحاظ ظاہر ہیں اور نہ صرف بخاری اس روایت کو قبول کرتے ہیں بلکہ اور کئی ذرائع سے اس کی تائید ہوتی ہے تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حدیث میں ہے ما السموات السبع والارضون السبع عند الکرسی الا کحلقة ملقاة بارض فلاة یعنی ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے سامنے ایسی ہیں جیسے ایک انگوٹھی بیابان میں جواب یہ حدیث کرسی بمعنی علم لیکر بھی ویسے ہی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے آسمان اور زمین کیا حقیقت رکھتے ہیں خود قرآن شریف سے کرسی کے معنی علم ہی صحیح ثابت ہوتے ہیں ۔ اول سیاق وسباق میں علم کا ذکر ہے ۔ کیونکہ حفاظت بھی بذریعہ علم ہی ہے دوم قرآن کریم میں ایسے بیانات تو بکثرت ہیں کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے یا اس کو وہ جانتا ہے ۔ مگر یہ نہیں آتا کہ جو کچھ کرسی میں ہے وہ اس کا ہے یا اس کو وہ جانتا ہے ۔ اور یہ تو بہرحال ظاہر ہے کہ جیسے خدا کا ہاتھ ہمارے ہاتھوں کی طرح نہیں ۔ اس کی کرسی بھی ہمارے بیٹھنے کی جگہوں کی طرح نہیں بلکہ جیسے کرسی اہل علم کے لئے ہوتی ہے اور اصل غرض اس پر بیٹھنے کی علم ہے پس وہی غرض یہاں مراد ہے دیکھو ۳۲۸ جو اونگھ اور نیند سے بالا ہے وہ بیٹھنے اور لیٹنے سے بھی غنی ہے ولا کرسی فی الحقیقة ولا قاعد (ض) فی الحقیقت نہ کرسی ہے نہ بیٹھنے والا ٭

اود ۳۲۹ج ۔ یؤود ۔ اَوْد سے ہے جس کے معنی جہد و مشقت کو پہنچانا ہیں ٭

آیۃ الکرسی
اسم اعظم

یہ آیۃ کریمہ آیت الکرسی کے نام سے مشہور ہے اور حدیث میں اس کی بڑی عظمت مذکور ہے ۔ ہر فرض نماز کے بعد اس کے پڑھنے کی تاکید ہے ایک حدیث میں ہے کہ یہ سب سے زیادہ عظمت والی آیت ہے اور ایک میں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے ۔ اور احمد ۔ ابوداؤد و ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اس آیت اور آل عمران کی پہلی آیت کو پڑھکر فرمایا ۔ ان دونوں میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے اور ایک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم سورہ بقرہ آل عمران ۔ طٰہٰ میں ہے ۔ اور تینوں میں یہی اسم الحی القیوم آئے ہیں جو اور کسی سورت میں نہیں آئے اور یہ بھی ثابت ہے کہ جنگ بدر میں جب علیحدہ عریش بناکر آنحضرت

۲۵۶ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ

دین میں کوئی زبردستی (منوانا) نہیں۔ ہدایت (کی راہ) گمراہی سے واضح ہو چکی ہے ۳۳۰

صلعم دعا میں مصروف تھے تو آپ کی زبان پر یہی لفظ بار بار آتے تھے یا حی یا قیوم ۔

آیۃ الکرسی میں مذاہب باطلہ کا رد

پس اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ حی و قیوم خدا مسلمانوں کو کافروں کے ہاتھ سے تباہ ہونے سے بچائیگا اور انہیں ایک زندہ قوم بنائیگا۔ نیز اس میں مذاہب باطلہ کا رد ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید کو بیان کیا۔ پھر الحی میں بتایا کہ زندگی اس کی صفت ہے اور اس دنیا میں جو کچھ حیات یا زندگی ہم دیکھتے ہیں یہ اسی کی صفت الحی کا ظہور ہے۔ یہ رد ہے ان لوگوں کا جو مادہ اور روح کو غیر مخلوق مانتے ہیں پھر یہ بتایا کہ اسے اونگھ نہیں آتی عیسیٰ مسیح جس کو خدا بنایا جاتا ہے سوتے تھے۔ ایسا ہی شفاعت کے مسئلہ میں افراط و تفریط کی غلطیوں کو دور کیا۔ جیسے مثلاً عیسائیوں نے تو ایسا دروازہ کھولا کہ جو مسیح کے کفارہ پر ایمان لایا جو چاہے کرے عیسیٰ مسیح اس کے شفیع بن جائینگے۔ اس کے مقابل بعض لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو ایسا قانون کے پنجہ میں جکڑا ہوا سمجھا کہ شفاعت سے کلی انکار کر دیا تو قرآن شریف نے باذنہ کے ساتھ دونوں غلطیوں کو دور کیا کوئی شخص کسی پر ایمان لانے سے شفاعت کا حقدار نہیں ہو جاتا۔ اور احادیث سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن آنحضرت صلعم سجدہ میں گر کر دعا کرینگے یہاں تک کہ آپ کو شفاعت کی اجازت دی جائے گی پس جو لوگ یہاں نیکوں کی دعا کے قبول ہو جانے کو مانتے ہیں۔ وہ شفاعت کا جو وہ بھی ایک دعا کا رنگ اپنے اندر رکھتی ہے انکار نہیں کر سکتے ۔

اکراہ

ن ۳۳۰ اکراہ۔ انسان سے ایسا بوجھ اٹھوانا جسے وہ پسند نہ کرتا ہو ۔

الدین میں ال عہد کا ہے یا اضافت سے بدل ہے اور مراد دین اللہ ہے ۔

غی۔ رشد

غَیّ۔ غَیّ وہ جہالت ہے جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو گو مطلق جہل کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے (غ) اس کے خلاف رُشد ہے یعنی ہدایت۔ رُشد و غی سے حق و باطل مراد ہیں ۔

انصار میں بچہ کو بطور نذر یہودی بنانے کا دستور۔

لکھا ہے کہ اہل مدینہ میں یہ دستور تھا کہ بعض عورتیں جب اولاد زندہ نہ رہے تو نذر مان لیتیں کہ بچہ کو اہل کتاب کے دین میں داخل کر دینگے کیونکہ اس دین کو وہ اپنے دین سے بہتر سمجھتے تھے۔ جب اسلام آیا تو انصار نے چاہا کہ جو اس طرح دین یہود میں داخل ہو گئے تھے ان کو اسلام میں داخل کریں تو یہ آیت نازل ہوئی جس میں اصول یہ بتایا کہ ایک دین سے دوسرے دین میں داخل ہونا اپنی خوشی کی بات ہے جبر اس میں جائز نہیں۔ اور ابن عباس سے مروی ہے کہ قبیلہ بنی سالم بن عوف میں سے ایک شخص کے دو بیٹے عیسائی تھے جب وہ مسلمان ہوا تو آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں انہیں اسلام میں داخل ہونے کے لئے مجبور نہ کروں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

آیت لا اکراہ منسوخ نہیں

یہ الفاظ ایسے صاف اور اس قدر وسیع ہیں کہ دین اسلام پر بجبر پھیلایا جانے کے جس قدر اعتراضات ہیں ان سب کا ایک ہی جواب کافی ہے۔ اور اس کو منسوخ کہنا محض ایک غلط خیال ہے۔ زید یا بکر کے کہنے سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی ہاں رسول اللہ صلعم کا کوئی فرمان ہو تو تسلیم کر لیا جائے اس کو آیت جاھد الکفار والمنفقین سے منسوخ قرار دینا اور بھی غلطی ہے۔ اس حکم کے ماتحت کسی ایک شخص کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا جو بجبر مسلمان کیا گیا ہو اور ایسا حکم تو اس سے پیشتر مکہ میں نازل ہو چکا تھا جاھدھم بہ جہادا کبیرا۔ جب جاھد کا حکم اس کے دونوں طرف موجود ہے یعنی اس کے نزول سے پہلے بھی اور اس کے نزول کے بعد بھی تو اس کو منسوخ کہنا بالکل بے معنی بات ہے ۔

حکم لا اکراہ اہل کتاب سے مقید نہیں۔

ایسا ہی اس کے حکم کو اہل کتاب پر محدود کرنا بھی صریحاً خلاف قرآن ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس حکم کے ساتھ تو دلیل بھی موجود ہے۔ پھر حکم کو منسوخ یا محدود کرنا اس دلیل کو غلط قرار دینا ہے اور وہ دلیل یہ ہے کہ ہدایت کی راہ گمراہی سے متمیز ہو چکی ہے۔ اس لئے بجبر داخل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب حکم منسوخ تب ہو جب یہ تمیز دور ہو جائے جو بالبداہت باطل ہے کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کو اہل کتاب سے مقید کرنا تو ایک طرف رہا میں کہتا ہوں جو دلیل دی ہے اس کی رو سے تو دعویٰ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن

قرآن کریم مسلمانوں کو بھی بجبر کچھ تبدیل منوانا

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى

پس جو شخص شیطان کا انکار کرتا ہے اور اللہ پر ایمان لاتا ہے اس نے ایک محکم جائے گرفت کو مضبوط پکڑ لیا

لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ ۲۵۷

جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۳۳۱ اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے وہ ان کو نکالتا

مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ

اندھیرے سے نکالکر روشنی کیطرف لاتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے ولی شیطان ہیں وہ انہیں روشنی سے

النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰٓـئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

نکالکر اندھیروں کیطرف لیجاتے ہیں یہ آگ والے ہیں وہ اسی میں رہینگے ۳۳۲

شریف اپنے پیرووں کو بھی بجبر کچھ نہیں منواتا۔ بلکہ جو چیز منواتا ہے اس کی دلیل بھی دیتا ہے۔ کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ ہدایت کی راہ واضح ہو چکی بجبر منوانے کی ضرورت ہی کوئی نہیں سب مذاہب کچھ نہ کچھ حصہ انسان سے بجبر منواتے ہیں جسے طبیعت قبول نہیں کرتی مگر اسلام کچھ بجبر نہیں منواتا پس جبر کا کلی استیصال مذاہب میں سے اسلام نے ہی کیا ہے +

طغی۔طغیان ۳۳۱ الطاغوت طَغٰی سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں حد سے گزر گیا لما طغا الماء (الحاقة ۶۹ - ۱۱) اور طُغیان نافرمانی میں حد سے گزرنا ہے

طاغوت طاغوت اس مادہ سے وزن فَعَلُوت پر ہے اور اس سے مراد ہر ایک سرکش۔ اور ہر معبود اللہ کے سوائے ہے واحد اور جمع میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ساحر۔ کاہن۔ مارد جن اور نیکی کے رستے سے پھیرنے والے کو طاغوت کہا جاتا ہے (غ) یہاں طاغوت کے معنی شیطان حضرت عمرؓ سے مروی ہیں بعض نے کاہن بعض نے ساحر بعض نے باطل معبود بعض نے اصنام یعنی بت معنی لئے ہیں فی الحقیقت بدی یا گمراہی کی طرف لیجانے والی سب چیزیں طاغوت کے مفہوم میں شامل ہیں +

استمساک استمسک۔ ایسی مضبوطی سے پکڑنا کہ اس پر ثبات کا قصد ہو +

عری۔عراء۔عروة عُروة۔ اصل میں عُرِیَ سے ہے جس کے معنی ننگا ہونا ہیں عَرَاء وہ مکان جو بالکل کھلا ہو اور اس میں کسی قسم کا سترہ نہ ہو لنبذ بالعراء (القلم ۶۸ - ۴۹) اور عُرَاء کے معنی جانب یا پہلو ہیں اور عُروة وہ چیز جو کسی کی جانب میں ہو اور جسے پکڑا جائے (غ) اس لئے ڈول اور کوزہ کی جائے گرفت کو عُروہ کہا جاتا ہے +

انفصام انفصام فَصَم سے ہے جس کے معنی توڑنا ہیں +

کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ یہاں کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ کو اکٹھا بیان کیا ہے۔ اور جس طرح کفر بالطاغوت سے مراد صرف یہی ہے کہ شیطان کی بات نہ مانے ایمان باللہ سے مراد صرف یہی ہے کہ اللہ کے احکام کی تعمیل کرے جو شخص اس اصول صحیح پر قایم ہو جاتا ہے اس نے ایک مضبوط جائے گرفت کو پکڑا ہے جو ٹوٹتی نہیں یعنی اس کا عمل ضائع نہیں جاتا جیسا کہ معاذ بن جبل کا قول ہے لا انفصام لہا دون الجنة ایمان یا اسلام کو عُروة سے تشبیہ دی ہے اور اسکو زور سے پکڑنا یہ ہے کہ انسان پوری کوشش سے اس پر عمل کرے۔ مجاہد سے روایت ہے کہ ان الفاظ کو پڑھکر آپ نے فرمایا ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم آج وہی عُروہ وُثقیٰ موجود ہے مگر اس پر مسلمانوں کی گرفت نہیں +

ولاء۔توالی ۳۳۲ وَلِیٌ۔ وَلَاء اور تَوَالِی قرب کے لئے استعمال ہوتے ہیں خواہ مکان کے لحاظ سے ہو یا نسبت کے لحاظ سے یا دین کے یا صداقت

۳۵ ع ۳

اللہ تعالیٰ کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے

۲۵۸ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرٰهٖمَ فِي رَبِّهٖٓ أَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيٖ وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيٖ وَأُمِيتُ ؕ قَالَ إِبْرٰهٖمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ۚ

کیا تو نے اس کی (حالت) پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے اسکے رب کے بارہ میں جھگڑا کیا اسلئے کہ اللہ نے اسے ملک دیا تھا جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جو زندگی بخشتا اور مارتا ہے اس نے کہا میں بھی زندگی دیتا اور مارتا ہوں ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال پھر وہ جو کافر تھا مبہوت رہ گیا اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا ۳۴۳

ولایۃ — کے یا نصرت کے یا اعتقاد کے اور ولایۃ کے معنی نصرت اور وَلایۃ کے معنی تولّی امر ہیں یا دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی تولّی امر یعنی کسی

ولیّ - مولیٰ — معاملہ کا متولی ہونا۔ اور وَلِیّ اور مَولیٰ دونوں فاعل کے معنی میں بھی آتے ہیں اور مفعول کے بھی یعنی بمعنی مُوالِی۔ ولایت کرنے والا۔ یا مُوالیٰ جس کی ولایت کی گئی۔ اور اللہ تعالیٰ (بمعنی موالِی) بندہ کا وَلِی بھی کہلاتا ہے اور مولیٰ بھی اور بندہ کو بھی خدا کا وَلِی کہا جاتا ہے (بمعنی مُوالیٰ) مگر مولیٰ نہیں کہا جاتا (غ)۔ اور چونکہ وَلاءۃ کے اصل معنی شدید تعلق قرب ہیں لیس بینہما مالیس منہما (غ)۔ اسلئے اللہ کا بندہ کا ولی ہونا یا بندہ کا اللہ کا ولی ہونا اسی شدید قرب پر دلالت کرتا ہے اور دونوں میں نصرت دینے یا نصرت دیا جانے کے معنی بھی شامل ہیں اور وَلِیّ کے معنی محب بھی ہیں اور صدیق بھی اور نصیر بھی (ت) گویا وَلِی میں قرب اور محبت اور صداقت کا تعلق ہے جسکے ساتھ نصرت ملی ہوئی ہو۔ اسلئے قرآن کریم میں مومنوں کو مومنوں کے ولی کہا گیا ہے اور منافقوں کو منافقوں کے اور کفار کا وَلِی شیطان کو کہا گیا ہے جیسے یہاں بھی ہے اولیاؤھم الطاغوت (اولیاء ولی کی جمع ہے)۔ اور قیامت میں کفار کی ایک دوسرے سے ولایت اور شیطان کی موالاۃ کو منقطع قرار دیا ہے جیسے فرمایا یوم لایغنی مولی عن مولی شیئا (الدخان ۴۴: ۴۱)۔

اللہ کی ولایت مومنوں سے کیا ہے — اللہ کا مومنوں سے تعلق ہے وہ ان کا ولی ہے۔ اور اس کی ولایت یہ ہے کہ جب ایک شخص عملی رنگ میں ایمان لاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو کفر شرک معاصی گندے رسم و رواج فاسد اعتقادات جہالت غرض ہر قسم کی تاریکی سے نکال روشنی میں لے آتا ہے پس سچے ایمان کی یہ علامت ہے کہ انسان تاریکی سے باہر نکل آئے کا فر جو نیکی کی طرف قدم اٹھانے سے انکار کرتا ہے اس کا تعلق روز بروز ظلمت سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک بدی سے دوسری بدی کی طرف قدم اٹھتا ہے اور ایک نیکی سے دوسری نیکی کی طرف۔

نور مفرد اور ظلمات جمع لانے کی وجہ — یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن شریف نے ہمیشہ نور کو واحد میں استعمال کیا ہے۔ اور ظلمات کو جمع میں۔ کیونکہ نور یعنی حق ایک ہی ہے اور ظلمات یعنی باطل بہت سے ہیں۔ نور کے کمال کو ظاہر کرنے کے لئے بھی نور علیٰ نور فرمایا (النور ۲۴: ۳۵) اور اسی کے مطابق ہے وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل (الانعام ۶: ۱۵۴) خدا کی طرف لے جانے والا رستہ ایک ہی ہے اس سے دور لیجانیوالے بہت ہیں۔

بہت - بہتان — ۳۴۳ بُہِت۔ کے معنی ہیں دہشت زدہ اور متحیر رہ گیا۔ بُہتان ایسا جھوٹ جو سننے والے کو متحیر کردے (غ)۔ بخاری میں ہے بُہِت ذَھَبَت حُجَّتُہٗ یعنی اس کو کوئی دلیل نہ سوجھی یا دلیل میں ہار گیا۔

ظالموں کو ہدایت نہ دینے سے مراد — لا یھدی القوم الظالمین۔ قرآن کریم میں بار بار آتا ہے کہ اللہ ظالموں یا کافروں کو ہدایت نہیں کرتا حالانکہ قرآن کریم کو ھدی للناس بھی فرمایا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ ہدایت اور تعلیم دو چیزوں کو چاہتی ہے ہدایت یا تعلیم دینے والے کی طرف سے اس کا دیدینا۔ اور جس کو ہدایت یا تعلیم دی جاتی ہے اس کا اس کو حاصل کرلینا۔ دونوں باتوں سے ہدایت اور تعلیم کامل ہوتی ہے پس جب ہدایت یا تعلیم دینے والے نے اپنا کام کردیا ہو اور جس کو ہدایت یا تعلیم پہنچائی گئی ہے اس نے اسے قبول نہ کیا ہو۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ ۲۵۹

یا اسکی مثال پر (غور نہیں کیا) جو ایک گاؤں پر گزرا اور وہ ویران تھا اسکی عمارتیں گری ہوئی تھیں اسنے کہا اللہ اسے اسکی موت کے بعد کب

مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۗ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ

زندہ کریگا سو اللہ نے اسے ایک سو سال موت کی حالت میں رکھا پھر اسے اٹھایا کہا تو کتنا ٹھہرا۔ اس نے کہا میں ایک دن یا دن کا کوئی

بَعْضَ يَوْمٍ ۗ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى

حصہ ٹھہرا ہوں۔ کہا بلکہ تو سو سال ٹھہرا پس تو اپنے کھانے اور پینے کی چیز کو دیکھ کہ اس پر سال نہیں گزرے اور اپنے گدھے

حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ

کو دیکھ اور تاکہ ہم تجھے لوگوں کیلئے نشان بنائیں اور ہڈیوں کو دیکھ ہم انہیں کس طرح اٹھاتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں ۳۳۴

تو نہ قبول کرنے کے لحاظ سے کہا جائیگا کہ اس نے ہدایت اور تعلیم نہیں دی (رغ) کیونکہ وہ کام اپنے کمال کو نہیں پہنچا مگر یہاں ہدایت سے مراد صحیح دلیل کا دکھانا ہے (دھ)

اس رکوع میں تین آیتیں ہیں۔ اور تینوں میں کسی نہ کسی رنگ میں احیائے موتے کا ذکر ہے۔ گو باقی باتیں مختلف ہوں پس اس رکوع کا اصل منشاء احیائے موتے پر روشنی ڈالنا ہے اس سے پہلے رکوع میں مسلمانوں کو بشارت دی گئی تھی کہ وہ انہیں ایک زندہ قوم بنائیگا۔ اب تین مثالوں سے سمجھایا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کیا کرتا ہے ۔

حضرت ابراہیم بادشاہ سے جھگڑا

پہلی مثال حضرت ابراہیم کی ہے۔ حضرت ابراہیم کا ایک شخص کے ساتھ جھگڑا ہوتا ہے بظاہر وہ کوئی بادشاہ ہے جیسا کہ اس کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے انا احی و امیت۔ مگر ان اٰتٰہ اللّٰہ الملک میں ضمیر حضرت ابراہیم کی طرف جاتی ہے اور مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو دیا تھا کہ زمین مقدس کا وارث آپکو بنایا جائیگا اور ہمیشہ کے لئے آپ کی نسل میں رہے گی۔ اسی پر جھگڑا ہے۔ ایک مادہ پرست انسان جس کے سر میں حکومت کا نشہ ہے کہتا ہے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ یہ طاقتور قومیں جو اس وقت اس سرزمین کی مالک ہیں نابود ہو جائیں اور تمہاری نسل سے ایک زبردست قوم پیدا ہو جائے۔ تو حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ وہ جو میرا رب ہے وہی قوموں کو زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے۔ یہ میری طاقت کی بات بیشک نہیں مگر اللہ تعالیٰ کا یہی قانون ہے کہ آج ایک قوم طاقتور ہے تو کل اس کو تباہ کرکے دوسری اسکی جگہ لے آتا ہے۔ اس کا جواب اس بادشاہ کی طرف سے یہ ہے کہ میں بھی تو بڑا صاحب اقتدار ہوں میں خود جس کو چاہوں زندہ رکھوں جس کو چاہوں ماروں جس زمین کو چاہوں آباد کروں جس کو چاہوں ویران کردوں۔ تو میری طاقت بھی خدا کے برابر ہوئی حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ اگر تمہاری طاقت خدا کے برابر ہے تو پھر خدا تو اپنے قانون کے مطابق سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم مغرب سے نکال کر دکھاؤ جس پر وہ کافر بادشاہ مبہوت رہ گیا اور کوئی بات نہ سوجھی ویسے بھی عموماً بت پرست قوموں میں بادشاہ کو خدا کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم اس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر تم میں خدائی طاقتیں ہیں تو پھر خدا کے قانون کو اول بدل کرکے دکھاؤ۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس نے حضرت ابراہیم کو یہ جواب کیوں نہ دیا کہ تمہارا خدا اس کو مغرب سے نکال کر دکھائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا تو یہ دعویٰ نہ تھا کہ وہ اپنے خدا سے جو چاہیں کرا سکتے ہیں بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے اٹل قانونوں کی طرف ہی توجہ دلا رہے ہیں۔ انہی قانونوں میں سے ایک قانون قوموں کے گرنے اور بننے کا ہے جس کا ایک متکبر بادشاہ انکار کر رہا ہے ۔

کالذی

۳۳۴ کالذی۔ کسائی اور فراء اور اکثر نحویوں نے الذی کے پہلے ک کو اسمیہ بمعنی مثل قرار دیا ہے۔ گویا عبارت یوں ہے او رایت

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۝

پس جب اسکے لئے بات کھل گئی تو اس نے کہا میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۳۴

مثل الذی مر (ل) کیا تو نے اس شخص کی مثال پر غور کیا ....

خاویۃ — خاویۃ خواء اصل میں خالی ہونے کو کہتے ہیں وہ خوت الدار کے معنی ہیں گھر میں کوئی رہنے والا نہ رہا (ل) بخاری میں ہے خاویۃ لا انیس فیہا

عروش — علی عروشہا عروش عرش کی جمع ہے جس کے معنی ہیں چھتی ہوئی چیز اور یہاں بخاری نے معنی کئے ہیں أبنیتہا یعنی اس کی عمارتیں

علی عروشہا — پس علی عروشہا سے مراد ہے اس کی عمارتیں گری ہوئی تھیں ٭

اماتہ اللہ مائۃ عام یعنی سو سال تک ایک حالت میں رکھا جس کو موت کی حالت سے تعبیر کیا ہے ٭

سنہ ۔تسنّہ — یتسنہ ۔سنۃ سے ہے اور سنۃ سال کو کہتے ہیں سَنَہَتِ النَّخلۃ یا تَسَنَّہَتْ کے معنی ہیں اس پر سال گزر گئے ۔ اور یہی معنی سَنَہَ الطعامُ وتَسَنَّہَ کے ہیں (ل) مگر چونکہ کھانے پینے پر ایک مدت گزر جانے سے وہ بس جاتا ہے ۔ اس لئے طعام یا شراب پر جب تسنہ بولا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ لئے جاتے ہیں اس میں تغیر واقع ہو گیا یا سڑ گیا اور فراء نے لم یتسنہ کے معنی کئے ہیں لم یتغیر بمرور السنین علیہ یعنی سالوں کے گزرنے کی وجہ سے اس میں تغیر پیدا نہیں ہوا ٭

نشز — ننشزہا ۔ النشز کے اصل معنی بلند زمین ہیں پھر بلند زمین کی طرف اُٹھ کر جانے پر بھی استعمال ہوا ہے اس لئے محض اُٹھنے پر بھی ۔ و

انشاز — اذا قیل انشزوا فانشزوا (المجادلۃ ۵۸ ۔ ۱۱) اور اسی سے نشوز ہے جو میاں بی بی کے جھگڑے پر بولا جاتا ہے اور انشاز کے معنی مردہ کا زندہ کرنا بھی ہیں ٭

کساء ۔کسوۃ — نکسوہا ۔کساء سے ہے جس کے معنی لباس ہیں ۔کسوۃ بمعنی لباس قرآن شریف میں آیا ہے اوکسوتہم (المائدۃ ۵ ۔ ۸۹) فکسونا العظام لحما (المؤمنون ۲۳ ۔ ۱۴) میں انسان کی پیدائش کے ذکر میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے ٭

احیائے موتی کی دوسری مثال — ۳۳۴ یہ دوسری مثال احیائے موتی کی ہے جو مسلمانوں کو بطور تشفی دی گئی ہے ۔ گویا سمجھایا ہے کہ اگر کبھی تم پر موت بھی آجائے تو اللہ تعالیٰ پھر تم کو زندہ کریگا ۔ کالذی سے صاف ثابت ہے کہ یہ مثالی واقعہ ہے ۔ گویا معنی یوں ہوئے کیا تو نے اس شخص کی مثال یعنی اس کی مثالی حالت پر غور نہیں کیا پس یہاں کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو ایک شخص کو عالم مثال یا عالم رویا میں پیش آیا ہے

حزقیل کی رویا — جب ہم واقعات کو دیکھتے ہیں جن کا ذکر الفاظ قرآنی میں پایا جاتا ہے تو اس کو بالکل حزقیل کی اس رویا کے مطابق پاتے ہیں جس میں ان کو بتایا گیا تھا کہ یروشلم سو سال کی تباہی کے بعد پھر آباد ہو گا ۔ اور یہ بخت النصر کے یروشلم کو تباہ کرنے کے بعد کا واقعہ ہے ۔ بائبل میں اس رویا کا ذکر حزقیل چھتیسویں باب کے آخر اور سینتیسویں باب میں الفاظ ذیل میں ہے ۔

"خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا ۔ اور اس نے مجھے خداوند کی روح میں اُٹھا لیا ۔ اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے بھرپور تھی مجھے اتار دیا ...... اس نے مجھے کہا اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں میں نے جواب میں کہا اے خداوند یہوواہ تو ہی جانتا ہے پھر اس نے مجھے کہا کہ تو ان ہڈیوں کے اوپر نبوت کر اور ان سے کہہ کہ اے سوکھی ہڈیو تم خداوند کا کلام سنو خداوند یہوواہ ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھو تمہارے اندر میں روح داخل کروں گا اور تم جیو گے اور تم پر نسیں بٹھلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تمہیں چمڑے سے مڑھونگا اور تم میں روح ڈالونگا اور تم جیو گے اور جانو گے کہ میں خداوند ہوں سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور جب میں نبوت کرتا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ ایک جنبش اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے اور جو میں نے نگاہ کی تو دیکھ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور چمڑے کی ان پر پوشش ہو گئی پر ان میں روح نہ تھی ...... اور ان میں روح آئی اور وے جی اُٹھے ...... تب اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد یے ہڈیاں سارے اسرائیل ہیں ۔ دیکھ یے کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیاں

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ط ۲۶۰

اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب مجھے دکھا تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ کہا کیا تو نہیں مانتا ہے۔

سوکھ گئیں، اور ہماری اُمید جاتی رہی ہم تو بالکل فنا ہو گئے اس لئے تو نبوت کر اور ان سے کہو کہ خداوند یہوواہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے میرے لوگ میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تمہیں تمہاری قبروں سے باہر نکالونگا اور اسرائیل کی سرزمین میں لاؤں گا۔"

حزقیل کے مکاشفہ کا ذکر قرآن کریم میں

اس سے ظاہر ہے کہ بائبل حضرت حزقیل کے ایک کشف کا ذکر کرتی ہے جس کی ابتدا یہ ہے کہ وہ ایک ہڈیوں سے بھری ہوئی وادی میں بحالت کشف گزرے گویا وہ ایک ویران بستی تھی جیسا کہ قرآن شریف نے فرمایا اور بائبل میں بھی سوال ہے اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں۔ قرآن شریف میں بھی ہے انی یحی ھذہ اللہ بعد موتھا اور کشف میں ان کو دکھایا گیا کہ کس طرح ہڈیوں کو اٹھایا جاتا اور ان پر گوشت چڑھایا جاتا ہے جس کو قرآن شریف نے کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحما میں بیان فرمایا۔ اور بائبل میں ہے کہ یہ ہڈیاں بنی اسرائیل ہیں۔ قرآن شریف میں بھی ہے ولنجعلک اٰیۃ للناس اور الناس سے مراد یہاں انہی کی قوم بنی اسرائیل ہے پس یہ مطابقت صاف بتاتی ہے کہ دونوں جگہ ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے۔ اور وہ واقعہ عالم مثال کا ہے جسے بائبل نے ان الفاظ میں ظاہر کیا کہ خداوند کی روح مجھ پر تھی۔ اور قرآن شریف نے ایک ف سے اس واقعہ کے مثالی ہونے کی طرف اشارہ کر دیا۔ ہاں قرآن شریف میں کچھ امر زائد ہے۔ اور وہ ہے حالت موت کا سو سال رہنا۔ سو یہاں بائبل کی کمی کو بھی پورا کر دیا ہے۔ اور ایک پیشگوئی بھی کی ہے۔ کیونکہ امر واقع

یروشلم کیلئے پیشگوئی

یہ ہے کہ بنی اسرائیل پر وہ مردہ ہونے کی حالت ایک سو سال رہی تھی گو بائبل میں اس کا ذکر نہیں بخت النصر نے ۵۸۶ قبل مسیح میں یروشلم پر چڑھائی کر کے اس کو فتح کیا۔ اور ۵۳۶ قبل مسیح میں بابلیوں کی تباہی کے بعد خورس شاہ ایران نے یہودیوں کو واپس آ کر آباد ہونے کی اجازت دی اور ۴۹۰ قبل مسیح تک یہ دوبارہ آباد ہوتا رہا گویا یہ ۹۶ یا قریباً ایک سو سال کا زمانہ موت کا گزرا اور پیشگوئی یہ تھی کہ قریباً بالکل اسی قدر زمانہ یروشلم پر وہ گزرا جب عیسائیوں نے صلیبی جنگوں میں اسے مسلمانوں کے ہاتھ سے لے لیا تھا اور پھر دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھ میں اس کا آنا اس کی زندگی تھی۔ اور شاید انہی واقعات کا اب پھر اعادہ ہونے والا ہے یا خدا چاہے تو مسلمانوں کو اب یروشلم پھر جلد دوبارہ دلا دے۔ قرآن شریف کا اس سو سال کے واقعہ کا ذکر کرنا اور بائبل میں اس کا ذکر نہ ہونا مگر تاریخی واقعات سے اس کا صحیح ثابت ہونا اور پھر پیشگوئی کے طور پر بھی اس کا ٹھیک صادق آنا ایسا باریک علم غیب ظاہر کرتا ہے جو عرب کے ایک امی کو تو کیا کسی انسان کو بھی حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

قبل اس کے کہ میں کچھ اور الفاظ کی تشریح کروں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تفاسیر کے مختلف اقوال میں جو اس آیت کے متعلق ہیں عکرمہ اور ربیع اور وہب نے کہا ہے کہ یہ بیت المقدس کا ذکر ہے جس کو بخت النصر نے برباد کر دیا تھا۔ اور روح المعانی میں ہے کہ یہ قول سب سے زیادہ مشہور ہے پس یوں سلف کی شہادت بھی اسی پر ہے۔

رؤیا میں سو سال کی موت کیوں دکھائی گئی

قابل تشریح یہ امر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پوچھا تو کتنا ٹھہرا۔ تو جواب میں نبی کہتا ہے دن یا دن کا کچھ حصہ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بلکہ تو سو سال ہی ٹھہرا۔ سو بلحاظ رؤیا کے تو دن کا کچھ حصہ ہی گزرا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ سو سال تو ٹھہرا ہے۔ تو یہ اس حقیقت کے اظہار کیلئے تھا۔ اصل غرض تم کو یہ سو سال کی موت کا رؤیا دکھانے کی یہی ہے کہ تمہاری قوم پر یہ موت سو سال تک رہے گی۔ سو چونکہ تم اپنی قوم کے قائم مقام ہو اس لئے حالت لبث یا حالت موت فی الحقیقت سو سال ہی ہے ہاں تم کو ہم نے یہ نقشہ ایک رؤیا میں دکھایا ہے سو دیکھ لو تمہارا کھانا پینا سب اسی طرح موجود ہے اور تمہارا گدھا بھی اسی طرح زندہ موجود ہے (قرآن کریم نے کہیں نہیں فرمایا کہ گدھا مردہ تھا اس کی ہڈیوں پر گوشت چڑھایا تھا بلکہ صاف فرمایا کہ اپنے کھانے پینے کو دیکھ لو اور اپنے گدھے کو دیکھ لو) اس میں یہ اشارہ تھا کہ جس طرح تمہارے یہ کھانے پینے کے سامان اور تمہاری سواری کا سامان اصلی موجود ہے اسی طرح پر تمہاری قوم پھر اپنی اصلی حالت پر آ جائیگی اور پھر

قَالَ بَلٰی وَلٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ ؕ قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَۃً مِّنَ الطَّیۡرِ فَصُرۡهُنَّ

کہا ہاں مگر اس لئے کہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو کہا تو چار پرندے لو پھر انہیں اپنی طرف

اِلَیۡکَ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنۡهُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُهُنَّ یَاۡتِیۡنَکَ

مائل کرو پھر ان میں سے ایک ایک حصہ ہر ایک پہاڑ پر رکھ دو پھر ان کو بلاؤ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے

سَعۡیًا ؕ وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۶۰﴾

آجائینگے اور جان لو کہ اللہ غالب حکمت والا ہے ۳۳۵ف

وطن میں آباد ہو جائے گی۔ اور سو سال کو ایک دن میں گزار دینا اس میں یہ اشارہ تھا کہ وعدہ ابراہیمی کے اس کو خلاف نہ سمجھا جائے کہ یروشلم تمہارے ہاتھ میں نہیں۔ سو سال خدا کے ہاں ایک دن کی طرح ہے ✦

صَوۡر۔ صُرۡ

صاد صلہ الیٰ کے ساتھ

۳۳۵ف صُرۡ۔ باب صَارَ یَصُوۡرُ مادہ صَوۡرٌ سے ہے جس کے معنی اَلۡمَیۡلُ یعنی مائل ہونا ہیں (غ۔ ل) خود اس آیت میں فَصُرۡهُنَّ کی تفسیر وَجِّهۡهُنَّ سے کی ہے (ل) یعنی ان کو اپنی طرف متوجہ کر۔ اور زجاج کا قول نقل کیا ہے کہ اہل لغت کے نزدیک فَصُرۡهُنَّ اِلَیۡکَ کے معنی اَمِلۡهُنَّ وَاَجۡمِعۡهُنَّ اِلَیۡکَ ہیں (ل) یعنی مائل کر اور اپنی طرف اکٹھا کر۔ اور یہ جو معنی منقول ہیں کہ صُرۡتُ الشَّیۡءَ قَطَعۡتُہٗ وَفَصَلۡتُہٗ یعنی میں نے اس کو قطع کر دیا اور اس کا فیصلہ کر دیا جس کی سند میں شعر پیش کیا ہے صُرۡ نَابِہِ الۡحُکۡمَ تو اس قطع کرنے سے مراد قیمہ کرنا نہیں بلکہ فیصلہ کے طور پر کسی بات کا قطع کرنا ہے۔ اور دوسرے صُرۡ کا صلہ جب اِلٰی ہو جیسے یہاں قرآن شریف میں ہے تو اس کے معنی قطع نہ موزون ہیں اور نہ ہی لغت میں آئے ہیں۔ بلکہ اس صلہ کے ساتھ معنی صرف مائل کرنا ہی ہیں۔ مگر مفسرین کے خیال میں چونکہ یہ سمایا ہوا ہے کہ یہاں مراد قیمہ کرنا ہی ہے اس لئے یا تو فَصُرۡهُنَّ کے بعد فقطعھن محذوف فرض کرتے ہیں گویا مطلب یہ ہوا کہ پہلے ان کو ہلا لے پھر ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور یہ آخری حصہ اپنی طرف سے فرض کیا ہے۔ اور یا صلہ اِلٰی کی تقدیم و تاخیر کر لی ہے یعنی یوں عبارت بناتے ہیں فخذ الیک اربعۃ من الطیر فصرھن (ل)، مگر یہ بالبداہت غلط ہے کیونکہ اس طرح ایک فعل کا صلہ دوسرے فعل کی طرف منتقل کرنے سے امن اٹھ جاتا ہے۔ ملا غب نے صُرۡ کے ایک معنی صِحۡ بھی کئے ہیں یعنی ان کو آواز دو مگر اس سے مراد بھی وہی ہے۔ بیضاوی نے صرف یہی معنی قبول کئے ہیں فَاَمِلۡهُنَّ وَاضۡمُمۡهُنَّ یعنی ان کو مائل کر اور ان کو ہلا لے مگر پھر جزۡئھن محذوف مانا ہے یعنی ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ✦

جزء

جُزۡءًا۔ جُزۡءٌ کسی شے کا حصہ ہے چار پرندوں کی جزو یہی نہیں کہ سب کو قیمہ کیا جائے اور پھر ملایا جائے اور پھر حصہ لیا جائے بلکہ چاروں میں سے ہر ایک چار کا جزو ہے۔ قرآن شریف میں ہے لِکُلِّ بَابٍ مِّنۡهُمۡ جُزۡءٌ مَّقۡسُوۡمٌ (الحجر ۱۵۔ ۴۴) اسکے یہ معنی نہیں کہ سب لوگوں کو اکٹھا کر کے ان کا قیمہ کر کے پھر حصے بنائے جائینگے۔ بلکہ کل لوگوں میں سے چند لوگ ان کا ایک جزو ہیں ✦

کیفیت احیائے موتےٰ کا سوال

یہ تیسری آیت ہے جس میں احیائے موتےٰ کا ذکر ہے۔ پہلی آیت میں احیائے موتےٰ کا دعویٰ ہے۔ دوسری میں ایک نظیر احیائے موتےٰ کی تاریخ اسرائیل سے پیش کی ہے اور اب تیسری میں کیفیت احیائے موتےٰ کا بیان کیا ہے۔ حضرت ابراہیم کا ایمان تو اس وعدہ الٰہی پر تھا وہ اطمینان قلب کے لئے اس کی کیفیت کا سوال کرتے ہیں۔ یہاں شک کوئی نہیں کیونکہ شک ایمان کے منافی ہے۔ ایک کام کو ہم ہوتا ہوا دیکھتے اس کو صحیح مانتے ہیں۔ نطفہ سے انسان بنتا ہے بیج سے درخت بنتا ہے۔ مگر کیفیت سے ناواقف ہیں کہ یہ کیونکر ہو جاتا ہے پس واقعہ میں تو حضرت ابراہیم کو شک نہیں کہ احیائے موتےٰ ہو جائے گا۔ وہ مانتے ہیں بلکہ ابھی ایک کافر بادشاہ سے بحث کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ احیائے موتےٰ کیا کرتا ہے اب صرف وہ کیفیت احیائے موتےٰ کا سوال کرتے ہیں ✦

۳۶
ع

خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کا نتیجہ

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ ۲۶۱

ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ایک دانہ کی مثال ہو جو سات بالیں اُگائے

مردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں۔

اس کیفیت کو سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک مثال دی ہے چار جانوروں کو لو اور ان کو ہلا لو پھر چار مختلف سمتوں میں ان کو ایک ایک کر کے رکھدو۔ پھر بلاؤ اور دیکھو کہ کس طرح تمہاری آواز پر بھاگے چلے آتے ہیں۔ اس مثال سے حضرت ابراہیم کو سمجھ میں آگیا یعنی کیفیت کا پتہ لگ گیا کہ باوجودیکہ ایک پرند انسان سے بہت دور رہنے والی اور بھاگنے والی چیز ہے لیکن انسان جب اسے ہلالے تو یہانتک اسے اپنے حکم کے تابع کر سکتا ہے کہ اس کی آواز پر وہ اُڑا چلا آتا ہے تو جب انسان میں اور اس کی ہلائی ہوئی چیز میں ایسا شدید تعلق محض ایک عارضی تدبیر سے پیدا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا تصرف جو خالق و مالک ہے کیوں اس سے بڑھکر نہ ہو۔ ایک مردہ قوم کس طرح زندہ ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ بھلائی کے کام جو ان کی فلاح کا موجب ہوں ان کو کرنے کی توفیق مل جاتی ہے اللہ تعالیٰ جس قوم کو زندہ کرنا چاہتا ہے اس کی زندگی کے اسباب جمع کر دیتا ہے کیونکہ وہی خالق اسباب ہے اس کے تصرف میں سب چیزیں ہیں۔ خود لفظ طیر کے استعمال میں نیک و بد اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ لفظ طائر نیک و بد اعمال پر استعمال ہوا ہے۔ وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ (بنی اسرائیل - ۱۳) جہاں طائر کے معنی ہی اعمال ہیں۔ اور چونکہ اس مثال سے حضرت ابراہیم کو اصل کیفیت معلوم ہو جاتی ہے اس لئے ان کو یہ ضرورت بھی پیش نہیں آتی کہ وہ ایسا کر کے بھی دیکھیں اور نہ ان کے قرآن شریف میں ایسا کرنے کا ذکر ہے۔ کیونکہ یہ ایک مثال بر رنگ دلیل تھی اور حضرت ابراہیم جانتے تھے کہ ایسا ہوتا رہتا ہے +

اور اگر اس کو وہی واقعہ سمجھا جائے جو مفسرین بیان کرتے ہیں تو اس سے کئی وساوس پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں یہ معلوم ہوگا کہ حضرت ابراہیم کو واقعی شک تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے جبتک چار مردہ جانوروں کو زندہ ہوتے نہیں دیکھ لیا ان کو یہ یقین نہ آیا جو ایمان کے منافی ہے اور باایں ایک واقعہ کو ہوتا دیکھ کر اس کی کیفیت کا پتہ نہیں لگتا ہم ہر روز درخت سے بیج اور نطفہ سے انسان بنتا دیکھتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ کس طرح ایسا ہوتا ہے پس کیف تحی الموتی کا یہ جواب کوئی نہیں کہ مردہ جانوروں کو پھر زندہ ہوتے دیکھ لیا۔ کیف کا جواب صرف وہی دلیل ہو سکتی ہے جو قلب کو مطمئن کر دیتی ہے کہ فی الواقع عالم میں ایسا ہی ہو رہا ہے اور مزید برآں اس اطمینان قلب کی جو حضرت ابراہیم کو حاصل ہو گیا کیا ہم کو ضرورت نہیں۔ اگر تو ان کو اطمینان یوں ہوا تھا کہ ان کے سامنے چار مردہ جانور زندہ ہو گئے تو ہم کو یہ اطمینان کبھی میسر آ سکتا ہی نہیں۔ اور اگر وہ دلیل ان کیلئے موجب اطمینان ہوئی تھی تو ہمارے لئے بھی وہی دلیل کام دے سکتی ہے اور سکون و اطمینان کا موجب ہو سکتی ہے۔ بخاری میں جو حدیث اس آیت کی تفسیر کے رنگ میں مروی ہے وہ اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ یہ ایک دلیل ہے کوئی واقعہ نہیں۔ اس حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ اِذْ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ہم ابراہیم سے زیادہ شک کے حقدار ہیں جب اس نے کہا اے میرے رب مجھے دکھا کہ تو کس طرح مردے زندہ کرتا ہے یعنی اگر حضرت ابراہیم کو شک پیدا ہوا ہوتا تو ہم کو اس سے بھی زیادہ ہونا چاہئے تھا۔ بالفاظ دیگر جس اطمینان قلب کی ضرورت حضرت ابراہیم کو تھی اس کی ہم کو بھی ہے اس لئے جس راہ سے حضرت ابراہیم کو اطمینان ہوا ہمیں بھی ہونا چاہئے۔ لیکن ہم تو چار جانوروں کو قیمہ کر کے پھر بلائیں تو وہ کبھی اُڑتے ہوئے نہیں آتے نہ نبی کریم صلعم کی موجودگی میں ایسا ہوا پس وہ کونسا امر ہے جس سے ہمارا اطمینان قلب ہو وہ یہی صورت ہے کہ ان الفاظ میں جو مثال ہے وہ ایک دلیل کے رنگ میں ہو تو دلیل ایک ایسی چیز ہے جو جس طرح آج سے ہزارہا سال پیشتر کسی کو مطمئن کر سکتی تھی اسی طرح آج کر سکتی ہے مگر واقعہ جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے وہ جبتک ہر شخص نہ دیکھے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ رہا یہ امر کہ حضرت ابراہیم کے سامنے ایسا ہوا ہوگا سو وہ تو پہلے بھی حاصل ہے کہ خدا ایسا کر سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم کے سامنے ایسا ہونے سے اس میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ یہ دلیل نہ صرف دنیا میں احیائے موتیٰ پر صادق آتی ہے بلکہ قیامت میں احیائے موتے پر بھی وہی کام دیتی ہے +

حدیث کی شہادت کہ سوال کیفیت سے تھا

فِی کُلِّ سُنۡۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ ؕ وَ اللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ۝

ہر ایک بال میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے کئی گنا کر کے دیتا ہے اور اللہ بہت دینے والا جاننے والا ہے ۝

انفاق فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے

۳۳۶؎ سبیل اللّٰہ - دیکھو ۱۹۳ اللہ کی راہ یا اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی راہ اس کا دین ہے پس انفاق فی سبیل اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت یا ترقی کے لئے اموال کا خرچ کرنا ہے۔ اور چونکہ جہاد بھی حقیقتاً دین کی ترقی اور حفاظت میں کوشاں ہونا ہے اس لئے بعض نے کہا ہے کہ عرف قرآن میں فی سبیل اللّٰہ جہاد سے مختص ہے۔ جہاد بالسیف ایک خاص اور وقتی ضرورت ہوتی ہے جہاد کبیر وہ ہے جو ہر وقت ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان ۲۵: ۵۲) یعنی اس قرآن کے ذریعہ سے ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو پس انفاق فی سبیل اللہ کا اصل مفہوم ترقی دین اسلام پر خرچ کرنا ہے گو دیگر خیراتی کام بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں +

سنبلۃ

سنبلۃ۔ اس کا اصل بھی سبل ہے اور معنی خوشہ ہیں۔ جمع سَنَابِل +

قوم کی زندگی کے اسباب کیا ہیں

اس سے پہلے ضرورت انفاق کا مضمون چلا آتا ہے اس رکوع میں یہ ذکر ہے کہ انفاق کا نتیجہ کیا ہے اور اس نتیجہ کو ضائع ہونے سے کیونکر بچایا جا سکتا ہے اسی لئے اس میں اخلاص کی ضرورت اور ریا سے بچنے کا ذکر کیا ہے پچھلے رکوع میں مسلمانوں کو زندگی کی بشارت دی اور اس سے پچھلی آیت میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو زندہ کرنا چاہے تو اس کے اسباب اکٹھے کر دیتا ہے اب انہی اسباب کا ذکر کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ افراد کی قربانیاں قوم کی زندگی کا موجب ہوتی ہیں۔ اور مالی قربانیوں کی ضرورت ہر وقت ہر قوم کو پڑتی ہے اس لئے ان کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی +

بیج کی مثال اور انجیل سے مقابلہ

خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کو اس بیج کے بونے سے مشابہت دی ہے جس سے ایک دانہ سے سات سو دانہ بنتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی دو چند اور کئی گنا ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بغیر حساب رزق بھی اس کا نتیجہ ہے۔ جیسا موقعہ ہو جس قدر اس میں اخلاص ہو جس قدر اس کے لئے کوشش کی جائے اسی کے مطابق نتیجہ ہوگا حضرت مسیح نے بھی انجیل میں ایک دانہ کے بڑھنے کی مثال دی ہے مگر تیس گنا، ساٹھ گنا حد سو گنا بڑھنے کا ذکر کیا ہے (متی ۱۳: ۲۳) قرآن کریم سات سو گنا سے شروع کر کے اسے چند در چند کرنے کا وعدہ دیتا ہے اور یہ نرا وعدہ ہی نہیں بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں ہی اس وعدہ کا ثبوت بھی مل جاتا ہے بیکڑوں دیئے تو لاکھوں اور کروڑوں پائے عرب کی دولت کیا ہوگی اس کو خرچ کر کے قیصر و کسرٰی کے خزانوں کے مالک ہو گئے بعض لوگوں کو ایک غلطی لگی ہے کہ وہ ایک پیسہ

دہ در دنیا

جیب سے دیکر یہ چاہتے ہیں کہ فوراً دس پیسے ان کی جیب میں غیب سے آ پڑیں دہ در دنیا سنا ہوا ہے مگر نظر اتنی تنگ ہے کہ کبھی اس کے معنوں پر غور نہیں کرتے دہ در دنیا تو ادنٰی سے ادنٰی ہے اللہ تعالیٰ تو سات سو گنا بلکہ اس سے بھی چند در چند کا وعدہ دیتا ہے۔ مگر وہ آخا یوں ہے کہ قومی اور دینی مفاد پر جو اموال خرچ کئے جاتے ہیں وہ قوم کو خدا کے فضلوں کا وارث بنا دیتے ہیں اور جب قوم میں دولت آتی ہے تو بحصہ رسدی اس کے سب افراد اس میں حصہ دار ہو جاتے ہیں۔ قومی زندگی ہی اصل زندگی ہے اسی کی طرف قرآن شریف بار بار توجہ دلاتا ہے۔ مگر تنگ دل انسان اپنا مال صرف اسی کو سمجھتا ہے جو اس کی جیب میں ہو +

اسلام کی ترقی انفاق فی سبیل اللہ سے ہوگی

اب بھی مسلمانوں پر سے ذلت و ادبار کی حالت دور نہیں ہو سکتی جبتک کہ وہ خدا کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرنا نہ سیکھیں اپنے شغلوں پر شادیوں اور ماتموں کے موقعہ پر بید ریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں مگر خدا کی راہ میں دینے کے وقت مفلس بن جاتے ہیں دین اسلام کی ترقی انفاق فی سبیل اللہ سے وابستہ ہے جبتک اس اصول قرآنی کو اپنی زندگیوں کا عملی رہنما نہ بنائیں کامیاب نہیں ہو سکتے مسلمانوں میں مال و دولت کی کمی نہیں مگر وہ دل نہیں جو خدا کے وعدوں پر سچا ایمان رکھتا ہو اور اس کی راہ میں مال و دولت کو لٹا دے +

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ ۲۶۲
وہ لوگ جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے پیچھے جو خرچ کیا نہ احسان جتاتے ہیں اور

لَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ ۲۶۳
نہ دکھ دیتے ہیں ان کیلئے انکا اجر انکے رب کے پاس ہے اور انہیں کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہونگے [۳۳۷] نیک بات

مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝
کہنا اور مغفرت اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے اور اللہ غنی بردبار ہے [۳۳۸]

مَنّ

۳۳۷ مَنّ ۔ مِنَّۃ کے معنی بھاری نعمت ہیں (مَنّ مشہور وزن ہے چالیس سیر) اور مَنّ ایک تو فعل سے ہے جس کے معنی ہیں اس کو بھاری نعمت دی اتنی بڑی نعمت جس کے بوجھ کے نیچے وہ دب گیا۔ جیسے فرمایا مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ (اٰل عمران ۳ - ۱۶۳) فمن اللّٰہ علیکم (النسآء ۴ - ۹۴) مَنَنَّا عَلٰی موسٰی وھارون (والصّٰفّٰت ۳۷ - ۱۱۴) نرید ان نمن علی الذین استضعفوا (القصص ۲۸ - ۵) اور یہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ اور دوسرا مَنّ قول سے ہے یعنی لفظوں میں جتانا کہ ہم نے یوں کیا ہے اور یہ قبیح ہے (غ)، اسی مَنّ کا یہاں ذکر ہے۔ اسی کی مثل ہے یمنون علیک ان اسلموا (الحجرات ۴۹ - ۱۷) اور مَنّ کے معنی قطع بھی آتے ہیں۔ گویا احسان جتانا اس نعمت کو قطع کر دیتا ہے۔

انفاق کی پہلی غرض ترقی دین ہے۔

یہاں بھی فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے مراد اولاً ترقی دین کے لئے خرچ کرنا ہی ہے جیسا کہ مفسرین نے اس کے ماتحت غزوہ تبوک میں حضرت عبدالرحمٰن کے آٹھ ہزار درہم میں سے جو ان کے پاس تھے چار ہزار درہم دینے کا اور حضرت عثمان کے ایک ہزار اونٹ مع سامان دینے کا ذکر کیا ہے لکھا ہے کہ اس پر آنحضرت صلعم حضرت عثمان کے لئے بار بار دعا کرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی یا رب ان عثمان بن عفان رضیت عنہ فارض عنہ اے میرے رب عثمان بن عفان سے میں راضی ہوا تو بھی اس سے راضی ہو جا۔ ان واقعات کو جن کا تعلق غزوہ تبوک سے ہے اس آیت کے شان نزول میں بیان کرنا جو مدت پہلے کی نازل شدہ ہے بتاتا ہے کہ شان نزول سے مراد کسی واقعہ کا کسی آیت کے ماتحت آنا ہے نہ کچھ اور۔ ایسے چندوں کی صورت میں مَنّ یہ ہے کہ چندہ دیکر فخر کرے کہ میں نے اس قدر چندہ دیا ہے جیسے دوسری جگہ ہے۔ یمنون علیک ان اسلموا خدا کی راہ میں دیکر یہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک فرض تھا یا ایک امانت تھی جو ادا ہو گئی کیونکہ مومن کا مال تو خدا کا مال ہے جیسا ان اللّٰہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم واموالھم سے ظاہر ہے اور اذیٰ یہ ہے کہ دوسروں کو یہ کہکر دکھ پہنچائے کہ فلاں نے تھوڑا دیا ہے یا فلاں نے نہیں دیا۔

بغیر انفاق خوف و حزن کی حالت دور نہ ہوگی۔

انفاق فی سبیل اللہ کا نتیجہ نہ صرف اجر ہے جس کو بلحاظ اس کی قوت یا کثرت کے یا تاکید کے طور پر عند ربھم فرمایا بلکہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کی حالت بھی اسی کا نتیجہ ہے یعنی مالی قربانیوں سے قوم خوف و حزن کی حالت سے نکل کر کامیابی کی منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہے یعنی دشمن کا خوف باقی نہ رہے گا۔ اور جس قربانی پر انسان کو کامیابی حاصل ہو اس پر وہ کبھی پچھتاتا نہیں۔ آج بھی مسلمان اگر خوف و حزن کی حالت سے نکلنا چاہتے ہیں تو یہی راہ ہے لیکن قربانی کے بغیر کچھ نہ بنے گا۔

الغنی غنی

۳۳۸ غنی ۔ الغنی ۔ جو اسمائے الٰہی میں سے ہے اس کے معنی ہیں وہ جو کسی کا محتاج نہیں اور ہر ایک شخص اس کا محتاج ہے (ت) اور یہ غنا مطلق ہے۔ اور وہ المُغْنِی بھی ہے یعنی اپنے بندوں کو غنی کرتا ہے مگر یہ غنائے مطلق نہیں جسے عدم حاجت سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ حاجات کا کم کر دینا ہے جیسا کہ فرمایا وجدک عائلا فاغنی (الضحیٰ ۹۳ - ۸) یا جیسا حدیث میں ہے اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ (غ)، اور محض مال کی زیادتی پر بھی بولا جاتا ہے جیسے من کان غنیا فلیستعفف (النسآء ۴ - ۶)

۲۶۴ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے صدقوں کو احسان جتانے اور دکھ دینے سے باطل نہ کرو ۳۳۹ اس شخص کی طرح

يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ

جو اپنا مال لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہو اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتا سو اس کی مثال

كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا

اس صاف چٹان کی سی ہے جس پر مٹی ہو پھر اس پر زور کا مینہ پڑے اور اسے بالکل صاف کرکے چھوڑ دے اس میں

يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

سے کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا جو کمایا تھا اور اللہ کافر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا ۳۴۰

بھلی بات بتانا بھی صدقہ ہو — قول معروف سے مفسرین نے سائل کو اچھی بات کہکر رد کردینا اور مغفرۃ سے سائل کی پردہ پوشی یا خدا کی حفاظت مراد لی ہے مگر چونکہ یہاں ذکر مال کے دینی ترقیات میں خرچ کرنے کا ہے اس لئے قول معروف سے مراد لوگوں کو بھلائی کی باتیں بتانا ہو سکتا ہے اور مغفرۃ سے یہ کہ ایسا شخص خود دوسروں کو معاف کرے یا اللہ تعالیٰ کی مغفرت حاصل کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ دے نہیں سکتے تو پھر قول معروف اور دوسروں کی پردہ پوشی سے ہی کام لو۔ یہ بھی ایک خدمت دینی بلکہ ایک صدقہ ہے +

باطل۔ ابطال — ۳۳۹ تبطلوا۔ باطل نقیض حق ہے یعنی وہ چیز جس کو ثبات نہ ہو۔ اور ابطال یہ ہے کہ کسی چیز کو فاسد کر دیا جائے یا اسے بالکل نیست و نابود کر دیا جائے خواہ فی نفسہ وہ چیز حق ہو یا باطل (غ)۔ +

صدقہ کے ابطال سے مراد — صدقات کا باطل ہونا یہ ہے کہ وہ عظیم الشان نتائج جو ان پر مترتب ہونے تھے ان سے انسان محروم ہو جائے صدقہ مثل ایک بیج کے ہے جو پھل لاتا ہے۔ من اور اذیٰ ایسی آفات ہیں جو اس پھل کو تباہ کر دیتی ہیں جیسا کہ اس رکوع کی آخری تمثیل میں بتایا +

رئاء — ۳۴۰ رئاء۔ رای کے معنی ہو دیکھا۔ اور رئاء۔ دوسروں کو دکھانا اور شائع کرنا (غ)۔ +

صفوان — صَفْوَان۔ اور صَفَا کے ایک ہی معنی ہیں صاف پتھر ۱۹۷ واحد صَفْوَانَةٌ ہے +

وابل — وَابِل۔ اس بارش کو کہتے ہیں جو وزنی قطروں والی ہو یعنی زور کی بارش۔ اور اصل مادہ میں ثقل یا بوجھ کے معنی ہیں اسی لحاظ سے

وبال وبیل — ہی وبال ایک امر کے ضرر دینے والے نتیجہ کو کہا جاتا ہے ذاقوا وبال امرھم (الحشر ۵۹-۱۵) اور وبیل وہ ہے جس کے وبال کا خوف ہو فاخذنٰہ اخذا وبیلا (المزمل ۷۳-۱۶) (غ) +

صلد — صَلْد وہ سخت پتھر جس پر کوئی چیز نہیں اگتی اس لئے رَاْسٌ صَلْدٌ اس سر کو کہا جاتا ہے جس پر بال نہ اگیں (غ)۔ +

ریا کے خرچ کی مثال — ریا سے مال خرچ کرنے کی مثال اس پتھر سے دی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہے اور بیج جو ڈالا جائے اگتا نظر آتا ہے مگر جڑ نیچے نہیں جاتی اور زور کی بارش جو زمین کی روئیدگی کو ترقی دیتی ہے اس پتھر کی اوپر کی مٹی کو بیج سمیت بہالے جاتی ہے +

ریا کا خرچ مسلمان کا کام نہیں — اس آیت میں اصل مقصود تو مسلمانوں کو ریا سے روکنا ہے۔ مگر اس کا پیرایہ یہ اختیار کیا کہ تم نے ریا سے خرچ کرنے والوں کی طرح نہ ہو جانا کیونکہ ریا سے خرچ کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے یعنی یہ تو کافروں کا کام ہے مومن کا کام ہی نہیں یوں اس فعل کو حد سے زیادہ قبیح بنا کر دکھایا ہے۔ انجیل میں بھی ریا سے روکا ہے مگر قرآن شریف نے بلاغت کو

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا ۲۶۵

اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کی رضا چاہنے اور کچھ اپنے آپ کو مضبوط

مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا

کرنے کیلئے خرچ کرتے ہیں اس باغ کی مثال کی طرح ہی جو اعلیٰ درجہ کی زمین پر ہو پھر اس پر زور کا مینہ پڑے پس وہ اپنا پھل

ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

دو چند دے لیکن اگر اس پر زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکا مینہ ہی (کافی ہی) اور اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے ۳۴۱

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّن ۲۶۶

کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اس کا ایک باغ

رسم و رواج کے اخراجات ریا میں داخل ہیں

کمال تک پہنچایا ہے۔ رسوم و رواجات پر جو روپیہ خرچ ہوتا ہے وہ سب ریا سے ہے۔ کیونکہ اس میں مدنظر صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایسا کہیں اور ایسا نہ کہیں۔ اگر خرچ نہ کریں تو لوگوں میں ناک کٹتی ہے یہی ریا کی شناخت ہے۔ افسوس ہے کہ جس فعل کو ایسا قبیح بنا کر دکھایا گیا تھا کہ یہ مسلمان کا کام ہی نہیں ہو سکتا۔ اس میں آج اس کثرت سے مسلمان ملوث ہیں کہ شاذ و نادر ہی کوئی بچا ہوگا رسوم و رواج پر قرضے لیتے اور مکانات اور جائدادیں بیچ دیتے ہیں لیکن خدا کی راہ میں دینے کے لئے پاس موجود ہو تو بھی حیلے تلاش کرتے ہیں۔ مومن کہلا کر کام کافروں سے بدتر ہیں پھر نتیجہ کیا ملے۔ کیوں ان کے علماء اور مشائخ ان کاموں سے ان کو نہیں روکتے ٭

لا یقدرون علی شیء مما کسبوا میں صاف پیشگوئی ہے کہ کفار جو کچھ خرچ کر رہے ہیں وہ محض ریاکاری ہے جب خدا کی رحمت کی بارش آئے گی تو ان کا سب کیا کرایا اس طرح تباہ ہو جائیگا جس طرح صاف پتھر پر سے مٹی۔ اور ہر ایک ریا سے خرچ کرنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتا ٭

۳۴۱ من انفسہم میں من بعضیہ ہے یعنی کہ بقدر اپنے نفسوں کو ایمان پر مضبوط کرنے کے لئے۔ انفاق مال سے کچھ مضبوطی ایمان کی حاصل ہوتی ہے اور اپنے سارے قویٰ کو خدا کی راہ میں لگا دینے سے پوری قوت ایمانی حاصل ہوتی ہے ٭

ربوة — رَبْوَةٍ۔ رَبَا کے معنی ہیں بڑھا اور بلند ہوا اور رَبْوَة اعلیٰ درجہ کی زمین کو کہتے ہیں (غ) ٭

اکل — اکل۔ جو چیز کھائی جائے۔ اس لئے پھل کو بھی کہتے ہیں ٭

طل — طل۔ نہایت کمزور بارش جس کا اثر بہت ہی کم ہو (غ) ٭

اللہ کی رضا کیلئے مال خرچ کرنے سے محبت الٰہی بڑھتی ہے

یہ دوسری مثال ان لوگوں کی ہے جو اللہ کی رضا کے لئے مال خرچ کرتے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی بڑھایا ہے کہ اپنے نفسوں کے ثبات کے لئے۔ یہ انفاق مال کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ یعنی خدا کی رضا کے لئے مال خرچ کرنے سے ایمان پر ثابت قدمی بڑھتی ہے۔ کیونکہ مال انسان کی محبوب چیز ہے اور جس چیز پر وہ اپنا مال خرچ کرے گا اسی سے اسے محبت پیدا ہو گی۔ پس خدا کی رضا کے لئے مال خرچ کرنے سے خدا کی راہ میں ثابت قدمی اور وفاداری بڑھتی ہے ٭

نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُۙ لَهٗ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِۙ

کھجوروں اور انگوروں کا ہو اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں اس کیلئے اس میں ہر قسم کے پھل ہوں

وَاَصَابَهُ الۡكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَاۤ اِعۡصَارٌ فِيۡهِ نَارٌ

اور اسے بڑھاپے نے آلیا ہو اور اس کی اولاد چھوٹی چھوٹی ہو پھر اسے ایک بگولا پہنچے جس میں آگ ہو

فَاحۡتَرَقَتۡ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ ۝

پس وہ جل جائے اس طرح اللہ تمہارے لئے باتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر کرو ۳۴۲

ع ۳۷ / ۵

مال کیسا ہو کس طرح کس کو دیا جائے

۲۶۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَـكُمۡ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو ان اچھی چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور اس سے جو ہم نے تمہارے لئے

مِّنَ الۡاَرۡضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الۡخَبِيۡثَ مِنۡهُ تُنۡفِقُوۡنَ وَلَسۡتُمۡ بِاٰخِذِيۡهِ

زمین سے نکالا ہے اور ردی چیز دینے کا قصد نہ کرو اس میں سے تم خرچ کرو گے حالانکہ تم خود اس کو لینے والے نہیں

اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِيۡهِ ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيۡدٌ ۝

سوائے اسکے کہ اس کی قیمت کم کراؤ اور جان لو کہ اللہ غنی تعریف کیا گیا ہے ۳۴۳

نخل — ۳۴۲ نخیل۔ نخل کی جمع ہے۔ کھجور +

عنب — اَعْنَاب۔ عِنَبٌ کی جمع ہے۔ انگور کی بیل اور انگور کے پھل دونوں پر بولا جاتا ہے +

ثمر — ثمرات۔ یا تو یہ مراد ہے کہ کھجور انگور کے سوائے اور بھی سب پھل ہیں اور یا یہ کہ اس میں ہر قسم کے منافع ہیں کیونکہ ثمر سے مراد بعض وقت مال بھی ہوتا ہے جس سے انسان فائدہ اُٹھاتا ہے (غ) +

عصر۔اعصار — اِعصار۔ عصر کے معنی نچوڑنا ہیں جیسے فیہ یعصرون (یوسف ۱۲۔۴۹) اور اعصار وہ ہوا ہے جو زمین سے اُٹھتی ہے اور غبار کو اُٹھاتی ہے پھر ستون کی طرح آسمان کی طرف بلند ہو جاتی ہے یعنی بگولا (ل) +

من واذی کا اثر صدقہ پر — یہ تیسری مثال من واذی کے اثر کی ہے۔ اصل مضمون من واذی کا ہی تھا۔ اس سے روکتے ہوئے ریا کا ذکر کیا پھر رضائے الٰہی کے لئے خرچ کرنے کا اور رکوع کے آخر پر پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا اور سمجھایا کہ ابتداءً میں انسان رضائے الٰہی کیلئے خرچ کرتا ہے۔ اس لئے وہ جڑ پکڑتا اور باغ بن جاتا ہے لیکن من واذی کا اثر اس پر ایک بگولے کی طرح ہوتا ہے جو ہری بھری کھیتی کو جلا دیتا ہے۔ گویا اس رکوع میں رضائے الٰہی کے لئے اور دین حق پھیلانے کے لئے خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے من واذی اور ریا سے روکا ہے۔ اور تینوں باتوں کی وضاحت تین مثالوں سے کر دی ہے +

کسب — ۳۴۳ کسبتم۔ کَسْب وہ ہے جس میں انسان اپنے آپ کو لگاتا ہے جس میں نفع اُٹھائے اور فائدہ حاصل کرنے کی غرض ہو لفظ کسب کے مقابل پر مما اخرجنا لکم من الارض فرمایا۔ گویا پہلے میں تجارت صنعت وغیرہ ہے اور دوسرے میں پھل کھیتیاں معدنیات +

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً ۲۶۸

شیطان تم کو تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تم کو بخل کا حکم دیتا ہے اور اللہ تمہیں اپنی طرف سے مغفرت

مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

اور فضل کا وعدہ دیتا ہے اور اللہ بہت دینے والا جاننے والا ہے ۳۴۴

تیمم — تیمموا۔ تیمم کے معنی قصد کرنا ہیں (اصطلاح شریعت میں خاص معنی ہیں) اور اس کا اصل اَمَّ ہے جس کے معنی ہیں قصد کیا (ل)

خبیث — الخبیث۔ وہ چیز جس سے کراہت کی جائے بوجہ اس کے ردی ہونے یا اس کے خسیس ہونے کے خواہ محسوس ہو یا معقول اور اس میں باطل اعتقاد اور جھوٹ باتیں اور برے فعل سب شامل ہو جاتے ہیں یحرم علیہم الخبائث (الاعراف ۱۵۷) ونجیناہ من القریۃ التی کانت تعمل الخبائث (الانبیاء ۲۱-۷۴) الخبیثات للخبیثین (النور ۲۴-۲۶) (غ) یہاں مراد ردی چیز ہے +

غمض۔ اغماض — تغمضوا۔ غمض اور اغماض کے اصل معنی نیند ہیں (غ۔ ل) اور بطور استعارہ تغافل اور تساہل پر استعمال ہوتا ہے۔ اور اغمض فی البیع کے معنی ہیں جب فروخت والی چیز کو زیادہ مانگے اور قیمت کو کم کرے (ن) یا اس کے ردی ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت میں کمی کا مطالبہ کرے

اس سے پہلے رکوع میں بتایا تھا کہ انفاق کس طرح پھل لاتا ہے کس طرح بیج ضائع ہونے سے بچایا جا سکتا ہے کس طرح آفات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس رکوع میں بتایا ہے کہ کونسا مال خرچ کرنا چاہئے کس طرح یعنی علانیہ یا چھپ کر خرچ کرنا چاہئے اور کس پر خرچ کرنا چاہئے یوں انفاق کی تمام اصولی تفصیلات کو ان دو رکوعوں میں بیان کر دیا ہے +

کیسا مال خدا کی راہ میں خرچ کیا جائے — کونسا مال ہو جو خدا کی راہ میں دیا جائے۔ اول شرط یہ ہے کہ مال طیب ہو یعنی جائز طور پر کمایا ہوا ہو اور اچھا ہو۔ دوسری یہ کہ ردی مال نہ ہو جس کی تمہارے نزدیک بھی کوئی وقعت نہیں۔ ردی چیز کو دیکر اعلیٰ درجہ کے نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ آج کل کی بڑی اسلامی ہمدردی یہ ہے کہ کاروبار سے فارغ ہو کر دل بہلانے کے لئے چار باتیں اسلامی ہمدردی کی بھی کر دیں یہی وہی ردی متاع ہے اور خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کا تو نام بھی مسلمانوں کو بھولا ہوا ہے۔ حالانکہ انفاق کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کیلئے کیسا محبوب بناتا ہے کہ کوئی ناقص چیز بھی خدا کی راہ میں دینے کو پسند نہیں کرتا بلکہ یہی چاہتا ہے کہ جب کوئی دے اعلیٰ درجہ کی چیز دے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وشان کے لئے پاس ادب بھی سکھایا ہے۔ کیونکہ جب خدا کا نام درمیان میں آگیا تو پھر چیز خواہ کسی کو دی جائے اعلیٰ اور افضل دینی چاہئے اسی کے مطابق آیت کا خاتمہ غنی حمید پر کیا ہے +

وعد۔ وعید — ۳۴۴ یَعِدُ۔ وعد کا لفظ خیر و شر دونوں پر بولا جاتا ہے یعنی اچھی چیز کے وعدہ دینے پر اور برے انجام سے ڈرانے پر اور وعید کا لفظ شر سے خاص ہے +

فحشاء — الفحشاء۔ اصل میں ہر ایک قبیح فعل یا قول پر بولا جاتا ہے لیکن عرب کے لوگ بخیل کو بھی فاحش کہتے تھے (ل) اس لئے بلحاظ قرینہ یہاں بخل معنی کئے گئے ہیں +

صدقہ سے انسان مفلس نہیں ہوتا — اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ جو خیالات بعض وقت اللہ کی راہ میں دینے میں مانع ہوتے ہیں وہ حقیقت میں شیطانی خیال ہیں کہ خدا کی راہ میں دیکر ہم غریب ہو جائینگے۔ ایک حدیث میں آتا ہے نبی کریم صلعم نے فرمایا تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں جن میں سے ایک یہ ہے کہ خدا کی راہ میں دینے سے مال کم نہیں ہوتا۔ اور حق بھی یہی ہے کہ آج تک کوئی شخص خدا کی راہ میں دینے سے فقر و فاقہ میں مبتلا نہیں ہوا گو سارا مال بھی خدا کی راہ میں دیدے۔ البتہ رسم و رواج کی پابندیوں سے بہتیرے تباہ ہو گئے ہیں حضرت ابن مسعود سے اس آیت کی

لمہ شیطانی و لمہ ملکی — تفسیر میں مروی ہے کہ انسان کے لئے ایک لمہ شیطانی اور ایک لمہ ملکی ہوتا ہے شیطانی تحریک برے کاموں کیلئے اور حق کی تکذیب کے لئے

۲۶۹ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا

وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت عطا کی جائے بیشک اسے بہت بھلائی

۲۷۰ كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ

دی گئی اور کوئی نصیحت قبول نہیں کرتا مگر جو، پاکیزہ عقل والے ہیں، ۳۴۵ اور جو کچھ خرچ کرنے کی چیز تم خرچ کرو یا

نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

کسی نذر کی منت مان لو تو اللہ اسے ضرور جانتا ہے اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ۳۴۶

ہوتی ہے ۔ اور مالک کی تحریک بھلائی کے لئے اور حق کی تصدیق کے لئے ہوتی ہے ۔ علاوہ ازیں ایسے معاملات میں اندازہ قومی حالت سے لگانا چاہئے نہ افراد کی حالت سے جب افراد قومی اپنے اموال کو قومی یا دینی ترقی کے لئے خرچ کرتے ہیں تو قوم غریب نہیں ہوتی بلکہ خدا کا فضل زیادہ سے زیادہ اس کے شامل حال ہوتا ہے +

لب

۳۴۵ الباب ۔ اَلْبَاب لُبّ کی جمع ہے اور لُبّ کسی چیز کے خلاصہ یا مغز کو کہتے ہیں ۔ اور انسان میں لُبّ اس عقل خالص کو کہتے ہیں جو ہر قسم کے شائبوں سے پاک ہو یعنی نہایت خالص عقل پس ہر لُبّ عقل ہے اور ہر عقل لُبّ نہیں (غ) +

حکمت خیر کثیر ہے

جب یہ بتایا کہ انفاق سے تنگدستی کا پیدا ہونا محض شیطانی ڈراوا ہے تو اب بتاتا ہے کہ مال خیر نہیں بلکہ اصول حقہ کو سمجھ لینا خیر کثیر ہے ۔ اور یہ اصول حقہ یا اصول دین کی سمجھ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے دیتا ہے ۔ گویا اس اصول کو سمجھ لینا کہ خدا کی راہ میں مال دینے سے انسان تنگدست نہیں ہوتا اصول دین میں سے ایک اصل ہے ۔ اور اس کو سمجھ کر انسان خیر کثیر کا مالک ہو جاتا ہے ۔

صحابہ کا نمونہ

اس کا بگڑنا کیا ہے ۔ اس حکمت کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھا اور باوجودیکہ وہ غریب تھے اپنے مالوں کو انہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں بھی خیر کثیر کے مالک ہو گئے اس لئے کہ ایک زندہ اور کامیاب قوم بن گئی ۔ آج مسلمان ان سے بہت زیادہ مالدار اور تعداد میں ہزار ہا گنے زیادہ ہیں ۔ مگر اسی حکمت کی بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کا مال ان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں جا رہا ہے ۔ اور پھر بھی وہ قرآن کریم کی اس حکمت کی بات پر عمل پیرا نہیں ہوتے +

نذر

۳۴۶ نذر ۔ امام راغب نے نذر کے یہ معنی کئے ہیں کہ کسی امر کے حدوث کی وجہ سے تم اپنے نفس پر کسی ایسی بات کو واجب

نذر میں شرط

کرو جو واجب نہیں مگر قرآن کریم میں جہاں جہاں لفظ نذر آیا ہے کوئی شرط ساتھ نہیں ۔ مثلاً اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا (مریم ۱۹ : ۲۶) اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا (آل عمران ۳ : ۳۴) نہایہ میں ابن اثیر نے نذر کے معنی صرف اس قدر لکھے ہیں کہ جب تم اپنے نفس پر عبادت یا صدقہ وغیرہ سے کوئی چیز بطور نفل واجب کرلو ۔ تو وہ نذر ہے اور پھر لکھا ہے کہ احادیث میں اس سے روکنے کا مکرر ذکر آیا ہے ۔ اور اس کا منشا یہ ہے کہ یہ ایک ایسا امر ہے جو نہ کوئی نفع کھینچ لاتا ہے نہ کسی نقصان کو دور کرتا ہے ۔ نہ کسی قضاء وقدر کو رد کر دیتا ہے پس اگر اس اعتقاد کے ساتھ انسان کسی امر کو اپنے اوپر واجب کرلے تو اس کا پورا کرنا یوفون بالنذر کے ماتحت ضروری ہے اور گو مفسرین لکھتے ہیں کہ نذر شرط کے ساتھ یا بلا شرط ہو سکتی ہے مگر قرآن شریف میں یا حدیث میں شرط کا ذکر نہیں +

ظالم

یہاں ظالم ان لوگوں کو کہا ہے جو خدا کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ نہیں کرتے یا معصیت میں اور رسم و رواج کی پابندی میں خرچ کرتے ہیں +

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَإِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ ۲۷۱

اگر تم صدقات کو کھلے طور پر دو تو کیا ہی اچھی بات ہو اور اگر تم ان کو چھپاؤ اور محتاجوں کو دو تو وہ

خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

تمہارے لئے اچھا ہو اور وہ بعض تمہاری برائیاں تم سے دور کر دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے ۳۴۷

نعمّا — ۳۴۷ نِعِمَّا۔ نِعْمَ اور مَا سے مرکب ہے اور نِعْمَ فعل مدح ہے پس نعما کے معنی ہوئے کیا اچھی چیز ہے +

کفر — یکفر۔ کفر کے اصل معنی ڈھانکنا ہیں (اور ابن اثیر نے بڑھایا ہے ایسا ڈھانکنا جو اسے ہلاک کر دے یعنی ایک چیز کی ترقی کو روک

تکفیر — دے) اور تکفیر کے معنی ہیں ایک چیز کا ڈھانک دینا اور اس کا دبا دینا یہاں تک کہ وہ بمنزلہ اس چیز کے ہو جائے جو کی نہیں گئی اور اسی سے کفارہ ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو گناہ کو ڈھانک دے (غ) +

من سیاٰتکم۔ من بعضیہ ہے۔ صدقات سے ساری برائیاں دور نہیں ہوتیں بعض قسم کی برائیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اسلام نے جو کفارہ بتایا ہے وہ یہی ہے کہ بعض قسم کی نیکیوں سے بعض قسم کی بدیاں دور ہو جاتی ہیں اور دب جاتی ہیں یعنی ظاہر نہیں ہوتیں۔

علانیہ صدقات — اس آیت میں انفاق کا طریق بتایا قرآن کریم ہر ایک مسئلہ پر انسانی ضروریات کے سارے پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر بحث کرتا

انجیل کی ناقص تعلیم — ہے انجیل کی مشہور پہاڑی تعلیم میں صدقات کا مضمون اتنی ہی بات پر ختم ہو جاتا ہے کہ تم دکھاوے کے لئے خیرات نہ کرو بلکہ تمہارا دایاں ہاتھ دے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ مگر یہ بھی ایک غلطی ہے کہ جو صدقات علانیہ طور پر دئے جائیں ان کو دکھاوے کے لئے سمجھ لیا جائے اور نہ ہی ضروریات انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ انسان جب صدقہ کرے تو ایسے ہی طور پر کرے کہ دایاں ہاتھ

قومی چندے — دے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ بڑے بڑے قومی چندے جن سے ضروریات قومی پوری ہوتی ہیں وہ کبھی اس طریق پر نہیں دیئے جا سکتے اور جس کتاب نے اپنی تعلیم کو یہیں تک ختم کر دیا وہ یقیناً ناقص ہے۔ قرآن شریف جس نے تعلیم کو کمال تک پہنچانا تھا وہ یوں تعلیم دیتا ہے کہ علانیہ طور پر بھی مال خدا کی راہ میں دینا بہت اچھا ہے بلکہ اسے پہلے بیان کیا۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دوسروں کو نیکی کی تحریک ہوتی ہے۔ اور درحقیقت بڑے بڑے قومی کام علانیہ چندوں سے ہی سرانجام پا سکتے ہیں۔ آج عیسائی لوگ ان قومی چندوں میں علانیہ حصہ لیکر اپنے عمل سے انجیل کی تعلیم کو جھٹلا رہے اور قرآن کریم کی تعلیم کو سچا قرار دے رہے ہیں۔ ہاں جہاں اس قسم کی ضروریات کی عظمت اور وقعت کے لحاظ سے انہیں مقدم کیا۔ ساتھ ہی دوسرے پہلو کا بھی ذکر کر دیا کہ غربا کی کچھ مدد کرو تو وہ چھپا کر دو وہ بھی ایک ضرورت قومی ہے اور بہت لوگ مستحق امداد ہوتے ہیں جن کو علانیہ دینا مناسب نہیں اور نہ وہ علانیہ لینا پسند کرتے ہیں خصوصیت سے ایسے لوگ کون ہیں ان کا ذکر اگلی سے اگلی آیت میں ہے +

مخفی صدقات — قرآن شریف نے صرف ایک لفظ اخفا ہی ایسے صدقات کے متعلق استعمال فرمایا ہے مگر احادیث میں ایسے صدقات کا ذکر بہت پایا جاتا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سایہ میں لے گا۔ امام عادل۔ جوانی میں عبادت الٰہی کرنے والا۔ وہ شخص جو اللہ کے لئے محبت کرنے والے ہوں۔ وہ شخص جو مسجد سے نکلتا ہے تو اس کا دل مسجد میں معلق ہوتا ہے۔ وہ جسے حسین مالدار عورت بلائے تو صرف خدا کے خوف سے بچے۔ اور وہ شخص جو صدقہ کرتا ہے تو اسے اتنا چھپاتا ہے کہ اس کا بایاں ہاتھ نہیں جانتا جو اس کا دایاں ہاتھ خرچ کرتا ہے۔ اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ مخفی صدقہ رب کے غضب کو دور کرتا ہے مگر ظاہر صدقہ بسا اوقات مقدم ہوتا ہے خود زکوٰۃ جو ظاہر صدقہ ہے بوجہ فرضیت نفلی صدقات پر مقدم ہے +

۲۷۲ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ

ان کی ہدایت تیرے ذمے نہیں لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور جو کچھ مال تم خرچ کروگے وہ تمہارے

فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ

اپنے ہی لئے ہے اور تم خرچ نہیں کرتے سوائے اسکے کہ اللہ کی رضا چاہو اور جو کچھ تم مال خرچ کروگے وہ تمہیں پورا

اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ ۲۷۳ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا

دیا جائیگا اور تمہیں نقصان نہیں پہنچایا جائیگا ۳۴۸ ان محتاجوں کیلئے جو اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں زمین

يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ

میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے (سوال سے) بچنے کے باعث ناواقف ان کو دولتمند سمجھتا ہے تو انہیں انکی

بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝   الربع

نشانیوں سے پہچان لیگا وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے اور جو کچھ مال تم خرچ کرو اللہ اسے یقیناً جانتا ہے ۳۴۹

غیر مسلم پر مال خرچ کرنا

۳۴۸ لیس علیك ھدٰىھم ۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ پہلے پہلے مسلمان (بوجہ ان سختیوں کے جو کفار سے پہنچی تھیں) فی سبیل اللہ اپنے مشرک رشتہ داروں کی امداد کو ناپسند کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی یعنی قرآن شریف نے غیر مسلموں کی امداد بھی فقر اور تنگی کی حالت میں ضروری قرار دی ہے۔ اور انسانی ہمدردی کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا۔ اور فرمایا کہ ہدایت امر دیگر ہے مگر احتیاج کے وقت انسان کی دستگیری ایک فرض انسانی ہے۔ یہ ذکر محتاجوں کو دینے کے ذکر کے ساتھ ہی کیا تا اس مضمون کی تکمیل ہو جائے +

صدقہ سے فائدہ آپ نے آپکو اور قوم کو ہوتا ہے

اور یہ جو فرمایا فلانفسکم تو مراد یہ ہے کہ اس کا فائدہ خود تم کو یا تمہارے لوگوں کو ہی پہنچتا ہے۔ کیونکہ انفسکم میں دونوں مفہوم داخل ہیں انسان کا اپنا نفس بھی اور اس کے بھائی بند بھی۔ اپنے نفس کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ اس کے اندر نیکی کی قوت نشو و نما پاتی ہے ہمدردی انسانی جو انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے ترقی کرتی ہے۔ قوت ایمانی بڑھتی ہے اور اپنے بھائی بند کو یہ فائدہ ہے کہ قومی بہبودی کے کاموں سے ساری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے وما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللہ میں یا تو یہ بتایا ہے کہ مسلمان کا جو انفاق ہوگا وہ رضائے

غیر حقدار کے ہاتھ میں صدقہ کا چلا جانا

الٰہی کیلئے ہی ہوگا۔ اور یا یہ کہ تم اسبات کا فکر مت کرو کہ جس کو دیا ہے وہ کون ہے تم نے تو خرچ محض رضائے الٰہی کیلئے کیا ہے سو وہ ملجائیگی پس صدقہ دینے کے وقت لوگوں کے اعمال کی فکر نہ کرو۔ صحیحین کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے کہا میں آج رات صدقہ کروں گا تو وہ صدقہ ایک زانیہ کے ہاتھ چلا گیا۔ دوسری رات صدقہ کیا تو وہ ایک غنی کے ہاتھ چلا گیا تیسری رات کیا تو ایک چور کے ہاتھ چلا گیا۔ تو اسے کہا گیا تمہارا صدقہ قبول ہوگیا ہے رہے وہ لوگ جن کے ہاتھ میں گیا ہے سو شاید زانیہ زنا سے بچ جائے غنی صدقہ دینے کی توفیق پائے۔ چور چوری سے رک جائے۔ ماحصل اس تعلیم کا یہ ہے کہ ادنیٰ عذروں پر انسان صدقہ کو نہ روک رکھے۔ ایک سرسری نظر سے دیکھے جو مستحق نظر آئے یا جہاں نیکی کا کام ہو رہا ہو وہاں اعانت میں شامل ہو جائے۔ اسی کی طرف آیت کے آخری الفاظ میں اشارہ کیا کہ تمہارا انفاق ضائع نہیں جائیگا۔ بلکہ اس کا اجر تم کو پورا پورا ملے گا اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا +

عِفّۃ

۳۴۹ التعفف ۔ عفۃ سے ہے اور عِفَّۃ کے اصل معنی ہیں تھوڑی چیز پاکر صبر کرلینا (غ) اور پھر اس کے معنی ہو گئے ہیں اس

ع ۳۸ / ۲

الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً ۲۷۴

جو لوگ رات اور دن چھپکر اور ظاہر اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں

چیز سے رکنا جو حلال نہیں یا اچھی نہیں (ل)۔ اِستعفاف اور تعفُّف کے ایک ہی معنی ہیں یعنی حرام سے اور لوگوں سے سوال کرنے سے بچنا (ل)۔ +

سِیما۔ سَوم کے اصل معنی میں کسی چیز کی تلاش میں جانا (غ)۔ اس سے سِیما اور سِیمیاء کے معنی علامت ہوگئے ہیں +

الحافا۔ الحاف۔ سوال کرنے میں سخت الحاح کو کہتے ہیں (ل)۔ اور یہ لحاف سے ہے کیونکہ اس سے انسان اپنے آپکو سارا ڈھانک لیتا ہے۔

پچھلی سے پچھلی آیت میں جب محتاجوں کو دینے کا ذکر فرمایا تو یہ بیان کرکے کہ محتاج مسلم ہو یا غیر مسلم وغیرہ۔ اب یہ بتاتا ہے کہ خصوصیت سے کونسے محتاج مستحق ہیں۔ وہ وہ فقراء ہیں جو اللہ کی راہ میں رک گئے ہوں یعنی اپنے کاروبار نہ کرسکتے ہوں اور یہ تین قسم کے لوگ ہیں (۱) وہ مجاہدین یا خدا کی راہ میں کوشش کرنے والے جو اس لئے کہ ساری قوت اسی کام پر لگاتے ہیں اپنا ذریعہ معاش نہ رکھتے ہوں نبی کریم صلعم کے زمانہ میں اصحاب الصفہ کا گروہ اسی ذیل میں شامل تھا۔ اب بھی جو لوگ تعلیم دین پاتے ہوں یا خدمت دین کیلئے اپنے آپ کو وقف کرچکے ہوں اس ذیل میں آتے ہیں (۲) وہ لوگ جو کفار کے ظلم کی وجہ سے یا امن اٹھ جانے کی وجہ سے اپنا کاروبار نہ کرسکتے ہوں (۳) وہ لوگ جو دینی جنگوں میں زخمی ہوگئے ہوں یا خدمت دینی ادا کرتے ہوئے کام کے ناقابل ہوگئے ہوں لا یستطیعون ضربا فی الارض میں بتادیا کہ وہ اللہ کی راہ میں ایسے روکے گئے ہیں کہ زمین میں چل پھر کر اپنی معاش پیدا نہیں کرسکتے اور ان کی نشانی یہ بتائی ہے کہ ایسے لوگ سوال نہیں کرتے مانگتے نہیں یوں ان کام کرنے والوں کو بھی کیا اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے۔ ان واعظوں کے لئے جو وعظ کرکے مداری کی طرح دست سوال دراز کرتے ہیں اس میں سبق ہے۔ اور فی سبیل اللہ دینے والوں کو بھی نصیحت ہے کہ وہ زیادہ تر اپنے اموال کن لوگوں پر صرف کریں +

یہاں لفظ تعفف کے استعمال سے اور مستحقین کے متعلق یہ بتاکر کہ وہ سوال نہیں کرتے۔ یہ بھی بتادیا ہے کہ سوال کرنا اچھی بات نہیں کیونکہ تعفف بری بات سے بچنے کا نام ہے تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سوال کرنا مذموم امر ہے۔ مگر آج جدھر دیکھو بھیک مانگنے والے مسلمان نظر آتے ہیں۔ بخاری کی حدیث میں جو ان الفاظ کی تفسیر ہے یہ لفظ آتے ہیں۔ کہ مسکین وہ نہیں جس کو ایک یا دو کھجوریں یا ایک دو لقمے دیئے جاتے ہیں انما المسکین الذی یتعفف مسکین یعنی لینے کا حقدار صرف وہی ہے جو سوال سے بچے۔ اور ایک اور حدیث میں یہ لفظ آتے ہیں کہ وہ مسکین نہیں جو در بدر گھومتا پھرے اور تم اسے لقمہ لقمہ دو اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے یہ خطبہ پڑھا کہ جو شخص اپنی حاجت غیروں کے پاس نہیں لے جاتا اللہ اسے غنی کردیتا ہے اور جو سوال سے بچتا ہے اللہ اسے بچاتا ہے اور جو اپنے آپ کو روکتا ہے اللہ اس کیلئے کافی ہوجاتا ہے (من استغنی اغناہ اللہ ومن استعف اعفہ اللہ ومن استکف کفاہ اللہ) اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص سوال کرے اور اس کے پاس ایک اوقیہ کی قیمت کی قدر ہو تو وہ الحاف کرتا ہے پس ان احادیث کی رو سے وہ بھیک مانگنے والے جو لقمہ لقمہ کیلئے دربدر پھرتے ہیں مستحق خیرات نہیں ہیں اور ایسا سوال کرنے کو اسلام نے بہت مذموم قرار دیا ہے پس ایسے سائلین کے روکنے کا انتظام عین مطابق منشائے تعلیم اسلامی ہے۔

قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ اس میں تعلیم کمال کو پہنچ گئی ہے۔ اس کی تعلیم کے ہر شعبہ سے ظاہر ہے۔ ان دو رکوع میں صدقات کے مضمون کا کوئی پہلو جس پر اصولی رنگ میں بحث ہوسکتی تھی نہیں چھوڑا صدقات کی ضرورت بتائی نتیجہ بتایا نتیجہ کے ضائع ہونے سے بچنے کی راہ بتائی۔ ریاء سے روکا۔ بتایا کہ کیسا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے پھر بتایا کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے کوئی قوم غریب نہیں ہوتی۔ بلکہ خدا کے فضل کی زیادہ حقدار ہوتی ہے پھر بتایا صدقات کس طرح دو۔ قومی کاموں میں علانیہ بھی دو محتاجوں کو چھپاکر بھی دو پھر مسلمان محتاجوں کو بھی دو غیر مسلموں کو بھی دو پھر دو تو یہ فکر نہ کرو کہ کس کے ہاتھ میں گیا پھر بتایا کہ بھیک مانگنا مذموم فعل ہے اور مستحق امداد وہ لوگ ہیں جو بھیک نہیں مانگتے اور اپنی معاش کی فکر اس لئے نہیں کرتے کہ کسی دینی کام میں مصروف ہیں۔ اب انجیل اس تعلیم کا کیا مقابلہ کرے گی جس کی ساری دو دیڑھ اس ایک دل خوش کن فقرہ پر ختم ہوجاتی ہے کہ دکھاوے کے لئے نہ دو۔ یہاں تمام ضروریات انسانی کو مدنظر رکھکر تمام پہلوؤں پر بحث ہے +

حرمت سود

تعفف

سیما

الحاف

کون محتاج خصوصیت سے مستحق امداد ہیں۔

سوال کرنا مذموم ہے بھیک مانگنے والوں کا انتظام مطابق تعلیم اسلامی ہو +

قرآن نے صدقات کی تعلیم کو کامل کیا۔

۲۷۵ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ — وقف منزل

تو ان کے لئے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کو کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ غمگین ہونگے ۳۵۰ جو لوگ

يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ

سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہونگے مگر اس طرح جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پچھاڑ دیا ہو ۳۵۱

صدقات اور سود کا تقابل — ۳۵۰ اس رکوع کا اصل مضمون تو حرمتِ سود ہے مگر یہاں بطور خلاصہ صدقات کے مضمون کو پھر بیان کر دیا ہے۔ کیونکہ صدقہ وہ چیز ہے جو اغنیا سے لیکر غربا کو دی جاتی ہے اور سود وہ چیز ہے جو غربا سے چھین کر اغنیا کو دی جاتی ہے تو اس تعلق کے لحاظ سے سود کے ذکر سے پہلے پھر صدقات کی طرف توجہ دلائی کہ وہی اصل الاصول ہے جس پر دنیا کی خوشحالی کا انحصار ہے۔ کیونکہ مال کی تقسیم میں جبتک مساوات کے پہلو کو مدنظر نہ رکھا جائے کبھی دنیا میں خوشحالی نہیں رہ سکتی۔ صدقات کا دینا اور سود کا نہ لینا اسی مساوات کے دو پہلو ہیں +

اکل — ۳۵۱ یاکلون۔ اَکل ابتداءً کھانے کے معنی میں آتا ہے۔ پھر ہر قسم کے انفاق مال پر بولا جاتا ہے کیونکہ کھانا سب سے بڑا امر ہے جس کیلئے انسان مال کا محتاج ہوتا ہے ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل (۲-۱۸۸) ان الذین یاکلون اموال الیتامی ظلما (النساء ۴-۱۰) اور اکل المال بالباطل سے مراد اس کا ایسے طور پر خرچ کرنا جو حق کے منافی ہو۔ اور یاکلون فی بطونہم نارا (النساء ۴-۱۰) میں آگ کا کھانے کی طرح پیٹ میں ڈالنا مراد ہے +

ربا — الربٰو۔ رَبَا الشیءُ کے معنی ہیں ایک چیز بڑھ گئی اور اس نے ترقی کی (غ)، قرآن شریف میں سبزی کے بڑھنے پر آتا ہے ربت (الحج ۲۲-۵)

ربو — اور ایسا ہی مال کے بڑھنے پر ہے لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ (الروم ۳۰-۳۹) اور رِبٰو راس المال پر بڑھوتی کا نام ہے لیکن شریعت میں خاص قسم کی بڑھوتی پر یہ لفظ بولا گیا ہے (غ) ابو اسحاق کا قول ہے کہ جو ربٰو حرام ہے اس کی صورت اس قرض کی ہے جس کے ذریعہ سے جتنا دیا تھا اس سے زیادہ لیا جائے یا جس کے ذریعہ سے کوئی اور فائدہ اٹھایا جائے۔ اور جو حرام نہیں وہ یہ ہے کہ انسان بطور ہبہ یا تحفہ

ربائے جاہلیت — کوئی چیز دے یہ چاہتا ہو کہ اس سے بڑھکر اس کو ملے (ل)، ابن جریر نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ ایک شخص کا دوسرے پر قرضہ ہوتا تو وہ کہتا کہ تم اس قدر اصل میں بڑھا لو اور ادائگی میں مہلت دیدو۔ اور قتادہ کہتے ہیں کہ ربائے جاہلیت یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے سے ایک وقت مقرر کیلئے خرید و فروخت کا معاملہ کرتا جب وہ وقت آجاتا اور رقم ادا نہ ہوتی تو رقم بڑھا دی جاتی اور مہلت دیدی جاتی +

خبط۔ تخبط — یتخبط خَبْط سے ہے جس کے معنی سخت مارنا (ل)، ہیں جیسے درخت پر پتے جھاڑنے کے لئے سونٹا مارا جاتا ہے۔ اور حدیث میں یتخبطنی الشیطان آتا ہے اس کے معنی کئے ہیں یصرعنی ویلعب بی (ت)، یعنی مجھے پچھاڑ دے اور مجھے کھیل بنائے +

مس — مَسّ کے اصل معنی چھونا ہیں پھر ہر ایک ضرر پر جو انسان کو پہنچے بولا جاتا ہے مستہم البأساء۔ اور کنایۃً جنون پر بھی بولا جاتا ہے (غ)، اور یہی معنی یہاں مراد ہیں جیسا اکثر تفاسیر میں ہے +

حرمت ربا کا حکم آخری حکم نہیں — صدقات اور ربا کے مضمون میں جو تعلق ہے وہ پچھلے نوٹ میں بیان ہو چکا ہے۔ اور گو صدقات اور ربا کی آیات کا نزول مختلف زمانوں کا ہے مگر ترتیب میں ان کو ایک جگہ رکھنا صاف بتاتا ہے کہ ترتیب آیات آنحضرت صلعم کے ارشاد سے ہوتی تھی۔ مگر بخاری میں ابن عباس کے جو یہ لفظ ہیں کہ اٰخر اٰیۃ نزلت علی النبی صلعم اٰیۃ الربٰو یعنی آخری آیت جو نبی صلعم پر نازل ہوئی آیت ربا ہے یہ اس معنی میں درست نہیں کہ ربا کی حرمت کا حکم نزول قرآن کریم میں آخری آیت ہے حجۃ الوداع میں آنحضرت صلعم کا ربا سے منع کرنا ثابت ہے۔ سو یہ آیت اس سے پہلے کی ہے اور حجۃ الوداع میں الیوم اکملت لکم دینکم کا نزول ثابت ہے اس لئے اس کے بعد کوئی حکم کی آیت نازل نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے ربا سے روکنے کا حکم بھی اٰخر اٰیۃ نزلت نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ اسے سود معنوں میں بلحاظ نزول

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ

یہ اسلئے ہو کہ وہ کہتے ہیں کہ خرید و فروخت بھی سود ہی کی طرح ہی حالانکہ اللہ نے خرید و فروخت کو حلال کیا ہی اور سود کو حرام کیا ہے

آخری آیت مانا جائے مگر اس سے بہتر توجیہ اس حدیث کی وہ ہے جو نوٹ ٣٥٥ میں کی گئی ہے یعنی آیت ربا سے مراد اس رکوع کی آخری آیت ہے۔ اور سورہ آل عمران میں بھی لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفۃ آتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ حرمت سود کا حکم ویسے نازل ہوا ہو اور حرمت شراب کی طرح حرمت سود بھی تدریجاً ہوئی ہو اور سورہ آل عمران میں صرف سود در سود سے روکا ہو۔

اس قول کے معنی کہ آنحضرت صلعم نے ربا کی تفسیر نہیں کی

اور یہ جو روایات میں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ربا کی تفسیر نہیں کی جیسا حضرت عمر کا قول جو مسند احمد میں مروی ہے اور اسی قسم کے اور بھی اقوال ہیں حالانکہ ربا جاہلیت میں ایک مشہور و معروف امر تھا تو اس سے مراد صرف اس قدر ہے کہ وہ امور جو ربا سے ملتے جلتے ہیں ان کا ذکر نہیں کیا جیسا کہ ان اقوال میں ربا کے تریا ستر دروازوں کا ذکر آتا ہے۔ اور جیسا کہ حضرت عمر کے ان الفاظ سے ظاہر ہے فدعوا الربا والریبۃ سو ربا اور شک کو چھوڑ دو یعنی ان امور کو جنکے متعلق شک ہو کہ وہ ربا سے ملتے جلتے ہیں ان میں سے بعض ملتی جلتی صورتوں کا ذکر احادیث میں آ بھی گیا ہے۔ جیسے یہ کہ مخابرۃ سے روکا یعنی معین حصہ پر زمین کاشت کرنے سے یا مزابنہ سے یعنی خشک کھجوروں سے تازہ کھجوریں خریدی جائیں جو خوشے میں ہوں۔ یا محاقلۃ سے یعنی اس دانہ کے خریدنے سے جو ابھی خوشوں میں ہو۔

سود کی ممانعت عام ہے

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ صرف سود در سود منع ہے نہ سود حالانکہ ربا کے معنی میں سود صاف آتا ہے بعض نے کہا کہ یہ حکم صرف دار الاسلام کے لئے ہے لیکن اس طرح قرآن کریم کے کل احکام سے امن اٹھ جائیگا جو مدینہ میں نازل ہوئے کہ وہ صرف دار الاسلام سے مخصوص ہیں بعض کا خیال ہے کہ سود کے حکم کی علت غربا سے ہمدردی ہے جیسا کہ صدقات اور ربا کے مضمون کو ایک جگہ کرنے سے ظاہر ہے مگر علت گو کچھ ہو حرمت تو عام ہے جیسے شراب کی حرمت کی علت تو یہ ہے کہ اس سے نشہ ہو جاتا ہے نقصان پہنچتا ہے۔ مگر ایک قطرہ بھی جائز نہیں گو اس سے نشہ نہ ہو کیونکہ حکم عام ہے۔ البتہ سود دینے والے کے لئے بعض صورتیں اضطرار کی پیدا ہو سکتی ہیں کہ اس کے بغیر اس کی زندگی قایم نہ رہ سکے۔

بنکوں کا سود

ایک سوال یہ ہے کہ بنکوں میں جو روپیہ حفاظت کے لئے رکھا جائے اور اس پر حسب قواعد بنک سود ملے اس کا لینا جائز ہے یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ربا میں یہ لازم بات ہے کہ روپیہ بیکو قرض دیا گیا ہو جتنی ربائے جاہلیت کی صورتیں بیان کی گئی ہیں ان میں یہ ضروری ہے اور بنک میں ایک شخص روپیہ قرض نہیں دیتا بلکہ بطور امانت رکھتا ہے تو گو یہ صورت کسی قدر مختلف ہے مگر پھر بھی سود ربا سے مشابہ ہے اس لئے محتاط طریق یہی ہے کہ وہ روپیہ سود کا مخالفین اسلام کے مقابل پر اشاعت اسلام یا جہاد میں خرچ کیا جائے اور اپنے مصرف میں نہ لایا جائے جیسا کہ نوٹ ٣٥٦ میں ہے۔

زمیندارہ بنک

اور زمیندارہ بنکوں کی صورت بھی کسی قدر عام صورت ربا سے اختلاف رکھتی ہے کیونکہ وہاں وہی لوگ قرض لے سکتے ہیں جو خود حصہ دار ہوں اور یوں ایک رنگ میں نفع نقصان دونوں کے مالک ہو جاتے ہیں۔ مگر وہاں بھی احتیاط کا طریق یہی ہے جو بنک کے سود کے متعلق لکھا گیا۔

بغیر تقرر کے زیادہ رقم لینا

ہاں یہ جائز ہے کہ ایک شخص قرضہ لے اور واپس کرتے وقت اصل رقم سے کچھ بڑھ کر محض ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کے طور پر دیدے یہ سود نہیں کیونکہ قرض دینے والے کو اس کا لینا مدنظر نہ تھا۔

احادیث میں حرمت ربا

ربا کی حرمت میں کئی ایک احادیث ہیں ایک حدیث میں ربا کے کھانے اور کھلانے اور گواہ اور کاتب سب پر لعنت کی ہے۔ کیونکہ وہ سب سود کو مروج کرتے ہیں اور ایک اور حدیث میں ہے جو ابو داؤد نے روایت کی ہے کہ ایک زمانہ آئیگا کہ لوگ سود کھائینگے عرض کیا گیا سب لوگ؟ فرمایا من لم یاکلہ منہم نالہ من غبارہ جو ان میں سے سود نہیں کھائیگا اس کا غبار اسکو پہنچ رہیگا آج یہ الفاظ مخبر صادق کے کیسے سچے نظر آتے ہیں۔

ممانعت سود کی وجوہ

سود کی ممانعت کی کیوں ضرورت ہوئی؟ اس کی وہ بڑی وجوہ اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمادی ہیں جن میں سے پہلی وجہ ان الفاظ میں ہے

فَمَنْ جَاۤءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ

سو جس کے پاس اپنے رب سے نصیحت آگئی پھر وہ رُک گیا تو اس کے لئے جو گزر چکا (معاف ہے) اور اس کا معاملہ

اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۤئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

اللہ کے سپرد ہے اور جو پھر لینے لگے پس وہی آگ والے ہیں وہ اس میں رہ پڑینگے ۳۵۲

مال کی بیجا محبت

یتخبطہ الشیطان من المس سودخوار کی حالت ایسی ہوجاتی ہے جیسے ایک شخص کو شیطان نے مجنون بنا کر گرا دیا ہو گویا وہ مال و دولت کی محبت میں مجنون ہوجاتا ہے اور پھر وہ گرجاتا ہے یعنی شرف انسانیت کھو دیتا ہے۔ یہ الفاظ نہایت سچے ہیں جب ایک انسان یا ایک قوم سودخوری میں ترقی کرتی ہے تو آخر مال و دولت کو اپنا معبود بنا لیتی ہے۔ اور ہمدردی انسانی کی اعلیٰ صفات سے محروم ہوجاتی ہے یہودیوں نے سودخوری میں ترقی کی ہمارے ملک کے بنئے بھی اسی کی مثال ہیں۔ ان کی مال و دولت کی محبت اس حد تک ترقی کر گئی ہے کہ اپنے آرام اور آسائش پر اپنی اولاد پر بھی صرف کرنا ان کو دشوار نظر آتا ہے۔ وہ مہذب قومیں جنہوں نے آج سودخوری میں ترقی کی ہے ان کا معبود صرف ایک مال رہ گیا ہے اسی کی وہ پوجا کرتے ہیں اس پر دین ایمان عزت عفت سب کچھ بیچنے کو تیار ہیں +

شراب اور سود کے بدنتائج بہت باریک ہیں

جس طرح اسلام سے پہلے کسی مذہب نے شراب کو حرام نہیں کیا اسی طرح سود کو بھی حرام نہیں کیا۔ بات یہ ہے کہ ان دونوں کے خطرناک نتائج اس قدر باریک ہیں اور ان کا دور کرنا اس قدر مشکل ہے کہ اس کام کا اہل وہی انسان تھا جس نے سب نبیوں اور رسولوں کا سرتاج ہو کر آنا تھا اسی کی وحی کو یہ کمال عطا کیا گیا کہ باریک سے باریک بدنتائج جو مدتوں بعد ظاہر ہوتے ہیں اسے دکھا دیئے جائیں اور اسی کو یہ قوت قدسی عطا کی گئی کہ خطرناک سے خطرناک بدیاں جو انسانوں کی طبائع کے اندر اس قدر دخل پا گئی ہیں کہ بظاہر جزو فطرت بنی ہوئی نظر آتی ہیں دنیا سے دور کرے۔

آنحضرتؐ کی کامل تعلیم اور کامل قوت قدسی

جس طرح شراب کے بدنتائج اگر انسان یوں دیکھنا چاہے کہ ایک شخص حد اعتدال تک شراب پیتا ہے یا دو چار گھونٹ پیتا ہے تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح بظاہر اس میں کسی کا نقصان نظر نہیں آتا کہ زید بکر کو دس روپے قرض دے اور اس پر سال بھر میں دو روپے یا چار روپے سود لے اور بکر ان دس روپوں کو تجارت میں لگا کر ان سے فائدہ اُٹھائے۔ اتنے عظیم الشان مسائل ہیں ایک وسیع پیمانہ پر اور لمبے زمانہ میں نتائج کو پھیلا کر دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یوں تو بدی اور نیکی چیزیں ہی ایسی ہیں کہ ان کے نتائج فوری اور بدیہی نہیں ہوتے بلکہ کھلا نتیجہ ان کا اسی وقت نظر آتا ہے جب ان کا بار بار کثرت سے اعادہ ہو۔ مگر جس قدر بدی باریک ہوگی اسی قدر اس کے نتائج اور لمبے زمانہ پر پھیلانے سے نظر آئینگے۔ خود زنا کی بدی ایسی ہے کہ اس کے بھی فوری بدنتائج لوگوں کو نظر نہیں آتے۔ اس لئے آج طرح طرح کے پیرایوں میں زناکاری کو رواج دیا جاتا ہے پس سودخوری کے نتائج کو جب لمبے زمانہ پر پھیلا کر دیکھا جائے تو خود واقعات شہادت دے اُٹھتے ہیں کہ وہ اخلاق انسانی اور عامہ آسائش انسانی کی ترقی میں بڑی بھاری روک ہی سودخوری کیساتھ جوں جوں مال کی محبت ترقی کرتی ہے۔ اصول۔ اخلاق۔ ہمدردی انسانی کی وقعت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہانتک کہ آخرکار ایسا انسان یا ایسی قوم روپے کی محبت کے عوض تمام اعلیٰ اخلاق کو بیچ دیتی ہے۔ اخلاق فاضلہ کی اعلیٰ منزل پر پہنچانے کے لئے ایک چھوٹی سی مالی منفعت کو قربان کرکے اسلام نے بتا دیا کہ واقعی وہ دنیا کا آخری اور کامل مذہب ہے سودخوری کے دوسرے عظیم الشان نقصان کی طرف اگلے الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے۔ دیکھو اگلا نوٹ +

بیع

۳۵۲ بیع چیز کے دینے اور قیمت کے لینے یعنی فروخت کو کہتے ہیں اور شرا خرید کو۔ مگر دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ اور معاملہ خرید فروخت پر بھی استعمال ہوتے ہیں +

سلف

سَلَف متقدم یعنی پہلے آنے والے کو کہا جاتا ہے فلہ ما سلف سے یہاں مراد ہے کہ جو اس کا گناہ پہلے گزر چکا اس پر گرفت (یعنی دنیا میں) نہیں کیجائیگی

امر

اَمْر کے اصل معنی شان یعنی معاملہ یا حالت ہیں اور وہ ہر قسم کے اقوال و افعال کیلئے عام لفظ ہے (غ) امرہ الی اللہ ایسا ہی محاورہ ہے

یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ؕ ۲۷۶

اللہ سود کو بے برکت کرتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

کسی کی پچھلی کمزوریوں کا ذکر

جیسے ہم کہہ دیتے ہیں اس کا معاملہ سپرد خدا یعنی تم انسان اس کے متعلق زبان مت کھولو کہ پہلے یوں کرتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام یہی تعلیم دیتا ہے کہ جب ایک شخص ایک برائی سے رک جائے تو اس کی گزشتہ کمزوریوں کا ذکر کرنا قرآن شریف کی رو سے ایک نہایت قبیح امر ہے۔

سود اور تجارت میں فرق

یہاں بتایا کہ لوگ سود کے جواز کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ جیسا سود ویسی تجارت حالانکہ لین دین خرید و فروخت کو اللہ تعالیٰ حلال قرار دیتا ہے اور سود کو حرام پس معلوم ہوا کہ وہ دونوں یکساں نہیں۔ ظاہری مساوات جس کی طرف لوگوں کی نظر جاتی ہے وہ تو یہ ہے کہ جب انسان مال خرید کر اس سے منفعت حاصل کر سکتا ہے اسی طرح روپے سے بھی اسے منفعت حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ مگر خدا کے ہاں ان دونوں میں فرق ہے ادنیٰ تامل سے کام لیا جائے تو وہ فرق یہ نظر آتا ہے کہ سود میں محنت نہیں خرید و فروخت میں محنت کرنی پڑتی ہے۔

سود سے محنت کی بے وقری

اسلام نے چونکہ محنت کو انسانی ترقی کا ضروری جزو قرار دیا ہے اس لئے ایک ایسے معاملہ کو جس میں محنت نہیں ناجائز ٹھہرایا ہے اور نہ صرف سود خوری محنت سے خالی ہے بلکہ اس سے محنت کی بے وقری بھی ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ سرمایہ دار جب سود پر روپیہ دیتا ہے تو وہ شخص جو اس سے تجارت کرتا ہے اور اس پر محنت کرتا ہے بعض وقت نفع اٹھاتا ہے بعض وقت نقصان۔ مگر سرمایہ دار ہمیشہ نفع لیتا ہے اور نقصان سے اس کو کچھ واسطہ نہیں۔ اگر بالفرض تجارت میں سارے مال کا بھی نقصان ہو جائے تو بھی سرمایہ دار نہ صرف اپنے سرمایہ کا حقدار ہے بلکہ وہ اس پر نفع بھی لیگا گویا محنت کی بمقابلہ سرمایہ یعنی روپیہ کے کچھ بھی قدر نہیں نقصان کی ذمہ دار وہ اور نفع سے فائدہ اٹھانے والا سرمایہ۔

شراکت کی فضیلت

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جہاں ایک شخص دوسرے سے روپیہ قرض لیکر تجارت چلاتا ہے تو سرمایہ دار اور محنت کرنے والا دونوں نفع نقصان میں حصہ دار ہوں یعنی بجائے قرض کے شراکت کا رنگ ہو۔ اسلام کا اصل الاصول معاملات دنیا میں محنت کے وقر کو بڑھاتا ہے۔ اسی لئے اس نے ان امتیازات کو دور کر دیا ہے جو مال کی کمی یا زیادتی سے پیدا ہوتے ہیں۔

سود خواری کا بدتر نتیجہ

سود خواری میں سرمایہ کی عزت محنت سے بڑھ کر ہے چنانچہ یورپ کی موجودہ سود خوار قوموں میں اس اصول کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انسانوں کا وہ حصہ جن کا مدار زندگی محنت پر ہے غریب اور مفلس ہو گیا ہے اور ان کا افلاس روز بروز ترقی کر رہا ہے اور سرمایہ اور روپیہ چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں اکٹھا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اکثر حالات میں یہ سرمایہ بھی محنت سے پیدا ہوا ہے۔ مگر جب ایک دفعہ وہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر کوئی اصول ایسا نہیں کہ اس کو محنت کرنے والوں کی طرف واپس کرے بلکہ اصول سود خواری کی رو سے یہ سود خوار کے ہاتھ میں بلا محنت ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔

سوشلزم اور بولشوزم

اس غلط اصول کا نتیجہ ہی پہلے سوشلزم کا اور اب بولشوزم کا پیدا ہونا ہے جنہوں نے اس سرمایہ کے چند ہاتھوں میں اجتماع کو دیکھ کر اس کے خلاف یہ اصول قائم کیا کہ کوئی شخص اپنے کمائے ہوئے مال کا آپ مالک نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ سب مل کر کمائیں اور ملکر کھائیں۔ گو اس میں محنت کی عزت نظر آتی ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں۔ اور اس میں بھی محنت کی بے وقری ہے کیونکہ جب محنت کے نتیجہ کا انسان مالک نہ ہوگا تو ترقی کے لئے اور زیادہ محنت کرنے کے لئے کوئی تحریک باقی نہ رہے گی۔

اصول محنت و مساوات دولت میں توازن اسلام نے قائم کیا

ان مشکلات کا حل اسلام نے کیا کہ ایک طرف تو محنت کو یہ عزت دی کہ محنت سے کمائے ہوئے مال کو محنت کرنے والے کا حق قرار دیا تاکہ محنت کیلئے یہ موجب تحریک ہو۔ اور دوسری طرف جب محنت سے سرمایہ ایک جگہ جمع ہونے لگے تو پھر اس کے واپس لوٹنے اور ایک حد تک دوسرے لوگوں میں تقسیم کرنے کا انتظام کیا۔ گویا اصول محنت مساوات دولت کے خلاف تھا۔ اور مساوات دولت اصول محنت کے خلاف اسلام نے ان دونوں کو نہایت خوبی سے جمع کیا ہے۔ یعنی اصول محنت کو بطور بنیاد قائم رکھا کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا اور مساوات دولت کے لئے کئی ایک قانون بنا دیئے جیسے زکوٰۃ کا اصول کہ جمع شدہ دولت کا چالیسواں حصہ ہر سال لازماً غربا کو دیا جائے۔ یا جیسے تقسیم ورثہ کا اصول کہ دولت ایک جگہ جمع ہو کر ایک شخص کی موت کے ساتھ تقسیم ہوتا رہے۔ ایسا ہی یہ اصول سود کی حرمت کا ہے کہ اس کی رو سے اغنیاء سے غربا کو مدد ملتی رہتی ہے۔

۲۷۷ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا

اور اللہ کسی ناشکر گزار گنہگار کو پسند نہیں کرتا ۳۵۳ جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں اور نماز کو

الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں ان کے لئے ان کا اجر انکے رب کے پاس ہے اور ان کو کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ غمگین ہونگے ۳۵۴

۲۷۸ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ کرو اور جو کچھ سود سے باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو جب تم مومن ہو ۳۵۵

شراب کی تجارت — بخاری میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت آنحضرت صلعم پر نازل ہوئی تو آپ نے اسے پڑھکر سنایا پھر شراب کی تجارت کو منع فرمایا یہ اس لئے کہ احل اللہ البیع میں بیشک ہر قسم کی تجارت جائز ہے مگر وہ تجارت جائز نہیں جو کسی حکم الٰہی کی خلاف ورزی میں ہو۔

محق — ۳۵۳ یمحق محق نقصان کو کہتے ہیں اور محقہ کے معنی ہیں ایک چیز کو گھٹا دیا اور اس کو بے برکت کردیا ۔

کفار — کفار کفر سے کفور اور کفار مبالغہ کے صیغے آتے ہیں اور کافر کی جمع کفار ہے۔ کفار کفر پر اصرار کرنے والا ہے۔ گویا وہ خدا کے حکم کے مقابلہ پر حالت رد پر مصر ہے ۔

اثیم — اثیم ۔ اثم سے مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی وہ باوجود عقیدہ حرمت کے گناہ میں پڑتا ہے ۔

سود سے بے برکتی اور صدقات سے برکت کا پیدا ہونا — یہاں بیان فرمایا ہے کہ سود سے بے برکتی پیدا ہوتی ہے اور صدقات سے برکت پیدا ہوتی ہے ۔ مسند امام احمد میں ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ان الربوا وان کثر فان عاقبتہ تصیر الی قل یعنی سود گو بہت ہو جائے مگر انجام اس کا کمی کی طرف ہوتا ہے ۔ اور صدقات کے متعلق بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو شخص ایک کھجور کے برابر پاک کمائی سے صدقہ کرتا ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ پاک مال کے سوا کے قبول نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اسکو اپنے دائیں ہاتھ سے قبول کرتا ہے پھر اسکو اس کے دینے والے کیلئے بڑھاتا ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنے بچھیرے کو پالتا ہے ۔ یہانتک کہ وہ ایک پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے (کتاب الزکوٰۃ) ۔

قوم کا مال کس طرح بڑھتا ہے — ان باتوں کی صداقت پر واقعات عالم شاہد ہیں کسی قوم کی دولت یوں نہیں بڑھتی کہ اس میں سے چند لوگوں کے صندوقوں میں بیشمار روپیہ پڑا ہو بلکہ قومی دولت بڑھی ہوئی اس وقت سمجھی جائے گی جب ہر ایک شخص کو اس دولت سے فائدہ پہنچ رہا ہو اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ سود خواری اس کے منافی اور صدقات اور صرف صدقات ہی اس کے معاون ہیں ۔

۳۵۴ جب ان لوگوں کا ذکر کیا جو احکام الٰہی کی اعتقاداً یا عملاً نافرمانی کرتے ہیں اور فرمایا کہ ایسے لوگ خدا کے محبوب نہیں ہو سکتے تو ساتھ ہی تقابل کے طور پر نیکوں کا ذکر کیا ۔ اور اعمال صالحہ کے دو ارکان نماز اور زکوٰۃ کا خصوصیت سے ذکر کیا ۔

بقایا سود کا ترک کرنا — ۳۵۵ یہاں یہ حکم دیا ہے کہ جب حرمت سود کا حکم نازل ہوا یا جب کوئی شخص توبہ کر کے حکم الٰہی کی فرمانبرداری کی طرف رجوع کرتا ہے تو جو کچھ سود وغیرہ اس وقت باقی ہے اسے چھوڑ دے ۔

حجۃ الوداع کا خطبہ — حجۃ الوداع میں نبی کریم صلعم نے جو خطبہ پڑھا تھا اس میں اور امور میں یہ بھی ذکر تھا کہ جس قدر جاہلیت کے سود کی رقمیں تھیں وہ سب موقوف کی جاتی ہیں یعنی اب قابل وصول نہ ہونگی اور فرمایا کہ پہلا ربا جو موقوف کیا جاتا ہے وہ عباس بن عبدالمطلب کا ہے یعنی آپ کے چچا کا ۔ یہ تعلیم کیوں موثر نہ ہو جس میں اصلاح گھر سے شروع کی جائے ۔

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ ۲۷۹

پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کے لئے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے تمہارے

أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۲۸۰

اصل مال ہیں نہ تم نقصان پہنچاؤ اور نہ تمہیں نقصان پہنچایا جائے ۳۵۶ اور اگر مقروض تنگدست ہو تو فراخی تک مہلت دینا چاہئے

وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۲۸۱

اور اگر تم خیرات کر دو تو تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو ۳۵۷ اور اس دن سے اپنا بچاؤ کرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے

اذن / أذنوا — **۳۵۶** أذنوا۔ اذن سے ہے۔ اَذِنَ کے اصل معنی سنا ہیں (کیونکہ اُذُن کان کو کہتے ہیں) اور پھر اس کا استعمال اس علم پر بھی ہوتا ہے جو سننے سے حاصل ہو اور بالآخر مطلق علم پر بھی کیونکہ اکثر علم سننے سے حاصل ہوتا ہے (غ) ابن جریر نے أذنوا کے معنی کئے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم پا لو۔ اور ابن عباس نے استیقنوا معنی کئے ہیں یعنی یقیناً جان لو (ج)۔

سود لینے والے کا قتل کرنا جائز نہیں۔ — یہاں سود لینے کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرنا قرار دیا ہے بعض لوگوں نے ظاہر الفاظ کا تتبع کر کے یہ خیال کر لیا ہے کہ سود لینے والے کو قتل کر دینا جائز ہے مگر یہ درست نہیں اور نہ حدود شرعی میں اس کا کہیں ذکر آتا ہے۔ یہ الفاظ صرف تنبیہ و تہدید کیلئے ہیں مال کی محبت بعض وقت انسان کو اندھا کر دیتی ہے اس لئے اس سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔

سود کا روپیہ اشاعت اسلام پر خرچ کرنا — یہاں سود لینے کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرنا قرار دیا ہے تو اس سے بطور اشارہ لطیفہ یہ استنباط ہو سکتا ہے کہ اگر انسان کے پاس کوئی ایسا روپیہ سود کا آ جائے جو اس نے سود حاصل کرنے کی نیت سے نہیں لیا یا جس میں کچھ شائبہ سود کا ہو تو اگر ایسے روپے کو اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں کے مقابلہ پر خرچ کر دیا جائے تو جائز ہے۔ اسی طرح جو لوگ بنکوں میں یا ڈاکخانوں میں روپیہ محض پس انداز کرنے کے لئے یا حفاظت کے لئے رکھوا دیتے ہیں۔ ان کے لئے جائز ہے کہ سود کے روپے کو وصول کر کے

ملازمین کا بونس — اشاعت اسلام کے کام پر لگا دیں مگر اپنے کسی مصرف میں نہ لائیں اسی طرح جن ملازمین کو بونس کا روپیہ ملتا ہے اگر اس میں کچھ حصہ سود کا ہو تو تقوے کا طریق یہ ہے کہ سود کے روپے کو تبلیغ دین پر لگا دیں یا جہاد میں صرف کر دیں ایسا ہی اگر کوئی شخص بنک میں روپیہ محض اس غرض سے جمع کراتا ہو کہ اس کے پسماندگان کے لئے کچھ اندوختہ رہ جائے تو یہ بھی اس شرط پر جائز ہو سکتا ہے کہ اصل رقم کے

ناجائز کمائی کا روپیہ — علاوہ جو روپیہ ہے وہ اشاعت اسلام کے کام پر لگا دیا جائے۔ اگر کسی شخص کے پاس ناجائز کمائی کا روپیہ ہے اور وہ آئندہ اس طریق سے توبہ کرتا ہے۔ اور مال مشتبہ کا الگ کرنا یا اصل حقداروں کو پہنچانا مشکل امر ہے تو اس کا بھی خیراتی کاموں پر لگا دینا جائز ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ناجائز طریق پر روپیہ کما کر خیرات میں دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ محض ایک حالت مجبوری ہے کہ روپے کو دوسری صورت میں تباہ کرنا پڑتا ہے تو اس صورت میں بہتر ہے کہ اسے اشاعت اسلام پر یا کسی خیراتی کام پر لگا دیا جائے۔

نظرۃ — **۳۵۷** نَظِرَۃ۔ نظر سے ہے ڈھیل یا مہلت دینا۔

میسرۃ — مَیْسَرَۃ۔ یُسر عُسر کی ضد ہے اور میسرۃ سے مراد یہاں غنا ہے۔

تصدق — تصدقوا۔ تصدّق کے اصل معنی ہیں صدقہ دیا۔ لیکن جب انسان کا ایک حق ہو اور اسے وہ چھوڑ دے تو اس پر بھی تصدق بولا جاتا ہے (غ)۔

قرضہ کا معاف کرنا — احادیث میں بھی قرضدار کو معاف کر دینے یا ڈھیل دینے کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ یہاں یا حکم ہے اور اسکی

۲۹۲ ثُمَّ تُوَفّٰی كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ ع ۳۹

پھر ہر شخص کو جو اس نے کمایا پورا دیا جائیگا اور انہیں نقصان نہیں پہنچایا جائیگا ۳۵۸ اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں مقرر

بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ

وقت کیلئے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لو ۳۵۹ اور چاہیئے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا عدل کیساتھ لکھے

لین دین کے معاملات

فرمانبرداری ضروری ہو یا سفارش ہو اور خدا کی سفارش سے بڑھکر کیا چیز مومن کو محبوب ہونی چاہئے۔ یہ وہ ہمدردی ہے جو اسلام سکھاتا ہے۔ مقروض تنگ دست ہو تو یا مہلت دو یا معاف ہی کردو آج کل کے قوانین کی طرح جیلخانہ میں نہیں بھیجا جاتا ۔

آخری آیت جو آنحضرت پر نازل ہوئی۔ آیات کی ترتیب آنحضرت کے حکم سے

۳۵۸ اس آیت کے متعلق متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری آیت ہے جو نبی کریم صلعم پر نازل ہوئی اور اس کا نزول آپ کی وفات سے چند ہی یوم پیشتر تھا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا اجعلوھا بین آیۃ الربوٰا وآیۃ الدین یعنی اس کو آیت ربا اور آیت دَین کے درمیان رکھدو (آیتِ دَین آگے آتی ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم ہر ایک آیت کا مقام خود بتاتے تھے۔ اور بخاری کی یہ روایت جو ابن عباس سے ہے کہ آخری آیت جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوئی آیت ربا تھی اس کے خلاف نہیں۔ امام بخاری نے جس باب کے نیچے اس حدیث کو بیان کیا ہے وہ واتقوا یوما ترجعون فیہ ہے چونکہ ربا کا مضمون اس آیت پر ختم ہوتا ہے اس لئے اسی کو آیت ربا کہدیا ہے۔ مضمون ربا کا خاتمہ اس آیت پر کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مال و دولت جس کی محبت کے لئے تم اپنے اخلاق کو تباہ اور روحانیت کو برباد کرتے ہو یہ انجام کار تمہارے کچھ کام نہیں آئے گی ۔

مدا ینۃ

۳۵۹ تداینتم۔ دَین قرضہ کو کہتے ہیں اور مُدا ینۃ اس سے مفاعلہ ہے ایک دوسرے سے قرض کا معاملہ کرنا ۔

حفاظت مال کی تعلیم

پچھلے تین رکوعوں میں ایک طرف انفاق فی سبیل اللہ پر زور دے کر اور دوسری طرف سود کو حرام قرار دے کر مال کی محبت کی جڑ کاٹی ہے تو اب یہ بھی بتا دیا کہ مال کی حفاظت کی کس قدر ضرورت ہے۔ یہانتک کہ مال کی حفاظت کو ایک دینی حکم قرار دیا بلکہ ان لوگوں کو جو اپنے مال کی حفاظت نہیں کرسکتے سفیہ قرار دیا یہی اسلام کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ انسانی قوتے کے نشوونما میں اعتدال کے پہلو کو کبھی نظرانداز نہیں کرتا۔ مال سے محبت نکرنا اخلاق فاضلہ کے لئے ضروری ہے۔ مگر یہ نہیں کہ حقوق کی حفاظت نہ کی جائے کیونکہ مال سے انسان کے کام چلتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا التی جعل اللہ لکم قیاما (النسآء ۔۵) اور جو شخص مال کی حفاظت نہ کریگا وہ دوسروں کا محتاج ہو جائے گا اور احتیاج بھی اخلاق فاضلہ سے محروم کرتی ہے ۔

لین دین کے معاملات چار طرح پر

لین دین کے معاملات چار طرح پر ہو سکتے ہیں ا۔ بیع العین بالعین لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود ہوں اس کو تجارت حاضرہ کے نام سے موسوم کیا ہے قیمت دی اور چیز لی۔ تحریر کی ضرورت نہیں ۲۔ بیع الدین بالدین یعنی لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ یہ فرضی بیع ہے جیسا آج کل تجارت کے رنگ میں جوا کھیلا جاتا ہے جسے سٹہ کہتے ہیں اسے اسلام نے منع کیا ہے ۳ و ۴ بیع العین بالدین یا بیع الدین بالعین یعنی ایک چیز موجود نہ ہو اور دوسری ہو یہی مداینہ ہے اس میں حکم ہے کہ ایسے معاملات کو لکھ لیا کرو اور گواہ بھی رکھ لیا کرو تا جھگڑے کم ہوں ۔

تحریر معاملات کے حکم میں آیندہ کی خبر

عرب اُمّی قوم تھی۔ معاملات سادہ رنگ کے تھے ان میں لکھنے کا رواج نہ تھا۔ کاغذ بھی کمیاب تھا۔ ایسی قوم کو تحریر معاملات کا اتنا موکد حکم بتاتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کے ایک عظیم الشان متمدن قوم بننے کا اشارہ تھا۔ اس لئے اس قوم کی بنیاد ہی ایسی رکھی کہ آیندہ ضرورتوں کا سامان پہلے سے کر دیا ۔

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ

اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا اللہ نے اسے سکھایا اور ضرور لکھ دے اور چاہیئے کہ وہ جس پر حق ہے لکھائے

وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ

اور وہ اللہ اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرے اور اس سے کچھ کمی نہ کرے پھر اگر وہ شخص جس پر حق ہے کم عقل یا

ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا

ضعیف ہو یا لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوائے اور دو گواہ اپنے

شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ

مردوں میں سے گواہی کیلئے بلالیا کرو پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے ہوں

مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا

جن کو تم پسند کرو تاکہ اگر ایک بھول جائے تو ایک ان دونوں میں سے دوسری کو یاد دلا دے اور گواہ جب بلائے جائیں

مَا دُعُوا وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ

انکار نہ کریں اس کے وقت تک اسے لکھنے میں کاہلی نہ کرو تھوڑا ہو یا بہت۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت انصاف

عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً

کی بات ہے اور گواہی کو بہت مضبوط رکھنے والی ہے اور اس سے بہت قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو لیکن اگر نقد سودا

حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهِدُوا

ہو جس کو تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو پھر تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اسے نہ لکھو اور جب خرید و فروخت

إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ

کرو تو گواہ رکھ لیا کرو اور نہ لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے اور نہ گواہ کو اور اگر تم (ایسا) کرو گے تو یہ تمہاری طرف سے

بِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ○

نافرمانی ہوگی اور اللہ کا تقویٰ کرو اور اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۔ ۳۶۰

ف ۳۶۰ کما علمہ اللہ ۔ میں کما کے معنی بِمَا جل کے بھی ہو سکتے ہیں یعنی اس لئے کہ اللہ نے اسے سکھایا اور کے معنی مثل بھی ہو سکتا ہے

٢٨٣ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ فَإِنْ أَمِنَ

اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو (کچھ) قبضہ میں کرکے گرو رکھ لیا جائے پھر اگر تم میں سے

یعنی جس طرح اللہ نے اُسے سکھایا۔ کاتب کے سیکھنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا کیونکہ اسی نے انسان کو استعداد دی اور اُسی نے سامان مہیا کئے +

عدل — بالعدل۔ اس سے یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ کسی فریق کی طرف میلان نہ ہو اور یہ بھی کہ کتابت میں عدل ہو یعنی ایسی کتابت ہو جس پر وثوق کیا جاسکے (ر) پس ہر شخص کتابت کا اہل نہیں یوں وثیقہ نویسی کو ایک فن قرار دیا ہے +

وثیقہ نویسی

ملل — تُملل۔ مَلّ کے اصل معنی ملال ہونے کے ہیں (ل) حدیث میں ہے فان اللہ لا یمل حتیٰ تملّوا یعنی (وہ عمل اختیار کرو جس کی طاقت رکھتے ہو کیونکہ) اللہ ملول نہیں ہوتا یہاں تک کہ تم ملول ہو جاتے ہو۔ ملول ہونا انسان کے لئے ہے خدا کے لئے نہیں۔ اور

املال۔ املاء — اَملَلْتُ الکتاب اور اَملَیْتُ الکتاب کے ایک ہی معنی ہیں اسے کاتب پر ڈالا (یعنی بول کر) تاکہ وہ اسے لکھ لے (ل) قرآن شریف میں دوسری جگہ اِملاء آتا ہے۔ فھی تملیٰ علیه بکرۃ و اصیلا۔ (الفرقان ۲۵ - ۵) اور لفظ مِلّۃ بمعنی مذہب بھی ملت الکتاب سے

ملة

مدیون کا حق — ہی اخذ کیا ہے الذی علیه الحق جس شخص پر حق قایم ہو رہا ہے وہ لکھوائے اس سے بہت سے مظالم کا سد باب ہوتا ہے جو آج ساہوکاروں کی طرف سے غریب مدیونوں پر ہو رہے ہیں جو چاہتے ہیں خود بہیوں میں لکھ لیتے ہیں +

بخس — یبخس۔ بخس ظلم کے طور پر کسی چیز کا کم کرنا (غ) +

سفیه — سفیھا۔ دیکھو ۲۵ جو لوگ اپنے اموال کو ٹھیک طرح سے خرچ کرنا یا اپنے حقوق کی حفاظت کرنا نہیں جانتے ان کو سفیہ کہا ہے +

ضعیف — ضعیفا۔ لڑکا ہو یا بہت بوڑھا +

لا یستطیع ان یمل ھو۔ املاء نہ کرسکنے کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں گو نگا ہو۔ زبان سے ناواقف ہو۔ کوئی اور عارضہ ہو +

ان لم یکونا رجلین۔ دو گواہ مرد نہ ہوں یعنی نہ ملیں یا نہ رکھنا چاہو +

ضلال — تضل۔ طریق مستقیم سے عدول کا نام ضلال ہے عمداً ہو یا سہواً تھوڑا ہو یا بہت (غ) چنانچہ محض نسیان یعنی بھول جانے پر بھی بولا جاتا ہے (غ) +

تذکر — تذکر۔ اس کے معنی کئے ہیں تیعل ذکرہ (غ) یعنی اس کے ذکر کا اعادہ کردے +

حاضرة — حاضرۃ۔ موجود یعنی نقد تجارت +

ضر — یضار۔ یہاں ضر بمقابلہ نفع ہے (ش) یعنی مالی نقصان نہ پہنچایا جائے جب شہادت میں بلایا جائے اس کو اس کی صنعت یا محنت کا عوضہ دیا جائے +

باہم معاملات میں احتیاط قوانین — اس ایک آیت میں ایک ترقی یافتہ قوم کی لین دین کی جملہ ضروریات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اول کاتبوں یا وثیقہ نویسوں کی ضرورت بتائی۔ وہ لکھنے سے انکار نہیں کرسکتے اور لکھانے والے کو معاوضہ دینا ضروری ہے۔ دوم۔ گواہ ہوں وہ گواہی دینے سے انکار نہیں کرسکتے۔ مگر جو ان کو بطور گواہ بلاتا ہے وہ ان کے کاروبار کے ہرجہ کا معاوضہ دے۔ سوم۔ معاملہ کرنے والا بچہ ہو یا بوڑھا یا مال کی حفاظت نہ کرسکتا ہو یا کوئی اور امر مانع ہو تو اس کا ولی مقرر کیا جائے غرض ایک ایک فقرہ میں ایک ایک قانون کی بنیاد قایم کردی ہے آگے اس پر قانون بن سکتے ہیں +

دو گواہ — یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شہادت میں دو گواہوں کا ہونا بلحاظ حالات عامہ ہے عموماً دو گواہوں سے بات منضبط ہو جاتی

بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا

ایک دوسرے کا اعتبار کرے تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے چاہئے کہ وہ اپنی امانت کو ادا کرے اور اللہ اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرے اور گواہی

الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ

کو نہ چھپاؤ اور جو شخص اسے چھپاتا ہو تو اس کا دل ضرور گنہگار ہوتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے [۳۶۱]

ہے جھوٹ کی ملاوٹ کا احتمال کم ہو جاتا ہے۔ بیان کا جو حصہ ایک دوسرے کی تائید میں ہو وہ وزنی ہو جاتا ہے۔ یہ حکم نہیں کہ اگر ایک ہی گواہ ہو تو فیصلہ نہ کیا جائے یا قرائن کی شہادت پر فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ حضرت یوسفؑ کے معاملہ میں جہاں قمیص کے آگے یا پیچھے سے پھٹنے کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ قرائن کی شہادت پر بھی فیصلہ ہو سکتا ہے +

عورت کی گواہی اور ایک مرد کی جگہ جو دو عورتوں کی شہادت رکھی تو اس کی وجہ بھی خود ہی بتا دی کہ عورتوں کو چونکہ معاملات لین دین سے واسطہ کم پڑتا ہے اسلئے ایسی باتوں کو شاید وہ اچھی طرح یاد نہ رکھ سکیں تو ایک کی کمی کو دوسری پورا کر دے۔ اکیلی عورت کی شہادت ناقابل قبول ہونے کا ذکر کہیں نہیں۔ بلکہ لعان کے معاملہ میں جو وزن مرد کی چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے وہی وزن عورت کی چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے گویا مرد اور عورت کی شہادت میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ولادت بکارت وغیرہ معاملات میں فقہانے بھی عورت کی شہادت کو پورا وزن دیا ہے +

رِھان۔ رَھن **امانۃ** [۳۶۱] رِھان۔ رَھْن کی جمع بھی ہے اور خود رَھْن کی طرح مصدر بھی ہے اور وہ چیز ہی جو بطور ضمانت قرض کے لئے رکھی جائیں، امانۃ۔ اَمْن اور اَمانَۃ اور اَمَان اصل میں مصدر ہیں جن کے معنی نفس کی طمانیت اور خوف کا جاتے رہنا ہے۔ اور اَمان اس حالت کا نام بھی ہے جس میں انسان ہو اور اس چیز کو بھی کہدیا جاتا ہے جس کے متعلق انسان کا اعتبار کیا جائے یا اسے امین سمجھا جائے اسی معنی میں امانت ہے (غ)، اور یہاں جس چیز کے متعلق اعتماد کیا گیا ہے وہ قرضہ ہے پس اسی کو امانت کہدیا ہے +

رہن با قبضہ کا جواز عام ہے قرض کا معاملہ تحریر سے دو صورتوں میں مستثنےٰ کیا۔ اول رہن با قبضہ کی صورت میں۔ دوم اعتماد ہو۔ رہن با قبضہ کا جواز تو یہاں صریح ہے مگر آیا یہ مشروط سفر اور کاتب کے نہ ملنے سے ہے۔ یا جواز تو عام ہے اور یہاں صرف یہ توجہ دلائی ہے کہ اگر سفر وغیرہ میں کاتب نہ ملے۔ تو تمہارے لئے ایک دوسری صورت بھی جائز ہے۔ دوسری صورت کا صحیح ہونا جمہور کا مذہب ہے یعنی رہن با قبضہ

آنحضرت کا زرہ کو یہودی کے پاس رہن رکھنا۔ بہرحال جائز ہے خواہ سفر میں ہو یا حضر میں۔ کاتب ملے یا نہ ملے۔ احادیث صحیحہ سے اسی کی تائید ہوتی ہے صحیحین میں حضرت انسؓ سے ہے ان رسول اللہ صلعم توفی ودرعہ مرھونۃ عند یہودی علی ثلثین وسقا من شعیر رھنھا قوتا لاھلہ یعنی رسول اللہ صلعم فوت ہو گئے اور آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس وسق جو پر رہن تھی جو آپ نے اپنے اہل کے گزارہ کیلئے لئے تھے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم نہ تو سفر میں تھے کیونکہ اہل کے گزارہ کا ذکر ہے۔ اور نہ ہی کاتبوں کی آپ کے پاس کمی تھی۔ پس رہن با قبضہ کا جواز عام ہے +

نبی کریم کا گزارہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کس طرح گزارہ کرتے تھے اور بیت المال سے کس قدر لیتے تھے۔ آپ وفات کے وقت عرب کے بادشاہ تھے خراج کا لاکھ سے زیادہ درہم صرف بحرین سے آپ کے پاس آیا اور آپ نے مسجد کے صحن میں اسے رکھوا دیا اور تب اُٹھے جب تقسیم کر چکے مال غنیمت سے ایک ایک کو سو سو اونٹ بھی دیئے۔ اپنی ذات کے لئے لیتے تو کون اعتراض کر سکتا تھا۔ مگر اپنی یہ حالت ہے کہ تھوڑے سے جو کے لئے اپنی زرہ گرو رکھی ہوئی ہے۔ جو لوگ آپ پر نفسانیت کا الزام کرتے ہیں کاش ان کے سینوں میں دل ہوتا +

۲۸۴ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ

اللہ ہی کا ہی جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہو اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا

تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَاۗءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاۗءُ ۭ

اسے چھپاؤ اللہ اسکے مطابق تم سے حساب لیگا پھر وہ جس کو چاہے مغفرت کرے اور جس کو چاہے عذاب دے

وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۶۲

اسلام کی وسعت اس کی کامیابی

رہن با قبضہ جائز نہیں

اس آیت سے اور احادیث سے جو اس بارہ میں مروی ہیں یہی ثابت ہے کہ رہن با قبضہ ہی جائز ہے بلا قبضہ رہن جائز نہیں اور وہ درحقیقت سود کی ایک صورت ہے۔ البتہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ رہن با قبضہ کی صورت میں مرہونہ چیز سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً گھوڑا رہن رکھا تو اس کو چارہ دیا جاتے اور اس سے سواری کا کام لیا جائے جانما دغیر منقولہ کے رہن با قبضہ کا مسئلہ بھی اس سے اخذ کیا جا سکتا ہے یعنی زمین یا مکان کا رہن با قبضہ جائز ہے۔ اور زمین کی پیداوار اور مکان کے کرایہ سے فائدہ اٹھانا بھی جائز ہے بشرطیکہ لگان یا اخراجات وغیرہ بھی ادا کئے جائیں۔ البتہ جو لوگ زمین یا مکان کو اپنے قبضہ میں نہیں لیتے اور مالک سے کچھ سالانہ منافع مقرر کر لیتے ہیں تو وہ صریح سود ہے +

مکان اور زمین کا رہن

معاملہ دنیوی میں سچائی کی اہمیت

پہلے ذکر کیا تھا کہ گواہ انکار نہ کرے۔ اب یہ حکم دیا ہے کہ گواہی کو نہ چھپائے اور جو چھپائے اس کا دل گنہگار ہوتا ہے۔ دل گنہگار کہنے سے یہ منشاء ہے کہ انسان ان لین دین کے معاملات کو معمولی نہ سمجھے جو شخص ان معاملات میں راستبازی سے کام نہیں لے سکتا۔ وہ راستباز نہیں ہو سکتا۔ قلب چونکہ تمام نیکیوں کا مرکز ہے اس پر اثر پڑنے سے دوسری نیکیوں کی توفیق بھی چھن جاتی ہے پس یہ سمجھایا ہے کہ یہی چھوٹے چھوٹے معاملات ہی انسان کے قلب کو سفید یا سیاہ کر دیتے ہیں جو شخص انسانوں کے باہم معاملات اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں صداقت کا طریق اختیار نہیں کرتا وہ نماز او روزہ سے نیک نہیں بن سکتا +

کتمان شہادت اور جھوٹی شہادت

یہاں صرف کتمان شہادت کو اس قدر برا بتایا ہے یعنی سچی شہادت چھپانے کو۔ تو جھوٹی شہادت کس قدر بڑا گناہ ہے۔ اگر سچی شہادت کا اخفا بھی انسان کے دل کو سیاہ کر دیتا ہے تو اس شخص کی کیا حالت ہوگی جو جھوٹی گواہی دیتا ہے۔ اور یہی وہ لوگ مسلمان کہلاتے ہیں جو آٹھ آٹھ آنے پر کچہریوں میں جا کر جھوٹی شہادتیں دیتے اور علاوہ اپنا قلب سیاہ کرنے کے اسلام کو بھی بدنام کرتے ہیں یہی سیاہ دلی ان لوگوں کے حصہ میں بھی آئی ہے جو حکام کے سامنے جھوٹے واقعات بیان کرتے ہیں یا سچے واقعات کا اخفا کرتے ہیں محض اس لئے کہ حکام ان سے خوش ہو جائیں۔ ان کی خان بہادریاں محض سیاہ دلی کے تمغے ہیں۔ خدا کی ناراضی کا کوئی خیال نہیں۔ ان کے معبود وہ حاکم ہیں نہ خدا اور ان کا دعویٰ اسلام ایک جھوٹ ہے +

خلاصہ سورہ بقرۃ

۳۶۲ یہ رکوع سورت کو ختم کرتا ہوا اس کے مضمون کا خلاصہ بیان کرتا ہے یعنی مذہب اسلام کی وسعت کہ سب رسولوں پر ایمان لاؤ اور کامیابی کی بشارت جو دعا کے رنگ میں فانصرنا علی القوم الکافرین میں سکھائی۔ ابتداء میں فلاح کا وعدہ اور آخرت پر نصرت کی دعا ایک ہی بشارت دیتے ہیں +

آیت ان تبدوا کی منسوخی پر بحث

الفاظ ان تبدوا ما فی انفسکم آیت کے آخر تک کو کئی مفسرین نے منسوخ قرار دیا ہے۔ ابن عمر سے بخاری میں روایتیں ان کی منسوخی کی ہیں مگر ابن جریر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عمر اس کی منسوخی کے قائل نہ تھے چنانچہ ابن جریر میں ہے کہ ابن عمر

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط ٢٨٥

رسول اس پر ایمان لاتا ہے جو اس کے رب سے اس کی طرف اُتارا گیا اور مومن (بھی)

نے اس آیت کو پڑھا تو بہت روئے ابن عباس کے پاس ذکر ہوا تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے اس کو پچھلی آیت نے منسوخ کردیا یہاں ابن عباس کو منسوخی کا قائل قرار دیا گیا ہے مگر ابن جریر کی دوسری روایت سے پایا جاتا ہے کہ ابن عباس اس کی منسوخی کے قائل نہ تھے۔ اسی بنا پر خود ابن جریر نے اس کے منسوخ ہونے سے انکار کیا ہے +

پھر سورہ آل عمران میں جو اس کے بعد ہے بعینہ ایسے الفاظ ہیں قل ان تخفوا ما فی صدورکم او تبدوہ یعلمه الله (آل عمران ٢٨) جہاں یعلمه الله سے وہی مراد ہے جو یہاں یحاسبکم الله سے ہے۔ اگر ان الفاظ کو لا یکلف الله نے منسوخ کردیا ہوتا تو دوبارہ اسی مضمون کے لفظ کیوں نازل ہوتے۔ اور یہ روایت کہ اس آیت کے نزول پر صحابہ نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ یہ ہماری طاقت سے باہر ہے تو آیت لا یکلف الله نازل ہوئی خود عدم نسخ کی مؤید ہے اس لئے کہ اس میں یہ لفظ کہیں نہیں آتے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ہو کہ پہلی آیت منسوخ ہوگئی۔ ہاں یہ کہا جائیگا کہ دوسری آیت نے پہلی کے معنی واضح کردیئے اور بتادیا کہ وہ مراد نہیں جو بعض صحابہ نے خیال کرلیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمادیا کہ انسان کی وسعت سے بڑھکر کوئی حکم نہیں دیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے اس قسم کی وضاحت معنی پر ہی صحابہ نسخ کا لفظ مجازاً استعمال کرلیتے تھے جہاں سے ناسخ منسوخ کی غلط فہمی پیدا ہوئی۔ چنانچہ روح المعانی میں اسی کے مطابق خیال نقل کیا گیا ہے۔ ان المراد من النسخ البیان وایضاح المراد مجازاً مسند احمد کی روایت اس معاملہ کو بالکل صاف کردیتی ہے جس میں ابن عباس سے ہے کہ جب یہ آیت ان تبدوا... نازل ہوئی تو لوگوں کے دلوں میں ایک خیال گزرا جو پہلے کبھی نہ گزرا تھا اور دوسری روایت میں ہے وہ سخت مغموم ہوئے کہ ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے) تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ قولوا سمعنا واطعنا وسلمنا فالقی الله الایمان فی قلوبهم یعنی کہو ہم نے سنا اور فرمانبرداری کی اور تسلیم کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان ڈالا۔ اور پھر اٰمن الرسول... نازل ہوا جس سے معلوم ہوا کہ دوسری آیت کے نزول سے پہلے ہی وہ سمجھ چکے تھے۔ اور ارشاد نبوی سمعنا واطعنا بتاتا ہے کہ یہ طاقت سے باہر کوئی چیز نہ تھی پس یہ یاد رکھنا چاہئے کہ نسخ کا لفظ محض واضح کرنے کے معنی میں صحابہ نے استعمال کیا ہے۔ گویا ایک غلط خیال جو کسی کے دل میں ان الفاظ سے پیدا ہوا وہ منسوخ ہوا اصل الفاظ منسوخ ہونے کا منشاء نہیں ہوتا +

نسخ کا استعمال صحابہ میں

چھپی اور کھلی باتوں پر خدا کا محاسبہ

اب معنی پر غور کرو تو اور بھی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منسوخ نہیں۔ ایک بات کو دل میں چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو اللہ اس کے مطابق تم سے حساب لیگا۔ ظاہر ہے کہ دل میں وہ بات چھپائی جاتی ہے جس کا انسان عزم کرچکا ہو کہ میں ایسا کروں گا پھر اس کو چھپاتا ہے کہ لوگوں پر ظاہر نہ ہو اور جو کوئی وسوسہ دل میں گزرے اور نکل جائے اس پر دل میں چھپانا صادق نہیں آتا جن کو غلطی لگی وہ یہی لگی کہ انہوں نے سمجھا کہ جو خیال دل میں گزرے اس پر محاسبہ ہوگا۔ حالانکہ یہ مراد نہ تھی جیسا کہ آنحضرت صلعم نے قولوا سمعنا واطعنا سے سمجھا دیا۔ اور لا یکلف الله نے اس کی مزید توضیح کردی۔ اسی کی تائید دوسرے مقامات سے ہوتی ہے جہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ گرفت اس پر کرتا ہے جو دل کر گزرے اور محض خیال یا وسوسہ پہلے سے مستثنیٰ ہے جیسا کہ سورہ النجم میں ہے الا اللمم (النجم ٥٣: ٣٢) اور دل کا گزرنا پختہ طور پر ٹھان لینا ہے جیسا فرمایا بما کسبت قلوبکم اور بما تعمدت قلوبکم اور پھر محاسبہ بھی ہر ایک فعل پر برابر نہیں فیغفر لمن یشاء میں خود بتا دیا کہ بہتیری باتیں اللہ تعالیٰ معاف بھی کرتا رہتا ہے اسی کے مطابق صحیحین میں ابوہریرہ کی روایت ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب بندہ بدی کا قصد کرے تو اس کے خلاف نہ لکھو اگر وہ فعل کردے تو اس کو ایک بدی لکھو اور جب وہ نیکی کا قصد کرے اور وہ نیکی عمل میں نہ آئے تو اسے ایک نیکی لکھو۔ اور اگر عمل میں آجائے تو دس نیکیاں لکھو۔ یہ وسعت رحمت ہے +

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

سب اللہ پر اور اسکے فرشتوں اور اسکی کتابوں اور اسکے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں ہم اسکے رسولوں میں سے کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے فرمانبرداری کی لے ہمارے رب تیری مغفرت ۳۶۳ مانگتے ہیں اور تیری طرف ہی انجام کار پہنچنا ہے

۲۸۶ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ

اللہ کسی شخص پر کچھ ۳۶۴ مشقت نہیں ڈالتا مگر (جو) اسکی طاقت ہو۔ اسی کیلئے ہے جو وہ (اچھی) کمائی کرے اور اسی پر ہے جو وہ (بری) کمائی کرے

آیت کے پہلے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اور دوسرے میں علم کامل کا ذکر ہے اور یہی دو چیزیں ہیں جن سے جزاو سزا پر ایمان پیدا ہوتا ہے +

غفران

۳۶۳ غفرانك. غفران۔ غفر سے مصدر ہے معنی کے لئے دیکھو ۲۵۵ نیز ۳۶۵ تقدیر یوں ہے نسالك غفرانك +

سب انبیاء پر ایمان

اس سورت کے شروع میں وسعت اسلامی کی طرف توجہ دلائی یومنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك۔ درمیان میں بھی۔ جہاں فرمایا کہ ہم صرف ابراہیم موسیٰ عیسیٰ پر ہی ایمان نہیں لاتے بلکہ جو کچھ بھی دنیا میں کہیں نبیوں کو دیا گیا اس کو بھی مانتے ہیں وما اوتی النبیون من ربہم (۱۳۶) اور اب پھر۔ اور ما انزل من قبلك کی تفسیر ما اوتی النبیون من ربہم سے کردی یعنی ما انزل میں صرف وہی چیز ہے جو نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی۔ کیونکہ وحی الٰہی غیر انبیاء کو بھی ہوتی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں کئی جگہ ذکر ہے۔ اور پھر دونوں کی تفسیر یہاں لفظ کتبہ لا کر کر دی یعنی وہ ما انزل من قبلك اور ما اوتی النبیون من ربہم اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں جو ان نبیوں کو دی گئیں اور اسی طرح کتبہ ورسلہ کی تفسیر ما انزل من قبلك سے کردی کہ وہ کتابیں اور رسول وہی ہیں جو تجھ سے پہلے دنیا میں ہو چکے بعد میں ہونے والا کوئی نہیں۔ اگر آپ کے بعد بھی رسول آنے والے ہوتے تو من قبلك کی حد بندی عائد نہ کی جاتی +

من قبلك کی تحدید

کلّف

۳۶۴ یکلف۔ کلّف سے ہے کلّفہ کے معنی ہیں اس کو ایسا حکم دیا جو اس پر مشقت ہے (غ) +

وسع

الا وسعہا۔ وُسع کے معنی فراخی بھی ہیں اور قدرت یا طاقت بھی جو مکلّف کے اندازہ سے بڑھ کر ہو (غ)، صورت ثانی میں معنی یوں ہونگے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اس سے کم مشقت ڈالتا ہے جس سے اس کی طاقت درماندہ ہو جائے۔ اور صورت اول میں یوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر جو مشقت ڈالتا ہے اس کا پھل وسعت ہوتا ہے یا جنت (غ) یعنی جو باتیں تکلیف یا مشقت کی معلوم ہوتی ہیں انہی سے فی الحقیقت انسان کے لئے وسعت پیدا ہوتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ان مع العسر یسرا (الانشراح ۹۴-۶) یا فرمایا یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (۱۸۵) +

مشقت سے راحت پیدا ہوتی ہے

کسب۔ اکتساب

کسبت۔ اکتسبت گو کسب اور اکتساب دونوں بھلائی اور برائی پر استعمال ہوتے ہیں مگر یہاں کسب بھلائی کیلئے اور اکتساب برائی کے لئے ہے جیسا لہا اور علیہا سے ظاہر ہے اصل فرق دونوں میں یہ ہے کہ کسب اپنے لئے بھی ہو سکتا ہے اور اپنے غیر کیلئے بھی اور اکتساب صرف اپنے لئے ہوتا ہے۔ اس لئے بعض کے نزدیک کسبت سے مراد وہ افعال ہیں جو فعل خیر سے انسان دوسرے کیلئے کرتا ہے اور اکتسبت سے مراد وہ افعال ہیں جو اپنی ذات کیلئے کرتا ہے۔ گو یا جو کچھ دوسرے کی بھلائی کو مدنظر رکھکر کیا جائے وہ بہرحال لہا ہے یعنی موجب نفع اور جو کچھ اپنے آپ کو مدنظر رکھکر کرتا ہے وہ علیہا ہے یعنی وبال کی صورت اختیار کر لیتا ہے +

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا

اے ہمارے رب ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھول جائیں یا خطا کریں اے ہمارے رب اور ہم پر نافرمانی کا بوجھ نہ ڈال

كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا

جیسا تو نے ان پر ڈالا جو ہم سے پہلے تھے[٣٦٥] اے ہمارے رب اور ہم پر ایسا بوجھ نہ رکھ جس کی طاقت ہم میں

بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا وقفۃ وَاغْفِرْ لَنَا وقفۃ وَارْحَمْنَا وقفۃ

نہیں اور ہمیں معاف فرما اور ہماری حفاظت فرما[٣٦٦] اور ہم پر رحم فرما۔

مواخذۃ

٣٦٥ تؤاخذنا۔ گناہ کی سزا پر لفظ مُؤَاخَذَۃ جو اخذ سے مفاعلہ ہے اس لئے اختیار کیا گیا کہ اس میں مجازات اور مقابلہ کے معنی ہیں کیونکہ انہوں نے نعمتوں کو اللہ تعالیٰ سے لیا پھر ان کے مقابلہ پر شکر نہ کیا ؛

اصر

اِصْر کے اصل معنی بوجھ اور مضبوط باندھ دینا پھر کسی عہد کا گناہ جب اسے ضائع کر دیا جائے یعنی عہد شکنی کا گناہ (ل) اور حدیث

ظل اللہ

میں بادشاہ کے متعلق آتا ہے کہ وہ زمین میں ظل اللہ ہے جب اچھا کرے تو اس کے لئے اجر اور تم پر شکر ہے اور جب برا کرے تو اس پر اِصْر ہے (ل) یعنی اس عہد کے توڑنے کا گناہ جو سلطان اور رعایا کے درمیان ہے ؛

غفر

٣٦٦ اِغفر۔ یہاں اور قرآن شریف کے بہت سے موقعوں پر غَفْر کے معنی خصوصیت سے گناہ سے محفوظ کرنا ہیں دیکھو ح ٢٥٨ کیونکہ گناہ کی سزا سے بچانے کا ذکر واعف عنا میں موجود ہے۔ پہلا مرتبہ گناہوں کی سزا سے بچانے کا تھا اس کا ذکر عفو میں ہے۔ دوسرا

عفو اور غفر کا اکٹھا ذکر

مرتبہ خود گناہ سے بچانے کا ہے اس کا ذکر غفر میں ہے۔ اور اسی لئے عفو کو پہلے مرتبہ پر اور غفر کو دوسرے پر رکھا ہے۔ اور جہاں کہیں قرآن شریف میں عفو اور غفر کا ذکر اکٹھا آیا ہے۔ عفو کو پہلے رکھا ہے۔ کیونکہ وہ ادنےٰ مرتبہ ہے اور غفر کو پیچھے۔ بلکہ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی صفات عَفُوّ اور غَفُوْر کو اکٹھا کیا ہے وہاں بھی عفو کو پہلے اور غفور کو پیچھے رکھا ہے۔ دیکھو النساء ٤ - ٤٣ و ٩٩ ؛ الحج ٢٢ - ٦٠ ؛ المجادلۃ ٥٨ - ٢ - وغیرہ مقامات اور یہ یقینی شہادت اس بات پر ہے کہ قرآن شریف نے لفظ غفر سے مراد عفو سے بڑھ کر کچھ لیا ہے اور چونکہ عفو گناہوں کے مٹانے کا نام ہے یعنی ان کی سزا سے درگزر کرنا اس لئے غفر سے ان موقعوں پر صرف گناہوں سے بچانا ہے جیسا کہ ح ٢٥٨ میں لغت کی شہادت سے دکھایا گیا ہے۔ اس جگہ اول عفو ہے۔ دوم غفر سوم رحم اور یہ تینوں لفظ تین پہلے جملوں کے مقابل پر ہیں یعنی لا تؤاخذنا یا مواخذہ سے بچنے کے مقابل پر عفو کی دعا ہے گناہ یا عہد شکنی کے ارتکاب سے بچنے کے مقابل پر غفر یعنی گناہ سے حفاظت کی دعا ہے۔ اور بوجھوں سے بچنے کے مقابل پر رحم کی درخواست ہے اسی طرح فاعف عنہم واستغفر لہم وشاورھم فی الامر (آل عمران ٣ - ١٥٨) میں ان لوگوں سے جو جنگ میں بھاگ گئے تھے۔ پہلے عفو کا حکم ہے۔ پھر ان کیلئے استغفار کا حکم ہے یعنی آئندہ ایسے گناہوں سے بچے رہیں۔ پھر ان کو مشورہ میں شریک کرنے کا حکم ہے جو ان کی اور بھی زیادہ عزت افزائی پر دلالت کرتا ہے پس عفو اور غفر جہاں اکٹھے ہوں وہاں غفر سے مراد گناہ سے حفاظت ہے نہ کچھ اور ؛

أَنتَ مَوْلَىٰنَا فَٱنصُرْنَا عَلَى ٱلْقَوْمِ ٱلْكَٰفِرِينَ ۝

تو ہمارا مولیٰ ہے پس ہمیں کافر قوم کے خلاف نصرت دے ۳۶۷

خواتیم سورہ بقرہ کی فضیلت

۳۶۷ سورہ بقرہ کی آخری دو آیات کی احادیث میں بہت فضیلت آئی ہے۔ بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو شخص سورہ بقرہ کی دو آخری آیات کو ایک رات میں پڑھے وہ اس کے لئے کافی ہو جاتی ہیں مسند احمد میں ہے کہ خواتیم سورہ بقرہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں مسلم اور نسائی میں ہے کہ آپ کو بشارت دی گئی کہ فاتحہ اور خواتیم بقرہ دو ایسے نور ہیں کہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ فاتحہ کی عظمت کا ذکر پہلے ہو چکا ان دو آیتوں کو یہ عظمت حاصل ہے کہ اگر ایک میں مسلمان کے مذہب اور اس کے قلب کی وسعت بتائی گئی کہ وہ سب انبیاء پر ایمان لاتا اور کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا تو دوسری میں اسے یہ دعا سکھائی گئی کہ وہ کبھی کفر اور باطل پر راضی نہیں ہوتا بلکہ اس پر غالب آنے کے لئے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہے۔ آج بھی مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ اس دعا سے کام لیں۔

نسیان اور خطا

خاص اس دعا میں تین باتیں ہیں۔ اول انسان کے عجز کا پہلو کہ نسیان اور خطا اس سے واقع ہو جاتا ہے۔ تو دعا سکھائی کہ اس پر گرفت نہ ہو۔ ایسی دعا انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ وہ غافل نہ ہو ایسا نہ ہو کہ وہ احکام الٰہی کو بھول جائے۔ اور احکام الٰہی کی فرمانبرداری میں بہت محتاط اور چست ہو تاکہ خطا سے بچا رہے۔ اور جو نسیان وخطا باوجود کوشش کے واقع ہو جائے اس کے نتائج سے حفاظت سکھائی ہے۔

عہد شکنی

دوسری دعا ہے کہ عہد شکنی کے وجہ سے بچایا جائے یعنی اس قدر مخالفت احکام الٰہی کی نہ ہو کہ عہد کو توڑ ڈالے جس طرح پہلی قومیں توڑتی رہیں۔ اگر پہلی غفلت و عجز کے بد نتائج سے بچنے کی دعا ہے تو دوسری عہد کے بد نتائج سے اور تیسری

قضا و قدر کے مصائب

دعا یہ ہے کہ ہم پر وہ بوجھ مصائب قضا و قدر کا نہ ڈالا جائے جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ تکالیف شرعی تو اللہ تعالیٰ وسعت سے بڑھکر نہیں ڈالتا مگر مصائب قضا و قدر انسان پر بعض وقت ایسے آ جاتے ہیں کہ ان کے بوجھ کے نیچے پس جاتا ہے پس ان سے بچنے کی دعا سکھائی ہے۔

دعائے عفو و غفر و رحم

ان تینوں کے مقابل پر پھر تین دعائیں سکھائی ہیں۔ نسیان وخطا کے بالمقابل عفو کی درخواست یعنی یہ کہ نسیان وخطا انسان کی عاجزی سے واقع ہوتے رہتے ہیں ان کے بد نتائج سے بچایا جائے اور عہد شکنی کے بوجھ سے بچنے کے مقابل پر دعائے غفر (حفاظت) یعنی دیدہ دانستہ انسان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔ اور قضاء و قدر کے مصائب کے مقابلہ پر رحم کی درخواست اور ان سب کا آخری مقصد کیا ہے کہ کافر قوم کے خلاف اللہ تعالیٰ کی نصرت ملے۔

سورت کی غرض و غایت مسلمانوں کو ایک زندہ اور کامیاب قوم بنانا۔

سورۃ کا خاتمہ اس پاک دعا پر کیا ہے جس میں سورۃ کی غرض و غایت بھی بتا دی ہے جس طرح اس کی ابتدا میں۔ یعنی یہ کہ یہ سورت مسلمانوں کو کامیابی کی راہ بتاتی ہے۔ شروع میں وعدہ کامیابی دیا تھا۔ پھر کامیابی کے ذرائع اور وسائل بیان کئے کہ ان کو اختیار کرو۔ اور آخر پر دعا کیطرف متوجہ کیا کہ جو راہیں بتائی ہیں ان پر چلو پھر خدا سے بھی دعائیں کرو۔ اس سورت کی غرض مسلمانوں کو ایک زندہ اور کامیاب قوم بنانا اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔

سورۃ آل عمران مدنیۃ وھی

نام

نام - اس سورت کا نام آل عمران ہے۔ عمران حضرت موسیٰ اور ہارون کے والد کا نام ہے اور چونکہ اس سورت میں نبوت کے سلسلہ موسویہ سے رخصت ہونے کا ذکر ہے اور اس سلسلہ کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیرووں کی غلطیوں کا بالتفصیل ذکر ہے۔ اس مناسبت کے لحاظ سے اس کا نام آل عمران رکھا گیا اس میں بیس رکوع اور ۱۹۹ آیتیں ہیں۔

خلاصہ مضمون

خلاصہ مضمون - اس سورت میں عیسائی مذہب کے دعووں کی تردید کی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بتا کر کہ عالمگیر مذہب اسلام ہے جو ساری دنیا میں پھیلے گا جنگ اُحد کا ذکر کیا ہے جس میں بظاہر مسلمانوں کی ناکامیابی نظر آتی تھی مگر اس کی تہ میں بھی ایک عظیم الشان کامیابی تھی۔ غرض یہ ہے کہ اگر کفر کے مقابلہ میں اسلام کی حالت کسی وقت مصیبت اور درماندگی کی نظر آئے تو اس سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ فی الواقع جو حالت جنگ اُحد میں مسلمانوں کی قریش کے مقابل پر ہو گئی تھی ویسی ہی حالت آج عیسائیت کے مقابلہ میں ہے یعنی بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کچلا گیا۔ مگر اس بلا کے نیچے بھی ایک گنج کرم ہے +

پہلے رکوع میں عقیدۂ الوہیت مسیح کی تردید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ عیسائیوں کو ٹھوکر اس سے لگی کہ انہوں نے محکم اصول دین کو چھوڑ کر متشابہات کی پیروی کی اور یہ ذکر ایسے پیرایہ میں کیا ہے جس سے مسلمانوں کو بھی ساتھ ہی متنبہ کر دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کے معنی کرنے میں اس غلط راہ پر قدم نہ ماریں۔ بلکہ فروع کو اصول دین کے ماتحت کریں جن کا ذکر محکم الفاظ میں ہے برخلاف فروع کے جن کا ذکر متشابہ الفاظ میں بھی آ جاتا ہے۔ دوسرے رکوع میں یہ بتاتے ہوئے کہ جنگ بدر میں قدرت خداوندی کا ایک نظارہ تھا کہ کس طرح باطل اپنی ساری طاقتوں کے ساتھ حق کے سامنے مغلوب ہو جاتا ہے توحید الٰہی کو جسے عیسائیوں نے چھوڑ دیا سب مذاہب کی اصل بنیاد قرار دیتے ہوئے ضمناً پیش گوئی کی ہے کہ آخر کار توحید ہی غالب رہے گی۔ تیسرے رکوع میں بیان فرمایا کہ نبوت بنی اسرائیل کی قوم سے سلب ہوتی ہے اور ایک دوسری قوم کو دی جاتی ہے جو اس کی اہل ہے۔ چوتھے رکوع میں سلسلہ موسوی کے آخری برگزیدہ افراد کا ذکر فرمایا یعنی ذکریا اور ان کے فرزند یحییٰ کا اور مریم صدیقہ کا۔ پانچویں اور چھٹے رکوع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بچپن بڑھاپے نبوت تعلیم نشانات وفات وغیرہ کا ذکر کر کے بتایا کہ وہ کسی بات میں انسان سے بڑھ کر نہیں اور دلائل کو پس پشت پھینکنے والوں کو مباہلہ کی طرف بلایا۔ ساتویں رکوع میں انہی عیسائیوں کو اصول مقابلہ مذاہب کی طرف بلایا یعنی سب مذاہب میں امر مشترک خالص توحید الٰہی ہے پس اس کو قبول کرو اس کے ساتھ ہی حضرت ابراہیم کا ذکر کیا جن کا وجود عیسائیوں یہودیوں مشرکین عرب اور مسلمانوں میں بطور مشترک مسلم تھا۔ آٹھویں رکوع میں مثیل موسیٰ والی پیشگوئی کی طرف توجہ دلائی اور اہل کتاب کو ملزم کیا کہ تم دنیا کی امانتوں کی پروا نہیں کرتے اسی لئے خدا کی امانت کو بھی جو پیشگوئی کے رنگ میں تھی ضائع کر رہے ہو۔ نویں رکوع میں بتایا کہ موسیٰ ہی نہیں کل انبیائے عالم نے رسول اللہ صلعم کے ظہور کی پیشگوئیاں کی تھیں اسی لئے مذہب اسلام سب کا مصدق ہے۔

دسویں رکوع میں بتایا کہ یہ نبی ہی سب انبیاء کا موعود نہیں بلکہ خانہ کعبہ جو اس کا قبلہ ہے وہ دنیا میں خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر ہے۔ گیارھویں رکوع میں بتایا کہ اس خیر و خوبی کے مذہب کو دنیا میں پھیلانے کے لئے مسلمان کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں حقوق کی نگہداشت کریں وحدت اسلامی کو قائم کریں۔ دعوت الی الاسلام کے کام کو ترک نہ کریں۔ بارھویں رکوع میں بتایا کہ دشمنان اسلام سے کیسے تعلقات ہوں۔ تیرھویں رکوع میں جنگ اُحد کی ابتداء اور نصرت الٰہی کے وعدہ کا ذکر کیا۔ چودھویں میں کامیابی کے موٹے موٹے اصول بتائے۔ پندرھویں میں بتایا کہ کوئی بھی مصیبت پیش آ جائے مسلمان اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف نہیں جا سکتا۔ سولھویں میں تکلیف غم و ہم کا ذکر کرتے ہوئے جو مسلمانوں کو پہنچا بتایا کہ اس کی وجہ نافرمانی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے معاف

مائتان وعشرون رکوعًا

کردیا۔ سترھویں میں بتایا کہ اس جنگ نے مومنوں اور منافقوں میں تمیز کردی اور آنحضرتؐ کے اخلاق فاضلہ کا ذکر کیا کہ کس وسعت قلبی سے آپ نے کام لیا۔ اٹھارھویں میں بتایا کہ سچے مومن دشمن کی طاقت یا اس کی کثرت سے گھبراتے نہیں۔ اُنیسویں میں اہل کتاب کے بیہودہ اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ دُکھ پہنچتا ہی رہے گا اور اس پر صبر کی تلقین کی آخری رکوع میں پھر دعا سکھا کر کامیابی کا وعدہ دیا اور فرمایا کہ کامیاب اسی صورت میں ہو سکتے ہو کہ دشمن کے مقابلہ پر پورے تیار رہو۔

تعلق بقرہ اور آل عمران کا — الزھراوان

تعلق۔ اس سورت کا تعلق سورہ بقرہ کا سے اس قدر شدید ہے کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث کے مطابق ان دونوں کو الزھراوان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ جو زھرا کا تثنیہ ہے یعنی روشن وسفید دونوں میں توحید الٰہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات ہے پہلی پیشگوئیوں سے بھی اور دوسرے ذرائع سے بھی۔ پس حدیث نے ان دونوں سورتوں کو بلحاظ ان کے شدید تعلق کے ایک کے حکم میں رکھا ہے یہ تعلق مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ جو باتیں سورہ بقرہ میں اشارہ کے رنگ میں بیان کی گئی ہیں ان کو یہاں واضح کردیا ہے اور جو وہاں واضح کردی گئی ہیں ان کا ذکر یہاں اشارہ اور کنایہ کے رنگ میں ہے سورہ بقرہ میں زیادہ تر خطاب یہودیوں سے اور تھوڑا عیسائیوں سے ہے یہاں زیادہ عیسائیوں سے اور تھوڑا یہودیوں سے سورہ بقرہ کو حضرت آدمؑ کے ذکر سے شروع کیا جو پہلے نبی ہیں تو اس سورت کو حضرت عیسیٰ کے ذکر سے شروع کیا جو قومی نبیوں میں سے سب سے پیچھے آئے۔ وہاں توحید کا ذکر بت پرستی کے مقابلہ میں ہے تو یہاں عیسیٰ پرستی کے مقابلہ میں وہاں نظائر قدرت سے توحید پر دلائل دیئے تو یہاں فطرت اور مذاہب کی متفقہ شہادت سے وہاں خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا ذکر ہے تو یہاں اس کے اول بیت ہونے کا وہاں جنگ کی ضرورت اصولی رنگ میں بیان کی تو یہاں ایک جنگ کے واقعات کا مفصل ذکر کیا۔ اس تفصیل کو جتنا چاہو بڑھالو۔ اور دونوں سورتوں کی ابتدا میں اور انتہا میں بھی تعلق ہے۔ سورہ بقرہ کی ابتدا میں اگر اصول فلاح بتائے تو آل عمران کا خاتمہ بھی تفلحون پر کیا۔ گویا دونوں کا ایک ہی مضمون تھا۔ اور دوسری طرف اگر سورہ بقرہ کا خاتمہ فانصرنا علی القوم الکافرین پر کیا یعنی کافر قوم کے خلاف ہماری نصرت فرما تو آل عمران کی ابتدا میں ہی اس قوم کا ذکر کیا جس کے ساتھ اسلام کا سب سے بڑھکر مقابلہ ہونا تھا یعنی عیسائی قوم۔

زمانہ نزول

زمانہ نزول ترتیب نزول کے لحاظ سے اس سورت کا تعلق سورہ بقرہ سے وہی ہے جو ترتیب قرآنی کے لحاظ سے یعنی اس کا اکثر حصہ سورہ بقرہ کے اکثر حصہ کے بعد نازل ہوا ہے سورہ بقرہ پہلے اور دوسرے سال ہجرت کی نازل شدہ ہے تو یہ تیسرے سال ہجرت کی تیرھویں رکوع سے لیکر قریبًا آخر تک اس سورت میں جنگ اُحد کے واقعات کا ذکر ہے جو ۳ھ ہجری میں ہوئی اسلئے یہ حصہ یقینًا ۳ھ ہجری کا نازل شدہ ہے۔ ابتدائی حصہ میں بالخصوص عیسائی مذہب کا ذکر ہے اسی میں آیت مباہلہ بھی ہے اور یہ مباہلہ وفد نجران سے تھا جو ۹ھ میں آیا مگر سورت کا یہ حصہ ۹ھ کا نازل شدہ یقینًا نہیں اور اندرونی شہادت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ مدینہ کا نازل شدہ ہے اور وفد نجران کے مقابلہ پر انہی پہلے کے نازل شدہ امور کو ہی آنحضرت صلعم نے پیش کیا۔ علاوہ ازیں اس حصہ میں جو اصول مقابلہ مذاہب قایم کیا ہے تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم یہ آیت ان خطوط میں موجود ہے جو ۶ھ ہجری کے آخر آپ نے قیصر وغیرہ کو لکھے پس یہ حصہ یقینًا ۶ھ سے پہلے کا نازل شدہ ہے اور قرین قیاس یہی ہے کہ ۳ھ کا ہی ہے۔ ہاں ممکن ہے کہ صرف آیت مباہلہ کا نزول وفد نجران کے آنے پر ہوا ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

ع ۸ — الوہیت مسیح کی تردید اور اصول تفسیر

الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ ۱-۲-۳

میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہمیشہ زندہ خود قائم قائم رکھنے والا ہے[۳۶۸] اس نے تجھ پر حق کیسا تھ

۳۶۸؎ اس آیت کے الفاظ بعینہ وہی ہیں جو آیۃ الکرسی کے صدر کے الفاظ ہیں جس کے لئے دیکھو ۳۲۹؎ و ۳۲۹؎ ج ✦

صفات الٰہی جن سے عیسائیت کے عقائد خصوصی کا بطلان ہوتا ہے

چونکہ اس سورت کے ابتدائی حصہ میں عیسائیت کی تردید ہے اس لئے اس کی ابتدا میں ان صفات الٰہی کا ذکر کیا ہے جو عیسائی مذہب کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ اول توحید کا ذکر فرمایا۔ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر فرمایا کہ وہ حی اور قیوم ہے۔ ابن جریر نے ربیع سے ایک روایت بیان کی ہے جس کے رو سے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صفات سے اور اگلی آیات کی مندرجہ صفات سے مسیح کی خدائی کے خلاف استدلال کیا ہے۔ میں اس روایت کا لفظی ترجمہ یہاں دیتا ہوں۔

آنحضرت صلعم کی وفد نجران سے گفتگو

نصاریٰ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عیسیٰ بن مریم کے متعلق آپ سے بحث کی اور آپ کو کہا کہ اس کا باپ کون ہے اور اللہ پر جھوٹ اور بہتان کہا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جسنے نہ اپنی جورو بنائی اور نہ بیٹا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کہا کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں ہوتا مگر وہ اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ ہاں آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہمیشہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا اور عیسیٰ پر فنا آئی۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہر چیز کو قایم رکھنے والا۔ اس کی نگہبانی کرتا ہے اور حفاظت کرتا ہے اور اس کو رزق دیتا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ عیسیٰ ان میں سے کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ پر آسمان وزمین کی کوئی چیز مخفی نہیں (آیت ۴) انہوں نے کہا ہاں۔ فرمایا کیا عیسیٰ کوئی بات جانتا ہے سوائے اس کے جس کا اسے علم دیا گیا؟ انہوں نے کہا نہیں آپ نے فرمایا ہمارے رب نے عیسیٰ کی صورت جس طرح چاہا رحم میں بنائی (آیت ۵) اور آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب کھانا نہیں کھاتا اور نہ پانی پیتا ہے۔ اور نہ قضائے حاجت کرتا ہے انہوں نے کہا ہاں آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ کو ایک عورت نے حمل میں لیا جس طرح عورت حمل میں لیا کرتی ہے۔ پھر اس کو جنا جس طرح عورت اپنا بچہ جنا کرتی ہے پھر اس کو غذا دی گئی جس طرح بچوں کو غذا دی جاتی ہے پھر وہ کھانا کھاتا تھا اور پانی پیتا تھا اور پاخانہ کرتا تھا۔ انہوں نے کہا ہاں آپ نے فرمایا پھر جو تم دعوے کرتے ہو وہ کیسے ہو سکتا ہے ✦

حضرت عیسیٰ پر فنا کا ذکر

اس گفتگو سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جن خاص صفات الٰہی کا ذکر یہاں کیا ہے۔ ان کی خاص غرض حضرت عیسیٰ کی الوہیت کی نفی ہے۔ روایت میں جہاں حضرت عیسیٰ پر فنا آنے کا ذکر ہے وہاں اصل الفاظ ہیں ان عیسیٰ یاتی علیه الفناء یعنی عیسیٰ پر فنا آتی ہے یا آئیگی مگر مضارع کبھی ماضی کے معنی میں بھی آجاتا ہے اور ممکن ہے کہ الفاظ روایت میں ہی کمی بیشی ہوگئی ہو کیونکہ عیسائیوں کا عقیدہ یہ کبھی نہیں ہوا کہ عیسیٰ پر فنا ابتک نہیں آئی اور آیندہ آئیگی بلکہ ان کا کھلا عقیدہ یہی ہے کہ عیسیٰ پر فنا آئی مگر آیندہ نہیں آئیگی۔ اس لئے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے کہ عیسیٰ پر فنا آئیگی تو اس کا جواب ان کی طرف سے ہاں کبھی نہ ہوتا وہ ہرگز اس بات کے قائل نہیں کہ عیسیٰ پر آیندہ کوئی فنا آئے گی۔ اس لئے یقیناً آپ نے الفاظ ایسے فرمائے ہونگے جن کا ترجمہ یہ ہو کہ عیسیٰ پر فنا آئی اس کا جواب عیسائی بلاشبہ اثبات میں دینگے کیونکہ وہ مانتے ہیں کہ عیسیٰ پر موت آئی مگر پھر وہ موت پر فتح پا گیا اور ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گیا ✦

بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۙ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ

کتاب اُتاری اسکی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے ہوئی۳۶۹ اور توریت اور انجیل کو۳۷۰ لوگوں کو راہ دکھانے کیلئے پہلے سے نازل کیا

حق

۳۶۹۔ حق کے اصل معنی ۶۵ میں بیان ہو چکے ہیں۔ کسی چیز کو جو وجود میں آئے مقتضائے حکمت کے مطابق ہونے کی وجہ سے حق کہا جاتا ہے اور انہی معنوں میں یہاں قرآن کو بالحق نازل کرنے کا ذکر فرمایا ہے یعنی وہ مقتضائے حکمت کے مطابق نازل ہوا یہ اسبات کا جواب ہے کہ جب پہلے بھی کوئی وحی نازل ہوتی رہی تھی تو قرآن کے نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور عموماً عیسائیوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ توریت و انجیل کے ہوتے ہوئے قرآن شریف کی کیا ضرورت تھی۔ اس سورت میں آگے زیادہ تفصیل کے ساتھ بھی اس کا جواب آئے گا۔ مگر یہاں بھی اس کی ایک وجہ بتا دی ہے۔ اور وہ وجہ یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں جو رسول اللہ صلعم کے متعلق پیشگوئیاں تھیں ان کی تصدیق کے لئے ضروری تھا کہ یہ کتاب نازل ہوتی۔ گویا سابقہ وحی الٰہی بغیر نزول قرآن خود سچی نہ ٹھہرتی تھی۔ چنانچہ اس کو کھول کر آیت ۸۲ میں بیان فرمایا ہے۔ جہاں تصدیق کا صاف منشا بتایا ہے واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اٰتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے ذریعہ سے یہ عہد لیا تھا کہ جو کچھ تم کو کتاب و حکمت سے دیا جاتا ہے پھر تمہارے پاس ایک رسول تمہاری وحیوں کی تصدیق کرتا ہوا آئے۔ تو اس پر ایمان لانا ہوگا پس ان کی پیشگوئیوں کا پورا کرنا بھی درحقیقت ان کی تصدیق ہے۔ قرآن کریم کے نزول کی دوسری ضرورتوں کو بھی اس سورت میں آگے چل کر بیان فرمایا ہے ۔

پہلی وحی کے ہوتے ہوئے نزول قرآن کی ضرورت۔

توراۃ

۳۷۰۔ التوراۃ اصل لفظ کے عبرانی ہونے میں شبہ نہیں مگر عربی اور عبرانی زبانیں بہت ملتی جلتی ہیں۔ یہ لفظ بھی ان دونوں زبانوں میں ملتا جلتا ہے۔ اہل عرب کے نزدیک توریت وری سے ہے۔ اور وہ کوفیوں کے نزدیک اصل میں تَفْعَلَة وزن پر ہے اور بصریوں کے نزدیک فَوْعَلٌ وزن پر جس کا اصل وَوْرَاۃ تھا اور وسے ت سے بدل گئی (غ) اور وری کے معنی وری الزند سے آگ نکالنا ہیں جس سے قرآن شریف میں بھی آتا ہے النار التی تورون ۔۔۔۔ (الواقعۃ ۵۶-۷۱) اور وَارَیْتُ کے معنی سترت ہیں یعنی ایک چیز کو چھپا دیا جس سے ہے لباسا یواری سواٰتکم (الاعراف ۷-۲۶) یا حتی توارت بالحجاب ۔۔ (صٓ ۳۸-۳۲) پس توریت کو توریت یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پتھر سے آگ نکالنے کی مثال ہے یعنی بڑی مشقت سے اس سے کچھ روشنی پیدا ہوتی ہے۔ جیسا ابتدائے تاریخ عالم میں پتھر سے آگ نکالی جاتی تھی جس کے بالمقابل قرآن کریم کو ایسا نور بیان فرمایا ہے یکاد زیتہا یضیٓء ولو لم تمسسہ نار (النور ۲۴-۳۵) اس کا تیل خود بخود جل اُٹھتا ہے گو اسے آگ نہ چھوئے اور یا اس لئے کہ اس میں بعض مضامین مستتر یعنی مخفی حالت میں ہیں جیسا جزا و سزا کا مسئلہ ۔۔۔ ان مسائل پر پوری روشنی قرآن کریم نے ہی ڈالی ہے ۔

وری

واری

توریت اس مجموعہ کتب کا نام ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوا قرآن کریم نے ایک جگہ اس کے حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں کو دیئے جانے کا ذکر فرمایا ہے واٰتینٰہما الکتاب المستبین (الصٰفٰت ۳۷-۱۱۷) جیسا کہ اب موجود ہیں کل پانچ کتابیں ہیں جو بائبل کی ابتدا میں ہیں اور ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔ پیدایش یا تکوین۔ خروج۔ احبار۔ اعداد یا گنتی۔ استثناء۔ پرانے عبرانی نسخوں میں پانچ کتابوں کی تقسیم نہیں ہے بلکہ پیدایش سے لیکر استثناء تک ایک ہی مجموعہ ہے جس کو کئی چھوٹے اور بڑے بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔

توریت میں کونسی کتابیں ہیں

الانجیل۔ سریانی میں بھی اس سے ملتا جلتا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی خوشخبری ہیں۔ اہل عرب نے انجیل کا مادہ نجل لیا ہے اور نَجَلَ کے معنی نَسَلَ اور وَلَدَ بھی ہیں۔ اور اِنْتَجَلَ الْاَمْرُ کے معنی ہیں اِسْتَبَانَ واضح ہو گیا اور نَجَلْتُ الْاَرْضَ کے معنی ہیں زراعت کے لئے اسے پھاڑ ڈالا۔ انجیل کی جمع اناجیل ہے اور حدیث میں صحابہؓ کی صفت میں آتا ہے صدورھم اناجیلہم (ل) ان کے سینے انکی انجیلیں ہیں۔ اور یہ انجیل یعنی بشارت سے ہی ماخوذ معلوم ہوتا ہے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سینے بشارتوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

انجیل

صحابہ کے سینے اناجیل ہیں

وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۵

اور حق و باطل میں فیصلہ اتارا ۳۷۱

یا یہ کہ جو عظیم الشان بشارت انجیل لائی تھی وہ اب صحابہ کے سینوں میں ہے کیونکہ وہ بشارت محمد رسول اللہ صلعم کے ظہور کی تھی +

انجیل کون سی کتاب ہے

انجیل قرآن کریم کے نزدیک وہ کتاب ہے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اور جس شکل و صورت میں وہ عیسائیوں کے پاس تھی اس کو انجیل ہی کہا گیا ہے گو وہ چار کتابیں جو عیسائیوں کی اصطلاح میں اناجیل کے نام سے موسوم ہیں ان میں سے

چار انجیلیں

کوئی بھی حضرت عیسٰی پر نازل شدہ انجیل نہیں بلکہ وہ چار۔۔ الگ الگ اشخاص کی تصنیف ہیں ایک متی کی۔ ایک مرقس کی۔ ایک لوقا کی۔ ایک یوحنا کی +

بائبل

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بائبل صرف توریت و اناجیل کے مجموعہ کا نام نہیں۔ یہودیوں کے نزدیک تو بائبل اس مجموعہ کا نام ہے جس کے شروع میں حضرت موسٰی کی پانچ کتابیں ہیں۔ اور ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں انبیاء کی وہ اس میں شامل کرتے ہیں ایوب یونس خرقیل دنیال وغیرہم کی کتب کے علاوہ حضرت داؤد کی زبور بھی اسی مجموعہ میں شامل ہے۔ اور بعض کتب کی شمولیت کے متعلق اختلاف بھی چلا آیا ہے یعنی عام مروج نسخہ میں ۲۰ کتابیں شامل نہیں جو سپٹواجنٹ نسخہ میں ہیں۔ اور عیسائی

پرانا اور نیا عہدنامہ

اس مجموعہ کا نام تو پرانا عہدنامہ رکھتے ہیں اور ہر چار اناجیل اور اعمال حواریین۔ اور پولوس اور دیگر رسولوں کے خطوط اور مکاشفات یوحنا کے مجموعہ کو نئے عہدنامہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور پھر پرانے اور نئے عہدنامہ کل کو بائبل کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس الہامی کتاب کی بھی عجیب کیفیت ہے کہ کتابوں کی کتابیں بعض نسخوں میں شامل ہیں اور بعض سے خارج کر دی گئی ہیں +

اناجیل کے مصنف

اناجیل کے متعلق جیسا کہ ذکر ہوا۔ عیسائیوں کے ہاتھ میں نہ صرف مسیح ہی کی کوئی انجیل نہیں بلکہ وہ چار اناجیل جو ان کے پاس ہیں وہ بھی ان لوگوں کی لکھی ہوئی ثابت نہیں ہوتیں جن کے ناموں پر وہ مشہور ہیں بلکہ ان کے لکھنے والے کوئی اور لوگ ہیں متی کی انجیل کی تصنیف پر بحث کرتا ہوا پادری ڈملو اپنی تفسیر میں لکھتا ہے "جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس سے یہ ظاہر ہے کہ اس انجیل کا براہ راست متی کی تصنیف ہونا غیر اغلب ہے" (صفحہ ۶۲۰) اور آگے چل کر دکھایا ہے کہ متی سے کوئی کلمات وغیرہ مسیح کے جمع کئے ہونگے جس کو اس مصنف نے استعمال کیا ہے۔

زمانہ تصنیف اناجیل

اور اس کی تصنیف کا زمانہ جو خود پادری صاحبان بتاتے ہیں سنہ ۶۰ء ہے مگر واقعات سے سنہ ۱۵۰ عیسوی سے پیشتر مروجہ اناجیل اربعہ میں سے کسی انجیل کا کتاب کی صورت میں موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ لوقا اور مرقس کی اناجیل کو عموماً ان مصنفوں کا سمجھا گیا ہے مگر نئی تحقیقات کی رو سے ان اناجیل کے ان کے مصنف ہونے پر شبہ کیا گیا ہے اور یہی حال یوحنا کی انجیل کا ہے جو پہلی صدی کے آخر کی لکھی ہوئی سمجھی جاتی ہے +

محرف کتابوں کا نام بھی توریت و انجیل ہی ہے

پس توریت و انجیل کا لفظ اپنی حقیقت کی رو سے تو انہی اصل کتابوں پر بولا جا سکتا ہے جو حضرت موسٰی اور حضرت مسیح علیہما السلام پر نازل ہوئی تھیں۔ مگر موجودہ محرف کتابیں جن میں ان کا کچھ بقیہ ہے ان کو بھی اسی نام سے موسوم کیا جائیگا۔ اور یہاں اللہ تعالٰی نے یہ بتایا ہے کہ یہ کتابیں بھی ہم نے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل کی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ اب بھی ان میں ہدایت کچھ نہ کچھ موجود ہے

توریت و انجیل میں ہدایت

اور سب سے بڑی ہدایت ان میں یہی موجود ہے کہ دونوں کتابیں نبی کریم صلعم کی آمد کی پیشگوئی کرتی ہیں۔ اور انجیل تو صاف طور پر کہتی ہے کہ کامل ہدایت کی راہیں سکھانے والا میرے (یعنی مسیح کے) بعد آنے والا ہے +

فرقان

م ۳۷۱ فرقان کے اصل معنی تو جیسا ۱۸۵ میں دکھایا جا چکا ہے حق و باطل میں فرق کرنے والا ہیں۔ اور قرآن کریم کا بھی یہ ایک نام ہے

فرقان قرآن کا نام ہے

قتادہ سے روایت ہے کہ یہاں فرقان سے مراد قرآن کریم ہے (ث) اور گو پہلے قرآن کریم کے نزول کا ذکر فرما چکا ہے مگر دوبارہ دوسرے لفظ کو لا کر بیان کرنے سے خاص مقصود ہے۔ وہاں فرمایا تھا کہ یہ کتاب مقتضائے حکمت کے مطابق نازل ہوئی ہے یعنی ضرورت

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو

وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ ان کیلئے سخت دکھ ہے اور اللہ غالب سزا دینے والا

۴-۵ انْتِقَامٍ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۝ هُوَ الَّذِي

ہے ۳۷۲ یقیناً اللہ پر نہ زمین میں کوئی چیز چھپی ہے اور نہ آسمان میں ۳۷۳ وہی ہے جو

۶ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ هُوَ الَّذِي

تمہاری تصویریں رحموں میں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔ غالب حکمت والا ہے ۳۷۴ وہی ہے

حقہ کو پورا کرنے والی ہے۔ تو ایک دلیل اس کی تو وہاں دی تھی کہ یہ مصدق ہے۔ دوسری دلیل لفظ فرقان میں دی ہے۔ توریت و انجیل کے نزول کا ذکر کر کے ان کی تحریف کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جس کو بالتفصیل سورہ بقرہ میں بیان کر دیا تھا۔ تو اس لئے جب تحریف ہو گئی تو حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کوئی کتاب نہ رہی پس اللہ تعالیٰ نے فرقان حمید کو نازل کیا کہ اس سے حق و باطل میں فرق کرے۔

نقم۔ نقمۃ

۳۷۲ انتقام۔ نقم سے ہے نَقِمْتُ الشَّيْءَ وَنَقَمْتُهُ کے معنی ہیں میں نے اس چیز کو ناپسند کیا۔ زبان سے ہو یا سزا دیکر۔ اس لئے نقمۃ کے معنی عقوبت ہیں (غ)۔ اِنْتَقَمَ اللّٰهُ مِنْهُ کے معنی ہیں عَاقَبَهُ یعنی اسے سزا دی (ل)۔ اسی معنی سے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں منتقم یا ذوانتقام ہے یعنی سزا پہنچانے والا (ل) ✦

منتقم۔ ذو انتقام

حضرت مسیح کے اعتراف لاعلمی انا جیل سے مثال

۳۷۳ یہاں اللہ تعالیٰ کی وسعت علم کو موکد الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اور غرض جیسا کہ نوٹ ۳۶۸ سے ظاہر ہے حضرت مسیح کے صفات باری سے عاری ہونے کا ذکر ہے۔ قرآن کریم ہمیشہ ایسے لطیف طریق پر بات کو بیان کرتا ہے کہ کسی دوسرے کو ناگوار نہ گزرے اور پھر ایک لفظ میں بہت سا مضمون بیان کر دیتا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ بیان فرماتا کہ مسیح کو کوئی علم نہ تھا مگر جس قدر ایسے برگزیدہ انسانوں کو ہوتا ہے جیسا کہ نبی کریم صلعم نے اس آیت سے استدلال کر کے بیان فرمایا۔ اور اناجیل سے ان مثالوں کو پیش کرتا کہ کس طرح حضرت مسیح کا علم انسانی علم تک محدود تھا یوں فرمایا کہ وہ اللہ ہی ہے جس پر آسمان و زمین کی کوئی چیز مخفی نہیں گویا یہ بتا دیا کہ مسیح پر بہتیری چیزیں مخفی تھیں۔ چنانچہ اس کی شہادت خود اناجیل سے ملتی ہے۔ مثلاً انجیر کے درخت کا واقعہ "دوسرے دن جب وہ بیت عنیاہ سے نکلے اس کو بھوک لگی اور دور سے انجیر کا ایک درخت جس میں پتے تھے دیکھ کر گیا کہ شاید اس میں کچھ پائے مگر جب اس کے پاس پہنچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا" (مرقس ۱۱: ۱۲ و ۱۳) اس واقعہ میں یہ الفاظ کہ "شاید اس میں کچھ پائے" اور "انجیر کا موسم نہ تھا" قابل غور ہیں جو بتلاتے ہیں کہ حضرت مسیح کو باوجود انجیر کا موسم نہ ہونے کے یہ خیال تھا کہ شاید وہاں کچھ انجیریں مل جائیں کس قدر علم کی عاجزی کا اظہار ہے۔ یہ تو عملی اعتراف عجز ہے دوسری جگہ لفظوں میں بھی اپنے علم کے ناقص ہونے کا اظہار کیا ہے "لیکن اس دن اور اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا۔ مگر صرف باپ" (متی ۲۴: ۳۶)

تصویر۔ صورۃ

۳۷۴ یصور۔ تصویر صورت بنانے کا نام ہے۔ اور صورۃ وہ ہے جس سے کسی چیز کے عین کا نقش ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ دوسری اشیاء سے الگ ہوتی ہے۔ پھر یہ دو طرح پر ہے ایک محسوس جسے خاص و عام بلکہ حیوان بھی پہچان سکتے ہیں اور دوسرے معقول جسے صرف خواص ہی پہچان سکتے ہیں جیسے وہ صورت جس سے انسان مخصوص ہے یعنی عقل اور رویۃ۔ اور وہ معانی جن سے ایک شے دوسری سے مخصوص ہوتی ہے۔ اور جہاں اللہ تعالیٰ کے انسان کی صورت بنانے کا ذکر ہوتا ہے

أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ

جس نے تجھ پر کتاب اُتاری اس میں سے محکم آیتیں ہیں جو کتاب کی اصل ہیں اور کچھ اور متشابہ ہیں ۳۷۵

یہ دونوں صورتیں مراد ہوتی ہیں (غ)۔ جیسے خلقنکم ثم صورناکم (الاعراف۔ ۱۱) وصورکم فاحسن صورکم (المؤمن ۶۴)

آدم کو اللہ کی صورت پر پیدا کرنے سے مراد

فی ای صورۃ ما شاء رکبک (الانفطار ۸۲۔ ۸) اور یہاں بھی۔ اور یہ جو حدیث میں آیا ہے۔ اِنَّ اللہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ تو امام راغب کہتے ہیں اس سے وہ صورت مراد ہے جس سے انسان مخصوص ہے یعنی وہ ہیئت جس کا ادراک آنکھ سے اور عقل سے ہوتا ہے جس سے انسان کو دوسری مخلوق پر فضیلت ہے۔ اور صورتہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے ساتھ تشبیہ کے لئے نہیں یا اس لئے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بھی کوئی صورت ہے بلکہ علیٰ سبیل الملک ہے یعنی اس کی ملک ہونے کے لحاظ سے اور علیٰ سبیل التشریف

روحی میں ضمیر

لہ یعنی اس کی عزت کے لحاظ سے جیسے بیت اللہ۔ ناقۃ اللہ وغیرہ میں۔ اور ایسا ہی نفخت فیہ من روحی یا روح منہ میں بھی ملکیت اور عزت کے لحاظ سے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے ◆

حضرت مسیح کا معمولی بچوں کی طرح حمل میں لیا جانا اور پیدا ہونا

اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر کہ وہ انسان کی صورت رحم میں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے۔ اس کی کمال قدرت کے اظہار کیلئے ہے کہ کس طرح تاریکیوں پر تاریکی میں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا فی ظلمٰت ثلٰث (الزمر ۳۹۔ ۶) انسان کی نہ صرف جسمانی بلکہ اس کی اخلاقی اور روحانی تصویر بناتا ہے۔ یہ بھی الوہیت مسیح کے بطلان کی دلیل کے طور پر ہے۔ جیسا کہ روایت منقولہ بالا سے ثابت ہے یعنی یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جو حالات انسانوں پر گزرتے ہیں وہ حضرت عیسیٰ پر بھی گزرے اور رحم میں اس پر وہ سب حالتیں یکے بعد دیگرے آئیں جیسا کہ عام انسانوں پر آتی ہیں۔ اور ابن جریر میں حضرت ابن مسعود اور ابن عباس اور دیگر صحابہ سے اس روایت کا اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے۔ کہ پہلے نطفہ ہوتا ہے پھر چالیس دن کے بعد علقہ کی صورت اختیار کرتا ہے الخ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح پر نطفہ سے لیکر وہ تمام حالات انسانی آئے ہیں جو دوسرے انسانوں پر آتے ہیں کوئی خصوصیت بر بنائے پیدائش ان کے حالات میں نہیں۔ اسی کی طرف دوسری جگہ اشارہ ہے جہاں فرمایا فحملتہ پھر مریم نے ان کو حمل میں لیا (مریم ۱۹۔ ۲۲) اور نوٹ ۳۶۶ میں جس روایت کا ترجمہ دیا گیا ہے اس میں نبی کریم صلعم کے یہ الفاظ ہیں ان عیسیٰ حملتہ امرأۃ کما تحمل المرأۃ ثم وضعتہ کما تضع المرأۃ یعنی عیسیٰ کو ایک عورت نے حمل میں لیا جس طرح عورتوں کو حمل ہوتا ہے اور اس کو جنا جس طرح عورتیں جنتی ہیں۔ تعجب ہے کہ ایسی صراحت کے ہوتے ہوئے مفسرین نے بعض عجیب قصے بنالئے ہیں اور بعض نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ایک ہی گھڑی کے لئے حضرت مریم صدیقہ کو حمل ہوا تھا اور فوراً حضرت مسیح پیدا بھی ہو گئے ◆

محکم۔ حکم

۳۷۵ محکمٰت مُحْکَم کی جمع ہے اور محکم وہ ہے جس میں لفظ اور معنی کی حیثیت سے کوئی شبہ وارد نہ ہو (غ)۔ حَکَمْتُ۔ اَحْکَمْتُ۔ حَکَّمْتُ کے اصل معنی مَنَعْتُ ہیں یعنی روک دیا (ل) پس فساد یا خلل کو روکنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس طرح حاکم کو حاکم اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو ظلم سے روکتا ہے اور یہ وجہ بھی محکم کی دی گئی ہے کیونکہ اس کا بیان خود اپنے آپ میں مضبوط ہوتا ہے اور دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا (ل)۔ روح المعانی میں ہے۔ واضحۃ للمعنی ظاہرۃ الدلالۃ محکمۃ العبارۃ۔

اُمّ

اُمّ۔ ماں کو کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو بھی اُمّ کہا جاتا ہے جو کسی چیز کے وجود یا اس کی تربیت یا اس کی اصلاح یا اس کی ابتدا کے لئے بطور اصل ہو (غ)۔ پس اُمّ درحقیقت وہ اصل ہے جس سے ایک چیز پیدا ہوتی ہے یا جس پر دوسری چیزیں متفرع ہوتی ہیں

ام الکتاب

ہیں پس اُمّ الکتاب سے مراد اصول ہیں۔ جیسے مروی ہے ھن ام الکتاب لانھن مکتوبات فی جمیع الکتب (ت) وہ اُمّ کتاب اس لئے ہیں کہ سب آسمانی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں یعنی اصول دین ہیں ◆

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ

پھر جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اسکے پیچھے پڑجاتے ہیں جو اس میں سے متشابہ ہے اختلاف چاہتے ہوئے اور یہ چاہتے

وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ

ہوئے کہ اسکی دمن مانی تاویل کریں اور اسکی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے

[illegible]

اُخریٰ — اُخَرُ: اُخریٰ کی جمع ہے جو آخر کی تانیث ہے۔ اور محذوف یعنی آیات کی صفت ہے۔ اصل اس کا تاخیر یعنی پیچھے رہنے کے لئے ہے مگر محض ایک چیز کے غیر پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

شبہ۔ متشابہ — متشٰبِہٰت۔ مُتَشَابِہ شبہ سے ہے اور کسی چیز کا شِبْہ وہ ہے جو بلحاظ کیفیت اس کی مثل ہو (غ)، اور قرآن میں متشابہ اسے کہا جاتا ہے جس کی تفسیر بوجہ اس کی غیر کے ساتھ مشابہت کے مشکل ہو خواہ مشابہت لفظ کی حیثیت سے ہو یا معنی کی حیثیت سے (غ)۔

محکم اور متشابہ آیات پر مفصل بحث — مفسرین میں اس بات کے متعلق کہ محکمات کون آیات ہیں اور متشابہات کون مختلف آراء ہیں۔ امام راغب نے مفردات میں اس پر بڑی لمبی اور جامع بحث کی ہے۔ اول وہ کل آیات کی تقسیم تین طرح پر کرتے ہیں۔ محکم مطلق اور متشابہ مطلق اور ایک وجہ سے محکم اور ایک وجہ سے متشابہ۔ پھر متشابہ تین قسم پر۔ لفظ کی حیثیت سے معنی کی حیثیت سے اور لفظ اور معنی دونوں کی حیثیت سے۔ پھر لفظ کی حیثیت سے جو تشابہ ہو وہ دو قسم پر ایک الفاظ مفردہ میں۔ دوسرا کلام مرکب میں۔ الفاظ مفردہ میں تشابہ یا تو بوجہ غرابت لفظ کے ہوتا ہو جیسے اَبّ۔ یَزِفُّوْن اور یا اشتراک لفظی کی وجہ سے جیسے ید عین وغیرہ کے استعمال میں اور کلام مرکب میں اختصار سے تشابہ واقع ہوتا ہو جسکی مثال وہ ہو وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ماطاب لکم من النسآء اور یا بسط سے جیسے لیس کمثلہ شئ اور معنی کے لحاظ سے تشابہ میں اللہ تعالیٰ کے اوصاف اور یوم القیامۃ کے اوصاف داخل ہیں جسکی وجہ یہ ہوتی ہیں کہ یہ صفات ہمارے تصور میں نہیں آسکتیں کیونکہ ہمارے ذہن میں وہی چیز آسکتی ہو جسکو ہم محسوس کرتے ہیں یا اس جنس کی چیز جس جنس کی چیز کو ہم محسوس کرتے ہیں پس جنت دوزخ حساب کتاب وغیرہ کے متعلق جسقدر امور ہیں وہ متشابہات میں داخل ہیں اور جنہیں تشابہ بحیثیت لفظ بھی ہو اور معنی بھی اسکو پانچ قسم بیان کیا ہے جنمیں سے میں صرف یہاں اول دو قسم کو لیتا ہوں۔ کمیت کے لحاظ سے جیسے عموم وخصوص جس کی مثال ہو فاقتلوا المشرکین (التوبۃ ۹-۵) جہاں لفظ عام ہے مگر مراد خاص مشرک ہیں۔ وجوب وندب کے لحاظ سے جیسے فانکحوا ماطاب لکم اور آخر پر لکھا ہو کہ مفسرین نے جو جو تشریحات محکم و تشابہ کی کی ہیں وہ سب اس تقسیم کے اندر داخل ہیں۔

ایک اور رنگ میں تشابہ کو تین قسم کیا ہے ایک وہ جس کی حقیقت پر انسان واقفیت حاصل نہیں کرسکتا جیسے امور متعلق قیامت وغیرہ ایک وہ جن پر واقفیت حاصل کرسکتا ہے جیسے الفاظ غریبہ اور مشکل احکام اور ایک ان دونوں کے درمیان جن سے راسخ فی العلم واقفیت حاصل کرسکتے ہیں مگر ہر شخص نہیں۔

زیغ — ۳:۷۶ زیغ۔ استقامت سے ایک طرف جھک جانا زیغ ہے۔ فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبہم (الصف ۶۱-۵)۔ ما زاغ البصر وما طغیٰ (النجم ۵۳-۱۷)۔

بغی۔ ابتغاء — ابتغاء۔ بَغْی سے ہے جسکے معنی ہیں میانہ روی سے بڑھنے کو چاہنا اور بَغَیْتُ الشَّیْءَ اور ابتغیتہ کے معنی ہیں قدر واجب سے بڑھکر کسی چیز کو طلب کیا یا چاہا (غ)۔ فتنہ کے متعلق اس کا استعمال خاص طور پر ہوا ہے لقد ابتغوا الفتنۃ من قبل (التوبۃ ۹-۴۸)۔ یبغونکم الفتنۃ (التوبۃ ۹-۴۷)۔

وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ

اور ان کے جو علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں ۳۷۶

فتنہ

الفتنۃ - فتنہ کے اصل معنی ۱۳۳ میں بیان ہو چکے ہیں۔ مگر یہاں وہ معنی مراد نہیں اور اس لفظ کے کئی اور معنی بھی آتے ہیں منجملہ ان کے حق سے پھیر دینا بھی اس کے معنی آتے ہیں چنانچہ فَتَنَ الرَّجُلَ کے معنی ہیں ازاله عما کان علیہ (ل) یعنی جس حالت پر وہ تھا اس سے اس کو ہٹا دیا۔ اور اسی لحاظ سے وان کادوا لیفتنونك عن الذی اوحینا الیك (بنی اسرائیل ۔۷۳) میں یفتنونك کے معنی لکھے ہیں یمیلونك ویزیلونك یعنی تجھے مائل کردیں اور ہٹا دیں۔ اور پھر لکھا ہے کہ لفظ فتنہ کے معنی کلام عرب میں حق سے ایک طرف جھکا دینا ہیں۔ اور فتنۃ کے معنی اضلال بھی آتے ہیں (ل) اور اس حدیث میں کہ انی اری الفتن خلال بیوتکم (میں فتنوں کو تمہارے گھروں کے اندر دیکھتا ہوں) فتنہ سے مراد وہ اختلاف ہے جو مسلمانوں کے فرقوں میں ہوگا (ل) اور ان تینوں معنوں میں سے یعنی حق سے پھیرنا۔ گمراہ کرنا۔ اختلاف کوئی سے معنی یہاں مراد ہو سکتے ہیں پس ابتغاء الفتنۃ کے معنی ہوئے حق سے پھیرنے کو چاہتے ہوئے۔ یا گمراہی چاہتے ہوئے یا اختلاف چاہتے ہوئے۔ گویا متشابہات کی پیروی سے ان کی غرض حق کی بجائے غلطی کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یا لوگوں کو دین حق سے گمراہ کرنا یا اختلاف ڈالنا حضرت مجاہدؒ سے یہاں فتنہ کے معنی شبہات مروی ہیں (ج) یعنی لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرنے کے لئے جیسا کہ اکثر مفسرین نے اسے کو لکھا ہے کہ مراد یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں شکوک اور شبہات پیدا کرکے دین سے پھیر دیں ◆

اول - تاویل

تاویل۔ اَوْل سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا اصل کی طرف رجوع کرنا اور تاویل کے معنی ہیں رَدُّ الشَّیْءِ اِلَی الْغَایَةِ الْمُرَادَةِ منه علمًا کان اَوْ فعلًا (غ) ایک شے کا اس غایت کی طرف لوٹانا جس کا اس سے ارادہ کیا گیا ہو علمی طور پر ہو یا فعلی طور پر یہاں تاویل بلحاظ علم مراد ہے اور هل ینظرون الا تاویله یوم یاتی تاویله (الاعراف ۵۳) میں اور ذالك خیر و احسن تاویلا (بنی اسرائیل ۳۵) میں تاویل فعلی یعنی مآل یا انجام مراد ہے ◆

اپنی خواہش کے مطابق تاویل

ابتغاء تاویله۔ تاویل کی ضمیر کہا گیا ہے کہ عہد کے لئے ہے یعنی اس سے مراد مخصوص تاویل یا ایسی تاویل ہے جو محکمات کے خلاف ہو اور اپنی خواہش کے مطابق (ر) اس لئے مفسرین نے عموماً ابتغاء تاویله کے معنی کئے ہیں طلب تاویل الذی یشتہونہ یعنی اس تاویل کو چاہتے ہوئے جو ان کی اپنی خواہش ہوتی ہے اور یا یہ مراد ہے جیسا لفظ ابتغاء کے معنی بھی اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اس کی تاویل کی طلب میں حد سے تجاوز کرتے ہیں اور وہ حد سے تجاوز کرنا یہ ہے کہ اسے محکمات کی طرف نہیں پھیرتے۔ متشابہ الفاظ کے معنی میں ابتغاء یہی ہے کہ انسان ایسا ان الفاظ کے پیچھے پڑے کہ دوسرے الفاظ یا اصول کی طرف توجہ نہ کرے۔ اور اکثر متشابہ کی پیروی کرنے والوں کو یہی غلطی لگتی ہے کہ وہ ان الفاظ کے ایسا پیچھے پڑتے ہیں کہ باقی بڑی بڑی اور روشن اور واضح باتوں کی پرواہ تک نہیں کرتے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ محض اپنی خواہش کی پیروی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پہلے انسان اپنے دل میں ایک خیال بٹھا لیتا ہے۔ پھر متشابہ الفاظ کو لیکر اور الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہے ◆

رسوخ۔ راسخ فی العلم

راسخ فی العلم متشابہات کی تاویل کس طرح کرتے ہیں۔

۳۷۶ راسخون۔ رُسُوخ کے معنی ہیں کسی چیز کا نہایت ہی مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جانا اور راسخ فی العلم علم میں متحقق کو کہتے ہیں (غ)۔ یہاں الله اور الراسخون فی العلم دونوں جگہ پر وقف ہے۔ اس لئے والراسخون فی العلم دونوں طرف ملتا ہے یعنی اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے الله کے اور راسخون فی العلم کے اور یہ بتانے کو کہ وہ راسخ فی العلم کس طرح اس تاویل کو جانتے ہیں یہ الفاظ بڑھا دئے ہیں یقولون اٰمنا به کل من عند ربنا یعنی ہم متشابہات اور محکمات دونوں کو خدا کی طرف سے مانتے ہیں۔ گویا ان کا اصول یہ ہے کہ متشابہات کو محکمات پر عرض کرتے ہیں۔ چنانچہ بخاری میں اسی طرح بیان الفاظ کے معنی کئے ہیں والراسخون

وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝

اور عقل والوں کے سوائے کوئی نصیحت قبول نہیں کرتا ع۳۷۸

يَعْلَمُوْنَ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ یعنی راسخ بھی ان معنوں کو جانتے ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے۔ اور حضرت ابن عباس سے مجاہد کی وساطت سے یہ قول مروی ہے کہ آپ نے فرمایا انا من الراسخین الذین یعلمون تاویلہ (ت) میں ان راسخوں میں سے ہوں جو اس کی تاویل کو جانتے ہیں۔ اور حضرت ابن عباس کے متعلق صحیح حدیث میں آتا ہے۔ اللّٰھم فقہہ فی الدین وعلمہ التاویل اے اللہ اس کو دین میں سمجھ دے اور اس کو تاویل سکھا۔ اور محکمات کے معنی تو واضح ہوتے ہیں اسلئے یہ دعا متشابہات کی تاویل کے متعلق ہی ہوسکتی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر متشابہات کے معنی راسخین فی العلم کو بھی معلوم نہیں ہوسکتے تو ان کا انسانوں کی ہدایت کیلئے نازل کرنا بے معنی ہے۔ باقی رہیں بعض اشیاء جیسے جنت و نار وغیرہ کی حقیقت تو اس کے معلوم کرنے کی ہمیں یہاں کوئی ضرورت بھی نہیں ہاں جب اس عالم سے کوچ کرکے دوسرے عالم میں منتقل ہو جائینگے تو ان کی حقیقت بھی کھل جائے گی ◆

عیسائی مذہب کی بنا د متشابہات پر ہے

پیشگوئی متشابہات سے ہے

بائبل کی پیشگوئیاں جن میں خدا کے آنیکا ذکر ہے آنحضرت صلعم کے لئے ہیں۔

۳۷۸ اس آیت کریمہ میں قرآن شریف نے محکم اور متشابہ کا ایک اصول بیان فرمایا ہے اس میں عیسائیت کے بطلان کیطرف اشارہ کیا ہے کیونکہ عیسائیوں نے محکمات اور متشابہات میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے ہی غلطی کھائی ہے عیسائی مذہب کی بنیاد صرف متشابہات پر ہے سب سے بڑی دلیل حضرت مسیح کی خدائی کی یہ دیجاتی ہے کہ پیشگوئیوں میں آپکو خدا کہا گیا تھا اور آپکی آمد کو خدا کی آمد قرار دیا گیا ہے مگر یہ کسقدر بودی بنیاد ہے پیشگوئی تو خود متشابہات میں سے ہوتی ہے۔ اور پیشگوئیوں کی زبان میں استعارہ اور مجاز کا استعمال بکثرت ہوتا ہے چنانچہ خود مسیح کی آمد کے جو نشانات ہیں ان کو ہی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کس قدر مجاز اور استعارہ ان کے اندر ہے اور حق تو یہ ہے کہ جن پیشگوئیوں میں خدا کا لفظ آیا ہے وہ حضرت مسیح کے لئے نہیں بلکہ ہمارے نبی کریم صلعم کی آمد کے متعلق ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود حضرت مسیح نے بھی خدا کے آنے کی پیشگوئی کو بیان کیا ہے۔ دیکھو متی ۲۱: ۳۳۔۴۰ جہاں انگورستان کے مالک کی تمثیل میں بیٹے کے آنے کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ پھر انگورستان کا مالک خود آئیگا اور آگے آیت ۴۳ میں صفائی سے بتا دیا ہے کہ "خدا کی بادشاہت تم سے لے لیجائیگی اور ایک اور قوم کو جو اس کے میوہ لاوے دی جائیگی"۔ پس وہ خدا جس کے آنے کی پیشگوئیاں بائبل میں ہیں محمد رسول اللہ صلعم ہیں مگر باوجود ان پیشگوئیوں کے وہ خدائی کا دعویٰ نہیں کرتے ◆

بائبل میں لفظ خدا کا استعمال نیکوں کے حق میں

لیکن اس بات کو چھوڑکر بائبل میں لفظ خدا کا استعمال بطور مجاز نیک لوگوں کے حق میں موجود ہے "میں نے تو کہا کہ تم الہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو" (زبور ۸۲: ۶) یوحنا ۱۰: ۳۴ میں حضرت مسیح اسی قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں جبکہ اس نے انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا"۔ پس اول پیشگوئی خود ایک استعارہ ہے اسلئے اس میں خدا کی آمد کا ذکر ایک استعارہ سے بڑھکر نہیں۔ پھر وہ پیشگوئیاں بھی مسیح کے لئے نہیں بلکہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہیں پھر بغیر پیشگوئیوں کے بھی اسی بائبل میں لفظ خدا بطور مجاز نیک لوگوں کے حق میں استعمال ہوا اس لئے اس کے معنی دوسری جگہ بھی یہی مراد ہوں گے پس

حضرت مسیح کا اقرار کردہ بطور مجاز خدا کا بیٹا کہلانے

ایک متشابہ امر کی بنیاد پر تمام محکمات کو رد کرنا یہ عیسائی مذہب کی خطرناک غلطی ہے۔ اور خود حضرت مسیح نے بھی ان کو بتا دیا تھا کہ وہ جو لفظ خدا کا بیٹا اپنے لئے استعمال کرتے ہیں تو اسی مجازی معنی کی رو سے جس مفہوم کو مدنظر رکھکر سارے راستبازوں کو خدا اور خدا کا فرزند قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی تو حضرت مسیح نے ان سے دریافت کیا کہ میں نے خدا کی طرف سے بہت سے نیک کام کئے ہیں میرے کس نیک کام کے عوض مجھے سنگسار کرتے ہو تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اچھے کام کیلئے ہم تم کو سنگسار نہیں کرتے بلکہ اس لئے کہ تو کفر کہتا ہے اور تو انسان ہو کے اپنے تئیں خدا بناتا ہے (یوحنا ۱۰: ۳۳) تو حضرت مسیح نے اس کا جواب یہ دیا "کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا تم خدا ہو جبکہ اس نے

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ

اے ہمارے رب! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ ہونے دے اسکے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت کی اور اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرما

انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا..... تم اسے جسے خدا نے مخصوص کیا اور جہان میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے کہ میں نے کہا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں" (یوحنا ۱۰: ۳۴-۳۶) اب اس سوال و جواب پر غور کرو اگر حضرت مسیح کا دعویٰ واقعی خدائی کا ہوتا تو جب آپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ تم انسان ہو کر اپنے آپ کو خدا کہتے ہو تو اس کا جواب یوں دیتے کہ میں تو خدا ہی ہوں اور تمہاری پیشگوئیوں میں خدا کا آنا لکھا ہے مگر بجائے اس کے آپ یہ جواب دیتے ہیں کہ تمہارے بزرگوں کو بھی خدا کے کلام میں خدا کہا گیا ہے اگر ان کا خدا کہلانا کفر نہیں تو میرا خدا کا بیٹا کہلانا کیوں کفر ہو گیا۔ بالفاظ دیگر جن معنوں میں وہ خدا کہلائے انہی معنوں میں میں خدا کا بیٹا ہوں۔ نہ وہ حقیقت میں خدا تھے نہ میں حقیقت میں خدا کا بیٹا ہوں مگر مجازی طور پر ان کو بھی خدا کہا گیا۔ مجازی طور پر میں بھی خدا کا بیٹا ہوں۔ اس قدر صفائی کے ہوتے ہوئے عیسائیوں نے متشابہات کو لیا اور محکمات کو چھوڑ دیا اس لئے ان کے عقیدہ کے بطلان میں اس مسئلہ کی توضیح کرنی ضروری تھی۔ پس اس بحث کی ابتدا میں اصولی طور پر یہ بیان کر کے کہ خدا کی صفات مسیح میں نہ پائی جاتی تھیں اب بتاتا ہے کہ ان کو ٹھوکر متشابہات سے لگی ہے اور یہ ان کے دلوں کی کجی کا نتیجہ ہے کہ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کی پیروی کرتے ہیں اور اسی اثنا میں مسلمانوں کو بھی متنبہ فرماتا ہے۔ کہ تم ایسی غلطی میں نہ پڑنا۔ مگر افسوس ہے کہ آج بعینہٖ یہی غلطی وہ لوگ کرتے ہیں جو حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرتے ہیں۔ اور ان کے ہاتھ میں بھی دلیل صرف یہی ہے کہ پیشگوئی میں آنے والے مسیح کے لئے لفظ نبی کا آگیا ہے حالانکہ اول تو پیشگوئی میں استعارہ ہونا ایک مسلّم امر ہے دوسرے خود وہ پیشگوئی جس میں لفظ نبی ہے ساری کی ساری استعارات سے بھری ہوئی ہے بعینہٖ اسی طرح جب اس مسیح ثانی پر یہ اعتراض ہوا کہ تم نے اپنی تحریروں میں لفظ نبی استعمال کیا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ کیا پہلے کسی بزرگ نے نہیں کہا او نبی وقت باشد اے مرید یعنی مرشد نبی وقت کا حکم رکھتا ہے جس میں صاف بتا دیا کہ میری تحریر میں لفظ نبی اصطلاح شرعی میں نہیں بلکہ لغوی معنی میں ہے اور مجازی رنگ میں جس طرح پہلے بزرگوں نے بھی مجازی رنگ میں اسے استعمال کر لیا ہے اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ آخر تک صاف لفظوں میں لکھ دیا کہ سُمِّيتُ نبيا من الله على طريق المجاز لا على وجه الحقيقة میرا نام خدا کی طرف سے مجاز کے طور پر نبی رکھا گیا نہ حقیقت کے طور پر۔

حضرت مرزا صاحب کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرنا متشابہات کی پیروی ہے

محکمات اصول دین ہیں

اب یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم نے محکمات اور متشابہات کی تفسیر میں اصول کیا بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ یہاں آکر ایک دوسری دقت پیش آتی ہے کہ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں۔ خود غرض لوگ اپنے حسب منشا جس کو چاہتے ہیں متشابہ بنا کر اسے کسی دوسری آیت کے ماتحت کر دیتے ہیں۔ یا اس کی تاویل اپنے حسب منشا کر لیتے ہیں۔ ایک شخص اسی کو محکم کہتا ہے دوسرا اسی کو متشابہ کہتا ہے۔ تو پس اس کا بھی کوئی علاج قرآن کریم نے بتایا ہے یا نہیں؟ اگر الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو ایک ایسی پکی بات بتا دی ہے کہ تمام جھگڑے اٹھ جاتے ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ محکمات کے متعلق فرمایا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وہ کتاب کی اصل یا جڑ ہیں۔ اب اُمّ یا جڑ اس چیز کو کہتے ہیں جو بطور اصل ہو۔ تو پس قرآن کریم ہمیں یہ ہدایت دیتا ہے کہ محکمات سے مراد اصولی امور ہیں اور طرز تاویل یہ ہوگی کہ فروعات اور مخصوصات کو جو بطور شاخوں یا اولاد کے ہیں جڑ اور اُم کی طرف لوٹانا پڑے گا یعنی اصول کے ماتحت کرنا پڑے گا۔ کیونکہ حق یہی ہے کہ جب تک مخصوصات اور فروعات کو اصول کے تحت نہ لایا جائے اس وقت تک حق بات انسان معلوم نہیں کر سکتا۔ مخصوصات کو اگر اصول اور قانون سے الگ کیا جائے تو اس کا نتیجہ وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمایا ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله ایک مخصوص امر کی تاویل کے پیچھے پڑ کر ایک فتنہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بعض کا مفہوم بعض کے خلاف ہو جاتا ہے پس ضروری ہوا کہ کسی امر مخصوص کے صحیح معنی سمجھنے کے لئے پہلے

فروع کو اصول کے ماتحت کیا جائے

۸ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ○ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ

بیشک تو ہی بہت عطا کرنیوالا ہے ۳۷۹ اے ہمارے رب! ضرور تو لوگوں کو اس دن کیلئے اکٹھا کرنیوالا ہے جس میں کچھ شک نہیں

۹ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ○ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ

ع ۱۱ ۲

مغلوبیت کفر، غلبہ توحید

بیشک اللہ وعدہ کا خلاف نہیں کرتا۔ جنھوں نے انکار کیا انکے مال اور انکی اولاد اللہ (کے عذاب) کے سامنے

وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ○

ان کے کسی کام نہ آئے گی اور وہی آگ کا ایندھن ہیں ۳۸۰

ایک اصول قایم کیا جائے اور اس اصول کے ماتحت اس کی تاویل کی جائے۔ یہی وہ راہ ہے جو قرآن کریم نے سکھائی ہے اور اس راہ پر چلکر نہ صرف بیرونی تفرقوں کا علاج ہی ہو سکتا ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے جس قدر اندرونی اختلافات ہیں ان کا بھی ایک حد تک فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اور جو اختلافات باقی رہ جائیں گے وہ اصولی اختلافات نہ ہونگے۔ کیونکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے تمام امور ضروریہ کی تکمیل کر دی ہے۔ اب فروعات تو اس قدر وسیع دائرہ رکھتی ہیں کہ تا قیامت بھی اُن کو ایک دفتر میں اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔ روز نئی نئی فروعات پیدا ہوتی رہتی ہیں پس یہ ماننا پڑے گا۔ کہ سب اصول کو قرآن کریم نے واضح کر کے بیان کر دیا ہے اور فروع میں سے حسب ضرورت کچھ لے لیا ہے اس لئے ہم فروع کو اصول کے ماتحت کر سکتے ہیں نہ اصول کو فروع کے ماتحت۔ اسی بات کی طرف عدم توجہی نے مذاہب میں غلطیاں پیدا کیں اور اسی اصول کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے مختلف اسلامی فرقوں نے ایک دوسرے کے خلاف قرآن سے ہی نتایج اخذ کئے اگر سب لوگ اس بات پر کاربند ہوں کہ اصول کو تو چونکہ محکم کرنے کا ذکر خود قرآن کریم میں ہے پس ہر ایک فرع کو قرآن کریم کے قایم کردہ اصول پر پیش کیا جائے تو بہت سے جھگڑے اُٹھ جاتے ہیں +

الوھاب ۳۷۹ الوھاب۔ اسمائے الٰہی میں سے ہے۔ ھِبَۃ کے معنی ہیں اپنی ملک بلا عوض غیر کو دیدینا (غ) اور الوھّاب اس امر کو ظاہر کرنے کیلئے ہے اَنَّہٗ یُعْطِی کُلًّا عَلٰی قَدْرِ اِسْتِحْقَاقِہٖ (غ) یعنی ہر ایک کو بقدر استحقاق دیتا ہے +

متشابہات میں پڑنیوالا

زیغ سے بچنے کی دعا

اس دعا کی اس مقام پر تعلیم صاف اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ متشابہات کی پیروی میں لگ کر دین میں فتنہ پیدا کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو پہلے ہدایت پا چکتے ہیں کیونکہ ان کے متعلق فرمایا تھا کہ ان کے دلوں میں زیغ یعنی کجی ہوتی ہے۔ اس لئے اب مومنوں کو اسی زیغ سے بچنے کی دعا سکھاتا ہے۔ نبی کریم صلعم کے دل میں اپنی اُمت کے لئے اس قدر رحمت جوش مارتی تھی کہ ان کی تعلیم کے لئے آپ اس دعا کو بہت کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت اُم سلمہ سے روایت ہے ان النبی صلعم کان یقول یا مقلب القلوب ثبت قلبی علیٰ دینک ثم قرأ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب (ت) یعنی نبی کریم صلعم یوں دعا کیا کرتے تھے اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر مضبوط رکھیو پھر آپ یہ آیت ربنا لا تزغ قلوبنا پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق کی نسبت بھی روایت ہے کہ آپ سورۃ فاتحہ کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اس میں مومن کو سکھایا ہے کہ اپنے نفس پر بھروسہ نہ کرے بلکہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا طالب رہے۔

اغنی عنہ۔ اغناہ ۳۸۰ لن تغنی عنھم۔ اَغْنٰی عَنْہُ کذا کے معنی ہیں کفاہ (غ) یعنی وہ شے اس کے لئے کافی ہو گئی اور یہی معنی اغناہ کے ہیں جیسا کہ لکل امرئ منھم یومئذ شان یغنیہ (عبس۔ ۳۷)۔ اور اغنی عنہ کا زیادہ استعمال ہے۔ ما اغنی عنی مالیہ (الحاقۃ ۲۹) ما اغنی عنھم ما کانوا یمتعون (الشعراء ۲۰۶) لا تغن عنی شفاعتھم (یٰس ۲۳) ولا یغنی من اللھب (المرسلٰت ۳۱)

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ ۱۰

جس طرح فرعون کے لوگوں اور ان سے پہلے لوگوں کا حال (ہوا) انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ پس اللہ نے ان کو

اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۱۱

انکے قصوروں کے سبب پکڑا اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے ۳۸۱ ان لوگوں کو جنہوں نے انکار کیا کہدو

سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

کہ تم جلد مغلوب کئے جاؤگے اور جہنم کیطرف اکٹھے کرکے چلائے جاؤگے اور کیا ہی بری تیاری ہوئی جگہ ہے ۳۸۲

انہم لن یغنوا عنک من اللہ شیئا (الجاثیۃ - ۱۹)

مِن — من اللہ۔ مِنْ ابتدائے غایت کے لئے ہے اور مراد ہے من عذاب اللہ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اگلی آیت میں جو مثال دی ہے اس میں اللہ کے عذاب کا ہی ذکر ہے بعض نے من کو یہاں بدل کے معنی میں لیا ہے (مغنی) یعنی اللہ کی طاعت یا اسکی رحمت کے بدل میں یہ چیزیں کچھ کام نہ آئیں گی +

کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی — جیساکہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ خاص خطاب اس سورۃ کے صدر میں عیسائیوں سے ہے۔ چنانچہ بعض نے یہاں مراد وفد نجران لیا ہے (ر) یعنی وہ وفد جو عیسویت کا قائم مقام ہو کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے مالوں اور جتھے پر جس قدر فخر عیسائی اقوام کو ہے شاید ہی کسی قوم کو ہوا ہو۔ مگر چونکہ الفاظ عام ہیں اسلئے ہر قسم کے کافر اسکے اندر شامل ہیں جو اسلام کو نابود کرنا چاہیں +

دأب — ۳۸۱۔ دأب۔ دَأَبَ کے معنی ہیں کوشش کی اور تھک گیا پس دَأْب اور دَأَب دونوں کے معنی عادت اور شان یعنی حالت آتے ہیں (ل)، مگر ازہری نے کہا ہے کہ دَأْب سے مراد ان کا کفر میں سخت زور لگانا (اجتہادُھم فی الکفر) اور نبی صلعم کی مخالفت پر ایک دوسرے کے مددگار بننا ہے جیساکہ فرعون کے لوگ حضرت موسیٰ کے خلاف ایک دوسرے کے مددگار رہوتے (ل) +

ذنب — ذنوب۔ ذَنْب کی جمع ہے وَالذَّنْبُ فِی الْاَصْلِ الْاَخْذُ بِذَنَبِ الشَّیْءِ (غ)، ذَنْب اصل میں کسی چیز کی ذَنَب یعنی دم یا موخر حصہ کے پکڑنے کا نام ہے وَیُسْتَعْمَلُ فِی کُلِّ فِعْلٍ یُسْتَوْخَمُ عُقْبَاہُ اعتبارا بِذَنَبِ الشَّیْءِ (غ)، اور ذنب ہر ایک اس فعل پر استعمال ہوتا ہے جس کا انجام ناگوار اور گراں ہو۔ گویا وہ بمنزلہ ایک چیز کی دم کے ہے لسان العرب میں ہے اَلذَّنْبُ اَلْاِثْمُ وَالْجُرْمُ وَالْمَعْصِیَۃُ یعنی ذنب اثم جرم اور معصیت تینوں پر شامل ہے۔ اب اثم ہر ایک اس فعل کا نام ہے جو ثواب سے انسان کو روکتا ہے جُرم ان افعال کا نام ہے جن کی وجہ سے گویا جناب الٰہی سے قطع تعلق ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا اشتقاق جَرم بمعنی قطع سے ہے اور معصیت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو کہتے ہیں خواہ عمداً ہو یا سہواً۔ گو جو نافرمانی سہو سے ہو وہ قابل مواخذہ نہیں پس معلوم ہوا الذنب کا لفظ زبان عربی میں نہایت وسیع ہے۔ اور اس سے مراد وہ افعال بھی ہو سکتے ہیں جو فی الحقیقت گناہ نہیں اور نہ نافرمانیاں ہیں مگر ان کا انجام ناگوار ہے اور ایسی نافرمانی بھی اس سے مراد ہو سکتی ہے جس میں عمد اور ارادہ کا کوئی دخل نہیں اور ایسے سخت گناہ بھی اس سے مراد ہو سکتے ہیں جو جناب الٰہی سے قطع تعلق کا موجب ہو جائیں پس لفظ ذنب کا صحیح ترجمہ گناہ نہیں بلکہ قریب تر لفظ جو اس کے مفہوم کو ادا کرتا ہے قصور ہے اور کبھی وہ اتنا چھوٹا ہوگا کہ اس میں کرنے والے پر کوئی الزام نہیں اور بعض وقت بہت بڑا جیسے یہاں +

فرعون کے لوگوں کی حالت کا ذکر کرکے یہ بتا دیا کہ جس طرح وہ دنیا میں مغلوب و ذلیل ہوئے اسی طرح مخالفین اسلام کی حالت بھی ہوگی +

حشر — ۳۸۲ تحشرون۔ حَشْر کسی جماعت کو اپنی جائے قرار سے نکال دینا اور وہاں سے بے آرام کرکے جنگ وغیرہ کی طرف لیجانا ہے چنانچہ

۱۲ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِىْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ

ان دو گروہوں میں جن کی آپس میں مٹ بھیڑ ہوئی یقیناً تمہارے لئے ظاہر نشان تھا۳۸۳ ایک گروہ اللہ

اس روایت اَلنِّسَاءُ لَا يُحْشَرْنَ میں معنی یہ ہیں لا یُخْرَجْنَ اِلَى الْغَزْوِ ۔ یعنی عورتوں کو جنگ کے لئے نکلنے پر مجبور نہ کیا جائیگا۔ اور حشر کا لفظ سوائے جماعت کے نہیں بولا جاتا (غ)۔ وابعث فی المدائن حاشرین (الشعراء ۳۶) والطیر محشورۃ (صٓ ۱۹) واذا الوحوش حشرت (التکویر ۵) وحشر لسلیمٰن جنودہ (النمل ۱۷) ھو الذی اخرج الذین کفروا من دیارھم لاول الحشر (الحشر ۲) اور قیامت میں لوگوں کے اکٹھا کئے جانے پر بھی لفظ حشر بولا گیا ہے۔

النساء لا یحشرن سے مراد

اس آیت میں اور بھی صفائی سے بیان کیا ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہونگے وہ ضرور پہلے اسی دنیا میں مغلوب ہونگے پھر جہنم کی طرف اکٹھے کرکے چلائے جائینگے۔ اور اس دنیا میں ان کی مغلوبیت آخرت میں جہنم کا ثبوت ہوگی۔ یہ پیشگوئی اس زمانہ کی ہے کہ ابھی نبی کریم صلعم کی جمیعت ملک عرب میں دشمنوں کے مقابلہ پر کچھ بھی نہ تھی اور مخالفت ایک مشرکین عرب کی طرف سے ہی نہ تھی بلکہ اندرونی مخالف منافق۔ اور بیرونی مخالف عرب کے سب مشرک اور یہود اور نصاریٰ اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو چکے تھے۔ ان حالات میں ایسے صاف الفاظ میں کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی کرنا اور پھر اس پیشگوئی کا آنحضرت صلعم کے سامنے پورا ہو جانا اسلام کی صداقت کے چمکتے ہوئے نشانوں میں سے ایک نشان ہے اور آج ایک مسلمان کے قلب کو اس بات سے قوت ملتی ہے کہ وہ خدا جس نے اپنا وعدہ ان حالات میں پورا کیا۔ وہ اسلام کی ہر ایک بیکسی کے وقت اس کا حامی ہوگا۔ اور اس کے مخالفین کو مغلوب کرے گا۔

کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی سخت مخالفت کے وقت

۳۸۳ اس آیت میں بالخصوص اہل کتاب مخاطب ہیں۔ کیونکہ اس سورت کے ابتدائی حصہ میں اصل خطاب انہیں کے ساتھ چلتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں مشرکوں اور مسلمانوں کے مقابلہ اور جنگ کی طرف توجہ دلائی ہے پس جس کو توجہ دلائی ہے وہ کوئی تیسرا گروہ ہے اور یہ عیسائی ہیں جن کے ساتھ اصل بحث چلتی ہے۔ دو گروہوں کی مٹ بھیڑ سے مراد جنگ بدر ہے جیسا کہ اگلے الفاظ میں صاف اشارہ بھی ہے کہ ایک گروہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتا تھا اور دوسرا گروہ کافروں کا تھا جو دیکھنے میں ان سے دو چند تھے۔

عیسائیوں کو خطاب

جنگ بدر میں آنحضرت صلعم کی صداقت کا نشان ایک تو اس طرح تھا کہ قرآن کریم کی مکی سورتوں میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان ایک مٹ بھیڑ کی خبر بار بار دی گئی تھی جس میں کفار کی ہزیمت اور مسلمانوں کی فتح کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ یہاں تفصیل کے ساتھ ان پیشگوئیوں کے ذکر کا موقعہ نہیں۔ صرف ایک پیشگوئی پر کفایت کی جاتی ہے۔ سورہ القمر میں آخری رکوع میں ہے ام یقولون نحن جمیع منتصر سیھزم الجمع ویولون الدبر بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر۔ کیا یہ (کفار) کہتے ہیں کہ ہم ایک جماعت ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ان کی جماعت کو ہزیمت دی جائے گی۔ اور وہ پیٹھیں پھیر کر واپس ہو جائینگے۔ ہاں ایک گھڑی ان کے وعدے کا وقت ہے اور وہ گھڑی بڑی سخت اور تلخ ہوگی۔ کہا جائیگا کہ یہ تو قیامت کے متعلق ہے۔ مگر جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں قرآن کریم نے پیشگوئی میں ایسی لطیف طرز اختیار کی ہے۔ کہ قیامت کی رسوائی کے ساتھ اس دنیا کی مغلوبیت کا ذکر بھی کیا ہے۔ تاکہ ایک کے پورا ہو جانے سے دوسرے کی صداقت پر شہادت ہو۔ مگر یہاں ساعت سے مراد وہی ہزیمت کی ساعت ہے ورنہ قیامت کے دن ہزیمت اور جنگ کا کیا ذکر ہے۔ وہ تو اسی دنیا میں ہوگی۔ اور یہ بھی ایک معنی میں اُن کے لئے قیامت ہی ہے۔ ہاں پھر قیامت میں اس سے بھی زیادہ سختی اور تلخ کامی دیکھیں گے۔ اس بات کا ثبوت کہ خود نبی کریم صلعم اس پیشگوئی سے بدر کی جنگ مراد لیتے تھے صحیح احادیث سے ملتا ہے چنانچہ اسی آیت کی تفسیر میں بخاری میں ہے عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال وھو فی قبۃ لہ یوم بدر انشدک عھدک ووعدک اللھم ان شئت لم تعبد بعد الیوم ابدا فاخذ ابوبکر بیدہ وقال

جنگ بدر کی پیشگوئیاں مکی سورتوں میں

آنحضرت کی دعا بدر کے دن

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ

کی راہ میں لڑتا تھا اور دوسرا کافر تھا وہ انکو آنکھ سے دیکھتے ہوئے اپنے سے دوچند دیکھتے تھے اور اللہ

يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ۝

اپنی مدد کے ساتھ جس کی چاہے تائید کرتا ہے بصیرت والوں کے لئے اس میں یقینی عبرت ہے ۳۸۴

حسبك يا رسول الله فقد الححت على ربك وهو فى الدرع فخرج وهو يقول سيهزم الجمع ويولون الدبر بل الساعة موعدهم والساعة ادهى وامر۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ بدر کے دن نبی صلعم ایک چھوٹے سے خیمہ میں تھے۔ اور بارگاہ الٰہی میں یوں دعا کر رہے تھے: میں تیرے عہد اور تیرے وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں۔ اے اللہ اگر تیری ایسی ہی مشیت ہے (یہ نظر بحالت ظاہر تھا۔ کیونکہ بظاہر مسلمان کفار کے سامنے اتنے تھوڑے اور بے سامان تھے۔ کہ ان کے ہاتھوں ان کا کچلا جانا صاف نظر آتا تھا) تو آج کے دن کے بعد زمین میں تیری پرستش نہیں کی جائیگی ابوبکر نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا یا رسول اللہ بس کیجئے آپ نے اپنے رب پر الحاح کیا ہے آپ نے زرہ پہنی ہوئی تھی پس آپ نکلے اور یہ آیت پڑھ رہے تھے سیهزم الجمع ويولون الدبر بل الساعة موعدهم والساعة ادهى وامر۔ اسی قسم کی اور بہت سی پیشگوئیاں اسی جنگ کے متعلق قرآن کریم میں تھیں پس ایک طرف پیشگوئیوں کا پہلے موجود ہونا دوسری طرف باوجود مسلمانوں کی قلت اور بے سروسامانی اور دشمن کی کثرت اور مسلح ہونے کے کفار کا ہزیمت اٹھانا ان دونوں باتوں نے جنگ بدر کو ایک عظیم الشان نشان بنا دیا تھا۔ تو اب دوسرے مخالفت کرنے والوں کو کہا جاتا ہے کہ اسی نشان پر غور کرو ✦

بائبل میں جنگ بدر اور ہجرت کی پیشگوئیاں

اور اہل کتاب یعنی عیسائیوں کے لئے بالخصوص ایک نشان جنگ بدر میں یہ تھا۔ کہ جنگ بدر کی پیشگوئی اُن کی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے چنانچہ نبی کریم صلعم کی ہجرت اور بدر میں قریش کی طاقت کو کمزور کیا جانے کی پیشگوئی صاف الفاظ میں یسعیاہ نبی کی کتاب میں موجود ہے۔ دیکھو یسعیاہ ۲۱ : ۱۳ سے ۱۷ آیت تک ✦

”عرب کی بابت الہامی کلام۔ عرب کے صحرا میں تم رات کو کاٹو گے۔ اے ددانیوں کے قافلو۔ پانی لیکے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو روٹی لیکے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ کیونکہ وے تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے اور کھینچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں۔ کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس۔ ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی۔ اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائینگے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا“

اب صاف ظاہر ہے کہ بھاگنے والے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت ابوبکر آپ کے ساتھ تھے اور درحقیقت ساری تاریخ مقدس میں ایک ہی شخص کے بھاگنے کو یہ عظمت حاصل ہوئی۔ کہ اُس سے ایک سنہ چل پڑا پس اس بھاگنے میں آپ کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے اور الفاظ ”عرب کی بابت الہامی کلام“ اس واقعہ کو عرب پر ہی محدود کرتے ہیں۔ اب بھاگنے کے ذکر کے تعلق میں یہ کہا کہ ایک سال کے اندر قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی۔ اور قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائینگے سو ایسا ہی ہوا۔ کہ جنگ بدر کا وقوع جو ہجرت کے ایک سال کے گزر جانے کے بعد ہوا۔ اس میں قیدار کی حشمت جاتی رہی۔ اور اُن کے بہادر لوگ گھٹ گئے۔ قیدار کا لفظ بائبل میں بہت مرتبہ بنی اسماعیل کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ پس اہل کتاب کے لئے یہ کھلا کھلا نشان جنگ بدر میں تھا ✦

عبر۔ اعتبار۔ عبرۃ

۳۸۴ عبرۃ عَبَرَ کے اصل معنی ہیں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف تجاوز کرنا۔ اسی سے عبور ہے اور اعتبار اور عِبْرۃ

۱۳ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ

لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت (جیسے) عورتوں اور بیٹوں اور ڈھیروں ڈھیر

الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَ

سونے اور چاندی اور بلے ہوئے گھوڑوں اور مویشی اور کھیتی سے بھلی معلوم

الْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○

ہوتی ہے یہ اس ورلی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے پاس لوٹ کر جانے کی اچھی جگہ ہے ۳۸۵

سے وہ حالت مراد ہے جس کے ساتھ ایک دیکھی ہوئی چیز کی معرفت سے اس چیز کی معرفت حاصل کی جائے جو دیکھی نہیں گئی (غ)

بدر میں مسلمانوں کا کفار کو اپنے سے دو چند دیکھنا

یرونہم مثلیہم رای العین - اُن کو ظاہر نظر میں اپنے سے دوچند دیکھتے تھے یعنی مسلمان کفار کو بظاہر اپنے سے دوچند دیکھتے تھے - اور سورہ انفال میں ہے واذ یریکموہم اذ التقیتم فی اعینکم قلیلا ویقللکم فی اعینہم اور جب تم میں مٹ بھیڑ ہوئی تو اُن کو تمہاری نظر میں کم دکھاتا تھا اور تم کو اُن کی نظر میں کم دکھایا - ان دونوں بیانات میں کوئی مخالفت نہیں ہے۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ کفار کی کل جمعیت ایک ہزار کے قریب اور مسلمان تین سو کے قریب تھے - تو یرونہم مثلیہم سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو وہ کوئی چھ سو کے قریب نظر آتے تھے - وجہ یہ تھی کہ بقیہ حصہ پہاڑ کی اوٹ میں تھا - اور یہ دوچند دکھانا بے معنی نہ تھا۔ بلکہ اس میں حکمت یہ تھی کہ یہ بھی ارشاد الٰہی ہو چکا تھا فان یکن منکم مائۃ صابرۃ یغلبوا مائتین وان یکن منکم الف یغلبوا الفین باذن اللہ (الانفال ۶۶) کہ اگر تم میں سے ایک سو صابر ہونگے تو دو سو پر غالب آئینگے اور ایک ہزار تم میں سے ہونگے تو دو ہزار پر غالب آئینگے - تو چونکہ یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو چکا تھا کہ تم دوچند جمعیت پر غالب آؤ گے گو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زیادہ پر غالب نہیں آئینگے تاہم اسلئے کہ مسلمانوں کے حوصلے مضبوط رہیں اور انہیں یقین کامل رہے کہ ہم دشمن پر غالب آئینگے انکو اسی قدر حصہ دکھایا گیا جو تعداد میں اُن کی اپنی جمعیت سے دوچند تھا تو اس طرح پر کفار مسلمانوں کو تھوڑے کر کے دکھائے گئے اور مسلمان بھی کفار کو تھوڑی سی دکھائے گئے - کیونکہ وہ تو واقعی تھے ہی تھوڑے پس اُنہوں نے مسلمانوں کو ہیچ سمجھا - اور یہ خیال کیا کہ ہم فوراً اُن کو نابود کر دینگے اگر یہ خیال اُن کے دلوں میں نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ جنگ کو ٹال دیتے - لیکن اللہ تعالیٰ اس میدان میں پیشگوئیوں کے مطابق کفار کی طاقت کو توڑنا چاہتا تھا پس قرآن کریم کی سب آیات ایک دوسری کی موید ہیں +

شہوۃ

۳۸۵ شہوات - شَہْوَۃ کی جمع ہے اور اس کے اصل معنی نفس کا اس چیز کا اشتیاق ہے جس کا تم ارادہ کرو اور دنیا میں شہوات انسانی دو طرح پر ہیں ایک سچی اور ایک جھوٹی - شہوت صادقہ وہ ہے کہ اس خواہش کے پورا ہوئے بغیر بدن میں اختلال واقع ہو اور کاذبہ وہ ہے جو ایسی نہ ہو - اور کبھی مُشْتَہیٰ کو (یعنی اس چیز کو جس کی خواہش کی گئی ہے) بھی شہوۃ کہا جاتا ہے (غ) اور یہاں مراد مشتہیات ہی ہیں +

قنطار - قنطرۃ

القناطیر المقنطرۃ - قناطیر قِنطار کی جمع ہے - قَنْطَرَۃ جسے یعنی پل کو کہتے ہیں اور بلند عمارت کو بھی کہتے ہیں - اور قِنطار ایک معیار ہے جس کے متعلق اختلاف ہے کسی نے کہا چالیس اوقیہ ہوتا ہے کسی نے کہا بارہ سو دینار کسی نے کہا بارہ سو اوقیہ کسی نے کہا ستر ہزار دینار - مگر حق وہ ہے جو ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ عرب قنطار کا وزن نہیں جانتے (ل) اور قَنْطَرَ الرجل کے معنی ہیں مال کثیر کا مالک ہوا (ل) امام راغب کہتے ہیں کہ قناطیر قِنْطَار کی جمع ہے اور قَنْطَرَۃ اس مال کو کہتے ہیں جس سے

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ ۱۴

کہو کیا میں تم کو اس سے اچھی بات بتاؤں ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے رب کے پاس باغ ہیں جنکے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ

نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں رہنے والے ہیں اور پاک ساتھی اور اللہ کی رضامندی

اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے ۳۸۶

انسان کی زندگی گزر جائے گو یا پل پر سے عبور کے لحاظ سے یہ معنی ہیں۔ اور یہ غَيْرُ مَحْدُوْدِ الْقَدْرِ فِيْ نَفْسِهٖ ہے یعنی اس کا اندازہ محدود نہیں بلکہ جس طرح غنا کے لئے کوئی خاص مقدار معین نہیں اسی طرح قنطار ہے اور القناطیر المقنطرۃ کے معنی کئے ہیں المجموعة قِنْطَارًا قِنْطَارًا +

خیل — الخیل۔ خَیل کا لفظ اصل میں گھوڑے اور سوار دونوں پر یکجائی حالت میں بولا جاتا ہے (اس کی وجہ راغب نے لفظ خیال سے لی ہے کیونکہ خُیَلَاء متکبر کو کہتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑھکر خیال کرتا ہے اور جو شخص گھوڑے پر سوار ہوتا ہے وہ بھی ایسا ہی خیال کرتا ہے) پھر علیحدہ علیحدہ گھوڑے اور سوار دونوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ) اور یہ اسم جمع ہے۔ واحد کے لئے فَرَس بولا جاتا ہے +

مسومه — المسوّمة۔ سَوْم کے معنی کے لئے دیکھو ۲/۲۷ اونٹ کو چراگاہ میں چھوڑنے پر بھی بولا جاتا ہے اور سَوَّمَتُهٗ کے معنی اَعْلَمْتُهٗ بھی آتے ہیں (غ) یعنی میں نے اس پر نشان لگایا پس الخیل المسوّمة کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں المَرْعِيَّة۔ والمُعَلَّمة یعنی چرنے کے لئے چھوڑے گئے یا پلے ہوئے اور نشان لگائے گئے۔ مجاہد کہتے ہیں الخیل المسومة المطہمة الحسان (بخاری) یعنی خیل مسومۃ سے مراد موٹے خوبصورت گھوڑے ہیں +

انعام — الانعام۔ نَعَم کی جمع ہے اور یہ لفظ اونٹ گائے اور بکری پر بولا جاتا ہے۔ مگر خصوصیت سے اونٹ پر بولا جاتا ہے کیونکہ اونٹ ان کے لئے سب سے بڑی نعمت تھی +

ماٰب۔ اَوْب — ماٰب۔ اَوْب سے مصدر بھی ہے اور اسم مکان و زمان بھی اور اَوْب رجوع ہے مگر اَوْب صرف اس جاندار پر بولا جاتا ہے جو ارادہ رکھتا ہے اور رجوع عام ہے +

دنیا کے مرغوبات مقصد زندگی نہیں — عیسائیوں کے ساتھ بحث میں دنیا کی محبوب چیزوں کا ذکر بالخصوص کیا ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ یہ قوم دنیا کی مرغوب چیزوں کی محبت میں پڑکر اللہ کو بالکل بھول جائیگی۔ بالخصوص یہاں ڈھیروں ڈھیر سونے چاندی کا ذکر بتاتا ہے کہ یہ عرب کے لوگوں کا نقشہ نہیں جن کے پاس سونا چاندی اگر ہوگا بھی تو برائے نام اور آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے کہ حسن ماٰب اللہ کے پاس ہے گویا یہ بتایا ہے کہ مرغوبات دنیا کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا انجام کار مفید نہیں ان سے بیشک فائدہ اٹھائے مگر منظر خدا کی رضا ہو جیسا اگلی آیت میں کھول دیا +

رضوان — ۳۸۶ رضوان۔ رضا سے ہے اور رضائے کثیر کو رضوان کہا جاتا ہے (غ) اور چونکہ سب سے بڑی رضا اللہ کی رضا ہے اس لئے قرآن کریم میں لفظ رضوان رضائے الٰہی سے مخصوص ہے جیسے ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ (الحدید ۲۷) يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ

۱۵-۱۶ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ اَلصّٰبِرِيْنَ

وہ جو کہتے ہیں، اے ہمارے رب بیشک ہم ایمان لائے پس تو ہماری کمزوریوں سے ہماری حفاظت فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا[۳۸۶] صبر کرنے والے

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝

اور سچ کر دکھانیوالے اور فرمانبردار اور خرچ کرنے والے اور صبح کے وقتوں میں استغفار کرنے والے[۳۸۸]

رضا

ورضوانا (الفتح ۴۸-۲۹ - الحشر ۵۹-۸) یبشرھم ربھم برحمۃ منه ورضوان (التوبۃ ۹-۲۱) اور رضا کو راغب نے دو طرح پر لکھا ہے بندہ کا اللہ سے راضی ہونا اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کی قضا و قدر اس پر وارد ہو اسے بُرا نہ سمجھے اور اللہ کا بندہ سے راضی ہونا کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اپنے امر پر چلنے والا اور اپنی نہی سے رُکنے والا دیکھے +

جنت اور اسکی عظیم ترین نعمت رضائے الٰہی کا حصول اسی دنیا میں

نعمائے جنت خلود و ازواج کے متعلق دیکھو ع[۳۹] یہاں انہی امور کا ذکر کر کے جن کا ذکر سورہ بقرہ میں کیا تھا۔ آخر پر لفظ رضوان من اللہ اور بڑھا دیتے ہیں اور دوسری جگہ رضوان من اللہ کو جنت کی سب سے بڑی نعمت فرمایا ہے ورضوان من اللہ اکبر (التوبۃ ۹-۷۲) پس نعمائے جنت میں رضائے الٰہی کو داخل کر کے بتا دیا ہے کہ مومن کی اصل خوشنودی کا سامان رضائے الٰہی ہے۔ اور پھر صحابہؓ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا کہ رضی اللہ عنھم ورضوا عنه اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہ بتایا کہ نعمائے جنت کا حصول بلکہ اعظم ترین نعمت جنت کا حصول اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے +

انہماک مرغوبات دنیا کا انجام

اس آیت کریمہ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض قومیں محض مرغوبات دنیا میں منہمک ہو گئیں یا ہو جائینگی۔ مگر مرغوبات دنیا میں انہماک کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ ہاں رضائے الٰہی اصل چیز ہے جس کے حصول کے لئے انسان کو پوری کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ یہی دنیا و آخرت کی سب سے بڑی نعمت ہے واللہ بصیر بالعباد (یعنی اللہ بندوں کے عملوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ وہ ان کے اعمال حسنہ پیان کو جزائے احسن عطا فرماتا ہے +

ع[۳۸۶] یہاں جو دعائے مغفرت ذنوب یعنی کمزوریوں کی حفاظت کی دعا ہے اس میں بالخصوص مراد کمزوریوں کے سرزد ہونے سے حفاظت ہے۔ ایمان لانے سے پچھلے گناہ تو معاف ہو ہی جاتے ہیں پس وہ سب گناہوں سے پاک ہو کر پھر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہیں کہ آئندہ ان سے کمزوریاں سرزد نہ ہوں +

صدق

ع[۳۸۸] الصادقین۔ صدق اولاً قول کے لئے ہی آتا ہے۔ مگر اس کا استعمال لغت میں اور قرآن کریم میں افعال کیلئے بھی کثرت سے ہوا ہے۔ مثلاً صَدَقَ فِي الْقِتَالِ کے معنی ہیں جنگ کا حق پورا کیا اور جو کرنا واجب تھا اور جس طرح کرنا واجب تھا اسی طرح کیا۔ اور قرآن کریم میں آتا ہے رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیه (الاحزاب ۳۳-۲۳) یعنی انہوں نے عہد کو سچ کر دکھایا ان افعال کے ذریعہ سے جو انہوں نے ظاہر کئے (غ)۔ ایسا ہی لقد صدق اللہ رسوله الرؤیا بالحق (الفتح ۴۸-۲۷) میں صدق بالفعل مراد ہے یعنی سچ کر دکھایا چونکہ یہاں صبر کے بعد صدق کا مرتبہ رکھا ہے۔ اور صبر کے معنی امساک فی ضیق یعنی تنگی کی حالت میں اپنے آپکو روک رکھنا ہی اسلئے صادقین سے صادق بالفعل یا جو کچھ کہا ہی اسکو سچ کر دکھانیوالے مراد ہیں صبر میں صرف اپنے آپکو روک رکھنا ہے صدق میں قدم آگے بڑھانا ہے

قنوت

القانتین۔ قنوت طاعت یعنی فرمانبرداری کو خضوع کے ساتھ لازم کر لینا ہے۔ صبر اور صدق کے ساتھ تیسرا مرتبہ قنوت کا ہے یعنی صبر اور صدق دکھائے مگر ایسی حالت میں کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم کیا ہو اور پھر فرمانبرداری بھی ایسی ہو جس میں خضوع یعنی عاجزانہ حالت پائی جائے۔ اپنے کئے پر فخر نہ ہو۔ بڑائی نہ ہو +

انفاق

للمنفقین۔ یہ چوتھا مرتبہ ہے۔ صبر بھی دکھائے صدق بھی۔ فرمانبرداری بھی ہو لیکن جبتک انسان انفاق فی سبیل اللہ

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا ۱۷

اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے انصاف پر قائم ہوتے

بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ؕ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۟ قف ۱۸

ہوئے اس کے سوا کوئی معبود نہیں غالب حکمت والا ہو ۳۸۹ یقینا دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے

النصف

نہیں کرتا یعنی اپنے سارے مال کو اپنی ساری طاقتوں کو خدا کی راہ میں لگا نہیں دیتا وہ کسی بڑی کامیابی کا وارث نہیں ہو سکتا۔

استغفار ترقی کا آخری مرتبہ ہے

للمستغفرین دیکھو ۲۵۸ یہ پانچواں مرتبہ ہے۔ اور چاروں مراتب کے بعد اس کے لانے سے صاف بتا دیا ہے کہ یہ ترقی کیلئے آخری مرتبہ ہے پس اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہنے والے ہیں یعنی باوجود صبر اور صدق دکھانے کے باوجود فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم کر لینے کے باوجود اپنے مال اور قویٰ کو خدا کی راہ میں لگا دینے کے اپنے نفس پر کوئی بھروسہ نہیں کرتے۔ بلکہ حفاظت الٰہی کے طالب ہوتے ہیں۔ اور جس قدر زیادہ انسان استغفار کرتا ہے۔ اسی قدر زیادہ وہ حفاظت الٰہی کے ماتحت آتا ہے اور اسلئے ہر قسم کے خطرات سے مامون ہو جاتا ہے ٭

سحر

الاسحار سحر کی جمع ہے اور سحر اصل میں آخر شب کے اندھیرے کا دن کی روشنی کے ساتھ مختلط ہو جانے کا نام ہے اور اس وقت کو بھی سحر کہتے ہیں (غ) ٭

صبح کے وقت استغفار و دعا کی خصوصیت

صبح کے وقت استغفار سے مراد بعض نے اس وقت کی نماز کو لیا ہے جیسے کہ قتادہؓ سے روایت ہے (ج) اور بعض نے محض استغفار۔ مگر نماز میں بھی استغفار ہی ہوتا ہے صبح کے وقت کی خصوصیت کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح کے وقت دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ سحر کا وقت درحقیقت ایسا وقت ہے کہ ایک تو دنیا کے شور و شغف اس وقت کم ہوتے ہیں۔ دوسرے قوائے حیوانی بھی اس وقت کسی قدر کمزور ہوتے ہیں۔ اور اس لئے انسان کی توجہ اور قوائے روحانی کے کمال کا وقت ہوتا ہے آج کل کی عیاشی بھی رات کے دو تین بجے ختم ہو جاتی ہے اور یعنی یا وبائی بیماریوں میں عموماً یہی وقت نزع کا ہوتا ہے جو سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ وقت قوائے حیوانی کی کمزوری کا ہوتا ہے اس لئے اس وقت کو دعائے استغفار کے لئے مخصوص کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا نزول سمائے دنیا پر

حدیث صحیح میں جس پر صحیحین اور سنن کا اتفاق ہے یہ آتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ینزل اللہ تبارک وتعالیٰ فی کل لیلۃ الی السماء الدنیا حین یبقی ثلث اللیل الاخیر فیقول ھل من سائل فاعطیہ ھل من داع فاستجیب لہ ھل من مستغفر فاغفر لہ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ ہر رات جب رات کا آخری تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے سماء الدنیا پر نزول فرماتا ہے پس فرماتا ہے کیا کوئی سائل ہے۔ میں اس کو دوں گا کیا کوئی دعا کرنے والا ہے میں اس کی دعا قبول کروں گا کیا کوئی مغفرت مانگنے والا ہے میں اس کو اپنی مغفرت میں لے لونگا۔ اللہ تعالیٰ تو مکان کی قید سے پاک ہے پس اس کے نزول سے مراد بھی اس کی رحمت اور فضل کا خاص جلوہ ہے جس کے لئے کوئی جاذب دل ہونا چاہئے افسوس کہ مسلمان اب اس قدر غفلت کی نیند سوتے ہیں کہ اس قبولیت کے وقت سے کوئی فائدہ اٹھانے والا نہیں الا ماشاء اللہ۔ بلکہ دوسری قوموں کا تتبع کر کے رات کو لغویت یا عیاشی میں گزار کر اس وقت جو جاگنے کا وقت ہے سو جاتے ہیں ٭

الصابرین وغیرہ یا تو الذین کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور یا خود نصب علی المدح ہے ٭

قِسط۔ قَسط
اقسط۔ قاسط

ع ۳۸۹ قسط۔ قِسط کے معنی عدل یا انصاف کا حصہ ہیں (اور مراد اس سے انصاف ہے) اور یہی وجہ ہے کہ قَسط کے معنی ہیں اس نے ظلم کیا گویا دوسرے کا حصہ لے لیا اور اَقسط کے معنی ہیں اس نے انصاف کیا گویا دوسرے کا حصہ دیدیا (غ) اسی لئے قاسط

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا

اور انہوں نے جن کو کتاب دی گئی اختلاف نہیں کیا مگر اس سے پیچھے کہ ان کے پاس علم آچکا تھا آپس کی

بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

ضد سے اور جو شخص اللہ کی آیتوں کا انکار کرتا ہو تو اللہ بھی جلد حساب لینے والا ہے ۳۹۰

مقسط — ظالم کے معنی میں آیا ہے واما القاسطون فکانوا لجہنم حطبا (الجن ۷۲-۱۵) اور مُقسِط اچھے معنی میں آتا ہے ان اللہ یحب المقسطین (المائدہ ۵-۴۲)

قائما بالقسط — قائما بالقسط کی دو توجیہیں ہوسکتی ہیں۔ جمہور مفسرین نے تو اسے شہد سے حال لیا ہے مگر یہ بھی جائز ہے کہ اولوا العلم سے حال ہو، اور تقدیر یوں ہوگی واولوا العلم حال کون کل واحد منہم قائما بالقسط (ز) یعنی اولوا العلم کی گواہی بھی یہی ہے اس حال میں کہ ان میں سے ہر ایک انصاف کے ساتھ کھڑا ہوا۔ میرے نزدیک یہ دوسری وجہ ہی درست ہے ۔

توحید پر تین قسم کی شہادت — یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر تین قسم کی شہادت پیش کی ہے۔ اول خود اللہ تعالیٰ کی شہادت۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اس قول کی شہادت اسکی فعلی کتاب سے ملتی ہے اور اس کے ہاتھ کی نکلی ہوئی چیزیں خود توحید پر دلالت کرتی ہیں۔ دوسری شہادت ملائکہ کی ہے جن کا تعلق پاک فطرت انسانوں سے ہے۔ کیونکہ فطرت انسانی جب گردوپیش کے حالات سے متاثر نہیں ہوتی۔ تو اللہ تعالیٰ کی توحید پر گواہی دیتی ہے۔ عموماً تمام لوگ یہاں تک کہ خدا کے منکر بھی مصائب کے وقت میں خدا تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرتے ہیں اور بت پرست اور دوسری قسم کے مشرک جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے بتوں کو اور دوسرے شرکاء کو بھول جاتے ہیں اور خالص اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں۔ اور علم والوں کی شہادت درحقیقت دنیا کی الہامی کتابوں کی شہادت ہے کہ وہ سب بھی بہت سی باتوں میں باہم اختلاف رکھتی ہوئی اس بات پر متفق ہیں۔ کہ خدا ہے اور ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولوا العلم کے ساتھ قائما بالقسط کی شرط لگادی ہے کہ اہل علم اگر انصاف پر قایم ہوں تو وہ بھی یہی گواہی دینگے۔

عیسائیت پر اتمام حجت — یہاں توحید پر ایسی جامع شہادت پیش کرنے کا منشاء یہی ہے کہ عیسائیت پر اتمام حجت کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی گواہی جو اس کی فعلی کتاب قدرت سے ملتی ہے۔ اور ملائکہ کی گواہی جو نیک دل انسانوں کی صحیح فطرت سے ملتی ہے کیونکہ ملائکہ کا ان کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ اور اہل علم کی انصاف کے ساتھ شہادت سب اس بات پر متفق ہیں کہ خدا ایک ہے۔ اور تثلیث کی کوئی شہادت ان تینوں ذرائع سے نہیں ملتی یعنی نہ قانون قدرت اس کا شاہد ہے۔ نہ فطرت انسانی اپنی صحیح حالت میں اس کی گواہی دیتی ہے اور نہ ہی دنیا کی الہامی کتابیں یہ شہادت دیتی ہیں حتیٰ کہ مروجہ اناجیل باوجود اپنی تحریفات کے تین خداؤں کی کوئی شہادت نہیں دیتی ہیں پس جب توحید الٰہی پر اس قدر زبردست شہادت موجود ہے۔ اور ان تین ذرائع یعنی قانون قدرت۔ فطرت انسانی۔ اور الہامی کتابوں کی شہادت کے سوا کوئی اور ذریعہ شہادت مسلمہ فریقین نہیں ہوسکتا تو یہ عیسائی مذہب کے بطلان کی صریح دلیل ہے ۔

بغی — ع ۳۹۰ بغیا۔ بغی کے اصل معنی خواہش ہیں اس لئے بعض نے یہاں بغیا سے مراد لیا ہے طلب الریاسات والملک والسلطان (ج) یعنی ریاست حکومت اور غلبہ کی خواہش سے۔ اور یا اس سے مراد ضد اور حسد ہے ۔

کیوں اسلام ہی قابل قبول دین ہے — جب یہ بتا دیا کہ توحید الٰہی پر ہی تمام شہادتوں کا اتفاق ہے۔ اور دین اسلام ہی وہ دین ہے جس نے توحید خالص کو سکھایا پس اسلام ہی اب سچا دین ہے جس کو قبول کرنے کے سوا کوئی شخص توحید خالص پر قایم نہیں ہوسکتا اور واقعات شہادت دیتے ہیں کہ یہ دعویٰ بالکل سچا ہے ہر مذہب میں توحید کا کسی قدر شرک کے ساتھ اختلاط ہوگیا ہے ۔ اسلام کی پاک کتاب نے اگر ایک

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا ۱۹
پھر اگر تجھ سے جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ میں نے اپنی توجہ کو اللہ کی فرمانبرداری میں لگا دیا ہے اور انہوں نے بھی جو میرے پیچھے چلتے ہیں اور ان لوگوں کو جنہیں

الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا
کتاب دی گئی اور اُمیوں کو کہہ دو کہ کیا تم فرمانبردار ہوتے ہو؟ پھر اگر وہ فرمانبردار ہو جائیں تو یقیناً انہوں نے راہ پالی اور اگر پھر جائیں تو تجھ پر

عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۲۰
پہنچانا ہی ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے[۳۹۱] وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں

ع ۳ / ۱۱
خدا کی بادشاہت بنی اسرائیل سے نکلکر بنی اسمٰعیل کو ملتی ہے

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ
اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور جو ان کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں سے انصاف کا

مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝
حکم دیتے ہیں تو ان کو دردناک دکھ کی خبر دے دو[۳۹۲]

طرف شرک کے خفی مراتب تک کو بیان کر دیا تو دوسری طرف وہ تعلیم تحریف سے بھی پاک ہے ✦

بلاغ — **۳۹۱** البلاغ۔ بَلاغ کے معنی انتہائے مقصد کو پہنچنا بھی ہیں جو بُلوغ کے معنی ہیں اور تبلیغ یا پہنچا دینا بھی اس کے معنی ہیں اور یہاں پیغام کا پہنچا دینا ہی مراد ہے ✦

آنحضرتؐ کی بعثت اسود و احمر کیطرف — یہاں اہل کتاب اور اُمی دونوں کو خطاب کے لئے حکم دیا ہے۔ اور اس میں درحقیقت کل دنیا آجاتی ہے۔ خواہ اُمی سے مراد مکہ کے لوگ لئے جائیں دیکھو ۱۰۲ کیونکہ انہی لوگوں کی طرف کوئی رسول نہ آیا تھا باقی کل دنیا کی قوموں کی طرف رسول آچکے تھے پس وہ سب اہل کتاب میں داخل تھے اسی لئے اس آیت کے ماتحت مفسرین نے ان احادیث کو نقل کیا ہے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے بعثت الی الاسود والاحمر میں اسود اور احمر کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بغیر آنحضرت صلعم پر ایمان لانے کے نجات نہیں گو پہلے وہ لوگ کتاب بھی رکھتے ہوں۔ گویا آنحضرت صلعم کا پیغام صرف اُمیوں کے لئے نہ تھا بلکہ اہل کتاب کے لئے بھی تھا ✦

تبشیر — **۳۹۲** بشّر۔ تبشیر۔ خیر اور شر یعنی اچھی اور بری دونوں خبروں پر بولا جاتا ہے (ل) کیونکہ جس طرح خوشی کی خبر چہرہ (بشرۃ) پر انبساط پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح ایک بری خبر بھی چہرہ پر ایک تغیر پیدا کرتی ہے بعض نے کہا کہ عذاب پر تبشیر کا لفظ لانے کا یہ مطلب ہے کہ زیادہ سے زیادہ خوشی کی خبر جو وہ سنیں گے وہ بھی عذاب کی خبر ہے (غ)۔ بالفاظ دیگر خوشی کی کوئی خبر وہ نہ سنینگے جیسا شاعر کہتا ہے تَحِيَّةُ بَيْنِهِمْ ضَرْبٌ وَجِيْعٌ ✦

نبیوں کا قتل — دُکھ کی خبر تو موجود لوگوں کو یا بعد میں آنے والوں کو بھی دی جاسکتی ہے۔ اس لئے یا تو مراد یہ ہے کہ جو لوگ نبیوں کو قتل کرتے تھے اب جو ان کے نقش قدم پر چل کر مخالفت کرتے ہیں ان کو عذاب کی خبر دیدو۔ اور یا نبیوں کے قتل سے مراد ان کی دعوت کا ابطال ہے یا ایسی مخالفت کہ گو یا اپنی طرف سے تو قتل کا پورا سامان کر چکے گو حفاظت الٰہی نے بچا لیا۔ دیکھو ۹۱ ✦

۲۱ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○

یہ وہ لوگ ہیں جن کے کام دنیا اور آخرت میں کام نہ آئے اور ان کیلئے کوئی مددگار نہ ہونگے ۳۹۳

۲۲ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے وہ اللہ کی کتاب کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے

۲۳ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ

درمیان فیصلہ کرے پھر ایک گروہ ان میں سے پھر جاتا ہے اور وہ منہ پھیرنے والے ہیں ۳۹۴ یہ اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ سوائے

تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَّغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○

گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئے گی اور اس بات نے انکو انکے دین میں دھوکہ دیا جو وہ افترا کرتے تھے ۳۹۵

حبط عمل

۳۹۳ حبط عمل پر دیکھو ۲۷۹؎ جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے یہاں ان اعمال کے حبط کا ذکر ہے جو آنحضرت صلعم کی مخالفت میں حق کو مٹانے کے لئے کئے جاتے ہیں ۔

نصیب

تحریف بائبل

۳۹۴ نصیب ۔ نَصْب سے ہے جس کے معنی وضع ہیں اور نصیب حظ منصوب یعنی معین حصہ کا نام ہے (غ)

ان لوگوں سے جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ، یہود و نصاریٰ مراد ہیں جن کو کتاب دی گئی مگر وہ اصل کتاب الٰہی ان کے ہاتھ میں نہ رہی بلکہ صرف اس کا ایک حصہ موجودہ محرف کتابوں میں باقی رہ گیا ۔ قرآن کریم نے اس بیان کے ساتھ کہ اصل کتاب ان کے پاس نہیں بلکہ اس کا صرف ایک حصہ ہے اپنا منجانب اللہ ہونا ثابت کر دیا ہے اس لئے کہ اس حقیقت پر جو اس وقت دنیا کی نظروں سے مخفی تھی آج تیرہ سو سال بعد روشنی پڑتی ہے ۔ اور خود عیسائیوں کو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ توریت و اناجیل میں اصل کتابوں کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے ۔ اس لئے فرمایا کہ وہ کتابیں اب حق کے ساتھ فیصلہ نہیں کر سکتیں کیونکہ حق ان میں بہت کم رہ گیا اور اب ان کو کامل کتاب اللہ قرآن کی طرف بلایا جاتا ہے ۔ اور فیصلہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جو مذہبی اختلافات ان کے درمیان ہیں اُن کا فیصلہ کرے کیونکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے اور آج یہ ثابت شدہ دعویٰ ہے کہ تمام اختلافات مذہبی کا یہ فیصلہ کرتا ہے ۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ (النحل ۹: ۶۴) یعنی ہم نے قرآن کو اسی غرض سے اُتارا ہے کہ جو اصولی اختلافات مذاہب میں پڑ گئے ہیں ان کا یہ فیصلہ کر دے ۔

قرآن کریم تمام اختلافات مذہبی کا فیصلہ کرتا ہے

عزّ

۳۹۵ غرّ ۔ غرّہٗ کے معنی ہیں اسے دھوکہ دیا اور باطل کے ساتھ اس کو طمع دی (ل) نیز دیکھو ۵۸۲؎

فری

افراء ۔ افتراء

یفترون ۔ فری سے ہے جس کے اصل معنی قطع یا شق کرنے کے ہیں مفردات میں ہے کہ فری ایسے قطع کرنے کو کہتے ہیں جو اصلاح کے لئے ہو اور اِفْرَاء وہ جو افساد کے لئے ہو اور اِفْتِرَاء دونوں میں آتا ہے اور زیادہ کذب یعنی جھوٹ کو کہتے ہیں جیسے اِفْتَرٰی یعنی اِخْتَلَقَ ہے یعنی جھوٹ بنایا ۔

دوزخ سے بریت کا دعویٰ

یہی مضمون البقرہ ۸۰ میں ہے مگر یہاں مزید وضاحت موجود ہے کہ عیسائی بھی شامل ہیں کیونکہ یہاں دین کے بارہ میں کسی افترا کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ سب سے بڑا افترا دین کے بارہ میں جو کیا گیا اس کی مرتکب عیسائی قوم ہوئی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ رسول اور نبی کو خدا بنا دیا ۔ اس سے اگلی آیت میں جو جواب دیا ہے وہ وقیت

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۖ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ ۲۴

پھر کیا حال ہوگا جب ہم انکو اس دن کیلئے اکٹھا کرینگے جس میں کوئی شک نہیں اور ہر ایک جان کو جو کچھ اس نے کمایا پورا دیا جائیگا اور انپر

لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ ۲۵

ظلم نہ کیا جائیگا ۳۹۷ کہو اے اللہ ملک کے مالک تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک

مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

لے لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسکو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے تیرے ہی ہاتھ میں (سب) بھلائی ہے بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے ۳۹۸

کل نفس ما کسبت وہ بھی عیسائی مذہب کے عقیدۂ کفارہ پر ایک زد ہے۔ کیونکہ کفارہ کی رو سے صرف مسیح کے خون پر ایمان لانے سے ایک شخص نجات پا جاتا ہے مگر اس کے خلاف قرآن کریم یہ اصول سکھاتا ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنے اپنے اعمال کا پورا بدلہ ملے گا +

۳۹۶ فکیف۔ اس دن کے ہول اور عظمت کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہے۔ اور مراد ہے کیف تکون حالہم ان کی حالت کیسی ہوگی +

لیوم سے مراد فی یوم ہے یعنی اس دن یا لجزاء یوم یعنی اس دن کی سزا کے لئے +

عمل اور اس کی جزا میں اتصال

وفیت کل نفس ما کسبت۔ جو کچھ کسی جی نے کام کیا ہے یا کمائی کی ہے وہی اس کو پورا دیا جائیگا۔ یہاں کام کی جزا کے دینے کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ خود اس کمائی کا ذکر کیا جو ہر جان کر رہی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہر ایک عمل کسی کمائی کا موجب ہے یعنی اس کا کوئی نتیجہ ساتھ کا ساتھ پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اور یہ وہ کمائی ہے جو ہر جان کر رہی ہے۔ اور یہی نتائج پورے کے پورے قیامت کے دن مل جائینگے۔ روح المعانی میں ہے کہ کمائی کا پورا دیا جانا اس لحاظ سے کہا ہے کہ کسب یعنی کام اور اس کی جزا میں کمال اتصال ہے +

اللّٰھم

۳۹۷ اللّٰھم اصل میں یا اللہ ہے اور یا کی بجائے آخر میں میم مشدد لایا گیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی دعا سے مخصوص ہے بعض کے نزدیک اس کی اصل ترکیب ہے یا اللہ أمنا بخیر اے اللہ ہمارے ساتھ بھلائی کا قصد فرما یا (غ) قرآن کریم میں اللّٰھم جتنے دعائیں آئی ہیں ان میں اللّٰھم کے ساتھ کسی اور صفت الٰہی کا بھی ذکر ہے جیسے یہاں۔ او اللّٰھم فاطر السمٰوٰت (الزمر ۳۹ ع ۴۶) سبحانک اللّٰھم دعوٰنا (۱۰)

مُلک۔ مِلک

الملک۔ مُلک کے معنی ہیں جس شے میں تصرف حاصل ہے حکم کے ساتھ اس کو ضبط میں رکھنا (غ) اور مِلک اس سے بمنزلہ جنس کے ہے یعنی ہر مُلک مِلک ہے مگر ہر مِلک مُلک نہیں۔ اور لسان العرب میں ملک اور ملکوت کے جب اللہ کی طرف

ملکوت

مضاف ہوں ایک ہی معنی دیئے ہیں سلطانہ وعظمتہ یعنی اللہ تعالیٰ کا تسلط اور اس کی عظمت۔ مجاہد نے یہاں صرف نبوت معنی لئے ہیں اور قتادہ نے حکومت اور بادشاہت (ج) اور حق یہ ہے کہ دونوں شامل ہیں +

نزع

تنزع۔ نَزَعَ کے معنی ہیں ایک چیز کو اس کی جائے قرار سے کھینچ لیا اور اس کا استعمال اعراض پر بھی ہوتا ہے مثلاً محبت اور عداوت کے نکال دینے پر و نزعنا ما فی صدورھم من غل (الحجر ۱۵ ع ۴) اور اسی سے تَنَازُع اور مُنَازَعَت ہے ایک دوسرے کو کھینچنا جس سے مراد باہم جھگڑا ہے (غ) +

تنازع

خدا کی بادشاہت

یہاں مسلمانوں کو بتایا ہے کہ دنیا اور آخرت کی بادشاہت سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنی مشیت سے جس کو

۲۶ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ

تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے۔ اور

تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور تو جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے ۳۹۸

چاہتا ہے بادشاہت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ اور ان تغیرات پر تاریخ عالم شاہد ہے مگر یہاں لفظ مُلک میں جس کے حقیقی معنی سلطان و عظمت ہیں۔ نبوت اور بادشاہت دونوں شامل ہیں۔ اور خاص لفظ ملک کو اختیار کرنے میں یہ حکمت ہے کہ تا یہ معلوم ہو جائے کہ یہ وہی خدا کی بادشاہت ہے جس کی انتظار چلی آتی تھی۔ اور جس کے قرب کی خوشخبری حضرت مسیح علیہ السلام نے دی تھی۔ اور جس کے جلد آنے کے لئے اپنے پیرووں کو روزانہ دعا میں یہ سکھایا تھا کہ "تیری بادشاہت آوے" (متی ۶: ۱۰) سلسلہ بنی اسرائیل میں بھی یہ خدا کی بادشاہت موجود تھی مگر اس کا اپنے کمال کو پہنچنا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے مقدر تھا۔ اس لئے خدا کی بادشاہت کا لفظ بالخصوص اسی پر بولا گیا ہے۔ اور ان الفاظ میں یہ خوشخبری مسلمانوں کو سنائی اور دوسرے یہود و نصاریٰ کو توجہ دلائی کہ خدا کی بادشاہت اب بنی اسرائیل سے نکل کر دوسری قوم کے پاس جانے والی ہے۔ اور یہ اس وعدہ کے مطابق تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کیا تھا۔ اور جس کی خبر تمام نبیوں کے ذریعہ سے دی گئی تھی۔ چنانچہ سلسلہ موسوی کے آخری نبی حضرت مسیح علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ "جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائیگی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دیدی جائیگی" (متی ۲۱: ۴۲ و ۴۳) یہ وہی خدا کی بادشاہت تھی جو اب اللہ تعالےٰ کے قدیم وعدے کے مطابق محمد رسول اللہ صلعم کو دی گئی تھی +

لفظ عزت میں حکومت کی خوشخبری

یہاں علاوہ مُلک کے عزت دینے کا ذکر بھی فرمایا ہے جس سے صاف مطلب یہ ہے کہ وہ مغلوب اور محکوم نہیں رہینگے اور یہ پیشگوئی ملک و حکومت دینے کی اور مسلمانوں کو دنیا میں ایک معزز قوم بنانے کی اس وقت کی جاتی ہے جب ابھی عرب کے اندر مسلمان چاروں طرف کفار میں گھرے ہوئے تھے۔ اور کفار کا ہی غلبہ تھا۔ اور یہودی اور عیسائی اور مشرک سب اس بات پر اتفاق کر چکے تھے کہ اس چھوٹے سے گروہ کو نابود کر دیں پس یہ مسلمانوں کے لئے بطور تسلی نازل ہوئی اور نہ صرف اس حالت میں ان کی تسلی کے لئے تھی بلکہ آیندہ بھی یہ ہمیشہ ان کے لئے جب کبھی اسلام اسی قسم کی مشکلات میں مبتلا ہو موجب تسلی رہے گی +

ولج - ایلاج

۳۹۸ تولج۔ وُلُوج تنگ جگہ میں داخل ہونے کو کہتے ہیں (غ) حتی یلج الجمل فی سم الخیاط (الاعراف ۷: ۴۰) اور ایلاج اس طرح پر داخل کرنا۔ یہاں تاریکی کے روشنی میں اور روشنی کے تاریکی میں داخل کرنے پر یہ لفظ بولا ہے +

مردہ اور زندہ سے مراد

عموماً مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ کے نکالنے سے مراد نطفہ سے جاندار کا اور جاندار سے نطفہ کا پیدا کرنا مراد لیا گیا ہے مگر یہاں مراد یہ نہیں جس کو پہلی آیت میں بادشاہت کا دینا معزز بنانا کہا تھا اسی کو یہاں دن اور زندگی قرار دیا ہے اور جس کو وہاں بادشاہت کا لے لینا اور ذلیل کرنا فرمایا تھا اسے یہاں رات اور مردگی سے تعبیر کیا ہے۔ قوموں کی زندگی اور مردگی عزت اور ذلت یہی چیز ہے۔ انقلابات زمانہ کی طرف توجہ دلائی ہے مسلمان بھی غور کریں اور جو آج برسر حکومت ہیں وہ بھی +

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ۲۷

مومن مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں ۳۹۹ اور جو ایسا کرے

دُون

۳۹۹ دون ۔ یقال للقاصر عن الشیء دون یعنی کسی چیز سے پیچھے رہنے والے کے متعلق دُون کہا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک وہ دُنُوّ سے مقلوب ہے (غ) پس من دُون المومنین کے معنی ہوئے مومنوں کو چھوڑ کر یا مومنوں سے پیچھے رہتے ہوئے یا ان کے معاملہ میں کوتاہی کرتے ہوئے ۔

موالات کفار

ان الفاظ کے معنی نہایت صاف ہیں مگر قرآن کریم کے پرحکمت کلام کو مدنظر رکھنے سے بڑی بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔ یہاں مومنوں کو کفار کی جس ولایت سے روکا ہے اس کے ساتھ من دون المومنین کے لفظ بڑھائے ہیں تو گویا یوں فرمایا کہ مومنوں کو نہیں چاہئے کہ مومنوں کو چھوڑ کر یا مومنوں کے معاملہ میں پیچھے رہتے ہوئے یعنی ان کے فوائد کو نقصان پہنچاتے ہوئے کفار کی ولایت اختیار کریں۔ ولی اور ولایۃ کے معنی کے لئے دیکھو ۳۳۲ جہاں دکھایا گیا ہے کہ اس کے معنی میں قرب و محبت کے تعلقات کے ساتھ نصرت بھی شامل ہے۔ پس یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ شدید تعلق قرب و محبت و نصرت جو مومنوں کو باہم ہوتا ہے کفار کے ساتھ وہ نہیں ہو سکتا۔ گویا یہاں یہ فرمایا ہے کہ کفار کے ساتھ بھی تم کو معاہدات نصرت وغیرہ کرنے ہونگے مگر ایسا نہ ہو کہ کفار کے ساتھ تمہارے تعلقات نصرت ایسے ہوں جیسے مومنوں کے ساتھ یا ایسے جن سے مومنوں کو ہی نقصان پہنچے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفار کے ساتھ تعلق یا معاہدہ نصرت ہو سکتا ہے مگر ایسا کوئی معاہدہ جائز نہیں جس میں مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک عظیم الشان سلسلہ اخوت کل اقوام عالم میں قایم کرتا ہے اور تمام قومی اور ملکی تفرقوں کو مٹاتا ہے۔ خدائے عالم الغیب جانتا تھا کہ مسلمان مختلف ملکوں میں رہینگے ان کے تعلقات مختلف قوموں سے ہونگے اور غیر مسلم اقوام سے بھی تعلقات اور معاہدات نصرت ہونگے پس شرط یہ لگا دی کہ کسی دوسری قوم کے ساتھ ایسا تعلق یا معاہدہ نصرت کا نہ ہو جس کی غرض اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو نقصان پہنچانا ہو کیونکہ اس کے بغیر اسلام کی اخوتِ عالمگیر کا سلسلہ قایم ہی نہ ہو سکتا تھا پس جب مسلمانوں کو حکومت اور بادشاہت کی خوشخبری سنائی تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اصولِ اخوتِ اسلامی کو کسی حالت میں نہ بھولیں اور کفار کے ساتھ ملکر اپنے ہی بھائیوں کو تباہ نہ کریں۔ اخوت اسلامی کا تعلق تمام تعلقات پر مقدم ہے اور اس کا ذکر بالخصوص ایسے موقعہ پر کرنا جہاں عیسائی مذہب کا ذکر ہو رہا ہے یہ بھی اس کلام کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت ہے گویا بتا دیا کہ عیسائی قوموں کے ساتھ بالخصوص تمہیں یہ معاملہ پیش آنے والا ہے کہ وہ تم سے ایک دوسرے کے خلافِ فوائد معاہدے کر کے تمہاری ہی بیخکنی کے درپے ہونگے اور تمہیں نقصان پہنچائینگے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی سلطنت شوکت عظمت کو نقصان پہنچنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہوئی ہے کہ وہ غیر قوموں کے ساتھ ملکر اپنے بھائیوں کو نقصان پہنچاتے رہے ہیں۔ اور غیر قوموں بالخصوص عیسائی اقوام نے ہمیشہ اس ہتھیار کو استعمال کر کے مسلمانوں کی قوت و شوکت کو توڑا ہے اسی لئے خدا کے پرحکمت کلام میں تؤتی الملک کے ساتھ تنزع الملک کا بھی ذکر ہے کہ کیا اب بھی مسلمان سمجھیں گے؟ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ کفار کے ساتھ تعلقات نصرت وغیرہ ہو سکتے ہیں تو یہ خود نبی کریم صلعم اور صحابہ کے نمونہ سے ظاہر ہے حبش میں جو مسلمان ہجرت کر کے گئے تھے وہ حبش کے عیسائیوں کی حمایت میں ان کے دشمنوں کے خلاف لڑے نبی کریم صلعم نے کئی مشرک قبائل سے معاہدات کئے اور یہودیوں سے بھی معاہدات کئے جن میں دشمنان اسلام کے مقابلہ میں ان قبائل نے یا غیر جانبدار رہنا منظور کیا اور یا مسلمانوں کو امداد دینا منظور کیا اس شرط پر کہ ان پر حملہ کے وقت مسلمان ان کی امداد کریں جنگ حنین میں مشرکین مسلمانوں کی فوج میں موجود تھے۔ صحابہ کے وقت میں ایران کی جنگوں میں عیسائی فوج مسلمان فوج کے پہلو بہ پہلو لڑی

فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ

تو اس کا اللہ کے ساتھ کچھ بھی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ تم ان سے کسی طرح اپنا بچاؤ کر لو[۴۰۱]

اصل بات یہ ہے کہ اسلام سب غیر مسلموں کے ساتھ یکساں سلوک کا حکم نہیں دیتا۔ اور ترک موالات بھی مدارج رکھتی ہے۔ اس کی اصولی بحث سورۃ ممتحنہ میں آئے گی +

لیس من اللہ فی شئ

۴۰۱ لیس من اللہ فی شئ۔ من اللہ قایم مقام من ولایۃ اللہ ہے۔ اور فی شئ میں تنوین تحقیر کے لئے ہے یعنی اللہ کی ولایت سے وہ کسی چیز میں نہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کو اللہ کی کچھ ولایت حاصل نہیں۔ یا اللہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں +

تتقوا

تتقوا منہم تقاۃ۔ وقایۃ کے معنی بیان ہو چکے ہیں ایذا اور ضرر کی باتوں سے اپنے آپ کو بچانا ۵۔ اور یہی معنی تقوٰے کے ہیں جعل النفس فی وقایۃ مما یخاف (غ) جس سے خوف ہو اس سے اپنی حفاظت کریں اور اسی معنی کے لحاظ سے یہاں تتقوا کا صلہ من آیا ہے یعنی ان کی طرف سے کسی نقصان کا خوف ہو تو اس سے تم اپنا بچاؤ کر لو۔

تقاۃ

تقاۃ بھی اسی سے ہے یہ اصل میں وُقَیَۃ تھا و تا سے بدل گئی اور یا متحرک نے الف کی صورت اختیار کر لی۔ پس تقاۃ کے معنی بچاؤ ہوئے اور نکرہ لانے میں یہ بتانا مقصود ہے کہ کسی طرح کا بچاؤ کریں +

مسئلہ تقیہ

مفسرین نے یہاں تتقوا کے معنی تخافوا لئے ہیں اور معنی یوں کئے ہیں کہ کافروں کو کسی صورت میں دوست نہ بناؤ سوائے اس کے کہ ان سے تم کو خوف ہو اس چیز کا جس کا خوف واجب ہے۔ یا کچھ خوف ہو گویا اس صورت میں ان سے ظاہر طور پر دوستی کا تعلق کر لو گو دل میں کچھ نہ ہو اور پھر اس سے مسئلہ تقیہ کو اخذ کیا ہو مگر درحقیقت ان الفاظ کو مسئلہ تقیہ سے کچھ تعلق نہیں۔ قرآن کریم میں اکراہ یا جبر کی حالت میں دوسری جگہ یوں فرمایا ہے الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان (النحل ۱۶-۱۰۶) یہ مکی آیت ہے اور مفصل بحث اس پر اپنے موقعہ پر ہوگی مگر اس میں صرف اس قدر اجازت دی ہے کہ اگر قتل وغیرہ کے خوف کے وقت انسان کے منہ سے جان بچانے کے لئے کلمہ کفر نکل جائے تو اللہ معاف کر دے گا مگر ظاہر طور پر دوستی کا رنگ رکھنا حالانکہ دل میں دشمنی ہو یا بات بات پر جھوٹ بول کر پیچھا چھڑانا اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے یہ زندگی کا منافقانہ رنگ ہے جسے اسلام سخت ترین نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے پس اکراہ کی صورت میں اگر کوئی شخص کوئی بات کہدے تو وہ اسے معاف ہے۔ گو یہ اعلیٰ مقام مومن کا نہیں۔

اہل تشیع میں تقیہ

لیکن اہل تشیع نے اس کو بہت وسیع کیا ہے اور ان کے نزدیک بوقت ضرورت ہر قول میں تقیہ جائز ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح جھوٹ پر جرأت ہوتی ہے اور ایک شخص کے کلام سے امن اٹھ جاتا ہے۔ کیونکہ اپنی ضرورت کا فیصلہ کرنے والا وہ خود ہوا دوسرے کو کیا علم ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہے یہ صدق دل سے کہہ رہا ہے یا جھوٹ کہہ رہا ہے اور اس طرح پر منافقت دنیا میں بڑھتی ہے۔ چنانچہ ان کے بعض ائمہ کا ایک یہ بھی قول مشہور ہے کہ من صلی وراء سنی تقیۃ فکانما صلی وراء نبی (د) یعنی جو شخص سنی کے پیچھے تقیہ کر کے نماز پڑھ لے گویا کہ اس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی +

کفار سے موالات کی ایک صورت

الفاظ الا ان تتقوا منہم تقاۃ کے معنی صاف ہیں مگر یہ کہ ان سے بچاؤ کر لو کسی طرح کا بچاؤ کر لینا یعنی پورا پورا بچاؤ کر لو گویا کفار سے یہ موالات کی صورت رکھی ہے کہ اس میں تمہارا اپنا بچاؤ مدنظر ہو یعنی کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لئے اس کو اختیار کر لینا جائز ہے۔ مثلاً جنگ کی صورت میں ہی جب مسلمان مغلوب ہو جائیں تو مجبوراً اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لئے جو صورت اختیار کرنی پڑے کر لیں۔ مگر جو کچھ عہد کریں اس کی پابندی ضروری ہوگی جیسے نبی کریم صلعم نے صلح حدیبیہ میں مغلوب فریق کی شرائط قبول کیں تو پھر ان کا ایفا بھی کیا یہاں تک کہ کفار نے خود اس عہد کو توڑ دیا۔ ایسا ہی جو کفار جنگ نہیں کرتے مگر ویسے اسلام کے نابود کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان سے بھی مسلمانوں کو بچاؤ کی صورت کر لینی جائز ہے مگر یہ بچاؤ اور حفاظت قومی ہے نہ فرداً فرداً +

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِىْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۲۸

اور اللہ تمکو اپنی سزا سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف انجام کار پہنچنا ہے[۴۰۱] کہو اگر جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے چھپا دیا اسے ظاہر کرو اللہ اسے جانتا ہے

وَيَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖۚ ۲۹

اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے[۴۰۲] جسدن ہر شخص جو کچھ اس نے نیکی کی ہے موجود پائیگا اور جو کچھ

وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۛۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًاۢ بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ ؏

اس نے بدی کی ہے آرزو کریگا کہ اسکے اور اسکے درمیان لمبا فاصلہ ہوتا اور اللہ تم کو اپنی سزا سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر مہربان ہے[۴۰۳]

مع عذاب التحزن ۱۱

يحذركم الله نفسه

[۴۰۱] یحذرکم اللہ ۔ حذر کسی خوف والے امر سے بچنا ہے (غ)، اسی سے تحذیر ہے۔ نفسہ سے مراد عقاب نفسہ ہی ہے نفس کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے اس سے مراد ذات ہے۔ سزا کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرنے میں سخت تہدید ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو کفار کا خوف ہے تو اس سے بڑھکر اللہ تعالیٰ کی سزا کا خوف ہونا چاہئے پس ایسا نہ ہو کہ تم اللہ تعالےٰ کے حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے دشمن سے خوف کرتے ہوئے اس کے ساتھ مل جاؤ۔ اور بعض کے نزدیک نفسہ میں نفس کی اضافت اللہ کی طرف ملک کی اضافت ہے۔ اور نفس سے مراد انسانی نفس امارہ ہے (غ) گویا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے نفوس امارہ سے ڈراتا ہے ✦

دشمنان اسلام کی مخفی تدابیر

[۴۰۲] پچھلی آیت میں اعدائے اسلام کا ذکر تھا اور اہل اسلام کو ہدایت کی تھی کہ وہ انہیں اپنا دوست نہ بنائیں اس آیت میں اعدائے اسلام کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ خواہ تم اپنی تدابیر کو جو اسلام کی بیخکنی کے لئے کر رہے ہو اپنے دلوں کے اندر مخفی رکھو اور خواہ ان کو ظاہر کرو یعنی خواہ پوشیدہ طور پر دشمنی کرو یا ظاہر طور پر اللہ تعالیٰ کو سب علم ہے اور وہ کسی تمہاری تدبیر کو کارگر نہ ہونے دیگا بلکہ اس کی سزا تم کو دے گا۔ ہمارے نبی کریم صلعم کا زمانہ تو ایسا تھا کہ اس وقت سب لوگ علی الاعلان ہی دشمن تھے سوائے تھوڑوں کے۔ اس لئے مخفی دشمنی کے ذکر میں اسلام کے آخری زمانہ کے دشمنوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ دوستی کا اظہار کرتے اور ان کی دوستی کا دم بھرتے ہیں مگر ہر وقت ایسی تدابیر کے سوچنے میں مصروف ہیں جن سے اسلام اور مسلمانوں کی بیخکنی ہو سو یہ آیت مسلمانوں کیلئے باعث تسکین ہے کہ ان کا خدا مخفی تدابیر کا بھی وہی حشر کرے گا جو کھلی تدابیر کا کیا تھا۔ اس سورۃ کے صدر کا اصل مضمون اسی نتیجہ کا موید ہے ✦

[۴۰۳] و ما عملت من سوء۔ مراد تو یہی ہے کہ جو کچھ بدی کی ہے اسے بھی موجود پائیگا لیکن محضرا کے لفظ کو خیر کے ساتھ رکھا ہے۔ کہ اصل غرض وہی ہے۔ اور بدی کی سزا بتقاضائے ضرورت ہے۔ اور نیز ما عملت من سوء کو اس لئے بھی علیحدہ رکھا گیا ہے کہ اس کے متعلق کسی تمنی کا ذکر اگلے الفاظ میں آتا ہے ✦

بینہا۔ میں ضمیر بعض نے یوم کی طرف لی ہے یعنی اس جزا و سزا کے دن میں اور اس میں زمانہ دراز ہوتا مگر چونکہ جو نیک اعمال کی جزا پاتا ہے وہ یہ خواہش نہیں کرسکتا۔ اس لئے ما عملت کی طرف ہی اس کی ضمیر پھیرنا صحیح ہے ✦

امد ۔ ابد

امد ۔ اَمَد اور اَبَد کے معنی قریب قریب ہیں لیکن ابد اس زمانہ کو کہا جاتا ہے جس کے لئے کوئی حد محدود نہیں اور امد اس کو جب مطلق ہو تو اس کی حد مجہول ہوتی ہے۔ اور زمان میں اور اَمَد میں یہ فرق ہے کہ اَمَد بلحاظ غایت بولا جاتا ہے (غ) ✦

اس آیت میں اسلام کے چھپے اور کھلے دونوں قسم کے دشمنوں کو یہ بتایا ہے کہ بدی کرنے والا انسان آخر اپنی بدی پر ضرور پچھتاتا ہے

ع ۱۱/۱۴

۳۰ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ

سلسلہ موسویہ کے آخری برگزیدہ انسان

کہو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کریگا اور تمہارے لئے تمہارے قصوروں کی حفاظت کریگا اور اللہ

۳۱ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝

حفاظت کرنیوالا رحم کرنیوالا ہے۔ کہو اللہ اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ پھر جائیں تو اللہ انکار کرنیوالوں سے محبت نہیں کرتا۔

اور ایک وقت آتا ہے جب وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش اس نے وہ بُرا کام نہ کیا ہوتا۔ اس میں فطرت انسانی کی شہادت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ پیشگوئی بھی کی ہے کہ جو لوگ اسلام کے ساتھ بدی کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آخر کار پچھتائیں گے۔ اس میں یہ بشارت بھی ہے کہ وہ انجام کار مسلمان بھی ہونگے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ اس یوم مذکور کو دنیا کا یوم سمجھا جائے اور کوئی شبہ نہیں کہ اس زندگی میں بھی انسان پر ایک وقت آتا ہے جب وہ اپنی بدیوں پر افسوس کرتا ہے۔ لیکن اگر اس یوم کو یوم قیامت لیا جائے تو آخرت کی جزا و سزا مراد ہوگی۔ اور یہ محض وعید ہوگا۔ بدی اور نیکی کے نتائج پانے کے اس قانون میں ابطال کفارہ بھی کیا ہے +

کفار کے ذکر میں مسلمانوں کو ہدایات

یہ قرآن کریم کا کمال ہے کہ ان تمام آیات میں جن میں کسی خاص قوم سے خطاب ہے ایک طرف اگر ان پر اتمام حجت کرتا چلا جاتا اور لطیف سے لطیف امور کی طرف ان کو توجہ دلاتا ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کو بھی کامل ہدایات دیتا چلا جاتا ہے۔ ان آیات میں جیسا کہ بیان ہو چکا خاص خطاب عیسائیوں سے ہے اور اس لئے ان کو بتایا ہے کہ تم خدا کے محب اور محبوب ہونے کے بڑے دعویدار ہو اور اس بات کے مدعی ہو کہ تمہارا مذہب خدا سے محبت سکھاتا ہے۔ مگر خود مسیح جس کی پیروی سے تم خدا کی محبت کے مقام تک پہنچ سکتے تھے تم کو ہدایت دے گیا ہے کہ تمہاری خدا سے محبت اسی صورت میں قایم رہ سکتی ہے کہ میرے پیچھے آنے والے کو مانو اور اس کی اتباع کرو۔ اور یوں یہاں مسیح کے ان الفاظ کی طرف اشارہ ہے جو یوحنا ۱۴: ۱۵ و ۱۶ میں مذکور ہیں "اگر تم مجھ سے پیار کرتے ہو

دوسرا مسیح

تو میرے حکموں پر عمل کرو اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا اور وہ تمہیں دوسرا تسلی دینے والا بخشے گا"۔ جس لفظ کے معنی تسلی دینے والا کئے گئے ہیں اس کے معنی شفیع بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ بائبل کے نئے ترجموں کے حاشیہ پر صاف نوٹ دیا ہوا ہے اب جائے غور ہے کہ یہ دوسرا تسلی دہندہ دوسرا شفیع جو مسیح کے بعد دنیا میں آیا کون ہے۔ عیسائیوں کو حکم تھا کہ جب دوسرا شفیع آجائے تو اس کی اتباع کریں۔ اور اسی بات پر قرآن کریم یہاں ان کو ملزم کرتا ہے +

محبوب الٰہی بننے کیلئے آنحضرت کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے

دوسری طرف مسلمانوں کو بھی بتاتا ہے کہ وہ نرے زبانی دعووں سے یا اپنے تجویز کردہ طریقوں سے خدا کے محبوب نہیں بن سکتے بلکہ ضروری ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کے نقش قدم پر چلیں۔ اس بات کو بیان کرنے کی ضرورت اس لئے تھی کہ اس رکوع میں ذکر یہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن قوموں کو پہلے چنا کس طرح وہ آخر رضائے الٰہی کی راہ سے دور پڑ گئیں۔ اس لئے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ رضائے الٰہی کے مقدم کرنے کو کبھی نہ چھوڑیں۔ اور نہ دنیا کی مرغوبات میں حد سے زیادہ منہمک ہوں تاکہ ان کا حشر دوسری قوموں کی طرح نہ ہو +

کفارہ گناہ سے نہیں چھڑا سکتا

الفاظ یغفر لکم ذنوبکم میں اس طرف بھی اشارہ ہے۔ کہ گناہوں سے حفاظت کفارہ پر ایمان سے نہیں ہوتی بلکہ ان راہوں پر چلنے سے ہوتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والی ہیں اور جن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل طور پر دنیا پر ظاہر کیا جیسا کہ خود مسیح نے بھی کہا تھا "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا"۔ پس جب تمام سچائی کی راہیں دکھانے والا ابھی آنا تھا تو کفارہ گناہ سے کیونکر چھڑا سکتا ہے +

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ۳۲

یقیناً اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو قوموں پر چن لیا ہے ۴۰۵

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ ۳۳

(یہ) ایک دوسرے کی نسل سے (تھے) اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۴۰۶

نوح

۴۰۵ نوح عربی میں ناح کے معنی ہیں نوحہ کیا۔ رویا۔ اور اس کا مصدر نوح ہے حضرت نوح ایک عظیم الشان نبی گزرے ہیں جن کی پیدائش بائبل والوں نے کوئی تین ہزار سال قبل مسیح بیان کی ہے مگر نئے مفسرین بائبل اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم سے قبل کے واقعات کے متعلق کوئی صحیح تاریخی اندازہ موجود نہیں قرآن کریم سے ایسا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم کے بعد ایک عظیم الشان نبی حضرت نوح ہوتے ہیں جن سے ایک نئے سلسلہ کی بنیاد پڑی لیکن موجودہ نسل انسانی کا حضرت نوح کی اولاد سے ہونا قرآن شریف سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

عمران

عمران۔ یہ امر تاریخی طور پر ثابت ہے۔ کہ حضرت موسیٰ کے والد کا نام عمران تھا۔ اور اس لئے موسیٰ اور ہارون سے جو سلسلہ نبوت شروع ہوا وہ آل عمران کے اندر داخل ہوگا۔ گویا آل عمران سلسلہ موسویہ کے قائم مقام ہے۔ مقاتل نے یہاں عمران سے مراد حضرت موسیٰ کے والد کو ہی لیا ہے۔ بہت سے مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ حضرت مریم کے والد کا نام بھی عمران تھا مگر اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ گو اس کے خلاف بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔

حضرت عیسیٰ کے ذکر کی ابتداء

اس آیت سے اس رکوع بلکہ اس سورۃ کا اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو صاف کرکے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کو ظاہر کرنا ہے اس قصہ کو شروع کرنے کیلئے ابتداء یوں کی ہے کہ عیسیٰ خدا کا ایک ہی برگزیدہ بندہ نہیں بلکہ جب سے نسل انسانی کی ابتدا ہوئی اسی وقت سے اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو برگزیدہ کرتا رہا ہے۔ حضرت آدم ان کے بعد ان کی نسل سے حضرت نوح جنہوں نے ایک نئے سلسلہ کی بنیاد رکھی پھر آل ابراہیم اور آل عمران جو آل ابراہیم کی ایک شاخ ہے اور اس آل عمران یعنی سلسلہ موسویہ کے بہت سے انبیاء میں آخری حضرت عیسیٰ ہیں۔ آل ابراہیم کے بعد آل عمران کا ذکر کرکے یہ اشارہ کیا ہے کہ آل ابراہیم کا دوسرا عظیم الشان سلسلہ سلسلہ محمدیہ ہے جیسا کہ بالتفصیل آگے آئے گا۔

آدم اول اور آدم آخر

آدم سے شروع کرنے میں اور پھر قومی نبیوں کا ذکر کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح آدم اول کا پیغام بتقاضائے ضرورت تمام نبیوں سے ایک الگ رنگ رکھتا تھا اسی طرح آدم آخر یعنی محمد رسول اللہ صلعم کا پیغام بھی بتقاضائے ضرورت تمام نبیوں سے الگ رنگ کا ہونا ضروری تھا اور جس طرح پہلے آدم کا پیغام اس کی ساری ذریت کی طرف تھا گو وہ محدود ہو۔ کیونکہ یہ موجودہ نسل انسانی کی ابتدا تھی۔ اور حضرت آدم اپنی ہی ذریت کیطرف مبعوث ہوئے اسی طرح آدم آخر کا پیغام ساری نسل آدم یعنی نسل انسانی کی طرف ہوا۔ گو وہ اسی وجہ سے سب سے زیادہ وسیع ہوگیا۔ کیونکہ آدم آخر کے وقت نسل انسانی تمام روئے زمین پر پھیل چکی تھی۔ آدم اور حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام تمام نسل انسانی کی طرف تھا۔ اور درمیان میں جس قدر نبی ہوئے اُن کا پیغام ایک ایک قوم کی طرف تھا۔

برگزیدگی بالخصوص اپنے زمانہ میں ہے

تمام جہانوں پر چن لینے سے یہ مراد ہے کہ اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں یا قوموں پر ان کو چنا۔ کل دنیا لازمی طور پر مراد نہیں کیونکہ کل دنیا پر اصطفا کے لئے صرف ایک کا ذکر چاہیئے تھا۔ بہتوں کا ذکر بتاتا ہے کہ اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں پر ہی اصطفا مراد ہے۔

۴۰۶ ذریۃ۔ یہ بدل ہے۔ آل ابراہیم اور آل عمران سے یا حال ہے۔ اس لئے منصوب ہے۔

بعضها من بعض۔ مراد ایک دوسرے کی نسل سے ہونا ہے یعنی آل عمران آل ابراہیم کی نسل سے ہے۔ یا آل ابراہیم نوح کی نسل سے ہے۔

۳۴ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ

جب عمران کی ایک عورت نے کہا^۴۰۷^ میرے رب جو کچھ میرے پیٹ میں ہے میں نے آزاد کر کے تیری نذر

اور بعض کے نزدیک بعضہا من بعض سے اشارہ اتحاد نسل کی طرف نہیں بلکہ ایک اور قسم کی یگانگت کیطرف ہے جو دین سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے +

اللہ تعالیٰ کی صفات سمیع وعلیم کے آخر لانے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی دعاؤں کو سُنتا اور پھر جانتا ہے کہ کون شخص کس بلند مقام پر کھڑا کیا جانے کے لایق ہے +

امرأة عمران

۴۰۷ امرأۃ عمران - امرأۃ عمران کے معنی دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں. عمران کی بی بی (اس صورت میں عمران مریم کے والد کا نام ہوا اور بزرگوں کے ناموں پر نام رکھنا یہ ایک عام رواج تھا) یا آل عمران کی عورت چونکہ اوپر آل عمران کی برگزیدگی کا ذکر تھا اور اسی کے متعلق مضمون چلتا ہے اس لئے اس دوسرے معنی کو ترجیح ہے. اور عمران کا آل عمران کی جگہ رکھا جانا عام محاورہ کے مطابق ہے چنانچہ بائبل میں بھی ایک بڑے مورث کے نام سے ایک قوم کو پکارا گیا ہے. جیسا بنی اسرائیل کی جگہ بہت دفعہ صرف اسرائیل ہی آیا ہے. اور بنی اسمٰعیل کو قیدار کے نام سے پکارا ہے. جو عربوں کے مورث اعلیٰ تھے پس اس لحاظ سے قرین قیاس یہی ہے کہ عمران سے مراد سلسلہ آل عمران ہے. اور یہاں ذکر انہی میں سے ایک عورت کا ہے. اور چونکہ اوپر آل عمران کے اصطفا کا ذکر ہے جو عام ہے یہاں اُن میں کی ایک خاص عورت کا ذکر فرمایا جس کے ذریعہ آل عمران کے آخری برگزیدہ انسان کا ظہور ہونا تھا. ایک دوسری مثال جو اسی ذکر کے اندر آئے گی وہ بھی آل عمران کی آخری یادگاروں یعنی زکریا اور یحییٰ علیہما السلام کے متعلق ہے یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ مریم کو اُخت ھارون (مریم ۱۹-۲۸) اور ابنت عمران (التحریم ۶۶-۱۲) کر کے پکارا گیا ہے اور گو بعض مفسرین نے ان دونوں ناموں عمران اور ہارون کی یہ توجیہ کی ہے کہ عمران حضرت مریم کے والد کا نام تھا. اور ہارون آپ کے ایک بھائی کا نام تھا. اور اس کے خلاف شہادت نہ ہونے کی وجہ سے یہ بات بھی قابل قبول ہے. لیکن چونکہ اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں. اور جس عمران کا اوپر ذکر کیا اس سے صاف طور پر مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ہیں. اور ہارون جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ بھی اسی عمران کے بیٹے ہیں. اس لئے اقرب الی الفہم یہی بات ہے کہ امرأۃ عمران اور اخت ھارون دونوں لفظوں میں انہیں اعلیٰ موروثوں کی طرف اشارہ ہے. اس میں شک نہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کا کوئی نسب نامہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے. مگر بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ مریم کے والدین کا تعلق بنی اسرائیل میں خاندان کہانت سے تھا. اور اسی خاندان سے حضرت زکریا کا بھی تعلق تھا. اور مریم کا ہیکل کی خدمت کے لئے مخصوص کیا جانا بھی اسی بات کو ظاہر کرتا ہے. اور چونکہ کہانت کا تعلق حضرت ہارون کے خاندان سے تھا. اس لئے مریم کو اخت ہارون اور اس کی والدہ کو امرأۃ عمران کے نام سے پکارا ہے عربی زبان میں لفظ اب - ام - اخ - اخت سب کے سب وسیع معنی میں استعمال ہوئے ہیں نبی کریم صلعم فرماتے ہیں انا دعوۃ ابی ابراھیم میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں. یہاں ابراہیم کو صاف طور پر اپنا اب کہا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت صفیہؓ نے شکایت کی کہ مجھے یہودی عورت کہا جاتا ہے تو آپ نے فرمایا تو نے جواب میں یوں کیوں نہیں کہا. ان ابی ھارون وعمی موسیٰ وزوجی محمد میرا باپ ہارون ہے. اور میرا چچا موسیٰ ہے. اور میرا خاوند محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں. یہاں صفیہ کا باپ اور چچا ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کو قرار دیا ہے اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ ایک ہی جملہ میں زوج تو اپنے حقیقی معنوں پر ہے اور اب اور عم دور کے تعلق والوں پر بولے ہیں. پس کوئی وجہ نہیں کہ عمران اور ہارون کے لفظوں سے وہی عمران اور ہارون مراد نہ لئے جائیں اور امرأۃ اور اُخت کے وسیع معنی نہ لئے جائیں +

مریم کو اُخت ہارون اور بنت عمران کہنے کی وجہ

۳۵ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ

مانا ہو پس مجھ سے قبول فرما۔ کیونکہ تو سننے والا جاننے والا ہے ۴۰۸ پھر جب اس کو جنا کہا میرے رب

اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰیؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰیۚ

میں نے یہ لڑکی جنی ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے جو اس نے جنا اور لڑکا اس لڑکی کی طرح نہیں ۴۰۹

محرر۔ حُرّ

۴۰۸ محررا تحریر کے معنی انسان کا حُر کر دینا (ع)۔ اور مفردات میں ہے کہ انسان حُر دو طرح پر ہوتا ہے ایک وہ جس پر کسی شے کا حکم جاری نہ ہو جیسے الحر بالحر یعنی جسمانی طور پر آزاد۔ اور دوسرا اخلاقی طور پر آزاد من لم تتملکہ الصفات الذمیمۃ من الحرص و الشرہ علی المقتنیات الدنیویۃ (غ)۔ یعنی وہ شخص جس پر بری صفات حکمران نہیں جیسے دنیوی مال و دولت پر حرص اور لالچ۔ راغب کے نزدیک محررا سے مراد اسی قسم کی صفات ذمیمہ سے آزادی ہے جیسا کہ اس کے مقابل پر کسی شخص کو عبد الدرھم کہہ دیتے ہیں یا عبد الشہوۃ کہہ دیتے ہیں اور بعض کے نزدیک محرر سے مراد صرف اس قدر ہے کہ وہ اس سے دنیوی نفع نہ اٹھائے گی۔ بلکہ اس کو عبادت الٰہی کے لئے مخصوص کیا جائیگا اس لئے شعبی نے اس کے معنی مُخلَص کئے ہیں۔ مجاہد نے خادما للبیعۃ کئے ہیں یعنی عبادتگاہ کی خادم۔ اور بعض نے امر دنیا سے آزاد اس کے معنی کئے ہیں (ع)۔ بظاہر ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے یعنی اس کو خدمت دین کے لئے وقف کر دیا جائے گا +

اولاد کو خدمت دین کے لئے وقف کرنا

گزشتہ قصے تو سب مسلمانوں کی عبرت کیلئے بیان ہوئے ہیں اس بیان میں یہ اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل کی اس گئی گزری حالت میں ان کے اندر ایسے لوگ ابھی موجود تھے جو محض خدمت دین الٰہی کیلئے اپنی اولاد کو وقف کر دیتے تھے اور درحقیقت کوئی دین قایم نہیں رہ سکتا جبتک کہ اس کے اندر وہ لوگ موجود نہ ہوں جو اپنی زندگیوں کو دین کے لئے وقف کردیں کاش مسلمان آج اس سے سبق حاصل کریں اور ان میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو اپنی اولاد کو خدمت دین کیلئے وقف کردیں اور بچپن سے ان کو خدمت دین کے لئے تیار کریں مگر یہاں تو عربی پڑھانے سے بھی بھاگتے ہیں اس لئے کہ بی۔ اے میں روٹیاں اچھی مل جاتی ہیں۔ رونے کا مقام ہے کہ اس قوم کی نظر اس قدر تنگ ہو جائے جس کے اصول دین میں آخرت پر ایمان تھا۔ مگر مسلمان یاد رکھیں کہ گو وہ ساری دنیا کے بادشاہ بھی بن جائیں مگر دین اسلام کی شوکت وعظمت دنیا میں قایم نہیں ہو سکتی جبتک کہ ان میں وہ لوگ کثرت سے نہ ہوں جو خدا کے دین کے لئے۔ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں +

عورتیں بھی خدمت دین کر سکتی ہیں

۴۰۹ واللہ اعلم بما وضعت جملہ معترضہ ہے جب مریم کی والدہ نے بچہ جنا اور اس بچہ کو اس نے خدمت دین کیلئے وقف کرنے کی نذر مانی ہوئی تھی تو اس نے تعجب سے کہا کہ میں نے تو ایک لڑکی جنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک جملہ میں یہ بتا دیا کہ لڑکی بھی اس خدمت کو ادا کر سکتی ہے جس کیلئے اس نے لڑکے کو وقف کرنا چاہا تھا اللہ تعالیٰ کے علم کے ذکر سے یہ مقصود ہے کہ اس بات پر تعجب نہ کرو کہ یہ خدمت دین کیونکر کرسکے گی۔ اللہ اس کے مقام عظمت سے خوب واقف ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ جو مریم کی والدہ نے نذر مانی ہے اسکو یہ لڑکی بھی پورا کریگی

ولیس الذکر کالانثیٰ۔ یہ دوسرا جملہ معترضہ ہے اور الذکر اور الانثیٰ میں لام عہد کا ہے یعنی وہ لڑکا جسے تو چاہتی تھی اس لڑکی جیسا نہیں وہ تو صرف ایسا لڑکا چاہتی تھی جس کی زندگی خدمت دین کے لئے وقف ہو اور یہ ایک معمولی خواہش تھی کہ اس کے ہاں خادم دین لڑکا ہو۔ اور خادم دین لڑکے بہر حیثیت کے ہو سکتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ایک بہت بلند مرتبہ کی لڑکی عطا فرمائی جسے اس زمانہ کی ساری عورتوں پر بلند مرتبہ دیا جیسے واصطفاک علی نساء العالمین سے ظاہر ہے +

بعض مفسرین نے اسے جملہ معترضہ قرار دینے کے بجائے مریم کی والدہ کا قول قرار دیا ہے اور مراد یہ لی ہے کہ لڑکے لڑکیوں جیسے

وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۝

اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی نسل کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں ع۴۱

نہیں ہوتے یعنی اس جنس کا لیا ہے جو کچھ کام لڑکا کر سکتا ہے وہ لڑکی نہیں کر سکتی +

عوذ۔ اعاذ

ع۴۱ اعیذ عوذ کے معنی ہیں کسی دوسرے کی طرف پناہ چاہنا اور اس کے ساتھ تعلق (غ) پس اعاذ کے معنی ہوئے کسی پناہ میں دیا۔

رجم

رجیم۔ رجم کے اصل معنی الرمی بالرجام ہیں (غ) یعنی کنکروں کے ساتھ مارنا مگر بطور استعارہ یہ لفظ رمی بالظن پر

رجیم

یعنی ظنون کے پھینکنے پر اور توہم پر اور شتم یعنی گالی دینے پر اور طرد یعنی دھتکارنے یا دور کرنے پر بولا جاتا ہے۔ والشیطان الرجیم میں الرجیم کے معنی ہیں بھلائی سے اور ملاء اعلیٰ کے منازل سے دور کیا گیا (غ) +

مریم کا بیاہا جانا او صاحب اولاد ہونا

حضرت مریم کی والدہ کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ مریم کو باوجود ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کرنے کے ان کا یہ منشا نہ تھا کہ وہ کنواری رہے گی بلکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ جوان ہو کر بیاہی جائے گی اور صاحب اولاد ہوگی اس لئے انھوں نے نہ صرف مریم کے لئے دعا کی بلکہ مریم کی اولاد کے لئے بھی۔ رہبانیت یا تارک دنیا ہونے کا طریق عیسائیوں کی ایجاد ہے +

حدیث مس شیطان

اس آیت کی تفسیر میں بخاری میں ہے عن ابی ھریرۃ ان النبی صلعم قال ما من مولود یولد الا والشیطٰن یمسہ حین یولد فیستھل صارخاً من مس الشیطان ایاہ الا مریم وابنھا۔ ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر کہ شیطان اسے چھوتا ہے جب وہ پیدا ہوتا ہے پس وہ شیطان کے اس کو چھونے سے فریاد کرتا ہوا آواز بلند کرتا ہے سوائے مریم اور اس کے بیٹے کے اس کے بعد آتا ہے کہ ابوہریرہ کہا کرتے تھے کہ اگر چاہو تو پڑھو انی اعیذھا بك وذریتھا من الشیطان الرجیم گویا یہ حدیث ان کے نزدیک اسی آیت کی تفسیر ہے +

بحث حدیث مس شیطانی

بظاہر جو کچھ اس حدیث کا منشاء معلوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ تمام بنی آدم کو پیدائش کے وقت شیطان چھوتا ہے سوائے مریم اور اس کے بیٹے کے۔ یہ بوجوہات قطعیۃ الدلالت باطل ہے۔ اول آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ نے جو مریم اور اس کی ذریت کے لئے شیطان سے پناہ مانگی ہے وہ مریم کے پیدا ہونے کے بعد بلکہ اس کا نام بھی رکھنے کے بعد مانگی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نام کبھی بچہ کے فوراً پیدا ہوتے نہیں رکھا جاتا۔ اور حدیث جسے اس کی تفسیر قرار دیا جاتا ہے اس میں یہ ہے کہ ہر بچہ کو پیدا ہوتے ہی شیطان مس کرتا ہے پس یا اس اعاذہ کو اس مس شیطانی سے کوئی تعلق نہیں جس کا ذکر حدیث میں ہے ورنہ جب مس شیطانی کا وقت ہی گزر چکا تو پھر دعا کرنے کا کیا فائدہ تھا اور یا حدیث اس آیت کی تفسیر نہیں بلکہ حدیث کا ظاہری مفہوم آیت کے خلاف ہے دوم اگر بچہ کا پیدا ہوتے ہی رونا مس شیطانی کا نتیجہ ہوتا ہے تو پانچ منٹ بعد رونا کس بات کا نتیجہ ہے۔ یا کیا حضرت مریم اور حضرت مسیح بچپن میں کبھی روئے ہی نہیں۔ اور اگر بچپن میں کبھی نہ روئے تھے تو بڑے ہو کر کیوں روتے تھے۔ حضرت مسیح کے متعلق تو صاف لکھا ہے کہ وہ رو رو کر دعائیں کرتا تھا اور حضرت مریم کا دردزہ کے وقت یلیتنی مت قبل ھذا کہنا بتاتا ہے کہ اس وقت وہ بھی روئی ہونگی۔ جن وجوہات سے تمام بچے بعد میں روتے ہیں انہی میں سے کسی وجہ سے پیدا ہوتے ہی روتے ہیں اور حضرت مریم اور ان کا بیٹا بچپن کے ایام میں اسی طرح روتے تھے جس طرح دوسرے بچے روتے ہیں ورنہ وہ بڑے ہو کر کیوں روتے۔

مس شیطان کے دو مفہوم

سوم شیطان کا چھونا دو معنوں میں آتا ہے۔ ایک کسی تکلیف کے پہنچانے کے معنی میں جیسے انی مسنی الشیطان بنصب وعذاب (ص ۳۸-۴۱) اس معنی میں حضرت مسیح کو بھی دکھ پہنچا جب یہودیوں نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور آخر صلیب پر چڑھایا۔ اور دوسرے وسوسہ ڈالنے کے معنی میں جیسے اذا مسھم طائف من الشیطٰن تذکروا (الاعراف ۲۰۱) مگر بچہ کے دل میں پیدائش کے وقت شیطان

بچہ اور وساوس شیطانی

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۳۶

سو اس کے رب نے اسکو اچھی قبولیت سے قبول کیا اور اسکو عمدہ پرورش سے بڑھایا۔

کا وسوسہ ڈالنا بے معنی بات ہے شیطانی وساوس کا تعلق سن تمیز سے ہے جس کو ہوش ہی نہیں اس کے دل میں شیطان کیا وسوسہ ڈالیگا۔ چہارم قرآن شریف اور حدیث صحیح کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر بچہ پیدایش کے وقت معصوم پیدا ہوتا ہے قرآن کریم میں ہے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا (الروم ۳۰-۳۰) یعنی اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو فطرت صحیحہ پر پیدا کیا ہے اور حدیث میں اسی کی تفسیر میں ہے ما من مولود یولد الا علی الفطرۃ کوئی بچہ نہیں مگر صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ بات اصول اسلام میں داخل ہے کہ ہر بچہ معصوم پیدا ہوتا ہے پس وہی مذہب یہ تعلیم نہیں دے سکتا کہ ہر بچہ کو پیدایش کے وقت شیطان چھوجاتا ہے +

ہر بچہ معصوم پیدا ہوتا ہے

سوال ہوگا کہ کیا یہ حدیث صحیح نہیں بلاشبہ اس کے وہ معنی صحیح نہیں جو پادری صاحبان لیتے ہیں کہ اس سے تمام انبیاء کا سوائے مریم اور ابن مریم کے گنہگار ہونا لازم آتا ہے۔ گنہگار ہونے کے بارہ میں تو اس سے زیادہ صریح الفاظ اور موجود ہیں ایک حدیث میں ہے ما من عبد یلقی اللہ الا ذا ذنب الا یحیی بن ذکریا (ث) کوئی بندہ نہیں مگر وہ خدا کو گنہگار ہونے کی حالت میں ملیگا سوائے یحییٰ بن ذکریا کے۔ اور اسی کی روایت حضرت ابوہریرہ سے یوں ہے کل ابن آدم یلقی اللہ بذنب یعذب بہ علیہ ان شاء او یرحمہ الا یحیی بن ذکریا (ث) ان احادیث کی رو سے تو مریم اور ابن مریم دونوں ذا ذنب قرار پاتے ہیں مگر نہیں ایسی احادیث میں صرف ان لوگوں کی پاکیزگی پر زور دینا مقصود ہوتا ہے جن پر جھوٹے الزامات لگائے گئے ہوں۔ اور جس طرح یحییٰ سے مراد صرف حضرت یحییٰ نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو اس زمرۂ صالحین میں داخل ہے جن میں سے یحییٰ ایک ہے مراد ہے اسی طرح مریم اور اسکے بیٹے سے بھی ہر وہ شخص مراد ہے جو مریم صفت ہے اور جو ابن مریم والے زمرۂ صلحا میں داخل ہے۔ اور یحییٰ اور مریم اور ابن مریم یہاں سب بطور مثال ہیں اور ان کے ناموں کا انتخاب اس لئے ہوا کہ ان پر بہت سخت الزام لگائے گئے اور زمرۂ صلحا میں یہی لوگ آنحضرت صلعم سے قریب تر تھے +

احادیث میں یحییٰ کا گنہگار ہونے سے مستثنیٰ ہونا

یحییٰ مریم ابن مریم کا ذکر بطور مثال

اگر حدیث کے الفاظ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ واقعی وہی توجیہ درست ہے جو اوپر کی گئی کیونکہ یحییٰ وغیرہ یہاں صفاتی نام ہیں اور بطور مثال رکھے گئے ہیں اصل میں حدیث میں بچے کے رونے کا ذکر نہیں بلکہ بڑے آدمی کے فریادرسی کے طور پر آواز بلند کرنے کا ذکر ہے اور مدد مانگنے کا ذکر ہے۔ چنانچہ استہلال کے معنی رونا نہیں بلکہ آواز بلند کرنا ہے جس طرح رویت ہلال کے وقت آوازیں بلند کی جاتی ہیں تاکہ لوگوں کو خبر ہو جائے اسی سے اہلال ہے اور صارخ کے معنی بھی رونے والا نہیں بلکہ بالاتفاق صارخ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو مدد کے لئے کسی کے پاس فریاد لے جائے یعنی مستغیث کو دل) اور صرخ فلان کے معنی ہیں استغاث فقال واغوثاہ کہ اس نے فریاد کی اور کہا کوئی میری مدد کے لئے پہنچے اور قرآن کریم میں ہے فلا صریخ لہم (یٰسٓ ۴۳-۳۶) جہاں صریخ کے معنی فریادرس یا مددگار ہیں نہ رونے والا پس مس شیطان کا جو نتیجہ لکھا ہے فیستہل صارخا تو وہ صرف اس قدر ہے کہ وہ شخص جس کو شیطان چھوتا ہے وہ فریاد کرتا ہوا آواز بلند کرتا ہے پس یولد سے مراد یہاں بچہ کا پیدا ہونا نہیں بلکہ انسان کی پیدایش روحانی ہے۔ یا گناہ کا احساس اس کے اندر پیدا ہونا۔ اور اس پیدایش روحانی کو دو قسم پر تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ لوگ جو مریم صفت ہیں اور ان کو شیطان چھوتا بھی نہیں یعنی کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ اور دوسرے وہ لوگ جن کو شیطان چھوتا ہے۔ پھر وہ خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں تو آخر کار شیطان پر غالب آجاتے ہیں۔ اور یہ صرف اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتا بلکہ خود قرآن کریم نے اس کو بتصریح بیان فرمایا ہے وضرب اللہ مثلا للذین اٰمنوا امرأۃ فرعون اذ قالت رب ابن لی عندک بیتا فی الجنۃ ونجنی من فرعون وعملہ ونجنی من القوم الظالمین ۵ ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجہا فنفخنا فیہ من روحنا وصدقت بکلمٰت ربہا وکتبہ وکانت من القانتین (التحریم ۶۶-۱۱، ۱۲) یہاں مومنوں کی مثال دو عورتوں سے دی ہے۔ اول فرعون کی بی بی۔ دوسرے مریم۔ اول کی صفت میں بیان فرمایا کہ ان کے دلوں میں

حدیث مس شیطان کا اصل مفہوم

استہلال

صارخ

صرخ

حدیث میں پیدایش روحانی مراد ہے

وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ

اور اس کو زکریا کی سپردگی میں دیا ۱۴۳ جب کبھی زکریا اس کے پاس عبادتگاہ میں آتے اس کے پاس رزق پاتے ۔ کہا

یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے معلوم ہوا کہ ان لوگوں پر شیطان اپنی وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے مگر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور بار بار تڑپ تڑپ کر اس کی طرف آتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ تو ہم کو فرعون سے نجات دے۔ اسی کے مطابق حدیث میں ہے غیبت اہل صار اخامومن پر جب شیطان حملہ کرتا ہے تو وہ خدا کی طرف فریاد لے جاتا ہے اور خدا سے مدد چاہتا ہے یہ اس کی روحانی پیدایش ہے۔ اور دوسرے کی صفت میں بیان فرمایا کہ وہ مریم صفت ہیں التی احصنت فرجہا۔ فرج کے معنی موقع مخافت ہیں یعنی انہوں نے ان تمام راہوں کو مضبوط کر لیا ہوتا ہے جن سے شیطان حملہ آور ہو سکتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو محفوظیت کے مقام پر پہنچ چکے ہیں جس کو انبیاء میں مقام عصمت کہا جاتا ہے۔ اور حدیث گویا انہی روایتوں کی تفسیر ہے نہ آیت اعیذھا بك کی جس کے ساتھ اس کا کچھ تعلق نہیں پس جس طرح آیت قرآنی میں مریم صفت مومنوں کا ذکر ہے اسی طرح حدیث میں مریم کا نام لیکر مریم صفت مومنوں کا ذکر کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مریم کے ذکر کو مقدم کیا کہ وہی اصل مقصود ہے اور ابنہا یعنی ابن مریم کو پیچھے رکھا ہے کہ وہ بطور نتیجہ ہے۔ کیونکہ جب مومن بھی اس محفوظیت کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو پھر انبیاء بدرجہ اولے اس مقام پر ہیں۔ اگر ابن مریم کی کوئی بڑائی مقصود ہوتی تو حضرت عیسیٰ کا نام پہلے لیا جاتا یہی اصل توجیہ اس حدیث کی ہے جو اس کو قرآن اور حدیث اور واقعات کے مطابق ٹھہراتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اصل اصول مذہب کے قرآن شریف سے لئے جاتے ہیں اور احادیث کو قرآن کریم کے ماتحت کیا جاتا ہے کیونکہ احادیث میں اکثر روایت بالمعنی ہے اور لفظوں میں کمی بیشی ہے پس حین یولد کے لفظ کے معنی اگر ولادت روحانی نہ کئے جائیں تو ان الفاظ کو زائد کہنا پڑے گا جو کسی راوی کی غلطی سے داخل ہو گئے۔

تقبل۔ قبول ۱۴۲ تقبلہا ربہا بقبول حسن تقبل کے معنی کے لئے دیکھو ۱۶۲ تقبل کے بعد قبول کے لانے میں راغب لکھتے ہیں حکمت یہ ہے کہ تقبل میں اقتضائے ثواب ہے اور قبول میں اقتضائے رضائے الٰہی +

نبت۔ نبات انبتہا نباتا۔ نبت اور نبات اصل میں نامیات یعنی بڑھنے والی چیزوں میں سے وہ ہے جو زمین سے اُگتی ہے۔ اور خاص استعمال اس کا ان اشیاء میں ہوتا ہے جن کی ساق یعنی تنہ نہ ہو پھر اس کا استعمال ہر بڑھنے والی شے پر ہوتا ہے خواہ وہ سبزی میں سے ہو یا درخت یا حیوان ہو یا انسان (غ)، انبت کے بعد مصدر انباتا کی بجائے نباتا آیا ہے۔ اور یہ اسی کی جگہ ہے گو بعض نے نباتا کو یہاں حال کہا ہے۔ مگر ابن جریر کہتے ہیں کہ عرب یہ کثرت سے کرتے ہیں کہ مصادر کو اصول افعال پر لاتے ہیں گو لفظ مختلف ہوں مثلاً تکلم فلان کلاماً کہیں گے تکلم فلان تکلماً نہیں اس لحاظ سے تقبل کے بعد قبول اور انبت کے بعد نبات آیا ہے مفردات میں ہے کہ انبت کا لفظ انسانوں پر بولنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی ایک وجہ سے نبات ہی ہیں کیونکہ ان کی ابتداء بھی زمین سے ہی ہوتی ہے۔ گو نبات سے ان میں ایک وصف زائد ہو پس یہاں انبت سے مراد اس کا انماء یعنی بڑھانا ہے +

کفل۔ تکفیل کفل۔ کِفْل یا کَفِیْل وہ حصہ ہے جس میں کفایت ہو اس لئے کفالۃ بمعنی ضمانت ہے اور تکفیل دوسرے کی کفالت میں دیدینا (غ)

زکریا زکریا حضرت یحییٰ کے والد کا نام ہے۔ اور یہ نام قرآن کریم میں زمرۂ انبیاء میں بھی آتا ہے۔ لوقا ۱: ۵ میں زکریا کے متعلق یہ الفاظ ہیں "یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں سے زکریا نام ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی . . . اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانونوں پر بے عیب چلنے والے تھے" (اناجیل میں ایسے صحیح بیانات کہ ہوتے جہاں ایک کاہن اور اس کی بی بی خداوند کے سارے حکموں اور قانونوں پر بے عیب چلنے والے بتلائے جاتے ہیں اس کے پیروؤں کا یہ دعویٰ کہ شریعت پر کوئی شخص نہیں چل سکتا۔ ایک مضحکہ انگیز حرکت ہے) اناجیل میں زکریا کو صرف

يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

اے مریم یہ تجھے کہاں سے ملا اس نے کہا یہ اللہ کی طرف سے ہے بیشک اللہ جسکو چاہتا ہو بے حساب رزق دیتا ہے[۴۱۲]

ذکریا اور زکریا کا ہن بیان کیا گیا ہے۔ البتہ پرانے عہدنامے میں ایک نبی ذکریا کا نام بیان کیا گیا ہے اور اس کی کتاب بھی مجموعہ عہدنامہ قدیم میں موجود ہے پس ممکن ہے کہ جہاں قرآن کریم نے زکریا کو زمرہ انبیاء میں سے فرمایا (الانعام - ۸۶) وہاں اشارہ ذکریاہ کی طرف ہی ہو کیونکہ جہاں زکریا کو انبیاء میں سے گنا ہے وہاں ان کے ہاں یحییٰ کے پیدا ہونے کا کوئی ذکر نہیں اور جہاں زکریا کے ہاں یحییٰ کے پیدا ہونے کا ذکر ہے جو تین جگہ آیا ہے یعنی یہاں۔ اور سورۃ مریم میں اور سورۃ انبیاء میں وہاں زکریا کو نبوت عطا فرمانے کا کوئی ذکر نہیں اور ذکریاہ اور زکریا دونوں ناموں میں اس قدر مشابہت ہے کہ عربی میں آکر ان کا ایک ہی صورت اختیار کر لینا کوئی بعید بات نہیں۔ بلکہ بعض مقامات کے الفاظ قرآنی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں چنانچہ یہ امر کہ مریم قرعہ اندازی سے زکریا کی سپردگی میں آئیں۔ اگر وہ نبی ہوتے تو کاہن پر تو بہی ان کا حق فائق ہوتا۔ یا ذکریا کا یحییٰ کے متعلق دعا کرتے ہوئے یہ کہنا یرثنی ویرث من اٰل یعقوب (مریم - ۶) یہ اوارث ہو اور آل یعقوب کا وارث ہو۔ ظاہر ہے کہ نبوت کی طرف اشارہ آل یعقوب میں ہے۔ ورنہ یرثنی کافی تھا۔ ایسا ہی سورۃ انبیاء میں ذکریا اور اس کی بی بی کا اکٹھا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ انہم کانوا یسارعون فی الخیرات ویدعوننا رغبا ورھبا (الانبیاء - ۹۰) وہ بھلائیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور ہم کو امید اور خوف رکھتے ہوئے پکارتے تھے۔ ان قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زکریا نبی اور زکریا والد یحییٰ دو الگ الگ شخص ہیں ✦

مریم کے متعلق بعض مفسرین کے خیالات عجوبہ پسند طبائع نے یہاں بھی کچھ قصے بنا لئے ہیں کہ مریم ایک دن میں اتنا بڑھتی تھی جتنا کوئی دوسرا ایک سال میں بڑھے۔ حالانکہ یہاں صرف منباتاً حسناً عمدہ پرورش کا ذکر ہے۔ زکریا کی سپردگی میں ان کا دیا جانا حصول علم دین کے لئے تھا۔ یہ کہنا کہ پیدا ہوتے ہی ان کی ماں اس کو ہیکل میں لے گئی تھی۔ اسی عجوبہ پسندی کی وجہ سے ہے جو بہت سی تفاسیر میں دیکھی جاتی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کفالت کا وقت وہی ہوتا ہے جب بچہ تربیت کے قابل ہوتا ہے۔ مروجہ اناجیل میں مریم کی پیدائش تربیت وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ✦

کلما ۴۱۲ کلما۔ کل زمان او کل وقت۔ جب کبھی ✦

محراب المحراب۔ حرب اس کا مادہ ہے جس کے معنی جنگ ہیں۔ مفردات میں ہے کہ مسجد کے محراب کو محراب اس لئے کہا جاتا ہے لِاَنَّہٗ مَوْضِعُ مُحَارَبَۃِ الشَّیْطَانِ وَالْھَوٰی یعنی وہ شیطان اور خواہشات کے جنگ کا مقام ہے لیکن لسان العرب میں ہے کہ اَلْمِحْرَابُ صَدْرُ الْبَیْتِ وَاَکْرَمُ مَوْضِعٍ فِیْہِ یعنی محراب گھر کے صدر اور سب سے معزز مقام کا نام ہے۔ اور زجاج کا قول نقل کیا ہے کہ محراب اشرف بَیْتٍ فِی الدَّارِ کا نام ہے یعنی گھر میں سب سے اعلیٰ درجے کے کمرہ کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ بنی اسرائیل کے ذکر میں ہے۔ اور بنی اسرائیل میں محراب مسجد کو کہتے تھے جس میں وہ بیٹھا کرتے تھے (ل) یا جہاں نماز کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محراب وہ خاص جگہ تھی جہاں عبادت کے لئے وہ بیٹھا کرتے تھے۔ اور یہاں کی مساجد ہی تھیں ✦

رزق رزق کے اصل معنی راغب کے نزدیک عطاء جاری ہیں خواہ دنیوی ہو یا اُخروی۔ مال ہو یا جاہ یا علم۔ اس لئے رُزِقْتُ عِلْماً مراد لیا جاتے پر بولتے ہیں۔ بعض مفسرین نے تو حسب معمول اس کو غیر معمولی رزق قرار دیا۔ حالانکہ یہاں کوئی ایسے لفظ نہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں فاکھۃ الصیف فی الشتاء و فاکھۃ الشتاء فی الصیف یعنی گرمی کے پھل سردیوں میں اور سردی کے پھل گرمیوں میں حالانکہ قرآن شریف میں شے رونی کا ذکر ہے نہ پھلوں کا۔ اول تو رزق سے مراد پھل ہی لینا اس پر کوئی دلیل نہیں۔ پھر پھل بھی خلاف موسم اور یہ بھی لکھا ہے کہ زکریا ان پر سات دروازوں پر قفل لگایا کرتے تھے ان قفلوں میں تو معمولی میوہ کا پہنچنا بھی کافی اعجاز تھا خلاف موسم بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور مجاہد سے **بے موسم کے پھل**

رزق سے مراد علم روایت ہے وجد عندھا رزقا ای علما وقال صحفا فیھا علم (ف) یعنی رزق سے مراد یہاں علم ہے یا صحیفے جن میں علم تھا ✦

۳۷ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي

وہیں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی کہا میرے رب اپنی جناب سے مجھے

عند

من عند اللہ ۔ عِنْدَ ظرف مکان اور زمان ہے اور اس کے معنی حُضُوْرُ الشَّیْءِ وَدُنُوُّہٗ ہیں یعنی کسی شے کا حضور اور اس کا قرب اور اس پر مِنْ داخل ہوتا ہے جس طرح لَدُن پر مِن داخل ہوتا ہے یعنی مِنْ عِنْدِنَا ۔ مِنْ لَدُنَّا ۔ مفردات میں ہے کہ عِنْدَ میں جو قرب ہے وہ بعض وقت بلحاظ مکان ہوتا ہے اور بعض وقت بلحاظ اعتقاد جیسے عندی کذا یعنی میرے اعتقاد میں یوں ہے اور کبھی مرتبہ کے لحاظ سے جیسے بَلْ اَحْیَاءٌ عند ربہم ہیں ۔ اور کبھی محض حکم میں جیسے عندہ علم الساعۃ (الزخرف [43] - ۸۵) ومن عندہ علم الکتاب (الرعد [13] - ۴۳) ایسا ہی

من عند اللہ

فاولئک عند اللہ ھم الکاذبون (النور [24] - ۱۳) وھو عند اللہ عظیم (النور [24] - ۱۵) ان تمام مقامات پر فی حکمہ مراد ہے یعنی اللہ کے حکم میں ۔ اسی طرح وان من شیء الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم (الحجر [15] - ۲۱) اور یہی صورت یہاں ہے من عند اللہ یعنی اللہ کے حکم سے یہ چیزیں پہنچتی ہیں ۔ مفسرین کا خیال ہے کہ اس کو من عند اللہ اس لئے کہا گیا ہے کہ بلا واسطہ بشر پہنچتا تھا ۔ مگر یہ ضروری نہیں ان من شیء الا عندنا خزائنہ جب سب چیزوں کے خزانے اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہیں تو جو کچھ پہنچتا ہے سب من عند اللہ ہی ہے چنانچہ ایک جگہ فرمایا کہ جب ان لوگوں کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ھذا من عند اللہ یہ اللہ کا احسان ہے اور جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ھذا من عندک یعنی تمہاری بے تدبیری سے ہے ۔ اس کے جواب میں فرمایا قل کل من عند اللہ (النساء [4] - ۷۸) بھلائی برائی ہر چیز اللہ کی طرف سے ہی ہے ۔ حالانکہ اسی کی تشریح آگے چل کر یوں کی ہے کہ بد نتائج انسان کے اپنے بد اعمال سے ہیں اسی طرح فرماتا ہے وما النصر الا من عند اللہ (آل عمران [3] - ۱۲۵) حالانکہ نصرت اسباب کے ساتھ ہی آتی ہے ۔ اگر مسلمان قتال نہ کرتے اور حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کی طرح انکار کر دیتے تو یہ نصرت بھی نہ ملتی ۔ پس بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ ہر چیز من عند اللہ ہی ہے ✦

مریم کے پاس رزق کا پہنچنا

ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلا اسباب بھی کوئی امر مہیا کر دے یا ایسے اسباب سے مہیا کر دے جن کے سمجھنے پر انسان قادر نہیں ۔ جیسے ویرزقہ من حیث لا یحتسب (الطلاق [65] - ۳) اللہ تعالیٰ متقی کو ایسے ذرائع سے رزق پہنچاتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا ۔ اور اگر یہ مریم صدیقہ کی کرامت ہو ۔ کہ کسی ظاہری سبب کے بغیر ان کو پہنچ جاتا ہو ۔ تو اس سے بھی ہمیں انکار نہیں ۔ لیکن سوال صرف یہ ہے کہ آیا قرآن کریم نے یہاں ایسا فرمایا ہے یا کسی حدیث صحیح میں ایسا آیا ہے کہ مریم کو بے موسم کے پھل سات قفلوں کے اندر پہنچ جایا کرتے تھے اس کا جواب نفی میں ہے نہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فرمایا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور الفاظ ظاہری سے سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ مریم کے پاس کچھ رزق پہنچ جاتا تھا ۔ ممکن ہے زائرین پہنچاتے ہوں جیسا کہ دستور ہے کہ جو لوگ خلوت نشینی اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں ڈال کر ان کو پہنچا دیتا ہے ۔ اور ممکن ہے یہاں رزق سے مراد جیسا مجاہد نے کہا ہے علم ہو اور اس علم کو ہی مریم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا ہو ۔ تو اس پر ایک دن جب زکریا نے سوال کیا کہ اے مریم یہ تم کو کہاں سے پہنچتا ہے تو اس نے وہی خدا پرستوں والا جواب ۔ یا جن کی نظر وسائل سے بلند ہوتی ہے اور وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھتے ہیں حضرت ابراہیم تو یہاں تک فرماتے ہیں والذی یطعمنی ویسقین (الشعراء [illegible]) وہ اللہ ہی جو مجھے کھانا کھلاتا اور پانی پلاتا ہے حالانکہ اپنے ہاتھ سے کھاتے اور پیتے تھے ✦

معمولی امور کے ذکر میں بھی مسلمانوں کیلئے سبق ہے

کہا جائیگا کہ اگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی تو اس کا ذکر یہاں کیوں کیا ۔ لیکن کیا قرآن کریم معمولی امور کا ذکر نصیحت کے لئے نہیں کرتا ؟ بلکہ سبق تو انسان معمولی امور سے ہی حاصل کر سکتا ہے ۔ اگر یہ کوئی غیر معمولی امر تھا تو ہمیں اس سے فائدہ کیا ۔ یہ کوئی معجزہ تو ہے نہیں کہ مخالفین پر اتمام حجت کے لئے دکھایا گیا ہو ۔ نہ کوئی ایسی کرامت ہے جو منکرین کے لئے ظاہر ہوتی ہو ۔ بلکہ بات صاف ہے مسلمانوں کو سمجھانا مقصود ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے دین کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرتا ہے ۔

مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ○

اچھی اولاد عطا فرما بیشک تو دعا سننے والا ہے ۴۱۳

اللہ تعالیٰ اس کے لئے بھی رزق کا کچھ سامان کر دیتا ہے اور کسی نہ کسی ذریعہ سے اس کو رزق پہنچا دیتا ہے۔ بلکہ آخر پر ان الفاظ میں کہ واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب یہ بھی بتا دیا کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ بے حساب رزق دیتا ہے انہی الفاظ میں مسلمانوں کو بھی مخاطب فرمایا ہے۔

ایک اور بات قابل توجہ یہ ہے کہ زکریا ہمیشہ ہی جب اس کے پاس جاتے تو رزق پاتے۔ اگر یہ کوئی غیر معمولی رزق ہوتا تو یہ سوال پہلے دن ہی ان کو کرنا چاہئے تھا کہ اے مریم یہ تم کو کہاں سے ملا۔ حالانکہ عبارت قرآنی بتاتی ہے کہ وہ جب کبھی مریم کے پاس جاتے ایسا پاتے اور سوال نہ کرتے۔ پھر انہوں نے کسی ایک موقعہ پر ایسا سوال کیا ہے جب انہوں نے مریم میں خدا پرستی کے آثار دیکھے ہیں۔ اگر یہ مراد ہوتی کہ پہلی مرتبہ ہی دیکھکر سوال کیا تھا تو عبارت یوں ہونی چاہئے تھی۔ لما دخل علیہا۔

۴۱۳ هنالك۔ هنا ظرف مکان ہے۔ ل بعد کے لئے اور کاف خطاب کے لئے یعنی جہاں وہ (مریم کے پاس محراب میں) تھے وہیں یہ دعا کی۔

هنالك

نیک اولاد کی خواہش

معلوم ہوتا ہے حضرت زکریا بنی اسرائیل کی حالت کو دیکھ کر یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اب یہ قوم اس قابل نہیں رہی کہ اس کے اندر وہ پاک لوگ پیدا ہوں جو اس قوم کو راہ راست پر رکھ سکیں۔ اور اسی لئے انہوں نے کبھی اولاد کے لئے دعا بھی نہیں کی تھی۔ چنانچہ دوسری جگہ ان کے یہ الفاظ مذکور ہیں وانی خفت الموالی من ورائی۔ ان کا خوف اسی وجہ سے تھا کہ ان لوگوں کی عملی حالتیں انکو اچھی نظر نہ آتی تھیں۔ ورنہ انبیاء اور اولیاء کو مال و جائداد کے ورثہ کا فکر نہیں ہوا کرتا۔ پس جب مریم کے اندر انہوں نے ایسی نیکی اور سعادت دیکھی تو ان کی طبیعت میں بھی ایک جوش پیدا ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی ایسی نیک اولاد عطا کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکوں کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے تو نیک اولاد کے لئے ہی پیدا ہوتی ہے۔ باوجود بوڑھا ہو جانے کے زکریا نے اولاد کے لئے دعا نہ کی۔ کی تو یہی کی کہ اے خدا نیک اولاد دے۔

یہ کہنا کہ دعا کی خواہش ان کے دل میں اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا اس بات پر قادر ہے۔ درست نہیں۔ اس لئے کہ وہ پہلے بھی مقبولین بارگاہ الٰہی میں سے تھے۔ ہر ایک راستباز انسان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعائیں قبول کیا کرتا ہے۔ اور حضرت زکریا کا تو اپنا قول دوسری جگہ قرآن میں منقول ہے ولم اکن بدعائك رب شقیا (مریم ۱۹-۴) یعنی جو دعا کی وہ قبول ہوئی پھر عورت کے بانجھ ہونے کا یقین تو بے اولادی سے ہوا پہلے وہ دعا کیوں نہ کرتے تھے۔ اصل بات یہی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی حالت کو دیکھ کر یہی خیال کرتے تھے کہ یہ قوم اب اس قابل نہیں رہی کہ ان میں نیک لوگ پیدا ہوں۔ مریم کی نیکی کو دیکھکر ان کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہوا۔ اور ان کی روح بے اختیار بارگاہ الٰہی میں پکار اٹھی فهب لی من لدنك ولیا یرثنی ویرث من اٰل یعقوب واجعله رب رضیا (مریم ۱۹-۵-۶) اے خدا مجھے بھی اپنی جناب سے ایک وارث عطا فرما جو میرے علوم اور نیکیوں کا وارث ہو۔ اور یعقوب کے سچے پیرووں کے علوم اور نیکیوں کا وارث ہو اور اسے میرے رب اسے اپنی بارگاہ میں پسندیدہ بنائیو۔ نیکوں کو دیکھکر نیکوں کے دل میں نیک تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اسی کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے۔

۳۸ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى

پھر فرشتوں نے اسے پکارا جبکہ وہ عبادتگاہ میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا کہ اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے ۴۱۴

ملائکہ کا کلام

۴۱۴ فنادته الملٰئكة ۔ بعض کے نزدیک یہاں ملائکہ سے مراد جبرائیل ہے اور بعض کے نزدیک جماعت ملائکہ اللہ تعالیٰ کا کلام اور الہام بھی ملائکہ کی وساطت سے ہی نازل ہوتا ہے ۔ دوسری جگہ فرمایا یازکریا انا نبشرك بغلام اسمه یحییٰ (مریم ۱۹ : ۷) پس یہ وحی بھی جو زکریا کو ہوئی ۔ خواہ کوئی سے ملائکہ اس کے لانے والے ہوں ۔ اور دوسری جگہ قرآن کریم نے حصر کرکے بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام انسان سے تین ہی طرح پر ہوتا ہے ۔ دل میں بات ڈال کر ، یا کشف الہام سے ۔ بذریعہ جبرائیل علیہ السلام جو انبیاء سے مخصوص ہے عام ملائکہ کا کلام کشف یا الہام کے رنگ میں ہوگا ۔

یحییٰ

یحییٰ ۔ مفردات میں ہے سماہ بذلك من حیث انه لم تمتہ الذنوب کما اماتت کثیرا من ولد آدم صلعم یعنی اس کا نام یحییٰ رکھا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ گناہ سے اس پر موت نہیں آئے گی جیسا کہ بہت سے آدم کے بیٹوں پر آئی ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یحییٰ نام بتانے میں اشارہ یہ تھا کہ جیسے کہ بنی اسرائیل کی عام حالت اس وقت بھی کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا تھے اور اعلیٰ درجہ کے نیک اور راستباز انسان ان میں عموماً نہ تھے ۔ یہ لڑکا ایسا نہ ہوگا بلکہ وہ ایک روحانی زندگی کا وارث ہوگا اور گناہ کی موت اس پر نہ آئے گی بعض نے کہا ہے کہ یحییٰ نام اس طرف اشارہ کے لئے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو ایمان سے زندہ کرے گا ۔ یا اس لئے کہ وہ علم و حکمت سے زندہ ہوگا (ل) یا اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے لوگ

یوحنا بپتسمہ دینے والا

ہدایت کے ساتھ زندہ کئے جائینگے (ر) اناجیل میں یہ نام یوحنا آتا ہے اور یوحنا بپتسمہ دینے والے کے نام سے یہ مشہور ہیں انہوں نے ہی حضرت مسیح کو بپتسمہ دیا تھا ۔ ان کا اور حضرت مسیح کا زمانہ ایک ہی تھا ان کا ظہور کچھ حضرت مسیح سے پہلے ہوا

سلسلہ موسویہ کے اول و آخر دو دو نبیوں کے ظہور کی وجہ

یہ عجیب بات ہے کہ سلسلہ موسوی کی ابتدا بھی دو نبیوں موسیٰ اور ہارون سے ہی ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ بھی دو نبیوں یحییٰ اور عیسیٰ پر ہی ہوتا ہے جس طرح حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی اصلاح کا سارا کام اکیلے نہ کر سکتے تھے اسی طرح حضرت مسیح بھی اکیلے اس قابل نہ تھے ۔ حضرت موسیٰ اور مسیح دونوں کا کام بڑا تھا ۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ ان کے ساتھ دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت پیش آئی ۔ حضرت موسیٰ کے کام کا کچھ حصہ حضرت ہارون نے کیا ۔ حضرت یحییٰ نے حضرت مسیح کے لئے لوگوں کو تیار کیا ۔

یحییٰ کے ظہور کی پیشگوئی

حضرت یحییٰ اور عیسیٰ دونوں کے لئے کتب سابقہ میں کچھ پیشگوئیاں تھیں ۔ حضرت یحییٰ کے متعلق پیشگوئی ان الفاظ میں ملاکی نبی کی کتاب میں تھی " دیکھو خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پیشتر میں ایلیاہ نبی کو تمہارے پاس بھیجوں گا "

الیاس کا آسمان پر جانا

(ملاکی ۴ : ۵) بظاہر اس پیشگوئی میں الیاس کے آنے کا ذکر ہے اور الیاس کے متعلق یہودیوں کا یہ خیال تھا کہ وہ زندہ آسمان پر چلا گیا ہوا ہے اور یہ صرف خیال ہی نہ تھا بلکہ ان کی کتاب میں یہ لفظ بھی تھے کہ " ایلیاہ بگولے میں ہوکے آسمان پر جاتا رہا " (۲ - سلاطین ۲ : ۱۱) اب جب حضرت مسیح نے دعویٰ کیا ۔ تو یہودیوں نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ ہماری پیشگوئیوں میں لکھا ہے کہ

الیاس کی دوبارہ آمد کی پیشگوئی کیونکر پوری ہوئی ۔

مسیح سے پیشتر ضروری ہے کہ الیاس آئے چنانچہ شاگردوں نے یہ اعتراض حضرت مسیح کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا " ایلیاہ تو آچکا ۔ اور انہوں نے اس کو نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا اسی طرح ابن آدم بھی ان کے ہاتھ سے دکھ اٹھائیگا " اس کے بعد لکھا ہے " تب شاگرد سمجھ گئے کہ اس نے ہم سے یوحنا بپتسمہ دینے والے کی بابت کہا ہے " (متی ۱۷ : ۱۲ و ۱۳) اور دوسری جگہ اس کی وجہ یوں دی ہے " اور وہ ایلیاہ کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا " گویا یحییٰ کی آمد ہی الیاس کی دوبارہ آمد تھی اس لئے کہ وہ اس کا مثیل ہو کر آیا ۔ مگر یہودی اس تشریح سے مطمئن نہ ہوئے ۔

مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

جو اللہ کی ایک بات کو سچا کر دکھانیوالا اور سردار اور بدیوں سے رکنے والا اور نبی نیکو کاروں میں سے (ہوگا)۔ ۴۱۵

کلمۃ

۴۱۵ کلمۃ۔ یہ لفظ قرآن کریم میں وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی کلام کے ہم معنی جیسے عیسائیوں کے حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے پر فرمایا کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم (الکہف ۱۸ - ۵) اور ایک جگہ کافر کی طرف اس قول کو منسوب کر کے رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت (المومنون ۲۳ - ۱۰۰) فرمایا انھا کلمۃ ھو قائلھا ✦

کلمہ کی تصدیق سے مراد

یہ تو کلمہ کے عام معنی ہیں۔ یہاں کس کلمہ کی تصدیق ہے۔ مفردات میں تین قول دیئے ہیں کلمۃ التوحید۔ توحید کی بات۔ کتاب اللہ یعنی اللہ کی کتاب۔ عیسیٰ۔ اور عیسیٰ کا نام کلمۃ اس لئے رکھا گیا کہ دوسری جگہ کلمتہ القاھا الی مریم قرآن شریف میں آتا ہے۔ میرے نزدیک یہاں کلمہ عام معنی میں ہے یعنی اللہ کے ایک کلام کو سچا کر دکھائیگا۔ اور اس کلمہ کے لفظ میں اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جو یحییٰ کے متعلق بائبل میں پائی جاتی ہے۔ اور جو پچھلے نوٹ میں مذکور ہو چکی ہے ✦

سید۔ سواد

سیدا۔ سید۔ سود سے ہے اور سواد سیاہی کو کہتے ہیں اور بڑی جماعت کو بھی اسی لحاظ سے سواد کہتے ہیں اور سید وہ ہے جو سواد یا جماعت کثیر کا متولی ہو۔ یحییٰ کو سید اس لئے کہا کہ وہ بھی ایک جماعت کا پیشوا بننے والا تھا ✦

حصور۔ حصر

حصورا۔ حصر سے ہے جس کے معنی تضییق یعنی روکنے کے ہیں۔ مفردات میں ہے کہ حصور وہ ہے جو عورتوں کے پاس نہیں جاتا یا نامردی کی وجہ سے اور یا پاکدامنی کی وجہ سے اور شہوت کے دور کرنے میں کوشش کی وجہ سے۔ اور پھر لکھا ہے کہ اس آیت میں یہ دوسری قسم کا ہی حصور مراد ہے یعنی پاکدامنی کی وجہ سے عورتوں کے پاس نہ جانے والا کیونکہ اس سے ایک شخص تعریف کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اور یہی بات صحیح ہے ورنہ نامرد تو دنیا میں بہتیرے ہوئے اور ہونگے۔ یہ کسی تعریف کے موقع پر نہیں بولا جا سکتا۔ اور ابن عباس کی ایک روایت میں بھی یہ لفظ آتے ہیں الذی لا یاتی النساء مع القدرۃ علی ذٰلک (ر)۔ اور روح المعانی میں ہی یہ بھی ہو کہ جائز ہے کہ حصور سے مراد یہ ہو کہ جو شخص نفس کے روکنے کو کمال تک پہنچا دے اور باوجود قدرت کے شہوات سے اسے روک رکھے ✦

یحییٰ اور عیسےٰ

عیسائی لوگ حضرت عیسیٰ کا یہ کمال بیان کیا کرتے ہیں کہ انہوں نے شادی نہیں کی۔ قرآن کریم اس کے بالمقابل یحییٰ کو پیش کرتا ہے کہ اگر یہ کوئی خوبی ہے تو پھر حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ سے کم نہیں۔ حضرت یحییٰ کی زندگی۔ دنیا کی ان معمولی آسائشوں سے بھی خالی تھی جو حضرت عیسیٰ کو میسر تھیں۔ چنانچہ انجیل میں ان کا یہ نقشہ کھینچا ہے کہ وہ نہ پیتے تھے اور کھاؤ پیو نہ تھے۔ اور حضرت مسیح کو لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ کھاؤ پیو ہے اور مے پیتا ہے "کیونکہ یوحنا نہ کھاتا آیا نہ پیتا اور وہ کہتے ہیں کہ اس میں بدروح ہے۔ ابن آدم کھاتا پیتا آیا اور وہ کہتے ہیں دیکھو کھاؤ اور شرابی آدمی" (متی ۱۱ - ۱۹) ✦

قرآن کریم تو یحییٰ کو انبیاء میں سے ایک نبی بیان فرماتا ہے۔ مگر حضرت مسیح نے یوحنا کو نبیوں سے بھی بڑھکر کہا ہے کہیں مسیح کے متعلق ایسا فقرہ ہوتا تو اس کی بنا پر اسے خدا بنا لیا جاتا مگر یوحنا کو کچھ بھی نہیں سمجھا جاتا حالانکہ مسیح صاف کہتا ہے "تو پھر کیوں گئے تھے؟ ایک نبی کے دیکھنے کو؟ ہاں میں تم سے کہتا ہوں بلکہ نبی سے بڑے کو . . . . میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورت سے پیدا ہوئے ہیں ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا نہیں ہوا" (متی ۱۱: ۹ - ۱۱) سوال یہ ہے کہ کیا مسیح عورت سے پیدا نہیں ہوئے؟ پھر اس صریح بیان کے مطابق بڑا کون ہوا؟ یحییٰ یا عیسیٰ؟ عیسائی خود ہی اس کا جواب دیں۔ اور جہاں فرشتہ زکریا کو یحییٰ کی بشارت دیتا ہے وہاں ان الفاظ میں بشارت ہے "اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سبب خوش ہونگے کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا۔ اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پیئے گا اور اپنی ماں کے پیٹ سے ہی روح القدس سے بھر جائیگا" (لوقا ۱: ۱۴ و ۱۵) اور احادیث میں بھی آتا ہے ما من عبد یلقی اللہ الا ذا ذنب الا یحییٰ بن زکریا۔ کوئی بندہ نہیں جو خدا کو ملے مگر وہ قصوروار ہوگا سوائے یحییٰ بن زکریا کے۔

۳۹ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ
اس نے کہا میرے رب میرے بیٹا کب ہوگا اور یقیناً مجھ پر بڑھاپا آچکا ہو اور میری عورت بانجھ ہے فرمایا

۴۰ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ
اسی طرح ہوگا اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۱۴۶ اس نے کہا میرے رب میرے لئے کوئی نشان مقرر کردو فرمایا

اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ
تیرے لئے نشان یہ ہو کہ تین دن سوائے اشارہ کے لوگوں سے بات نہ کرو

یہ تمام باتیں اگر ان کو ظاہر پر حمل کیا جائے تو حضرت یحییٰ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بڑی فضیلت ثابت کرتی ہیں۔ عیسائی صاحبان اس پر غور کریں۔

غلام — ۱۴۶ غلام۔ غلام اس کو کہتے ہیں جس کی مونچھیں نکل رہی ہوں (غ) یعنی نوجوان۔ یا پیدا ہونے سے لیکر جوانی تک غلام کہلاتا ہے اور کہل کو بھی غلام کہدیتے ہیں (ت)۔ قرآن کریم میں اکثر لڑکے کی بشارت غلام کے لفظ سے دی گئی ہے جس میں شاید یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ موعود لڑکا جوانی کی عمر کو پہنچے گا اور یہاں یعنی حضرت زکریا کے سوال میں شاید یہ بھی اشارہ ہو کہ وہ لڑکا جس کے اب پیدا ہونے کی بشارت دی جاتی ہے وہ کب نوجوان ہوگا۔

کبر — الکبر۔ کبر یا بڑائی بعض وقت بلحاظ جسامت کے ہوتی ہے۔ اور بعض وقت بلحاظ زمانہ کے اور بعض وقت بلحاظ منزلت اور رفعت کے (غ) یہاں کبر بلحاظ زمانہ کے مراد ہے یعنی مُسِن ہونا یا بڑھاپا۔

عاقر عقر — عاقر۔ عقر کے اصل معنی کسی چیز کا اصل ہیں یعنی اس کی جڑ اور اس سے عقرت النخل کے معنی آتے ہیں قَطَعْتُهٗ من اَصْلِه (غ) یعنی میں نے کھجور کو جڑ سے کاٹ دیا۔ اس طرح عقر کے معنی ذبح کردینا یا کاٹ دینا ہو گئے ہیں چنانچہ عَقَرْتُ الْبَعِيْرَ کے معنی ہیں نَحَرْتُهٗ اسے ذبح کردیا انہی معنوں میں آتا ہے فعقروھا (الشمس ۹۱ - ۱۴) فتعاطی فعقر (القمر ۵۴ - ۲۹) اور امراۃ عاقر۔ اس عورت کو کہتے ہیں جو بچہ نہیں جنتی كَاَنَّهَا تَعْقِرُ مَاءَ الْفَحْلِ گویا وہ نر کے پانی کو کاٹ دیتی ہے یا ضائع کردیتی ہے۔ (غ)۔

کذالك الله يفعل ما يشاء کی ترکیب یوں ہے۔ الامر کذالك یعنی ایسا ہی ہوتا ہے الله يفعل ما يشاء۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے پس یہ دو الگ الگ جملے ہیں پہلے میں مبتدا محذوف ہے۔

یہ سوال اللہ تعالیٰ کی قدرت کے استعظام پر اور ایک ایسے بڑے نشان کے ظاہر ہونے پر ہے۔ جو انسان بطور تعجب کرتا ہے۔ کیونکہ ظاہر حالات اس کے مخالف ہیں۔ اس میں کسی قسم کی بے ادبی خیال کرنا درست نہیں اس لئے کہ ایسا ہی سوال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی بشارت پر کیا ہے۔ قال ابشرتمونی علیٰ ان مسنی الکبر فبم تبشرون (الحجر ۱۵ - ۵۴)۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۟

اور اپنے رب کو بہت یاد کرو اور شام اور صبح کو تسبیح کرو۔ ۴۱۷

۴۱۷ ثلٰثة ایام۔ سورہ مریم میں اسی تذکرہ میں فرمایا ثلٰث لیال یعنی تین راتیں اصل بات یہ ہے کہ بعض وقت ایک کا ذکر کرکے دونوں مراد لے لیتے ہیں جیسے سرابیل تقیکم الحر (النحل ۱۶: ۸۱) میں اصل مراد ہے الحر والبرد یعنی گرمی اور سردی سے بچاتے ہیں۔ یا مشرق کہکر مراد مشرق و مغرب لے لیتے ہیں۔ اسی طرح ایام میں لیالی بھی شامل ہیں اور لیال میں ایام شامل ہیں۔ اور ایک جگہ ایام اور ایک جگہ لیال کہکر اس کو واضح کر دیا ◆

رمز — رمزاً۔ رمز کے معنی ہیں ہونٹوں سے اشارہ کرنا اور آواز مخفی اور آنکھوں سے اشارہ (غ) رمز کے اصلی معنی تحرک یعنی ہلانا ہیں اور ابن عباس سے رمز کے معنی الاشارة بالید والوحی بالراس (ل) مروی ہیں یعنی ہاتھ سے اشارہ اور سر سے اشارہ ◆

عشی — العشی — عشی اس وقت کا نام ہے جو آفتاب کے ڈھلنے سے لیکر صبح تک ہو (غ) چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے الا عشیة او ضحٰها (النزعٰت ۷۹: ۴۶) اور عشاء صلوٰۃ مغرب سے لیکر عتمہ تک بولا جاتا ہے یعنی تاریکی کے وقت تک جاؤا اباھم عشاء یبکون (یوسف ۱۲: ۱۶)

ابکار۔ بکرة — ابکار یعنی بکرة دن کے پہلے حصہ کو کہتے ہیں (غ) اور ابکار اسی معنی میں مصدر ہے ◆

زکریا کی خاموشی اضطراری تھی یا اختیاری — زکریا کا نشان مانگنا اس بات پر دلیل نہیں کہ آپ کو وعدہ الٰہی پر ایمان نہ تھا جس کہتی ہیں لیتلقی تلک النعمة بالشکر (م) تا کہ اس نعمت پر شکر کرے۔ یہاں لوگوں نے بعض لغو قصے بڑھا دیئے ہیں کہ شیطان نے زکریا کو کہہ دیا تھا کہ تمہیں فرشتے کی آواز نہیں آئی بلکہ یہ شیطان کی آواز تھی اور کہ اسی لئے زکریا نے کہا تھا انّٰی یکون لی غلام اور اسی لئے نشان مانگا تھا۔ اس بات کی طرف تو مفسرین گئے ہیں کہ حضرت زکریا کا نہ بولنا کسی آفت کی وجہ سے نہ تھا۔ کیونکہ سورہ مریم میں صاف لفظ سویا بڑھا دیا ہے یعنی حالت صحت میں ہونے کے باوجود کلام نہ کرو۔ مگر اکثر کا خیال یہی ہے کہ زکریا کا نہ بولنا بطور اضطرار تھا لیکن ابو مسلم کہتے ہیں کہ یہ بطور اختیار تھا اور عطاء کہتی کہ یہ ...... روزہ رکھنے کی طرف اشارہ تھا کیونکہ ان میں دستور تھا کہ روزہ رکھتے تھے تو کلام نہ کرتے تھے (ر) یہ توجیہ بہت لطیف ہے ایک تو اس پرانی نذرت للرحمٰن صوما فلن اکلم الیوم انسیا (مریم ۱۹: ۲۶) شاہد ہے یعنی مریم کہتی ہیں میں نے رحمٰن کیلئے روزہ نذر مانا ہے اس لئے آج میں کسی انسان سے گفتگو نہ کروں گی۔ کیونکہ جہاں نہ بولنے کا حکم ہے وہیں یہ بھی حکم ہے کہ اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کرو اور صبح و شام تسبیح کرو۔ اگر حضرت زکریا بولنے پر قادر نہ تھے تو تسبیح کا حکم ٹھیک نہیں رہتا یہ کہنا کہ اختیاری طور پر نہ بولنا نشان نہیں لفظ نشان کے معنی کی غلط فہمی پر مبنی ہے حضرت زکریا نے یہی عرض کیا تھا کہ اجعل لی اٰیة میرے لئے کوئی نشان مقرر کر دو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے لئے یہ نشان مقرر کرتے ہیں کہ تین دن روزہ رکھو اور لوگوں سے بات چیت نہ کرو ◆

لوقا کا قصہ — انجیل لوقا میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ قابل قبول نہیں۔ وہاں لکھا ہے کہ فرشتہ نے زکریا کو یوں کہا "اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہونگی یقین نہ کیا۔" اور آگے لکھا ہے کہ جب زکریا باہر نکلا تو وہ لوگوں سے "اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا" (لوقا ۱: ۲۰-۲۲)۔ حالانکہ زکریا نے جو کچھ کہا وہ اس سے بڑھکر نہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسے ہی حالات میں کہا۔ اور یہ مفسرین بائبل کو خود اعتراف ہے۔ پھر ایک ہی سوال پر ایک جگہ کوئی بات خلاف یقین نہیں اور دوسری جگہ یہ کہنا کہ یقین نہ کیا۔ صحیح نہیں ہے ◆

ع ۵ / ۱۳ / ۱۳

۴۱ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور تجھے پاک بنایا ہے[۴۱۵]

مسیح کی پیدائش اور بعثت کا ذکر

مریم نبیہ تھیں یا نہیں

۴۱۵ - قالت الملائکة - دیکھو ۴۱۴ فنادته الملائکة پر - دونوں کا منشاء ایک ہی ہے - یہاں پر یہ بحث ہوئی ہے کہ آیا حضرت مریم نبیہ تھیں یا نہیں - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ نبیہ تھیں بعض نے انکار کیا ہے - قائلین اثبات نے اس بات سے حضرت مریم کی نبوت کا استدلال کیا ہے کہ ملائکہ نے ان سے کلام کیا - اور بغوی نے کہا ہے کہ ملائکہ کا کلام کرنا ایسے لوگوں سے ثابت ہے جو بالاجماع نبی نہیں - چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص اپنے ایک بھائی کی زیارت کے لئے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے نکلا تو فرشتوں نے اسے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم سے ایسی محبت کرتا ہے جیسی تم اپنے بھائی سے محبت کرتے ہو چنانچہ وہ کہتے ہیں من توھم ان النبوة بمجرد الوحی و مکالمة الملك فقد حاد عن الصواب (ر) یعنی جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ مجرد وحی اور مکالمہ کا نام نبوت ہے وہ صواب سے پھر گیا - اس کے ساتھ اختلاف بھی لوگوں نے کیا ہے - غور کیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ غیر انبیاء سے مکالمہ الٰہی ایک امر مسلم ہے اور حدیث صحیح رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء - (یعنی ایسے لوگوں کا وجود جن سے کلام الٰہی ہوتا ہے حالانکہ وہ نبی نہیں) اس پر ایسی کھلی دلیل ہے کہ جس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا - پھر ایک مریم سے ہی کلام الٰہی از روئے قرآن ثابت نہیں - بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی وحی کا ہونا ثابت ہے - واوحینا الی ام موسٰی (القصص ۲۸ - ۷) پھر اوحیت الی الحواریین (المائدة ۵ - ۱۱۱) بھی موجود ہے - یعنی حواریوں کی طرف وحی کی - اب بہر حال حواریوں کی نفی نبوت پر حدیث شاہد ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - لم یکن بینی و بینه نبی یعنی میرے اور عیسیٰ کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا پس صرف وحی پانا نبوت نہیں - ہاں لفظ نبی کے لغوی معنی چونکہ یہ ہیں کہ وہ خدا سے خبر پاکر پہنچاتا ہے گو وہ خبر کسی ہدایت دینی سے تعلق نہ رکھتی ہو بلکہ محض ایک ذاتی امر ہو یا ایک پیشگوئی ہو اس لئے لغوی معنی کے لحاظ سے بلاشبہ ہر اس شخص پر جس سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا لفظ نبی کا صادق آسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل میں صرف خواب بینوں کو بھی نبی کہہ دیتے تھے - مگر چونکہ اصطلاح شریعت میں لفظ نبی انہی لوگوں پر صادق آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایات دینی لیکر آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان سفیر ہوتے ہیں جیسا کہ راغب نے لکھا ہے (نوٹ ۹۱) اس لئے جب محض مکالمہ مخاطبہ والے پر لفظ نبی بولا جائے گا تو صرف مجازی معنی میں بولا جائے گا پس جن لوگوں نے حواء اور آسیة اور ام موسٰی اور سارة اور ھاجر اور مریم کو نبیہ کہا ہے (ر) وہ محض اس لغوی یا مجازی معنی کی رو سے ہے - اور اسی لئے انہوں نے لفظ رسول ان پر نہیں بولا جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ گو اللہ تعالیٰ ان سے کلام کرتا تھا - مگر وہ کلام کسی دینی ہدایت کے متعلق نہ تھا - اور جن معنوں میں مریم نبیہ تھیں ان معنوں میں اس اُمت کے برگزیدہ لوگ بھی نبی ہیں - کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے بھی ہمکلام ہوتا ہے - اور سورة تحریم میں صاف طور پر اس اُمت کے برگزیدہ لوگوں کو مریم بنت عمران سے مثال دی ہے ✦

محض مکالمہ نبوت نہیں

غیر انبیاء سے مکالمہ اور ان کو وحی

نبی بلحاظ معنی لغوی

نبی اصطلاح شریعت میں

طھرك - طہارة کے معنی دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں طہارة دو قسم پر ہے - طہارت جسمانی اور طہارة نفس - اور گو بعض جگہ دونوں معنوں پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے ویحب المتطھرین (البقرة ۲ - ۲۲۲) یحبون ان یتطھروا (التوبة ۹ - ۱۰۸) مگر یہاں مقصود بالذات طہارت نفس ہی ہے ایمان کی وجہ سے کفر سے پاک کیا - اور طاعت کے ساتھ نافرمانی سے پاک کیا (ر) یا جیسا کہ کہا گیا ہے اخلاق ذمیمہ سے پاک کیا ✦

طہارت جسمانی و طہارت نفس

وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ ۴۲

۔ قوموں کی عورتوں میں سے تجھے چن لیا ہے [۴۱۹] اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری کرو

عالمین پر فضیلت سے مراد

[۴۱۹] علیٰ نساء العالمین۔ بنی اسرائیل کے ذکر میں فرمایا تھا وانی فضلتکم علی العالمین۔ ایسے موقعوں پر مراد ہمیشہ عالمی زمانہ یعنی اس زمانہ کے لوگ ہوتے ہیں چنانچہ ایک حدیث مرسل میں یہ تشریح آئی بھی ہے مریم خیر نساء عالمہا (د) مریم اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے بہتر تھیں۔ ہاں احادیث اس بارہ میں مختلف طور پر آئی ہیں اور ان میں سے جو ایک میں دوسری کے ساتھ اختلاف نظر آتا ہے کہ مثلاً کسی حدیث میں تو محض چار عورتوں کے افضل النساء ہونے کا ذکر آتا ہے جیسا ابن مردویہ کی روایت میں۔ مریم۔ آسیہ۔ خدیجہ اور فاطمہ کا نام ہے اور ایک میں یوں آتا ہے کہ عورتوں میں سے سوائے تین کے کسی کی تکمیل نہیں ہوئی۔ مریم۔ آسیہ۔ خدیجہ اور عائشہ کی فضیلت سب عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت کھانوں پر (ث)، اور ایک حدیث میں ہے کہ بہترین عورتوں کی مریم بنت عمران اور بہترین عورتوں کی خدیجہ بنت خویلد ہیں (ث)۔ معلوم ہوتا ہے یہ فضیلت بعض پہلوؤں سے ہے +

عیسائیوں کا مریم کی فضیلت سے حضرت عیسیٰ کی فضیلت پر استدلال

بعض عیسائی یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ کو اتنی بڑی فضیلت حاصل ہے جو محمد رسول اللہ صلعم کی والدہ کو حاصل نہیں اس سے حضرت عیسیٰ کی فضیلت لازم آتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ماں کی فضیلت کے بغیر اولاد افضل نہیں ہو سکتی؟ اگر اولاد کو فضیلت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ماں کو فضیلت حاصل ہو تو مریم کی ماں کو تو کوئی فضیلت حاصل نہ تھی مریم کو کیونکر فضیلت حاصل ہو گئی۔ اور اگر یہ سلسلہ اور آگے چلایا جائے تو حضرت عیسیٰ کی دادیوں نانیوں میں تو بعض ایسی عورتیں ملیں گی جن کے متعلق عیسائیوں کی کتابوں میں جو کچھ پایا جاتا ہے کوئی مسلمان اس کو نام بھی نہیں سکتا۔ عجیب بات ہے کہ قرآن کی رو سے مریم صدیقہ کو جو فضیلت ملتی ہے وہ پہلے مل چکی ہے۔ اور وہ بیٹا جس کو اس وجہ پر افضل کہنے کی جرأت کی جاتی ہے نہ صرف ابھی پیدا ہی نہیں ہوا بلکہ ماں کے رحم میں بھی موجود نہیں اگر وہ پیدا نہ بھی ہوتا تو مریم کو جو فضیلت ملنی تھی وہ مل چکی۔ کیسا پر حکمت کلام ہے مریم کے اصطفا اس کی تطہیر اس کی فضیلت کے ذکر میں جو اس آیت میں موجود ہے حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے کی بشارت تک بھی نہیں اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ ہاں جس ماں کی فضیلت کو حضرت عیسیٰ کی فضیلت کی وجہ قرار دیا جاتا ہے اناجیل کو اٹھا کر دیکھو وہاں اسی ماں کو کس زمرہ میں داخل کیا گیا ہے: "کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری

مریم کا ذکر اناجیل میں

حضرت مسیح کا اپنی والدہ سے خطاب

ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں اس نے خبر دینے والے کے جواب میں کہا کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں۔ کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور بہن اور ماں ہے" (متی ۱۲: ۴۷ تا ۵۰) اب اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کے خیال میں اس کی ماں آسمانی باپ کی مرضی پر چلنے والی نہ تھی۔ ورنہ ماں کی طرف سے یوں بیزاری کا اظہار اور شاگردوں سے جو اس کی رائے میں آسمانی باپ کی مرضی پر چلنے والے تھے یوں محبت کا اظہار نہ ہوتا۔ پھر ایک جگہ مریمؑ نے کچھ کہنا چاہا تو آپ یوں اپنی والدہ محترمہ سے مخاطب ہوتے ہیں "اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام ہے" (یوحنا ۲: ۴)۔ کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح اپنی والدہ محترمہ کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ ان کو تمام دنیا کی عورتوں سے بلند مرتبہ سمجھتے ہوں اور اپنی فضیلت کو بھی ماں کی بزرگی کی طرف منسوب کرتے ہوں بلکہ یہاں تو حالات کچھ اس کے برعکس نظر آتے ہیں۔

آنحضرتؐ کا اپنی بیٹی کی عزت کرنا

جائے غور ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی کی اس سے بہت بڑھ کر عزت کرتے ہیں جس قدر حضرت مسیح نے اپنی والدہ کی کی۔ آپ کبھی فاطمہؓ کو ایسے الفاظ میں خطاب نہیں کرتے۔ بلکہ ہمیشہ پیار محبت عزت کے الفاظ سے پکارتے ہیں بلکہ حضرت فاطمہؓ کی تعظیم کے لئے بعض وقت اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بہرحال حضرت مریم کی فضیلت سے کوئی استدلال حضرت عیسیٰ کی فضیلت پر نہیں ہو سکتا +

۴۳ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ

اور سجدہ کرو اور جھک جانیوالوں کیساتھ جھک جاؤ۔ ۴۲۰ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ۴۲۱ جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں ۴۲۲ اور تو انکے

حکم بیشک خلاف عادت نہ تھی حکم سے استدلال غلط ہے

۴۲۰ جب کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی حکم ہو (بلکہ عام حکم بھی ہو) تو عیسائی کہا کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خلاف کیا تھا۔ اس لئے یہ حکم ہوا کہ ایسا کرو۔ اس موقعہ پر بھی انہیں غور کرنا چاہئے کہ کیا مریم پہلے خدا کی فرمانبرداری یا عبادت نہ کرتی تھیں؟ سیدھی بات ہے۔ بعض وقت مشکلات کے لحاظ سے ایک بات کی تاکید کی جاتی ہے۔ مریم پر بھی بڑے ابتلاؤں کا وقت آنے والا تھا کہ لوگ اس پر طرح طرح کے الزام لگائیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمانبرداری کی تاکید فرمائی۔

نباء

۴۲۱ انباء۔ نَبَأ کی جمع ہے جسکے معنی ہیں ایسی خبر جس میں کوئی عظیم الشان مطلب ہو۔ اور اس سے علم یا غلبہ ظن حاصل ہو (غ)۔

غیب

الغیب اس کا استعمال ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو حاسہ سے مخفی ہو یا انسان کے علم میں نہ ہو (غ)، واقعات گزشتہ بھی اس لحاظ سے غیب میں داخل ہو جاتے ہیں جب ان کا صحیح علم نہ رہا ہو۔

واقعات گزشتہ کس حیثیت میں غیب میں داخل ہو جاتے ہیں

عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ تاریخی باتوں کو قرآن شریف نے انباء الغیب کہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت مریم صدیقہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق واقعات دنیا میں دشمن اور دوست دونوں میں نہایت غلط طور پر پیچ ہو گئے اس لئے قرآن کریم نے اصل واقعات پر عالم کو مطلع فرما کر واقعی ایک غیب پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ اور مسیح اور مریم کی اصل حقیقت کو دنیا میں ظاہر فرمایا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسی گڑبڑی میں جہاں مسیح کے اصل حالات پر خطرناک تاریکی کا پردہ پڑ چکا تھا ان کی حقیقت پر اطلاع پانا کسی عالم کا کام بھی نہ ہو سکتا تھا۔ چہ جائے کہ عرب کا ایک اُمّی ان اصل حالات کو ظاہر کرتا۔ اصل انجیل جس میں خالص حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم تھی وہ دنیا سے بالکل نابود ہو چکی تھی اور اس کی جگہ بہت سی انجیلیں لے چکی تھیں جن میں سے بعض کو کلیسا نے بلا دلیل الہامی مان لیا اور بعض کو وضعی قرار دے کر رد کر دیا اور مسیح کو خدائی کا مرتبہ دے کر اس کے خون کے کفارہ کو نجات کا موجب قرار دیا اور شریعت کو لعنت قرار دیا۔ اعمال کی ضرورت باقی نہ بھی۔ یہودیوں نے بوجہ اپنی عداوت کے جو ان کو مسیح کے ساتھ تھی کوئی صحیح حالات حضرت مسیح علیہ السلام کے باقی نہ رکھے تھے ہاں وہ ان پر طرح طرح کے ناپاک الزام لگاتے تھے۔ جب اہل کتاب کے دونوں گروہ ایک شخص کے معاملہ میں اس طرح حد بندیوں کو توڑ کر دور نکل چکے تھے اور کوئی صحیح علم حضرت مسیح کے متعلق باقی نہ رہا تھا تو اب سوائے اللہ تعالیٰ کی وحی کے ان واقعات کا صحیح علم دنیا پر دوبارہ نہ آ سکتا تھا یہ واقعی غیب کی خبر تھی جو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر فرمائی اور آج دنیا آہستہ آہستہ اس بات کی قبولیت کی طرف چلی آتی ہے جس کا اعلان آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک اُمّی نے جو ایک ناخواندہ قوم میں سے تھا دنیا میں کیا۔

مسیح اور مریم کے صحیح حالات انباء الغیب ہیں

مریم کی عصمت پر شہادت انباء الغیب ہے۔

ہٰذٰلک من انباء الغیب نوحیہ الیک کے الفاظ ایک اعلیٰ درجہ کی صداقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور دوسری وجہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کی عصمت کی شہادت کو انباء الغیب سے کیوں قرار دیا یہ ہے کہ واقعی گواہ تو اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی کی معرفت اس کی شہادت ادا کی تا دنیا اس حقیقت پر بذریعہ وحی آگاہ ہو جس سے آگاہی کا اور کوئی واقعی ذریعہ نہ رہا تھا۔

لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ۝

پاس نہ تھا جب وہ اپنی قلمیں ڈالتے تھے کہ ان میں سے کون مریم کا کفیل بنے اور نہ تو ان کے پاس تھا جب وہ آپس میں جھگڑتے تھے ۴۲۲

قَلَم قَلَم - قِلم

۴۲۲ اقلام قَلَم کی جمع ہے - اور قَلَم (ل) یا قِلم (غ) کی جمع بھی اقلام آتی ہے جو اس تیر کا نام ہے جو قمار میں کام دیتا تھا۔ اور قَلَم تیر کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ کاٹا جاتا ہے۔ کیونکہ قَلْم کے اصل معنی کاٹنے کے ہیں اس لئے ناخن کٹوانے پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں زجاج وغیرہ نے اقلام سے مراد قداح یعنی قرعہ اندازی کے تیر ہی لئے ہیں اور بعض کے نزدیک معمولی قلمیں مراد ہیں جن سے کاہن لوگ لکھا کرتے تھے۔ اور قَلَم کا لفظ تقدیرِ الٰہی کے متعلق بھی بولا جاتا ہے۔ گو اس کی کیفیت کا علم کسی انسان کو نہیں دیا گیا۔

لوح و قلم

جیسا کہ ابن سیدہ کا قول لسان العرب میں منقول ہے والقلم الذی فی التنزیل لا اعرف کیفیتہ اور ایک اعرابی کا قول نقل کیا گیا ہے سَبَقَ الْقَضَاءُ وَجَفَّتِ الْاَقْلَامُ یعنی قضاء و قدر کا فیصلہ ہو چکا اور قلمیں خشک ہو چکیں مراد یہ ہے کہ جو فیصلہ ہونا تھا وہ پہلے ہو چکا پس لوح و قلم میں بغیر کسی تشبیہ کے مراد قضاء و قدر ہے ۔

اس آیت میں کس واقعہ کی طرف اشارہ ہے بعض کے نزدیک یہ مراد ہے کہ صغر سنی میں جب وہ تعلیم و تربیت کیلئے ہیکل میں آئیں تو اس وقت کاہنوں میں جھگڑا ہوا کہ ان کا کفیل کون ہو اور بذریعہ قرعہ اندازی جو خواہ تیروں سے ہوئی یا قلموں سے حضرت زکریا مریم صدیقہ کے کفیل ہوئے اس صورت میں ماکنت لدیہم وغیرہ میں ضمیر کاہنوں کی طرف ہو گی جن کا کوئی ذکر پہلے نہیں مگر یہ کہا گیا ہے کہ چونکہ زکریا کی کفالت میں مفہوم یہ پایا جاتا ہے کہ یہ کفالت کسی جھگڑے کے بعد ہوئی تھی اس لئے ان جھگڑنے والوں کی طرف ضمیر جاتی ہے یہ بہت بعید تاویل ہے۔

حضرت مریم کی دوسری کفالت جو مریم کی بلوغت پر تھی۔

بعض مفسرین کے نزدیک یہ اشارہ کسی ایسی کفالت کی طرف ہے جو مریمؑ کے بلوغ کو پہنچ جانے کے بعد وقوع میں آئی جب زکریا اس کی کفالت سے عاجز آگئے در یعنی پہلے کوئی جھگڑا نہیں ہوا اور بعض نے دو دفعہ قرعہ اندازی لیکر اس آیت کو اسی دوسری قرعہ اندازی کے متعلق مانا ہے اور گو روح المعانی میں اس قول کو مرجوح لکھا ہے مگر فی الحقیقت اسے ترجیح ہے۔ کیونکہ قرآن کریم ایک پر نظم کلام ہے اور تمام واقعات کا ذکر ایک ترتیب سے ہوتا چلا آرہا ہے پہلے مریم کی پیدائش کا ذکر کیا پھر اس کی کفالت زکریا کا ذکر پھر اسی ذکر میں زکریا علیہ السلام کی دعا اور یحییٰ کی بشارت کا ذکر ضمنی طور پر آگیا۔ اس کے بعد پھر اصل ذکر کی طرف رجوع کیا تو مریمؑ کے اصطفاء و پاکیزگی برگزیدگی کا ذکر کیا۔ اسے فرمانبرداری اور عبادت کا حکم دیا۔ یہ واقعات یقیناً زمانہ بلوغت سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اس کے بعد پھر ایک گزشتہ واقعہ کی طرف اشارہ کرنا بلاغت کے خلاف ہے پس یہ آیت یقیناً اس وقت کی طرف اشارہ کرتی ہے جب مریم صدیقہ سن رشد کو پہنچ چکی تھیں اب ان کی تربیت کا زمانہ ختم ہو گیا اور وہ ہیکل میں نہ رہ سکتی تھیں۔ اس لئے بھی کہ بلوغت کے ساتھ ایام حیض کا آنا ضروری تھا اور یہود میں ایام حیض کے اندر عورت کو ناپاک سمجھ کر الگ رکھا جاتا تھا پس یہاں جس کفالت کا ذکر ہے اس سے مراد کفالت نکاح ہے۔

مریم صدیقہ کا نکاح

ایک سن بلوغ کو پہنچی ہوئی عورت کیلئے اب یہ ضروری تھا کہ اس کے نکاح کا فکر کیا جاتا۔ اور مریم کی ماں نے مریم کو خدمت دین کے لئے نذر کر دینے کے بعد بھی یہ دعا مانگ کر کہ انی اعیذھا بك وذریتها۔ بتا دیا تھا کہ تارکہ بٹھانا اس کا منشا ہرگز نہ تھا۔ اور نہ تارکہ بٹھانے کا بنی اسرائیل میں کوئی دستور معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ ہیکل کی خدمت کیلئے وقف ہو چکی تھیں اس لئے انہیں یہ اختیار نہ تھا نہ انکی والدہ کو یا والد کو اختیار تھا کہ ان کے نکاح کی تجویز کریں۔ بلکہ اس کے متعلق قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنا مناسب سمجھا گیا۔

قرعہ اندازی

کیونکہ وہ بہت سے کام قرعہ اندازی سے کر لیا کرتے تھے۔ اور اسے خدائی فیصلہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ خود کہانت کے کام کے سرانجام دینے میں قرعہ اندازی کو خدائی فیصلہ سمجھا جاتا تھا جیسا کہ اناجیل میں مرقوم ہے "اور جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے موافق اس کے نام کا قرعہ نکلا کہ خداوند کے مقدس میں جا کر خوشبو جلائے" (لوقا ۱ - ۸ و ۹) باقی رہا ذکر خصومت سو یہ بھی کوئی بعید از قیاس بات نہیں ایسی نیک اور پاک بی بی کو اپنی زوجیت میں لانے کی خواہش بہتیرے دلوں میں

۴۴ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ

جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلام کیساتھ خوشخبری دیتا ہے ۴۲۳

پیدا ہوتی ہوگی علاوہ انیں وہ ہیکل کی نذر ہو چکی تھیں گویا ماں باپ کا یا اپنا اختیار تو اس معاملہ میں رہا نہ تھا۔ اس لئے مناسب یہی سمجھا گیا کہ بذریعہ قرعہ اندازی ہی اس کا فیصلہ ہو پس یہاں گویا درحقیقت یہ ذکر ہے کہ مریم کے لئے خاوند کا فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا گیا اور ضمیریں اس صورت میں عام ہیں یعنی وہ لوگ جو اس وقت تھے +

مریم کی بریت کی شہادت

اور یہ جو فرمایا کہ تم ان کے پاس نہ تھے تو اس میں یا تو یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مریم علیہا السلام کی بریت کی شہادت ایک ایسے شخص کی طرف سے ہے جس کا تعلق فریق مقدمہ سے کوئی نہیں اس لئے یہ نہایت سچی اور بے لوث شہادت ہے اور یا اس لحاظ سے کہا کہ وہ واقعات تمہارے ذریعہ سے ظاہر کئے جاتے ہیں جن کا علم دنیا میں مفقود ہو چکا تھا تم تو ان کے پاس نہ تھے پس یہ علم غیب سوائے خدا کے کون ظاہر کر سکتا تھا۔

اصطفائے روحانی میں ذکر خصومت

اں ایک امکان یہ بھی ہے کہ یہ مریم کے اصطفائے روحانی کی طرف اشارہ ہو ملائکہ کا ذکر پہلے آچکا ہے اور قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کی برگزیدگی کے وقت ملاء اعلیٰ میں ایک خصومت ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا ماکان لی من علم بالملاء الاعلیٰ اذ یختصمون (صٓ ۳۸۔ ۶۹) مجھے ملاء اعلیٰ کے متعلق کوئی علم نہ تھا جب وہ جھگڑتے تھے۔ اس صورت میں اقلام سے مراد قضا و قدر ہو سکتی ہے جیسا کہ اس لفظ کے معنی میں پہلے بیان ہو چکا ہے اور ملائکہ کی طرف اس کو منسوب کرنا اس لئے درست ہے کہ گو سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے مگر وہ ملائکہ کی وساطت سے ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ خدا ہی کلام کرنے والا ہے مگر یہاں قول ملائکہ کی طرف منسوب ہے +

کلمۃ اللہ سے مراد

۴۲۳ ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ اس کے معنی میں نے یوں کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلام کے ذریعہ بشارت دیتا ہے۔ مگر عام طور پر اس کے معنی یوں کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ایک کلمہ کی بشارت دیتے ہیں اس معنی کے لحاظ سے گویا مسیح کو اللہ تعالیٰ کا ایک کلمہ کہا گیا ہے اور عیسائیوں کا اس پر بہت زور ہے۔ کہ مسیح کو کلمۃ اللہ کہکر قرآن شریف نے ایک ایسی خصوصیت دیدی ہے۔ جو دوسرے کسی نبی کو نہیں دی۔ اور پھر اس خصوصیت کی بنیاد پر مسیح کو خدا بنایا جاتا ہے یہی وہ دلیل ہے جو وفد نجران نے نبی کریم صلعم کے مقابلہ پر پیش کی۔ اور یہی وہ دلیل ہے جس پر آج بھی عیسائی زور دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے کیسا لطیف جواب بھی ان لوگوں کو دیدیا تھا

اصول اور خصوصیات کی بحث

کہ اس کی بشریت یا خدائی کا فیصلہ اصولی رنگ میں کرو۔ کیا جس شخص کے ساتھ کھانے پینے۔ قضائے حاجت کی ضروریات۔ ماں کے رحم میں رہنے۔ پیدا ہونے بڑھنے۔ جوان اور پھر بوڑھا ہونے کے پھر وفات پانے کے عوارض پائے جاتے ہوں اس کو بشر کہیں گے یا خدا۔ مگر ہر ایک باطل پرست کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ اصولی بحث سے گریز کرتا ہے اور خصوصیات میں جا کر پناہ ڈھونڈھتا ہے۔ اب اگر یہ بھی مان لیں کہ مسیح کو کلمۃ من اللہ کہا گیا ہے اور اور کسی نبی کا نام لیکر اس کے ساتھ کلمۃ اللہ کا لفظ نہیں بولا۔ تو کیا اس سے مسیح کی خدائی ثابت ہو سکتی ہے یا بشریت کے دائرہ سے وہ نکل جاتا ہی۔ یہ محض ایک دعویٰ ہے جس کی دلیل کوئی نہیں۔ کہ کیونکر صرف اس خصوصیت سے دائرہ بشریت سے نکل کر مسیح خدا بن جاتا ہے۔ پھر مسیح کو تو کلمۃ منہ کہا یعنی اپنی طرف سے ایک کلمہ۔ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکیلا ہی کلمہ نہیں

برمئے قرآن کلمات اللہ بہت ہیں

بلکہ کلموں میں سے ایک کلمہ ہی اور اپنے کلمات کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قل لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی (الکہف ۱۸۔ ۱۰۹) کہ اگر میرے رب کے کلمات کیلئے سمندر بھی سیاہی بن جائیں تو میرے رب کے کلمات اس قدر لاتعد و لا تحصے ہیں کہ سمندر ختم ہو جائیں مگر وہ کلمات ختم نہ ہوں۔ تو کیا صاف ظاہر نہیں کہ اس لا انتہا تعداد میں سے جو اللہ تعالیٰ کے کلموں کی ہے ایک کلمہ مسیح بھی ہے پس خصوصیت بھی کوئی نہ رہی۔ پھر کلمۃ منہ کے معنی تو صرف اس قدر ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک کلام ہے۔ اب جب

کلمہ یا قول کے آنے سے مراد

کوئی شخص کوئی بات کرے اور وہ بات پوری ہو جائے تو کہتے ہیں جاء کلامہ یا جاء قولہ۔ اس کا کلام یا اس کا قول آگیا۔ اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ کلام یا قول مجسم ہو کر آگیا۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جو اس نے کہا تھا وہ پورا ہو گیا ہے پس اس معنی میں مسیح کو کلمۃ اللہ

اِسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا

اس (مبشَّر) کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے ۴۲۴ جو دنیا اور آخرت میں وجاہت والا

کہہ سکتے ہیں۔ کہ خدا نے ایک بات کہی تھی وہ مسیح کے آنے سے پوری ہوگئی پس مسیح کے آنے میں گویا خدا کا کلام آگیا۔ چنانچہ یہی توجیہ مفسرین نے پسند کی ہے۔ جیسا کہ امام رازی کہتے ہیں انه قد وردت البشارة فی کتب الانبیاء الذین کانوا قبله فلما جاء قیل هذا هو تلك الکلمة یعنی ان نبیوں کی کتابوں میں جو اس سے یعنی مسیح سے پہلے گزر چکے تھے مسیح کے متعلق بشارت تھی پس جب مسیح آیا تو کہا گیا کہ وہ کلمہ آگیا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نسبت فرماتے ہیں انا دعوة ابی ابراهیم۔ میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔ حالانکہ آپ کوئی دعا نے مجسم تو نہ تھے۔ مگر چونکہ آپ کے وجود میں حضرت ابراہیم کی دعا پوری ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ نے اپنے آپکو دعا کہہ دیا۔

آنحضرت کا اپنے آپکو دعائے ابراہیم قرار دینا

کلمہ کی دوسری توجیہ

دوسری توجیہ یہ ہے کہ یبشرك بکلمة منه میں ب ذریعہ کے لئے ہے یعنی معنی یہ ہیں کہ اے مریم اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلمہ کے ساتھ بشارت دیتا ہے۔ اور یہ بعینہ اسی طرح ہے جیسے حضرت ابراہیم کو اسحاق کی بشارت دی تو آپ نے فرمایا فبم تبشرون تو جواب اس کا یوں دیا گیا بشرناك بالحق ہم تمہیں حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں یہ مراد نہیں کہ الحق کی بشارت دیتے ہیں۔ اب یبشرك بکلمة منه اور بشرناك بالحق بالکل ایک جیسی مثالیں ہیں۔ اگر ایک کے ذریعہ سے مسیح کلمۃ اللہ بن سکتا ہے۔ تو دوسرے کے ذریعہ اسحاق الحق بن سکتا ہے۔ حالانکہ بات صرف اس قدر ہے کہ ایک جگہ تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ساتھ بشارت دیتا ہے اور دوسری جگہ مراد ہے کہ ہم تم کو حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں۔ اس صورت میں مفعول کو محذوف کرکے اس کی بجائے فرما دیا اسمه المسیح وہ جس کی بشارت ہم دیتے ہیں۔ اس کا نام مسیح ہے۔ تو کلمة منه سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کی پیشگوئی ہے۔ اور اسی کی موید یہ بات ہے کہ کلمة منه کے بعد فرمایا اسمه۔ حالانکہ کلمة مؤنث ہے پس اسمه میں ضمیر مبشر بہ کی طرف جائیگی یعنی اس کا نام جسکی بشارت دیجاتی ہے

اسم

۴۲۴ اِسْم۔ وہ ہے جس سے ایک چیز کی ذات اور اس کا اصل پہچانا جانے (غ) اسم سے مراد علَم بھی ہوتا ہے اور یہ اسم سمہ اور بلحاظ معنی لغوی علامت ممیزہ بھی ہوتے ہیں (ل) یہاں دونوں معنوں کو جمع کر دیا ہے۔ کیونکہ المسیح جس کو مقدم کیا ہے وہ لقب ہے۔ جو بعد نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ملتا ہے اور ابن مریم آپ کی کنیت ہے +

مسیح

نام کی وجہ تسمیہ

الْمَسِيْح۔ مَسْح کے معنی کسی چیز پر ہاتھ کا پھیرنا۔ اور اس سے اثر کا دور کر دینا ہے (غ)، اور پھر ان دونوں معنوں میں الگ الگ بھی استعمال ہوتا ہے وعُبِّرَ عن السَّيْرِ بالمَسْحِ (غ)، اور سیر یعنی چلنے کو بھی مسح کہتے ہیں قیل سُمِّيَ عیسٰی علیه السلام مسیحا لکونه ماسحًا فی الارضِ ای ذاهبًا فیها یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام مسیح اس لئے رکھا گیا کہ وہ زمین میں چلنے والے یا سیاحت کرنے والے تھے۔ اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت مسیح علاوہ ملک شام کے دوسرے ممالک میں بھی پھرتے رہے اور کہ وہ افغانستان اور کشمیر میں آئے اور اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل زمانہ قید میں کچھ جلا وطن ہو کر افغانستان وغیرہ کی طرف چلے آئے تھے اور افغان اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہتے ہیں اور افغانستان اور کشمیر کے شہروں کے ناموں میں اور افغانوں اور کشمیریوں کے رسم و رواج میں بھی اس کی شہادت ملتی ہے ضرور تھا کہ مسیح ان اسرائیلی اقوام کی طرف بھی آتے۔ دیگر وجوہات یہ دی ہیں کہ آپ کے ہاتھ لگانے سے بیمار اچھے ہو جاتے تھے یا آپ ماں کے پیٹ سے ممسوح بالدُّهن پیدا ہوئے تھے۔ اور پھر لکھا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ مسیح وہ ہے جس کی ایک آنکھ ماری ہوئی ہو۔ وقد رُوِیَ ان الدجال ممسوحُ الیُمنٰی وعیسٰی ممسوح الیسرٰی قال ویعنی بان الدجال قد مُسِحَتْ عنه القوة المحمودةُ من العلم والعقل والحلم والاخلاق الجمیلة وان عیسٰی مسحت عنه القوة الذمیمة من الجهلِ والشَّرَهِ والحرصِ وسائرِ الاخلاقِ الذمیمةِ (غ) اور روایت کی گئی ہے کہ دجال کی دائیں آنکھ ماری ہوئی ہوگی اور عیسیٰ کی بائیں آنکھ ماری ہوئی ہوگی اور مراد اس سے یہ ہے کہ دجال سے علم اور عقل اور حلم اور اچھے اخلاق کی قابل تعریف قوت جاتی رہی

مسیح کا کشمیر وغیرہ میں آنا

مسیح کی بائیں اور دجال کی دائیں آنکھ نہ ہونے سے مراد

۴۵ وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

اور مقربوں میں سے ہوگا ۴۲۵ اور وہ لوگوں سے جھولے میں اور ادھیڑ عمر میں باتیں کریگا اور نیکوں میں سے ہوگا۔ ۴۲۶

ہوگی۔ اور عیسیٰ سے جہل اور لالچ اور حرص اور برے اخلاق کی قابل نفرت قوت جاتی رہی ہوگی۔ امام راغب کی اس تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کا کانا ہونا محض بلحاظ صفات ہے اور ان بزرگوں نے ان پیشگوئیوں کو مجاز اور استعارہ پر حمل کیا ہے +

وجیہ

۴۲۵ وجیہ کے معنی ہیں ذوجاہ یا ذووجاھۃ یعنی مرتبہ یا وجاہت والا۔ حضرت موسیٰ کے متعلق فرمایا وکان عند اللہ وجیھا (الاحزاب ۳۳: ۶۹) اللہ تعالیٰ کے انبیاء سب ہی وجاہت والے ہوتے ہیں۔ یہاں اشارہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ سمجھیں گے کہ یہ شخص ذلیل ہوگیا مگر ایسا نہ ہوگا بلکہ اسے دنیا میں بھی ضرور وجاہت حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی جس قدر تاریخ حضرت مسیح کی عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بظاہر انہیں ایک ذلت کی حالت میں چھوڑتی ہے۔ کیونکہ ان کا خاتمہ چوروں کے ساتھ صلیب پر ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ انبیاء کو کچھ نہ کچھ کامیابی دیکر اٹھاتا ہے حضرت عیسیٰ کے متعلق وجیہ فی الدنیا فرمانا یہی معنی رکھتا ہے کہ لوگ انہیں ناکام سمجھینگے مگر فی الحقیقت وہ کامیابی کے بعد اٹھائے جائینگے یہ کامیابی حضرت عیسیٰ کو یہود بیت المقدس میں حاصل نہیں ہوئی۔ ان الفاظ سے یہ خیال اور بھی قوت پکڑتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعہ صلیب کے بعد بنی اسرائیل کی دوسری قوموں کی طرف چلے گئے جو بخت النصر کے زمانہ میں جلاوطن ہوکر دوسرے ممالک میں آباد ہوچکی تھیں +

مسیح کو وجیہ کہنے کی وجہ

حضرت عیسیٰ کا دوسری اقوام اسرائیل میں جانا

مسیح کا مقرب ہونا

ومن المقربین یعنی حضرت عیسیٰ خدا کے مقربوں میں سے ایک ہیں کہتے ہیں ڈوبتا ہوا تنکے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے۔ وہی حالت بعض وقت عیسائی مشنریوں کی ہوجاتی ہے۔ یہ بھی کہدیتے ہیں۔ کہ چونکہ قرآن نے مسیح کو مقرب کہا اور مقرب ملائکہ ہوتے ہیں اسلئے مسیح کو بشر سے اوپر مانا ہے۔ چونکہ قرآن کریم سے محض بے خبر ہیں اُن کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ جن مقربین میں سے مسیح کو کہا ہے ان مقربین میں اُمت محمدیہ کا ایک گروہ بھی داخل ہے۔ السابقون السابقون اولئٓک المقربون (الواقعۃ ۵۶: ۱۰، ۱۱) یعنی سابقین اس اُمت کے مقربین بارگاہ الٰہی ہیں۔ اور دوسری جگہ ہے عینا یشرب بہا المقربون (التطفیف ۸۳: ۲۸) وہاں بھی اُمتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گروہ کو ہی مقرب قرار دیا ہے جیسا کہ اس سے پہلے الفاظ ان کتاب الابرا ر سے ظاہر ہے پس جب صلحاء بھی مقربین بارگاہ الٰہی ہیں تو حضرت مسیح کو خصوصیت سے مقربوں میں سے ایک کہنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ انبیاء بدرجہ اولیٰ مقرب ہوتے۔ سو بات یہ ہے کہ یہودیوں نے عداوت سے اور عیسائیوں نے بیوقوفی سے (ضلالت محبت میں) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ ملعون قرار دیا کیونکہ دونوں ان کی صلیب پر موت مانتے ہیں اور ملعون وہ ہے جو خدا سے دور کیا گیا ہو اسلئے اس الزام لعنت سے صاف کرنے کے لئے قرآن کریم نے مسیح کو من المقربین کہا ہے۔ اور دوسری جگہ اس قرب کو لفظ رفع سے ظاہر کیا ہے۔ اور من المقربین خود بتاتا ہے کہ مسیح کے علاوہ اور بھی مقرب ہیں +

مسیح کو مقرب کہنے کی ضرورت

مہد

۴۲۶ المھد۔ مھد کے ایک معنی ۲۶۵ میں بیان ہوئے ہیں خصوصیت سے اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو بچے کے لئے تیار کی جاتی ہے یعنی جھولا +

کہل

کہل۔ کہل کی عمر کی مختلف حدیں اہل لغت نے بیان کی ہیں مگر صحیح وہ ہے جو راغب نے لکھا ہے اور لسان العرب میں بھی ہے کہ کہل وہ ہے جس کے سیاہ بالوں کے اندر سفید مل گئے ہوں +

صالح

الصالحین۔ صالح۔ صلاح سے ہے جو فساد کی ضد ہے اور ان دونوں کا اکثر استعمال افعال میں ہے (غ) مگر خود قرآن شریف میں لئن اٰتیتنا صالحا (الاعراف ۷: ۱۸۹) میں صالح سے مراد صحیح سالم ہے جیسا کہ اس سے اگلی آیت میں فلما اٰتٰھما صالحا کہکر واضح کردیا۔ کیونکہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کی صلاحیت افعال کی فوراً معلوم نہیں ہوتی صلاحیت جسم کی معلوم ہوتی ہے

قَالَتْ رَبِّ أَنّٰى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۴۶

اس نے کہا میرے رب میرے بیٹا کب ہوگا اور مجھے کسی انسان نے چھوا نہیں فرمایا اسی طرح ہوگا اللہ جو چاہتا ہی پیدا کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے وہاں صلحا کے معنی ولدا سویا قد صلح بدنہ کئے ہیں (مف)۔ اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ صلاح کبھی استوائے خلق یعنی صحیح سالم ہونے میں ہوتی ہے اور کبھی دین میں +

مسیح کا جھولے میں اور بڑھاپے میں باتیں کرنا اور صالح ہونا

اس آیت میں تین باتیں بیان کی ہیں حضرت مسیح کا جھولے میں باتیں کرنا۔ بڑھاپے میں باتیں کرنا۔ صالح ہونا سب بچے عموماً جھولے میں ہی باتیں کرنا سیکھتے ہیں۔ کیونکہ دو سال کی عمر تک جھولے میں رہتے ہیں لیکن حضرت مسیح کے متعلق جو یہ الفاظ آئے ہیں تو ان سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ آپ کا بچپن میں باتیں کرنا معجزہ تھا۔ اور اس کی بشارت دی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ چونکہ کہولت میں باتیں کرنے کا ذکر ہے۔ اس لئے اس کو بھی معمولی حالت سے الگ کر کے نزول ثانی میں باتیں کرنے پر محمول کیا گیا ہے لیکن اس کی غلطی خود اسی سے ظاہر ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کو یہ بشارت دینے کے کیا معنی؟ کیا ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول ثانی کا مسئلہ بھی بتا دیا گیا تھا؟ اور اگر بتانا ہی تھا تو یہ بتایا جاتا کہ اسے آسمان پر زندہ اٹھایا جائیگا۔ اور پھر آخری زمانہ میں نزول ہوگا اتنی بات بتانے سے کہ وہ حالت کہولت میں لوگوں سے باتیں کرے گا ان کو یہ کس طرح پتہ لگ سکتا تھا کہ کسی نزول ثانی کا ذکر ہے۔ پھر یہ دو تو معجزے ہوگئے۔ تیسری بات آپ کا صالح ہونا آیا یہ بھی معجزہ تھا؟

جھولے کے کلام پر بحث

انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا انکار کوئی مسلمان نہیں کرسکتا۔ لیکن مفسرین کو یہاں خود یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ حضرت مسیح کا جھولے میں باتیں کرنا کس کا معجزہ تھا؟ حضرت مسیح کا؟ تو وہ ابھی نبی نہیں بنے۔ اس لئے اس کو ارہاص کہنا پڑا۔ حضرت مریم کا تو وہ نبی نہیں۔ یوں

لکڑی کی آواز معجزات نبوی میں سے ہے

اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ ایک بچہ کو چھوڑ کر خشک لکڑی سے بھی کلام کرا دے جیسا کہ نبی کریم کے ٹیک لگانے کی لکڑی کی آواز آپ کے معجزات میں گنی گئی ہے سوال صرف یہ ہے کہ آیا قرآن و حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ معجزہ ہے۔ اول۔ حضرت مریم کو یہ تو بتایا نہیں گیا کہ یہ بچہ نبی ہوگا صرف یہ بتایا گیا کہ وجیہ ہوگا مقرب ہوگا۔ اور مقرب ہونے کے لئے نبی ہونا ضروری نہیں۔ پھر آپ کے معجزات پر کیونکر ایک بے محل کلام شروع کردیا۔ دوم ماں کو بچہ کی بزرگی۔ دینی اور دنیوی صلاح کی خبر سے تو خوشی پہنچتی ہے اس بشارت سے کیا حاصل کہ وہ ایک معجزہ بھی دکھائیگا سوم اگر معجزات کی بشارت ہی مریم صدیقہ کو سنانی تھی تو جو اس سے بڑے بڑے معجزات تھے ان کا ذکر کیوں نہ کیا۔ چہارم جو کلام اس سے مراد لیا گیا ہے وہ وہ ہے جس کا ذکر سورۃ مریم میں ہے اِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا وَّجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَتِي (مریم ۱۹: ۳۰-۳۲) اس پر مفصل بحث تو اپنے موقعہ پر ہوگی لیکن اس قدر یہاں ظاہر کردینا ضروری ہے کہ یہ کلام جھولے کے بچہ کا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی ہے۔ مجھے نبی بنایا ہے۔ مجھے بابرکت بنایا ہے جہاں کہیں جاؤں مجھے نماز کا حکم دیا ہے اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ جبتک میں زندہ ہوں ماں سے نیکی کرنے والا بنایا ہے۔ اب یہ سب کلام ایک بالغ انسان کا ہے جو نہ صرف مکلف ہوچکا ہے بلکہ جسکو کتاب و نبوت مل چکی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کتاب و نبوت ملنے کے یہ معنی ہیں کہ انجیل آپ پر وحی ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے پہلے فرما دیا تھا کہ ہم تم کو نبی بناتے ہیں اور یہ بالبداہت غلط ہے۔ علاوہ ازیں ابھی آگے آتا ہے ويعلمه الكتاب والحكمة والتوراة والانجيل جس سے معلوم ہوا کہ انجیل کے نزول سے پہلے آپ لکھنا بھی جانتے تھے اور حکمت کی باتوں سے بھی آگاہ ہوچکے تھے اور تورات بھی پڑھ چکے تھے آخر اس معمہ کو بھی حل کرنا چاہئے کہ ایک دن کا بچہ یہ سب کچھ سیکھ چکا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی اس پر نماز اور زکوٰۃ فرض ہوچکی تھی اور مادمت حیا کی شرط نے بتا دیا کہ اس وقت بھی فرض تھی جب یہ کلام کر رہے تھے۔ اگر بچپن کا کلام ہوتا تو بجائے اس کے یوں ہوتا کہ مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب میں بلوغت کو پہنچ جاؤں +

اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○

جب کسی امر کا فیصلہ کر دیتا ہے تو اسے کہتا ہے ہو پس وہ ہو جاتا ہے ۴۲۷

صالح ہونے سے مراد

پھر ان الفاظ کا کیا مطلب ہے ؟ تین باتیں بتائی ہیں ۔ طفولیت میں کلام کرنا ۔ کہولت کی حالت میں کلام کرنا ۔ صالح ہونا ۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں صالح سے مراد نیک کام کرنے والا نہیں بلکہ صحیح سالم تندرست بچہ مراد ہے ۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اوپر آپ کو مقرب بارگاہ الٰہی کہدیا تو اب یہ بتانا کہ وہ نیک کام کرنے والا ہو گا تحصیل حاصل ہے ۔ نیک کام کرنے والے ہی مقرب ہوا کرتے ہیں ۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں حضرت مریم کو جب فرزند کی خوشخبری دی تو فرزند کے متعلق جن باتوں کا خیال والدین کو ہوتا ہے وہ بھی بتا دیں ۔ دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا ۔ مقرب بارگاہ الٰہی ہوگا یعنی کمال روحانی کو حاصل کرے گا کوئی جسمانی نقص بھی اس میں نہ ہوگا ۔ اور وہ بڑھاپے کی عمر کو بھی پہنچے گا یعنی

مہد و کہولت کی باتوں سے مراد

لمبی عمر بھی پائیگا ۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے قویٰ کے صحیح سالم ہونے کا علم تو فوراً ہو جاتا ہے مگر یہ بات کہ وہ باتیں بھی کرے کچھ مدت کے بعد ظاہر ہوتی ہے ۔ اس لئے اس کی الگ خوشخبری بھی سنا دی پھر یہ بات کہ وہ عمر بھی پائیگا یہ بھی دیر میں ظاہر ہوتی ہے اس لئے اس کی خوشخبری بھی علیحدہ کر کے سنا دی ۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہو کہ بچپن میں اس کی باتیں معمولی بچوں سے بڑھکر ذہانت کی باتیں ہونگی اور بڑی عمر کو پہنچ کر اس کا کلام معمولی لوگوں سے بڑھکر پر حکمت کلام ہوگا ۔

بشارت کے ذکر میں نفی الوہیت مسیح

لیکن قرآن کریم ایک ایسا پر حکمت کلام ہے کہ ایک ذکر کرنے سے کئی کئی باتیں بتا دیتا ہے ۔ حضرت مریم کو جو خوشخبری دی اس کا ذکر قرآن شریف میں آخر کیوں کیا ۔ ظاہر ہے کہ اس سارے بیان کی اصل غرض تو عیسائیوں پر اتمام حجت ہے ۔ اس لئے جب وجیہ فی الدنیا کہا تو بتا دیا کہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ درست نہیں کہ دنیوی طور پر حضرت مسیح کو کوئی عزت حاصل نہیں ہوئی بلکہ ان کا خاتمہ ماریں کھاتے کھاتے ہو گیا اور آخرت میں وجیہ کہکر یہ بتا دیا کہ یہودی بھی غلطی پر ہیں ۔ اور مقرب کہکر یہودیوں اور عیسائیوں کے اس خیال کی تردید کی کہ آپ نعوذ باللہ من ذالک ملعون ہوئے کیونکہ ملعون یعنی مطرود یا راندہ درگاہ کے مقابلہ پر مقرب بارگاہ الٰہی ہے ۔ اور عیسائی بھی آپ کو تین دن کیلئے ملعون قرار دیتے ہیں ۔ اور مہد اور کہولت کا ذکر کر کے یہ بتا دیا کہ آپ پر وہ تمام تغیرات آئے جو بچوں پر چھوٹے کی حالت سے لیکر کہولت تک آتے ہیں یعنی بڑھے جوان ہوئے پھر بڑھاپا آیا یعنی انحطاط شروع ہوا اور یوں تردید الوہیت کی ۔ اور اس کا اعتراف مفسرین کو بھی ہے وذکر احواله المختلفة المتنافية ارشاد الى انه بمعزل عن الالوهية (ض) جن لوگوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان

کھانا کھانے کے ذکر میں نفی الوہیت

باتوں کو صرف بوجہ ان کے معجزہ ہونے کے ہی ذکر کیا حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ کے متعلق کھانا کھانے کا ذکر کیا کانا یاکلان الطعام (المائدۃ ۔ ۵ ۷) جس میں مراد نفی الوہیت ہے ۔ ورنہ کھانا تو ساری دنیا کھاتی ہے ۔ حضرت مریم کے آپ کو حمل میں لینے کا ذکر کیا ۔ درد زہ کے ساتھ جننے کا ذکر کیا یہ سب کچھ عام طور پر ہوتا ہے ۔ غرض یہ ہے کہ یہ خدا نہیں ہو سکتا اور مہد اور کہولت کے ذکر کی اصل غرض ہے کہ خدا تعالیٰ پر یہ تغیرات نہیں آسکتے ۔

۴۲۷ جس طرح حضرت زکریا کو باوجود دعا کے اور اس یقین کے کہ اس کی دعا رد نہ ہوگی بیٹے کی خوشخبری ملی تو ان کا خیال فوراً اس طرف گیا کہ اس قدر رکاوٹ کے باوجود کہ میں بڈھا ہو گیا اور میری عورت بانجھ ہے ۔ بچہ کب ہو گا کس طرح ہو گا اسی طرح حضرت مریم کو جب بیٹے کی بشارت ملتی ہے تو وہ متعجب ہوتی ہیں کہ بچہ کب پیدا ہو گا یا کس طرح ہو گا جب ابھی تک مرد کے ساتھ تعلق ہی نہیں ہوا ۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ایک ہی جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے یا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے ۔

حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش اسلامی عقائد میں داخل نہیں عیسائیت کا اصول ہے ۔

عیسائی حضرت مسیح کی پیدائش بن باپ مانتے ہیں اور مسلمان بھی عموماً ایسا ہی مانتے ہیں مگر عیسائیوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو بن باپ نہیں مانتے اور مسلمانوں میں بھی ۔ ہاں ان دونوں میں ایک فرق ہے ۔ اگر فی الواقع حضرت مسیح بن باپ پیدا نہیں ہوئے تو اس سے مسلمانوں کے کسی عقیدہ میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا ۔ کیونکہ ان کو بن باپ پیدا شدہ ماننا ان کے عقاید میں داخل نہیں ۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۴۷

اور وہ اسے کتاب اور حکمت اور تورات

لیکن عیسائیت کی عمارت کی بنیاد ہی اُکھڑ جاتی ہے اگر یہ ثابت نہ ہوسکے کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ اگر وہ باپ رکھتے تھے تو نہ روح القدس سے حضرت مریم حاملہ ہوئیں نہ مسیح میں الوہیت تھی نہ کفارہ صحیح رہا۔ پس حضرت مسیح کا بن باپ پیدا نہ ہونا عیسائیت کو بیخ و بن سے اُکھاڑتا ہے۔ اور اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ ایک مسلمان حضرت مسیح کی نبوت کا اس صورت میں بھی قائل ہے کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے ہوں اور اس صورت میں بھی کہ بن باپ پیدا نہ ہوئے ہوں۔ وہ صرف اس قدر دیکھ لے گا کہ قرآن کریم نے کیا فرمایا ہے یا نبی کریم صلعم کی احادیث سے کیا ثابت ہے اگر ان دونوں میں بن باپ پیدا ہونا مذکور ہو تو وہ مان لیگا ورنہ نہیں

بن باپ پیدا ہونے میں وجہ فضیلت نہیں

نہ ہی اگر وہ بن باپ پیدا ہوئے ہوں تو اس سے ان کی کوئی فضیلت ان انبیاء پر ثابت ہوتی ہے جو باپ سے پیدا ہوئے۔ کیونکہ یوں تو حضرت آدم اور حوا بھی بن باپ پیدا ہوئے اور بائیبل میں ملک صدق کا ذکر موجود ہے جو "بے باپ بے ماں" تھا دیکھو عبرانیوں ۷: ۳ تو اس صورت میں یہ تینوں حضرت مسیح سے بھی افضل ٹھہرے مگر یہ استدلال ہی غلط ہے کہ بن باپ پیدا شدہ انسان بڑا ہوتا ہے

مسلمان مریم کا روح القدس سے حاملہ ہونا نہیں مانتے

علاوہ ازیں ایک مسلمان یہ بھی نہیں مانتا کہ حضرت مریم روح القدس سے حاملہ ہوئی تھیں۔ اگر وہ بن باپ بھی پیدا ہوئے تو یہ محض ایک عجوبہ قدرت خالقیت ہے کہ حضرت مریم میں دونوں قسم کی طاقتیں رکھدی تھیں بلکہ یہ معجزہ بھی کوئی نہیں اس لئے کہ معجزہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس پر کسی کی شہادت ہو کوئی دیکھنے والا اس کا گواہ ہو گا بغیر خاوند کے حمل ہونے کی گواہی سوائے مریم کے کوئی دوسرا دے ہی نہیں سکتا یہ کرامت یا معجزہ کیا ہوگا۔ پس ہم نے صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ قرآن شریف یا احادیث نبوی سے اس بارہ میں کیا معلوم ہوتا ہے

نسل انسان کی پیدائش کے متعلق خدا کا بیان کردہ قانون

اب اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اس نے نسل انسانی کے لئے یہ قانون بنایا ہے۔ ثم جعل نسله من سللة من ماء مهين (السجدۃ ۳۲: ۸) یعنی آفرینش اول کے بعد اس کی نسل کو نطفہ سے چلایا ہے۔ اور فرماتا ہے انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج (الدھر ۷۶: ۲) ہم انسان کو مرد و عورت کے ملے ہوئے نطفہ سے پیدا کرتے ہیں۔ پس جبتک اللہ تعالیٰ بالتصریح یہ نہ فرمائے کہ عیسیٰ کو ہم نے اپنے اس قانون کے خلاف یا الگ رنگ میں پیدا کیا تھا اس وقت تک یہی ماننا ہوگا کہ وہ اسباب جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے وہ اسی رنگ کے تھے

قدرت کا سوال نہیں

یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کوئی سوال نہیں کہ اس کو ایسا کرنے کی قدرت ہے یا نہیں۔ اس کو بغیر باپ چھوڑ کر ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا کرنے کی قدرت ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ قرآن شریف سے یا حدیث صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔ اور جب وہ خود ایک قانون بتاتا ہے تو جبتک خود ہی نہ فرماتے کہ فلاں معاملہ میں اس نے اس قانون کے خلاف اپنی قدرت کا اظہار دکھایا اس وقت تک خود بخود ہمارا کسی امر کو اس قانون کے خلاف سمجھ لینا جائز نہیں پس اگر کوئی شخص قرآن کریم کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کا بن باپ پیدا ہونا تسلیم کیا گیا ہے تو وہ ایسا مانے میرے نزدیک یہ نتیجہ الفاظ قرآنی سے نہیں نکلتا گو میں اس مسئلہ کو اس قدر اہمیت نہیں دیتا مگر تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ نیک نیتی سے جو کچھ منشائے قرآن مجید ہے اس کو ظاہر کردے۔ حضرت عیسیٰ کو باپ والا یا بن باپ ماننے سے ہمارے دینی اعتقادات یا ہمارے عمل پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوتا۔

مس بشر

کیا الفاظ لم یمسسنی بشر سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے۔ لم یمسسنی میں گزشتہ کا ذکر ہے کہ مجھے بشر نے نہیں چھوا اس میں آیندہ کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن کہا جائیگا کہ ہر ایک عورت جانتی ہے کہ بیٹا خاوند سے ہوتا ہے مریم کو یہ کہنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ یہ اس لئے کہ حضرت مریم ہیکل میں رہتی تھیں، اور انہیں ابھی علم بھی نہ تھا کہ ان کا نکاح ہونے والا ہے۔

توریت وانجیل کی تاریخی شہادت

توریت و انجیل میں بیشک تحریف ہوئی ہے لیکن آخران کی پیشگوئیوں میں بہت کچھ صداقت موجود رہی ہے۔ اسی طرح تاریخی واقعات میں جس بات کو قرآن کریم نہ جھٹلائے اس کے رد کرنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں۔ اب اناجیل سے ثابت ہے کہ حضرت مریم کے ساتھ

وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾

اور انجیل سکھائے گا ۴۲۸

یوسف کا مریم سے تعلق زوجیت اور اولاد کا ہونا

یوسف کا تعلق زوجیت کا تھا۔ اور اسی تعلق سے آپ کے ہاں بہت سی اولاد بھی ہوئی۔ ذیل کی عبارتیں قابل غور ہیں:۔

"پس یوسف..... اپنی بیوی کو اپنے ہاں لے آیا اور اس کو نہ جانا جبتک وہ بیٹا نہ جنی" (متی ۱: ۲۴ و ۲۵)۔ "جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ رہا تھا تو دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے باتیں کرنی چاہتے تھے کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں" (متی ۱۲: ۴۶ و ۴۷) "کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں؟ اور اس کی ماں کا نام مریم اور اسکے بھائی یعقوب اور یوسف اور شمعون اور یہوداہ نہیں؟ اور کیا اس کی سب بہنیں ہمارے ہاں نہیں؟" (متی ۱۳: ۵۵) بہنوں کے لئے جمع کے صیغہ سے معتبر بائبل نے یہ صاف استدلال کیا ہے کہ کم سے کم تین بہنیں آپ کی تھیں بعض مفسرین نے اس مصیبت کو یوں ٹالنا چاہا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ یوسف کی پہلی بیوی کی اولاد تھی۔ اور حضرت مریم ان کی دوسری بیوی تھیں۔ مگر ایک طرف تعلق زوجیت کا حضرت مریم اور یوسف میں موجود ہونا خود اناجیل سے ظاہر ہے دوسری طرف ماں کے ساتھ بھائیوں کا آنا صاف بتاتا ہے کہ یہ اسی ماں کی اولاد تھے۔ سوتیلے بھائی ہوتے تو مریم سے ان کا کیا تعلق تھا۔ تیسرے کہیں بھی سوتیلے بھائی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اور جب لفظ بھائی مطلقاً استعمال کیا جائیگا تو اس سے مراد حقیقی بھائی لیا جائیگا پس یہ انجیلی شہادت صاف بتاتی ہے کہ حضرت مریم کا تعلق زوجیت تو یوسف کے ساتھ ضرور ہوا اور اس تعلق سے اولاد بھی پیدا ہوئی اور اگر ایک طرف لم یمسسنی بشر اس وقت کے بعد مس بشر سے مانع نہیں تو دوسری طرف تاریخی ثبوت کھلا کھلا موجود ہے کہ واقعی میاں بیوی کے تعلقات حضرت مریم اور آپ کے شوہر میں رہے +

حدیث کی شہادت کہ حضرت مسیح معمولی حالات میں حمل میں آئے اور پیدا ہوئے۔

والتی احصنت فرجہا (الانبیاء ۲۱-۹۱) سے بھی اس کے خلاف دلیل نہیں پکڑی جاسکتی۔ کیونکہ احصان کے معنی قید نکاح میں آنا ہے۔ جیسا کہ اپنے موقعہ پر دکھایا جائیگا۔ حدیث ایک بھی ایسی نہیں ملتی کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ہو کہ حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے ہیں بلکہ آپ کی جو گفتگو وفد نجران کے ساتھ لکھی ہے جس کو میں اوپر ۳۶۲ میں نقل کرچکا ہوں اس میں نبی کریم صلعم کے یہ صاف الفاظ مروی ہیں الستم تعلمون ان عیسیٰ حملتہ امہ کما تحمل المرأۃ کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ کو اس کی ماں نے حمل میں لیا جس طرح عورتیں بچوں کو حمل میں لیا کرتی ہیں۔ اور عورتیں بچوں کو اپنے خاوندوں سے ہی حمل میں لیتی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھکر صفائی سے جب عیسائیوں نے یہ سوال کیا۔ وقالوا لہ من ابوہ یعنی اس کا باپ کون ہے تو آپ نے یہ جواب نہیں دیا کہ اس کا باپ کوئی نہیں بلکہ جواب میں فرمایا الستم تعلمون انہ لا یکون ولد الا وھو یشبہ اباہ کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں مگر وہ اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے یہ بتا دیا کہ حضرت عیسیٰ کا باپ انسانوں میں سے ہی کوئی ہے کیونکہ اس کی شکل انسانوں سے ملتی ہے اگر آنحضرت صلعم نے اسبات کو ظاہر کرنا ہوتا کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوا تو جیسا کہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے یوں فرماتے کہ وہ آدم کی طرح بن باپ ہے یا کلمہ کن سے پیدا ہوا ہے۔ پس یہ تمام امور اس بات پر دلیل ہیں کہ قرآن کریم حضرت عیسیٰ کی پیدائش بن باپ بیان نہیں کرتا۔ اور لم یمسسنی بشر آیندہ مس بشر سے مانع نہیں ہوا +

۴۲۸ ویعلمہ الکتاب ..... یہ کس پر عطف ہے کسی نے کہا کہ یبشرک (آیت ۴۴) پر عطف ہے بعض نے کہا آیت سابقہ میں یخلق پر عطف ہے یعنی کذلک اللہ یخلق ما یشاء ویعلمہ الکتاب ..... مگر صحیح یہ ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور واؤ استئناف کے لئے ہے جو ابتدائے کلام میں آجاتی ہے گویا یہ الگ کلام ہے +

کتاب

الکتاب سے یہاں مراد کتابت ہے یعنی ہاتھ سے لکھنا (د-ث) حکمت کے معنی بھی پہلے بیان ہوچکے ہیں۔ یہاں حضرت عیسیٰ کو چار چیزوں کے سکھانے کا ذکر فرمایا ہے۔ تعلیم کے معنی ۱۵۸ میں بیان ہوچکے ہیں جہاں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کو علم

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۵ ۴۸

اور وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول (بنایا گیا) ۴۲۹

حضرت عیسیٰ کی تعلیم کس طرح پر ہوئی

دینا دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک جو بذریعہ وحی دیا جاتا ہے۔ دوسرا جو ان ذرائع سے انسان حاصل کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے دئے ہیں۔ اس طرح پر انبیاء کو بھی علم حاصل ہوتا ہے۔ یہاں کس قسم کی تعلیم مقصود ہے بعض نے کہا بذریعہ وحی بعض نے کہا بذریعہ توفیق و ہدایت جو علم حاصل کرنے کے لئے دی۔ مگر صورت اول صحیح نہیں اس لئے کہ کتابت یعنی لکھنے کا علم تو معمولی طور پر حاصل کیا جاتا ہے اور اسی طرح توریت کا علم بذریعہ اُستاد کے حضرت مسیح نے حاصل کیا جیسا کہ بعض روایات سے ثابت ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کتاب سے مراد جنس کتب الٰہی ہو۔ تو اس صورت میں کتاب اور حکمت اور توریت و انجیل کا علم دینے سے مراد ان کا فہم بذریعہ وحی خفی دینا مراد ہو۔ اس میں بھی کوئی ہرج نہیں کہ ان چار چیزوں کا علم الگ الگ طریق پر دیا گیا ہو یعنی کتابت اور توریت کا علم تو اسباب معمولی سے ہو۔ اور حکمت یعنی فہم اور انجیل کا علم بذریعہ وحی دیا گیا ہو۔

رسولا الی بنی اسرائیل

۴۲۹ و رسولا الی بنی اسرائیل۔ اس کو یعلمہ پر عطف قرار دے کر یجعلہ مقدر مانا گیا ہے یعنی و یجعلہ رسولا الی بنی اسرائیل اور اللہ تعالیٰ اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنائیگا اور وہ یوں یوں کہے گا۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کر رہے ہیں چنانچہ ان سب اقوال کے بعد فلما احس عیسیٰ منہم الکفر قال من انصاری الی اللہ ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ درمیان میں سے ان تمام واقعات کو جو حضرت مریم کے آپ کو حمل میں لینے جننے آپکے بلوغ روحانی کو پہنچنے وغیرہ کے متعلق ہیں ترک کر دیا گیا اور بعض ان واقعات کا ذکر سورہ مریم میں جو اس سے پہلے کی نازل شدہ ہے آبھی چکا ہے، اور اس زمانہ کا ذکر شروع کر دیا ہے جب حضرت عیسیٰ کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا اور تقدیر عبارت یوں سمجھی جائے گی وجعل رسولا الی بنی اسرائیل یعنی حضرت عیسیٰ جب پیدا ہو کر بلوغ روحانی کو پہنچے تو انہیں بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اسی وقت کو دیکھ کر بعض مفسرین نے بھی فلما احس عیسیٰ منہم الکفر کے نیچے لکھدیا ہے کہ رسولا الی بنی اسرائیل سے نیا کلام شروع ہوتا ہے جو کلام ملائکہ میں داخل نہیں اور تقدیر عبارت یوں نکالی ہے فجاء عیسیٰ کما بشرہ اللہ تعالیٰ رسولا الی بنی اسرائیل یعنی جب عیسیٰ آگئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بشارت دی تھی درانحالیکہ وہ رسول تھے بنی اسرائیل کی طرف۔

حضرت عیسیٰ کا صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونا

اس موقعہ پر قرآن کریم نے یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اصل میں صرف قوم اسرائیل کی طرف رسول تھے جس زمانہ میں نبی کریم صلعم کی بعثت ہوئی اس وقت عیسائی مذہب بہت سی قوموں میں پھیلا ہوا تھا۔ یہانتک کہ عیسائی بعض اقوام عرب کو بھی عیسائی کر چکے تھے اور باقی کو کرنے کی کوشش میں تھے پس کوئی شخص عیسائی مذہب کی حالت کو دیکھکر ہرگز یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ حضرت عیسیٰ صرف بنی اسرائیل کیطرف رسول ہو کر آئے لیکن جب اصلیت پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصل پیغام حضرت مسیح کا بنی اسرائیل تک ہی محدود تھا۔ چنانچہ متی میں ذیل کا قصہ جو ایک کنعانی عورت کے متعلق لکھا ہے صاف اسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے "اور دیکھو ایک کنعانی عورت ان سرحدوں سے نکلی اور پکار کر کہا کہ اے خداوند ابن داؤد مجھ پر رحم کر..... اس نے جواب میں کہا کہ میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ مگر اس نے آکر اسے سجدہ کیا اور کہا اے خداوند میری مدد کر اس نے جواب میں کہا کہ لڑکوں کی روٹی لیکر کتوں کو ڈال دینی اچھی نہیں اس نے کہا ہاں خداوند کیونکہ کتے بھی ان ٹکڑوں میں سے کھاتے ہیں جو ان کے مالکوں کی میز سے گرتے ہیں اس پر یسوع نے جواب میں اس سے کہا اے عورت تیرا بڑا ہی ایمان ہے جیسا چاہتی ہے تیرے لئے ویسا ہی ہو" (متی ۱۵-۲۲ سے ۲۸) اب اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیح سوائے بنی اسرائیل کے "اور کسی کے پاس" نہیں بھیجے گئے۔ ہاں دوسروں پر وہ اتنے مہربان ہو سکتے ہیں کہ جو روٹی بچے نہ کھائیں وہ کتوں کے آگے پھینکدی جائے اس لئے جب یہودیوں نے آپکے پیغام کو رد کر دیا

دوسری اقوام کو کتوں کی حیثیت دینا

أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ

کہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک بات لایا ہوں ۴۳۰ کہ میں تمہارے لئے کیچڑ سے پرندی کی شکل کی مانند اندازہ کرتا ہوں ۴۳۱

یہود سے مایوسی پر دوسری اقوام کی طرف توجہ۔

تو دوسری قوموں کو معلوم ہوتا ہے اسی حیثیت سے جس کا اوپر ذکر ہوا حضرت مسیح کے حواریوں نے داخل کرلیا۔ چنانچہ پولوس کی تقریروں سے اسبات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ جب یہودیوں کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو پھر دوسری قوموں کی طرف رُخ شروع ہوا۔ مگر حضرت مسیح کا پیغام بلاشبہ فی الاصل صرف بنی اسرائیل تک محدود تھا جب مذہب نے ایک دوسرا رنگ اختیار کرلیا اور اس کو بت پرستوں کی قبولیت کے قابل بنا دیا گیا۔ کیونکہ بت پرستی سے ملتے جلتے عقائد اس میں داخل ہو گئے تو پھر سارا رخ دوسری اقوام کیطرف ہو گیا +

حضرت مسیح اُمت محمدیہ میں نہیں آسکتے۔

ایک اور امر جس کا یہ آیت فیصلہ کرتی ہے یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اُمت محمدیہ کی اصلاح کے لئے نہیں آسکتے نہ ہی دین اسلام کی توسیع تمام اقوام میں انکا کام ہو سکتا ہے اگر انہوں نے اُمت محمدیہ کے لئے بھی رسول ہونا ہوتا تو قرآن کریم میں یہ لفظ جو ان کے کام کی صحیح حدبندی کرتے ہیں وارد نہ ہوتے پس جس شخص پر یہ حکم لگ چکا ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کے لئے رسول ہوگا۔ اس کا ساری دنیا کی طرف رسول بننا محال ہے۔ مسلمانوں کو آنحضرت صلعم کے بعد کسی دوسرے نبی سے مستغنی کرنے کے لئے ہی یہ کلمات سکھائے تھے رضیت باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیا محمد صلعم کے بعد جو کافۃ الناس کی طرف مبعوث ہو گئے اور جن کا زمانہ نبوت قیامت تک ممتد ہے کسی دوسرے رسول یا نبی کا محتاج اپنے آپ کو سمجھنا اس نعمت عظمیٰ کی ناشکر گزاری ہے پس حدیث میں جو ابن مریم کے آنے کی پیشگوئی ہے اس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ اس اُمت میں سے کوئی شخص ابن مریم کے رنگ میں آجائے جس طرح الیاس کے دوبارہ آنے کی پیشگوئی یوں پوری ہوئی کہ حضرت یحییٰ الیاس کے رنگ میں آگئے دیکھو ۱۲۴ حضرت عیسےٰ کو قرآن کریم کی یہ تصریح اُمت محمدیہ میں آنے سے روکتی ہے

۴۳۰ انی قد جئتکم بعض نے یہاں مخبرا یا ناطقا مقدر سمجھا ہے۔ مگر خود لفظ رسول میں پیغام کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لئے جب رسول بنائے جانے کا ذکر آیا تو ساتھ ہی جو کچھ اس رسول کی بعثت کا عظیم الشان مقصد تھا وہ ظاہر کر دیا اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم الشان بات لاتے ہیں +

خلق کے معنی تجویز کیلئے بولا جاتا ہے۔

۴۳۱ اخلق یخلق کے معنی کے لئے دیکھو ۳۳ والخَلْقُ لَا يُسْتَعْمَلُ فِي كَافَّةِ النَّاسِ اِلَّا عَلٰی وَجْهَيْنِ اَحَدُهُمَا فِي مَعْنَى التَّقْدِيْرِ ..... والثانی فی الکذب (غ) اور کل لوگوں کے حق میں لفظ خلق صرف دو معنی میں بولا جاتا ہے۔ ایک اندازہ کرنے کے معنی میں اور دوسرا جھوٹ کے معنی میں۔ اندازہ کے معنی کی مشہور مثال شاعر کا قول ہے ولَاَنْتَ تَفْرِیْ مَا خَلَقْتَ ۔ وَبَعْضُ الْقَوْمِ يَخْلُقُ ثُمَّ لَا يَفْرِیْ یعنی تو جو ارادہ یا اندازہ یا تجویز کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے اور عمل میں لے آتا ہے لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تجویزیں تو کرتے رہتے ہیں مگر ان کو عمل میں نہیں لاتے اسی طرح ضرب المثل ہے ماخلقت الا فریت و ما وعدت الا وفیت یعنی میں نے کوئی تجویز نہیں کی مگر اسے عمل میں لا دکھایا اور میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا مگر اسے پورا کر دکھایا جھوٹ کے معنی میں تخلقون افکا قرآن شریف میں آیا ہے احسن الخالقین۔ (المومنون ۲۳: ۱۴) کے صحیح معنی احسن المقدرین ہی ہیں کیونکہ جہاں یہ لفظ آتا ہے وہاں وقتا بعد وقت مختلف حالتوں میں انسان کے بننے کا سوال ہے یعنی حالت نطفہ حالت علقہ۔ حالت مضغہ وغیرہ۔ اور صحیح یہی ہے کہ خلق کا لفظ پیدا کرنے کے معنی میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے پر بولنا جائز نہیں گو بعض نے یہ کہدیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے لئے یہ لفظ بولا گیا ہے مگر جیسا کہ میں آگے چلکر ثابت کروں گا قرآن کریم اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اور یہ کہنا کہ چونکہ یہاں لفظ من الطین موجود ہے اس لئے مادہ سے خلق کرنے میں اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے امتیاز ہو گیا یہ بھی درست نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بھی دونوں طرح خلق کرتا ہے مادہ سے بھی اور بغیر مادہ بھی۔ جیسے کہ ۳۳ میں دکھایا گیا۔ بیضاوی نے اخلق لکم کے معنی کئے ہیں اقدر لکم اور یہی درست ہے +

خلق پیدا کرنے کے معنی میں صرف اللہ تعالیٰ کیلئے بولا جاتا ہے۔

لکم میں ل انتفاع کے لئے ہے اور مراد ہے تمہاری بھلائی کے لئے +

فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ

پھر اسکے اندر پھونکتا ہوں پس وہ اللہ کے حکم سے اُڑنے والا ہو جاتا ہے [۴۳۲]

طین — الطین۔ طین اس مٹی کو کہتے ہیں جس میں پانی ملا ہوا ہو۔ اور اگر اس سے پانی کا اثر جاتا بھی رہے تو بھی اس کو طین ہی کہا جاتا ہے (غ) قرآن کریم میں خلقِ انسان کو طین سے قرار دیا گیا ہے۔ بالمقابل وہ ہستیاں جو جن کے نام سے موسوم ہیں ان کی پیدائش نار یعنی آگ سے بتائی گئی ہے۔ بہ نسبت دوسرے عناصر کے طین یا مٹی میں اثر کی قبولیت کی استعداد بہت زیادہ ہے ♦

ھیئۃ **ھیئًا** — ھیئۃ۔ ھیئۃ اس حالت کا نام ہے جس پر کوئی چیز ہو خواہ وہ حالت محسوس ہو یا معقول (غ) یعنی حواس سے اس کا علم حاصل ہوتا ہو یا عقل سے۔ اسی مادہ سے ہے وھیّئ لنا من امرنا رشدا (الکہف [۱۵]-۱۰) ویھیّئ لکم من امرکم مرفقا (الکہف [۱۵]-۱۶)

طائر — الطیر۔ طائر ہر ایک جانور کو کہتے ہیں جو پر رکھتا ہے اور ہوا میں اُڑتا ہے اور طائر بمعنی عمل بھی قرآن مجید میں آیا ہے وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ (غ) اور طائر انسان کا وہ حظ ہے جو علم الٰہی میں اس کے لئے مقدر ہو ما حصل لہ فی علم اللّٰہ مما قدر لہ (ن) اور طیر۔ طائر کی جمع ہے اور واحد پر بھی بولا جاتا ہے (ل) اور طیر کی جمع طُیُور آتی ہے۔ اور حدیث میں آتا ہے الرُّؤیا لاوّل عابر وھی علی رجلِ طائرٍ۔ جہاں طائر کی تشریح یوں کی گئی ہے۔ کُلّ حرکۃٍ من کلمۃٍ او جارٍ یجری فھو طائر مجازًا اراد علٰی رجلِ قدرٍ جارٍ وقضاءٍ ماضٍ من خیرٍ او شرٍ (ل) یعنی ہر ایک حرکت کسی کلام کی یا کسی جاری ہونے والے امر کی مجازًا طائر ہے اور حدیث میں علٰی رجلِ طائرٍ کہنے سے منشاء یہ ہے۔ کہ وہ ایک ایسے قدر یا اندازہ کے جو چلا جا رہا ہو اور ایسی قضا کے جو گزر رہی ہو پاؤں پر ہے۔ قرآن کریم اور حدیث سے یہ مثالیں طائر کے معنی پر یہ دکھانے کے لئے بیان کی گئی ہیں کہ مجازًا اس لفظ کا استعمال ایسے معنوں پر کیا گیا ہے جو پہلے لغت میں موجود نہ تھے ♦

نفخ — ۴۳۲ نفخ۔ نفخ کے معنی پھونکنا ہیں۔ روح کے ساتھ بھی یہی لفظ نفخ آتا ہے۔ جیسے آدم کے متعلق ونفخت فیہ من روحی (الحجر [۱۵]-۲۹) ہر انسان کے متعلق ونفخ فیہ من روحہ (السجدۃ [۳۲]-۹) مریم کے متعلق فنفخنا فیھا من روحنا (الانبیاء [۲۱]-۹۱) مگر جہاں بغیر روح کے لفظ نفخ آیا ہے وہاں نفخ روح مراد نہیں بلکہ محض پھونکنا ہے خواہ حقیقی طور پر ہو یا بطور استعارہ جیسے قال انفخوا حتّٰی اذا جعلہ نارًا (الکہف [۱۸]-۹۶) جہاں آگ پر پھونکنا یا آگ کا جلانا مراد ہے۔ یا نفخ فی الصور میں جہاں بگل میں پھونکنا یا بگل بجانا مراد ہے اور لفظ نفخ کا استعمال بطور حقیقت و بطور استعارہ احادیث میں بھی ہوا ہے۔ انہ نھی عن النفخ فی الشراب پانی میں پھونک مارنے سے آپ نے منع فرمایا۔ کیونکہ اس کے اندر تھوک پانی کے اندر جاتا ہے اور کراہت کا موجب یا بعض امراض کا موجب ہوتا ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے اعوذ باللّٰہ من نفخہ ونفثہ جہاں نفخ سے مراد شیطان کا حقیقی طور پر پھونکنا نہیں بلکہ روح شیطانی کا انسان کے اندر آ جانا ہو اور وہ روح شیطانی استکبار ہے چنانچہ نفخہ کی تشریح شارحین حدیث نے کبرہ کی ہے (ن) یعنی استکبار شیطانی چونکہ یہاں لفظ نفخ کے ساتھ روح نہیں اس لئے نفخ روح یہاں مراد لینا صحیح نہیں یہ اسی قسم کا مگر پاک نفخ ہے جیسے حدیث میں ایک نفخ کا ذکر ہے گو وہ ناپاک شیطانی نفخ ہے۔ شیطان کا نفخ کرنا اپنی ناپاکی یا کبر کا دوسرے میں پھونکنا ہے اور نبی کا نفخ کرنا اپنی پاکیزگی یا فرمانبرداری کا دوسرے میں نفخ کرنا ہے ♦

پانی میں پھونکنے کی ممانعت نبیؐ اور شیطان کا نفخ

باذن اللّٰہ — باذن اللّٰہ۔ اِذن کے معنی کیلئے دیکھو ۲۴۳ گو اِذن میں مشیت پائی جاتی ہے مگر مشیت سے اس صورت میں کیا مراد ہے اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے ایمان لانے پر بھی باذن اللّٰہ بولا گیا ہے جیسے وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللّٰہ (یونس [۱۰]-۱۰۰) اور نیکی میں ترقی کرنے پر بھی ومنھم سابق بالخیرات باذن اللّٰہ (فاطر [۳۵]-۳۲) مشیت کے ہونے سے جیسا کہ راغب نے لکھا ہے مراد یہی ہے کہ چونکہ انسان کے قویٰ کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے پس جو کچھ اثر وہ قویٰ قبول کرتے ہیں وہ بھی باذن اللّٰہ ہی ہوتا ہے اس لئے جب ظالم کسی پر ظلم کرے اور اس کو دکھ پہنچے تو اس پر بھی باذن اللّٰہ کہدیا جائیگا۔ گو اس کا یہ منشا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہوتا ہو کہ ایسا ہو پس باذن اللّٰہ سے نتیجہ نکالنا

وَاُبْرِئُ

اور اللہ کے حکم سے

کہ کوئی خاص امر ہے جو اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کرتا تھا مگر حضرت مسیح کو اس نے اپنی طرف سے اجازت دیدی تھی اور اسلئے اس صفت میں وہ اللہ تعالیٰ کی خاص اجازت سے شریک ہو گئے درست نہیں۔ اذن کے لئے مشیت ضروری ہے اور اس کی مشیت کے یہ خلاف ہے کہ اس کی مخلوق اس کی کسی صفت میں کامل طور پر شریک ہو۔

حضرت عیسیٰ کا پرند یا چمگادڑ بنانا

مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعی پرند بنایا کرتے تھے اور مشہور یہ ہے کہ آپ نے سوائے چمگادڑ کے اور کوئی جانور پیدا نہیں کیا (د) اب یہاں آکر دو گروہ ہو گئے ہیں ابن جریر کی ایک روایت میں تو ہے کہ حضرت عیسیٰ لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے تو آپ نے کچھ گیلی مٹی لیکر کہا کہ میں اس سے پرند بنا دوں تو انہوں نے کہا کہ کیا تم ایسا کر سکتے ہو۔ عیسیٰ نے کہا ہاں۔ تب عیسیٰ نے ایک پرند کی شکل بنا کر اس میں پھونکا تو وہ پرند بن گیا اور دوسری روایت کی رو سے یہ ایک اقتراحی معجزہ تھا۔ اور بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ چمگادڑ بنا کر بتاؤ تب ہم ایمان لائینگے اس لئے حضرت عیسیٰ نے چمگادڑ کو بنایا مگر تعجب یہ ہے کہ اقتراحی معجزہ دیکھکر بھی ایمان نہ لائے۔ حالانکہ دوسری طرف یہ بھی مذہب ہے کہ اقتراحی معجزات نہیں دکھائے جاتے۔
لیکن وہب کہتے ہیں کان یطیر ما دام الناس ینظرون الیہ فاذا غاب عن اعینہم سقط میتا لتمیز عن خلق اللہ تعالیٰ بلا واسطہ (د) یعنی وہ اُڑتا تھا جبتک لوگ اسے دیکھتے رہتے تھے جب نظر سے غائب ہو جاتا تو مردہ ہو کر گر جاتا تا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق بلا واسطہ میں اور اس خلق میں تمیز رہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ جب نظر سے غائب ہو کر گرا تو تمیز کہاں رہی لوگوں کے نزدیک تو خدا کی خلق میں اور حضرت عیسیٰ کی خلق میں کوئی تمیز نہ رہی پھر اگر یہ بچپن کا قصہ ہے تو معلوم نہیں بچپن میں جب ابھی دعوی نبوت ہی نہیں اس معجزہ کے دکھانے سے حاصل کیا۔ اور معجزہ دکھایا بھی معمر لڑکوں کو جاتا ہے۔ اب اگر حضرت عیسیٰ فی الواقع پرند بناتے تھے۔ تو دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ پرند دوسرے پرندوں کی طرح جاندار بن کر ان میں مل جل جاتے ہونگے۔ اور یا محض پرندوں کی شکل تو بن جاتی ہوگی۔ مگر ایک تماشہ کے طور پر اُن کا اُڑنا ایک آنی نظارہ ہوگا۔ اور پھر وہ مٹی کی مٹی رہ جاتی ہوگی۔ اس دوسرے خیال کی تائید میں وہب سے روایت ہے اور اسی کو حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مجدد صدی چہاردہم نے بھی قریب قریب تسلیم کیا ہے۔ اب ہم اس کو ایک اصول کے ماتحت لا کر محکمات اور متشابہات کے قانون کے رنگ میں اس پر بحث کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کوئی شخص فی الواقع خدا کی مخلوق جیسی مخلوق بنا سکتا ہے۔ گو وہ خدا کے اذن سے ہی ایسا کرے اور گو وہ نبی ہو اور یہ امر بطور ایک اعجاز کے ہو۔

خلق اشیاء خاصہ صفات باری ہے

اب جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو خلق یعنی پیدا کرنا صرف ذات باری کا خاصہ قرار دیا گیا ہے خواہ وہ خلق مادہ سے ہو یا بغیر مادہ اس کے ثبوت میں اول یہ آیت ہے ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیہم (الرعد [13] - ۱۶) جسکے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ اپنا ایک عام قانون بیان فرماتا ہے۔ قل اللہ خالق کل شئ یعنی نہ صرف یہی غلط ہے کہ معبودان باطل نے کسی چیز کو پیدا کیا ہو۔ پھر وہ دونوں قسم کی مخلوق مل جل گئی ہو بلکہ دنیا میں اللہ کے سوا کوئی بھی کسی چیز کا خالق نہیں۔ دوسری جگہ فرماتا ہے خلق کل شئ فقدرہ تقدیرا (الفرقان [25] - ۲) اسی نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا پھر اس کے لئے ایک قانون اور ایک حد بست مقرر کردی۔ پھر فرمایا ربنا الذی اعطی کل شئ خلقہ ثم ھدی (طٰہٰ [20] - ۵۰) ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر ایک چیز کو اُس کی پیدایش بھی عطا فرمائی۔ پھر اس کو اس کا کمال حاصل کرنے کی راہ بھی بتائی۔ اور اس سے بڑھکر ان لوگوں کے متعلق جنکو خدا بنا لیا گیا ہے۔ اور بھی صراحت فرمائی جیسا کہ سب سے پہلی آیت میں ایسا ہی فرمایا والذین یدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئا وھم یخلقون اموات غیر احیاء وما یشعرون ایان یبعثون (النحل [16] - ۲۰ و ۲۱) اور وہ لوگ جنہیں (یہ کافر) سوائے اللہ کے پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور وہ سب فوت بھی ہو چکے ہیں۔ کوئی ان میں سے زندہ نہیں اور اُن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب وہ دوبارہ اُٹھائے جائینگے۔ اسی کے مطابق سورہ فرقان میں فرمایا پس اللہ تعالیٰ نے خلق یا پیدا کرنے کے متعلق اپنا قانون اصولی رنگ میں یہ بیان فرمایا کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے۔ اور کہ اللہ کے سوا، کوئی خالق نہیں۔ اور جن لوگوں کو معبود بنا لیا گیا ہے۔ اُنھوں نے کوئی خلق نہیں کی اور ایسا

الاکمہ

شبکور

اس صفت میں ہمارا شریک نہیں ہوسکتا

کبھی ہو نہیں سکتا۔ کہ انسان کی بنائی ہوئی چیز اور خدا کی خلق کی ہوئی چیز ایسی مل جل جائیں۔ کہ ان میں امتیاز نہ رہے۔ ایسا ہی فرمایا افمن یخلق کمن لا یخلق (النحل ۱۶: ۱۷) کیا جو خلق کرتا ہو وہ اُس جیسا ہو سکتا ہے جو خلق نہیں کرتا۔ اب اگر مسیح کا خلق طیور مانا جائے تو مسیح من یخلق ہونے کی وجہ سے انسانوں جیسا نہ ہوا بلکہ خدا جیسا ہوا تو چونکہ قرآن کریم میں اختلاف نہیں ہے ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا۔ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اختلاف ہوتا۔ اس لئے یہ کسی صورت میں قابل تسلیم نہیں۔ کہ بار بار یہ قانون باندھ کر کہ اللہ کے سوا کوئی کسی چیز کا خالق نہیں۔ اور پھر یہ بتا کر کہ جن لوگوں کو معبود بنایا گیا ہے اُنہوں نے ہرگز ہرگز کسی چیز کو پیدا نہیں کیا۔ پھر خود ہی یہ کہدے کہ مسیح نے بھی کچھ پرند پیدا کئے تھے۔ اس طرح پر صورت اول یعنی مسیح کا سچ مچ کے پرند بنا دینا جن پر ظاہری لغوی معنی کی رو سے لفظ طیر کا صادق آسکے باطل ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ محکمات قرآنی اور تصریحات کلام ربانی کے خلاف ہے۔ اور یہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا کہ حضرت مسیح خدا کے اذن سے خلق کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے خلاف اذن نہیں دیتا جب خلق کو اس نے اپنی صفت خاص بیان فرمایا ہے جس میں مخلوق کسی صورت میں شریک نہیں ہو سکتی تو اس کے خلاف اذن دینا گویا اپنی صفت کو ہی باطل کرنا ہے ۔

طیور کی توجیہ کہ وہ جلد مٹی ہو جاتے تھے

اب دوسری صورت یہ ہے کہ جو کچھ حضرت مسیح بناتے تھے وہ اصلی اور حقیقی پرند تو نہ تھے۔ بلکہ محض پرند کی شکل ہوتی تھی۔ جیسے مٹی کے کھلونے پرندوں کی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔ بال و پر و چونچ وغیرہ ان کے اندر کچھ چیز نہ تھی جس کی وجہ سے حقیقی طور پر لفظ پرند یا طیر کا ان کے لئے استعمال ہو سکے جیسے مٹی کے کھلونے پرندوں وغیرہ کی شکل میں بنے ہوئے بازار میں ملتے ہیں۔ ایسے ہی وہ بھی ہونگے اور حضرت مسیح کے نفخ سے صرف ایک آنی نظارہ ان کے پرواز کا نظر آجاتا ہوگا جیسا کہ وہب نے بیان کیا ہے۔ تو اس صورت میں گو تشابہ فی الخلق واقع نہ ہونے کی وجہ سے محکمات مذکورۂ بالا کے خلاف تو یہ امر نہیں ٹھہرتا مگر اس صورت میں اول تو لفظ طیر کا استعمال مجاز کے رنگ کا ہوا نہ حقیقت کے طور پر کیونکہ وہ واقعی پرند نہ تھے بلکہ ان کی شکل پرند سے مشابہ تھی۔ اور باوجود لفظ طیر کے مجازی معنی لینے کے اس میں اعجاز کا رنگ یا نبی کی شان کے شایان کوئی کام نہ رہا بلکہ زیادہ تر ایک کھیل اور تماشہ کی صورت رہی۔ اور نبی کی شان سے یہ امر بعید ہے کہ ان لوگوں کی طبائع کو جن کی اصلاح کے لئے وہ آتا ہے ایسے کھیلوں کی طرف متوجہ کرے۔ کیا اس سے کسی پر اتمام حجت ہو سکتا ہے یا کوئی غرض اصلاح نفوس کی پوری ہو سکتی ہے نہ تو یہ فعل مخالف کیلئے مسکت ہو سکتا ہے۔ اور نہ مسیح کے پیرو خود اس سے کوئی روحانی فائدہ حاصل کر سکتے تھے ۔

کلام برنگ مجاز ہے

اب بحث مذکورہ بالا سے یہ تو عیاں ہے کہ طیر کے ظاہری لغوی معنی پرند مفہوم آیت کو محکمات قرآنی کے خلاف ٹھہراتے ہیں۔ پس یہاں مجاز اور استعارہ کے رنگ کا کلام ماننا لازمی ہے۔ اور جب قرآن کریم میں مجاز اور استعارہ بہت مقامات پر پایا جاتا ہے۔ اور اصول یہی ہے کہ جب قرائن یا محکمات ظاہر معنی لینے کے مانع ہوں تو مجاز ماننا پڑتا ہے۔ تو یہاں مجاز ماننے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور وہب نے جو صورت پیش کی ہے وہ درحقیقت طیر کے استعمال کو برنگ مجاز اور استعارہ ہی قرار دیتی ہے نہ بطور حقیقت علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے کلام میں مجاز اور استعارہ کا استعمال بہت پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ شاگردوں نے یہ اعتراض بھی کیا۔ کہ آپ تمثیلوں میں لوگوں سے باتیں کرتے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں تو مسیح نے کہا "اس لئے میں اُن سے تمثیلوں میں بات کرتا ہوں۔ کہ وے دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سُنتے ہوئے نہیں سُنتے"۔ (متی ۱۳: ۱۳) حالانکہ یہ بھی تمثیل ہی ہے پھر لکھا ہے کہ "یہ سب باتیں یسوع نے ان جماعتوں کو تمثیلوں میں کہیں اور بے تمثیل ان سے نہ بولتا تھا۔ تاکہ جو نبی نے کہا تھا پورا ہو کہ میں تمثیلیں لا کر کلام کرونگا" (متی ۱۳: ۳۴، ۳۵) پس یہ وجہ ہو کہ کیوں مسیح کا کلام اللہ تعالیٰ نے بھی تمثیل کے رنگ میں بیان فرمایا ہے۔ اب اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم اور کتب مقدسہ نے جہاں اس رنگ کے مجاز کو استعمال کیا ہے وہاں عموماً صورت یہی ہے کہ وہ جسمانیات سے اکثر روحانیات کی طرف لے جاتے ہیں۔ مثلاً زمین کے مردہ ہونے کا ذکر ہے تو مراد اس سے روحانی موت ہے۔

مسیح کے کلام میں کثرت مجاز

روحانیات کا ذکر جسمانیات میں۔

وَالْاَبْرَصَ

اور پھلبہری والے کو اچھا کرتا ہوں ۴۳۳

اندھوں اور بہروں کا ذکر ہے تو مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی آنکھوں اور کانوں سے کام نہیں لیتے۔ بارش کا ذکر ہے تو مراد وحی الٰہی کا نزول ہے تاریکی کا ذکر ہے تو جہالت مراد ہے۔ دن اور روشنی کا ذکر ہے تو نور ایمان مراد ہے۔ اسی طرح چار پایوں سے کسی قوم کو مشابہت دی تو مراد فہم سے کام نہ لینا یا زمینی باتوں پر جھکے رہنا ہے کسی کو گدھا کہا تو مراد یہ ہے کہ جو کتابیں اس نے پڑھی ہیں وہ ایک بوجھ کے طور پر تو ہیں لیکن انسان جو ان سے فائدہ حاصل کرتا ہے وہ نہ ہوا کسی قوم کو بندر بنایا تو مراد یہ ہے کہ وہ اچھے افعال کی نقل کرتے ہیں مگر حقیقت ان میں کوئی نہیں۔ اسیطرح ہم دیکھتے ہیں کہ طیر کو جو امتیازہ دوسرے جانداروں پر حاصل ہے وہ پرواز کرنا یا زمین سے اوپر اُٹھنا ہے پس جب طیر کا لفظ کسی نبی کے کلام میں بطور استعارہ استعمال ہو جیسا کہ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں کہ یہاں سوائے استعارہ ماننے کے چارہ نہیں تو استعارہ میں اصل ذکر اسی مابہ الامتیاز امر کا ہوگا یعنی زمین سے اوپر اُٹھکر پرواز کرنا جیسا کسی کے متعلق فرمایا اخلد الی الارض وہ زمین کے ساتھ لگ گیا مراد یہ ہے کہ زمینی چیزوں کی طرف مائل ہوگیا۔ اور اوپر کی طرف اسکی توجہ نہ ہوئی پس بہ رنگ استعارہ یہاں طیر سے مراد ایسے لوگ ہیں جو زمین اور زمینی چیزوں سے اوپر اُٹھکر خدا کی طرف پرواز کرسکیں۔ اور یہ بات آسانی سے سمجھ میں بھی آسکتی ہے کہ کس طرح نبی کے نفخ سے انسان اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ زمینی خیالات کو ترک کرکے عالم روحانیت میں پرواز کرے ✦

طیر کے مجازی معنی

لفظ طیر کے اس مجازی استعمال پر ممکن ہے بعض طبائع میں خلش پیدا ہو لیکن جب ظاہری معنی ممتنع ہوئے تو سوائے مجاز کے چارہ نہیں۔ اور لفظ طیر بطور مجاز قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اور حدیث میں بھی۔ تو ان حالات کے اندر اس آیت کے معنی کرنے میں سوائے اس مجاز کو ماننے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اور پھر یہ معنی بھی نرے قیاس پر ہی مبنی نہیں۔ بلکہ احادیث میں شہداء کو جو اعلیٰ سے اعلیٰ مقام روحانیت پر پہنچ چکے ہیں طیر یعنی پرندوں سے مشابہت دی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ بہشت میں سبز پرندوں کی شکل میں پھر رہے ہیں چنانچہ صحیح مسلم میں ابن مسعود کی روایت سے ہے ان ارواح الشھداء فی اجواف طیر خضر شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں۔ اور ابن ماجہ میں حضرت ابن مسعود کی ہی روایت سے ہے ارواح الشھداء عند اللہ تعالیٰ کطیر خضر یعنی شہیدوں کی روحیں اللہ تعالیٰ کے ہاں سبز پرندوں کی طرح ہیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندے ہیں۔ اور بعض میں ہے کہ سفید پرندے ہیں ✦

طیر کا استعمال بطور مجاز قرآن و حدیث میں

پس احادیث میں اس صراحت کے ہوتے ہوئے یہاں طیر یا پرندوں سے مراد شہداء کی قسم کے لوگ لینا یعنی ایسے لوگ جو عالم روحانیت میں پرواز کرنے والے ہوں یا سفلی تعلقات سے بلند پرواز کرتے ہوں عین مطابق منشائے قرآن کریم معلوم ہوتا ہے ✦

اس استعارہ کو مد نظر رکھتے ہوئے باقی الفاظ کی تشریح میں کچھ مشکل باقی نہیں رہتی خلق کے معنی اندازہ کرنا نہ پیدا کرنا۔ انسان کیلئے آتے ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں طین کا لفظ استعارہ کے رنگ میں فرمانبرداری کو چاہتا ہے۔ گویا طینی مخلوق میں فرمانبرداری کی استعداد زیادہ ہے نفخ سے مراد نفخ روحانی ہونے پر بھی اوپر دلائل دی جاچکی ہیں پس اب اس سارے کلام انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ سے مراد استعارہ کے رنگ میں یہ ہوئی۔ کہ حضرت مسیح اپنے اس نفخ روحانی کا ذکر کرتے ہیں جس سے وہ استعدادیں جو طینی ہونے کی وجہ سے قبولیت کی استعداد زیادہ رکھتی ہیں۔ ان کا وہ طیر کی ہیئت پر اندازہ کرتے ہیں۔ اور ان کے اندر بلند خیالی پیدا کرنے کی تجویز کرتے ہیں اور زمین سے ان کے تعلقات کم کرنا چاہتے ہیں پس وہ اُن کے اندر ایک نفخ روحانی کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا کے نبی درحقیقت نفخ روحانی ہی کرنے آتے ہیں۔ اور نفخ روحانی سے قابل استعدادوں کو اعلیٰ مقام پر پہنچا دیتے ہیں ✦

اکمہ - کمہ

۴۳۳۔ اکمہ ۔ سورج کے متعلق کَمِہَتْ کہا جاتا ہے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے سامنے غبار آگیا پس وہ تاریک ہوگیا۔ اسی سے کَمِہَ بَصَرُہٗ ہے اور اَکْمَہُ اس اندھے کو بھی کہتے ہیں جو ماں کے پیٹ سے اندھا پیدا ہو اور بعد میں جس کی بصارت پر تاریکی آجائے اس کو بھی کہتے ہیں (ل) اور اس معنی میں یہ لفظ اشعار میں بہت آیا ہے اور ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ اَکْمَہُ وہ ہے جو دن کو دیکھتا ہے اور رات کو نہیں دیکھتا۔

وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی

اور مردوں کو زندہ

اور روحانی رنگ میں ایسے لوگ جو سورج کی تیز روشنی میں تو حق کو دیکھ لیتے ہیں مگر ذرا سی مشکلات سامنے آتی ہیں تو کچھ نہیں دیکھتے +

برص

ابرص بَرَص۔ برص سفیدی کو کہتے ہیں جو جسم میں نمودار ہوتی ہے جسے پھلوہری کہا جاتا ہے اور روحانی رنگ میں ایسی بدی جو ظاہر میں نیکی معلوم ہو +

حضرت مسیح کے کلام میں بیماریوں سے مراد روحانی بیماریاں ہیں

حضرت مسیح کا معمولی جسمانی بیماریوں کا علاج کرنا ان کی نبوت کے متعلق کوئی خاص امر نہیں۔ حالانکہ یہاں نشان کے طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور پھر یہاں کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کے علم کے بعد ان باتوں کو بیان کیا گیا ہے جن میں خلق طیر اور اکمہ اور ابرص کے علاج کا ذکر ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں کتاب و حکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ کیونکہ حکمت سے مراد یہاں علم طب نہیں بلکہ حقیقت تک پہنچنا اور اصل بات کا فہم حاصل کرنا ہے۔ پس قرینہ چاہتا ہے کہ یہاں روحانی بیماریوں کے علاج کا ذکر ہے کیونکہ توراۃ و انجیل روحانی بیماریوں کے علاج کے لئے نازل ہوئی تھیں نہ جسمانی بیماریوں کے علاج کے لئے۔ اور خود انجیل میں حضرت مسیح کے اقوال اسی کے موید ہیں۔ متی ۱۳:۱۵ میں یہودیوں کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مسیح فرماتے ہیں "کیونکہ اس قوم کا دل موٹا ہوا اور وے اپنے کانوں سے اونچا سنتے ہیں اور انہوں نے اپنی آنکھیں موند لیں تا ایسا نہ ہو کہ وے آنکھوں سے دیکھیں اور کانوں سے سنیں اور دل سے سمجھیں۔ اور رجوع لاویں اور میں انہیں چنگا کروں"۔ اب یہاں سب روحانی حالت اور روحانی بیماریوں کا ذکر کر کے آخر پر یہ الفاظ ہیں کہ میں انہیں چنگا کروں جو ابرئ الاکمہ والابرص کے بالکل مطابق ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ چنگا کرنے سے آپ کا منشا یہ تھا کہ روحانی بیماریوں سے شفا دوں۔ پھر متی ۹:۱۲ میں فرماتے ہیں "بھلے چنگوں کو حکیم درکار نہیں بلکہ بیماروں کو"۔ اب یہاں تینوں لفظ یعنی بھلے چنگے حکیم اور بیمار ظاہری معنی کے لحاظ سے استعمال نہیں کئے گئے۔ بلکہ روحانی صحت۔ روحانی طبیب اور روحانی بیمار مراد ہیں پھر اس سے بھی بڑھ کر صفائی اس سوال و جواب سے ہوتی ہے جو متی ۱۱ باب میں مذکور ہے۔ جہاں یہ ذکر ہے کہ یوحنا نے دو آدمیوں کو مسیح کے پاس بھیجا تھا کہ دریافت کریں کہ وہ وہی مسیح ہے جس کی ان کو انتظار تھی۔ تو اس کے جواب میں حضرت مسیح نے یوں فرمایا "یسوع نے جواب میں انہیں کہا۔ کہ جو کچھ تم سنتے اور دیکھتے ہو جا کے یوحنا سے بیان کرو۔ کہ اندھے دیکھتے اور لنگڑے چلتے۔ کوڑھی پاک صاف ہوتے۔ اور بہرے سنتے اور مردے جی اٹھتے ہیں۔ اور غریبوں کو خوشخبری سنائی جاتی ہے"۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں آخری فقرہ میں غریبوں سے مراد مال و دولت سے محروم نہیں بلکہ دل کے غریب ہیں اور خوشخبری لفظ گاسپل یا انجیل کا ترجمہ ہے۔ اس ایک فقرہ نے درحقیقت پہلے تمام فقروں کے معنوں پر روشنی ڈال دی ہے کہ یہاں بھی مراد روحانی بیماریاں ہی ہیں۔ ورنہ جسمانی بیماریوں کے ذکر میں غریبوں کو انجیل کا سنایا جانا ایک بے معنی بات ہے۔ پس ان تمام حوالجات سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اپنے کلام میں جیسا کہ وہ انجیل میں اب ملتا ہے۔ بیماروں کو شفا دینے سے مراد روحانی بیماریوں کا دور کرنا ہے +

قرآن کریم میں بیماریوں اور شفا سے مراد

اب ہم دوسری طرف قرآن کریم پر غور کرتے ہیں تو یہاں بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں روحانی بیماروں کو شفا دینا ہی نبیوں کا کام لکھا ہے۔ وہ جن اندھوں۔ بہروں اور گونگوں کو اچھا کرتے ہیں ان کے متعلق فرماتا ہے فانہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور (الحج ۲۲-۴۶) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ اندھے وہ دل ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔ اور اسی نابینائی کا ذکر قرآن کریم بار بار فرماتا ہے صم بکم عمی فہم لا یرجعون یہ ان کافروں کی حالت ہے جو انذار کی پروا نہیں کرتے۔ نہ باتیں سنتے ہیں نہ ان پر غور کرتے ہیں۔ نہ منہ سے کلمہ حق کہتے ہیں نہ خدا کے نشانات کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے حق کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ اور یہی نہیں کہ روحانی امراض کا ذکر ہی بار بار فرمایا ہے بلکہ شفا کا ذکر بھی اسی رنگ میں فرمایا چنانچہ قرآن کریم کے متعلق ایک جگہ فرمایا ھدی وشفاء (حم ۴۴:۴۱) وہ ہدایت بھی ہے اور شفا بھی۔ لفظ شفا کو ہدایت کے ساتھ لگا کر بتا دیا کہ روحانی بیماریوں کی شفا مراد ہے۔ نہ جسمانی بیماریوں کی۔ اور پھر فرمایا شفاء لما فی الصدور (یونس ۱۰-۵۷) یعنی جو سینوں کے اندر کی

بِاِذْنِ اللّٰهِ

کرتا ہوں ۴۳۴

بیماریوں کے لئے شفاء ہے +

عیسائیوں کی لفظ پرستی

پس انجیل اور قرآن کریم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء کا کام اور اُن کی تعلیم روحانی بیماریوں سے نجات دینے کیلئے ہوتے ہیں۔ اور کتب مقدسہ میں جن بیماریوں کا ذکر اکثر آتا ہے۔ وہ روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔ اور اسی قسم کی بیماریوں کا علاج حضرت مسیح کرتے تھے۔ عیسائیوں نے لفظ پرستی کی اور آپ کے کلام میں جو مجاز اور استعارہ تھا اسے حقیقت پر محمول کیا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مریض دیئے گئے مگر ان کا علاج کرو۔ ان کا مرض مسیح کے مریضوں کے مرض سے بہت بڑھا ہے۔ یہاں تو کوڑھی اور برص والے ہیں۔ مگر آنحضرت صلعم کو اندھے اور گونگے اور بہرے دیئے جاتے ہیں۔ گو کوڑھا اور بہرہ صفات حسنہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ ساتھ اندھا بھی ہو تو کوئی ذریعہ اُس کے علوم حاصل کرنے کا باقی نہیں رہتا۔ اس میں درحقیقت یہ بتایا ہے کہ مسیح کے وقت کی بیماری

دنیا کا سب سے بڑا طبیب

ایسی خطرناک نہ تھی جیسے نبی کریم صلعم کے زمانہ کی بیماری اور جیسقدر بیماریاں خطرناک ہوں۔ اسی قدر فاضل طبیب بھی بکار ہوتا ہے پس دنیا کا سب سے بڑا طبیب ہی اس قابل تھا کہ ایسے لوگوں کو بھی شفا دے جو اندھے بھی ہیں اور گونگے بھی ہیں۔ اور بہرے بھی ہیں +

مردوں کا اس دنیا میں واپس آنا بروئے تعلیم قرآنی ممنوع ہے۔

۴۳۴ موت اور حیات کے معنی ۹۵ میں بیان ہو چکے ہیں۔ قوت نامیہ۔ قوت حاسہ۔ قوت عاقلہ ہر ایک کے زوال کا نام عربی میں موت ہی ہے۔ یہاں کون سے مردے مراد ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم مردوں کے اس دنیا میں دوبارہ واپس آنے کے متعلق اصولی رنگ میں کیا تعلیم دیتا ہے۔

قبض روح کے متعلق اللہ تعالیٰ اپنا عام قانون ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے اللہ یتوفی الانفس حین موتہا والتی لم تمت فی منامہا فیمسک التی قضی علیہا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمی (الزمر ۳۹: ۴۲) اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے روحوں کو ان کی موت کے وقت۔ اور جو مرتے نہیں ان کی نیند میں پھر روک رکھتا ہے اس کو جس پر موت وارد کر دی اور واپس بھیجتا ہے دوسرے کو ایک وقت مقرر تک۔ اس آیت کریمہ کی رو سے قبض روح دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک موت کی حالت میں اور دوسرے نیند کی حالت میں۔ گویا ان دونوں حالتوں پر قبض روح کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قبض روح کی تیسری کوئی طرز بیان نہیں فرمائی۔ اور ان دونوں طرزوں میں سے بھی ایک کے متعلق فیصلہ قطعی صادر فرما دیا کہ جس پر موت وارد کر دے۔ اس کو پھر اس دنیا میں واپس نہیں بھیجتا۔ ان کے زندہ ہونے کیلئے اللہ تعالیٰ نے قیامت کا وقت مقرر فرمایا ہے پس اس آیت کی رو سے کوئی شخص جس پر موت واقعی وارد ہو چکی ہے زندہ ہو کر اس دنیا میں نہیں آسکتا +

پھر یہی اصول ایک اور آیت میں بیان کیا گیا ہے حتی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت کلا انہا کلمۃ ھو قائلہا ومن ورائہم برزخ الی یوم یبعثون (المومنون ۲۳: ۹۹-۱۰۰) یہاں تک کہ جب ان میں سے ایک پر موت آجاتی ہے تو پھر وہ کہتا ہے میرے رب مجھے لوٹاؤ تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں نیک عمل کروں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا یہ ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے اور ان کے ادھر (یعنی بعد موت) ایک حالت برزخ ہے۔ اس دن تک کہ ان کو اُٹھایا جائے۔ اب اس آیت میں بھی یہی اصول بیان فرمایا کہ موت کے بعد اس دنیا میں واپس آنا ممنوع ہے۔ اور ایسی خواہش پوری نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ یوم البعث تک یعنی قیامت کے دن تک حالت برزخ میں رہنا ہو گا پس اس آیت کی رو سے بھی مردوں کا قبل از بعثت اس دنیا میں واپس آنا باطل ثابت ہوتا ہے +

تیسری آیت جو اس پر شاہد ہے وہ ذیل کی آیت قرآنی ہے وحرام علی قریۃ اھلکنٰہا انہم لا یرجعون (الانبیاء ۲۱: ۹۵) اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ ان کے لئے یہ قطعی ہو چکا کہ وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئینگے۔ قریۃ سے مراد بستی کے لوگ ہیں یعنی جو لوگ مر جاتے ہیں وہ لوٹ کر اس دنیا میں نہیں آیا کرتے۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک حدیث نسائی اور ابن ماجہ میں مذکور ہے عن جابر بن عبد اللہ قال لقینی

شہادت حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا جابر مالی اراک منکسرا قلت یا رسول استشہد ابی وترک عیالا ودینا فقال

وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ

اور جو تم نے کھانا اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ رکھنا ہے اس کی خبر دیتا ہوں

الا ابشرک ما لقی اللہ بہ اباک قال بلی . . . . قال یا عبدی تمن علی اعطک قال یا رب تحیینی فاقتل فیک ثانیۃ قال الرب تعالیٰ قد سبق منی انھم لا یرجعون یعنی جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلعم ملے اور فرمایا اے جابر کیا ہے میں تم کو غمگین پاتا ہوں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا باپ شہید ہو گیا اور عیال اور قرضہ پیچھے چھوڑ گیا فرمایا میں تم کو خوشخبری دوں کہ تیرے باپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور کیا معاملہ پیش آیا۔ عرض کیا فرمایئے۔ (یہاں حدیث کا درمیانی ٹکڑا چھوڑ دیا گیا ہے) . . . . اللہ تعالیٰ نے (جابر کے والد کو) فرمایا۔ اے میرے بندے۔ تو میرے سامنے کوئی خواہش کر تاکہ میں تجھے دوں۔ اس نے عرض کیا اے میرے رب مجھے زندہ کر دیجیے تاکہ میں دوبارہ تیری راہ میں مارا جاؤں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا یہ میں پہلے وعدہ کر چکا ہوں کہ (جو مر جائیں گے) وہ لوٹ کر اس دنیا میں نہیں جائینگے۔ اب یہ حدیث قطعی طور پر اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ مردہ کبھی اس دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ اور مردہ کا واپس آنا قانون الٰہی کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود جابر کے والد کو یہ کہا تھا۔ کہ جو چاہتے ہو مانگو میں دونگا۔ مگر جب اُس نے دوبارہ دنیا میں بھیجا جانے کی خواہش ظاہر کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے۔ اب یہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کا فرمانا۔ کہ جو مانگو دونگا۔ دوسری طرف مسلمانوں میں اس وقت ایسے آدمیوں کی سخت ترین ضرورت ہونا جو خدا کی راہ میں اپنی جانیں قربان کریں۔ یہ دونوں باتیں اس امر کی مقتضی تھیں کہ اگر خدا کے قانون میں کوئی مردہ اس دنیا میں واپس آسکتا ہو تو جابر کا والد سب سے بڑھ کر واپسی کا مستحق تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے باوجود یہ فرمانے کے جو مانگو میں تم کو دونگا۔ پھر بھی دوبارہ دنیا میں اُس کے آنے کی خواہش کو پورا نہیں کیا۔ اس بنا پر کہ یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے۔ تو کیا یہ وعدہ خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح کے زمانہ کے بعد کیا تھا کہ اب میں مردوں کو زندہ نہیں کیا کرونگا پھر ہم پوچھتے ہیں کہ خدا اگر مسیح کے ذریعہ سے مردوں کو زندہ کرتا تھا تو خود ایک مردہ کو زندہ کر کے کیوں واپس نہ بھیج دیا۔ قریباً اسی مضمون کی ایک حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے جہاں اللہ تعالیٰ شہداء کی ارواح کو فرماتا ہے ماذا تبغون تم کیا چاہتے ہو؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ ہمیں کچھ حاجت نہیں پھر یہ سوال ہوتا ہے یہانتک کہ فلما راؤا انھم لا یترکون من ان یسئلوا قالوا نرید ان ترد نا الی الدنیا فنقاتل فی سبیلک حتی نقتل فیک مرۃ اخریٰ لما یرون من ثواب الشھادۃ فیقول الرب جل جلالہ انی کتبت انھم الیھا لا یرجعون جب وہ دیکھینگے کہ ان سے بار بار سوال کیا جاتا ہے۔ تو کہینگے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں دار دنیا کی طرف واپس لوٹا دیں تب ہم تیری راہ میں جنگ کریں۔ یہانتک کہ تیری راہ میں دوسری مرتبہ قتل کئے جائیں کیونکہ وہ شہادت کا اس قدر ثواب دیکھ چکے ہونگے تو رب جل جلالہٗ فرمائے گا میں یہ لکھ چکا ہوں کہ اس دنیا کی طرف پھر ان کو نہیں لوٹایا جائیگا۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی مردہ دنیا میں زندہ ہو کر آسکتا ہے تو شہداء سب سے بڑھکر حقدار ہیں کیونکہ ان کی زندگیاں محض اللہ کیلئے ہیں پھر اللہ تعالیٰ خود ان کو فرماتا بھی ہے کہ تم جو کچھ مانگو میں دونگا لیکن با ایں ہمہ دوبارہ ان کو دنیا میں نہیں بھیجتا کیوں؟ اس لئے کہ فرماتا ہے یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین اصول کے رنگ میں کیسے محکم ہیں ۔

قرآن کریم میں روحانی مردوں کے احیاء کا ذکر

پس یہ آیتیں اور حدیثیں اس بات پر شاہد ہیں کہ مردے ہرگز اس دنیا میں واپس نہیں آیا کرتے اور اب سوائے اس کے چارہ نہیں کہ یہاں بھی روحانی مردوں کا احیاء مراد لیا جائے۔ اور قرآن کریم میں روحانی مردوں کے احیاء کا ذکر بھی کثرت کے ساتھ اور بار بار آتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا اومن کان میتا فاحیینٰہ وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمٰت لیس بخارج منھا (الانعام ۱۲۳) کیا وہ شخص جو مردہ ہو پھر اُسے ہم زندہ کریں اور اس کو ایک روشنی دیدیں جس کے ساتھ وہ لوگوں کے اندر چلے اس شخص کی مثل ہو سکتا ہے جو تاریکیوں کے اندر ہی رہے۔ اُن میں سے باہر نکلنے والا نہ ہو۔ اب یہاں ایک مردہ کا ذکر ہے۔ اور اُس کے زندہ کرنے کا بھی ذکر ہے۔ مگر کس قسم

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

یقیناً اس میں تمہارے لئے نشان ہے اگر تم مومن ہو ۴۳۵

کا مردہ ہے۔ اور اس کا احیاء کیا ہے۔ اس مردہ کو جب اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے نور ایمان عطا فرماتا ہے تو اس نور کے ذریعہ سے پھر وہ لوگوں میں چلتا ہے۔ اور اس زندگی کے مقابل اس مردہ کی حالت ہے جو تاریکیوں میں ہی رہتا ہے۔ پھر فرمایا۔ یا یہا الذین آمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (الانفال ۸-۲۴) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو فرمانبرداری کرو اللہ کی اور رسول کی جب وہ تم کو بلائے اس کے لئے جو تم کو زندہ کرے پھر فرمایا و ما یستوی الاحیاء ولا الاموات ان اللہ یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور (فاطر ۳۵-۲۲) زندے اور مردے یکساں نہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے سناتا ہے۔ اور جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں تم اُن کو نہیں سنا سکتے یہاں نہ صرف روحانی زندوں کو احیاء اور روحانی مردوں کو اموات کے نام سے پکارا ہے۔ بلکہ اُن کو من فی القبور بھی قرار دیا ہے یعنی ایسے لوگ جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں +

مسیح کے احیاء موتے سے روحانی مردوں کی زندگی مراد ہے

پس جب قرآن کریم مردوں کے اس دنیا میں واپس آنیکا دروازہ قطعاً بند کرتا ہے۔ اور روحانی مردوں کو قرآن کریم میں مردے ہی کہا گیا ہے۔ بلکہ انبیاء کا یہ کام بتایا گیا ہے۔ کہ وہ روحانی مردوں کو زندہ کریں۔ تو ہم احی الموتی باذن اللہ کے ایک ہی معنی لے سکتے ہیں کہ اللہ کے اذن سے میں روحانی مردوں کو زندگی دیتا ہوں +

نبی کی قوت قدسی کا اظہار دو رنگوں میں

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ دراصل یہ تینوں فقرے یعنی اول خلق طیر۔ دوم اکمہ اور ابرص کو شفا دینا۔ سوم مردوں کو زندہ کرنا ایک ہی مطلب کے ظاہر کرنے والے ہیں یعنی نبی کے نفخ روح سے ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ جو طینی فطرت کے لوگ ہیں یعنی بوجہ فرمانبرداری کے مادہ کے استعداد قبولیت زیادہ رکھتے ہیں۔ ان میں تو نفخ روح کا اثر اس قدر ہوتا ہے کہ ان کے زمینی تعلقات منقطع ہو کر وہ بالکل خدا کے لئے ہی ہو جاتے ہیں۔ اس سے ادنیٰ حالت ان لوگوں کی ہے جن کو بیمار کہا یعنی اکمہ اور ابرص ان کی بیماریاں دور ہو کر وہ بھلے چنگے ہو جاتے ہیں۔ مگر سب سے ردی حالت اُن لوگوں کی ہے جن میں سے روحانی زندگی مفقود ہو چکی ہے اور وہ مردوں کے حکم میں داخل ہو چکے ہیں۔ مگر ان پر بھی نبی کی قوت قدسی کا اثر ہوتا ہے۔ اور اُن کو از سرِ نو زندگی دی جاتی ہے۔ اصل غرض بہرحال ایک ہی ہے یعنی انسانوں میں نفخ روح کرنا اور تین مختلف پیرائے اس کے صرف اس لئے بیان فرمائے۔ کہ تا انسانوں کے تین مراتب پر یعنی اس حالت پر جس میں نبی اُن کو پاتا ہے۔ شاہد ہوں یہی وجہ ہے کہ یہاں ان تینوں کو ایک ہی آیت قرار دیا ہے۔ اور یوں فرمایا ہے انی قد جئتکم بآیة من ربکم میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بات لایا ہوں۔ حالانکہ آگے ذکر تین باتوں کا ہے۔ اس سے اسی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ کہ درحقیقت یہ تینوں باتیں ایک ہی مطلب کو ظاہر کرنے والی ہیں۔ اور نبی کی قوت قدسی کا فیضان ہی وہ بات ہے جس کا یہاں ذکر مطلوب ہے +

ما

۴۳۵ بما تاکلون۔ یہاں یا تو ما مصدریہ ہے اور مراد یہ ہے کہ تمہارے کھانے اور تمہارے ذخیرہ کرنے کی خبر دیتا ہوں یعنی اس کی کہ کیا کھاتا ہو اور کیا ذخیرہ کرتا ہو اور یا ما موصولہ ہو اور اس صورت میں خبر بمعنی امر ہو یعنی اس امر کی خبر دیتا ہوں کہ کیا کھاؤ اور کیا ذخیرہ کرو +

ادخار

تدخرون۔ ادخار اصل میں اذتخار ہے جو ذخر سے ہے۔ اور ادخرته کے معنی ہیں اَعْدَدْتُهٗ لِلْعُقْبٰی (غ) یعنی آیندہ کیلئے اسے سامان بنا کر رکھا۔ ذخیرہ کیا +

مسیح کے متعلق غلط قصے

اس موقعہ پر جو قصے لکھے گئے ہیں کہ حضرت مسیح چھوٹے ہوتے باہر لڑکوں میں کھیلا کرتے تھے تو لڑکوں کو بتا دیا کرتے تھے کہ تمہاری ماں نے فلاں چیز فلاں جگہ چھپا کر رکھی ہے۔ اور اس طرح لڑکے گھر میں جا کر ماؤں کو تنگ کیا کرتے تھے۔ پھر لکھا ہے کہ ایک دن محلہ والوں نے سارے لڑکوں کو ایک مکان میں بند کر دیا۔ اور جب مسیح اُن کو بلاتے ہوئے آئے تو ان کے متولیوں نے کہدیا کہ وہ یہاں نہیں ہیں اور

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۴۹

اور اس کی تصدیق کرنیوالا جو توریت میں سے مجھ سے پہلے ہے^۴۳۶^ اور تا کہ بعض اس کا جو تم پر حرام کیا گیا ہے تمہارے لئے حلال کروں^۴۳۷^

جب مسیح نے اس مکان کی طرف جہاں وہ لڑکے بند تھے۔ اشارہ کرکے کہا کہ یہاں کون ہے۔ تو انہوں نے کہدیا کہ سؤر تو وہ سب لڑکے سؤر بن گئے۔ یہ بے سروپا قصے گھڑ لئے گئے ہیں جن کی غرض صرف مسیح کی ہر بات کو عجوبہ بنانا ہے حالانکہ مسیح میں دیگر انبیاء بنی اسرائیل سے بڑھ کر کوئی بات نہ تھی۔ اس آیت کے معنی صاف اس قدر ہیں کہ حضرت مسیح اُن کو بتاتے ہیں کہ کیا چیزیں کھاؤ اور کس قدر ذخیرہ کرو۔ گویا حلال وحرام کے متعلق بھی کچھ احکام دیتے تھے۔ اور زیادہ تر ان کی تعلیم کا زور اس بات پر تھا کہ دنیا کے مال و دولت کا زیادہ ذخیرہ مت کرو اور اپنے لئے زمین پر خزانے جمع مت کرو۔ گو آپ کے پیروؤں نے آپ کی ہر ایک تعلیم کی خلاف ورزی ہی کی ہو۔ یورپ اور امریکہ کے پیروان مسیح کی حالت دیکھو جو دن رات دولت جمع کرنے کی فکر میں ہیں اور جن کا خدا ہی اب سیم و زر ہے اور حضرت مسیح کی اس تعلیم کو دیکھو "اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں کیونکہ جہاں تیرا مال ہے وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا۔" (متی ۶: ۱۹ تا ۲۱) ؁

حضرت مسیح کے احکام کھانے ذخیرے کے متعلق

۴۳۶ وَمُصَدِّقًا عطف ہے بِاٰيَةٍ پر یعنی قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ۔ وَجِئْتُكُمْ مُصَدِّقًا ؁

حضرت مسیح کا توریت کا مصدق ہونے سے منشاء اسکی کمی کو پورا کرنا ہے

یہاں حضرت عیسیٰ اپنے آپ کو توریت کا مصدق قرار دیتے ہیں۔ اس تصدیق کا منشاء کیا ہے اس پر مفصل بحث ۱۳۵ میں گزر چکی ہے۔ جہاں دکھایا گیا ہے کہ اس تصدیق سے جس کا صلہ لام آئے مراد یہ ہوتی ہے کہ پہلی کتاب اس بات کو چاہتی تھی کہ اس کی کسی کمی کو پورا کرنے کے لئے یا اس کی پیشگوئیوں کو پورا کرنے کے لئے کوئی دوسرا نبی آوے پس جب وہ دوسرا نبی آتا ہے تو اس پہلی کتاب کی تصدیق کرتا ہے یعنی اس کا منجانب اللہ ہونا بھی تسلیم کرتا ہے۔ اور اس کی اس کمی یا نقص کو بھی پورا کرتا ہے۔ توریت کی تعلیم جس طرح بعض پہلوؤں کی رو سے مختص القوم تھی یعنی صرف بنی اسرائیل کیلئے تھی اسیطرح اسکی تعلیم کے بعض پہلو مختص الزمان بھی تھے۔ اور انبیائے بنی اسرائیل وقتاً فوقتاً ظاہر ہو کر ایسی کمی کو پورا کرتے رہے اس لئے شریعتِ توریت ان میں بطور ایک بنیاد کے رہی۔ اور باقی انبیا کی تعلیم اپنے اپنے زمانہ تک محدود رہی۔ وہ اپنے اپنے وقت میں تعلیمِ توریت کی کمی کو پورا کرتے رہے۔ اس لئے حضرت عیسیٰ دنیا کی ساری کتابوں کے یا سارے رسولوں کے مصدق نہیں ہوئے بلکہ صرف توریت کے مصدق ہوئے کیونکہ ان کی بعثت کی غرض توریت کی تعلیم کی کسی کمی کو ہی پورا کرنا تھا۔ اور اس تصدیق سے یہ نتیجہ قطعاً نہیں نکلتا کہ حضرت عیسیٰ کے وقت تک توریت میں کوئی تحریف نہ ہوئی تھی ہاں اللہ تعالیٰ انبیاء کو اس لئے مامور نہیں کرتا کہ وہ پرانی کتابوں کے ایک ایک حرف کو درست کردیں بلکہ اصل غرض اصلاح نفوس ہوتی ہے اس کے لئے موٹی موٹی ہدایات وہ انہیں دیدیتا ہے ؁

توریت اور انبیائے بنی اسرائیل

یہ امر کہ حضرت مسیح نے توریت کی تعلیم کی کمی کو پورا کیا۔ خود قرآن کریم کے اگلے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اور بعثت انبیاء کی اصل غرض چونکہ بروئے قرآن کریم ہدایت کا لانا ہے جیسا کہ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى سے ظاہر ہے۔ اس لئے ہر نبی کوئی نئی ہدایت لاتا ہے خواہ وہ بہ رنگ شریعت ہو یا بہ رنگ نصیحت یا بہ رنگ نمونہ عمل ؁

حضرت عیسیٰ کا بعض احکام توریت کو منسوخ کرنا

۴۳۷ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ یعنی بعض اس کا جو موسوی شریعت میں تم پر حرام کیا گیا ہے۔ اور یہ روایت قتادہ سے ابن جریر نے دی ہے كَانَ الَّذِيْ جَاءَ بِهٖ عِيْسٰى اَلْيَنَ مِمَّا جَاءَ بِهٖ مُوْسٰى یعنی جو کچھ حضرت عیسیٰ لائے اس میں نرمی کا پہلو غالب تھا بہ نسبت اس کے جو موسیٰ لائے۔ بعض مفسرین نے اس کے یوں معنی کئے ہیں کہ بعض وہ باتیں جو تم نے غلطی سے اپنے اوپر حرام کر رکھی تھیں ان کو حلال کرتا ہوں اور اس لئے انہوں نے کہا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے توریت کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کیا۔ مگر یہ صحیح نہیں

۵۰ وَجِئۡتُکُمۡ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوۡنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیۡ وَرَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡہُ ؕ ہٰذَا

اور میں تمہارے پاس تمہارے رب سے ایک بات لایا ہوں پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو[۴۳۸]۔ اللہ ہی میرا رب اور تمہارا رب ہے پس اسی کی عبادت کرو یہی

۵۱ صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿۵۱﴾ فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیۡسٰی مِنۡہُمُ الۡکُفۡرَ قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ

سیدھا رستہ ہے[۴۳۹]۔ پھر جب عیسیٰ نے ان سے کفر محسوس کیا تو کہا کون اللہ کی طرف میرے مددگار ہیں[۴۴۰]۔ حواریوں نے کہا

اس لئے کہ اس وقت بھی اناجیل میں باوجود اس اقرار کے کہ میں توریت کو منسوخ کرنے نہیں آیا۔ توریت کے بعض احکام کے خلاف احکام موجود ہیں اور ان الفاظ سے کہ توریت کو منسوخ کرنے نہیں آیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہی منشاء تھا کہ بطور بنیاد وہ قایم رہے گی لیکن کچھ تغیر و تبدل یا ترمیم اس میں ضرورت زمانہ کے لحاظ سے ہوگی اس سے شریعت توریت منسوخ نہیں ہوتی جیسا کہ انجیل کی اس قسم کی عبارات سے ظاہر ہے۔ مثلاً تکمیل کے رنگ میں "تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ خون نہ کر۔ . . . . لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی پر غصے ہوگا وہ عدالت کی سزا کے لایق ہوگا۔ اور جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل کہے گا وہ صدر عدالت کی سزا کے لایق ہوگا اور جو اس کو احمق کہے گا وہ آگ کی جہنم کا سزاوار ہوگا"۔ (متی ۵: ۲۱ و ۲۲) اس سے حکم توریت کہ خون نہ کر منسوخ نہیں ہوتا بلکہ اسکی تکمیل ہوتی ہے۔ ایسا ہی "تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زنا نہ کر لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس کسی نے بری نظر سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا"۔ (متی ۵: ۲۷ و ۲۸) یا مثلاً ترمیم کے رنگ میں "یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑے اسے طلاق نامہ لکھدے لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرامکاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے وہ اس سے زنا کراتا ہے" (متی ۵: ۳۱ و ۳۲) یا تنسیخ کے رنگ میں "تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے (متی ۵: ۳۸ و ۳۹)

توریت کی تکمیل ترمیم نسخ کی مثالیں

اب یہ جس قدر باتیں "کہا گیا تھا" میں حضرت مسیح نے بیان کی ہیں۔ وہ توریت کے احکام ہیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ انبیائے بنی اسرائیل اس اختیار کے ساتھ آتے تھے کہ وہ توریت کو بطور بنیاد شریعت تسلیم کرتے ہوئے ان ہدایات کی تکمیل کریں یا انہیں ترمیم کریں یا نسخ کریں۔

[۴۳۸] اطیعون میری اطاعت کرو۔ یہ تعلیم ہر ایک نبی دیتا ہے۔ چنانچہ سورہ شعراء میں جہاں بہت سے انبیاء کا ذکر کیا ہے۔ قریباً ہر ایک نبی کی تعلیم میں یہ حصہ بھی پایا جاتا ہے فاتقوا اللہ واطیعون۔ اللہ کا تقویٰ کرو اور میری اطاعت کرو۔ باوجودیکہ شریعت حضرت موسیٰ کی تھی جس پر حضرت مسیح نے بھی عمل کرنا اور کرانا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں کہتے کہ موسیٰ کی اطاعت کرو۔ اس لئے کہ وہ خود مطاع ہیں اور کسی دوسرے کے مطیع نہیں بلکہ جو کچھ پاتے ہیں براہ راست اللہ تعالیٰ سے پاتے ہیں۔ گویا ہر نبی بمنزلہ ایک بادشاہ کے ہوتا ہے اس کو بڑی صراحت سے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (النساء ۴: ۶۴) یہاں حضرت مسیح کا اپنی اطاعت کے لئے حکم دینا یہی سمجھانے کو ہے کہ اگر وہ احکام توریت میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کریں تو ان کی بات ماننی ہوگی اور وہ اس بناء پر رد نہیں ہوسکتی کہ توریت کے خلاف ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کی اطاعت جزو دین ہے۔

حضرت عیسیٰ کا اپنی اطاعت کیطرف بلانا، اور نبی کی غرض

نبی کی اطاعت جزو دین ہے

[۴۳۹] قرآن کریم نے جو کچھ حضرت مسیح کی تعلیم کا یہاں خلاصہ بیان کیا ہے وہ اب بھی اناجیل میں باوجود ان کی خطرناک تحریف کے موجود ہے "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (متی ۴: ۱۰) یہ کسی قائل تثلیث کی تعلیم نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں پر اتمام حجت کے لئے اس قسم کے فقروں کو ان کی کتابوں میں باقی رہنے دیا ہے۔

اناجیل میں توحید کی تعلیم

[۴۴۰] احسّ۔ اِحساس کے معنی ہیں حواس ظاہری سے کسی چیز کا معلوم کر لینا۔ حضرت عیسیٰ کا ان سے احساس کفر کر لینا اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ ان کا کفر اس حد تک ظاہر ہو چکا تھا کہ فہم کے لئے اس کا ظاہر ہونا تو ایک طرف رہا حواس

احساس

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَ ۵۲

ہم اللہ کے (دین کے) مددگار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم فرمانبردار ہیں ۱۴۴ اے ہمارے رب ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے نازل کیا اور

کے لئے بھی وہ ظاہر تھا (غ) دوسرے معنی کے لئے دیکھو ۵۳۶ +

نصیر۔ انصار — من انصاری الی اللہ ۔ انصار نصیر کی جمع ہے بمعنی مددگار۔ ابن جریر نے من انصاری الی اللہ کی تشریح یوں کی ہے من

انصاری الی اللہ — اعوانی علی المکذبین بحجۃ اللہ یعنی کون تکذیب کرنیوالوں کے خلاف اللہ کی حجت کیلئے میرا مددگار ہوگا اور وہ کہتے ہیں الی اللہ

یہاں بمعنی مع اللہ ہے اور بعض نے اس کے معنی کئے ہیں ملتجأ الی اللہ ا وذاھبا ا وضا ما الیہ (ض) یعنی میرا مددگار کون ہے اس

انصار اللہ — حال میں کہ میں اللہ کی طرف پناہ ڈھونڈھنے والا یا اس کی طرف جانے والا یا اس کے ساتھ تعلق کرنے والا ہوں۔ اور آگے جو انصار اللہ

آتا ہے تو اس سے مراد انصار دین اللہ ہے یا انصار رسول اللہ یعنی اللہ کے دین یا اللہ کے رسول کے مددگار +

حواری۔ حوْر — ۱۴۴ الحواریون حواری کی جمع ہے اور یہ حوْر سے مشتق ہے حوْر کے معنی ہیں ایک چیز سے لوٹ آنا یا ایک چیز کی طرف لوٹ جانا

تحاور — اور اسی سے یحور ہے انہ ظن ان لن یحور (الانشقاق ۔ ۱۴) اور تحاور جو ایک دوسرے کی طرف کلام کو لوٹانے کا نام ہے واللہ

حور ا ء — یسمع تحاورکما (المجادلہ ۔ ۱) ۔ اور حَوَر اصل میں بیاض یعنی سفیدی کو کہتے ہیں اور حَوْرَاء اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کی آنکھ کی سفیدی

اعلیٰ درجہ کی سفید اور سیاہی شدت سے سیاہ ہو اور جس کا رنگ بھی سفید ہو۔ اسی وجہ سے اعراب یعنی بادیہ نشین لوگ شہروں کی عورتوں

کو حواریات کہتے تھے کیونکہ ان کے رنگ اعراب کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کے سفید تھے (ل) اور تحویر کے معنی تبییض آتے ہیں

حواری نام کی وجہ — یعنی سفید کرنا۔ ابن اثیر راغب وغیرہ کے نزدیک لفظ حواری اسی سے مشتق ہے۔ اور یہ لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے برگزیدہ

احباب پر کیوں بولا گیا ہے اس کی وجہ اکثر نے یہی دی ہے کہ حواری قصّار کو کہتے ہیں یعنی جو کپڑے دھو کر ان کو سفید کرتا ہے اور

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص احباب کو حواری کا خطاب اس لئے دیا گیا کہ وہ دھوبی کا کام کرتے تھے۔ اور حضرت عیسےٰ کے

حواریوں پر یہ نام آکر ہر ایک ناصر اور پسندیدہ دوست پر بولا جانے لگا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے والزبیر ابن عمتی وحواریّ

من امتی یعنی زبیر میری پھوپی کا بیٹا اور میری اُمت سے میرا حواری ہے۔ اور زجاج کا قول لسان العرب میں منقول ہے کہ الحواریون

خلصان الانبیاء وصفوتہم یعنی نبیوں کے خالص اور برگزیدہ دوست حواری کہلاتے ہیں جس کی وجہ بعض نے یہ دی ہے کہ

وہ اپنی خلوص نیت اور سیرت کی پاکیزگی کی وجہ سے حواری کہلائے بعض نے کہا ہے اس لئے کہ وہ لوگوں کو گناہوں کی میل سے صاف کرتے تھے

بارہ حواریوں کے نام — حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری بارہ تھے جن کے نام اناجیل میں حسب ذیل دئے گئے ہیں :۔ (لوقا ۔ ۶ ۔ ۱۴ ۔ مرقس ۳ ۔ ۱۶)

(۱) شمعون جو پطرس کہلاتا ہے (۲) اس کا بھائی اندریاس (۳) زبدی کا بیٹا یعقوب (۴) اس کا بھائی یوحنا (۵) فلپس

(۶) برتلمائی (۷) توما (۸) متی محصول لینے والا (۹) حلفئی کا بیٹا یعقوب (۱۰) تدّئی (۱۱) شمعون قنانی (۱۲) یہودا اسکریوطی

وعظ کیلئے ہدایات — جس نے حضرت مسیح کو پکڑوا بھی دیا۔ ان بارہ کو یہ حکم دیا گیا "انہیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر

میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت

حواریوں کا کام — نزدیک آگئی ہے"۔ ان کا کام یہ قرار دیا گیا — "بیماروں کو اچھا کرنا۔ مردوں کو جلانا۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا۔ بدروحوں کو نکالنا"

اور ان کو حکم تھا کہ اپنے پاس کچھ نہ رکھیں "نہ سونا اپنے کمر بند میں رکھنا۔ نہ چاندی نہ پیسے راستے کیلئے نہ جھولی لینا نہ دو دو کرتے نہ

حواریوں کی ایمانی حالت بموجب اناجیل — جوتیاں نہ لاٹھی" (متی ۱۰ : ۵ ۔ ۱۰) ان بارہ کی ایمانی حالت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ایسے سخت الفاظ ہیں کہ یہ تسلیم کرنا مشکل

نظر آتا ہے کہ واقعی ان کی حالت ایسی ہو۔ کہیں ان کو "کم اعتقاد" کہا گیا ہے (متی ۱۶ : ۸) کہیں "بے اعتقاد اور کجرو قوم" (متی ۱۷ : ۱۷)

کہیں ان کو "رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان" سے محروم قرار دیا گیا ہے (متی ۱۷ : ۲۰) کہیں پطرس کو جو ان سب کا سردار تھا شیطان

۵۳ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ○ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ○

رسول کی پیروی کی پس تو ہمیں گواہی دینے والوں کیساتھ لکھ[۴۴۲] اور (کافروں نے) تدبیر کی اور اللہ نے تدبیر کی اور اللہ سب تدبیر کرنیوالوں سے اچھا ہے[۴۴۳]

کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ان میں سے ایک یہودا اسکریوطی آخر صرف تیس روپے لیکر حضرت مسیح کو پکڑوا دیتا ہے۔ اور بارہ کے گیارہ رہ جاتے ہیں مگر الفاظ کو پورا کرنے کے لئے پیچھے پولوس کو داخل کر کے بارہ کی تعداد پھر بنائی جاتی ہے۔ مگر باقی کی کمزوری کا بھی یہ حال ہے کہ پطرس جس پر مسیح نے کلیسیا کی بنیاد رکھی تھی (متی ۱۶: ۱۸) تین دفعہ مسیح کا انکار کرتا ہے اور جب لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کے ساتھ تھا تو جھوٹ بول کر اپنی جان چھڑاتا ہے کہ میں نہیں تھا (لوقا ۲۲: ۵۷-۶۲) اور باقی حواری حضرت مسیح کی گرفتاری کے وقت بھاگ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ساتھ جو وعدے کئے گئے تھے۔ وہ بڑے عظیم الشان تھے۔ چنانچہ پطرس کو کہا "میں آسمان کی بادشاہت کی کنجیاں تجھے دوں گا اور جو کچھ تو زمین پر باندھے گا وہ آسمان پر بندھے گا اور جو کچھ تو زمین پر کھولے گا وہ آسمان پر کھلے گا" (متی ۱۶: ۱۹) اور بارہ حواریوں کے لئے یہ وعدہ تھا "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو لئے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے" (متی ۱۹: ۲۸) قرآن کریم نے حواریوں کی ان کمزوریوں کا ذکر نہیں کیا صرف ان کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے یہ ان کی خدمت اور نصرت کی عزت کی ہے یہ قرآن شریف کا احسان عیسائیوں پر تھا کہ ان کے رسول کو چھوڑ کر رسول کے اصحاب کی بھی خوبیوں کا ذکر کیا کمزوریوں کا نام تک نہیں لیا مگر اس احسان فراموش قوم نے سارا زور اس محسن کی عیب شماری پر لگا دیا اور وہ بھی سب جھوٹ ٭

حواریوں کے ساتھ وعدے

قرآن شریف کا عیسائیوں پر احسان اور انکی ناشکری

۴۴۲ الشاھدین یہاں شاھدین کی تفسیر میں کئی قول ہیں میرے نزدیک زجاج کا قول سب سے بہتر ہے ھم الشاھدون للانبیاء بالتصدیق (ل) یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو انبیاء کی سچائی پر ایمان لا کر ان کے لئے بمنزلہ گواہوں کے ہو جاتے ہیں۔ یہ معنی اس لئے بھی چسپاں ہیں کہ انبیاء کی قوت قدسی کے یہ لوگ گواہ بن جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ عملی رنگ میں پاک ہو کر بمنزلہ گواہوں کے ہو جاتے ہیں ٭

شاھد

۴۴۳ مکروا اَلْمَكْرُ اِحتیال فی خُفْیَةٍ (ل) یعنی مکر خفیہ طور پر احتیال کو کہتے ہیں اور احتیال کیا ہے اَلْحَوْلُ وَالْحِیَلُ وَالْحِوَلُ وَ الْحِیْلَةُ .... والاحتیال .... کل ذٰلک الحذقُ وجودةُ النظرِ وَالْقُدْرَةُ علٰی دِقَّةِ التصرّف (ل) یعنی حول حیل۔ حِوَل حیلۃ۔ اِحْتِیَال ان سب الفاظ کے معنی دانائی اور نظر کی ذہانت اور باریک تصرفات پر قدرت رکھنا ہے گویا احتیال یا حیلۃ باریک مضبوط تدبیر کو کہتے ہیں۔ پس مَکْر کے معنی ہوئے مخفی طور پر باریک مضبوط تدبیر کرنا۔ اور مفردات راغب میں مَکْر کے معنی دئے ہیں صَرْفُ الْغَیْرِ عَمَّا یَقْصِدُهٗ بِحِیْلَةٍ یعنی کسی غیر کا اس سے جس کا وہ قصد کرتا ہے باریک مضبوط تدبیر سے پھیر دینا۔ اور پھر لکھا ہے کہ مکر دو طرح پر ہے۔ ایک محمود یعنی قابل تعریف اور وہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اچھا کام کرنے کا ارادہ کیا جائے اور اس کی مثال دی ہے و مکر اللہ واللہ خیر الماکرین اور دوسرا مذموم جس کے ساتھ فعل قبیح کا قصد کیا جائے اور اس کی مثال دی ہے واذ یمکر بک الذین کفروا۔ پس خیر اور شر دونوں پر مکر کا استعمال ہوتا ہے اور تفسیر کبیر میں بھی اس پر بحث کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ مکر وہ رائے محکم اور مضبوط ہے جو نقص و فتور سے محفوظ ہو پس اس قدر تصریح کے ہوتے ہوئے معترضین اسلام کا اپنے ذہن میں اس مفہوم مکر کو رکھ کر جو زبان اُردو میں اس لفظ نے اختیار کر لیا ہے قرآن کریم پر یہ اعتراض کرنا۔ کہ اللہ تعالیٰ کا نام مکار ہے کم فہمی یا شرارت کی وجہ سے ہے۔ بسا اوقات ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں اگر ایک خاص مفہوم کو اختیار کر لیتا ہے۔ پس اگر لفظ مکر اُردو زبان میں بُرے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ عربی زبان میں یہ لفظ بُرے ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے صریح غلطی ہے اور قرآن کریم نے تو ایک جگہ لفظ مکر کے ساتھ خیر کا لفظ لگا کر جیسا واللہ خیر الماکرین اور دوسری جگہ سیئ کا لفظ لگا کر جیسا ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ (الفاطر ۳۵ ع ۵) میں یہ بتا دیا ہے کہ اصل لفظ مکر میں بدی کا مفہوم نہیں کیونکہ جو فعل فی نفسہٖ برا ہو اس کے ساتھ خیر یا بھلے کا لفظ تو لگ ہی نہیں سکتا اور اس کے ساتھ ذم کا لفظ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی و مکروا میں ضمیر ان لوگوں کی طرف ہے جن کا ذکر ان الفاظ میں ہے فلما احس عیسٰی منھم الکفر یعنی اعدائے مسیح کی طرف ٭

مکر احتیال

ع ۶ / ۱۴

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ ۵۴

جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں ۲۴۴

صلیب پر کھچوانے کی تدبیر

اور انہوں نے مسیح کے جس مکر یا باریک تدبیر کا یہاں ذکر ہے وہ یہ تھی کہ انہوں نے حضرت مسیح کو جھٹلانے پر کفایت نہیں کی۔ اور نہ صرف انہیں سنگسار کرنے یا کالی سمجھا کہ اس کو مروا دیں بلکہ انہوں نے باریک تدبیر کے ذریعہ اسے حکام وقت سے صلیب پر کھچوانے کی تدبیر کی جیسا کہ دوسری جگہ اس کی طرف اشارہ آتا ہے۔ اور جیسا اناجیل میں مفصل مذکور ہے۔

مسیح کو آسمان پر اٹھانا مخفی تدبیر نہیں کہلا سکتا

ومکر اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے بھی کوئی باریک تدبیر کی۔ یہ باریک تدبیر کیا تھی؟ عام طور پر یہ خیال ہے کہ حضرت مسیح کو آسمان پر اٹھا لینا اور آپ کا ہمشکل ایک حواری کو بنا کر اس کو مصلوب کرا دینا یہ خدائی تدبیر تھی۔ لیکن اس پر تین اعتراض پیدا ہوتے ہیں اول یہ کہ ایک شخص کو یوں دشمنوں کے تصرف سے نکال لینا کہ اسے آسمان پر اٹھا لیا جائے یہ کوئی باریک مخفی تدبیر نہ ہوئی۔ دوسرا یہ کہ مکر تو اس تدبیر مخفی کو کہا جاتا ہے جو جہات نقص و فتور سے خالی ہو جب ایک حواری مارا گیا اور اسی صلیب کی موت سے مارا گیا تو یہ تدبیر تو سخت ناقص ہے۔ مسیح تو لعنتی موت سے بچے لیکن ان کی جگہ ایک حواری جو انصار اللہ میں سے تھا اسی لعنتی موت میں گرفتار رہا۔ تیسرا اور سب سے بڑا نقص اس پر یہ ہے کہ یہودیوں کی غرض تو پوری ہو گئی کہ مسیح کے کاروبار کا اور تبلیغ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور بنی اسرائیل اس کی ہدایت سے محروم رہ گئے پھر یہ کیسی ناقص تدبیر ہوئی واللہ خیر الماکرین کا لفظ اس پر نہیں بولا جا سکتا۔ الٰہی تدبیر جیسا کہ دوسری جگہ دکھایا جائیگا یہ تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ایک نہایت مخفی باریک تدبیر سے موت صلیب سے بچا کر باقی بنی اسرائیل کی طرف بھیج دیا اور اس طرح پر یہودی کوشش دونوں طرح پر ناکام ہوئی حضرت مسیح اپنی نبوت کا کام بھی کرتے رہے اور باریک رنگ میں صلیب کی موت سے بھی بچا دیئے گئے۔

توفی بتوفاہ اللہ

۲۴۴ متوفیک۔ توفاہ اللہ اذا قبض نفسہ (ل) قبض روحہ (ت) یعنی محاورہ توفاہ اللہ کے معنی قبض نفس یا قبض روح ہیں۔ توفاہ اللہ کے کوئی معنی سوائے قبض نفس یا روح کے کسی لغت میں نہیں آئے چونکہ یہاں زیر بحث خالی لفظ توفی نہیں بلکہ متوفیک زیر بحث ہے جس میں اللہ تعالیٰ فاعل اور حضرت عیسیٰ بطور مخاطب مفعول ہیں۔ اس لئے متوفیک پر صرف توفاہ اللہ کے معنی سے ہی سند لائی جا سکتی ہے۔ اور تمام اہل لغت نے توفاہ اللہ کے محاورہ کو تسلیم کر کے الگ لکھا اور اس کے خاص معنی قبض روح یا قبض نفس دیتے ہیں اور یہ معنی نہ صرف لغت سے ثابت ہیں۔ بلکہ خود قرآن کریم نے بھی صراحت فرمائی ہے اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا (الزمر ۳۹: ۴۲) اللہ کا نفوس کا توفی کرنا یا موت کے وقت ہوتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی نیند میں بھی توفی نفس کرتا ہے۔ تیسری کوئی صورت نہیں پس متوفیک کے معنی سوائے تیری قبض روح کرنے والا کے اور کچھ نہیں ہو سکتے ہاں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ یہاں مراد نیند میں قبض نفس ہے یا موت کے وقت۔ سو اس پر آگے بحث ہو گی۔

اس میں شک نہیں کہ توفی وفی سے ہے جس کے معنی پورا کرنا ہیں مگر خاص ابواب میں یا خاص محاورات میں جا کر جو معنی ایک لفظ اختیار کرتا ہے ان کا مدار قیاس پر نہیں بلکہ سماع پر ہے۔ اگر لغت کا مدار بجائے سماع کے قیاس پر رکھا جائے تو آج سب الفاظ کے معانی سے امن اٹھ جاتا ہے۔ پس وفی نے جو معنی باب تفعل میں اور اس باب کے اس خاص محاورہ توفاہ اللہ میں آ کر اختیار کر لئے ہیں ان پر سماع کی شہادت سوائے قبض روح کے چونکہ اور کچھ نہیں اس لئے قیاس سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ وفی کے معنی پورا کر لینا ہے اس لئے توفاہ اللہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے اسے مع جسم کے لیا توفاہ اللہ میں صرف نفس یا روح کا لینا اہل لغت کا فیصلہ ہے اور اشعار جاہلیت کی قرآن کریم کی حدیث کی علم ادب کی ایک بھی مثال اس کے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی۔

اور توفاہ اللہ صرف انسانوں پر بولا جاتا ہے نہ دوسرے حیوانات پر اور صرف نیند پر یا موت پر ہی بول سکیں گے اور جس طرح مجنون پر باوجود اس کی قوت عاقلہ ممیزہ کے جاتے رہنے کے توفاہ اللہ کا استعمال جائز نہیں حالانکہ نیند پر توفی کے استعمال کی یہی وجہ بیان کی گئی

وَرَافِعُكَ

اور اپنی طرف تیرا

کہ قوت ممیزہ عاقلہ جاتی رہتی ہے اسی طرح ہاں اگر یہ ممکن ہے کہ ایک شخص مع جسد عنصری آسمان پر چلا جائے تو اس پر بروئے لغت عرب توفاہ اللہ کا محاورہ بولنا جائز نہیں اس کے لئے کوئی اور لفظ چاہئے۔ اور لغت اور قرآن کریم کی اس شہادت کے مطابق ہی امام المفسرین حضرت ابن عباس سے متوفیک کے معنی خود بخاری میں ممیتک مروی ہیں یعنی تجھے موت دینے والا ہوں۔

متوفیک پر مفسرین کے خیالات

چونکہ یہ معنی اس عقیدہ کے خلاف تھے جو عیسائیوں میں مروج ہونے کی وجہ سے غلطی سے مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ ہیں۔ اور دوسری طرف اس کو نزول ابن مریم کی پیشگوئی کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے قوت مل گئی اس لئے ان معنوں کی کسی نے تو یوں توجیہ کر دی کہ موت کے بعد پھر زندہ کر دیا جو احیائے موتیٰ کے اصول کے خلاف ہے جس کا ذکر ۲۴۳:۲ میں ہو چکا اور بعض نے کہا تقدیم تاخیر ہے۔ اور یہ بات حضرت ابن عباس کی طرف بعض روایات میں منسوب کر دی گئی ہے۔ حالانکہ امام بخاری نے ابن عباس سے متوفیک کے معنی ممیتک روایت کرتے ہوئے تقدیم و تاخیر کو قبول نہیں کیا اور اسی لئے روایت کے اس حصہ کو غلط سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ پس قرآن و حدیث لغت اور امام المفسرین کی شہادت سب اس بات پر ہے کہ یہاں متوفیک کے معنی موت دینے والا ہیں۔ اور جن لوگوں نے متوفیک کے معنی مستوفی شخصك من الارض کئے ہیں یعنی تیرے وجود کو زمین سے پورا لینے والا ہوں یا اٰخذك وافیا بروحك کئے ہیں تجھے تیری روح کے ساتھ پورا لینے والا ہوں یا موت قوائے شہوانیہ مراد لیتے ہیں انہوں نے لغت میں قیاس کو دخل دے کر خود معنی بنا لئے ہیں جن پر کوئی شہادت لغت کی قطعاً نہیں۔ اسی لئے محتاط مفسرین کو باوجود اس خیال کے بھی اسی طرف جانا پڑا کہ متوفیک کے معنی موت دینے والا ہوں ہی ہیں۔ ہاں انہوں نے اپنے خیال کے قایم رکھنے کو یہ بات بڑھا دی کہ کچھ وقت وفات پا کر پھر حضرت عیسیٰ زندہ ہو گئے تھے۔ جیسا کہ ابن جریر نے وہب سے یہ روایت کی ہے قال توفی اللہ عیسیٰ ثلاث ساعات من النهار یعنی انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو تین گھڑی دن کی مردہ رکھا اور حاکم نے ان ہی سے روایت کی ہے ان اللہ توفی عیسیٰ سبع ساعات ثم احیاہ کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو سات گھڑی مردہ رکھا پھر زندہ کیا۔ اور بعض نے کہا یہاں متوفیک سے مراد ہے تجھے سلانے والا ہوں۔ اور پھر اس کی وجہ یہ بتائی ان اللہ تعالیٰ رفع عیسیٰ الی السماء وھو نائم رفقا بہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ سے نرم معاملہ کرنے کیلئے ان کو آسمان پر نیند کی حالت میں اٹھایا۔ پھر آتا ہے وقت ایک اور توفی وارد کرنی ہو گی اس کا بھی کہیں ذکر ہونا چاہئے تھا مگر قرآن شریف نے ایسا ذکر نہیں کیا نہ کسی حدیث میں ہے اور بعض نے کہا کہ یہاں ترتیب مراد نہیں یعنی توفی پہلے نہیں بلکہ رفع کے بعد ہے مگر یہاں چار باتیں ہیں توفی۔ رفع۔ تطہیر فوقیت متبعین متوفیک کو اگر اپنی جگہ سے اٹھایا جائے تو پھر اس کے لئے کوئی بھی موزون جگہ نہیں رفع کے بعد اور تطہیر سے پہلے اسے نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ تطہیر تو ہو چکی اور توفی قائلین حیات کے نزدیک ابھی ہوئی نہیں۔ تطہیر کے بعد اور فوقیت سے پہلے بھی اسے نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ فوقیت بھی ہو چکی اور فوقیت کے بعد بھی نہیں رکھا جا سکتا اس لئے کہ اس کا زمانہ قیامت تک ممتد ہے۔ تو اس صورت میں وفات گویا بعد قیامت ہوئی جو بالبداہت باطل ہے پس حق یہی ہے کہ جو ترتیب قرآن کریم نے رکھی ہے وہی درست ہے پہلے توفی ہی پھر رفع پھر تطہیر پھر فوقیت۔

وفات مسیح

حضرت مسیح کی وفات کے نام پر بعض لوگ باوجود اس تصریح کے جو قرآن شریف میں موجود ہے بہت گھبراتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ یہ کوئی نیا عقیدہ ہے جو اسلام میں داخل کیا جا رہا ہے اور سمجھتے ہیں کہ قرآن شریف اور احادیث میں حضرت عیسیٰ کے زندہ بآسمان ہونے کا ذکر ہے۔ حالانکہ نہ صرف قرآن شریف و حدیث میں حیات مسیح کا مطلق کوئی ذکر نہیں بلکہ دونوں جگہ آپ کی وفات کا ذکر ہے۔ اور حیات مسیح پر جو اجماع امت سمجھا جاتا ہے اس کا یہ حال ہے کہ چار ائمہ میں سے ایک امام مالک کھلے طور پر وفات مسیح کے قائل ہیں چنانچہ بیان کا

امام مالک کا مذہب کہ مسیح فوت ہو چکے۔

عقیدہ عتبیہ اور مجمع البحار میں صاف الفاظ میں لکھا ہوا موجود ہے۔ قال مالك مات۔ اور باقی تین اماموں میں سے صراحت سے کوئی

اِلَیَّ

رفع کرنے والا ہوں ۴۴۵

حیات مسیح کے عقیدے سے عیسائی مذہب کو کیا فائدہ اُٹھاتا ہے

حیات مسیح کا قائل نہیں پس اصل عقیدہ اہل سنت والجماعت کا وفات مسیح ہے نہ حیات مسیح۔ پھر یہ بھی غور نہیں کیا جاتا کہ اس وقت عیسائی کس قدر مسلمانوں کے اس شہرت یافتہ خیال سے کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ آسمان پر ہیں فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ اور ناواقف مسلمانوں کو یہ کہکر گمراہ کر رہے ہیں کہ تمام رسول بروئے قرآن کھانے کے محتاج تھے مگر مسیح علیہ السلام کا جسم ایسا ہے کہ وہ دو ہزار سال سے زندہ آسمان پر موجود ہیں مگر اس طرح کھانے پینے کے محتاج نہیں جس طرح تمام بشر حتیٰ کہ رسول بھی اس جسم عنصری کی زندگی میں ہوتے ہیں اور اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس کا انکار نہیں ہو سکتا کہ اس صورت میں مسیح اُن کا کان کے مصداق ہوتے ان کے جسم خاکی میں کوئی تغیر نہیں آتا۔ اور یہ مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی صفت لازم ہے۔ اس لئے مسیح بشر سے نرالا اور خالق کی صفات میں شریک ہے اس طرح پر مسیح کی خدائی کو جس کے لئے ایک بھی دلیل کسی عیسائی کے ہاتھ میں نہیں۔ ثابت کرنے کے لئے مسلمانوں کا حیات مسیح کا عقیدہ کافی ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات ہیں جن سے حضرت مسیح کا وفات یافتہ ہونا ثابت ہوتا ہے مگر ان پر اپنے اپنے موقعہ پر بحث آئیگی آیت زیر بحث اکیلی بھی اس کو ثابت کر رہی ہے کیونکہ اگر متوفیک کا وعدہ پورا نہیں ہوا تو باقی وعدے جو اس کے بعد آتے ہیں وہ بھی پورے نہیں ہوئے اور یہ بالبداہت باطل ہے اور یہ در حقیقت پچھلے رکوع کی آخری آیت کا جواب بھی ہے کہ دشمن تو تم کو صلیب کی موت مارنا چاہتے ہیں جو لعنتی موت ہے میں باریک تدبیر سے تمہیں بچاؤں گا اور طبعی موت ماروں گا۔ احادیث میں جہاں کوئی حدیث مرفوع حضرت مسیح کے زندہ ہونے پر یا آسمان پر مع جسد عنصری اُٹھائے جانے پر نہیں بہت

وفات مسیح پر حدیث کی شہادت

سی احادیث سے حضرت مسیح کی وفات ثابت ہوتی ہے مثلاً مشہور حدیث معراج جس میں آپ نے حضرت عیسٰی اور حضرت یحییٰ کو ایک ہی جگہ پر دیکھا حالانکہ اگر حضرت عیسٰی زندہ تھے تو وفات یافتہ انبیاء میں ان کا کیا کام تھا۔ پھر وہ حدیث جس میں صاف یہ لفظ آتے ہیں لو کان موسیٰ وعیسیٰ حیین لما وسعھما الا اتباعی اگر موسیٰ وعیسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں میرا اتباع کرنا پڑتا۔ اور وہ حدیث جس میں ہے ان عیسیٰ عاش عشرین ومائۃ سنۃ عیسیٰ ایک سو بیس برس زندہ رہے اور یہ وہ بات ہے جو نبی کریم صلعم فرماتے ہیں جبرائیل نے مجھے بتائی پس وفات مسیح کا عقیدہ نہ صرف قرآن وحدیث سے ثابت ہے بلکہ ائمہ اہل سنت والجماعت کے چار ائمہ میں سے ایک امام کا کھلا مذہب ہے اور باقی تین خاموش ہیں اور آج وفات مسیح کو مان کر مسلمان عیسائی مذہب کی قوت کو ایسا توڑ سکتے ہیں کہ پھر یہ سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہتا +

رفع

الرافع

۴۴۵ رَافِعُكَ اِلَیَّ ۔ رفع کے چار گونہ استعمال پر دیکھو ۹۳ اور انسان کے رفع سے مراد بلندی درجات ہونے پر دیکھو ۳۲۵ لسان العرب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الرافع ہے جس سے مراد ہے وہ جو مومن کو سعید بنا کر اور اپنے اولیاء کو قرب عطا کر کے رفع فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں اس لفظ کا آنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے انسانوں کو رفع کرنے کا ذکر ہو۔ وہاں مراد بلندی درجات اور قرب کا عطا کرنا ہوتا ہے نہ ایک نیچی جگہ سے اُٹھا کر کسی بلند جگہ پر ان کو رکھ دینا۔ پس امام راغب نے جو چار معنی رفع کے دیئے ہیں ان میں سے چوتھے معنی یعنی مرتبہ کی بلندی یہاں صادق آئینگے کیونکہ یہ انسان کا رفع ہے جو اللہ تعالیٰ کرتا ہے اور یہ رفع اس کے اسم الرافع کے ماتحت ہی ہوگا رفع کے یہ معنی عام طور پر زبان عرب میں مروج ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں نساء مرفوعات جس کے معنی لسان العرب میں دیئے ہیں نساء مکرمات یعنی معزز عورتیں۔ اور فرش مرفوعۃ جو قرآن کریم میں آیا ہے (الواقعۃ ۵۶ - ۳۴) اس کے معنی دیئے ہیں اے مُقَرَّبَةٍ لَهُم یعنی جو ان کے قریب کئے جائینگے۔ ایسا ہی قیامت کے متعلق قرآن شریف میں آیا ہے خافضۃ رافعۃ (الواقعۃ ۵۶ - ۳) جس کے معنی زجاج نے یوں کئے ہیں کہ گنہگاروں کو ذلیل کرے گی اور فرمانبرداروں کو رفع کرے گی یعنی ان کے مراتب بلند کرے گی اور فی بیوت اذن اللّٰہ ان ترفع (النور ۲۴ - ۳۶) میں ترفع کے معنی لکھے ہیں تعظم (ل) ان کو عظمت دی جائے قرآن کریم میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کے انسانوں کو رفع کرنے کا ذکر آیا ہو۔ ہاں رفع کے معنی صرف قرب ہیں نہ جسم کا بلند کرنا ولو شئنا لرفعنٰہ بہا (الاعراف ۷ - ۱۷۶)

وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور تجھے ان سے پاک کرنیوالا ہوں جو کافر ہیں ۴۴۶

جہاں تفاسیر میں بھی رفع الی منازل الابرار (ض) یا الی منازل العلماء یا الی الجنۃ (ف) وغیرہ لکھا ہے یعنی نیکوں یا علماء کے مقام کی طرف یا جنت کی طرف اور اسی آیت کے نیچے ابن جریر لکھتے ہیں والرفع بہم معانی کثیرۃ منہا الرفع فی المنزلۃ عندہ ومنہا الرفع فی شرف الدنیا ومکارمہا ومنہا الرفع فی الذکر الجمیل والثناء الرفیع یعنی "رفع بہت سے معنوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ کے حضور بلندی مرتبہ ہے اور ان میں سے دنیا میں عزت اور مکرمت کا مقام ہے اور ان میں سے اچھے ذکر اور ثنائے بلند میں رفع ہے" لیکن اللہ تعالیٰ کا انسان کو رفع کرنا صرف ایک ہی معنی یعنی بلندی درجات میں آتا ہے اور کبھی کسی دوسرے معنی میں نہیں آیا۔

رفع کے معنی حدیث میں۔

احادیث رفع کے معنی کا قطعی فیصلہ کر دیتی ہیں۔ سب سے زیادہ قابل غور وہ دعا ہے جو بین السجدتین کی جاتی ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں وارفعنی اے خدا مجھے رفع دے کیا آج تک کسی مسلمان کے وہم میں یہ گزرا ہے کہ اس دعا کا منشاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جسم سمیت آسمان پر اٹھا لے۔ بلکہ اگر اللہ کے انسان کو رفع کرنے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں تو یہ دعا تو آج تک کسی مسلمان کی قبول نہ ہوئی۔ کیونکہ کوئی مع جسم آسمان پر نہ گیا۔ ترمذی میں ایک حدیث میں ہے یریدالناس ان یضعوہم ویابی اللہ الا ان یرفعہم لوگ چاہتے ہیں کہ ان کو ذلیل کریں اور اللہ تعالیٰ ان کے رفع کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو مع جسم آسمان پر اٹھائے جانا چاہتا ہے پھر احادیث تواضع میں بار بار آتا ہے کہ جو تواضع کرے اللہ تعالیٰ اس کا رفع کرتا ہے فتواضعوا یرفعکم اللہ اور ایک حدیث میں آتا ہے فاذا تواضع رفعہ اللہ بالسلسلۃ الی السماء السابعۃ (کنزالعمال جلد ۲۔ صفحہ ۲۶) جب بندہ تواضع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے زنجیر کے ساتھ ساتویں آسمان پر رفع کرتا ہے۔ یہاں رفع بھی ہے ساتواں آسمان بھی ہے زنجیر بھی ہے مگر پھر بھی رفع جسم مراد نہیں بلکہ قرب مراد ہے پس لغت۔ قرآن شریف۔ حدیث سب اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے انسان کو رفع کرنے سے ہمیشہ اور ہر حال میں مراد قرب عطا کرنا ہوتا ہے خواہ کتنے بھی قرائن اس کے خلاف ہوں اور ایک بھی نظیر نہیں جہاں اللہ کے انسان کو رفع کرنے کے معنی سوائے اسکے کچھ اور آتے ہوں۔

خدا کی طرف جانا یا رفع سے مراد

اسی معنی پر ایک قرینہ رافعک الی میں لفظ الیّ بھی ہے۔ کیونکہ یہ رفع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ آسمان کی طرف رفع کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کوئی جسم نہیں جو آسمان پر ہو اور اس پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مکان میں ہونا ممتنع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں اللہ کی طرف یا رب کی طرف جانے کا ذکر ہو کبھی بھی مراد انتقال جسمانی نہیں ہوتا بلکہ قرب روحانی مراد ہوتا ہے۔ جیسے ارجعی الی ربک۔ انا الیہ راجعون۔ انی ذاھب الی ربی۔ اتخذ الی ربہ سبیلا۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں صفائی سے لکھ دیا ہے رفعہ فی قولہ ورافعک الی ھو الرفعۃ بالدرجۃ والمنقبۃ لا بالمکان والجہۃ یعنی رافعک الی میں رفع سے مراد درجہ اور مرتبہ میں بلندی ہے نہ مکان اور جہت کی بلندی۔

حضرت عیسیٰ کی تطہیر

۴۴۶ مطہرک من الذین کفروا۔ طہارت دو طرح پر ہے ایک طہارت جسم اور دوسرا طہارت نفس۔ طہارت جسمانی تو یہاں مراد ہی نہیں ہو سکتی۔ طہارت نفس کے معنی عموماً مفسرین نے لئے ہیں۔ اور معنی یوں کئے ہیں مُخْرِجُكَ مِنْ جُمْلَتِهِمْ وَمُنَزِّهُكَ اَنْ تَفْعَلَ فِعْلَهُمْ (ع) یعنی ان کی (یعنی کافروں کی) جماعت سے باہر نکالنے والا اور تمہاری تنزیہ کرنے والا اس امر سے کہ تم ان کے افعال کرو مگر ظاہر ہے کہ یہ معنی یہاں نہیں لگتے۔ اس لئے کہ کافروں کے فعل کرنے سے پاک کرنا تو نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے نہ نبی بنایا جانے کے بعد کا بلکہ نبی تو فطرتاً ہی گناہ سے پاک کیا جاتا ہے پھر ایسا وعدہ دینے کی ضرورت کیا تھی۔ اور بعض نے کہا تطہیرہ علیہ السلام بتبعیدہ منہم بالرفع (ر) یعنی رفع کرکے ان سے دور کر دینا ہی تطہیر تھی مگر یہ بھی تحصیل حاصل ہے۔ اس تبعید کا ذکر تو رافعک میں آچکا دوبارہ اس کے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ مطہرک من الذین کفروا میں درحقیقت ایک اور قسم کی تطہیر مراد ہے انبیاء سے

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ

اور جنہوں نے تیری پیروی کی انہیں ان پر جنہوں نے انکار کیا قیامت کے دن تک فوقیت دینے والا ہوں ۴۴۷

حضرت عیسیٰ کی تطہیر آنحضرت کا غفر ایک ہی معنی میں ہیں۔

تو مطہر ہی ہوتے ہیں۔ مگر لوگ ان پر جھوٹے الزامات لگا کر ان کو نعوذ باللہ ناپاک مشہور کرتے ہیں۔ ان جھوٹے الزامات کی قرار واقعی تردید بھی درحقیقت ایک تطہیر ہے اور یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح ہمارے نبی کریم صلعم کے متعلق فرمایا لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک و ما تاخر جہاں مراد وہ ذنوب ہیں جو دوسرے لوگ آپ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ پس انبیاء کی تطہیر اور غفر تو پہلے ہو چکا ہوتا ہے آئندہ جس تطہیر اور غفر کا وعدہ ہوتا ہے وہ ان امور سے تطہیر اور غفر ہے جو دشمن ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

تبع۔ اتبع

عیسٰیؑ کے متبع عیسائی ہیں مسلمان نہیں

۴۴۷ اتبعوک۔ تَبِعَ اور اتَّبَعَ کے معنی ہیں اس کے نقش قدم پر چلا (غ) حقیقی معنی تو یہی ہیں مگر چونکہ ہر ایک متبع کامل طور پر نقش قدم پر چلنے والا نہیں ہو سکتا اس لئے الذین اتبعوک میں وہ لوگ بھی داخل ہو سکتے ہیں جو صرف نقش قدم پر چلنے کا دعوےٰ کرتے ہوں جن مفسرین نے اس سے مراد مسلمانوں کو لیا ہے سخت غلطی کھائی ہے اس سے مراد صرف عیسائی ہیں۔ اور مسلمان حضرت عیسیٰ کے متبع نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلعم کے متبع ہیں ابھی حدیث نقل ہو چکی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر موسیٰ اور عیسیٰ زندہ ہوتے تو وہ میرے متبع ہوتے پس مسلمان حضرت عیسیٰ کے متبع نہیں اور اسی کی طرف قرآن کریم نے خود بھی رہنمائی فرمائی ہے کیونکہ دوسری جگہ صاف فرمایا فاٰمنت طائفۃ من بنی اسرائیل وکفرت طائفۃ فایدنا الذین اٰمنوا علیٰ عدوھم فاصبحوا ظاھرین (الصف ۱۴:۶۱)

فوق

فوق۔ کا استعمال بلحاظ مکان اور زمانہ اور جسم اور عدد اور مرتبہ کے ہوتا ہے۔ یہاں مفسرین کو بالاتفاق تسلیم کرنا پڑا ہے کہ فوقیت مکانی مراد نہیں اور یہاں فوقیت سے غلبہ بلحاظ دلائل مراد لیا ہے یا ظاہری غلبہ یعنی حاکم و محکوم کا یعلونھم بالحجۃ او السیف (ف)

کافران مسیح

الذین کفروا سے مراد کل غیر عیسائی یا غیر مسلم نہیں بلکہ صرف وہ لوگ جو بالخصوص حضرت مسیح کا کفر کریں اور اس لئے ان الفاظ میں صرف یہود کا ذکر مقصود ہے کہ وہ کل انبیائے بنی اسرائیل کو مانتے چلے آئے مگر حضرت عیسیٰ کا انکار کر دیا۔

حضرت مسیح سے چار وعدے

یہاں حضرت مسیح کو کل چار وعدے دیئے گئے ہیں۔ جو بجواب تدابیر کفار ہیں جن کا ذکر پچھلی آیت میں الفاظ مکروا میں صاف طور پر فرمایا ہے۔ ان چار وعدوں میں سے پہلا وعدہ ہے کہ تمہیں طبعی موت سے وفات دوں گا۔ دوسرا وعدہ ہے کہ تمہارا اپنی طرف رفع کروں گا یعنی اپنا قرب عطا فرماؤں گا۔ تیسرا وعدہ ہے کہ ان الزامات سے جو تم پر لگائے جائیں گے۔ تم کو پاک وصاف کروں گا اور چوتھا وعدہ ہے فوقیت یعنی حضرت مسیح کے نام لیوا آپ کے منکروں پر بذریعہ دلائل یا قہری طور پر غالب رہیں گے۔ قرآن کریم کا لفظ لفظ اپنے اندر اعجاز رکھتا ہے۔ یہودیوں کی تدبیر کا ذکر تھا۔ وہ تدبیر کیا تھی؟ حضرت عیسیٰ کو بذریعہ صلیب مارنا۔ تو اول تو بذریعہ صلیب مارنے کی نفی کی اور اس کا جواب دیا متوفیک بذریعہ صلیب تمہیں نہیں مار سکیں گے بلکہ تم اپنی طبعی موت سے مرو گے۔ پھر صلیب پر مارنے کا نتیجہ تھا کہ ایسا شخص ملعون ہو۔ کیونکہ استثناء ۲۱: ۲۲ و ۲۳ میں صلیب کا ذکر کر کے لکھا ہے "کیونکہ وہ جو پھانسی دیا جاتا ہے خدا کا ملعون ہے۔" اور گلتیون ۳: ۱۳ میں پولوس کہتا ہے "کیونکہ لکھا ہے جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے" اور ملعون کے معنی ہیں خدا سے دور۔ اس لئے اس نتیجہ کی نفی کی کہ وہ خدا سے دور نہیں بلکہ مرفوع یعنی خدا کا مقرب ہو گا پھر صلیب پر مار کر اور کذاب مشہور کر کے غلط الزامات کا آپ پر لگانا تھا جیسے مثلاً یہ کہ آپ ناجائز تعلق سے پیدا ہوئے جیسا کہ قولھم علیٰ مریم بہتانا عظیما سے ظاہر ہے اس کی نفی مطھرک من الذین کفروا میں کی یعنی فرمایا کہ تم پر سے یہ الزامات بھی دور کروں گا یا یہ کہ تم پر سے ملعون ہونے کے الزام کو بھی دور کروں گا جو دراصل نتیجہ صلیب کا ہے اور پھر وہ مصلوب کر کے تم کو ناکام کرنا چاہتے ہیں۔ سو میں تمہارے پیروؤں کو تمہارے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔

چاروں وعدوں میں ترتیب

اور چاروں وعدوں میں ایک اور بھی لطیف ترتیب ہے۔ رفع یعنی حقیقی قرب کا مقام بعد وفات ہی حاصل ہوتا ہے جب سالک

۵۵ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ فَأَمَّا الَّذِينَ

پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹ آنا ہے پس میں تمہارے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کرونگا جنمیں تم اختلاف کرتے تھے ۴۴۸ سو وہ جنہوں نے

كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن

انکار کیا میں انکو دنیا اور آخرت میں سخت دکھ کا عذاب دوں گا اور انکے لئے کوئی بھی

۵۶ نَّاصِرِينَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ

مددگار نہ ہوگا ۴۴۹ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے سو ان کے اجر انکو پورے دے گا

۵۷ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ۝

اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا ۴۵۰ یہ ہم آیتوں اور حکمت والے ذکر سے تجھ پر پڑھتے ہیں ۴۵۱

حجاب دور ہو جاتے ہیں پس توفی کے بعد رفع فرمایا تو جب مقام قرب عطا ہوتا ہے تو دوسری طرف مخلوق میں بھی محبت اور عزت بڑھتی ہے یہی آپ کی تطہیر یعنی الزامات سے پاک کیا جانا ہے۔ اور عزت اور محبت کے بعد متبعین کی کثرت اور غلبہ کا ہونا لازمی امر ہے۔ اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ خیال کہ کبھی حضرت عیسیٰ پھر آئینگے تو سارے اہل کتاب ان پر ایمان لے آئینگے قرآن کریم کے خلاف ہے اسلئے کہ قرآن شریف قیامت تک مسیح کے پیروؤں اور مسیح کے منکروں کا وجود ضروری قرار دیتا ہے ✦

مسیح کے منکر قیامت تک رہینگے۔

۴۴۸ ان الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ اختلاف عقائد کا فیصلہ قیامت کے دن ہی ہوگا یعنی دنیا میں اختلاف عقائد کا فیصلہ کبھی نہیں ہوگا اور اختلاف عقاید قیامت تک رہیگا۔ پس اس سے بھی ان لوگوں کا خیال باطل ثابت ہوتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ پھر آئینگے تو اختلاف عقائد دنیا سے مٹ جائیگا اور اس دنیا میں ہی سب فیصلے ہو جائینگے ✦

اختلاف عقیدہ تا قیامت رہے گا۔

۴۴۹ جس اختلاف پر فیصلہ کا ذکر پچھلی آیت میں کیا تھا اب اس کی تفصیل فرماتا ہے کہ اختلاف کرنے والوں میں سے ایک گروہ تو حضرت عیسیٰ کے منکروں کا ہے ان کو دونوں جگہ سزا ملے گی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سو یہود کی دنیا کی سزا اظہر من الشمس ہے یہ قوم باوجود مالدار ہونے کے ہمیشہ دنیا میں ذلیل رہی ہے اور جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کوئی ان کا یار و مددگار نہیں بنتا۔ ذلت سے بڑھکر کوئی دکھ کا عذاب نہیں ✦

مسیح کے منکروں کیلئے عذاب دنیا

۴۵۰ الظالمین۔ ظلم کے معنی کیلئے دیکھو ۵۵ جہاں دکھایا گیا ہے کہ شرک بھی ایک ظلم ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے ان الشرک لظلم عظیم (لقمٰن ۳۱ - ۱۳) سب سے بڑا ظلم شرک ہے اور وہی یہاں مراد ہے اس لئے کہ یہ مسیح کو خدا بنانے والوں کا ذکر ہے ✦

ظلم

یہ ماننے والوں کا گروہ ہے جس کے یہاں دو حصے کر دیئے ہیں ایک حصہ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات والوں کا ہے یعنی وہ جو عقیدہ بھی صحیح رکھتے تھے اور عمل بھی اچھے کرتے تھے۔ اور دوسرا حصہ الظالمین کا ہے جس سے مراد حضرت عیسیٰ کو خدا ماننے والے ہیں اور لا یحب الظالمین میں اسی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہ خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ وہ مشرک ہیں ان کا دعویٰ محبت جھوٹا ہے خدا ان سے محبت نہیں کرتا۔ اس لئے بھی پہلے گروہ کے ساتھ جو حضرت مسیح کے صحیح معنی میں متبع تھے عملوا الصالحات کی شرط لگا دی ہے کہ یہ دوسرا گروہ کفارہ کو اصل بنیاد قرار دے کر اعمال صالحہ سے محروم ہو گیا ہے ✦

عیسائیوں کے دو گروہ

۴۵۱ الاٰیات سے مراد یہاں حجج یا دلائل ہیں جو اوپر گزر چکی ہیں جن کی طرف لفظ ذٰلک میں اشارہ بھی کیا ہے۔ کیونکہ اٰیۃ کا استعمال

اٰیۃ

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۵۸

بیشک عیسٰی کی حالت اللہ کے نزدیک آدم کی حالت کی مانند ہے۔ اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اسے کہا ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے ۴۵۲

محسوسات اور معقولات دونوں میں ہوتا ہے +

ذکر — **قرآن کو کیوں ذکر کہا جاتا ہے**

الذکر۔ اصل میں یاد کرنے یا یاد دلانے کو کہا جاتا ہے۔ اور یہاں ذکر سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ ذکر قرآن شریف کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور ذکر اس کو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ان تمام باتوں کو جو فطرت انسانی میں مرکوز ہیں یاد دلاتا ہے۔ یا اس لئے کہ وہ انسان کو شرف اور بزرگی کے مقام پر پہنچاتا ہے +

الحکیم

الحکیم۔ یہاں ذکر یا قرآن شریف کی صفت ہے اور یہ لفظ قرآن شریف کی وصف ہیں اور جگہ بھی آیا ہے یٰسٓ والقرآن الحکیم (یٰسٓ ۱) قرآن کریم کو حکیم اسلئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اعلیٰ درجہ کی حکمت کی باتیں ہیں (القمر ۴ و ۵) جس پر قرآن کریم بھی شاہد ہے ولقد جاءھم من الانباء ما فیہ مزدجر حکمۃ بالغۃ

حضرت مسیح کے حالات انکی الوہیت کے خلاف دلیل ہیں۔

یہاں بالخصوص آیات یعنی دلائل کا لفظ لانا اور پھر ان باتوں کو پر حکمت قرار دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ اوپر حضرت عیسٰی کے متعلق کہا گیا ہے وہ دعویٰ نہیں بلکہ دلائل ہیں اور پر حکمت باتیں ہیں۔ ان کی پیدائش ان کا بچپن ان کی وفات کے حالات ان کی تعلیم ان کے نشانات یہ سب کچھ دلائل ہیں جو عیسائیت کے بطلان پر دی گئی ہیں۔ جو لوگ ان باتوں کو محض قصوں کہانیوں کی حد تک سمجھتے ہیں وہ یہاں لفظ حکیم کے لانے پر غور کریں +

آدم اور عیسٰی کی مشابہت کس بات میں ہے

۴۵۲ مثل کے معنی کے لئے دیکھو ۳۵ یہاں مراد صفت یا حالت ہے اور فرمایا کہ عیسٰی کی حالت اللہ کے نزدیک آدم کی حالت کی طرح ہے۔ اسے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اسے کہا ہو سو وہ ہو گیا آدم کا ذکر قرآن کریم میں دو رنگ میں آیا ہے۔ ابو البشر ہونے کے لحاظ سے یعنی بشریت کے لوازمات تامہ اس میں پائے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک ہونے کے لحاظ سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق جو کچھ اوپر ذکر ہوا۔ اس میں بھی انہی دو باتوں کا ذکر ہے یعنی حضرت عیسٰی میں بشر ہونے کی ساری صفات پائی جاتی ہیں اور دوسرے وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک ہیں۔ چنانچہ بشریت کے لحاظ سے آپ کی پیدائش۔ طفولیت کہولت وفات کا ذکر فرمایا کیونکہ یہی باتیں بشر کو خدا سے الگ کرتی ہیں۔ بشریت کے تقاضوں میں سے ہی پیدا ہونا اور مرنا۔ اور اس دنیا کی زندگی میں ان تغیرات کے تحت آنا ہے جو طفولیت سے لیکر کہولت تک انسان پر آتے ہیں۔ خدا نہ پیدا ہوتا ہے نہ مرتا ہے نہ اس پر تغیرات آتے ہیں۔ کہ بچپن کی حالت سے ترقی کرتا کرتا ترقی کے آخری مرتبہ پر پہنچ کر پھر اس کے قویٰ میں تنزل واقع ہونا شروع ہو۔ اور برگزیدگی کے لحاظ سے آپکے رسول ہونے اور دنیا میں ایک روحانی انقلاب پیدا کرنے اور رفعت مرتبہ وغیرہ کا ذکر ہے پس جو کمال آدم میں اللہ تعالیٰ نے رکھا تھا وہ کمال حضرت عیسٰی علیہ السلام کو بھی دیا۔ اور اس طرح پر عیسائیوں پر اتمام حجت کی اور اس اتمام حجت کا خلاصہ اس آیت میں ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے۔ کہ اس سورت کے صدر میں عیسائیوں کے ساتھ ہی بحث ہے۔ اور غرض اس سارے بیان کی حضرت مسیح میں لوازمات بشریت کا ثابت کرنا اور یہ ظاہر کرنا ہے۔ کہ وہ خدا نہ تھا پس ساری بحث کو اب بطور خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرمایا۔ کہ جو کچھ باتیں آدم میں پائی جاتی ہیں یعنی بشریت اور برگزیدگی وہی عیسٰی میں پائی جاتی ہیں۔ خدا تم اس کو کس بنا پر بناتے ہو۔ مماثلت کیلئے تو یہی دو امر کافی ہیں بشریت اور برگزیدگی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ صورت پیدایش میں مشابہت ہے۔ تو کوئی مشابہت فی الواقع نہیں آدم کو جس طرح بنایا مسیح کو اس طرح نہیں بنایا۔ مسیح کو ماں کے پیٹ میں رکھا۔ پھر بچہ بنایا۔ پھر بڑھایا۔ آدم کی خلق کے متعلق جو کچھ صورت سمجھی جاتی ہے اسکی رو سے آدم پر یہ حالات نہیں گزرے پس مشابہت صورت خلق میں نہیں نہ صورت خلق کا یہاں ذکر ہے بلکہ بشریت اور برگزیدگی میں مشابہت ہے اسیلئے ان اللہ اصطفٰی آدم بطور تمہید بھی اس سے پہلے بیان کیا ہے۔ کن فیکون کا استعمال یہی بتاتا ہے یعنی ہو جا تاہی کہا گیا نہ ہو گیا جس میں استمرار پایا جاتا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ انسانوں کو برگزیدگی کے مقام پر کھڑا کرتا رہا ہے +

۵۹ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا

حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس تو جھگڑا کرنے والوں میں سے نہ ہو پھر اگر کوئی اس کے بعد جو تیرے پاس علم آچکا اسکے

جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَ

بارے میں تجھ سے جھگڑا کرے تو کہو آؤ ہم اپنے بیٹوں اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں اور تمہاری

نِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝

عورتوں کو اور اپنے لوگوں اور تمہارے لوگوں کو بلائیں پھر گڑگڑا کر دعا کریں۔ پس جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں ۴۵۳

خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون۔ میں بھی انہی دو مذکورہ بالا باتوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے یعنی خلقه من تراب یا مٹی سے پیدا کرنے میں بشریت کی طرف اشارہ ہے۔ اور کن فیکون میں برگزیدہ کیا جانے کی طرف کیونکہ خلق کے بعد کن کا امر یہی معنی رکھ سکتا ہے کہ اس کو ایک دوسری زندگی عطا فرمائی یعنی روحانی زندگی یا اپنا کلام اس میں نفخ کیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ مٹی سے پیدا کیا جانا کوئی آدم اور عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص امر نہیں۔ بلکہ ہر فرد بشر کو اللہ تعالیٰ مٹی سے ہی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ کہف میں مومن اور کافر کے مکالمہ میں مومن کافر کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔ اکفرت بالذی خلقك من تراب ثم من نطفة ثم سوّٰك رجلا (الکہف ۱۸: ۳۷) تو اس ذات پاک کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے۔ پھر تجھے ٹھیک مرد بنایا ایسا ہی سورۃ الحج میں فرمایا۔ یا یہا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقنٰکم من تراب (الحج ۲۲: ۵) اے لوگو اگر تم بعث کے بارے میں شک میں ہو تو غور کرو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پس مٹی سے ہی سب نوع بشر پیدا ہوئی ہے۔ ہاں پھر بعض کو اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اور ایک روحانی زندگی عطا فرماتا ہے۔ بن باپ پیدائش کا نہ یہاں کوئی ذکر ہے۔ نہ کوئی ایسا اعتراض موجود ہے جس کا جواب دیا ہو۔ کیونکہ اس کا ذکر اگر ہوتا تو وہاں ہوتا جہاں پیدائش کے حالات کا ذکر تھا۔ یہاں تو حضرت عیسیٰ کی وفات کے تذکرہ کے ساتھ ساری بحث کو ختم کرکے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔ بلکہ فیکون کا لفظ آخر پر مضارع لاکر بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہر حال میں جاری ہے صرف دو مخصوص مثالوں پر محدود نہیں ✦

ہر بشر مٹی سے پیدا ہوتا ہے

۴۵۳ تعالوا - اصل میں یہ لفظ (علو سے مشتق ہونے کی وجہ سے) کسی بلند مکان کی طرف بلانے کیلئے آتا ہے پھر ایک مکان کی طرف بلانے کیلئے۔ یہاں مراد ہے۔ رائے اور عزم کو پختہ کرکے آؤ ✦

تعالوا

نبتهل - اَلْبُهْلُ وَالْاِبْتِهَالُ فِی الدُّعَاءِ الاسترسال فیه وَالتَّضَرُّعُ (غ) یعنی بہل اور ابتہال دعا میں ٹھہر ٹھہر کر مانگنا اور تضرع کرنا ہے۔ اور آگے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے ابتہال کی تفسیر لعنت سے کی ہے وہ اس لئے ہے کہ اس میں ٹھہرنا لعنت کی غرض سے ہے۔ اور لسان العرب میں بھی ہے ابتهل فی الدعاء اذا اجتهد یعنی ابتہال دعا میں اجتہاد یا زور سے دعا کرنا ہے ✦

ابتہال

اس مضمون کو ان الفاظ سے شروع کیا ہے کہ اس کے بعد جو تیرے پاس علم آچکا یعنی دلائل جو اوپر دی گئیں۔ دلائل کی رو سے جب اتمام حجت کر دیا اور عیسائیوں نے دلائل کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر مباہلہ کے لئے بلایا یعنی بالمقابل دعا کرنے کے لئے اور دعا پر پورا زور لگانے کیلئے یہ گویا ایک دوسرے رنگ کا اتمام حجت تھا۔ دعا کی قبولیت کے عیسائی بھی قایل ہیں اور انجیل میں ہے کہ متقی کی دعا سنی جاتی ہے چنانچہ عبرانیوں ۵: ۷ میں جہاں مسیح کے صلیب کی موت سے بچنے کیلئے رو رو کر دعائیں کرنے کا ذکر ہے "بہت رو رو اور آنسو بہا بہا کے اس سے جو اس کو موت سے بچا سکتا تھا دعائیں اور منتیں کیں" وہاں اس دعا کی قبولیت کا ذکر ان الفاظ میں ہے وسمع له من اجل

دعوت مباہلہ عیسائیوں پر اتمام حجت کیلئے

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ ۶۱

یقیناً یہی سچا بیان ہے اور اللہ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں۔

تقویٰ یعنی اس کے تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے اس کی دعا سنی گئی پس جب عیسائیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ ساری دنیا گنہگار ہے اور ہم ہی کفارہ پر ایمان لا کر نجات کے مستحق بنتے ہیں تو ضرور تھا کہ اس پہلو سے بھی ان پر اتمام حجت کیا جاتا۔ اور یہی اس آیت میں ذکر ہے۔

واقعہ مباہلہ وفد نجران سے

بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ میں روایت ہے۔ جاء العاقب والسید صاحبا نجران الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یریدان ان یلاعناہ قال فقال احدھما لصاحبہ لا تفعل فواللّٰہ لئن کان نبیا فلاعناہ لا نفلح نحن ولا عقبنا من بعدنا یعنی عاقب اور سید نجران کے قائم مقام رسول اللہ صلعم کی طرف آئے کہ تا آپ سے ملاعنہ کریں راوی (حذیفہ) کہتا ہے پھر ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو کہا ایسا مت کرو خدا کی قسم اگر یہ نبی ہو اور ہم نے اس سے ملاعنہ کیا تو نہ ہم اور نہ ہماری نسل ہمارے بعد کامیاب ہو سکے گی۔

اور محمد بن اسحاق نے سیرۃ میں لکھا ہے کہ وفد نجران (جو عیسائی تھے) ساٹھ سوار رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے چودہ ان کی قوم کے سردار تھے جن میں عاقب (جس کا نام عبدالمسیح تھا) اور سید (ایہم) کا نام بھی لیا ہے۔ اور عاقب ان کا سردار تھا اور سید ان کا لاٹ پادری تھا ان لوگوں کا ڈیرہ نبی کریم صلعم نے مسجد نبوی میں کرایا اور جب ان کی نماز کا وقت آیا تو مسجد میں ہی انہوں نے

مسجد میں عیسائیوں کو نماز پڑھنے کی اجازت

مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی (اس سے نبی کریم صلعم کی وسعت قلبی کا اندازہ کرو کہ اپنی مسجد میں عیسائیوں کو نہ صرف ٹھہراتے ہیں بلکہ انکو اپنی طرز پر عبادت کرنے کی بھی اجازت دیتے ہیں) پس جب انہوں نے دلائل کو نہ مانا اور الوہیت مسیح کے عقیدہ پر اصرار کیا تو نبی کریم صلعم نے ان کو مباہلہ کے لئے بلایا۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں انہوں نے کہا کہ ہم کو مہلت دیجئے کہ ہم مشورہ کریں سو جب انہوں نے مشورہ کیا تو یہی مشورہ قرار پایا کہ مباہلہ کرنے میں ہماری خیر نہیں اس لئے انہوں نے مباہلہ سے انکار کر دیا۔ اور جیسا کہ بخاری کی روایت میں آیا ہے جزیہ قبول کیا اور ابو عبیدہ ان کے ساتھ گئے۔ اور ابن مردویہ کی روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے ان کو مباہلہ کے لئے بلایا تو انہوں نے کہا ہم کل کرینگے۔ سو اگلے دن رسول اللہ صلعم علیؓ فاطمہؓ حسنؓ حسینؓ کو ساتھ لئے نکلے اور ان کو بلا بھیجا۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وفد نجران نے مباہلہ سے انکار کر دیا۔ ان کے عیسائی حمایتی کہتے ہیں کہ وہ بددعا کرنا چاہتے تھے یہ وکالت اس لئے بھی بے سود ہے کہ عیسائی تو اب تک نعوذ باللہ آنحضرت صلعم کو دجال کہتے ہیں وہ کونسے ان کے بزرگ تھے جو دجال کیلئے بددعا کرنا جائز نہ سمجھتے تھے۔ احادیث صحیحہ سے صاف ثابت ہے کہ وہ ڈر گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کو اللہ تعالیٰ نے یہ علم دیا تھا کہ عیسیٰ پرستی کا عقیدہ دنیا میں بہت زور پکڑنے والا ہے اس لئے اس کے خلاف ہر رنگ سے اتمام حجت کیا ہے۔ اول دلائل کی رو سے پھر بارگاہ الٰہی میں بالمقابل دعا سے فیصلہ کے طریق سے۔ اور سب سے آخر ایک اور طریق پر انکو بلایا ہے جس کا ذکر اگلے رکوع میں آتا ہے۔

عیسیٰ پرستی کی تردید پر زور

مباہلہ میں حضرت علیؓ کا نکلنا اور اہل تشیع

شیعہ کہتے ہیں علیؓ۔ فاطمہؓ حسنؓ حسینؓ کے ساتھ لانے میں آپ نے حضرت علیؓ کی فضیلت کی طرف اشارہ کیا ہے حالانکہ بات تو صاف ہے ابناء میں حسنؓ حسینؓ بلکہ حضرت علیؓ داخل ہیں کیونکہ داماد بھی بیٹا ہی ہوتا ہے۔ اور نساء میں حضرت فاطمہؓ اور انفسنا میں خود نبی کریم صلعم مراد تو صرف یہ تھی کہ جو شخص جھوٹا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ایسا استیصال کر دے کہ اس کے بچے بھی تباہ ہو جائیں اور سلسلہ نسل منقطع ہو جائے۔ یہاں فضیلت کا کوئی سوال نہیں دوسرے ایک روایت میں یہ لفظ بھی آتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے بیٹے اور حضرت عمرؓ اور ان کے بیٹے اور حضرت عثمانؓ اور ان کے بیٹے اور حضرت علیؓ اور ان کے بیٹے بھی نکلے تھے (د) بہر حال یہ تو ظاہر ہے کہ ابھی آنحضرت صلعم گھر سے ہی نکلے تھے۔ اور اگر فی الواقعہ مباہلہ ہوتا تو شاید بڑے بڑے صحابہ کو مع ان کی اولاد اور بیبیوں کے بھی بلاتے۔ لیکن عیسائیوں نے پہلے ہی انکار کر دیا۔ پس اس روایت سے تو کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔

مباہلہ کب جائز ہو

ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مباہلہ اب بھی جائز ہے؟ نبی کریم صلعم نے بغیر امر الٰہی مباہلہ نہیں کیا اور جب امر ہوا تو صرف

۶۲ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝

اور یقیناً اللہ ہی غالب حکمت والا ہے ۴۵۴ اور اگر وہ پھر جائیں تو اللہ بھی فساد کرنیوالوں کو جانتا ہے

امر شرک کی بنا پر مذہب میں فیصلہ

۶۳ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۤءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا

کہو اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی

اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ

کی عبادت نہ کریں اور نہ اسکے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے اور اگر وہ

۶۴ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَاۗجُّوْنَ

پھر جائیں تو تم کہو گواہ رہو کہ ہم فرمانبردار ہیں ۴۵۵ اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے میں

یعنی لوگوں کو مباہلہ کے لئے بلایا جن کے ساتھ مباہلہ کرنے کا صراحت سے حکم آچکا تھا۔ اس لئے بدون امر الٰہی مباہلہ کرنا جائز معلوم نہیں ہوتا جس شخص کو اللہ تعالیٰ اصلاح کے لئے مامور کرے وہ اپنے اعداء سے خدا کی طرف سے حکم پانے پر مباہلہ کرسکتا ہے۔ ہاں ابن عباسؓ کے متعلق ایک روایت ابن جریر نے بیان کی ہے کہ آپ کا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا ہو گیا تھا تو آپ نے اسے مباہلہ کے لئے بلایا (ر) مگر اول حضرت ابن عباس کا فعل کوئی حجت شرعی نہیں دوسرے اگر باہمی جھگڑوں پر مباہلہ ہونے لگے تو دن رات مسلمانوں کے باہم مباہلے ہی ہوتے رہیں اور بجائے اخوت اور محبت کے جس کا پیدا کرنا اسلام کی اصل غرض ہے ایک دوسرے کی بیخکنی اور استیصال کے درپے ہی ہیں +

قصص — ۴۵۴ قصص۔ کے معنی اثر یعنی نقش قدم بھی ہیں۔ اور قصص اخبار مُتَتَبَّعَة کو بھی کہتے ہیں یعنی خبر جس کا تتبع کیا جائے الحق قصص کی صفت ہے +

آیت کے اخیر پر عزیز حکیم کی صفات لانے سے اشارہ کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ نصرانیت کا غلبہ آخر دنیا سے دور ہو جائے گا۔ اور ما من اله الا الله یعنی ایک ہی خدا کی عبادت رہ جائے گی

سواء — ۴۵۵ سواء کے معنی وَسَط ہیں جب مکان سے تعلق ہو۔ اور کلمۃ سواء سے مراد امام راغب عدل امن الحکم لیتے ہیں یعنی انصاف کی بات۔ اور ابن عباس وغیرہ سے بھی عدل معنی مروی ہیں۔ مگر سواء مصدر بمعنی مستویۃ بھی ہو سکتا ہے ای لا یختلف فیہ التوراۃ والانجیل والقرآن (ر) یعنی مشترک بات جس میں تورات انجیل اور قرآن اختلاف نہیں کرتے اور لا اختلاف فیہا بین الشرائع (ر) یعنی تمام شریعتیں اس پر متفق ہوں +

شرک فی الصفات — لا نشرک به شیئاً۔ شرک کے معنی کے لئے دیکھو ۱۳۱ یہاں مراد شرک عظیم ہی ہے یعنی کسی چیز کو باری تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا اور یہ اس طرح پر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی دوسرے کو کامل شریک ٹھہرایا جائے جیسے مجوسیوں کا دو خالق تجویز کرنا۔ یا عیسائیوں کا مسیح کو صفات کاملہ باری تعالیٰ ازلیت ابدیت قدرت وغیرہ میں شریک ٹھہرانا۔ یا آریہ سماج کا مادہ اور روح کو باری تعالیٰ کی صفت ازلیت اور خود بخود اور غیر مخلوق ہونے میں شریک ٹھہرانا۔ یہ سب شرک عظیم میں داخل ہیں +

ارباب من دون اللہ — اربابا من دون اللہ۔ رب کی جمع ہے دیکھو ۲ا۔ اور ارباب سے مراد یہ ہے کہ ان کو مسبب الاسباب اور مصالح عباد کا متولی سمجھا جائے۔ اور اس لئے ان کی اطاعت اس طرح کی جائے جس طرح رب کی اطاعت کی جاتی ہے خود قرآن کریم نے اس کی تصریح فرمائی ہے

فِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰٮۃُ وَالۡاِنۡجِیۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ○

کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ توریت اور انجیل اس کے بعد ہی اُتاری گئیں۔ پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۴۵۶

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللّٰہ (التوبۃ-۳۱) انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا ہے۔ ترمذی نے عدی بن حاتم سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم ان کی عبادت نہ کرتے تھے آپ نے فرمایا اما کانوا یحلون لکم ویحرمون فتاخذون بقولھم کیا یہ نہیں تھا کہ وہ تمہارے لئے حرام اور حلال ٹھہراتے اور تم اُنہی کے قول کے پیچھے چلتے۔ تو انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی کرتے تھے پس جو مسلمان اپنے پیروں اور علماء کے پیچھے اس طرح آنکھیں بند کرکے چلتے ہیں کہ اپنی عقل و فکر سے کبھی کام نہیں لیتے۔ وہ بھی اسی فتوٰی کے ماتحت ہیں۔

پیر پرستی

تین قسم کا شرک

اس آیت میں تین قسم کے شرک سے منع فرمایا ہے۔ ایک شرک فی العبادت دوسرے شرک فی الصفات تیسرے شرک فی الاطاعت۔

شرک فی العبادات

شرک فی العبادت کو الا نعبد الا اللّٰہ میں بیان کیا ہے۔ یہ بہت موٹا شرک ہے کہ کسی چیز کے آگے سجدہ کیا جائے یا اس سے دعا کی جائے جیسے بت پرست کرتے ہیں۔ یا بعض عیسائی بھی حضرت مسیح سے یا حضرت مریم سے دعا کرتے ہیں بلکہ رومن کیتھولک ان کے بت بھی رکھتے ہیں اس سے اُتر کر شرک فی الصفات ہے۔

شرک فی الصفات

یعنی اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی چیز کو کامل شریک ٹھہرانا جس کا ذکر لا نشرک بہ شیئا میں کیا ہے کسی چیز کے شریک کرنے سے مراد یہی ہے کہ اس میں کامل طور پر کوئی صفت ایسی مانی جائے جیسے اللہ تعالیٰ کی صفت ہوتی ہے اور تیسرا شرک فی الاطاعت ہے جس کا ذکر اربابا من دون اللّٰہ میں کیا اور ان تمام قسم کے موٹے شرکوں سے منع فرمایا ✦

شرک فی الاطاعت

اصول مقابلۂ مذاہب اور صداقت اسلام

جیسا کہ پچھلے رکوع کے آخر میں میں نے کہا تھا جب دلائل اور دُعاء دونوں سے اتمام حجت ہو چکا اور دلائل کے قبول کرنے سے اُنہوں نے انکار کیا اور دعا میں مقابلہ سے خائف ہوئے تو اب ان پر ایک اور رنگ میں اتمام حجت کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمہارے اور ہمارے مذہب میں جو امر مشترک ہے اسکو دونوں فریق بنیاد کے طور پر مان لیں تو بہت سا فساد مٹ جاتا ہے ایک عیسائیت کیا جملہ مذاہب پر اسلام کی یہ حجت قایم ہو گی کہ اگر سب مذاہب میں امر مشترک کو نکالا جائے تو وہ اسلام کا مذہب ہے اور اسلئے کسی مذہب کا پیرو بھی اسلام کی حقانیت کا انکار نہیں کر سکتا ایک رنگ میں سب قومیں ہی اہل کتاب ہیں۔ گو مخصوص طور پر یہود یا عیسائیوں کو اہل کتاب کے نام سے پکارا گیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر قوم میں ہم نے رسول بھیجا پس اس رسول کی تعلیم ہی اس قوم کی کتاب ہے۔ اب اگر دنیا کی ساری قوموں کے معتقدات اور ساری مذہبی کتابوں کو دیکھا جائے تو ذات باری کے عقیدہ میں جو امر مشترک ان میں پایا جاتا ہے وہ ایک خدا کی ہستی ہے حتیٰ کہ کتب مقدسہ کے پیرووں کو چھوڑ کر بت پرستوں تک کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ ان کے بتوں سے اوپر ایک خدائے واحد ہے۔ اور بت بھی اسی کے دربار تک پہنچانے والے ہیں ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللّٰہ زلفی۔ پس تمام مذاہب دنیا میں اگر امر مشترک تلاش کیا جائے تو وہ خدائے واحد کی پرستش کا عقیدہ ہے۔ پھر ہر قوم نے اس خدائے ذو الجلال کے نیچے اپنے لئے طرح طرح کے خدا تجویز کر لئے کہیں رامچندر اور کرشن ہیں تو کہیں مسیح پس اللہ تعالیٰ مذاہب میں فیصلہ کے لئے ایک سیدھی راہ بتاتا ہے۔ کہ سب مذاہب میں امر مشترک کو لیلو اسی کو کلمۃ سواء فرمایا ہے۔ تو یہ امر مشترک یہی ہوگا۔ کہ صرف ایک خدا کی پرستش کی جائے۔ اس کلمۃ سواء میں درحقیقت مقابلۂ مذاہب کے عظیم الشان اصول کی طرف دنیا کو توجہ دلائی ہے۔ اور گویا یہ اشارہ فرمایا ہے۔ کہ جب اور کسی راہ سے نہ مانیں تو پھر مقابلہ مذاہب کا اصول پیش کرو اور امر مشترک کو بطور ایک بنیادی اصول کے مان کر آگے چلو تو اس سے بھی اسلام کی صداقت ہی نکلے گی ✦

مقوقس کے نام آنحضرت صلعم کا خط

یا اھل الکتاب تعالوا الی ۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن الفاظ میں صلح حدیبیہ کے زمانہ میں آنحضرت صلعم نے ھرقل اور مقوقس شاہ مصر کو مخاطب فرمایا تھا۔ موخر الذکر چٹھی کا اصل مسودہ مصر کی کسی خانقاہ میں ملا۔ اور اب اس کا فوٹو شائع ہو چکا ہے جس میں بعینہٖ وہی الفاظ ہیں جو صحیح بخاری وغیرہ دیگر کتب حدیث میں ملتے ہیں اس سے صداقت حدیث پر بڑی بھاری شہادت ملتی ہے ✦

مذہب ابراہیمی بطور امر مشترک

۴۵۶ لم تحاجون فی ابراھیم۔ حضرت ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔ حضرت ابراہیم کا ذکر بھی اسی اصول کے لحاظ سے کیا جس کا اوپر ذکر ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم کا وجود بھی چاروں قوموں مشرکین عرب۔ یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں میں بطور ایک

۶۵ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ

دیکھو تم وہ ہو جو اس میں جھگڑ چکے جس کا تم کو علم تھا پھر اس میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو علم نہیں

۶۶ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ

اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے [۴۵۷] ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی لیکن وہ

۶۷ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ

راست رو فرمانبردار تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا [۴۵۸] بیشک ابراہیم سے قریب ترین وہ لوگ ہیں

اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

جنہوں نے اسکی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ جو ایمان لائے اور اللہ مومنوں کا ولی ہے [۴۵۹]

مشترک کے تھا کہ چاروں آپ کی بزرگی کو مانتے تھے۔ گویا یہ بتایا ہے کہ توریت اور انجیل تو حضرت ابراہیم کے بعد کی کتابیں ہیں۔ اصل الاصول وہ ہے جس پر ابراہیم بھی قایم تھے۔ اور وہ وہی خدائے واحد کی عبادت ہے اسی لئے آیت ۶۷ میں فرمایا ان اولی الناس بابراهیم للذین اتبعوه وهذا النبی والذین اٰمنوا۔ کیونکہ یہ نبی اور مومن اس اصل الاصول یعنی خدائے واحد کی عبادت پر قائم ہیں۔ حالانکہ تم لوگ طرح طرح کی افراط و تفریط میں پڑ گئے ہو۔ اور خدائے واحد کی عبادت کے ساتھ کسی نے اپنے احبار اور کسی نے اپنے مسیح کی عبادت کو ملا لیا ہے ٭

هآ **۴۵۷** ھا حرف تنبیہ ہے۔ اور ھٰؤلاء میں دوبارہ تاکید کیلئے آیا ہے۔ اور اخفش کے نزدیک ھا قایم مقام ہمزہ استفہام کے ہے۔ اور استفہام یہاں تعجب کے لئے ہے (ر) ٭

یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت — فیما لکم به علم سے مراد حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کا معاملہ ہے۔ کہ ان کے بارہ میں اہل کتاب یعنی یہود حضرت موسیٰ کے مذہب کے بارہ میں اور عیسائی حضرت عیسیٰ کے مذہب کے بارہ میں جھگڑا کر چکے اور ان جھگڑوں کا ذکر سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں ہو چکا۔ تو اب جب اصل الاصول یعنی حضرت ابراہیم کے مذہب کی طرف توجہ دلائی۔ کیونکہ اسی کے ساتھ وعدہ کے ماتحت یہود و نصاری کا وجود پیدا ہوا۔ تو فرمایا کہ حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ کے مذہب کے علم کا تو تم کو کچھ دعویٰ بھی ہے مگر حضرت ابراہیم کے مذہب کا ذکر تو تمہاری کتب مقدسہ میں بھی جیسی کچھ وہ تحریف شدہ موجود ہیں نہیں ہے پس اس پر تمہارا جھگڑا کرنا بالکل فضول ہے۔ یا فیما لکم به علم سے مراد وہ پیشگوئیاں ہیں جو ان کی کتابوں میں آنحضرت صلعم کے متعلق پائی جاتی تھیں یعنی پیشگوئیوں کے بارہ میں تو تم نے جھگڑا کر لیا مگر یہ اصول مقابلہ مذاہب اور اصول مشترکہ کی طرف رجوع کرنا ایک ایسا امر ہے جس کا تم کو علم نہیں تھا۔ مگر بات صاف ہے اس میں جھگڑا کیوں کرتے ہو ٭

ابراہیم سے نفی یہودیت و نصرانیت — **۴۵۸** مطلب یہ ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کے خاص عقاید ابراہیم کے نہ تھے یہودیت اور نصرانیت کی نفی کے ساتھ لفظ حنیف کے لانے پر دیکھو نوٹ ۱۹۰۔ اور آخر پر حضرت ابراہیم سے مشرک ہونے کی نفی مشرکین عرب پر اتمام حجت کیلئے ہے۔ گویا ان تینوں قوموں کو ایک اصول کی طرف بلایا ہے کہ جس پر ہم سب کا اتفاق ہے اسی کو بطور اصل الاصول لو۔ اور اس لئے بھی حضرت ابراہیم کا ذکر کیا ہو کہ اصل وعدہ انہی کے ساتھ ہے جس کے ماتحت عرب میں بھی ایک نبی پیدا ہوتا ہے۔ پس یہ نبی اس کے مذہب کے اصل الاصول پر بھی قایم ہے ٭

اَولی — **۴۵۹** اولی۔ وَلِیَ یلی سے افعل التفضیل ہے۔ اور وَلْیٌ کے اصل معنی قرب ہیں پس اولیٰ کے معنی اقرب یا قریب ترین ہوئے۔ اور اطلاق بکثرت اسے مراد احریٰ بکذا ہے (غ) یعنی اس کا سب سے بڑھکر اہل ٭

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ ۶۸

اہل کتاب کے ایک گروہ چاہتا ہے کہ تم کو گمراہ کریں اور وہ اپنے آپ کو ہی ہلاک کرتے ہیں

وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ۶۹

اور وہ محسوس نہیں کرتے ۴۶۰ اے اہل کتاب اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم مشاہدہ کرتے ہو ۴۶۱

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ ۷۰

اے اہل کتاب کیوں حق کو باطل کے ساتھ ملاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو جب تم

تَعْلَمُوْنَ ۝ ع وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ ۷۱

جانتے ہو ۴۶۲ اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ دن کی ابتدا میں اس پر

اہل کتاب کی مسلمانوں کو بہکانے کی تدبیریں

آنحضرت ابراہیم کے تبع نہیں

اتبعوہ۔ نبی کے متبعین اس کی اُمت ہوتی ہے جو اس کے نقش قدم پر چلتی اور اس کی ہدایات سے نور حاصل کرتی ہے۔ اسی لئے یہاں ھذا النبی والذین اٰمنوا کو الذین اتبعوہ سے الگ کر دیا ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان ابراہیم کے متبعین میں سے نہیں ہیں گو آپ کا ملت ابراہیمی پر ہونا بیان کیا گیا ہے۔ مگر وہ بحیثیت ایک متبع کے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہی اصول دین آپ کو بھی وحی ہوتے ہیں الذین اتبعوہ سے مراد حضرت ابراہیم کے پیرو ہیں جو آپ کے زمانہ نبوت میں آپ کی شریعت پر تھے ✦

طائفة

۴۶۰ طائفة طوف سے ہے۔ جس کے معنی گھومنا ہیں۔ اور طائفة کا لفظ جب انسانوں پر بولا جائے تو اس سے مراد جماعت ہوتی ہے۔ اور کسی چیز کے حصہ یا ٹکڑہ کو بھی اس کا طائفہ کہا جاتا ہے (غ) ✦

اضلال

یضلونکم۔ اِضلال کے ایک معنی صراط مستقیم سے پھیرنے کے ہیں۔ لیکن ضَلَّ بمعنی ضَاعَ و ھَلَکَ (ل) بھی آتا ہے اس لئے اضلال اِھلاک کو بھی کہتے ہیں۔ اگر پہلے معنی مراد لیں تو ما یضلون الا انفسھم کے معنی ہونگے اپنے آپ کو اور بھی گمراہ کرتے ہیں کیونکہ جب ایک شخص دوسرے کی گمراہی کے درپے ہو جاتا ہے تو اور بھی راہ حق سے دور چلا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ پہلے بھی گمراہ ہی تھا ہے۔ دوسرے معنی کی رو سے مراد یہ ہوگی کہ تم کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں خود ہی ہلاک ہونگے ✦

عیسائیوں کی مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوششیں

یہاں ایک پیشگوئی بھی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اصل مخاطب تو ان آیات کے نصاریٰ ہی ہیں جیسا کہ سفیان نے بھی کہا ہے۔ کل شئ فی اٰل عمران من ذکر اھل الکتاب فھو فی النصاریٰ (د) یعنی آل عمران میں جو کچھ اہل کتاب کے متعلق آیا ہے وہ اصل میں نصاریٰ کے متعلق ہے۔ گو بعض وقت یہود یا دوسرے اہل کتاب بھی ان میں شامل ہو جائیں۔ اشارہ یہ ہے کہ یہ اہل کتاب یعنی نصاریٰ باوجود باطل پر ہونے کے اور ہر طرح سے ملزم ہونے کے اس قدر زور پکڑینگے کہ مسلمانوں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کریں یعنی اپنے دین کی طرف لے جانے کی سو اس پیشگوئی کا ظہور اس زمانہ میں ہو رہا ہے ✦

۴۶۱ اللہ کی آیتوں سے مراد یہاں قرآن کریم ہے جس کی صداقت وہ مشاہدہ کر رہے تھے اور خود اس بات کے بھی گواہ تھے کہ ان کی کتابوں میں ایک رسول کے آنے کا ذکر ہے ✦

۴۶۲ یہاں انہی پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلائی جن کی طرف پچھلی آیت میں اشارہ کیا تھا ✦

عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

ایمان لے آؤ جو ان لوگوں پر اُتارا گیا ہے جو ایمان لائے ہیں اور اسکے آخر میں انکار کرو تاکہ وہ لوٹ آئیں[۴۶۳]

وجہ النہار

[۴۶۳] وجہ النہار۔ وجہ چونکہ بدن کا وہ حصہ ہے جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے اس لئے اس کا استعمال ہر چیز کے پہلے آنے والے حصہ اور اس کے اشرف اور اس کی ابتداء پر ہوا ہے (غ)۔ اس لئے وجہ النہار کے معنی اول النہار ہیں ✦

یہودیوں کی چال کہ منافقانہ طور پر اسلام میں داخل ہو جائیں

اس آیت کے معنی کئی طرح پر کئے گئے ہیں۔ ایک معنی تو یوں ہیں کہ دن کے پہلے حصہ میں دین اسلام کو قبول کر لو۔ اور پچھلے حصہ میں اس کا انکار کر دو۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ یہودیوں نے دین اسلام کو بدنام کرنے کے لئے یہ تجویز کی تھی کہ اپنے چند لوگوں کو تیار کیا کہ صبح جا کر نفاق کے طور پر مسلمان بن جائیں۔ اور شام کو کہدیں کہ ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں۔ ہم نے دیکھ لیا کہ اس دین میں کوئی حق نہیں۔ اور لعلہم یرجعون کے معنی ہوتے تاکہ مسلمان بھی اپنے دین سے لوٹ آئیں یعنی اس طرح وہ سمجھینگے کہ اہل کتاب کو کوئی دشمنی تو نہیں وہ مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن جب انہوں نے اس دین کے اندر داخل ہو کر اس کو جھوٹا پایا تو اسے چھوڑ دیا یہی بات درست ہو گی یوں وہ بھی اسلام چھوڑ کر پھر کفر کی طرف لوٹ آئینگے۔

ارتداد

چونکہ دین اسلام کی یہ خوبی تھی کہ جب ایک شخص اس کے اندر داخل ہو جاتا تو پھر مرتد نہیں ہوتا تھا جیسا کہ ہرقل والی حدیث میں ابو سفیان کی زبان سے بھی شہادت موجود ہے کہ جب اس نے پوچھا هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ مِنْهُمْ سُخْطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ۔ کیا ان میں سے کوئی شخص دین میں داخل ہونے کے بعد اس سے بیزار ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے تو ابو سفیان نے جواب دیا کہ نہیں اور یہ دین اسلام کی صداقت پر بڑی بھاری شہادت تھی کہ مرتدین کا وجود باوجود سخت ایذا رسانیوں کے اور طرح طرح کی مشکلات کے النادر کالمعدوم کے حکم میں تھا۔ اور مسلمانوں کی اس مضبوطی کو دیکھکر ہی اہل کتاب اس قسم کے حیلے سوچتے رہتے تھے کہ کسی طرح دین اسلام بدنام ہو یہ دلائل میں عاجز ہونے کا نتیجہ تھا۔ جب دین اسلام کا ہر پہلو سے غلبہ دیکھا تو ان مخفی تدابیر پر اُتر آئے کہ شاید اسی طرح اسلام مٹ جائے جیسا کہ آج بھی اہل کتاب اس قسم کی تدبیریں اسلام کے تباہ کرنے کیلئے کرتے رہتے ہیں ✦

ایک معنی ابو مسلم نے کئے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ دن کے پہلے حصہ میں ایمان لانے اور پچھلے میں انکار کرنے سے مراد یہ ہے کہ نفاق کے طور پر مسلمانوں کی ہاں میں ہاں ملا دیا کرو۔ مگر فی الواقع اپنے دین پر مضبوط رہو اس لئے جب اپنے لوگوں کے پاس آؤ تو پھر اس کا انکار کرو جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ واذا لقوا الذین آمنوا قالوا آمنا واذا خلوا الی شیاطینہم قالوا انا معکم (البقرۃ ۲-۱۴) جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ معنی بھی صحیح اور مناسب موقع ہیں اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ محض نفاق کے طور پر مسلمانوں کے ساتھ ملگئے تھے تا اس طرح دین اسلام کو بدنام کریں

احکام اسلام میں تفریق کی چالبازی

تیسرے معنی اصم سے منقول ہیں۔ معناہ تفریق احکام الاسلام الی قسمین وذلک انہ قال بعضہم لبعض ان کذبتموہ فی جمیع ماجاء بہ علم عوامکم کذبکم لان کثیرا مما جاء بہ حق ولکن صدقوہ فی بعض وکذبوہ فی بعض لیحملوا کلامکم علی الانصاف فیقبلوا قولکم ویرجعوا من دین الاسلام والرغبۃ فیہ (غ ق)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ احکام اسلام میں تفریق کر کے ان کو دو قسم کے ٹھہرایا جائے اور وہ اس طرح کہ ان میں سے بعض نے بعض کو کہا کہ اگر تم اس کو ساری باتوں میں جھوٹا کہو گے تو عوام تم کو جھوٹا سمجھیں گے کیونکہ بہت سی وہ باتیں جو وہ لایا ہے حق ہیں اس لئے بعض باتوں میں اس کی تصدیق کرو اور اس کو سچا کہو اور بعض میں جھوٹا تاکہ لوگ تمہارے کلام کو انصاف پر حمل کریں اور تمہاری بات کو قبول کریں اور دین اسلام سے اور اس کی طرف میلان سے باز آجائیں۔

موجودہ زمانہ میں عیسائیوں کی چال بازیاں

اس قسم کی چالبازیاں اب بھی کی جاتی ہیں۔ بعض عیسائی یہ جتانے کیلئے کہ ہم بڑے انصاف پسند ہیں اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے یوں کہدیتے ہیں کہ بیشک پہلے آنحضرت صلعم صداقت پر تھے۔ اور محض عرب کو بت پرستی سے نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن بعد میں دنیوی اغراض مل گئیں اور ایک نیا دین بنا لیا گیا۔ اور جنگوں میں ناحق کا کشت و خون ہوا۔ آج کل پادریوں کی ایک اور چالبازی بھی ہے کہ جھوٹے قصوں

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ط قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ يُّؤْتٰٓى ۷۲

اور ایمان نہ لاؤ مگر اسی پر جو تمہارے دین کا پیرو ہو[۴۶۴] کہو (کہ اصل) ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے کہ کسی شخص کو اسکی

اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ط قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ

مثل دیا جائے جو تمہیں دیا گیا یا وہ تمہارے رب کے نزدیک تمہارے ساتھ جھگڑا کرینگے کہو فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے

يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○

وہ جسے چاہتا ہو اسے دیتا ہے اور اللہ بہت دینے والا جاننے والا ہے[۴۶۵]

کے طور پر ایک عیسائی اور ایک مسلمان کا مکالمہ شائع کر دیتے ہیں جس میں مسلمان کے منہ میں کمزور دلائل ڈالکر مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی صداقت پر شبہات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ غرض حق کے مقابل چالبازیوں سے کام عیسائی پہلے بھی لیتے رہے۔ اب بھی لیتے ہیں انہی چالبازیوں سے کہ دوست بنکر دشمن کا کام کرتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے +

۴۶۴ یہ اہل کتاب کے قول کا بقیہ حصہ ہے۔ اور مراد اس پر ایمان لانے سے جو تمہارے دین کا پیرو ہے یہ ہے کہ حقیقی ایمان تمہارا صرف اسی نبی پر ہو جو شریعت اسرائیلی کا پیرو ہو پس جبکہ ایک طرف بعض لوگوں کو اس چالبازی کے لئے تیار کیا کہ وہ جھوٹے طور پر ایمان کا اظہار کر کے پھر انکار کر دیں یا کچھ حصہ کو صحیح تسلیم کر لیں۔ تو دوسری طرف اپنے پیروؤں کو یہ بھی کہدیا کہ تم صرف ایسے نبی کو مانو جو تمہاری شریعت کا پیرو ہو۔ اور اس طرح آنحضرت صلعم پر ایمان لانے سے روکا کیونکہ آپ کی شریعت میں بہت سی باتیں شریعت موسوی کو منسوخ کرنے والی تھیں اور یہ انکا قول اس کے مطابق ہے جو پچھلی سورت میں مذکور ہے قالوا نؤمن بما انزل علینا ویکفرون بما وراءہ (البقرۃ ۲-۹۱) اور اسی پر یہود آج تک قایم ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ جو نبی آئے شریعت موسوی پر ہی آنا چاہئے +

۴۶۵ قل ان الھدیٰ ھدی اللّٰہ ان یوتی احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم۔ ان الفاظ کی تفسیر کئی طرح پر کی گئی ہے لیکن سیاق و سباق کے لحاظ سے دو توجیہیں درست ہو سکتی ہیں اور ان میں کچھ اشکال بھی نہیں۔ اول یہ کہ الفاظ قل ان الھدیٰ ھدی اللّٰہ جملہ معترضہ کے طور پر ہوں اور ان یوتی احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم پھر انہی لوگوں کا قول ہو اور اس سب کا جواب قل ان الفضل بید اللّٰہ میں دیا۔ تو گویا جب یہودیوں نے اپنے پیروؤں کو یہ سکھایا کہ لا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم سوائے اس نبی کے جو تمہاری شریعت کا پیرو ہو اور کسی کو نہ مانو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا و ان یوتی احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم اور قل ان الھدیٰ ھدی اللّٰہ جملہ معترضہ کے طور پر رہا کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے ان کی ان فضول گوئیوں سے کیا بنے گا) یعنی اور اس بات پر بھی ایمان نہ لاؤ کہ کسی شخص کو اس کی مثل دیا جائیگا جو تم کو دیا گیا یعنی جیسی شریعت تم کو دی گئی اس کی مثل کسی اور کو دیجا سکتی ہے۔ گویا استثناء ۱۸:۱۸ کی مثل والی پیشگوئی کو نہ مانو۔ کیونکہ اگر تم نے اس بات کو مان لیا کہ مثل والی پیشگوئی سوائے بنی اسرائیل کے کسی اور پر بھی پوری ہو سکتی ہے تو وہ یعنی مسلمان تمہارے رب کے نزدیک تمہارے ساتھ جھگڑا کرینگے۔ رب کے نزدیک جھگڑا کرنے سے مراد ہے فی کتاب وحکمہ دیکھو نوٹ ۱۰۵ اور یحاجوکم کے معنی کے لئے بھی اسی نوٹ کو دیکھو۔ یحاجوکم میں ضمیر احد کی طرف جائے گی۔ کیونکہ وہ جمع کے معنی کے حکم میں ہے اور مراد مسلمان ہونگے یا بنی اسمٰعیل جن کی طرف احد میں اشارہ ہے۔ یہ معنی بعینہ اس کے مطابق ہیں جو البقرۃ ۲-۷۶ میں ذکر کیا کہ یہودیوں کے علماء اپنے پیروؤں کو کہتے ہیں اتحدثونھم بما فتح اللّٰہ علیکم لیحاجوکم بہ عند ربکم۔ تم ان پیشگوئیوں کو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں مسلمانوں کو بتا دیتے ہو تاکہ وہ تمہارے رب کے حکم میں تمہارے ساتھ جھگڑا کر سکیں۔ گویا اسی بات سے یہاں

مثیل موسیٰ کی پیشگوئی سے یہود ڈرتے تھے

۷۳ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے

منع کیا ہے۔ کہ جب تم اُن کے ساتھ ملو تو یہ پیشگوئی تسلیم نہ کرو کہ مثل والی کوئی پیشگوئی ہے۔ ورنہ مسلمانوں کو تمہارے خلاف یہ حجت مل جائے گی۔

مثیل موسیٰ کی پیشگوئی ناقابل تردید ثبوت صداقت اسلام کا ہے۔

اور دوسرے معنی یوں ہونگے کہ قل ان الھدیٰ سے عند ربکم تک سب قل کے ماتحت یہودیوں کی اس بات کا جواب ہو کہ لا تومنوا الا لمن تبع دینکم۔ اس صورت میں الھدیٰ ان کا اسم ہوگا اور ھدی اللّٰہ۔ الھدیٰ سے بدل ہوگا۔ گویا اس بات کا جواب کہ سوائے موسوی شریعت کے پیرو کے اور کسی نبی کو نہ مانو۔ اللہ تعالےٰ یہ دیتا ہے کہ ان کو کہدو کہ کامل ہدایت (جو اللہ کی ہدایت ہے) یہ ہے کہ جو کچھ اے اہل کتاب تم کو دیا گیا یعنی موسوی شریعت اس کی مثل کسی اور کو دیا جائے کیونکہ تمہارے ہاں تو یہ پیشگوئی موجود ہے کہ موسیٰ کی مثل ایک نبی آئے گا اور اس لئے یہ ضروری ہے کہ جو تم کو دیا گیا یعنی شریعت موسوی اس کی مثل کسی اور کو دیا جائے یا (یعنی اگر ایسا نہ ہو تو) مسلمان تمہارے رب کے حکم میں تمہارے ساتھ جھگڑا کر سکیں گے (اور وہ جھگڑے میں غالب رہینگے اور اس غلبہ کی طرف لفظ یحاجوکم میں بھی اشارہ ہو سکتا ہے یا ایسے لفظ مقدر ہو سکتے ہیں جیسے فیدحض حجتکم کیونکہ سیاق عبارت اس کا مقتضی ہے) دونوں صورتوں میں اشارہ اس عظیم الشان پیشگوئی کی طرف ہے جس کا کوئی جواب اہل کتاب کے پاس نہیں جو حضرت موسیٰ نے کی تھی، اور جس کی صداقت کو کل انبیائے بنی اسرائیل نے تسلیم کیا یہانتک کہ حضرت عیسیٰ نے بھی اس کو تسلیم کیا یعنی حضرت موسیٰ کی مثل ایک پیغمبر کا دنیا میں ظاہر ہونا جس کا ذکر استثناء ۱۸: ۱۵-۱۸ میں ہے۔ اب یہ موسیٰ کی مثل نبی کا کھڑا کیا جانا سوائے اس کے کیا معنی رکھتا ہے کہ جس طرح ایک شریعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے ذریعہ سے دی گئی۔ اسی طرح ایک شریعت بنی اسمٰعیل میں سے ایک نبی کے ذریعہ سے دنیا کو دی جائے۔ یوں تو بنی اسرائیل میں نبی بہت ہوئے مگر موسیٰ کی مثل ہونے کا کسی نے دعویٰ نہ کیا۔ حتیٰ کہ حضرت مسیح نے بھی نہیں کیا۔ جیسا کہ یوحنا ۱: ۲۱ سے ثابت ہے کہ یہودی تین کے منتظر تھے۔ الیاس کی دوبارہ آمد سو وہ حضرت یحییٰ میں پوری ہوئی۔ مسیح کی آمد جس کا دعویٰ حضرت عیسیٰ نے کیا۔ موعود نبی کی آمد جس کا دعویٰ نہ حضرت عیسیٰ نے کیا نہ حضرت یحییٰ نے اور نہ بنی اسرائیل کا کوئی نبی جو شریعت موسوی کا پیرو ہو ایسا دعویٰ کر سکتا تھا۔ کیونکہ نہ صرف وہ نبی بنی اسمٰعیل سے ہونا چاہئے۔ بلکہ پیشگوئی کے مطابق یہ بھی ضروری تھا کہ اسے حضرت موسیٰ کی مثل ایک شریعت دی جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت جو آپ کو بنی اسرائیل کے کل انبیا میں ممتاز کرتی ہے۔ یہی ہے کہ آپ ایک جدید اور مستقل شریعت لائے۔ اس لئے پیشگوئی میں موسیٰ کی مثل کا لفظ لانے سے سوائے اس کے کچھ منشاء نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ نبی بھی ایک جدید اور مستقل شریعت لانے والا ہو۔ اس لئے قرآن کریم بنی اسرائیل کے اس اعتراض کے جواب میں کہ ہم اسی نبی کو مانینگے جو ہماری شریعت کا پیرو ہو۔ اس پیشگوئی کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ کہ اس کے مطابق تو یہ ضروری ہے۔ کہ جو شریعت تم کو موسیٰ کے ذریعہ سے دی گئی ویسی ہی شریعت کسی اور کو دی جائے۔ تم اصرار کرتے ہو کہ ہم اپنی ہی شریعت کے پیرو نبیوں کو مانینگے۔ حالانکہ حضرت موسیٰ کی پیشگوئی اس امر کی مقتضی ہے کہ اس جیسی ایک اور شریعت بھیجی جائے پس تم اپنے اصرار میں غلطی پر ہو۔

نبوت ایک قوم سے مخصوص نہیں

اس کے بعد جو الفاظ آتے ہیں قل ان الفضل بید اللّٰہ یوتیہ من یشاء اور یختص برحمتہ من یشاء یہ اہل کتاب کے اسی اعتراض کا جواب ہیں۔ یہاں نبوت کو ایک فضل فرمایا۔ تو فضل ایک قوم سے مخصوص نہیں یہ موہبت ہے جس کو اللہ چاہے دیدے۔ اس کا مقابلہ البقرۃ۔ ۱۰۵ سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح کا اعتراض اور جواب وہاں دیا ہے وہی یہاں دوسرے الفاظ میں بیان فرمایا ہے کیونکہ وہاں بھی یہ کہکر کہ ما یود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم جواب دیا تھا۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ ۷۵

اور اہل کتاب میں سے وہ ہو کہ اگر تو اس کو مال کے ڈھیر پر امین بنائے تو وہ اسے تجھے واپس دیدے اور ان میں سے وہ ہو کہ اگر تو اسے

بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا

ایک دینار پر امین بنائے تو وہ اسے تجھے واپس نہ دے سوائے اسکے کہ تو اس (کے سر) پر کھڑا رہے یہ اسلئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر

لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○

ان اُمیوں کے بارے میں کوئی (الزام کی) راہ نہیں اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں ۴۶۶

واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم ۔

ما دمت علیہ قائما — ۴۶۶ ما دمت علیہ قائما بعض نے یہاں لفظی معنی مراد لئے ہیں کہ واقعی اس کے سر پر کھڑا رہے اور اس سے ادھر اُدھر نہ ہو۔ مگر یہ بلا ضرورت تکلف ہے۔ اس سے مراد مطالبہ اور تقاضا ہے جیسا کہ ابن قتیبہ نے کہا ہے۔ اصلہ ان الطالب للشئ یقوم بہ والتارک لہ یقعد عنہ (غق) یعنی اصلیت اس محاورہ کی یہ ہے کہ ایک شے کا طالب اس کی رعایت کو ملحوظ رکھتا ہے گویا وہ اس پر کھڑا ہوتا ہے اور ترک کرنے والا اس کی طرف سے سست ہو جاتا ہے یا بیٹھ جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں آتا ہے اُمۃ قائمۃ (آل عمران ۳ - ۱۱۲) تو مراد ہے عاملۃ بامر اللہ یعنی اللہ کے حکم پر عمل کرنے والی ۔

سبیل — سبیل ۔ کے معنی راہ پھر ہر سبب جس کے ذریعہ سے دوسری چیز تک پہنچا جائے برا ہو یا بھلا (غ) یہاں مراد یہ ہے کہ ہم تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں یعنی ہم پر کوئی پرسش یا الزام نہیں ۔

اہل کتاب کے معاملہ میں اسلام کا منصفانہ رویہ — اہل کتاب کے بارہ میں قرآن کریم نے باوجود ان کی خطرناک عداوتوں کے اور دن رات اسلام کی بیخکنی کے درپے رہنے کے نہایت انصاف کا معاملہ کیا ہے۔ اگر ان کی بدیوں کا ذکر کیا ہے تو ان کی نیکیوں کا بھی اعتراف کیا ہے یہاں صرف ان کی بددیانتی کا ذکر نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی اس کے ان میں نیک لوگوں کے وجود کا بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ سونے کے ڈھیر پر بھی امین بنائے جائیں تو اس میں خیانت نہیں کرتے۔ گویا مسلمانوں کو بتایا ہے کہ کسی قوم کو بعض افراد کی وجہ سے بلاتمیز برا کہدینا یا برا سمجھ لینا ٹھیک نہیں اگر کسی کو اس میں برائی دیکھ کر برا کہو تو اس میں نیکی پاؤ تو اس کا بھی اعتراف کرو اور بلا تفریق مذہب و ملت ۔ قوم و رنگ ہر ایک کے ساتھ نیکی اور انصاف کا معاملہ کرو ۔

معاملات دنیا میں دیانت معیار اعتبار بھی ہے — اصل ذکر تو یہاں دینی معاملات اور پیشگوئیوں کا تھا۔ اسی ذکر میں دنیوی معاملہ کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین و دنیا کو کس طرح پر قرآن شریف نے اکٹھا کیا ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف اہل کتاب کو یہ الزام دیا ہے کہ جب دنیوی معاملہ میں ان کی حالت ایسی خراب ہے کہ ایک دینار کی امانت کا حق ادا نہیں کر سکتے تو دینی معاملہ میں کتاب کی حفاظت میں پیشگوئیوں کی حفاظت میں وہ کیونکر قابل اعتبار ہو سکتے ہیں تو دوسری طرف مسلمانوں کو بھی سمجھایا ہے کہ دین و دنیا الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ دنیوی معاملات میں امانت و دیانت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ تو دین میں ان کا راہ راست پر ہونے کا دعویٰ کس کام کا ہے۔ چنانچہ یہاں معمولی دیانت کا ذکر کرتے ہوئے معاً روحانیت کی طرف انتقال کر کے فرماتا ہے ان الذین یشترون بعھد اللہ وایمانھم ثمنا قلیلا وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑا سا مال یعنی اس دنیا کی زندگی کا سامان لے لیتے ہیں وہ یوں تکلیف اٹھائینگے۔ یوں قرآن کریم نے ایک مسلمان کو یہ بتایا ہے کہ وہ روحانیت کوئی چیز نہیں جس کے ساتھ

۷۵ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ○

ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرتا ہے اور تقویٰ کرتا ہے تو یقیناً اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے ۴۶۷

لوگوں سے اچھا معاملہ نہیں ÷

اُمی سے مراد

یہاں اُمیون کے متعلق مفسرین نے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ بعض کے نزدیک تو مطلقاً عرب کے لوگ مراد ہیں۔ اور یہ حالت اہل کتاب کی ان کے ساتھ معاملہ کی اسلام سے پہلے کی ہے۔ مگر بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مسلمان ہیں یعنی مشرکوں کے ساتھ اہل کتاب کا معاملہ ہوتا رہتا تھا جب اسلام آیا اور بعض لوگ مسلمان ہو گئے تو اہل کتاب نے ان کے اموال کو دبا لیا اور یہ عذر کر دیا کہ یہ لوگ چونکہ مرتد ہو گئے ہیں اس لئے اب ان کا کوئی حق ہم پر نہیں رہا دونوں قسم کی روایات کو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے مگر الفاظ میں عمومیت ہے اور ان تامنه میں خطاب بھی عام ہے یعنی اے مخاطب۔ اور وجہ یہی ہے

عیسائی قوموں کا دوسری قوموں کے حقوق کو اپنے برابر نہ سمجھنا۔

کہ اہل کتاب اپنے آپ کو عرب کے لوگوں سے بڑھکر سمجھتے تھے اس لئے ان کے حقوق کو اپنے برابر خیال نہ کرتے تھے چنانچہ ان کا قول دوسری جگہ منقول ہے نحن ابناء الله واحباؤه المائدة ۱۸ ہم اللہ کے بیٹے اور اسکے رسول ہیں اور دوسرے لوگ ہمارے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ یہ غلط خیال اب بھی اہل کتاب میں مروج ہے کہ وہ عیسائی اقوام یا یورپین اقوام کے مقابل میں دوسری اقوام کے حقوق کو کمتر سمجھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام یورپین قومیں باوجود ادعائے تہذیب کے ایک نہایت

عہد کے معاملہ میں تعلیم اسلامی

ذلیل حالت میں ہیں جس سے ان کو صرف اسلام کی بلند تعلیم ہی نکال سکتی ہے۔ جو یوں تعلیم دیتا ہے بلیٰ من اوفیٰ بعھدہ عہد کسی شخص کے ساتھ ہو۔ سپید رنگ کے آدمی سے ہو یا سیاہ رنگ کے۔ فلاسفر سے ہو یا جاہل سے اپنے ہم مذہب اور ہم قوم سے ہو یا غیر مذہب اور غیر قوم سے سب کے ساتھ پورا کرنا چاہئے ایسا ہی امانت کا معاملہ ہے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب

امانت

ایام جاہلیت کے خون وغیرہ انتقامات اور حقوق کو کالعدم قرار دیا تو ساتھ ہی امانت کے متعلق تاکید بھی فرما دی الا ان الامانة فانها مودّاة الى البر والفاجر۔ مگر امانت کے حقوق باطل نہیں ہوتے اور امانت نیک کی ہو یا بد کی سب کی طرف ادا ہونی چاہیے اور چونکہ امانت اور معاہدات میں ہر ایک قسم کی ذمہ داریاں آجاتی ہیں اس لئے گویا یہ سمجھایا ہے کہ انسان کی ذمہ داری نیکوں

اہل ذمہ کے حقوق

کی طرف ہو یا بدوں کی۔ بڑوں کی طرف یا چھوٹوں کی۔ پوری ادا ہونی چاہئے۔ حضرت ابن عباس کے متعلق روایت ہے کہ کسی شخص نے کہا کہ اہل ذمہ کی بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں جیسے مرغی بکری وغیرہ جنگ کے وقت ہم لے لیا کریں آپ نے فرمایا کہ یہ تو اہل کتاب کے قول کی مانند ہے کہ لیس علینا فی الامیین سبیل جب وہ جزیہ ادا کر دیں تو انکے اموال میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں سوائے اسکے جو وہ اپنی خوشی سے دیدیں

عہد اور امانت

۴۶۷ اس چھوٹی سی آیت میں اسلام کی تعلیم کی وسعت ظاہر فرمائی ہے۔ ذکر تو صرف امانت کا تھا مگر ہر ایک قسم کی ذمہ داری کو اس کے اندر داخل کرنے کے لئے پہلے عہد کے پورا کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ اور پھر تقویٰ کی طرف۔ عہد کو تو ہر ایک شخص سمجھتا ہے یعنی کوئی ذمہ داری جو انسان علی الاعلان اپنے اوپر لے لیتا ہے عہد میں داخل ہو جاتی ہے۔ مگر تقویٰ کے اختیار کرنے میں اشارہ زیادہ باریک امور کی طرف ہے۔ جن کا تعلق امانت سے ہے۔ کیونکہ امانت کی ادائگی میں ہر قسم کے ان حقوق کی ادائگی داخل ہے جو انسان کے ذمہ بطور امانت ہوں۔ خواہ وہ عہد کے اندر آتے ہوں یا نہ آتے ہوں گو یا کھلا عہد ہو یا بطور امانت کوئی ذمہ داری ہو خواہ کسی کے متعلق ہو تو ان عہدوں اور امانتوں کو ادا کرنا ضروری ہے اور اسی طرح پر انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب بنتا ہے۔ اور چونکہ اتقا کا مرتبہ ایسا کامل ہے کہ ایفائے عہد بھی اس میں آجاتا ہے اس لئے آخر پر صرف یحب المتقین فرمایا۔ اور ان عہود میں اللہ تعالےٰ کے ساتھ عہد بھی داخل ہے جس کے ایفا سے مراد یہ ہے کہ اسکے احکام کی جن کو انسان ایمان لا کر علی الاعلان قبول کر چکا ہے تعمیل کرے اسی لئے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے عہد کا ذکر شروع ہو جاتا ہے ÷

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَہۡدِ اللّٰہِ وَ اَیۡمَانِہِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ ۷۷

وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی قیمت لے لیتے ہیں ان کے لئے آخرت میں

لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ وَ لَا یَنۡظُرُ اِلَیۡہِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیۡہِمۡ

کوئی حصہ نہیں اور نہ ان سے اللہ کلام کرے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف دیکھیگا اور نہ انکو پاک کریگا

وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝ وَ اِنَّ مِنۡہُمۡ لَفَرِیۡقًا یَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَہُمۡ بِالۡکِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡہُ ۷۸

اور ان کے لئے دردناک دُکھ ہے ۴۶۸ اور ان میں سے ایک گروہ ہے جو کتاب کے متعلق جھوٹ بناتے ہیں تا کہ تم اسے

مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مَا ہُوَ مِنَ الۡکِتٰبِ ۚ وَ یَقُوۡلُوۡنَ ہُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ وَ مَا ہُوَ مِنۡ

کتاب سے سمجھو حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف

عِنۡدِ اللّٰہِ ۚ وَ یَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ۝

سے نہیں ہے اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں ۴۶۹

دنیا پرستی

۴۶۸ اس آیت میں ان لوگوں کا انجام بتایا ہے جو اللہ کے ساتھ عہد کرکے اور قسمیں کھا کر پھر ان کو ضائع کر دیتے ہیں۔ یعنی اول ایمان کا اقرار کرتے بلکہ اس کے اوپر قسمیں کھاتے ہیں۔ پھر دنیا کے ادنیٰ ادنیٰ فوائد کے لئے یا اپنی اغراض نفسانی کیلئے اس عہد کی اور ان قسموں کی پرواہ تک نہیں کرتے۔ ثمناً قلیلاً سے مراد متاع الدنیا قلیل ہے اور اشتراء یہی ہے کہ وہ اس عہد کو ترک کر دیتے اور دنیا کے حقیر فائدہ کو لے لیتے ہیں +

عیسائی اور معاہدات

روئے سخن بالخصوص عیسائیوں کی طرف ہی ہے جن کے ساتھ یہ بحث چلتی ہے اُس زمانہ میں تو عیسائیوں کی کیا طاقت تھی پیشگوئی کے رنگ میں آئندہ کا حال بتایا ہے اور آج ہم کو تمام عیسائی اقوام کی یکساں حالت نظر آتی ہے کہ معاہدات کو وہ ردی کاغذ کے ٹکڑے سمجھتے ہیں اور اپنا مطلب نکالنے کا ذریعہ۔ ان کے انجام میں پانچ باتوں کا ذکر کیا ہے اول ان کا آخرت میں کوئی

دنیا پرستی کا انجام

حصہ نہیں یعنی صرف دنیا ہی دنیا۔ دنیا کا مال دنیا کی حکومت ان کے مدنظر ہے اور دنیا تک ہی ان کی سب کوششیں محدود ہیں۔ دوم اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں کرے گا نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ دنیا میں مکالمہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے سے پیدا ہوتا ہے آخرت کا مکالمہ اسی کا نتیجہ ہے۔ سوم اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا نہیں یعنی اس کی جناب میں ان کی کچھ قدر نہ ہو گی کیسی کی طرف نہ دیکھنے سے مراد یہی ہوا کرتی ہے کہ اس کی نگہ میں اس کی کچھ قدر و قیمت نہیں۔ چہارم یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو گناہوں سے پاک نہیں کرے گا۔ کفارہ کا عقیدہ کس طرح ناپاکیوں سے باہر نکال سکتا ہے بلکہ اس سے اور گناہوں پر دلیری پیدا ہوتی ہے اور سب سے آخر فرمایا کہ آخری نتیجہ اس دنیا پرستی کا دردناک دُکھ ہے +

لوی لسانہ

۴۶۹ یلوون السنتہم اَلۡسِنَۃ لِسان کی جمع ہے۔ اور یلوون السنتہم بالکتاب کے معنی مجاہد کے نزدیک یحرفونہ ہیں (ج) یعنی کتاب کی تحریف کرتے ہیں اَلَیّ کے (جو یلوون سے مصدر ہے) اصل معنی فَتۡلُ الۡحَبۡلِ ہیں یعنی رسہ کا بٹنا یا مروڑنا مگر لَوٰی لسانہٗ بکذا ایک خاص محاورہ ہے جس کے معنی میں راغب نے لکھا ہے کِنَایَۃٌ عَنِ الۡکَذِبِ وَ تَخَرُّصِ الۡحدیث یعنی جھوٹ

۷۸ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ
کسی بشر کیلئے (شایاں) نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے پھر وہ لوگوں کو کہے کہ تم
كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ
اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔ لیکن (وہ کہے گا) تم ربانی ہو جاؤ اس لئے کہ تم کتاب سکھاتے
۷۹ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ۝ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا
تھے اور اس لئے کہ تم درس دیتے تھے نٹ۴۷۰ اور نہ یہ کہ وہ تم کو حکم دے کہ تم فرشتوں

اور بات کے بنانے سے کنایہ ہے اور اسی کے مطابق مجاہد نے معنی کئے ہیں بس یہاں لفظی معنی زبان کو مروڑنے کے مراد نہیں بلکہ کتاب میں تحریف کے معنی ہیں یا کتاب کے متعلق جھوٹ بنانے کے۔ اور لَوَّيْتُ عَنْهُ الْخَبَرَ کے معنی بھی ایسے ہی آتے ہیں اخبرته به علی غیر وجهه (ل) یعنی جو اصل حقیقت معاملہ تھی اس کے خلاف اسے خبر دی۔ اور اللَّوْ اور اللَّیُّ کے معنی الباطل یعنی جھوٹ ہیں جس طرح الحو اور الحی کے معنی الحق یعنی سچ بھی آتے ہیں ✦

لَوّ۔ لَیّ

حَوّ۔ حَیّ

اہل کتاب کی کتاب کے پڑھنے میں تحریف

یہاں اب صاف طور پر ان کی تحریف کتاب اللہ کو بیان کیا ہے جس کی طرف پہلے امانت کے ادا نہ کرنے کا ذکر کرکے اشارہ کیا تھا۔ اور جس طرح سورۂ بقرہ میں یکتبون الکتاب بایدیہم ثم یقولون ھذا من عند اللہ کہکر یہ بتایا تھا کہ وہ تحریر میں تحریف کرتے ہیں۔ یہاں کتاب کے پڑھنے میں ان کی تحریف کا ذکر ہے اور مراد یہ ہے کہ کچھ عبارتیں جھوٹ طور پر کتاب اللہ کی طرف منسوب کرکے پڑھ دیتے ہیں تاکہ تم ان عبارتوں کو کتاب کا حصہ سمجھو حالانکہ وہ کتاب کا حصہ نہیں یعنی جو کتاب ان کے پاس ہے اس میں بھی وہ عبارتیں نہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں۔ یہاں دو باتوں کی نفی الگ الگ کی ہے ایک یہ فرمایا کہ وہ کتاب میں سے نہیں دوسرے یہ کہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود کتاب بھی ساری من عند اللہ نہیں یعنی پہلے اس میں تحریف موجود ہے مگر یہ اب پڑھنے میں اور بھی تحریف کرتے ہیں اور کتاب کا لفظ من عند اللہ سے پہلے اس لئے آیا ہے کہ یلوون السنتہم بالکتاب میں کتاب کے متعلق جھوٹ بنانے کا ذکر تھا سو پہلے اسی کی تردید کی بعض مفسرین نے کتاب سے مراد توریت کو اور من عند اللہ سے مراد توریت سے پچھلے انبیاء کی کتابوں کو لیا ہے (غ) ✦

نٹ۴۷۰ ولکن کونوا۔ تقدیر اس کی یوں ہے ولکن یقول کونوا ✦

ربانی

ربانیین۔ رَبَّانِی کی جمع ہے۔ مفردات میں ہے کہ ربانی یا تو ربان کی طرف منسوب ہے۔ جیسے عطشان۔ سکران آتا ہے اور یا رب کی طرف منسوب ہے۔ اگر رب کو مصدر تربیت کرنے کے معنی میں لیا جائے۔ اور ربانی وہ ہے جو علم کو نشو و نما دیتا ہے اَلَّذِیْ یَرُبُّ الْعِلْمَ اور یا وہ جو علم کے ساتھ اپنی تربیت کرتا ہے اَلَّذِیْ یَرُبُّ نَفْسَهٗ بِالْعِلْمِ (غ) راغب کہتے ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے متلازم ہیں۔ کیونکہ جو شخص اپنے نفس کی تربیت علم سے کرتا ہے۔ وہ علم کو بھی نشو و نما دیتا ہے اور ایسا ہی اس کے برعکس اور بعض کے نزدیک رب کی طرف منسوب ہے جب اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہو۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسے ایک شخص کے متعلق کہدیا جائے الٰہی (غ) یعنی اللہ کی طرف منسوب اور اس سے مراد ہوگی مقبلا الی معرفۃ الالٰہ وطاعتہ (غ) یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اطاعت کی طرف بڑھنے والا۔ اسی لئے ربانی سے مراد بعض نے اہل علم کو لیا ہے۔ یا فقیہ کو بعض

الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۟

اور نبیوں کو خداوند بنا لو کیا وہ تم کو کفر کا حکم دے گا اس کے بعد کہ تم مسلم ہو چکے ہو ۔ ۱۷۹

نے عالم حکیم کو بعض نے حکیم متقی کو ۔ اور حضرت علی کا قول منقول ہے انا ربانی ھذہ الامۃ میں اس امت کا ربانی ہوں ۔ اور جب حضرت ابن عباس فوت ہوئے تو ابن حنفیہ نے کہا مات ربانی ھذہ الامۃ ۔ اور بخاری میں ہے الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کبارھا یعنی ربانی وہ (فقیہ) ہے جو لوگوں کو علم کی آسان باتیں اس کی مشکل باتوں سے پہلے سکھاتا ہے ۔ لفظ ربانی میں بھی عیسائی عقیدہ پر ایک زد کی ہے یعنی انسان رب کو پہنچنے والا تو ہو سکتا ہے مگر رب نہیں ہو سکتا ۔

درس

تدرسون ۔ درس الدار کے معنی ہیں بقی اثرھا (غ) یعنی اس کا اثر باقی رہا ۔ اس لئے درست العلم کے معنی ہیں ۔ تناولت اثرہ (غ) یعنی اس کے اثر کو لیا اور چونکہ علم کا ایک دوسرے سے لینا قرأت کے ہمیشہ رہنے سے ہوتا ہے اس لئے درس سے مراد قرأت کا ہمیشہ رکھنا بھی ہے ۔ یہاں تعلیم سے الگ درس کا ذکر اسی معنی میں ہے ۔

عیسائیت کی تحریف

تحریف کتاب کے ذکر میں اب ان کی ایک عظیم الشان تحریف کا ذکر کرتا ہے کہ انہوں نے بعض کلمات حضرت عیسیٰ کی طرف ایسے منسوب کر دیئے ہیں جن سے یہ معلوم ہو کہ وہ یہ تعلیم دیتے تھے کہ وہ خدا ہیں ۔ حالانکہ انہی کی کتابوں میں حضرت عیسیٰ کے ایسے اقوال بھی موجود ہیں کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے ۔ اور اپنی عبودیت کا بھی اقرار ہے تو اس میں فرماتا ہے کہ ایک ایسے بشر کے لئے جسے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکم اور نبوت دے یہ کہاں شایاں ہے کہ وہ پھر لوگوں کو یہ بھی کہے کہ اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر میری عبادت کرو ۔ اور مجھے اپنا خدا مانو ۔ وہ تو یہی تعلیم دیگا کہ تم ربانی بنو یا خدا تعالیٰ کی طرف قدم آگے بڑھانے والے بنو ۔ یا عالم و فقیہ بنو ۔ کیونکہ عیسائیوں نے جو بعض استعارات کی بنا پر مسیح کو خدا بنایا ہے تو درحقیقت انہوں نے فقاہت سے کام نہیں لیا ورنہ اگر تدبر کرتے تو ان کو صاف سمجھ آجاتا کہ حضرت مسیح کے کسی کلمہ میں اگر خدا کے بیٹے کا لفظ اپنے لئے آگیا ہے تو وہ خود ہی فرماتے ہیں کہ میرا خدا کا بیٹا اپنے آپ کو کہنا اس لئے قابل الزام نہیں کہ تمہارے بڑے یعنی بنی اسرائیل کے بزرگوں پر تو خدا کا لفظ بھی بولا گیا ہے ۔ گویا ان کی مراد یہ تھی کہ جس طرح وہ مجاز اور استعارہ کے رنگ میں خدا کہلاتے اسی طرح میں مجاز اور استعارہ کے رنگ میں خدا کا بیٹا کہلایا ۔ لیکن ایک قوم اٹھی جس نے نہ تو خدا کی طرف قدم اٹھانے میں ترقی کی نہ علم و فقاہت سے کام لیا ۔ اور لفظ پرستی اختیار کر کے مسیح کی طرف اس عقیدہ کو منسوب کر دیا کہ وہ یہ تعلیم دیتا تھا کہ میں ہی خدا ہوں اس لئے میری ہی عبادت کرو ۔

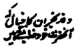
علماء ربانی مثیل اور وارث انبیاء ہیں

تم ربانی بنو اس لئے کہ تم تعلیم کتاب اور درس کتاب دیتے ہو معلوم ہوا کہ ربانیت کا مرتبہ محض تعلیم و تدریس سے اوپر ہے ایسے ہی علماء یعنی علمائے ربانی کے حق میں کہا گیا ہے العلماء ورثۃ الانبیاء کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انہی کے حق میں ہے علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں ۔

ہر نبی کو کتاب و حکم دیا جاتا ہے

یہاں اشارہ صاف حضرت عیسیٰ کی طرف ہے ۔ اور آپ کو اور آپ کی طرح ہر نبی مرسل کو تین چیزیں دینے کا ذکر ہے ۔ کتاب حکم نبوۃ جس سے معلوم ہوا کہ ہر نبی کو لازماً کتاب و حکم ملتا ہے حکم سے مراد فیصلہ کرنے کا اختیار ہے یعنی وہ خود صاحب اختیار ہوتا ہے اور وحی الٰہی کے ماتحت فیصلہ کرتا ہے ۔ دوسری جگہ اٹھارہ نبیوں کا ذکر کر کے فرمایا ہے اولٰئک الذین اٰتینٰھم الکتٰب والحکم والنبوۃ (الانعام)

۱۸۰ ولا یامرکم ۔ یامر پر نصب ہے اس لئے کہ یقول پر عطف ہے ۔ اور لا مزید تاکید کے لئے ہے یا ترکیب عبارت یوں ہے ماکان لبشر ان ..... یقول ... ولا ان یامرکم ۔



وفد نجران کا خیال کہ آنحضرت خود خدا بننا چاہتے ہیں

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد نجران کو بہت سمجھایا تو انہوں نے کہا اترید ان نعبدک ونتخذک ربا کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں اور آپ کو رب بنا لیں تو آپ نے فرمایا معاذ اللہ ۔ انہوں نے

ع ۹ ۱۱ ۱۷

۸۰ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ

اور جب اللہ نے نبیوں کے ذریعہ سے عہد لیا اسلئے کہ ضرور تم کو میں نے کتاب اور حکمت سے دیا ہی پھر تمہارے پاس

اسلام سب کا موعود اور تکمیل مذاہب کیلئے

رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ

وہ رسول آئے جو اسکی تصدیق کرنیوالا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم نے ضرور ہی اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور ہی اسکی مدد کرنی ہوگی کہا کیا تم

عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد لیتے ہو انہوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں کہا پس گواہ رہو اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں ۴۷۲

سمجھا ہوگا کہ یہ اس قدر زور جو حضرت مسیح کی خدائی کے خلاف دے رہے ہیں تو شاید اپنے آپ کو خدا منوانا چاہتے ہیں اور کیا غرض ہوسکتی ہے؟ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ تو کسی نبی کو بھی شایاں نہیں کہ وہ لوگوں کو یہ کہے کہ نبیوں یا فرشتوں کو اپنے خداوند مانو کیونکہ نبی تو مسلم فرمانبردار بنانے آتا ہے۔ اور کسی دوسرے کی عبادت یا اس کو خدا ماننا یہ کفر میں داخل ہے پھر نبی اپنے کئے پر آپ پانی کیوں پھیرے گا۔ اس آیت میں اس استدلال کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی نبی کو یہ شایاں ہوتا تو کوئی نبی دنیا میں اور بھی ایسا ہوا ہوتا جسنے یہ تعلیم دی ہوتی مگر حضرت مسیح کے متنازعہ قوال کو چھوڑ کر کیا دنیا کے کسی اور نبی کا ایسا قول دکھایا جاسکتا ہے؟ جب اس قدر نبی دنیا میں آئے اور کسی نے ایسی تعلیم نہیں دی تو معلوم ہوا کہ مسیح کی طرف ایسی تعلیم منسوب کرنا بھی درست نہیں ۔

میثاق النبیین

۴۷۲ میثاق النبیین۔ میثاق کی اضافت النبیین کی طرف دو طرح پر ہوسکتی ہے۔ یا تو انبیاء معاہد منہ ہیں اور میثاق النبیین سے مراد وہ میثاق ہے جو نبیوں سے لیا گیا۔ اور یا انبیاء معاہد ہیں یعنی عہد لینے والے اور میثاق النبیین سے مراد وہ عہد ہے جو انبیاء نے لیا۔ جیسے میثاق اللہ اس عہد کو کہہ سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے لیا۔ قرآن کریم میں آتا ہے میثاقہ الذی واثقکم بہ (المائدۃ ۵ - ۷) جہاں میثاقہ سے مراد اللہ کا میثاق یا وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے لیا۔ اور چونکہ انبیاء علیہم السلام نے تو آنحضرت صلعم کے وقت تک زندہ نہ رہنا تھا اور یہ بات مکلف نہیں اس لئے دوسرے معنی ہی مراد ہوسکتے ہیں۔ گویا ترکیب یوں ہوئی اذ اخذ اللہ المیثاق الذی وثقہ النبیون علیٰ اممھم یہی معنی حضرت ابن عباس سے نقل کئے ہیں جب آپ سے کہا گیا کہ فلاں شخص میثاق الذین اوتوا الکتاب پڑھتا ہے (اور یہ قرأت گویا تفسیر اصل الفاظ کی تھی) تو آپ نے فرمایا انما اخذ اللہ میثاق النبیین علیٰ اممھم (د) یعنی اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا میثاق ان کی اُمتوں پر لیا۔ اور بعض نے یہاں النبیین سے مراد حذف مضاف پر امم النبیین لیا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں کی اُمتوں کا عہد لیا۔ ایک اور صورت وہ ہوسکتی ہے جو ترجمہ میں اختیار کی گئی۔ یعنی وہ عہد جو انبیا کے ذریعہ سے لیا گیا قرآن کریم میں اس کی اور مثال بھی موجود ہے الم یؤخذ علیہم میثاق الکتاب (الاعراف - ۱۶۹) کیا ان سے میثاق کتاب نہیں لیا گیا۔ جہاں میثاق کتاب سے مراد وہ میثاق ہے جو کتاب میں مذکور ہے۔ یا جو بذریعہ کتاب لیا گیا۔ کثیر علما جیسا کہ امام رازی نے لکھا ہے۔ اسی طرف گئے ہیں کہ یہاں مراد وہی میثاق ہے جو نبی اپنی اُمتوں سے لیتے تھے۔ المراد ان الانبیاء کانوا یاخذون المیثاق من اممھم بانہ اذا بعث محمد فانہ یجب علیہم ان یومنوا بہ وان ینصروہ وھذا قول کثیر من العلماء ۔

لَمَا

لَمَاۤ۔ اس کے معنی یہاں دو طرح پر ہوسکتے ہیں یا تو ما موصولہ اور لام ابتدا کے لئے ہے۔ اور معنی یوں ہونگے وہ جو

فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۝ ۸۱

پھر جو کوئی اس کے بعد پھر گیا تو وہی بدعہد ہیں ۔

میں نے تم کو کتاب و حکمت سے دیا۔ اور ما تاکستضمن معنی شرط ہے۔ اور اخذ میثاق کو قسم لینے کے معنی میں لیکر لتؤمنن بہ کو جواب قسم سمجھا جائے۔ اور جواب شرط یا جزا کے علیحدہ ذکر کی ضرورت جواب قسم کے آجانے کی وجہ سے نہ رہی ٭

اخذ — اخذ تم سے مراد یہاں قبلتم ہے یعنی تم نے قبول کیا۔ جیسے ان اوتیتم ھذا فخذوہ میں ٭

اصر — اِصْرِی ۔ اِصْر کے اصل معنی ع۳۶۵ میں بیان ہو چکے ہیں ۔ الثقل والشد۔ بوجھ اور مضبوط باندھ دینا۔ اس کے معنی عہد شکنی کا گناہ بھی آتے ہیں ع۳۶۵ اور اِصْر اس عہد موکد کو بھی کہتے ہیں جو توڑنے والے کو ثواب سے پیچھے رکھتا ہے (غ) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِصْر کے معنی یہاں مطلق بوجھ یا ثقل ہوں جو اس کے اصل معنی ہیں ۔ اور اخذتم اصری سے مراد ہو کہ یہ بوجھ جو میں تم پر ڈالتا ہوں کہ رسول موعود کی نصرت کرنا ہوگا اس بوجھ کو تم قبول کرتے ہو چنانچہ دوسری جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا یضع عنھم اصرھم ان کے بوجھ کو ان سے ہٹاتا ہے یعنی اس رسول کو قبول کرنے سے وہ بوجھ جو انسانوں پر رکھا گیا تھا قبول کرنے والوں کے ذمہ سے ہٹ گیا ؟

آنحضرت جملہ انبیائے عالم کے موعود ہیں — اصل بحث اہل کتاب سے تھی ان پر کامل اتمام حجت کرکے اور پچھلے رکوع میں ان کو پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلا کر اب بتایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کی پیشگوئیاں صرف یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں میں ہی نہیں بلکہ اسلام جملہ انبیائے عالم کا موعود مذہب ہے۔ اور

اول النبیین اور آخری نبی — اس رکوع میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم سب نبیوں کے موعود ہونے کے لحاظ سے اول النبیین اور بعثت میں آخری نبی ہیں ۔ اور اس سے اگلے رکوع میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ خانہ کعبہ سب سے پہلا خدا کا معبد ہے ۔ جو زمین پر مقرر کیا گیا ۔ اور وہ آخری معبد بھی ہے اس لحاظ سے کہ اس کی خیر و برکت دائمی ہے ۔ اور کبھی منقطع نہ ہوگی ۔ گویا یہ دونوں رکوع اسلام کی کمال عظمت کو ظاہر کرنے والے ہیں ٭

اس بات پر کہ رسول مصدق جس کے آنے کا یہاں ذکر ہے ۔ اس سے مراد آنحضرت صلعم ہیں ۔ قریبًا قریبًا اُمت کا اتفاق ہے۔ اور ابن جریر میں حضرت علی سے یہ روایت ہے لم یبعث اللہ تعالیٰ نبیا اٰدم فمن بعدہ الا اخذ علیہ العھد فی محمد صلعم یعنی آدم سے لیکر آخر تک اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث نہیں کیا جس سے محمد صلعم کے متعلق عہد نہ لیا ہو اور یہی صحیح ہے ٭

جیسا کہ قرآن کریم میں بار بار ذکر آیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک قوم میں اور ہر ایک اُمت میں ایک رسول مبعوث کیا ۔ بعض قوموں میں ایک سے زیادہ رسول بھی مبعوث کئے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جس قدر رسول آنحضرت صلعم سے پہلے آتے رہے ۔

کل دنیا کی طرف صرف ایک رسول کا آنا اور اس میں حکمت — یہ سب خاص خاص قوموں کی طرف آتے رہے ۔ کل دنیا کی طرف مبعوث ہونا یہ صرف ایک ہی رسول کے لئے مخصوص رکھا گیا ۔ جو سب سے آخر اور سب کو ایک دین پر جمع کرنے کے لئے آیا ۔ تو چونکہ اس رسول نے ساری قوموں کو ایک دین پر جمع کرنا تھا ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ساری قوموں سے بذریعہ اُن کے نبیوں کے یہ عہد لیا کہ جب وہ رسول آجائے تو تم سب نے اس کے دین پر چلنا ہوگا ۔ کیونکہ اصل غرض یہی تھی کہ نسل انسانی کے اندر سے قومیت کی تفریقوں کو مٹایا جائے ۔ اور سب کو بھائی بھائی بنایا جائے ۔ مگر مختلف قوموں میں مختلف نبیوں کے آنے سے قومی امتیازات ایک حد تک مضبوط ہوتے چلے گئے ۔ کیونکہ ہر قوم ہدایت کے لئے اپنے ہی نبی کو دیکھتی تھی اور اس کو دوسری قوم کے نبی کی تعلیم سے کوئی سروکار نہ تھا اور چونکہ تعلقات بین الاقوام بھی اس وقت نہ تھے ۔ سب قومیں اپنے اپنے ملکوں میں علیحدہ علیحدہ پڑی ہوئی تھیں اس لئے ان حالات کا اقتضاء بھی یہی تھا ۔ کہ ہر قوم کے اندر جدا جدا نبی مبعوث ہو ۔ مگر یہ علیحدگی جو ملکوں اور قومیتوں کی حد بندی سے پیدا ہوئی ہمیشہ کے لئے رہنے والی نہ تھی ۔ اس لئے یہ ضروری ہوا کہ جب وہ وقت آجائے کہ تعلقات بین الاقوام کی راہیں کھل جائیں تو قومی رسولوں کی بجائے ایک ہی رسول ساری دنیا کی طرف مبعوث ہو یہی وجہ ہے کہ ایک ہی رسول دنیا میں ہوا ۔ جس نے علی الاعلان بار بار کہا ۔ کہ میں کل عالمین کی طرف آیا ہوں ۔ اور جس کے متعلق ارشاد ہوا

۸۲ أَفَغَيْرَ دِينِ اللّٰهِ يَبْغُونَ

تو کیا اللہ کے دین کے سوا کچھ اور چاہتے ہیں

کہ ہم نے تم کو کافۃ للناس بھیجا ہے جس نے قومیتوں کی ساری تفریقوں کو مٹایا اور نسل انسانی کو وہ حکم خداوندی سنایا جو ان کو بھائی بھائی بنانے والا تھا۔ یا یہا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقکم (الحجرات ۴۹: ۱۳) اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تم کو شاخیں اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو سب سے متقی ہے۔ تو چونکہ اس رسول نے سب قوموں کو دین واحد پر جمع کرنا تھا۔ اس لئے سب قوموں سے یہ عہد لیا گیا۔ کہ تم نے اس رسول پر ایمان لانا اور اس کی نصرت کرنی ہوگی۔ اور یہ عہد ہر ایک قوم سے بذریعہ ان کے نبی کے لیا گیا یہی وہ مضمون ہے جس کو اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو ایک حدیث میں آیا ہے انا اول النبیین خلقا و آخرھم بعثا۔ کیونکہ اگر آپ اول النبیین خلقا ہوئے تو آپ کے متعلق ہر نبی سے وعدہ کس طرح لیا جاتا۔ اور بعثت میں آخری اس لئے ہوئے۔ کہ تا کل نبیوں سے آپ کے متعلق عہد لیا جائے اور آپ بھی کل کی تصدیق کریں ۔

آخری رسول کی سب سے بڑی علامت تصدیق رسل ؛؛ الٰہی

اس رسول کی سب سے بڑی علامت جو یہاں بتائی وہ یہ ہے کہ وہ مصدق لما معکم ہے یعنی اس کی تصدیق کرتا ہے جو کچھ قوموں کے پاس ہے۔ یہ ایک امتیازی نشان ہے جو رسول عربی فداہ امی و ابی میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی ایک رسول ہے جس نے اپنے سے پہلے دنیا کے تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا چنانچہ اس کا ذکر قرآن کریم میں بار بار ہے۔ ابتدائے قرآن میں ہی فرمایا۔ یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک (البقرۃ ۴) جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا۔ اس سب پر ایمان لاتے ہیں اور پھر بار بار فرمایا لا نفرق بین احد من رسلہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں بھی اس رسول مصدق کے اس امتیازی نشان کا ذکر فوراً کر دیا۔ جیسا کہ آیت ۸۳ میں فرمایا قل امنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ والنبیون من ربھم لا نفرق بین احد منھم پس یہاں درحقیقت بتا دیا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے کل نبیوں کی تصدیق فرماتے ہیں۔ اور اس طرح پر قرآن نے خود ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ رسول مصدق لما معکم سے کیا مراد ہے۔ کیونکہ محمد رسول اللہ صلعم ہی دنیا میں ایک رسول ہوا ہے جس نے دنیا کے کل نبیوں کی تصدیق کی ہے۔ اور ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے ۔

حواریان مسیح کی شہادت آنحضرت کے لئے

حضرت مسیح کے حواریوں نے بھی اس بات کی شہادت دی ہے۔ کہ وہ نبی مثل موسیٰ جس کی پیشگوئی استثناء ۱۸: ۱۵ و ۱۸ میں ہے اس کے متعلق دنیا کے کل نبیوں نے شہادت دی ہے۔ چنانچہ اعمال رسل باب ۳۔ آیت ۲۱ میں ہے "ضرور ہے کہ آسمان اسے لئے رہے۔ اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا۔ اپنی حالت پر آویں۔ کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے ایک نبی میری مانند اٹھائیگا جو کچھ وہ تمہیں کہے اس کی سب سنو" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کے بعد تک اس پیشگوئی کا انتظار تھا۔ اور دنیا میں ایک ہی شخص ہوا ہے جس نے یہ دعویٰ کیا۔ کہ میں وہ نبی ہوں جس کی بابت کل نبیوں نے خبر دی تھی۔ اور جس طرح اس کی خبر سب نبیوں نے دی۔ اسی طرح اس نے سب نبیوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ قرآن کریم اگر تفصیلات میں پڑتا تو اتنی بڑی کتاب تو صرف نبیوں کی پیشگوئیوں کے ذکر کے لئے کافی ہوتی۔ اس لئے یہاں یہ بتا کر کہ کل نبیوں سے یہ عہد لیا گیا تھا اس کا موٹا نشان یہ بتایا کہ کل نبیوں کا موعود کل کی تصدیق کرنے والا ہے اور ان من

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ

اور جو آسمانوں اور زمین میں ہیں خوش اور ناخوش اسی کے فرمانبردار ہیں اور اسی کی طرف لوٹائے جائینگے

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ ۸۳

کہہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور

اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ

یعقوب اور اسکی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا

---

۱ [illegible] یہاں نذیر کہنے والا دوسرا کوئی انسان دنیا میں نہیں گزرا اور یہ موٹا نشان ہے تا کہ صرف سلسلہ بنی اسرائیل کے انبیاء اور ان کے آخری نبی کی منتظر نبیوں کا ذکر صراحت سے کر دیا یعنی حضرت ابراہیم کی اس دعا کا دینا وابعث فیهم رسولا منهم یتلوا علیهم آیاتك ویعلمهم الکتاب والحکمة ویزکیهم (البقرہ ۲-۱۲۹) اور حضرت مسیح کی اس پیشگوئی کا ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمه احمد (الصف ۶۱-۶) اور باقی سب کے متعلق کہ یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراة والانجیل (الاعراف ۷-۱۵۷) وانه لفی زبر الاولین (الشعراء ۲۶-۱۹۶) چونکہ گزشتہ کتابوں میں اب بھی آپ کی پیشگوئی موجود ہے اس لئے اگر کسی کتاب میں سے عبارت بھی ہو سکتی ہو تو اس پر تعجب نہیں ۔

انبیاء میں سے نبیوں کا ذکر

۸۳ یبغون ۔ بغی کے اصل معنی میانہ روی سے تجاوز کو چاہنا ہے دیکھو ۱۱۵ گویا دین اللہ یا اسلام میانہ روی سکھاتا ہے جو اس کو چھوڑ کر کچھ اور چاہتا ہے وہ میانہ روی سے تجاوز کو چاہتا ہے ۔

اسلم ۔ اسلام کے اصل معنی فرمانبرداری کرنا ہیں ۔ اور یہی وسیع معنی یہاں مراد ہیں جیسا کہ تمام مخلوق ارضی وسماوی کی طرف اسلم منسوب کرنے سے ظاہر ہے ۔

طوعا وکرها دونوں مصدر ہیں جو حال کی جگہ پر آئے ہیں یعنی مرادے طائعین وکارہین ۔

طوع کے معنی ہیں فرمانبرداری اختیار کرنا یعنی رضا ورغبت سے اور کرہ اس کی ضد ہے ۔

اسلام عالمگیر مذہب

اس آیت میں اسلام کے عالمگیر مذہب ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ گویا پہلی آیت میں بتایا تھا کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا موعود مذہب ہونے کے لحاظ سے ساری نسل انسانی کا مذہب ہے اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اسلام اپنی حقیقت میں کل عالم کا مذہب ہے صرف زمین میں انسانوں کا ہی نہیں بلکہ من فی السموات ومن فی الارض کا مذہب ہے کیونکہ اسلام کے اصل معنی فرمانبرداری ہیں اور مذہب کے رنگ میں قوانین شریعت کی فرمانبرداری کا نام اسلام ہے اور عام رنگ میں قوانین الٰہی کی فرمانبرداری بھی اسلام ہی ہے پس اسلام جمیع مخلوقات کا مذہب ہے کیونکہ اس وسیع عالم میں جو چیز قوانین الٰہی کی فرمانبرداری نہ کرے گی اس کا وجود ہی نہیں رہ سکتا بالفاظ دیگر ہر شے کا وجود ہی قوانین کی فرمانبرداری پر ہے پس حقیقی معنی میں اسلام ہی عالمگیر مذہب ہے کیونکہ چھوٹے سے چھوٹے ذرہ سے لیکر بڑے سے بڑے کرہ تک سب اللہ تعالیٰ کے قوانین کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں ۔

جبراً فرمانبردار ہونے سے مراد

طوعا وکرها سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ خواہ کچھ ہو کوئی چیز قانون الٰہی کی فرمانبرداری سے باہر نہیں نکل سکتی کیونکہ فرمانبرداری تو طوعا ہی ہوتی ہے یعنی اپنی رضا ورغبت سے لیکن اگر ان چیزوں کو اختیار ہو تا کہ وہ فرمانبرداری کریں یا نہ کریں اور اپنی

۸۴ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ

ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں ۴۷۴ اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین

دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ○

چاہتا ہو تو اس سے قبول نہیں کیا جائیگا اور وہ آخرت میں نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا ۴۷۵

رضاء رغبت سے وہ فرمانبرداری نہ کریں - تو کرہاً بھی ان کو فرمانبرداری اختیار کرنی پڑتی یا طوعاً و کرہاً میں دو قسم کی فرمانبرداری کا ذکر ہے - ایک تو وہ چیزیں ہیں جن کی خواہش فرمانبرداری کے خلاف ہوسکتی ہی نہیں - جیسے مثلاً ملائکہ یا خود زمین و آسمان اور ان کی طاقتیں جیسا کہ اتینا طائعین (حٰمٓ السجدۃ - ۱۱) سے ظاہر ہے طبعی امور میں انسان بھی اسی طرح فرمانبرداری اختیار کرتا ہے - مگر وہ امور جن کا تعلق اختیار اور ارادہ سے ہے ان میں کرہاً بمعنی مشقت کے ساتھ فرمانبرداری ہے یعنی اس کام کو انسان طبعاً نہیں کرتا بلکہ مشقت اس کے لئے بکار ہے - اور یا کرہاً بمعنی ناخوشی سے یوں فرمانبرداری ہے کہ کافر جب خوشی سے ان قوانین کی فرمانبرداری نہیں کرتا تو ناخوشی سے بھی اس کو کرنی پڑتی ہے - کیونکہ ایسے قوانین میں فرمانبرداری دو طرح پر ہے جو شخص ان قوانین پر چلتا ہے وہ سکھ پاتا ہے جو نہیں چلتا وہ دکھ اُٹھاتا ہے - پس جس نے قانون کی فرمانبرداری طوعاً نہ کی اس کو کرھاً یعنی دکھ اور سزا کے رنگ میں کرنی پڑی - اسی لحاظ سے مفسرین نے طوعاً فرمانبرداری مومن کے لئے اور کرھاً کافر کے لئے لکھی ہے (ث) +

۴۷۴ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ دراصل یہی رسول مصدق ہے جو سب کا موعود تھا کیونکہ اس نے سب انبیاء پر ایمان لانا ضروری قرار دیا +

خسران

۴۷۵ الخاسرون خسر اور خسران راس المال کے کم ہو جانے کا نام ہے (غ)

اسلام کو چھوڑنا فطرت کو بگاڑنا ہو

جب دین اسلام سب انبیاء کا موعود بھی ہوا - سب رسولوں کا مصدق بھی ہوا بلحاظ اپنے معنی کے تمام ذرات عالم کا مذہب بھی ہوا - تو جو شخص ایسے کامل دین کو چھوڑ کر ناقص چیز کو قبول کرے وہ واقعی خسارہ میں ہے - اور چونکہ خسران راس المال کے ضائع ہو جانے کا نام ہے - اس لئے اس نے گویا اپنے راس المال کو بھی تباہ کر دیا - انسان کا راس المال مذہب کے معاملہ میں اس کی فطرت ہے - اور حدیث شاہد ہے کہ کل مولود یولد علی الفطرۃ ہر ایک انسانی بچہ اسی فطری دین پر پیدا ہوتا ہے پس جو شخص اسلام یا کامل فرمانبرداری کی راہوں کو ترک کر کے ادھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے اس نے اپنی فطرت کو بھی بگاڑ دیا +

نجات اور دوسرے مذاہب

یہ آیت اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ کامل راہیں نجات کی صرف اسلام میں پائی جاتی ہیں - گو قرآن کریم دوسرے مذاہب میں خوبیوں کا اعتراف کرتا ہے گو اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ سب مذاہب کی ابتدا خدا کی طرف سے ہی ہے مگر ساتھ ہی اس امر حق کا بھی اظہار فرماتا ہے کہ سب مذاہب میں غلطیوں کے راہ پا جانے سے اب انسان ان کے ذریعہ سے گناہ سے نجات یا اُخروی نجات حاصل نہیں کر سکتا - یہی معنی ہیں اس حدیث صحیح کے من عمل عملا لیس علیه امرنا فھو رد (ث) جو شخص ایسا عمل کرتا ہے جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے - ہاں ہر ایک نیکی کے کام پر خدا اور اس کے رسول کا امر موجود ہے پس نیکی کا کام کوئی بھی کرے مردود نہیں - اور اس لئے یہ ضروری ہے کہ سب لوگ دین واحد پر جمع ہو کر گناہ کی غلامی سے بھی نجات حاصل کریں اور دنیا میں ایک عظیم الشان اخوت نسل انسانی کے قائم کرنے کا موجب بھی ہوں +

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ ۸۵

اللہ ان لوگوں کو کس طرح ہدایت کرے جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے اور انہوں نے مشاہدہ کر لیا کہ رسول سچا ہے

وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ ۸۶

اور انکے پاس کھلی دلیلیں آچکیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۴۷۶ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہو کہ

اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۸۷

ان پر اللہ اور فرشتوں اور لوگوں سب کی لعنت ہے اس میں رہینگے

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا ۸۸

نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائیگا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی ۴۷۷ سوائے ان کے جنہوں نے

مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

اسکے بعد توبہ کی اور اصلاح کی تو اللہ بھی بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۴۷۸

اہل کتاب کا باوجود مشاہدہ صداقت نبوی سے انکار

۴۷۶ گو بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں ایک خاص گروہ کا ذکر ہے جو اسلام لا کر پھر مرتد ہو گئے اور اہل مکہ سے جا ملے۔ اور ان میں ابو عامر راہب کا نام بھی لیا گیا ہے۔ مگر حسن اور ابن عباس سے روایات صریحہ ہیں کہ ان آیات میں اہل کتاب کا ہی ذکر ہے۔ اور یہی سیق و سباق عبارت چاہتا ہے۔ اصل مخاطب تو اس رکوع میں اہل کتاب ہی ہیں۔ اسلام پر اس قدر کھلے دلائل کے باوجود ان لوگوں نے کوئی توجہ اسلام کی طرف نہ کی۔ کفروا بعد ایمانہم سے یہ مراد ہے کہ وہ پہلے انبیاء پر ایمان لائے اور اس کے بعد اب محمد رسول اللہ صلعم کا کفر کرتے ہیں۔ و شہدوا ان الرسول حق میں یہ اشارہ ہے کہ درحقیقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا یہ لوگ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں۔ جیسا دوسری جگہ فرمایا یعرفونہ کما یعرفون ابناءہم (البقرۃ ۲-۱۴۶) اور دوسری جگہ فرمایا لم تکفرون بآیات اللہ وانتم تشہدون (۶۹) بینات سے مراد وہ کھلے دلائل ہیں جن میں سے کئی ایک یہاں بھی بتفصیل بیان ہو چکے ہیں۔

اللہ کے ان کو ہدایت نہ دینے سے یا تو یہ مراد ہے کہ ان کو ہدایت کی منزل مقصود پر نہیں پہنچاتا۔ یا یہ کہ ان کو کامیاب نہیں کرتا یا جنت میں نہیں پہنچاتا۔ اور یا یہ کہ ایسے ظالموں سے ہدایت کی توفیق چھین لیتا ہے اور یہ ان کے دلائل کی طرف توجہ نہ کرنے اور باوجود مشاہدہ حق کو قبول نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

۴۷۷ ان لعنتوں کے متعلق دیکھو ۱۹۹ دونوں جگہ اس لعنت کو دوزخ قرار دیا ہے اسی لئے فرمایا خالدین فیہا۔

توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔

۴۷۸ اسلام کوئی ایسی مہر کفار کے قلوب پر تجویز نہیں کرتا جو ٹوٹ نہ سکتی ہو۔ ان لوگوں کی زیادتیوں اور کفر پر اصرار وغیرہ کا سا ذکر کر کے اور ان کی خطرناک سزا کا ذکر کر کے فرماتا ہے پھر بھی جو لوگ توبہ کریں اور توبہ کے ساتھ اصلاح کریں وہ اس سزا کے پانے والے نہیں ہونگے۔ مگر توبہ کے ساتھ اصلاح شرط ہے۔ اور اس پر غفر کا وعدہ ہے یعنی ان کی وہ طاقتیں جو ان سے بدیاں کراتی تھیں اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کریگا۔

۸۹ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِہِمۡ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا لَّنۡ تُقۡبَلَ تَوۡبَتُہُمۡ

جو لوگ اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے پھر کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ قبول نہ کی جائے گی۔

۹۰ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الضَّآلُّوۡنَ ۝ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَ ہُمۡ کُفَّارٌ فَلَنۡ

اور وہی گمراہ ہیں ۴۷۹ جو لوگ کافر ہوئے اور مر گئے اور وہ کافر ہی تھے تو ان میں

یُّقۡبَلَ مِنۡ اَحَدِہِمۡ مِّلۡءُ الۡاَرۡضِ ذَہَبًا وَّ لَوِ افۡتَدٰی بِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ

سے کسی سے زمین بھر کر سونا بھی قبول نہ کیا جائیگا اگرچہ وہ اسے فدیہ دے ان کے لئے

عَذَابٌ اَلِیۡمٌ وَّ مَا لَہُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ۝

دردناک دکھ ہے اور ان کے لئے کوئی بھی مددگار نہ ہوگا ۴۸۰

ازدیاد کفر — **۴۷۹** ازدادوا کفرا سے مراد اصرار علی الکفر ہے کیونکہ جب کفر پر اصرار ہوتا ہے تو وہ بڑھتا رہتا ہے۔ اور یا عداوت میں بڑھتے جانا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے یہودیوں سے مخصوص کیا ہے کہ انہوں نے پہلے حضرت موسیٰ پر ایمان لاکر پھر حضرت عیسیٰ کا انکار کیا۔ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے کفر میں بڑھ گئے۔ مگر یہ بلاوجہ تحدید ہے۔ سارے اہل کتاب مراد ہیں جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ اور کفر میں ان کا ترقی کرتے جانا مخالفت حق میں بڑھتے جانا ہے۔ ایسے لوگ اگر گھر میں بیٹھ کر توبہ بھی کریں تو یہ توبہ قبول نہیں ہوتی کیونکہ ان کے اعمال اس کے خلاف ہوتے ہیں۔ اور حق کو وہ ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں تو یہ کیسی! اور یا جیسا کہ ابن الانباری اور قفال نے کہا ہے یہ متعلق ہے اُن لوگوں کے جن کا ذکر الا الذین تابوا میں پہلے آچکا ہے اور مراد یہ ہے کہ اگر توبہ کر کے پھر کفر کی طرف لوٹ گئے۔ اور کفر میں بڑھتے گئے تو وہ ان کی پہلی توبہ قبول نہ ہوتی ۔

ملء — **۴۸۰** ملء الارض۔ ملء الشئ سے مراد ہوتی ہے مقدار ما یملاء یعنی وہ مقدار جس سے وہ شئے بھر جائے۔ پس اس قدر سونا مراد ہے جس سے زمین بھر جائے ۔

مال دنیا آخرت میں کام نہ دیگا۔ — اس آیت میں صاف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب جو دین حق سے منحرف ہو کر اس قدر سونا کمائیں گے کہ گویا ساری زمین ہی سونے سے بھر جائے گی تو اس قدر سونا بھی اس نقصان کی تلافی نہ کرسکے گا جو دین سے انحراف میں انھوں نے اُٹھایا ہوگا لو افتدیٰ بہ اس لئے فرمایا کہ یوں قبول نہ کرنے میں اس قدر اظہار ناراضگی نہیں جس قدر اس میں کہ بطور فدیہ کوئی چیز پیش کی جائے تو اسے قبول نہ کیا جائے۔ گویا یوں فرمایا کہ ان کا ساری زمین کو سونے سے بھر دینا تو کسی کام ہی نہیں بطور فدیہ بھی دیں تو قبول نہیں ہوگا۔ اور من احدھم اس لئے فرمایا کہ جس قدر سونا سب مل کر پیدا کرسکتے ہیں اتنا اتنا اکیلا بھی کرے تو اسے کچھ کام نہ دے گا۔ بتایا ہے کہ اخلاق اور روحانیت کے مقابلہ میں سونا ہیچ ہے ۔

ع ۱

مرکز اسلامی دنیا کا سب سے پہلا معبد ہے

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ ۹۱

تم راستبازی کو ہرگز حاصل نہ کرو گے یہاں تک کہ اس سے خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ

بِهٖ عَلِیْمٌ ۝ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ ۹۲

اسے خوب جاننے والا ہے ۴۸۱ کھانے کی سب چیزیں بنی اسرائیل کیلئے حلال تھیں قبل اس کے کہ تورات اتاری جائے

عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ

سوائے اس کے جو اسرائیل نے اپنی جان پر حرام کر لیا کہو اگر سچے ہو تو تورات لاؤ پھر اسے

صٰدِقِیْنَ ۝ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ۹۳

پڑھو ۴۸۲ پھر جو کوئی اس کے بعد اللہ پر جھوٹ بنائے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

مِنْ

۴۸۱ مما میں مِنْ تبعیضیہ بھی ہو سکتا ہے یعنی بعض حصہ اس کا خرچ کرو جس سے تم کو محبت ہے اور بیانیہ بھی ہو سکتا ہے۔
پچھلے رکوع میں اسلام کی صداقت کی اس عظیم الشان دلیل کی طرف توجہ دلائی تھی کہ یہ سب انبیاء کا موعود ہے اس رکوع میں ایک ایسی ہی اور عظیم الشان دلیل کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کا مرکز یعنی خانہ کعبہ دنیا کا سب سے پہلا معبد ہے اس لئے ضروری تھا کہ الگ الگ قوموں میں نبی بھیجنے کے بعد دنیا کا آخری معبد اور ساری نسل انسانی کی عبادتگاہوں کا مرکز اسی کو قرار دیا جاتا اور یوں اصولی طور پر دو عظیم الشان امور کی طرف اہل کتاب کو توجہ دلائی ہے۔ مگر چونکہ سلسلہ مضمون اس رنگ میں چلتا تھا کہ اہل کتاب اگر ساری زمین کو بھی سونے سے بھر دیں تو وہ ان کی بدیوں کا فدیہ نہیں ہو سکتا اس لئے اب مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ وہ البر خیر وسیع یا سب قسم کی خیر کے ابواب میں کس طرح داخل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ سونے سے زمین بھرنے والوں کے بالمقابل جنہوں نے اپنی ساری طاقتوں کو اسی سفلی زندگی پر لگا دیا ہے۔ اس گروہ کا ذکر ضروری تھا جو ہر قسم کی خیر اور نیکی کو حاصل کرے تو اس کا گر یہ بتایا کہ جن چیزوں سے تم کو محبت ہے وہ خرچ کرو تو جمیع ابواب خیر میں داخل ہو سکتے ہو۔ بعض نے یہاں البر کے معنی جنت لئے ہیں مگر اصل دونوں کا ایک ہے کیونکہ جس نے جمیع خصال خیر حاصل کر لئے وہ اسی دنیا میں جنت میں داخل ہو گیا۔ اب مما تحبون صرف مال اور زر ہی نہیں بلکہ اگر ضرورت ہو تو اپنے وقت عزیز کو خدا کی راہ میں لگانا اپنی عزت اور مرتبہ کو جس سے انسان محبت کرتا ہے خدا کی راہ میں خرچ کر دینا۔ اپنی ساری قوتوں اور طاقتوں کو لگا دینا یہ سب کچھ اس کے اندر داخل ہے۔ ہاں مال و دولت جائداد سب سے زیادہ محسوس ہونے والی چیزیں ہیں بعض لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ یہ آیت حکم زکوٰۃ سے منسوخ ہے حالانکہ یہ ایک ایسا محکم اور پختہ اصول ہے کہ جبتک انسان اس دنیا میں ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہو سکتا۔ نسل انسانی کی ساری ترقیات کا مدار ہی محبوب اشیاء کے انفاق پر ہے۔ صحابہ نے اس اصول کو خوب سمجھا تھا۔ اور اپنی جانیں مال جائدادیں سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر کے ہر قسم کی بڑائی کے وارث ہوتے۔

مال دنیا کا معبد بنانا خیر کے مقابل

ما تحبون کیا ہے

طعام

یہودیوں کا اونٹ کے متعلق

۴۸۲ الطعام میں ال عہد کے لئے ہے۔ یعنی وہ طعام جو مسلمان کھاتے ہیں۔ اور طعام ہر وہ چیز ہے جو بطور غذا کھائی جاتی ہے۔
واحدی نے کلبی سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ہم دین ابراہیم پر ہیں (ان اولی الناس بابراہیم للذین اتبعوہ وھذا النبی) تو یہودیوں نے کہا کہ آپ اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں۔ اور اونٹ کا گوشت نوح اور ابراہیم

۹۴ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

کہو اللہ نے سچ فرمایا ہے پس ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو راست رو تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا[۴۸۳]

۹۵ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

پہلا گھر جو لوگوں کیلئے مقرر کیا گیا یقیناً وہی ہے جو مکہ میں ہے برکت دیا گیا اور جہانوں کے لئے ہدایت ہے[۴۸۴]

علیہما السلام پر بھی حرام تھا۔ تو یہ آیت ان کی تکذیب کے لئے اُتری (د) گویا یہ الفاظ اس اعتراض کے جواب میں ہیں کہ کھانے کی چیزوں میں مسلمانوں کا ملت ابراہیمی سے کوئی اختلاف ہے۔ اور دعویٰ کیا ہے کہ وہی چیزیں جو ابراہیم کے لئے حلال تھیں بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھیں۔ مگر اسرائیل نے کچھ اپنے اوپر حرام کر لیا تھا وہ کیا تھا؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کا گوشت تھا۔ اور حضرت یعقوب نے ایک لمبی بیماری میں مبتلا ہونے پر یہ نذر مانی تھی کہ وہ محبوب ترین طعام کو جو اونٹ کا گوشت تھا ترک کر دینگے بعض نے چربیوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے بعض نے کہا ہے کہ حضرت یعقوب نے عبادت کے رنگ میں اسکو ترک کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ایسا کیا تھا۔ بہر حال اہل کتاب کا جو اعتراض تھا کہ یہ چیزیں ہمیشہ سے حرام تھیں اور ملت ابراہیمی میں بھی حرام تھیں اس کا جواب دیا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو توریت لاکر پڑھو۔ اور اس میں دکھاؤ کہ کہاں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم پر بھی یہ چیزیں حرام تھیں اس کیطرف توجہ دلانے کیلئے فرمایا فاتبعوا ملۃ ابراہیم حنیفا اور توریت میں جو بہت سی چیزیں ان پر حرام کی گئیں تو اس کی وجہ قرآن کریم نے دوسری جگہ یوں بیان فرمائی ہے فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم (النساء۴ - ۱۶۰) اور دوسری جگہ فرمایا ذٰلک جزینٰھم ببغیھم وانا لصادقون (الانعام۶ - ۱۴۷) یعنی حقیقت یہی ہے کہ توریت کے نزول سے پہلے بنی اسرائیل پر ہر ایک قسم کا طعام جو مسلمانوں کیلئے حلال ہے حلال تھا۔ اور بنی اسرائیل پر بھی بہت سی چیزوں کی حرمت کی وجہ ان کی حرمت اصلی نہیں بلکہ سزا کے طور پر تھا ✦

بنی اسرائیل پر بعض چیزیں حرام ہوئیں

۴۸۳ قل صدق اللّٰہ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اشارہ اس بیان کے متعلق ہو جو آیت ۹۲ میں پایا جاتا ہے۔ مگر قرین قیاس یہ ہے کہ اس میں دین اسلام کی صداقت کا اظہار ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے وہ سب سچ ہے۔ اس کے بعد فرمایا فاتبعوا ملۃ ابراہیم حنیفا یعنی اصول دین اسلام وہی ہیں جو ابراہیم کی ملت کے اصول تھے۔ اور چونکہ وہ تم سب کا مسلم بزرگ ہے۔ اس کے اصول دین سے تمہارا انحراف کرنا کسی صورت میں ٹھیک نہیں۔ چونکہ گزشتہ ساری بحث میں اصول پر ہی توجہ دلائی گئی ہے۔ اس لئے ملت ابراہیم سے مراد یہاں اصول ملت ابراہیمی ہیں نہ اس کے فروع۔ اس سے پہلی آیت میں جو اللہ پر جھوٹ بنانے کا ذکر ہے۔ اس میں بھی ان افتراؤں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو یہود و نصاریٰ نے دین کے معاملہ میں کر رکھے تھے ✦

یہود و نصاریٰ کو ملت ابراہیم کے اتباع کی دعوت

۴۸۴ اول سے مراد یہاں متقدم فی الزمان ہی ہے۔ یعنی زمانہ کے لحاظ سے سب سے پہلا۔ جیسا کہ دوسری آیات واحادیث سے واضح ہوتا ہے۔ اور مرتبہ کے لحاظ سے بھی وہ اول ہے کیونکہ آخری مرجع عالم بھی وہی قرار پایا ✦

اول

وُضع۔ وضع کا استعمال کئی طرح پر ہوتا ہے۔ ایجاد اور خلق کے معنی میں بھی آتا ہے (غ)، جیسے والارض وضعھا للانام (الرحمٰن۵۵ - ۱۰) اور بچہ جننے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ فلما وضعتھا قالت رب انی وضعتھا انثیٰ واللّٰہ اعلم بما وضعت (اٰل عمرٰن۳ - ۳۵) اور وَضْعُ الْبَيْتِ سے مراد ہوتی ہے بِنَاؤُہٗ (غ) یعنی اس کی تعمیر۔ اور وضع الکتاب سے مراد ہے اِبْرَازُ اَعْمَالِ الْعِبَادِ (غ) یعنی بندوں کے اعمال کا ظاہر کرنا۔ ووضع الکتاب (الکہف۱۸ - ۴۹) ✦

وضع

بکۃ۔ بکۃ اور مکۃ ایک ہی نام کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ چنانچہ راغب نے بھی مجاہد کے اس قول کو ہی ترجیح دی ہے

مکۃ

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ۗ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ ۹۶

اس میں کھلے کھلے نشان ہیں مقام ابراہیم — اور جو وہاں داخل ہوا وہ امن والا ہو گیا اور لوگوں پر اللہ کے لئے

کہ بکۃ مکۃ ہے۔ اور ب اور م کے ایک دوسرے کی جگہ آ جانے کی بہت سی مثالیں ہیں جیسے سَبَدًا اور سَمَدًا۔ لازِبٌ اور لازم۔ بعض لوگوں نے ان دونوں میں کچھ فرق کیا ہے۔ بعض کے نزدیک بطن مکہ کا نام بکہ ہے بعض کے نزدیک مسجد کا نام بکہ ہے اور بعض کے نزدیک خاص البیت کا۔ اور مکہ شہر کا نام ہے پھر اس کے اشتقاق کی وجہ میں بھی اختلاف ہے بعض کے نزدیک یہ تباک سے ہے جس کے معنی ازدحام ہیں۔ کیونکہ لوگ طواف کے لئے اس میں اکٹھے ہوتے ہیں اور بعض نے کہا کہ مکہ کا نام بکہ اس لئے رکھا گیا ہے اِنَّهَا تَبُكُّ اَعْنَاقَ الْجَبَابِرَةِ یعنی وہ جباروں اور سرکشوں کی جو اس کے اندر یا اس کے متعلق زیادتی کرنا چاہیں گردنیں توڑتا ہے ♦

برک مبارکا۔ برک کی اصل اہل لغت نے بَرَكَ الْبَعِيرُ سے لکھی ہے جس کے معنی ہیں اونٹ بیٹھ گیا اور اس جگہ کے ساتھ لگا رہا

برکۃ (ل) اس وجہ سے لزوم اور ثبات کے معنی کے اظہار کے لئے بَرَكَة کا لفظ بولا جاتا ہے اور گو اہل لغت نے نمو اور بڑھنا بھی بَرَكَة کے معنی لکھے ہیں مگر اصل معنی اسکے لزوم اور ثبات ہی ہیں جیسا کہ لسان العرب میں بھی ہے اور مفردات میں ہے اَلْبَرَكَةُ ثُبُوْتُ الْخَيْرِ الْاِلٰهِيِّ

مبارک فِي الشَّيْءِ یعنی کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا ثابت ہو جانا۔ اور مبارک کے معنی ہیں مَا يَاْتِيْ مِنْ قِبَلِهِ الْخَيْرُ الْكَثِيْرُ (ل) جس کی طرف سے خیر کثیر آتی

بکہ کو مبارک کہنے کی مراد رہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی یہ لفظ بولا گیا ہے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ پس بکۃ کو مبارک کہا کہ اس کی طرف سے خیر کثیر آتی رہے گی یہ خیر کثیر صرف عبادت میں اور اس کے ثواب میں یا قبولیت دعا میں یا يُجْبٰى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ (القصص ۲۸۔ ۵۷) میں محدود نہیں بلکہ منشاء یہ ہے کہ انسان کیلئے تمام خیرات دینی کا یہ مرکز رہے گا یہاں سے وہ سرچشمہ توحید کا پھوٹا جو قیامت تک منقطع نہیں ہو گا ♦

ھدی ھدی۔ مراد ہے ذا ھدی یعنی ہدایت والا۔ کیونکہ یہیں سے وہ ہدایت نکلی جو تمام دنیا جہان کے لئے تھی۔ تمام ہدایتیں ایک ایک قوم کے لئے آئیں۔ صرف ایک ہی ہدایت ہے جو علی الاعلان ساری دنیا کے لئے آئی اور وہ ہدایت اسی مقام مبارک سے نکلی ♦

خانہ کعبہ سب سے پہلا دنیا کا معبد ہے آیا خانہ کعبہ اول بیت یعنی دنیا کا سب سے پہلا معبد ہے؟ اس پر مخالفانہ شہادت کا ذکر ۵۷ میں ہو چکا ہے۔ احادیث نبوی میں بھی صراحت سے اس کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم میں ہے کہ ابو ذرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اَيُّ مَسْجِدٍ وُضِعَ اَوَّلُ کونسی مسجد سب سے پہلے بنائی گئی۔ تو آپ نے جواب دیا اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامُ یعنی مسجد حرام یا خانہ کعبہ اور یہ جو ایک روایت حضرت علی سے ابن ابی حاتم نے بیان کی ہے کہ ایک شخص نے حضرت علی سے سوال کیا اَھُوَ اَوَّلُ بَيْتٍ وُضِعَ فِي الْاَرْضِ قَالَ لَا وَلٰكِنَّهُ اَوَّلُ بَيْتٍ وُضِعَ فِيْهِ الْبَرَكَةُ (ث) کیا وہ سب سے پہلا گھر ہے جو زمین پر بنایا گیا تو آپ نے فرمایا نہیں لیکن وہ پہلا گھر ہے جس میں برکت ڈالی گئی۔ تو یہ بخاری اور مسلم کی حدیث کے خلاف نہیں اور حضرت علی سے بھی ابن ابی حاتم کی دوسری روایت اس کی توضیح کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے کہا كَانَتِ الْبُيُوْتُ قَبْلَهُ وَلٰكِنَّهُ اَوَّلُ بَيْتٍ وُضِعَ لِعِبَادَةِ اللّٰهِ (ث) یعنی گھر تو اس سے پہلے بھی تھے مگر وہ پہلا گھر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے مقرر کیا گیا۔ اور یہی منشاء حدیث متفق علیہ کا ہے کہ سب سے پہلی مسجد یا سب سے پہلا اللہ تعالیٰ کی عبادت کا گھر جو دنیا میں مقرر ہوا وہ خانہ کعبہ ہے اور بیہقی کی حدیث ذیل اسی کی موید ہے جس کو گو بعض لوگوں نے ابن لہیعہ کے نام کی وجہ سے کمزور کہا ہے مگر چونکہ قرآن کریم کے صریح الفاظ اول بیت اور حدیث متفق علیہ کے مطابق ہے اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا اور وہ حدیث

آدم کا کعبہ کو بنانا عمرو بن العاص سے مرفوع یوں ہے بَعَثَ اللّٰهُ جِبْرِيْلَ اِلٰى اٰدَمَ وَحَوَّاءَ فَاَمَرَهُمَا بِبِنَاءِ الْكَعْبَةِ فَبَنَاهُ اٰدَمُ ثُمَّ اُمِرَ بِالطَّوَافِ بِهٖ (ث)

حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ

اس گھر کا حج کرنا ہے اس پر جس کو اس کی طرف راہ کی طاقت ہو اور جس نے کفر کیا تو بیشک اللہ جہانوں سے بے نیاز ہے۔ ۴۸۵

بیت اللہ اور بیت المقدس میں چالیس سال کا فرق

یعنی اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو آدم اور حواء کی طرف بھیجا اور ان کو کعبہ کے بنانے کا حکم دیا پس آدم نے اسے بنایا پھر اسے اس کے طواف کا حکم دیا گیا۔ اور یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ بیت الحرام کے بعد بیت المقدس ہے اور دونوں میں چالیس سال کا فرق ہے تو اس کا منشا صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے ان دونوں گھروں کے بنانے میں چالیس سال کا فرق ہے کیونکہ پہلے حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل کے ساتھ خانہ کعبہ کو دوبارہ بنایا اور پھر اپنی نسل کی دوسری شاخ کے لئے بیت المقدس کو قبلہ بنایا۔

مکہ کے نام

مکہ کے کئی ایک نام آئے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ مثلاً ام القرٰی (الانعام ۹۲) بستیوں کی ماں اور یہ نام مکۃ کی وجہ تسمیہ کے ساتھ ملتا ہے کیونکہ مکہ بھی مَکَّ سے ہے جس کے معنی ماں کی چھاتیوں سے دودھ چوسنا ہے اور ام القرٰی یا بستیوں کی ماں اسے اس لئے کہا کہ اس کی چھاتیوں سے ساری زمین توحید الٰہی اور دین حق کا دودھ چوسے گی اس لئے ساری دنیا کا یہی حقیقی مرکز ہے اور مفسرین نے اسے زمین کا مرکز کہا ہے جس سے مراد روحانی مرکز ہے۔ اور البلد یا خاص شہر بھی اس کا نام آیا ہے۔ اور البلد الامین یا امن والا شہر بھی کیونکہ اس جیسی کوئی جائے امن اور دنیا میں نہیں۔ اور احادیث میں دو عظیم الشان فتنوں کا ذکر کر کے جن میں سے ایک روحانی فتنہ ہے اور ایک جسمانی یہ بتا دیا ہے کہ اس میں دجال اور طاعون داخل نہیں ہونگے یعنی ہر قسم کے فتنوں سے امن میں رہے گا اور خانہ کعبہ کے جو نام ہیں وہ بھی سب گویا مکہ کے ہی نام ہیں جیسے مقام ابراھیم۔ البیت خاص گھر البیت العتیق قدیم گھر۔ البیت المحرم پاک گھر یا عزت والا گھر البیت الحرام۔ الکعبۃ۔ دوسرے نام جو بیان کئے گئے ہیں یہ ہیں الحاطمۃ یعنی توڑ دینے والا جس میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے جو بکّۃ میں بھی پائے جاتے ہیں یعنی ظالموں کی جو اس کی بےحرمتی کرنا چاہیں گردنیں توڑنے والا۔ المامون۔ ام رحم۔ صلاح۔ عرش۔ القادس۔ المقدس۔ الناس۔ کوثاء۔ البنیۃ وغیرہ (ث)۔

آخری عبادت گاہ

جس طرح اس گھر کو اول بیت کہا ہے اسی طرح لفظ مبارک میں یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ خاتم النبیین کا یہ قبلہ خدا کی عبادت کا آخری گھر بھی ہے کیونکہ مبارک کے معنی ہیں جس کی خیر و برکت کبھی منقطع نہ ہو اور دائمی ہو۔ گویا جس طرح پہلے قبلے ایک وقت کے لئے تھے اور آخر ان کی خیر و برکت ایک وقت آکر منقطع ہونے والی تھی۔ یہ صورت اس پاک گھر کی نہ ہوگی۔ کیونکہ اس نے دنیا کی ساری بستیوں کا مرکز بننا تھا۔ اس کے بعد اور کوئی عبادتگاہ خدا کی اس دنیا پر قایم نہ ہوگی۔ اور تاریخ خود اس پر شاہد ہے کہ اس کے بعد کوئی مقام اس قسم کا مرکز دنیا میں نہیں بنا۔ ھدی للعالمین کے لفظ میں انہی مطالب کی تصریح فرما دی کہ یہاں سے ہدایت ملے گی۔ اور وہ ہدایت عرب کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی کل قوموں کے لئے ہوگی۔

حَج۔ حِج

۴۸۵ حَج۔ اور حِج کے ایک ہی معنی ہیں دیکھو لسان فرق صرف اس قدر اہل لغت نے کیا ہے۔ کہ حَج مصدر ہے اور حِج اسم ہے (غ)۔

استطاعت راہ سے مراد

استطاع الیہ سبیلا۔ استطاعت کے معنی دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ استطاعت مدد وسعت کا نام ہے یعنی جس کو بسہولت انسان کر سکے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استطاع الیہ سبیلا کا مطلب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا الزاد والراحلۃ (ث) یعنی زاد راہ اور سواری۔ اور بعض نے صحت کو بھی داخل کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ سارے امور اس کے اندر داخل ہیں مثلاً خود وہاں کا امن۔ رستہ کا امن متعلقین کا گزارہ۔ امن کے نہ ہونے کی وجہ سے خود نبی کریم صلعم نے مدینہ میں آکر کئی سال تک حج نہیں کیا۔ اور چھٹے سال میں حدیبیہ سے واپس آنا پڑا۔

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَٱللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ ۝ ۹۷

کہو اے اہل کتاب کیوں اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو اور اللہ اس پر گواہ ہے جو تم کرتے ہو۔

مقام ابراہیم

مقام ابراہیم۔ یہ آیات بینات کی تشریح ہے یعنی وہ کھلی کھلی نشانیاں کیا ہیں۔ سب سے پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ مقام ابراہیم ہے۔ مقام ابراہیم کی تشریح ۱۵۵ میں ہو چکی ہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ سارا حرم ہی مقام ابراہیم ہے (رض)

مقام ابراہیم سے شہادت

خانہ کعبہ کا مقام ابراہیم ہونا یا اس میں مقام ابراہیم کا ہونا ایک کھلا نشان قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ خانہ کعبہ کے ساتھ اور عبادات حج کے ساتھ حضرت ابراہیم کا نام نامعلوم زمانہ سے چلا آیا ہے۔ اگر واقعی حضرت ابراہیم یہاں نہ آئے ہوتے تو عرب کے بت پرستوں کو جن کی روایات میں یہ ایک مسلم امر چلا آیا ہے - کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ ایک ایسے شخص کے نام کا تعلق جو علی الاعلان بت شکن تھا۔ اس گھر سے قائم کرتے اور اس میں ایک مقام ابراہیم قائم کر کے اس کے مراسم حج وغیرہ کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے اصل بات یہ ہے کہ بعض باتیں جن کی شہادت زبانی روایات میں پوری نہیں رہ سکتی۔ ان کی شہادت ایک تعامل قومی میں رہ جاتی ہے۔ اور وہ شہادت ایسی زبردست ہوتی ہے کہ جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ سو ایسی ہی ایک شہادت خانہ کعبہ کے ساتھ حضرت ابراہیم کے نام کے تعلق میں رہ گئی ہے جو آج بھی اہل کتاب پر اتمام حجت کے لئے کافی ہے کہ جس بیت اللہ یا بیت ایل کا ذکر بائبل میں ہے۔ وہ حقیقت میں خانہ کعبہ تھا کیونکہ دنیا میں یہی ایک گھر ہے جس کا نام بیت اللہ ہے اور یہی ایک گھر ہے جس کے ساتھ حضرت ابراہیم کے نام کا تعلق ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ اور جس کی ساری عبادات اور رواجات حضرت ابراہیم کی طرف منسوب ہیں۔

کعبہ مقام امن ہے

دوسرا کھلا نشان خانہ کعبہ کے متعلق یہ ہے کہ من دخلہ کان آمنا یعنی یہ ایک امن کا مقام ہے۔ یہ بھی خصوصیت ساری دنیا میں صرف خانہ کعبہ کو ہی حاصل ہے کہ وہ امن کا مقام ہے۔ حدیث میں ہے۔ کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ مکہ مجھ سے پہلے کسی کیلئے حلال نہیں ہوا (یعنی ہمیشہ مقام حرمت رہا) اور نہ میرے بعد کسی کیلئے حلال ہوگا اور وہ میرے لئے بھی صرف دن کی ایک گھڑی حلال ہوا۔ (یعنی وہ وقت جب فتح مکہ کے وقت آپ اس میں داخل ہوئے ہیں) سن رکھو کہ وہ اس وقت سے حرمت کا مقام ہے۔ نہ اس کے کانٹے کاٹے جائینگے نہ اس کے درخت قطع کئے جائینگے نہ اس کی گری ہوئی چیز اٹھائی جائیگی مگر اس شخص کے لئے جو اس کے (اصل مالک کو) پہنچانے والا ہو پس مکہ کی حدود کے اندر کسی قسم کی جنگ جائز نہیں یعنی ان حدود کے اندر مکہ معظمہ میں جنگ کرنا منع ہے۔ اور یہ حرمت اس کی عرب کے اندر ابتدا سے اللہ تعالیٰ نے ایسی محکم رکھی تھی۔ کہ عرب جیسی جنگجو قوم جن کا شغل ہی دن رات جنگ کرنا تھا۔ اور جہاں قبیلہ قبیلہ کے ساتھ اور قوم قوم کے ساتھ ہر وقت برسر پیکار رہتے اس قوم میں بھی مکہ کی حدود کے اندر کسی کی طاقت نہیں تھی کہ تلوار کو نیام سے باہر نکال سکے۔ اور جو ہزارہا سال کی تاریخ میں کوئی ایک دو مثالیں اس حکم کی خلاف ورزی کی پیش کی جاتی ہیں تو وہ النادر کالمعدوم کے حکم میں ہیں۔ پھر ایک حدیث میں مکہ کی حرمت کے متعلق یہ لفظ بھی آتے ہیں کہ اس کے اندر نہ دجال داخل ہوگا۔ اور نہ طاعون۔ یہ امن اس مقدس سرزمین میں کیوں رکھا گیا اور کیوں ساری دنیا میں یہ ایک ہی جگہ امن کے لئے مخصوص ہوئی؟ - درحقیقت یہ قوم کا خیال نہ تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک جنگجو قوم کے اندر اپنی طاقت اور قدرت کا ایک نشان رکھا ہوا تھا تاکہ یہ ایک نشان ہو اس روحانی امن و امان کا جس کا جھنڈا اس مقام پر بلند ہو کر دنیا کی کل قوموں میں صلح و اتحاد اور اخوت کی بنیاد رکھی جاتی تھی پس یہ دوسرا کھلا نشان ہے جو اس گھر کو عطا کیا گیا۔

تیسرا نشان ان الفاظ میں مذکور ہے وللہ علی الناس حج البیت۔ لوگوں کے لئے (من استطاع الیہ سبیلا) کی

۹۸ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ

کہو اے اہل کتاب کیوں اسے اللہ کی راہ سے روکتے ہو جو ایمان لائے تم اس کیلئے ٹیڑھا پن چاہتے ہو حالانکہ تم

۹۹ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا

گواہ ہو اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو ۴۸۶ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم ان لوگوں میں سے

فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝

ایک گروہ کے پیچھے لگ جاؤ گے جن کو کتاب دی گئی ہے تو وہ تمہیں تمہارے ایمان کے بعد کافر بنا دینگے ۴۸۷

خانہ کعبہ کا حج کبھی نہ رکے گا

شرط کے ماتحت) اللہ کے لئے اس مقدس گھر کا حج کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔ ہر ایک مقدس مقام پر کوئی نہ کوئی زمانہ ابتلا کا بھی آجاتا رہا ہے۔ بیت المقدس کو کس شان وشوکت کے ساتھ سلیمان علیہ السلام نے بنایا۔ مگر تھوڑا ہی عرصہ بعد اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی حج اور زیارت کہاں کی؟ اسی طرح پر دنیا کے کل مقدس مقامات ایک نہ ایک وقت اپنے مخالفوں کے ہاتھ میں پڑ کر تباہ و برباد ہو گئے ہیں تو اس کے قیام کی طرف اشارہ فرمایا۔ کہ یہ نہ صرف ہمیشہ کے لئے قایم رہیگا۔ بلکہ اس کا حج بھی لوگ ہمیشہ کرتے رہینگے۔ گویا کسی وقت یہ اپنے مخالفوں کے ہاتھ میں نہ پڑیگا۔ اور یہ خصوصیت بھی ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو شروع سے قایم رکھا ہے۔ چنانچہ جب خانہ کعبہ کے اندر بت بھی تھے اور اس کے متولی مشرکانہ عقاید رکھتے تھے۔ اس وقت بھی جب ایک عیسائی بادشاہ نے اس پر چڑھائی کی اور اُس کو تباہ کر کے اس کے حج اور زیارت سے لوگوں کو روکنا چاہا۔ اور اس وقت اس کے متولیوں میں اس بادشاہ کی فوجوں سے مقابلہ کی کچھ بھی طاقت نہ تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایسے سامان پیدا کر دیئے۔ کہ وہ بادشاہ مع اپنی ساری فوج کے تباہ ہو گیا۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک نشان ہے کہ ایک عالمگیر جنگ کے اندر بھی جب خود وہ سلطنت بھی جنگ میں مبتلا تھی۔ جو اسکی اصل متولی ہے۔ یعنی ترکی قوم۔ خانہ کعبہ کا حج نہیں رکا۔ اس آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے ومن کفر فان اللّٰہ غنی عن العالمین یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ بڑے بڑے لوگ اس کا کفر بھی کرینگے مگر وہ اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکینگے۔ اگلی آیت میں صاف بتا دیا کہ یہ بڑے بڑے کفر کرنے والے اہل کتاب ہی ہیں۔ بعض نے یہاں کفر سے مراد صرف اس رکن کا کفر لیا ہے +

خانہ کعبہ دشمن کے قبضہ میں نہ جائے گا۔

عَوَج - عِوَج

۴۸۶ عِوَجًا۔ عَوَج قایم رہنے کی حالت سے مڑ جانے کا نام ہے (غ) یعنی ٹیڑھا پن اور عَوَج اور عِوَج میں فرق یہ ہے کہ عَوَج اس شی میں خاص پر بولا جاتا ہے جو آنکھ سے دیکھا جا سکے جیسے گڑی ہوئی لکڑی کا ٹیڑھا ہونا یا دیوار کا ٹیڑھا ہونا وغیرہ۔ اور عِوَج اس ٹیڑھا پن پر بولا جاتا ہے جس کا ادراک فکر اور بصیرت سے ہو (غ)۔ جیسے دین معاش وغیرہ کے معاملہ میں اور تبغونہا عِوَجا کی تقدیر ہے تبغون لھا عِوَجا۔ کیونکہ بغی ایک مفعول کو چاہتا ہے۔ اور جب دوسرا مفعول آئے تو لام بڑھایا جاتا ہے۔ اور بعض نے عِوَجًا کو حال لیکر ذا عِوَج معنی کئے ہیں یعنی تم اس کو تلاش کرتے ہو ٹیڑھے رہ کر سچی بات میں وساوس کا پیدا کرنا اس میں ٹیڑھا پن چاہنا ہے +

طوع
طاعة
اَطَاعَ

۴۸۷ تطیعوا۔ طَوْع۔ اِنقیاد یعنی برضا و رغبت فرمانبرداری ہے اور اس کی ضد کُرہ یا ناپسندیدگی ہے (غ)۔ ابھی آچکا ہے لہ اسلم من فی السموات والارض طوعًا وکرھًا اور طاعة اور طوع ایک ہی ہیں مگر طاعة کا اکثر استعمال اس طرح ہے کہ جو حکم دیا گیا تھا اسے بجالایا اور جو طریق مقرر کر دیا گیا تھا اس پر چلا (غ)۔ اور اَطَاعَ کے معنی ہیں ایک امر کی پیروی کی اور اس کی مخالفت نہ کی (ت)۔ یا اسکے معنی ہیں لان وانقاد (ت)۔ اس کے لئے نرم ہو گیا اور اس کا منقاد ہو گیا +

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ ۱۰۰

اور تم کس طرح کفر کرسکتے ہو حالانکہ تم وہ ہو کہ تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول ہے اور جو شخص

يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۠

اللہ کے ذریعہ اپنے آپکو بچاتا ہو وہ یقیناً سیدھی راہ کی طرف ہدایت پا گیا ۴۸۸

کفار کی اطاعت یہاں اہل کتاب کی اطاعت سے روکا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ان کی اطاعت کروگے تو وہ ایمان کے بعد تمہیں کافر بنا کر چھوڑیں گے۔ کسی دوسرے کی اطاعت یہ ہے کہ انسان برضا ورغبت جو وہ کہے مانتا چلا جائے اور جو وہ کرے اسی طرح کرتا چلا جائے۔ پس اطاعت صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہی ہوسکتی ہے۔ یا اولوا الامر کی جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا صرف انہی کے حکم کے ماتحت کسی دوسرے کا حکم مانا جا سکتا ہے۔ اس لئے کفار کی اطاعت فی الواقع کوئی نہیں۔ اور سیاق عبارت کو دیکھا جائے تو اوپر ذکر شکوک وشبہات کا تھا۔ پس یہاں اطاعت سے مراد ان کے انہی وساوس کا قبول کرنا ہے مطلب یہ ہے کہ بعض بے ایمانوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ایک وسوسہ دل میں پیدا کر دیا انسان اگر اسکے پیچھے لگ جائے اور خود غور سے کام نہ لے تو ہلاک ہو جاتا ہے۔ ابن جریر نے مجاہد سے یہ روایت کی ہے کہ یہ آیت اوس اور خزرج کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی۔ اوس اور خزرج مدینہ کے دو بڑے قبیلے تھے جن میں مدت سے باہم جنگ چلی آتی تھی۔ جب یہ لوگ مسلمان ہو گئے تو پرانے کینے سب دور ہو گئے۔ اور جنگ بند ہو گئی۔ ایک دن ایک اوس اور ایک خزرج کا آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک یہودی آگیا اور اس نے موقعہ پا کر اوس اور خزرج کے پرانے جھگڑوں کا ذکر شروع کر دیا یہاں تک کہ یہ دونوں مسلمان ان واقعات کو یاد کر کے ایک دوسرے کے خلاف لڑنے کو تیار ہو گئے اور دونوں نے اپنی اپنی قوم کو پکارا جو ہتھیاروں سے نکل آئے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ لگا تو آپ ان کے درمیان آئے اور آپ کی وجہ سے سب لوگوں کا غضب جاتا رہا اور وہ نادم ہوئے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

عصم۔ اعتصام ۴۸۸ یعتصم باللہ۔ عَصَمَ کے معنی روک رکھنا۔ اور اعتصام کے معنی اپنے آپ کو روک کر بچا رکھنا ہیں (غ)۔ قرآن کریم میں آتا ہے لا عاصم الیوم من امر اللہ (ھود ۱۱-۴۳) آج کے دن کوئی شخص اللہ کے امر سے بچانے والا نہیں۔ ایسا ہی ما لھم من اللہ من عاصم (یونس ۱۰-۲۷) میں۔ اور معصوم وہ ہے جو بچایا گیا ہو۔ اور اسی مادہ سے عِصمت ہے جس کی تشریح آگے آتی ہے۔ اور فاستعصم (یوسف ۱۲-۳۲) میں استعصم کے معنی امام راغب نے کئے ہیں تَحَرّٰی مَا يَعْصِمُهٗ یعنی اس چیز کا قصد کیا جو اس کو بچائے۔ پس اعتصام باللہ سے مراد ہے اللہ کو پکڑ کر یعنی ذریعہ بنا کر اپنے آپ کو بچائے۔ اور اعتصام کے معنی کسی دوسری چیز کو پکڑنا بھی ہیں (غ) جیسا آگے آتا ہے واعتصموا بحبل اللہ (۱۰۲)

یہاں اہل کتاب کے ان وساوس سے بچنے کا طریق بتایا ہے کہ جب وہ ایسے وساوس ڈالیں تو ان کے اثر بد سے مسلمان اس طرح بچ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آیت ماقبل میں اطاعت سے مراد وساوس کے پیچھے لگنا ہے۔

ع ۵ / ۲
مسلمانوں کی کامیابی کی راہ

۱۰۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور تم نہ مرو سوائے اس حال کے کہ تم

۱۰۲ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

فرمانبردار ہو ۴۸۹ اور سب کے سب اللہ کے عہد کو مضبوط پکڑ لو ۴۹۰ اور تفرقہ نہ کرو ۴۹۰

کامیابی کا پہلا گر فرداً فرداً ذمہ داری کا احساس ہے

ع ۴۸۹ اسلام کے کمالات اور امتیازی نشانوں کا ذکر کرکے اب مسلمانوں کو بتایا ہے کہ وہ کن اصول کو مدنظر رکھ کر دنیا میں ایک کامیاب قوم بن سکتے ہیں اور اس رکوع میں کامیابی کے تین عظیم الشان گر بتائے ہیں جن میں سب سے پہلی بات ہے اتقوا اللہ حق تقاتہ تقوی اللہ کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں ع۱۰ یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق کی نگہداشت۔ یا ان حقوق اور ذمہ داریوں کی حفاظت جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ذمہ ڈال رکھی ہیں خواہ ان کی طرف شریعت ہدایت کرتی ہو یا عقل انسانی۔ گویا قوم کے ہر جزو کے اندر پہلے فرداً فرداً ذمہ داری کا احساس پیدا ہونا ضروری ہے اور یہی کامیابی کی عمارت کی خشت اول ہے۔ مگر صرف اس احساس کا پیدا ہونا بھی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ حق تقاتہ بڑھا کر بتایا کہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے قوم کے ہر فرد کو اپنی اپنی جگہ پر پورا زور لگانا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کا حق اس انسان نے ادا کر دیا جس نے اپنی طرف سے پورا زور لگا دیا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی فرماتا ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا پس اتقوا اللہ حق تقاتہ سے وہی مراد ہے جو فاتقوا اللہ ما استطعتم (التغابن ۶۴-۱۶) سے ہے۔ اور جن لوگوں نے پہلے الفاظ کو دوسرے الفاظ سے منسوخ سمجھا ہے انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے۔ اور اسی کے مطابق دوسری جگہ جہاد کا حکم ہے جاھدوا فی اللہ حق جھادہ (الحج ۲۲-۷۸) دونوں میں اپنی مقدرت کے مطابق زور لگانا ہے تکلیف مالا یطاق اس میں داخل نہیں اور آخر پر فرمایا کہ لا تموتن الا وانتم مسلمون جس میں یہ بتایا کہ تم پر کوئی آن ایسی نہ آئے کہ کامل فرمانبرداری کی حالت نہ ہو کیونکہ موت کا وقت تو مقرر نہیں اور یہ بھی بتا دیا کہ اتقوا اللہ حق تقاتہ سے مراد مسلم یا کامل فرمانبردار بننا ہے۔ اور مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے ہر ایک مسلم بچا رہتا ہے +

حَبْل

ع ۴۹۰ حبل اللہ حبل رسہ کو کہتے ہیں اور استعارۃ ہر ایک اس ذریعہ یا سبب پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس سے کسی چیز کی طرف پہنچ سکیں استعیر للوصل ولکل ما یتوصل بہ الی شیء (غ)، والحبل العھد والذمۃ والامان یعنی حبل عہد اور ذمہ اور امان کو بھی کہتے ہیں (ل) اور حدیث دعا میں آتا ہے یا ذا الحبل الشدید جہاں حبل کے معنی ابن اثیر نے قرآن یا دین کئے ہیں۔

حبل اللہ

اور حبل اللہ کے معنی حضرت ابن مسعود سے سند صحیح سے قرآن مروی ہیں (د) اور ابو سعید خدری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی معنی روایت کئے ہیں کتاب اللہ حبل متین ممدود من السماء الی الارض۔ کتاب اللہ وہ مضبوط رسہ ہے جو آسمان سے زمین تک ممتد ہے (ث) اور حضرت علی کی روایت میں نبی کریم صلعم نے جب فرمایا کہ فتنہ ہوگا تو دریافت کیا گیا اس سے نجات کی راہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا کتاب اللہ فیہ نبأ ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم وھو حبل اللہ المتین (عق) یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب جس میں تم سے پہلے کی اطلاع اور تم سے بعد کی خبر اور جو اختلاف تمہارے درمیان ہو اس کا فیصلہ ہے۔

تفرّق

تفرقوا۔ فرق۔ جمع کے خلاف ہے اور اسی سے تفرّق ہے۔ جو جماعت کے خلاف ہے۔ اختلاف کے ساتھ جماعت رہ سکتی ہے لیکن تفرقہ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ تفرقہ میں دو چیزیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور باہم ان کا تعلق نہیں رہتا +

کامیابی کا دوسرا گر اتحاد قومی ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی کا دوسرا گر بتایا ہے اور وہ اتحاد اور جماعت کا رنگ ہے کتنا بھی افراد قوم کے اندر انفرادی ذمہ داری کا احساس موجود ہو صرف اس سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جبتک کہ افراد قوم کے اندر ایک

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ
اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم باہم دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں اُلفت ڈال دی

فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ
تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہوگئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تم کو اس سے

مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○
بچالیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی باتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ ۴۹۱

اجتماعی رنگ پیدا نہ ہو۔ وہی کوشش عظیم الشان نتائج پیدا کرسکتی ہے جس کے کرنے والی ایک قوم کی قوم ہو پس بتا دیا کہ انفرادی احسان اور انفرادی کوشش کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سب ملکر ایک کام کو کریں۔ اور یوں وحدت قومی کو کامیابی کا دوسرا اصول قرار دیا پھر یہ اصول وحدت نامکمل ہوتا اگر یہ نہ بتایا ہوتا کہ وہ کونسی خاص بات ہے جس پر اس اتحاد کی بنیاد رکھی جائے پس کمال بلاغت سے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اتحاد اسلامی کی بنیاد حبل اللہ یعنی قرآن کریم ہے۔ اس میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ قرآن شریف کے متعلق مسلمانوں کا کبھی باہم اختلاف نہ ہوگا اور سب کے ہاتھ میں ایک ہی قرآن کریم ہوگا۔ کیونکہ اتحاد کی بنیاد اسی چیز پر ہوسکتی ہے جس کے بارہ میں اختلاف کوئی نہ ہو اور یہ کس قدر صداقتِ اسلام کی ایک بین شہادت ہے کہ آج تیرہ سو سال گزر جانے پر سارے عالم اسلامی میں سنی شیعہ۔ خارجی سب کے ہاتھ میں قرآن شریف ایک ہی ہے اور ایک زیر و زبر تک کا فرق نہیں۔ وہ مذہب جو مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ساری روئے زمین پر پھیلا ہوا ہے جس کے پیرو ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ایک دوسرے کے حالات سے ناواقف ہیں وہ سب قرآن کریم ایک ہی اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اس لئے جہاں مسلمانوں کو ان کی کامیابی کا گر بتایا ہے وہیں درحقیقت یہ بھی پیشگوئی کر دی ہے کہ قرآن کریم پر مسلمانوں کا کبھی اختلاف نہ ہوگا +

قرآن پر مسلمانوں کا اتحاد

پس اس اتحاد کے ہوتے ہوئے اگر مسلمان باہم تفرقہ کریں تو کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ ان کے پاس اتحاد کی ایک ایسی محکم بنیاد ہے جو دنیا کی کسی قوم کے پاس نہیں۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ بعض لوگوں نے اتحاد کی اس بنیاد کو چھوڑ کر اپنی اپنی روایات کو اصل بنیاد قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ ایک فرقہ کی روایات مثلاً اہل تشیع کی روایات کو دوسرا فرقہ تسلیم نہیں کرتا پس جب امر متحد کو چھوڑ کر امر مختلف فیہ کو بنیاد قرار دیا جائیگا تو نتیجہ لازماً تفرقہ ہوگا اسی لئے ساتھ ہی فرمایا ولاتفرقوا یعنی تفرقہ سے بچنے کی یہی راہ ہے +

قرآن کے بنیاد اتحاد ہونے سے منشاء

قرآن کریم کو بنیاد اتحاد قرار دینے سے کیا منشاء ہے؟ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے تمام اصولی امور کو جن کی ضرورت دین کو ہے اپنے اندر جمع کر لیا ہے۔ اور تمام اختلافات کا فیصلہ درحقیقت اس قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ اس لئے جب قرآن شریف کو اتحاد کی بنیاد مانا جائیگا۔ تو تمام روایات کو جو کسی فرقہ کے ہاتھ میں ہوں اصول قرآنی پر پرکھا جائیگا اور جو روایت قرآن کریم کے خلاف ہو اسے ترک کرنا ہوگا۔ یہ ایک بڑی سیدھی راہ ہے جس پر مسلمانوں کا اتحاد قایم رہ سکتا ہے۔ پھر قرآن کریم ہماری تمام تعلیم و تعلم کا اصل سرچشمہ ہونا چاہیے ہر ایک مسلمان اور کچھ جانے یا نہ جانے مگر قرآن ضرور جانتا ہو مگر آج اسکے خلاف یہ نظر آرہا ہے کہ جس چیز کو مسلمان نہیں جانتے وہ قرآن ہی ہے

شفا

۴۹۱ شَفَا۔ کوئیں یا دوسری چیز کا شفا اس کے کنارہ کو کہتے ہیں اور ہلاکت سے قریب ہونے کو اس کے ساتھ مثال دی جاتی ہے (غ)، شَفَةٌ (ہونٹ)، شفا سے چھوٹا ہے +

شَفَة

نار

نَار۔ نار آگ کو بھی کہتے ہیں جو حواس کے لئے ظاہر ہو اور مجرد حرارت کو بھی کہا جاتا ہے اور نار جہنم کو بھی اور نار حرب یعنی جنگ

۱۰۳ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ

اور چاہئے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں ۴۹۲

کی آگ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے اوقدوا نارا للحرب میں (المائدہ ۵-۶۴) (غ)

انقاذ — انقذ - انقاذ - ہلاکت سے بچا لینے کا نام ہے (غ)

قرآن میں اتحاد پیدا کرنے کی طاقت — اس حصہ آیت میں مسلمانوں کو یہ توجہ دلائی ہے۔ کہ ہم نے جو تم کو حبل اللہ یعنی قرآن کو اپنے اتحاد کی بنیاد قرار دینے کو کہا ہے تو یہ اس لئے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی طاقت رکھی ہے کہ یہ سخت سے سخت دشمنوں کو بھی بھائی بھائی بنا دیتا ہے۔ عرب کی قومیں اور قبیلے جن کی دشمنیوں پر صدیاں گزر کر ایک دوسرے کی عداوت اب ان کے خونوں میں داخل ہو چکی تھی۔ اور دن رات وہ ایک دوسرے سے جنگ پر آمادہ رہتی تھیں گویا آگ کے گڑھے میں گر کر بالکل بھسم ہو جانے کو تھیں۔ بیس سال کے عرصے میں قرآن کریم نے ان کے اندر ایک ایسا اتفاق اور ایسی اخوت پیدا کر دی کہ جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں۔ پھر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایسی پاک کتاب کے پاس ہوتے ہوئے مسلمان ایک دوسرے کی تخریب کے درپے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو ہی دنیا سے نابود کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے حصہ میں دعویٰ تھا کہ قرآن کریم تم میں اتحاد پیدا کر سکتا ہے دوسرے حصہ میں دلیل ہے کہ عرب جیسی جنگجو قوموں کے اندر اس نے اتحاد پیدا کر کے دکھا دیا

کامیابی کا تیسرا گر دعوت الی الاسلام ہے — ۴۹۲ اس آیت میں کامیابی کا تیسرا اصول دعوت الی الخیر کو بیان فرمایا ہے اور منکم کہکر بتا دیا کہ قوم میں ایک گروہ ایسا رہنا چاہئے اس کی وجہ دوسری جگہ مذکور ہے ما کان المومنون لینفروا کافۃ (التوبۃ ۹-۱۲۲) یعنی سب کے سب اس کام کیلئے نہیں نکل سکتے۔ دعوت الی الخیر کیا ہے۔ اس سے مراد دعوت الی الاسلام یا دعوت الی القرآن ہے دوسری جگہ خود قرآن کو خیر فرمایا دیکھو البقرہ ۱۰۵ اور ۱۳۷ اور خیر کے معنی بھلائی ہیں۔ اور حقیقی بھلائی کی سب راہیں قرآن کریم میں ہی ہیں۔ اس لئے ارشاد الٰہی یہاں یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی موجود رہے جو دعوت الی الاسلام کے کام میں لگی رہے۔ ابتدائے اسلام کا زمانہ تو وہ تھا کہ ہر ایک مسلمان کے اندر ایک ایسی روح دعوت الی الاسلام کی پھونکی گئی تھی کہ وہ سب کے سب ہی داعیان اسلام تھے۔ اور اس جوش اور تڑپ کو لیکر وہ دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف شہروں اور جزیروں میں نکل گئے اور تھوڑے ہی سالوں میں دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا یعنی اسلام کا نام دنیا کے دور دور کے ملکوں میں روشن کر دیا ہر ملک اور ہر شہر میں اسلام کا جھنڈا لگا دیا۔ پھر بعد اس کے ایک ایسا زمانہ آیا کہ بادشاہوں اور امراء کی توجہ دعوت الی الاسلام کی طرف سے کم ہو کر وہ تو اپنے تعیشات میں گرفتار بلا ہو گئے۔ علماء کی توجہ بھی زیادہ تر فروعی اختلافات میں صرف ہونے لگی پھر بھی بہت سے خدا کے بندے ان تمام جھگڑوں سے الگ ہو کر دعوت الی الاسلام کے کام میں لگے رہے۔ بہت سے وہ بزرگ جن کے ناموں پر آج ہزار ہا لوگ قربان ہوتے ہیں۔ ان کی یہ عزت محض اسلام کی خدمتگزاری سے ہوئی۔ وہ درحقیقت روحانی بادشاہ تھے۔ اور جب دنیوی بادشاہوں نے دعوت الی الاسلام کے کام کو چھوڑ دیا تو ان روحانی بادشاہوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ مگر یہ کس قدر افسوسناک نظارہ ہے کہ آج ان داعیان اسلام کی گدیاں محض دنیا کے چند پیسے کمانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اور

موجودہ گدیاں — ہر ایک گدی جس میں ہزاروں اور لاکھوں کی آمد ہے وہ چند لوگوں کے پیٹ بھرنے یا ان کے تعیش کا سامان پیدا کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اور نہ صرف دنیا کی بحث اور دنیوی جھگڑوں میں ہی گرفتار بلا ہو رہی ہے بلکہ طرح طرح کی بدعات میں مبتلا ہو کر خود مسلمانوں کو چاہ ضلالت میں گرا رہی ہے اور دعوت الی الاسلام کا وہاں نام بھی نہیں۔ کیسے کیسے پاک اصول فلاح کے مسلمانوں کو اس پاک کتاب کے اندر دیئے گئے تھے۔ دوسرے لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور کامیابیاں حاصل کیں۔ مگر مسلمانوں نے ان قومی اتخذوا هذا القرآن مهجورا کا مصداق اپنے آپ ہی کو ثابت کر دکھایا

وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○

اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں اور وہی کامیاب ہونیوالے ہیں ۱۴۹۲

دعوت الی الاسلام کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے کیوں دعوت الی الاسلام کے کام کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اسلام میں ایک جماعت کا موجود رہنا ضروری قرار دیا ہے جو دعوت الی الاسلام کے کام میں ہی لگی ہوئی ہو۔ اس جماعت کے افراد کی زندگیوں کا مقصد اصلی اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے سوائے اور کچھ نہ ہو۔ اس لئے کہ بغیر اس کے مسلمان قوم ایک زندہ قوم نہیں رہ سکتی۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے۔ کہ جس قوم نے اپنی ترقی کے لئے اپنی تعداد کو بڑھانے کے لئے جدوجہد ترک کر دی ہے۔ اس میں تنزل اور انحطاط شروع ہوگیا ہے۔ زندگی کے آثار اس میں سے دور ہو گئے ہیں۔ اور وہ آخرکار مردگی کی حالت تک پہنچ گئی ہے۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا تنزل ان کی سلطنت اور حکومت کے جاتے رہنے سے ہوا ہے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ مسلمانوں کا تنزل اس وقت سے شروع ہوا ہے۔ جب سے اُنہوں نے دعوت الی الاسلام کے کام کی طرف کم توجہی کر دی ہے۔ اور سلطنتوں کا جاتے رہنا محض اس کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے۔ پھر جب مسلمان دعوت الی الاسلام کے کام پر پوری توجہ کرینگے تو پھر وہی کامیابیاں اور وہی شان و شوکت اُن کے لئے ہوگی جس کا وعدہ اولٰئک ھم المفلحون میں ہے +

مجدد صدی کا دعوت الی الاسلام کے لئے جماعت تیار کرنا

اس زمانہ میں جب دعوت الی الاسلام کے کام کی طرف سے اکثر مسلمان غافل ہو رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو اپنی جناب سے یہ الہام کیا کہ وہ ایک جماعت اس غرض کے لئے تیار کریں۔ اور یہ بھی ان کو الہام کیا کہ بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں برمنار بلند تر محکم افتاد جس میں درحقیقت وہی وعدہ ہے جو اولٰئک ھم المفلحون میں ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو دیا گیا ہے چنانچہ آپ نے بارہا یہ اعلان کیا۔ کہ میرے آنے کی اصل غرض یہی ہے۔ کہ تا اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔ اور آپ جو اقرار اس سلسلہ میں داخل ہونے والوں سے لیتے تھے یا جو اقرار اب آپ کے جانشین لیتے ہیں وہ یہی ہے کہ "میں دین کو دُنیا پر مقدم رکھونگا"۔ اس اقرار کا اصل منشا بھی یہی ہے کہ ایک ایسی جماعت تیار ہو جن کی متحد غرض خدمت دین ہو۔ گویا آپ نے مسلمانوں کے اندر اس حکم کی تعمیل کیلئے ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ایک جماعت بنانی چاہی ہے۔ پس ہر ایک شخص جو اس جماعت میں داخل ہوتا ہے وہ درحقیقت یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا اصل نصب العین صرف دعوت الی الاسلام رکھے گا۔ اور ظاہر ہے کہ بغیر ایک جماعت اور نظم و اتحاد کے کوئی کام ہو نہیں سکتا۔ جو لوگ اس کام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں وہ اسلام کی خیرخواہی نہیں کرتے کیونکہ جس قدر یہ جماعت ترقی کرے گی اسی قدر دعوت الی الاسلام کا کام بھی ترقی کریگا +

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

۱۴۹۲ دعوت الی الاسلام کے ساتھ دو باتیں اور بیان فرمائی ہیں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ معروف وہ کام ہے جسے فطرت انسانی پہچانتی ہے یعنی نیک کام اور منکر وہ ہے جس سے فطرت انکار کرتی ہے یعنی بُرا کام۔ بدترین حالت کسی قوم کی وہ ہوتی ہے جب اپنے لوگوں کو بُرا کرتے دیکھیں اور اس سے روکیں نہیں یہودیوں کی بدترین حالت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ (المائدہ - ۷۹) اور گو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر ایک مسلمان کے فرائض میں سے ہے۔ مگر دعوت الی الاسلام کا کام کرنے والے گروہ کے فرائض میں اسے خصوصیت سے داخل فرمایا ہے حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر افضل الجہاد ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا خدا کی زمین میں اس کا خلیفہ اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے۔ اسلام کا یہ فخر تھا۔ کہ اس میں چھوٹے سے چھوٹا انسان بڑے سے بڑے کو نصیحت کر سکتا تھا۔ اور اُس کی غلطی پر اسے بیدھڑک آگاہ کر سکتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق جیسا کامل راستباز خلافت کے منصب پر آتے ہی کہتا ہے فان زغت فقوّمونی

۱۰۴ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا اسکے بعد کہ ان کے پاس کھلی باتیں آچکی تھیں اور انہی

۱۰۵ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ

کیلئے بھاری عذاب ہے ت‍۴۹۳ جس دن (کچھ) منہ سفید ہونگے اور (کچھ) منہ سیاہ ہونگے ت‍۴۹۴

اگر میں کجروی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کرو۔ فاروق جیسے رعب والے انسان کے سامنے ایک بڑھیا یوں کہہ سکتی ہے کہ یا ابن الخطاب اللہ یعطینا و انت تمنعنا قرآن تو عورتوں کے مہر کے متعلق فرماتا ہے ان اٰتیتم احدٰھن قنطارا فلا تاخذوا منہ شیئا۔ اور آپ کہتے ہیں بڑے بڑے مہر نہ دو۔ تو حضرت عمر اپنی رائے سے رجوع کرتے ہیں لیکن آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ہر حلقہ میں ایک پیر یا گدی نشین ہے۔ اور اس کا حکم ان کے لئے خدا کے حکم کے قایم مقام ہے۔ اس کو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم میں یہ غلطی ہے۔ یا فلاں بات تم نے ٹھیک نہیں کہی۔ گویا دعوت الی الاسلام کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ان کے درمیان سے اٹھ گئے ؀

حاشیہ	
پہلے مذاہب کا تفرقہ اور اصولی اختلاف	ت‍۴۹۳

ت‍۴۹۳ اس آیت میں یہود و نصارٰی کا بلکہ سب پہلے مذاہب کا ذکر ہے اور دو باتیں الگ الگ بیان کی ہیں ایک یہ کہ انہوں نے تفرقہ کیا اور دوسرے یہ کہ اختلاف کیا۔ تفرقہ سے مراد ان کی پراگندگی ہے یعنی الگ الگ راہوں پر ہو جانا اور کسی اصول پر متحد نہ رہنا۔ چنانچہ تمام مذاہب جو اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں ان میں اس قدر تفرقہ موجود ہے کہ باہم اصول میں وہ اختلاف رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنے دین سے خارج قرار دیتے ہیں (گو بعض مسلمانوں نے بھی حماقت سے باوجود اصول میں متحد ہونے کے ایک دوسرے کو کافر و بیدین کے فتوے دینے شروع کئے ہوئے ہیں) اور اختلاف کو چونکہ اس سے علیحدہ بیان کیا ہے۔ اس لئے یہ اختلاف تعلیم حقہ سے ہے یعنی وہ سب کے سب فرقے تعلیم حقہ سے اختلاف کر رہے ہیں اور اس پر من بعد ما جاءھم البینات سے بھی شہادت ملتی ہے کہ منشا تعلیم حقہ سے اختلاف کرنا ہے اور بینات سے مراد اسلام کی صداقت کے دلائل ہیں جن میں سے بہت سی اسی سورت میں بیان ہو چکے ہیں ؀

حاشیہ	
مونہوں کی سفیدی اور سیاہی سے مراد	ت‍۴۹۴

ت‍۴۹۴ تبیض وجوہ وتسود وجوہ - سفیدی اور سیاہی اصل رنگوں میں سے ہے۔ لیکن عزت اور ذلت پر بھی ان لفظ کا استعمال ہے جیسا کہ مفردات میں ہے لما کان البیاضُ افضلَ لونٍ عندھم۔۔ عُبِّرَ عن الفضل والکرمِ بالبیاضِ حتی قیل لمن لم یَتَدَنَّسْ بمعابٍ ھو ابیضُ الوجہِ یعنی چونکہ سفید عرب کے نزدیک سب سے افضل رنگ ہے اس لئے بیاض سے مراد فضل و کرم ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص عیب سے آلودہ نہ ہو اس کو ابیض الوجہ یا سفید منہ والا کہا جاتا ہے۔ اور پھر اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے ابیضاضُ الوجوہِ عبارۃٌ عن المسرّۃِ و اسودادھا عن الغمّ۔ یعنی مونہوں کی سفیدی کے معنی خوشی ہیں اور سیاہی سے مراد غم ہے۔ مفسرین میں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو اسی طرف گیا ہے اور دوسرا گروہ لفظی سفیدی اور سیاہی مراد لیتا ہے مگر خود قرآن کریم نے اس محاورہ کو دوسری جگہ استعمال کر کے بتا دیا ہے کہ اس کا منشاء کیا ہے جہاں فرمایا واذا بشر احدھم بالانثی ظل وجھہ مسودا (النحل - ۵۸) جب لڑکی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ فی الواقع سیاہ نہیں ہوتا۔ بلکہ مراد مغموم ہونا ہے اور لکھا ہے کہ جب حضرت امام حسن نے حضرت معاویہ کو امارت سپرد کر دی تو ایک شخص نے کہا یا مسود وجوہ المومنین (اے مومنوں کے منہ سیاہ کرنے والے)۔ جو لوگ ظاہر کی طرف گئے ہیں انہوں نے بھی مراد نور اور ظلمت کا مونہوں پر ہونا لیا ہے ؀

فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ

پس جن لوگوں کے مُنہ سیاہ ہوئے کیا تم اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے ؟ سو تم عذاب چکھو

بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ ۱۰۶

اس لئے کہ تم کفر کرتے تھے [۴۹۵] اور جن کے منہ سفید ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہیں وہ

فِيهَا خَالِدُونَ ۝ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا ۱۰۷

اسی میں رہینگے [۴۹۶] یہ اللہ کی باتیں ہیں جن کو ہم تجھ پر حق کیساتھ پڑھتے ہیں اور اللہ جہانوں کیلئے ظلم کا ارادہ

لِلْعَالَمِينَ ۝ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝ كُنْتُمْ خَيْرَ ۱۰۸ ۱۰۹

نہیں کرتا اور اللہ کیلئے ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کی طرف ہی (سب) کام لوٹائے جاتے ہیں تم سب سے

أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ

اچھی اُمت ہو جو لوگوں (کی بھلائی) کیلئے ظاہر کی گئی ہے تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو [۴۹۷]

(حاشیہ: ۱۲ ع ۱۱ — خیر الامم اور اس کے تعلقات کیسے دین سے)

---

[۴۹۵] اکفرتم بعد ایمانکم سے کون لوگ مراد ہیں ؟ منافقوں کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ بلکہ ذکر پہلے لوگوں کا ہے جنہوں نے تفرقہ کیا اور دین حق سے اختلاف کیا۔ اس لئے ایمان سے مراد اُن کا پہلے انبیاء پر ایمان ہوگا اور کفر سے مراد دین اسلام سے انکار بعض نے بعد ایمانکم کی تاویل یوں کرلی ہے کہ بعد اسکے کہ تمہارے لئے وہ امور ظاہر ہوگئے جنکا تقاضا یہ تھا کہ تم ایمان لاتے ہو۔

[۴۹۶] ففی رحمۃ اللہ۔ یہاں جنت کی بجائے رحمۃ اللہ کا لفظ اختیار کیا ہے اور اسی میں خلود بتایا ہے۔ سچ ہے کہ اللہ کی رحمت ہی مومن کی حقیقی جنت ہے۔ اور اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا کہ انسان جنت میں اپنے اعمال سے داخل نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی رحمت اور فضل سے ہی جنت ملتی ہے ۔

کان — [۴۹۷] کنتم۔ یہاں کنتم کے استعمال کی کئی ایک توجیہیں کی گئی ہیں بعض نے کہا ہے کنتم فی علم اللہ تم اللہ کے علم میں بہترین اُمت تھے بعض نے کہا کنتم فی الامم قبلکم مذکورین بانکم خیر امۃ یعنی پہلی اُمتوں میں تمہیں بہترین اُمت کے نام سے یاد کیا گیا۔ جیسا کہ ذالک مثلہم فی التورٰۃ ومثلہم فی الانجیل (الفتح ۴۸ - ۲۹) سے ظاہر ہے اور بعض نے کان کو زائد کہکر معنی انتم خیر امۃ کئے ہیں مگر دیکھو [۲۷۲] جہاں دکھایا گیا ہے کہ وصف لازم کسی چیز کا ذکر کرنے کیلئے بھی کان کا استعمال ہوتا ہے۔ پس یہاں خیر ہونا گویا اس اُمت کا وصف لازم قرار دیا گیا ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ تم بہترین اُمت ہو اور ہمیشہ بہترین اُمت ہی رہو گے ۔

خَرَجَ — اخرجت۔ خَرَجَ کے معنی ہیں اپنی قرارگاہ یا اپنی حالت سے ظاہر ہو گیا یا نکل آیا خواہ اس کی قرارگاہ گھر ہو یا شہر یا لباس اور خواہ اس کا حال۔ اپنے نفس میں اس کی کوئی حالت ہو یا اسباب خارجی میں (غ)۔ یہاں اخرجت کے معنی اظہرت کئے گئے ہیں یعنی ظاہر کئے گئے (ل) ۔

اُمت محمدیہ کا کام دوسروں کی تکمیل ہو — للناس۔ یہاں لام انتفاع کے لئے ہے یعنی تمہارا ظہور لوگوں کی بھلائی کے لئے ہے۔ اسی لئے آگے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر کیا ہے یعنی تمہارا کام دنیا میں نیکیوں کی تعلیم دینا اور نیکیوں پر لوگوں کو قائم کرنا اور بدیوں سے روکنا ہے۔

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ط

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو یقیناً ان کے لئے اچھا ہوتا

اور اسی لئے تومنون باللہ کو جو کمال نفس کا مرتبہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے جو دوسروں کی تکمیل کے لئے ہے پیچھے رکھا ہے کیونکہ اصل غرض یہاں یہی ظاہر کرنے کی ہے کہ تمہارا کام دوسروں کی تکمیل ہے۔ اور تومنون باللہ یا ان کے اپنے کمال نفس کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ تا یہ معلوم ہو کہ وہ ایسی باتیں دوسروں کو نہیں کہتے جو خود نہ کرتے ہوں۔ بلکہ اگر دوسروں کی تکمیل چاہتے ہیں تو اپنے نفس کی تکمیل بھی کرتے ہیں ٭

امت کی فضیلت

اس آیت میں مسلمانوں کو بہترین اُمت قرار دیا گیا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے ہے مگر اول تو یہاں لفظ کان کا استعمال اس کے خلاف ہے۔ دوسرے کوئی وجہ اس قید کی نہیں۔ تیسرے حدیث سے بھی ثابت ہے کہ ساری اُمت کو ہی خیر الامم کہا ہے چنانچہ امام احمد نے یہ حدیث روایت کی ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعطیت مالم یعط احد من الانبیاء نصرت بالرعب واعطیت مفاتیح الارض وسمیت احمد وجعل التراب لی طہورا وجعلت امتی خیر الامم یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے وہ کچھ دیا گیا جو اور کسی نبی کو نہیں دیا گیا میری نصرت رعب سے کی گئی اور مجھے زمین کے خزانے دیئے گئے اور میرا نام احمد رکھا گیا اور میرے لئے مٹی پاک کرنے والی بنائی گئی اور میری اُمت بہترین اُمت بنائی گئی۔ بیشک صحابہ رضی اللہ عنہم خود اس اُمت میں سے بھی بہترین گروہ ہے اور اس کی شہادت قرآن کریم سے ملتی ہے کہ ان کو رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کی سند دی لیکن یہاں ساری اُمت کی افضلیت کا دوسری اُمتوں پر ظاہر کرنا مقصود ہے اور اگر اس اُمت کے معلم اور مزکی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے تمام روحانی معلموں اور مزکیوں سے افضل ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آنجناب کے شاگرد تمام انبیاء کے شاگردوں سے افضل نہ ہوں ٭

اس فضیلت کی وجوہات

یہ افضلیت کس بات میں ہے؟ اس کی وجہ خود بتادی ہے۔ ایک یہ کہ یہ اُمت دنیا کے تمام لوگوں کی بھلائی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ ہر ایک نبی کی اُمت زیادہ تر اپنی قوم کی بہتری میں ہی کوشاں رہی مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے قومیت کا نشان مٹا کر ان کو تمام لوگوں کی بھلائی چاہنے والے قرار دیا گیا وہ صرف مسلمانوں کا ہی بھلا نہیں چاہتے بلکہ ہر ایک قوم اور ہر ایک ملت کے لوگوں کا بھلا چاہنے والے ہیں قومی تفرقوں کو اسلام نے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا اور دوسری وجہ ان کی فضیلت کی ان کا آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہونا ہے یعنی بھلائیوں کا حکم دینے والے اور بدیوں سے روکنے والے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے انبیاء کی اُمتیں یہ کام نہ کرتی تھیں؟ اصل بات یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام انبیاء کا کام ہے۔ اور گو سابقہ اُمتیں بھی ایک حد تک اس کام کو کرتی تھیں مگر ان کا کام بہت محدود تھا۔ اور ایک رنگ میں محدود تھا اور پھر ان کے اندر وقتاً فوقتاً انبیاء کی بعثت بھی ہوتی رہتی تھی۔ مگر یہ انبیاء کا کام اب پہلے سے ایک نہایت وسیع پیمانہ پر اسی اُمت کے سپرد کیا گیا ہے۔ کل دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا۔ اور قوائے انسانی کی ساری شاخوں کی پرورش کرنا اور سب کا تزکیہ کرنا یہ وہ عظیم الشان کام ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی نبی نے بھی کر کے نہیں دکھایا چنانچہ سورۃ بقرہ میں اس وجہ افضلیت کو صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ جہاں فرمایا وکذلک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا (البقرۃ۔ ۱۴۳) یوں ہم نے تم کو اعلیٰ درجہ کی اُمت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے پیشرو بنو اور رسول تمہارا پیشرو ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اس اُمت کے علماء کو ورثۃ الانبیاء۔ انبیاء کے وارث اور کانبیاء بنی اسرائیل انبیائے بنی اسرائیل کے مثیل قرار دیا گیا ہے۔ اگر اس اُمت میں کسی نبی نے

مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ لَنْ یَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًىؕ وَاِنْ ۱۱۰

ان میں سے کچھ مومن ہیں اور ان میں سے اکثر بدعہد ہیں ۴۹۸ وہ تم کو سوائے ذرا سی تکلیف کے کچھ نقصان نہ پہنچا سکینگے اور اگر

یُّقَاتِلُوْكُمْ یُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ قف ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ ۝ ضُرِبَتْ ۱۱۱

وہ تم سے لڑینگے تو تمہارے سامنے پیٹھ پھیر لینگے پھر ان کو مدد نہ دیجائے گی ۴۹۹ ان پر

آگر بھی کام کرنا ہوتا تو اُمت کی بحیثیت اُمت افضلیت دیگر اُمم پر جاتی رہتی پس نہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسرائیلی اس اُمت کے اندر آکر کام کرسکتے ہیں کیونکہ اس طرح بھی اُمت کی فضیلت جاتی رہتی ہے اور نہ کوئی دوسرا نبی اس اُمت کے اندر پیدا ہوسکتا ہے کیونکہ اس طرح بھی اُمت کی فضیلت دوسری اُمم پر نہیں رہتی ۔

فضیلت کا ثبوت

اور یہ دعویٰ کہ تم بہترین اُمت یا خیر الامم ہو بلا ثبوت نہیں چھوڑا گیا جس ردی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کو پایا کیا بلحاظ عقاید کے اور کیا بلحاظ اعمال کے اور کیا بلحاظ جہالت کے ایسی بدترین حالت کی قوم اور کسی نبی کو اصلاح کے لئے نہیں دی گئی ۔ مگر باوجود ایسی ردی حالت میں پانے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی نے ان کو ایمانی اور عملی پہلو کے لحاظ سے اور تعلیم اور تہذیب کے لحاظ سے ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچایا کہ کسی نبی نے اپنی اُمت کو اس مقام پر نہیں پہنچایا ۔ وہ نہ صرف زہد و عبادت میں تمام دنیا کی قوموں سے آگے بڑھ گئے بلکہ ہر طرح کے اخلاق فاضلہ کے زیور سے آراستہ ہو کر ہر پہلو میں دنیا کے ہادی و رہبر بنے کیا فتوحات ملکی کے لحاظ سے کیا سیاست کے لحاظ سے ۔ کیا تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے ۔ کیا علوم کے لحاظ سے ۔ کیا تہذیب کے لحاظ سے ۔ کیا آزادی خیال کو قایم کرنے کے لحاظ سے اور کیا مساوات نسل انسانی کے قایم کرنے کے لحاظ سے ۔

اھل الکتاب

۴۹۸ اھل الکتاب ۔ اہل کتاب کا لفظ یوں تو وسیع معنی میں آتا ہے مگر اکثر جگہ صرف عیسائیوں اور یہودیوں کو اس سے خطاب کیا ہے ۔ اور بعض جگہ صرف عیسائیوں کو بھی اس سے خطاب کیا ہے مثلاً یا اھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم (النساء ۱۷۱) اور یہاں اہل کتاب سے صرف یہودی مراد ہیں جیسا کہ آیت ۱۱۱ کے مضمون سے ظاہر ہے جہاں الفاظ ضربت علیھم الذلۃ و باءوا بغضب من اللہ و ضربت علیھم المسکنۃ استعمال کر کے جو مخصوص طور پر یہود کی سزا کے بارہ میں سورۂ بقرہ میں آچکے ہیں صاف بتا دیا ۔ کہ یہاں انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کی یہ سزا پہلی سورت میں بیان ہو چکی ہے ۔ ایسا ہی الفاظ یقتلون الانبیاء بغیر حق سے بھی یہی ظاہر ہے کہ صرف یہود کا یہاں ذکر ہے کیونکہ قتل انبیاء کا الزام ہمیشہ انہی پر دیا گیا ہے ۔ علاوہ ازیں اب اس سورت کے مضمون کو جنگ اُحد کے واقعات کی طرف لانا ہے ۔ اور ان جنگوں میں ہمیشہ یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کو شرارت کا خطرہ رہتا تھا ۔ کیونکہ ایک بڑی یہودی آبادی مدینہ منورہ میں تھی ۔ اس لئے اس جنگ کی تمہید میں ان کے ساتھ تعلقات کا ذکر کر دیا ہے ۔ اور واقعات جنگ کے ذکر کے اختتام پر بھی یہودیوں کا ذکر ہے ۔ اور بجائے کافر کے فاسق اس لئے کہا کہ ان لوگوں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق عہد بھی لیا گیا تھا ۔

اذی

۴۹۹ ۔ اذی ۔ بمقابلہ ضرر خفیف کو کہا جاتا ہے دیکھو ۲۸۵ تکلیف دینے والی باتوں کو بھی اس سورت کے اخیر میں اذی کے نام سے موسوم کیا ہے ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذی کثیرا (۱۸۶) حدیث میں جمعہ کے دن لوگوں کے اوپر سے گزر کر آگے جانے کو بھی اذی کہا ہے ۔ اور رستہ میں چھوٹی چھوٹی تکلیف دینے والی چیزوں کو بھی اذی کہا ہے اماطۃ الاذی عن الطریق ۔

یہود کی شکست کی پیشگوئی

اس میں یہ پیشگوئی کی ہے کہ یہودیوں سے اہل اسلام کو کوئی زیادہ تکلیف نہ پہنچے گی ۔ اور اگر وہ مسلمانوں سے جنگ کرینگے

عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ

ذلت کی مار ہے جہاں میں وہ پائے جائیں سوائے (اسکے کہ) اللہ کے عہد اور لوگوں کے عہد کے ذریعہ سے (پناہ لیں) اور وہ

مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ

اللہ کے غضب کا محل ہوگئے اور ان پر مسکینی کی مار ہے ۵۰۰ یہ اسلئے کہ وہ اللہ کی باتوں کا انکار کرتے تھے اور

اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ ۱۱۲ لَيْسُوْا

نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے　　　یہ اسلئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے (سب) برابر

سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝

نہیں۔ اہل کتاب میں سے ایک گروہ (حق پر) قایم ہو جو اللہ کی آیتوں کو رات کی گھڑیوں میں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔

تو شکست کھائینگے اور اس کے آخر پر ثم لا ینصرون بڑھایا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ منافق اور مشرک ان یہودیوں کو یہ وعدے دیتے رہتے تھے کہ اگر تم جنگ کروگے تو ہم تمہاری مدد کرینگے جیسا کہ دوسری جگہ ذکر ہوا الم تر الی الذین نافقوا یقولون لاخوانہم الذین کفروا من اھل الکتاب لئن اخرجتم لنخرجن معکم ولا نطیع فیکم احدا ابدا و ان قوتلتم لننصرنکم واللہ یشھد انہم لکاذبون۔ (الحشر ۵۹-۱۱) سو انہی وعدوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ان کی مدد کیلئے وہ ہرگز نہ نکلیں گے بعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ جنگ میں شکست کھانے کے بعد پھر ان کی کبھی نصرت نہ ہوگی یعنی ایسا نہ ہوگا کہ شکست کھا کر پھر ہی غالب آجائیں بلکہ ہمیشہ کیلئے خذلان ہی انکے شامل حال رہیگا۔

ذلۃ　**۵۰۰** ذلۃ کے معنی ۹۱ میں بیان ہو چکے ہیں۔ گو یہ لفظ محض محکومیت پر بھی صادق آتا ہے مگر انتہا اس کی یہ ہے کہ ایسی قتل و غارت ان پر واقع ہو کہ کسی حالت میں آرام نہ ملے چنانچہ مفسرین نے بھی عموماً القتل والاسر وسبی الذراری مراد لیا ہے (ر) اور چونکہ محض محکومیت مسکنت میں شامل ہے اس لئے یہاں ذلت سے مراد یہی انتہائی ذلت قتل اور غارت کی ہے

حبل من اللہ　حبل کے معنی عہد اور ذمگی اوپر بیان ہو چکے ہیں ۴۹۰ حبل من اللہ سے مراد اللہ کا عہد یا ذمگی ہے یعنی حکومت اسلامی جیسا کہ امر اللہ سے بھی کئی جگہ حکومت اسلامی ہی مراد لی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان بموجب فرمان الٰہی ان سے معاملہ کرینگے اسلئے مسلمانوں کا عہد گویا اللہ کا عہد ہے۔ اور حبل من الناس سے لوگوں کا عہد یعنی کوئی غیر اسلامی حکومت مراد ہے۔

یہود کا انجام　اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہود کا انجام ذلت مسکنت اور اللہ کے غضب کے نیچے آجانا ہے اور یہی انجام ان کا دوسری جگہ سورۃ بقرہ میں بھی بیان ہو چکا ہے (البقرۃ ۲-۶۱) ذلت اور مسکنت ان کی دنیوی حالت کے متعلق ہے۔ اور غضب من اللہ انکی دینی حالت کے متعلق ہے۔ مگر ذلت یعنی قتل و غارت کی حالت سے وہ اس طرح سے نکل سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذمگی میں آجائیں۔ یعنی حکومت اسلامی کے ماتحت آجائیں اور یا کسی دوسری حکومت سے معاہدہ کرکے رہیں (وہاں بھی آو ہے) اور چونکہ غیر اسلامی سلطنتوں میں ان کو پورا آرام ملنا مقدر نہ تھا۔ اس لئے حبل من الناس کو بعد میں رکھا ہے۔ اور یا الناس سے مراد مسلمان ہیں یعنی اللہ کے عہد اور اہل اسلام کے عہد کے ذریعہ سے ہی یہ پورا امن حاصل کر سکینگے اور اس طرح وہ سے ان دونوں کو حکم واحد میں رکھا ہے۔ مگر مسکنت یا محکومیت سے اور اللہ کے غضب سے یہ کسی حالت میں نہ نکلیں گے۔

يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ ۱۱۳

وہ اللہ اور آخر کے دن پر ایمان لاتے ہیں اور اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کاموں سے

الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ۚ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ○

روکتے ہیں اور نیکیوں کو جلدی لیتے ہیں اور وہی نیکوں میں سے ہیں ع۱۰۵

قیام ع۱۰۵ قائمۃ۔ قیام مختلف معنی میں آتا ہے ایک قیام ایک وجود کا ہے جو تسخیر سے ہو یا اختیار سے تسخیر سے جیسے قائم وحصید (ھود۔ ۱۰۰) اختیار سے جیسے امن ھو قانت اٰناء الیل ساجدا و قائما (الزمر ۳۹۔ ۹) اور کسی چیز کا قیام اس کا نگاہ رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے یہی معنی یہاں ہیں اور ایک قیام کسی چیز پر عزم کر لینا ہے جس کی مثال ہے اذا قمتم الی الصلوٰۃ (غ) مفسرین نے

قائمۃ مستقیمۃ عادلۃ یا قائم بحق العبودیۃ (غق) یا مستقیمۃ علی طاعۃ اللہ (ر) معنی کئے ہیں یعنی حالت استقامت میں رہنے والی عادل۔ یا حق عبودیت کی حفاظت کرنے والی یا اللہ تعالیٰ کی طاعت پر استقامت اختیار کرنے والی جماعت +

اِنی۔ آنٰی اٰناء۔ اِنی یا اِنًی کی جمع ہو رات کی گھڑی۔ اور اَنٰی کے معنی ہیں ایک چیز اپنے وقت اور انتہا کو پہنچ گئی حان وأدرک اسی سے ہے الم یأن للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ (الحدید۔ ۱۶) اور اَنَی الحرُّ کے معنی ہیں گرمی اپنی انتہا کو پہنچ گئی یطوفون بینھا و بین

اٰنٍ حمیم اٰن (الرحمٰن ۵۵۔ ۴۴) اور عین اٰنیۃ (الغاشیۃ ۸۸۔ ۵) میں یہی معنی ہیں اور اسی سے اِنًی کے معنی پکنا ہیں غیر ناظرین انٰہ (الاحزاب ۳۳۔

اِناء۔ اٰنیۃ ۵۳) اور اِناء برتن کو کہتے ہیں جس کی جمع اٰنیۃ ہو ویطاف علیھم باٰنیۃ من فضۃ (الدھر ۷۶۔ ۱۵) (ل)

اہل کتاب کے مومن ان دو آیات میں اہل کتاب میں سے ایک گروہ کا ذکر کیا ہے مگر اہل کتاب میں سے ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ یہودیت کے مذہب پر ہیں بلکہ وہ لوگ جو ان میں سے نکل کر اسلام میں آ گئے تھے جن میں سے عبداللہ بن سلام اور اسد بن عبید اور ثعلبہ بن شعبہ وغیرہم ہیں جیسا کہ اس سورت کے آخر پر فرمایا وانّ من اھل الکتاب لمن یؤمن باللہ وما انزل الیکم وما انزل الیھم (آل عمران ۳۔ ۱۹۸) چونکہ پچھلی آیت میں یہود کی ذلت اور ان پر غضب کا ذکر تھا تو اس لئے اب فرمایا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی قوم کے ساتھ یہ کوئی خصوصیت ہے بلکہ یہ ان کے اعمال کی وجہ سے ہے اسی لئے اس دوسرے گروہ کا ذکر کر دیا جو اپنے اعمال و اعتقادات کی وجہ سے ان تمام باتوں سے نکل کر ایک اعلیٰ مقام پر پہنچ چکے ہیں +

یہاں ان لوگوں کی کچھ صفات بیان فرمائی ہیں۔ پہلی صفت یہ ہے کہ وہ مستقیم ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت پر استقامت اختیار کرنے والے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ رات کی گھڑیوں میں آیات اللہ کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ بھی مسلمانوں کا ہی خاصہ ہو تیسری صفت یہ ہے کہ وھم یسجدون جس سے مراد یا نماز ہی کیونکہ رکوع اور سجدہ کا دونوں لفظ بوجہ اپنی عظمت کے نماز پر بولے گئے ہیں اور یا یسجدون سے مراد یخضعون ہے یعنی خدا کے حضور جھکے رہتے ہیں یہ مراد نہیں کہ حالت سجدہ میں تلاوت آیات کرتے ہیں۔ کیونکہ نبی کریم صلعم سے روایت ہے الا نھیت ان اقرأ راکعاً وساجداً (غق) یعنی مجھے روکا گیا ہے کہ حالت رکوع یا حالت سجدہ میں قرآن شریف پڑھوں ان تین صفات کے بعد جو عمل سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے عقیدہ کا ذکر فرمایا اور چوتھی صفت ان کی یہ فرمائی کہ وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں ان الفاظ میں ہمیشہ قرآن شریف میں مسلمانوں کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ پانچویں صفت ان کی یہ ہے ۔ کہ دوسروں کی تکمیل کرتے ہیں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں او چھٹی یہ کہ ہر قسم کی بھلائیوں میں سبقت کرتے ہیں کیونکہ ان تمام امور کو ایک انسان اس حالت میں بھی کر سکتا ہے کہ سستی سے اور کمزوری سے ان کی طرف رغبت کرے مگر ان کی صفت یہ ہے کہ تمام بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں کہ پیچھے نہ رہ جائیں جس سے معلوم ہوا کہ ان کا دل ان باتوں کے اندر ہے +

۱۱۵ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ

اور جو کچھ وہ نیکی کرینگے تو اس کی ناقدری نہیں کی جائیگی اور اللہ متقیوں کو خوب جاننے والا ہے ۵۰۲ جنہوں نے

كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۗ وَاُولٰٓئِكَ

کفر کیا ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) کے سامنے انکے کسی کام نہ آئینگے اور وہی

۱۱۶ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ

آگ والے ہیں وہ اسی میں رہینگے ۵۰۳ اس کی مثال جو اس دنیا کی زندگی کے متعلق خرچ کرتے

الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

ہیں ایسی ہے جیسے ہوا جس میں سخت سردی ہو وہ ان لوگوں کی کھیتی کو پہنچے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے

فَاَهْلَكَتْهُ ۗ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

اور اسے تباہ کردے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے ہیں ۵۰۴

---

۵۰۲ یکفروہ ۔ کفر کے اصل معنی ستر الشئ یعنی کسی چیز کا ڈھانک دینا ہیں پس یہاں لن یکفروہ سے مراد ہے لن یحرموا ثوابہ یعنی اس کے ثواب سے محروم نہیں کئے جائینگے ۔ یا کفر بمقابلہ شکر ہے ۔ چونکہ پہلی دو آیات میں کامل صالحین کا نقشہ کھینچا تھا اس لئے اب بتایا ہے کہ ہر ایک اگر اس کمال کو حاصل نہ کرسکے تو جتنی بھی نیکی کرے اس کی بھی اللہ کے ہاں قدر ہے + — کفنا

۵۰۳ قریباً یہی الفاظ سورۃ آل عمران کے شروع میں بھی آئے ہیں جہاں خاص طور پر نصاریٰ مخاطب تھے دیکھو ۳۸۰ یہاں یہود اور مشرکین عرب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگیں کر رہے تھے خاص مخاطب ہیں +

۵۰۴ صِرّ ۔ صِرّ اور صِرَّۃ سردی کی شدت کا نام ہے (ل)، کیونکہ صَرّ کے اصل معنی شدّ یعنی کسکر باندھنا ہیں ۔ اور اسی سے اِضار ہے اور صُرّۃ یعنی تھیلی جس میں روپے باندھے جاتے ہیں اور ریح صِرٌّ اور ریح صَرْصَرٌ اس ہوا کو کہتے ہیں جس میں سخت سردی ہو یا بعض کے نزدیک سخت آواز ہو (ل)، اور زجاج نے صِرّ کو معنی صوت لہیب النار (ل) کہتے ہیں یعنی آگ کے شعلے کی آواز اور ابن عباس سے ایک روایت میں اس کے معنی نار یعنی آگ بھی آئے ہیں (غ)، مراد اس سے ایسی ہوا ہے جو بوجہ شدت سردی (یا بوجہ شدت گرمی کے) کھیتی کو تباہ کردے + — صِرّ

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ ان لوگوں کے مال اور اولاد جن کے فخر پر وہ تخریب اسلام کے درپے ہیں ان کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکینگے یہاں ان کی ان کوششوں کا انجام ایک مثال کے رنگ میں سمجھایا ہے ۔ ان کے خرچ کرنے کو ما ینفقون فی ھذہ الحیوۃ الدنیا قرار دیا ہے ۔ کیونکہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے تھے محض نمود اور ریا کیلئے تھا ان کے لشکروں کی تیاری اور دیگر ایذا رسانی پر مال خرچ کرنے کو ایک کھیتی سے تشبیہ دی ہے جس کو آخر ایک عذاب کی ہوا تباہ کردے گی اور ان کے ہاتھ میں سوائے حسرت اور ندامت کے کچھ نہ آئیگا ۔ اور آخر پر فرمایا کہ ان کی کوششوں کی ناکامی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم کے طور پر نہیں بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں کیونکہ بجائے نیکی اور تائید حق کے اپنے اموال کو معصیت اور تخریب حق پر خرچ کرتے ہیں اور اس لئے وہ سزا کے مستحق ہیں +

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ ۱۱۷

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے سوا (اپنے) رازدار نہ بناؤ وہ تم کو نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے وہ تمہارے

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ

خطرناک مصیبت میں پڑنے کو چاہتے ہیں انکے منہوں سے بغض ظاہر ہو چکا ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ

اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

بڑھکر ہے یقیناً ہم نے تمہارے لئے باتیں کھول کر بیان کر دی ہیں اگر تم عقل سے کام لو۔

بَطن — بطانۃ — عـ ۱۱۷ بطانۃ۔ بَطن اصل میں پیٹ ہے۔ لیکن ہر چیز میں اس کے ظاہر کے خلاف کو اس کا بطن کہدیتے ہیں اور اسی طرح بِطَانَۃ خلاف ظِہَارَۃ ہے اور بطور استعارہ بطانۃ کا استعمال اس شخص پر ہوتا ہے جس کو تم اپنے معاملہ کے باطن یعنی راز پر اطلاع دینے کیلئے خاص کرو (غ)، اور ایک حدیث میں جس کو بخاری نسائی وغیرہما نے روایت کیا ہے بطانۃ اس ملک اور شیطان پر بولا گیا ہے جو انسان کا قرین ہے مَا بَعَثَ اللّٰہُ مِنْ نَبِیٍّ وَلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِیفَۃٍ اِلَّا کَانَتْ لَہٗ بِطَانَتَانِ بِطَانَۃٌ تَاْمُرُہٗ بِالْخَیْرِ وَتَحُضُّہٗ عَلَیْہِ وَبِطَانَۃٌ تَاْمُرُہٗ بِالشَّرِّ وَتَحُثُّہٗ عَلَیْہِ وَالْمَعْصُوْمُ مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ یعنی اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ

عصمت انبیاء — کوئی خلیفہ بنایا ہے۔ مگر اس کے لئے دو صاحب سر ہوتے ہیں ایک صاحب سر جو اسے نیکی کا حکم کرتا ہے اور اسکی ترغیب دلاتا ہے اور ایک صاحب سر جو اسے برائی کا امر کرتا ہے اور اس پر اسے برانگیختہ کرتا ہے۔ اور معصوم وہ ہے جسکو اللہ تعالیٰ بچائے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اور انکے خلفاء مامورین یعنی مجددین بھی یوں تو اس قانون کے ماتحت ہیں جسکے ماتحت سب انسان ہیں مگر اللہ اپنے فضل سے ہی جسکو چاہتا ہے بچا لیتا ہے اس سے انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر بھی دلیل ملتی ہے +

خبال — خبالا۔ خبال وہ فساد ہے جو کسی جاندار کو پاکر اس میں اضطراب پیدا کردے جیسے جنون یا ایسی بیماری جو عقل و فکر پر اثر ڈالے (غ)،

بغض۔ بغضاء — البغضاء۔ بُغض نفس کا اس چیز سے نفرت کرنا ہے جس کو تم ناپسند کرو (غ)، اور بغضاء شدت بغض ہے +

فم — افواہ۔ اس کا واحد فم ہے جس کے معنی مُنہ ہیں مگر اصل اس کا فوہ ہے +

دشمن کو دوست بنانے کی ممانعت — اس آیت میں اپنے دشمنوں کو راز دار و دوست بنانے کی ممانعت کی ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ اپنے دشمن کو راز دار و دوست بنانا اپنی ہی تخریب ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ من دونکم عام الفاظ ہیں ان کو دشمنوں کے ساتھ خاص کیوں کیا جائے تو اس کی وجہ خود آگے بیان کر دی ہے۔ کیونکہ ان کے متعلق خود فرمایا کہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے بلکہ چاہتے ہیں کہ ان پر کوئی ہلاک کرنے والی مصیبت آئے۔ پھر یہ انکی باتیں مخفی ہی نہیں بلکہ یہ بغض ان کے الفاظ سے ظاہر ہو چکا ہاں جس قدر انہوں نے ظاہر کیا ہے اس سے بہت بڑھکر ابھی ان کے سینوں میں مخفی ہے یہ سب کچھ کھول کر مسلمانوں کو بتا دیا تاکہ وہ جلد ان کی ہلاک کر دینے والی دوستی سے بچیں +

یہودیوں کی منافقت اور بدزبانی۔ — یہود نے جیسا کہ اگلی آیت سے معلوم ہوگا۔ منافقانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ ادھر نبی کریم صلعم کے ساتھ معاہدہ کر رکھا تھا ادھر اندر ہی اندر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ اور مسلمانوں کے دشمنوں کو مسلمانوں پر چڑھائی کرنے کیلئے اکساتے رہتے تھے۔ ان مخفی شرارتوں کے علاوہ انکی بدزبانی بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی جیسا کہ قد بدت البغضاء من افواھھم سے ظاہر ہے نبی کریم صلعم کے سامنے بھی شرارت کے الفاظ بول دیتے تھے جیسا کہ سورۃ بقرہ میں ذکر آ چکا ہے مگر اس سے بڑھکر بھی مسلمانوں کو بدزبانی سے ایذا پہنچاتے رہتے تھے۔ اور اشعار

۱۱۸ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ

دیکھو کیا تم وہ ہو جو ان سے محبت کرو گے اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے حالانکہ تم ساری کی ساری کتاب پر ایمان لاتے ہو

وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ

اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو سخت غضب کے مارے تم پر انگلیاں

۱۱۹ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ

کاٹتے ہیں کہو اپنے غصے میں مرجاؤ بیشک اللہ سینوں کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے ۵۰۸ اگر

تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ

تم کو کوئی سکھ چھو جائے ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی دکھ پہنچے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں

ہیں پاک دامن مسلمان عورتوں پر گندے حملے کرتے رہتے تھے ۔

۵۰۶ وتؤمنون بالکتاب کلہ میں واو حالیہ ہے۔ اور الکتاب سے مراد جنس کتاب ہے یعنی تم سب کتب الٰہی پر ایمان لاتے ہو جن میں ان کی کتاب بھی شامل ہے ۔

عضّ۔ انملۃ — عضوا علیکم الانامل۔ عَضّ دانتوں سے کاٹنے کو کہتے ہیں۔ اور انامل۔ اَنْمُلَۃ کی جمع ہے۔ اور اس کے معنی انگلیوں کی اطراف یعنی پورے ہیں۔ اور عضّ انامل خاص محاورہ ہے جس سے مراد اظہار ندامت ہوتا ہے (غ) کیونکہ یہ لوگوں کی عادت ہے کہ ندامت کے وقت ایسا کرتے ہیں اور سخت غصہ کے وقت بھی انسان ایسا ہی کرتا ہے گویا اپنے آپ کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے ۔

غیظ — الغیظ۔ غیظ شدید غضب کو کہتے ہیں اور یہ وہ حرارت ہے جو انسان قلب کے خون کے جوش میں آنے سے اپنے اندر پاتا ہے (غ) ۔

قل موتوا بغیظکم۔ یہ ان کی حالت کا اظہار ہے۔ گویا عملاً ان کو یہ کہدینا چاہئے کہ وہ غیظ میں ہی مرجائیں اور مطلب یہ ہے کہ یہ غیظ ان کا جو مسلمانوں کی کامیابیوں پر پیدا ہوتا ہے روز بروز بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اور یوں بھی یہ الفاظ ان کو پہنچا ہی دیئے گئے ۔

اس آیت میں اول مسلمانوں کو ان کی محبت سے روکا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ان کی شرارتوں کے مسلمان اپنی پاک فطرتوں کی وجہ سے ان سے محبت ہی کرتے تھے۔ اور اگر معمولی حالات رہتے خواہ وہ اسلام میں داخل نہ ہوتے تو مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ نہ روکتا۔ مگر روکنے کی وجہ بھی بتادی کہ ان کا غیظ وغضب تم پر حد سے بڑھا ہوا ہے پہلے فرمایا ولا یحبونکم و تؤمنون بالکتاب کلہ یعنی حالانکہ تم تو ان کی کتاب پر بھی ایمان لاتے ہو پھر بھی وہ تم سے محبت نہیں کرتے حالانکہ حق یہ تھا کہ جب مذہب کے رو سے بھی مسلمان ان کی کتابوں کو اصولاً منزل من اللہ مانتے تھے تو وہ ان سے محبت کرتے تو فرمایا کہ جب باوجود اس کے کہ تم ان کی کتاب پر ایمان لاتے ہو۔ وہ تم سے محبت نہیں کرتے۔ تو وہ تو نہ صرف تمہاری کتاب پر ہی ایمان نہیں لاتے بلکہ تمہارے ساتھ اس قدر بغض رکھتے ہیں کہ تمہارا سکھ ان کے لئے موجب دکھ ہے ۔

ع ۱۳ | جنگ اُحد میں نکلنا

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ ۱۲۰ وَاِذْ

اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کرو تو انکی تدبیر تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیگی بیشک اللہ اس کا جو وہ کرتے ہیں احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ۵۰۷ اور جب

غَدَوْتَ مِنْ اَھْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

تو سویرے اپنے گھر والوں سے چلا مومنوں کو لڑائی کیلئے مورچوں پر بٹھاتا تھا اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۵۰۸

حُسن ۔ حسنۃ

۵۰۷ حسنۃ حُسن۔ ہر ایک خوش کرنیوالے امر کو کہتے ہیں جس میں رغبت کی جائے اور اسی سے حسنۃ ہے جس سے مراد ہر ایک نعمت ہے جو انسان کو اس کے نفس یا بدن یا حالت میں پہنچے اور اس کی ضد سیئۃ ہے (غ) مزید تفصیل کے لئے دیکھو ۱۰۵ +

کَید

کید ۔ کید کے اصل معنی زبان عربی میں احتیال اور اجتہاد ہیں یعنی باریک یا خفیہ تدبیر اور کوشش کرنا (ل ۔ غ ۔ ن) اور امام راغب کہتے ہیں کبھی کید مقام مدح میں ہوتا ہے اور کبھی مقام ذم میں گو اس کا اکثر استعمال مقام ذم میں ہے کئی احادیث میں یہ لفظ آتا ہے ۔ ایک میں ہے فی عقولٍ کادھا خالقھا جس کے معنی ابن اثیر کرتے ہیں ارادھا بسوءٍ یعنی ان کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کیا ہے ایک میں ہے دخل علی سعد وھو یکید بنفسہ جہاں معنی کئے گئے ہیں النزع یعنی آپ سعد پر داخل ہوئے اور وہ حالت نزع میں تھے ۔ کیونکہ کید کے معنی لسوق یعنی چلانا بھی آتے ہیں ۔ گویا وہ اپنی جان کو نکال رہے تھے ۔ اور ایک میں آتا ہے ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزا غزوۃ کذا فرجع ولم یلق کیدا یعنی آپ فلاں غزوہ میں گئے اور آپ واپس آئے اور کوئی کید نہیں ملا ۔ جہاں کید کے معنی حرب یعنی جنگ آتے ہیں یعنی جنگ کوئی نہیں ہوئی +

اس آیت میں ان کی خطرناک عداوت کا مزید بیان ہے ۔ اور پھر ان کی چالوں اور تدبیروں سے بچنے کی راہ بتائی ہے پہلے فرمایا کہ ان کی عداوت کا یہ حال ہے کہ تم کو سکھ چھو بھی جائے تو ان کو بُرا لگتا ہے ۔ اور تم پر دکھ کی مصیبت وارد ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں ۔ یہاں سکھ کیلئے تمسسکم استعمال کیا ہے ۔ اور دکھ کیلئے تصبکم یعنی وارد ہو جانا ۔ یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ سکھ کا محض چھو جانا یعنی ذرا سے سکھ کا تم کو ملنا بھی ان کے لئے باعث تکلیف ہوتا ہے ۔ حالانکہ دکھ اور تکلیف جب کبھی کسی شخص کو پہنچے تو فطرت انسانی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ رنجش اور کدورت جو تھوڑی بہت باہم ہو وہ دور ہو کر اس کی جگہ ہمدردی پیدا ہو جائے ۔ مگر ان کی عداوت اس قدر شدید ہے کہ مسلمانوں پر مصیبت وارد ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں +

غُدوۃ ۔ غداء غدا

۵۰۸ غدوت ۔ اس کا مادہ غدا ہے ۔ اور غُدوۃ اور غداۃ دن کے ابتدا کو کہتے ہیں اور غداء اس طعام کو کہتے ہیں جو صبح کے وقت کھایا جائے (غ) پس غدوت کے معنی ہوئے صبح کے وقت نکلا +

حضرت عائشہؓ کا جنگ اُحد میں شریک ہونا

من اھلک ۔ اھل کے معنی کیلئے دیکھو ۳۷۱ خصوصیت سے یہ لفظ بی بی پر بولا جاتا ہے (غ) تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس جنگ میں نبی کریم صلعم کے ساتھ تھیں ۔ چنانچہ صحیح بخاری میں غزوہ اُحد کے بیان میں حضرت انس کی روایت میں حالت جنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے حضرت عائشہ اور اپنی والدہ اُم سلیم کو دیکھا کہ پانی کی مشکیں

جنگ میں عورتوں کی شمولیت

بھر بھر کر اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لاتیں اور زخمیوں کو پلاتی تھیں اور اُم سلیط کے بھی زخمیوں کو پانی پلانے کا ذکر بخاری میں ہے اور ام عمارہ کا ذکر ہے کہ وہ نبی کریم صلعم سے دشمنوں کا دفاع بھی کرتی تھیں ۔ عورتوں کا جنگوں میں شامل ہونا تاریخی امر ہے اور اُحد کے میدان میں بھی انکی شمولیت ثابت ہے پس اھلک سے مراد یہاں حضرت عائشہ صدیقہ ہیں اور انہی کے گھر سے نبی کریم صلعم نے اُحد کو ہفتہ کے دن صبح ہی مومنوں کو لڑائی کے موقعوں پر آراستہ کیا +

بواء ۔ بوأ

تبوئ ۔ بواء سے ہے اور بواء اصل میں مکان میں اجزا کی مساوات کو کہتے ہیں یعنی ہمواری کو دیکھو ۹۱ اور بوّأت لہ مکانا

۱۲۱ **اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ**

جب تم میں سے دو گروہوں نے ارادہ کیا | کہ ہمت ہار دیں

کے معنی ہیں سَوَّیْتُہٗ (غ) یعنی اس کے لئے مکان کو ہموار کیا۔ مطلب یہ کہ اس کو ایسا مکان دیا جس میں وہ مضبوطی سے قدم جما سکے۔ اور صرف جگہ یا مکان دینے پر بولا جاتا ہے ان تبوّا لقومکما بمصر بیوتا (یونس ۱۰-۸۷) ولقد بوّانا بنی اسرائیل (یونس ۱۰-۹۳) یتبوّا منہا حیث یشاء (یوسف ۱۲-۵۶) +

مقعد جنگ اُحد

مقاعد۔ مَقْعَدٌ کی جمع ہے جسکے معنی بیٹھنے کی جگہ ہیں۔ اور مقاعد للقتال قتال کیلئے بیٹھنے کی جگہیں ہیں جس سے مورچے مراد ہیں (غ)
یہاں سے جنگ اُحد کا ذکر شروع ہوتا ہے اور طرز عبارت واذ غدوت من اهلك گویا کسی پہلے بیان پر بطور عطف ہے ایسی ہی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ مضمون ایک ہی چل رہا ہے ابو مسلم نے اسے قد کان لکم اٰیۃ فی فئتین التقتا پر عطف قرار دیا ہے یعنی ایک تو نشان جنگ بدر میں تھا اور ایک نشان جنگ اُحد میں ہے۔ مگر میرے نزدیک اس کا تعلق پچھلے رکوع کی آخری آیت سے ہے۔ کیونکہ وہاں فرمایا تھا کہ تم کو کوئی دکھ پہنچے تو یہ اہل کتاب خوش ہوتے ہیں اور تم کو خوشی پہنچے تو انہیں برا لگتا ہے تو اب اس واقعہ کا ذکر اٹھاتا ہے جس میں مسلمانوں کو کچھ دُکھ پہنچا۔ اور وہ واقعہ جنگ اُحد کا ہے۔ اور اس رکوع میں اس جنگ کی طرف نکلنے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اپنے لشکر کو مورچوں پر بٹھانے اور نصرت ملائکہ کا ذکر ہے +

جنگ بدر میں سخت ہزیمت اُٹھانے کے بعد قریش مکہ نے ایک بڑی بھاری کوشش اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے اور پہلی ہزیمت کا داغ مٹانے کیلئے کی۔ اور اگلے سال یعنی ۳ ہجری میں تین ہزار کا لشکر لیکر جس میں دو سو سوار تھے شوال کے مہینہ میں اُحد کے مقام پر جو مدینہ کے شمال میں صرف چار میل کے فاصلہ پر ہے پہنچ گئے۔ ان کا وہاں ٹھہر جانا اس لئے تھا کہ تا مسلمان کسی طرح مدینہ سے باہر نکل آئیں۔ کیونکہ مدینہ کے اندر رہنے سے انکی حالت زیادہ مضبوط رہتی چنانچہ بدھ کے دن وہ مقام اُحد پر پہنچے۔ اِدھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی تیاری کی اور جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ آپ چلے اور ہفتہ کے دن صبح صف آرائی کی اور اسی دن جنگ اُحد ہوئی بعض نے لکھا ہے کہ ۱۱ شوال تھی اور بعض نے اسے نصف شوال کہا ہے +

جنگ اُحد کے متعلق مشورہ

نکلنے سے پہلے نبی کریم صلعم نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ ہم کو باہر نکل کر ان کے ساتھ جنگ کرنی چاہئے یا مدینہ کے اندر رہ کر اور اس مشورہ میں عبد اللہ بن ابی کو بھی جو بعد میں رئیس منافقین کے نام سے مشہور ہوا بلایا اس سے پہلے آپ نے اسے کبھی نہ بلایا تھا عبد اللہ نے یہ مشورہ دیا کہ مدینہ کے اندر ہی رہکر جنگ کرنی چاہئے۔ انصار کے بعض لوگوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ مگر دوسرے لوگوں نے عرض کیا کہ ہم کو باہر نکلنا چاہئے۔ کیونکہ اگر ہم باہر نکل کر نہ لڑیں تو ان کا خیال ہو گا کہ مسلمان ہم سے ڈر گئے۔ اور محصور ہو کر جنگ کی رسول اللہ صلعم کی اپنی رائے بھی پہلے گروہ کے ساتھ تھی اور آپ نے تین خواب بھی اس بارہ میں دیکھے تھے۔ ایک یہ کہ میرے لئے ایک گائے ذبح کی گئی ہے اس کی تعبیر آپ نے کی کہ ہمارے لئے بہتری ہے۔ دوسرا یہ کہ میں نے اپنی تلوار کی دھار میں بعض جگہ شکستہ دیکھی ہیں اور اس کی تعبیر آپ نے یوں کی کہ ہمارے غلبہ میں کچھ آثار ہزیمت کے ہونگے۔ تیسرا یہ کہ میں نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط زرہ میں داخل کیا ہے اور اسکی تعبیر آپ نے مدینہ سے کی یعنی اگر ہم مدینہ میں رہینگے تو یہیں ایک مضبوط زرہ کا کام دے گا مگر کثرت رائے یہی تھی کہ باہر نکلنا چاہئے

آنحضرت کی تین رویا

مشورہ کی عزت

اسی کے مطابق آپ نے فیصلہ کیا۔ یہ ہے مشورہ کی عزت اور شوریٰ کے فیصلہ کی عزت جو نبی کریم صلعم نے جو خود مہبط وحی تھے کر کے دکھائی کہ اپنی رائے بلکہ اپنی رویا کے بھی خلاف شوریٰ کے فیصلہ کو ترجیح دی +

واقعات جنگ اُحد

غرض جمعہ کے بعد ایک ہزار آدمی کو لیکر آپ باہر نکلے جب ایک مقام شوط پر پہنچے تو عبد اللہ بن ابی ایک تہائی آدمیوں کو ساتھ لیکر اس لئے واپس آ گیا کہ میرے مشورے کے مطابق کیوں کام نہیں کیا گیا سو آپ چھ اور سات سو کے درمیان آدمیوں کو

وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

اور اللہ ان دونوں کا ولی تھا اور اللہ پر ہی مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہئے ۵۰۹

لیکر اُحد کے مقام پر پہنچے اور اگلے دن علی الصباح پہاڑ کو اپنی پشت پر رکھ کر اپنے لشکر کو جنگ کے لئے تیار کیا۔ اور ایک مورچہ پر عبداللہ بن جبیر کے ماتحت پچاس تیر اندازوں کو کھڑا کیا اور ان کو حکم دیا کہ ہمکو فتح ہو یا شکست تم نے کسی صورت میں اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا ہوگا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں نے ایسے جوش سے حملہ کیا کہ سات سو کے سامنے تین ہزار کے پاؤں اُکھڑ گئے ان کے علمبردار یکے بعد دیگرے مارے گئے اور بہت سے آدمی ان میں سے زخمی ہوگئے آخر وہ قائم نہ رہ سکے اور بھاگ اُٹھے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا۔ اور خوب دور نکل گئے تیر اندازوں نے سمجھا اب فتح کامل ہوگئی ہے اور اب جگہ کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے اپنے امیر کے حکم کے خلاف جگہ کو چھوڑا۔ قریش کے رسالہ پر خالد بن ولید اور عکرمہ تھے انہوں نے جب اس مورچہ کو خالی دیکھا تو فوراً رسالہ کے ساتھ عقب سے حملہ کیا۔ ادھر قریش کا بھاگتا ہوا لشکر سنبھلا۔ مسلمان تعاقب کی وجہ سے پہلے ہی منتشر تھے۔ اب دو طرف سے حملہ ہوا یہ ایک بڑا سخت وقت تھا۔ فوج تتر بتر تھی۔ اتنے میں نبی کریم صلعم نے اس حالت کو دیکھکر بلند آواز سے پکارا اِلیَّ عِبادَ اللّٰہ اَنا رسول اللّٰہ اے اللہ کے بندو میری طرف آجاؤ میں اللہ کا رسول ہوں کفار کی اصل غرض تو یہی تھی کہ سب سے پہلے آنحضرتؐ کو ماریں ان الفاظ کے ساتھ اگر ایک طرف کچھ صحابہؓ آنحضرت صلعم کے گرد جمع ہوگئے تو دوسری طرف کفار کے حملہ کا سارا زور اسی موقعہ پر ہوگیا۔ آنحضرتؐ کے سر میں زخم آیا اور کچھ دانت بھی زخمی ہوگئے اور آپ گر گئے۔ مگر ساتھ ہی آپکے صحابہ نے آپ کے اردگرد اور دشمن کے مقابل پر ایک مضبوط دیوار بنالی اور سب مسلمان آہستہ آہستہ یہاں جمع ہوگئے۔ اور چند ایک نفوس مدینہ کی طرف بھاگ گئے۔ جب دشمن نے دیکھا کہ مسلمانوں کی پراگندہ جمعیت پھر اکٹھی ہوگئی ہے تو انہوں نے فوراً واپسی کی ٹھان لی۔ اور مسلمانوں کو میدان جنگ میں چھوڑ کر مکہ کو واپس ہوئے۔ مسلمانوں کو نقصان ضرور پہنچا۔ مارے بھی گئے زخمی بھی ہوئے مگر انہوں نے شکست نہیں کھائی۔ کفار سخت نقصان اور کھلی ہزیمت سے ضرور بچ گئے مگر انہوں نے فتح حاصل نہیں کی بلکہ صرف مسلمانوں کے تعاقب سے محفوظ ہوکر گھر کی راہ لی ✦

آنحضرت صلعم کے مختلف کام

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم ہر قسم کے ذمہ داری کے کام کو خود ہی کرتے تھے۔ یہاں مسلمان فوج کو مورچوں پر بٹھانا بھی آپ کا کام بتایا ہے۔ گویا جرنیل یا کمانڈر کا اصل کام آپ خود ہی کرتے تھے۔ کس قدر مختلف شعبے کام کے آپ کی ذات میں جمع تھے خود ہی نمازوں کی امامت کرائیں خود ہی تعلیم دین دیں۔ خود ہی جھگڑوں کے فیصلے کریں۔ خود ہی قوانین بنائیں۔ خود میدان جنگ میں جا کر لڑیں۔ اور خود ایک جرنیل کا کام بھی کریں۔ غرض کوئی پہلو ایسا نظر نہیں آتا جس میں آپ نے خود ہی ایک نمونہ قایم نہ کیا ہو ✦

ھَمَّ ۔ اَھَمَّ ۔ ھَمَّ

۵۰۹ ھمّت۔ ھَمٌّ ایسے غم کو کہتے ہیں جو انسان کو پگھلا دے (غ)۔ اسلئے اَھَمَّہُ الْاَمْرُ کے معنی ہیں اَقْلَقَہٗ۔ اَحْزَنَہٗ (ل) یعنی اس امر نے اس کو قلق میں یا حزن میں ڈالا۔ اسی لئے مہمّات الامور ان سخت امور کو کہتے ہیں جو حزن میں ڈالنے والے ہوں۔ اور ھَمَّ بالشئی کے معنی ہیں اس کی نیت یا ارادہ کیا یا اس پر عزم کیا (ل)

ھِمَّۃ ۔ ھُمَام

ھِمّۃ اور ھُمام اسی سے ہیں ھِمّۃ کسی امر کے کر لینے کے قصد کا نام ہے۔ اور ھمام عظیم الھمۃ آدمی کو کہتے ہیں اور یہاں ھمّت کے معنی صرف دل میں ایک خیال کا لانا ہیں جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے کہ ان سے وہ کمزوری سرزد نہیں ہوئی

فشل

تفشلا۔ فَشَل سے ہے جس کے معنی ہیں وہ کمزوری جسکے ساتھ بزدلی ملی ہوئی ہو (غ) ✦

وکل

یتوکّل۔ وَکْل سے ہے۔ وَکَلْتُ اَمْرِی اِلٰی فلان کے معنی ہیں دوسرے کی طرف ایک امر کو لے گیا۔ اور اس بارہ میں اس پر اعتماد کیا (ل) اور

توکّل

توکّل کا استعمال دو طرح پر ہے ایک صلہ لام کے ساتھ توکلت لفلان کے معنی ہیں تولیت لہٗ یعنی اس کی خاطر میں اس کا متولی ہوگیا۔ اور توکلت علیہ کے معنی ہیں اعتمدت علیہ یعنی اس پر میں نے اعتماد کیا (غ)۔ اور اللہ تعالیٰ کا وکیل ہونا اسی معنی میں ہے کہ وہ سب امور کا متولی ہے (غ) ✦

وکیل

۱۲۲ **وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ**

اور یقیناً اللہ نے تم کو بدر میں

بنو حارثہ و بنو سلمہ

یہ وہ گروہ جن کا ذکر اس آیت میں ہے کون تھے؟ بخاری میں جابر بن عبداللہ سے روایت ہے فینا نزلت اذ همت طائفتان منکم ان تفشلا واللہ ولیھما قال نحن الطائفتان بنو حارثة وبنو سلمة وما نحب انھا لم تنزل لقول اللہ واللہ ولیھما یعنی یہ آیت ہمارے متعلق اُتری اور ہم بنو حارثہ اور بنو سلمہ وہ دو گروہ ہیں اور ہم کو یہ پسند نہیں کہ یہ نہ اترتی کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ ان دونوں کا کارساز اور مددگار ہے۔ ان کا ھمّ یا ارادہ محض حدیث نفس کے طور پر تھا اس لئے کہ اگر عزم ہوتا تو وہ کر بھی گزرتے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فوج کی کفار کے مقابلہ پر اس قدر قلت کو دیکھ کر ایک اور چار کی نسبت سے بھی کفار زیادہ تھے ان کے دلوں میں یہ کمزوری کا خیال آیا +

قرآن سے توکل کے معنی پر روشنی

اللہ پر توکل کرنے سے کیا مراد ہے؟ لفظی معنی بھروسہ یا اعتماد کرنا ہیں مگر کیا خدا پر بھروسہ کرنے سے یہ مطلب ہے کہ ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہئے اور کام کو خدا پر چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ جو چاہے کرے یہی معنی آج کل مسلمانوں نے توکل کے سمجھے ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ اگر یہی معنی توکل کے نبی کریم صلعم اور آپ کے صحابہ نے سمجھے ہوتے تو نہ وہ جنگ کو نکلتے نہ دشمن کی خبر رکھتے نہ دور دور دشمنوں کی سرکوبی کے لئے فوجیں بھیجتے نہ مہمات کا فکر کرتے نہ ان کے لئے روپیہ جمع کرتے نہ ہتھیار فراہم کرتے نہ دن رات مسلح رہتے اور یہ سب کچھ وہ کرتے تھے۔ خود اسی موقعہ پر جو توکل کی ہدایت ہوئی ہے تو کس معنی میں؟ دو گروہوں نے ارادہ کیا کہ جنگ سے واپس ہو جائیں مگر خدا نے ان کو اس ارادہ کے عمل میں آنے سے بچا لیا اور فرمایا کہ مومن خدا پر توکل کیا کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ جنگ کرنا توکل تھا اور جنگ نہ کرنا خلاف توکل تھا پس قرآن کریم کے اس استعمال نے بتا دیا کہ توکل اسباب سے کام لینے کا نام ہے اسباب کو ترک کرنے کا نام نہیں۔ اور فی الحقیقت وہ شخص خدا پر بھروسہ کرنے والا نہیں کہلا سکتا جو خدا کے پیدا کئے ہوئے اسباب سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ حقیقت توکل یہ ہے کہ اسباب خواہ کمزور بھی نظر آئیں تو بھی ان سے کام لے۔ کیونکہ یہاں دو گروہوں کو جنگ نہ کرنے کا خیال اس لئے پیدا ہوا کہ دشمن طاقتور تھا۔ اور اوّل صرف تین ہزار کے مقابلہ میں سات سو تھے۔ تو حکم ہوا کہ تم اپنا پورا زور لگاؤ اور بے پرواہ نہ کرو کہ کیا ہوگا۔ بالفاظ دیگریوں کہنا چاہئے کہ اسباب سے پورا کام لے کر نتیجہ کو خدا پر چھوڑے یہ توکل ہے۔ کام کرے گو نتیجہ خلاف امید بھی ہو تو بھی کام نہ چھوڑے اور یہ سمجھے کہ میرا فرض تو کام کرنا ہے اس پر نتیجہ مترتب کرنا خدا کا کام ہے پس خدا پر بھروسہ کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ اسباب پر پورا زور لگائے نتیجہ کو سپرد خدا کرے یہ توکل انسان کی ہمت بڑھانے والی چیز ہے اور مصائب کے نیچے اس کو ہمت ہارنے سے روکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے صبر کے ساتھ توکل کو جمع کیا ہے یہاں بھی یہی صورت ہے اور دوسری جگہ ہے ومالنا الا نتوکل علی اللہ وقد ھدٰنا سبلنا ولنصبرن علیٰ ما اٰذیتمونا وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون (ابراہیم ۱۴۔ ۱۲) الذین صبروا وعلیٰ ربھم یتوکلون (النحل ۱۶۔ ۴۲) اور ایک جگہ کمال صفائی سے عمل اور صبر اور توکل کو جمع کیا ہے نعم اجر العٰملین الذین صبروا وعلیٰ ربھم یتوکلون (العنکبوت ۲۹۔ ۵۸۔ ۵۹) عمل یعنی کام کرنے والوں کا اجر کیا ہی اچھا ہے وہ جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں پس قرآن کریم کی اس صحیح تعلیم کے مطابق توکل یہ ہے کہ انسان اسباب سے خوب کام لے اور نتیجہ خلاف بھی ہو تو گھبرائے نہیں۔ بلکہ نتیجہ کو خدا پر چھوڑے +

احادیث سے توکل کے معنی پر روشنی

احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ حج میں جو لوگ زاد راہ لئے بغیر جایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے نحن المتوکلون ان کو قرآن کریم نے وتزودوا کہہ کر بتا دیا کہ اسباب سے کام نہ لینا یہ توکل نہیں۔ نبی کریم صلعم سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ اونٹ کو خدا کے توکل پر کھلا چھوڑ دوں تو فرمایا اعقلھا وتوکل اس کے گھٹنے کو رسی سے باندھ دو اور توکل کرو یعنی اسباب سے

بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۱۲۳

مدد دی جب تم تھوڑے تھے — پس اللہ کا تقویٰ کرو — تاکہ تم — شکرگزار بنو ۵۱۰ — جب تو مومنوں کو کہتا تھا

اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝ؕ

کہ کیا یہ تمہارے لئے کافی نہیں — کہ تمہارا رب تین ہزار اُتارے ہوئے فرشتوں سے تمہاری — مدد کرے

بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ ۱۲۴

ہاں — اگر تم صبر کرو — اور تقویٰ کرو — اور وہ اپنے پورے جوش میں

کام لو اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑو۔ اور اس کے خلاف جن احادیث سے نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے مثلاً یہ حدیث لو انکم تتوکلون علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا و تروح بطانا یعنی اگر تم اللہ پر توکل کرو جو حق توکل ہے تو تم کو رزق دے جس طرح پرند کو رزق دیتا ہے کہ صبح کے وقت بھوکا نکلتا ہے اور شام کو پیٹ بھر کر آتا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ طلب معاش کی ضرورت نہیں حدیث کے منشاء کے بالکل خلاف ہے حدیث میں یہ نہیں کہ پرند کو گھونسلے میں رزق بھیج دیتا ہے بلکہ پرند تلاش رزق کے لئے نکلتا ہے تو اسے بھی مل جاتا ہے تو مطلب صاف یہ ہوا کہ تم اگر تلاش کرو گے تو تم کو بھوکا نہیں مارے گا مسلمانوں کے ادبار کے اسباب میں سے توکل کا غلط مفہوم بھی ایک بھاری سبب ہے ✦

بدر — ۵۱۰ بَدْر۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان (مدینہ سے تین منزل اور مکہ سے دس منزل دور) ایک مقام کا نام ہے۔ اور یہ ایک کنوئیں کے نام پر ہے جو اسی نام کے ایک شخص نے لگوایا تھا۔ اس مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی جنگ قریش مکہ سے ہوئی جس میں قریش مغلوب ہوئے ✦

ذُلّ — اذلۃ — اذلۃ۔ ذلیل کی جمع ہے۔ اور ذُلّ نقیض عِزّ ہے۔ اور ذُلّ کے معنی رفق اور مرحمت بھی آتے ہیں (ل)، اور دوسری جگہ اذلۃ علی المؤمنین (المائدۃ۔ ۵۴) میں یہی مراد ہے۔ اور یہاں اذلۃ کا لفظ محض ان کی تعداد کی قلت کو ظاہر کرنے کیلئے بولا گیا ہے۔ بدر میں مسلمانوں کو اذلۃ اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہ بہ سبب اپنی قلت تعداد کے غالب آنے کے قابل نہ تھے۔ بلکہ بظاہر مغلوب کی حیثیت میں تھے اور ذل کے معنی مقابلہ سے عاجز ہونا بھی ہیں ✦

اوپر کی آیت میں دو گروہوں کی کمزوری کے خیال کا ذکر کیا تھا۔ تو اب ان کی ہمت بندھاتا ہے۔ کہ اگر یہاں تم تھوڑے ہو تو یہی حالت تمہاری بدر میں بھی تھی کہ وہاں بھی تم قلیل تھے۔ بلکہ سامان جنگ کے لحاظ سے تو بالکل مقابلہ کے قابل ہی نہ تھے۔ پھر جب وہاں اللہ تعالیٰ نے تمہیں مدد دی تو کیا اب نہ دیگا ✦

فاتقوا اللہ لعلکم تشکرون۔ اللہ کا تقویٰ کرو تاکہ تم شکر کرنے والے بنو۔ مومن تو پہلے بھی شکرگزار تھے۔ پھر یہاں تقویٰ کرنے کا نتیجہ شکرگزار بننے سے کیا مراد ہے؟ اللہ تعالیٰ جب انسان کو کوئی نئی نعمت عطا فرماتا ہے تو اس کے لئے ایک نئی شکرگزاری کا موقع ہوتا ہے پس شکرگزار بننے میں اسی نئی نعمت کی طرف اشارہ ہے یعنی جیسا پہلے تمہیں نصرت ملی تو اس نعمت کی وجہ سے ایک شکرگزاری کا موقع ملا اسی طرح اگر اب بھی تقویٰ اختیار کرو تو پھر تمہیں نصرت عطا ہوگی اور اس نعمت کی وجہ سے شکرگزاری کا موقع ملے گا ✦

مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ۝   الربع

تم پر حملہ کریں   تمہارا رب پانچ ہزار (دشمن کو)   تباہ کرنے والے فرشتوں سے   تمہاری مدد کرے گا ۵۱۱

فور

۵۱۱ فَور۔ فَور شدت جوش کا نام ہے، اور اس کا استعمال آگ کے متعلق ہوتا ہے جب وہ بھڑکے اور ہانڈی کے متعلق (جب وہ اُبلے)، اور غضب کے متعلق (جب اس میں سخت جوش پیدا ہو) (غ)، نار جہنم کے متعلق آتا ہے وھی تفور (الملک ۶۷۔ ۷)۔ فَعَلْتُ کذا من فَوْرِی سے مراد ہے ایسا کام جوش کی حالت میں کیا (غ)، فار الشیء فوراً ۔۔ جاش یعنی فور کے معنی جوش میں آنا ہیں (ل)، اور اسی سے بطور استعارہ فور کے معنی فی الحال بھی ہیں اور یہی لفظ ہماری زبان میں فوراً استعمال ہوتا ہے لیکن اصل معنی جوش اور غلیان ہی ہیں۔ اور وہی یہاں مراد ہیں +

سام

مُسَوِّمِین۔ اصل اس کا سَوم ہے جس کے معنی ہیں امام راغب لکھتے ہیں کہ اس کا اصل کسی چیز کی تلاش میں جانا ہے مگر پھر اس کا استعمال اس مرکب معنی کے دونوں اجزاء پر الگ الگ ہوا ہے یعنی صرف ذِھاب (جانا)، اور صرف اِبتغاء (تلاش کرنا)، اور لسان العرب میں ہے کہ سام چار معنی میں آتا ہے۔ چرنے کیلئے چھوڑا۔ اور طلب کیا اور بیچا اور عذاب دیا۔ اور یہاں مُسَوِّم

مسوّم

میں یہی آخری معنی مراد ہیں یعنی عذاب دینے والے اور اسی کے مطابق سَوَّمَت علی القوم آتا ہے اِذا اغَرْتَ عَلَیھم فَعَیَّثْتَ فِیھِم (ل) یعنی ان پر گھوڑے کو دوڑایا اور ان میں تباہی ڈالی۔ پس مُسَوِّمِیْن سے مراد ہے تباہی ڈالنے والے یا عذاب دینے والے اور عام طور پر نشان لگانے والے معنی کئے گئے ہیں +

جنگ اُحد میں تین ہزار ملائکہ کی نصرت کا وعدہ

ان دو آیات میں سے پہلی آیت میں تین ہزار فرشتوں کے نزول کا ذکر ہے اور دوسری میں پانچ ہزار کا بعض مفسرین نے یہ کوشش کی ہے کہ ان تمام کو جنگ بدر کے متعلق ہی لگایا جائے حالانکہ سورۃ انفال میں صراحت سے فرمایا انی ممدکم بالف من الملئکۃ مردفین (الانفال ۸۔ ۹) یعنی جنگ بدر میں کھلے طور پر ایک ہزار ملائکہ کی امداد کا ذکر ہے۔ اور یہاں تین ہزار فرشتوں کی امداد کا ذکر ہے اس لئے یہ واقعہ بدر کے متعلق نہیں۔ علاوہ ازیں یہاں اذ کے ساتھ بار بار جنگ اُحد کے واقعات کی طرف ہی توجہ دلائی ہے و اذ غدوت من اهلك ۔ اذ همت طائفتان ۔ اور یہاں تیسری مرتبہ اذ تقول فرمایا پھر اسی سورت میں دوسری جگہ یہ بھی فرمایا ولقد صدقکم الله وعدہ اذ تحسونهم باذنه (آل عمران ۳۔ ۱۵۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی وعدہ نصرت کا بھی اس جنگ کے متعلق تھا۔ اور وہ وعدہ صرف انہی الفاظ میں ہے الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثۃ آلاف من الملئکۃ منزلین اور بالآخر یہ بات قابل غور ہے کہ جہاں بدر میں ایک ہزار دشمن ہے تو ایک ہزار ملائکہ کی نصرت کا ذکر ہے اور چونکہ اُحد میں تین ہزار دشمن ہے اس لئے تین ہزار ملائکہ کا تعلق اسی جنگ کے قرین قیاس ہے +

جنگ احزاب میں پانچ ہزار ملائکہ کی نصرت کا وعدہ

اس کے بعد جو دوسری آیت میں پانچ ہزار ملائکہ کی آمد کا ذکر ہے۔ وہ ایک تیسری جنگ کے متعلق ہے بدر اور اُحد کے نہیں۔ اور وہ جنگ احزاب ہے جس کا ذکر یہاں ان الفاظ میں کیا گیا ہے ویاتوکم من فورهم هذا اپنے پورے جوش میں تم پر ٹوٹ پڑیں۔ اور جہاں جنگ احزاب کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے وہاں بھی اسی قسم کا نقشہ کھینچا ہے اذ جاؤکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون بالله الظنونا هنالك ابتلی المؤمنون وزلزلوا زلزالا شدیدا (الاحزاب ۳۳۔ ۱۰۔ ۱۱) یہ نقشہ صریحاً وہی دشمن کے جوش میں ٹوٹ پڑنے کا نقشہ ہے اور اس جنگ میں دس ہزار یا بعض اقوال میں چوبیس ہزار فوج کے ساتھ دشمن آیا تھا کیونکہ قریش نے دوسری قوموں کو بھی اُکسا کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ قریش خود بمشکل کوئی پانچ ہزار کے قریب ہی ہونگے اور اصل دشمن وہی تھے +

تین ہی بڑی جنگیں تھیں جن میں دشمن یعنی کفار قریش مسلمانوں پر چڑھ کر آئے۔ جنگ بدر۔ جنگ اُحد۔ جنگ احزاب

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا ۱۲۵

اور اللہ نے اسے صرف تمہارے لئے خوشخبری ٹھہرایا اور تاکہ اس سے تمہارے دل اطمینان پکڑیں اور مدد تو

النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ

اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے ہی ہے ۵۱۲

بدر، اُحد، احزاب تینوں میں نزول ملائکہ کی حکمت

ان تینوں لڑائیوں میں مسلمانوں کی تعداد کفار کی تعداد کے مقابل کچھ نسبت نہ رکھتی تھی۔ تینوں جنگوں کی غرض مسلمانوں اور اسلام کا استیصال تھا۔ تینوں میں کفار اپنے مقصد میں ناکام ہو کر واپس ہوئے۔ اور تینوں کے متعلق ہی نزول ملائکہ کا ذکر بھی ہے۔ اور دشمن کی تعداد سے خاص نسبت رکھتا ہے۔ جنگ احزاب کے بعد پھر دشمن کو مدینہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے بعد جو چڑھائی ہوئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہونا تھا۔ اور اس موقعہ پر کفار کو مقابلہ کی جرأت مطلق نہ ہوئی۔ اب دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ کفار کو دو قسم کا وعدہ دیا گیا تھا جس کے متعلق وہ بار بار مطالبہ بھی کرتے تھے هل ينظرون الا ان تاتيهم الملٰئكة او ياتى امر ربك (النحل ۱۶-۳۳) کیا وہ اس امر کا انتظار کرتے ہیں کہ فرشتے ان پر آئیں یا تیرے رب کا امر ہی آ جائے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان تینوں جنگوں میں جہاں کفار کی چڑھائی مسلمانوں پر تھی۔ ملائکہ کے ساتھ مسلمانوں کی نصرت فرمائی اور کفار کو سزا دی اور ان کو اپنے ارادوں میں ناکام رکھا۔ اور فتح مکہ میں گویا امر رب ہی آ گیا۔ کیونکہ اسلام کی حکومت قائم ہو گئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ چڑھائی ایسی پرشوکت تھی۔ کہ وہ کفار جو ہزارہا کا لشکر لیکر مٹھی بھر مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ اب ان میں اتنی بھی ہمت اور جرأت نہ رہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دس ہزار قدوسیوں کے مقابلہ میں میدان میں بھی نکل سکیں اور امر رب کا مقابلہ کر کون سکتا تھا۔ پس ملائکہ کے نزول میں گویا درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو پورا فرمایا ہو جسکا مطالبہ بار بار کفار کی طرف سے ہوتا تھا۔

امر رب کا آنا

نزول ملائکہ فرضی بات نہ تھی۔

یہ نزول ملائکہ کوئی فرضی بات نہ تھی۔ بلکہ ایک حقیقت تھی ورنہ یہ ناممکن تھا۔ کہ معدودے چند مسلمان اس قدر فوجوں کا مقابلہ کر کے کامیاب ہو سکتے۔ غور کا مقام ہے کہ ایک آدھ میدان میں اگر تھوڑے بہتوں پر غالب آ جائیں تو اسے اتفاق کہا جا سکتا ہے۔ گو وہاں بھی کوئی نہ کوئی وجوہ کامیابی کی ضرور ہونی چاہئیں۔ مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ اول میدان بدر میں کفار کی جمعیت تگنی میدان کا اچھا حصہ ان کے ہاتھ میں۔ پانی اُن کے قبضہ میں۔ ان کی فوج میں تجربہ کار جنگی جوان بالمقابل مسلمانوں میں بچے اور بوڑھے شامل ہتھیار ندارد و میدان کی مشکلات۔ پھر بھی کفار سخت نقصان اٹھاتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ پھر میدان اُحد میں بجائے تگنے کے اب کفار کی تعداد مسلمانوں سے چوگنی ہے۔ سواروں کی ایک بڑی جمعیت ان کی فوج میں ہے۔ خالد جیسے بہادر بھی ساتھ ہیں۔ مگر پھر بھی کفار خالی ہاتھ اور ناکام واپس جاتے ہیں جنگ احزاب میں کفار کی تعداد مسلمانوں سے دس گنی۔ علاوہ ازیں اندر یہودی دشمن منافق جاسوسوں کا کام کرنے والے موجود۔ مگر وہاں بھی خدا نے اس بڑی فوج کو ناکام اور نامراد کر کے واپس پھیرا۔ اور وہ سخت پریشانی کی حالت میں بھاگے۔ یہ نزول ملائکہ کا ہی نتیجہ تھا۔

۵۱۲ء یہاں فرمایا کہ نزول ملائکہ کے وعدہ کو اللہ تعالیٰ نے صرف تمہارے لئے بشارت ٹھہرایا اور تاکہ تمہارے دل اس کے ساتھ مطمئن ہو جائیں۔ اسی طرح سورۃ انفال میں فرمایا وماجعله الله الا بشرى ولتطمئن به قلوبكم (الانفال ۸-۱۰) اور وہاں آگے چل کر فرمایا اذ يوحى ربك الى الملٰئكة انى معكم فثبتوا الذين امنوا سالقى فى قلوب الذين كفروا الرعب (الانفال ۸-۱۲) جب تیرا رب ملائکہ کو وحی کرتا تھا۔ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں سو ان لوگوں کو جو ایمان لائے ثابت قدم رکھو

۱۲۶ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ○

تاکہ ان لوگوں سے جو کافر ہوئے ایک حصہ کو کاٹ دے یا ان کو ذلیل کرکے لوٹا دے سو وہ نامراد واپس جائیں ۵۱۳

میں ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے کفر کیا رعب ڈالوں گا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ ملائکہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ مومنوں کو ثابت قدم کرتا اور کفار کے دلوں میں رعب ڈالتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہو کہ ملائکہ کی تعداد کو کفار کی جمعیت سے ہر میدان میں ایک خاص نسبت نظر آتی ہے +

ملائکہ نے قتال نہیں کیا — اگر ملائکہ کا نزول ہوا تو کیا انہوں نے انسانوں کی شکل میں ہو کر جنگ بھی کی؟ جس غرض کے لئے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو نازل کیا وہ تو خود ہی بتا دی ہے۔ اور حق یہی ہے کہ ملائکہ کا تعلق قلوب سے ہوتا ہے۔ پس مومنوں کو اطمینان قلب عطا کرنا اور کفار کے دل میں رعب ڈالنا یہ وہ غرض تھی جس کے لئے قرآن کریم کی تصریح کے مطابق ملائکہ کا نزول ہوا۔ بعض مفسرین نے بھی اسی کے مطابق لکھا ہے۔ چنانچہ غرائب القرآن میں یہ قول مذکور ہے ومنهم من قال ان نصر الملائكة بالقاء الرعب فی قلوب الكفار و باشعار المؤمنين بان النصرة لهم یعنی بعض نے کہا ہے کہ ملائکہ کی نصرت کافروں کے قلوب میں القائے رعب تھی اور مومنوں کو یہ علم دینے سے کہ نصرت ان کے لئے ہے۔ یہ جنگ بدر اور جنگ اُحد دونوں کے متعلق ہے۔ اور جنگ اُحد کے متعلق تو قریبًا اتفاق ہے کہ وہاں ملائکہ نے قتال نہیں کیا۔ چنانچہ امام مجاہد کا قول منقول ہے عن مجاهد انه قال حضرت الملٰئكة يوم احد ولكنهم لم يقاتلوا یعنی آپ نے فرمایا کہ فرشتے اُحد کے دن موجود تھے۔ لیکن انہوں نے جنگ نہیں کی۔ ایسا ہی حضرت ابن عباس سے مروی ہے عن ابن عباس انه لم تقاتل الملائكة سوى يوم بدر وفيما سواه كانوا عددا و مددا لا يقاتلون ولا يضربون یعنی سوائے بدر کے دن کے ملائکہ نے جنگ نہیں کی اور اس کے سوائے جہاں وہ آئے وہ تعداد اور مدد کیلئے تھے انہوں نے قتال نہیں کیا اور نہ کسی کو مارا۔ بدر کے دن ملائکہ کے قتال کرنے یا نہ کرنے پر بحث سورۃ انفال میں ہوگی +

قطع — ۵۱۳ يقطع۔ قطع کے اصل معنی کاٹنا ہیں مگر ہلاک کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مفردات میں ہے ليقطع طرفا اى ليهلك جماعة منهم یعنی ان سے ایک جماعت کو ہلاک کر دے +

طرف — طرفا کسی چیز کی طرف سے مراد اس کی ایک جانب ہے اور اس کا استعمال اجسام میں اوقات میں اور اس کے سوائے بھی ہوتا ہے (غ)۔ ليقطع طرفا میں مراد ایک حصہ یا ایک جماعت ہے جیسا اوپر ذکر ہوا اور امام راغب کہتے ہیں کہ طرف کی تخصیص اسلئے کی کہ کسی چیز کی طرف یا ایک جانب کے کم کرنے سے اس کی توہین اور اسکے نابود کرنے کی طرف پہنچا جاتا ہے +

کبت — يكبت۔ کَبْت سختی کے ساتھ اور ذلیل کرکے رد کر دینا ہے (غ) اور لسان العرب میں ہے الكبت الصرف والاذلال یعنی کبت کے معنی پھیر دینا اور ذلیل کرنا ہے پس کبت الله العدوّ کے معنی ہیں صرفه واذلّه (ل) اسے واپس پھیر دیا اور ذلیل کیا اور کبت کسی چیز کے مُنہ کے بل گرا دینے کو بھی کہتے ہیں +

خاب — خائبين۔ خاب لم ینل ما طلب (ل) خاب کے معنی ہیں جو کچھ طلب کیا تھا وہ نہ پایا یعنی حصول مقصد میں ناکام ہوا اور خيبة ظفر کا نقیض ہے۔ پس جو خائب ہو وہ مظفر نہیں کہلا سکتا +

اُحد میں کفار کی ناکامی — جنگ اُحد میں نصرت الٰہی کی دو اغراض بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک کر دے۔ اور دوسرا یہ کہ ان کو سختی اور ذلت سے لوٹا دے اور وہ بلا نیل مرام اور بلا حصول مقصد واپس جائیں۔ چنانچہ یہ دونوں باتیں اسی طرح وقوع میں آئیں۔ ابتدائے جنگ میں مسلمانوں نے کفار کے ایک حصہ کو ہلاک کیا اور بہتوں کو زخمی کیا۔ اور آخر کار بھی

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ ۱۲۷

اس کام میں تیرا کچھ (دخل) نہیں خواہ وہ انپر رحمت سے لوٹے یا انکو عذاب دے بیشک وہ ظالم ہیں ۵۱۴

وہ ذلیل ہو کر لوٹے اور جس غرض کو مدنظر رکھکر آئے تھے اسے حاصل کئے بغیر واپس ہوئے۔ اور یوں یہ آیت اسبات پر قطعی دلیل ہے کہ جنگ اُحد میں کفار کو فتح نہیں ہوئی۔ بلکہ قرآن کریم نے انہیں نامراد قرار دیا ہے۔ کفار کا حملہ اس غرض سے تھا کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کردیں۔ اور اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی اس غرض کو حاصل کئے بغیر واپس ہوئے اور یہ ان کے لئے بڑی ذلت تھی۔ مسلمانوں کا لشکر اسی طرح میدان جنگ میں موجود تھا۔ اس لئے وہ مدینہ پر حملہ آور نہیں ہو سکے اور وہ مسلمانو کا ایک برائے نام قیدی بھی پکڑ کر نہ لے گئے۔ پس ایک طرف قرآن کریم اور دوسری طرف واقعات قریش کے لشکر کو ناکام ٹھہراتے ہیں۔

الامر

۵۱۴ لیس لك من الامر شیٔ۔ اسی سورت میں آگے آتا ہے۔ لو کان لنا من الامر شیٔ ما قتلنا ھٰھنا (آل عمران ع ۱۵۲) اگر ہمارا بھی معاملہ میں کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔ یہی معنی یہاں ہیں یعنی تیرا اس معاملہ میں کچھ دخل نہیں اور وہ امر یا معاملہ کیا ہے۔ کفار کی سزا یا ان پر رجوع برحمت کرنا یعنی یہ معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے اور کسی انسان کا خواہ وہ نبی ہی ہو اس میں کچھ دخل نہیں +

آنحضرت کا بددعا کرنا

بخاری میں حضرت انسؓ کی روایت ہے شُجَّ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم یومَ اُحُدٍ فقال کیف یُفلِحُ قومٌ شَجُّوا نَبِیَّھُم فنزلت لیس لك من الامر شیٔ یعنی اُحد کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر میں زخم آیا تو آپ نے فرمایا کس طرح وہ قوم کامیاب ہوگی جنہوں نے اپنے نبی کو زخمی کیا تو یہ آیت لیس لك من الامر شیٔ نازل ہوئی۔ لیکن سالم نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلعم سے سُنا کہ جب آپ فجر کی نماز میں دوسری رکعت میں رکوع سے اُٹھتے تو سمع اللہ لمن حمدہ ربنا ولك الحمد کہنے کے بعد کہتے اَللّٰھُمَّ الْعَنْ فلانًا وفلانًا وفلانًا اے اللہ فلاں فلاں فلاں پر لعنت کر تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری لیس لك من الامر شیٔ اور دوسری روایت میں سالم نے ہی ابن عمر سے بجائے اَللّٰھُمَّ العن فلانًا کے یہ الفاظ روایت کئے ہیں کہ آپ صفوان ابن امیّۃ اور سہیل بن عمرو اور حارث بن ھشام پر بددعا کیا کرتے تھے تو یہ آیت اتری یہ غزوہ اُحد کے ذکر میں ہے۔ اسی کے قریب قریب نسائی میں بھی روایت ہے۔ اور غزوہ اُحد میں علاوہ اسکے کہ بہت سے مسلمان شہید ہوئے اور نبی کریم صلعم کو زخم پہنچے کفار نے مسلمانوں کی لاشوں کی بھی بیحرمتی کی اور ان کا مثلہ کیا اور یہ واقعات ایسے دردناک تھے کہ ان پر ظالموں کی سزا کی خواہش بالکل حق بجانب تھی۔ لیکن ایک دوسری روایت کی بنا پر بعض مفسروں نے اس آیت کا نزول

واقعہ بئر معونہ

غزوہ بئر معونہ کے واقعہ کے متعلق بیان کیا ہے۔ اور وہ واقعہ یہ ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ نبی کریم صلعم نے اپنے ستر قاریوں کو ایک سردار قوم کی درخواست پر اس قوم کی تعلیم کے لئے بھیجا تو جب یہ رستہ میں ہی تھے تو ایک کنوئیں کے پاس جس کا نام بئر معونہ ہے۔ اس قوم کے چند قبیلوں نے غداری سے ان سب کو قتل کردیا۔ اور یہ قبائل رِعْل اور ذَکْوان اور عُصَیَّۃ اور بنی لِحْیان تھے۔ تو نبی کریم صلعم نے ایک مہینہ قنوت میں جو آپ نماز صبح کی دوسری رکعت میں بعد رکوع پڑھتے تھے ان پر بددعا کی۔ اور بخاری نے کتاب التفسیر میں جو حدیث ابوہریرہ سے روایت کی ہے اس میں یہ لفظ آتے ہیں وکان یقولُ فی بعضِ صلاتہ فی صلاۃِ الفجرِ اَللّٰھُمَّ العن فلانًا وفلانًا لِاَحیاءٍ من العرب حتی انزل اللہ لیس لك من الامر شیٔ یعنی آپ نماز فجر کے کسی حصہ میں کہا کرتے تھے اے اللہ فلاں فلاں پر لعنت کر عرب کے کچھ قبیلوں کا نام لیکر یہانتک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری لیس لك من الامر شیٔ تو اس حدیث کی رو سے آیت کا نزول واقعہ بئر معونہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر یہ درحقیقت اختلاف نہیں اور دونوں روایتیں درست ہیں اور اصل بات یہ ہے کہ بئر معونہ کا واقعہ اور جنگ اُحد کا واقعہ بالکل قریب قریب ہیں۔ اور ابن ہشام

۱۲۸ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

اور اللہ کیلئے ہی ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے جس کو چاہے بخش دے اور جسکو چاہے عذاب دے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے

نے لکھا ہے کہ جنگ اُحد کے صرف چار ماہ بعد غزوہ بئر معونہ ہوا۔ تو اس لئے یہ واقعہ اور جنگ اُحد کا واقعہ ایک ہی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور غالباً دونوں پر نبی کریم صلعم نے اکٹھی بددعا کی ہے اور امام احمد نے جو روایت سالم بن عبداللہ سے کی ہے تو اس میں حضرت ابن عمر کے الفاظ ان دونوں بددعاؤں کو اکٹھا کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللّٰھم العن فلاناً اللّٰھم العن الحرث بن ھشام اللّٰھم العن سہیل بن عمرو اللّٰھم العن صفوان بن امیۃ فنزلت ھذہ الاٰیۃ لیس لک من الامر شئ یعنی میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ کہتے سُنا ہے کہ اے اللہ فلاں پر لعنت کر اور فلاں پر لعنت کر اے اللہ حرث بن ہشام پر لعنت کر اے اللہ سہیل بن عمرو پر لعنت کر اے اللہ صفوان بن اُمیہ پر لعنت کر پس یہ آیت نازل ہوئی لیس لک من الامر شئ اب اس میں فلاں اور فلاں کا ذکر الگ بھی ہے اور اس سے مراد وہی قبائل عرب ہیں جیسا کہ ابوہریرہ کی روایت میں یہ لفظ فلاں فلاں کی تشریح میں موجود بھی ہیں یعنی رعل اور ذکوان وغیرہ اور سرداران قریش کا ذکر الگ ہے تو پس اگر سالم بن عبداللہ کی دونوں روایتوں کو جو بخاری میں ہیں اکٹھا کیا جائے جن میں سے ایک میں لفظ فلاں وفلاں ہیں اور دوسری میں حرث بن ہشام وغیرہ کے نام ہیں۔ تو وہ روایت بالکل صحیح ٹھہرے گی جسکو امام احمد نے بیان کیا ہے اور اس طرح پر معلوم ہوگا کہ درحقیقت نبی کریم صلعم نے ایک طرف اُحد کی تکلیفیں اُٹھاکر اور دوسری طرف اپنے ستر قاریوں کے دھوکے سے قتل کیا جانے پر دونوں قوموں پر اکٹھی بددعا کی ہے۔ اور تیس دن تک آپکے بددعا کرنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ہے جس میں آپ کو اس بددعا سے روکا گیا ۔

آنحضرت کو بددعا سے روکنے میں سبق

نبی کریم صلعم کو باوجود اس قدر خطرناک مصائب اعداء کے ہاتھ سے پیش آنے کے بددعا سے روکا جانے میں یہ سبق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں کیا کہ آپ کا وجود رحمۃ للعالمین کسی پر بددعا بھی کرے یہ عجیب بات ہے کہ وہ تینوں شخص جن پر آپنے بددعا کی بعد میں مسلمان بھی ہو گئے ایسا ہی وہ قبائل بھی مسلمان ہو گئے اس میں ان لوگوں کیلئے سبق ہے جو بات بات میں اپنے مسلمان بھائیوں پر لعنت کرتے اور ان کو بددعاؤں کی دھمکیاں دیتے ہیں بلکہ بددعائیں کرتے رہتے ہیں یہ محمد رسول اللہ صلعم کے طریق کے خلاف ہے۔ یہ سوال کیا جائیگا کہ تیس دن تک نبی کریم صلعم کیوں بددعا کرتے رہے ؟ سو وہ واقعات جن پر آپ نے بددعا کی ہے ایسے دلخراش ہیں کہ ایک شخص مخلوق الٰہی پر رحم ہی خیال کرے گا کہ ایسے ظالموں کا وجود دنیا سے مٹ جانے۔ پس ایسے ظالموں کیلئے بددعا کرنا بالکل حق تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے دوسرے پہلو کی طرف نبی کریم صلعم کو توجہ دلائی ہے کہ وہ گناہوں کو معاف کرکے ایسے لوگوں پر بھی رجوع برحمت کرسکتا ہے پس گو بددعا کرنے میں نبی کریم صلعم حق پر ہوں مگر یہ درحقیقت آپ کا کام نہ تھا جس طرح اگر آپ اہل مکہ کو جنہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا فتح مکہ پر قتل کر دیتے تو آپ حق بجانب ہوتے مگر آپنے افضل طریق کو اختیار کیا اور سب کو معاف کر دیا بلکہ ان پر ملامت تک نہ کی۔ اسی طرح بتقاضائے بشریت آپنے بددعا کی اور اس بددعا میں کوئی ناانصافی نہ تھی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک افضل مقام کی طرف توجہ دلائی اور اب ہم مسلمانوں کے لئے وہی طریق مناسب ہے جس پر چلنے کی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ہدایت کی ۔

رحمت کا غضب پر سبقت لے جانا

اس آیت میں رجوع برحمت کرنے کو عذاب پر مقدم کیا ہے (حالانکہ فانھم ظالمون میں صاف بتا دیا ہے کہ مستحق تو بیشک یہ عذاب کے ہیں) اور اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور عذاب کے ذکر میں مغفرت کو عذاب پر مقدم کیا اور اس طرح پر بتا دیا ہے کہ مغفرت اور رحمت کا جوش کس قدر وسیع ہے۔ اور رحمت غضب پر سبقت لیگئی ہے پھر اس آیت کا خاتمہ تو فانھم ظالمون پر کیا یعنی لوگوں کی حالت کیسی ہے۔ اور اگلی آیت کا خاتمہ واللہ غفور رحیم پر کیا یعنی اس کی صفات کا تقاضا غفر و رحم ہے گو انسان ظلم ہی کرے ۔

رکوع ۱۴ ۵ — کامیابی کی راہیں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۱۲۹

اے لوگو جو ایمان لائے ہو بڑھا بڑھا کر سود نہ کھاؤ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ۵۱۵

اضعاف

۵۱۵ اضعافاً مضاعفۃ - اضعاف ضِعف کی جمع ہے۔ ۳۱۴ اور اضعافاً مضاعفۃ۔ ربوٰ سے حال واقع ہوا ہے عرب میں یہ دستور تھا اور ایسا ہی دستور قریباً تمام سود خواروں میں ہے کہ جب قرضہ کی میعاد پوری ہو جاتی اور قرضہ ادا نہ ہوتا تو سود کو اصل رقم میں بڑھا کر پھر از سر نو اس پر سود لگایا جاتا اور یوں تھوڑی مدت میں مدیون کی ناداری سے ایک چھوٹی سی رقم بڑی بھاری رقم بن جاتی۔ اور مطلب یہ نہیں کہ صرف کئی گنا کر کے سود مت کھاؤ اور تھوڑا کھا لو بلکہ مراد توبیخ ہے یعنی سود کی تو حالت یہی ہے کہ وہ کئی کئی گنا بن جاتا ہے پس تم سود مت کھاؤ ✦

حرمت سود جنگوں کے روکنے میں معاون ہے

چونکہ جنگ اُحد میں مسلمانوں کو اپنی کسی غلطی کی وجہ سے بہت سی تکلیف اُٹھانی پڑی اس لئے اسی جنگ کے ذکر میں اب اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کو کن راہوں پر چلنا چاہئے اور انکی کامیابی کی اصل راہیں کیا ہیں۔ سب سے پہلی آیت میں حرمت سود کا ذکر ہے تعلق یہ ہے کہ پہلے رکوع میں جنگ اُحد کا ذکر تھا۔ اور اسی اثنا میں اہل اسلام کی نصرت اور کفار کے کاٹنے کا ذکر کیا تو اب ایک ایسے امر کی طرف توجہ دلاتا ہے جس پر گویا دنیا کے جنگوں کی کامیابی کا دارومدار رکھا ہے اور وہ سود ہے۔ اور یہ صرف آج کی بات ہی نہیں کہ سود کے روپے کے ساتھ جنگوں کو جاری رکھا جاتا ہے اور جس قدر کوئی قوم زیادہ سودی روپیہ لے سکتی ہے اسی پر اس کی جنگ میں کامیابی کا دارومدار ہے۔ بلکہ عرب میں بھی جنگوں کا انحصار بہت کچھ سود پر تھا کیونکہ یہ لوگ جو روپیہ جنگوں پر خرچ کرتے تھے وہ عموماً سود اور جوئے کی کمائی کا روپیہ ہوتا تھا۔ اسی لئے سورۃ بقرہ میں جنگوں کے ذکر میں شراب اور جوئے سے منع کیا تھا۔ تو اب جنگ کے ہی ذکر میں سود سے روکا ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے ان اکثر اموال المشرکین کانت قد اجتمعت من الربا وکانوا ینفقون تلك الاموال علی العساکر یعنی اکثر مال مشرکوں کے سود سے جمع ہوتے تھے اور یہی جمع شدہ مال وہ لشکروں پر خرچ کرتے تھے۔ اسلام نے جہاں ایک طرف ضرورت جنگ کو تسلیم کیا ہے اور ان حالات میں جب ایک قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہو اسے ضروری قرار دیا ہے دوسری طرف ان تمام موجبات کو جو جنگ کے بلاضرورت جاری رکھنے کا موجب ہو سکتے ہیں دور یا کم کرنا چاہا ہے۔ اب سود پر روپیہ ملتا جانے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو اشخاص برسر حکومت ہوں وہ بلاضرورت اور بغیر قوم کی خواہش کے جنگ کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ اگر سود کو اُڑا دیا جائے تو ہر قوم صرف اس حد تک جنگ جاری رکھ سکے گی جب تک اس کی اپنی ہستی معرض خطر میں ہو اور اس حال میں قوم کا ہر ایک بھی خواہ اپنے مال اور اپنی طاقت کو جنگ میں کامیابی حاصل کرنے پر لگائیگا۔ لیکن اگر قوم اپنے آپ کو ایسا معرض خطر میں نہیں سمجھتی اور اپنی طاقت اور مال کو جنگ پر لگانے کیلئے تیار نہیں۔ بلکہ وہ جنگ کو بھی محض سود سے روپیہ حاصل کرنے کا اور دوسری قوموں کو سودی روپیہ دیکر اپنے نیچے دبا کر رکھنے کا ایک ذریعہ بنانا چاہتی ہے تو یہ جنگ بلاضرورت ہے اگر ہمدردی انسانی جنگ کی محرک ہے۔ تو روپیہ اور طاقت اس پر بلامعاوضہ خرچ ہونا چاہئے۔ سود پر روپیہ دینا کسی ہمدردی انسانی کے باعث نہیں ہوتا بلکہ روپیہ کمانے کی غرض سے ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو سمجھایا جاتا کہ تمہاری جنگوں کا صرف ایک ہی موجب ہو سکتا ہے بقائے قوم یا قیام امن کی ضرورت سو اس ضرورت پر بتقاضائے ہمدردی انسانی اپنے مال اور طاقت کو لگاؤ اور یہ نہ کرو کہ جنگوں کو روپیہ کمانے کا ذریعہ بنا کر بلاوجہ ان جنگوں کو طول دیتے جاؤ ✦

حرمت سود کے دو موقعوں پر ذکر کرنے میں ایک بتعلق صدقات و انفاق اور دوسرے جنگوں کے تعلق میں ایک اور حکمت بھی معلوم ہوتی ہے۔ پہلی سورت میں اصل خطاب یہود سے تھا اور یہودیوں میں سود خواری نے بخل کا مرض پیدا کیا تھا کہ وہ

۱۳۱ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ ۚ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۟

اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۵۱۶

خیراتی کاموں پر روپیہ لگانے میں بہت مضائقہ کرتے۔ اس لئے وہاں صدقات کا ذکر کرتے ہوئے سود سے روکا اور اس سورت میں عیسائی بالخصوص مخاطب ہیں اس لئے یہاں عین جنگ کے ذکر میں سود خواری سے روکا ہے۔ کیونکہ عیسائی قوم نے سود خواری سے بڑا فائدہ یہ اٹھانا تھا کہ اس کے ذریعہ سے بلا ضرورت جنگیں کر کے نسل انسانی کو تباہ کریں ✦

مسلمانوں کی کامیابی اللہ اور رسول کی اطاعت میں ہے۔

۵۱۶ اس آیت میں بتایا ہے کہ اصل کامیابی تمہاری یہ نہیں کہ تم جنگ کر کے بڑی فاتح قوم بن جاؤ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر قائم رہو۔ مسلمانوں نے جنگیں کیں بڑے فاتح بھی دنیا میں بنے دنیا کے مالک بھی بنے مگر جب اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت چھوڑ دی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ترقی کے اوج سے قعر ذلت میں گرے۔ اب بھی اگر وہ دنیا میں اٹھ سکتے ہیں تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے نہ اپنی تجویز کردہ راہوں سے ✦

رسول کی اطاعت شرک نہیں، وہ اللہ کی اطاعت میں داخل ہے

اس زمانہ میں جب مسلمانوں نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی بجائے اربابًا من دون اللّٰه کی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں پر رکھ لیا۔ اور آنکھیں بند کر کے اپنے علماء اور پیروں کے پیچھے لگ گئے۔ تو ایک گروہ نے تفریط میں مبتلا ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے جوئے کو بھی پھینک دینا چاہا۔ اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کے شامل کرنے کو بھی شرک قرار دیا نعوذ باللّٰه من ذالک۔ انہوں نے شاید اطاعت اور عبادت کا مفہوم ایک لے لیا ہے۔ عبادت غیر اللہ کی خواہ نبی ہو بیشک شرک ہے لیکن اطاعت تو اولوا الامر یعنی حکام کی بھی ہو سکتی ہے۔ پھر نبی کی اطاعت شرک کیونکر ہو گئی اور یہ کہنا کہ رسول اللہ کی اطاعت ان آیات کے خلاف ہے ان الحکم الا للّٰه یقص الحق وھو خیر الفاصلین (الانعام ۶-۵۷) ان الحکم الا للّٰه امر ان لا تعبدوا الا ایاہ (یوسف ۱۲-۴۰) یعنی حکم صرف اللہ کیلئے ہی ہے اور لا یشرک فی حکمه احدا (الکھف ۱۸-۲۶) وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا صحیح نہیں اسلئے کہ جب اللہ تعالیٰ خود ہی حکم دے کہ تم رسول کی اطاعت کرو تو پھر رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت میں داخل ہوئی۔ اور وہ کوئی علیحدہ بات نہیں جس طرح ایک بادشاہ جب بعض وزراء کے سپرد ایک کام کر دیتا ہے یا وزرا گورنروں کے سپرد ایک کام کر دیتے ہیں علیٰ ہذا تو ان گورنروں، اور وزرا کے حکم کی اطاعت بادشاہ کے حکم کی اطاعت ہی ہے سوائے اس صورت کے کہ وہ لوگ بادشاہ کے حکم کے خلاف کوئی حکم جاری کریں اسی طرح اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کرو اطیعوا اللّٰه واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (النساء ۴-۵۹) تو کیا اب اولی الامر کی اطاعت شرک میں داخل ہے اور نعوذ باللہ خدا نے خود ہی شرک کی تعلیم دی ہے نہیں بلکہ ان کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت ہی ہے چونکہ اسی کے حکم کے ماتحت ہے۔ اس کی اور مثالیں بھی ہیں ایک جگہ ہے افغیر اللّٰه ابتغی حکمًا (الانعام ۶-۱۱۵) کیا میں اللہ کے سوائے کوئی حکم چاہوں دوسری جگہ ہے فابعثوا حکمًا من اھله وحکمًا من اھلھا (النساء ۴-۳۵) ایک حکم مرد کے اہل سے اور ایک عورت کے اہل سے مقرر کرو۔ خدا بھی حَکَم اور یہ بھی حَکَم مگر چونکہ وہ خدا کے حکم کے ماتحت حکم ہیں اس لئے یہ شرک نہیں ✦

وٓ تفسیر کیلئے نہیں آتی

اور اطیعوا اللّٰه والرسول کی جو تاویل کی جاتی ہے کہ یہاں واؤ تفسیری ہے اور رسول کے معنی یہاں پیغام ہیں نہ پیغامبر تو اس کے لئے کوئی دلیل چاہئے لیکن نہ صرف دلیل اس کی تائید میں کوئی نہیں بلکہ کئی دلائل سے اس کا بطلان ہوتا ہے۔ اول یہ کہ واؤ تفسیر کے لئے آیا کرتی ہے یہ دعویٰ بلا دلیل ہے جسکی کوئی سند زبان عربی میں نہیں۔ ہاں واؤ کا استعمال بعض وقت عطف علی المرادف کیلئے ہوتا ہے دیکھو مغنی اللبیب بیان واؤ یعنی دو مرادف لفظ (ایسے لفظ جنکے معنی قریبًا یکساں ہیں اور بہت باریک فرق ہے) ایک دوسرے پر واؤ کے ذریعہ سے عطف ہو جاتے ہیں جیسے انما اشکوا بثی وحزنی الی اللّٰه (یوسف ۱۲-۸۶)

وَسَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ جَنَّۃٍ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ ۙ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ۱۳۲

اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جلدی کرو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے وہ متقیوں کیلئے تیار کی گئی ہے[۵۱۷]

میں بثّ اور حزن ایک دوسرے پر عطف ہیں مگر اللہ اور رسول کو آج تک کسی نے مرادف نہیں کہا کہ یہاں واؤ کا استعمال عطف علی المرادف کے طور پر لیا جائے۔ دوم رسول کے بہرحال دو معنی ان تاویل کنندگان کو بھی مسلم ہیں ایک پیغامبر اور دوسرے پیغام۔ اور اللہ کے معنی ایک کے سوائے دوسرے آج تک کسی نے نہیں سنے اور تفسیر مبہم یا ذومعنی لفظ کی واضح سے ہوا کرتی ہے نہ واضح لفظ کی مبہم سے۔ اب اللہ واضح ہے اس کی تفسیر ایسے لفظ سے جو دو معنی رکھتا ہے انسان بھی نہیں کریگا چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس بات کو منسوب کیا جائے۔ سوم اگر واضح لفظ کی تفسیر کی ضرورت ہی تھی تو ایک دفعہ تفسیر کر دینا کافی تھا۔ بار بار اس تفسیر کی کیا ضرورت تھی۔ چہارم گو لغت میں رسول کے معنی پیغامبر اور پیغام دونوں لکھے ہیں لیکن قرآن کریم نے خود فیصلہ کر دیا جب فرمایا محمد رسول اللہ حالانکہ القرآن رسول اللہ کہیں نہیں فرمایا۔ پس جب قرآن شریف نے خود تصریح کر دی کہ رسول اللہ محمد ہیں تو اس معنی کو چھوڑ کر ہم دوسرے معنی کیوں اختیار کریں ✦

رسول۔ اللہ کی تفسیر نہیں

۵۱۷ عَرۡض۔ عرض کے اصل معنی چوڑائی ہیں جو طول کے خلاف ہے اور اصل استعمال اس کا اجسام کے متعلق ہے لیکن غیر اجسام میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے فذو دعاء عریض (حٰمٓ السجدۃ ۴۱-۵۱) اور کہا گیا ہے کہ اسکے عرض سے مراد اس کی وسعت ہو مگر نہ بلحاظ مساحت کے بلکہ بلحاظ مسرت کے (غ) اور اس کی مثال امام راغبؒ یہ دی ہے کہ جیسا کہ اس کے خلاف کہدیا جاتا ہے۔ الدُّنیا علیٰ فُلانٍ حَلۡقَۃُ خَاتَمٍ دنیا فلاں پر ایک انگوٹھی کا حلقہ بن گئی۔ یا کہا جاتا ہے وسعۃ ھٰذہ الدار کسعۃ الارض اس گھر کی وسعت زمین کی وسعت کی طرح ہے۔ اور تیسرے معنی عرض کے امام راغب نے یہاں بَدَل اور عِوَض کئے ہیں یعنی اس کی قیمت زمین و آسمان ہیں ✦

عرض

کیا پاک تعلیم ہے۔ کہاں جنگوں کا ذکر اور کہاں یہ ہدایات۔ کیا خوبی سے بتا دیا کہ جنگ کوئی اصل غرض نہیں بلکہ اصل غرض اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا حاصل کرنا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے جو سامان مختلف کسی وقت میں ہوں ان کے حصول کیلئے جلدی کرنی چاہئے۔ اور چونکہ اوپر ذکر کیا تھا کہ نار کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے تو یہاں بتایا ہے کہ متقیوں کیلئے تو جنت تیار کی گئی ہے پس اس کے حصول کے لئے جلدی قدم اٹھانا چاہئے۔ اور جیسے کافر کیلئے آگ اور متقی کیلئے جنت آخرت میں ہے اسی طرح اس دنیا میں بھی کافر کے دل پر آگ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور متقی کے لئے جنت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ✦

مغفرت الٰہی اصل غرض ہے

یہاں جنت کے متعلق فرمایا کہ اس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ اس سے کیا منشاء ہے بعض کے نزدیک آخرت کے آسمان اور زمین اور ہونگے۔ اس لئے مراد یہ ہے کہ جنت کی چوڑائی اس دنیا کے آسمان و زمین کے برابر ہوگی۔ اور اس پر یوم تبدل الارض غیر الارض والسمٰوات (ابراہیم ۱۴-۴۸) کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ (غ)۔ اور بعض نے اس کے معنی قیمت کرلئے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا۔ اور بعض نے کہا کہ یہ کلام کنایہ ہے حد درجہ کی فراخی سے (ر) گویا اتنی وسیع جنت ہوگی جو انسان کے وہم و گمان میں آسکتی ہے۔ مسند امام احمد حنبل میں ایک حدیث ہے کہ ہرقل نے نبی کریم صلعم کو لکھا تھا کہ آپ مجھے اس جنت کی طرف بلاتے ہیں جس کا عرض آسمان اور زمین ہیں۔ تو پھر دوزخ کہاں ہے آپ نے فرمایا سبحان اللہ این اللیل اذا جاء النہار۔ پاک ہے ذات اللہ کی رات کہاں ہوتی ہے جب دن آجاتا ہے اور ابن جریر میں بھی ایسی ہی روایت ہے اور ایک روایت سے حضرت عمر کا یہی جواب یہود کو دینا معلوم ہوتا ہے اور ایک میں حضرت ابن عباس نے یہی جواب ایک اہل کتاب کو دیا۔ اور ایک روایت ابوہریرہ سے انہی الفاظ کی ہے کہ نبی کریم صلعم نے ایسا فرمایا تھا (د) پس اس قدر مختلف

وسعت جنت

۱۳۳ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ

جو لوگ آسودگی اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں اور سخت غضب کو دبا لینے والے اور

الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۚ

لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے ۵۱۸

طریقوں سے یہ روایت آتی ہے کہ الفاظ قرآنی کی تفسیر میں مقدم اسی کو کرنا ہوگا ✦

مکان جنت کی کیفیت اس عالم کی طرح نہیں

اس مثال کی مفسرین نے عموماً یہ توجیہ کی ہے کہ جب ایک حصہ پر دن ہوتا ہے تو دوسرے حصہ پر رات ہوتی ہے ۔ یہ تو صحیح ہے مگر اس صورت میں کوئی شخص یہ نہیں کہیگا کہ دن سارے آسمان اور زمین پر محیط ہے ۔ اصل یہ ہے کہ حضرت نبی کریم صلعم نے جنت و نار کی وسعت کو سمجھانے کیلئے مکان کی بجائے کیفیت کی مثال دی ہے ۔ کیونکہ دن اور رات یا نور و ظلمت درحقیقت دو کیفیات ہیں ۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جنت و نار کی تمام چیزوں کی کیفیات وہ نہیں جو اس عالم کی ہیں کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین (السجدۃ ۳۲-۱۷) اور حدیث فرماتی ہے ما لاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم اس عالم کے مکان کے تصور کے ماتحت جنت و نار کو نہ لاؤ ۔ بلکہ اس کو سمجھانے کیلئے دو کیفیات روشنی اور تاریکی کی مثال دی ہے ۔ اور جب ہم زیادہ غور کرتے ہیں تو حق یہی معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ قرآن کریم میں جو نقشہ جنت و نار کا کھینچا گیا ہے اس میں ایک طرف تو ان دونوں میں اس قدر بعد ہے کہ فرمایا لا یسمعون حسیسہا (الانبیاء ۲۱-۱۰۲) اہل جنت دوزخ کی آہٹ کو بھی نہ سنیں گے ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں کہ دوزخ کو اپنی آنکھوں سے تو دیکھیں گے مگر اس کی آواز کو نہ سنینگے ۔ بلکہ اصل غرض صرف اظہار بعد ہے ۔ اور دوزخ کا نظارہ آنکھ کے سامنے رہنا اس حقیقی راحت کے ساتھ کیونکر جمع ہو سکتا ہے جس کا اہل جنت کو حاصل ہونا قرآن کریم سے صاف معلوم ہوتا ہے دوسری طرف اہل جنت اور اہل نار باہم بات چیت بھی کرتے ہیں اور دوزخ والے جنتیوں سے پانی بھی مانگتے ہیں اور دیگر نعماء کا بھی سوال کرتے ہیں ۔ اور جنتی انکو جواب بھی دیتے ہیں پس وہ ایک دوسرے کی باتوں کو سنتے ہیں مگر اس خطرناک آگ کی آہٹ کو نہیں سُنتے جس کی زفیر و شہیق کی دنیا میں کوئی نظیر ہی نہیں ۔ پھر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں فاطلع فراٰہ فی سواء الجحیم (والصّٰفّٰت ۳۷-۵۵) مگر آگ کی لپٹوں اور اسکی خطرناک اذیتوں کو نہیں دیکھتے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُس عالم میں مکان کا وہ رنگ نہیں جو اس عالم میں ہے ✦

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بعض کے نزدیک اتنی بڑی جنت جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے وہ ایک ایک شخص کیلئے ہوگی وقیل ان الجنۃ التی عرضہا عرض السموٰت والارض انما تکون للرجل الواحد لان الانسان انما یرغب فیما یصیر ملکا لہ (رغ) اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک شخص کی جنت اس قدر وسیع ہے کہ سارے آسمانوں اور زمین پر محیط ہوگی لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کے دخل سے محفوظ ہوگی کیونکہ خاص اسی کی ملک ہوگی جس طرح ہر ایک شخص اللہ تعالیٰ کی پوری پوری مغفرت کو حاصل کر سکتا ہے مگر اس کا اسے حاصل کرنا دوسرے کیلئے مانع نہیں اسی طرح ہر ایک شخص ساری جنت کو بھی حاصل کر سکتا ہے ۔ مگر اس کا اسکو حاصل کر لینا دوسرے کے حاصل کر لینے سے مانع نہیں اس کی مثالیں اس دنیا میں بھی ملتی ہیں جیسے مثلاً سورج ہم میں سے ہر ایک کا بھی ہے اور سب کا بھی ہے جو فائدہ میں اس سے اُٹھاتا ہوں وہ دوسرے کیلئے مانع نہیں ۔ اور حق تو یہ ہے کہ کچھ رنگ اس دنیا میں جنت و نار کا ہر ایک کو مل جاتا ہے ۔ اس سے جو کچھ ہر ایک انسان خود سمجھ سکتا ہے وہ دوسرے کو الفاظ میں سمجھا نہیں سکتا ✦

سراء ۔ ضراء

ع ۵۱۸ السّراء ۔ الضّراء ۔ سراء سُرور سے ہے (مادہ سرر ہے) اور ضراء ضر سے ہے اور ضراء کے مقابلہ پر سراء بھی آتا ہے

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا　　۱۳۴

اور وہ　　جو جس وقت وہ کوئی

اور نعماء بھی ۔ پہلے کی مثال یہی ہے اور دوسرے کی مثال ہے ولئن اذقناہ نعماء بعد ضراء ۔ اور سراء حالت غنا کا نام ہے اور ضراء حالت فقر کا ✦

کظم — الکاظمین ۔ کَظْم ۔ مخرج النفس کو کہتے ہیں یعنی سانس کے مخرج کو اور کُظُوم اِحْتِبَاس النَّفَس یعنی سانس کا روکنا ہے اور اس سے مراد خاموش ہونا لیا جاتا ہے اور کظم غیظ سے مراد غضب کا روکنا ہے اور کَظَمَ السِّقَاء کے معنی ہیں مشکیزہ کو بھر کر اس کا منہ باندھ دیا تاکہ پانی باہر نہ نکلے (غ)، کظم غیظ کا استعارہ بھی اسی سے لیا گیا ہے غیظ کے لئے دیکھو ۵۰۶

خوشحالی اور تنگی میں انفاق — اس آیت میں متقیوں کے چار اوصاف کا ذکر کیا ہے ۔ اول وہ خوشحالی اور تنگی میں برابر خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ۔ دونوں آخری حدود کے اندر تمام درمیانہ حالتیں خود ہی آجاتی ہیں اور انسان کیلئے دو حالتوں میں خرچ کرنا ہی بہت مشکل ہوتا ہے ایک جب وہ حد درجہ کے آرام اور راحت میں ہو کر اس وقت خدا کو بھول جاتا ہے ۔ اور دوسرے جب حد درجہ کی تنگی کی حالت میں ہو کر اس وقت جو کچھ اسے مشکل اپنی ہی ضرورت پورا کرنے کیلئے مکتفی ہوتا ہے پس ان دو حالتوں کا ذکر کرکے بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ایسا تعلق ہونا چاہئے ۔ کہ جب تمام طرف راحت کے ہی سامان نظر آتے ہوں اور دنیا میں انسان اپنے آپ کو کسی کا محتاج نہ سمجھتا ہو تب بھی خدا کا محتاج اپنے آپ کو جانکر اس کی راہ میں دے اور مال کی محبت پر اللہ تعالیٰ کی محبت کو ترجیح دے اور جب یہ سمجھتا ہو کہ میں اس قدر تنگ دست ہوں کہ میری ضرورتوں سے کچھ نہیں بچتا تب بھی اپنی ضرورتوں کو پیچھے کرکے اور محرومی کے باوجود اپنے آپ کو محروم کرتے ہوئے خدا کی راہ میں خرچ کرے ایک حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے پوچھا کہ تم میں سے کون ہے جس کے نزدیک اپنے مال سے اپنے وارث کا مال زیادہ محبوب ہو تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ سب کے نزدیک ہو اپنا مال وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہوتا ہے تو آپ نے فرمایا نہیں بلکہ حالت اس کے برعکس ہے مالك من مالك الا ما قدمت و مال وارثك الا ما اخرت (ث) تیرے مال سے کچھ بھی تیرے لئے نہیں مگر وہی جو تو آگے بھیجے اور جو تو پیچھے رکھتا ہے وہی تیرے وارث کا مال ہے ✦

غضب کا دبانا — دوسری صفت کظم غیظ ہے ۔ جو شخص اسبات پر قادر ہو کہ وہ غیظ یعنی سخت سے سخت غضب کو روک لے وہ گویا اپنے کل جذبات پر قادر ہو گیا صحیح حدیث میں ہے لیس الشدید بالصرعۃ ولکن الشدید الذی یملك نفسہ عند الغضب یعنی پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں دوسروں کو پچھاڑ لیتا ہے ۔ بلکہ پہلوان وہ ہے جو غضب کے وقت اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے ۔ (متفق علیہ) اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا مَن کظم غیظا وھو یقدر علی انفاذہ ملأ اللہ جوفہ امنا و ایمانا (ث) جو شخص سخت غضب کو روک لے درانحالیکہ وہ اسکے نکالنے پر قدرت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے پیٹ کو امن اور ایمان سے بھر دیتا ہے ۔ اور ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان کو غضب آئے تو اس کے دبانے میں اس سے بھی مدد ملتی ہے کہ اس حالت میں وضو کرلے اس سے غضب کی آگ فرو ہو جاتی ہے ✦

تیسری صفت عافین عن الناس کی ہے ۔ لوگوں کی خطاؤں پر درگزر کرنے والے یہانتک کہ ان خطاؤں کو مٹا ہوا سمجھیں ۔ یہ کظم غیظ سے بڑھکر صفت ہے ۔ اس لئے کہ کظم غیظ صرف غصہ کو روک لینے کا نام ہے ۔ اور عفو یہ چاہتا ہے کہ خطا کو بالکل کالعدم سمجھا جائے اور اس پر کسی قسم کی گرفت نہ کی جائے نہ کسی قسم کے انتقام کا خیال دل میں لایا جائے حدیث میں آتا ہے ثلث اقسم علیھن ما نقص مال من صدقۃ و ما زاد اللہ عبدا بعفو الا عزا و من تواضع للہ

فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۫ وَمَنْ

برا کام کرتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں اللہ کو یاد کرتے ہیں پھر اپنے قصوروں کیلئے بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے

۱۳۵ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۫ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ

سوا کون قصوروں کو بخشتا ہے اور جو کر بیٹھیں اس پر اصرار نہیں کرتے درانحالیکہ وہ جانتے ہوں [519] انہی کیلئے

جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

بدلہ اپنے رب کی مغفرت اور باغ ہیں جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں

۱۳۶ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ قَدْ خَلَتْ مِنْ

ان میں رہینگے اور کام کرنیوالوں کا اجر کیا ہی اچھا ہے [520] تم سے پہلے واقعات

رضی اللہ (ت) تین باتوں پر میں قسم کھاتا ہوں ایک یہ کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ جو شخص عفو کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو عزت میں ہی بڑھاتا ہے اور تیسرے یہ کہ جو اللہ کیلئے تواضع کرے اللہ اس کا رفع کرتا ہے +

محسن — پھر خطاؤں کے عفو سے بڑھکر محسنین کا مرتبہ ہے جو کسی کی خطا پر غضب کو ہی نہیں روکتے اس سے عفو ہی نہیں کرتے بلکہ اس پر احسان بھی کرتے ہیں۔ یہ کمال کا آخری مرتبہ ہے +

اُحد کی جنگ میں بعض لوگوں کی غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا اس لئے اب ان کو بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ نہ صرف اپنے غصہ کو دبا جائیں نہ صرف ان کی خطاؤں کو معاف کریں بلکہ ان پر احسان بھی کریں۔ ایسا ہی معاملہ احد کے موقع پر اور فتح مکہ میں قریش کے ساتھ نبی کریم صلعم نے کیا +

فاحشۃ — **۵۱۹** فاحشۃ فعل ہو یا قول جس کی قباحت بھاری ہو [206] یہاں اوظلموا انفسہم کے بالمقابل فاحشۃ کو لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ فاحشۃ سے یہاں وہ امور مراد ہیں جن کی قباحت کا اثر دوسرے پر ہوتا ہے اور ظلموا انفسہم سے مراد وہ ذنوب ہیں جن کا بد اثر دوسروں پر تو نہ ہو مگر اپنے آپ کو ہی ان کا نقصان پہنچے +

اصرار — یصروا۔ صرّ کے اصل معنی مضبوط باندھنا ہیں اور اصرار کے معنی ہیں کسی قصور پر پختہ ہو جانا اور اسمیں مضبوط ہو جانا اور اس سے جدا ہونے سے رُکنا (غ) +

پہلی آیت کے متقی تو نہایت اعلیٰ درجہ پر ہیں۔ جو دوسروں کے قصوروں کو معاف کرنے والے اور ان سے احسان کرنیوالے ہیں۔ اس آیت میں اس سے کم مرتبہ کے متقیوں کا ذکر ہے۔ ان سے بعض وقت کوئی بڑی قباحت والا کام سرزد ہو جاتا ہے یا اپنی ہی جان پر ظلم کرتے ہیں تو وہ استغفار کرتے ہیں۔ یہاں استغفار میں دونوں باتیں داخل ہیں جو کچھ کر چکے ہیں اس کے بد تاثرات سے بچنے کی دعا اور آیندہ ایسے گناہ میں پڑنے سے بچنے کی دعا +

عمل — **۵۲۰** عاملین عمل ہر وہ فعل ہے جو ایک جاندار قصد سے کرتا ہے پس فعل عام ہے اور عمل خاص ہے انسان کے سوائے دوسرے حیوانات سے بھی فعل سرزد ہو سکتا ہے مگر عمل نہیں (غ)، عمل وہی ہے جو انسان کو کسی اچھے یا بُرے اجر کا مستحق ٹھہراتا ہے

عامل — اور گو عمل اچھے اور بُرے دونوں پر آتا ہے مگر قرینہ صاف بتاتا ہے کہ یہاں عاملین سے مراد اچھے کام کرنے والے ہیں +

قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

گزر چکے ہیں — پس تم زمین میں پھرو — پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا — (یعنی بُرا)

الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ ۱۳۷

انجام ہوا ۵۲۱ — یہ لوگوں کے لئے بیان اور ہدایت — اور متقیوں کے لئے — وعظ ہے ۵۲۲

مغفرت — آیت ۱۳۲ میں فرمایا تھا کہ مغفرت اور جنت کی طرف جلدی آؤ تو درمیان میں ان لوگوں کی صفات بیان کرکے جو مغفرت اور جنت کے حقدار ہوتے ہیں یہاں پھر ان کا اجر بیان فرمایا کہ ایسے لوگوں کو ضرور مغفرت اور جنت عطا ہوتی ہے۔ مغفرت کو قرآن کریم نے جنت کے ساتھ جمع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ مقام ہے۔ آیت کے آخر پر پھر نعم اجر العاملین لاکر بتا دیا کہ یہ عظیم الشان اجر کام کرنے پر ہی ملتا ہے۔ بغیر کام کے کچھ نہیں +

سُنّة — ۵۲۱ سُنَن۔ سُنّة کی جمع ہے (جس کا مادہ سنن ہے) اور سُنّة طریقہ کو کہتے ہیں۔ اور ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت سے مراد آپ کا طریقہ ہے جس پر آپ چلتے تھے۔ اور سُنّة اللہ کے معنی ہیں طریقۃ حکمتہ وطریقۃ طاعتہ (غ) یعنی اس کی حکمت کی راہ اور اس کی فرمانبرداری کی راہ اور یہاں لفظ عام ہے اور مراد اس کی سیاق عبارت سے ظاہر ہے یعنی اُمم سابقہ کی ہلاکت اور استیصال کے طریق۔ یا ان کے ساتھ جو واقعات گزرے اور مفضل نے یہاں مراد محض اُمم لی ہے۔ کیونکہ عرب کے کلام میں سنة بمعنی اُمّة بھی آیا ہے (ر) اور عطاء نے معنی شرائع اور ادیان لئے ہیں پس مراد یہ ہے کہ تم سے پہلے قومیں گزر چکی ہیں یا دین ہو چکے ہیں یا واقعات ہلاکت ہو چکے ہیں۔ غرض سب کی ایک ہے +

تکذیب — المکذبین۔ تکذیب کے معنی کسی شخص کو جھوٹ کی طرف منسوب کرنا یعنی اسے اپنے کلام یا دعوے میں کاذب قرار دینا۔ خواہ وہ سچا ہو یا جھوٹا۔ مگر قرآن شریف میں صادق کی تکذیب پر ہی یہ لفظ بولا گیا ہے۔ اس لئے کوئی قرینہ نہ ہو تو مُکذِّب سے مراد سچائی کا جھٹلانے والا ہو گا۔ اس آیت سے پھر جنگ اُحد کی طرف رجوع کیا ہے۔ اور پہلے مومنوں کو تسلی دی ہے کہ مکذبین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تم سے پہلے بہت مثالیں گزر چکی ہیں۔ اگر کوئی شخص چاہے تو زمین میں پھر کر دیکھ لے۔ فسیروا فی الارض میں سیر فی الارض کا امر لازمی نہیں۔ بلکہ صرف ان کا حال معلوم کرنے کی ایک راہ بتائی ہے کہ چاہو تو زمین میں پھر کر دیکھ لو۔ ہر زمین میں یہی خدا کا قانون پاؤ گے کہ حق کی تکذیب کرنے والے برباد ہوئے۔

۵۲۲ ھٰذا۔ میں اشارہ قرآن کریم کی طرف ہے۔ یا جو کچھ کفار اور متقیوں کے متعلق بیان ہوا ہے اس کی طرف یا انجام مکذبین کی طرف بیان۔

بیان — بیان سے ہے۔ اور بَیَان کے معنی ہیں الکشف عن الشیء (غ) کسی چیز کی اصل حقیقت کا واضح کرنا۔ اور یہ لفظ نطق سے عام ہے۔ کیونکہ نطق انسان سے خاص ہے اور بیان کسی خاص حالت پر دلالت کرنے کو بھی کہا جا سکتا ہے اور خبر دینے کو بھی خواہ وہ بذریعہ نطق ہو یا لکھ کر یا کنایہ کے طور پر (غ)۔ اور بیان اور ہدیٰ میں یہ فرق ہے کہ بیان عام ہے یعنی خواہ کسی قسم کا بھی اظہار معنی ہو۔ اور ھُدیٰ خاص ہے۔ موعظة کے لئے دیکھو ۹۵

بیان اور نطق میں فرق

یہاں قرآن کریم کو یا جس حالت کا یہاں ذکر کیا ہے اسے لوگوں کے لئے کھول کر بتا دینے والا کہا ہے۔ پھر اسے ہدیٰ کہا ہے یعنی بھلائی کی راہ بتانے والا بیان۔ یہ دونوں للناس ہیں یعنی سب لوگوں کے لئے اور بالآخر اسے متقیوں کے لئے وعظ کہا ہے یعنی متقیوں کو بری راہ سے ہٹا دینے والا اور خیر کی راہ پر چلانے والا +

۱۳۹ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحۡزَنُوا وَأَنتُمُ ٱلۡأَعۡلَوۡنَ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ ۝ إِن

اور نہ سُست ہو اور نہ غمگین ہو اور تم ہی غالب رہو گے جب تم مومن ہو ۵۲۳ اگر

يَمۡسَسۡكُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ ٱلۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهُۥۚ وَتِلۡكَ ٱلۡأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيۡنَ

تم کو کوئی زخم پہنچا ہے تو یقیناً اسی طرح کا زخم (لوگوں کو بھی) پہنچا ہے اور ان دنوں کو ہم لوگوں میں نوبت بہ نوبت لاتے

ٱلنَّاسِ وَلِيَعۡلَمَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمۡ شُهَدَآءَۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ ٱلظَّٰلِمِينَ ۝

رہتے ہیں ۵۲۴ اور تاکہ اللہ ان کو جان لے جو ایمان لائے اور تم میں سے شہید بنائے اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا

وَھن — **۵۲۳** تَھِنُوا۔ وَھن سے ہے جس کے معنی ہیں کمزوری جو جسمانی بناوٹ کے سبب سے ہو یا خُلق کے (غ) وھن العظم منی (مریم ۱۹-۴)

اِنْ — اِنْ ۔ بعض نے اِنْ کو اس موقعہ پر شرطیہ لیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طرز محض زیادہ ترغیب کے لئے اختیار کی گئی ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کو کہے ان کنت ابنی فلا تفعل کذا اگر تو میرا بیٹا ہے تو ایسا مت کر۔ مگر کوفیوں کے نزدیک یہاں اِنْ بمعنی اِذْ ہے یعنی جب کیونکہ شرط تو ہمیشہ آیندہ کے متعلق ہوتی ہے اور یہ امر واقع ہو چکا ہے اس قسم کی اور بہت سی مثالیں آتی ہیں مثلاً لتدخلن المسجد الحرام انشاء اللہ اٰمنین (الفتح ۴۸-۲۷) اور نبی صلعم کا قول اِنَّا اِنْ شاء اللہ بکم لاحقون پس جہاں فعل متحقق الوقوع ہے وہاں اِنْ کے معنی اِذْ ہونگے (مغنی)۔

اُحد میں آنحضرت کی دعا — جنگ اُحد میں ستر مسلمان شہید ہو گئے اور بہت سی تکلیف ان کو پہنچی۔ اور یہ امر طبائع میں کچھ سُستی اور کمزوری پیدا کر سکتا تھا۔ اور اس سے مسلمانوں کو غم بھی پہنچا تھا۔ تو تقویت کیلئے فرمایا کہ اس پر تم سے کوئی کمزوری ظاہر نہ ہو اور نہ اب جو کچھ ہو چکا ہے اس پر غمگین ہو۔ اور پھر ان کی تسلی کے لئے فرمایا کہ وہ جو وعدے تمہارے غلبہ کے ہیں وہ تو سچ ہو کر رہینگے۔ کیونکہ تم مومن ہو اور ہلاکت مکذبوں کا انجام ہے نہ مومنوں کا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب اُحد کے دن رسول اللہ صلعم کے ساتھی دشمن کے واپس لوٹنے پر گھبرا اٹھے۔ اور ادھر خالد کا لشکر عقب کی طرف سے حملہ آور ہوا تو مسلمان فوج کے گھر کر بالکل تباہ ہو جانے کا خطرہ ہو گیا۔ تو اس وقت آنحضرت صلعم نے دعا کی اللّٰھم لا یعلُنّ علینا اللّٰھم لا قوۃ لنا الا بک اللّٰھم لیس یعبدک بھٰذہ البلد غیر ھؤلاء النفر (غق) اے اللہ یہ ہم پر غالب نہ آئیں اے اللہ ہمیں کوئی قوت نہیں مگر تیرے ساتھ۔ اے اللہ سوائے اس گروہ کے اس شہر میں کوئی تیری عبادت کرنے والا نہیں۔ اور لکھا ہے کہ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بطور تسلی نازل کی۔

قرح — **۵۲۴** قَرۡحٌ۔ قَرۡح اس زخم کے اثر کو کہتے ہیں جو کسی خارجی شے سے انسان کو پہنچے اور قُرۡح اس کو جو داخلی شے سے ہو اور قَرۡح اور قُرۡح میں بعض وقت یہ فرق بھی کیا جاتا ہے کہ اول الذکر کا استعمال زخم پر ہوتا ہے اور دوسرے کا درد پر جو اس سے پیدا ہو (غ) اور یہاں قَرۡح سے مراد وہ تکلیف ہے جو مسلمانوں کو جنگ اُحد میں پہنچی۔

ایام — الایام۔ ایام یَوۡم کی جمع ہے اور اس کا اصل اطلاق تو زمانہ کی ایک مدت پر ہی ہوتا ہے ۳۔ مگر عرب ایام کو بمعنی وقائع یعنی واقعات بھی استعمال کرتے ہیں (ل) مثلاً کہتے ہیں ھو عالم بایام العرب یعنی وہ عرب کے واقعات کا عالم ہے۔ اسی لحاظ سے وذکرھم بایام اللہ (ابراھیم ۱۴-۵) میں ایام اللہ سے مراد نعم اللہ و نقم اللہ لئے گئے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کی عقوبتیں۔ اور مجاہد نے اس کے معنی صرف نعم اللہ کئے ہیں (ل)۔

دولۃ۔ تداول — نداولھا۔ دول سے ہے۔ اور دَوۡلَۃ اور دُوۡلَۃ گردش یا نوبت کو کہتے ہیں دَوۡلَۃ مال میں اور دُوۡلَۃ جنگ میں اور تداول

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ○ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ ۱۴۱

اور تاکہ اللہ ان لوگوں کو کھرا کردے جو ایمان لائے اور کافروں کو گھٹادے ۵۲۵ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے

القوم کذا سے مراد ہے تناولوہ من حیث الدولۃ یعنی ایک چیز کو نوبت بنوبت لیا اور اسی سے ہے داول اللہ کذا بینہم یعنی اللہ تعالیٰ ایک شے کو نوبت بنوبت ان پر لایا +

یعلم اللہ۔ لفظ علم کے اس استعمال کیلئے دیکھو ۱۷۹

علم وقوع عمل — قرآن کریم نے عموماً اللہ کے علم کو اس جگہ بیان کیا ہے جہاں مقصود اعمال کی جزا و سزا ہے پس یہاں لیعلم اللہ سے مراد وہ علم بھی ہو سکتا ہے جس کا تعلق جزا و سزا سے ہے کیونکہ گو اللہ تعالیٰ کو سب موجود و غیر موجود کا علم ہے۔ عالم الغیب والشہادۃ اس کا نام ہے۔ مگر اس کی جزا و سزا محض علم پر نہیں ہوتی۔ بلکہ وقوع پر ہوتی ہے۔ پس لیعلم اللہ سے مراد ہوئی تاکہ جزا دینے کیلئے جان لے۔ اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں۔ تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ایسے علم کے ساتھ جان لے جو ان کو ان کے غیر سے ممیز کردے ہے

اس آیت میں بتایا ہے کہ اُحد کی جنگ میں اگر تم کو کچھ تکلیف پہنچی ہے تو ویسی ہی تکلیف تمہارے دشمنوں کو بھی پہنچی کیونکہ جنگ کے شروع میں کفار نے بھی نقصان اُٹھایا تھا۔ یہ جنگ بدر کے متعلق نہیں ہے۔ کیونکہ جنگ بدر کے واقعہ کو لیکر قرح مثلہ نہیں رہ جاتا بلکہ جیسا کہ خود قرآن کریم نے آگے چل کر فرمایا ہے اولما اصابتکم مصیبۃ قد اصبتم مثلیہا (اٰل عمران ۳ - ۱۶۴) جہاں دو مثلوں میں جنگ بدر اور جنگ اُحد ہیں +

اس کے بعد ان الفاظ میں وتلک الایام نداولہا بین الناس فرمایا کہ دکھ اور تکلیف کے واقعات جیسے کافروں پر آتے ہیں مومنوں پر بھی آتے ہیں۔ اور جنگوں میں ایسا ہو جاتا ہے کہ کبھی ایک فریق کو دکھ پہنچ جاتا ہے کبھی دوسرے کو اس کا تعلق فتح و ظفر سے کچھ نہیں +

تکالیف کی غرض — اگر دکھ اور تکلیفیں نوبت بنوبت آتی رہنے والی چیزیں ہیں تو اس کی غرض کیا ہے۔ کیوں مسلمانوں کو جو خدا پر ایمان لاتے ہیں دکھ اور تکلیفیں پہنچیں، اس لئے کہ یہ دکھ اور تکلیفیں مومنوں کو منافقوں سے اور کھروں کو کھوٹوں سے الگ کرتی ہیں۔ اور یہ ضروری ہے کہ ایسا امتیاز ہوتا رہے۔ اور مومنوں کا ایمان ظاہر ہو کر وہ اس اجر کے مستحق قرار پائیں جو ایمان پر ملتا ہے۔ اور دوسری ضرورت یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے اور اس اعلیٰ مقام پر پہنچائے کہ وہ خدا کی راہ میں اپنی جانیں دیدیں اور جو بچ گئے وہ بھی اسی مقام پر ہیں کیونکہ اپنی طرف سے انہوں نے بھی اپنی جانیں خدا کی راہ میں دیدی تھیں گو اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا۔ اور یا شہداء سے مراد پیشرو اور امام ہے یعنی تم سے یہ قربانیاں کراکر تم کو دنیا کے لوگوں کے لئے پیشرو اور امام بنائے کیونکہ بغیر دکھوں اور تکلیفوں میں پڑنے کے اور ان میں ثابت قدمی دکھانے کے کوئی شخص لوگوں کا پیشرو اور امام نہیں بن سکتا +

محص تمحیص — ۵۲۵ یمحص۔ محص کے اصل معنی ہیں ایک چیز کا ہر عیب سے جو اس میں ہو پاک کردینا سونے کا محص یا تمحیص اسے کہتے ہیں کہ جو اس میں میل ہے اسے دور کر کے خالص سونا بنا دیا جائے (غ) +

محق — یمحق۔ محق کے معنی ہیں بے برکت کرنا یا کم کرنا ۳۵۳ ایک چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے یا تدریجاً کم کرنا (ض)

تکلیف سے فائدہ اُٹھانا مومن کا کام ہے — یہاں دو مزید نتائج بیان فرمائے ہیں۔ مومنوں کی تمحیص اور کافروں کی بے برکتی یا نقصان یعنی جو تکلیف مومن کو پہنچتی ہے وہ اس کے ذنوب اور عیوب سے تطہیر کا موجب ہو کر اس کی ترقی کا موجب ہوتی ہے۔ وہ تکلیف کے آنے سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور کافر چونکہ اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتا اس لئے اس کے لئے تکلیف کا نتیجہ نقصان اور بے برکتی ہوتی ہے

۱۴۲ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ

حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو نہیں جانا جو کوشش کرتے ہیں اور (نہ) صبر کرنیوالوں کو جانا ہے ۵۲۶ اور یقیناً

كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝

تم جنگ چاہتے تھے قبل اس کے کہ اسے ملو سو اب تم نے اسے دیکھ لیا اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو ۵۲۷

۱۴۳ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ

اور محمد ایک رسول ہی ہے اس سے پہلے (سب) رسول مر چکے ہیں پھر اگر وہ مرجائے یا قتل کیا جائے تو کیا تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے ۵۲۸

ع ۵ / ۱۵

رسول صلعم کی وفات مسلمانوں کو کمزور نہیں کر سکتی۔

لمّا

۵۲۶ لمّا۔ اس میں لَمْ نافیہ اور ما ہے +

یہ آیت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ علم سے مراد جزا و سزا کا علم ہے۔ کیونکہ یہاں فرمایا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے گویا تمہارے جنت میں داخل ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اللہ تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو جان لے۔ اب جنت میں داخل ہونا جہاد کرنے اور صبر کرنے پر منحصر ہے یعنی ان امور کے واقع ہونے پر یہاں اللہ کے علم سے مراد ان چیزوں کے وقوع کا علم ہے جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جزا ملے کہ وہ لوگ جنت میں داخل ہوں +

موت

۵۲۷ الموت۔ یہاں موت کا لفظ اسباب موت پر بولا گیا ہے (ج)، آگے آتا ہے تم اسے دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ موت کو کوئی شخص نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں اسباب موت دیکھے جا سکتے ہیں اس لئے بھی موت سے مراد اس کا سبب یعنی جہاد اور قتل ہے۔ اور یا موت کی تمنی سے مراد صرف خدا کی راہ میں جان دیدینے کی آرزو ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَوَدِدْتُ انی اُقتل فی سبیل اللہ ثم اُحیٰی ثم اقتل ثم احیٰی ثم اقتل میں اس بات سے محبت رکھتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو سب آرزوؤں سے بہتر ہے +

خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو۔

تمنون الموت سے اشارہ بعض صحابہ کی اس خواہش کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم کھلے میدان میں دشمن کے ساتھ جنگ کرینگے۔ یا بعض صحابہ جو جنگ بدر میں رہ گئے تھے اس بات کے آرزومند تھے کہ انہیں بھی کسی جہاد میں شامل ہونے کا موقعہ ملے +

محمد

۵۲۸ محمد۔ اس کا مادہ حمد ہے۔ اور یہ سب سے زیادہ مشہور اسم علم ہمارے نبی کریم صلعم کا ہے۔ اور اس کے معنی ہیں الذی کثرت خصالہ المحمودۃ (ل)، وہ جس کی قابل تعریف خصلتیں بہت بڑھی ہوئی ہوں اور محمد اور احمد ہمارے رسول مصطفےٰ صلعم کے ناموں میں سے ہیں (ل)، لسان العرب میں سات نام دیئے ہیں جن کا نام ایام جاہلیت میں محمد رکھا گیا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کے دادا عبدالمطلب نے یہ نام آپ کا رکھا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ یہ نام آپ کا مجھے رویا میں بتایا گیا ہے (ر) اور حدیث متفق علیہ میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا انا محمد وانا احمد میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور ایک حدیث میں ہے الم تروا کیف صرف اللہ تعالیٰ عنی لعن قریش و شتمھم یشتمون مذمما وانا محمد کیا تم نہیں دیکھتے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ سے قریش کی لعنت اور ان کی گالی گلوچ کو پھیر دیا ہے۔ وہ کسی مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور میں محمد ہوں

خلا

خلت۔ خلا کے معنی ۲۰۲ و ۱۶۹ میں بیان ہو چکے ہیں لیکن جب کسی انسان کے متعلق کہا جائے خلا تو اس سے

وَمَنۡ يَّنۡقَلِبۡ عَلٰى عَقِبَيۡهِ فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡـئًا ؕ

اور جو کوئی اُلٹے پاؤں پھر جائے — تو وہ اللہ کا کچھ بھی — نہیں بگاڑے گا

مراد اس کی موت ہوتی ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ابن الاعرابی کا قول منقول ہے خلا فلان اذا مات اور یہ ظاہر بھی ہے کیونکہ انسان کا گزر جانا یہی ہے کہ وہ اس عالم سے دوسرے عالم کی طرف انتقال کر جائے اور اس کا دروازہ موت ہی ہے اور یہاں خلت کے مقابلہ پر مات او قتل لا کر صاف بتا دیا کہ جن کے خلا کا ذکر ہے وہ ان کا گزر جانا بذریعہ موت یا قتل ہی ہوا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ محمد رسول اللہ صلعم کا بھی ان دو طریقوں میں سے کسی ایک طریق پر گزر جانا ضروری ہے پس قد خلت من قبلہ الرسل سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم سے پہلے رسول بذریعہ موت یا قتل گزر چکے۔ اگر کوئی تیسری صورت گزر جانے کی بھی قد خلت میں شامل ہوتی تو ضرور تھا کہ اس کا ذکر بھی خلت کے مقابلہ پر کر دیا جاتا جیسے کہ مات کا ذکر کر دیا گیا ہے حالانکہ یہاں خبر تو مشہور صرف قتل کی ہوئی تھی پس اگر پہلے رسولوں کے گزر جانے کے ساری صورتوں کا ذکر مقصود نہ ہوتا تو صرف افائن قتل کہنا چاہئے تھا۔ اس کے ساتھ مات کہنے کی ضرورت نہ تھی +

موت، او قتل — مات او قتل۔ موت سے مراد موت علی الفراش ہے یعنی طبعی موت اور قتل سے مراد وہ موت ہے جو کسی ایسے واسطے سے ہو جو جسم انسانی کا ناقض ہو +

اِنقلاب — انقلبتم۔ اِنقلاب۔ قَلْب سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا ایک رخ سے دوسرے رُخ کی طرف پھیرنا اور انقلاب کے معنی انصراف ہیں یعنی پھر جانا (غ)

عقب — اعقاب۔ عَقِب کی جمع ہے اور عَقِب ایڑی کو کہتے ہیں۔ اور رَجَعَ علٰی عَقِبِہٖ کے معنی کئے ہیں انثنٰی (غ) اُلٹا پھر گیا یہی معنی انقلب علٰی عَقِبَیۡہِ کے ہیں اور یہ بعینہ وہی خیال ہے جو ہماری زبان میں اُلٹے پاؤں پھر جانے سے ادا ہوتا ہے۔

انقلاب علی الاعقاب — افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم میں ہمزہ انکاری ہے۔ اور انکار سے مراد انکار انقلاب علی الاعقاب ہے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مرتد ہو جاؤ۔ اور بعض نے انقلاب علی الاعقاب سے مراد محض جنگ سے فرار لیا ہے۔ اس صورت میں اشارہ ان چند نفوس کی طرف ہے جو میدان جنگ سے بھاگ گئے تھے۔ اور بعض نے انقلاب علی الاعقاب سے مراد صرف ایمانی کمزوری کا دکھانا لیا ہے کیونکہ فرار کسی کمزوری کا نتیجہ ہی تھا اور چونکہ یہ آیت آنحضرتؐ کی وفات کا ذکر کرتی ہے اسلئے اس میں ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جو آنحضرتؐ کی وفات پر مرتد ہو گئے تھے +

اُحد میں آنحضرتؐ کے قتل کی خبر کا مشہور ہو جانا — اس آیت میں جنگ اُحد کے اس نازک ترین موقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ جب تیر اندازوں کے جگہ چھوڑ دینے کی وجہ سے قریش مکہ کا رسالہ خالد کے ماتحت لشکر اسلامی کی عقب کی طرف سے حملہ آور ہوا اور بھاگتا ہوا لشکر کفار بھی لوٹا اور مسلمان پریشانی کی حالت میں ہو گئے۔ اس حالت میں نبی کریم صلعم نے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کے لئے بلند آواز سے یہ کہنا شروع کیا الیّ عباد اللّٰہ انا رسول اللّٰہ اے اللہ کے بندو میری طرف آ جاؤ میں رسول اللہ ہوں۔ اس آواز کے بلند ہوتے ہی کفار نے نہایت تندی سے آنحضرت صلعم پر حملہ کیا۔ اور ابن قمئہ حارثی نے رسول اللہ صلعم پر ایک بڑا پتھر پھینکا جس سے آپ کے سامنے کے دانت مبارک شہید ہو گئے اور منہ اور سر زخمی ہو گیا۔ اور یہ شخص آگے بڑھا کہ آپ کو قتل کر دے کہ مصعب بن عمیر صاحب الرایۃ درمیان میں حائل ہو گئے اور خود شہید ہو کر نبی کریم صلعم کو بچا لیا اور آہستہ آہستہ رسول اللہ صلعم کے سامنے صحابہ کی ایک دیوار حائل ہو گئی۔ مگر آپ زخم کی شدت سے گر گئے۔ ادھر جب ابن قمئہ آپ کو قتل نہ کر سکا تو اس نے یہ خبر اُڑا دی کہ محمد رسول اللہ صلعم قتل ہو گئے۔ اور یہ آواز سارے لشکر میں بلند ہو گئی۔ اسی واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے وما

وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ○

اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد بدلہ دے گا

محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم مگر صحابہ کے قدم میں اس خبر سے کوئی تنزلزل نہیں آیا سوائے چند نفر کے جو لشکر سے کٹ جانے کی وجہ سے بھاگ گئے بلکہ ان میں وہ لوگ تھے جنہوں نے کہا ان کان محمد قد قتل فان رب محمد حی لا یموت ..... فقاتلوا علی ما قاتل علیہ اگر محمد صلعم قتل ہوگئے ہیں تو رب محمد زندہ ہے جو کبھی نہیں مریگا سو تم بھی اس بات کے لئے جنگ کرو جس کے لئے آپ جنگ کرتے تھے

آنحضرت سے پہلے تمام رسول فوت ہوچکے

اس آیت و ما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل سے ایک اور اہم مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ وہ آیت ہے جس سے حضرت ابو بکر صدیق نے آنحضرت صلعم کی وفات پر استدلال کیا اور جس استدلال کے سامنے سارے صحابہ کی گردنیں جھک گئیں۔ نبی کریم صلعم کی وفات کی خبر جب شائع ہوئی۔ تو کون مسلمان ہوگا جس کا دل چاہتا ہو کہ اس خبر پر یقین کرے۔ صحابہ کو جو آپ سے محبت تھی۔ وہ ایسی تھی کہ وہ لوگ آپ کی وفات کا کلمہ بھی مُنہ پر لانا پسند نہ کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عام مجمع میں یہ کہدیا۔ کہ جو شخص رسول اللہ صلعم کو وفات یافتہ کہے گا میں اس کا سر اُڑا دوں گا حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اتنے میں آئے اور سیدھے حضرت عائشہ صدیقہ کے گھر میں چلے گئے۔ کپڑا چہرہ مبارک سے اُٹھایا اور دیکھا کہ آپ رفیق اعلیٰ سے جاملے ہیں۔ تو آپ نے واپس مسجد میں آکر ایک خطبہ پڑھا جس میں آپ نے فرمایا۔ أَيُّهَا النَّاسُ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ محمد ا فَاِنَّ محمد ا قد مات و من كان يَعْبُدُ اللّٰهَ تعالیٰ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لا يموتُ اے لوگو جو کوئی محمد (صلعم) کی عبادت کرتا تھا تو محمد (صلعم) فوت ہوگئے اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ ہے کبھی نہیں مریگا۔ پھر آپ نے یہ آیت قرآن کریم کی پڑھی و ما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل محمد صلعم ایک رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے سب رسول گزر چکے۔ اور اس سے یہ استدلال کیا۔ کہ آنحضرت صلعم فوت ہوگئے تو سب لوگ خاموش ہوگئے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ استدلال اسی صورت میں کام دے سکتا تھا جب حضرت صدیق اور دیگر صحابہ کا یہ عقیدہ ہو کہ آنحضرت صلعم سے پہلے تمام رسول وفات پاچکے ہیں۔ کیونکہ اگر پہلے رسولوں میں سے کچھ ایسے بھی مانے جائیں کہ انہوں نے وفات نہ پائی ہو تو پھر ایک سول کی وفات پر یہ کوئی دلیل نہیں ہوسکتی۔ اگر بعض رسولوں نے وفات پائی اور بعض نے نہیں پائی تو پھر کیوں رسول اللہ صلعم ان میں نہ ہوں جنہوں نے وفات نہیں پائی۔ ہاں اگر سب رسول ہی وفات پاچکے تو پھر آنحضرت صلعم کی وفات پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا پس حضرت ابو بکر صدیق کے اس استدلال کی صحت کے سامنے سارے صحابہ کا خاموش ہوجانا ایک قطعی شہادت اس بات پر ہے کہ وہ آنحضرت صلعم سے پہلے کل رسولوں کو وفات یافتہ مانتے تھے۔ گویا آنحضرت سے پہلے کل نبیوں کی وفات پر صحابہ کا اجماع ہوگیا۔ یہ امر کہ اس سے سارے رسولوں کا وفات یافتہ ہونا ثابت ہوتا ہے مفسرین نے بھی تسلیم کیا ہے اور تمام رسولوں کا آنحضرت صلعم سے پہلے موت یا قتل سے جن کو قرآن کریم نے بمقابلہ خلا استعمال کیا ہے گزر جانا ہی مانا ہے چنانچہ بیضاوی میں ان الفاظ و ما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل کی تفسیر یوں کی ہے فسیخلو کما خلوا بالموت او القتل پس آپ بھی گزر جائینگے جیسے وہ گزر گئے موت سے یا قتل سے جس سے سارے پہلے انبیاء کا موت یا قتل سے گزر جانا ثابت ہے۔ اور تفسیر غرائب القرآن میں ان الفاظ و ما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل میں دو دلیلیں مانی ہیں جن میں سے دوسری دلیل کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ و ثانیها القیاس علی موت سائر الانبیاء و قتلهم یعنی دوسری بات تمام کے تمام انبیاء کی موت یا ان کے قتل پر قیاس ہے۔ اور تفسیر روح المعانی

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا ۱۴۴

اور کسی شخص کے لئے یہ نہیں کہ وہ اللہ کے اذن کے سوا مر جائے (موت کا) مقرر وقت لکھا ہوا ہے[529] اور جو کوئی دنیا کے بدلہ کا ارادہ کرتا ہے

میں انہی الفاظ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا ہے وبیّن ان حکم النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حکم من سبق من الانبیاء صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہم اجمعین فی انہم ماتوا وبقی اتباعہم متمسکین بدینہم یعنی اللہ تعالیٰ نے یہاں کھول کر بیان کر دیا ہے کہ نبی کریم صلعم کا حکم ان انبیاء کا حکم ہے جو پہلے گزر چکے سب پر اللہ کی صلوات اور سلام ہو اس بارہ میں کہ وہ مر گئے اور ان کے پیروان کے دین پر متمسک رہے اور پھر لکھا ہے فتکون جملۃ قد خلت الخ صفۃ لرسول منبئۃ عن کونہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی شرف الخلو فان خلو مشارکیہ فی منصب الرسالۃ من شواھد خلوہ لامحالۃ کانہ قیل قد خلت من قبلہ امثالہ فسیخلو کما خلوا یعنی اس صورت میں یہ جملہ قد خلت رسول کی صفت ہوگا۔ خبر دینے والا اس بات کی کہ آنحضرت صلعم کو شرف گزر جانے کا حاصل ہے کیونکہ منصب رسالت میں جو آپ کے شریک ہیں ان کا گزر جانا لامحالہ آپ کے گزر جانے کے شواہد میں سے ہے گویا یوں کہا گیا ہے کہ اس کی مثل اس سے پہلے گزر گئے پس جس طرح وہ گزر گئے اسی طرح یہ بھی گزر جائیگا ۔

علاوہ ازیں اس آیت کا مقابلہ اگر ایک دوسری آیت قرآنی سے کیا جائے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر انہی الفاظ میں آتا ہے تو اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلعم سے پہلے کل رسول اس آیت کے نزول سے پیشتر مر چکے تھے اور وہ آیت یوں ہے ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل (المائدۃ ۵ - ۷۵) مسیح ابن مریم ایک رسول ہی ہے اس سے پہلے رسول گزر چکے۔ اب اس میں شک نہیں کہ یہ آیت حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات پر استدلال کے طور پر ہے۔ کہ جس طرح پہلے رسول گزر چکے وہ بھی گزر گئے۔ اور یہاں جو قد خلت من قبلہ الرسل فرمایا تو اس پر بہرحال قریباً سب کا اتفاق ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے تمام رسول وفات پا چکے۔ اب تعجب ہے کہ یہ آیت تو حضرت مسیح سے پہلے سارے رسولوں کے مرنے پر دلیل ہو اور بعینہ ایسی ہی آیت ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل آنحضرت صلعم سے پیشتر کے تمام رسولوں پر وفات کی دلیل نہ مانی جائے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ آیت ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل سے تو حضرت مسیح سے پیشتر تمام رسولوں کی وفات ثابت ہے مگر آیت ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل سے ایک بھی رسول کی وفات ثابت نہیں کیونکہ باقی سب تو دوسری آیت کی رو سے مر چکے اور اس آیت کی رو سے ایک حضرت مسیح بھی نہ مرے ۔

اذن

529 باذن اللہ - اِذن کے معنی اجازت اور رخصت کا اعلام ہے۔ اور علم کے معنی میں بھی آتا ہے ۲:۱۰۲ اور ابو مسلم نے یہاں اذن کے معنی امر کئے ہیں (دغ)، اور بعض نے اس کے معنی تخلیۃ اور اطلاق یعنی چھوڑ دینا لئے ہیں اور مراد ماکان لنفس ان تموت الا باذن اللہ سے یہ لی ہے۔ کہ کوئی شخص قتل کے ذریعہ سے نہیں مر سکتا سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ قاتل کو چھوڑ دے کہ وہ مقتول کو مار ڈالے (دغ)، گویا یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلعم پر ان لوگوں کو غالب نہیں آنے دیا کہ باوجود اسباب قتل کے جمع ہو جانے کے وہ آپ کے قتل پر مسلط ہو جاتے ۔

اجل

کتابًا مؤجلًا۔ کتاب۔ مصدر ہے جو یہاں مقدر کتب الموت کیلئے بطور تاکید لایا گیا ہے اور مؤجل کے معنی وہ جس کیلئے اجل مقرر کی گئی ہو اور اجل وہ مدت معینہ ہے جو کسی چیز کیلئے مقرر کی گئی ہو۔ اور عام طور پر انسان کی زندگی کی مدت معینہ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔

نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ○

ہم اس کو اس سے دیدیتے ہیں اور جو کوئی آخرت کے بدلہ کا ارادہ کرتا ہے ہم اسکو اس سے دیدیتے ہیں اور شکر کرنیوالوں کو ہم جلد بدلہ دینگے۔ ۴۳۰

ان الفاظ میں ان لوگوں کی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جنہوں نے یہ مشہور کیا تھا کہ آنحضرت صلعم فوت ہو گئے ہیں۔ بالخصوص بعض منافقین نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہم عبداللہ بن ابی کے ذریعہ سے ابو سفیان سے امان طلب کرینگے حالانکہ ابوسفیان خود مکہ کی طرف بہت دور نکل چکا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کوئی انسان بھی اذن الٰہی کے بغیر نہیں مرتا اس لئے گو محمد رسول اللہ صلعم کی موت کے سب سامان جمع ہو چکے تھے مگر اللہ تعالیٰ کا یہ اذن نہ تھا کہ آپ اس وقت وفات پائیں۔ گو الفاظ میں عمومیت ہو مگر اصل غرض آنحضرت صلعم کی حفاظت کی طرف ہی توجہ دلانا ہے۔ بیشک ایسے اسباب اس جنگ میں جمع ہو چکے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت نہ ہوتی تو آنحضرتؐ وفات پا جاتے۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا تھا کہ آپ کو مخالفین پر غالب کرے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان وعدوں کو پورا فرمایا اور آنحضرت کی حفاظت فرمائی۔ اور الفاظ کو عام کرکے یہ بتایا ہے کہ کسی شخص کو بھی نہ چاہیئے کہ جب اس کا فرض اس کو موت کے مقام پر کھڑا ہونے کیلئے بلاتا ہو تو گھبرا کر وہاں سے بھاگے۔ اللہ تعالیٰ اسباب پر قادر ہے کہ اسباب موت کے جمع ہونے کے باوجود بھی اس کو بچالے +

ثاب

۴۳۰ ثواب۔ ثَوْب سے مشتق ہے جس کے اصل معنی دو طرح پر ہیں یعنی اول ایک چیز کا اپنی پہلی حالت کی طرف جس پر وہ تھی لوٹ آنا اسی معنی میں آتا ہے ثاب فلانٌ الی دارہٖ فلاں شخص اپنے گھر کی طرف لوٹ آیا اور دوسرے معنی ہیں رُجُوْعُ الشَّیْءِ اِلَی الْحَالَۃِ الْمُقَدَّرَۃِ بِالْفِکْرَۃِ یعنی ایک چیز کا لوٹ کر ایسی حالت کی طرف آجانا جو اس کے لئے بروئے فکر و عقل مقدر تھی اس معنی کے لحاظ سے ثَوْب لباس کو کہتے ہیں کیونکہ سوت کا کاتنا اس غرض کیلئے تھا کہ اس سے کپڑا بنے۔ اور اسی معنی میں ثوابِ عمل ہے یعنی وہ چیز جو انسان کے اعمال کے بدلے سے اس کی طرف لوٹکر آتی ہے اور جزا یا بدلہ کو ثواب اس خیال سے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ اصل چیز ہی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بعض جگہ جزا کو نفس فعل ہی قرار دیا گیا ہے جیسے فرمایا من یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہٗ جو کوئی شخص ایک ذرہ کے برابر نیکی کریگا وہ اسے دیکھ لیگا اور یہ نہیں کہا کہ وہ اس کی جزا کو دیکھ لیگا (غ) +

ثَوْب۔ ثواب

فلسفۂ عمل

لفظ ثواب کو جزائے اعمال کیلئے اختیار کرکے فلسفۂ اعمال کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب انسان ایک اچھا یا برا فعل کرتا ہے تو اس کے کرنے کے ساتھ وہ فعل ختم نہیں ہو جاتا گو انسان ایسا ہی سمجھتا ہے کہ بس جو ہونا تھا ہو چکا اسی لحاظ سے عمل کو دوسری جگہ طائر کہا ہے گویا کرنے والے کے نزدیک وہ اُڑ جاتا ہے گو قرآن کریم فرماتا ہے کہ وہ اُڑتا نہیں بلکہ فی عنقہٖ یعنی اس کے ساتھ لازم ہو جاتا ہے، بلکہ وہی فعل ایک دوسرے رنگ میں لوٹ آتا ہے۔ اور ہر ایک نتیجہ درحقیقت اصل فعل کی ہی ایک دوسری صورت ہے +

لفظ ثواب خیر اور شر دونوں پر استعمال ہوتا ہے گو اس کا زیادہ استعمال خیر پر ہے۔

دنیوی اور اُخروی بھلائی کے متعلق خدا کا قانون

اس حصہ آیت میں دو گروہوں کا ذکر کیا ہے من کان یرید ثواب الدنیا۔ اور من کان یرید ثواب الاخرۃ مفسرین نے عموماً یہاں گروہ اول سے مراد تیر اندازوں کا وہ حصہ لیا ہے جنہوں نے مال غنیمت کی خاطر نبی کریم صلعم کے حکم کے خلاف کیا اور اپنی جگہ کو چھوڑ دیا مگر میرے نزدیک اس سے مراد منافق ہیں جنکو جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اُڑتی اُڑتی افواہ آنحضرت صلعم کی وفات کی مدینہ میں پہنچی تو وہ خوش ہوئے کہ وہ ساتھ نہ تھے۔ اور انکو وہ تکلیف نہ پہنچی جو مسلمانوں کو پہنچی۔ تو ان کو بتاتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اگر کوئی شخص دنیوی فائدہ اپنے عمل سے حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ دیدیتا ہے۔ اور جو انجام کی بھلائی چاہتا ہو اللہ تعالیٰ وہ بھی دیدیتا ہو جو انجام میں بھلائی کیلئے کوشش کرتا ہو اس کو ضرور ہے کہ ابتدا میں کچھ دکھ اٹھانا پڑے اور جو موجودہ وقت کی بھلائی چاہتا ہے اس کو وہ ملجاتی ہے

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ ۱۴۵

اور کتنے نبی ہوتے ہیں جن کے ساتھ ہوکر بہت سے ربانی لوگ لڑے ۵۳۱ پھر اس وجہ سے وہ سست نہ ہوئے جو ان کو اللہ کی راہ میں

اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝

مصیبت پیش آئی اور نہ کمزور رہے اور نہ عاجز ہوئے اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے ۵۳۲

مگر انجام کار دُکھ اُٹھانا پڑتا ہے ✦

کاین ۵۳۱ کاین - بعض کے نزدیک اس میں نون اصلی ہے اور یہ لفظ بسیط خاص اسی معنی کے لئے موضوع ہے اور مشہور یہ ہے کہ یہ مرکب ہے کافِ تشبیہ سے - اور اَیٍّ سے جو ابہام کے لئے آتا ہے - اور اَیٍّ کی تنوین نے نون کی شکل اختیار کر لی ہے - اور اس کی مثال کذا ہے جو ک اور ذا سے مرکب ہے - اور کاین بمعنی کم ہے یعنی کتنے ✦

رِبِّی ربیون - رِبِّی کی جمع ہے - امام راغب کے نزدیک رِبِّی اور رَبّانی کے ایک ہی معنی ہیں جس کے لئے دیکھو ۵۳۴ اور لسان العرب میں رِبِّی کو منسوب الی الرب ہی لکھا ہے گویا ربّی اور ربّانی کے ایک ہی معنی ہیں - مگر ابن عباسؓ سے اس کے معنی جموع یعنی جماعتیں مروی ہیں (ر) اور یہی معنی فراء اور زجاج نے کئے ہیں (ع ق) اور اس صورت میں یہ رِبۃ یا ربوۃ سے مشتق ہے جس کے معنی جماعت ہیں اور ضحاک نے اس کو ایک ہزار کے ساتھ مخصوص کیا ہے - مگر یہاں تعداد اور گنتی کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں - اور اس کا ذکر لفظ کثیر میں موجود ہے بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو جنگیں کرنی پڑیں اور ان کے ساتھ بڑے بڑے ربانی لوگوں کو علماء فقہا کو بھی جنگیں کرنی پڑیں تو ان کو ان جنگوں میں تکلیفیں بھی اُٹھانی پڑیں مگر اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوا کہ وہ کمزور ہو گئے ہوں ✦

وھن ۵۳۲ وھنوا - وَھن کے معنی بیان ہو چکے ہیں - ضعفِ خُلق یا خَلق اور حدیث میں آتا ہے لا واھنا فی عزم جس کے معنی ہیں صعیفا فی رای (ل) اور چونکہ یہاں ضعف کا الگ ذکر ہے اس لئے اس سے مراد ضعف رائے ہے یعنی ارادہ میں سست ہو جانا لسان العرب میں فما وھنوا کے معنی بیان کئے ہیں مَا فتروا و ما جَبُنُوا عن قتال عدوھم یعنی دشمن کی جنگ میں نہ وقفہ کیا اور نہ بزدل ہوتے

اِستکانۃ استکانوا اس کے اشتقاق میں اختلاف ہے مفردات میں اس کا اشتقاق کان سے باب استفعال میں مانا ہے اور معنی تضرّع ہیں یعنی عاجزی اختیار کی اور لسان العرب میں اِستکانۃ کا اصل سکن یا سکون سے مانا ہے اور معنی اس کے خضع وذلّ ہی کئے ہیں یعنی عاجزی اور فرمانبرداری اختیار کی اور اس صورت میں تعلق اصل معنی سے ظاہر ہے اور لسان العرب میں ہے کہ اصل میں استکنوا تھا اشباع سے استکانوا ہو گیا ہے - دوسری جگہ قرآن شریف میں آتا ہے فما استکانوا لربھم (المؤمنون ۲۳-۷۶) اور غرائب القرآن میں ہے وھن وہ ضعف ہے جو دل سے تعلق رکھتا ہے اور ضعف مطلق قوت جسمانی میں کمزوری ہے اور استکانۃ اس عاجزی اور ضعف کا اظہار ہے ✦

یہاں جو تین لفظ اختیار کئے ہیں - یہ تین الگ الگ مراتب کی طرف اشارہ کرتے ہیں سب سے پہلے وھن یا رائے کی سستی اور ارادہ کی کمزوری ہے جس کا تعلق گویا دشمن کی تیاری سے ہے اور اس کی جموع کثیرہ اور اس کے سامان جنگ سے - دوسرا ضعف یا کمزوری کا پیدا ہو جانا ہے جس کا تعلق بعض کے قتل ہو جانے اور بعض کے زخمی ہو جانے سے ہے - اور تیسرا اظہار عاجزی ہے جس کا تعلق دشمن کی آنی فتحیابی سے ہے - گویا بہر حال انسان کو دشمن کے مقابلہ پر مضبوط اور قوی رہنا چاہئے - اور دب نہیں جانا چاہئے ✦

۱۴۶ وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِيۡۤ اَمۡرِنَا وَ

اور ان کی بات سوائے اسکے کچھ نہ تھی کہ انہوں نے کہا ہمارے رب ہمارے قصور اور ہمارے کام میں ہماری خطائیں معاف فرما اور

۱۴۷ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ○ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا وَحُسۡنَ

ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ اور ہم کو کافر لوگوں پر نصرت دے [۵۳۳] سو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا

۱۴۸ ثَوَابِ الۡاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ○ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِيۡعُوا

ع ۱۴ جنگ احد کے واقعات

اچھا ثواب (دیا) اور اللہ احسان کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے [۵۳۴] اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم ان کی اطاعت کروگے

الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَرُدُّوۡكُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ ○

جو کافر ہوئے تو وہ تم کو اُلٹے پاؤں لوٹا دینگے پس تم نقصان اُٹھانیوالے ہوکر پھر جاؤگے [۵۳۵]

اسراف — **۵۳۳** اسرافنا۔ اسراف۔ سرف سے ہے۔ ہر فعل میں جو انسان کرے حد سے گزر جانے کا نام سَرَف یا اسراف ہے (غ)، گو مال کے متعلق اس کے معنی کی زیادہ شہرت ہے ۔

قدموں کا ثابت ہونا — ثبت اقدامنا لفظی معنی تو یہی ہیں کہ ہمارے قدموں کو مضبوط کر۔ مگر مراد اس سے یہ ہے کہ دلوں سے خوف دور ہو۔ اور ہر قسم کے خیالات فاسدہ سینوں سے نکلے رہیں (غ)، قدموں کی مضبوطی کو دل کی قوت سے شدید تعلق ہے ۔

اپنی کمزوری کا علاج دشمن پر فتح پر مقدم ہے — یہاں بتایا ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ سے اپنی کمزوریوں کا علاج اور خطاؤں کی معافی چاہو دوسری طرف دشمن پر نصرت کے طالب بنو۔ اگر اپنے ہی نفسوں میں کمزوریاں بھری رہیں تو دشمن پر فتح پانے سے انسان کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے

محسن کون ہے — **۵۳۴** اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں کوشش کرتے ہیں۔ اور دنیا کو دین پر قربان کردیتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ دنیا کا ثواب بھی ضرور دیتا ہے اور آخرت کا ثواب تو نہایت اعلیٰ درجہ کا ملتا ہے۔ ان لوگوں کو یہاں محسن کہا ہے احسان کے معنی حدیث میں آئے ہیں تعبد اللہ کانک تراہ اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ اسے دیکھ رہا ہے اور جو شخص اپنے فوائد دنیوی کو اللہ کی راہ میں قربان کردیتا ہے یہانتک کہ اپنا سر بھی خدا کی راہ میں دیدیتا ہے یا دینے کے لئے تیار ہوتا ہے وہ واقعی احسان کی اس تعریف کے نیچے آتا ہے ۔

اطاعت کفار — **۵۳۵** ان تطیعوا الذین کفروا۔ اطاعۃ کے معنی گزر چکے کسی کے امر کی پیروی کرنا [۴۸۹] یہاں اطاعت سے مراد یا تو کافروں کے سامنے کمزور ہوکر عاجزی اختیار کرلینا اور ان کی ماتحتی قبول کرلینا ہے جیسا کہ آیت ۱۴۵ میں فرمایا تھا کہ نبی کے ساتھی ایسے کمزور نہیں ہوتے کہ دشمن کو ذرا غالب دیکھا تو فوراً اس کے آگے جھک گئے اور یہ اس لئے فرمایا کہ منافق جو راستہ سے واپس ہو گئے تھے اب اس مصیبت کو دیکھ کر اس بات پر تلے بیٹھے تھے کہ ابو سفیان مدینہ کا رخ کرے تو فوراً اس کی اطاعت کرلیں۔ اس لئے مومنوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ ان کافروں کی اطاعت کا نتیجہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ وہ دین اسلام سے تم کو پھیر دیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا (البقرۃ ۔ ۲۱۷) اور یا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی رائے کو دین کے بارے میں مت قبول کرو اور ان کو اپنے خیر خواہ سمجھ ان کے پیچھے نہ چلو فیما یامرونکم بہ وفیما ینہونکم عنہ فتقبلوا ذالک منہم فی ذالک (ج)، اور فی الحقیقت دونوں معنی درست

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ○ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۱۴۹، ۱۵۰

بلکہ اللہ ہی تمہارا مولیٰ ہے اور وہ سب سے اچھا مددگار ہے[۵۳۶] ہم عنقریب ان لوگوں کے دلوں میں رعب ڈال دینگے جو

الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ○ [۵۳۷]

کافر ہوئے اسلئے کہ انہوں نے اللہ کیساتھ اسے شریک بنایا ہے جس کی اس نے کوئی مضبوط دلیل نہیں اُتاری اور انکا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کی کیا ہی بُری جگہ ہے۔

ہیں اگر مسلمانوں کو کفار کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے یا وہ کہیں میدان جنگ میں غالب بھی آجائیں تو مسلمانوں کو نہیں چاہئے کہ فوراً ہمت ہار کر ان کی اطاعت قبول کرلیں۔ اور امور دینی میں بالخصوص اور ہر حال میں کافروں کے تتبع سے بچنا چاہئے۔ الذین کفروا سے مراد بعض نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو لیا ہے اور حضرت علی سے روایت ہے کہ منافق مراد ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو کہا کہ اپنے بھائیوں کی طرف لوٹ جاؤ اور ان کے دین میں داخل ہو جاؤ پہلے معنی کے لحاظ سے یہ آیت دونوں پر صادق آتی ہے اور حسن کا قول ہے کہ یہود و نصاریٰ مراد ہیں جو مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات ڈال کر دین اسلام سے منحرف کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ تطیعوا کے دوسرے مفہوم کے لحاظ سے درست ہے۔ اور بعض نے کہا کہ یہ آیت عام ہے اور صحیح یہی ہے کیونکہ ہر زمانہ میں ہی کافر ایک یا دوسرے معنی کے لحاظ سے اسلام کے خلاف لگے رہتے ہیں۔

حضرت کی غیرت توحید کی ایک مثال

[۵۳۶] بخاری میں ہے کہ اُحد کے دن جب مسلمان بہت سا نقصان اُٹھا کر آخر پھر ایک جگہ آنحضرت صلعم کے گرد جمع ہو گئے اور آنحضرتؐ زخموں سے نڈھال ہو کر گر گئے تھے اور آپ کی وفات کی خبر بھی دشمنوں میں مشہور ہو چکی تھی تو ابوسفیان نے میدان سے واپس ہوتے وقت بلند آواز سے کہا کہ کیا قوم میں محمد صلعم ہیں تو آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جواب نہ دو پھر اس نے کہا کیا قوم میں ابوبکر ہیں پھر آپ نے فرمایا کہ جواب نہ دو پھر اس نے کہا کیا قوم میں عمر ابن الخطاب ہیں اور ساتھ ہی کہا اگر یہ لوگ زندہ ہوتے تو جواب دیتے تب حضرت عمر نے کہا کہ ہم سب تم کو ذلیل کرنے کے لئے زندہ ہیں۔ تب ابوسفیان پکارا اُعْلُ ھُبل یعنی ہبل کی جے آنحضرت صلعم نے فرمایا اس کو جواب دو اللہ اعلیٰ واجلّ اللہ ہی سب سے بلند اور سب سے زیادہ جلال والا ہے پھر ابوسفیان نے کہا لنا العزّٰی ولا عزّٰی لکم ہمارا (بت) عزیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزیٰ نہیں۔ پھر آنحضرت صلعم نے فرمایا اس کو جواب دو اور کہو اللہ مولٰنا ولا مولیٰ لکم اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔ آیت کے الفاظ بل اللہ مولٰکم میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کو توحید الٰہی کے لئے کس قدر غیرت تھی جب اپنی زندگی یا موت کا سوال ہوا تو خاموشی کا حکم دیا لیکن جب بت کی بڑائی کی گئی تو چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر حملہ تھا اس لئے آپ نے فوراً جواب دینے کا حکم دیا۔ اور بتایا کہ ہم یعنی مسلمان کبھی ذلیل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہمارا مولیٰ اور مددگار اللہ تعالیٰ ہی ہے اور بالآخر کافر ہی ذلیل ہونگے گو درمیان میں وہ مسلمانوں کو کچھ نقصان بھی پہنچائیں +

رعب

[۵۳۷] الرُّعْب۔ رُعب انقطاع ہے جو خوف سے بھر جانے سے پیدا ہو اسی لئے باعتبار بھرنے کے رَعَبْتُ الْحَوْضَ کے معنی ہیں میں نے حوض کو بھر دیا۔ اور باعتبار انقطاع کے رَعَبْتُ السَّنَامَ کے معنی ہیں میں نے سنام کو کاٹ دیا (غ) +

سلاطة۔ سُلطان

سلطان۔ جس کا مادہ سلط ہے۔ اور سَلَاطَة کے معنی ہیں غالب آکر مضبوط ہو جانا اور اسی معنی میں سلطان آتا ہے جیسے ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیه سلطنا (بنی اسرائیل ۱۷۔ ۳۳) انه لیس له سلطان علی الذین امنوا (النحل ۱۶۔ ۹۹) انما سلطانه علی الذین یتولونه (النحل ۱۶۔ ۱۰۰) لا تنفذون الا بسلطان (الرحمٰن ۵۵۔ ۳۳) (غ) اور حجة یعنی دلیل کو سلطان اس لئے کہا گیا ہے کہ دلوں کو وہ پکڑ لیتی ہے اور ان پر غالب آجاتی ہے لیکن اس کا تسلط بیشتر اہل علم و حکمت پر ہوتا ہے (غ)

۱۵۱   وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ

اور اللہ نے یقیناً اپنا وعدہ تم سے سچا کر دکھایا

ماوی: ماوی۔ اَوَی اِلٰی کَذَا کے معنی ہیں اِنْضَمَّ اِلَیْہِ اس کے ساتھ یا اس کی طرف مل گیا +

مثوی: مثوی۔ ثوی سے ہے اور ثواء کے معنی ہیں استقرار کے ساتھ ٹھہرنا یا قرارگاہ بنا کر ٹھہرنا (غ) +

مسلمانوں کا کافروں پر رعب: واقعات سے ظاہر ہے کہ اُحد کے میدان میں باوجود مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچانے کے کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب تھا۔ ان کو صاف معلوم ہو گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم بھی زندہ ہیں ابوبکر و عمر بھی زندہ ہیں جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث سے ظاہر ہے جس کا ترجمہ اوپر دیا گیا ہے۔ تاہم ابوسفیان نے جب دیکھا کہ مسلمان آنحضرت صلعم کے گرد جمع ہو گئے ہیں تو اس نے اپنی بہتری اسی میں دیکھی کہ فوراً مکہ کی راہ لے۔ اور یہ بھی بعض روایات میں آیا ہے کہ رستہ میں خود ان کو اپنی کرتوت پر ندامت بھی ہوئی اور انہوں نے باہم کہا کہ ہم نے اچھا نہیں کیا اور بغیر استیصال کے مسلمانوں کو چھوڑ آئے مگر پھر بھی اس رعب کی وجہ سے لوٹ نہ سکے۔ بلکہ اُلٹا نبی کریم صلعم نے ان کا تعاقب اگلے دن حمراء الاسد تک کیا۔ اور پھر رعب کی وجہ سے ہی تھا کہ اگلے سال باوجود وعدہ کر جانے کے ابوسفیان مقابلہ کے لئے نہ نکلا اور جنگ احزاب میں جب دس ہزار آدمیوں کو ساتھ لیکر آیا تب بھی راتوں رات یہ عظیم الشان لشکر جس کے سامنے مسلمانوں کی کوئی حقیقت نہ تھی بھاگ اُٹھا۔ اور پھر اس کے بعد تو ایسے مرعوب ہوئے کہ نہ صرف خود ان کے حملوں کا انقطاع ہو گیا بلکہ جب آٹھویں سال ہجرت میں نبی کریم صلعم نے ان کی عہد شکنی کی وجہ سے دس ہزار صحابہ کے ساتھ چڑھائی کی تو وہ کچھ بھی مقابلہ نہ کر سکے۔ غرض ایک چھوٹی سی جماعت کے سامنے سارے ملک کا عاجز آ جانا اسی رعب خداوندی کی وجہ سے تھا +

آنحضرت کا رعب آپ کی خصوصیات میں سے ہے: کئی صحیح حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے اپنی جو خصوصیات دیگر انبیاء پر بیان کی ہیں ان میں آپ کو رعب کا دیا جانا بھی ہے۔ چنانچہ یہ حدیث متفق علیہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ میری امداد ایک مہینہ کی مسافت کے برابر رعب سے کی گئی ہے اور یہ رعب کوئی فرضی بات نہیں۔ نبی کریم صلعم کی زندگی آپ کے بعد صحابہ کی زندگی اور ایک مدت تک مسلمانوں کی حالت اس کا کھلا کھلا نقشہ پیش کرتی ہے حتّٰی کہ آج سے ایک صدی پیشتر تک یورپ کی عورتیں اپنے بچوں کو ترکوں کے نام سے ڈراتی تھیں۔ گو وہ ان سے مسیرت شہر کے فاصلہ سے بھی زیادہ دور تھے۔ اور آج مسلمانوں کی اس گئی گزری حالت میں بھی اکثر عیسائی مدبرین کی یہ حالت ہے کہ وہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح کمزور کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں کیونکہ وہ ان کی قوت سے ڈرتے ہیں۔ کہیں پین اسلامزم کا ایک فرضی بت بنا کر اس سے یورپ خائف ہو رہا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کی سیاسی طاقت جو کچھ ہے اس سے اتنی بڑی عظیم الشان سلطنتوں کا خائف ہونا جو کروڑوں کی تعداد میں افواج رکھتی ہیں۔ اور جن کے آہن پوشوں ان کے ہوائی جہازوں ان کی سترہ انچ دہانوں کی توپوں کے سامنے مسلمان بالکل نہتے ہیں۔ ایک مضحکہ انگیز خیال ہے۔ ایسا ہی حالانکہ مسلمان اپنے دین کی اشاعت کی طرف سے بالکل غافل ہیں اور قریباً ایک مردگی کی حالت کو پہنچے ہوئے ہیں مگر عیسائی مشنوں کو اگر کسی مذہب کا خوف ہے تو وہ اسلام ہے یہ رعب حق ہے۔ اور یہ اسی طرح رہے گا۔ کیونکہ مخبر صادق کے الفاظ غلط نہیں ہو سکتے۔ اور خدائی وعدہ جھوٹ نہیں ہو سکتا

اس رعب کی وجہ: اس رعب کی وجہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرما دی ہے بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ اس لئے کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ مشرک بزدل اور کمزور ہوتا ہے کیونکہ جو شخص ادنےٰ سے ادنےٰ طاقت کے سامنے

اِذْ تَحُسُّوْنَھُمْ بِاِذْنِہٖ

جب تم اس کے اذن سے انکو کاٹ رہے تھے ۵۳۸

سر جھکا دینے کو تیار ہے حتی کہ باد و باران کی اور دوسری ارضی و سماوی طاقتیں تو ایک طرف رہیں بیجان چیزوں جیسے پتھر اور بتوں اور مردہ انسانوں کو بھی اپنا خدا سمجھ کر ان کی عبادت کرتا اور ان سے دعائیں کرتا ہے اس کا دل کمزور ہو جاتا ہے برخلاف اس کے ایک خدا پر ایمان رکھنے والا موحد مسلمان ایک اللہ تعالیٰ کی طاقت کو ہی اپنے اوپر سمجھتا ہے باقی سارے عالم کی طاقتوں کو وہ اپنے نیچے سمجھتا ہے اس لئے چونکہ حقیقی طور پر کسی چیز سے اس کا دل خائف نہیں ہوتا۔ وہ قوی القلب ہوتا ہے اور ساری دنیا کی مخالفت کی بھی اسے کچھ پروا نہیں ہوتی ٭

حس

۵۳۸ تحسون حس سے ہے۔ حاسۃ اس قوت کا نام ہے جس کے ساتھ اعراض حسیہ کا ادراک ہوتا ہے۔ مفردات میں ہے کہ حسست کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک قوت حاسہ کے ساتھ ایک چیز کو پالینا و دیکھو نمبر ۴۴۲ اور دوسرا کسی چیز کے حاسہ کو لے لینا جس سے اس کا قتل مراد ہے اس لئے حسستہ کے معنی قتلتہ آتے ہیں اور حسیس قتیل کو کہتے ہیں ٭

ابتدائے جنگ میں کفار کا شکست کھا جانا اور وعدہ نصرت الٰہی کا پورا ہونا

یہاں سے جنگ اُحد کے واقعات کا ذکر پھر شروع ہوتا ہے۔ تیرھویں رکوع کی ابتدا میں کہا تھا و اذ غدوت من اھلک تبوئ المؤمنین مقاعد للقتال دوسرا واقعہ وہیں فرمایا تھا اذ ھمت طائفتان منکم ان تفشلا۔ تیسرا واقعہ تھا اذ تقول للمؤمنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثۃ الاف من الملائکۃ منزلین اسکے بعد اب چوتھے واقعہ کا ذکر فرماتا ہے۔ و لقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسونھم باذنہ اور درمیان میں وعظ و نصیحت کو بیان کیا ہے۔ اور مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرنے کا سامان اور کامیابی کی راہیں بتائی ہیں اور یوں ملائکہ کی نصرت کے وعدہ کے بعد گویا اب فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ وعدہ سچا بھی کر دکھایا۔ اور اصل غرض کو اذ تحسونھم میں بیان کیا ہے یعنی تم نے ان کو قتل کرنا شروع کیا۔ لیکن باوجودیکہ صاف فرمایا کہ تین ہزار ملائکہ سے تمہاری نصرت کرینگے اور پھر صاف فرمایا کہ وہ وعدہ بھی ہم نے سچ کر دکھایا یعنی ملائکہ کو نازل بھی فرما دیا۔ مگر یہ کس طرح ہوا اذ تحسونھم باذنہ جب اللہ تعالیٰ کے خاص ارادہ سے تم نے انہیں قتل کرنا شروع کیا یہ نہیں کہ ملائکہ نے انہیں قتل کرنا شروع کیا بلکہ تم مسلمانوں نے قتل کرنا شروع کیا۔ گویا ملائکہ صرف معاون ہیں۔ یا کفار کے دلوں میں رعب ڈالنے والے ہیں جیسا سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب سے ظاہر ہے اور جنگ کرنے والے کافروں کو قتل کرنے والے مسلمان ہیں ٭

مسلمانوں کا کافروں کو قتل کرنا اور یہانتک قتل کرنا کہ وہ میدان جنگ سے بھاگ اُٹھے تاریخی واقعات ہیں کفار کے لشکر کو مسلمانوں نے یہانتک تہ تیغ کیا کہ انکا صاحب لواء مارا گیا۔ بلکہ نو آدمی جن کے ہاتھ میں یکے بعد دیگرے جھنڈا آیا سب مارے گئے۔ اور یہ بھی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اس قدر لوگ زخمی ہو گئے تھے کہ آخر سواریوں کے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کو پیٹھوں پر اُٹھا کر لے گئے اور کثرت سے زخمی ہو جانے کی وجہ سے ہی ان کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ باوجود مسلمانوں کے منتشر ہو جانے کے انکا استیصال کر سکتے یا ان کو قید ہی کر لیتے۔ اور یہ جو بعض عیسائی مورخوں نے لکھدیا ہے کہ فی الحقیقت کوئی شکست کفار کو نہ ہوئی تھی بلکہ یہ ان کی ایک چال تھی۔ کوئی واقعہ جنگ کا اس کی تائید نہیں کرتا جن کی تباہی کیلئے اس قدر سامان کر کے آتے ہوں ان کا اسی طرح میدان جنگ میں چھوڑ کر چلے جانا صاف بتاتا ہے کہ یہ چال کوئی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کی غلطی سے خالد نے ایک فائدہ اٹھایا۔ اور صحیح روایات سے ثابت ہے کہ فی الواقع ان کا لشکر ہزیمت اُٹھا چکا تھا۔ اور قرآن کریم نے یہ صاف دعویٰ کیا ہے ٭

حَتّٰٓی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ

یہاں تک کہ تم پھسل گئے اور حکم کے متعلق آپس میں جھگڑنے لگے، اور تم نے نافرمانی کی اسکے بعد کہ جو کچھ تم پسند کرتے تھے تمکو دکھا دیا تھا ۵۳۹ تم میں

مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ

کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور کچھ تم میں سے وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے ۵۴۰ پھر تم کو ان سے ہٹا دیا

نزع

۵۳۹ تنازعتم۔ نزع کے معنی ہیں ایک چیز کو اس کی جائے قرار سے کھینچ لیا اور اعراض پر بھی استعمال ہوتا ہے جیسے دل سے محبت یا عداوت کے نکال دینے پر و نزعنا ما فی صدورھم من غل (الاعراف۔ ۴۳) اور سلب یا ایک چیز کے لے لینے پر بھی استعمال ہوتا ہے جیسے تنزع الملک ممن تشاء (آل عمران ۳۔ ۲۵) اور تنازُع اور مُنازعۃ کے معنی ہیں ایک دوسرے کو کھینچنا اور مراد اس سے مخاصمت اور مجادلہ ہے یعنی ایک دوسرے سے جھگڑنا، گویا ہر جھگڑنیوالا دوسرے کو اپنی جگہ سے کھینچتا ہے۔

تنازع

قوم کے بعض افراد کا اثر کل قوم پر

یہ جنگ کی پانچویں حالت کا ذکر ہے۔ فشلتم اور تنازعتم اور عصیتم سب میں اصل ذکر صرف تیراندازوں کے گروہ کا ہے۔ گو بظاہر مخاطب سب نظر آتے ہیں۔ قرآن کریم کا یہ قاعدہ ہے کہ جب قوم کے بعض افراد کے کسی کام کا اثر کل قوم پر پڑے تو وہ کل قوم کا ہی ذکر کرتا ہے۔ جو کچھ تیراندازوں نے کیا اس کا خمیازہ سارے مسلمانوں کو اٹھانا پڑا اس لئے سب کو ہی مخاطب کر لیا ہے ✦

تیراندازوں کی غلطی

تیراندازوں کی پہلی حالت کو فشلتم سے تعبیر کیا ہے یعنی تم میں بزدلی ظاہر ہوئی یہ بزدلی دشمن کے مقابلہ کے معاملہ میں نہ تھی بلکہ جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے۔ مال غنیمت کے خیال کے سامنے رسول اللہ صلعم کے حکم کی نافرمانی تھی درحقیقت بڑی بزدلی تھی کہ تھوڑے سے دنیوی فائدہ کے سامنے دل کمزور ثابت ہوا۔ پھر ان کی دوسری حالت کو تنازعتم فی الامر سے تعبیر کیا ہے۔ امر سے مراد نبی کریم صلعم کا امر ہے جس میں آپ نے صاف طور پر فرمایا تھا۔ لا تبرحوا ان رایتمونا ظھرنا علیھم فلا تبرحوا وان رایتموھم ظھروا علینا فلا تعینونا (بخاری)، تم نے اپنی جگہ نہ چھوڑنا اگر تم دیکھو کہ ہم ان پر غالب آ گئے ہیں تو اپنی جگہ نہ چھوڑو اور اگر دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آ گئے ہیں تو تم ہماری مدد کیلئے نہ آؤ۔ اور تنازع یوں واقعہ ہوا۔ کہ جب تیراندازوں نے دیکھا کہ دشمن بھاگ گیا یہاں تک کہ ان کی عورتیں پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا کر بھاگیں جیسا کہ شدت کے وقت کی حالت ہوتی ہے۔ تو تیراندازوں نے کہنا شروع کیا الغنیمۃ الغنیمۃ ان کے امیر نے انہیں سمجھایا کہ رسول اللہ صلعم نے ہم کو یہ حکم دیا ہے مگر اس وقت تھوڑے سے لالچ نے حکم کی تاویل کرا دی۔ پچاس تیراندازوں میں سے چالیس نے اپنی جگہ چھوڑ دی پس یہ تنازع بھی باہم تیراندازوں کا تھا اور کوئی تنازع قطعاً ثابت نہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات تیراندازوں کے متعلق ہیں۔ تیسری حالت انکی یہ ہے کہ وہ نافرمانی کے مرتکب ہو گئے یعنی اپنی جگہ کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ نافرمانی کرنے والے صرف چالیس آدمی تھے مگر یہاں بھی سب کے متعلق ہی فرمایا۔ عصیتم تم نے نافرمانی کی کیونکہ ان کی نافرمانی کا اثر سب پر پڑا ✦

مال غنیمت کے حصول کو غرض بنانا خلاف تعلیم قرآنی ہے۔

۵۴۰ ان الفاظ میں انہی تیراندازوں کے دو گروہوں کا ذکر صاف الفاظ میں ہے۔ من یرید الدنیا وہ گروہ ہے جو مال غنیمت کو حاصل کرنے کے لئے اپنی جگہ چھوڑ گیا اور حکم کی نافرمانی کی اور من یرید الاخرۃ میں عبداللہ بن جبیر اور ان کے وہ ساتھی داخل ہیں جنہوں نے اپنی جگہ کو نہیں چھوڑا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مال غنیمت کو لینا گو اسلام نے جائز رکھا ہے۔ مگر اس کو حاصل کرنے کی غرض کو مدنظر رکھنے والوں کو یرید الدنیا کا خطاب دیا ہے۔ اس میں

لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ○

تاکہ تمہاری اصل حالت کو ظاہر کرے ۵۴۱ اور یقیناً اُس نے تمہیں معاف کر دیا اور اللہ مومنوں پر فضل والا ہے ۵۴۲

ان لوگوں کے لئے سبق ہے جو اسلام پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اس کی جنگیں مال غنیمت کو حاصل کرنے کے لئے تھیں۔ ایسی غرض کو قرآن کریم صریح الفاظ میں ایک گرا ہوا خیال قرار دیتا ہے اور جن لوگوں کے دل میں کبھی ایسا خیال آیا ان کو کیسے سخت الفاظ میں سرزنش کی ہے ۔

صحابہ کی جانفشانی اور شجاعت کا اظہار

۵۴۱ یہ جنگ کی چھٹی حالت ہے۔ جب تیراندازوں میں جھگڑا ہوا اور ان کا کثیر حصہ نافرمانی کا مرتکب ہوا تو پہلا نقشہ اذ تحسونھم باذنہ کا یعنی مسلمانوں کے کافروں کو قتل کرنے کا بدل گیا۔ اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کفار سے ہٹا دیا یعنی پہلے کافر بھاگ رہے تھے اور مسلمان ان کو مار رہے تھے اب مسلمان بھاگ رہے ہیں اور کافر ان کو مار رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف ہٹانا منسوب کیا ہے نہ اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے زبردستی مسلمانوں کو پکڑ کر ہٹا دیا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ جب ایک گروہ نے غلطی کی اور اس غلطی کا خمیازہ بموجب قانون الٰہی ساری قوم کو بھگتنا پڑا۔ تو چونکہ یہ ایک غلطی کی سزا تھی جو اللہ تعالیٰ نے دی اس لئے اس کا فاعل اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے۔ مگر یہ سزا بھی محض ایک رحمت کے رنگ میں تھی اور اس کی اصل غرض جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے یہ تھی کہ تا جن لوگوں کے اندر کوئی کمالات ہیں انکا اظہار ہو جائے اور جن کے اندر کچھ کمزوری ہے یا جن کے اندر کچھ خباثت ہے ان کی کمزوری یا خباثت ظاہر ہو جائے چنانچہ جانفشانی جوانمردی شجاعت اور ہمت کا اظہار جو کچھ صحابہ نے اس میدان میں کیا اس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ باوجود اس خبر کے کہ محمد رسول اللہ صلعم قتل ہو گئے وہ دشمن کے مقابلہ سے رُکے نہیں اور قتال میں مصروف رہے۔ رسول اللہ صلعم پر ابن قمئہ حملہ کرنے لگتا ہے تو مصعب بن عمیر صرف رسول اللہ کو بچانے کیلئے اپنا سر کٹوا لیتے ہیں ایک شخص تلوار کا وار آنحضرت صلعم پر کرتا ہے تو طلحہؓ اپنا ہاتھ آگے کر کے کٹوا لیتے ہیں اور نبی کریم صلعم کو بچا لیتے ہیں۔ صحابہ ایک آہنی دیوار سے زیادہ مضبوط دیوار کی طرح نبی کریم صلعم کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اس آہنی دیوار میں سے جب ایک شخص گرتا ہے تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور دشمن اپنی سخت سے سخت کوششوں کے باوجود نبی کریم صلعم تک جن کا قتل کرنا اس کا اصل مقصد تھا پہنچنے میں ناکام رہتا ہے۔ ابودجانہ دشمن کی طرف پیٹھ کر کے رسول اللہ صلعم کے سامنے ڈھال بنکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے مقابل پر پانچ یا دس آدمیوں کے بھاگ جانے پر کیا سات سو صحابہ پر بزدلی کا الزام کوئی عقلمند دے سکتا ہے البتہ خبیث طبع منافقین اور یہودیوں کی خباثت اس سے ظاہر ہو گئی ۔

۵۴۲ ولقد عفا عنکم تم کو معاف کر دیا یعنی غلطی تو ایسی خطرناک تھی کہ معمولی حالات میں ایک قوم کے استیصال کے لئے کافی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ چونکہ مومنوں پر فضل کرتا ہے اس لئے اس نے اس غلطی کی پوری سزا تم پر وارد نہیں کی بلکہ عفو سے کام لیا اور تم کو استیصال سے بچا لیا۔ یہاں عفو عن الاستئصال مراد ہے (ر) اور اگر عفو گناہ مراد ہے۔ تو یہاں تیراندازوں کی نافرمانی پر عفو کا ذکر ہے اور دوبارہ جو آیت ۱۵۴ میں ولقد عفا اللہ عنھم آتا ہے تو وہ بھاگنے والوں سے عفو کرنا ہے ۔

ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے بڑے بھاری گناہ ہوں جن کو کبیرہ گناہ کہنا چاہئے انسان کی بعض دوسری خوبیوں کی وجہ سے بلا توبہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کی صفات میں دوسری

۱۵۲ إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ

جب تم دور نکلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف التفات نہ کرتے تھے اور رسول تمہیں تمہارے پیچھے بلاتا تھا ۵۴۳

جگہ آتا ہے۔ غافر الذنب وقابل التوب (المؤمن ۴۰-۳) بغیر توبہ گناہ کو معاف کرنے والا اور توبہ کا قبول کرنے والا +

صعود۔ اصعاد

۵۴۳ تصعدون ۔ صعد سے ہے۔ اور صُعُود کے معنی ہیں بلند مکان میں جانا (غ) اور اِصْعَاد (جس سے یہاں تصعدون آیا ہے) زمین میں دور نکل جانا ہے خواہ اوپر کی طرف جا رہا ہو یا نیچے کی طرف (غ) گو اس کا اصل صُعُود سے ہی ہے یعنی بلند مقامات کی طرف جانے سے لیکن پھر صرف دور نکل جانے پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ گو اس میں صعود

تعال

یعنی اوپر چڑھنے کا اعتبار نہ ہو امام راغب نے اسی کو صحیح تسلیم کیا ہے اور اس کی مثال انہوں نے تعال سے دی ہے جس کی اصل علوّ سے ہے مگر اب اس کے معنی محض آنا ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اصعاد سے مراد ابعاد فی الارض نہیں بلکہ اس سے اشارہ کیا ہے کہ جس بات کا انہوں نے قصد کیا اور جس کی طرف گئے اس میں انہوں نے علو اختیار کیا یعنی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی (غ) +

لوی

تلوون ۔ لوی کے اصل معنی فتل حبل یعنی رسہ کا بٹنا ہیں۔ مگر لَوَيْتُ عَلَيْهِ کے معنی ہیں عَطَفْتُ دل ہیں اسکی طرف مڑا۔ اور حدیث میں آتا ہے لا یلوی احدٌ علیٰ احدٍ جس کے معنی ابن اثیر نے کئے ہیں اس کی طرف التفات نہیں کرتا تھا اور نہ اس کی طرف پھر کر دیکھتا تھا +

فی اخراکم سے مراد یا تو فی جماعتکم الاخری ہے یعنی تمہاری پچھلی جماعت میں گویا ایک جماعت آگے نکل گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک گروہ میں پیچھے رہ گئے تھے۔ اور یا اس سے مراد فی ورائکم ہے یعنی تمہاری پچھلی طرف کیونکہ جاء فلان فی اخرا الناس و اخراہم کے معنی ہوتے ہیں جاء خلفہم ان کے پیچھے آیا +

آنحضرت صلعم کی شجاعت

یہ جنگ کا ساتواں مرحلہ تھا کہ جب مسلمان دشمن کی زد میں آ کر بھاگ اٹھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اجتماع کے لئے بلا رہے تھے۔ اور بآواز بلند کہہ رہے تھے الیّ عباد اللہ الیّ عباد اللہ انا رسول اللہ اے اللہ کے بندو! میری طرف آجاؤ میں اللہ کا رسول ہوں ایسے خطرناک موقعہ پر اپنے آپ کو آگے بڑھانا۔ اور دشمن کے حملہ کی زد میں لانا نبی کریم صلعم کی کمال شجاعت کو دکھاتا ہے۔ اور ظاہر کرتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی نصرت پر کس قدر بھروسہ تھا۔ کہ میدان جنگ میں دشمن کے غلبہ کے وقت آپ سب سے آگے ہوتے اور گویا دشمن کو اپنے اوپر حملہ کرنے کے لئے بلاتے ہیں یہی نقشہ آپ کی قوت قلبی کا میدان حنین میں نظر آتا ہے جب مسلمانوں کی جمعیت دشمن کی تیر اندازی کی وجہ سے پریشان ہوگئی اور لوگ بالکل تاب مقابلہ نہ لا کر منتشر ہوتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ تو اس وقت آپ دشمن کی صفوں کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب میں نبی ہوں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ اُحد کے میدان میں منتشر فوج کو جمع کرنے کے لئے آپ نے اپنی جان کی پرواہ نہیں کی۔ اور اس طرح یہ نمونہ دکھایا کہ ایک جرنیل کو میدان جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو کس طرح آگے کرنا چاہئے۔ اور اپنے سپاہیوں کو یہ دکھانا چاہئے کہ وہ اپنی جان کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس آواز کا ہی یہ نتیجہ تھا۔ کہ مسلمانوں نے آپ کے گرد جمع ہونا شروع کیا۔ اور ان کی منتشر جمعیت مجتمع ہوگئی +

فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ط

پھر تم کو ایک غم کے بدلے (دوسرا) غم دیدیا تاکہ تم اس پر غمگین نہ ہو جو تم سے جاتا رہا اور نہ اس (مصیبت) پر جو تمہیں پہنچی

وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○

اور اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو ۵۴۴

اثاب — ۵۴۴ اثابکم۔ اثاب کے معنی اصل میں جزا دینا یا ایک فعل کے نتیجہ کا لوٹا کر لانا ہے دیکھو ۱۳۱ مگر بعض وقت صرف دینے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے اثابہ اللہ ثوابہ میں اثابہ کے معنی صرف اعطاہ ہیں (ل) یعنی اس کو دیا۔ اور ثواب چونکہ خیر اور شر دونوں میں استعمال ہوتا ہے اس لئے غلطی کی سزا پر بھی اثابہ بولا جاسکتا ہے +

غم — غما ۔ غمّ کے اصل معنی ستر الشئ ہیں کسی چیز کا ڈھانک لینا اسی لئے غمام بادل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سورج کی روشنی کو ڈھانک لیتا ہے اور غم کو غم اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ لذت و سرور کو ڈھانک لیتا ہے +

ب — بغم۔ ب مصاحبت کے لئے ہے اور معنی یوں ہونگے کہ تمہاری غلطی کی سزا میں ایک غم کے ساتھ دوسرا غم دیا اور یا معاوضہ کے لئے ہے اور معنی یوں ہونگے کہ ایک غم کے بدلے دوسرا غم دیا پہلا غم تو یہ تھا کہ ان کے ہاتھ سے شکست خوردہ دشمن نکل گیا اور مسلمان مارے گئے اور زخمی ہوئے اور دوسرا غم یہ تھا کہ دشمن کا حملہ الیّ عباد اللہ کہنے پر نبی کریم صلعم پر ہو کر آپ کو سخت زخم لگے اور قریب تھا کہ آپ کو شہید کردیا جاتا بلکہ جھوٹ طور پر آپ کے قتل کی افواہ بھی اڑائی گئی +

فوت — ما فاتکم۔ فوت کسی چیز کا انسان سے اس طرح دور ہوجانا ہے کہ اس کا پانا محال ہوجائے پس ما فاتکم سے مراد وہ فوائد ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتے رہے اور وہ فتح کے ثمرات تھے مال غنیمت کا ہاتھ آنا دشمن کا قید کرنا وغیرہ ما اصابکم۔ مسلمانوں کی اپنی مصیبت اور ان کا زخمی ہونا اور مارا جانا ہو +

صحابہ کی محبت آنحضرت صلعم سے — ان الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک غم کی جگہ یا ایک غم کے ساتھ دوسرا غم تم کو دے دیا۔ تاکہ تم غم نہ کرو نہ اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور نہ اس پر جو تم کو مصیبت پہنچی۔ یہ جنگ اُحد کا آٹھواں مرحلہ ہے +

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر دشمن نے اپنے حملہ کا پورا زور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالا۔ اور قبل اسکے کہ صحابہ آپکے گرد جمع ہوسکیں۔ آپ کو سخت زخم پہنچے یہانتک کہ آپ گر گئے۔ اودھر اس آواز نے منتشر ہوئے ہوئے مسلمانوں کو اکٹھا کردیا۔ مسلمانوں کو پہلا غم تو یہ تھا۔ کہ دشمن اُن کے تعاقب سے نکل گیا اور اُلٹا ان کو مصیبت پہنچی مگر اب جو رسول اللہ صلعم کی حالت کو دیکھا تو وہ اپنا غم بھول گئے اور اس کی جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ دوسرا غم دے دیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ بتایا ہے۔ کہ تا جو غنیمت تمہارے ہاتھ سے نکل گئی اور دشمن بچ کر چلا گیا۔ اس پر تم کو افسوس نہ رہے اور نہ ہی جو دُکھ اور مصیبتیں تم کو پہنچیں ان پر کچھ افسوس ہو کیونکہ رسول اللہ صلعم سے جو محبت مسلمانوں کو تھی وہ ایسی شدید تھی کہ آپ کی تکلیف کو دیکھتے ہی اُنہیں اپنے سب غم بھول گئے۔ وہاں میدان جنگ میں تو مرد تھے۔ جو رسول اللہ صلعم کو ادنیٰ تکلیف سے بچانے کے لئے اپنی گردیں کٹوانے کو تیار تھے بلکہ اسی میں راحت پاتے تھے۔ مدینہ میں عورتوں نے اپنے رشتہ داروں اور بیٹوں بھائیوں وغیرہ کی شہادت پر افسوس نہیں کیا جب اُن کو یہ معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ صلعم زندہ ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک واقعہ ایک بی بی کا لکھا ہے کہ اسے خبر دی گئی کہ اس کا باپ اور اس کا بیٹا اور اس کا خاوند جنگ میں شہید ہوگئے تو اس نے دریافت کیا۔ کیا رسول اللہ صلعم تو زندہ ہیں لوگوں نے کہا ہاں تو اس نے کہا۔

۱۵۴ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ

پھر غم کے بعد تم پر امن نازل کیا (یعنی) اونگھ جس نے تم میں سے ایک گروہ کو ڈھانک لیا ۵۴۵ اور ایک گروہ کو اپنے

اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ

آپ نے فکرمند کر رکھا تھا وہ اللہ پر ناحق بدگمانی جاہلیت کی سی بدگمانی کرتے ہیں کہتے ہیں کیا ہمارا بھی کچھ

مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ

اختیار ہے کہو اختیار تو سب کا سب اللہ کا ہی ہے ۵۴۶ وہ اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپاتے ہیں جو تجھ پر ظاہر نہیں کرتے۔

كُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ۔ آپ کے بعد ہر ایک مصیبت ایک حقیر شے ہے یہ وہ محبت تھی جو رسول صلعم کے ساتھ صحابہ مرد اور عورتوں کو تھی۔ اور درحقیقت صحابہؓ کی محبت کا نقشہ ہی اس حدیث میں کھینچا گیا ہے لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین تم میں سے کوئی ایمان نہیں لاتا جتنک کہ میں اس کے نزدیک اسکے باپ اور اس کے بیٹے اور سارے لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ اس کامل ایمان کا نقشہ صحابہ کی زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتا

نبی کریم صلعم کا جنگ میں تنہا رہ جانا۔

نبی کریم صلعم کا تنہا یا نو یا سات آدمیوں کے ساتھ رہ جانا احادیث سے ثابت ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی سب لوگ بھاگ گئے تھے۔ بلکہ نبی کریم صلعم ایک طرف اکیلے رہ گئے اور فوج منتشر حالت میں تھی اور اسی حالت میں نبی کریم صلعم پر سخت حملہ ہوا یہاں تک کہ سات آدمی انصار میں سے یکے بعد دیگرے آپ کی حفاظت میں جنگ کرتے ہوئے مارے گئے اور حضرت طلحہ کے جسم پر ستر سے زیادہ زخم آئے اور ان کی انگلیاں بھی کٹ گئیں۔ اور آخر میں جب ابی بن خلف نے نبی کریم صلعم پر حملہ کیا تو آپ نے اپنا نیزہ اسے مارا اور ساتھ ہی یہ لفظ بھی فرمائے اشتد غضب اللہ علی من قتلہ رسول اللہ صلعم بیدہ فی سبیل اللہ اللہ کا سخت غضب اس شخص پر ہے جس کو رسول اللہ صلعم نے اپنے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں قتل کیا۔ اور کسی جنگ میں آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا

امنة

۵۴۵ امنة۔ امن کی طرح مصدر ہے۔ اور ترکیب میں انزل کا مفعول ہے +

نعاس

نعاسا۔ نعاس تھوڑی نیند کو کہتے ہیں جیسے اونگھ اور ایک قول یہ بھی ہے۔ عبارة عن السکون والھدوء (غ) یعنی اس سے مراد سکون اور اطمینان ہے یہاں نعاسًا امنة سے بدل واقع ہوا ہے +

یہ جنگ اُحد کا نواں مرحلہ ہے مسلمان آنحضرت صلعم کے گرد جمع ہو گئے اور کفار انکے انتشار کو پھر اجتماع کے رنگ میں دیکھ کر میدان جنگ چھوڑ گئے۔ اور مسلمان اسی میدان میں رہے اور دشمن کی طرف سے ایسے مطمئن ہوئے کہ بعض کو نیند آگئی یا کامل سکون کی حالت وارد ہو گئی۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے گو تکلیف اٹھائی مگر شکست نہیں کھائی کیونکہ میدان جنگ میں وہ موجود رہے اور ایسے اطمینان کی حالت میں تھے اور دشمن کی طرف سے ایسے بےخوف کہ بعض کو نیند بھی آگئی۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر دشمن کی طرف سے کچھ خوف وخطر ہوتا تو نیند نہ آسکتی تھی بعض احادیث میں جو یہ لفظ آتے ہیں کہ راوی کہتا ہے میدان جنگ میں مجھے اس قدر نیند آئی کہ تلوار ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ پڑتی تھی اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ جب مجھے اونگھ آرہی تھی تو میں نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا لو کان لنا من الامر شیء ما قتلنا ھھنا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں خواب میں سن رہا ہوں (ت) ظاہر ہے کہ یہ جنگ کا خاتمہ ہے +

۳: ۱۵۴

۵۴۶ اھمتھم۔ اھمت ھم سے ہے جس کے معنی غم یا حزن ہیں۔ اور جب کوئی امر تمہیں قلق وحزن میں ڈالے تو کہا جاتا

يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ
کہتے ہیں اگر ہمارا بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے کہو اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے

لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي
تو جن کیلئے قتل ہونا لکھا جاچکا تھا وہ ضرور اپنے لیٹنے کے موقعوں کی طرف نکل آتے اور تاکہ اللہ اسے ظاہر کردے جو

صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝
تمہارے سینوں میں ہے اور اسے خالص کردے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے ۵۴۷

ہے اهمتهم الامر (دل)۔

يظنون بالله غير الحق۔ غیر الحق یا مصدر کے حکم میں ہے غیر ظن الحق۔ اور ظن الجاهلية اس سے بدل ہے۔ اور یا ظن الجاهلية مصدر موکد ہے اور غیر الحق یظنون کی تاکید ہے۔

ظن الجاهلية ظن الجاهلية میں موصوف کی اضافت اس کی صفت کے مصدر کی طرف ہے اور مراد ہے ظن المختص بالجاهلية یعنی ایسا ظن جو جاہلیت سے مخصوص ہے یا حذف مضاف پر مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے۔ اور مراد ہے ظن اهل الجاهلية یعنی اہل جاہلیت کا سا ظن اہل جاہلیت سے مراد مشرک لوگ ہیں کیونکہ جاہلیت کا زمانہ قبل اسلام کا زمانہ ہے۔

الامر الامر سے مراد یا تو معاملہ ہے۔ ...... یعنی اس معاملہ جنگ میں کچھ ہمارا دخل یا اختیار ہے۔ اور یہی معنی میں نے اختیار کئے ہیں۔ اور حکومت بھی بعض مفسرین نے مراد لی ہے اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کیا وہ حکومت جس کا وعدہ محمد صلعم دیتے ہیں ہمیں مل سکتی ہے۔ یہ خیال اس لئے پیدا ہوا کہ اُحد میں سخت تکلیف اُٹھانی پڑی۔

منافقوں کی چہ میگوئیاں یہ گروہ جن کو اپنی ہی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی منافقین کا گروہ تھا جو عبداللہ بن ابی کے ساتھ جنگ کے شروع ہونے سے پہلے ہی واپس ہوگیا تھا ان کو اسلام کی حفاظت سے بہت بڑھکر اپنی فکر تھی کہ کہیں مارے نہ جائیں اس لئے وہ ساتھ شامل نہ ہوئے۔ یظنون بالله غير الحق ظن الجاهلية میں جس ظن کا ذکر ہے اس کی تصریح قرآن کریم نے خود دوسری جگہ فرمائی ہے جہاں منافقوں کے ایسے ہی ظنوں کا ذکر ہے بل ظننتم ان لن ينقلب الرسول والمومنون الى اهليهم ابدا (الفتح-۱۲) اُحد کی جنگ میں بھی منافقوں کو یہی خیال تھا کہ اتنے بڑے لشکر کے ہاتھ سے کھلے میدان میں مسلمان مارے جائیں گے۔ اب جو واقعات جنگ کی خبر ان کو پہنچی تو وہ بھی باتیں بنانے لگے اور کچھ اپنے مشورہ کو اہمیت دینی شروع کی یقولون هل لنا من الامر من شيء ہمارا بھی اس معاملہ میں کچھ اختیار ہوتا یعنی اگر ہماری بات مان لی جاتی تو یہ تکلیف پیش نہ آتی۔ عبداللہ بن ابی کا مشورہ یہ تھا کہ مدینہ میں ہی رہکر جنگ کی جائے۔ اب اس نے اپنے اس مشورہ کے درست ہونے پر زور دینا شروع کیا۔ کہ اگر میری بات مان لی جاتی تو یہ مصیبت کیوں پیش آتی اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یوں دیا ہے۔ کہ سب اختیار اللہ کا ہی ہے۔ کیونکہ شوریٰ اسی کا حکم ہے اور شوریٰ پر عمل کرکے ہی نبی صلعم نے باہر نکلنے کا حکم دیا تھا۔ ایک تکلیف کے ڈر سے ایک اصول کو چھوڑنا درست نہیں یہ وہ سبق ہے جو اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے۔ اور یا مراد یہ ہے کہ جس حکومت میں سے تم کچھ حصہ چاہتے ہو وہ سب ہی اللہ تعالیٰ تمہیں دینے والا ہے۔

مضجع ۵۴۷ مضاجع۔ مَضْجَع کی جمع ہے اور ضجع کے معنی لیٹ جانا یعنی اپنی کروٹ کو زمین کے ساتھ لگانا یا سوجانا ہیں۔

۱۵۴ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ

وہ لوگ جنہوں نے اس دن تم میں سے پیٹھ پھیر دی جس دن دو گروہ (جنگ میں) ملے شیطان نے ہی انکو پھسلانا چاہا اسکے کسی حصہ

مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝

کیوجہ سے جو انہوں نے کمایا اور یقینا اللہ نے انکو معاف کر دیا ہے کیونکہ اللہ بخشنے والا حلم والا ہے ۵۴۵

پس مضجع لیٹنے یا سونے کی جگہ ہے تتجافی جنوبہم عن المضاجع (السجدۃ ۳۲-۱۶) میں سونے کی جگہ ہی مراد ہے +

صحابہ کی جان نثاری پر قرآن کی شہادت

یہاں منافقوں کے دل میں جو خیال اُٹھا اس کا ذکر کیا ہے اور اس کا جواب دیا ہے۔ فرمایا ان کے دل میں کچھ ہے جسکو ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں یعنی دل میں کہ اگر ہمارا کچھ اختیار ہوتا یعنی ہماری بات مان لی جاتی یا معاملہ جنگ میں ہم کو اختیار دیدیا جاتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔ ماقتلنا سے مراد ان کے بعض لوگوں کا قتل ہونا ہے کیونکہ منافق ان لوگوں کے رشتہ دار بھی تھے جو میدان اُحد میں جنگ کر رہے تھے۔ ان کی ان بیہودہ گوئیوں کا یہ جواب دیا ہے کہ جن مسلمانوں نے جان نثاری کی ہے اور خدا کی راہ میں شہید ہو گئے ہیں۔ وہ تو خدا کی راہ میں اس طرح جان دینے کو تیار تھے۔ کہ مدینہ میں رہ کر جنگ ہوتی تو وہ کوئی اپنے گھروں میں چھپے نہ بیٹھے رہتے بلکہ دشمن کے مقابلہ پر نکل کر جان نثاری کا سچا نمونہ دکھاتے لوکنتم فی بیوتکم سے مراد یہی ہے کہ مدینہ میں رہکر جنگ کرتے۔ ورنہ یوں تو منافق اپنے گھروں میں ہی رہے تھے۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ جو شہید ہوئے اُنہوں نے تو جان نثاری دکھائی۔ اور خدا کی راہ میں اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ جنگ یہاں ہوتی یا وہاں وہ تو اسی طرح اپنے آپ کو قربان کر دیتے۔ اور اگر کہنے والا گروہ ان لوگوں میں سے ہو جو جنگ میں شامل تھے مگر ان کے دلوں میں کچھ کمزوری تھی۔ تو مراد یہ ہوگی کہ اگر تم جنگ کے لئے نہ نکلتے تو تمہاری کمزوری کے سبب سچے مومن جنگ سے نہ رُک جاتے اور قتل کفار کے لئے ضرور باہر نکل آتے اور خدا کی راہ میں جانیں دیتے۔ مگر جو کچھ ہوا وہ بیفائدہ نہیں ہوا +

ولیبتلی اللہ ما فی صدورکم ولیمحص ما فی قلوبکم اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ بعض سینوں کے اندر مخفی تھا وہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا جن دلوں میں منافقت اور کھوٹ تھا۔ اُن کا کھوٹ ظاہر ہو گیا اور جن کے دلوں میں بعض کمزوریاں تھیں ان کی تمحیص کر دی گئی یعنی ان کی کمزوریاں دور کر دی گئیں +

۵۴۵ استزلہم۔ زلّ سے ہے زَلّۃ اصل میں بلا قصد پاؤں کے پھسل جانے کو کہتے ہیں اور اِستزلّہ کے معنی ہیں تحرّی زلّتہ (غ) یعنی اس کی زلّۃ کا قصد کیا۔ لفظ زلّۃ کو ان کی طرف منسوب کر کے بتا دیا کہ جو کچھ بھاگنے والوں سے ہوا وہ بلا قصد تھا ارادۃً وہ میدان جنگ کو چھوڑ کر نہیں بھاگے۔ مگر ببعض ماکسبوا میں بتا دیا کہ ان کا کچھ اپنا قصور بھی تھا بعض مفسرین نے اس کو ان کی پہلی کسی غلطی پر لگایا ہے +

جنگ اُحد میں بھاگنے والے

یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو جنگ میں شامل تو ہوئے مگر میدان جنگ سے بھاگ گئے۔ کیونکہ منافق التقی الجمعن سے پہلے ہی واپس چلے گئے تھے۔ بھاگنے کے وجوہات کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ جب تیر اندازوں کے جگہ چھوڑ دینے کی وجہ سے کفار کا ہزیمت خوردہ لشکر پلٹا اور مسلمانوں پر حملہ آور ہوا تو مسلمانوں کی فوج بوجہ تعاقب کے پراگندہ حالت میں تھی اور یکدم تنہا ایک بڑی فوج کے حملہ کے سامنے وہ اپنی جمعیت کو قایم نہ رکھ سکے۔ اسی حالت میں نبی کریم صلعم نے آواز دیکر لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہا۔ مگر ایسی حالت میں سب کا جمع ہونا محال تھا بعض لوگ بالکل علیحدہ ہو گئے اور ان کیلئے اصل جمعیت کے ساتھ ملنا مشکل ہو گیا بعض ایسے لوگ میدان جنگ سے بھاگ گئے۔ اور ان کے قدموں کو لغزش آگئی ۔ خواہ

ع ۱۷ / ۸

جنگ اُحد میں مومنوں اور منافقوں میں تمیز

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا ۱۵۵

اے لوگو جو ایمان لائے ہو ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کافر ہوئے

کچھ بھی واقعات ہوں۔ میدان جنگ سے بھاگنا اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کیلئے پسند نہ تھا۔ اگر وہ تھوڑی دیر اور انتظار کرتے تو اصل جمعیت کے ساتھ مل جاتے۔ ہر ایک کمزوری کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے شیطان کی طرف ہی منسوب کیا ہے مگر ساتھ ہی اس کو زلت کہکر بتا دیا کہ وہ ارادۃً نہیں بھاگے +

بھاگنے والوں کی تعداد

ان بھاگنے والوں کی تعداد کس قدر تھی۔ روایات میں عموماً قیاس سے کام لیا گیا ہے۔ اس لئے بعض نے کہدیا ہے کہ فوج کی ایک تہائی بھاگ گئی تھی اور ایک تہائی مجروح ہو گئے تھے۔ اور ایک تہائی نبی کریم صلعم کے ساتھ رہے۔ یہ بالبداہت غلط ہے۔ کیونکہ سات سو کی کل جمعیت مسلمانوں کی تھی۔ اگر اُن میں سے صرف دو سو آدمی نبی کریم صلعم کے ساتھ رہ گئے ہوتے تو تین ہزار کفار کی فوج اُن کو میدان جنگ پر قابض چھوڑ کر مکہ کو واپس نہ ہو جاتی۔ بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ چودہ یا سترہ آدمی رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہ گئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد صرف وہ آدمی ہیں جو کفار کے دوبارہ حملہ کی ابتداء میں آنحضرت صلعم کے ساتھ رہ گئے تھے۔ کیونکہ سب لوگ تعاقب میں مصروف تھے۔ امام رازی جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہی درست معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں والذی تدل علیہ الاخبار فی الجملۃ ان نفرا منھم تولوا وابعدوا فمنھم من دخل المدینۃ ومنھم من ذھب الی سائر الجوانب واما الاکثرون فانھم نزلوا عند الجبل واجتمعوا ھناک یعنی مختلف روایتیں جس بات پر دلالت کرتی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک نفر بھاگ گئے تھے اور دور چلے گئے تھے (عربی زبان میں نفر کا لفظ تین سے نو تک یا دس سے کم آدمیوں کے گروہ پر بولا جاتا ہے) ان میں سے بعض مدینہ میں داخل ہوئے۔ اور بعض دوسری اطراف میں بھاگ گئے لیکن کثیر حصہ فوج کا پہاڑ کے پاس ہی رہا اور وہیں جمع ہو گئے اور یہی قول قفال کا ہے جس نے ان کو نفرا قلیلا بھی کہا ہے (غ ق) +

بھاگنے والے کون کون تھے۔

بھاگنے والوں میں کون کون تھے۔ اکثر روایات میں صرف حضرت عثمان رضؓ کا اور اُن کے ساتھ دو انصار سعد اور عقبہ کا نام پایا جاتا ہے کسی ایک آدھ ناقابل اعتبار روایت میں حضرت عمرؓ کا نام بھی ہے مگر وہ آنحضرتؐ کیساتھ میدان جنگ میں تھے چنانچہ صحیح حدیث بخاری کا حوالہ دیا جا چکا ہے جس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر میدان جنگ میں نبی کریم صلعم کے ساتھ موجود تھے۔ بلکہ یہ بھی کہ آپ نے دشمن کے مقابلہ میں خاموش رہنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اور ابو سفیان کو جواب دیا کہ ہم سب تجھے ذلیل کرنے کیلئے خدا کے فضل سے موجود ہیں۔ ہاں حضرت عثمانؓ بھاگنے والوں میں سے تھے۔ اور شیعہ اور خوارج نے یہ طعن آپ پر کیا ہے۔ گو یہ طعن تعجب کی جگہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے ولقد عفا اللہ عنھم۔ جو کچھ بھی ان کا اس میں قصور تھا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا چنانچہ حضرت ابن عمرؓ کے سامنے اس طعن کا ذکر ہوا۔ جو جواب آپ نے دیا وہی دُہرا دینا کافی ہے۔ اس جواب میں حضرت عثمان کے بدر اور بیعت رضوان سے غیر حاضر ہونے کی وجوہ بھی درج ہیں

حضرت عثمان پر طعن

"عثمان بن موہب سے روایت ہے انہوں نے کہا ایک شخص نے بیت اللہ کا حج کیا۔ اُس نے وہاں کئی لوگوں کو بیٹھے دیکھا اور پوچھا یہ کون لوگ بیٹھے ہوئے ہیں انہوں نے کہا قریش ہیں۔ اس نے کہا یہ بوڑھا ان میں کون ہے۔ انہوں نے کہا ابن عمرؓ۔ سو وہ شخص حضرت ابن عمر کے پاس آیا اور کہنے لگا میں آپ سے کچھ سوال کرتا ہوں۔ کیا آپ بتلائینگے۔ چنانچہ اُس نے کہا میں تم کو اس گھر کی حرمت کی قسم دیتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ عثمان بن عفان اُحد کے دن بھاگ گئے تھے۔ فرمایا ہاں۔ اُس نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ وہ بدر کے دن غائب تھے اور اس میں شریک نہ تھے فرمایا ہاں

وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا

اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں جب وہ زمین میں سفر کرتے ہیں یا لڑائی کرتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے

مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ

تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے تاکہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں حسرت بنائے اور اللہ

يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

زندہ کرتا اور مارتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ سے خوب دیکھتا ہے ۵۴۹

کہا کیا تم جانتے ہو وہ بیعت رضوان سے پیچھے رہ گئے اور اس میں شریک نہیں ہوئے۔ فرمایا ہاں۔ اس شخص نے کہا اللہ اکبر (گویا حضرت عثمان پر یہ مطاعن قائم کئے) ابن عمر نے کہا آ میں تم کو بتاؤں اور جو کچھ تم نے پوچھا ہے اس کو کھول دوں اُحد کے دن ان کا بھاگ جانا سو میں گواہی دیتا ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔ اور بدر کے دن ان کا غیر حاضر ہونا سو بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کی صاحبزادی اُن کے گھر میں تھیں اور وہ بیمار تھیں۔ سو نبی صلعم نے (ان کو تیمارداری کا حکم دیا اور) فرمایا کہ تم کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا ایک شخص کو جو اس جنگ میں شریک ہوگا۔ اور ایک آدمی کا حصہ بھی مال غنیمت سے ملے گا۔ اور آپ کا بیعت رضوان سے غیر حاضر ہونا۔ سو بات یہ ہے کہ اگر عثمان سے زیادہ کوئی عزت اور شان والا مکہ میں ہوتا تو آنحضرت صلعم اسی کو مکہ والوں کی طرف بھیجتے سو آپ نے عثمان کو ہی بھیجا اور بیعت رضوان حضرت عثمان کے مکہ کو جانے کے بعد ہوئی پس آنحضرت صلعم نے اپنا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر مار کر فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اسے عثمان کی بیعت قرار دیا۔ اب جا اور ان باتوں کو ساتھ لیجا یعنی یاد رکھ *

ل ۵۴۹ لاخوانہم۔ ل تعلیل کے لئے ہے یعنی لاجل اخوانہم اپنے بھائیوں کی خاطر۔ یا بمعنی فی یعنی ان کی بابت *

ضرب فی الارض ضربوا فی الارض کے لئے دیکھو ۴۸۳ یہاں مراد زمین میں سفر تجارت یا طلب معاش کے لئے ہے *

غاز غزّی۔ غاز کی جمع ہے۔ جو غزا سے ہے۔ اور غزو کے معنی ہیں دشمن کی جنگ کے لئے نکلنا (غ)۔ غاز کے جو معنی مشہور ہیں کہ جو شخص کسی غیر مسلم کو قتل کر دے یا اس کے قتل کیلئے نکلے یہ صحیح نہیں۔ بلکہ غازی وہ ہے جو دشمن کی جنگ کیلئے نکلے

لیجعل اللہ ذلک حسرۃ۔ لام عاقبت ہے یعنی ان کا ایسی باتیں کرنے کا نتیجہ سوائے حسرت کے کچھ نہیں۔ اور یا یہ لام لا تکونوا کالذین کفروا کے متعلق ہے یعنی تمہارا ان جیسے نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ کافروں کے دلوں میں ایک حسرت رہے گی کہ یہ ہم سے کس طرح بڑھ گئے *

مسلمانوں کو موت سے خائف نہ ہونا چاہئے اس آیت میں الذین کفروا کون ہیں یا تو یہ لفظ عام ہیں اور واقعی کافر مراد ہیں وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں۔ ان کے بھائی بند جب تجارت کیلئے یا دشمن کے ساتھ جنگ کیلئے نکلتے اور مارے جاتے تو ان کو افسوس ہوتا کہ کاش وہ باہر نہ نکلے ہوتے اور ہمارے پاس ہی رہتے تو موت سے بچ جاتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ محض ایک حسرت ان کے دل میں رہ جاتی ہے جس کا فائدہ کچھ نہیں کیونکہ ایسا کہنے سے کہ یوں کرتے تو ایسا ہوتا فائدہ کچھ نہیں۔ باقی رہی موت وحیات سو وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے نہ گھر میں بیٹھنے والے سب موت سے بچے رہتے ہیں نہ باہر نکلنے والے سب مر جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو منع کیا ہے کہ تم ایسے نہ ہو جاؤ۔ بلکہ زمین میں تجارت یا طلب معاش کے لئے سفر کرنے یا دشمن کی

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ ۱۵۶

اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کئے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی مغفرت اور رحمت یقیناً اس سے بہتر

خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ○ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ۟لَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ○ ۱۵۷

ہے جو وہ جمع کرتے ہیں - اور اگر تم مر جاؤ یا قتل کئے جاؤ تو یقیناً اللہ کی طرف ہی اکٹھے کئے جاؤ گے ۵۵۰

جنگ کے لئے نکلنے میں موت کا خوف کبھی تمہارے لئے روک نہیں ہونا چاہئے۔ یہ کمزوروں کی باتیں ہیں جس کام کا کرنا ضروری ہے خواہ اس میں موت آئے اس کو کرنا چاہئے۔ بات بات میں موت سے ڈرنے والے کمزور دل ہوتے ہوتے آخر نکمے ہو جاتے ہیں۔ آج یہی حالت کثیر حصہ مسلمانوں کی ہے۔ کہ موت سے ڈرتے گھروں سے باہر نہیں نکلتے حالانکہ ذلت کی زندگی موت سے بدتر ہے۔ اور واللہ یحی ویمیت میں اس طرف اشارہ بھی ہے۔ کہ حقیقی احیاء و اماتت سانس آنے یا نہ آنے کا نام نہیں بلکہ جو لوگ تجارتوں کے لئے طلب معاش کیلئے خدا کے دین کو پھیلانے کے لئے دشمن کی جنگ کے لئے موت کو قبول کر کے نکل پڑتے ہیں ان کو کامیابی کی زندگی دی جاتی ہے اور جو موت کے خوف سے چھپ کر گھروں کے اندر بیٹھ رہتے ہیں وہ جہالت اور ذلت کی موت میں رہتے ہیں۔ حضرت علی کا قول ہے ان لم تقتلوا تموتوا والذی نفسی بیدہ لالف ضربۃ بالسیف اھون من موت علیٰ فراش یعنی اگر تم قتل نہ کئے جاؤ گے تو مر جاؤ گے اور قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تلوار کی ہزار ضرب بستر پر مرنے سے آسان تر ہے۔

اور یا الذین کفروا سے مراد منافق ہیں۔ منافقوں کو بعض جگہ الذین اٰمنوا میں داخل کیا گیا ہے۔ اور بعض جگہ ان کو الذین کفروا سے یاد کیا گیا ہے۔ اور اکثر اوقات ایک علیحدہ گروہ قرار دیا گیا ہے اور اگلی آیت میں ان کے متعلق ہے کہ وہ بہ نسبت ایمان کے کفر سے قریب تر ہیں اور کہیں آتا ہے اٰمنوا ثم کفروا ایمان بھی لاتے ہیں کفر بھی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظاہر میں ایمان لاتے اور دل میں کافر تھے لیکن چونکہ شریعت کا تعلق ظاہر سے ہے اس لئے مسلمانوں کو ان سے مسلمانوں کی طرح ہی سلوک کرنے کا حکم تھا مگر غزوہ تبوک کے بعد بحکم الٰہی نبی کریم صلعم نے چند آدمیوں کو مسجد سے نکال دیا کیونکہ انہوں نے اپنی اصلاح آخر تک نہ کی۔ اب مسلمان جو جنگ اُحد میں مقتول ہوئے یا جو جب تجارت وغیرہ کیلئے نکلتے تو دشمن انہیں مار ڈالتے، تو ان کی نسبت منافقین نے یہ کہنا شروع کیا کہ اگر وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتے یعنی جس طرح سے ہم جنگ سے واپس آ گئے تھے وہ بھی واپس آجاتے تو مارے نہ جاتے اور اخوان ان کو اس لئے کہتے تھے کہ قرابت میں وہ ان کے بھائی بند ہی تھے۔

۵۵۰ آیت ۱۵۶ و ۱۵۷ کا مضمون ملتا جلتا ہے۔ اور جو کچھ پچھلی آیت میں فرمایا تھا اسی کی تائید ہے یعنی موت سے انسان کو خائف نہیں ہونا چاہئے۔ مگر دونوں آیتوں میں ایک باریک فرق نظر آتا ہے۔ آیت ۱۵۶ میں فرمایا اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کئے جاؤ یا مر جاؤ۔ اور یہاں مر جانے سے مراد بھی اللہ کی راہ میں ہی مر جانا ہے۔ کیونکہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہوا انسان قتل بھی ہو جاتا ہے اور مر بھی جاتا ہے اور گو قتل ہمیشہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں اور اکثر اللہ کی راہ میں کام کرتے ہوئے معمولی موت سے ہی مرتے ہیں جیسا کہ صحابہؓ میں بھی گو بہتیرے قتل ہوئے مگر پھر بھی کثیر حصہ معمولی موت سے عالم جاودانی کی طرف انتقال کر گیا۔ تاہم خدا کی راہ میں قتل ہونا چونکہ ایک عظمت کا مقام ہے۔ اور چونکہ منافق زیادہ تر اسی سے ڈرتے تھے اور کمزور دل کو بھی قتل کا ہی زیادہ خوف ہوتا ہے اسلئے یہاں قتل کو مقدم کیا ہے۔ اور فرمایا ہو کہ اللہ کی راہ میں کام کرتے ہوئے

۱۵۰ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ

سو اللہ کی رحمت سے تو اُن کیلئے نرم ہے اور اگر تو سخت کلام سخت دل ہوتا تو تیرے اردگرد سے بکھر جاتے۔۵۵۱

قتل ہو جاؤ یا مر جاؤ۔ تو زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ دنیا کا مال و دولت جمع کرنے میں کمی رہ جائیگی۔ سو یہ مال و دولت جس کو انسان جمع کرتا ہے کیا چیز ہے۔ اس سے بہت بڑھکر اللہ کی مغفرت اور رحمت ہے جس کو خدا کی راہ میں کام کرنے والا پاتا ہے اسلئے مما یجمعون کی نسبت کفار کی طرف کی ہے۔ کیونکہ مال و دولت کے جمع کرنے پر گزارہ رہنا یہ دنیا پرست کا کام ہے جس کو آخرت پر ایمان نہ ہو۔ اور آیت ۱۵۸ میں ترتیب لفظی کو بدل دیا ہے اور فی سبیل اللہ کا لفظ بھی اُڑا دیا ہے تو اس میں یہ بتایا ہے کہ اگر خدا کی راہ میں کام نہ کرو گے تو پھر بھی تو آخر مرو گے اور کچھ نہ کچھ قتل بھی ہو گے تو آخر معاملہ تو اللہ سے ہی پڑنا ہے۔ اور اسی حضور تم نے اکٹھا کیا جانا ہے۔ یہ مال و دولت تو بہر حال ساتھ نہیں جائیگا +

ما

۵۵۱ فبما۔ ما یا تو مزید تاکید کے لئے ہے۔ اور یا استفہامیہ تعجب کے لئے ہے یعنی کس قدر رحمت الٰہی ہے جو تم ان کیلئے نرم ہو

لین

لنت۔ لین خشونت کی ضد ہے اور ان کا استعمال اولاً اجسام میں ہی ہے۔ پھر اخلاق پر بھی یہ لفظ بولے جاتے ہیں

فظ

فظ۔ فظظ کلام میں خشونت کو کہتے ہیں اور فظ سخت گو ہے۔ یعنی کلام میں سختی کرنے والا (ل)، اور فظ کریہ الخلق کو بھی کہتے ہیں (غ) یعنی بدخو کو +

غلظة۔ غلیظ القلب

غلیظ القلب۔ غِلْظَة اور خشونت کے ایک ہی معنی ہیں۔ فظ اور غلیظ القلب میں فرق یہ ہے کہ فظ بدخلق ہے جو دوسروں سے بری طرح پیش آئے۔ اور غلیظ القلب وہ سخت دل ہے جس کا دل دوسرے کی مصیبت سے متاثر نہ ہو اور دوسروں کیلئے اس کے دل میں رقت محبت اور ہمدردی پیدا نہ ہو گو وہ ان کے ساتھ سختی نہ کرے +

فض۔ انفض

انفضوا۔ فَضّ اصل میں کسی چیز کے توڑنے کو اور اس کے اجزا میں تفریق کرنے کو کہا جاتا ہے (غ) اور اسی سے انفض القوم استعارہ کے رنگ میں لیا گیا ہے۔ اور فض کے معنی ہیں لوگوں کے حلقہ کو ان کے اجتماع کے بعد پراگندہ کر دینا (ل)، پس انفضوا کے معنی ہوئے اس طرح پراگندہ ہو گئے +

آنحضرت کی لینت

اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق لینت اور عفو کیطرف توجہ دلائی ہے۔ پچھلے رکوع کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا تھا کہ جو لوگ بھاگ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا اور درمیان میں ایک نصیحت کرتے ہوئے اب نبی کریم صلعم کے عفو کا ذکر فرمایا لکھا ہے کہ جو لوگ اُحد کی جنگ میں بھاگ گئے تھے۔ ان کے ساتھ نبی کریم صلعم نے کسی طرح کی سختی نہیں کی نہ کسی کو درشت لفظ کہا۔ بلکہ محبت بھرے کلام میں اُن سے گفتگو کی۔ محبت سے صرف اتنے الفاظ فرمائے لقد ذھبتم فیھا عریضۃ تم تو بہت دور نکل گئے اور جب حضرت علی نے حضرت عثمان کی بی بی کے سامنے حضرت عثمان کے متعلق کچھ سخت لفظ کہے تو آنحضرت صلعم نے حضرت علی کو روک دیا۔ اور ان کی بات کو ناپسند کیا سو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلعم کے خلق لینت کے کمال کو ظاہر فرمایا ہے۔ آنحضرتؐ کی ذات بابرکات میں ہر قسم کے اخلاق فاضلہ اعلیٰ سے اعلیٰ پایہ کے پائے جاتے تھے۔ جیسا کہ آیۃ کریمہ انك لعلیٰ خلق عظیم (القلم ۶۸ - ۴) اس پر شاہد ہے۔ ان اخلاق کا ذکر قرآن کریم میں مختلف موقعوں پر آتا ہے یہاں آپکے خُلق لینت کے کمال کو دکھایا گیا ہے +

آپکے اخلاق اور خلق لینت کا کمال

ہر ایک خُلق کا اظہار کامل رنگ میں اس وقت ہوتا ہے جب اس کے اظہار کے مخالف موقعہ ہو۔ جنگ کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس میں نرمی کے اظہار کا موقعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کے اندر جس قدر شدت ہے اس کا اظہار جنگ میں پورے زور کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑھکر یہ بات ہے کہ جب اُن احکام کی تعمیل میں جو کسی فوج کو دئے گئے ہوں

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ

پس ان کو معاف کرو اور ان کیلئے استغفار کرو اور کام میں ان کا مشورہ لیتے رہو پھر جب پختہ ارادہ کرو

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ○

تو اللہ پر ہی بھروسہ کرو بیشک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ۵۵۲

فروگذاشت ہو یا اُن احکام کی تعمیل نہ ہو تو پھر قواعد جنگ اس امر کے مقتضی ہوتے ہیں کہ سخت سے سخت سزا دی جائے پس اول تو موقعہ اظہار لینت کا نہیں بلکہ اظہار شدت کا تھا۔ دوسرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی جس کی وجہ سے اس قدر عظیم مصیبت آپ کو اور مسلمانوں کو برداشت کرنی پڑی۔ اور یہ موقعہ سخت سے سخت سزا کو چاہتا تھا۔ مگر اس موقعہ پر نافرمانی کرنے والوں کو ایک حرف بھی ملامت کا نہ کہنا ظاہر کرتا ہے کہ نبی کریم صلعم میں کس قدر کمال خُلق لینت کا موجود تھا کہ سخت سے سخت حالات کے ماتحت بھی۔ ہاں ان حالات کے ماتحت بھی جو بظاہر خلق لینت کے اظہار کے منافی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے اندر اس خلق کا اظہار ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے تعریف کے موقعہ پر بیان فرمایا ہے۔ ورنہ آپ کے خُلق لینت کے تو بیشمار موقع تھے۔ دن رات خدام سے بیبیوں سے دوستوں سے دشمنوں سے لینت کا برتاؤ آپ فرماتے تھے۔ مگر یہ موقع اس خلق کے کمال کو دکھانیوالا تھا ✦

آنحضرت کی رحمت

نبی کریم صلعم کی نرمی اور رحمت کے متعلق اور بھی بہت سی آیات قرآنی شاہد ہیں جیسا کہ فرمایا عزیز علیہ ما عنتم (التوبۃ ۹ - ۱۲۸) کوئی دُکھ تم کو پہنچے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے اور فرمایا واخفض جناحک للمؤمنین (الحجر ۱۵ - ۸۸) اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا انا لکم مثل الوالد بلکہ والد سے بہت بڑھکر شفقت اور محبت آپ کے دل میں بھری ہوئی تھی۔ نبی کریم صلعم کے اس خلق کے اظہار میں یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کے پیرو بھی اور بالخصوص وہ لوگ جو دوسروں کے لئے پیشرو یا سردار کے طور پر ہوتے ہیں وہ اس قسم کے اخلاق اپنے اندر پیدا کریں تو ہی جماعت قایم رہ سکتی ہے ورنہ کوئی جماعت نہیں بن سکتی۔ چنانچہ اس کی طرف ایک حدیث میں اشارہ ہے لا حلم احب الی اللہ من حلم امام و رفقہ ولا جہل ابغض الی اللہ من جہل امام وخرقہ (رغق) یعنی کوئی حلم اور نرمی امام کے حلم اور نرمی سے بڑھکر اللہ کو پسند نہیں اور کوئی جہل امام کی جہالت سے بڑھکر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ نہیں ✦

استغفار کے معنی

۵۵۲ نبی کریم صلعم کی لینت کا ذکر کرکے اب ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر آپ کو قایم کرتا ہے۔ اول پچھلا گناہ معاف کر دینا۔ آیت ۱۵۴ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے معافی دی تھی مگر چونکہ رسول کے حکم کی نافرمانی ہوئی تھی اس لئے اب آپ کو عفو کرنے کا حکم ہوا۔ دوم ان کے لئے استغفار یا آیندہ اس قسم کی نافرمانی سے حفاظت چاہنا۔ یہاں استغفار گو دوسروں کے لئے ہے مگر اس کے معنی گناہ کی سزا سے حفاظت چاہنا نہیں بلکہ خود گناہ سے حفاظت چاہنا ہیں کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ تو خود ان کے گناہ کو معاف کر چکا ہے ولقد عفا اللہ عنھم (۱۵۴) پس جس کو خدا معاف کر چکا اس کیلئے سزا سے بچانے کی دعا کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یہ ایک اور قطعی شہادت ہے کہ استغفار سے مراد گناہ سے حفاظت بھی ہوتی ہے۔ سوم ان کو مشورہ میں شریک کرنا گویا ان کو اس قدر بلند مرتبہ دیا کہ پھر وہ مجلس شوریٰ کی شمولیت کے بھی اہل قرار دئے گئے۔ شوریٰ کا حکم تو قرآن کریم میں پہلے سے موجود تھا وامرھم شوریٰ بینھم (الشوریٰ ۴۲ - ۳۸) یہاں اس کے ذکر میں دو غرضیں ہیں ایک تو یہ بتانا کہ ایک دفعہ نافرمانی سے مشورہ کی اہلیت نہیں چھن جاتی۔ آج مہذب قومیں جو پولیٹیکل مجرموں کو مجلس شوریٰ سے

شوریٰ کا حکم

۱۵۹ إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ

اگر اللہ تمہاری مدد کرتا رہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔

نہیں روکتیں اسلام کی تعلیم سے ابھی آگے نہیں بلکہ پیچھے ہیں اس لئے کہ یہ پولٹیکل مجرم نہ تھے جنگی مجرم تھے جن کے لئے مہذب قوموں میں کورٹ مارشل ہے۔ ان کیلئے یہ رعایت۔ معاف کردینا۔ ان کی بلندی درجات چاہنا۔ پھر مجلس شوریٰ کے ان کو ممبر بنانا اسلام کے ساتھ ہی یہ تعلیم خاص ہے دنیا میں اور کہیں نہیں ملے گی۔ اور دوسری غرض یہاں شوریٰ کے حکم کو دوہرانے کی یہ ہے کہ جنگ اُحد میں جو مصیبت پیش آئی وہ شوریٰ کے فیصلہ پر عمل کرنے سے ہی پیش آئی کیونکہ نبی کریم صلعم کی اپنی رائے تو یہی تھی کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کی جائے اس لئے حکم دیا کہ گو نتیجہ شوریٰ کا برا بھی نکلا اور اس موقعہ پر کثرت رائے نے غلطی بھی کھائی مگر اصول شوریٰ پھر بھی قائم رکھنے کے قابل ہے ایسا نہ ہو کہ اس نتیجہ کو دیکھ کر اصول شوریٰ سے ہی بیزاری ہو جائے اس میں کس قدر دور اندیشی کی تعلیم ہے کہ ایک چیز کے ذرا سے نقصان کو دیکھ کر فوراً اس سے بیزار نہ ہو جاؤ۔ ممکن ہے اس کے فوائد اس سے بڑھکر ہوں ❖

آنحضرتؐ کا مشورہ پر عمل

اس آیت کے ساتھ امرھم شوریٰ بینھم کو اس قدر قوت دیدی ہے کہ کسی مسلمان کو یہ جرأت نہ ہونی چاہئے کہ اصول شوریٰ کا انکار کرے یا اسے استخفاف کی نظر سے دیکھے شوریٰ کو خود اللہ تعالیٰ نے اس قدر عزت کا مقام دیا ہے کہ اسکے نقصانات کو ناقابل التفات قرار دیا ہے اور پھر خود نبی کریم صلعم نے اس پر باقاعدہ عمل کرکے دکھایا کہ آپ کی اُمت کو اصول شوریٰ کسی حالت میں چھوڑنا نہ چاہئے۔ تمام امور مہمہ میں آپ صحابہ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ بدر میں بعد مشورہ مدینہ سے نکلے۔ اُحد میں بھی۔ احزاب میں مشورہ کرکے خندق کھدوا دی اور محصور ہوئے پھر صلح کی اس تجویز پر کہ ایک تہائی مدینہ کے پھل کفار کو دیئے جایا کریں مشورہ کیا اور اسے چھوڑ دیا حدیبیہ میں بھی مشورہ کیا بلکہ ایک ایسے معاملہ میں جو صرف آپ کی ذات سے تعلق رکھتا تھا یعنی حضرت عائشہ صدیقہ پر افک کا معاملہ اس میں بھی مشورہ کیا اور حدیث میں ہے مَا تَشَاوَرَ قَوْمٌ قَطُّ إِلَّا هُدُوا لِأَرْشَدِ أَمْرِهِمْ کبھی کسی قوم نے مشورہ نہیں کیا مگر اپنے معاملہ میں نہایت سیدھی راہ کی طرف ہدایت کئے جاتے ہیں ❖

کثرت رائے پر عمل

شوریٰ میں نبی کریم صلعم نے اپنی رائے کے خلاف بھی کیا ہے۔ جیسے اُحد کے معاملہ میں بلکہ وہاں کچھ خواب بھی آپکو آئے مگر چونکہ صریح وحی کوئی نہ تھی اس لئے مشورہ پر ہی عمل کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب کثرت رائے خلاف ہو تو میر کو اپنی رائے ترک کر دینی چاہئے۔ اور کثرت کی رائے پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ اور یہ بات کہ کثرت رائے پر آپ عمل کرتے تھے اسی اُحد کے میدان میں نکلنے والے واقعہ سے ظاہر ہے کیونکہ وہاں کچھ آدمیوں کی رائے آنحضرت صلعم کے ساتھ بھی تھی پس آپ کا ان کی اور اپنی رائے کو چھوڑ دینا محض اسی وجہ سے تھا کہ کثرت رائے آپ کے خلاف تھی اور حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا اجتہاد ملک کے بارے میں کثرت رائے پر فیصلہ کرنا ثابت ہے جس سے معلوم ہوا کہ قانون سازی بالخصوص اور تمام امور مہمہ بالعموم کثرت رائے سے طے ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں نے اس اصول شوریٰ کو بہت جلد ترک کر دیا اور یہی انکی سلطنتوں کی تباہی کا موجب ہے

عزم شوریٰ کا نتیجہ ہو

کیا اذا عزمت فتوکل علی اللہ سے شوریٰ کے خلاف کچھ نکلتا ہے ہرگز نہیں بلکہ وہ عزم شوریٰ کا ہی نتیجہ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ مشورہ کرکے جب بات پختہ کرلو تو پھر نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دو جیسا اُحد کے موقعہ پر آپ نے کیا کہ جب مشورہ کرکے حکم دیدیا پھر بعض لوگوں نے اپنی رائے سے رجوع کیا تو آپ نے اس کی پروا نہ کی۔ یہ خلاف عزم ہوتا۔ پھر جب نقصان پہنچا تب بھی آپ نے یہ نہ کہا کہ میری رائے پر کیوں نہ عمل کیا گیا۔ تفاسیر میں عزم سے مراد یہی لی گئی ہے کہ جو فیصلہ بعد شوریٰ کے قرار پائے اذا شاورتھم فی الامر وعزمت علیہ (ث)، فاذا وطنت نفسک علی شیٔ بعد الشوریٰ (رض) اذا عقدت

وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ

اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرے اور اللہ پر ہی

فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا ۱۶۰

مومنوں کو توکل کرنا چاہئے ۵۵۳ اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرتا ہے وہ جو کچھ خیانت

غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○

کی ہو قیامت کے دن لائیگا پھر ہر شخص کو جو اس نے کمایا ہو پورا دیا جائیگا اور ان پر ظلم نہ کیا جائیگا ۵۵۴

فلیثت علی الفعل وامضانہ بعد المشاورۃ (ر) پس مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد ان کے اہم معاملات کی بنیاد ان کے قوانین کی بنیاد قرآن وحدیث کی صریح تعلیم اور نبی کریم صلعم کے کھلے کھلے عمل کے مطابق مشورہ میں کثرت رائے پر ہونی چاہیئے۔

اس صدی کے مجدد کا کثرت رائے کے اصول کو زندہ کرنا

اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے جب اشاعت اسلام کیلئے ایک کام شروع کیا تو اس کی بنیاد بھی شوریٰ اور کثرت رائے پر رکھی اور تمام اموال سلسلہ کو ایک انجمن کے سپرد کیا جس کے متعلق یہ صفائی سے لکھدیا کہ تمام معاملات میں جو فیصلہ انجمن کا کثرت رائے سے ہوگا اسی پر عمل کرنا ہوگا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ جب قوم بڑھ جائے تو پھر اس کی کثرت رائے کو معلوم کرنے کیلئے خاص آدمیوں کے انتخاب کی ضرورت پیش آتی ہے ✦

خُذلان

(ع)
۵۵۳ خذل۔ خُذلان کے معنی ہیں اس شخص کا چھوڑ دینا جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہو کہ وہ اپنی نصرت سے اسے مدد دیگا

غلّ

۵۵۴ یغل۔ غلّ یَغُلّ اذا خان (غ یعنی غلّ جس کا مضارع یغُلّ آتا ہے (جو یہاں ہے) اس کے معنی ہیں خیانت کی۔ اور جس نے اسے غنیمت کی خیانت سے خاص کیا ہے مگر چونکہ الفاظ عام ہیں یعنی کسی نبی کو بھی یہ شایاں نہیں کہ وہ غلول کا ارتکاب کرے حالانکہ غنیمت کا تصرف آنحضرت صلعم کی امت کیلئے حلال ہونا حدیث سے ثابت ہے اور یہ آپ کی ایک خصوصیت ہے اس لئے یہاں یغُلّ کے عام معنی خیانت ہی مراد ہیں ✦

خیانت کی سزا کا ذکر بطور مثال ہے۔

ومن یغلل یأت بما غل۔ یہ لفظ عام ہیں اور یہ مراد نہیں کہ جو نبی خیانت کرے بلکہ نبی کے متعلق تو فرمایا کہ اسکی تو شان ہی نہیں کہ وہ خیانت کرے یعنی ایسا ہو سکتا ہی نہیں اور جب خیانت کا ذکر آیا تو یہ بھی بتادیا کہ خیانت چھپی نہ رہ جائے گی بلکہ ایک دن آتا ہے کہ وہ کھلی کھلی ظاہر ہو جائے گی۔ اکثر مفسرین نے اس کو ظاہر پر محمول کیا ہے کہ جس قدر خیانت کی ہے بعینہٖ سزا خود وہی خیانت کا مال اس پر وارد کیا جائیگا۔ مگر یہ بیوجہ تکلیف ہے۔ ایسے موقعہ پر مراد محض سزا ہوتی ہے جیسے توفی کل نفس ما کسبت میں مراد نیکی بدی کے اجر کا دیا جانا ہے۔ ابو مسلم نے اس کو سزا کیلئے تمثیل کہا ہے (رغ) اور یہ جو بعض احادیث میں ذکر آتا ہے کہ ایک شخص اونٹ گردن پر اٹھائے ہوئے ہوگا جس کی اس نے خیانت کی ہے تو وہ بھی سزا کیلئے بطور تمثیل ہے ✦ کم از کم یہ تو ظاہر ہے کہ اس دنیا کی سزا و جزا میں اس عالم کی چیزیں بطور مثال ہی بیان کی گئی ہیں جیسے مثل الجنۃ التی وعد المتقون (الرعد ۱۳-۳۵) سے ظاہر ہے ✦

حصت ابنیاء پر شہادت

اس آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جنگ میں جو مصیبت پیش آئی وہ اس وجہ سے نہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم میں کوئی نقص ہو یا آپ نے کوئی کوتاہی کی ہو۔ کیونکہ محمد رسول اللہ کا تو اتنا بلند مرتبہ ہے یہ کسی بھی نبی کی شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اس لئے کہ نبی معصوم ہوتا ہے۔ اس بات پر کہ یہاں مصیبت کے اسباب کی طرف اشارہ ہے اور یہ

۱۶۱ أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ

تو کیا جو شخص اللہ کی رضا کی پیروی کرے وہ اسکی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کی سزا کا محل ہوا اور اسکا ٹھکانا دوزخ ہے

۱۶۲ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ○ هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ

اور وہ کیا ہی بری پہنچنے کی جگہ ہے ۵۵۵ یہ اللہ کے نزدیک درجے ہیں اور اللہ خوب دیکھتا ہے

بِمَا يَعْمَلُونَ ○

جو وہ کرتے ہیں ۵۵۶

بتانا مقصود ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے نہیں یہی دلیل ہے کہ ان آیات کے جن میں رسول اللہ صلعم کی عصمت اور آپ کی قوت قدسی کا اور آپ کے تزکیہ اور تعلیم قرآن و حکمت کا ذکر ہے فوراً بعد یہ آیت آتی ہے اور لما اصابتکم مصیبۃ قد اصبتم مثلیہا قلتم انّٰی ھٰذا یعنی تم اس مصیبت کے متعلق سوال کرتے ہو کہ کہاں سے آئی یہاں لفظ خیانت یا غلول اسی طرح وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے جس طرح امانت کا لفظ وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس میں ہر ایک قسم کی کمی شامل ہے۔ اور یہ خود اس بات سے ظاہر ہے کہ اس کے آگے فرمایا ہے کہ جو کوئی خیانت کریگا وہ قیامت کے دن اسے لائیگا یعنی جس قدر اللہ تعالیٰ کی امانتوں کے ادا کرنے میں کسی نے کمی کی ہے اس سب کے متعلق قیامت کے دن جوابدہی کرنی ہوگی۔ اور پھر فرمایا کہ ہر جان کو جو اس نے کمایا پورا دیا جائیگا اس میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس قدر کوتاہی کسی نے فرائض و حقوق کی ادائگی میں کی ہے اسی قدر اس پر ذمہ داری ہوگی اور اس سے اگلی آیت نے اور بھی مضمون کو صاف کر دیا ہے کیونکہ وہاں دو گروہ کر دیئے ہیں ایک اللہ کی رضا کی پیروی کرنیوالا گروہ اور دوسرا اللہ کی ناراضگی کو خریدنے والا۔ اور پھر آگے چل کر اور بھی صفائی سے کہا کہ نبی کی بعثت کی تو غرض ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو پاک کرے جس میں خود کسی قسم کی خیانت یا کوتاہی پائی جائے وہ دوسروں میں امانت اور کمال کس طرح پیدا کر سکتا ہے گویا یہاں ضمناً عصمت انبیاء کے اصول کو قائم کیا ہے +

بعض لوگوں نے یہاں یَغُلَّ کو خاص مال غنیمت سے مخصوص لیکر یوں توجیہ کی ہو کہ تیر اندازوں نے جب اپنی جگہ کو چھوڑا تو انہوں نے گویا ایک رنگ میں نبی صلعم پر بدظنی کی کہ آپ ان کو مال غنیمت کا حصہ نہیں دلائینگے تو اس لئے فرمایا کہ نبی مال غنیمت میں خیانت نہیں کیا کرتا۔ یہ اسکی شان سے بہت گری ہوئی بات ہے کہ ایسا کرے اور بعض وسعت کی طرف گئے ہیں یہانتک کہ بعض کے نزدیک یہاں مراد امانت وحی کی ادائگی میں خیانت نہ کرنا ہے +

سخط

۵۵۵ سخط۔ سَخَطَ وہ غضب شدید ہے جو عقوبت یعنی سزا کا مقتضی ہو (غ) اور اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارسال عقوبت یعنی سزا وارد کرنے کے معنی میں ہے +

تفاوت درجات

۵۵۶ ہم درجات اس کی ترکیب ہے۔ لہم درجات یعنی ان کے لئے درجات ہیں یہ اسی قسم کا بیان ہے جیسے حدیث میں آتا ہے النَّاسُ معادنُ کمعادنِ الذَّھبِ والفِضَّۃِ لوگ کانیں ہیں سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح اور بعض نے ذو درجات مراد لیا ہے یعنی لوگ صاحب درجات ہیں۔ بعض بڑے درجوں والے بعض کم درجوں والے اور روح المعانی میں ہے کہ مبالغہ کے لئے ان کو نفس درجات کہا ہے۔ ہم کی ضمیر کو بعض نے من اتبع رضوان اللہ

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ ۱۶۳

بقیناً اللہ نے مومنوں پر احسان کیا جب ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اسکی آیتیں

اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

پڑھتا ہو اور انہیں پاک کرتا ہو اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہو گو وہ پہلے کھلی گمراہی میں تھے ۵۵۷

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۱۶۴

اور کیا جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچی جس کی دوچند ویسی تم پہنچا چکے ہو تم نے کہا یہ کہاں سے ہو

قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۱۶۵

کہو یہ تمہاری اپنی طرف سے ہی ہو بیشک اللہ ہر شے پر قادر ہو ۵۵۸ اور جو کچھ تمہیں اس دن مصیبت پہنچی جب گروہ جنگ میں ملے

کی طرف لیا ہو کیونکہ درجات کا لفظ عموماً ثواب میں استعمال ہوتا ہے مگر چونکہ لفظ درجات عام بھی آیا ہے۔ جیسے ولکل درجات مما عملوا (الانعام۔۱۳۳) اس لئے اہل ثواب اور اہل عقاب دونوں کا ذکر ہو +

درجة

درجات۔ دَرَجَة کی جمع ہے۔ اور دَرَجَة اور مَنْزِلَة ایک ہی ہیں لیکن درجہ اوپر چڑھنے کے لحاظ سے کہا جاتا ہے اور منزلة رفیعة یعنی بلند مرتبے یا بلند مقام پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ) +

نبی کا کام چونکہ دوسروں کو پاک کرنا ہو اسلئے خود ناپاک نہیں ہو سکتا

۵۵۷ چونکہ اصل غرض اس رکوع کی یہ بتانا ہو کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو پاک کرتا اور ان کی منافقوں سے تمیز کرتا ہے اور انہی سامانوں میں سے جنگ اُحد ایک سامان ہو۔ اسلئے اب انکو اپنا ایک عظیم الشان احسان یاد دلاتا ہے کہ ان میں سے ایسے رسول کا کھڑا کر دینا جو ان کو پاک کر دے کتنا بڑا احسان ہے۔ اور دوسرے چونکہ اوپر فرمایا تھا کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے یعنی اس میں خود کوئی نقص اور کوتاہی ہو۔ تو اب بتاتا ہے کہ اس میں نقص اور کوتاہی کس طرح ہو سکتی ہے۔ اور کوئی ناپاک امر اس کی طرف منسوب کیونکر ہو سکتا ہو جبکہ اس کا منصب یہ ہے کہ وہ دوسروں کو آیات اللہ کے ذریعہ سے ہر قسم کی آلائشوں سے پاک کرے +

تعلیم اور تزکیہ کو چار دفعہ آنحضرت صلعم کا کام بیان کرنے میں حکمت

ہمارے نبی کریم صلعم کی تعریف ان الفاظ میں دو دفعہ پہلے آچکی ہو۔ ایک حضرت ابراہیم کی دعا میں دوسرے اس دعا کے خانہ کعبہ کے تعلق میں پورا ہونے کے ذکر میں یعنی کعبہ کا قبلہ ہونا اسلئے ضروری ہو کہ وہ رسول مزکی جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا مقصد تھا وہ یہاں ظاہر ہو چکا ہو۔ اب تیسری مرتبہ مومنوں کے تزکیہ کو اسکی اصل غرض ٹھہرا کر پھر اسکو بیان کیا ہو اور یہاں ان کانوا من قبل لفی ضلال مبین کے لفظ بھی بڑھا دیئے ہیں یعنی معمولی حالات میں بھی تزکیہ کرنا ایک نہایت ہی مشکل کام ہو مگر اس رسول کے سامنے وہ قوم رکھی جاتی ہے جو حد درجہ کی جہالت اور گمراہی میں ڈوبی ہوئی ہو اور شاید اس میں یہی اشارہ ہو کہ جس طرح تمکو یہ رسول پاک کرتا ہے تمہارا بھی کام ہو کہ دوسرے لوگوں کو پاک کرو۔ مگر اسکو کھولکر سورۃ جمعہ میں بیان فرمایا ہو جہاں چوتھی مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ اثنائے ذکر جنگ میں ایسی آیات کے لے آنے سے یہ بھی تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہو کہ لڑائیاں یا ان میں کامیابی کوئی اصل غرض اسلام کی نہیں بلکہ اصل غرض تزکیہ نفوس اور تعلم و تعلیم کتاب و حکمت ہے +

۵۵۸ آیت ۱۶۰ میں جس امر کی طرف اشارہ کیا تھا اب اس کی تصریح فرماتا ہے یعنی اس مصیبت کی وجہ ذات پاک نبوی

۱۶۶ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا

تو اللہ کے اذن سے تھا اور تاکہ وہ مومنوں کو جان لے اور تاکہ ان لوگوں کو جان لے جنہوں نے نفاق کیا ۵۵۹

مصیبت کی وجہ

تو نہیں ہے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کہاں سے آئی۔ مگر اس کا جواب دینے سے پہلے فرمایا قد اصبتم مثلیھا جس کی دو چند ویسی تم پہنچا چکے ہو۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ تم کو مصیبت پہنچی تو تم کو اس قدر گھبراہٹ ہے کہ یہ کیوں آئی۔ حالانکہ تم ویسی دو چند دشمن کو پہنچا چکے ہو۔ اس دو چند مصیبت میں ایک تو جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے کہ وہاں کفار کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے اور دوسرے جنگ اُحد کی ابتدائی حالت کی طرف کہ اس میں بھی بیس سے زیادہ آدمی قریش کے مارے گئے اور بہت سے آدمی زخمی ہوئے پس جب تم ان کو دو چند مصیبت پہنچا چکے ہو۔ تو پھر تھوڑی سی مصیبت اگر تم پر آگئی تو اس پر اس قدر گھبراہٹ کیوں ہو؟ دو چند مصیبت کا ایک چھوٹے سے گروہ سے ایک عظیم الشان اور طاقتور قوم کو پہنچ جانا تو صاف بتاتا ہے کہ نصرت الٰہی تمہارے ساتھ ہے۔ اور ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم کا ثبوت ملتا ہے۔ ہاں اگر یہ کہو کہ جب نصرت الٰہی ہمارے ساتھ تھی تو پھر مصیبت کیوں آئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ھو من عند انفسکم یہ تمہاری اپنی طرف سے ہے یعنی تم سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی وجہ سے نصرت الٰہی رک گئی۔ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نافرمانی کی حتّٰی اذا فشلتم و تنازعتم فی الامر و عصیتم (۱۵۱) + آخری الفاظ ان اللہ علی کل شیء قدیر میں یا تو یہ اشارہ ہے کہ یوں اس نے تمہیں سمجھا دیا کہ اللہ تعالیٰ کیسا قادر ہے کہ جب اس کی نصرت شامل حال ہو تو کمزوری بھی قوت بن جاتی ہے اور یا یہ مراد ہے کہ جب مومن اطاعت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی نصرت کی قدرت ثانی کا نظارہ دکھاتا ہے۔ اور جب اس سے نافرمانی وقوع میں آتی ہے تو اپنی نصرت کو روک دیتا ہے +

نفق

۵۵۹ نافقوا۔ اس کا اصل نَفَقَ ہے جس کے معنی گزر گیا اور ختم ہوا۔ اس لئے خرچ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے

نَفَقٌ

اور اسی سے نَفَقٌ ہے جس کے معنی ہیں جاری رستہ یا وہ رستہ جو دوسری طرف نکل جاتا ہو اور زمین میں سرنگ جو دوسری طرف نکل گئی ہو (غ)، چنانچہ قرآن کریم میں بھی آتا ہے ان استطعت ان تبتغی نفقاً فی الارض (الانعام ۶-۳۵) اسی لحاظ سے

نِفاق

نِفاق سے مطلب ہے الدُّخُوْلُ فِی الشَّرْعِ مِنْ بَابٍ وَالْخُرُوْجُ عَنْهُ مِنْ بَابٍ (غ) یعنی ایک دروازہ سے شریعت میں داخل ہونا اور دوسرے دروازہ سے اس سے نکل جانا۔ اور منافق حقیقی طور پر وہ شخص ہے جو ظاہر میں ایمان لاتا ہے اور اندر سے کافر رہتا ہے۔ اسی سے نَافَقَ ہے یعنی اس نے نفاق کیا۔ پھر حدیث میں اس معنی کو وسیع کیا ہے جہاں یہ فرمایا

منافق

کہ منافق کی چار علامتیں ہیں جس میں وہ چاروں پائی جائیں وہ منافق خالص ہے اور جس میں بعض پائی جائیں اس میں اسی قدر نفاق ہے۔ اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ یعنی جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرتا ہے اور جب بات کرتا ہو تو جھوٹ بولتا ہے اور جب عہد کرتا ہے تو بیوفائی کرتا ہے اور جب جھگڑا کرتا ہے ناحق کی طرف جاتا ہے۔ پھر وہ لوگ جو مُنہ سے بات کہتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے ان میں بھی نفاق کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون (الصف ۶۱-۳) +

مصیبت کی غرض

پچھلی آیت میں جنگ اُحد کی مصیبت کی وجہ بتائی تھی اس میں اس کی غرض بتائی ہے۔ پہلے فرمایا فباذن اللہ یہ مصیبت اللہ کے اذن سے آئی ہے۔ اذن کے معنی دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ اس کی اجازت یا اس کے علم سے اور یعلم کہنے کی غرض یہ ہے کہ یہ مصیبت محض تمہارے لئے دکھ بن کر نہیں آئی جس کے نیچے کوئی غرض نہ ہو بلکہ اس میں ایک خاص

وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ

اور ان کو کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا مدافعت کرو ع۵۶۰ انھوں نے کہا اگر ہم لڑائی

قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَٰكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ

جانیں تو ضرور تمہارا ساتھ دیں ع۵۶۱ وہ آج کے دن ایمان کی نسبت کفر سے بہت نزدیک ہیں ع۵۶۲

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ۝

اپنے مونہوں سے کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں ع۵۶۳

غرض بھی ہے۔ اور وہ غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں اور منافقوں کو الگ الگ کر دے۔ جاننے سے کیا مراد ہے دیکھو ع۱۶۹ و ع۴۲

ع۵۶۰ ادفعوا۔ دفع کے معنی قوت کے ساتھ ازالہ کر دینا ہیں اور جب اس کا صلہ عن ہو تو اس کے معنی حمایت ہوتے ہیں (غ) یہاں کوئی صلہ مذکور نہیں۔ مگر چونکہ قتال فی سبیل اللہ کے مقابل پر اس کو استعمال کیا ہے اس لئے مراد ہے ادفعوا عن انفسکم واھلیکم واموالکم یعنی اپنے آپ سے اور اپنے اہل سے اور اموال سے دشمن کو روکو یا ان کی حمایت کرو +

دفع

قوم کو ہلاکت یا ذلت سے بچانے کا فرض

قتال فی سبیل اللہ تو ایمان کو چاہتا ہے اس لئے پہلے ان کو یہی کہا گیا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو اللہ کے دین کی حفاظت کرنا اور اس کو نیست و نابود ہونے سے بچانا تمہارا فرض ہے اس لئے اللہ کی راہ میں جنگ کرو۔ لیکن اگر تمہارا اس پر ایمان نہیں تو کم از کم اپنے لوگوں کو اہل و عیال کو دشمن سے بچانا تو ہر انسان کا فرض ہے۔ پس تم اپنے اہل و عیال کو ہی بچاؤ اور ان کی حمایت میں ہی کھڑے ہو جاؤ یہی آج مسلمانوں کی حالت ہے اور ان کے لئے اس میں سبق ہے۔ انھوں نے خدا کے دین کی خدمت کو چھوڑ دیا اور خدا کی راہ میں کوشش نہ کی مگر جس ذلت کی حالت کو پہنچ چکے ہیں اس کا تقاضا کم از کم یہ تو ہے کہ اپنی قوم اور اپنی ناموس کی حفاظت کیلئے اب بیدار ہو جائیں اور دیکھیں کہ بدون ایثار اور قربانی کے وہ دنیا میں زندہ بھی نہیں رہ سکتے

ع۵۶۱ لو نعلم قتالا۔ اگر ہم لڑائی جانیں یا لڑائی سمجھیں اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر ہم یہ جانیں کہ فی الواقع جنگ ہو گی۔ گویا یہ کہا کہ ہمارے نزدیک کوئی جنگ ہونیوالی نہیں ہے۔ اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اگر ہم سمجھیں کہ یہ کوئی جنگ ہے جس میں سات سو آدمی تین ہزار بہادر کے مقابل پر نکلتا ہے یہ جنگ نہیں کیونکہ جنگ میں کچھ نہ کچھ توازن فریقین کا ضروری ہے بلکہ یہ عمداً اپنے آپکو ہلاکت میں ڈالنا ہے اگر آیت کے آخری الفاظ یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم اپنے مونہوں سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں کو ان کے اسی قول کے متعلق لیا جائے تو پہلے معنی درست ہونگے +

لاتبعنکم۔ تبع اور اِتَّبَعَ کے معنی پیچھے چلنا ہیں۔ یہاں پیچھے چلنے سے مراد جنگ میں ساتھ دینا ہے +

ع۵۶۲ ھم للکفر۔ للکفر اور للایمان میں ل بمعنی الیٰ ہے یعنی ان کا قرب کفر سے ایمان سے ان کے قرب سے بڑھکر ہے۔ اور یا حذف مضاف ہے اور مراد ہے کہ وہ اپنے فعل سے بہ نسبت مومنوں کے کافروں کی نصرت کے قریب تر ہیں کیونکہ انکے الگ ہو جانے سے کفار کو مدد پہنچی بعض کے نزدیک اقرب قرب سے ہے جس کے معنی طلب الماء ہیں (د) یعنی پانی کا طلب کرنا پس اقرب بمعنی اطلب ہوا یعنی وہ کفر کو بہ نسبت ایمان کے زیادہ طلب کرنے والے ہیں +

ع۵۶۳ یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم۔ اس سے یا تو ان کے قول سابق کی طرف اشارہ ہے لو نعلم قتالا۔ دیکھو نوٹ ع۵۶۱ اور یا اس سے مراد ہے کہ منہ سے ایمان لاتے ہیں مگر ان کے دل میں ایمان نہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ولما یدخل الایمان

۱۶۷ اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِہِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا قُلْ فَادْرَءُوْا

جنہوں نے اپنے بھائیوں کے متعلق کہا اور خود بیٹھے رہے کہ اگر وہ ہماری اطاعت کرتے تو قتل نہ کئے جاتے کہو تو اپنی جانوں سے

۱۶۸ عَنْ اَنْفُسِکُمُ الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا

موت کو ہٹا رکھو اگر تم سچے ہو ۵۶۴ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّہِمْ یُرْزَقُوْنَ ○

مارے گئے انہیں مردے خیال مت کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دئے جاتے ہیں ۵۶۵

فی قلوبکم (الحجرات ۴۹ - ۱۴) +

واللہ اعلم بما یکتمون - بجائے محبت اسلام کے جس کا وہ مُنہ سے اظہار کرتے ہیں ان کے دلوں میں اسلام کا بغض ہے۔ مگر اللہ اس سے واقف ہے +

قعد — ۵۶۴ قعدوا۔ قُعُود اصل میں قیام کے مقابل پر ہے یعنی بیٹھ رہنا۔ مگر قاعِد (بیٹھنے والے) سے مراد المتکاسل فی الشئ (غ) لیا جاتا ہے یعنی کسی چیز کے متعلق کسل یا سستی کرنے والا جو اس سے پیچھے رہ جاتے +

درأ — ادرؤا۔ دَرْأٌ کے معنی ہیں المیل الی احد الجانبین یعنی ایک جانب کی طرف مائل ہوجانا اور اس کا صلہ عن ہو تو درأت عنہ کے معنی ہیں دفعت عن جانبہ (غ) اس کی جانب سے دفع یا روکیا یدرؤن بالحسنۃ السیئۃ (الرعد ۱۳ - ۲۲) و یدرؤا عنہا العذاب (النور ۲۴ - ۸) +

روانگی غرض میں موت کی پروا نہ ہو۔ — یہ بھی منافقین کا ذکر چلتا ہو جیسا کہ وقعدوا سے ظاہر ہے یعنی یہ کہنے والے وہ لوگ ہیں جو جنگ سے پیچھے رہے یعنی جنگ میں شامل نہ ہوئے۔ وہ اپنے بھائیوں کے متعلق (کیونکہ ان لوگوں کے قریبی سب مومن تھے) کہتے کہ اگر وہ بھی ہماری فرمانبرداری کرتے یعنی دل سے ایمان نہ لاتے۔ اور ہمارے ساتھ نفاق میں شامل رہتے یا جنگ میں نہ نکلتے تو قتل نہ ہوتے۔ مگر چونکہ ان کی اصل غرض تو موت پر افسوس کرنا تھا کہ ہمارے بھائی بند مر گئے۔ اس لئے خصوصیت اعتراض کو چھوڑ کر ایک عام جواب دیدیا ہے قتال تو خود مسلمانوں کی زندگی کے قیام کیلئے ضروری ہوگیا تھا پس جب سوائے اس کے چارہ نہیں تو خواہ اس کے کرنے میں جان رہے یا جائے وہ کام کرنا ہوگا۔ یہ کوئی اصول زندگی نہیں کہ اگر ایک کام کے کرنے میں جس کی ضرورت انسانی زندگی کے بقا کے لئے ہے موت کا خطرہ ہو تو انسان وہ کام نہ کرے اس طرح پر موت سے بچنا گویا انسانی زندگی کی اصل غرض ہوگئی اس لئے جواب میں فرمایا کہ اگر تم موت سے بچنے کو ہی انسان کی زندگی کی اصل غرض قرار دینے میں سچے ہو تو ضرور اس کے حصول کا سامان بھی تمہارے پاس ہوگا۔ پس اپنی جانوں سے موت کو دور رکھ کر بتاؤ کہ تم نے اس مقصد کو حاصل کر لیا ہے۔ ورنہ انسانی زندگی کے مقصد کو یوں کھویا اور شرف انسانیت کو بٹہ لگایا اور موت تو پھر بھی آخر کار آئے گی۔ اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے یعنی اپنی زندگی کا فرض ادا کرتے ہوئے مارے گئے۔ انہوں نے اصل مقصد زندگی کو تو پا لیا پس وہ مردے نہیں +

شہداء کی زندگی — ۵۶۵ ان الفاظ کا مطلب ۱۹۳ میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ مگر وہاں فرمایا تھا بل احیاء (البقرۃ ۲ - ۱۵۴) یہاں فرمایا بل احیاء عند ربہم جس میں صاف بتا دیا کہ یہ ان کی زندگی حضور رب میں ہے جسمانی زندگی نہیں

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۱۶۹

اس سے خوش رہتے ہیں جو اللہ نے انکو اپنے فضل سے دیا اور انکی وجہ سے (بھی) خوش ہوتے ہیں جو ان کے پیچھے سے انہیں

مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۱۷۰

نہیں ملے کہ ان کو کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہونگے ۵۶۶ اللہ کی نعمت اور فضل

بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

سے خوش ہوتے ہیں اور کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ۵۶۷

وقف لازم

جو اسی زمین پر ہے۔ یا عند ربہم میں مراد ان کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا ظاہر کرنا ہے۔ اور کئی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء کو خاص مراتب قرب کے عطا ہوتے ہیں۔ اور یہاں آخر پر فرمایا یرزقون ان کو رزق بھی ملتا ہے۔ یہ رزق وہی رزق ہے جو جنت میں ملتا ہے۔ کلما رزقوا منہا من ثمرۃ رزقا (البقرۃ - ۲۵) گویا ان سے اگرچہ جسمانی رزق منقطع ہوا تو کیا حرج ہے۔ ان کو وہ رزق ملتا ہے جو ان کو حیات جاودانی کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

استبشار

۵۶۶ یستبشرون۔ اِستبشار سے مراد ہے کہ جو کچھ کشائش کی اس کو خوشخبری دی گئی تھی اس کو پالیا (غ) اور بشارۃ سے جو سرور حاصل ہو اس پر بھی استبشار بولا جاتا ہے۔ اس لئے بَشَّرَہ کے بعد فاستبشر بطور فعل لازم لایا جاتا ہے یعنی اس نے اسے خوشخبری دی پس وہ خوش ہو گیا۔ گویا صرف خوش ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔

من خلفہم سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کے پیچھے زندہ باقی رہے ہیں۔

اس آیت اور اس سے بعد کی آیت میں مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ زندگی کے مقصد کے حاصل کرنے میں جو لوگ اپنی جانیں دیتے ہیں اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ خوش قسمت ہیں۔ گروہ اول یعنی شہداء کا گروہ تو ان خوشیوں اور راحتوں کو پا لیتا ہے جو نیکوں کو زندگی بعد الموت میں ملنے والی ہیں۔ اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں انکے لئے یہ بشارت ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے اور نہ ان کو اعدا کا یا شیطان کا خوف رہیگا اور نہ ان کو یہ حزن یا غم ہوگا کہ کیوں انہوں نے خدا کی راہ میں قربانیاں کیں۔ اور جس طرح اللہ تعالیٰ اہل دنیا کو علم دیتا ہے کہ شہداء اس کی فضاء سے متمتع ہو رہے ہیں اسی طرح وہ شہداء کو علم دے دیتا ہے کہ جو ان کے پیچھے رہے ہیں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔

خوف و حزن سے مراد

۵۶۷ اس آیت میں پچھلی آیت کے آخری حصہ کے مضمون کو دوہرایا ہے اور یہ مزید تاکید اور تصریح کے لئے ہے وہاں فرمایا تھا کہ ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہونگے۔ خوف انسان کو کسی امر مکروہ کے پہنچنے کا ہوتا ہے یا مصائب پیش آنے کا۔ تو اسکے مقابل میں فرمایا کہ نہ صرف انہیں امر مکروہ نہیں پہنچیگا بلکہ وہ اللہ کی نعمت اور اسکے فضل سے مالا مال ہونگے اور حزن یا غم اسباب پر ہوتا ہے کہ جب اسکے ہاتھ سے کوئی اچھا موقعہ نکل جائے یا اسکی کسی کام پر لگائی ہوئی طاقت یا لگایا ہوا مال برباد ہو جائے جس کا آئندہ کیلئے کوئی اچھا اثر پیدا نہ ہو تو اسکے مقابل پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انکے اجر کو ضائع نہیں کریگا۔ یوں خوف و حزن کی تشریح خود فرما دی یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ پہلی آیت میں تو صرف خوف و حزن سے انکے بچ جانے کی بشارت ہے اور اس میں نعمت اور فضل کے ملنے اور انکے کاموں پر اجر کے ملنے کی بشارت ہے۔ گویا وہاں دفع مضار کی بشارت ہے تو یہاں حصول منافع کی اور یا لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون روحانی طور پر نجات کی خوشخبری ہے اور اللہ کی نعمت اور فضل میں دنیوی فلاح اور دنیوی نعمتوں کی بشارت ہے۔

دینی اور دنیوی منافع کی بشارت

۱۷۱ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا

وہ جنہوں نے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی اس کے بعد جو انہوں نے زخم کھایا جنہوں نے ان میں سے

۱۷۲ مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ

احسان کیا اور تقویٰ کیا ان کیلئے بڑا اجر ہے ۵۶۸ وہ جن کو لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے (مقابلے کے) لیئے (لشکر) جمع کئے ہیں

فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝

پس ان سے ڈرو تو اس (بات) نے انکا ایمان بڑھایا اور انہوں نے کہا اللہ ہمیں کافی ہے اور کیا ہی اچھا کارساز ہے ۵۶۹

ع ۱۸ / م ع — کاوڑ کو انبیاء پر علی الحقیقت غالب نہ ہونگے

۵۶۸ غزوہ حمراء الاسد — اس آیت میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ غزوہ حمراء الاسد کے نام سے موسوم ہے۔ اُحد کے واقعہ سے اگلے ہی دن نبی کریم صلعم نے مسلمانوں میں یہ منادی کرائی کہ ہم دشمن کے تعاقب میں نکلنے والے ہیں۔ چنانچہ جس قدر آدمی ساتھ چل سکتے تھے وہ ساتھ ہو لئے۔ ادھر ابو سفیان روحاء کے مقام تک پہنچا تو مشرکین ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ نہ تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کیا نہ تمہارے ہاتھ کوئی قیدی آئے اس لئے انہوں نے مشورہ کیا کہ واپس لوٹکر پھر مسلمانوں کو تباہ کریں مگر ابھی اسی سوچ میں ہی تھے۔ کہ ان کو خبر پہنچی کہ مسلمان ان کے تعاقب میں آرہے ہیں۔ اس پر وہ ایسے مرعوب ہوئے کہ وہاں سے فوراً کوچ کیا اور مکہ کو چلے گئے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ معلوم کرکے کہ وہ بہت دور نکل گئے ہیں حمراء الاسد سے جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے واپس آگئے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ نبی کریم صلعم اور آپ کے صحابہ کس قدر باہمت قوم تھی کہ اس قدر تکلیف دشمن کے ہاتھ سے اُٹھا کر پھر بھی اس کا تعاقب کرتے ہیں +

حکم رسول کی فرمانبرداری — یہاں الذین استجابوا للہ والرسول فرمایا جو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں حالانکہ جس واقعہ کا ذکر ہے اس میں حکم صرف نبی کریم صلعم کا تھا یعنی دشمن کے تعاقب کے متعلق لیکن چونکہ قرآن کریم کی رو سے رسول اللہ صلعم کے حکم کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے اس لئے بجائے صرف الرسول کہنے کے للہ والرسول کہا ہے +

۵۶۹ جمعوا لکم۔ مفعول محذوف ہے یعنی جمعوا الجموع لشکر اکٹھے کئے ہیں +

حسب — حسبنا اللہ ۔ حَسْبُ ۔ کفایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ حسبنا اللہ یعنی اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور حسبہم جہنم۔ جہنم ان کے لئے کافی ہے +

بدر صغریٰ — جب ابو سفیان اُحد کے میدان سے چلا تو اس نے باآواز بلند کہا کہ اے محمد (صلعم) ہمارے اور تمہارے درمیان اگلے سال بدر صغریٰ پر جنگ ہوگی۔ سو جب اگلا سال آیا۔ تو ابو سفیان اپنی قوم کے ساتھ نکلا جب مرالظہران کے مقام پر پہنچا تو اس کا دل مرعوب ہو گیا اور اس نے واپسی کی ٹھان لی۔ اتنے میں نعیم ابن مسعود اشجعی سے ملا۔ تو ابو سفیان نے اس سے کہا کہ میں نے محمد صلعم سے وعدہ کیا تھا کہ بدر صغریٰ پر اگلے سال ہماری تمہاری جنگ ہوگی۔ مگر کچھ خشک سالی ہے اور ہم واپس ہونا چاہتے ہیں لیکن اس طرح یہ خوف ہے کہ مسلمانوں کی جرأت بڑھ جائیگی اور وہ خیال کرینگے کہ ان لوگوں میں ہمارے مقابلہ کی طاقت نہیں اس لئے تم مدینہ جاؤ اور مسلمانوں کو ڈراؤ تاکہ وہ جنگ کے لئے نہ نکلیں اور تمہیں دس اونٹ دوں گا چنانچہ نعیم آیا اور اس نے مسلمانوں کو تیاری کرتے پایا تو اس نے کہا یہ بات ٹھیک نہیں پچھلے سال انہوں نے تم کو کس قدر نقصان پہنچایا اور اب وہ بہت بڑی تیاری کے ساتھ آرہے ہیں۔ مگر مسلمانوں نے اس کی پرواہ نہ کی اور کہا حسبنا اللہ ونعم الوکیل

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ ۱۷۳

پس وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس آئے انہیں کوئی دکھ نہ پہنچا اور انہوں نے اللہ کی رضا کی

اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۱۷۴

پیروی کی اور اللہ بڑے فضل والا ہے ۵۷۰ یہ شیطان صرف اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے

فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ ۱۷۵

سو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو اگر تم مومن ہو ۵۷۱ اور وہ لوگ تجھے غمگین نہ کریں جو

يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا

کفر میں جلدی کرتے ہیں یقیناً وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے اللہ چاہتا ہے کہ ان کے

يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے ۵۷۲

چنانچہ مسلمان بدر صغریٰ پر پہنچ گئے جہاں بنی کنانہ کا ایک تجارتی میلہ لگا کرتا تھا۔ اس میں مسلمانوں نے تجارت کرکے بہت سا فائدہ اٹھایا اور چونکہ وہاں قریش نہیں آئے اس لئے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اُدھر ابوسفیان واپس مکہ میں پہنچ گیا اور اہل مکہ نے اس مہم کا نام جیش السویق رکھا یعنی صرف ستو پینے کی مہم تھی۔ مسلمانوں میں یہ غزوہ بدر صغریٰ کے نام سے موسوم ہے +

جیش السویق

۵۷۰ اس آیت میں غزوہ بدر صغریٰ سے لوٹنے کا ذکر ہے۔ اللہ کی نعمت اور فضل میں ان تجارتی منافع کی طرف اشارہ ہے جو ان کو وہاں حاصل ہوئے اور لم یمسسہم سوء میں یہ بتایا ہے کہ کسی قسم کی بھی تکلیف ان کو نہ پہنچی کیونکہ کوئی جنگ نہ ہوئی اور اللہ کی رضا کی پیروی یہ تھی کہ باوجود بھاری لشکر کا خوف دلانے جانے کے انہوں نے کچھ پروا نہیں کی بلکہ اللہ کی رضا کو اپنی جان و مال پر مقدم کیا۔

۵۷۱ ذٰلکم الشیطان۔ اس سے مراد وہی نعیم یا وفد عبد القیس ہے اور ذٰلکم کے لفظ میں اسی کی طرف اشارہ ہے بعض نے حقیقی شیطان ہی مراد لیا ہے +

شیطان

یخوف اولیاءہٗ۔ اس کے دو طرح پر معنی ہو سکتے ہیں۔ یخوفکم باولیاءہ (گویا مفعول اول محذوف ہے) تم کو اپنے دوستوں یا رفیقوں سے ڈراتا ہے یعنی مسلمانوں کو کفار سے ڈراتا ہے کہ ان کا لشکر بہت بڑا ہے۔ جیسا دوسری جگہ ہے ویخوفونک بالذین من دونہ (الزمر ۳۹-۳۶) یا اولیاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفار کی جمعیت کے خوف سے جنگ میں نہ نکلتے تھے یعنی منافقین اور مراد یہ ہے کہ شیطان اپنے دوستوں منافقوں وغیرہ کو ڈرا سکتا ہے مومن اس سے نہیں ڈرتے +

۵۷۲ الذین یسارعون فی الکفر۔ کفر میں شدت رغبت کا ذکر منافقین کے زیادہ موزون حال ہے اور اگلی آیت میں الفاظ اشتروا الکفر بالایمان ایمان کے بدلے کفر خریدا بھی منافقوں پر زیادہ چسپاں ہیں۔ مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ ان کے منصوبوں سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ اور لن یضروا اللہ شیئاً میں مراد اولیاء اللہ ہیں +

اللہ کا یہ ارادہ کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو ان کے اپنے افعال کا نتیجہ ہے۔ کہ کفر کی طرف انکی رغبت ہے

۱۷۷ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ

جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر خریدا وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے اور ان کیلئے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ ۱۷۷

دردناک عذاب ہے اور جو کفر کرتے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم جو انہیں مہلت دیتے ہیں یہ ان کے

۱۷۸ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ مَا كَانَ

لئے اچھا ہے ہم انہیں مہلت دیتے ہیں آخر وہ گناہ میں بڑھ جاتے ہیں اور ان کیلئے ذلیل کرنیوالا عذاب ہے ۵۷۳ اللہ ایسا

اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ

نہیں کہ وہ مومنوں کو اس حالت پر چھوڑ دے جس پر تم ہو جبتک کہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دے ۵۷۴

زیادہ ہے۔ پھر انہوں نے اس کے خلاف منصوبہ بازیاں اور شرارتیں کر کے اسلام کو تباہ کرنا چاہا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ان پر نافذ ہو گیا کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو ✦

نملی۔املاء

۵۷۳ نملی۔ ملاء سے مشتق ہے۔ طویل مدت کو مَلَاوَةٌ من الدهر یا مَلِيٌّ من الدهر کہا جاتا ہے (غ) جیسے واهجرنی ملیا (مریم ۱۹-۴۶) اس لئے املاء کے معنی اِمہال یعنی مہلت دینا ہے ✦

لام عاقبت

لیزدادوا اثما لام کا استعمال یعنی انجام کا ربعت ہوا ہے۔ یہ لام عاقبت کہلاتا ہے جیسے قرآن شریف میں آتا ہے فالتقطہ آل فرعون لیکون لھم عدوا وحزنا (القصص ۲۸-۸) دیکھو معنی حالانکہ آل فرعون کے اس کو اٹھانے میں یہ غرض نہ تھی کہ وہ ان کا دشمن بنے بلکہ وہ اسے بیٹا بنانا چاہتے تھے یا اس سے کچھ نفع چاہتے تھے عسیٰ ان ینفعنا او نتخذہ ولدا (القصص ۲۸-۹) اسی طرح جعلوا للّٰہ اندادا لیضلوا عن سبیلہ (ابراھیم ۱۴-۳۰) حالانکہ ان کی غرض اس اتخاذ سے قرب آلہی حاصل کرنا تھا جیسا کہ فرمایا ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللّٰہ زلفیٰ (الزمر ۳۹-۳) پس لیضلوا سے مراد ہے وہ انجام کار ان کو گمراہ کر دیتے ہیں پس جب دوسری جگہ فرمایا اولم نعمرکم ما یتذکر فیہ من تذکر (فاطر ۳۵-۳۷) جس سے معلوم ہوا کہ عمر اللہ تعالیٰ اس لئے دیتا ہے کہ انسان نصیحت حاصل کرے۔ پس لیزدادوا اثما میں لام عاقبت کا ہی ہو سکتا ہے یعنی ہمارے مہلت دینے کا نتیجہ یہ ہے بعض نے اس کو شبہ بالتعلیل کہا ہے مگر مآل ایک ہی ✦

جنگ احد میں کفار کو قرار واقعی سزا نہ ملنے پر وہ سمجھتے تھے کہ بس اب ہم کامیاب ہو گئے فرماتا ہے کہ یہ تو ایک مہلت ہے سو اگر وہ مہلت کو اپنی بھلائی کیلئے استعمال کرتے تو یہ ان کے لئے مفید تھا مگر وہ تو اس کو اور بھی شرارتوں اور منصوبہ بازیوں میں صرف کرتے ہیں اس لئے اس مہلت کا نتیجہ صرف یہ ہو گا کہ ان کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور ان پر گرفت کا موقعہ آجائے اور یہ گرفت کا موقعہ کیا ہو عذاب مہین۔ ذلیل کر دینے والا دکھ یا ذلت کا دکھ سو آخر کار اس قوم کو ذلیل کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مغلوب اور مفتوح کی حیثیت میں لایا گیا ✦

میز۔ تمیز

۵۷۴ یمیز۔ مَیْز اور تمییز کے معنی ہیں الفصل بین المتشابہات (غ) ملتی جلتی چیزوں کو الگ الگ کر دینا ✦

طیب

الطیب۔ طیب۔ طاب سے ہے دیکھو ۲۰۲ اور انسانوں میں سے طیب وہ ہے جو جہل اور فسق اور برے اعمال

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ

اور اللہ کی شان نہیں کہ تمہیں غیب پر اطلاع دے لیکن اللہ اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○

پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقوٰی اختیار کرو تو تمہیں بڑا اجر ملے گا ۵۷۵

کی نجاست سے پاک ہو اور علم اور ایمان اور اچھے اعمال کے زیور سے آراستہ ہو (غ) جیسے تتوفٰهم الملٰئكة طيبين ۔ (النحل ۱۶-۳۲) یا سلٰم علیکم طبتم (الزمر ۳۹-۷۳) یاھب لی من لدنك ذریۃ طیبۃ (آل عمران ۳-۳۸) اور

خبیث — اس کے مقابل پر خبیث ہے یعنی جس میں باطل اعتقاد جھوٹ بُرے اعمال ہوں دیکھو ۳۴۳

مصائب کی غرض — اس آیت میں بتایا ہے کہ ایک پاک گروہ کو مصائب کے ہاون میں کیوں ڈالا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ منہ کی باتوں سے خوش نہیں ہو سکتا۔ ان میں کچے اور پکے منافق اور مومن یکساں ہو سکتے ہیں۔ اسلئے ان دونوں گروہوں کو الگ الگ کرنے کے لئے۔ مومنوں کی کمال وفاداری دکھانے کیلئے اللہ تعالیٰ مصائب لاتا ہے۔ اور اس طرح پر ایک سلے جلے گروہ میں سے خبیث وطیب کو الگ الگ کر دیتا ہے ۔

ما انتم علیه میں مخاطب منافق ہیں۔ کیونکہ انہی کا یہ اعتراض تھا کہ مصائب کیوں آتی ہیں اور کسی تکلیف کے آنے پر وہ بہت گھبرا اٹھتے تھے ۔

جابیۃ — ۵۷۵ یجتبی جَبَیتُ الماءَ کے معنی ہیں۔ میں نے حوض میں پانی جمع کیا ۔ اور اس لئے حوض کو جابیۃ کہا

اجتباء — جاتا ہے جس کی جمع جواب آتی ہے جیسے جفان کالجواب (السبا ۳۴-۱۳) اور اِجتباء کے معنی ہیں الجمع علی طریق الاصطفاء (غ) یعنی اصطفاء کے طریق پر جمع کر دینا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے تعلق اجتباء کے معنی یوں کئے ہیں کہ وہ بندوں کو الٰہی فیض کے ساتھ بغیر بندہ کی کسی کوشش کے خاص کر لیتا ہے جس سے طرح طرح کی نعمتیں حاصل ہوں اور یہ نبیوں کے لئے ہے اور بعض ان لوگوں کے لئے جو صدیقوں اور شہیدوں میں سے ان کا قرب حاصل کر لیتے ہیں (غ) ۔

کیوں ہر شخص کو وحی نہیں ہوتی — جب یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ مصائب اس لئے بھیجتا ہے کہ تا مومن اپنے کمال کو حاصل کریں۔ تو پھر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ اگر کمال تک ہی پہنچانا مقصود ہے تو اللہ تعالیٰ ہم کو خود ہی کیوں غیب پر یعنی اپنی رضا کی راہوں پر اطلاع نہیں دے دیتا تاکہ ہم ان راہوں پر چلیں اور کمال کو حاصل کر لیں۔ گویا ہر ایک کو خود وحی کیوں نہیں ہو جاتی تاکہ وہ اپنے کمال کو حاصل کرے۔ تو اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ اللہ کی شان قدوسیت کا تقاضا نہیں کہ تم جیسے ناپاک لوگوں کا اس سے تعلق ہو۔ پہلے تمہارا پاک ہونا ضروری ہے۔ اور تمہارے پاک کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ راہ رکھی ہے کہ اپنے ایک رسول پر فیضان الٰہی بغیر اس کی کسی سعی کے جاری کرکے اس کے ذریعہ سے دوسروں کو پاک کرتا ہے یہ بعینہ اسی طرح ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا کہ کہتے ہیں لن نؤمن حتی نؤتی مثل ما اوتی رسل الله (الانعام ۶-۱۲۵) ہم تو ایمان نہیں لائیں گے جبتک کہ ہم کو وہ کچھ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا جاتا ہے وہاں بھی جواب یہی دیا ہے الله اعلم حیث یجعل رسالته (الانعام ۶-۱۲۵) اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کو کہاں رکھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یجتبی من رسله من یشاء کے بعد فوراً فرمایا فاٰمنوا بالله ورسله یعنی اسی طریق سے تم کمال کو حاصل کر سکتے ہو۔ ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو منافقوں کے نام نہیں بتاتا مگر رسولوں کو بتا دیتا ہے ۔

۱۷۹ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ

اور وہ لوگ یہ خیال نہ کریں جو اس میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہو کہ یہ ان کیلئے اچھا ہے

بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ

بلکہ وہ ان کے لئے برا ہے قیامت کے دن وہی انکے گلے کا ہار بنایا جائیگا جس میں وہ بخل کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین

۱۸۰ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۟ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ

کی میراث اللہ کی ہی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے ۵۷۶ یقیناً اللہ نے ان لوگوں کی بات کو سن لیا ہے

قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ

جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں ہم لکھ رکھینگے جو کچھ انہوں نے کہا ہو اور ان کا نبیوں کو ناحق

بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۟

قتل کرنا بھی اور ہم کہینگے جلانے والا عذاب چکھو ۵۷۷

ع ۱۹ — اہل کتاب کی نکتہ چینی اور بدزبانی — ربع

بخل — ۵۷۶ یبخلون۔ بُخْلٌ۔ جُوْد یعنی سخاوت کی ضد ہے۔ اور بخل کے معنی ہیں مال کا وہاں سے روکنا جہاں سے روکنا مناسب نہیں (غ)۔

طوق — یُطَوَّقُوْنَ۔ طَوْق وہ چیز ہے جو گردن میں ڈالی جائے۔ خواہ بلحاظ پیدایش ہو جیسے کبوتر کا طوق یا خود کیا جائے جیسے ہار۔

یطوّق — یُطَوَّقُوْنَ کے معنی ہیں ان کو طوق پہنایا جائیگا (غ)، اور یہ تشبیہ کے طور پر ہے جیسا کہ خود حدیث میں ہے یاتی احدکم یوم القیامۃ شجاع اقرع لہ زبیبتان فیتطوق بہ فیقول انا الزکوٰۃ ۔ یہاں بھی طوق بننے سے مراد اس کی تشبیہ ہے (غ)۔ اور اصل یہ ہے کہ تمام اعمال کا قرآن کریم نے گلے میں ڈالا جانا ہی بیان فرمایا ہے وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ (بنی اسرائیل ۱۷-۱۳)۔ پس جس طرح تمام اعمال انسان کے گلے کا ہار بن جاتے ہیں اسی طرح بخل بھی گلے کا ہار بن جائیگا۔ ایسے مقامات پر یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ مال جس کے متعلق اس نے بخل کیا تھا اکٹھا کر کے اس کے گلے میں ہار ڈال دیا جائیگا۔ بلکہ منشا یہ ہے کہ اس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑے گا +

وراثۃ — میراث۔ ورث سے ہے۔ وِرَاثَۃ اور اِرْث کے معنی ہیں ایک شخص کی طرف کسی دوسرے سے مال کا منتقل ہونا بغیر کسی معاہدہ کے یا ایسے امر کے جو قائم مقام معاہدہ ہو (غ)، اس لئے جو مال میت سے منتقل ہوتا ہے اس کو اس نام

ارث — سے پکارا جاتا ہے۔ اور مال منتقل شدہ کو میراث کہا جاتا ہے۔ اور اسی لحاظ سے اِرْث بمعنی اصل بھی آتا ہے جیسے نبی کریم صلعم نے فرمایا فانکم علی ارث ابیکم جہاں مراد ہے کہ تم اسی اصل پر ہو جس پر تمہارا باپ تھا (غ)، اسی طرح جو چیز کسی کو بغیر محنت و مشقت کے حاصل

وارث — ہو جائے اس پر بھی وارث ہونے کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آپکو بھی وارث کہا ہے اس لئے کہ سب کی

میراث — سب اشیاء اللہ تعالیٰ کی طرف ہی پہنچنے والی ہیں (غ)، اسی لحاظ سے یہاں میراث کا لفظ فرمایا اور اسی کے مطابق دوسری جگہ ہے ونحن الوارثون (الحجر ۱۵-۲۳) +

ذوق — ۵۷۷ ذوقوا۔ ذوق کے معنی منہ کے ساتھ طعم کا پانا ہے۔ اور اصل میں لفظ ذوق تھوڑے کے متعلق استعمال ہوتا ہے

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ ۱۸۱

یہ اس لئے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ۵۷۸

کثیر کے لئے نہیں (غ)، مگر قرآن کریم میں عذاب کے لئے لفظ ذوق ہی استعمال ہوا ہے۔ بعض موقعہ پر تو یہ معنی لفظ کی صراحت سے نظر آتے ہیں جیسے ولنذیقنہم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر (السجدۃ ۳۲-۲۱) کیونکہ عذاب ادنیٰ یا اس دنیا کا عذاب بمقابلہ آخرت کے ایک بہت تھوڑی چیز ہے۔ اور بعض مقامات پر ذوق کا لفظ اختیار کرکے یہ اشارہ کیا ہے کہ جو کچھ عذاب آخرت ہے کچھ مزا اس کا انسان یہاں بھی چکھ لیتا ہے +

حریق — الحریق۔ اَحْرَقَ کے معنی جلایا اور حریق کے معنی آگ ہیں (غ)، عذاب الحریق کے معنی جلانے والا عذاب یا وہ عذاب جس میں جلن ہے +

یہود کا اسلامی چندوں پر استہزاء — منافقوں کے جن کا ذکر ہو رہا تھا بڑے حامی اور جنگ اُحد کے بعد مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن جو منافقوں کی طرح اندرونی دشمن تھے کیونکہ بظاہر مسلمانوں سے معاہدہ بھی کر رکھا تھا یہودی تھے انہی کا یہاں ذکر ہے جیسا کہ قتل انبیاء کے لفظ میں صاف بتا دیا ایک طرف اسلام میں زکوٰۃ کا قایم کرنا دوسری طرف صدقات کی ترغیب پھر جنگوں کیلئے مالی قربانیوں کی ضرورت۔ علاوہ ان سب کے مسلمان اس وقت حالت غربت میں تھے۔ ادھر یہود ہمیشہ سے بوجہ اپنی سود خواری کے ایک مالدار قوم رہی ہے اس لئے یہ لوگ ایسی باتوں پر بھی استہزا کرتے رہتے تھے کہ اللہ تو فقیر ہے کیونکہ اس کے مخلص پرستار تنگی کی حالت میں ہیں اور ہم امیر ہیں۔ اور پھر چندوں اور مالی قربانیوں کے مطالبہ پر بھی استہزا کرتے تھے کہ کیا خدا فقیر ہے جو اسے چندوں کی ضرورت پڑ گئی حالانکہ اس بات سے خوب واقف تھے کہ سنت اللہ یہی ہے کہ مومنین کو مالی و جانی ہر قسم کی امداد میں شامل ہونا پڑتا ہے مگر نحن اغنیاء کہنے والوں کو کچھ عذاب الحریق اس دنیا میں بھی پہنچا دیا جب ان کا غنا حالت فقر سے بدل گیا اور ان کو اپنے املاک وغیرہ چھوڑ کر ملک بدر ہونا پڑا اور جن کو وہ فقیر کہتے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بے حساب رزق دیا۔ واقعی اس نظارہ کو دیکھ کر کیسی جلن ان لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہوگی۔ یہ آنے والے عذاب الحریق کا مزہ اسی دنیا میں چکھا دیا

ظلام — ۵۷۸ لیس بظلام۔ ظلّام مبالغہ کا صیغہ ہے۔ بہت ظلم کرنے والا۔ مگر نفی مبالغہ سے یہ مطلب نہیں کہ تھوڑا ظلم کر لیتا ہے کیونکہ قرآن کریم خود فرماتا ہے۔ ولا یظلمون فتیلا (النساء ۴-۴۹) ان پر ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائیگا۔ اور پھر فرماتا ہے ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ (النساء ۴-۴۰) اللہ تعالیٰ ایک ذرہ کے وزن کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ مبالغہ کی نفی کی وجہ صاف

مبالغہ کی نفی — ظاہر ہے۔ ان کے جس عذاب کا ذکر ہے وہ ایک سخت جلانے والا عذاب ہے اس عذاب کے اگر وہ حقدار نہ ہوتے تو اس کا پہنچانے والا بڑا ظالم ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے فرمایا کہ اتنا بڑا عذاب جو ان کو دیا تو کیا اللہ کوئی بڑا ظالم ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ نفی کثرت سے اصل کی نفی نہیں ہوتی۔ یہ ہر موقعہ پر صحیح نہیں اور یہاں بالخصوص روح المعانی میں اس کی ایک لطیف وجہ یہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جس قدر صفات ہیں وہ مبالغہ کے رنگ کی ہیں کیونکہ ہر ایک صفت اس میں اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہے پس اگر ظلم بھی اس کی صفات میں ہوتا تو وہ ظلام یعنی بڑا ہی ظالم ہوتا۔ اور جب اس میں ایک بات علی وجہ الکمال نہیں تو معلوم ہوا کہ وہ مطلق نہیں پس جب وہ ظلام نہیں تو اس کی صفت میں ظلم مطلق نہیں +

عبد — عبید عَبْد ایک بلحاظ تسخیر کے ہے اور اس رنگ میں کل انسان اللہ تعالیٰ کے عبد ہیں بلکہ دیگر اشیاء بھی۔ اور ایک عبد بلحاظ اختیار بنتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرکے عبید۔ عبد کی جمع پہلے معنی میں ہے اس لئے عبد بمعنی غلام کی جمع بھی عبید آتی ہے کیونکہ وہ بھی تسخیر ہے۔ اور دوسرے معنی میں اس کی جمع عباد ہے اسی لئے عباد کا لفظ اچھے موقع پر بولا گیا ہے۔

۱۸۲ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ

جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہماری طرف تاکیدی حکم بھیجا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ہمارے پاس قربانی (نہ) لائے

تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِىْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِىْ قُلْتُمْ

جسے آگ کھاتی ہو کہو مجھ سے پہلے رسول تمہارے پاس کھلی دلائل کے ساتھ اور اس کے ساتھ جو تم کہتے ہو آئے۔

۱۸۳ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ

تو ان کو تم نے کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو ۵۷۹ پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں

جیسے عباد الرحمٰن (الفرقان ۲۵: ۶۳) عبادہ الذین اصطفٰی (النمل ۲۷: ۵۹) اسر بعبادی (طٰہٰ ۲۰: ۷۷) من عبادنا (الکہف ۱۸: ۶۵) پس عبید کا لفظ زیادہ وسیع ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ نیک پر ظلم کرتا ہے نہ بد پر +

قربان

۵۷۹ قربان اصل میں وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے قرب الٰہی حاصل کیا جائے (غ)، مگر تعارف میں نسیکہ یعنی ذبیحہ سے مخصوص ہوگیا ہے جیسے یہاں اور اذ قربا قربانا (المائدۃ ۵: ۲۷) +

سوختنی قربانی

اس آیت میں یہودیوں کے ایک اعتراض کا ذکر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ حکم ہے کہ کسی رسول کو نہ مانیں مگر اسکو جو ایسی قربانی لائے جسے آگ کھاتی ہو۔ توریت میں ایسا کوئی حکم نہیں۔ البتہ توریت میں قربانیوں کے متعلق بہت سے احکام ہیں اور ایک قسم کی قربانی ان کے ہاں سوختنی قربانی کہلاتی تھی جو ساری کی ساری آگ میں جلا دی جاتی تھی۔ مگر ایسی قربانی کو انبیاء کہیں سے ساتھ نہ لاتے تھے۔ بلکہ وہی قربانیاں جو لوگ گزرانتے تھے ان میں سے بعض قسم کی قربانیوں کو سالم آگ میں جلانے کا حکم تھا اور بعض قسم کی قربانیوں کا کچھ حصہ آگ میں جلایا جاتا تھا اور باقی کاہن کھاتے تھے۔ دیکھو احبار ۱: ۹-۶ و ۶: ۱۴-۱۶ و ۲۶ وغیرہ۔ پس شریعت موسوی میں قربانی کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور آگ کھاتی تھی +

شریعت موسوی کا ایک امتیازی نشان

پس قربان تاکلہ النار میں صرف شریعت موسوی یا اس کی سوختنی قربانیوں کا ذکر ہی نہ کچھ اور۔ سورۃ بقرہ میں یہ مفصل ذکر ہو چکا ہے کہ یہودیوں کو جب قرآن شریف پر ایمان لانے کیلئے بلایا جاتا تھا تو وہ یہ جواب دیتے تھے۔ کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہماری طرف اُتارا گیا۔ اور دوسری کسی قوم کو شریعت کا دیا جانا نہیں مانتے یہی اعتراض ان کا یہاں بھی ہے صرف اس جگہ شریعت موسوی کا ایک امتیازی نشان بتا دیا ہے اور وہ امتیازی نشان یہ ہے کہ ان کے ہاں قربانیوں کو آگ کھاتی تھی۔ مگر اسلام میں قربانی کا کوئی حصہ جلایا نہیں جاتا۔ گویا اسلام کی قربانی نے شریعت موسوی کی قربانی کو منسوخ کر دیا اعتراض کا جواب یوں دیا ہے کہ تمہارے پاس تو ایسے رسول بھی آتے رہے جو شریعت موسوی پر عامل ہونے کی وجہ سے قربانیوں کو جلانے کا حکم دیتے تھے۔ پھر باوجودیکہ وہ بینات یعنی کھلی دلائل یا معجزات بھی لائے مگر تم نے ان کو قتل کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء کی مخالفت تمہارے خمیر میں داخل ہوگئی ہے۔ یہاں بینات یعنی دلائل و معجزات کا بالذی قلتم سے الگ ذکر کرکے یہ بتا دیا ہے کہ ان کا مطالبہ ایسی قربانی کا جسے آگ کھائے معجزہ کے رنگ میں نہ تھا بلکہ معمولی شریعت کا امر تھا اگر معجزات میں یہ امر داخل ہوتا تو بالذی قلتم کو بینات سے الگ نہ کیا جاتا +

آگ کا آسمان سے اُترنا

اور یہ جو مفسرین نے لکھا ہے کہ ایسی قربانی ہوتی تھی جسے ایک سفید آگ آسمان سے اُتر کر کھا جاتی تھی۔ سو آسمان سے آگ اُترنے کا ذکر نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ ہاں بائبل میں ایک موقعہ پر آگ کے آسمان سے اُترنے کا ذکر ہے مگر وہ ایک

فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ؕ

تو تجھ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی دلائل اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے ۵۸۰

خاص موقعہ ہے اور ہر اسرائیلی نبی کی صداقت کا یہ نشان بائبل سے ثابت نہیں ہوتا صرف ۲ تواریخ ساتویں باب کے شروع میں ہے "اور جب سلیمان دعا مانگ چکا تھا تو آسمان سے آگ اتری اور سوختنی قربانی کو اور ذبیحوں کو کھا گئی اور وہ گھر خداوند کے جلال سے بھر گیا"۔ مگر سلیمان کو بنی اسرائیل نے قتل نہیں کیا نہ ان کے قتل کے درپے ہوئے اور یہاں آتا ہے فلم قتلتموھم پس اس کی طرف اشارہ نہیں ۔

زبر

زبود - زبرۃ

۵۸۰ زُبُر - زَبُود کی جمع ہے اور زَبُود کے معنی ہیں لکھی ہوئی کتاب کیونکہ زَبَرَ کے معنی ہیں کتب یعنی لکھا بعض نے پتھر میں نقش کرنا بھی اس کے معنی لکھے ہیں (ل) اور زبُود ہر ایک کتاب کو کہتے ہیں (ل) (اور زُبَر - زُبْرَۃ کی جمع ہے جو اسی مادہ سے الگ لفظ ہے اور جس کے معنی لوہے کا بڑا ٹکڑہ ہیں جیسے اٰتونی زبر الحدید (الکھف ۱۸ - ۹۶) اور پھر استعارۃً اسکے معنی ٹکڑے کرنا بھی آئے ہیں جیسے فتقطعوا امرھم بینھم زبرا جہاں زبرۃ کی جمع بجائے زُبَر کے زُبُر آگئی ہے) زبرتُ الکتاب کے معنی کَتَبْتُهٗ کِتَابَةً عَظِيْمَةً بھی ہیں (غ) یعنی میں نے اس کو بڑا بھاری لکھنا لکھا - اور زبُود کے معنی ہیں کل کتابٍ غلیظ الکتابۃ ہر ایک کتاب موٹی کتابت والی ۔

نور

المنیر - نُور روشنی کو کہتے ہیں مگر یہ دو قسم ہے ایک وہ جو معاون بصارت ہے یعنی ظاہری روشنی اور دوسرا وہ جو معاون بصیرت ہے یعنی باطنی روشنی - جیسے نور عقل یا نور قرآن - اور قرآن کریم کو نور مجسم کہا ہے قد جاء کم من اللہ نور وکتاب مبین (المائدۃ ۵ - ۱۵) اور منیر کے معنی ذو نور ہیں یعنی روشنی دینے والی ۔

منیر

زبور اور کتاب

یہاں انبیاء کو تین چیزیں دیئے کا ذکر ہے - بینات - زبور - کتاب منیر - بینات سے مراد دلائل نبوت یا معجزات ہیں زبور کے معنی اوپر کتاب بیان ہو چکے - بینات پر زبر کا عطف ہونے سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ معجزات الگ امور ہیں - اور زبر و کتاب منیر الگ - یہ تو ثابت ہو چکا کہ زبور سے مراد کتاب ہی ہے نہ کچھ اور اور قرآن کریم میں صحف یا کتب انبیاء پر یہ لفظ بولا گیا ہے جیسے انہ لفی زبر الاولین (الشعراء ۲۶ - ۱۹۶) اور ام لکم براءۃ فی الزبر (القمر ۵۴ - ۴۳) ان دونوں آیات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ زُبُر سے مراد انبیاء کے صحیفے ہی ہیں نہ کچھ اور پھر دو دفعہ یہ لفظ کیوں لایا گیا یعنی زُبُر کے بعد پھر کتاب منیر کے لانے کی کیا ضرورت تھی - اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا ہے کہ زبر سے مراد چھوٹے صحیفے اور کتاب منیر سے مراد توریت - انجیل و زبور ہیں - گویا بعض انبیاء کو چھوٹے صحیفے دیئے اور بعض کو ایسی عظیم الشان کتابیں جیسے توریت و انجیل و زبور - اور قتادہ سے مروی ہے کہ الکتاب المنیر سے مراد زبر ہی ہیں - اور بعض وقت ایک شے کا دوسرے اعتبار سے ذکر کر کے اسے دوبارہ لایا جاتا ہے - اور الکتاب المنیر کو واحد اس لئے لائے ہیں کہ جملہ کتب سماوی ایک لحاظ سے ایک ہی کتاب ہیں اور زجاج کا قول ہے کہ ہر ایک کتاب ذی حکمت کو زبور کہدیا ہے اور جس میں احکام شرعی ہوں اس کو کتاب کہدیا ہے - یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبود کے معنی میں غلظت یا شدت پائی جاتی ہے - اور اس شدت کا تعلق اعداء سے ہوتا ہے اور اس کے مقابل کتاب منیر میں نور کی طرف توجہ دلائی ہے گویا وہ پیروؤں کو ایک نور عطا کرتی ہے پس زبود اسی کتاب کو بلحاظ اس کی شدت کے کہا ہے اور کتاب منیر - اسی کو نور اور روشنی کے لحاظ سے کہا ہے - اور حضرت داؤد کی کتاب کو جو بالخصوص زبور کے نام سے پکارا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ حضرت داؤد کی کتاب میں زیادہ حصہ شدت کا ہے ۔

۱۸۶ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ

ہر ایک شخص موت چکھنے والا ہے اور تم کو صرف قیامت کے دن تمہارے پورے اجر دیئے جائینگے ۵۸۱ پس جو آگ سے

عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ○

دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ ضرور مراد کو پہنچ گیا اور دنیا کی زندگی نرا دھوکے کا سامان ہے ۵۸۲

۱۸۵ لَتُبْلَوُنَّ فِىْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۟ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

ضرور تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں آزمائے جاؤ گے اور ضرور تم ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے

۵۸۱ اس عبارت کا اس مضمون سے تعلق یوں ہے کہ پچھلی آیات میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو انبیاء علیہم السلام کی معاندانہ مخالفت کرتے ہیں اور ہر مخالفت کا بدلہ فوراً تو ملتا نہیں اس لئے وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی مخالفت سے ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس لئے فرمایا کہ بیشک ہر عمل کا کھلا کھلا بدلہ تو اس زندگی میں نہیں ملتا مگر ہر شخص پر موت آنے والی ہے۔ اور کھلے کھلے اور کامل اجر کے لئے اللہ تعالیٰ نے بعث بعد الموت یا قیامت کا دن مقرر کیا ہے۔ لیکن توفون یا پورا دینا کہکر یہ بھی بتا دیا ہے کہ کچھ نہ کچھ یہاں بھی انسان کو مل جاتا ہے۔ اس میں معاندین اسلام کو دو ہرا زجر ہے ایک یہ کہ اپنی بداعمالیوں کی پوری سزا تو تم قیامت کے دن پاؤ گے اور دوسرے یہ کہ اس سزا کا کچھ حصہ اس دنیا میں بھی مل رہیگا +

زحزح — **۵۸۲** زحزح۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ زحّ ہے۔ اور زحّہٗ (مصدر زحزحۃ) کے معنی ہیں اس کے موضع سے اس کو ہٹا دیا اور الگ کر دیا اور اس سے دور کر دیا (غ۔ ل) اور بعض کے نزدیک ذاح یزیح سے ہے جسکے معنی ہیں تاخر یعنی پیچھے رہ گیا (ل) +

فوز۔ مفازۃ — فَازَ۔ فوز کے معنی ہیں۔ بھلائی کا کامیابی سے پالینا مع سلامتی کے حصول کے اور مفازۃ اس سے مصدر ہے (غ) +

غرور — غرور۔ غَرَّ سے مصدر ہے۔ اور غَرَرْتُ فلانًا کے معنی ہیں۔ اس کو حالت غفلت میں پایا۔ اور جو کچھ ارادہ کیا تھا اس سے حاصل کیا (غ) اور غرور۔ غارّ کی جمع بھی ہے جس کے معنی دھوکہ دینے والا ہیں +

دنیا کی زندگی دھوکا ہونے سے مراد — اس آیت میں بتایا ہے کہ انسانی زندگی کے مقصد کے سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہئے۔ فوز مراد کو پالینا یا انسانی زندگی کے مقصد کو حاصل کرلینا یہ ہے کہ ایک شخص آگ سے دور کیا جائے۔ اور جنت میں داخل کیا جائے لیکن بعض لوگ اس دنیا کی زندگی کو ہی غرض و غایت سمجھ لیتے ہیں۔ یہاں الحیوۃ الدنیا سے مراد صرف دنیا میں رہنا نہیں کیونکہ دنیا میں نیک و بد سب رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے خود ہی انسان کو پیدا کرکے دنیا میں رکھا ہے بلکہ جیسا کہ مقابلہ سے ظاہر ہے مراد یہ ہے کہ حیوانی زندگی کو غرض و غایت انسانی زندگی کی نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ یہ حیوانی زندگی تو لازماً منقطع ہونے والی ہے اس لئے جس نے اس کو غرض و غایت بنایا اس نے بڑا دھوکا کھایا کیونکہ جب یہ منقطع ہوگی تو ایسا شخص گویا خالی ہاتھ رہ گیا۔ قرآن کریم میں جہاں دنیا کی زندگی کی مذمت ہے انہی معنوں میں ہے +

وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ

اور ان سے جو مشرک ہوئے بہت سی دُکھ دینے والی باتیں سنوگے۔ اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بیشک یہ بڑی ہمت کے

عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۱۸۶

کاموں میں سے ہے ۵۸۳ اور جب اللہ نے ان سے اقرار لیا جنہیں کتاب دی گئی ہے

عزم الامور

۵۸۳ عزم الامور۔ عزم کے لئے دیکھو نوٹ ۲۹۰ عزم الامور کی مراد معزومات الامور ہیں یعنی ایسے امور جن پر عزم کرلینا چاہئے کیونکہ ان میں کمال خوبی اور شرف اور عزت ہے۔ ہٹ اور ضد کا نام عزم نہیں۔ یا مراد ایسے امور ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے پختہ فیصلہ کرکے ان کو واجب کردیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے مالی اور جانی نقصانوں اور ایذا کی پیشگوئی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کیلئے دو سخت قسم کے ابتلاؤں کا ذکر کیا ہے جو ابھی پیش آنے والے تھے۔ ایک مالی اور جانی ابتلا۔ دوسرا اہل کتاب اور مشرکین سے ایذا کی باتیں سُننا۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی اس لئے ان مالی اور جانی ابتلاؤں کا اس میں ذکر نہیں ہوسکتا جو اس جنگ سے پہلے مسلمانوں کو اُٹھانے پڑے ہجرت میں یا اس سے پہلے یا اس کے بعد جنگوں میں۔ اور نہ ہی ان ایذا کی باتوں کا ذکر ہوسکتا ہے جو مکہ میں مشرکین سے اور مدینہ میں یہود سے سننی پڑیں کیونکہ ان کے بعد کی یہ آیت ہے اور اس میں آیندہ کا ذکر ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس قدر مالی اور جانی ابتلا مسلمانوں کو جنگ اُحد میں یا اس سے پیشتر اٹھانے پڑے۔ اور جس قدر ایذا کی باتیں اس وقت تک سننی پڑیں نبی کریم صلعم کے بقیہ حصہ زندگی میں اس قدر ابتلا نہیں اُٹھانے پڑے نہ اس قدر ایذا کی باتیں سُننی پڑیں۔ بلکہ بعد میں روز بروز اسلام کی قوت بڑھتی گئی یہانتک کہ سارے ملک عرب پر مسلمانوں کا تسلط ہوگیا۔ پس یہ مالی اور جانی ابتلا اور یہ ایذا کی باتیں کسی آیندہ زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اُحد کی جنگ کے ذکر کے بعد ان کا ذکر اس لئے کیا کہ اس جنگ میں بھی مسلمانوں کو بہت مالی اور جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔ تو گویا فرمایا کہ اگر یہ مالی اور جانی نقصان تم کو پہنچا ہے تو ابھی اور بھی مالی اور جانی نقصان پہنچنے والے ہیں۔ اور یوں ان الفاظ میں یقیناً اہل اسلام کے ان مالی اور جانی نقصانوں کی طرف اشارہ ہے جو ہمارے اس زمانہ میں ان کو اُٹھانے پڑے ہیں۔ اور اسی لئے ان کے ساتھ ایذا کی باتوں کو جمع کیا ہے کہ یہ دونوں باتیں اسی زمانہ میں اکٹھی ہوئی ہیں۔ مالی اور جانی نقصان ظاہر ہیں ملکوں کے ملک چھن گئے۔ دولت اور املاک ہاتھوں سے نکل گئے۔ اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ شہید کئے گئے۔ مرد اور بچے اور عورتیں ہزارہا کی تعداد میں تہ تیغ ہوئے اس کے ساتھ ہی عیسائیوں اور مشرکوں کی طرف سے وہ کچھ ایذا کی باتیں اسلام کے مقدس پیشوا اور بزرگان دین کی نسبت سننی پڑیں کہ الامان۔ اس زمانہ میں جو گندے اعتراض اسلام کے خلاف ہوئے ہیں اور جس قدر دشنام دہی کے رسائل تیار ہوئے ہیں ان کا اگر انبار لگایا جائے تو ایک پہاڑ بن جاتا ہے۔ اور چونکہ اس سورت میں اصل عیسائیوں کا ذکر ہے اور اُحد کی جنگ کا ذکر بھی درمیان میں بطور ایک مثال کے آگیا تھا اس لئے سمجھایا کہ اسلام پر ایسے مصیبت کے زمانے پہلے بھی آئے ہیں کہ دشمنوں نے سمجھا کہ ہم نے اسے کچل دیا ہے۔ مگر وہ مغلوب کبھی نہیں ہوا ہمیشہ غالب ہی ہوا ہے اس لئے اب بھی جب چاروں طرف سے مسلمان مصائب کا شکار ہو رہے ہیں یہ آیت قرآنی ہمیں تسلی دیتی ہے کہ اسلام اب بھی مغلوب نہ ہوگا۔

ان مصائب کا علاج

ان مصائب کا علاج صبر اور تقویٰ بتایا ہے۔ سو صبر دو قسم ہے ایک مصائب میں ہمت نہ ہارنا دوسرا اللہ تعالےٰ

لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡفَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ

کہ ضرور تم اس کو لوگوں کیلئے کھولکر بیان کرتے رہوگے، اور اسے نہیں چھپاؤگے پھر انہوں نے اسکو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینکدیا اور اسکے عوض

ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا ۱۸۷

تھوڑی سی قیمت لے لی سو کیا ہی برا ہے جو وہ خریدتے ہیں ۵۸۴ ہرگز خیال نہ کرو کہ جو لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں جو انہوں نے کیا

وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّھُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ

اور پسند کرتے ہیں کہ اس کیلئے ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے نہیں کیا یہ ہرگز بھی خیال نہ کرو کہ وہ عذاب سے نجات پا گئے۔

کی طاعت پر عمل کے لئے اور اس کے منہیات سے بچنے کے لئے مضبوط کھڑا ہو جانا۔ اور تتقوا کو بعد میں رکھ کر بتایا کہ یہاں تقویٰ سے مراد اپنا بچاؤ کرنا ہے ان تدابیر سے جو اس وقت عمل میں لائی جا سکتی ہیں۔ اور حقوق کی نگہداشت بھی مراد ہو سکتی ہے۔

اہل کتاب کا اپنی کتاب کو چھپانا۔

۵۸۴ جب اہل کتاب کے مسلمانوں کو مالی اور جانی نقصان پہنچانے کا ذکر کیا اور ان کی سب وشتم سے پیشگوئی کے طور پر آگاہ کیا تا کہ مسلمان یہ جان لیں کہ ان کا خدا ان کے مصائب سے غافل نہیں تو ساتھ ہی اہل کتاب کے معاہدات کی طرف توجہ دلائی کہ ان کی کتابوں میں صریح پیشگوئیاں آنحضرت صلعم کی تشریف آوری کی موجود تھیں اور ان کو حکم تھا کہ ان کو ظاہر کریں اور چھپا کر نہ رکھیں مگر انہوں نے محض دنیا کی دولت اور دنیا کی عزت کی خاطر جو ثمن قلیل ہے ان معاہدات کو ان کتب کو پس پشت پھینک دیا مگر جیسا کہ قرآن شریف کا قاعدہ ہے صرف اہل کتاب کو الزام دینا مقصود نہیں ساتھ ہی مسلمانوں کو سمجھانا مقصود ہے کہ تم پر بھی وہ وقت آئے گا کہ خدا کی کتاب قرآن کریم کو کھول کر لوگوں کے لئے بیان نہ کرو گے بلکہ اس کو چھپاؤ گے۔ اور تم بھی اس کے عوض دنیا کی زندگی کے عارضی فائدے چاہو گے۔ چنانچہ جب مسلمانوں میں مال و دولت اور آسایش اور حکومت آئی تو انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا اور دنیا کے پیچھے پڑ گئے۔

مسلمانوں کی بیماری قرآن کو بیان نہ کرنا ہے۔

یہاں دو باتیں الگ الگ بیان کی ہیں ایک کھول کر بیان نہ کرنا دوسرے اس کا چھپانا۔ کتاب کا کھولکر بیان کرنا یہ تھا کہ جو احکام اس میں قابل عمل تھے ان کو عمل کیلئے پیش کیا جاتا۔ بجائے اس کے تفسیر کرنے بیٹھے تو یا تو قصوں میں پڑ گئے جن کا نام و نشان تک قرآن میں نہیں ہے۔ یا دماغ سے عجیب عجیب نکتے اختراع کرنے شروع کئے یا اپنے معتقدات کی تائید میں الفاظ قرآنی کو توڑ مروڑ کر لگا لیا اور پھر ان قصوں نے اور عدم تبیین نے توجہ کو آہستہ آہستہ قرآن شریف کی طرف سے ہی ہٹا دیا یہانتک کہ اس کو بالکل چھپا ہی دیا گیا۔ یہ گویا دوسرا مرتبہ تھا اور یہی آج مسلمانوں کی حالت ہے کہ قرآن شریف ان کے اندر بظاہر بڑی عزت کے مقام پر ہے مگر فی الحقیقت وہ بالکل مخفی ہو رہا ہے۔ عدم بیان کے بعد کتمان کا مرتبہ دوسرا تھا اور پہلے سے بڑھکر تھا اس لئے لاتکتمونہ کو لتبیننہ کے بعد رکھا ہے حالانکہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کتمان پہلا مرتبہ اور عدم تبیین دوسرا مرتبہ ہے۔ آج اگر غور کیا جائے تو اس قدر مصائب کا آماجگاہ ہونے کے باوجود بھی مسلمان قرآن کے کتمان کے مجرم ہیں۔ ہر طرف توجہ ہوتی ہے مگر قرآن کریم کی طرف نہیں ہوتی۔ سجادہ نشین۔ علماء اور سیاسی لیڈر عموماً قرآن کی طرف سے لاپروا ہیں۔ بہتیری راہیں مسلمانوں کے لئے تجویز کرتے ہیں مگر قرآن کو تجویز نہیں کرتے پس اہل کتاب کے اس ذکر میں مسلمانوں کے اصل مرض کو بھی بتا دیا ہے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ ۱۸۸

اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے [۵۸۵] اور آسمانوں اور زمین کا ملک اللہ کا ہی ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے [۵۸۶]

رکوع ۲۰ — ۱۱

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ○ ۱۸۹

یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور اور رات اور دن کے اختلاف میں عقل والوں کے لئے نشان ہیں [۵۸۷]

مومن انجام کار کامیاب ہونگے

قرآن کریم کے پیش کرنے سے اصلاح اور اشاعت کے دو کام ہوتے ہیں

لتبیننہ للناس ۔ کتاب کا کھول کر بیان کرنا للناس یعنی سب لوگوں کے فائدہ کے لئے ہو۔ اس میں اگر ایک طرف مسلمانوں کی حالت کی اصلاح آجاتی ہو کہ ان کو اس کتاب پر چلایا جائے ۔ تو دوسری طرف غیر مسلموں کے سامنے حق کو پیش کرنا بھی اسی میں داخل ہو مسلمان دونوں سے غافل ہیں مگر بالخصوص یہ دوسرا امر تو ایسا بھلایا ہو کہ اس زمانہ کے مجدد کو تیس سال گزر گئے کہ اس نے مسلمانوں کو جگانا شروع کیا کہ اسلام کی اصلی کامیابی اسی میں ہو مگر کتنے ہیں جنہوں نے توجہ کی ۔ جہاں اس قدر اسلام کی کامیابی کی راہوں پر کم و بیش عمل کر کے دیکھ لیا جاتا ہے ۔ اس بات کی طرف تجربہ کے لئے بھی لوگ نہیں آتے ۔ حالانکہ تاریخ بتاتی ہو کہ یہی بات پہلے اسلام کی اصل کامیابی کا موجب ہوئی +

۵۸۵ اصل نقشہ تو اسلام کے دشمنوں کا کھینچا ہے جیسا روایات سے ثابت ہے ۔ اہل کتاب ہوں یا منافق ۔ اور اس زمانہ میں وہی لوگ جنہوں نے شوکت اسلامی کے مٹانے میں کوئی کوشش باقی نہیں چھوڑی خود مسلمانوں کے منہ سے اپنی تعریف سننے کے خواہاں ہیں ۔ مگر سبق مسلمانوں کے لئے تھا ۔ آج مسلمانوں کی قوم کو یہ بیماری کھا گئی ہو ۔ کام کرنے والے بہت قلیل ہیں ۔ اور تھوڑا سا کرتے ہیں تو اس پر اتراتے ہیں اور پھر اکثر کی حالت یہ ہو کہ کرتے کراتے کچھ نہیں اپنی تعریف کے گیت لوگوں سے سننا چاہتے ہیں ۔ سجادہ نشین علماء لیڈر الا ماشاء اللہ سب اس بلا میں مبتلا ہیں ۔ یہ لوگ عذاب الٰہی سے نڈر ہیں ۔ مگر وہ پہنچ کر رہے گا +

۵۸۶ معاندین اسلام کو بتایا ہو کہ حق کی مخالفت کر کے وہ اپنے آپکو کامیاب نہ سمجھیں +

مومن کیلئے ساری مخلوق میں اور اختلافات زمانہ میں نشان ہیں

۵۸۷ اس رکوع میں اصل ذکر مومنوں کی کامیابی کا ہے ۔ اور اسی پر سورت کا خاتمہ ہے ۔ اور ان تمہیدی آیات میں کچھ صفات ان مومنوں کی بیان کی ہیں دو قسم کے نشانوں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک وہ جو خلق سماوات والارض سے تعلق رکھتے ہیں یعنی مخلوق الٰہی کے ساتھ خواہ وہ آسمانوں پر ہو اور خواہ زمین میں ۔ اس میں بھی نظر انسانی کو بہت وسیع کیا ہے ایک ملک تک محدود رکھنا تو ایک طرف رہا ساری زمین تک بھی محدود نہیں کیا بلکہ مومن کی نظر کو اس قدر بلند کیا ہے کہ وہ آسمانوں کی پیدائش پر بھی غور کرے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ترقی کرتا کرتا آسمانوں کی مخلوق کے حالات کو بھی معلوم کر سکتا ہو دوسری قسم کے نشان جن کا یہاں ذکر کیا ہے وہ ہیں جو لیل و نہار کے اختلاف سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ لیل و نہار کے اختلاف سے مراد زمانہ ہے ۔ پس صرف مخلوق الٰہی میں ہی جیسے کہ وہ نظر آتی ہے نشان نہیں بلکہ زمانہ میں بھی نشانات ہیں اور قوموں اور امتوں پر جو انقلابات آتے رہتے ہیں وہ سب لیل و نہار کے اختلافات میں شامل ہیں +

یہ دس آیات یعنی آخر سورت تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کو اٹھتے ہوتے پڑھا کرتے تھے ۔ جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباس کی روایت سے ثابت ہو +

۱۹۰ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ

جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

فکر کرتے رہتے ہیں ہمارے رب تو نے اسے بے فائدہ پیدا نہیں کیا ۵۸۹ تو پاک ہو پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا ۵۸۹

جنب

۵۸۸ علیٰ جنوبہم ۔ جنوب ۔ جنب کی جمع ہے جس کے اصل معنی پہلو یا کروٹ ہیں (غ)۔

یتفکرون ۔ فکر اسکا اصل ہو اور فکرۃ کے معنی ہیں وہ قوت جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہو (غ)، اور تفکر اس قوت کے جولان کا نام ہو جو عقل کی نظر کے مطابق ہو اور یہ صرف انسان کے لئے ہو نہ حیوان کیلئے (غ)۔

ذکر و فکر

یہاں مومنوں کی دو بڑی صفات بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کا ذکر ہر حال میں کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ مخلوق میں فکر کرتے ہیں۔ اللہ کا ذکر صرف زبان سے نہیں ہوتا دیکھو ۱۹۱ بلکہ زبان اور قلب اور جوارح سب سے ہی۔ اور ذکر قلب سے مراد یہ ہے کہ انسان کے دل میں ہر وقت عظمت الٰہی ہو اور عملی حالت میں ذکر الٰہی ہی وہ چیز ہے جس کو انسان اپنے تمام حالات میں آٹھوں پہر چلتا پھرتا ہو یا بیٹھا یا سوتا مد نظر رکھ سکتا ہو ان الفاظ سے صرف ذکر لسان اور اس سے نماز مراد لیکر یہ استدلال بھی کیا گیا ہو کہ اس میں گویا یہ ہدایت ہو کہ انسان کھڑا ہو کر نماز ادا کرے اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو بیٹھکر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو لیٹ کر۔

قرآن کریم نے عبادت اور حصول علم کو اکٹھا کیا ہے

دوسری صفت مومنوں کی یہ بیان فرمائی ہو کہ وہ آسمانوں اور زمین کی خلق میں فکر کرتے ہیں۔ اور ان کے فکر کا نتیجہ کیا ہوتا ہو کہ وہ پکار اٹھتے ہیں ربنا ما خلقت ھذا باطلا یعنی ہر ایک چیز ایک حقیقت رکھتی ہو اور ایک غرض کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس حصہ میں علوم کی طرف توجہ دلائی ہی کیونکہ جس قدر علوم دنیا میں پیدا ہوتے ہیں وہ حقیقت اشیا میں فکر کرنے سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا رہا کہ جب ایک قوم خدا کے ذکر کی طرف متوجہ ہوئی تو علوم سے غافل ہوگئی اور جب علوم کی طرف جھکی تو خدا سے غافل ہوگئی۔ چنانچہ عیسائیت کی تاریخ میں اس کا بہترین نظارہ نظر آتا ہے۔ جب ابتدا میں ان لوگوں کا اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف میلان ہوا تو ایسی خطرناک رہبانیت اختیار کی کہ علوم میں ترقی کو کفر قرار دیا اور مدت تک جو کوئی ان میں علوم طبعی یا حساب وغیرہ کی طرف توجہ کرتا اسے ملحد و بیدین قرار دیا جاتا اور علوم کو شیطانی خیالات سمجھا جاتا لیکن آج اس قوم کی یہ حالت ہو کہ یہاں تک علوم میں توغل ہو کہ خدا کا نام تک لینا گناہ سمجھا جاتا ہی۔ چونکہ اس سورت میں بالخصوص عیسائیت سے خطاب تھا۔ اس لئے اس کے خاتمہ پر جو صفات مومنوں کی بیان فرمائی ہیں ان میں ان دونوں باتوں کی طرف ایک ہی آیت میں توجہ دلائی ہو کہ ایک طرف ذکر الٰہی سے غافل نہ ہو اور دوسری طرف مخلوق میں تفکر سے کام لو۔ اور حقیقت اشیاء پر غور کرکے علوم کو حاصل کرو۔

اشیاء میں فکر سے خدا کی معرفت و تسبیح ملتی

۵۸۹ آیت کے یہ آخری الفاظ سبحانک فقنا عذاب النار۔ گویا مخلوق الٰہی میں فکر کا نتیجہ ہیں۔ سبحانک میں جیسا ک ۵۴ میں دکھایا جا چکا ہے مقصود اس امر کا ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سب عیوب اور نقصوں سے پاک ہے۔ یہاں یہ لفظ اس لئے لایا گیا کہ جب یہ فرمایا کہ کوئی چیز بھی باطل پیدا نہیں کی گئی اور سب کے اندر کچھ حقیقت اور غرض ہو تو اس دوسرے پہلو سے بچانا بھی ضروری تھا کہ انہی اشیاء کو اور اس مخلوقات کو ہی کامل سمجھکر دوسری غلطی میں انسان پڑ جائے تو اس لئے فرمایا کہ تمام عیوب سے پاک اور تمام نقصوں سے مبرا ایک ذات الٰہی ہے۔ اور یہ

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَآ ۱۹۱ ۱۹۲

ہمارے رب جس کو تو آگ میں داخل کرے یقیناً اسے تو نے رسوا کیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہمارے رب

اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا

بیشک ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کے لئے بلاتا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ پس ہم ایمان لائے ہمارے رب

فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝

سو تو ہماری کمزوریوں کی حفاظت فرما اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہم کو راستبازوں کے ساتھ وفات دے ۵۹۰

اشیاء سب مخلوقیت کی مہر اپنے اوپر رکھتی ہیں پس جب اللہ تعالیٰ ہی سب نقصوں سے پاک اور مبرا ہے تو واجب ہے

دنیا اور آخرت کی آگ

کہ ہر انسان اسی کی طرف رجوع کرے اور اس کا محتاج اپنے آپ کو بنائے اور رب سے پہلے آگ سے بچنے کی دعا سکھائی۔ کیونکہ آگ ہی قیامت کا بدترین عذاب ہے اور آگ یا جلن ہی اس دنیا میں انسان کے سارے امن واطمینان کو برباد کر دیتی ہے۔ دنیا کی کامیابی بھی یہی ہے کہ انسان آگ سے بچے اور آخرت کی بھی یہی ہے کہ دوزخ سے نجات پائے +

نداء

ع۵۹۰ مُنادی۔ ندا سے ہے اور ندا ء آواز کے بلند کرنے اور اس کے ظہور کو کہتے ہیں۔ اور بعض وقت صوت مجرد پر یہ لفظ بولا جاتا ہے خواہ اس سے کچھ معنی مفہوم ہوں یا نہ جیسے الا دعاء و نداء (البقرۃ ۲-۱۷۱) اور بعض وقت مرکب پر جس سے معنی مفہوم ہوں واذ نادٰی ربك موسٰی (الشعراء ۲۶-۱۰) واذا نادیتم الی الصلوٰۃ (المائدۃ ۵-۵۸) اور نادٰی کا صلہ الیٰ بھی آتا ہے اور لِ بھی اور للایمان کے معنی لاجل الایمان ہیں اور ان اٰمنوا اس کی تفسیر ہے

منادی سے مراد

اور منادی یہاں رسول اللہ صلعم کو ہی کہا ہے۔ کیونکہ آپ نے دنیا کو بہت ہی بلند آواز سے پکارا یہاں تک کہ اس بلند آواز کی یادگار اذان میں موجود ہے جس میں اصول دین کی طرف بلایا ہے۔ اور بعض کے نزدیک قرآن شریف مراد ہے۔ اور امام راغب کہتے ہیں کہ منادی میں اشارہ ہے عقل کی طرف اور کتاب کی طرف جو اتاری گئی اور رسول کی طرف جو بھیجا گیا اور تمام نشانات کی طرف جو اللہ تعالیٰ پر ایمان کی طرف دلالت کرنے والے ہیں اور اس کو منادی اس لحاظ کر کہا کہ اس کا ظہور ندا کی طرح ہے +

اَنْ

اَنْ مفسرہ ہے اور اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے پہلے بھی جملہ ہو جس میں قول کے معنی پائے جائیں اور بعد میں بھی جملہ ہو۔ اس صورت میں یہ پہلے جملہ کی تفسیر کرتا ہے +

بارّ۔ برّ

الابرار۔ بارّ کی جمع (برّ سے ہے دیکھو ۲۵۲ اور بارّ سے ابلغ برّ ہے جس کی جمع بررۃ ہو یا یدی سفرۃ کرام بررۃ عبس ۸۰-۱۵-۱۶) (غ)

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ آگ سے بچاؤ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ذریعہ محمد رسول اللہ صلعم ہیں پس آپ پر ایمان لانا پہلی ضرورت ہے۔ اور جب انسان ایمان لاتا ہے تو پھر وہ یہ دعا بھی کرتا ہے کہ اس کے قصوروں کی حفاظت ہوتی رہے اور اس کی برائیاں اور کمزوریاں دور کی جائیں۔ غفر ذنوب کے لئے دیکھو ۲۵۸ سیئات کا لفظ چونکہ تکالیف جسمانی پر بھی بولا گیا ہے اس لئے غفر ذنوب کے ساتھ سیئات کے دور کیا جانے کی دعا میں تکالیف جسمانی کے دور کیا جانے کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ زیادہ وضاحت کے لئے دیکھو ۵۹۳ جہاں اس دعا کی قبولیت کا ذکر ہے +

۱۹۳ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ

ہمارے رب اور ہمیں وہ عطا فرما جس کا وعدہ تونے ہمیں اپنے رسولوں کے ذریعے دیا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا بیشک تو وعدہ

۱۹۴ الْمِيْعَادَ ○ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ

کا خلاف نہیں کرتا[۵۹۱] سو انکے رب نے ان کی دعا کو قبول کیا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنیوالے کے عمل کو ضائع نہ کرونگا مرد ہو یا

اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ

عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو[۵۹۲] سو جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے

وَاُوْذُوْا فِىْ سَبِيْلِىْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا

اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے

دین اور دنیا میں کامیابی کی دعا

۵۹۱ اس سے پہلی آیت میں غفر ذنوب کی دعا تھی اس میں یہ دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے وہ وعدے پورے ہوں جن کا تعلق تصدیق رسل سے ہے یا جو رسولوں کی زبان پر کئے گئے تھے۔ اور اس دعا کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں اٰتنا ما وعدتنا اور دوسرے میں لا تخزنا یوم القیامۃ یہ مقابلہ صاف دکھاتا ہے کہ پہلے وعدے دنیا کے متعلق ہیں۔ اور دوسرے قیامت کے گویا لا تخزنا یوم القیامۃ کہکر یہ بتا دیا ہے کہ پہلے حصہ دعا کا مطلب بھی یہی ہے کہ دنیا میں ذلیل اور رسوا نہ ہوں بلکہ نصرت الٰہی کے ساتھ منصور و مظفر ہوں۔ اور سورۃ بقرہ میں ایسی ہی دعا پر خاتمہ کرکے صاف الفاظ میں فانصرنا علی القوم الکافرین کہنا ہے۔

وعدہ کیساتھ دعا کی ضرورت

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک امر کا وعدہ ہو تو پھر اس کے لئے دعا کی کیا حاجت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے وعدے جو نصرت وغیرہ کے متعلق ہوں ان کا تعلق اعمال سے ہوتا ہے۔ نہ خاص انسانوں سے پس اگر اعمال صالحہ اس حد کو نہ پہنچیں یا کوئی بدعملیاں درمیان میں روک ہو جائیں تو ان وعدوں کا ایفا بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے مومن کی دعا ان اسباب کے پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہے جن پر اس نصرت کا آنا لازم ہے اور ان اسباب کو پیدا ہونے سے روکتی ہے جو اس کے لئے رکاوٹ کا موجب ہوسکتے ہیں ◆

منْ

۵۹۲ بعضکم من بعض سے یا تو یہ مراد ہے کہ تم سب ایک ہی اصل سے ہو۔ مرد سے عورت اور عورت سے مرد پیدا ہوتا ہے اور یا یہ مراد ہے کہ تم مرد اور عورتیں سب ایک ہی سیرت اور ایک ہی خلق پر ہو جیسے حدیث میں آتا ہے سلمان منا اھل البیت سلمان ہم اہل بیت میں سے ہے یعنی ہمارے خلق اور سیرت پر ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے من غشنا فلیس منا جو ہم سے کھوٹ کرے وہ ہم میں سے نہیں یا اتحاد اور اتصال اسلامی کا ذکر کیا ہے کہ تم سب ایک ہی ہو یعنی تمہارے تعلقات یگانگت کے ہیں۔

دعا کیساتھ عمل کی ضرورت

سورۃ بقرہ کا خاتمہ بھی ایک دعا پر کیا تھا۔ اور یہاں بھی دعا پر خاتمہ ہے۔ مگر یہاں ساتھ قبولیت دعا کی بھی بشارت دیدی ہے یعنی یہ تمہاری دعا جو ہم نے خود تمہیں سکھائی ہے ضائع نہیں جائے گی بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ قبول کرچکا ہے۔ اور وہ قبولیت کا جواب جو مومنوں کی اس دعا پر دیا گیا یہ ہے کہ میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو خواہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کروں گا یعنی انکے عمل کو بار آور کیا جائیگا اور انکا مقصود و مطلوب ان کو دیا جائیگا۔ یہ قبولیت دعا ہے۔ کہ کام کروگے تو اجر پاؤگے۔ صرف دعا کوئی چیز نہیں جبتک کہ اس کے ساتھ عمل نہیں۔ مسلمانوں نے دعا کے مسئلہ کو کس قدر غلط سمجھ رکھا ہے۔

لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا

میں ضرور ان کی تکلیفوں کو ان سے دور کر دونگا اور میں ضرور انکو باغوں میں داخل کرونگا جن کے نیچے نہریں

الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝

بہتی ہیں یہ اللہ کی طرف سے بدلہ ہے اور اللہ ہی کے پاس اچھا بدلہ ہے ۵۹۳

بعض تو قبولیت دعا کے ہی منکر ہو گئے بعض افراط کی طرف چلے گئے یعنی دعا کی طرف جھکے تو اسباب سے کام لینے کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر یہ قرآن کی تعلیم نہ تھی +

سیئۃ اور حسنۃ

۵۹۳ سیّاٰتکم۔ سیّات۔ سیئۃ کی جمع ہے اور گو سیئۃ قبیح فعل کو بھی کہتے ہیں جو نیکی کے مقابل ہے مگر حسنۃ اور سیئۃ دونوں کا استعمال ایک اور معنی میں بھی ہوتا ہے یعنی وہ چیز جس کو طبیعت پسند یا ناپسند کرتی ہے جیسے فرمایا ان تمسسکم حسنۃ تسؤھم وان تصبکم سیئۃ یفرحوا بہا (اٰل عمرٰن ۳-۱۱۹) ایسا ہی ذھب السیئات عنی (ھود ۱۱-۱۰) میں بھی سیّات سے تکالیف جسمانی مراد ہیں دیکھو ۱۰۵ +

وہ عمل جن پر کامیابی ملتی ہے

پہلے حصہ آیت میں فرمایا تھا کہ عمل کرنے والوں کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا۔ اب اس عمل کی کچھ تفصیل فرمائی ہے پہلا کام جو ان لوگوں نے کیا وہ ہجرت ہے۔ چونکہ وطن سے نکالے جانے کا ذکر بعد میں آتا ہے اس لئے یہاں مراد صرف ترک ما نہی اللہ عنہ ہے اسکے بعد یہ کہ اپنے گھروں سے نکالے گئے اور رضائے الٰہی کو انہوں نے اس قدر مقدم کیا کہ وطن کی پروا بھی نہیں کی۔ پھر گھروں سے نکال دینے کے بعد بھی خدا کی راہ میں ان کو ایذا پہنچائی گئی اوذوا فی سبیلی میں وہ ایذائیں مراد ہیں جو بعد ہجرت کے ان کو برداشت کرنی پڑیں۔ اور ان ایذاؤں کی انتہا یہ ہوئی کہ ان کے اوپر چڑھائی کی گئی تاکہ تلوار کے ساتھ ان کو نابود کیا جائے اس لئے ان کو بھی بالمقابل جنگ کرنی پڑی جس کا ذکر لفظ قٰتلوا میں کیا ہے۔ پھر ان جنگوں کے اندر ان میں سے لوگ مارے بھی جاتے ہیں۔ اس لئے وقتلوا پر ختم کیا۔ گو سارے نہ مارے جائیں مگر ایک قوم نے جب اپنے سر خدا کی راہ میں دیدیئے تو جتنے بھی ان میں سے بچ گئیں سبھی کو کہا جاتے گا کہ انہوں نے اپنے سر کٹوا دیئے یہ وہ عمل ہیں جن پر خدا کی طرف سے اجر ملتا ہے +

مومنوں سے وعدہ

یہ تو ان کے عمل ہوئے۔ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان اعمال پر کیا وعدہ ہے اول یہ کہ میں ان کی تکلیفوں کو ضرور ان سے دور کروں گا۔ یہاں سیئات سے مراد وہی تکلیفیں معلوم ہوتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا گو لفظ ایسا اختیار کیا ہے جس میں بدیوں اور گناہوں کو دور کر کے ایک پاکیزہ بہشتی زندگی عطا کرنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اور دوسرا وعدہ قبولیت دعا پر یہ ہے کہ ان کو جنات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور یہ وعدہ گو اُخروی زندگی کے متعلق ہے مگر ہر ایک وعدہ کا کچھ نہ کچھ رنگ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس دنیا میں بھی دکھا دیا ہے اسلئے جس طرح سیئات کے دور کیا جانے میں دونوں طرف اشارہ ہے قرین قیاس ہے کہ جنت آخرت کے وعدہ میں اشارہ کامیابی اور فتحمندی کی طرف بھی ہے۔ اور الفاظ قرآنی اس دنیوی وعدہ پر یوں صفائی سے صادق بھی آتے ہیں کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں صاف طور پر دجلہ (جس کی جگہ حدیث میں لفظ نیل ہے) اور فرات جیحون اور سیحون کو انہار الجنۃ قرار دیا ہے۔ پس اُخروی جنت کے وعدہ کے ساتھ اس دنیا میں بھی فتوحات کا وعدہ مخفی ہے۔ دو دفعہ لفظ ثواب کے لانے میں دونوں وعدوں کیطرف اشارہ ہے۔

گناہوں سے پاک کرنے والی چیزیں

یہ بھی قابل غور امر ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے کس قدر امور کو گناہوں سے پاک کرنے کیلئے ضروری قرار دیا ہے۔ پہلے تو

۱۹۶-۱۹۵ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ۚ ثُمَّ

جو کافر ہیں ان کا ملکوں میں تصرف تجھے دھوکہ میں نہ ڈالے ۵۹۴ تھوڑا سا سامان ہے پھر

۱۹۷ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا

انکا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے لیکن جنہوں نے اپنے رب کا تقویٰ کیا ان کیلئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں

الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ ۝ الثلثة

بہتی ہیں انہی میں رہینگے یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے ۵۹۵ اور جو اللہ کے پاس ہے وہ راستبازوں کیلئے بہت اچھا ہے

ایک صلیب مسیح کو لئے پھرتے ہیں کہ اس سے ساری دنیا گناہوں سے پاک ہو گئی۔ مگر یہاں ایک ایک مسلمان صلیب سے بڑھ کر مصیبت اٹھاتا ہے۔ منہیات کو ترک کرتا ہے۔ وطن کو چھوڑتا ہے۔ ایذا دیا جاتا ہے۔ تلوار سے اس کی جان لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور حق یہی ہے کہ ایک کی صلیب سے دوسرا نہیں بچتا بلکہ ہر شخص کو بجائے خود صلیب سے بڑھکر مصائب اٹھانی ضروری ہیں +

تقلب

۵۹۴ تقلب۔ قَلَب سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا ایک طرف سے دوسری طرف پھیرنا اور تقلب کے معنی تصرف ہیں (غ)، اور تَقَلَّبَ فِي الْأُمُورِ والبِلَادِ کے معنی دیتے ہیں تَصَرَّفَ فِيهَا یعنی ان میں تصرف حاصل کیا (ل) +

عیسائیوں کے تصرف کی پیشگوئی

یہاں الذین کفروا سے مراد مفسرین نے عموماً مشرکین مکہ کو لیا ہے اور پھر ملکوں میں ان کے تقلب سے مراد انکی تجارتوں وغیرہ کا ہونا لیا ہے۔ عمومیت الفاظ میں کفار قریش بھی شامل ہو سکتے ہیں مگر یہاں ذکر اہل کتاب کا ہو رہا ہے۔ پچھلے رکوع کی آخری آیات میں انہی کا ذکر تھا واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتاب اب آگے بھی انہیں کا ذکر آتا ہے وان من اھل الکتاب لمن یومن باللہ بلکہ سیاق عبارت صاف بتاتا ہے کہ یہاں کفار سے مراد اہل کتاب ہی ہیں کیونکہ پہلے ان کافروں کا ذکر کر کے پھر یہ کہہ کر کہ متقیوں کیلئے یہ اجر ہے۔ یوں شروع کیا ہے وان من اھل الکتاب۔ جہاں واؤ عاطفہ بتاتی ہے کہ انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کو ابھی والذین کفروا کہا تھا۔ یہودیوں کا تصرف تو نہ اس زمانہ میں تھا نہ بعد میں ہو سکتا تھا کیونکہ ذلت و محکومیت کی پیش گوئی ان کے لئے ہو چکی تھی پس ظاہر ہے کہ اس سے مراد عیسائیوں کا تصرف ہے۔ اور یہ آیندہ کیلئے ایک پیشگوئی ہے کہ کسی زمانہ میں تمام ممالک میں ان لوگوں کا تصرف ہو جائے گا۔ اور یہ اس کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا وھم من کل حدب ینسلون (الانبیاء ۲۱-۹۶) وہ ہر ایک بلند مقام سے نکل پڑینگے یعنی تمام بلندیاں خواہ بلحاظ مکان ہوں یا بلحاظ مرتبہ ان کے تصرف میں آجائینگی اور جب ان کے تصرفات عالم کا نقشہ کھینچا تو ساتھ ہی ایک تسلی بھی دیدی کہ اے مخاطب ان کا ملکوں پر قابض اور متصرف ہو جانا تم کو یہ دھوکہ نہ دے کہ اس عظیم الشان تصرف کے سامنے اب اسلام نہیں ٹھہر سکتا۔ بلکہ یہ چند روزہ سامان ہے +

نُزُل

۵۹۵۔ نزل۔ مَا يُعَدُّ لِلنَّازِلِ مِنَ الزَّادِ (غ) یعنی وہ زاد یا سامان جو نئے مہمان کیلئے تیار کیا جائے +

یہاں جنات اور نہروں کو متقیوں کے لئے نزل کہنے کی وجہ سے جو مہمان کیلئے پہلا پیشکش ہوتا ہے۔ یہ سوال پیدا ہو ہے کہ اگر جنات یعنی خود بہشت ہی نزل یعنی مہمانی کا پہلا پیشکش ہیں تو پھر اصل نعماء جو ملنی چاہئیں کیا اور ہیں۔ اس لئے بعض نے ان اصل نعماء کو ما عند اللہ کا مقام یا عندیت یا رویت الٰہی قرار دیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنات کے وعدہ میں دو وعدے مضمر ہیں ایک اس دنیا میں فتوحات کا وعدہ اور ایک آخرت کی جنت کا وعدہ اس لئے نزلا من عند اللہ ہیں

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ ۱۹۸

اور اہل کتاب میں سے وہ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر جو تمہاری طرف اُتارا گیا اور اس پر جو انکی طرف اُتارا گیا اللہ کے

لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط

سامنے عاجزی کرتے ہوئے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی قیمت نہیں لیتے انہی کیلئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے

اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۱۹۹

بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہی ۵۹۶ اے لوگو جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور مقابلہ میں بڑھکر صبر دکھاؤ ۵۹۷ اور محافظت کرو ۵۹۸

اول الذکر کی طرف اشارہ کیا ہو وما عند اللہ خیر للابرار میں موخر الذکر کی طرف +

عیسائیوں کے اسلام لانے کی پیشگوئی

۵۹۶ اس آیت میں اہل کتاب میں سے بعض کے ایمان لانے کا ذکر ہی مفسرین نے عبد اللہ بن سلام اور آپکے ساتھیوں کی طرف جو یہود میں سے تھے۔ یا چالیس اہل نجران کی طرف اور بتیس اہل حبش اور آٹھ اہل روم کی طرف جو عیسوی دین پر تھے اشارہ سمجھا ہی اور سب سے زیادہ مشہور روایت یہ ہی کہ نجاشی کی طرف اشارہ ہی جس کا غائبانہ جنازہ بھی نبی کریم صلعم نے پڑھا مگر میرے نزدیک جیسے لتسمعن من الذین اوتوا الکتاب میں عیسائیوں کے آیندہ زمانے میں اسلام کے خلاف بدزبانی کی اور کافروں کے تقلب فی البلاد میں عیسائیوں کے دنیا میں تصرف کی پیشگوئی ہے۔ اسی طرح اب یہ بشارت سنادی ہی کہ ہمیشہ حالت یکساں نہ رہیگی بلکہ اہل کتاب کا ایک حصہ آخر قرآن کریم پر ایمان لائیگا اور اس کی صداقت کو تسلیم کرلیگا۔ ایسے اشارات قرآن کریم میں بہت ہیں جن میں نصاریٰ کے آنحضرت صلعم پر ایمان لانے کی توقع دلائی گئی ہی چنانچہ یہ جو فرمایا لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین اٰمنوا الیھود والذین اشرکوا ولتجدن اقربھم مودۃ للذین اٰمنوا الذین قالوا انا نصاریٰ (المائدۃ ۵ - ۸۲) اس میں بھی یہی اشارہ ہو کہ یہودیوں میں سے بہت کم لوگ ایمان لائینگے مگر عیسائیوں میں سے بہت اسلام لائینگے پس ان سابقین کے ساتھ ہم اس آیت میں ان تمام لوگوں کو بھی شامل کرسکتے ہیں جو وقتاً فوقتاً نصرانیت کے عقیدۂ باطل کو ترک کرکے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کرتے رہے ہیں۔ اور بالخصوص ان لوگوں کو جو ایک معقول تعداد میں اس زمانہ میں اسلام میں شامل ہو رہے ہیں اور جو آیندہ شامل ہونگے +

مصابرۃ

۵۹۷ صابروا۔ صبر سے مفاعلہ ہو راغب نے اس کے معنی کئے ہیں کہ اپنی خواہشات سے مجاہدہ کرو کیونکہ مصابرۃ میں مقابلہ پایا جاتا ہی اور لسان العرب میں اصبروا کے معنی کئے ہیں اثبتوا علیٰ دینکم اپنے دین پر مضبوط رہو اور صابروا کے معنی کئے ہیں صابروا اعداء کم فی الجہاد یعنی اپنے دشمنوں کے ساتھ جہاد میں ان سے بڑھ کر صبر دکھاؤ۔ بہرحال صبر میں تینوں قسم کا صبر شامل ہی جس کا ذکر حدیث میں ہی یعنی صبر فی المصیبۃ۔ صبر علی الطاعۃ۔ صبر عن المعصیۃ اور مصابرۃ سے مراد مقابلہ میں بڑھکر صبر دکھانا ہی خواہ حرص وہوا کے مقابلہ میں ہو یا دشمن کے مقابلہ میں +

ربط۔ رباط

۵۹۸ رابطوا۔ ربط سے ہے اور ربط الفرس کے معنی ہیں گھوڑے کو حفاظت کیلئے مکان پر باندھنا۔ اور رباط اس مکان کو کہتے ہیں جس میں محافظین کا قیام ہو۔ مفردات میں ہو کہ مرابطۃ جس سے رابطوا ہو دو طرح پر ہی ایک حدود پر گھوڑوں کا باندھنا یعنی دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رہنا۔ اور دوسری مرابطۃ انسان کے نفس کے متعلق ہی گویا نفس کو حدود پر کھڑا کیا گیا ہی تاکہ وہ انسان کی حفاظت کرے اور نبی کریم صلعم سے اسکے معنی میں انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم کامیاب ہو ۵۹۷

بھی مروی ہے یعنی ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار۔ لسان العرب میں بھی دونوں معنی رباط یا مرابطة کے ہیں یعنی ایک دشمن کی حد پر قایم رہنا۔ اور دوسرا ایک امر کی محافظت کرنا ؞

بدی اور دشمن دونوں کے مقابلہ کی ایک ہی وقت میں تیاری کی ضرورت

یہاں فلاح کیلئے تین باتیں بتائی ہیں صبر۔ مصابرہ۔ رباط ان تینوں الفاظ میں اگر ایک طرف نیکی پر قایم ہونے اور باہم اچھا معاملہ کرنے کی ہدایت ہے تو دوسری طرف بدی کے مقابلہ اور دشمن کے مقابل میں تیار رہنے کی ہدایت ہے۔ صبر تو یہ ہے کہ نیکی پر قایم ہو جائے اور معصیت سے رُک جائے یا جو مشکلات اور مصائب قضا و قدر سے یا دشمن کی طرف سے پیش آئیں اُن کو برداشت کرے اور اُنکے نیچے ہمت کو نہ ہارے مصابرۃ ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرنا یا اپنی خواہشات کے ساتھ جہاد کرنا۔ یا اپنوں اور قریبیوں اور ہمسایوں سے جو دکھ پیش آئیں ان کو برداشت کرنا۔ یا مصائب اور تکلیفوں کی برداشت میں اپنے دشمن سے فوقیت لیجانا ہے۔ گویا دشمن کے مقابلہ میں اس سے بڑھکر مصائب کو برداشت کرنے کے عادی بنو۔ اور رباط سے مراد لزوم اور ثبات ہے یعنی نیکیوں کے کرنے پر پابندی سے رُکنے یا مصائب و مکارہ کے اُٹھانے میں دوام اور مضبوطی اختیار کی جائے اور دشمن کے مقابلہ کیلئے ہر وقت تیار رہے۔ اور ایک لمحہ بھی اُس کی طرف سے غافل نہو۔ دشمن سے مراد ملکی دشمن ہی نہیں۔ جو لوگ دین پر حملہ کرتے ہیں ان کے مقابل میں دلائل اور جواب سے اسی طرح تیار رہنا چاہئے۔ مگر افسوس کہ مسلمان اس قدر غفلت کی نیند سو رہے ہیں کہ ملک اور حکومت تو ہاتھ سے نکلے تھے۔ اب انکے مذہب پر حملہ پر حملہ ہو رہا ہے کتابوں پر کتابیں نکل رہی ہیں اور وہ تاریک کوٹھڑیوں کے اندر آنکھیں بند کئے ہوئے یہی سمجھ رہے ہیں کہ کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ تیاری کیسی۔ یہاں تو ایسی غفلت اور نیند میں پڑے ہیں کہ موت قبول کرنے کو راضی ہیں مگر بیدار ہونا نہیں چاہتے۔ افسوس کہ جس قدر ہوشیار اور چوکس رہنے کی تعلیم اس قوم کو دی گئی تھی اسی قدر زیادہ غفلت میں یہ مبتلا ہو گئے۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جبتک کہ اصول قرآنی کو محکم نہ پکڑیں ؞

۵۹۷ سورت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا واتقوا اللّٰہ لعلکم تفلحون ۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ جیسا کہ میں نے اس سورت کی تمہید میں کہا تھا یہ سورۃ اور سورۃ بقرہ دونوں ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔ اس لئے جن الفاظ سے سورۃ بقرہ کی ابتدا کی تھی انہی پر آل عمران کا خاتمہ کیا ہے کیونکہ وہاں بھی ھدی للمتقین کہکر اور یہ بتا کر کہ متقی کون ہیں فرمایا تھا اولٓئک ھم المفلحون یہی کامیاب ہونگے اب اسی کو آخر میں بیان کیا ہے فلاح۔ نجات کامیابی سب تقویٰ میں ہے ؞

تقوی اللہ

چونکہ صبر اور مصابرہ اور رباط میں صرف مصائب اور دشمن کا مقابلہ بھی مراد تھا اس لئے یہ بتانے کو کہ مسلمان کیلئے صرف مقابلہ کر لینا ہی کافی نہیں۔ آخر پر تقوی اللہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ بغیر تقویٰ اختیار کئے اگر دشمن پر غالب بھی آ گئے تو اصل غرض زندگی کی پھر بھی حاصل نہ ہوئی وہ اصل غرض تقوی اللہ ہے جس کی طرف بار بار قرآن شریف نے توجہ دلائی ہے۔ اور حدیثوں میں بھی ہے یہانتک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو عامل مقرر کرتے وقت بھی تقوی اللہ کی نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ معاذ کو جب آپنے یمن پر حاکم کر کے بھیجا تو اس کو ان الفاظ نصیحت کی اتق اللّٰہ حیثما کنت واتبع السیئة الحسنة تمحھا وخالق الناس بخلق حسن (ت) اللہ کا تقویٰ کرو جہاں کہیں تم ہو اور بدی کا پیچھا نیکی کے ساتھ کرو وہ اس کو مٹا دیگی اور لوگوں کے ساتھ اچھے خلق سے پیش آؤ ؞

سُوْرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّسَبْعٌ

النساء نام کی وجہ

نام - اس سورت کا نام النساء ہی کیونکہ اس میں عورتوں کے حقوق اور معاشرت اور خانہ داری کے متعلق امور کا ذکر ہی جو امور خانہ داری سے تعلق رکھتے ہیں جس قدر تفصیل کے ساتھ اس سورت میں ان کا ذکر ہے۔ دوسری کسی سورت میں نہیں اور خود قرآن شریف نے جس قدر ان امور کو ضروری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہی اور جس قدر عورتوں کے حقوق پر زور دیا ہی دوسری کسی کتاب میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں - اس سورۃ میں ۲۴ رکوع اور ۱۷۷ آیات ہیں ۞

خلاصہ مضمون

خلاصہ مضمون - اس سورت کا خلاصہ مضمون تین بڑے بڑے عنوانوں کے نیچے آتا ہی یعنی یتیموں اور عورتوں کے حقوق اور ان سے تعلقات۔ منافقین یہودی - ان تینوں مضامین کے باہمی ربط کی کنجی پچھلی سورت کے مضمون کے آخری حصہ سے ملتی ہی۔ جہاں جنگ اُحد کا ذکر تھا۔ جنگ اُحد سے جو بڑے بڑے امور پیدا ہوئے وہ یہ تھے کہ اول بہت سے مسلمان مارے گئے اور اس طرح پر بہت سے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں رہ گئیں اس لئے یتامیٰ اور عورتوں کے حقوق پر بحث کی ضرورت پیش آئی۔ دوم جنگ اُحد میں منافق الگ ہوگئے اور وہاں بھی کچھ ذکر ان کا آیا تھا۔ یہاں زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہی۔ سوم اس جنگ نے یہودیوں کی چھپی ہوئی خباثتوں اور ان کی عداوت قلبی کو ظاہر کردیا۔ اسی لئے سورۃ آل عمران کے آخر پر بھی ان کا کچھ ذکر آیا تھا۔ اس سورت میں ان کی فتنہ پردازیوں کا کسی قدر کھول کر ذکر کیا ہی اور یہ بتایا ہی کہ یہ پہلے بھی راستبازوں سے اسی طرح شرارتیں کرتے رہی۔ اسی اثنا میں حضرت مسیح کے ساتھ جو انہوں نے کیا اس کا ذکر کیا ہی اور پھر بالآخر ان کے مقابل پر عیسائیوں کے غلو کا ذکر کیا ہی ۞

زیادہ تفصیل کیلئے رکوع وار خلاصہ مضمون دیا جاتا ہی۔ پہلے رکوع میں یتامیٰ کے حقوق اور ولیوں کی ذمہ داریوں کا ذکر ہی۔ اور اسی اثنا میں عورتوں کے حقوق کی طرف بھی کچھ توجہ دلائی ہی کیونکہ ان کے کمزور اور ضعیف ہونے کی وجہ سے ان کے حقوق بھی یتامیٰ کی طرح پاؤں تلے روندے جاتے تھے۔ دوسرے رکوع میں حقوق وراثت پر مفصل ہدایات دیں اور اولاد والدین۔ میاں بی بی۔ بھائی بہن سب کے لئے حصے مقرر کئے۔ تیسرے رکوع میں یہ بیان فرمایا کہ عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے۔ چوتھے رکوع میں ان عورتوں کا ذکر فرمایا جن کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہی۔ پانچویں رکوع میں کچھ عام نصائح بیان فرماکر اور یہ بتاکر کہ ایک دوسرے کے اموال کو ناحق نہ کھاؤ جیسا کہ عرب میں عورتوں اور بچوں کے مال کو کھاجاتے تھے۔ فرمایا کہ عورتوں کے اپنے مال پر وہی حقوق ہیں جو مردوں کے اپنے مال پر ہیں۔ چھٹے رکوع میں میاں بی بی کے اختلاف کی صورت کا ذکر کرکے احسان کی تعلیم دی بخل سے روکا۔ اتفاق کی طرف توجہ دلائی اور رسول کی نافرمانی سے ڈرایا۔ ساتویں رکوع میں اصل غرض کی طرف توجہ دلائی یعنی تزکیہ نفس۔ اور چونکہ نماز تزکیہ نفس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس لئے نماز اور وضو اور تیمم کے متعلق کچھ امور بیان فرمائے۔ یہودی جن ناپاکیوں میں مبتلا ہوگئے تھے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرچشمہ قدوسیت یعنی ذات الٰہی سے دور پھینکے گئے اُن سے ڈرایا۔ اور شرک کے خطرناک نتائج سے بچنے کیلئے ہدایت فرمائی۔ آٹھویں رکوع میں بتایا کہ یہودی کس طرح خدا کے احکام سے انحراف کرکے شیطان کے پیچھے لگ گئے۔ اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ اپنے معاملات کو نااہلوں کے سپرد مت کرو۔ اور اللہ اور رسول اور اولوا الامر کی اطاعت کرو۔ ہاں اولوا الامر سے اختلاف ہو تو پھر اللہ اور رسول کے حکم پر عمل کرو۔ نویں رکوع میں یہ بتایا کہ وہ لوگ جو رسول کے فیصلہ کی طرف نہیں آتے اور رسول اللہ کی اطاعت نہیں کرتے منافق ہیں۔ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے اعلیٰ سے اعلیٰ انعام

وسبعون اٰیۃ و اربع و عشرون رکوعًا

پاتے ہیں ۔ اور ان کو نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین کی معیت عطا ہوتی ہے ۔ دسویں رکوع میں یہ بیان فرمایا کہ حفاظت کیلئے جنگ کی ضرورت ہے ۔ مگر منافق اپنے آرام اور آسایش کو مدنظر رکھکر جنگ میں شامل نہیں ہوتے ۔ حالانکہ بہت سے کمزور مرد اور عورتیں اور بچے کفار کے ہاتھ سے دکھ اٹھا رہے ہیں ۔ گیارھویں رکوع میں بیان فرمایا کہ منافق مصائب سے بچنے کے لئے جنگ سے دل چراتے ہیں ۔ اور پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف مشورے کرتے ہیں اور مسلمانوں میں گھبراہٹ پھیلانا چاہتے ہیں اور فرمایا کہ نبی تو اکیلا بھی جنگ کے لئے مکلف ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ آخر اس جنگ کو روک دے گا ۔ بارھویں رکوع میں بتایا کہ منافقوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے ۔ تیرھویں رکوع میں مومن کو قتل کرنے کی سزا بیان فرمائی ۔ اور مومنوں کو ہدایت کی کہ ہر ایک شخص کو اپنا دشمن نہ سمجھ لیا کریں ۔ ہاں خدا کی راہ میں جہاد کی ضرورت بیشک ہے ۔ اور مجاہد کا مرتبہ بیٹھ رہنے والے سے بہت بڑھکر ہے ۔ چودھویں رکوع میں ان کمزور لوگوں کا ذکر کیا جو ابھی تک ہجرت نہیں کر سکے تھے ۔ پندرھویں رکوع میں بتایا کہ جنگ درپیش آگئی ہے ۔ مگر نماز (جو اصل غرض ہے) اسے کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہئے ۔ اور حالت جنگ میں بھی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنی چاہئے ۔ سولھویں اور سترھویں رکوع میں منافقوں کے خفیہ مشوروں کا ذکر کیا ۔ اٹھارھویں رکوع میں شرک کے ہر ایک پہلو سے بچنے کی تاکید فرمائی ۔ اُنیسویں رکوع میں پھر یتامیٰ اور عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی ۔ بیسویں میں بتایا کہ اپنا ہو یا غیر ہر ایک کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو ۔ اور بتایا کہ جو ایمان لاکر پھر کافر ہو جاتے ہیں ۔ یعنی منافق وہ سرسبز نہیں ہونگے ۔ اکیسویں رکوع میں منافقوں کی سزا کا ذکر کیا ۔ بائیسویں میں یہودیوں کی غلطیوں اور شرارتوں کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ کس طرح انہوں نے ایک پاکدامن عورت مریم پر بہتان باندھے ۔ اور اس کے بیٹے مسیح رسول اللہ کو صلیب کی سزا دلا کر ملعون ثابت کرنا چاہا ۔ مگر خدا نے اس برگزیدہ انسان کو صلیب کی موت سے بچا لیا اور اپنے قرب کے مراتب عطا فرمائے پھر ان کی دوسری شرارتوں کا ذکر کیا ۔ تیئیسویں رکوع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی طرف توجہ دلائی اور اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے نبیوں سے ایک ہی طرح کلام کرتا رہا ہے ۔ اور جس طرح اس نے پہلوں سے کلام کرکے ان کو اپنی رضا کی راہوں پر خبردار کیا ۔ اسی طرح اب اس نے اپنی رضا کی راہیں محمد رسول اللہ کے ذریعے سے کھول دی ہیں اور اہل کتاب کو بتایا کہ اگر ایک طرف یہودی مسیح کو دکھ دینے کی وجہ سے قابل الزام ٹھہرے تو دوسری طرف عیسائیوں نے بھی غلو کرکے ایک انسان کو خدا بنا لیا ۔ چوبیسویں رکوع میں بتایا کہ مسیح خدا کا ایک بندہ ہے اور اسی میں اس کی شان ہے ۔ اور آخر سورت کا خاتمہ پھر وراثت کے ایک مسئلہ پر کیا جس میں یہ بتانا مقصود تھا ۔ کہ اب نبوت کی وراثت بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسمٰعیل کو پہنچی ہے ۔

تعلق ۔ سورۃ بقرہ اور آل عمران میں اصل غرض اس بات کا بتانا تھا کہ مسلمان کس طرح پر ایک کامیاب اور زندہ قوم بن سکتے ہیں ۔ اس کے بعد اندرونی معاملات قومی پیدایات ضروری تھیں اور چونکہ قوم کی زندگی کی بنیاد میاں بی بی کے تعلقات پر ہے اسلئے ترتیب قرآنی میں پہلی دونوں سورتوں کے بعد اسی بات کی ضرورت تھی جس کا ذکر اس سورت میں یعنی النساء میں پایا جاتا ہے ۔ معاشرت کے صحیح اصول کو جو پایہ قوم کی زندگی میں حاصل ہے علاوہ اس کے کہ خود واقعات عالم اس کی شہادت دیتے ہیں کیونکہ قوم کے وسیع نظام میں گھر بمنزلہ ایک اکائی کے ہے ۔

تعلق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے نام سے جو بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنیوالا ہے

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی طرف توجہ دلائی ہو جب فرمایا خیرکم خیرکم لاھلہ گویا بتا دیا کہ اخلاق انسانی جو انسان کے مختلف تعلقات میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کا معیار گھر کے تعلقات یعنی بی بی سے سلوک ہے اور ان کی ابتدا گھر سے ہوتی ہو +

ایک اور رنگ میں اس سورت کا ربط پہلی سورت سے اس سے ظاہر ہو کہ پچھلی سورت کے آخری حصہ میں جنگ اُحد کے واقعات کا ذکر تھا۔ اور اس سورت میں انہی امور کا ذکر ہو جو جنگ اُحد سے پیدا ہوئے جیسا کہ خلاصہ مضمون سورت ہذا کی ابتدا میں دکھایا گیا ہو پس طبعی ترتیب یہی تھی کہ سورت النساء سورت آل عمران کے بعد رکھی جاتی +

تاریخ نزول

زمانہ نزول۔ جیسا کہ اوپر کے نوٹوں سے ظاہر ہو۔ اس سورت کا نزول جنگ اُحد کے بعد کا ہو اور بیشتر حصہ کا نزول چوتھے سال ہجرت میں ہوا لیکن خاص خاص آیات کا نزول پیچھے کا بھی معلوم ہوتا ہو +

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت موجود ہو کہ سورۃ النساء اس وقت نازل ہوئی جب آپ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تھیں۔ پس اس کے مدنی ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ ایک آیت کے متعلق البتہ یہ کہا جاتا ہو کہ یہ مکی ہو یعنی ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلہا۔ اس آیت کا شان نزول واقعہ مفتاح کعبہ ہے یعنی فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا عثمان کو خانہ کعبہ کی کنجی دینا جس کے قبضہ میں پہلے سے یہ کنجی چلی آتی تھی لیکن اس لحاظ سے بھی یعنی اگر اس آیت کو فتح مکہ کے وقت کا نازل شدہ مانا جائے یہ آیت مکی نہیں کہلائے گی کیونکہ اصطلاح میں جو کچھ بعد ہجرت نازل ہوا وہ سب مدنی ہو۔ خواہ وہ مکہ میں ہی نازل ہوا ہو۔ اصل تقسیم قبل ہجرت اور بعد ہجرت کی ہو کیونکہ ان دونوں زمانوں کی نازل شدہ وحی میں ایک بیّن فرق معلوم ہوتا ہو۔ قبل ہجرت زیادہ تر اصولی تعلیم ہو یعنی توحید رسالت معاد وغیرہ پر بحث اور بعد ہجرت تفصیلات شریعت پر زیادہ زور ہو کیونکہ تفصیلات شریعت کی ضرورت بعد ہجرت پیش آئی جب مسلمان ایک قوم کے رنگ میں الگ ہو کر رہنے لگے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عموماً لمبی سورتوں کا نزول ایک لمبے زمانہ پر ممتد رہا ہے اور یہ بات مدنی سورتوں کے متعلق بالخصوص صحیح ہے کیونکہ تفصیلات شریعت وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہیں۔ اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ جس طرح مثلاً سورۃ بقرہ میں جو پہلے دوسرے سال ہجرت کی سورت ہے بعض آیات بہت پچھلے زمانہ کی ہیں جیسے آیت ربا۔ اسی طرح اس سورت میں بھی بعض آیات بہت پچھلے زمانہ کی ہوں۔ اور سورۃ احزاب کی بعض آیات کو جن میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں کا ذکر ہے اس سورت کی آیت تعدد ازواج کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت تعدد ازواج پچھلے زمانہ کی ہو۔ یعنی غالباً فتح مکہ کے قریب زمانہ کی ہو اس پر مفصل بحث دوسری جگہ آئے گی +

۱ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

ع ۱ — یتیموں کی خبر گیری

اے لوگو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا ۵۹۸

نفس

۵۹۸ نفس۔ اس کے کئی معنی کئے ہیں۔ روح جیسے اخرجوا انفسکم (الانعام ۶-۹۴) اور نفس ناطقہ یا وہ چیز جو انسان کو حیوانات سے متمیز کرتی ہو ما یکون بہ التمییز (ل) اس کی مثال دی ہے اللہ یتوفی الانفس حین موتہا (الزمر ۳۹-۴۲) اور بعض نے روح اور نفس میں یہ فرق کیا ہے کہ روح وہ ہے جس سے زندگی ہے اور نفس وہ ہے جس سے عقل ہے۔ اور زجاج کا قول ہے کہ ہر انسان کے دو نفس ہیں یعنی حیات اور تمیز اور نیند میں یہی موخر الذکر نفس قبض کیا جاتا ہے (ل) اور نفس سے مراد سارا انسان بھی لیا جاتا ہے۔ جیسے ان تقول نفس یحسرتی (الزمر ۳۹-۵۶) اور کسی چیز کا نفس اسکی ذات ہے۔ اور کسی چیز کے عین اور اس کے جوہر اور اس کی کنہ کو بھی نفس کہتے ہیں (ل) +

نفس واحدۃ سے مراد

نفس واحدۃ سے کیا مراد ہے۔ عموماً یہاں اس سے حضرت آدم ابوالبشر کو مراد لیا گیا ہے۔ مگر دوسری جگہ جہاں یہی لفظ استعمال ہوئے ہیں ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منہا زوجہا لیسکن الیہا (الاعراف ۷-۱۸۹) شخص کا ذکر نہیں بلکہ جنس کا ذکر سمجھا گیا ہے (ث) اور امام رازی نے قفال سے اسی کی مثل قول نقل کیا ہے ھذا القصۃ علی تمثیل ضرب المثل یعنی ہر انسان کو خطاب ہے کہ اسے ایک ہی انسان سے یعنی اس کے والد سے پیدا کیا اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہاں خطاب اہل عرب سے ہے اور مراد صرف ان کا مورث اعلیٰ ہے پس وہی دو معنی یہاں بھی لئے جا سکتے ہیں۔ اور یوں نفس واحدۃ سے مراد حضرت آدم بھی ہو سکتے ہیں کسی ایک قوم کا مورث اعلیٰ بھی ہو سکتا ہے اور مثل کے طور پر ہر شخص بھی مراد ہو سکتا ہے +

نسل انسانی کا متحد الاصل ہونا اس کے اتحاد کی بنیاد ہے۔

یہاں چونکہ حقوق انسانی کی طرف بالخصوص توجہ دلانی تھی اور اس میں بالخصوص کمزوروں یعنی یتامیٰ اور عورتوں کے حقوق کی طرف اسلئے فرمایا کہ اس نے تم کو ایک نفس یا ایک ہی جی سے پیدا کیا۔ گویا تم سب ایک ہی کنبہ کے لوگ ہو پس تم سب کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں۔ سب انسانوں کو ایک ہی جی سے پیدا کیا۔ یہ بڑی بھاری صداقت ہے۔ اور اس میں نسل انسانی کے اتحاد کی بنیاد ہے۔ یورپ نے موجودہ دہریت کی رو کے نیچے یہ بھی خیال کر لیا ہے کہ ایک ماں باپ سے سب انسان پیدا نہیں ہوئے۔ کیونکہ خط و خال نقوش قد و قامت رنگت کے فرق بہت زیادہ ہیں۔ ایک یورپ کا آدمی خواہ کتنی مدت بھی افریقہ میں رہے اور گو کتنی بھی سیاہی اس کی رنگت پر آ جائے مگر وہ پورا حبشی کبھی نہیں بن سکتا۔ اور نہ ایک حبشی یورپ میں رہ کر یورپین کی سفیدی اور خط و خال حاصل کر سکتا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ وہ لوگ جو بندر اور انسان کو متحد الاصل مان سکتے ہیں۔ ایک یورپین انسان اور حبشی انسان کو متحد الاصل نہیں مان سکتے۔ اور اس طرح پر نسل انسانی میں ایک تفریق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ تا کہ سب نسل انسانی کے حقوق متساوی نہ سمجھے جائیں۔ جبتک نسل انسانی کا اتحاد قائم نہ ہو اس وقت تک تفریقات قومی مٹ نہیں سکتیں۔ اور چونکہ اسلام کا مقصد یہ تھا کہ سب نسل انسانی ایک ہو جائے اور سب تفریقات قومی مٹ جائیں اس لئے اس حقیقت کی طرف بھی اس نے توجہ دلائی ہے +

آدم سے پہلی نسل انسانی کا وجود۔

ہاں قرآن کریم نے بائبل کی طرح یہ نہیں کہا کہ نسل انسانی چھ ہزار سال سے ہے۔ اور نہ ہی اس بات کو منوایا ہے کہ حضرت آدم جن کا ذکر دوسری جگہ قرآن شریف میں آیا ہے سب سے پہلے بشر تھے۔ بلکہ بعض روایات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اور بھی آدم ہوئے ہیں اور ابتدا نسل انسانی کی کب سے ہے۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا چنانچہ امامیہ کی روایات میں ایک روایت ہے ان اللہ تعالیٰ خلق قبل ابینا آدم ثلثین آدم بین کل آدم و آدم الف سنۃ وان الدنیا بقیت خرابا بعدھم خمسین الف سنۃ ثم عمرت خمسین الف سنۃ ثم خلق ابینا آدم علیہ السلام (د) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے

وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ

اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں ۵۹۹

باپ آدم سے پہلے تیس آدم پیدا کئے ہر ایک آدم اور آدم کے درمیان ایک ہزار سال گزرے اور ان کے بعد دنیا پچاس ہزار سال ویران رہی پھر پچاس ہزار سال تک آباد ہوئی پھر ہمارے جد امجد آدم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور محمد بن علی الباقر سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا قد انقضی قبل آدم الذی ھو ابونا الف الف آدم او اکثر (د) اس آدم کے پہلے جو ہمارے باپ ہیں لاکھ آدم یا اس سے بھی زیادہ پیدا ہوئے۔ اور شیخ اکبر نے فتوحات میں لکھا ہے کہ ہمارے آدم سے چالیس ہزار سال پہلے ایک اور آدم تھے اور خصائص میں امام صادق سے روایت ہے ان اللہ تعالیٰ اثنی عشر الف عالم کل عالم منہم اکبر من سبع سمٰوات و سبع ارضین (د) یعنی اللہ تعالیٰ کے بارہ ہزار عالم ہیں ان میں سے ہر ایک عالم سات آسمانوں اور سات زمینوں سے بڑا ہے +

حوا کا آدم سے پیدا ہونا

۵۹۹ الفاظ خلق منہا زوجہا میں یہ اشارہ سمجھا گیا ہے کہ آدم سے اس کے جوڑے یعنی حوا کو پیدا کیا اور یہ اس طرح ہوا کہ آدم کی ایک پسلی نکال کر اس سے حوا بنائی گئی۔ مگر قرآن کریم نے ایسے ہی الفاظ دوسری جگہ استعمال کئے ہیں و من اٰیتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ (الروم ۳۰-۲۱) اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے ہی نفسوں سے تمہارے لئے بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے تسکین قلب حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحم بنایا۔ اور دوسری جگہ ہے واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا (النحل ۱۶-۷۲) اب یہاں تمام انسانوں کو یہ کہا ہے۔ کہ تمہاری بیبیاں تمہارے نفسوں سے پیدا کیں۔ حالانکہ یہ مراد نہیں کہ تمہاری پسلیوں سے پیدا کیں پس مرد سے عورت کے پیدا کرنے کا منشا بھی خود قرآن کریم نے بیان فرما دیا ہے یعنی یہ کہ تم ایک دوسرے سے تسکین حاصل کرتے ہو اور تم میں محبت و رحم باہم اس قدر ہے کہ گویا مرد اور عورت دونوں ایک ہی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ایک جگہ من انفسکم اور دوسری جگہ منہا کا استعمال بالکل درست ہے کیونکہ مرد اور عورت کا اس قدر گہرا تعلق ہے کہ گویا عورت مرد سے ہی بنی ہے یا خلق منہا زوجہا سے مراد یہ ہے کہ جس ایک جی سے اے مردو تم کو پیدا کیا اسی سے تمہاری ازواج کو پیدا کیا پس تم مرد اور عورت کے درمیان کسی اس قسم کا تفرقہ نہ کرو کہ ایک کو تو گویا حقوق انسانیت حاصل ہیں اور دوسرے کو نہیں۔ انسان ہونے میں عورتیں تمہارے ساتھ یکساں حقوق رکھتی ہیں کہ جہاں سے مرد پیدا ہوا وہیں سے عورت پیدا ہوئی۔ ہر رنگ میں یہ الفاظ عورت کو ایک نہایت ہی عزت کا مقام دیتے ہیں +

عورت کا پسلی سے پیدا ہونا

اور یہ جو خیال ہے کہ حدیث سے حوا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا ثابت ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں پسلی سے پیدا کرنے کا ذکر بیشک بائبل میں پایا جاتا ہے جہاں لکھا ہے "آدم پر ایک بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اسکی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی۔ ایک عورت بنا کے آدم کے پاس لایا" (پیدائش ۲: ۲۱ و ۲۲) مگر کسی حدیث میں یہ نہیں اور جس حدیث سے یہ نکالا جاتا ہے وہ دو طرح بخاری میں کتاب النکاح میں آتی ہے ایک جگہ ہے المرأۃ کالضلع (باب المداراۃ) عورت پسلی کی طرح ہے اور دوسری جگہ ہے واستوصوا بالنساء خیرا فانہن خلقن من ضلع (باب الوصاۃ بالنساء) عورتوں کے حق میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ ان دونوں حدیثوں میں حضرت حوا کے حضرت آدم سے پیدا ہونے کا ذکر مطلق نہیں۔ بلکہ عام طور پر تمام عورتوں کا ذکر ہے۔ اصل میں حدیث کی ایک روایت دوسری کی خود تشریح کرتی ہے خلقن من ضلع سے یہ مراد ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ

اور اللہ کے حق

المرأۃ کالضلع نے اس کو صاف کر دیا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ عورتیں پسلی سے تو پیدا نہیں ہوتیں۔ پس مراد وہی ہے جو دوسری حدیث میں بیان کر دی کہ وہ پسلی کی طرح ہیں یعنی ان میں اعوجاج ہے۔ ایسی مثالیں خود قرآن شریف میں ہیں خلق الانسان من عجل (الانبیاء ۲۱ - ۳۷) مطلب یہ کہ اس میں جلدبازی پائی جاتی ہے اللّٰہ الذی خلقکم من ضعف (الروم ۳۰ - ۵۴) یعنی تم میں ضعف پایا جاتا ہے +

انسانِ اول کی پیدائش — انسانِ اول کی پیدائش کس طرح ہوئی کوئی فلسفہ اس کو کھول نہیں سکتا۔ قرآن کریم کی غرض بھی چونکہ یہ نہ تھی کہ انسان کی ابتدائے پیدائش کا ذکر کرے بلکہ اس کی غرض صرف یہ بتانا ہے کہ انسان کیا کمالات حاصل کر سکتا ہے اس لئے زمین و آسمان کس طرح پیدا ہوئے مادہ کس طرح پیدا ہوا۔ روحیں کس طرح پیدا ہوئیں حیوان کس طرح پیدا ہوئے درخت کس طرح پیدا ہوئے انسان کس طرح پیدا ہوئے ان سوالوں کو یہ پاک کتاب نہیں چھیڑتی اور "کس طرح" کا جواب کبھی انسان اپنے ان قویٰ کے ساتھ دے سکتا ہے بلکہ دے سکنا تو ایک طرف رہا سمجھ بھی نہیں سکتا خواہ ہم مسئلہ ارتقا کو لے لیں اور خواہ عام طور پر جو مسلمانوں میں خیال پایا جاتا ہے اس کو لے لیں اور خواہ جو بعض دوسرے مذاہب پیش کرتے ہیں اسکو لے لیں۔ انسان اول کی پیدائش کسی عجیب رنگ میں ہی ہوئی جو دنیا کے موجودہ قوانین قدرت سے الگ کوئی قانون ہے خود قرآن کریم نے یبدئ و یعید میں بدء اور عود کے دو قانونوں کا ذکر کیا ہے پس انسان اول کی پیدائش کیلئے کوئی الگ حالات تھے پہلی عورت بھی انہی حالات کے ماتحت پیدا ہوئی ہوگی +

عورت میں اعوجاج کا مطلب — سوال یہ ہو سکتا ہے کہ عورت میں کیا ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے۔ ٹیڑھا پن سے مراد یہاں ایک طرف کا میلان ہے۔ آیا یہ ایک طرف میلان عورت میں مرد سے بڑھکر ہے؟ واقعات مجبور کرتے ہیں کہ اس کا جواب ہم اثبات میں دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دو قسم کی صفات دنیا میں کام کر رہی ہیں ایک نرمی کی صفت اور دوسری صفت خشونت۔ نرمی کی صفت میں اثر پذیری زیادہ ہے اور صفت خشونت میں اثر ڈالنا زیادہ ہے اب قدرت نے مرد و عورت کے ملاپ کے لئے اور ایک کو دوسرے کا زوج بنانے کیلئے یہ تقسیم کی ہے کہ نرمی کی صفت کو عورت میں زیادہ رکھا ہے اور صفت خشونت کو مرد میں زیادہ رکھا ہے۔ اسی لئے مرد و عورت کا تعلق ایک دوسرے کی تسکین قلبی کا موجب ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک میں جو کمال ہے وہ دوسرے کے نقص کو پورا کر دیتا ہے۔ صفت خشونت کا تقاضا یہ ہے کہ اس صفت کا مالک ہر قسم کی مخالفتوں وغیرہ کا مقابلہ خوب کر سکتا ہے مگر اس کا نقص یہ ہے کہ اس میں محبت اور ہمدردی کی کمی ہوتی ہے۔ نرمی کی صفت کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں محبت اور ہمدردی زیادہ ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ صفت چاہتی ہے کہ اس کا مالک جلد اثر قبول کرے۔ اس لئے اس میں نقص یہ ہے کہ وہ جلدی ایک طرف کا میلان اختیار کر لیتا ہے یہی وہ اعوجاج ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے۔ اور یہ عورت کے اس نقص کی طرف توجہ دلاتا ہے جو اس میں صفت محبت و رحم کے غلبہ کی وجہ سے پیدا ہونا ضروری تھا۔ اسی لئے مرد کو منع کیا ہے کہ وہ اس کی اقامت کے درپے ہو جائے چنانچہ خلقن من ضلع کے بعد آتا ہے ان ذھبت تقیمہ کسرتہ حالانکہ اگر یہ کوئی ٹیڑھا پن اپنے معمولی معنی میں ہوتا تو اس کی اصلاح تو مرد کا فرض تھا۔ یہ عورت کا ایک طبعی تقاضا ہے۔ اس لئے وہ اس کے خلاف کر نہیں سکتی۔ اور جو اس سے اس کے خلاف کرانا چاہے گا وہ اس طبیعت کو توڑے بغیر ایسا نہیں کرا سکتا +

الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ۝

ذریعے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحموں کے حقوق کی نگہداشت کرو بیشک اللہ تم پر نگہبان ہے ۶۰۱

تسأل — ۶۰۰ تساءلون۔ اس کا اصل تتساءلون ہے جو باب مفاعلہ سے ہے یعنی ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ اللہ کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے سوال کرنے سے یہ مراد ہے کہ اللہ کا واسطہ دیکر سوال کیا جاتا ہے۔ اور یہ صرف عرب ہی نہ کرتے تھے کہ ان کو مخاطب سمجھا جائے بلکہ کل دنیا میں اللہ کا واسطہ دیکر سوال کیا جاتا ہے +

رحم — الارحام ۔رَحِم کی جمع ہے یعنی عورت کا رحم اور راستعارۃً قرابت پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ قریبی ایک ہی رحم سے نکلے ہوتے ہیں۔ اسی مادہ سے لفظ رحمۃ۔ رحمان وغیرہ ہیں۔ اسی بنا پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رَحِم کا لفظ میرے نام رحمان سے مشتق ہے۔ انا الرحمٰن وانت الرحم شققت اسمك من اسمی۔ الارحام یہاں اللہ پر عطف ہے یعنی اتقوا اللہ والارحام۔ اور اتقوا الارحام سے مراد ہے ارحام کے حقوق کی نگہداشت کرو جیسا کہ اتقوا اللہ سے مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق کی نگہداشت کرو۔ دیکھو ۶۰۱

رقب۔ رقیب — رقیبا۔ رَقَبَۃ گردن کو کہتے ہیں اور رَقَبْتُہ کے معنی ہیں حفظتہ میں نے اس کی حفاظت کی اسی سے رقیب بمعنی حافظ یا نگہبان ہے۔ اور الرقیب اسمائے الٰہی میں سے ایک ہے +

حقوق العباد صلہ رحمی میں داخل ہیں۔ — پہلے حصہ آیت میں جو حکم اتقوا ربکم میں دیا گیا تھا اسی کی تفصیل بیان کی ہے۔ اور ایک طرف اگر حقوق اللہ کی طرف توجہ دلائی ہے تو دوسری طرف حقوق العباد کی طرف صلہ رحمی کا حکم دیتے ہوئے توجہ دلائی ہے۔ اور حقوق العباد کو صلہ رحمی میں اس لئے داخل کیا ہے کہ ساری نسل انسانی کو ایک ماں باپ کی اولاد ذکر اور دیکر گویا سب کو ایک ہی خاندان کے افراد قرار دیا اس لئے کہ اسلام کی صلہ رحمی کا علم بھی درحقیقت کل نسل انسانی پر حاوی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس صلہ رحمی کا یہی وسیع مفہوم بیان ہے جہاں اہل مصر کو حضرت ہاجرہ کے تعلق کی وجہ سے اپنے ننہال قرار دیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہے کہ جب مصر کے لوگ نہایت تنگی کی حالت میں نبی کریم صلعم کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے لوگوں کو صدقہ کی تحریک دلاتے ہوئے یہی آیت پڑھی یایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ جس سے صاف معلوم ہوا کہ آپ نے خود ساری نسل انسانی کو ایک ہی کنبہ قرار دیا ہے اور سب کے ساتھ نیکی کو صلہ رحمی میں داخل کیا ہے۔ اور دوسرے صلہ رحمی سے ہی حقوق العباد کی بنیاد پڑتی ہے۔ کیونکہ انسان کے تعلقات زیادہ تر قریبیوں سے ہی ہوتے ہیں اس لئے حقوق العباد کا بڑا حصہ صلہ رحمی میں آجاتا ہے۔ اور ایک انسان جب قریبیوں سے حسن سلوک کرتا ہے جن سے اسے دن رات واسطہ پڑتا ہے۔ تو وہ دوسروں سے حسن سلوک کا بھی عادی ہو جاتا ہے +

صلہ رحمی کی تاکید — یہاں اللہ تعالیٰ نے اتقوا اللہ والارحام کہکر اور رحموں کے حقوق کی نگہداشت کو اپنے حقوق کی نگہداشت کیساتھ بیان کرکے حقوق رحم کی عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور بتایا ہے کہ صرف عبادت کوئی چیز نہیں جبتک کہ ہر طرح کے حقوق جو انسان کے ذمہ ہیں ادا نہ ہوں۔ احادیث میں صلہ رحمی کی بڑی تاکید آتی ہے چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رَحِم کا نام میرے ہی نام سے مشتق ہے فمن وصلھا وصلتہ ومن قطعھا قطعتہ جو شخص صلہ رحمی کرتا ہے میں بھی اسکے ساتھ ملتا ہوں اور جو شخص قطع رحمی کرتا ہے میں بھی اس سے قطع کرتا ہوں اور ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا الصدقۃ علی المسکین صدقۃ وعلی ذی الرحم ثنتان صدقۃ وصلۃ یعنی مسکین پر صدقہ صدقہ ہے اور قریبی پر صدقہ دوہری نیکی ہے وہ صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان اپنے قریبیوں کے سوائے

۲ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ

اور یتیموں کو ان کے مال دو ۔۔ اور اچھی چیز کو ۔۔ ردی سے نہ بدلو ۔۔ اور انکے مالوں کو اپنے مالوں کے

۳ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى

ساتھ ملا کر نہ کھاؤ ۔۔ کیونکہ یہ بڑا گناہ ہے ۔۔ ۶۰۱ اور اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ

تو (ایسی) عورتوں سے نکاح کرلو جو تمہیں پسند ہوں ۔۔ ۶۰۲

دوسروں کو کچھ دے نہیں۔ اصل سوال استحقاق کا ہے جب دو یکساں محتاج ہوں تو قریبی کا حق بیشک زیادہ ہے۔ اسی لئے قرآن شریف نے جہاں احسان وغیرہ کا حکم دیا ہے وہاں ذوی القربی کو مساکین پر مقدم کیا ہے

یتیم — ۶۰۱ الیتامیٰ اصطلاح شریعت میں یتیم صرف اس کو کہا جاتا ہے جو حد بلوغ کو نہ پہنچا ہو۔ حدیث میں ہے لا یتم بعد الحلم یعنی بلوغت کے بعد یتیمی نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ۱۸ سال کی عمر بلوغت کی حد ہے +

خبیث۔ طیب — الخبیث بالطیب۔ خبیث کے معنی ردی بھی ہیں اور باطل یا حرام بھی اور طیب کے معنی ستھرا بھی ہیں اور پاکیزہ یا حلال بھی پس اس کے دو طرح پر معنی ہو سکتے ہیں۔ حلال مال جو تم خود کما سکتے ہو اسکے بدلے میں یتیموں کا مال نہ لو جو تم پر حرام ہے۔ یا اپنی ردی چیزوں کے ساتھ ان کے مال کی عمدہ چیزوں کو نہ بدل دو۔ اور

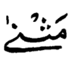
الیٰ — الیٰ اموالکم میں الیٰ بمعنی مع ہے یعنی ان کے ساتھ ملا کر مت کھا جاؤ +

حوب — حوبا حُوب کے معنی اثم یعنی گناہ ہیں۔ اس کا اصل حَوب سے ہے جس کے معنی زجر یا روک دینا ہیں +

یتامیٰ کی خبرگیری کی تاکید — چونکہ عورتوں کے حقوق کی طرح یتامیٰ کے حقوق بھی پامال ہوتے تھے۔ اور یہ دونوں گروہ کمزور تھے جن کے حقوق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس لئے ابتدا یتامیٰ کے حقوق سے کی ہے۔ یتامیٰ کی خبرگیری کے لئے اسلام میں اس قدر تاکید پائی جاتی ہے کہ مکی وحی میں جب زیادہ زور صرف توحید باری پر تھا یتامیٰ اور مساکین کی خبرگیری پر بھی اسی طرح زور دیا جاتا تھا۔ گویا بتا دیا کہ ایک خدا کو وہی مانتا ہے جو اسکی بیکس مخلوق پر شفقت کرتا ہے +

صاحب جائداد یتیم — ان آیات میں جن یتامیٰ کا ذکر ہے وہ صاحب جائداد یتامیٰ ہیں جس طرح آجکل دنیا میں ہو رہا ہے کہ اپنے بھائی کو کمزور دیکھا تو اسکا مال دبا لیا کسی قوم کو کمزور دیکھا تو اس کا ملک دبا لیا یہی حالت ملک عرب میں تھی کہ ان لوگوں کی جائدادوں کو جو ابھی بلوغ کو نہ پہنچے ہوتے کھا جاتے تھے۔ یہاں ان یتامیٰ کے بارے میں تین حکم دیئے ہیں۔ اول یہ کہ یتیموں کو ان کے مال دو یعنی ان کی ضروریات کے مطابق ان پر خرچ کرتے رہو ایسا نہ ہو کہ ولی بنکر تم ایسے ان کے مالوں پر متصرف ہو جاؤ کہ ان پر انکے مال خرچ نہ کرو اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ان کے مالوں کو نہ لگاؤ دوسرا حکم یہ ہے کہ ان کے مالوں کو جو تمہارے لئے حرام ہیں اپنی حلال کمائی کو چھوڑ کر نہ کھا جاؤ یا اپنی ردی چیزیں ان کی اچھی چیزوں کی جگہ نہ رکھ دو۔ اور تیسرا حکم یہ ہے کہ اپنے مالوں میں ملا کر انکے مال نہ کھا جاؤ یعنی بظاہر شراکت کا رنگ ہو مگر اصل غرض ان کے مال کو کھانے کی ہو +

طاب — ۶۰۲ طاب کے معنی ہیں ایک چیز کا عمدہ اور پاکیزہ ہونا (دل) پس ما طاب لکم سے مراد ہے جس کی طرف بوجہ اسکی عمدگی اور اچھا ہونے کے نفس مائل ہو۔ دیکھو ۸۲ اور اگلی آیت میں اسی سے طِبْنَ خوشی سے دینے کے معنی میں آیا ہے



دو دو

يتامىٰ کی بحث میں عورتوں سے نکاح کے ذکر کا تعلق اس کی چار توجیہیں

یتامیٰ کے ذکر میں عورتوں سے نکاح کے ذکر کا کیا تعلق ہو؟ اس کی چار توجیہیں کی گئی ہیں اول وہ جو حضرت عائشہ سے بخاری میں مروی ہو یعنی یہ کہ یتامیٰ سے مراد یتیم لڑکیاں ہیں جو اپنے ولی کی حفاظت میں ہوں اور ولی ان کے مال اور خوبصورتی کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ ان سے نکاح کرلیں مگر تھوڑے مہر پر اور پھر چونکہ ان کے حقوق کا مطالبہ کرنیوالا کوئی نہیں اس لئے ان سے اچھا معاملہ نہیں کرتے تو اس لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اگر ایسی یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے میں تم کو اس بات کا خوف ہو کہ ان کے معاملہ میں انصاف نہیں کرسکو گے تو ان کو چھوڑ کر دوسری عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں نکاح کرلو۔ دوسری توجیہ یہ ہو کہ اس میں چار سے زیادہ نکاحوں سے روکا ہو۔ کیونکہ عرب میں لوگ دس دس عورتوں تک نکاح کرلیتے پھر جب اپنا مال کفایت نہ کرتا تو یتامیٰ کا مال اس طرح اُڑا دیتے۔ تیسری توجیہ یہ ہو کہ یتیموں کے بارہ میں اگر تم کو ناانصافی کا خوف ہو تو عورتوں کے بارہ میں بھی ناانصافی سے بچو اور چار سے زیادہ بیبیاں نکاح میں نہ لاؤ اگر ان میں بھی عدل نہ کرسکو تو ایک ہی بی بی ہو۔ چوتھی توجیہ یہ ہو کہ وہ یتامیٰ کی ولایت کو ناانصافی کے خوف کی وجہ سے مشکل سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اس سے خوف کرتے ہو تو اسی طرح عورتوں کے بارہ میں زنا سے بھی خوف کرو یعنی اگر زنا میں پڑنے کا خوف ہو تو چار تک عورتوں سے نکاح کرلو +

ایک اور توجیہ

لیکن ان الفاظ کی ایک اور توجیہ بھی ہوسکتی ہو اور وہ یہ ہو کہ یہاں مراد ماطاب لکم من النسآء سے میں اُمہات الیتامیٰ ہیں یعنی یتیم بچوں کی مائیں۔ اور الا تقسطوا فی الیتامیٰ میں مراد وہ یتیم بچے ہیں تو گویا آیت کا مطلب یوں ہوا کہ اگر تم کو خوف ہو کہ یتیم بچوں کے بارہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو ایسی عورتوں سے جن کے وہ بچے ہیں نکاح کرلو۔ کیونکہ نکاح سے وہ بچے اولاد کی حیثیت حاصل کرلینگے۔ اور ان کی ذمہ داری ان کی والدہ کے شوہر پر ہوگی۔ اس معنی کی آیت ۱۲۷ بھی مؤید ہو۔ اسلئے کہ اس آیت یعنی یستفتونک فی النسآء کے بارہ میں یہ مسلم ہو کہ یہ اُم کحت کے بارہ میں نازل ہوئی جو یتامیٰ کی والدہ تھی۔ پس معلوم ہوا کہ وہ آیت اُمہات الیتامیٰ کے بارہ میں ہو اور اس لئے اُس آیت میں جو اس پہلی آیت کیطرف اشارہ ہو۔ وہ واضح کرتا ہے۔ کہ یہاں بھی ان عورتوں کے نکاح کا ذکر ہو جو اُمہات الیتامیٰ ہیں اس توجیہ کے لئے آیت میں کچھ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں۔ اور سیاق مضمون بھی یہی چاہتا ہو کیونکہ اصل مضمون اس رکوع میں عورتوں سے نکاح کا نہیں بلکہ یتامیٰ کی خبرگیری ہو پس یتامیٰ کی خبرگیری کی ایک دقت رفع کرنے کیلئے ایسے نکاح کو ایک علاج کے طور پر بتایا ہے۔

نکاح میں پسندیدگی اور ایک دوسرے کو دیکھ لینا

ماطاب لکم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نکاح کے لئے پسندیدگی شرط ہو۔ اور پسندیدگی کیلئے دیکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہو چنانچہ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہو کہ ایک صحابی سے جو ایک انصاری بی بی سے نکاح کرنا چاہتے تھے نبی کریم صلعم نے دریافت کیا۔ کیا تم نے اسے دیکھ لیا ہو اس نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا جاؤ اسے دیکھ لو کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ نقص ہوتا ہو۔ اور جمہور علماء کا یہی مذہب ہو کہ نکاح کیلئے عورت کو دیکھنا جائز ہو۔ ہاں اس میں اختلاف ہو کہ عورت کی رضامندی سے دیکھے یا نہیں امام مالک کہتے ہیں دیکھنے کیلئے عورت کی رضامندی ہونی چاہئے۔ جمہور اس کے خلاف ہیں۔ اور امام مالک کا قول قابل ترجیح ہو۔ اور اس سے ایک اور استنباط بھی ہوسکتا ہے یعنی جب مرد عورت کو دیکھ سکتا ہو تو عورت کے بھی ایسے مرد کو دیکھ لینے میں کوئی امر خلاف شریعت نہیں ...... اس زمانہ میں مسلمانوں کا عمل اس پر نہیں یعنی اکثر نکاح بن دیکھے ہوتے ہیں اسی کا نتیجہ بے اتفاقیوں کی کثرت اور طلاق کی زیادتی ہو +

وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ

اور تین تین اور چار چار ۶۰۳

چھوٹی عمر کے نکاح

دوسری بات جو ما طاب لکم سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ نکاح چھوٹی عمر میں نہیں ہونے چاہئیں۔ اس لئے کہ ایک چھوٹی عمر کا بچہ پسندیدگی یا ناپسندیدگی کس طرح کر سکتا ہے جب وہ اس کو سمجھنے کے ہی قابل نہیں ✦

مثنٰی۔ ثلٰث۔ ربٰع

۶۰۳ مثنٰی وثلٰث و ربٰع۔ یہ لفظ اثنین اثنین اور ثلاثۃ ثلاثۃ اور اربعۃ اربعۃ کے قائم مقام ہیں یعنی دو دو تین تین چار چار۔ اور ان کے درمیان واؤ لانے سے مراد ان کا جمع کرنا نہیں یعنی یہ منشا نہیں کہ ایک ہی شخص دو دو بھی کرے اور تین تین بھی کرے اور چار چار بھی کرے بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر ایک کو اس کے حالات کے مطابق دو کی اجازت ہے تو دوسرے کو اس کے حالات کے مطابق تین کی اجازت ہے اور کسی کو چار کی۔ دو اور تین اور چار کو جمع کر کے اس سے نو کی اجازت نکالنا یا دو دو تین تین چار چار کو جمع کر کے ۱۸ کی اجازت نکالنا خلاف قواعد تاویل ہے۔ اور اؤ کے ساتھ ان الفاظ کو اس لئے عطف نہیں کیا کہ پھر مراد یہ ہوتی کہ یا دو دو کی اجازت ہے یا تین تین کی یا چار چار کی۔ حالانکہ مطلب یہ تھا کہ کسی کو دو کی اور کسی کو تین کی اور کسی کو چار کی اجازت ہے اور اس ترکیب کے اختیار کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چار سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ جب یوں کہا جائے کہ اس مال کو دو دو اور تین تین اور چار چار کرکے تقسیم کر دو تو اس سے مراد صرف اسی قدر ہوتی ہے کہ کسی کو دو اور کسی کو تین کسی کو چار مید و اور چار سے زیادہ کی اجازت اس سے نہیں نکلتی۔ اور نہ ہی یہ مراد ہوتی ہے کہ ایک ہی آدمی کو دو اور تین اور چار یا نو دیدو ✦

چار سے زیادہ نکاح منع ہیں۔

مسئلہ تعدد ازدواج کے متعلق چار سوال

یہ الفاظ اسلام میں مسئلہ تعدد ازواج کی بنیاد ہیں۔ الفاظ صریحاً ایسے تھے کہ نہ مخالفین کو اعتراض کا موقعہ تھا نہ موافقین کو غلطی لگ سکتی تھی۔ مگر تعجب ہے کہ جہاں ایک طرف مخالفین نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ گویا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے نکاح میں کئی بیبیاں ہوں بعض مسلمان کہلانے والوں نے بھی اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کے لئے اسے حکم قرار دیا ہے اور یوں اس کی تاویل کر لی ہے کہ سب سے افضل تو یہ ہے کہ چار بیبیاں ہوں ورنہ تین ورنہ دو جس خیال کو قرآن شریف کے صاف الفاظ دھکے دے رہے ہیں سوالات غور طلب اس مسئلہ میں یہ ہیں۔ ۱ کیا ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا حکم ہے یا اجازت۔ ۲ کیا اجازت ضرورت کے لئے ہے یا بلا ضرورت بھی ایک سے زیادہ بیبیاں نکاح میں لائی جا سکتی ہیں۔ ۳ کیا اگر قرآن کریم نے یہی تعلیم دی ہے کہ بوقت ضرورت تعدد ازواج کی اجازت ہے تو اس مسئلہ پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ ۴ یہ کہ آیا ضرورت کے ہوتے ہوئے چار سے زیادہ بیبیاں نکاح میں لانا جائز ہے ✦

یہ اجازت ہے نہ حکم

سب سے پہلے دیکھنا ہے کہ یہ حکم ہے یا اجازت۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دو تین چار بیبیوں سے نکاح کرنا کسی شرط سے مشروط ہے۔ اور وہ شرط یتیموں کے بارہ میں انصاف نہ کر سکنے کا خوف ہے۔ پس اول تو یہ آیت صرف ان لوگوں کے لئے ہوئی جنکو یتامیٰ کی خبر گیری سے تعلق پڑتا ہے اور عام نہ ہوئی اور یہ خود اس کے حکم ہونے کے خلاف دلیل ہے۔ دوسرے یہ بے معنی بات ہے کہ کہا جائے کہ اگر تم کو یتیموں کے بارہ میں انصاف نہ کر سکنے کا خوف ہو تو تمہارے لئے ضروری ہے کہ دو یا تین یا چار بیبیوں سے نکاح کرو۔ پھر جس قدر توجیہات الفاظ ان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ کی کی گئی ہیں یا کی جا سکتی ہیں ان سب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشروط اجازت ہے نہ حکم ✦

اجازت صرف ضرورت کے لئے ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ تعدد ازواج کی اجازت ہے حکم نہیں تو دوسرا امر یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ اجازت ضرورت کے وقت پر استعمال کرنے کیلئے ہے یا بلا ضرورت بھی۔ سو اول تو لفظ اجازت خود بتاتا ہے کہ یہ صرف ضرورت کیلئے ہی کیونکہ

فَاِنْ خِفْتُمْ

اور اگر تمہیں خوف ہو

ہر ایک اجازت دنیا میں کسی ضرورت کیلئے ہی ہوا کرتی ہی۔ دوسرے خود قرآن کریم کے الفاظ اس بات کے مؤید ہیں۔ کیونکہ وہاں خود ایک شرط ساتھ لگا دی۔ گویا ایک ضرورت خود بتا دی۔ اب ضرورت میں توسیع تو ہو سکتی ہی۔ یعنی جو کام ایک ضرورت کے لئے جائز ہی۔ اس کا جواز اجتہادی رنگ میں کسی دوسری ملتی جلتی ضرورت کیلئے ہو سکتا ہی۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اس ضرورت کو بالکل اُڑا ہی دیا جائے +

تعدد ازدواج کی ضرورتوں کی تعیین کیوں نہیں کی

ہاں یہ سوال ہو سکتا ہی کہ قرآن کریم نے ان ضروریات کی تصریح کیوں نہیں فرما دی اس کا جواب یہ ہی کہ جن امور کا تعلق انسانی ضروریات کے مختلف پہلوؤں سے ہی جو ملکوں اور قوموں اور زمانہ اور حالات کے تغیر سے بدلتے رہتے ہیں وہاں قرآن حکیم ان ضروریات کو گننے کی لا حاصل کوشش سے احتراز فرماتا ہی۔ مثلاً طلاق کا مسئلہ ہی۔ قرآن کریم نے کہیں نہیں بتایا کہ فلاں فلاں ضروریات کے وقت طلاق دینا جائز ہی۔ حالانکہ یہ نہایت ہی بین امر ہی کہ طلاق کی اجازت ضرورت کیلئے دی ہی نہ بلا ضرورت۔ لیکن چونکہ طلاق کیلئے جو ضروریات پیدا ہوتی رہتی ہیں وہ نہ صرف انسانوں کی مزاجوں کے اختلاف کے ساتھ ہی بدلتی رہتی ہیں۔ بلکہ قومی اور ملکی اور زمانی حالات کے تغیر سے بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے انکا بتانا ایک لا حاصل کام تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے ممالک میں جہاں سب قوموں کا ایک ہی مذہب ہے ایک سی تعلیم ہی ایک سے خیالات ہیں۔ ایک سے حالات ہیں۔ کوئی دو ملک ضروریات طلاق پر اتفاق نہیں کرتے اسی طرح تعدد ازواج کی ضروریات کو خاص کرنا محال ہی +

تعدد ازواج کی ضرورت

اب تیسری بات جس پر ہم نے غور کرنا ہی یہ ہی کہ آیا جس صورت میں قرآن کریم نے تعدد ازواج کی اجازت ضرورت کے وقت دی ہی تو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہی۔ اس بات سے کس کو انکار ہو سکتا ہی کہ ہر ایک قوم نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہی۔ اسلام نے ان ضروریات کا علاج تعدد ازواج کی صورت میں رکھدیا۔ دوسری قوموں نے اس کے لئے طرح طرح کے اور طریق اختیار کئے۔ حتیٰ کہ بعض ملکوں میں قانوناً زنا کے پیشہ کو تسلیم کیا گیا ہی۔ اور بعض نے اس کو اس حد تک رواج دیا ہی کہ قانونی جواز سے کچھ کم مرتبہ اس کا نہیں رہا۔ اسلام چونکہ عورت کی عزت اور عفت کا حامی ہی اور یہ بات کو گوارا نہیں کرتا کہ عورتیں پیسوں کے عوض اپنی عفت کو فروخت کریں۔ اس لئے تعدد ازواج کی صورت میں ان تمام مشکلات کو حل کر دیا ہی۔ پھر علاوہ دوسری ضروریات کے جنگ ایک ایسی ہی ضرورت ہی کہ وہ بعض حالات میں تعدد ازواج پر مجبور کر دیتی ہی۔ یہ ظاہر ہے کہ جنگ کا سلسلہ دنیا سے مٹ نہیں سکتا۔ اور جنگوں میں مردوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی رہتی ہی اب چونکہ قدرتی حالت جس کے اندر انسان کو پیدا کیا گیا ہی وہ مرد و عورت کے باہمی تعلق کی حالت ہی اور اسی پر نسل انسانی کی ترقی موقوف ہی۔ اس لئے نسل انسانی کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہی کہ ہر ایک مرد اور ہر ایک عورت اپنے اس فرض کو پورا کرے۔ اب اگر مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہی تو چونکہ بچّہ کا پیٹ میں رکھنا جننا پرورش کرنا عورت کے فرائض میں داخل ہی اس لئے نسل انسانی کا ہر ایک فرد جسے ممکن طور پر یہ موقعہ ہی اپنے اس فرض کو ادا کر سکتا ہی۔ اور جو مرد بلا بیویوں کے رہ جائینگے۔ وہ کسی صورت میں نسل انسانی کی ترقی کا موجب نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہی۔ اور یہی وہ صورت ہی جو جنگوں اور مردوں کی دوسری ضروریات کی وجہ سے اکثر حالات میں دنیا میں پیش آتی رہتی ہے تو جو عورتیں بلا خاوندوں کے ہونگی وہ نسل انسانی کی ترقی میں صرف تعدد ازواج کے ذریعہ سے معاون ہو سکتی

اَلَّا تَعۡدِلُوۡا

کہ عدل نہیں کر سکوگے

ہیں۔ گویا اس صورت میں تعدد ازدواج ایک قومی فرض ہو جاتا ہے۔ اور ایسے حالات میں جب پہلے ہی آبادی کم ہو جاتی ہو اُن عورتوں کو خاوندوں کے بغیر چھوڑنا گویا عمداً نسل انسانی کی افزائش کی راہ کو روکنا ہے۔ اس سے علاوہ عموماً عورتوں کے معاش کا انحصار مردوں پر ہوتا ہے پس جو عورتیں جنگوں میں بیوہ رہ جاتی ہیں یا یتیم رہ جاتی ہیں اُن کے متعلق پیچھے رہے ہوئے مردوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اُن کی خبرگیری اور پرورش کریں اور اس کے لئے ایک ہی راہ ہے جو قدرت نے رکھی ہے یعنی ان کو نکاح میں لے آنا۔ یورپ بیشک تعدد ازدواج کا منکر ہوا ہے لیکن خدا تعالےٰ نے یورپ پر اتمام حجت بھی نہایت بین طور پر کیا ہے۔ کیونکہ وہاں باوجود امن کے عورتوں کی تعداد مردوں سے مدت سے بڑھی ہوئی چلی آتی تھی اور پچھلی باہمی جنگ نے اور بھی مردوں کی تعداد کو کم اور عورتوں کی تعداد کو زیادہ کر دیا ہے۔ آخر عقلمند غور کریں گے کہ جس صورت میں نسل انسانی کی افزائش کو جنگ سے سخت نقصان پہنچا ہے۔ اور پیچھے کثرت سے عورتیں موجود ہیں جو اگر خاوندوں کے گھروں میں ہوں خواہ ایک خاوند کے گھر میں دو دو تین تین چار چار عورتیں ہی کیوں نہ ہوں نسل انسانی کی افزائش کا موجب ہو سکتی ہیں تو یہ کس قدر دانش سے بعید ہے کہ ایک فرضی روک پیدا کر کے نسل انسانی کی افزائش کو اس طرح جنگ کے ساتھ یہ دوسرا صدمہ پہنچایا جائے یا دوسری صورت یہ ہوگی کہ ناجائز تعلقات سے بچے پیدا ہوں جو نہ صرف سوسائٹی اور قوم کے لئے ننگ اور عار کا موجب اور ان کے لئے پرلے درجہ کی ذلت کا باعث ہوں۔ بلکہ اُن کی خبرگیری کا بھی کوئی اہتمام نہ ہونے کے باعث وہ حقیقی طور پر قوم کی ترقی کا موجب نہیں ہو سکتے۔ اور چونکہ اُن کا کوئی کفیل بھی نہ ہوگا۔ اس لئے اُن میں سے کثرت کے ساتھ بلوغت کو پہنچنے سے پہلے ہی دنیا سے اُٹھ جائینگے۔ عقلمند انسانوں کا یہی کام ہے کہ فرضی اور وہمی رکاوٹوں پر آخر وہ غالب آجاتے ہیں۔ اسی طرح یورپ کے عقلمند مجبور ہو کر اس امر کو قبول کرینگے۔ کہ واقعی بعض حالات میں تعدد ازدواج ایک فرض قومی ہو جاتا ہے بلکہ اب بھی جبکہ ایک خطرناک عالمگیر جنگ نے یورپ کے بیشمار مردوں کو خاک کے نیچے سلا دیا ہے۔ ایک قوم اسباب پر بحث کر رہی ہے کہ موجودہ حالات کے ماتحت سوائے تعدد ازدواج کے قوم کے تباہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ خود انگلستان میں ہر سَو مرد کے لئے ایک سَو دس عورتیں ہیں۔

سب الہامی کتابیں اور سب راستباز تعدد ازدواج کے مجوز ہیں

اس ہدایت کا منجانب اللہ ہونا اس سے بھی ثابت ہے کہ دنیا کی الہامی کتابوں میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جس نے تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا ہو۔ اور ہر قوم کے بڑے بڑے مقدس اور برگزیدہ لوگوں میں تعدد ازدواج کی مثالیں پائی جاتی ہیں حالانکہ اگر تعدد ازدواج جائز نہیں تو پھر یہ زنا ہے اور یہ کبھی وہم میں نہیں آسکتا کہ تمام قوموں کے مقدس بزرگ نعوذ باللہ من ذٰلک ایک ایسے امر کا ارتکاب کرتے وہ جنہوں نے اللہ کی رضا کیلئے سب کچھ دیدیا وہ ایسا امر فاحش کا ارتکاب کبھی نہ کر سکتے تھے۔ پھر جب سب الہامی کتابوں نے ادنیٰ سے ادنیٰ گناہوں سے روکا تو کسی کتاب نے تعدد ازدواج سے کیوں نہ روکا؟ خود انجیل باوجود اسکے کہ اس وقت یہودیوں میں تعدد ازدواج پر عمل ہوتا تھا ایک حرف اسکے خلاف نہیں کہتی ہاں پولوس کی تعلیم میں صرف پادریوں کو یہ ہدایت ہے کہ ایک بی بی پر قناعت کریں عوام کو پھر بھی اجازت رہی۔

چار کی حد بندی

اس دوا کو تجویز کرتے ہوئے اسلام نے دو اور روکیں ایسی تجویز کر دی ہیں کہ حد اعتدال سے اس کا استعمال نہ بڑھ جائے وہ دو روکیں یہ ہیں کہ اول تو چار تک حد بندی کر دی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چار کی حد بندی کوئی نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک تو اجازت دیتے ہوئے ایک خاص عدد پر بس کر دینا خود اس اجازت کی آخری حد کو بتاتا ہے۔ دوسرے تعامل اس پر شاہد ہے تیسرے بعض روایات سے یہی گواہی ملتی ہے مثلاً نوفل بن معاویہ ایمان لائے تو ان کے ہاں پانچ بیبیاں تھیں نبی کریم صلعم نے حکم دیا کہ چار رکھ لو اور ایک کو طلاق دیدو دک، یا غیلان بن سلمہ ایمان لائے اور ان کی دس بیبیاں تھیں تو نبی کریم صلعم نے

فَوَاحِدَةً

نو ایک ہی ۶۰۴

چار رکھ کر باقی کو طلاق کا حکم دیدیا۔ اور اس حدیث کو ترمذی۔ ابن ماجہ بیہقی۔ دار قطنی اور امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے کہ عمیرۃ الاسدی ایمان لائے تو آٹھ عورتوں کے خاوند تھے نبی کریم صلعم نے چار رکھکر باقی کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ باقی رہا نبی کریم صلعم کی بیبیوں کا معاملہ سو چونکہ یہ مضمون بطور خود علیحدہ بحث چاہتا ہے۔ اس لئے اس پر سورۃ احزاب میں مفصل بحث ہوگی جہاں یہ ذکر ہے۔ اس قدر یہاں بتا دینا کافی ہوگا کہ نبی کریم صلعم کو بھی یہ حکم ہوا تھا کہ وہ اور بیبیاں نکاح میں نہ لائیں بلکہ جو اس وقت آپ کے نکاح میں تھیں ان کو طلاق دیکر ان کی جگہ اور شادی کرنے سے بھی روکا گیا تھا لایحل لك النسآء من بعد ولا ان تبدل بهن من ازواج (الاحزاب ۳۳۔ ۵۲) اس لئے آپ کے عقد میں جو نو بیبیاں تھیں تو چونکہ یہ شادیاں اغراض دینی کے لئے ہوئی تھیں اس لئے آپ کو یہ حکم نہ ہوا تھا کہ چار رکھکر باقی کو طلاق دیدیں۔ دوسری روک جو تعداد ازواج کے مسئلہ پر قرآن کریم نے ڈالی ہے وہ عدل کا قائم رکھنا ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

۶۰۴ اس حصہ میں بتایا ہے کہ اگر ضرورت بھی پیدا ہو مگر ایک شخص دو بیبیوں میں عدل قایم نہیں رکھ سکتا تو پھر ایک شوہر اور ایک بی بی کے اصول پر ہی عمل کرے۔ اس سے دو کھلے نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ ایک شوہر اور ایک بی بی کا اصول ہی نکاح میں اصل الاصول ہے۔ اور یہ ایسا مستحکم اصول ہے کہ گو ضروریات بھی دوسرے رنگ کی پیدا ہو جائیں جو تعداد ازواج کو ضروری ٹھہرا دیں تاہم اگر ایک شخص صرف اسباب پر قادر نہیں کہ وہ دو بیبیوں میں عدل قایم رکھ سکے تو بھی وہ ایک بی بی سے زیادہ نکاح میں نہ لائے پس قرآن کریم نے صاف طور پر سمجھا دیا کہ نکاح میں قاعدہ یہی ہے کہ ایک بی بی اور ایک شوہر ہو ہاں جب ضروریات پیدا ہو جائیں تو پھر تعداد ازواج کی طرف بطور ایک استثناء کے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

نبی کریم صلعم کی ازواج کی تعداد

نکاح میں اصول ایک شوہر کیلئے ایک بی بی ہے

عدل کی شرط

دوسرا نتیجہ جو ان الفاظ سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ تعداد ازواج پر عدل کی روک ایک بڑی بھاری روک ہے۔ اور دوسری جگہ فرمایا ولن تستطيعوا ان تعدلوا بين النسآء ولو حرصتم (النسآء ۴۔ ۱۲۹) تم طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کرسکو۔ خواہ تم کتنا ہی چاہو۔ ان الفاظ سے بعض لوگوں نے یہ غلطی بھی کھائی ہے کہ یہاں عدل کی شرط رکھکر اور دوسری جگہ عدل کو انسانی استطاعت سے باہر قرار دیکر تعلیق بالمحال کر دی ہے لیکن ظاہر ہے کہ شریعت میں ایک امر کی اجازت دینا اور پھر اس کو ایک محال امر کے ساتھ مشروط کرنا قرآن جیسی حکیم کتاب کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ اگر یہی منشاء تھا تو صاف یوں ہی فرما دیا ہوتا کہ تعدد ازواج کی تمہیں اجازت ہی نہیں۔ یہ محض یورپ کی تقلید نے باتیں کہلوائی ہیں۔ مگر مقلدین یورپ خوب یاد رکھیں کہ یورپ ایک سیہ کاری اور گند کے اندر مبتلا ہے جس سے اگر کبھی وہ باہر نکل سکتا ہے تو خدا کے بتائے ہوئے علاج تعدد ازواج کے ذریعہ سے ہی نکل سکتا ہے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ جہاں عدل کے ساتھ تعدد ازواج کو مشروط کیا ہے تو وہاں مراد ظاہری سلوک میں عدل ہے یعنی نان و نفقہ میں باری میں اور ظاہری امور میں اور جہاں یہ فرمایا کہ تم عدل کر ہی نہیں سکتے وہاں محبت میں مساوات مراد ہے یعنی دو بیبیوں سے یکساں محبت ہونا یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ اور اس پر خود قرینہ شاہد ہے۔ کیونکہ وہاں آگے فرمایا فلا تميلوا كل الميل یعنی محبت کے معاملہ میں بالکل ایک طرف سے نہ جھک جاؤ یہاں تک کہ ایک غریب عورت بی بی کہلا کر پھر درمیان میں لٹکی ہوئی ہو۔ پس عدل کی اس تشریح کے سمجھانے کو ہی وہ لفظ اختیار فرمائے۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اس میں پھر سمجھا دیا کہ تعدد ازواج ایک بڑا مشکل مقام ہے جس کو بغیر سخت ضرورت کے اختیار نہ کیا جائے۔

۴ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا وَاٰتُوا النِّسَآءَ

یا جیسے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے یہ زیادہ مناسب ہے تاکہ تم ناانصافی نہ کرو اور عورتوں کو ان کے

یمین — ۵۰ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ اَيْمَان۔ يَمِيْن کی جمع ہے جو یمن سے ہے جس کے اصل معنی برکت ہیں (ل) اور یمین اصل میں داہنے ہاتھ یا داہنی طرف کو کہتے ہیں مگر کئی اور معنی میں بھی آگیا ہے مثلاً حق کی جانب۔ جیسے تاتوننا عن الیمین (والصّٰفّٰت ۲۸) یا سعادت و برکت کی جانب جیسے اصحاب الیمین (الواقعۃ ۲۷) اور قسم کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے گزر چکا اور معاہدہ کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے مولی الیمین سے مراد وہ شخص ہے جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو (غ) اور لاخذنا منه بالیمین میں زجاج نے یمین کے معنی قدرت کئے ہیں (ل)۔ ایک حدیث میں آتا ہے اَلْحَجَرُ الْاَسْوَدُ يَمِيْنُ اللّٰهِ جس کے معنی میں امام راغب لکھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے اس سعادت کی طرف پہنچا جاتا ہے جو اس کی طرف قریب کرنے والی ہے اور ابن اثیر میں ہے کہ یہ کلام مثال کے طور پر ہے۔ کیونکہ جب بادشاہ کسی شخص سے مصافحہ کرتا ہے تو وہ اس کے ہاتھ کو چومتا ہے پس اس لئے کہ اسے چوما جاتا ہے اسے یمین اللہ کہا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ حجر اسود اس عہد کے لئے بطور ایک نشان کے تھا جو بائبل میں کونہ کے پتھر کے متعلق پایا جاتا ہے پس یمین اللہ میں اسی اللہ تعالیٰ کے عہد کی طرف اشارہ ہے ◆

حجر اسود یمین اللہ ہے

ملک یمین سے مراد — ملک یمین سے مراد امام راغب کے نزدیک صرف اسی قدر ہے جیسا فی یدی سے یعنی میرے ہاتھ میں یا میرے قبضہ میں مگر جو مختلف معنی اوپر دیئے گئے ہیں ان کے لحاظ سے ما ملکت ایمانکم کے معنی ہونگے وہ جن کے مالک تمہارے معاہدات ہوئے یا جن پر تم قدرت پاکر مالک ہو گئے۔ چنانچہ اس حدیث میں کہ نبی کریم صلعم کے آخری الفاظ تھے الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم مراد زکوٰۃ لی گئی ہے (ت) اور الا ما ملکت ایمانکم (۲۴) میں ایک معنی منکوحہ عورتیں ہیں یعنی وہ جن کے تم بذریعہ معاہدات مالک ہوئے۔ اور قرآن کریم میں غلاموں لونڈیوں پر بھی یہی لفظ بولے گئے ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر تم نے قدرت پائی۔ یعنی جنگ کرکے ان پر متسلط ہو گئے ◆

لونڈیاں — یہاں او ما ملکت ایمانکم سے کیا مراد ہے؟ عموماً لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ طریق چار کی حد بندی کو توڑنے کے لئے ہے کہ لونڈیاں جتنی چاہے کوئی رکھے حالانکہ اس سے اصل غرض ہی باطل ہو جاتی ہے۔ اگر حد بندی ضروری تھی تو اس کا اس طرح توڑ دینا جائز نہیں کہ لونڈیوں کی شکل میں جس قدر کوئی چاہے زیادتی کرے۔ اب ترکیب عبارت میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو یہ کہ اَوْ کے ذریعہ سے عطف النساء پر ہو یعنی ترکیب یوں ہو فانکحوا ما طاب لکم من النساء او من ما ملکت ایمانکم یعنی نکاح کرو جو تم کو پسند ہوں عورتوں سے یا لونڈیوں سے الخ اس صورت میں لونڈیاں خود عورتوں والی حد بندی کے اندر ہیں۔ یا فواحدۃ کے بعد یہ کوئی الگ ہی صورت ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ اگر ایک بھی میسر نہ آئے تو لونڈی سے نکاح کر لو اور اس کی موید وہ آیت ہے جس میں آگے چل کر لونڈی کیساتھ نکاح اس شرط پر مشروط قرار دیا ہے جب زوجہ میسر نہ آئے چنانچہ فرمایا ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنٰت المؤمنٰت فمن ما ملکت ایمانکم من فتیٰتکم المؤمنٰت (النساء ۲۵) اور زیادہ سے زیادہ اسکو واحدۃ کے ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے یعنی اگر عدل نہ کر سکو تو ایک بی بی کے ساتھ چار کی حد تک لونڈیوں کو جمع کر سکتے ہو۔ گو اس میں یہ لازم آئیگا کہ لونڈیوں کے معاملہ میں کسی عدل کی ضرورت نہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ ان کے حقوق نصف ہی سہی مگر پھر بھی عدل کی ضرورت تو ہے اس لئے پہلی یا دوسری توجیہ ہی درست ہے ◆

عول — ۵۱ تعولوا۔ اس کا مادہ عَوْل ہے اور عَوْل اور غَوْل کا مفہوم ملتا جلتا ہے اس قدر فرق ہے کہ غالہٗ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ چیز ہلاک کردے اور عالہٗ اس وقت جب وہ بوجھ کے نیچے دبا دے اور عَوْل وہ مصیبت ہے جو بھاری ہو اور

صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗـــًٔا مَّرِيْۗـــــًٔـا

مہر بلا بدل دو پھر اگر وہ خوشی سے اس میں سے کچھ تمہارے لئے چھوڑ دیں تو اسے مزے سے خوشگواری سے کھاؤ[۶۰۷]

اسی سے تعولوا کے معنی لئے گئے ہیں زیادہ بیکر انصاف کا ترک کردینا (غ)، عَوْل کے معنی ہیں فیصلہ میں ظلم کی طرف مائل ہونا (ل) اور اصل میں یہ معنی بھی ثقل سے لئے گئے ہیں اس لئے کہ عال المیزان اس وقت کہا جاتا ہے جب ترازو بوجہ ثقل کے ایک طرف مائل ہوجائے اسی لئے دل کے میلان پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔ اور امام شافعیؒ نے ان لا تعولوا کے معنی لئے ہیں تاکہ تمہارا عیال زیادہ نہ ہو اور کسائیؒ نے بھی عال یعول کے معنی کثرت عیال فصحائے عرب سے نقل کئے ہیں (ر)۔

اصول یہی ہے کہ ایک شوہر کی ایک ہی بی بی ہو

ذالك میں اشارہ فواحدۃ کی طرف ہے یعنی ایک بی بی سے ہی ایک شوہر کا نکاح ہونا زیادہ مناسب ہے تاکہ انسان ناانصافی سے بچا رہے گویا پھر دوسری بار فواحدۃ کے اصول پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ عام لوگوں کے لئے جو اعلیٰ درجہ کا ضبط اور انصاف نہیں رکھتے یہی مناسب ہے کہ وہ ایک ہی بی بی پر کفایت کریں۔ یا کثرت عیالداری کی مصیبت کے نیچے دب جانے سے بچنے کے لئے یہ زیادہ مناسب ہے کہ ایک ہی بی بی ہو پس ان الفاظ سے بھی یہی شہادت ملتی ہے کہ گو اسلام نے بعض ضروریات کے لئے مشروط اجازت تعدد ازدواج کی دی ہے مگر آخر پر پھر سفارش یہی کی ہے کہ اصولاً ایک بی بی اور ایک شوہر کا ہونا ہی زیادہ مناسب طریق ہے اور دوسری بی بی کا عقد نکاح میں لینا اسی صورت میں ہے جب ضروریات انسانی مجبور کردیں۔ ان روکوں کا رکھنا خود بتاتا ہے کہ سخت ضرورت کے سوا تعدد ازدواج جائز نہیں۔

صدقۃ

۶۰۷ صدقات۔ صَدُقَۃ کی جمع ہے جس کا اصل صدق ہے اور صَدَقَۃ وہ مال ہے جو انسان قرب حاصل کرنے کے لئے دیتا ہے۔ اور صَدُقَۃ اور صُدقات اور صِداق عورت کے مہر کو کہا جاتا ہے (غ)۔

نحلۃ

نِحْلَة۔ وہ عطیہ جو تبرع کے طور پر ہو (غ) یعنی اس کا معاوضہ کوئی نہ ہو اور یہ بھی اس کے معنی کئے گئے ہیں کہ بغیر مطالبہ کے طیب نفس سے دے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ نحلۃ سے مراد ھبۃ اس لئے ہے کہ نحل یعنی شہد کی مکھی جب کسی چیز پر بیٹھتی ہے تو اس کو نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ موجب نفع ہوتی ہے۔ اس لفظ سے مہر کی حقیقت پر قرآن کریم نے بڑی روشنی ڈالی ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ وہ کسی چیز کا معاوضہ یا بدل نہیں بلکہ وہ محض عطیہ بلا بدل کے طور پر خاوند کی طرف سے ایک تحفہ ہے۔

مہر عطیہ بلا بدل ہے

هناء

هَنِيْٓـًٔا۔ هَنِیْءٌ۔ هناء سے ہے وہ چیز ہے جس میں کسی قسم کی مشقت نہ ہو۔ اور اصل میں یہ لفظ کھانے پر بولا جاتا ہے۔

مرئ

مَّرِيْٓـًٔا۔ مریء سے ہے۔ اور مَرِیْءٌ اصل میں راس معدہ ہے اور کھانے کے متعلق مَرُؤَ یا مَرِئَ اس حالت میں کہا جاتا ہے جب وہ طبیعت سے موافقت کی وجہ سے معدہ سے مخصوص ہو یا ھنیٔ وہ ہے جس سے کھانے والا لذت حاصل کرے اور مریٔ وہ جو انجام کار اچھا ثابت ہو۔

مہر دینے کی تاکید

چونکہ یتامیٰ کے ذکر میں عورتوں سے نکاح کا ذکر آگیا اور عورتوں کا ایک خاص حق جو اسلام نے ہی دیا ہے مہر ہے۔ اور عورتوں کے حقوق پر بھی اس سورت میں بحث ہونی تھی اس لئے بہ تعلق مضمون نکاح مہر کا ذکر بھی کردیا۔ اس آیت میں اول عورتوں کو مہر دینے کی تاکید فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کو بغیر ان کے مطالبہ کے مہر دیدو اسی لئے لفظ نحلۃ بڑھایا ہے جس میں ساتھ ہی یہ بھی اشارہ کردیا ہے کہ مہر کسی چیز کا معاوضہ قطعاً نہیں بلکہ محض ہبہ بلا بدل کے طور پر ہے اور اس کو قرض کے طور پر تسلیم کرلینا جیسا کہ آجکل رواج ہے اصل غرض کو باطل کرتا اور عورت کو عملاً اس کے حق سے محروم کرتا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ نکاح کرنے سے پیشتر انسان کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ اپنی قوت بازو سے کما کر عورت کو مہر دے سکے اور اس میں مال کمانے کی اہلیت پیدا ہوچکی ہو۔

مہر لڑکی کے والد کا حق نہیں

دوسرا حکم اس لفظ میں اولیا یعنی باپ وغیرہ کو ہے کہ مہر کوئی ایسی چیز نہیں کہ وہ لڑکی کی قیمت کے طور پر خاوند سے وصول

۵ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوهُمْ

اور کم عقل لوگوں کو تم اپنے مال نہ دیدو جنکو اللہ نے تمہارے لئے سہارا بنایا ہو اور تم انہیں انکے ذریعہ سے

فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝

کھانے کیلئے دو اور انہیں کپڑا پہناؤ اور انہیں بھلی بات کہتے رہو ۶۰۸

کریں۔ بلکہ وہ عورت کا مال ہو جو اس کو ملنا چاہئے۔ عرب میں لوگ ایسا کرلیتے تھے جیسا کہ یہ رواج بعض اطراف ہند میں بھی پایا جاتا ہو کہ جب لڑکی کا نکاح کردیتے تو اس کے مہر کو خود وصول کرلیتے پس اس رسم بد سے روکا ہو +

قیام

۶۰۸ قیام۔ قام کا مصدر ہو۔ دیکھو ۵۰۱ مگر قیام اور قِوام کا استعمال اس شئے پر بھی ہو جس کے ذریعہ سے کوئی چیز قایم ہو یا ثابت رہی (رغ) یہی معنی یہاں ہیں یہاں مال کو قیام کہا ہو یعنی وہ تمہاری زندگی کا موجب ہو۔ اور دوسری جگہ انہی معنوں میں فرمایا جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس (المائدۃ ۹۷) +

ارزقوھم فیھا۔ اگر ارزقوھم منہا ہوتا تو اس کے معنی ہوتے کہ اس مال میں سے ان کو کھانے کیلئے دو اور یوں مال ضائع ہوجاتا لیکن فیھا کہکر یہ بتادیا کہ ان اموال کے ذریعہ سے ان کو رزق دو یعنی ان اموال کو ایسے منافع اور آمدنی کا ذریعہ بناؤ کہ اس نفع یا آمدنی سے ان کا گزارہ ہوتا رہے +

جو لوگ مال کو ترقی نہیں دے سکتے وہ سفہا ہیں

اس آیت میں یتامیٰ کے ذکر کی طرف رجوع کیا ہو مگر بجائے صرف یتامیٰ کا نام لینے کے اس قسم کے تمام لوگوں کو داخل کرلیا ہو۔ سفہا، سے کیا مراد ہو وہ ارزقوھم فیھا فرماکر بتادیا ہو۔ کیونکہ جب ان کو مال نہ دیا تو اب یہ حکم دیا کہ راس المال کو ایسے کم عقلوں کے ولی تباہ نہ کریں بلکہ اس مال کو تجارت یا کسی اور کام پر لگا کر اس کے منافع یا آمدنی سے ان کا گزارہ چلائیں۔ پس جو لوگ کسی قسم کی تجارت یا کوئی اور شغل معاش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور اپنے راس المال کو تباہ کرتے چلے جاتے ہیں وہ سب کم عقلوں میں داخل ہیں۔ ان کے سپرد مال کرنے کی بجائے یہ حکم دیا کہ ان اموال کو تم کسی تجارت وغیرہ میں لگاؤ اور منافع سے ان کو کھانے پینے کو دو۔ یہاں مخاطب حکام ہیں۔ اسی لئے اموالکم کہا کیونکہ فرداً فرداً جس قدر اموال ہیں وہ درحقیقت قوم کے اموال ہیں۔ اور جس قدر مال ضائع ہوگا وہ قومی نقصان ہو۔ اسی لئے اموال کو قیام یعنی قوم کے بقا کا موجب قرار دیا ہو جس قوم کا مال تباہ ہوجاتا ہو وہ گرجاتی ہو +

یتامیٰ وغیرہ کی تربیت

علاوہ کھانے اور لباس کے ایک اور ضرورت بتائی وقولوا لھم قولاً معروفاً۔ ان کو بھلی بات کہتے رہو مفسرین نے عموماً نصیحت کے چند فقرے اس سے مراد لئے ہیں مگر قفال کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ غلاموں کی سی معاشرت نہ کرو بلکہ ان کو نیکیوں کی طرف توجہ دلاتے رہو اور بتاتے رہو کہ اسراف مال کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک اس میں ان کی تربیت کے اہتمام کی ضرورت بتائی ہو۔ اور اسی لئے کھانے اور پہننے کے ساتھ اس کو تیسری ضرورت بتایا ہو یعنی ان کی تربیت پر روپیہ خرچ کرتے رہو۔ چنانچہ اگلی آیت میں جو فرمایا ہ وابتلوا الیتامیٰ وہ اسی کی طرف اشارہ ہو کہ جب ان کی تربیت کا اہتمام کرو تو ساتھ ہی ان کا امتحان بھی لیتے رہو کہ آیا وہ جائداد کو سنبھالنے کے قابل ہوگئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہو کہ قول معروف صرف معمولی نصیحت کا نام نہیں بلکہ اچھے اصول پر تربیت کرنا بھی قول معروف میں داخل ہو +

حفاظت مال کی تاکید

قرآن شریف میں بار بار اموال کی حفاظت کا حکم وہ اس کے متعلق قوانین بتائے گئے ہیں جو شاید اور کسی مذہبی کتاب میں نہیں پائے جاتے۔ کہیں تجارتوں کا ذکر ہو کہیں لین دین کا ذکر ہو کہیں رہن کا ذکر ہے کہیں وصایا کو ضروری ٹھہرایا ہو کہیں

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَإِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا ٦

اور یتیموں کا امتحان لیتے رہو یہانتک کہ جب وہ شادی (کی عمر) کو پہنچ جائیں۔ تب اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ

فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ

تو انکے مال انکے حوالے کردو اور فضولخرچی سے اور جلدی کرکے انکو کھا نہ جاؤ کہ وہ بڑے ہو جائینگے ۶۰۹

مال متروکہ کے حصے بتاتے ہیں کہیں عورتوں کو مہر میں سونے کے ڈھیر دینے کا ذکر ہو کہیں اموال کی حفاظت کے لئے تحریر اور گواہی کو ضروری بنایا جاتا ہو کہیں اموال کا ٹھیک انتظام نہ کرنے والوں کے لئے ولی مقرر کرنے کی ہدایت ہو۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ مال دنیا کو اسلام نے حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ بلکہ اس کی حفاظت کی سخت تاکید فرمائی ہو اور یوں اس کو ایک مذہبی فریضہ قرار دیا ہو۔ اور مال دنیا کی جہاں تحقیر کی ہو تو وہ صرف اس بات کو ظاہر کرنے کیلئے ہو کہ زندگی کا مقصد حصول اور فراہمی مال کو نہ سمجھ لیا جائے۔

صغرسنی کی شادی — ۶۰۹ بلغوا النکاح۔ نکاح کے اصل معنی عقد یعنی شادی ہیں اور یہاں نکاح سے پہنچنے کو مراد حد بلوغ کو پہنچنا ہو۔ یعنی اس عمر کو جس میں انسان اس قابل ہوتا ہو کہ اس کی شادی کی جائے۔ بلوغ کی بجائے لفظ نکاح رکھنے میں یہ بھی اشارہ ہو کہ نکاح یا عقد کا تعلق بلوغ سے ہو۔ کیونکہ یہاں نکاح اور بلوغ کو ہم معنی قرار دیا ہو۔ پس صغرسنی میں شادی کرنا ٹھیک نہیں۔

سن بلوغ — بلوغ کا سن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اٹھارہ سال اور امام شافعیؒ کے نزدیک پندرہ سال ہو۔ اور ابن عباس سے بھی لڑکے کے بلوغ کو پہنچنے کی عمر اٹھارہ سال ہونے پر روایت ہے (د) صحیحین میں حدیث ہو کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں اُحد کے دن چودہ سال کا تھا تو جب میں آنحضرتؐ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے جنگ میں نکلنے کی مجھے اجازت نہ دی۔ اور خندق کے دن میں پندرہ سال کا تھا تو آپ نے اجازت دیدی۔ مگر جنگ میں نکلنے کا تعلق قوائے جسمانی پر ہو۔ اور یہ بھی حدیث سے معلوم نہیں ہوتا کہ ابن عمرؓ کی عمر کا سوال نبی کریم صلعم کے سامنے پیش ہوا اس لئے محض اس بنا پر سن بلوغ کا فیصلہ نہیں ہو سکتا +

انس — اٰنَسْتُم۔ اٰنَسَ الشَّیْءَ (مادہ انس) کے معنی ہیں اَحَسَّہٗ یعنی اس کو محسوس کیا یا عَلِمَہٗ اس کو جانا (ل) +

رشد — رُشْدًا۔ رُشْد کے اصل معنی کسی امر کی طرف ہدایت پانا ہیں۔ اور وہ غیّ کا نقیض ہو۔ حدیث میں ہو تؤنس منہ الی رشد جس کے معنی ابن اثیر نے کئے ہیں کہ اس میں عقل کی پختگی اور فعل کی درستی اور اچھا تصرف جانا جائے (ن) یہاں یہی مراد ہو اور ایک رُشد ہو جو امور اُخروی میں ہدایت کی طرف لیجاتا ہو ولقد اٰتینا ابراھیم رُشدہٗ من قبل (الانبیاء ۲۱-۵۱) +

بدادا۔ بدر — بِدَارًا۔ بَدَرَ کے معنی اَسْرَعَ یا جلدی کی ہیں اور بِدار مصدر ہو۔ اور بَدْر پورے چاند کو کہتے ہیں اس لئے کہ وہ سورج کے غروب کے بعد فوراً نمودار ہو جاتا ہو گویا اس نے مبادرت سے غروب آفتاب کو پا لیا +

چونکہ پچھلی آیت میں یتامیٰ وغیرہ کی تربیت کا ذکر تھا۔ اس لئے اب فرمایا کہ اس تربیت کا نتیجہ بھی معلوم کرتے رہو کہ وہ کس قدر ترقی کر رہے ہیں۔ اور کس قدر اہلیت اپنے اپنے کاروبار کی موزونیت کی ان میں پیدا ہو رہی ہو۔ اور یہ انتظام اس وقت تک رہو کہ وہ حد بلوغ کو پہنچ جائیں۔ لیکن حد بلوغ کو پہنچنے پر بھی مال اس صورت میں ان کے حوالہ کیا جائے کہ ان میں عقل کی پختگی اور اموال میں حسن تصرف اور ضبط وغیرہ کی قوت ان میں دیکھو۔ گویا مال ان کے سپرد کرنے کی دو شرطیں ہیں ایک بلوغ اور دوم پختگی عقل اور پھر چونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہو کہ جب مالک اموال بلوغ کو پہنچنے والا ہوتا ہو تو ولی اس خیال سے کہ اب تو وہ اپنے مال کو اپنے تصرف میں لے لیگا۔ اس میں اسراف وغیرہ کرتے ہیں۔ اس لئے اس سے بھی روکا +

تربیت اولاد — یہاں جو کچھ ہدایات یتامیٰ کے متعلق دی ہیں ان میں عام طور پر تربیت اطفال کی صورت بھی سمجھادی ہو کیونکہ جو کچھ ایک ولی کا

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ

اور جو امیر ہے چاہئے کہ وہ رُکا رہے اور جو حاجتمند ہے تو وہ مناسب طور پر لے لے ۶۱۰

فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝

پھر جب تم ان کے مال ان کے حوالے کرو تو ان کے سامنے گواہ کرلو اور اللہ کافی حساب لینے والا ہے ۶۱۱

یتیم کے متعلق فرض ہو وہ باپ کا بیٹے کے متعلق بطریق اولیٰ ہو پس ہر والد کا یہ فرض ہو کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت قول معروف کیساتھ کرے یعنی اس کو نیکی کی راہ بھی بتائے اور اس کو معاش پیدا کرنے کے قابل بھی بنائے۔ پھر دیکھتا رہو کہ کس قدر ترقی وہ کررہے ہیں۔ یہاں تک کہ بلوغ کو پہنچنے تک ان میں عام طور پر رشد پیدا ہو جانا چاہئے یعنی ان کو اموال میں ضبط و تصرف کے قابل ہو جانا چاہئے۔ اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں نے اس فرض سے سخت غفلت اختیار کر رکھی ہو اور وہ اپنی اولاد کو اس قابل بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ امراء کے بچے تو عموماً ایسے فضول خرچ اور عیاش ہو جاتے ہیں کہ سوائے والدین کے مال کو تباہ کرنے کے اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ متوسط الحال لوگ بھی اپنی اولاد کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں ان کی تعلیم و تربیت پر کچھ خرچ کرنا بوجھ سمجھتے ہیں۔ ہر والد کا پہلا فرض یہ نہیں جیسا کہ آجکل مسلمانوں نے سمجھا ہوا ہے کہ اس کی شادی کردی بلکہ یہ ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت کرکے اس کی حیثیت کے مطابق اسے معاش پیدا کرنے اور نیکی کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنائے شادی کرنا اس کا اپنا کام ہو جب کمانے کے قابل ہو جائیگا تو خود شادی کرلیگا۔

عفة

۶۱۰ یستعفف۔ اس کا مادہ عفّ ہو۔ اور عِفّة کے اصل معنی ہیں تھوڑی چیز کے پا لینے پر اپنے آپکو روک لینا۔ کیونکہ عُفافة یا عُفّة کسی چیز کے بقیہ کو کہتے ہیں (غ) اور اسی سے عِفّة کے مشہور معنی پاکدامنی ہیں یعنی انسان میں ایک ایسی حالت کا پیدا ہونا کہ غلبہ شہوت سے رُکا رہے۔ اور استعفاف میں بوجہ تکلف مبالغہ ہو۔ کیونکہ اس کے اصل معنی ہیں طلب عفت۔ اور یہاں مراد صرف رکے رہنا ہو یعنی یتیم کا مال کھانے سے رُکنا ہو +

استعفاف

فقر

فقیر۔ فقر سے ہو جس کا استعمال چار طرح پر ہو۔ اول ضروری حاجت کا پایا جانا جو سب انسانوں کیلئے عام ہو۔ بلکہ کل موجودات کیلئے جیسا کہ فرمایا یایہا الناس انتم الفقراء الی اللہ (فاطر ۳۵ : ۱۵) یعنی تم سب اللہ کے محتاج ہو۔ دوسرا فقر مال کا نہ ہونا ہو جیسے انما الصدقات للفقراء تیسرا نفس کا فقر ہو جو غنائے نفس کے مقابل پر ہو۔ اور یہ حرص اور لالچ ہو۔ اور چوتھا فقر وہ ہو جو اللہ کی جناب میں انسان کو ہونا چاہئے جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہو اَللّٰھُمَّ اَغْنِنِی بِالْاِفْتِقَارِ اِلَیْکَ وَلَا تُفْقِرْنِی بِالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْکَ اے اللہ مجھے اپنا فقیر بنا کر غنی کردے اور اپنی طرف سے لاپروا کرکر فقیر نہ بنائیو۔ اس معنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہو ربّ انی لما انزلت الیّ من خیر فقیر (القصص ۲۸ : ۲۴) اور یہاں لفظ فقیر اول الذکر معنی میں استعمال ہوا ہو یعنی حاجتمند کے معنی میں اور اس کے مقابلہ پر غنی سے مراد یہ ہو کہ اس کے ذرائع آمد وغیرہ ایسے ہیں کہ اس کو مال یتیم سے لینے کی کچھ احتیاج نہیں +

مال یتیم سے حق الخدمت

چونکہ یتامیٰ کے ولیوں کو ان کے مال میں ہر قسم کے تصرف سے روکا تھا اسلئے اب یہ بھی بتانا ضروری تھا کہ بطور حق الخدمت بھی کچھ لینا جائز ہو یا نہیں۔ سو حق الخدمت کو بھی اس حد تک محدود کردیا کہ جو شخص انتظام کرتا ہو وہ اپنا کوئی ذریعہ معاش نہیں رکھتا تو لے سکتا ہو ورنہ نہیں +

حسب حسیب

۶۱۱ حسیب حَسْب کے معنی کفایۃ ہیں۔ جیسے حسبنا اللہ (التوبۃ ۹ : ۵۹) وحسبہم جہنم (المجادلۃ ۵۸ : ۸) اور حساب کے معنی مشہور ہیں پس حسیب کے معنی یا تو کافی ہیں۔ اور یا محاسب یعنی حساب لینے والا اور گو حسیب اور محاسب کے معنی صرف حساب لینے والے کے ہیں لیکن مراد اس سے مکافی بالحساب ہیں یعنی حساب لیکر بدلہ دینے والا +

اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت حساب کی طرف توجہ دلاکر ہر قسم کی زیادتی سے روکا ہو کیونکہ صرف ہدایات کا دینا کافی

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا

مردوں کے لئے اس سے ایک حصہ ہو جو ان کے والدین اور قریبی چھوڑیں اور عورتوں کے لئے اس سے ایک حصہ ہو جو (انکے)

تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝

والدین اور قریبی چھوڑیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت - ایک مقرر حصہ ۶۱۲

نہیں جبتک کہ کوئی روکنے والی طاقت ساتھ نہ ہو۔ سو اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات ہی وہ چیز ہیں جو انسان کو مخفی سے مخفی گناہوں سے روک سکتی ہیں +

جاہلیت میں یتامیٰ کی ورثہ سے محرومیت

۶۱۲ یہاں سے وراثت کا مضمون شروع ہوتا ہے مگر اصل غرض اب بھی یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت ہی ہے۔ کیونکہ یتامیٰ کو خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں میراث سے حصہ نہ دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ عرب کے لوگ کہتے تھے لا یرث الا من قاتل علی ظہور الخیل کوئی ورثہ نہیں لے سکتا مگر وہ جو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر جنگ کرتا ہے۔ چنانچہ جب اُم کحۃ نے رسول اللہ صلعم سے شکایت کی کہ اس کے خاوند اوس بن ثابت کے ترکہ میں سے اس کی بیٹیوں کو کوئی حصہ نہیں ملا اور کل پر اس کے بھائی قابض ہو گئے ہیں۔ تو انہوں نے رسول اللہ صلعم سے یہی عرض کیا تھا یا رسول اللہ ولدھا لا یرکب فرسا ولا یحمل کلا ولا ینکی عدوا یعنی اس کی اولاد نہ گھوڑے پر سوار ہوتی ہے نہ بوجھ اٹھاتی ہے نہ دشمن کو مارتی ہے۔ پس اس آیت نے ایک نہایت قدیم رسم کو موقوف کیا اور ترکہ میں مرد و عورت۔ بڑے اور چھوٹے۔ جنگ کرنے والے اور گھر بیٹھنے والے سب کو یکساں حصہ دار قرار دیا +

آنحضرتؐ کی قوت قدسی کا کمال۔

کسی پیغمبر کی زندگی میں اس کمال قوت قدسی کا نظارہ نظر نہیں آتا کہ سینکڑوں یا ہزاروں سالوں کی دیرینہ رسموں کو ایک لفظ سے نابود کر دیا ہو تقسیم مال کے معاملہ میں کسی انقلاب کے ایک لفظ سے پیدا ہو جانے پر تاریخ شہادت دینے سے عاجز ہے بڑے بڑے اولوا العزم نبی دنیا میں ہوئے مگر یہ قوت کسی کو نہ ملی جس کا نظارہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک ایک واقعہ میں نظر آتا ہے تمام رسوم و رواج کی خطرناک زنجیریں اور طوق ایک اشارہ سے کٹ جاتے ہیں صدیوں کی عادات جو طبائع انسانی میں پہاڑوں کی طرح قایم ہو چکے تھے۔ ایک پھونک سے اُڑ جاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس انسان کے سامنے کوئی چیز انہونی نہیں کوئی کام ناممکن نہیں۔ ملک عرب میں خدا جانے کب سے یہ رواج جاری تھا کہ ورثہ صرف ان لوگوں کو پہنچ سکتا ہے جو ملک یا قوم کی حفاظت کر سکتے ہیں جو کما کر کھلانے کی طاقت رکھتے ہیں اور کس قدر استحکام یہ حاصل کر چکا تھا عورتوں اور بچوں کی حمایت میں کب کسی نے آواز اُٹھائی۔ اور جب تمام ملک کے اہل الرائے تمام بہادر تمام سپاہی تمام شیخ اسباب پر متفق الرائے ہوں تو کون اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت کر سکتا ہے بیکس یتیم

آپکی یتیموں اور بیواؤں کی بے نظیر حمایت

اور عاجز عورتیں کیا اپنے ہی حامیوں اپنے ہی محافظوں کے خلاف آواز اٹھا سکتی تھیں؟ ہرگز نہیں۔ مگر آسمان سے ایک آواز آتی ہے اور اس کے سامنے تمام گردنیں جھک جاتی ہیں۔ ایک بادشاہ جس کی زندگی کا انحصار اس کے سپاہیوں کی بہادری پر اور ان کے تلوار چلانے پر ہو کیا وہ ان سپاہیوں کے حقوق چھین کر دوسروں کو دینے کا کبھی خیال بھی کر سکتا ہے۔ محمد رسول اللہ کے دشمن آئیں اور یہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا کے کسی بادشاہ سے مقابلہ کر کے دکھائیں۔ آپ کو اپنے سپاہیوں کی اسی طرح رعایت اور دلداری منظور تھی جیسا جنگ کے وقت سب بادشاہوں کو ہوتی ہے مگر بیکس بچوں اور ناتوان عورتوں کے حقوق کے سامنے اپنے سپاہیوں کی رعایت کرنا تو ایک طرف رہا ان سپاہیوں کے صدیوں کے قایم شدہ

۸ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا

اور جب تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو ان کو اس میں سے کچھ دو اور انکو

۹ لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا

اچھی بات کہو ۶۱۳ اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئیے جو اگر اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑیں تو ان کے لئے ڈرتے

۱۰ عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ

ہوں پس چاہئیے کہ اللہ کا تقویٰ کریں اور چاہئیے کہ سیدھی بات کریں ۶۱۴ جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے

ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۝

ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ ہی کھاتے ہیں اور وہ بھڑکائی ہوئی آگ میں داخل ہونگے ۶۱۵

حقوق کو چھین کر یتیموں اور بیواؤں کو دلاتے ہیں۔ اور آپکے پیروؤں کی جاں نثاری بھی دنیا میں ایسی عدیم المثال ہو کہ وہ بغیر چون و چرا کے اپنے حقوق کو چھوڑ دیتے ہیں یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی تھی جس نے دنیا میں ایسے ایسے انقلاب پیدا کر کے دکھائے جن کی نظیر دنیا میں کوئی دوسرا انسان نہیں دکھا سکتا۔ اور یہ انقلاب قوت ملکی کے بھروسہ پر نہیں قوت قومی کی حمایت سے نہیں بلکہ قوت ملکی اور قوت قومی کے مقابلہ میں کر کے دکھائے +

تقسیم ترکہ کے وقت غربا کو کچھ دینا

۶۱۳ القسمۃ۔ سے مراد تقسیم مال وراثت ہو یا وصیت کی تقسیم۔ اذا حضر القسمۃ سے یہ مراد نہیں کہ وہ اس وقت آکر دست سوال دراز کریں تو ہی ان کو کچھ دینا چاہئیے بلکہ ان کی محض موجودگی مراد ہے خواہ وہ کہیں ہوں۔ اس آیت میں بتایا کہ ایک تو وہ ہیں جن کے حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے لیکن ان کے علاوہ دوسرے قریبیوں کو (جن کو یہاں اولی القربیٰ کہا گیا ہو) اور مسکینوں اور یتیموں کو بھی فائدہ پہنچانا چاہئیے۔ یہ وسعت تعلیم اسلام سے خاص ہو۔ چونکہ بعض مفسرین نے قسمۃ کے معنی وصیت کی تقسیم کو بھی لیا ہو۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں دونوں قسمتیں مراد ہیں۔ اگر شخص متوفی خود اپنے قریبی رشتہ داروں کے لئے (جو معین حصہ نہیں لیتے) یا مسکینوں یتیموں کے لئے اپنے مال کے کسی حصہ کی وصیت کرے تو بہتر ورنہ تقسیم ترکہ کے وقت ان کو کچھ دے دیا جائے۔ بعض لوگوں نے اس آیت کو بھی منسوخ کہدیا ہو جس کی تردید بخاری میں حضرت ابن عباس کی روایت سے موجود ہو یعنی آپ نے فرمایا کہ یہ آیت محکم ہو منسوخ نہیں +

سدا۔ سدیدا

۶۱۴ سدیدا۔ سدّ سے ہو جس کے معنی کسی اختلال کا بند کر دینا یا روک دینا ہیں اسی لئے قول سدید اس بات کو کہا جاتا ہے جو صواب یعنی صحیح موقعہ پر پہنچنے والی ہو۔ کیونکہ وہ اختلال کو روک دیتی ہے یا سداد یعنی قصد کو حاصل کر لیتی ہو +

یہ فطرت انسانی کو اپیل کی ہو کہ جس طرح اگر تم مر جاؤ اور تمہاری چھوٹی چھوٹی اولاد رہ جائے تو تم یہ چاہتے ہو کہ دوسرے اس پر رحم کریں اور اس کے متکفل ہوں اسی طرح تم مسکینوں اور یتیموں کی خبر گیری کرو +

سعر۔ سعیر

۶۱۵ سعیرا۔ سَعَر کے معنی التہاب النار یا آگ کا شعلے مارنا یا بھڑکنا ہیں اور سعیر بمعنی مسعورۃ ہو یعنی بھڑکائی گئی آگ۔

اس آیت کے ساتھ چونکہ مضمون اور رکوع ختم ہوتا ہو اس لئے پھر یتامیٰ کے مال کھانے کے جرم سے ڈرایا ہو اور بتایا ہو کہ مال یتیم کا کھانا گویا آگ کا کھانا ہو۔ اور آگ کا کھانا بطور مجاز ہو۔ اور ان اسباب کا مہیا کرنا مراد ہو جو انسان کو آگ میں لے جائینگے +

ع ۲

تقسیم وراثت

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۞

۱۱

اللہ تمہاری اولاد کے متعلق تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے[۶۱۶]

ولد

۶۱۶ اولاد۔ وَلَد کی جمع ہے جس کے معنی مطلق مولود ہیں یعنی جنا گیا اور واحد و جمع میں۔ چھوٹے اور بڑے پر (غ)، مذکر و مؤنث پر (خق)، اور ولد الولد یعنی پوتے پر اس کا استعمال جائز ہے ✦

اسلام کا قانون وراثت

اس رکوع میں ورثاء کے مختلف حصص بتلاتے ہیں۔ عرب میں جائداد متروکہ کا کوئی حصہ ضعفاء یعنی عورتوں اور چھوٹے بچوں کو نہ ملتا تھا۔ اسلام نے ہر ایک شخص کی متروکہ جائداد کے چند حصے کر دیئے ہیں۔ کچھ خاوند یا بی بی کو مل جاتا ہے۔ کچھ ماں باپ کو کچھ اولاد کو۔ اور بعض حالات میں بھائیوں بہنوں کو۔ یا قریبی رشتہ داروں کے نہ ہونے کی صورت میں دور کے رشتہ داروں کو گویا ہر شخص کی جائداد میں سے ان لوگوں کو حصہ دیا ہے جن سے انسان کو کچھ نفع عام طور پر پہنچتا رہتا ہے۔ اس لئے وراثت کو سب میں تقسیم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ تا سب وہ لوگ جن سے انسان کو منفعت پہنچتی ہے اس سے منفعت حاصل کریں ✦

تقسیم وراثت میں اصول جمہوریت

اسلام کا اصول تقسیم وراثت حقوق انسانی کی مساوات پر مبنی ہے۔ اولاد میں ایک مساوات ہے وہ سب حصہ دار ہونے چاہئیں۔ نہیں کہ بیٹیوں کو محروم کر دیا جائے اور بیٹوں کو ساری جائداد دیجائے۔ اور نہ ہی یہ قرین انصاف ہے کہ ساری اولاد کو محروم کر کے ایک سپرد کل جائداد کر دیجائے جیسا کہ بعض ممالک میں سب سے بڑا بیٹا ساری جائداد کا مالک ہو جاتا ہے۔ اور باقی سب اولاد محروم رہ جاتی ہے۔ اسطرح پر اگر میاں بی بی کی جائداد کا وارث ہو سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ بی بی میاں کی جائداد میں سے حصہ نہ لے۔ اسی طرح ماں باپ کے حقوق ہیں۔ گویا اس تقسیم وراثت میں بھی اسلام نے جمہوریت کا اصول قایم کیا ہے کہ جن کے یکساں حقوق ہیں وہ سب اپنے حقوق کو پائیں۔ رہا جائدادوں کا بننا یا تقسیم ہونا سو جس طرح ایک انسان اپنی سعی اور کوشش سے ایک جائداد بنا سکتا ہے۔ اسی طرح دوسرا بھی بنا سکتا ہے۔ جو قوتیں ایک انسان کو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں وہی دوسرے کو بھی دی ہیں جو سامان ایک کے لئے مہیا کئے ہیں وہی دوسرے کے لئے بھی مہیا کئے ہیں۔ پس جو مساوات قانون قدرت میں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے اسی کو تقسیم وراثت میں مد نظر رکھا ہے ✦

تقسیم دولت کا صحیح اصول

اگر غور کیا جائے تو اسلام نے چار اصول قایم کر کے تقسیم دولت کا صحیح اصول قایم کیا ہے۔ اور موجودہ زمانہ کی مشکلات تقسیم دولت کا علاج اگر یورپ کو کبھی ملے گا تو صرف تعلیم اسلام میں۔ یورپ میں دو خیالات کی رو اس وقت چل رہی ہے۔ ایک خیال تو یہ ہے کہ ہر ایک فرد اپنی کوشش اور محنت سے جس قدر مال حاصل کرے وہ سب اس کا مال ہے۔ اسی خیال کے ماتحت یورپ میں حد درجہ کی خود غرضی بڑھ گئی ہے۔ اور ملک کی دولت عوام کے ہاتھ سے نکل کر چند افراد کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر حصہ نسل انسانی کا معمولی سامان معیشت سے بھی محروم ہے اور چند کس کروڑ پتی ہیں۔ اس نقص کو دیکھ کر ایک دوسرا خیال پیدا ہوا ہے جو بولشوزم کے نام سے موسوم ہے جس کا اصول یہ ہے کہ سب انسان ملک کی دولت میں یکساں حصہ دار ہیں سب کوشش کریں مگر ان کی کوشش کا ثمر جو کچھ ہو وہ سب مشترک ہونا چاہئے اور سب کو دولت کا یکساں حصہ ملنا چاہئے۔ مگر اس تحریک میں یہ نقص ہے کہ جب ہر ایک شخص اپنی کوشش سے جو کچھ حاصل کرے اس کا مالک نہیں تو زیادہ محنت اور کوشش کے لئے کوئی تحریص باقی نہ رہے گی۔

بولشوزم

اسلام نے اگر ایک طرف لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کا اصول قایم کیا ہے یعنی جو انسان جس کے لئے کوشش کرے وہ اس کا مال ہے۔ تو دوسری طرف اس بات کو روکنے کے لئے کہ دولت چند مخصوص ہاتھوں میں جمع ہوتی چلی جائے کچھ علاج تجویز کر دیئے گئے ہیں۔ انہی علاجوں میں سے ایک زکاۃ ہے جس کے ذریعہ سے جمع شدہ دولت کا جو دولتمندوں کے قبضہ میں ہو چالیسواں حصہ ہر سال کے آخر میں نکل کر غربا کو ملتا رہتا ہے۔ دوسرا سود کی ممانعت ہے یعنی ایسے لوگوں سے جو بوجہ تنگدستی قرضہ لینے کے محتاج ہوتے ہیں سود نہ لیا جائے۔ تیسرا یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو جو اپنی موت کے وقت مال چھوڑتا ہے یہ حکم دیا ہے

تقسیم دولت میں مساوات قایم رکھنے کے لئے چار علاج

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ

مرد کیلئے دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہو۔ پھر اگر (اولادیں) دو (یا اس) سے اوپر عورتیں ہوں تو انکیلئے اسکی دو تہائی ہو جو چھوڑا [۱۶۱۶]

کا اسکا کچھ حصہ خیراتی کاموں کے لئے وصیت کرے اور چوتھا اصول خود تقسیم ترکہ کا اصول ہے۔ جو ہر حال میں چند نہایت قریبی رشتہ داروں میں قریبًا یکساں تقسیم ہو جاتا ہے۔ عرب کے ملک میں آج سے تیرہ سو سال پیشتر ایک اُمّی محض ان مشکلات کا حل بتا دیتا ہے جو آج بڑی بڑی مہذب قوموں کو پیش آ رہی ہیں کیا یہ اسلام کے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منجانب اللہ ہونے کا ایک کھلا کھلا نشان نہیں ؟

حقوق وراثت کن باتوں سے پیدا ہوتے ہیں

وراثت کے لئے اسلام نے ذیل کے حقوق قرار دئے ہیں۔ اول قرابت۔ جیسے اولاد۔ ماں باپ۔ بھائی بہن۔ دوسرے نکاح یعنی خاوند بیوی۔ ان دونوں کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے۔ تیسرا حق ولاء قرار دیا ہے جو مخصوص حالات سے تعلق رکھتا ہے اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے یعنی جو شخص ایک غلام کو آزاد کرے۔ تو وہ آزاد کرنے والا اس کا وارث ہو جاتا ہے۔ اور چوتھا حق اخوت اسلامی کا ہے جو اس صورت میں قایم ہوتا ہے جب وارث کوئی نہ ملے۔ اس صورت میں ترکہ بیت المال میں مسلمانوں کی عامہ بھلائی میں صرف ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض ذمہ واریوں کی ادائگی بھی خاص حالات میں بیت المال کے ذمہ ہوتی ہے اور اس کی بنا بھی حدیث پر ہی ہے کہ آپ نے فرمایا انا وارث من لا وارث لہ۔ جس کا کوئی وارث نہیں۔ میں اس کا وارث ہوں ۔

ظاہر ہے کہ اصل حق قرابت اور زوجیت کا ہی ہے اور اسی پر قرآن کریم نے چند ہدایات دی ہیں۔ اور ترتیب جس سے وارثوں کا ذکر کیا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی حکمت پر مبنی ہے۔ یعنی سب سے پہلے اولاد کا ذکر کیا اور اس کے بعد ماں باپ کا۔ قرابت میں اول درجہ کا حق انہی دو کا ہے۔ اس کے بعد خاوند بیوی کے حصوں کا ذکر کیا۔ اور بھائیوں کے حق کو پیچھے رکھا۔ اس لئے کہ گو بھائیوں کا حق قرابت کے لحاظ سے ہے۔ مگر حق زوجیت بھائیوں کے حق قرابت پر فائق ہے اور بہن بھائی عمومًا صرف اس صورت میں لیتے ہیں جب اول درجہ کی قرابت والے نہ ہوں ۔

۱۶۱۶ فوق اثنتین کے معنی دو سے اوپر ہیں۔ مگر چونکہ یہاں دو کا حکم علیحدہ نہیں اور وہ بھی جماعت میں داخل ہیں اس لئے مراد فوق اثنتین سے دو اور دو سے اوپر ہیں۔ اس کی مثال حدیث میں ہے لا تسافر المرأۃ سفرا فوق ثلاثۃ ایام الا ومعہا زوجہا او ذو محرم لہا جس کے معنی ہیں کہ کوئی عورت تین یا تین دن سے زیادہ سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ اس کا خاوند یا ذو محرم ہو اور قرآن کریم میں ہے۔ فاضربوا فوق الاعناق (الانفال - ۱۲) جہاں مراد گردن کاٹنا ہے۔ نہ گردن کے اوپر۔ علاوہ ازیں اس سورت کے آخر پر بعض حالات میں دو بہنوں کا حصہ دو تہائی قرار دیا ہے فان کانتا اثنتین فلہما الثلثن مما ترک (۱۷۷)۔ لیکن وہاں دو سے زیادہ بہنوں کے حصہ کا ذکر نہیں۔ تو چونکہ قرآن کریم کی بعض آیات بعض کی تفسیر کرتی ہیں اس لئے اگر ایک جگہ دو لڑکیوں سے زیادہ کے حصہ کا ذکر ہے اور دو کا نہیں اور دوسری جگہ دو بہنوں کے حصہ کا ذکر ہے اور دو سے زیادہ کے حصے کا ذکر نہیں اور باقی امور میں وہ یکساں ہیں تو صاف طور پر سمجھ آتا ہے کہ دو لڑکیوں کا حصہ دو بہنوں سے کم نہیں ہو سکتا اور دو سے زیادہ بہنوں کا حصہ دو سے زیادہ لڑکیوں کے حصہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا پس قرآن کریم کا ایسے موقعوں پر اجمال کو اختیار کرنا اسطرف توجہ دلانے کیلئے ہے کہ اس کی وضاحت خود دوسری جگہ قرآن شریف میں موجود ہے ۔

وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا

اور اگر اکیلی ہو تو اس کے لئے نصف ہے ۶۱۷ اور اسکے ماں باپ کیلئے دونوں میں سے ہر ایک کیلئے اسکا چھٹا حصہ ہے جو

تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ وَلَدٌ وَّوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ

چھوڑا ہے اگر اس کی اولاد ہو لیکن اگر اس کی اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ ہی اسکے وارث ہوں تو اسکی ماں کیلئے تیسرا حصہ ہے

اولاد کا حق وراثت

۶۱۷ سب سے پہلے جیسا کہ حق تھا اولاد کا ذکر کیا۔ کیونکہ ایک تو اولاد کی پرورش ماں باپ کے ذمہ ہوتی ہے۔ دوسرے عموماً ماں باپ کی وفات سے اولاد ترکہ کو لیتی ہے۔ اور اولاد کی وفات سے ماں باپ کا ترکہ کو لینا کم واقع ہوتا ہے سب سے پہلی صورت یہ ہے کہ صرف اولاد ہی لینے والی ہو۔ اور اس میں اول اس صورت کو لیا کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان میں تقسیم وراثت کا یہ قاعدہ بتایا ہے کہ لڑکے کا حصہ لڑکی سے دوچند ہو۔ اور اس طرح ساری جائداد تقسیم ہو۔ اس صورت کا ذکر نہیں کیا جس میں صرف لڑکے ہوں اس لئے کہ وہ خود اس سے ظاہر ہے۔ اور جب صرف لڑکیاں ہی ہوں تو اس صورت میں فرمایا کہ ایک لڑکی ہو تو جائداد کی نصف کی وہ مالک ہوگی۔ باقی دور کے رشتہ داروں کو جائیگی۔ اور اگر دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو وہ سب بحصہ مساوی دو تہائی جائداد لینگی اور باقی ایک تہائی دور رشتہ داروں کو جائیگی۔ یہ تقسیم صرف اس صورت میں ہے جہاں اولاد کے ساتھ ماں باپ یا خاوند لینے والے نہیں ✦

پوتے کا حق

بظاہر یہاں صرف اولاد کا ذکر ہے یعنی بیٹوں اور بیٹیوں کا لیکن چونکہ لفظ ولد کا وسیع مفہوم ہے اس لئے اس میں اولاد کی اولاد بھی داخل ہے۔ مگر یہاں پر تعامل نے کچھ تفریق کر دی ہے یعنی اول تو بیٹی کی اولاد کو ورثا میں شامل نہیں کیا اور دوسرے بیٹوں کی اولاد کو اس صورت میں ورثا میں شامل کیا ہے۔ جب کوئی زندہ بیٹا موجود نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص کے دو زندہ بیٹے ہیں اور ایک بیٹے کی جو مر چکا ہے اولاد موجود ہے۔ تو اس بیٹے کی اولاد کو باقی بیٹوں کے ساتھ حصہ نہ دیا جائے گا۔ ہاں بروئے وصیت ان کو متوفی کچھ حصہ دے سکتا ہے جس کے لئے پہلے حکم بھی آ چکا ہے۔ اور اگر کوئی بیٹا زندہ نہ ہو تو پھر بیٹوں کی اولاد ان بیٹوں کے قایم مقام سمجھی جائے گی مگر قرآن کریم کے کوئی لفظ یہ ہدایت نہیں کرتے نہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسا فیصلہ کیا کہ ایک متوفی بیٹے کی اولاد کو زندہ بیٹوں کے ساتھ اپنے متوفی دادا کا حصہ لینے سے محروم کر دیا ہو۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ولد کے لفظ میں شامل ہونے کی وجہ سے ایک متوفی بیٹے کی اولاد زندہ بیٹوں بیٹیوں کے ساتھ اپنے دادا کا حصہ لینے کی حقدار ہے اور اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے جہاں پوتی کو بیٹی کے ساتھ شامل کر کے ابن مسعود نے دو بیٹیاں قرار دے کر دو تہائی جائداد ان دونوں کو دے دی (بخاری) گو اس میں ان کی آپس کی تقسیم میں پھر بیٹی کو ایک قرار دے کر اسے نصف دلایا اور بقیہ چھٹا حصہ پوتی کو دلایا مگر بہرحال اس سے دلیل ملتی ہے کہ جب پوتی بیٹی کے قائم مقام ہو سکتی ہے تو پوتا بیٹے کے قایم مقام کیوں نہیں ہو سکتا۔ تعامل میں اصل تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا تعامل ہے۔ جب وہ نہیں تو باقی تعامل کوئی دلیل نہیں۔ اور بہرحال ایسی صورت میں آیت اذا حضر کے ماتحت ایسے پوتوں کیلئے وصیت کرنا ضروری ہے اور اگر ایسی وصیت نہ کی گئی ہو تو تقسیم وراثت کے وقت بھی ان کو حصہ دیا جا سکتا ہے ✦

فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ

اور اگر اس کے بھائی ہوں تو اس کی ماں کیلئے چھٹا حصہ ہے ۶۱۸

ماں باپ کے حصے

۶۱۸ اس حصہ میں ماں اور باپ کے حصہ وراثت کا ذکر کیا ہے اور اس کی تین صورتیں قایم کی ہیں۔ اول یہ کہ ماں باپ ہوں اور اولاد بھی ہو۔ اس صورت میں ماں اور باپ ہر ایک چھٹا حصہ لیتا ہے۔ اور باقی اولاد کو ملتا ہے۔ اگر اولاد میں لڑکے ہوں یا لڑکے اور لڑکیاں ہوں یا دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو سب ان کو مل جائیگا۔ اگر صرف ایک لڑکی ہو تو نصف وہ لے لیگی اور باقی چھٹا حصہ پھر والد کو قریب ترین عصبہ ہونے کے لحاظ سے چلا جائیگا۔ کیونکہ اکیلی لڑکی کو بہرحال نصف سے زیادہ نہ ملیگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ماں باپ ہوں اور اولاد کوئی نہ ہو۔ تو اس صورت میں ماں کو ایک تہائی اور باقی دو تہائی باپ کو چلا جائے گا +

ماں باپ کے ساتھ بھائیوں کی موجودگی

تیسری صورت یہ بیان کی ہے کہ اولاد نہ ہو مگر بھائی ہوں۔ تو اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔ باپ کو کیا ملیگا اس میں اختلاف ہے۔ جمہور کے نزدیک بھائیوں کا ہونا صرف ماں کے تیسرا حصہ پانے کیلئے روک ہے۔ اور بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا۔ مگر حضرت ابن عباس کا مذہب ہے کہ جو ماں کا حصہ کم ہوا ہے وہ بھائیوں کو ملے گا۔ بظاہر یہ کوئی وجہ نہیں کہ بھائی ہوں تو ماں کا حصہ کم ہو جائے حالانکہ ورثہ پانے والا اور کوئی پیدا نہیں ہوا اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ بھائیوں کے ہونے سے باپ کا حصہ بڑھکر ⅚ ہوگیا اور ماں کیلئے صرف چھٹا حصہ رہ گیا اس میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی۔ کیونکہ عام اصول وراثت یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک کا حصہ کم ہونے کیلئے کوئی دوسرا اس کا پانے والا اور ہونا چاہیئے۔ مگر اس پر اعتراض ہے کہ یہاں یہ ذکر نہیں کہ بھائیوں کو کیا ملے۔ میرے نزدیک اس کا ذکر چونکہ آگے آجاتا ہے۔ اس لئے یہاں ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ اور ماں کا حصہ اس لئے کم کیا گیا ہے کہ بھائی حصہ پانیوالے ہیں۔ اور خود الفاظ قرآنی بھی اس پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ پہلے جہاں ماں باپ کے ساتھ اور کوئی ورثہ پانیوالا نہیں وہاں صاف لفظ بڑھادیتے ہیں وورثہ ابواہ اس کے ماں باپ اس کے وارث ہوں۔ مگر جہاں بھائیوں کا ذکر کیا وہاں یہ لفظ نہیں بڑھائے جس سے معلوم ہوا کہ اب وہ بھائی بھی ساتھ وارث ہیں +

دوسرا سوال اس صورت کے متعلق یہ ہے کہ اخوۃ سے کیا مراد ہے۔ اس پر تو اتفاق ہے کہ ایک بھائی ہو تو وہ ماں کا تیسرا حصہ پانے میں مانع نہیں ہوگا اور تین ہونگے تو وہ ضرور مانع ہونگے۔ مگر دو کے متعلق اختلاف ہے بعض نے کہا کہ اخوۃ چونکہ جمع ہے اس لئے دو اس میں داخل نہیں بعض نے کہا کہ دو پر بھی جمع کا حکم ہے جیسا کہ نبی کریم صلعم سے بھی مروی ہے الاثنان فما فوقہما جماعۃ۔ دو یا اس سے بڑھ کر جماعت ہے اور اکثر صحابہ کا مذہب یہی ہے کہ دو اخوۃ کے لفظ میں شامل ہیں +

میرے نزدیک قرآن کریم نے وراثت کے معاملہ میں الفاظ کو وسیع معنی پر محمول کیا ہے۔ ولد کو واحد جمع مذکر مؤنث میں یکساں استعمال کیا ہے۔ اب میں اگر باپ نہ ہو تو دادا مراد ہوگا ام میں اگر ماں نہ ہو تو دادی مراد ہوگی۔ اسی طرح اخوۃ کا لفظ عام ہے اور اس میں بھائی اور بہنیں سب شامل ہیں۔ خواہ ایک ہوں یا زیادہ۔ اور ان کے حصص کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔ جہاں کلالہ کی وراثت کا ذکر ہے۔ جہاں صاف یہ بیان فرمایا کہ اگر ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو اس کو چھٹا حصہ ملیگا اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں شریک ہونگے پس ماں باپ کے ہوتے ہوئے اگر بھائی بہنیں ہوں تو اس کی صورت یہ ہے کہ ماں کو چھٹا حصہ ایک بھائی یا بہن ہو تو اس کو چھٹا حصہ اور باقی دو تہائی باپ کو۔ ایک سے زیادہ بھائی بہنیں ہوں تو ماں کو چھٹا حصہ سب بھائی بہنوں کو تیسرا حصہ۔ اور باقی نصف باپ کو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ صورت تعامل کے خلاف ہے۔

مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ ۚ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ

وصیت (کی ادائگی) کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرضہ کے۔ تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تم نہیں جانتے کہ ان میں سے

اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

کون تمہارے لئے فائدہ کے لحاظ سے قریب تر ہے یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے بیشک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۶۱۹

مگر مسئلہ وراثت میں تعامل میں اختلاف چلا آتا ہے۔ نہ صرف بہت سے مسائل میں شیعہ سنی کا اختلاف ہے۔ بلکہ خود علمائے اہل سنت والجماعت میں بھی اختلاف ہے اور صحابہ میں بھی اختلاف ہے۔ چنانچہ کئی مسائل میں حضرت ابن عباس کا مذہب دوسرے صحابہ کے خلاف ہے۔ اگر لفظ کلالہ کے یہ معنی صحیح ہیں کہ کلالہ اس کو بھی کہتے ہیں جس کا ماں باپ اور اولاد دونوں نہ ہوں جیسا حضرت ابوبکر سے روایت ہے۔ اور اس کو بھی کہتے ہیں جس کے ماں باپ ہوں اور اولاد نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت عمر سے روایت ہے۔ تو دو جگہ مختلف کلالہ کے ذکر سے مراد یہ دونوں صورتیں ہوں گی۔ اور چونکہ قرآن کریم نے اس آیت میں صاف ذکر کیا ہے کہ اولاد نہ ہو اور ماں باپ کے ساتھ بھائی ہوں اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ اس صورت میں جو بھائیوں کو ملنا چاہئے اس کا ذکر بھی قرآن شریف میں ہے۔ اور یہی وہ صورت ہے جس کا ذکر زوجین کے بعد آتا ہے۔

وصیت اور قرضہ

۶۱۹ من بعد وصیۃ یوصی بہا او دین۔ یہ الفاظ ساری آیت پر حاوی ہیں۔ کیونکہ ان تمام کا ذکر کرکے آخر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ گویا خواہ صرف اولاد وارث ہو۔ یا ماں باپ اولاد کے ساتھ یا اولاد کے بغیر یا بھائیوں کے ساتھ وارث ہوں۔ تمام صورتوں میں اگر کوئی وصیت ہو یا قرضہ ہو تو پہلے اس کی ادائگی ضروری ہے اور جو باقی بچ رہے وہ بموجب حصص مذکورہ بالا تقسیم ہوگا۔ قرضہ اور وصیت میں سے قرآن کریم نے پہلے وصیت کا نام لیا ہے۔ مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ قرضہ سے پہلے وصیت کا مال ادا کیا جائے۔ اس لئے کہ مال متروکہ قرار وہی پائیگا جو بعد ادائگی قرضہ ہو۔ اور اَوْ ترتیب کے لئے نہیں آتا۔ وصیت کے ذکر کو مقدم اس لئے کیا کہ جب کوئی وصیت کرے گا تو اس وصیت میں قرضہ کا ذکر تو خود ہی کرے گا۔ اس لئے صرف وصیت کی تعمیل میں قرضہ کی ادائگی آجاتی ہے۔ اور اس کے بعد او دین کا لفظ اس لئے بڑھایا کہ اگر کسی نے وصیت نہیں کی مگر قرضہ اس کے ذمہ ثابت ہے تو قرضہ بہرحال ادا ہی کرنا ہوگا۔

اباؤکم وابناءکم لا تدرون ایہم اقرب لکم نفعا۔ قرابت کے لحاظ سے اصل حقدار وراثت یا اولاد ہی یا ماں باپ مگر اولاد کو پہنچنا تو قوانین دنیا نے تسلیم کیا ہے۔ لیکن ماں باپ کو عموماً کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جب ماں باپ کے حصص کا ذکر فرمایا تو بتا دیا کہ ماں باپ کے حقوق کو کم مت سمجھو۔ انسان کو نفع ماں باپ سے بھی پہنچتا ہے اور اولاد سے بھی پس جن سے انسان نفع اٹھاتا ہے۔ اس کے ترکہ سے ان کو نفع پہنچنا چاہئے اس لئے ماں باپ کے حقوق کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔

وصیت کا حق کہاں تک ہے

ہر دفعہ جہاں حصص کا ذکر کیا ہے ساتھ یہ لفظ بھی بڑھا دیئے ہیں کہ تقسیم وصیت کی تعمیل کے بعد ہوگی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وصیت کی رو سے ایک شخص کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے مال کو اپنے ورثا میں تقسیم کردے یا ان کو محروم کردے۔ یہ ایک ظاہر امر ہے کہ ایسی وصیت خود احکام آیت کو باطل کرتی ہے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ خود ہی ایک تقسیم قائم کرکے پھر خود ہی ایسی بھی اجازت دے کہ وہ تقسیم باطل ہو جائے۔ اگر منشاء الٰہی یوں ہوتا کہ مال کی تقسیم تو وصیت کے مطابق ہونی چاہئے لیکن جس صورت میں وصیت نہ ہو تو پھر یوں تقسیم ہو تو حصص کے مقرر کرنے سے پہلے یہ ہدایت صاف طور پر دیدی جاتی کہ مال کی تقسیم تمہاری وصیتوں کے مطابق ہوگی لیکن جہاں وصیت نہ ہو وہاں ذیل کی تقسیم ہو۔ برخلاف اس کے قرآن کریم نے پہلے حصص

۱۲ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ

اور تمہارے لئے اس کا نصف ہو جو تمہاری بیبیاں چھوڑیں اگر انکی اولاد نہ ہو — اور اگر ان کی اولاد ہو

فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ

تو تمہارے لئے اس کا چوتھا حصہ ہو جو انہوں نے چھوڑا ہی وصیت دکی اداگی کے بعد جو انہوں نے کی ہو یا قرضہ کے اور ان کیلئے اسکا چوتھا حصہ ہو جو تم نے چھوڑا

إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم ۚ مِّن بَعْدِ

ہو اگر تمہاری اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہو تو ان کیلئے اس کا آٹھواں حصہ ہو جو تم نے چھوڑا ہے — وصیت دکی اداگی)

وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ

کے بعد جو تم نے کی ہو یا قرضہ کے ۶۲۰ اور اگر کسی مرد یا عورت کا ورثہ کلالہ ہونے کی حالت میں لیا جائے ۔

مقرر کرکے پھر وصیت کا ذکر کیا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ وصیت مال کے کسی خاص حصہ کے متعلق ہونی چاہئے اور چونکہ حدیث صحیح سے ثابت ہی جس کا ذکر مفصل نوٹ ۲۲۰ میں ہو چکا ہی کہ آنحضرت صلعم نے ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے پہلی شرط اس وصیت کے لیے جس کا ذکر اس آیت میں ہے یہ ہی کہ وہ ایک تہائی مال سے زیادہ کیلئے نہ ہو دوسری شرط کا ذکر بھی ایک حدیث میں ہی کہ لا وصیۃ لوارث یعنی جو شخص حصص مقرر کردہ کے مطابق وراثت پاتا ہی۔ اس کے لئے وصیت کوئی نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ حدیث نہ بھی ہوتی تب بھی یہ بات ظاہر تھی کہ جب ورثاء کے لئے خود اللہ تعالےٰ نے حصص مقرر کر دئے ہیں تو اب ایک شخص کو یہ اختیار ہونا کہ وہ ورثاء میں سے کسی کے لئے کچھ وصیت بھی کر دے۔ پھر ایک ناانصافی ہو جاتی ہے کہ ایک وارث کو دوسرے سے بڑھ کر حقدار بنا دیا گیا۔ اس لئے حق یہی ہے کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہوسکتی پس یہ دو شرائط وصیت کے لئے ضروری ہیں۔ اول ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت نہ ہو دوسرے وارث کیلئے وصیت نہ ہو +

غرض وصیت

دوسرا سوال یہ ہی کہ یہ وصیت کس قسم کی ہو۔ نوٹ ۲۲۰ سے معلوم ہوگا کہ اس وصیت کی غرض خدا کے لئے کچھ مال کا چھوڑنا ہی خواہ وہ اشاعت دین کیلئے یا کسی غریب یا مفلس رشتہ دار کیلئے یا کسی یتیم کیلئے ہو بعض غریب اور یتیم رشتہ داروں میں بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو متوفی کے مال کا کچھ حصہ بطور ورثہ نہیں پہنچتا مثلاً موجودہ تعامل کے مطابق بیٹوں کی موجودگی میں کسی متوفی بیٹے کے بیٹے یعنی یتیم پوتے۔ لیکن زیادہ تر اس کی غرض محض فی سبیل اللہ یا اشاعت دین کیلئے کچھ چھوڑنا ہی جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے جس طرح قرآن کریم کے بہت سے اُصول مسلمانوں نے ترک کر دیئے اور غیر مسلموں نے لے لئے ہیں اسی طرح فی سبیل اللہ وصیت کا معاملہ بھی ہی۔ مسلمانوں میں بہت کم ہیں جو اپنے مال کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں وصیت کر جائیں لیکن عیسائیوں میں جا کر دیکھو تو جہاں بڑی بڑی جائدادیں ہیں کچھ نہ کچھ حصہ مال کا قوم کی بہتری یا اور کسی نیک غرض کے لئے وصیت کر دیا جاتا ہی۔ پھر قرآن کے حکموں کی تعمیل اگر دوسرے کریں تو کیوں ان سے نفع نہ اُٹھائیں اور مسلمان اگر قرآن کو اپنا رہنما نہ بنائیں تو کس طرح پر وہ کامیاب ہوسکتے ہیں +

خاوند اور بیوی کے حصے

۶۲۰ یہ تیسری صورت ہی۔ اس میں متوفی کی بیوی یا خاوند زندہ ہی۔ اگر بیوی مر گئی ہے اور اولاد ہی تو خاوند کو چوتھا حصہ اور نہیں ہی تو نصف اور اگر خاوند مر گیا ہی اور بیوی زندہ ہی اور اولاد ہے تو بیوی کو چوتھا حصہ اور نہیں ہی تو بیوی کو آٹھواں

وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ

اور اس کا بھائی یا بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے۔

حصہ ایک سے زیادہ بیبیاں ہوں تو اسی حصہ میں شریک ہونگی۔ اور باقی اولاد دے گی لیکن اس صورت میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ خاوند یا بیوی بھی ہو اور ماں باپ بھی ہوں تو حصص کس طرح تقسیم ہونگے۔ اس صورت میں خواہ اولاد ہو یا نہ ہو بعض مشکلات پیش آتی ہیں۔ اگر اولاد نہ ہو ماں باپ ہوں اور خاوند ہو۔ تو نصف خاوند کو چاہئے۔ ایک تہائی ماں کو اور اس طرح پر باپ کا حصہ صرف چھٹا رہ جاتا ہے جو ماں سے نصف ہے۔ اور اگر اولاد میں مثلاً لڑکیاں ہوں اور خاوند ہو اور ماں باپ ہوں تو لڑکیوں کو دو تہائی چاہئے ماں باپ کو ایک تہائی۔ تو خاوند کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ صورت اول میں یعنی جب اولاد نہ ہو ماں باپ ہوں اور خاوند یا بیوی ہو تو اکثر اس طرف گئے ہیں کہ خاوند یا بیوی پہلے اپنا حصہ لے لینگے۔ اور باقی کی ایک تہائی ماں کو اور دو تہائی باپ کو جائیگا اور اس طرح پر حصص ٹھیک ہو نگے یہی درست ہے۔ اور یہ مذہب حضرت عمر و عثمان و علی و زید بن ثابت اور ابن مسعود اور ساتوں فقہاء اور چار ائمہ اور جمہور علماء کا ہے (ف)۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ خاوند یا بیوی کو دیکر باقی مال ماں باپ کے حصص کے لئے کل مال قرار پائیگا۔ اور ان کے حق میں ترکہ وہی ہے جو خاوند یا بیوی کو دینے کے بعد رہے۔ اور اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ وہ ما ترک نہیں کیونکہ ما ترک ہر ایک کے لئے الگ الگ ہے۔ اگر قرضہ ہو تو پہلے ترکہ میں سے قرضہ جانا چاہئے اگر وصیت بھی ہے تو قرضہ کے بعد وصیت والوں کو ملنا چاہئے۔ اگر خاوند یا بیوی ہے تو وصیت کے بعد اسے ملنا چاہئے۔ پھر اس میں سے جو رہ جائے اس میں سے ماں باپ کا حصہ اور بقیہ اولاد کا حصہ ہوگا۔ اور جس طور پر قرآن کریم نے حصص قائم کئے ہیں وہ خود اس اصول کی صداقت پر شاہد ہے۔ کیونکہ اول یہ ذکر کیا کہ صرف اولاد ہو ماں باپ نہ ہوں۔ پھر یہ ذکر کیا کہ ماں باپ ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو تو اگر پہلی صورت میں اولاد فوراً لیتی ہے تو اس صورت میں پہلے ماں باپ لیتے ہیں باقی اولاد لیتی ہے تیسری صورت اب یہ ہے کہ خاوند یا بیوی ہو تو ظاہر ہے کہ جس طرح ماں باپ کو دے کر بقیہ اولاد کے لئے جاتا ہے اسی طرح اگر خاوند یا بیوی کے ساتھ ماں باپ بھی ہیں تو خاوند یا بیوی کو دے کر ماں باپ کو دیا جائیگا۔ اس صورت میں جس کو خود علمائے امت نے ایک مشکل کو حل کرنے کے لئے اختیار کیا ہے۔ عول وغیرہ کی تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ اور مسئلہ وراثت بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ اور اس میں سے بہت سی پیچیدگیاں دور ہو جاتی ہیں مسئلہ عول جو حضرت علی کی طرف منسوب ہے وہ بھی اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے کہ خاوند یا بیوی کے حق کو فائق نہ کیا جائے۔ کیونکہ عول کی صورت ایسی ہے کہ مثلاً بیوی زندہ ہے دو یا زیادہ لڑکیاں ہیں۔ ماں باپ ہیں اب بیوی کو آٹھواں چاہئے لڑکیوں کو دو تہائی ماں باپ کو ایک تہائی۔ اور یہ حصے پورے نہیں ہوتے۔ حضرت علی نے بذریعہ عول اس کا حل یوں کیا تھا کہ کل ستائیس حصے کئے جائیں جن میں سے سولہ لڑکیوں کو دیئے جائیں۔ آٹھ ماں باپ کو تین بیوی کو اس طرح مال تو پورا ہو گیا۔ مگر دو تہائی ایک تہائی آٹھواں حصہ کچھ بھی درست نہ رہا۔ اگر اس کی بجائے یوں کیا جاتا کہ بیوی کا حق نکال کر باقی میں سے ماں باپ کا تیسرا دیا جاتا اور پھر بقیہ لڑکیوں کو تو یہ مشکل ہی پیش نہ آتی یا اگر بیوی کا حق پہلے نہ بھی نکالا جائے تو بھی لڑکیوں کو دو تہائی اسلئے نہیں دینا چاہئے کہ ان کے ساتھ ماں باپ موجود ہیں اور لڑکیاں دو تہائی اس وقت لیتی ہیں جب دوسرا ساتھ لینے والا کوئی نہ ہو پس آٹھواں حصہ بیوی کا اور ایک تہائی ماں باپ کا نکال کر بقیہ لڑکیوں کو دیا جائے گا۔ کیونکہ اگر لڑکیوں کی بجائے لڑکے ہوتے یا لڑکے اور لڑکیاں ہوتیں تو ان کو بھی بقیہ ہی دیا جاتا اور لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ پانے کی بہر حال حقدار نہیں اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ نا انصافی ہے کہ پہلے خاوند یا بیوی کو اپنا حصہ مل جائے تو باقی میں سے والدین کا چھٹا

عول کا مسئلہ

فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ

اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ تہائی میں شریک ہیں ۶۲۱ وصیت (کی ادائگی) کے بعد

چھٹا حصہ نکلے اور پھر اس کا بھی بقیہ اولاد کو ملے تو یہ فی الحقیقت کوئی نا انصافی نہیں کیونکہ خاوند یا بیوی جو کچھ لینگے وہ بھی اولاد کی بہتری پر ہی صرف ہوگا۔ اور حق یہی ہو کہ خاوند یا بیوی کا ایک گونہ اشتراک جائداد میں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دونوں اس کے بنانے والے ہیں۔ خاوند کی جائداد کے بننے میں بیوی مددگار ہوتی ہے اور بیوی کی جائداد کے بننے میں خاوند مددگار ہوتا ہو۔ اور اس طرح مسئلہ وراثت کی تمام دقتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی فیصلہ اسکے خلاف مروی نہیں۔ صرف ایک فیصلہ سعد بن الربیع کی بیٹیوں اور بیوی کا مذکور ہے۔ جس میں بیوی کو آٹھواں حصہ بیٹیوں کو دو تہائی اور بقیہ چچے کو دیا گیا۔ یہ روایت اول تو بہت اعلیٰ پایہ کی نہیں۔ اور دوسرے اس میں کوئی تفصیلات نہیں جن سے ہمارے اس مفہوم کے خلاف کوئی نتیجہ نکل سکتا ہو +

کلّ ۔ کلالۃ

ع ۶۲۱ کلالۃ ۔ اس کا مادہ کلّ ہے جس کے معنی تھک جانا ہیں۔ راغب کہتے ہیں یہ ان وارثوں کا نام ہو جو والد اور ولد کے سوا ہوں اور ساتھ ہی ابن عباس کا قول نقل کرتے ہیں کہ اولاد کے سوا جو وارث ہوں ان کا نام ہو اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کلالۃ وہ ہو جو مر جائے اور اس کی اولاد یا اس کا والد کوئی نہ ہو تو یہاں گویا میت کو کلالہ قرار دیا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ دونوں قول صحیح ہیں اور اس کی تطبیق یہ ہے کہ کلالہ مصدر ہے جو وارث اور موروث دونوں کو جمع کرتا ہو +

کلالہ کی وراثت

مفسرین میں دو گروہ ہیں۔ بڑا گروہ تو اس طرف گیا ہو کہ کلالۃ وہ ہو جس کا نہ والد ہو نہ ولد۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کلالہ وہ ہو جس کا ولد نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کا خیال بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے گو ایک روایت میں آتا ہے کہ چونکہ حضرت ابو بکرؓ نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ اس کا والد و ولد نہ ہو اس لئے میں خاموشی اختیار کرتا ہوں مگر ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے اس کے وہی معنی کئے ہیں جو حضرت ابن عباسؓ نے کئے ہیں یعنی جس کا ولد نہ ہو۔ دیکھو غرائب القرآن وعن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ الکلالۃ من لا ولد لہ فقط اور ایک روایت حضرت عمر سے یہ ہے کہ آپ کہا کرتے تھے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کو وضاحت سے بیان کر دیا ہوتا تو میرے نزدیک ساری دنیا سے زیادہ محبوب تھا۔ کلالہ۔ خلافت۔ ربا (غ ق)

قرآن کریم میں دو جگہ کلالہ کا ذکر آیا ہو۔ ایک یہاں اور ایک اسی سورت کے آخر میں۔ یہاں بھائی یا بہن کا حصہ چھٹا اور زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک اور وہاں بہن کا حصہ نصف۔ دو یا زیادہ بہنیں ہوں تو دو تہائی۔ صرف بھائی ہوں ایک یا زیادہ تو کل لیں۔ بھائی اور بہنیں ملے جلے ہوں تو سارا ترکہ مرد کو عورت سے دو چند حصہ دیکر تقسیم ہو۔ مفسرین نے اس کی توجیہ یہ کی ہو کہ یہاں بھائی بہن سے مراد اخیافی بھائی بہن ہیں یعنی ماں کی طرف سے۔ اور دوسرے موقعہ پر یعنی آخر سورت میں بھائی بہن سے مراد عینی یا علاتی بہن بھائی ہیں یعنی ماں باپ دونو کی طرف سے یا صرف باپ کی طرف سے مگر نبی کریم صلعم کی کوئی حدیث اس کے متعلق نہیں۔ اس لئے دوسری توجیہ اس کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دونوں جگہ کلالہ سے الگ الگ مراد ہو +

دو قسم کے کلالہ

یہاں کلالۃ سے مراد وہی صورت ہو جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہو یعنی اولاد نہ ہو مگر ماں باپ ہوں اور بہن بھائی ہوں اور سورت کے آخر میں کلالۃ سے مراد وہ کلالہ ہو جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ اولاد اور یہی وجہ ہو کہ وہاں ساری جائداد بہن بھائیوں کو دلاتا ہے اور یہاں نہیں دلاتا۔ کیونکہ وہاں اور کوئی وارث نہیں ہو اور یہاں ہی اسکی تائید اس سے بھی ہوتی ہو کہ اوپر ایک صورت کا ذکر کیا تھا کہ بھائی ہوں اور اولاد نہ ہو تو ماں کو چھٹا حصہ ملے مگر بھائیوں کا حصہ بیان نہ کیا تھا۔ اس کا ذکر اب یہاں کر دیا ہو۔ ورنہ یہ اعتراض

يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝ تِلْكَ ۱۳

جو کی گئی ہو یا قرضہ کے جو ضرر پہنچانے کیلئے نہ ہو ۶۲۲ یہ اللہ کی طرف تاکیدی حکم ہے اور اللہ جاننے والا بردبار ہے یہ

حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

اللہ کی حدبندیاں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اسے باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۱۴

بہتی ہیں ان میں رہینگے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ کی اور اسکے رسول کی نافرمانی کرتا ہے

وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

اور اسکی حدبندیوں سے آگے نکلتا ہے اسے آگ میں داخل کریگا وہ اس میں رہیگا اور اسکے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے ۶۲۳

باقی رہتا کہ ایک صورت کو قایم کرکے حصص کا ذکر نہیں کیا +

وراثت کی پانچ صورتیں

اس طرح پر ان چار احکام میں ذیل کی چار صورتیں بیان کردی ہیں۔ اول صرف اولاد ہو۔ دوم ماں باپ ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو۔ سوم خاوند بیوی ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو۔ چہارم ماں باپ ہوں اولاد نہ ہو اور بھائی ہوں۔ اور پانچویں صورت سورت کے آخر پر یہ بیان کی ہے کہ نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں صرف بھائی بہن ہوں۔ ان پانچوں صورتوں میں اگر خاوند یا بیوی ہو تو اس کا حق پہلے نکالو۔ پھر ماں باپ ہوں تو ان کا حق دو پھر اولاد کو۔ اور اولاد نہ ہو یا ماں باپ اور اولاد دونوں نہ ہوں تو بھائی بہنوں کو +

ضرر والا قرضہ

۶۲۲ غَيْرَ مُضَآرٍّ۔ وصیت اور قرضہ کے پہلے ادائگی کا حکم تو ہر جگہ دیا ہے۔ مگر یہاں غَيْرَ مُضَآرٍّ ساتھ بڑھا دیا ہے یعنی وصیت یا قرضہ ایسے ہوں جو ضرر پہنچانے والے نہ ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اولاد کوئی نہیں۔ اور جب اولاد موجود نہ ہو۔ تو ممکن ہے کہ محض دور کے ورثا کو نقصان پہنچانے کے لئے کسی قرضہ کا اقرار کرلیا جائے یا بلا ضرورت کوئی قرضہ لے لیا جائے۔ اور اسی طرح محض نقصان پہنچانے کو کوئی وصیت کردی جائے۔ اس لئے اس قید کی ضرورت یہاں پیش آئی ہے اور غیر مُضَآرٍّ کا لفظ وصیت اور دین دونوں پر حاوی ہے +

رواج اور قرآن

۶۲۳ ان دونوں آیات میں بتایا ہے کہ یہ احکام گو دنیوی امور کے متعلق ہیں مگر ان کو استخفاف کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ اسلام کے احکام دینی اور دنیوی بہبودی سے یکساں تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان احکام کی مخالفت کرنے والے جہنم میں جائینگے اور ساتھ خَالِدًا فِيْهَا کے الفاظ بھی بڑھا دیئے ہیں۔ باوجود اس تاکید شدید کے مسلمانوں نے اس زمانہ میں بالخصوص پنجاب و ہندوستان کے دیہات میں صریحًا ان احکام کو پس پشت ڈالا ہے۔ یہاں تک کہ واجب العرض میں صاف یہ لفظ لکھوا دیتے ہیں کہ ہم قرآن کی پیروی نہیں کرینگے۔ رواج کی پیروی کرینگے۔ کیا اسی مخالفت کا نتیجہ ہی وہ نہیں جو خود قرآن کریم نے بیان فرمادیا ہے وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ یعنی ان کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے؟ واقعی مسلمان احکام قرآنی کی خلاف ورزی کی وجہ سے ہی ذلیل ہو رہے ہیں +

ع ۳ / ۸ / ۱۴

۱۵ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بیحیائی کا ارتکاب کریں تو اپنے میں سے چار گواہ ان پر بلاؤ سو اگر

شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰى یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا

وہ گواہی دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہانتک کہ انکو موت لیجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ نکال دے ۶۲۴

خاندانی بیحیائی عورتوں سے سلوک

اتیان ۶۲۴ یاتین - اتیان (اتی) کے اصل معنی آنا ہیں - مگر خود کسی انسان کے آنے پر یا کسی امر کے کرنے پر یا کسی تدبیر کے کرنے پر بولا جاتا ہے کیونکہ آنا بالذات یا بالامر یا بالتدبیر ہو سکتا ہے (غ) پس یہاں مراد ارتکاب فاحشہ ہے +

فاحشة الفاحشة ہر قول یا فعل جو بڑا قبیح ہو دیکھو ۲۰۶ ل گو اس میں شک نہیں کہ فاحشة کا لفظ قرآن شریف (۱) زبان عربی میں زنا پر بھی بولا گیا ہے مگر اصل استعمال اس کا ہر قبیح کام پر ہے اور اسی معنی میں زیادہ تر قرآن شریف میں بھی آیا ہے - جیسے واذا فعلوا فاحشة (الاعراف - ۲۸) فانه یامر بالفحشاء والمنکر (النور ۲۴ - ۲۱) اور ابن اثیر کہتے ہیں کہ حدیث میں فحش اور فاحشة اور فواحش کا ذکر بار بار آیا ہے اور وہ ہر قسم کے ذنوب اور معاصی پر مشتمل ہے جنکی قباحت سخت ہو اور کثرت سے فاحشة بمعنی زنا بھی آیا ہے اور اصل میں ہر ایک قبیح خصلت قول ہو یا فعل فاحشہ کہلاتی ہے - چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت عائشہ نے ان یہودیوں کو جنہوں نے آنحضرت صلعم سے گستاخی کی تھی کچھ سخت لفظ کہا تو آپ نے فرمایا یا عائشہ ان اللہ لا یحب الفحش اللہ تعالیٰ فحش کو پسند نہیں کرتا - اور یہاں فحش سے مراد صرف سخت گوئی ہے +

عورت کی عصمت کو محفوظ کرنے کے اسباب پہلے دو رکوعوں میں عورتوں کے حقوق کو بیان کیا ہے - اس رکوع میں کچھ ان کی ذمہ داری کا ذکر ہے جس طرح اسلام نے سارے مذاہب سے امتیاز کے طور پر عورتوں کو بہت سے حقوق دیئے ہیں اور ان کے ساتھ حسن معاشرت کو تعلیم الٰہی کا حصہ قرار دیا ہے - اسی طرح ان کی کچھ ذمہ داریاں بھی رکھی ہیں - اور یہ چاہا ہے کہ جس طرح سے وہ حقوق کو حاصل کرنے میں تمام دنیا کی عورتوں پر فائق ہیں - اسی طرح اپنے چال چلن میں اعلیٰ درجہ کی پاکبازی اور راستبازی اختیار کرنے میں بھی فوقیت لے جائیں - چونکہ اسلام کا اصل منشا یہی تھا کہ عورت کی ذلت کے جس قدر اسباب ہیں ان سب کو دور کیا جائے اس لئے اگر ایک طرف اس کے حقوق کو محفوظ کیا ہے جس سے اس کی عزت اور مرتبہ بڑھتا ہے تو دوسری طرف اس کی عصمت کو محفوظ کرنے کے اسباب کا بھی ساتھ ہی ذکر کر دیا ہے تا عورت پر سے ہر قسم کی ذلت دور ہو - چنانچہ اس آیت کا مقصود بھی یہی ہے +

مبادی زنا کا علاج اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں الفاحشة سے مراد زنا ہے - اور یہاں زنا کی سزا بتائی ہے اور پھر اس کو سورۃ نور کی آیت جلد سے اور عملی حکم رجم سے منسوخ قرار دیا ہے - بلکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے حدیث سے (یعنی مسلم کی حدیث جس میں ہے البکر بالبکر جلد مائة ونفی سنة والثیب بالثیب جلد مائة والرجم) اور حدیث منسوخ ہے آیت جلد سے اور آیت جلد منسوخ ہے دلائل رجم سے (غ ق) لیکن جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے - قرآن شریف میں کوئی حکم منسوخ نہیں نہ نبی کریم صلعم نے کسی حکم کو منسوخ قرار دیا - اور نہ کسی حدیث سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے یہاں الفاحشة کے معنی زنا بتائے ہیں - اس لئے ہم فاحشہ سے مراد یہاں عام معنی ہی لینگے - کیونکہ الفاظ کے معانی میں ہمیں وہ راہ اختیار کرنی چاہیے جس سے ایک آیت دوسری کے خلاف نہ ہو - پس الفاحشة سے یہاں مراد بیحیائی کا ارتکاب ہے جسے مبادی زنا کہنا چاہیے - اور یہاں قرآن کریم نے ایک راہ بتائی ہے کہ کس طرح عورتوں کو زنا سے بچانے کیلئے وقت پر اس کا انسداد کرنا چاہیے اور وہ یہ علاج ہے کہ جب کسی عورت سے مبادی زنا کا ارتکاب ثابت ہو تو اس کا فوری علاج یہ ہے کہ انہیں گھروں میں بند کر دیا جائے یعنی انکی آزادی

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا ١٦

اور جو دو تم میں سے اس کا ارتکاب کریں تو ان کو سزا دو پھر اگر وہ توبہ کریں اور اصلاح کریں تو ان کو جانے

عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝

دو بیشک اللہ توبہ قبول کرنیوالا رحم کرنے والا ہی ۶۲۵

سلب کردی جائے اور ان کو باہر نکلنے سے قطعاً محروم کردیا جائے یہاں تک کہ اسی حالت میں ان پر موت آجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ نکال دے۔ اور وہ راہ توبہ ہی۔ یا اگر ایسی عورتیں ہیں جن کا ابھی نکاح نہیں ہوا تو نکاح سے ان کی حالت سدھر سکتی ہو (مفسرین نے بھی یجعل اللہ لھن سبیلا میں نکاح مراد لیا ہی) اس طرح آزادی کے روک دینے سے دو غرضیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو خود بدی میں مبتلا ہونے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ نہیں بنتیں۔ ابو مسلم نے یہاں الفاحشۃ سے مراد سحاقت کو لیا ہے یعنی عورت کا عورت سے ارتکاب فاحشہ +

تعلیم اسلام میں زنا سے بچانے کے سامان

اگر غور کیا جائے تو اسلام کی تعلیم نہایت تدریجی اور خوبصورت ہے۔ زنا جیسی بلا سے بچانے کے لئے کس قدر رکاوٹیں تجویز کی ہیں اول تو مردوں اور عورتوں کے کھلے میل جول اور عورتوں کے غیر محرم مردوں سے خلوت اختیار کرنے کو روکا ہی پھر عورتوں کو اس بات سے روکا ہی کہ وہ بن سنور کر اور سنگار کرکے باہر نکلیں۔ بلکہ حکم دیا ہے کہ جب باہر نکلیں تو ایک سادہ کپڑا اوپر اوڑھ لیں جس سے ان کے لباس وغیرہ کی زینت ڈھک جائے پھر یہ حکم دیا ہے کہ باہر نکلیں تو مرد و عورت دونوں نگاہیں نیچی رکھیں پھر فرمایا کہ اگر عورت سے مبادی زنا کا ارتکاب ہوتا دیکھو تو اس کے باہر نکلنے کو قطعاً روک دو یہانتک کہ وہ توبہ کرے یا جائز طور پر نکاح ہو کر خیالات شہوانی ویسے رک جائیں۔ اور سب سے آخر جب کسی طرح کوئی نہ رکے تو پھر زنا کے لئے خطرناک سزا کوڑوں کی تجویز کی ہی عصمت کو قایم کرنے کے لئے اس سے بڑھکر اصلاح کی صورت ناممکن ہی یہی وہ باتیں ہیں جو قرآن کریم کی تعلیم اخلاقی و روحانی کو کمال تک پہنچانے پر شاہد ہیں +

اللذان

۶۲۵ اللذان۔ گو اصل میں دو مردوں کیلئے ہی مگر بلحاظ تغلیب مذکر ایک مرد اور ایک عورت پر بھی بولا جا سکتا ہے +

مبادی زنا میں مرد کے لئے سزا

چونکہ پچھلی آیت میں عورتوں کی بیحیائی کے ارتکاب کا ذکر کیا تھا تو یہ بتانے کیلئے کہ یہ امر صرف عورتوں میں ہی معیوب نہیں اور انہی کیلئے سزا نہیں بلکہ اگر مرد اور عورت دو کسی بیحیائی کا ارتکاب کریں اور دونوں سے مبادی زنا کا ظہور ہو تو دونوں کو سزا دی جائے۔ عورت کی سزا کا ذکر تو اوپر آچکا کہ اس کو باہر نکلنے سے روک دیا جائے۔ مرد کی سزا کو خاص الفاظ میں بیان نہیں کیا اس لئے کہ عورت تو گھر کے اندر رہ کر گھر کے کاروبار میں مدد دے سکتی ہی کیونکہ اس کے کام کا دائرہ زیادہ تر گھر کے اندر محدود ہے لیکن مرد کو ایسی سزا دینا گویا اسے کاروبار سے روکنا تھا اس لئے عام الفاظ میں کہدیا کہ سزا تو دونوں کو دی جائے گی مگر اپنے اپنے حالات کے مطابق اللذان سے مراد مفسرین نے بھی یہاں مرد و عورت ہی لیا ہی گو اٰذوھما کی سزا کو فہمایش یا تنبیہ و زجر یا ہلکی سزا تک محدود رکھا ہی۔ ابو مسلم نے اللذان سے مراد دونوں مرد لیکر یہاں لواطت کا ارتکاب مراد لیا ہی جیسے پہلی آیت میں سحاقت۔ اور یہی قول مجاہد کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے توبہ کرنے پر ان سے اعراض کرنا صاف بتاتا ہی کہ یہاں کس قسم کے مبادی مراد ہیں۔ اور یہاں توبہ کا لفظ پہلی آیت کے یجعل اللہ لھن سبیلا کی بھی تشریح کرتا ہے کہ وہاں بھی مراد اصل میں توبہ ہی ہی +

١٧ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

اللہ کے نزدیک توبہ صرف ان لوگوں کیلئے ہو جو جہالت سے بدی کر بیٹھتے ہیں پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں پس انہی پر اللہ (رحمت سے) متوجہ ہوتا ہو اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۶۲۶

توبة

۶۲۶ التوبة علی اللہ۔ عام طور پر یہی معنی کئے گئے ہیں کہ توبہ کا قبول کرنا اللہ پر ایسے لوگوں کے حق میں ہو۔ مگر چونکہ قبولیت توبہ کا ذکر صریح الفاظ میں آگے آتا ہے۔ اس لئے یہاں علی کو اگر معنی عند لیا جائے جیسا کہ طبری نے لیا ہو (د) تو وہ معنی ہونگے جو ترجمہ میں اختیار کئے گئے ہیں کہ توبہ اللہ کے نزدیک صرف ...... ان لوگوں کی ہو جو ایسا کرتے ہیں اور یہ تو توبہ کرنے والوں کا ذکر ہوا اس لئے آگے فرمایا کہ ایسوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہو۔ اور اگلی آیت کی ترکیب لیست التوبة کے ساتھ بھی یہی معنی موزوں ہیں۔ یا توبہ سے مراد توفیق توبہ بھی ہوسکتی ہے ✦

جہالة

جہالة۔ جہل کے معنی کے لئے دیکھو ۹۶ مجاہد کا قول ہو کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہو خطا سے ہو یا عمداً وہ جاہل ہے یہانتک کہ گناہ سے باہر نکلے (ث) اور قتادہ سے روایت ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلعم سب کا اس پر اتفاق تھا کہ ہر ایک چیز جس کے ساتھ ایک شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہو وہ جہالت ہو خواہ عمداً ہو یا سہواً (ث) اور خود قرآن کریم میں بھی جہالة کا لفظ صرف معصیت کے لئے استعمال ہوا ہے هل علمتم ما فعلتم بيوسف واخيه اذ انتم جاهلون (یوسف ۱۲ ۸۹) حالانکہ وہ جرم ان کا عمداً تھا ✦

من قریب

من قریب۔ اس کے لفظی معنی تو جلدی کے ہی ہیں لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی موت سے پہلے کسی وقت بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا بشرطیکہ صدق دل سے ہو اور نہ کبھی کریگا۔ اس لئے اس لفظ میں وسعت ہو چنانچہ حضرت ابن عباس سے مروی ہو کہ من قریب سے مراد ہو کہ اس وقت کے اندر جو اس کے اور اس کے ملک الموت کی طرف دیکھنے کے درمیان ہو۔ گو یا ملک الموت کے آنے یا حالت نزع سے پہلے پہلے کبھی ہو۔ اور امام احمد اور ترمذی اور ابن ماجہ نے ایک حدیث نبی کریم صلعم سے روایت کی ہو جس کے راوی حضرت ابن عمر ہیں قال ان الله يقبل توبة العبد ما لم يغرغر یعنی آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ کو قبول کرتا ہو جبتک کہ اس پر موت کا غرغرہ نہیں آتا ✦

توبہ اور اسکی قبو[لیت]

چونکہ پچھلی دونوں آیتوں کے مضمون کا تعلق توبہ سے بھی تھا یعنی حکم تھا کہ جن لوگوں سے زنا کے مبادی کا اظہار ہو مگر وہ توبہ کریں تو پھر ان کو کچھ مت کہو۔ اس لئے اب دو آیات میں توبہ کے مضمون کو کھول کر بیان کر دیا ہو۔ توبہ کے اصل معنی جیسا کہ دوسری جگہ بیان ہوچکا ہو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہیں خواہ ایسا رجوع کسی بدی کے ارتکاب کے بعد ہو یا ایک غفلت کی حالت سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو۔ یہاں جیسا کہ سیاق چاہتا تھا اس توبہ کا ذکر ہے جو بدی کے ارتکاب کے بعد ہو سو اول تو یہاں یہ فرمایا کہ توبہ یا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا صرف انہی لوگوں کے لئے ہو جو جہالت سے بدی کرتے ہیں۔ اور پھر فرمایا۔ کہ قریب ہی توبہ یا رجوع بھی کر لیتے ہیں۔ جہالت کا لفظ اسلئے اختیار فرمایا کہ انسان جو بدی کرتا ہو وہ جہالت سے کرتا ہو۔ اور توبہ کے یہ معنی ہیں کہ اس جہالت سے نکل جائے اور اس کو سمجھ آجائے کہ یہ اچھا کام نہ تھا جو اس نے کیا۔ جبتک انسان کے قلب پر یہ کیفیت وارد نہ ہو کہ وہ بدی کو بدی سمجھے اور اس سے متنفر ہو۔ اس وقت تک رجوع بھی نہیں ہوسکتا۔ اور من قریب کا لفظ گو موت سے پہلے ہر وقت پر حاوی ہو۔ مگر اس کو اختیار فرما کر یہ توجہ دلائی ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اگر اس سے بدی ہو بھی جائے

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ ۱۸

اور توبہ ان لوگوں کیلئے نہیں ہو جو بدیاں کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آموجود ہوتی ہو کہتا ہے

اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا

اب میں نے توبہ کی اور نہ ان لوگوں کے (لئے) جو کافر ہونے کی حالت میں ہی مرجاتے ہیں یہی ہیں جنکے لئے ہم نے دردناک دکھ

اَلِيْمًا ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ ۱۹

تیار کر رکھا ہی ۶۲۷ اے لوگو جو ایمان لاتے ہو تمہارے لئے جائز نہیں کہ عورتوں کو زبردستی ورثہ میں لو ۶۲۸

تو فوراً رجوع کرے۔ کیونکہ ایسی حالت میں رجوع کرنا بہت آسان ہوتا ہی۔ اور بدی کا بیج جو انسان کے دل میں بویا گیا ہی ابھی اس نے جڑ نہیں پکڑی ہوتی۔ لیکن اگر جلدی رجوع نہ کرے، اور بدی پر اصرار کرے یعنی بار بار اس کا ارتکاب کرے تو وہی بیج جڑ پکڑ کر مستحکم ہو جاتا ہی۔ اور وہ بدی ایک بدعادت کے طور پر طبیعت میں ایسی جاگزین ہو جاتی ہی۔ کہ پھر انسان کا اس سے رہائی پانا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہی گویا جتنی جلدی توبہ کرنے میں کریگا اتنی ہی جلد توبہ قبول ہوگی۔ اور جتنی دیر ایک بدی سے رجوع کرنے میں لگائیگا اسی قدر دیر توبہ کی قبولیت میں لگے گی۔

عدم قبولیت توبہ

۶۲۷ جس طرح پہلی آیت میں توبہ کی سہل ترین حالت یعنی قبولیت سے قریب ترین حالت کا ذکر کیا ہی۔ اس آیت میں توبہ کے نہ قبول ہونے کی حالت یعنی قبولیت سے بعید ترین حالت کا ذکر کیا ہی۔ اور وہ حالت یہ ہی کہ انسان بدیاں کرتا جائے اور کبھی انجام کو نہ سوچے پھر جب موت کا غرغرہ آنے لگے اور دیکھ لے کہ اب جا بد ہی سامنے ہے۔ تو پھر توبہ کرے ایسے شخصوں کو مطلقاً توبہ فائدہ نہیں دیتی اس سے بھی سخت تر حالت ان لوگوں کی ہی یموتون وھم کفار موت بھی ان پر کافر ہونے کی حالت میں آتی ہی یعنی وہ موت کے وقت بھی یا حالت نزع میں بھی نہیں سمجھتے کہ توبہ کرنی چاہئے ان کا کفر سخت ترین ہے۔ حالت نزع کی توبہ کیوں قبول نہیں ہوتی اسلئے کہ نزع کے وقت بھی انسان ایک گونہ دوسرے عالم میں داخل ہو چکا ہوتا ہی اور وہاں اللہ تعالیٰ نے اصلاح کے لئے اور سامان رکھے ہیں۔ توبہ یا رجوع کا موقعہ اس زندگی کے اندر اندر ہی۔ کیونکہ یہ زندگی ایک خاص رنگ میں اصلاح کے لئے دی گئی ہی اور ان دونوں انتہائی حالتوں کے درمیان یعنی ایک وہ حالت جس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا کہ نادانی سے کوئی بدی کی پھر فوراً اس سے رجوع کیا اور ایک یہ حالت جس کا ذکر اس آیت میں ہی کہ نزع کے وقت یا موت کے بعد رجوع چاہے مختلف حالات کے انسان ہیں جن کی توبہ کی قبولیت کا انحصار اس بات پر ہی کہ وہ کس قدر جرأت ارتکاب معاصی پر کرتے ہیں اور کس قدر دیر رجوع میں لگاتے ہیں جتنی جرأت کم اور توبہ جلدی ہی اسکی قبولیت آسان جتنی جرأت زیادہ اور توبہ دیر سے ہی اسی قدر اسکی قبولیت مشکل ہی۔

عورتوں کا ورثہ میں لیا جانا۔

۶۲۸ یہاں سے عورتوں کی ان تکالیف کا ذکر شروع ہوتا ہی جو اسلام سے پہلے ان کے لاحق حال تھیں۔ اور سب سے پہلے اس بدرسم کا ذکر کیا ہی جس کی رو سے عورتیں مال متروکہ کی طرح وراثت کا حصہ قرار پاتی تھیں گویا اوپر جب اسلام میں عورتوں کے حقوق وراثت کا ذکر کیا اور ان کو مال متروکہ کا حصہ دلایا تو اب جاہلیت کی رسوم کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ عورتوں کا مال متروکہ سے ورثہ پانا تو ایک طرف رہا وہ خود مال متروکہ کا حصہ قرار دی جاکر ورثہ میں لی جاتی تھیں چنانچہ بخاری میں ابن عباس سے مروی ہی قال کانوا اذا مات الرجل کان اولیاءہ احق بامرأتہ ان شاء بعضھم تزوجھا وان شاء زوجوھا وان شاؤا لم یزوجوھا فھم احق بھا من اھلھا فنزلت ھذہ الایۃ۔ یعنی اہل جاہلیت کا یہ دستور تھا کہ جب ایک شخص وفات پا جاتا تو اس کے وارث

وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ

اور نہ ان کو روک رکھو اسلئے کہ اسکا کچھ حصہ لے لو جو تم نے انہیں دیا ہو سوائے اس کے کہ وہ کھلی بےحیائی کا

مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا

ارتکاب کریں ۶۲۹ اور انکے ساتھ پسندیدہ طور سے میل جول رکھو پھر اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو تو ہو سکتا ہو کہ تم ایک چیز کو

۲۰ شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ

ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی رکھدے ۶۳۰ اور اگر تم ایک بی بی کی جگہ دوسری بی بی (سے نکاح) کرنا چاہو

اس کی عورت کے بھی حقدار ہوتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی چاہتا تو اس سے نکاح کر لیتا۔ اور اگر وہ چاہتے تو اس کا نکاح کسی سے نہ کرتے پس اس کے اہل کی نسبت وہ اس کے (مال کے) زیادہ حقدار ہوتے یعنی جب وہ مرتی تو اس کے وارث وہ خود ہوتے اور بعض روایتوں میں ہے کہ بجائے خود نکاح کرنے کے جس سے چاہتے اس کا نکاح کر دیتے اور مہر خود لے لیتے۔ اس مضمون کی بہت سی روایات ہیں کسی میں اہل یثرب کا یہ طریق بیان کیا گیا ہو کسی سے پایا جاتا ہو کہ اہل تہامہ اپنی عورتوں سے بہت بدسلوکی کرتے تھے۔ اور تمام روایات کا اس پر اتفاق ہو کہ میت کے مال کے وارث اس کی بیوی کے بھی وارث ہوتے تھے پس اس رسم بد کی یہاں اصلاح کی ہو۔ زہری سے مروی ہو کہ وہ لوگ عورت کو بلاضرورت روک رکھتے تھے یعنی حالانکہ اس سے بی بی کا تعلق نہ ہوتا تھا۔ مگر اس غرض سے اسے طلاق نہیں دیتے تھے کہ جب وہ مرے تو اس کے مال کے وارث ہوں +

۶۲۹ فاحشة مبينة۔ فاحشة کے معنی ۶۲۲ میں بیان ہو چکے ہیں - باوجود مبینة کا لفظ ساتھ ہونے کے قتادہ۔ ضحاک۔ ابن عباس وغیرہم سے یہاں معنی نشوزا اور سوء الخلق مروی ہیں یعنی خاوند کی نافرمانی یا اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا اور بدخلقی۔ اور بعض نے زنا بھی معنی کئے ہیں مگر حق یہ ہو کہ لفظ عام ہو اس لئے معنی اس کے وسیع ہیں۔ اور زنا بھی یہاں مفہوم میں شامل ہو سکتا ہو اس کے لئے کوئی مانع نہیں +

طلاق کے وقت سے مال لینا

یہ دوسری تکلیف ہو جو عورتوں کو پہنچائی جاتی تھی یعنی جب ایک شخص ایک بی بی کو ناپسند کرتا تو بجائے اس کے کہ طلاق دے اسے روک رکھتا اور اس کو تنگی اور تکلیف میں رکھتا یہاں تک کہ وہ تنگ ہو کر اس بات کو منظور کرتی کہ اپنے مال میں سے کچھ اسے دے۔ یا جیسا کہ اہل تہامہ کے ذکر میں لکھا ہو طلاق دیتے وقت یہ شرط کر لیتا کہ وہ اسی پہلے خاوند کے منشاء کے خلاف شادی نہ کرے گی اور غرض اس کی یہ ہوتی کہ جو کچھ مال اس پر پہلے خرچ کیا تھا اس کا کچھ حصہ اسے دوسرے خاوند کے نکاح میں دیکر خود وصول کرے (رد)۔ اسلام نے مہر لینے سے روکا ہو سوائے ایک صورت کے ان یاتین بفاحشة مبينة۔ ان سے زنا یا مبادی زنا یا نشوز کا ارتکاب ہو تو ایسی صورت میں چونکہ خلع ہوگا اسلئے یہ اختیار ہوگا کہ کچھ حصہ مہر کا جو دیا گیا تھا واپس لیا جائے۔

عشيرة

۶۳۰ عاشروا۔ اس کا مادہ عشر ہے جس کے معنی دس ہیں۔ اور چونکہ دس کو عدد کامل سمجھا گیا ہو۔ اس لئے عَشِيرة ایک شخص کے اہل کو کہتے ہیں جن سے وہ کثرت حاصل کرتا ہو گویا وہ اس کے لئے عدد کامل کے طور پر ہوتے ہیں (غ) پھر ایک شخص کے سارے اقارب پر یہ لفظ بولا گیا ہو۔ اور معاشرة کے معنی ہیں مصاہرت میں ہیں اس کیلئے دس کی مانند ہو گیا (غ) عشیر

معاشرة

کے معنی چونکہ مخالطت ہیں یعنی میل جول رکھنا۔ اسی سے معاشرة کے معنی بھی مخالطت ہیں اور عَشِير کے معنی قریبی اور صدیق یعنی

عشير

دوست ہیں۔ اور عورت کا عشیر اسکا خاوند ہو اسلئے کہ وہ مرد اس عورت کے اور عورت اس مرد سے دوست کیطرح میل جول رکھتے ہیں +

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝

اور تم اسے سونے کا ڈھیر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو کیا تم اسے بہتان سے اور کھلے گناہ کے ساتھ لوگے؟ ۶۳۱

عورتوں سے سلوک

یہ تیسرا امر ہے جس کی طرف اسلام نے توجہ دلائی ہے۔ پہلے دو احکام میں صرف ایک بد رسم کو دور کیا ہے۔ مگر یہاں اس بد رسم کو کہ عورت کے ساتھ عام طور پر خانہ داری کی زندگی میں انصاف کا برتاؤ نہ ہوتا تھا۔ اس کی کوئی خاص عزت و منزلت نہ تھی بلکہ صرف خواہشات کو پورا کرنے کا اسے ذریعہ سمجھا گیا تھا دور کرنے کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ عورت و مرد کا کیا تعلق ہے اور ایک ہی لفظ عاشروھن میں مرد و عورت کے سارے تعلق کو روشن کر دیا ہے میاں بی بی کا تعلق ایک دوسرے کے صدیق یا سچے دوست کا تعلق ہے جو ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ اور صرف لفظ معاشرت پر ہی انحصار نہیں رکھا جو بجائے خود صادقانہ تعلقات کا مقتضی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ تاکید کے طور پر لفظ بالمعروف بھی بڑھا دیا ہے یعنی ایسی معاشرت جو پہچانی گئی یا پسند کی گئی ہے اور ساتھ یہ بھی بڑھا دیا ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ وہ تمہیں ناپسند ہوں مگر ناپسندیدگی کا یہ نتیجہ نہ ہونا چاہئے کہ ان سے اچھا میل جول نہ رکھا جائے۔ بلکہ ایسی صورت میں اپنی طبیعت پر جبر کرکے بھی ان سے حسن اخلاق سے پیش آنا چاہئے کیونکہ جس طرح انسان کا یہ دن رات کا تجربہ ہے کہ ایک چیز کو وہ پہلے پسند نہیں کرتا مگر آخر کار اس سے بہت سے فوائد حاصل کرتا ہے۔ ایسا ہی عورتوں کے معاملہ میں بھی سمجھایا ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ تم بی بی کو ناپسند کرو لیکن اگر طبیعت پر جبر کرکے اس سے حسن سلوک کروگے تو اللہ تعالیٰ ناپسندیدگی کو بھی دور کر دے گا اور اس تعلق کو بہت سی بھلائی کا موجب کر دیگا +

حدیث میں حسن معاشرت کی تاکید

عورتوں سے حسن معاشرت کا حکم اسلام کی خصوصیات میں سے ہے اور اس کی نہایت عمدہ تفسیر حدیث و تعامل نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں ملتی ہے۔ آپ نے فرمایا خیرکم خیرکم لاھلہ۔ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل سے سب سے اچھا سلوک کرتا ہے۔ اور حجۃ الوداع میں آپ کی آخری نصیحت تھی واستوصوا بالنساء خیرا۔ عورتوں سے اچھا سلوک کرنا اور یہ بھی فرمایا کہ یہ نری میری تعلیم ہی نہیں بلکہ میرا عمل بھی ہے وانا خیرکم لاھلہ اور تاریخ شاہد ہے کہ آپ کے اخلاق اپنے اہل سے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے تھے۔ آپ ان سے ہنستے کھیلتے بھی تھے۔ اور ہمیشہ کشادہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ ان کو ہنساتے بھی تھے ان کے کاموں میں ان کی مدد بھی کرتے تھے بعض دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ کے ساتھ آپ دوڑے بھی ہیں +

طلاق کب دینی جائز ہے

ع۶۳۱ پچھلی آیت کے آخر پر فرمایا تھا کہ بی بی سے اچھا میل جول رکھو یہانتک کہ ناپسند بھی ہو تو طبیعت پر جبر کرکے اس سے حسن سلوک کرو لیکن بعض وقت ناپسندیدگی ناقابل علاج ہوتی ہے۔ اور طبائع میں قطعاً میل جول نہیں ہو سکتا تو ایسی صورت میں ایک کو دوسرے کے ساتھ بندھے رکھنا ان کے اخلاق کو بھی تباہ کرتا ہے اور ان کی اولاد کو بھی۔ اس لئے اس آیت میں اس صورت کا ذکر کیا ہے۔ جب ناپسندیدگی قابل علاج نہ ہو۔ یوں یہاں یہ بھی بتا دیا ہے کہ طلاق اسی صورت میں دینی جائز ہے جب ناپسندیدگی یا ناموافقت طبع اس حد کو پہنچ جائے۔ یہاں یہ کیوں نہ کہا کہ تم اسے طلاق دینا چاہو اور یہ کہا کہ اس کی بجائے دوسری بی بی کرنا چاہو۔ اس لئے کہ اسلام انسان کی معمولی حالت اسی کو قرار دیتا ہے۔ کہ وہ شادی شدہ ہو۔ پس جب ایک بی بی کو طلاق دیگا تو لازماً دوسری سے نکاح کریگا۔ اس آیت سے جو ایک نہایت ضروری حکم پر مشتمل ہے یعنی جب مرد کو عورت ناپسند ہو اور وہ اس سے حسن معاشرت نہ رکھ سکتا ہو تو اس بی بی کو چھوڑ کر دوسری سے نکاح کرلے۔ عورتوں کے ادل بدل کرتے رہنے کا نتیجہ نکالنا بگڑے ہوئے دماغ کا کام ہو سکتا ہے۔ یہاں تو صرف یہ حکم ہے کہ ایسی صورت میں بیشک ایک بی بی کو طلاق دینا جائز ہے۔ اور اس طلاق شدہ کی جگہ دوسری بی بی سے نکاح کرنا بھی جائز ہے عیسائیت کے قانون کی طرح نہیں کہ اگر ایک سے ان بن ہوئی یہانتک کہ میاں بی بی قانوناً الگ الگ بھی کئے جائیں کیونکہ اکٹھے وہ زندگی بسر نہیں کرسکتے۔ تو اب نہ بی بی

۲۱ وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ

اور تم اسے کس طرح لے سکتے ہو حالانکہ تم میں سے ایک دوسرے تک پہنچ چکا ہے

کو اجازت ہے کہ دوسرا نکاح کرے نہ خاوند کو اختیار ہے کہ دوسری بی بی سے نکاح کرے۔ بلکہ اس لفظ استبدال میں عیسائیت کے اس بیہودہ قانون کی طرف ہی اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جب ایک نکاح ناکامیاب ثابت ہوا ہے اور کسی طرح پر وہ مودت و الفت پیدا نہیں ہو سکتی جو نکاح کا اصل منشا ہے تو پھر ایسا تعلق قطع ہو کر دوسرا تعلق کیوں قایم نہ ہو۔ طلاق دی ہوئی عورت کو بھی دوسرا خاوند کرنے کا اختیار ہے۔ جیسا دوسری جگہ بالصراحت آچکا ہے۔ اور طلاق دینے والے خاوند کو دوسری بی بی سے نکاح کرنے کا اختیار اس لفظ استبدال میں دیا ہے اور ایسی صورت میں جب نشوز یا فساد باہمی میں خاوند پر الزام ہو وہ عورت سے ایک حبہ اس مال کا واپس نہیں لے سکتا۔ جو بطور تحفہ یا مہر اس نے دیا یا دینا کیا ہو۔ گو وہ مال ایک قنطار یعنی سونے کے ڈھیر کے برابر بھی ہو۔ آیت کے آخری الفاظ میں فرمایا کہ کیا تم مال لینے کی خاطر عورت پر کوئی بہتان لگاؤ گے یعنی فاحشہ مبینہ کا الزام۔ یا کسی گناہ کا ارتکاب کروگے یعنی جاہلیت کی طرح عورت کو دکھ دینا شروع کروگے تاکہ وہ مال کا کچھ حصہ واپس کر کے خلع کرائے پس اسلام دئے ہوئے مال کے (یا جو معاہدہ کے نیچے دینا ہو اس کے) واپس لینے کی اس صورت میں اجازت نہیں دیتا

مہر کی مقدار

یہ آیت اس پر بھی صریح دلیل ہے کہ عورتوں کے مہر پر کوئی حد بندی نہیں یعنی جتنا مہر کوئی شخص چاہے دے سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بڑے بڑے فرضی مہر باندھے جائیں۔ بلکہ مہر وہی ہے جو ادا کر دیا جائے ایسے مہر باندھنا جو ایک انسان ادا ہی نہیں کر سکتا۔ صریحا خلاف قرآن کریم ہے۔ یہاں بیشک قنطار کا دینا بھی جائز رکھا ہے جو ایک غیر محدود مقدار ہے مگر اٰتیتم کا لفظ بڑھا کر اور دوسری جگہ اٰتوا النساء صدقاتهن نحلة کا حکم دیکر یہ صاف بتا دیا کہ مہر دینے کی چیز ہے ایسا مہر باندھنا جو دے نہیں سکتا۔ یا جو دینے کا ارادہ نہیں۔ خلاف قرآن شریف ہے۔ اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا من خیر النساء ایسرهن صداقا بہترین عورت وہ ہے جس کے مہر میں سہولت ہو اور ایک حدیث میں ہے اعظم النساء برکة ایسرهن صداقا سب سے بڑھکر برکت والی عورت وہ ہے جس کے مہر میں سہولت ہو۔ ہاں

حضرت عمرؓ کا خطبہ تعیین مہر پر

اگر ایک امیر آدمی اپنی عورت کا مہر لاکھوں روپے بھی باندھتا ہو تو اسے روکنا بھی درست نہیں۔ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر چڑھے۔ اور فرمایا اے لوگو تم کتنا اپنی عورتوں کے مہر کو بڑھاتے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے اصحاب کے درمیان مہر چار سو درم یا اس سے کم ہی ہوتے تھے۔ اور اگر مہر میں زیادتی اللہ کے نزدیک تقویٰ اور عزت کا موجب ہوتی تو تم ان سے اس بارہ میں سبقت نہ لے جاتے۔ اس لئے میں چار سو درہم سے زیادہ مہر کو تسلیم نہیں کرونگا (اور ایک روایت میں ہے جس قدر چار سو درہم سے زیادہ ہوگا۔ اسے بیت المال میں داخل کرونگا) پھر آپ منبر سے اُترے تو ایک عورت قریش میں سے سامنے آئی۔ اور کہا اے امیر المومنین آپنے لوگوں کو چار سو درہم سے زیادہ مہر دینے سے روکا ہے۔ آپنے کہا ہاں اس نے کہا کیا آپنے نہیں سُنا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے وان اٰتیتم احدٰهن قنطارا فلا تاخذوا منه شيئا تو حضرت عمرؓ نے کہا اللّٰهم غفرا كل الناس افقه من عمر۔ اے اللہ معاف فرما یہ سب لوگ عمر سے زیادہ سمجھدار ہیں (اور ایک روایت میں ہے کہ اس عورت نے کہا اے خطاب کے بیٹے تو ہم کو روکتا ہے اور اللہ ہم کو دیتا ہے اور یہ آیت پڑھی تو آپنے فرمایا نساء المدينة افقه من عمر مدینہ کی عورتیں عمر سے زیادہ سمجھدار ہیں) تب حضرت عمر پھر منبر پر چڑھے اور فرمایا اے لوگو میں تم کو اس بات سے روکتا تھا کہ چار سو درہم سے زیادہ مہر دو۔ لیکن جو کوئی تم میں سے اپنے مال سے جس قدر چاہے

وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ○ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ۲۲

اور وہ تم سے مضبوط عہد لے چکی ہیں ۶۳۲ اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں

دے سکتا ہو (ث) ۔

یہ روایت بتاتی ہو کہ صحابہؓ کس طرح قرآن کریم کے سامنے گردنیں جھکاتے تھے۔ الفاظ کی صراحت کے بالمقابل آپ نے تاویل سے کام نہیں لیا یہ نہیں کہا کہ یہ بطور مثل ہو جس طرح بعض مفسرین نے یہ تاویل کرلی ہو۔ بلکہ بھرے مجمع میں اپنی بات سے رجوع کیا۔ یہی سب سے بڑی ضرورت اسلام کو آج ہے کہ اس کے پیرو اور اس کے علماء اور اس کے مشائخ احکام قرآنی کے سامنے سر تسلیم خم کردیں۔ عام لوگوں کے اندر یہ جرأت پیدا ہو کہ وہ اپنے پیروں اور علماء کو جب وہ خلاف قرآن بات کہیں روک سکیں اور ان پیروں اور علماء میں یہ تقوٰی ہو کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم سُن کر اپنی بات سے رجوع کریں ۔

فضا ۔ افضٰی

۶۳۲ افضٰی ۔ فضا فراخ مکان کو کہتے ہیں ۔ اور اسی سے اَفْضٰی فُلَانٌ اِلٰی فُلَانٍ کے معنی ہیں ۔ اس کی طرف پہنچ گیا گویا اس دوسرے شخص کو فضاء یا مکان قرار دیا گیا ۔ اور مفردات میں ہو کہ عورت کی طرف افضاء کنایہ میں زیادہ بلیغ اور تصریح میں زیادہ قریب ہو خَلَا بِھَا سے یعنی اس سے خلوت کی گویا مراد اس سے عورت سے خلوت کرنا ہو یہی معنی امام ابوحنیفہؒ نے لئے ہیں ۔

غلیظ

میثاقًا غلیظًا ۔ غِلْظَۃ ۔ رِقَّۃ کی ضد ہو ۔ گویا غلیظ کے معنی موٹا ہیں ۔ اور اس کا اصل استعمال اجسام میں ہے لیکن بطور استعارہ ..... معانی میں مثل کبیر اور کثیر کے استعمال ہوتا ہو ۔ اور میثاق کے ساتھ لانے سے اس کے معنی عہد

میثاق غلیظ

موکد یا مضبوط عہد کے ہونگے ۔ قتادہ کہتے ہیں کہ میثاق غلیظ سے مراد وہ عہد ہو جو اللہ تعالےٰ نے عورتوں کے بارہ میں مردوں سے لیا ہو ۔ جیسے فامساک بمعروف او تسریح باحسان ہیں کیونکہ مسلم میں نبی کریم صلعم کے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ الفاظ مروی ہیں واستوصوا بالنساء خیرا فانکم اخذتموھن بامانۃ اللہ یعنی عورتوں کے ساتھ نیک معاملہ کرو کیونکہ تم نے ان کو اللہ کی امانت سے لیا ہو گویا نکاح کو ہی امانت یا عہد قرار دیا ہو پس میثاق غلیظ سے مراد نکاح ہی ہو ۔

عورت سے کس صورت میں لیا جا سکتا ہو

اس آیت میں وجہ دی ہو کہ کیوں عورتوں سے مہر کا واپس لینا درست نہیں ۔ اس لئے کہ تم ان سے خلوت کر چکے ہو ۔ اور معاہدہ کر چکے ہو ۔ اب جب تک ان سے کوئی امر خلاف معاہدہ سرزد نہ ہو ۔ ان کو کوئی سزا نہیں دی جا سکتی بعض لوگوں نے اس آیت کو سورۃ بقرہ کی اس آیت کا جس میں بوجہ خلع عورت سے مہر کا کچھ حصہ لے لینا جائز ہو ناسخ قرار دیا ہو اور بعض نے اس آیت کو اس سے منسوخ قرار دیا ہو حالانکہ دونوں باتیں غلط ہیں ۔ سورۃ بقرہ کی آیت خُلع کا تو یہ منشاء ہو کہ اگر عورت بوجہ ناموافقت طبیعت یا کسی اور وجہ سے طلاق حاصل کرنا چاہتی ہو اور خاوند کا کوئی قصور نہیں تو اس صورت میں مہر کا کچھ حصہ لے لینا جائز ہو ۔ اور یہاں یہ فرمایا کہ اس صورت میں کچھ لے لینا جائز ہے جب مرد عورت کو بوجہ فاحشۃ مبینۃ طلاق دینا چاہے لیکن اور کسی وجہ پر طلاق دینا چاہے تو مہر کا لینا جائز نہیں ۔ اور ان دونوں باتوں میں کوئی تناقض نہیں ۔ عورت طلاق لینا چاہتی ہو تو مہر کا حصہ دے ۔ مرد طلاق دینا چاہتا ہو تو کچھ مہر میں سے نہیں لے سکتا ۔ سوائے ایک صورت کے کہ عورت سے فاحشۃ مبینۃ کا ارتکاب ہو پہلی حالت کا بیان سورۃ بقرہ میں ہو ۔ اس دوسری حالت کا بیان ذکر کیا ہو کس قدر تعجب ہے کہ غور وخوض سے کام نہ لینے سے جھٹ ایک آیت کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیا جاتا ہو حالانکہ دونوں حکم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں ۔ بلکہ اس سے نظم قرآنی کا کمال معلوم ہوتا ہو ۔ کہ کس طرح حصے حصے کرکے مضامین کو مکمل کردیا ہو ۔

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝

مگر جو گزر چکا بیشک یہ بےحیائی اور سخت بیزاری کی بات ہے اور بری راہ ہے ۶۳۳

۲۳ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ

ع ۱ — کن عورتوں سے نکاح حرام ہے

تم پر یہ عورتیں، حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں

وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ

اور بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو اور تمہاری

مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ

رضاعی بہنیں اور تمہاری بیبیوں کی مائیں اور تمہاری پالی ہوئی لڑکیاں جو تمہاری حفاظت میں ہوں ان عورتوں (کے بطن) سے

الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۡ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ

جن پر تم داخل ہو چکے ہو اور اگر تم ان پر داخل نہ ہوئے ہو تو تم پر کوئی

عَلَيْكُمْ ۡ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ

گناہ نہیں اور تمہارے ان بیٹوں کی بیبیاں جو تمہاری پیٹھوں سے ہوں ۶۳۴

مقت

۶۳۳ مقتاً۔ مقت سخت بغض ہے اس شخص کیلئے جس کو تم فعل قبیح کرتا دیکھو (غ)۔

یہ پانچویں اصلاح ہے جو مرد و عورت کے تعلقات میں اسلام نے کی عرب میں یہ رواج تھا جیسا کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اپنے باپوں کی بیبیوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ گو معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم اچھی نہ سمجھی جاتی تھی اور اسی لئے وہ لوگ اسے نکاح مقت کہتے تھے۔ تاہم اس رسم پر عمل ہوتا تھا۔ اسلام نے اس کو جڑ سے کاٹ دیا۔

الا ما قد سلف کے لفظی معنی تو صرف اسی قدر ہیں کہ جو پہلے گزر چکا۔ حرمت سود کے معاملہ میں بھی یہی لفظ آتے ہیں۔ فمن جاءہ موعظۃ من ربہ فانتھی فلہ ما سلف (البقرۃ۔ ۲۷۵) جہاں فلہ ما سلف کے معنی بتائے گئے ہیں کہ جو گناہ اس سے ہو چکا اس سے درگزر کی جائے گی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جس نے سودی معاملہ کیا ہوا ہے وہ سود لیتا رہے۔ بلکہ صاف الفاظ میں وہاں یہ ہدایت موجود ہے وذروا ما بقی من الربٰوا (البقرۃ۔ ۲۷۸) جو سود اس وقت لینا باقی ہے وہ بھی ترک کرنا پڑیگا۔ اسی طرح یہاں بھی الا ما قد سلف کے معنی ہیں جو تمہارا فعل ہو چکا اس کی وجہ سے تم پر کوئی گرفت نہیں (غ)، یہ مطلب نہیں کہ جو نکاح پہلے ہو چکا وہ اب باقی رہ سکتا ہے چونکہ اس آیت کے نزول کے بعد ایسا نکاح نا جائز ہو گیا اس لئے وہ تو فوراً فسخ ہو جائیگا البتہ اس کے کرنے والے پر کوئی گرفت نہیں پس الا ما قد سلف میں استثنا گناہ سے ہے جواز فعل سے نہیں۔

اُمّ

۶۳۴ اُمہات۔ اُمّ کی جمع ہے اور اس میں قریب کی والدہ جس نے اسے جنا ہے۔ اور بعید کی والدہ جس نے اس کے جننے والوں کو جنا ہو جیسے دادی نانی شامل ہیں (غ)۔

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۙ

اور یہ کہ تم دو بہنوں کو اکٹھا کرو — مگر جو گزر چکا — بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے

بنت — بنات۔ بنت کی جمع ہے۔ اور اس میں اولاد کی بیٹی یا اولاد کی اولاد کی بیٹی بھی شامل ہیں ◆

أخت — اَخَوات۔ اُخت کی جمع یعنی بہن۔ خواہ حقیقی بہن ہو یا صرف باپ کی طرف سے یا صرف ماں کی طرف سے ◆

عمة — عمّات۔ عَمَّةٌ کی جمع ہے اور عَمّ باپ کا بھائی ہے۔ اور عَمَّةٌ اصل میں باپ کی بہن یا پھوپی ہے ایسا ہی دادا کی بہن اور ماں کے باپ کی یا نانا کی بہن بھی عَمَّةٌ کہلائے گی ◆

خالة — خالات۔ خَالَةٌ کی جمع ہے اور وہ ماں کی بہن یا ماسی ہے ایسا ہی نانی کی بہن اور باپ کی طرف سے بھی خالہ ہو سکتی ہے۔ یعنی باپ کی ماں یا دادی کی بہن ◆

ربيبة — ربائبکم۔ ربائب۔ رَبِیبَۃٌ کی جمع ہے جو فعیل بمعنی مفعول ہے یعنی مَرْبُوبَۃٌ یا وہ لڑکی جس کو تم نے پالا ہے۔ اور لفظ ربیب یا ربیبۃ اس اولاد سے مخصوص ہے جو پہلے خاوند سے ہو اور دوسرا خاوند اس کی پرورش کرنے والا ہو۔ یا پہلی بیوی سے ہو اور دوسری بیوی اس کی پرورش کرنے والی ہو (غ) ◆

حجر — حجور۔ حِجْر کی جمع ہے۔ اور مراد اس سے حفاظت میں آنا ہے۔ کیونکہ حِجْر کے اصل معنی منع ہیں یعنی روکنا۔ جو پتھر کی سختی سے لئے گئے ہیں۔ اور حِجْر حفاظت یا تربیت کو اس لئے کہتے ہیں کہ جو شخص بچے کو اپنی حفاظت میں لیتا ہے وہ اسکے اموال اور دیگر حالات میں تصرف سے اوروں کو روکتا ہے ◆

حليلة — حلائل۔ حَلِیلَۃٌ کی جمع ہے (جو حَلَّ سے ہے جس کے معنی کھولنا ہیں) اور حلیل خاوند کو اور حلیلۃ بی بی کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کے لئے حلال ہیں ◆

چودہ وجوہ حرمت نکاح — اس آیت میں تیرہ قسم کی حرمت نکاح میں بیان کی ہے۔ اور اس سے پہلی آیت کو ساتھ شامل کر کے کل چودہ وجوہ حرمت ہیں۔ اور اس سے بعد کی آیت میں ایک عام حکم حرمت کا اور ہے۔ مگر اصل وجوہ حرمت نکاح چودہ ہی ہیں۔ ان میں سے سات بلحاظ نسب ہیں۔ اور سات دیگر وجوہ سے۔ جو سات وجوہ حرمت بلحاظ نسب ہیں وہ بھی دو قسم ہیں یعنی قسم اول بلحاظ ولادت ہے اور اس میں دو ہی قسم آتی ہیں یعنی مائیں اور فرع یعنی بیٹیاں اور قسم دوم بلحاظ اخوت ہے جو پانچ ہیں یعنی بہن باپ کی بہن۔ ماں کی بہن۔ بھائی کی بیٹی۔ بہن کی بیٹی۔ اور دیگر وجوہ میں جو سات وجہ حرمت ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔
دودھ مائیں۔ دودھ بہنیں۔ بیبیوں کی مائیں۔ بیبیوں کی پہلی بیٹیاں بشرطیکہ ان بیبیوں سے خلوت صحیحہ ہو چکی ہو۔ اور بشرطیکہ وہ بیٹیاں بطور ربیبہ ہوں (بعض کے نزدیک یہ دوسری شرط نہیں بلکہ محض عام صورت حال کا بیان ہے) بیٹوں کی بیبیاں۔ باپوں کی بیبیاں (جس کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے) اور دو بہنوں کا ایک وقت نکاح میں رکھنا۔ قرآن کا دعویٰ کامل شریعت ہونے کا کیسا صحیح ہے کہ ہر مسئلہ میں اصول خود قایم کر دیتے ہیں۔ دوسری قومیں بھی کچھ نہ کچھ محرمات ضروری قرار دیتی ہیں۔ مثلاً ماں یا بیٹی سے یا بہن سے نکاح کرنے کا رواج کسی قوم میں نہیں مگر ان کی کتب مقدسہ اس بارہ میں خاموش ہیں۔ صرف توریت میں کچھ ذکر ہے جس کیلئے دیکھو احبار باب ۱۸: ۶-۱۸ ◆

رضاعت کے رشتے — جو وجوہات حرمت اوپر بیان ہوئی ہیں ان میں صرف دودھ ماؤں اور دودھ بہنوں کا ذکر بالتصریح آیا ہے۔ اور رضاعت کے باقی رشتوں کا کوئی ذکر نہیں لیکن متفق علیہ حدیث میں ہے یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب یعنی جن جن رشتوں کی بوجہ نسب ممانعت ہے۔ انہی رشتوں کی بوجہ دودھ پلانے کے حرمت ہے۔ قرآن کریم ایک جامع کلام ہے۔ اس نے

۲۴ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

اور تمام بیاہی ہوئی عورتیں سوائے ان کے جنکے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے ۶۳۵ یہ تم پر اللہ کا فرض کیا ہوا ہے۔

حرمت بوجہ نسب کو دو اقسام پر تقسیم کر دیا ہے ایک حرمت بوجہ ولادت اور ایک حرمت بوجہ اخوت۔ اسلئے جب دودھ کے رشتہ کی حرمت کا ذکر آیا تو کمال بلاغت سے حرمت بوجہ ولادت کا اصل موجب یعنی ماں ہونا جس میں بیٹی ہونا بھی شامل ہے بیان کر دیا ہے اور حرمت بوجہ اخوت کا اصل موجب یعنی بہن ہونا جس میں باپ کی بہن ماں کی بہن بھائی کی بیٹی بہن کی بیٹی شامل ہیں) ذکر کر دیا۔ اور تفصیل کو چھوڑ دیا گیا پر حکمت کلام ہے کہ ضرورت سے زائد ایک لفظ بیان نہیں کیا۔ ہاں اسی سے یہ بھی سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم صلعم کا فہم بھی کیسا الٰہی روشنی سے منور ہے کہ اصل حقیقت تک فوراً پہنچ کر یحرم من الرضاع مایحرم من النسب کا حکم دیدیا اسی طرح دو بہنوں کو ایک وقت میں نکاح میں رکھنے کی جو حرمت ہے حدیث نے اسی حکم میں پھوپی اور بھتیجی کے جمع کرنے کو اور خالہ اور بھانجی کے جمع کرنے کو بھی شامل کیا ہے اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ کیونکہ اصل تعلق وہاں بھی اخوت کا ہے۔ گویا ایک عورت کے ساتھ اس کی بہن اس کے باپ کی بہن اس کی ماں کی بہن کو جمع کرنے کا حکم یکساں ہے۔ رضاعت کے متعلق یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس میں دو سال کی عمر کے اندر اندر بچہ کو دودھ پلانا شرط ہے جیسا کہ یرضعن اولادھن حولین کاملین (البقرۃ ۲-۲۳۳) سے ظاہر ہے اور دوسرے حدیث میں ہے الرضاعۃ من المجاعۃ یعنی وہ دودھ پلانا حرمت کے حکم میں لاتا ہے جو بھوک کے وقت بچہ کو دودھ پلایا ہو یوں ہی بچہ کا ایک دو دفعہ مُنہ مار لینا کافی نہیں۔

حِصن

تحصّن

حصینۃ حصان

حَصَان

محصنۃ

۶۳۵ الْمُحْصَنٰت۔ مُحْصَنَۃ کی جمع ہے۔ جو حِصْن سے ہے اور اس کے اصل معنی قلعہ ہیں اور جمع حُصُون آتی ہے مانعتہم حصونہم من اللہ (الحشر ۵۹-۲) اور اسی سے تَحَصَّنَ ہے جس کے معنی ہیں قلعہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اور اس سے تجاوز کر کے ہر قسم کے تحرّز پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے دِرْعٌ حَصِیْنَۃٌ زرہ جو بدن کی حفاظت کرتی ہے۔ فَرَسٌ حِصَانٌ وہ گھوڑا جو اپنے سوار کو بچاتا ہے اور قرآن کریم میں ہے اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ (یوسف ۱۲-۴۸) یعنی محفوظ مکان میں محفوظ کرو اور امرأۃ حَصَانٌ کے معنی ہیں عفیفہ اور ذو حُرْمَۃ یعنی پاکدامن اور عزت والی عورت۔ اور اِحْصَان کے معنی نکاح کرنا ہیں فاذا اُحْصِنَّ (۲۵) اور مُحْصَنَۃٌ حصان کو کہتے ہیں خواہ وہ بوجہ عفت کے محفوظ ہو یا بوجہ نکاح کے یا بوجہ اپنی بلند مرتبگی کے اور حریت کے (غ) اور عورت مُحْصَنَۃ ہوتی ہے بوجہ اسلام اور پاکدامنی اور آزادی اور نکاح کے (ل) اور ان چاروں معنوں میں اس لفظ کا استعمال قرآن کریم میں ہوا ہے پس محصنات سے مراد مسلمان عورتیں یا پاکدامن عورتیں یا آزاد عورتیں یا منکوحہ عورتیں ہو سکتی ہیں۔

اس آیت کی تفسیر مفسرین نے چار طرح پر کی ہے۔ اول محصنات سے مراد خاوند والی عورتیں لیجائیں تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ما ملکت ایمانکم سے مراد وہ عورتیں لی جائیں جو جنگ میں قید ہو کر ملک یمین ہو جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ملک یمین سے ملک نکاح مراد لیجائے تو پہلی صورت میں معنی یہ ہوئے کہ خاوند والی عورتوں سے نکاح کرنا منع ہے۔ سوائے ان خاوند والی عورتوں کے جو ملک یمین میں آجائیں۔ اور دوسری صورت میں یہ معنی ہوئے کہ خاوند والی عورتیں تم پر حرام ہیں سوائے اس صورت کے کہ وہ تمہاری ملک نکاح میں آجائیں بعد اس کے کہ ان کے پہلے خاوندوں سے جدائی واقع ہو جائے کیونکہ جبتک پہلے خاوند سے جدائی نہ ہو۔ ملک نکاح میں ایسی عورت نہیں آسکتی۔ دوم محصنٰت سے مراد آزاد عورتیں لیجائیں تو اس صورت میں بھی دو طرح پر معنی کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ما ملکت ایمانکم سے مراد وہ عدد لیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے حد مقرر کر دی ہے یعنی چار اور دوسرے یہ کہ ما ملکت ایمانکم سے مراد یہ لی جائے کہ وہ عورتیں جو تمہارے قبضہ میں جائز طور پر آچکی ہیں یعنی ولی کی رضامندی سے اور گواہوں کی موجودگی و دیگر شرائط کے ساتھ۔ تو گویا ان دو صورتوں میں معنی یہ ہوئے کہ آزاد عورتیں چار کی تعداد سے زائد تمہارے لئے حرام ہیں یا یہ کہ آزاد عورتیں تمہارے لئے حرام ہیں۔ سوائے اس کے

ملک یمین کا حکم

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ ۶۳۶

اور جو اس کے سوا ہیں وہ تمہارے لئے حلال ہیں (اس طرح کہ تم اپنے مالوں کیساتھ انکو چاہو نکاح میں لاکر نہ شہوت رانی کرتے ہوئے)

کیجائز طور پر وہ تمہارے نکاح میں آئیں۔ان معانی میں سے موخرالذکر معنی پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا اور پہلے معنی بھی تھوڑے تدبر سے صاف ہو جاتے ہیں اس معنی کے لحاظ سے تمام منکوحہ عورتوں سے خواہ وہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتی ہوں نکاح حرام ٹھہرایا گیا ہو اور یوں دوسرے مذاہب کی عورتوں کے نکاح کو بھی صحیح تسلیم کیا ہو اور حکم دیا ہو کہ کسی مذہب یا قوم کی عورت سے جو نکاح شدہ ہو مسلمان کا نکاح کرنا ناجائز ہو۔سوائے ایک صورت کے کہ کوئی ایسی منکوحہ عورت ملک یمین ہوجائے تو اس صورت میں اس سے نکاح کرلینا جائز ہو۔یہاں نکاح کے بغیر کسی قسم کا تعلق مرد وعورت کا ہونا ہرگز تسلیم نہیں کیا گیا ہو۔بلکہ صرف لونڈی سے نکاح کی اجازت ہو۔اور وہ نکاح دوسری شرائط کے ماتحت ہو جن میں سے بعض خاص شرائط کا ذکر آگے آیت ۲۵ میں آتا ہو اور عام شرائط دوسری جگہ قرآن کریم میں موجود ہیں مثلاً یہ کہ مشرک عورت سے نکاح جائز نہیں وغیرہ +

ان الفاظ کے ایک اور معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ تمام بیاہی ہوئی عورتیں تمہارے اوپر حرام ہیں سوائے ان بیاہی ہوئی عورتوں کے جن کے تمہارے اپنے داہنے ہاتھ مالک ہوں یعنی جو تمہارے اپنے نکاح میں ہوں۔اس صورت میں الا گویا استثنائے منقطع کا کام دیگا۔اور ترکیب اس طرح پر ہوگی۔کہ تمام بیاہی ہوئی عورتوں سے نکاح کرنا تمہارے لئے حرام ہے۔مگر جو عورتیں تم نے خود بیاہی ہیں وہ تم پر حرام نہیں ملک یمین سے مراد ملک نکاح نہ صرف مفسرین نے لیا ہو بلکہ لغت بھی اس پر شاہد ہو کیونکہ یمین کے معنی معاہدہ بھی ہیں اور نکاح ایک معاہدہ ہی ہو +

۶۳۶ کتٰب اللہ علیکم کتٰب یہاں مصدر موکد ہو۔اور اس سے مراد ہو واجب یا فرض کیا گیا +

ما وراء ذٰلکم اس کے سوا باقی عورتوں سے نکاح کرنا حلال ہو لیکن بعض حالات میں اور وجوہات سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔وہ دوسری آیات کے ماتحت آتی ہیں۔مثلاً تین بار کی مطلقہ لا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ کا یا مشرکہ عورت ولا تنکحوا المشرکات یا چار کے بعد پانچویں عورت۔یا جس سے لعان ہو چکا ہو جسکے متعلق نبی کریم صلعم نے فرمایا لا یجتمعان ابداً۔

مسافحین۔سفح خون یا پانی کے بہانے کو کہتے ہیں۔اور سفاح یا مسافحۃ کے معنی ہیں عورت کا مرد کے ساتھ بدکاری کی حالت میں رہنا اور صحیح طور پر ان کا عقد نہ ہونا کیونکہ اس سے مقصود پانی کا بہانا یا شہوت رانی ہو اور فریقین کے کوئی حقوق اور ذمہ داریاں پیدا نہیں ہوتیں +

سفح

یہاں پچھلی آیت کے مضمون کو صاف کر دیا۔جو عورتیں حرام ہیں ان کو گن کر بتایا کہ جو عورتیں حلال ہیں ان کے ساتھ تعلق اس صورت میں ہو کہ مہر دے کر انہیں قید نکاح میں لایا جائے اور بغیر نکاح کے ان کے ساتھ فجور کی حالت میں نہ رہیں۔قید نکاح میں لانے کی شرط کافی تھی غیر مسافحین ان خیالات کی تردید ہے جو تہذیب کے ساتھ پھیل رہے ہیں کہ قید نکاح میں خواہ مخواہ کی پابندی ہے۔قدرتی حالت میں مرد وعورت کا رہنا کافی ہے یعنی جس طرح حیوانات میں ایک جوڑا بن جاتا ہے۔اسی طرح ایک مرد اور ایک عورت بلا قید نکاح کے ملکر رہ لیا کریں +

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ

سو تم ان میں سے جسکے ساتھ نفع اُٹھانا چاہو تو انہیں ان کے مقرر شدہ مہر دیدو ۶۳۷

مَتاع — **۶۳۷** استمتعتم۔ اصل اس کا متع ہے اور مَتَاع کے معنی ہیں ایسا نفع اُٹھانا جو لمبے وقت کیلئے ہو (غ)۔ ومتعناھم الیٰ حین (یونس ۱۰ - ۹۸)، نمتعہم قلیلا (لقمان ۳۱ - ۲۴) سنمتعہم ثم یمسہم منا عذاب الیم (ھود ۱۱ - ۴۸) اور

اِستمتاع — استمتاع کے معنی ہیں طلب تمتع یعنی انتفاع ممتد الوقت کا طلب کرنا۔ ربنا استمتع بعضنا ببعض (الانعام ۶ - ۱۲۹)، فاستمتعوا بخلاقھم فاستمتعتم بخلاقکم کما استمتع الذین من قبلکم بخلاقھم (التوبۃ ۹ - ۶۹) اور عام محاورہ میں کہتے ہیں استمتع الرجل بولدہٖ یعنی آدمی نے اپنے بیٹے سے فائدہ اُٹھایا۔ پس استمتاع کے معنی محض نفع اُٹھانے کے ہیں نہ تعلقات زناشوئی۔

مُتعة — اور مُتعة کے معنی یوں کئے گئے ہیں اَلتَّمَتُّعُ بِالْمَرْأَةِ لَا تُرِيْدُ اِدَامَتَهَا لِنَفْسِكَ (ل) یعنی عورت سے فائدہ اُٹھانا جسکو تم اپنے لئے ہمیشہ رکھنا نہیں چاہتے ہو۔ یا جیساکہ امام راغبؒ نے لکھا ہے۔ ان الرجل کان یُشَارِطُ المرأۃَ بمالٍ معلومٍ یُعطیھا الیٰ اَجَلٍ معلومٍ فاذا انقضی الاجلُ فارقہا مِنْ غیرِ طلاقٍ یعنی ایک مرد ایک عورت سے شرط کر لیتا تھا کہ ایک معین مقدار مال کی اسے دیگا اور ایک وقت مقرر تک اس سے فائدہ اُٹھائیگا۔ اور جب وہ مدت گزر جاتی تو بغیر طلاق کے اس سے الگ ہو جاتا +

اجر — اجور۔ اَجْر کی جمع ہے۔ جو اصل میں تو وہ چیز ہے۔ جو ثواب عمل سے انسان کی طرف لوٹ کر آتی ہے۔ مگر عورت کے مہر پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے +

استمتاع اور متعہ میں فرق — ان الفاظ کی تاویل میں اہل تشیع کو یہ سخت غلطی لگی ہے کہ یہاں لفظ استمتعتم سے انہوں نے متعہ یا عارضی نکاح کا جواز نکالا ہے۔ حالانکہ استمتاع عام ہے اور مُتعة خاص معنی میں استعمال ہوا ہے جیساکہ اوپر لغت کے حوالہ سے دکھایا گیا ہے۔ بڑے اور چھوٹے انسانوں کا ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھانا۔ اور باپ کا بیٹے سے فائدہ اُٹھانا استمتاع ہے۔ اور اس کے معنی عارضی نکاح لینا صریح غلطی ہے۔ زجاج کا قول لسان العرب میں منقول ہے کہ اس آیت کے معنی میں ایک قوم نے بوجہ لغت سے جہالت کے بڑی سخت غلطی کھائی ہے +

دوسرا سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ گو متعہ کا ذکر یہاں مقصود نہ ہو مگر کیا ان الفاظ کے اندر فما استمتعتم بہٖ منہن متعہ کا مفہوم شامل نہیں ہو سکتا؟ کیونکہ استمتاع کے معنی طلب منفعت ہیں اور متعہ میں بھی طلب منفعت ہے۔ الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن شریف نے قید لگادی ہے کہ تم اپنے مال عورتوں پر اس رنگ میں خرچ کرو کہ ان کو قید نکاح میں لاؤ۔ اور قید نکاح جب ایک دفعہ عاید ہو جائے گی تو اس سے زوجین کی زندگی میں نکلنے کی صورت سوائے طلاق کے، اور کوئی قرآن شریف میں مذکور نہیں پس فما استمتعتم بہ منہن جو بطور نتیجہ وارد ہوا ہے وہ بھی اسی حالت یعنی قید نکاح کے متعلق ہی ہو سکتا ہے +

نکاح اور سافحت — قرآن شریف نے احصان یعنی نکاح کے مقابلہ پر مسافحت یعنی شہوت رانی کو رکھا ہے محصنین غیر مسافحین گویا جو احصان نہیں وہ مسافحت ہے۔ اس لئے متعہ کو ہمیں ان دونوں میں سے ایک میں شامل کرنا پڑے گا احصان اور مسافحت میں امر مشترک اس قدر ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کا تعلق ہوتا ہے دونوں میں امتیاز یہ ہے کہ احصان میں مرد اور عورت کا تعلق ساری عمر کیلئے ہوتا ہے مسافحت میں نہیں احصان میں عورت کے مرد پر کچھ حقوق پیدا ہوتے ہیں مثلاً ایک دوسرے کی زوجیت میں مرجائے تو حق وراثت پیدا ہوتا ہے۔ مسافحت میں پیدا نہیں ہوتا احصان میں اولاد کی پرورش کا ذمہ دار باپ ہے مسافحت میں نہیں

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ

اور تم پر اس کے متعلق کوئی گناہ نہیں

متعہ سافحت ہے نہ نکاح

پس احصان میں وہی امر داخل ہو سکتا ہے جو اس کے امتیازی پہلوؤں میں اس کا شریک ہو۔ اب متعہ میں ایک مرد و عورت کا تعلق ہے اس حد تک اس کا مسافحت کے ساتھ اشتراک ہو۔ اور احصان کی کوئی امتیازی خصوصیت اسکے اندر نہیں پائی جاتی۔ متعہ میں نہ تو کوئی تعلق عمر بھر کے لئے ہوتا ہے۔ اور نہ اگر مرد و عورت میں سے ایک دوسرے کی زوجیت میں فوت ہو جائے تو کوئی حقوق وراثت پیدا ہوتے ہیں۔ نہ اولاد کی پرورش کا ذمہ وار باپ ہوتا ہے۔ اس لئے صریحاً متعہ مسافحت میں داخل ہے نہ احصان کے اندر اور اگر یہ کہا جائے کہ متعہ میں اعلان ہوتا ہے تو اعلان ایک گونہ مسافحت میں بھی ہوتا ہے مسافحت کے معنی ہی علی الاعلان مرد اور عورت کا اکٹھا رہنا ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مسافحت کیسا تھ ایک جگہ چھپی آشنائی کو الگ بیان کیا ہے محصنين غير مسافحين ولا متخذي اخدان (المائدۃ ۵-۵) یہاں سے ان لوگوں کے لئے بھی جواب ہے جو نکاح کی غرض صرف شہوت رانی سمجھتے ہیں۔ اسلام نے نکاح کی غرض کو شہوت رانی سے اس قدر بلند قرار دیا ہے کہ شہوت رانی کو ناجائز قرار دیا ہے اور یوں بتایا ہے کہ نکاح صرف اس غرض کے لئے نہیں کہ مرد و عورت کے جذبات شہوانی پورے ہوں۔ بلکہ اس کی غرض بعض حقوق و ذمہ واریوں کا پیدا کرنا ہے جن سے تمدن و معاشرت انسانی کی بنیاد پڑتی ہے + نیز دیکھو ع ۶۳۹ میں خلان کی تشریح۔

احادیث میں متعہ کی حرمت

ہاں یہ سچ ہے کہ متعہ عرب میں مروج تھا۔ اس لئے اگر نزول حکم قرآنی سے پہلے نبی کریم صلعم نے اس کی اجازت دی ہو تو وہ دوسری بات ہے۔ علاوہ ازیں اگر روایات میں اجازت پائی جاتی ہے تو ممانعت بھی پائی جاتی ہے۔ اجازت نزول حکم سے پہلے کی ہے۔ اور جب قرآن شریف میں حکم نازل ہو گیا تو روایات میں بھی ممانعت آگئی۔ اب اجازت کو پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسا کوئی شراب کے متعلق کسی روایت کو پیش کر دے کہ فلاں وقت فلاں صحابی نے شراب پی تھی۔ چنانچہ اس کے مطابق صحیح مسلم میں سبرہ بن معبد کی روایت اپنے باپ سے ہے انه غزا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم فتح مکة فقال یا ایها الناس انی کنت اذنت لکم فی الاستمتاع من النساء و ان الله قد حرم ذلك الی یوم القیامة فمن کان عندہ منهن شئ فلیخل سبیله یعنی اس نے فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جنگ کی تو آپ نے فرمایا کہ اے لوگو میں نے تم کو عورتوں سے متعہ کی اجازت دی تھی اور اللہ نے اس کو قیامت کے دن تک حرام کر دیا ہے پس جس شخص کے پاس ایسی کوئی عورت ہو اس کا راستہ آزاد کر دے اور دوسری روایت صحیحین کی حضرت علیؓ سے ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن عورتوں کے متعہ سے روک دیا اور گھر الو گدھوں کے گوشت کے کھانے سے اور تیسرا واقعہ حضرت عمرؓ کے عہد کا نہایت صاف ہے جس کے متعلق ابن ماجہ میں اسناد صحیح سے روایت ہے کہ آپ نے خطبہ پڑھا فقال ان رسول الله صلے الله علیه وسلم اذن لنا فی المتعة ثلاثا ثم حرمها والله لا اعلم احدا تمتع وهو محصن الا رجمته یعنی فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو تین مرتبہ متعہ کی اجازت دی پھر اس کو حرام کر دیا اور مجھے جس شخص کے متعلق علم ہو گا کہ اس نے باوجود نکاح شدہ ہونے کے متعہ کیا ہے میں اسے سنگسار کروں گا۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو صحابہ اس کی مخالفت کرتے۔ مگر کوئی شخص اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کا خود اس پر اتفاق تھا کہ رسول اللہ صلعم متعہ کو حرام کر چکے ہیں۔ اور یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نبی کریم صلعم نے عام طور پر متعہ کی اجازت کبھی نہیں دی بلکہ صرف دو دفعہ جنگ کے موقعہ پر دی تھی اور وہ قریباً حالت اضطراری ہوتی ہے مگر بعد میں اس سے بھی روک دیا پس

۲۵ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَ

جس پر تم مقرر کرنے کے بعد آپس میں رضامند ہو جاؤ۔ بیشک اللہ جاننے والا حکمت والا ہی ۶۳۸ اور

مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ

جو شخص تم میں سے (اتنی) فراخی کی طاقت نہیں رکھتا کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو تمہاری ان مومن لونڈیوں سے (نکاح کر لے)

اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ

جنکے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہی۔

روایات متعہ کو مان کر بھی اس کا عام جواز جیسا اہل تشیع میں مروج ہی ہرگز ثابت نہیں ہوتا +

متعہ کب حرام ہوا

البتہ سوال تاریخ کے متعلق پیدا ہوتا ہی کہ کب متعہ حرام ہوا۔ حضرت علی کی روایت مندرجہ بالا میں یہ ذکر ہی کہ متعہ خیبر کے دن حرام ہوا اور سبرہ کی روایت میں ہی کہ فتح مکہ میں حرام ہوا ہم کو اس بارہ میں کسی فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ آیت خیبر کے دن نازل ہوئی تو اس وقت حرام ہوا ہوگا اور اگر فتح مکہ کے دن تو اس وقت۔ البتہ اگر حرمت خیبر کے دن تسلیم کی جائے تو اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہی کہ غزوہ اوطاس میں جو اس کی اجازت پائی جاتی ہی جس کا وقوع فتح کے سال ہوا وہ بے معنی ٹھہرتی ہو۔ ممکن ہی۔ اس روایت میں کسی راوی کو غلطی لگی ہو۔ اور ممکن ہی جیسا کہ ابن قیم نے لکھا ہی کہ حضرت علی کی صحیحین والی روایت میں غلطی ہو گئی ہی۔ اور لفظ یوم خیبر بجائے اکل لحوم حمر کے متعۃ النساء کے ساتھ لگ گئے ہیں۔ اور اس کی تائید بلا شبہ کئی واقعات سے ہوتی ہو جیسا کہ امام ابن قیم نے لکھا ہی۔ اول امام احمد کی اس روایت سے جو سفیان بن عیینہ نے کی ہی جس کے الفاظ یہ ہیں ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم حرم لحوم الحمر یوم خیبر وحرم متعة النساء یعنی رسول اللہ صلعم نے خیبر کے دن گدھے کے گوشت کو حرام فرمایا اور عورتوں کے متعہ کو حرام کیا۔ تو گویا یوں خیبر کا لفظ گدھوں کی حرمت کے متعلق تھا کسی راوی نے اس کو متعۃ النساء کے متعلق کر دیا۔ اور اس کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہی کہ خیبر کے دن کوئی متعہ کا سوال پیش نہیں ہوا۔ اور حضرت علیؓ نے جو ان دو باتوں کو اکٹھا کیا تو اس لئے نہیں کہ ان کی حرمت ایک دن ہوئی۔ بلکہ اس لئے کہ ابن عباسؓ ان دونوں مسائل میں دوسرا پہلو اختیار کرتے تھے اس لئے حضرت علیؓ نے ان دونوں کا اکٹھا ذکر کیا گو وہ الگ الگ وقت کے واقعات تھے +

متعہ کے بارہ میں ابن عباس کا مذہب

باقی رہا سوال حضرت ابن عباس کے متعہ کو حلال کہنے کا سو اس کی تشریح انہوں نے خود ان الفاظ میں کر دی قلت انما تحل للمضطر کما تحل المیتة والدم ولحم الخنزیر لہ میں نے کہا تھا کہ وہ مضطر کے لئے حلال ہی جس طرح اس کیلئے مردار اور خون اور سؤر کا گوشت حلال ہی۔ پس اضطرار کی حالت میں حلال قرار دینا یہ حلت کا فتویٰ نہیں۔ بلکہ حرمت کا فتوےٰ ہے اور بعد میں حضرت ابن عباس نے اس سے بکلی رجوع کر لیا +

مہر کی بیشی تقرر کے بعد

۶۳۸ یہاں جس رضامندی کا ذکر ہو وہ مہر کی کمی یا بیشی کے متعلق ہو یعنی مہر مقرر ہو جانے کے بعد میاں بی بی کی رضامندی سے کم بھی ہو سکتا ہو اور زیادہ بھی اس آیت کا خاتمہ علیماً حکیماً پر کیا ہے۔ گویا بتایا ہے کہ قید نکاح کی پابندی بڑے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اور یہ اُن لوگوں کا جواب ہی جو مرد اور عورت کے آزادانہ تعلقات کے حامی ہیں اور نکاح کی قید کو بے ضرورت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرف اقوام یورپ کا میلان ہی جن میں اولاد الزنا بچوں کی نہ صرف کثرت ہو گئی ہی بلکہ ان پر فخر کیا جاتا ہے

بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ

تم ایک دوسرے سے ہی ہو۔ سو انہیں ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح میں لاؤ اور ان کو دستور کے موافق انکے

بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ

مہر دیدو پاکدامن ہوں نہ کھلی بدکاری کرنے والی اور نہ در پردہ آشنا رکھنے والی پھر جب وہ نکاح میں لائی جائیں

فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۚ ذٰلِكَ لِمَنْ

تو اگر بےحیائی کا ارتکاب کریں تو ان کے لئے آزاد عورتوں کی سزا سے نصف ہے یہ تم میں سے

خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۚ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ع

اسکے لئے ہے جسے ہلاکت میں پڑنیکا خوف ہو اور اگر تم صبر کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اللہ مغفرت کرنیوالا رحم کرنیوالا ہے ۶۳۹

طَوْل — ۶۳۹ طول۔ طَوْل لمبائی کو کہتے ہیں اعراض میں ہو یا جواہر میں اور طَوْل۔ فضل اور منّ سے یعنی بزرگی یا زیادتی مال اور احسان سے مخصوص ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی آتا ہے ذی الطَّوْل (المؤمن ۴۰-۳) یعنی حقیقی فضل و منّ کا مالک وہی ہے اور اولوا الطول (التوبۃ ۹-۸۶) سے مراد صاحب وسعت لوگ ہیں اور یہاں بھی معنی فراخی یا وسعت ہی ہیں مراد اس قدر مال ہے جسکو مہر اور نفقہ میں دے سکے (غ)

محصنات — المحصنٰت سے مراد یہاں آزاد عورتیں ہیں کیونکہ ان کے مقابلہ میں لونڈیوں کا ذکر ہے

فتاۃ۔فتی — فتیات۔ فتاۃ کی جمع ہے جو فتی کی مونث ہے۔ اور فتی اصل میں اس کو کہتے ہیں جو تازہ جوانی پر پہنچا ہو۔ اور مراد اس سے غلام اور فتاۃ سے مراد لونڈی لی جاتی ہے

اھل — باذن اھلھن۔ اَھْل کے معنی ۱۳۶ میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں مراد اس سے مولیٰ یا مالک ہے۔ مالک کی اجازت کی شرط اس لئے ہے کہ نکاح سے مالک کے بہت سے فوائد خدمت اور کام لینے کے کم ہو جاتے ہیں چنانچہ حدیث سے ثابت ہے کہ جس طرح لونڈیاں اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتیں اسی طرح غلام بھی اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتا ایما عبد تزوج بغیر اذن موالیہ فھو عاھر (ت)

خدن — اخدان۔ خِدْن کی جمع ہے جس کے معنی مصاحب یا صدیق ہیں اور اس کا اکثر استعمال ایسے شخص کے حق میں ہے جو شہوت کی وجہ سے مصاحب ہو (غ) مسافحت کے ساتھ اتخاذ اخدان کے ذکر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ میں چھپی ہوئی آشنائی کی طرف اشارہ ہے چنانچہ ابن عباس نے مسافحات کے معنی الزوانی المعلنات کئے ہیں یعنی جو علی الاعلان زنا کرتی ہیں۔ اور بیضاوی میں اخدان کے معنی کئے ہیں الاخلاء فی السر

لونڈیوں سے نکاح — اس آیت میں لونڈیوں کے ساتھ نکاح کے احکام اور شرائط بیان کئے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں دو جگہ آتا ہے لفروجھم حافظون۔ الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم (المؤمنون ۲۳-۵،۶۔ المعارج ۷۰-۲۹ و ۳۰) پس جب ازواج یعنی بیبیوں کے متعلق احکام بیان کر دیئے تو ضروری تھا کہ ما ملکت ایمانھم کے متعلق بھی احکام کو بیان کر دیا جاتا جس طرح ایک آزاد عورت کو زوجیت میں لینے کی شرائط اللہ تعالیٰ نے بیان کر دی ہیں۔ اسی طرح ما ملکت ایمانکم کے ساتھ تعلقات زناشوئی قائم کرنے

۲۶ **یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ**

اللہ چاہتا ہی کہ تمہارے لئے کھولکر بیان کرے

ع ۵/۲ اماکی حقوق کی نصیحت

کے احکام بھی اس جگہ بیان کر دیئے ہیں تاکہ نکاح کا مضمون مکمل ہو جائے، اور لونڈیوں کا ذکر الگ کرکے اور ان کے ساتھ آزاد
مردوں کے نکاح کو بعض سخت شرائط کے ساتھ مشروط کرکے یہ بتا دیا ہی کہ قرآن کریم ما ملکت ایمانکم کو ازواج سے الگ رکھتا
ہی۔ اور سوائے سخت مجبوری کے ان کے ساتھ نکاح سے روکتا بھی ہی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن شریف لونڈیوں کے متعلق
یہی چاہتا ہی کہ وہ بلا نکاح یا حالت فجور میں رہیں۔ بلکہ اس سے صاف منع کرتا ہی ولا تکرھوا فتیٰتکم علی البغاء (النور ۲۴-۳۳)
اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور مت کرو اور ان کو نکاح سے روکنا انہیں زنا پر مجبور کرنا ہی۔ پھر صاف الفاظ میں حکم دیتا ہی وانکحوا
الایامٰی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم (النور ۲۴-۳۲) یہاں صاف صالح غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کر دینے
کا حکم دیا ہی پس اصل منشاء قرآن کریم کا یہ معلوم ہوتا ہی کہ لونڈیوں اور غلاموں کے آپس میں نکاح ہوں اور سوائے سخت ضرورت
کے آزاد مرد یا عورت کی لونڈی یا غلام سے زوجیت نہ ہو +

لونڈیوں سے نکاح سے روکنے کی وجہ

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہی کہ قرآن شریف غلاموں اور لونڈیوں کو ایک ذلیل حالت میں رکھنا چاہتا ہی۔ اس لئے
باہمی تعلقات نکاح کو روکتا ہی۔ اس کا جواب خود اسی آیت میں دیا ہی۔ بعضکم من بعض تم سب ایک دوسرے سے
ہو۔ غلام اور لونڈیاں آزاد مرد اور آزاد عورتیں سب ایک ہی نسل انسانی کے افراد ہیں اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں
اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل بتاتا ہی کہ غلاموں اور لونڈیوں سے کھانے پینے میں لباس میں
کام کے لینے میں مساوات کا سلوک ہوتا تھا پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ نکاح کے تعلقات پر ایسی سخت شرائط لگا دی ہیں۔
یہاں تک کہ ان تصبروا خیر لکم میں فرما دیا ہی کہ ممکن ہو تو نہ ہی کرو +

پس جب مساوات کو بھی تسلیم کیا ہی۔ بلکہ غلاموں لونڈیوں کے ساتھ مساوات کے سلوک کا حکم دیا ہی تو نکاح سے
ممانعت اس بنا پر نہیں ہو سکتی کہ ان کو ہمیشہ کیلئے ذلیل اور کم حیثیت پر رکھنا چاہا ہی لیکن کوئی غرض ضرور ہی۔ اس غرض کا پتہ
ہم کو خود نبی کریم صلعم کی زندگی سے لگتا ہی۔ اور بعض احادیث سے بھی اس مضمون پر روشنی پڑتی ہی نبی کریم صلعم نے کسی لونڈی
سے اس کو لونڈی کی حیثیت میں رکھکر نکاح نہیں کیا۔ بلکہ آزاد کرکے اور اس کو زوجیت کے پورے حقوق دیکر نکاح کیا ہی چنانچہ
ام المومنین حضرت صفیہ رض ملک یمین میں داخل تھیں نبی کریم صلعم نے ان کو آزاد کیا اور ان کو قریشی بیبیوں کے برابر زوجہ ہونے

ماریہ قبطیہ

کی حیثیت دی یہی حالت حضرت ماریہ قبطیہ کی معلوم ہوتی ہی جن کے بطن سے ابراہیم پیدا ہوئے شاہ مصر نے انہیں بطور
ایک لونڈی کے آپ کی طرف بھیجا تھا مگر آپ نے اس کو بھی اتنا مرتبہ دیا کہ وہ حجاب میں رہتی تھیں جس سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ زوجیت
میں داخل تھیں اور یہی وجہ ہی کہ اس حکم کے ماتحت ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا (الاحزاب ۳۳-۵۳) یعنی تمہارے
لئے جائز نہیں کہ آنحضرت کی ازواج سے آپکے بعد کبھی نکاح کرو حضرت ماریہ قبطیہ کا نکاح آنحضرت کے بعد نہیں ہوا۔ اور
حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض ان کی وفات تک ان کو دیگر ازواج کی طرح برابر نفقہ دیتے رہے ایسا ہی ریحانہ کا حال ہی جن کے متعلق
ایک روایت میں صاف ذکر ہی کہ آپ نے ان کو آزاد کرکے ان سے نکاح کیا تھا اور جب آپ کی دوسروں کو یہ تعلیم تھی کہ لونڈیوں
سے آزاد کرکے ان سے نکاح کرو تو خود ایسا کیوں نہ کرتے۔ چنانچہ بخاری باب اجر من اسلم من اھل الکتابین میں ذیل کی روایت ہے
الرجلُ تکون لہٗ الامۃُ فیعلّمھا فیحسن تعلیمھا ویؤدّبھا فیحسن ادبھا ثم یعتقھا فیتزوّجھا فلہ اجران یعنی جس شخص کے
پاس ایک لونڈی ہو پھر وہ اس کو تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے اور اس کو آداب سکھائے اور اچھے آداب سکھائے اور اسے

وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اور تم کو ان کی راہیں دکھا دے جو تم سے پہلے تھے

آزاد کرے اور نکاح کرے تو اس کے لئے دو چند اجر ہے۔ پس لونڈیوں کے ساتھ نکاح کی ممانعت میں اول حکمت تو یہی تھی کہ تا مسلمان ان کو آزاد کر کے ان کو اپنی زوجیت میں لیں اور لونڈی کی ادنیٰ حالت میں نہ رہنے دیں۔ ہاں لونڈی کی قدر آنحضرت صلعم نے سکھائی کہ اس کی احسن تعلیم اور احسن تادیب کی طرف توجہ دلائی مگر آج مسلمان اپنی بیٹیوں کی بھی اتنی عزت نہیں کرتے اور ان کی مناسب تعلیم و تادیب کا کوئی انتظام نہیں +

لڑکیوں کی تعلیم

دوسری حکمت اس میں یہ تھی کہ جو حالت ملک عرب میں غلاموں اور لونڈیوں کی تھی یا جو اور دنیا میں تھی۔ اس کی وجہ سے ان میں بہت سے ذلیل اخلاق آچکے تھے اور ماں چونکہ اولاد کی تربیت کرتی ہے۔ اور اولاد کے اخلاق ماں کے اخلاق سے ہی بنتے ہیں۔ اس لئے اگر لونڈیوں سے عام اجازت نکاح کی ہوتی تو اخلاق قومی پر اس کا بہت برا اثر پڑتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مشرک عورتوں کے نکاح سے بھی اسلام نے روک دیا اس لئے کہ ان کا اثر اولاد کی تربیت پر برا پڑتا تھا اور اخلاق بگڑتے تھے۔ یہاں چونکہ مومن ہو کر ان کو ایک موقعہ اپنے آپ کو بہتر بنانے کا بھی تھا اس لئے مشروط اجازت دی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ بعض لونڈیاں اس ذلت کی حالت سے نکل بھی سکتی تھیں تو ایسے غلاموں اور لونڈیوں کے لئے اسلام نے مکاتبت کی شرط رکھی ہوئی تھی اور ہر ایک غلام اور لونڈی کو جو اپنی حالت کی اصلاح کرنا چاہے یہ حق تھا کہ وہ مالک سے آزادی حاصل کر پس ان کیلئے آزاد ہو کر اور زوجیت میں مساوات کے حقوق حاصل کر کے نکاح کر لینے کا رستہ کھلا تھا +

تیسری حکمت اس میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو قیدی جنگ میں پکڑے جاتے تھے ان کے متعلق حکم تھا کہ ان کو بعد میں احسان سے یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے ایسی صورت میں بھی ممکن تھا کہ ان کے پہلے خاوند اگر زندہ ہوں تو اسلام لائیں اور اس صورت میں انہیں واپس اپنے خاوندوں کے پاس جانا چاہئے۔ لونڈی کے ساتھ جو نکاح میں جو شرائط رکھی ہیں وہ یہ ہیں۔ اول یہ کہ ایک مرد اس قدر فراخی اور وسعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد عورت سے نکاح کر سکے۔ کیونکہ لونڈی کا مہر اس کا نفقہ آزاد عورت سے بہت کم ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ عنت سے خائف ہو یعنی اگر نکاح نہ کرے تو کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو صحت جسمانی بگڑنے کا یا زنا میں پڑ کر ہلاکت میں پڑنیکا تیسری شرط یہ ہے کہ مالک کے اذن کے ساتھ نکاح ہو۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ لونڈی مومنہ ہو +

لونڈیوں سے نکاح کی شرائط

ایک اور سوال یہ ہے کہ کیا مالک کے لئے محض ملک یمین کی وجہ سے لونڈی سے زن و شوہر کا تعلق رکھنا جائز ہے یا وہ بھی ان شرائط کے ماتحت ہے جن کا ذکر اوپر ہوا جہاں تک موجودہ زمانہ کا سوال ہے نہ وہ دینی جہاد اس وقت ہیں نہ ملک یمین کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تاہم ایک مسئلہ کے رنگ میں یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن وجوہات کی بنا پر غیر مالک کو لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے سے حتی الوسع روکا ہے۔ وہی وجوہات مالک کیلئے موجود ہیں۔ بلکہ مالک کیلئے تو اور بھی آسان راہ ہے کہ اگر کوئی ملک یمین والی عورت اس کو پسند آئے تو وہ آزاد کر کے اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ اور چونکہ ایسی صورت میں آزادی عطا کرنا ہی مہر کے قائم مقام بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ حضرت صفیہ کی حالت میں ہوا اس لئے اس کیلئے کوئی مشکل بھی نہیں لیکن جب تک وہ اس کو لونڈی کی حیثیت میں رکھنا چاہتا ہے وہ ان تمام شرائط کا پابند ہے۔ ہاں بعض شرائط اس کی حالت میں خود زائل ہو جاتی ہیں مثلاً یہ کہ مالک کے اذن سے نکاح کیا جائے سو اس کو کسی اذن بکار نہیں۔ یا مثلاً یہ کہ مہر دیا جائے کیونکہ لونڈی کا مال مالک کا مال متصور ہوتا ہے اس لئے اس کو مہر دینے کی ضرورت نہیں۔ باقی رہا اعلان سو وہ ضروری ہے +

مالک اور مملوکہ لونڈی

۲۷ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫

اور تم پر توجہ فرمائے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہی ن۶۴۰ اور اللہ چاہتا ہی کہ تم پر توجہ فرمائے

۲۸ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝ يُرِيْدُ اللّٰهُ

اور جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں چاہتے ہیں کہ تم بہت زیادہ جھک جاؤ ن۶۴۱ اللہ چاہتا ہے

۲۹ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

کہ تم سے (بوجھ) ہلکا کردے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے ن۶۴۲ اے لوگو جو ایمان لائے ہو

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

اپنے مالوں کو آپس میں ناحق کے ساتھ نہ کھاؤ

شرائع کا نزول

ن۶۴۰ پچھلے رکوعوں میں عورتوں کی وراثت اور حقوق اور نکاح کے متعلق احکام دیئے ہیں۔ اس رکوع میں اصل غرض تو ان حقوق کی محافظت کی طرف ہی توجہ دلانا ہی۔ مگر پہلی تین آیتوں میں نزول شریعت کے متعلق چند باتیں بتائی ہیں یعنی یہ کہ کیا ضرورت پیش آئی کہ اللہ تعالیٰ اس طرح احکام نازل کرے۔ چنانچہ اس آیت میں بتایا کہ اس کی غرض یہ ہی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کھولکر بیان کرے اور ساتھ ہی توجہ دلائی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قدیم قانون ہی کہ وہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں ایسا کرتا آیا ہی سنن الذین من قبلکم میں یہی اشارہ ہی +

نزول شریعت کی غرض

ن۶۴۱ اس آیت میں بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اس طرح پر شریعت کو تم پر نازل کرنا اس لئے ہی کہ وہ تم پر خصوصیت سے توجہ فرمانے کا ارادہ کرچکا ہی تاکہ اس کی خاص توجہ سے صحیح اصول پر چل کر تم دنیا میں عظیم الشان قوم بن جاؤ مگر جو لوگ نری خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح میانہ روی سے ایک طرف جھک جاؤ اور جادۂ اعتدال سے منحرف ہو جاؤ۔ یہ لوگ کون ہیں بعض نے کہا زانی۔ بعض نے کہا یہود و نصاریٰ بعض نے مجوس لیکن قرآن کریم نے لفظ عام رکھے ہیں شہوات کی پیروی کرنے والے جو کوئی بھی ہوں ہاں اگر خصوصیت سے کسی ایک قوم پر یہ لفظ چسپاں ہیں تو عیسائیوں پر کیونکہ وہ نہ صرف عملاً خواہشات کی پیروی کرتے ہیں بلکہ شریعت سے ایسے متنفر ہیں کہ اس کو نعوذ باللہ لعنت تک کہدیا ہی عورتوں کے معاملہ میں بھی بجائے اسلام کی طرح سادگی کے ساتھ ان کے حقوق دینے کے اپنی خواہشات نفسانی کے لئے ان کے باہر بناؤ سنگار کرکے نکلنے پر ہی سارا زور دیتے ہیں۔ اور اسی کو عورت کا بڑا حق قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اصل حقوق جو اسلام نے عورت کو دیئے ہیں ان کی طرف توجہ بھی نہیں اور وہ مسلمانوں کو بھی اپنی طرح شہوات کا پیرو بنانا چاہتے ہیں +

نزول شریعت کی ضرورت

ن۶۴۲ اس آیت میں وجہ بیان فرمائی کہ انسان چونکہ کمزور پیدا ہوا ہی اپنی ہدایت کی مخفی راہوں پر خود اطلاع نہیں پا سکتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ اپنے کلام کے یہ ہدایات اسے عطا فرمائی ہیں۔ گویا ان تین آیتوں میں تین اصولی باتیں بیان فرمائی ہیں یعنی اول نزول شریعت کوئی نئی بات نہیں پہلے لوگوں پر بھی شرائع نازل ہوتی رہیں۔ دوم خدا کی طرف سے مقرر کردہ شریعت نہ ہوگی تو لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کرینگے۔ سوم نزول شریعت اس لئے ضروری ہے کہ انسان ہدایت کی راہوں کو اپنی کوشش سے پانے سے عاجز ہی جتنی دیر میں ایک راہ کے غلط ہونے کا اس کو تجربہ ہوگا۔ اتنی دیر میں خود بوجہ

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۚ

سوائے اسکے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے ۔۔۔ تجارت ہو ۶۴۳

اس غلط راہ پر چلنے کے ہلاک ہو جائیگا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے خود شرائع نازل کرکے انسان کے اس بوجھ کو ہلکا کردیا چنانچہ اس کی وجہ بھی ساتھ ہی بیان فرمادی ہو وخلق الانسان ضعیفا یعنی انسان کمزور پیدا کیا گیا ہو اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ خود بخود اپنے لئے اپنی حقیقی فلاح کے رستے بنا سکے۔ بلکہ وہ ایک طاقتور ہستی کا محتاج ہو جس کو آیت ۲۶ میں علیم حکیم کہکر بتادیا ہو۔ کہ ان رستوں کا بتانا اسی کا کام ہو سکتا ہو جو ہر شے کا عالم اور ہر ایک حکمت پر آگاہ ہو۔ انسان کا علم اور انسان کی حکمت چونکہ بہت کمزور ہیں۔ اس لئے اسے اللہ تعالیٰ کی امداد کی ضرورت ہو۔ خلق الانسان ضعیفا کے یہ معنی نہیں کہ انسان شرائع پر عمل نہیں کرسکتا۔ بلکہ جیسا کہ ماقبل کی عبارت صاف بتاتی ہو۔ یہ مطلب ہو کہ وہ شریعت کو خود اپنے لئے تجویز نہیں کرسکتا یہی وہ بوجھ ہو۔ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اوپر سے ہلکا کردیا ہو اس کو رستہ بتاکر اس پر چلنے کی ہدایت فرمادی ہو۔ باقی رہا شریعت کے بوجھ کے اُٹھانے کی قابلیت یا ان راہوں پر جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں چلنے کی طاقت۔ سو اس کا ذکر دوسری جگہ فرمایا کہ خدانے وہی راہیں انسان کو بتائی ہیں جن پر وہ چل بھی سکتا ہو جیسا کہ فرمایا لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی وسعت سے بڑھ کر مکلف نہیں کرتا۔

شرائع پر چلنے کی قابلیت اور عیسائی عقیدہ۔

عیسائیوں کا یہ کہنا کہ انسان شریعت کے بوجھ کو اُٹھا نہیں سکتا محض جھوٹ اور خدا پر ایک الزام ہو۔ کیونکہ اگر انسان واقعی اس قابل نہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے جن اپنی رضا کی راہوں کو اس پر بذریعہ شرائع کھولا اُن پر وہ چل سکے تو اس نے یہ عبث کام کیوں کیا کہ ہر زمانہ ہر ملک میں ہر قوم کے اندر نبی بھیجے بلکہ بعض قوموں کے اندر جیسے بنی اسرائیل پے درپے نبی بھیجے اور ان انبیاء کے ذریعے اپنی رضا کی راہیں انسانوں پر کھولیں۔ حالانکہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق یہ بالکل ایک لغو امر تھا۔ اور پھر کیوں خدا کو دو ایک نبی بھیجکر یہ پتہ نہ لگ گیا کہ انسانوں پر اپنی رضا کی راہوں کا کھولنا ایک لغو امر ہو وہ ان پر چل ہی نہیں سکتے۔ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں نبی بھیجتا چلا گیا۔ اسلام کا عقیدہ اس کے بالمقابل کیسا صاف اور کیسا واقعات حقہ کے مطابق ہو۔ انسان ضعیف ہو۔ اس حد تک کہ وہ خود بخود خدا کی رضا کی راہوں کو نہیں پا سکتا۔ اس لئے ابتدائے دنیا سے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ ہر قوم پر ہر زمانہ میں ہر ملک کے اندر اپنی رضا کی راہیں بتانے والے بھیجتا رہا۔ پس خود دنیا کے یہ واقعات کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضا کی راہیں بذریعہ شرائع کے ظاہر فرماتا رہا۔ اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ انسان میں یہ قابلیت ہو کہ خدا کی رضا کی راہوں پر چل سکے اور اگر اس میں یہ قابلیت ہی نہیں تو پھر کفارہ نے اس مشکل کو کس طرح حل کیا۔ اگر اس طرح حل کیا ہو کہ انسانوں کے اندر یہ قابلیت پیدا کردی ہو کہ خدا کی رضا کی راہوں پر چل سکیں تو پھر بھی آخر خدا کو یہی کرنا پڑا کہ ان کو اپنی رضا کی راہوں پر چلنے کے قابل بنائے۔ اور یہ پہلے ہی کیوں نہ کردیا۔ کیوں بلاوجہ انسانوں کو اس قدر مصیبت میں ڈالا کہ انپر تکلیف مالایطاق ڈالی۔ حالانکہ قصور اپنا تھا۔ کہ انسان کو اپنی رضا کی راہوں پر چلنے کے قابل ہی نہ بنایا تھا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ انسانوں کی قابلیت تو اب بھی وہی ہو مگر اب کوئی انسان اس کی راہوں پر چلے یا نہ چلے وہ سب کو معاف کردیتا ہو بشرطیکہ وہ کفارہ کو مان لیں تو اباحت اور گناہ کا دروازہ کھل جاتا ہو غرض صحیح اصول وہی ہو جو اسلام نے بیان کیا ہو۔

کفارہ

۶۴۳ لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل اس بات کو بیان کرکے کہ شرائع اور حقوق کا قائم کرنا ضروری تھا اب نصیحت فرماتا ہو کہ جو جو حقوق کسی کے قائم کردیئے گئے ہیں ان کے خلاف اب ایک دوسرے کا مال کھانے کی کوشش نہ کرو۔ اکل سے مراد ہر قسم کا تصرف ہو۔ اور باطل حق کا نقیض ہو۔ اور حق طریق وہی ہو جس کو قرآن کریم نے بیان فرمادیا مثلاً

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ○

اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو بیشک اللہ تم پر رحم کرنے والا ہے ۶۴۴

ورثہ کے ذریعے سے ہبہ کے ذریعے سے اور حقوق جو ایک دوسرے پر قایم کئے گئے ہیں ان کے ذریعے سے تو حق طریق ہیں ان کے سوائے جو طریق ہوگا وہ باطل ہوگا یہی حکم البقرۃ ۱۸۸ میں بھی آچکا ہو۔ یہاں عورتوں اور یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے لئے اسکو دوہرایا ہو منسوخ کے شایقین نے اس آیت کو بھی منسوخ کہدیا ہو اور لکھا ہو کہ سورہ نور کی وہ آیت جسکی رو سے باپوں بھائیوں چچوں دوستوں کے گھروں سے کھانا جائز ہو وہ اس کی ناسخ ہے۔ گویا یہ بالباطل کھانا ہوا!

الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم یہاں الا استثنائے منقطع ہو تراضی دونوں کا ایک دوسرے سے اظہار رضامندی ہو۔ تجارت کا ذکر بوجہ اس کی عظمت کے یہاں خصوصیت سے کیا ہو۔ اور ایک حدیث میں آتا ہو تسعۃ اعشار الرزق فی التجارۃ (د) رزق کے دس حصوں میں سے نو تجارت میں ہیں اور ایک حدیث میں ہو الطیب الکسب کسب التجار۔ اس زمانہ میں تجارت کو مسلمانوں نے ایسا چھوڑ رکھا ہو گویا یہ کام ان کے لئے بنا ہی نہیں۔ اور یہی وجہ ہو کہ غربت اور افلاس ان میں بڑھتا چلا جارہا ہو ✦

تجارت

۶۴۴ ولا تقتلوا انفسکم کے معنی دو طرح پر ہوسکتے ہیں۔ اول یہ کہ اپنے لوگوں کو قتل مت کرو۔ گویا ایک طرف اگر ایک دوسرے کے حقوق مالی کی طرف توجہ دلائی ہو کہ ناحق ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ تو دوسری طرف حقوق حفظ جان کی طرف توجہ دلائی ہو یعنی ایک دوسرے کو قتل مت کرو۔ اور انفسکم کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ سب مسلمان گویا ایک ہی نفس کے حکم میں ہیں۔ دوسرے معنی یوں ہوسکتے ہیں کہ اپنے آپ کو قتل مت کرو۔ اور اس صورت میں یا تو یہ مراد ہوسکتی ہو کہ ایک دوسرے کی حق تلفی کرنا یا یتیموں بیواؤں کے حقوق نہ دینا درحقیقت اپنے آپ کو یا اپنی قوم کو ہی قتل کرنا ہو۔ امام راغب نے یہاں قتل نفس سے مراد اپنے آپ کو ان باتوں سے محروم رکھنا لیا ہو جن سے حیات ابدی ملتی ہو۔ کیونکہ اس کے آگے آتا ہو ومن یفعل ذلك عدوانا۔ اور یا یہ مراد ہوسکتی ہو کہ خودکشی مت کرو۔ کیونکہ بہت سے جاہل جب ان کو غم یا خوف یا سخت بیماری یا کوئی ذلت پہنچتی ہو تو اس کو ناقابل برداشت سمجھکر خودکشی کرلیتے ہیں۔ اسلام نے خودکشی کو سخت جرم ٹھہرایا ہو۔ کیونکہ خودکشی کرنے والا انسان درحقیقت تکلیف کے سامنے ہمت ہار دیتا ہے اور جو تکلیف سے گھبرا کر ہمت ہار دے اس کا ایمان خدا پر نہیں۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہو کہ خودکشی کرنیوالا جہنمی ہو (ث)، بلکہ ایک حدیث میں آتا ہو کہ خیبر کی جنگ میں ایک شخص کے متعلق جو اسلام پر تھا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اہل نار میں سے ہے لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور زیادہ تعجب اس پر ہوا کہ اس دن اس نے خوب جنگ کی اور آخر زخمی ہوا لیکن زخموں کی تکلیف کو برداشت نہ کرکے خودکشی کرلی۔ عمرو بن العاص نے اسی آیت سے استدلال کرکے شدت کی سردی میں حالت جنب میں ایک جنگ میں بغیر غسل کرنے کے تیمم کرکے نماز پڑھادی۔ چنانچہ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ رات سخت سردی تھی اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہو ولا تقتلوا انفسکم۔ اس لئے میں نے غسل نہیں کیا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے ✦

خودکشی

شریعت کے احکام میں سب سے زیادہ وقعت اسبات کو دی ہو کہ ایک دوسرے کے مال باطل طور پر نہ کھائیں۔ درحقیقت دنیا کی اکثر بدیاں باطل طور پر مال کھانے سے ہی پیدا ہوتی ہیں مال کی محبت اور اس کی حرص ہی انسان سے اور قوموں سے اکثر ظلم کراتی ہو اور قتل نفس کو اکل مال بالباطل کے بعد اسلئے رکھا کہ قتل کے واقعات بھی بہت سے مال کی وجہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں یہانتک کہ یورپ کی اس خوفناک جنگ کا موجب بھی یہی ہے لاکھوں جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ۳۰

اور جو شخص حد سے نکل کر اور ظلم سے ایسا کریگا ہم اسے آگ میں داخل کرینگے اور یہ

ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ ۳۱

اللہ پر آسان ہے ۶۴۵ اگر تم ان بڑی بدیوں سے بچتے رہو جن سے تم کو روکا جاتا ہے ۶۴۶

---

۶۴۵ آگ میں جلانا یا داخل کرنا اللہ پر آسان ہو۔ یہ اس لئے کہا کہ لوگ اس کو بڑا بعید سمجھتے ہیں بلکہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کہاں ہوگا فرماتا ہو اس میں استبعاد یا محال کوئی نہیں ✦

اجتناب

۶۴۶ تجتنبوا جنب سے ہو جس کے اصل معنی پہلو ہیں۔ اور اجتناب کے معنی کسی چیز سے ایک پہلو میں ہو جانا ہیں یعنی اس سے بچ جانا ✦

کبیرۃ

کبائر۔ کبیرۃ کی جمع ہو جس کے اصل معنی صرف بڑا ہیں۔ اور کبیرۃ ہر اس گناہ کے معنی میں آتا ہو جس کی عقوبت بڑی ہو (غ)، اور ابن اثیر میں ہو کہ کبیرہ وہ فعل قبیح ہو جس سے شریعت نے روکا ہو اور اس کا امر عظیم ہو۔ قرآن شریف میں دوسری جگہ ہو الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم (النجم ۵۳-۳۲) کبیرہ خاص خاص گناہوں کا نام ہو یا نہیں

کبیرہ گناہ کون کون سے ہیں

اس میں اختلاف ہوا ہو۔ بعض احادیث کی بنا پر چند خاص گناہوں کو کبیرہ کہا جاتا ہو۔ مثلاً صحیحین میں حدیث ہو اجتنبوا السبع الموبقات سات ہلاک کر دینے والوں سے بچو۔ اور وہ سات گناہ یہ گنے ہیں۔ شرک۔ سحر۔ قتل۔ مال یتیم کا کھانا۔ سود کھانا۔ جنگ کے دن پیٹھ پھیر دینا۔ پاکدامن مومن عورتوں پر الزام لگانا۔ اور دوسری حدیث میں بجائے سحر کے ہو الانقلاب الی الاعراب بعد الھجرۃ ہجرت کے بعد بادیہ نشینی کی طرف لوٹ جانا۔ ایک اور میں بجائے اس کے والدین کی نافرمانی کہا ہو اور صحیحین کی ایک حدیث میں صرف تین کو کبیرہ (یا اکبر الکبائر) کہا ہو۔ شرک والدین کی نافرمانی جھوٹی گواہی دینا۔ اور ایک صحیحین کی حدیث میں ہو ای الذنب اعظم کا جواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں مروی ہو۔ اللہ کا شریک ٹھہرانا۔ دریافت کیا گیا۔ اس کے بعد فرمایا قتل اولاد اس خوف سے کہ اس کو کھانا دینا پڑیگا۔ دریافت کیا گیا۔ اس کے بعد فرمایا ہمسایہ کی جورو سے زنا۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اٰخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا یزنون۔ (الفرقان ۲۵-۶۸) اور ایک حدیث میں ہو کہ شراب کے متعلق نبی کریم صلعم سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اکبر الکبائر ہو اور ایک حدیث میں ہو کہ یہ بھی کبائر میں سے ہو کہ ایک شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے۔ اور اس کی کیفیت یوں بیان فرمائی کہ دوسرے کے ماں باپ کو گالی دے تو وہ اس کے ماں باپ کو گالی دے گا اور یہ بخاری کی حدیث ہو۔ اور بخاری میں ہی ہو سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر اور ظاہر ہو کہ فسوق بھی کبائر میں سے ہو اور ترک صلوٰۃ کو بھی کفر کہا ہو چنانچہ سنن میں ہو من ترک الصلوٰۃ فقد کفر۔ اور ایک حدیث میں ہو کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا اکبر الکبائر میں سے ہو ✦

ان تمام احادیث سے ثابت ہوتا ہو کہ نبی کریم صلعم نے کبائر کو معین نہیں فرمایا اور الگ الگ موقعوں پر الگ الگ جواب دینے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہو کہ جیسا سائل کی حالت کا اقتضا تھا اس کے مطابق اس کو جواب دیا ہو۔ پس احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہو کہ کبیرہ معین گناہوں کا نام نہیں چنانچہ یہی حضرت ابن عباس سے ثابت ہو۔ ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے کہا تھا کہ کبیرہ سات ہیں تو آپ نے فرمایا وہ ستر سے زیادہ قریب ہیں اور دوسری روایت میں ہو سات، سو سے زیادہ قریب ہیں۔ اور ایک روایت میں آپ نے کبیرہ کے معنی یوں کئے ہیں۔ کل ما نھی اللہ عنہ فھو کبیرۃ جس چیز سے اللہ نے روکا ہو وہ کبیرہ ہو

۳۲ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ○ وَلَا تَتَمَنَّوْا

تو ہم تمہاری بُرائیاں تم سے دور کر دینگے اور تم کو عزت کی جگہ میں داخل کرینگے ۶۴۷ اور اس کی آرزو نہ کرو

اور دوسری روایت میں ہو کل ما عصی اللہ تعالیٰ فیہ فھو کبیرۃ۔ ہر ایک چیز جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہو وہ کبیرہ ہو۔ اگر عظمت یا اکبر کے لفظ کو مدنظر رکھا جائے تو قرآن کریم میں ایک طرف شرک کو ظلم عظیم کہا ہو۔ دوسرے موقعہ پر قتل اولاد کے متعلق فرمایا ان قتلھم کان خطاً کبیرا۔ تیسرے موقعہ پر جوئے اور شراب کے متعلق فرمایا فیھما اثم کبیر۔ اور عیسائیوں کے عقیدہ اتخاذ ولد کے متعلق فرمایا کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم (الکھف [18] ۔ ۵) ایک جگہ حرمت کے مہینوں میں جنگ کے متعلق فرمایا قل قتال فیہ کبیر (البقرۃ [2] ۔ ۲۱۷) اور اس سے بڑھکر کفر باللہ۔ اور مسجد الحرام کا کفر۔ اور اس کے اہل کا اخراج قرار دیا وکفر بہ والمسجد الحرام و اخراج اھلہ منہ اکبر عند اللہ (البقرۃ ۔ ۲۱۷) اور اگر قتل کو کبیر کہا تو مسلمانوں کو اذیت دینا اس سے بھی بڑھکر فرمایا والفتنۃ اکبر من القتل۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہو کہ کبیر یا اکبر یا الکبائر خاص قسم کے گناہوں کو نہیں کہا اور جس طرح کبائر سے چند خاص گناہ مراد نہیں اس کے مقابلہ پر جو صغائر کہلاتے ہیں ان سے بھی خاص گناہ مراد نہیں یوں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر ایک گناہ یکساں نہیں جیسا جیسا جس جس گناہ کا اثر ہو اسی لحاظ سے اس کو بڑا یا چھوٹا کہا جائیگا۔ مگر چھوٹے گناہوں پر اصرار بھی گناہ کو بڑا بنا دیتا ہو۔ اور یہ حضرت ابن عباس سے بھی منقول ہو لا کبیرۃ مع الاستغفار ولا صغیرۃ مع الاصرار۔ استغفار کے ساتھ کوئی کبیرہ نہیں اور جس پر اصرار ہو وہ صغیرہ نہیں رہتا +

مدخل — ۶۴۷ مُدْخَلًا یا مصدر ہو بمعنی اِدخال اور یا اَدْخَلَ یُدْخِلُ سے ظرف مکان ہو +

کریم — کریم۔ کرم جب اللہ تعالیٰ کے وصف میں ہو تو اس کا احسان و انعام مراد ہوتا ہو۔ اور جب انسان کے وصف میں ہو تو اخلاق اور افعال محمودہ پر استعمال ہوتا ہو جو اس سے ظاہر ہوں اور اس کا استعمال صرف محاسن کبیرہ پر ہوتا ہو اور ہر ایک چیز جو اپنی نوع میں معزز و ممتاز ہو۔ وہ کریم کہلاتی ہو (غ) کم انبتنا فیھا من کل زوج کریم (الشعراء [26] ۔ ۷) وزروع ومقام کریم (الدخان [44] ۔ ۲۶) انہ لقرآن کریم (الواقعۃ [56] ۔ ۷۷) وقل لھما قولا کریما (بنی اسرائیل [17] ۔ ۲۳) +

بدی سے بچنے کا طریق — اس آیت میں ایک پر حکمت فلسفہ بدی سے بچنے کا پایا جاتا ہو۔ بدی کسی ایک چیز کا نام نہیں ہر شے کا نیک و بد استعمال ہو سکتا ہو اور ہر انسان کی زندگی میں الگ الگ موقعے پیدا ہوتے رہتے ہیں جہاں وہ نیکی یا بدی کر سکتا ہو۔ اس لئے اگر کوئی مذہب تمام بدیوں کو گننے لگتا اور اپنے پیروؤں کو یہ کہتا کہ اب تم ان باتوں سے بچو تو وہ ایک نہایت ہی ناکام کوشش ہوتی قرآن کریم نے یہ پر حکمت طریق اختیار کیا ہو کہ چند موٹی موٹی بدیوں سے جن کو ہر انسان جانتا ہو روک کر یہ فرمایا کہ اگر تم ان سے بچو تو ہم تمہاری بدیاں دور کر دینگے۔ ایک شخص کہہ سکتا ہو کہ یہ حکمت کیا ہو یہ تو ایک فرضی بات ہو کہ بڑی بڑی بدیوں سے بچ جاؤ گے تو ساری بدیاں دور کر دینگے۔ مگر ایسا اعتراض وہی کریگا جس نے بدی کے فلسفہ پر غور نہیں کیا۔ ظاہر ہو کہ بدی جس قدر زیادہ بیّن ہو گی یا جس قدر بڑی ہو گی اسی قدر انسان اس کا آسانی سے مقابلہ کر سکے گا جو شخص فطرت انسانی پر غور نہیں کرتا وہ اسے مستبعد خیال کریگا۔ مگر فطرت انسانی ایسی ہی ہو کہ جس چیز کا نقصان بہت بیّن ہوتا ہو اس سے بچنا انسان کے لئے آسان ہوتا ہو۔ کیونکہ فطرت کے اندر جو خالق فطرت نے طاقتیں ودیعت کر رکھی ہیں وہ ایک کھلے نقصان کو دیکھکر مقابلہ کیلئے باہر نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ اور انسان کا بدی پر غالب آنا یہی ہوتا ہو کہ اس کے اندر جو نیکی کی طاقتیں ہیں وہ مقابلہ کیلئے باہر نکل آئیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہو کہ جس چیز کا نقصان بہت بیّن ہو گا وہی بڑی بدی کہلائے گی پس اصل یوں ہو کہ بڑی بدی کا نقصان بہت کھلا ہوتا ہو۔ اور کھلے نقصان کو دیکھ کر انسان کے اندر جو نیکی کی طاقتیں ہیں وہ مقابلہ کیلئے نکل آتی ہیں۔ اور جب نیکی کی طاقتیں مقابلہ

مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ

جس سے اللہ نے تم کو ایک دوسرے پر فضیلت دی ہو مردوں کے لئے اس سے بہرہ ور ہونا ہو جو وہ کمائیں اور

لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ۝

اور عورتوں کیلئے اس سے بہرہ ور ہونا ہو جو وہ کمائیں اور اللہ سے اسکا فضل مانگتے رہو بیشک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہی ۶۴۸

کیلئے نکل آئیں تو گو اگر فطرت بدی کے نیچے دبی ہوئی ہو تو ابتدا میں وہ کمزور ہونے کی وجہ سے دب بھی جائینگی مگر آخر مقابلہ کرتے کرتے ان میں طاقت آ جائیگی جس طرح بچہ جب کھڑا ہونے لگتا ہو یا چلنے لگتا ہو تو پہلے پہلے گرتا ہو مگر اس کی بار بار کی کوشش اسکی طاقت کو مضبوط کر دیتی ہے۔ اسی طرح انسان کی روحانی طاقتیں مقابلہ کے وقت نشو و نما پاتی ہیں پس جب ایک شخص بڑی بدیوں کا مقابلہ کرنے کا اپنے آپکو عادی بنا بیگا تو اس کی نیکی کی اندرونی قوتیں نشو و نما پائینگی۔ اور ان قوی کے نشو و نما کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان چھوٹی بدیوں سے بھی بچ جائیگا جن کے نتائج ایسے بیّن نہیں ہیں۔ کیونکہ اس کے اندر سے آہستہ آہستہ بدی کا میلان ہی دور ہو جائے گا اور اس کی بدی کی طاقتیں بالکل مرجائینگی۔ اور یہی وہ مقام ہو جس پر اسلام پہنچانا چاہتا ہو نکفر عنکم سیاٰتکم سے مراد یہاں بدی کی طاقتوں کا دور کر دینا ہی ہو کیونکہ جب انسان سے بدی سرزد نہ ہوگی تو گویا اسکی بدیاں اس سے دور ہو جائینگی۔

بدی کا کفارہ اسلام اور دیگر مذاہب میں

یہ وہ راہ ہو جس کو بدی کے کفارہ کے طور پر اسلام نے پیش کیا ہو۔ اس کے بالمقابل کسی مذہب کا کفارہ لے لیا جائے تو محض ایک طفلانہ خیال معلوم ہوتا ہو مثلاً عیسائیوں کا کفارہ ہی لے لو۔ کہ ایک شخص کے دیا خدا کے مصلوب ہو جانے پر ایمان لانے سے انسان بدیوں سے پاک ہو جاتا ہو لیکن آج تک کوئی عیسائی یہ نہیں بتا سکتا کہ کس طرح اس بات کو مان لینے سے کہ یسوع مسیح صلیب پر مر گئے تھے۔ ایک انسان کی بدی کی قوت کمزور ہو جاتی ہو۔ یا وہ بدی سے پاک ہو جاتا ہو۔ ایسا ہی ہندوؤں کا عقیدۂ تناسخ ہے۔ اگر کوئی شخص بیل یا کتے یا گدھے یا کیڑے مکوڑوں کی جون میں چلا جاتا ہو۔ تو اس سے وہ گناہوں سے کیونکر پاک ہو جاتا ہو۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ اس کو احساس تک نہیں ہوتا کہ فلاں جون اس کو کس بدی کی سزا میں ملی ہو۔ تاکہ وہ آیندہ ہی اس سے رُکے غرض اسلام کی پر حکمت تعلیم کے سامنے واقعی یہ طفلانہ خیالات ہیں +

تمنّی

۶۴۸ تتمنوا۔ تمنی کا مادہ مَنَی ہو جس کے اصل معنی تقدیر یا اندازہ کرنا ہیں۔ اور تَمَنّی کے معنی ہیں کسی چیز کا صرف دل کے اندر اندازہ کرتے رہنا۔ اور دل کے اندر اس کی تصویر بناتے رہنا۔ اور اکثر تمنی یہی ہو کہ جس چیز کی حقیقت نہ ہو اس کا تصور کرتے رہنا ؛

جب یہ حکم دیا کہ ایک دوسرے کا مال باطل طریق پر نہ کھاؤ تو ایک قدم اور بھی آگے بڑھایا کہ جو فضیلت تم میں سے ایک کو دوسرے پر ملی ہو اس کا باطل تصور بھی نہ کیا کرو۔ ایک دوسرے کے مال کو باطل طریق پر کھانا ایک ظاہر فعل ہو جس کا علاج بر رنگ سزا ظاہری حکومت بھی کرتی ہو۔ اور ایک دوسرے کی فضیلت پر آرزوئے باطل کرنا ایک باطنی فعل ہو جس کا علاج صرف مذہب کر سکتا ہو۔ اور ظاہر کا علاج بہ نسبت باطن کے آسان بھی ہو اسلئے پہلے ظاہری فعل کیطرف توجہ دلائی تو پھر باطنی فعل کیطرف +

تمنی سے روکنے کا مطلب

ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جو چیز دوسرے کے قبضہ میں ہو مال یا جاہ اسکی آرزو مت کرو کہ وہ ہمارے پاس ہو اسکے پاس نہ ہو لیکن یہ چاہنا کہ جیسی چیز دوسرے کے پاس ہو ویسی ہی ہم کو مل جائے یہ رشک ہو حسد نہیں اور اصل بات یہ ہے کہ تمنی صرف دل میں تصور کرنے کا نام ہو اور جس فضیلت کا یہاں ذکر ہو اس سے وہ امور مراد ہیں جو انسان خود بطور کسب نہیں لیتا۔ بلکہ وہ وہبی امور ہیں یا ایسے حالات ہیں جنمیں قدرت نے انسان کو رکھدیا ہو مثلاً کسی کو مرد بنا یا کسی کو عورت کسی کو قوی بنا یا کسیکو ضعیف کسی کو امرا کے گھر میں پیدا کر دیا کسی کو غربا کے گھر میں کسی کو قوائے دماغی اعلیٰ درجہ کے دیدیئے کسی کو کم دیدیئے۔

۳۳ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ

اور سب کے لئے اس میں جو وہ چھوڑے ہم نے ماں باپ اور قریبی وارث بنائے ہیں اور جن سے تمہارے داہنے ہاتھوں نے

اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۟

(عہد) باندھے ہیں تو ان کو ان کا حصہ دو بیشک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے ۶۴۹

اور تمنی کے بالمقابل اکتساب کو لاکر اسے واضح بھی کر دیا۔ ایسی آرزوئیں کرتے رہنا کہ میں امیروں کے گھر کیوں پیدا نہ ہوا۔ یا میں فلاں حالات میں کیوں پیدا نہ ہوا۔ یا میرے گرد و پیش یہ امور کیوں نہ ہوئے یہ سب باطل آرزوئیں ہیں اس لئے اول یہ حکم دیا کہ ایسی آرزوئیں مت کیا کرو پھر اسکے بعد اصول بتایا کہ جن حالات میں انسان پیدا ہوا ہی انہی حالات میں اس کو کام کرتے رہنا چاہئے اور جس قدر طاقت اسے دی گئی ہو اسے خرچ کرتے رہنا چاہئے۔ اسکو عام فہم رنگ میں یوں بیان کر دیا کہ مرد جو کچھ کمائینگے اس سے بہرہ ور ہونگے عورتیں جو کچھ کمائینگی اس سے بہرہ ور ہونگی۔ کیونکہ سب سے بڑی تقسیم مرد و عورت کی ہے مرد الگ حالات میں رکھا گیا ہی اور وہ اپنے کمال کو اور طریق پر حاصل کرتا ہی۔ عورت اور حالات میں رکھی گئی ہو اور وہ اپنے کمالات کو اور طریق پر حاصل کرتی ہی جیسا کہ دوسری جگہ ہی وما خلق الذکر والانثیٰ ان سعیکم لشتّٰی (الّیل ۹۲ ع ۱) مگر باوجود علیحدہ علیحدہ حالات میں رکھے جانے کے دونوں کیلئے اکتساب کی راہ کھلی ہو دین میں بھی اور دنیا میں بھی۔ عورتیں دینی ترقیات اسی طرح حاصل کر سکتی ہیں جس طرح وہ دنیوی ترقیات حاصل کر سکتی ہیں جن کے لئے اسلام نے للنساء نصیب مما اکتسبن کہکر ہمیشہ کے لئے دروازہ کھول دیا ہی چنانچہ حدیث میں آتا ہو کہ جب عورتوں نے نبی کریم صلعم سے یہ عرض کیا کہ مرد تو ہم پر بہت سبقت لے گئے کہ ان کو جہاد کا موقعہ ہے اور وہ بہت ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔ اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں تو آپ نے فرمایا ان للحامل منکم اجر الصائم القائم واذا ضربہا الطلق لم یدر احد مالہا من الاجر فان ارضعت کان لہا بکل مصۃ اجر احیاء نفس (غق) یعنی تم میں سے حاملہ عورت کیلئے اس شخص کا اجر ہی جو دن کو روزے رکھتا اور رات کو ذکر الٰہی میں کھڑا رہتا ہی پھر جب وہ جنتی ہی تو کوئی نہیں جانتا کہ اس کے لئے کس قدر اجر ہے پھر اگر وہ دودھ پلاتی ہی تو ہر ایک مرتبہ جو بچہ اس کا دودھ چوستا ہی اسکو ایک نفس کے احیاء کا اجر ملتا ہی۔

رضا بالقضاء

لا تتمنوا میں یہ سبق بھی دیا ہو کہ انسان کو ان حالات پر راضی رہنا چاہئے جن میں اس کو پیدا کیا گیا ہو۔ اور جن سے نکلنا اس کے اختیار میں نہیں۔ یہی اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہونا ہی اور یہی قیام فی ما اقام اللہ ہے اور رضا بالقضاء کے یہ معنی نہیں کہ انسان ایک ذلت اور دنو کی حالت سے نکلنے کی کوشش نہ کرے +

مولیٰ

۶۴۹ موالی۔ مَوْلیٰ کی جمع ہی جو ولی سے ہو اور ولاء بمعنی قرب بھی استعمال ہوا ہی خواہ وہ قرب کسی لحاظ سے ہو۔ اس لئے وہ شخص جو غلام کو آزاد کرے۔ وہ غلام جو آزاد کیا جائے۔ حلیف یعنی جس سے معاہدہ ہو۔ ابن العم۔ وارث یعنی عصبہ ان سب پر مولیٰ کا لفظ اطلاق پاتا ہی یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں +

عقد

ایمان

عقدت ایمانکم۔ عَقْد کے اصل معنی ہیں کسی چیز کی اطراف کو اکٹھا کر دینا۔ مگر اس کا استعمال بہت وسیع ہی۔ مثلاً عقد بیع۔ عقد عہد وغیرہ۔ اور ایمان سے مراد یا داہنے ہاتھ ہیں کیونکہ عہد میں ہاتھ پر ہاتھ رکھا جاتا ہی اور یا مراد قسمیں ہیں اور عقدت کا مفعول محذوف ہی یعنی عہودھم پس معنی یوں ہوئے جن لوگوں سے تمہارے داہنے ہاتھوں نے عہد باندھے ہیں۔

مال کے حصول کے دوسرے جائز ذریعے

جب یہ فرمایا کہ انسان بذریعہ اکتساب ہی کچھ حاصل کرتا ہی تو دوسرے حصول کے ذریعوں کی طرف بھی توجہ دلائی۔ اول یہ کہ ہر ایک کے لئے ہم نے وارث بنائے ہیں جو اسکے ترکہ کو لیتے ہیں۔ اور وہ وارث ماں باپ یا قریبی ہیں۔ ورثہ کے علاوہ ایک

مال کے حصول کا ذریعہ اکتساب ہی۔

رکوع ۶

انتظامِ خانہ داری

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ ۳۴

مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں اسلئے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اسلئے کہ انہوں نے اپنے مالوں سے کچھ خرچ کیا ہے

حق بذریعہ معاہدات پیدا ہوتا ہے یعنی جس سے تم عہد کرو اس کا بھی حق ہو جاتا ہے اس میں خاوند کا بی بی سے عہد بھی شامل ہے
مگر یہاں خصوصیت سے میاں بی بی کا عہد ہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آگے الرجال قوامون علی النساء میں صاف بھی کر دیا ہے۔

معاہدہ یا مواخاۃ کے ذریعہ سے وراثت نہیں

والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم کو بعض لوگوں نے منسوخ کہا ہے اور اس کے تین طرح پر معنی کئے ہیں۔ اول یہ
کہ اس سے مراد وہ حلیف ہیں جو ایام جاہلیت میں لوگ بنا لیا کرتے تھے یعنی وہ ایک دوسرے سے معاہدہ کر لیا کرتے تھے
کہ میرا خون تیرا خون ہے میری صلح تیری صلح ہے۔ میری جنگ تیری جنگ ہے۔ تو میرا وارث ہوگا میں تیرا وارث ہونگا ایسے حلیف کو
متوفی کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ ملا کرتا تھا۔ اور اس آیت میں گویا اسی کو جائز رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے مراد منہ بولے بیٹے
ہیں جن کو متبنّٰی کہا جاتا ہے تیسرے یہ کہ آنحضرت صلعم نے ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کے درمیان مواخاۃ قایم کر دی
تھی۔ اور یہ مواخاۃ ایک کو دوسرے کا وارث بنا دیتی تھی۔ اور پھر اس آیت میں اس قسم کے ورثہ کو جائز رکھکر اس کو دوسری آیت
واولوا الارحام بعضھم اولٰی ببعض فی کتاب اللہ (الانفال ۔۷۵) سے منسوخ قرار دیا ہے حالانکہ سورۃ انفال پہلے کی
نازل شدہ ہے۔ اور بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "اس آیت ولکل جعلنا موالی میں موالی سے مراد وارث ہیں
والذین عقدت ایمانکم کے متعلق یہ ہے کہ جب مہاجر مدینہ میں آئے۔ مہاجر انصاری کا وارث ہوتا تھا اس کے ذی رحم کو
چھوڑ کر بسبب اس اخوت کے جو نبی کریم صلعم نے ان کے درمیان قایم کر دی تھی پس جب یہ آیت نازل ہوئی ولکل جعلنا
موالی تو یہ بات منسوخ ہو گئی۔ پھر کہا والذین عقدت ایمانکم ان کے لئے نصرت اور مہربانی اور نصیحت ہے اور میراث باقی
نہیں رہی۔ ہاں اس کے حق میں وصیت ہو سکتی ہے"۔ پس جن لوگوں نے اس آیت کو منسوخ کہا ہے ان کو غلطی یہ لگی ہے کہ انہوں نے
سمجھا کہ پہلے مواخاۃ والے کچھ ورثہ پاتے تھے تو وہ قرآن کریم کے اس حکم کے ماتحت پاتے تھے۔ حالانکہ بخاری کی روایت سے
معلوم ہوا کہ وہ کسی پرانے رواج کے ماتحت ورثہ لیتے تھے اور خود اس آیت نے اس کو منسوخ کر دیا۔ ہاں یہ جائز رہا کہ بذریعہ
وصیت اُن کو کچھ دیدیا جائے +

قائم

قوّام

ف۶۵۰ قوامون۔ قوّام کی جمع ہے جو قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے قام الرجلُ علی المرأۃ کے معنی ہیں مانہا یعنی اسکی مؤنت یا روزی
مہیا کی۔ اور قوّامٌ علیہا کے معنی ہیں مائنٌ لہا یعنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔ اور الرجال قوامون علی النساء کے معنی ہیں
متکفلون باموالنساء معنیّون بشؤنہن یعنی عورتوں کے امور کے متکفل ان کے حالات پر توجہ کرنے والے (ل) اور تاج العروس
میں ہے کہ قام الرجل المرأۃ اور قام علیہا کے معنی ہیں مانہا وقام بشانہا متکفلاً بامرھا یعنی اس کی مؤنت یا روزی مہیا کی
اور اس کے امر کا تکفل کرتے ہوئے اس کی حالت کو قایم کیا۔ اور قوام لہا کے معنی مائن لہا دیئے ہیں یعنی اس کے لئے روزی مہیا
کرنے والا اور اس کے امر کا متکفل پس قوّام کے اصل معنی متکفل ہیں۔ اس کے معنی محض محافظ یا محض حاکم درست نہیں اور تکفل
میں روزی کا مہیا کرنا حفاظت کرنا اور تادیب سب امور شامل ہیں کیونکہ جو شخص جس کا متکفل ہوتا ہے۔ اس کی جسمانی اور اخلاقی حفاظت
بھی اس کے ذمہ ہوتی ہے +

مردوں کے عورتوں پر قوام ہونے سے مراد

عورتوں کے حقوق کے ذکر کے ساتھ مردوں کے حقوق کا بھی ذکر ضروری تھا اس لئے بتایا کہ مرد عورتوں کے قوّام یعنی متکفل
ہیں۔ گھر بمنزلہ ایک چھوٹی سی بادشاہت کے ہے حدیث میں ہے کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ تم میں سے ہر ایک بادشاہ ہے
اور تم میں سے ہر ایک سے اپنی رعیت کے متعلق سوال کیا جائیگا اور اس کی تفصیل میں یہ بھی فرمایا کہ مرد بھی ایک بادشاہ ہے اور اسکے

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ

سو نیک عورتیں فرمانبردار، پیٹھ پیچھے حفاظت کرنیوالی ہوتی ہیں اسکی وجہ سے جو اللہ نے انکی، حفاظت کی ہے[۶۵۱]

ہر گھر ایک بادشاہت ہے

گھر کے لوگ بمنزلہ ایک رعیت کے ہیں اور عورت بھی اپنے خاوند کے مال کو صرف کرنے میں بمنزلہ ایک بادشاہ کے ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جہاں باہمی حقوق اور ذمہ داریاں پیدا ہونگی وہاں ایک شخص کو رنگ حکومت بھی دینا پڑے گا۔ اسلام ایک عملی مذہب ہے اور جس مضمون کو قرآن شریف لیتا ہے ایک کامل حکیم کی طرح اس کے سارے پہلوؤں پر بحث کرتا ہے۔ اس قدر باہمی حقوق اور ذمہ داریاں پیدا کرنے کے بعد یہ ضرور تھا کہ گھر کی چھوٹی سی سلطنت میں ایک کو دوسرے پر کچھ رنگ حکومت بھی دیا جاتا اور عملاً ساری دنیا کو دینا پڑا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نظم قایم نہیں رہ سکتا۔ اس رنگِ حکومت کو صراحت سے حکومت نہیں کہا اس لئے کہ خود دوسری جگہ فرما چکا ہے ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (البقرۃ ۲ - ۲۲۸) جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسیطرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ اور گھر کے نظم میں مرد و عورت کا اشتراک ہے تاہم ان کے حقوق اور ذمہ داریاں الگ الگ قسم کی ہیں پس ان تمام امور کو مدنظر رکھکر فرمایا کہ آخری ذمہ داری مردوں کی ہے اور وہ رنگ حکومت جس سے گھر کے امور طے ہوں مرد کو دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ خود ہی بیان فرمائی ہے۔ اول وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے چنانچہ مرد کو عورتوں پر قوائے جسمانی میں فضیلت ہے۔ اس لئے روزی کمانے کا کام اور ملک و قوم کی حفاظت کا کام ان کے سپرد کیا ہے جو ملک کا محافظ ہو وہی گھر کا محافظ بھی ہو سکتا ہے مگر بعضھم علیٰ بعض کہکر یہ بھی اشارہ کر دیا کہ بعض معاملات میں عورتوں کو بھی فضیلت ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک رنگ میں مردوں کی مخدوم ہوگئیں۔ کیونکہ روزی کا مہیا کرنا۔ گھر کی حفاظت کرنا۔ یہ ایک خدمت ہے۔ اور دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ مرد عورتوں پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ اور یہ وجہ اسی حکومت کے رنگ کیلئے بطور دلیل ہے جو کفل کے مفہوم میں پایا جاتا ہے یعنی مرد کو عورت پر اختیار اس لئے دیا گیا ہے کہ اس پر بوجھ بھی زیادہ ڈالا گیا ہے۔ کیونکہ وہ مال کمانے والا اور وہ مال کے خرچ کرنے والی ہے۔ اور مال کے کمانے والے کو بہرحال اس کے خرچ کرنے والے پر اختیارات ہونے

حدیث و لوا امرھم امرأۃ سے مراد

چاہئیں۔ اگر اس کے خلاف ہوگا تو موجب نقصان ہوگا یہی معنی اس حدیث کے معلوم ہوتے ہیں لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ (بخاری)، وہ قوم کامیاب نہیں ہو سکتی جو اپنے امر کا اختیار عورت کو دیدیں یعنی کمانے والے کا اختیار نہ ہو بلکہ خرچ کرنے والوں کا ہو یوں اس حدیث میں جمہوریت کا اعلیٰ سے اعلیٰ اصول بیان کر دیا ہے اور یہ نظم کیسا اعلیٰ درجہ کا ہے کہ مرد کماتے اور عورت خرچ کرے اور مرد اس کا نگران ہو اور یہی اصول جمہوریت ہے کہ عوام جنکے اموال نظم ملکی پر خرچ ہوتے ہیں حکام پر نگراں ہوں +

قنوت

[۶۵۱] قٰنِتٰتٌ۔ قنوت کے معنی چونکہ خضوع کے ساتھ فرمانبرداری کا لازم کر لینا ہیں۔ اس لئے قرآن کریم میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر ہی بولا گیا ہے +

حٰفظٰت للغیب۔ حفاظت کا مفعول مقدر ہے یعنی حقوق خاوند اور للغیب سے مراد ہے فی غیبتہ یعنی اس کی پیٹھ پیچھے

نیک عورتوں کی دو بڑی صفات

اسباب کا ذکر کرنے کے بعد کہ مرد عورتوں کے متکفل ہیں۔ اب دو قسم کی عورتوں کا ذکر کرتا ہے پہلے صالحات یعنی اچھی عورتوں کا ذکر کیا ہے اور اس میں دو امور کے ذکر پر بس کی ہے۔ اول یہ کہ وہ قانتات ہوں یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والی ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ خاوند کے حقوق کی پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والی ہوں۔ خاوند کے حقوق کا بلحاظ ان کی عظمت کے ذکر کیا۔ گویا خدا کی فرمانبرداری کے بعد ان پر خاوند کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری ہے اور للغیب یا پیٹھ پیچھے کی شرط اس لئے لگائی کہ قرآن کریم کمال کی حالت کا بیان کرتا ہے جو عورت پیٹھ پیچھے حقوق خاوند کی نگہداشت کرتی ہے۔ وہ اسکے سامنے تو ضرور ہی کرے گی۔ ان میں سب سے بڑی بات خاوند کا حقِ زوجیت ہے۔ گویا عورت کی عفت کو اس کا سب سے بڑا جوہر قرار دیا ہے۔ مگر

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ

اور جن عورتوں کی سرکشی کا تمہیں ڈر ہو ۶۵۲ تو انکو وعظ کرو اور خوابگاہوں میں انکو الگ کرو اور ان کو مارو

خاوند کے اور بھی حقوق عورت پر ہیں۔ مثلاً اس کی پردہ کی باتوں کو ظاہر نہ کرے اس کے مال کی حفاظت کرے۔ اس میں کسی قسم کا ناجائز تصرف نہ کرے اس میں فضولخرچی نہ کرے۔ ضرورت اور ذرائع آمد سے زیادہ خرچ نہ کرے۔ بیہقی میں ایک حدیث بھی ہے جس میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا اذا غبت عنہا حفظتك فی مالك و نفسہا جب تم اس سے غائب ہو تو تمہارے مال میں اور اپنے نفس میں تمہاری حفاظت کرے +

بما حفظ اللہ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ یا تو ما موصولہ ہے اور عاید محذوف ہے یعنی بمقابلہ ان حقوق کے جنکو اللہ نے ان کے لئے محفوظ کر دیا ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حقوق کو مردوں سے لیکر ان کو محفوظ کر دیا ہے اور ان میں خود یہ طاقت نہ تھی کہ وہ اپنے حقوق لیتیں۔ اس لئے اب اس قدر حقوق لینے کے بعد ان پر یہ حق ہو گیا ہے کہ وہ بھی خاوندوں کے حقوق کی حفاظت کریں۔ اور یہی معنی قابل ترجیح ہیں۔ مگر یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ عورتیں جو خاوندوں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں تو وہ اللہ کی حفاظت سے ہی ایسا کرتی ہیں +

خوف بمعنی علم

۶۵۲ تخافون۔ خوف کے معنی ہیں کسی امر مکروہ کی توقع ایسی علامت سے جو ظنی ہو یا علم کی حد تک پہنچی ہوئی ہو (غ) پس یہ یاد رکھنا چاہئے کہ خوف کسی فرضی خیال کا نام نہیں بلکہ کسی بدنتیجہ کے ظاہر ہونے کی توقع ہے جس کی علامات ظنی یا یقینی طور پر ظاہر ہو چکی ہوں۔ اور یہاں مراد یقینی طور پر ہی علامات کا ظاہر ہونا ہے جس طرح اس سے اگلی آیت میں خفتم سے مراد ہے تم پہچان لو (غ)۔ اور جس طرح دوسری جگہ وان امرأۃ خافت من بعلہا نشوزا او اعراضا (النسآء ۴۔ ۱۲۸) میں خافت سے مراد علمت ہے یعنی جان لے۔ اسی طرح واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیہم علی سواء (الانفال ۸۔ ۵۸) میں بھی خوف کے معنی مراد جان لینا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں خوف کی بنا پر حقوق اور ذمہ داریوں پر اثر پڑتا ہو۔ وہاں محض ظنی علامات پر کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی بلکہ یقینی علامات ہونی چاہئیں +

نشوز

نشوز نشز سے ہے جس کے اصل معنی اٹھنا ہیں جیسے واذا قیل انشزوا فانشزوا (المجادلۃ ۵۸۔ ۱۱) میں۔ اور نشوز بین الزوجین یعنی میاں بی بی میں نشوز ان کا ایک دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا ہے یعنی ان میں موافقت کا نہ رہنا اس لئے لغت میں نشوز بین الزوجین کے معنی ہیں کراھیۃ کل منہما صاحبہ وسوء عشرتہ (ل) یعنی ہر ایک کا اپنے رفیق سے کراہیت رکھنا اور اس سے بدسلوکی کرنا لیکن بلحاظ حالات کے الگ الگ معنی یوں کئے ہیں یعنی عورت کا نشوز مرد پر یہ ہے کہ اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی نافرمانی کی اور اس سے بغض رکھا اور اس کی اطاعت سے نکل گئی اور اس سے سخت دشمنی کی۔ اور خاوند کا نشوز عورت پر بھی یہی ہے اور یہ کہ اس کو مارے اور اس پر جفا کرے (ل)، چنانچہ دوسری جگہ آتا ہے وان امرأۃ خافت من بعلہا نشوزا (۱۲۸) اور عورت کے مرد پر نشوز کے معنی اپنے خاوند سے بغض رکھنا اور اسکی اطاعت سے اپنے آپکو بالکل باہر نکال دینا اور اس کا اس سے ہٹ کر دوسرے کی طرف دیکھنا بھی کئے گئے ہیں (غ)، +

نشوز کرنے والی عورتیں

صالحات کے ذکر کے بعد جو اپنے خاوند کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں اب ان عورتوں کا ذکر کرتا ہے جو حقوق خاوند کی حفاظت نہیں کرتیں۔ اور جنسے خاوند کے خلاف ارتکاب نشوز معلوم ہو یعنی خاوند سے دشمنی بغض اس کی نافرمانی پر تلے رہنا۔ گھر میں نہ بسنا وغیرہ۔ یہ صرف وہ صورت ہے جس میں قصور صرف عورت کا ہو جب مرد اور عورت دونوں کیطرف سے فساد کا خطرہ ہو اس کا ذکر اگلی آیت میں کیا ہے اور جب عورت کا قصور کوئی نہ ہو مرد کا ہی قصور ہو تو اس کے لئے آیت ۱۲۸ میں علاج بتایا ہے +

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝

پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو انکے خلاف کوئی راہ تلاش نکرو بیشک اللہ بلند بہت بڑا ہی ۶۵۳

۶۵۳ واھجروھن فی المضاجع ۔ ھجر کے معنی انسان کا اپنے غیر سے الگ ہو جانا ہیں (غ) خواہ جسم سے الگ ہو یا زبان سے یا دل سے ۔ اور ھجر فی المضاجع یعنی خوابگاہوں میں عورتوں سے مفارقت ان کے قریب نہ جانے سے کنایہ ہی (غ) ✦

عورت کے نشوز کا علاج

عورت کے نشوز کی صورت میں تین علاج بتاتے ہیں ۔ اول اول جب نشوز ظاہر ہو تو صرف نصیحت پر اکتفا کرنا چاہئے اگر نصیحت سے فائدہ نہ ہو تو اس سے بجائے محبت کے کسی قدر سختی کا برتاؤ کرنا چاہئے ۔ اور اس سے محبت کا میل جول اور محبت آمیز کلام ترک کر دیا جائے خوابگاہوں میں الگ کرنے سے یہی مراد ہی ۔ ایک شریف عورت کیلئے خاوند کی طرف سے ایسا سلوک کافی سزا ہے اور وہ فوراً اپنے رویہ میں اصلاح کرے گی لیکن جن عورتوں کو اس سے فائدہ نہ ہو ان کی فطرت ہی ایسی ہو گی کہ سختی کے سوا انکی اصلاح نہیں ہو سکتی اور چونکہ طلاق کا ذرا سی بات پر دینا ٹھیک نہیں اسلئے انکی اصلاح کیلئے انکو مارنے کی اجازت بھی ہی ✦

عورت کو مارنا کب اور کس حد تک جائز ہی

اس مارنے کی اجازت کو عیسائیوں نے اور بالخصوص آجکل کے مدعیان تہذیب عیسائیوں نے محل اعتراض ٹھہرایا ہی ۔ حالانکہ ظاہری ٹیپ ٹاپ کو چھوڑ کر بیشتر عیسائی گھروں میں جو سلوک عورتوں سے ہوتا ہی وہ اس سے بدتر ہی جو مسلمانوں کے گھروں میں ہوتا ہی ۔ اسلام کی تعلیم ایک خاص طبقہ کے لئے نہیں بلکہ تمام طبقات کیلئے ہی ۔ اسلئے اس کی ہدایات میں بھی وسعت پائی جاتی ہی ۔ قرآن کریم نے ان شریف عورتوں کا بھی ذکر کر دیا جن سے اگر نادانی سے کوئی قصور سرزد ہو تو تھوڑی نصیحت ہی ان کے لئے کارگر ہو جاتی ہی ۔ اور وہ اپنے قصور سے رجوع کرتی ہیں پھر ان شریف عورتوں کا بھی ذکر کر دیا جن کیلئے خاوند کا محبت سے نہ بولنا ہی کافی سزا ہی ۔ پھر اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہی کہ ایک طبقہ عورتوں کا ہر ملک اور ہر قوم میں وہ ہی جن کے خیالات بہت سطحی ہیں ۔ اور جن کے لئے نہ نصیحت کارگر ہوتی ہی نہ محبت کے میل جول کے انقطاع سے ان پر کچھ اثر ہوتا ہی ایسی عورتوں کیلئے دو ہی راہیں کھلی تھیں یا یہ کہ ان کو طلاق دیکر ہمیشہ کیلئے الگ کر دیا جائے یا یہ کہ ان سے کچھ اور زیادہ سختی برتی جائے ۔ اسلام چونکہ طلاق کو ابغض الحلال عند اللہ قرار دیتا ہی ۔ اس لئے طلاق سے پہلے اصلاح کی ہر ایک مناسب صورت کی تلقین دیتا ہی ۔ اور عورتوں کے اس طبقہ کیلئے جنکا اخلاقی احساس گرا ہوا ہو بطور اصلاح مارنے کی اجازت بھی دی ہی ۔

اس دلیل کی صداقت خود نبی کریم صلعم کے الفاظ سے ظاہر ہی ۔ چنانچہ ابو داؤد نسائی ابن ماجہ نے اس حدیث کو بیان کیا ہی ۔ کہ ایک موقعہ پر جب خاوندوں کی سختی کی شکایت نبی کریم صلعم کے پاس پہنچی تو آپ نے فرمایا لقد اطاف بآل محمد نساء کثیر یشتکین من ازواجھن لیس اولئک بخیارکم ۔ یعنی ہمارے گھروں میں بہت سی عورتیں آئی ہیں جو اپنے خاوندوں کی شکایت کرتی ہیں ۔ یہ لوگ تم میں سے اچھے لوگ نہیں ۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ اجازت بی بی کو مارنے کی اعلیٰ طبقہ کے لئے نہیں بلکہ ادنیٰ طبقہ کیلئے ہی پس جبتک ایک ایسا طبقہ دنیا میں موجود ہی جن کے لئے مار کی سختی کی ضرورت بھی ہی اور بہتیرے عیسائی خاوند اپنی عورتوں کو بڑی بڑی بیدردی سے بھی مارتے ہیں تو اسلام کا یہ حکم قابل اعتراض نہیں ۔ ہاں مزید احتیاط کیلئے نبی کریم صلعم نے یہ بھی حکم دیدیا ہی کہ سخت ضرورت کے وقت اگر عورت کو مارا جائے تو وہ سخت مار نہ ہونی چاہئے بلکہ ایسی مار ہو جس کا اثر نہ ہو ۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہی کہ آپ نے حجۃ الوداع میں فرمایا واتقوا اللہ فی النساء فانھن عندکم عوان ولکم علیھن ان لا یوطئن فرشکم احدا تکرھونہ فان فعلن فاضربوھن ضربا غیر مبرح یعنی عورتوں کے بارہ میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں ۔ اور تمہارا ان پر یہ حق ہی کہ تمہارے گھر میں کسی دوسرے کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو ۔ اگر وہ ایسا کریں تو انکو مارو مگر صرف ایسا جسکا اثر نہ ہو ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مار کی اجازت سخت جرم پر ہی ۔ نبی کریم صلعم کا اپنا پاک نمونہ

نبی کریم صلعم کا نمونہ

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ ۳۵

۳۵۔ اگر تمکو دونوں (میاں بی بی) میں باہم ناچاقی کا ڈر ہو تو ایک فیصلہ کرنیوالا اس (مرد) کے لوگوں میں سے اور ایک فیصلہ کرنیوالا اس عورت کے لوگوں میں سے مقرر کرو

اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ ۳۶

اگر وہ دونوں اصلاح چاہینگے اللہ ان میں موافقت کردیگا بیشک اللہ جاننے والا خبردار ہے ۶۵۴ اور اللہ کی عبادت کرو

یہی ہے کہ آپ نے اپنی ساری عمر میں کبھی کسی بی بی کو مارا نہیں۔ حالانکہ آپ کے پاس نو بیبیاں تھیں اور سوتوں میں اکثر جھگڑے ہو جاتے ہیں جن سے مرد غضب میں آکر ان پر زیادتی کر بیٹھتے ہیں۔ مگر آپ نے ایسے معاملات میں بھی ہمیشہ ایسی فراخدلی سے کام لیا کہ جو لوگ آنحضرت صلعم کو اپنا نمونہ بنانا چاہتے ہیں وہ کبھی بھی اپنی بیبیوں پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے بلکہ خیرکم خیرکم لاھلہ کو مدنظر رکھکر کہ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بی بی کیساتھ بہترین سلوک کرنیوالا ہو۔ اپنے حسن اخلاق کو گھر سے شروع کرنے کی کوشش کرینگے ◆

آخر پر فرمایا کہ اگر بی بی اطاعت کرے تو پھر اس پر الزام لگانے کی راہ تلاش نہ کرو۔ اسکی اطاعت سے مراد یہاں اس کا اپنے نشوز کو ترک کر دینا ہی ہے۔ ان الفاظ سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اوپر کی ترتیب تدریجی ہے۔ اگر پہلے مرحلہ پر وعظ و نصیحت سے عورت مان جائے تو دوسرے مرحلہ کی نوبت نہیں آنی چاہئے۔ ہاں پہلے مرحلہ پر نہ سمجھے تو پھر دوسرے طریق سے اسکو سمجھایا جائے حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا اول زبان سے نصیحت کرے اگر رک جائے تو اس پر کوئی الزام نہیں لیکن اگر انکار کرے تو اس سے مفارقت کرے پھر بھی انکار کرے تو مارے پھر بھی انکار کرے تو دو حکم مبعوث کئے جائیں ◆

حکم۔حاکم

۶۵۴ حکما حَکَم اور حَاکِم قریبًا ایک ہی معنی میں آتے ہیں اور الحکم اور الحاکم اور الحکیم اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے شمار کئے گئے ہیں۔ اور حَکَم کے اصل معنی ہیں روک دیا۔ اور حاکم کو حَاکِم اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ظلم سے لوگوں کو روکتا ہے اور حَکَم حاکم سے زیادہ بلیغ ہے (غ) ◆

وفق

یوفق۔ وفق سے ہے اور وِفق کے معنی دو چیزوں میں مطابقت ہیں۔ جیسے جزاء وفاقا (النبأ ۲۶) ◆

میاں بی بی میں باہم فساد کی صورت میں دو حَکَم مقرر کرنے کا حکم

یہ وہ صورت ہے جب دونوں یعنی میاں بی بی میں فساد اور عداوت کی صورت ہو۔ شقاق بینھما سے اسکو اس لئے تعبیر کیا کہ خاص طور پر ایک کی طرف فساد منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ پس یہ دیکھنے کو کہ ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے اور کس طرح پر موافقت میاں بی بی میں ہو سکتی ہے۔ دو حَکَم یا سرپنچ مقرر کرنیکا حکم ہے۔ ایک خاوند کے اہل میں سے ایک بی بی کے اہل میں سے کیونکہ ایسے حکم بہ نسبت اجنبیوں کے اصل حالات سے اور دونوں کے مزاج سے زیادہ واقف ہونگے۔ فابعثوا میں حکم حکام کو ہے یعنی جو صاحب اقتدار حاکم ہوں اگر ایسے حاکم میسر نہ آئیں تو مسلمانوں کی جماعت ہی کا یہ کام ہے بجائے اس کے کہ ایسے معاملات میں حاکم خود تحقیقات کرے اسے دو حَکَم مقرر کر دینے کا حکم ہے اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ باہمی فساد یا رنجش کے معاملات میں بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں جو عوام میں ظاہر کرنے کے قابل نہیں ہوتے اور عدالتوں کی کارروائی کھلی ہوتی ہے۔ اور سب لوگوں کے علم میں آتی ہے جن لوگوں نے عیسائی ممالک میں مقدمات طلاق کی کارروائیوں کو عدالتوں میں دیکھا ہے اور پڑھا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ اس قسم کے مقدمات سے کس قدر فحش لٹریچر دنیا میں شائع ہوتا ہے اور اسکا کیسا مخرب اخلاق اثر دوسرے لوگوں پر ہوتا ہے۔ وہ اس حکم کی حکمت کو خوب سمجھ سکتے ہیں کہ بجائے عدالت میں فیصلہ کے حَکَم مقرر کرنے کی ہدایت کیوں کی ہے۔ پھر دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ حَکَم جو اہل میں سے مقرر کئے جاتے ہیں۔ وہ حالات سے طبائع سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور غرض انکی زیادہ تر اصلاح ہوتی ہے

وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ

اور اسکے ساتھ کسی چیز کو شریک نکرو اور ماں باپکے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی اور یتیموں اور مسکینوں

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ

اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور پاس بیٹھنے والے ساتھی اور مسافر اور ان کے ساتھ بھی جنکے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں

حضرت علیؓ نے ایسے جھگڑے میں حکم مقرر کرکے ان کے فیصلہ کو قطعی قرار دیا ۔ مسلمانوں کا عمل ان ہدایات پر بالکل نہیں رہا۔ اور اسلئے عورتیں سخت دکھ اٹھا رہی ہیں کس قدر قابل تعریف ضابطہ تھا۔ کہ اگر اختلاف بڑھتا ہوا نظر آئے تو دو بیچ موافقت کرانے کی کوشش کریں۔ ہاں موافقت بالکل ناممکن ہو تو طلاق دلا دیں۔ اب ہر ایک گھر میں اپنی حکومت ہے اور مرد جس طرح چاہتے ہیں عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں جس کا نتیجہ ساری قوم بھگت رہی ہے اور قرآن کریم کی تعلیم پس پشت پھینکی جارہی ہے +

جار ذی القربیٰ

۶۵۵ الجار ذی القربیٰ ۔ جار وہ ہے جسکی جائے سکونت تمہارے قریب ہو (غ)، اور الجار ذی القربیٰ سے مراد یا قریب کا ہمسایہ ہے یا قریبی تعلق والا ہمسایہ بلحاظ نسب ہو یا اخوت دینی +

جار الجنب

الجار الجنب ۔ جنب کے اصل معنی پہلو ہیں ۔ جنب ۔ اجنب ایک پہلو پر یا دور ہو گیا ۔ الجار الجنب دور کا پڑوسی ہے کیونکہ چالیس گھر تک پڑوس کا حق ہے اور یا مراد ایسا پڑوسی ہے جس سے نسب کا یا اخوت قومی کا تعلق نہیں ۔ مثلاً ہندو یا عیسائی

الصاحب بالجنب

الصاحب بالجنب کے لفظی معنی پاس کا ساتھی یا ہمنشین ہیں ۔ رفیق سفر ۔ رفیق تعلیم ۔ رفیق پیشہ ۔ رفیق مسجد سب اس کے اندر آجاتے ہیں +

کل مخلوق سے حسن سلوک

قرآن کریم ہمیشہ خاص سے عام اور عام سے خاص کی طرف رجوع فرماتا ہے بیبیوں سے حسن سلوک کے نصائح کو تمام کرکے اور ان کے حقوق کی طرف توجہ دلا کر اب کل مخلوقات سے حسن سلوک کی طرف اور ان کے حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مخلوقات سے حسن سلوک کی اصل بنا یہ ہے کہ ان سب کا خالق ایک ہے اس لئے اللہ کی عبادت سے شروع کیا ۔ پھر ماں باپ سے احسان کا ذکر کیا پھر قریبیوں سے پھر یتیموں اور مسکینوں سے ۔ پھر پڑوسیوں سے ۔ احسان یا نیکی کرنے کی تعلیم ہر مذہب میں پائی جاتی ہے مگر اسلام نے پڑوسی کے حق کو بہت وسیع کیا ہے ۔ اور دو قسم کے ہمسایوں کا ذکر کیا ہے ۔ اول قریبی یا قرابت والے ہمسائے دوسرے دور کے یا اجنبی ہمسائے ۔ اور یوں یہود نصاریٰ مشرکین تک کو اس احسان میں شامل کر لیا ہے احادیث اس بارہ میں بکثرت مروی ہیں کہ نبی کریم صلعم پڑوسیوں سے کس قدر حسن سلوک کی تاکید فرماتے تھے ۔ چنانچہ صحیحین میں ایک حدیث ہے

پڑوسی کے حقوق

کہ آپ نے فرمایا کہ جبرائیل مجھے ہمسایہ کے متعلق کہتے رہے یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ اس کو ورثہ دلایا جائیگا ۔ پھر صاحب بالجنب کے ساتھ احسان کی تاکید فرمائی یعنی جو شخص ایک انسان کے پاس بیٹھتا ہو ۔ مثلاً ایک استاد کے دو شاگرد یا ایک پیشہ کے دو شریک یا ایک دفتر کے دو ملازم یا ایک تجارت کے دو کرنے والے ۔ یا ایسے شخص جو کبھی سفر یا حضر میں ایک دوسرے کے ہمنشین ہوئے ہوں مسجد میں دو نماز پڑھنے والے بھی ایک دوسرے کے صاحب بالجنب ہو جاتے ہیں ۔ پھر اس سے اتر کر مسافر ہیں اسلئے کہ گو ان کا تعلق تو انسان سے کسی قسم کا نہیں مگر وہ مدد کے محتاج ہیں ۔ اور سب سے آخر وہ جن پر انسان کا تصرف ہے خواہ انسان ہوں جیسے نوکر یا غلام جو قید ہو کر انسان کے تصرف میں آجاتے ہیں ۔ یا حیوان جو انسان کی ملک میں ہیں کیونکہ حیوان بھی انسان کی نیکی کے محتاج ہیں ۔ بیبیوں سے حسن سلوک کے ذکر کے بعد اس ذکر کو لانے کا منشاء یہ ہے کہ ایک نیکی سے دوسری نیکی کیطرف قدم اٹھے جیسا کہ خیرکم خیرکم لاھلہ میں فرمایا ہے گویا بی بی سے حسن سلوک سے دوسروں سے حسن سلوک کی طرف قدم اٹھتا ہے +

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَاۙ ۳۶ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ

بیشک اللہ اسے پسند نہیں کرتا جو تکبر کرنیوالا فخر کرنے والا ہو ۶۵۶ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کرنے کا

النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَیَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖؕ

حکم دیتے ہیں اور اسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے

غلاموں سے حسن سلوک

غلاموں سے حسن سلوک میں اسلام نے ایسا کمال دکھایا ہو جس کی نظیر کسی مصلح میں ہم کو نہیں ملتی۔ چنانچہ ہمارے نبی کریم صلعم کی آخری نصیحت مسلمانوں کو یہی تھی۔ اور حدیثوں سے ثابت ہوتا ہو کہ آخری وقت میں آپ یہ لفظ دوہراتے جاتے تھے الصلوٰۃ و ما ملکت ایمانکم۔ نماز اور تمہارے مملوک یعنی ان ہر دو کی بہت خبر رکھو۔ اور بعض احادیث میں آتا ہو کہ جو کھانا پکے یا انسان خود کھائے اس میں سے کچھ اپنے غلام یا خادم کو بھی کھلائے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم کی حدیث ہو فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا تکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم فاعینوھم یعنی جس کے تصرف میں اس کا بھائی ہو تو چاہیے کہ جو خود کھاتا ہو اسے کھلائے اور جو خود پہنتا ہو اسے پہنائے اور ان پر اس قدر کام کی مشقت نہ ڈالو جس کے نیچے وہ دب جائیں۔ اور اگر تم ان کو مشقت کا کام دو تو ان کی مدد کرو۔ ایسا ہی حیوانات کے ساتھ نیکی کا حکم بھی احادیث میں پایا جاتا ہے۔

خیال۔ خیلاء

ع ۶۵۶ مختال۔ اس کا مادہ خیل ہو۔ اور خیال ایک مشہور لفظ ہو اسی سے خُیَلَاءَ ہو جس کے معنی تکبر ہیں کیونکہ انسان اپنے نفس کیلئے ایک فضیلت کا خیال باندھ لیتا ہو (غ) اور اسی سے حدیث میں آتا ہو من جرَّ ثوبہٗ خُیَلَاءَ لم ینظر اللہ الیہ

مختال

جو اپنا کپڑا تکبر سے نیچا چھوڑتا ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔ اور اختال کے معنی ہیں وہ متکبر ہوا۔ اور مختال وہ ادلار بخیل ہو جو بڑا بنتا ہو۔ وہ جاہل جو اپنے قریبیوں سے جب وہ محتاج ہوں یا اپنے ہمسایوں سے جب وہ محتاج ہوں عار کرتا ہو (ل)

فخور

فخور۔ فخر سے ہو جس کے معنی ہیں ان چیزوں میں جو انسان سے باہر ہیں اپنی بڑائی ظاہر کرنا (غ) جیسے مال اور مرتبہ پس

مختال اور فخور میں فرق

مختال اور فخور میں ایک فرق تو یہ ہو کہ مختال اپنے نفس کو فضیلت دینے سے کہلاتا ہو اور فخور مال و مرتبہ وغیرہ کی بڑائی کی وجہ سے۔ اور دوسرے یہ کہ مختال اپنے طرز عمل سے بنتا ہو یعنی اس کا سلوک دوسروں سے متکبرانہ ہوتا ہو اور فخور زبان سے اپنی بڑائی ظاہر کرتا ہو۔ اور یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کے پاس مال کا ہونا یا اس کا بلند مرتبہ پر ہونا یا اس کا اپنے جسم اور

تکبر کیا ہے

لباس کو اچھی حالت میں رکھنا یہ امور تکبر میں داخل نہیں۔ بلکہ تکبر صرف وہی ہو جہاں دوسرے انسانوں کی حق تلفی ہو چنانچہ ثابت بن قیس سے مروی ہو کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے تو آپ نے یہ آیت ان اللہ لا یحب من کان مختالا فخورا پڑھی اور تکبر اور اس کی بُرائی کا ذکر کیا۔ تو ثابت رو پڑے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ کیوں روتے ہو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں تو ایک ایسا آدمی ہوں کہ خوبصورتی سے محبت رکھتا ہوں یہاں تک کہ میرا دل چاہتا ہو کہ میری جوتی کا تسمہ بھی خوبصورت ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تم تو اہل جنت میں سے ہو انہ لیس بالکبر ان تحسن راحلتک ورحلک ولکن الکبر من سفہ الحق وغمص الناس (د) یہ تکبر نہیں کہ تم اپنی سواری اور پالان کو اچھا بناؤ بلکہ متکبر وہ ہو جو حق کو ہلکا جانتا ہو اور لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہو۔ آجکل کی تہذیب اکثر لوگوں کو مختال اور فخور ہی بناتی ہو وہ خود بڑے بنکر لوگوں کو حقیر و ذلیل جانتے ہیں اور ان کو پورا انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں دیتے۔ احسان یا نیکی کا کرنا تو ایک طرف رہا جب پہلے حصہ آیت میں مخلوق خدا سے احسان کی تعلیم دی تو اسی مناسبت سے اس کا خاتمہ ان لوگوں کے ذکر پر کیا جو بجائے دوسروں سے احسان کرنیکے ان پر اپنی بڑائی جتلاتے اور انکے حقوق کو پاؤں تلے روندتے ہیں ✦

۳۸ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ

اور ہم نے کافروں کیلئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ۶۵۷ اور جو اپنے مالوں کو لوگوں کو دکھانے کیلئے خرچ کرتے

النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ

ہیں اور نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ پیچھے آنیوالے دن پر اور جس کا ساتھی شیطان ہو تو وہ بہت ہی برا

۳۹ قَرِيْنًا ۝ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ

ساتھی ہے ۶۵۸ اور ان پر کیا (وبال) آجاتا اگر اللہ اور پیچھے آنیوالے دن پر ایمان لاتے اور اس میں سے خرچ کرتے جو اللہ نے انکو دیا تھا۔

۴۰ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ

اور اللہ ان کو خوب جانتا ہے ۶۵۹ اللہ تو ایک ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا

---

۶۵۷ اس آیت میں مختال و فخور کا ایک وصف بیان کیا ہے۔ کہ یہ لوگ خود بخل کرتے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی ہدایت کرتے ہیں۔ گویا یہ بدی ان کے نزدیک اس قدر محبوب ہوگئی ہے کہ وہ دوسروں کو بجائے نیکی کا حکم کرنے کے اس بدی کا حکم کرتے ہیں۔ پھر تیسرا مرتبہ ان کے انتہائے بخل کا یہ بیان کیا کہ جو کچھ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے۔ اسے چھپاتے ہیں۔ مثلاً علم کے متعلق بھی بخل کرتے ہیں۔ یا اپنے اخلاق میں بھی دوسروں سے بخل کرتے ہیں۔ اگر خود کچھ علم حاصل کریں تو اب یہ نہیں چاہتے کہ دوسروں کو بھی وہ علم دیں اور آخر میں واعتدنا للکافرین۔ کہکر یہ بتا دیا کہ یہ اوصاف کافروں کے ہیں +

۶۵۸ قرین قرن سے ہے جس کے معنی دو یا زیادہ چیزوں کا اجتماع ہے۔ خواہ وہ اجتماع کسی معنی میں ہو شیطان کا قرین انسان ہونا بدی میں اس کا ساتھی ہونے کے لحاظ سے ہے + قرین

اس میں مختال فخور کا دوسرا وصف بیان کیا کہ اگر ایک طرف بخل کرتا ہے تو دوسری طرف محض دکھاوے کے لئے نمود کے طور پر رسم و رواج کے اتباع میں برادری اور بڑائی کے خیال سے اپنا مال خرچ بھی کرتا ہے۔ اگر آج مسلمانوں کی حالت دیکھی جائے تو کثیر حصہ اسی کا مصداق ثابت ہوگا۔ حکام کو خوش کرنے کے لئے۔ برادری میں ناک رکھنے کے لئے۔ اور دکھاوے کے رنگ میں جائدادیں بھی بیچ لینگے۔ مگر خدا کی راہ میں دینے کا نام آئے تو چند پیسے خرچ کرنا بھی دشوار نظر آتا ہے +

۶۵۹ ماذا علیہم۔ توبیخ کے لئے ہے۔ اور مراد ہے کہ کیا وبال یا ضرر ان کو پہنچتا اگر یہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے + پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ دکھاوے کے لئے خرچ کرنے والوں کا ایمان اللہ اور یوم آخر پر کچھ نہیں ہوتا جو شخص خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے ہچکچاتا ہے۔ درحقیقت اس کا ایمان اللہ اور یوم آخر پر بھی کم ہوتا ہے۔ اور یہاں اٰمنوا باللہ والیوم الآخر سے مراد ایمان کامل ہی ہے۔ وہی ایمان جس کا ذکر اس قسم کی آیات میں آتا ہے یاایہا الذین اٰمنوا اٰمنوا باللہ ورسولہ +

وقف النبی علیہ السلام

وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ فَكَيْفَ ۴۱

اور اگر وہ نیکی ہو (تو) وہ اس کو کئی گنا بڑھاتا ہے اور اپنے پاس سے بڑا اجر دیتا ہے ع۶۶۰ پھر کیا حال ہوگا

اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝

جب ہم ہر ایک اُمت سے گواہ لائیں گے اور تجھ کو ہم ان پر گواہ لائینگے ع۶۶۱

مثقال

ع۶۶۰ مثقال۔ ثقل سے ہے۔ اور مثقال کے معنی ہیں وہ جس کے ساتھ وزن کیا جائے اور وہ ایک خاص وزن بھی ہے جو چوبیس قیراط کے برابر ہے اور مطلق مقدار پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں مقدار ہی مراد ہے +

ذرّۃ

ذرّۃ۔ ذرد سے مشتق ہے۔ ذرّالشیئ کے معنی ہیں کسی چیز کو اُنگلیوں کی پوروں سے لینا پھر اس کو کسی چیز پر چھڑک دینا اور ذرّۃ (جس کی جمع ذرّات ہے) چیونٹی کے نئے پیدا ہوئے ہوئے چھوٹے بچوں کو کہتے ہیں۔ ان میں سے سو کا وزن ایک جو کے دانہ کے برابر ہوتا ہے۔ اور بعض نے کہا کہ ذرّہ کا وزن کچھ نہیں ہوتا۔ اور وہ وہ چیز ہے جو کسی مکان میں سورج کی کرنیں داخل ہوں تو اُڑتی ہوئی نظر آتی ہے (ل) کچھ وزن نہ ہونے سے بھی مراد اتنا کم وزن ہوتا ہے کہ ہوا میں وہ ذرات خود بخود اُڑتے ہیں بعض نے چھوٹی سُرخ چیونٹی کو ذرہ کہا ہے۔ اور ابن عباس سے یہ بھی روایت ہے کہ اس چیونٹی کا سر ذرّۃ کہلاتا ہے (ر) +

یہ آیت پچھلی آیت کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے پچھلی آیت میں انفاق اور حقوق العباد کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا تھا کہ جو کچھ کوئی خرچ کرے گا اللہ اس کو جانتا ہے یعنی اس کا اجر دے گا۔ اگر اجر نہ دے تو گویا اس ایک نیک فعل کے اجر کو ضائع کر دیا۔ اور یہ ایک ظلم ہے مگر خدا کی ذات میں ایک ذرہ برابر بھی ظلم روا نہیں رکھا جا سکتا پس اصل غرض یہی سمجھانا ہے کہ اللہ کسی اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اگر وہ فعل حسنۃ یعنی نیکی کا ہے تو ضائع کرنا کہاں۔ اس کو اللہ تعالیٰ کئی گنا بڑھاتا ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ہے کہ ان اصول کو چھوڑ کر مسلمان دُکھ اور تکلیف اُٹھائینگے وہ خدا کی طرف سے ظلم نہیں +

رسول اللہ صلعم کی گواہی امت محمدیہ پر

ع۶۶۱ یہاں بتایا کہ مسلمانوں کے مصائب رسول کی تعلیم سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے رسول کی شہادت کا ذکر کیا۔ اور بتایا کہ جس طرح دوسری اُمتوں کے رسول ان اُمتوں پر گواہ ہوں گے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت محمدیہ پر گواہ ہونگے۔ ھٰؤلاء میں اشارہ بعض مفسرین نے انبیائے سابقین یا من کل امۃ بشھید کی طرف لیا ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ھٰؤلاء سے مراد اُمت محمدیہ ہے اور یہ اسی کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (البقرۃ ۱۴۳) اور صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے کہ حضرت ابن مسعود نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ تو ابن مسعود نے کہا یا رسول اللہ میں آپ کو پڑھ کر سناؤں اور آپ پر تو نازل ہی ہوا ہے۔ فرمایا ہاں مجھے پسند آتا ہے کہ میں دوسرے سے سُنوں۔ تو حضرت ابن مسعود نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی یہانتک کہ آپ اس آیت پر آئے فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علی ھٰؤلاء شھیدا۔ تو آپ نے فرمایا بس کرو اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور ابن ابی حاتم نے ایک دوسرے صحابی سے اس حدیث کو یوں بیان کیا ہے۔ کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابن مسعود اور اور صحابی تھے تو آپ نے

۴۲ یَوْمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰی بِہِمُ الْاَرْضُ

اس دن وہ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی چاہیں گے کہ کاش زمین ان پر برابر کر دی جاتی۔

وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰہَ حَدِیْثًا ۝

اور اللہ سے کوئی بات نہیں چھپا سکینگے ۶۶۲

قرآن کریم سن رہے تھے۔ جب پڑھنے والا اس آیت پر پہنچا۔ تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم رو پڑے اور فرمایا یارب ھذا شہدت علیٰ من انا بین اظھرھم فکیف بمن لم ارہ (ث) اے رب ان پر تو میں گواہی دوں گا (یعنی یہ کہ انہوں نے میری فرمانبرداری کی)، جو میرے سامنے ہیں۔ لیکن ان کی گواہی کس طرح دوں گا۔ جن کو میں نے نہیں دیکھا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہاں ھٰؤلاء سے مراد آپ کے پیرو ہی ہیں۔ اسی کی تائید میں ابن جریر نے ایک حدیث بیان کی ہے جس کے راوی ابن مسعود ہی ہیں کہ اس موقعہ پر پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شہید علیہم ما دمت فیہم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم یعنی میں ان پر گواہ ہوں جب تک میں ان میں ہوں پھر جب تو مجھ کو وفات دے تو تو ہی ان پر نگران ہے۔ اور اس کی تائید بخاری کی اس حدیث سے ہوتی ہے۔ جو آیت قرآنی فلما توفیتنی کے نیچے انہوں نے بیان کی ہو۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رونا اس لئے تھا کہ آپ کو امت کی پچھلی حالت کی خبر دی گئی تھی ✦

۶۶۲ الذین کفروا وعصوا الرسول میں بعض نے وعصوا الرسول کو جملہ معترضہ قرار دیا ہے یعنی وقد عصوا الرسول یعنی انہوں نے رسول کی نافرمانی کی تھی۔ اس سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کا کفر رسول کی نافرمانی ہے۔ اور یا اصل مقصود تو رسول کی نافرمانی کرنے والوں کا ذکر ہے جیسا کہ پچھلی آیت سے ظاہر ہے۔ لیکن ساتھ کفار کا ذکر بھی بڑھا دیا ہے اور یوں بتا دیا ہے کہ رسول کی نافرمانی کرنے والا گروہ کافروں کے ساتھ ملتا ہے جزا و سزا کے وقت یہ خواہش کریں گے کہ مٹی میں ملے رہتے اور ان کی دوبارہ زندگی نہ ہوتی یا یہ کہ وہ پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے ✦

جو لوگ حقوق العباد ادا نہیں کرتے یا حقوق اللہ ادا نہیں کرتے۔ اور یوں رسول کی نافرمانی کرتے ہیں ان کے ذکر کو کفار کے ذکر کے ساتھ مقرون کر کے فرمایا کہ جب جزا و سزا کا وقت آئے گا تو پھر ان لوگوں کو اپنی زندگی پر افسوس ہوگا۔ اور وہ چاہیں گے کہ دوبارہ نہ اٹھائے جاتے اور زمین میں ہی دبے رہتے۔ مگر وہ ایسا وقت ہوگا کہ جو کچھ کیا ہے سب ظاہر ہو جائے گا۔ اور جس طرح دنیا میں چھپ چھپ کر بدیاں کر لیتے ہیں وہ اخفا کا پردہ وہاں نہ رہے گا۔ اور کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔ اور یا لو تسوّٰی بہم الارض کی طرح یہ بھی ان کی خواہش ہے۔ اور اس کا تعلق یود الذین سے ہے۔ یعنی ایک تو یہ خواہش کرینگے۔ کہ وہ دوبارہ زندہ نہ کئے جاتے۔ اور دوسرے یہ کہ انہوں نے اللہ سے کوئی بات دنیا میں چھپائی نہ ہوتی۔ اور اس کے دیئے ہوئے قویٰ کو ٹھیک محل پر لگایا ہوتا کیونکہ ان قویٰ کا اپنے محل پر نہ لگانا یہ بھی کتمان میں ہی داخل ہو ✦

ع ۸ / ۴

پاکیزگی اختیار کرنے کی نصیحت اور یہود کی حالت سے عبرت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۴۳

اے لوگو جو ایمان لائے ہو مسجد کے پاس بھی نہ جاؤ جب تم نشہ کی حالت میں ہو یہانتک کہ جو کہو اسے سمجھتے ہو

وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ

اور نہ جنابت کی حالت میں سوائے اسکے کہ راستہ گزر رہے ہو یہانتک کہ غسل کرلو[۶۶۳] اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو

صلٰوۃ ۶۶۳ الصلٰوۃ کے معنی بیان ہو چکے دیکھو ۱۲۔ اور نماز کی جگہ کو بھی صلٰوۃ کہتے ہیں (غ)۔ لھدمت صوامع وبیع وصلوٰت ومساجد (الحج ۲۲-۴۰) جہاں صلوٰت سے مراد عام عبادتگاہیں ہیں۔ یا کنائس یعنی یہودیوں کی عبادتگاہیں۔ یہاں لفظ صلٰوۃ سے مسجد مراد ہے۔ اور چونکہ اصل نماز مساجد میں ہی ہے اس لئے نماز کا مفہوم خود اس کے اندر شامل ہے +

سُکر سکارٰی۔ سَکْرَان کی جمع ہے۔ جو سُکْر سے ہے یعنی وہ حالت جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہوتی ہے (غ)، یعنی جب اس کے ہوش و حواس پورے درست نہیں ہوتے۔ اور اس کا اکثر استعمال شراب میں ہے۔

سکران یعنی شراب پیکر جب انسان کی عقل جاتی رہے تو اس کو سَکْرَان کہا جاتا ہے۔ لیکن غضب اور عشق وغیرہ سے بھی یہ حالت انسان کو پہنچتی ہے (غ) اور لسان العرب میں ہے کہ سُکْر تین ہیں یعنی جوانی کا سکر اور مال کا سکر اور غلبہ کا سکر اور یہی ہیں آیت زیر بحث کی تفسیر میں لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک یہاں سکر النوم مراد ہے یعنی نیند کا نشہ یا وہ حالت جب نیند کے غلبہ سے انسان کی عقل میں فتور آجاتا ہے اور سَکْرَۃُ الْہَمّ والنَّوم بھی کہا جاتا ہے یعنی غم اور نیند میں سکرۃ کی حالت ہو جانا۔ اور قرآن کریم میں بھی سَکْرَۃُ الموت آیا ہے۔ اور یہ وہ حالت ہے جب موت کی شدت سے غشی آتی ہے +

جُنُب جنب۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو حالت جنابت میں ہو اور اس کا استعمال مذکر مونث واحد جمع میں یکساں ہوتا ہے، اور اس کا اشتقاق جَنْب سے ہے جس کے معنی پہلو ہیں (غ)، اور اس کو حالت جنابت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس حالت میں حکم شریعت میں نماز سے ایک طرف رہنا چاہیے۔ اور نہایہ میں ہے کہ جُنُب وہ ہے جس پر جماع اور خروج منی سے غسل واجب ہو۔

عابری سبیل عابری سبیل۔ عابری عبور کرنے والے۔ عابری سبیل سے مراد حضرت ابن عباس کے نزدیک راستہ گزرتے ہوئے ہے یعنی مسجد میں سے صرف گزر جانا حالت جنابت میں جائز ہے۔ بیٹھنا جائز نہیں۔ اور بعض نے عابری سبیل کے وسیع معنی مسافر لئے ہیں یعنی حالت سفر کو حکم سے مستثنٰی کیا ہے +

پچھلے رکوع میں مسلمانوں کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی طرف توجہ دلائی تھی اس رکوع میں یہودیوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ جب اللہ تعالٰے کے بتائے ہوئے احکام سے انسان انحراف کرتا ہے تو اس کی نوبت کہاں تک پہنچتی ہے۔ اور چونکہ پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑ کر انسان بڑی بڑی بلاؤں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے نماز کے ذکر سے اس مضمون کو شروع کیا۔ کیونکہ نماز تزکیہ نفس انسانی کیلئے سب سے بہتر علاج ہے۔ مگر ایک مسلمان کی نماز کیسی ہو اس کے ساتھ سکر اور جنابت کی حالت جمع نہیں ہو سکتی اس لئے کہ وہ کسی دوسرے ذریعہ سے لذت کو حاصل کر چکا ہے۔ اس لئے وہ کمال لذت جو ذکر الٰہی میں حاصل ہوتی ہے اس کو ادنٰی لذات نفسانی سے ممتاز کر دیا ہے جنابت اور حالت سکر کو اکٹھا کرنے کی یہ بھی وجہ ہے کہ دونوں میں اعلٰی درجہ کا جسمانی سرور انسان کو حاصل ہوتا ہے اور نماز کو دونوں حالتوں میں روک کر بتایا ہے کہ وہ روحانی سرور جو نماز سے حاصل ہوتا ہے اس کا کیسا بلند مقام ہے۔ کہ ان جسمانی سروروں کو اس کے مقابلہ میں کوئی وقعت حاصل نہیں اسی مضمون کی طرف اس حدیث میں بھی اشارہ ہے حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمُ الطِّیْبُ وَالنِّسَاءُ وَجُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِی فِی الصَّلٰوۃِ (بخاری)

نماز کے ساتھ حالت سکر اور جنابت کیوں جمع نہیں ہو سکتی

اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا

یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے یا تم نے عورتوں کو چھؤا ہو پھر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی کا

صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ○

قصد کرو پھر اپنے مُنہ اور ہاتھوں پر مسح کر لو بیشک اللہ معاف کرنیوالا مغفرت کرنے والا ہے ۶۶۳

تمہاری دنیا سے میری طرف خوشبو اور عورت کو محبوب بنایا گیا ہے۔ مگر میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور میری حقیقی راحت نماز میں ہے یعنی گو ان چیزوں میں انسان کیلئے سرور اور لذت ہے مگر قرت عین یا حقیقی راحت صرف نماز میں یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں ہے +

شراب کی قطعی حرمت سے پہلے حالت سکر سے روکا۔

وانتم سکاریٰ کی تفسیر میں عموماً مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یہاں سُکر سے مراد نشہ شراب ہے۔ اور کہ یہ سورۃ مائدہ میں شراب کی حرمت کا قطعی حکم نازل ہونے سے پہلے کی آیت ہے جو حرمت شراب میں ایک ضروری تدریجی مرحلہ تھا۔ اور بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی دعوت میں بعض مسلمانوں نے شراب پی لی اور جب نماز کا وقت آیا تو قرآن کریم کی سورۃ قل یایہا الکافرون لا اعبد ما تعبدون کو غلط پڑھ دیا جس سے معنی میں فرق آگیا۔ اور اس پر یہ تحریم نازل ہوئی لیکن اگر سُکر سے مراد شراب کا ہی نشہ لیا جائے تو بھی اصل غرض یہاں سُکر سے روکنے کی ہے۔ کیونکہ پانچ اوقات نماز کی تقسیم دن رات میں اس طرح ہے کہ جو شخص حالت سُکر میں ہوگا وہ کسی نہ کسی نماز میں شامل ہونے سے رہ جائیگا۔ اور اصل مقصود یہ نہیں کہ جب نشہ ہو جائے تو نماز مت پڑھو۔ بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ نماز تو تم نے پڑھنی ہے مگر حالت نشہ میں نماز بے معنی ہے اسلئے نشہ کی حالت سے بچو۔ اور حدیث صحیح میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا اذا نعس احدکم وھو یصلی فلینصرف ولینم حتی یعلم ما یقول جب تم میں سے کسی کو اونگھ آجائے جب وہ نماز پڑھ رہا ہو تو چاہیئے کہ واپس چلا جائے اور سو رہے یہانتک کہ جو کچھ کہتا ہے اسے جانے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے نیند کی حالت کو اسی حکم میں شامل کیا ہے شاید یہی وجہ ہو کہ بعض مفسرین نے حالت سُکر سے مراد یہاں صرف نیند کا نشہ لیا ہے +

نماز کے لئے حضور قلب کی ضرورت

الفاظ حتیٰ تعلموا ما تقولون سے اس حکم کی علت غائی معلوم ہوتی ہے کہ نماز ایک بے معنی حرکت نہیں۔ نہ صرف کھڑے ہونے رکوع کرنے اور سجدہ کرنے کا نام نماز ہے۔ حالانکہ یہ نماز کے ارکان ہیں۔ نہ صرف چند الفاظ منہ سے کہنے کا نام نماز ہے حالانکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی بلکہ اصل نماز یہ ہے کہ انسان کا دل کسی خاص طرف لگا ہو۔ اور اس کو یہ علم ہو کہ میرے اس فعل کا اور میرے ان الفاظ کا یہ منشاء ہے پس اصل نماز تو قلب کی ہے یعنی قلب پر ایک خاص حالت کا وارد ہونا یہ ظاہر افعال صرف اس حالت قلبی کو ظاہر کرنے والے ہیں کس قدر معمولی الفاظ میں ایک باریک حکمت کی طرف یہاں اشارہ فرمایا ہے۔ دوسرے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کو نماز کے بالخصوص اور قرآن کریم کے عموماً معنی اور مفہوم معلوم ہونے چاہئیں۔ جو لوگ صرف لفظوں کو بغیر ان کی اصلیت اور ان کے معنی جاننے کے رٹتے رہتے ہیں وہ ایک نہ ایک رنگ میں حتی تعلموا ما تقولون کے ماتحت آجاتے ہیں پس مسلمانوں کے ہر بچہ کے لئے تعلیم لازمی ہے کیونکہ جس نے تعلیم حاصل نہیں کی وہ الفاظ کے معنی کس طرح جان سکتا ہے +

غاط - غائط

۶۶۴ الغائط - غوط اس کا مادہ ہے اور غاط کے معنی ہیں کھودا (ل) اس لئے غائط وسیع پست زمین کو کہتے ہیں اور چونکہ لوگ قضائے حاجت کیلئے پست زمین میں جاتے تھے تاکہ نظروں سے پوشیدہ ہو جائیں اسلئے اتی الغائط سے کنایۃً بول و براز وغیرہ مراد ہو گیا اور شریعت نے اس میں توسیع کرکے اخراج ہوا کو بھی شامل کیا ہے +

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ ۴۴

کیا تونے ان لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا وہ گمراہی کو خرید رہے ہیں اور ارادہ کرتے ہیں

اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ؗ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ۴۵

کہ تم راستہ سے بھٹک جاؤ اور اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور اللہ ہی کافی ولی ہے اور اللہ ہی کافی مددگار ہے[۶۶۵]

لمس۔ ملامسة لٰمستم لمس۔ مَسّ کی طرح ظاہر جلد کے چھونے کو کہتے ہیں اور ملامسة جس سے لٰمستم آیا ہے کنایۃً مرد اور عورت کے تعلق پر بولا جاتا ہے +

صعید صعید۔ صعود کے معنی اوپر چڑھنا ہیں اور صعید وجہ الارض یعنی سطح زمین کو کہا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک غبار کو جو اوپر چڑھ جاتا ہے (غ)۔ اس لئے تیمم میں بعض کے نزدیک سطح زمین پر ہاتھ مارنا کافی ہے خواہ اس میں گرد و غبار ہو یا نہ ہو جیسے پتھر اور بعض کے نزدیک غبار کا ہاتھ کو لگنا ضروری ہے +

مسح۔ تیمم امسحوا۔ مَسْح کے معنی کسی چیز پر ہاتھ کا گزارنا اور اس سے نشان کو مٹا دینا ہیں۔ الگ الگ دونوں مفہوموں پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب حالت جنابت کا ذکر آیا اور اس کے ساتھ تطہیر یعنی غسل کا ذکر آیا جو اعلیٰ درجہ کی تطہیر ہے تو ساتھ ہی تیمم کا ذکر بھی کر دیا جو ادنیٰ درجہ کی تطہیر ہے۔ اور گو بظاہر معلوم نہ ہو کہ مٹی سے تطہیر کس طرح ہو سکتی ہے۔ لیکن سچ یہی ہے کہ پانی اور مٹی دونوں پاک کرنے والی چیزیں ہیں۔ اور تیمم کو اس لئے بھی ضروری ٹھہرایا کہ تا نماز کے لئے ایک قسم کی تیاری انسان کے اندر پیدا ہو۔ اور شاید مٹی پر ہاتھ مارنے میں انسان کے عجز کی طرف بھی اشارہ ہو۔ اور یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ گو وضو اور غسل سے طہارت ظاہری بھی حاصل ہوتی ہے اور وہ اچھی چیز ہے مگر نماز کا اصل مقصود طہارت باطنی ہے۔ یہاں بیماری اور سفر اور حدث اصغر اور حدث اکبر کو اکٹھے ساتھ جمع کیا ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ انسان سفر میں نہ ہو اور پھر بھی پانی نہ ملے مثلاً پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا ایسے مقامات میں جہاں پانی بافراط دستیاب نہیں ہوتا یا صرف پینے کیلئے دستیاب ہو سکتا ہے +

تیمم کا طریق مسح کے طریق میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک دو دفعہ مٹی پر ہاتھ مارنا چاہیئے پہلی دفعہ منہ پر پھیرے اور دوسری دفعہ کہنیوں تک ہاتھوں پر۔ اور بعض نے ہاتھوں کو کفوں تک لیا ہے۔ مگر دو دفعہ ہاتھ مٹی پر مارنا ضروری قرار دیا ہے مگر دو دفعہ ہاتھ مارنے کی روایات ضعیف ہیں اور احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی دفعہ ہاتھ مارنے اور صرف کفین تک ہاتھ پھیرنے کا طریق خود ہی بتایا ہے۔ چنانچہ عمارؓ نے یہ واقعہ خود بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ جب وہ کسی سریہ میں تھے تو جنابت کی حالت میں ہو گئے تو آپ تیمم کے لئے مٹی کے اندر لوٹے کیونکہ پانی نہ تھا۔ جب آپ نے یہ ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے اور فرمایا کہ تمہیں صرف اس قدر کافی تھا ضرب النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ الارض ثم نفخ فیہا ومسح بہا وجہہ وکفیہ یعنی نبی کریم صلعم نے زمین پر ہاتھ مارے پھر اس پر پھونک ماری (تاکہ زائد مٹی اڑ جائے) پھر آپ نے اپنے منہ اور دونوں کفوں پر مسح کیا +

[۶۶۵] آیت ۴۴ و ۴۵ میں یہود کا ذکر ہے۔ جیسا کہ تصریح سے آیت ۴۶ میں بیان کر دیا ہے۔ یہود کی حالت پر مسلمانوں کو اس لئے توجہ دلائی ہے کہ جب انسان نیکی اور پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑتا ہے۔ تو اس کی حالت کہاں تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ انکی حالت کا انجام بتایا ہے کہ نیکی کی راہوں کو چھوڑ کر نیکی سے محبت ہونے کی بجائے نیکی سے اسقدر عداوت اور بدی سے اسقدر محبت ہو گئی ہے کہ بدی کو اختیار کرنے کیلئے اب اپنے مال بھی خرچ کرتے ہیں مسلمانوں کو تنبیہ کیا ہے کہ پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑ کر تمہاری بھی

۴۶ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَ

ان لوگوں میں سے جو یہودی ہوئے بعض باتوں کی انکے موقعوں سے تحریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے سُن لیا اور ہم نہیں مانتے اور

اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا

سُن تو نہ سُنوایا جائے اور راعنا اپنی زبانیں مروڑتے ہوئے اور دین میں طعن کرتے ہوئے اور اگر وہ دیں، کہتے کہ ہم نے سُنا

وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

اور ہم فرمانبرداری کرتے ہیں اور سنیئے اور انظرنا تو ان کیلئے بہت اچھا تھا اور درستی کی بات ہوتی لیکن اللہ نے ان پر انکے کفر کیوجہ سے لعنت کی سو بہت کم ایمان لاتے ہیں ۶۶۶

یہی حالت نہ ہو جائے +

موضع — ۶۶۶ عن مواضعہ۔ مواضع مَوضِع کی جمع ہے جو وضع سے ہے۔ کلمات کے مواضع ان کے مقام ہیں یا ان کے مفہوم مقام سے کلمات کا بدلنا تحریف لفظی ہے اور مفہوم سے بدلنا تحریف معنوی ہے۔ اور یہودی دونوں قسم کی تحریف کرتے تھے۔ مائدہ میں ہے۔ من بعد مواضعہ (المائدہ ۵-۴۱) ان کے موضعوں کے بعد ان کی تحریف کرتے ہیں یعنی حالانکہ ان کلمات کے موقع بیان کر دیئے گئے ہیں پھر بھی وہ تحریف کرتے ہیں +

دو قسم کی تحریف

غیر مسمع — واسْمَعْ غیر مُسْمَعٍ کے ایک معنی تعریفی بھی ہو سکتے ہیں یعنی سن تجھے کوئی مکروہ بات نہ سنائی جائے۔ اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اسمع مدعوا علیك بلا سمعت سُن لے تو نہ سنے۔ کیونکہ سن وہ نہیں سکتا جو بہرہ ہو۔ اور غیر مسمع میں سمع کے معنی قبولیت بھی ہو سکتے ہیں یعنی تیری بات قبول نہ کی جائے پس یہ کلام راعنا کی طرح ذو وجہین ہے +

طعن — طعن۔ اصل میں نیزہ مارنے پر آتا ہے مگر زبان کے ساتھ کسی کی عزت وغیرہ پر ہاتھ ڈالنے کو بھی طعن کہتے ہیں اس لئے طعن فیہ کے معنی ہیں اس کو عیب لگایا (ل) +

اقوم — اقوم۔ قام سے تفضیل ہے۔ اور اقوم سے مراد اعدل ہے یعنی فی نفسہ زیادہ انصاف کی یا زیادہ راستی کی بات +

یہود کا نبی سے طرزِ عمل — اس آیت میں یہودیوں کی قساوت قلبی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور نبی کریم صلعم کے ساتھ جو ان کا سلوک تھا اس کا ذکر کیا ہے یہود و نصاریٰ کی اپنی کتب میں تحریف کا مفصل ذکر دوسری جگہ آچکا ہے دیکھو ۱۰۰ مگر یہاں ان کی جس تحریف کا ذکر ہے وہ وہ ہے جو نبی کریم صلعم کے کلام میں وہ کرتے تھے۔ جیسا کہ سیاق کلام سے صاف ظاہر ہے بعض یہودی آپ کے پاس آ بھی جاتے تھے مگر بجائے اس کے کہ جو کچھ کہا جائے اس سے فائدہ اُٹھائیں کبھی الفاظ کو توڑ مروڑ کر کبھی مفہوم کو بگاڑ کر کچھ اور کا اور بیان کرتے یہ تحریف کلمات ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ جب کوئی اچھی بات بھی سُنتے خواہ وہ ان کے معتقدات کے خلاف نہ ہو تو بھی کہدیتے کہ ہم تمہاری بات نہیں مانتے۔ سمعنا وعصینا۔ تیسرا امر یہ تھا کہ ذو معنی کلام کرتے۔ اس کی یہاں دو مثالیں دی ہیں اسمع غیر مسمع اور راعنا ان تینوں قسم کی باتوں کا ذکر کر کے یعنی اول نبی کریم صلعم کے کلام کو بگاڑنا۔ دوسرا بھلی بات کا انکار کر دینا۔ تیسرا ذو وجہین کلام کرنا فرمایا کہ طعنا فی الدین ایسا کرتے ہیں یعنی دین اسلام میں عیب لگاتے ہوئے اور یہ ان کے نبی کریم صلعم کو بُرا کہنے کی طرف اشارہ ہے اور فرمایا کہ اگر اس کی بجائے وہ اچھا طریق اختیار کرتے اچھی باتوں کو قبول کر لیتے۔ سمعنا واطعنا۔ اور اگر بالمقابل کوئی بات اپنی پیش کرنا چاہتے تھے تو بجائے بددعائیہ اور طنز کے کلمات کے کہنے کے صرف اسمع کہدیتے کہ ہماری بات بھی سنئے۔ اور جو بات سمجھ نہ آتی تھی اس کے متعلق صرف کہدیتے کہ ہماری رعایت کیجئے یا ہمیں مہلت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا ۴۷

اے لوگو جنکو کتاب دی گئی ہے اس پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتارا ہے اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے قبل اسکے کہ ہم بڑے بڑے لوگوں کو

فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ○

شادیں اور انپر ذلت وارد کریں یا انپر لعنت کریں جس طرح کہ ہم نے سبت والوں پر لعنت کی اور اللہ کا حکم تو ہو ہی چکا ہوا ہے ۶۶۴

دیکھئے کہ ہم اس پر غور کریں تو یہ ان کی بھلائی کی بات تھی اور درست طریق بھی یہی تھا۔ اور یوں ایک پر حکمت طریق سے ان کو سمجھایا ہے کہ ان کا طریق کس قدر خلاف عقل اور خلاف آداب ہے +

طمس — ۶۶۴ نطمس وجوھا۔ طَمْس کے اصل معنی ہیں محو کر کے نشان کا دور کر دینا (غ) واذا النجوم طمست (المرسلٰت ۸)، ربنا اطمس علیٰ اموالہم (یونس ۸۸) اور لو نشاء لطمسنا علیٰ اعینہم (یٰسٓ ۶۶) میں ان کی آنکھوں کی روشنی کا دور کر دینا اور آنکھوں کا محو کر دینا مراد ہے (غ) +

وجه — وجوہ۔ وَجہ کی جمع ہے جس کے معنی منہ بھی ہیں اور توجہ بھی۔ اور وجہ القوم کے معنی سردار بھی ہیں وفلان وجہ القوم کعینہم و رأسہم (غ) +

طمس وجوه سے مراد — پس نطمس وجوھا سے مراد تغیر حالت ہے ایسا تغیر جو ان کو ذلیل کر دے جیسا کہ اگلے الفاظ فنردھا علیٰ ادبارھا سے ظاہر ہے۔ اور یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ انکے سرداروں کو شادیں یا ذلیل کر دیں اور یہ بھی کہ انہیں گمراہی کیطرف لوٹا دیں (غ) +

ردّ — نردھا علیٰ ادبار — نردھا علیٰ ادبارھا۔ رَدّ کے معنی کسی چیز کے بذاتہ لوٹا دینے کے یا ایک حالت سے دوسری حالت میں کر دینے کے ہیں اور ادبار۔ دُبُر کی جمع ہے جس کے معنی پیٹھ ہیں۔ اور منہوں کو پیٹھوں پر پھیرنے سے مراد ہے کہ ان کی وجاہت اور اقبال کو سلب کریں اور ان پر ذلت اور ادبار نازل کر دیں (ف) اور ایک قول یہ بھی ہے نردھم الی حیث جاؤا منہ وھی اذرعات الشام (ق) یعنی ان کو لوٹا دیں جہاں سے وہ آئے تھے یعنی ملک شام کی طرف گو یا بنی نضیر کی جلاوطنی کی طرف اشارہ ہے۔ ایسے محاورات میں لفظوں کے پیچھے پڑنا اور یہ خیال کرنا کہ سچ مچ منہ پیٹھوں کی طرف ہو جائیں صحیح نہیں آخر اسی قسم کا محاورہ یہ بھی ہے یردوکم علیٰ اعقابکم (آل عمرٰن ۱۴۸) یا انقلبتم علیٰ اعقابکم (آل عمرٰن ۱۴۳)، جیسے وہاں محاورہ کے خاص معنی ہیں ویسے ہی یہاں ہیں +

اصحاب السبت — اصحٰب السبت سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر دوسری جگہ آچکا ہے الذین اعتدوا منکم فی السبت (البقرۃ ۶۵)

فعل مفعول — مفعول۔ فِعل تاثیر کا نام ہے جو متاثر کی طرف سے ہو۔ اور مفعول بمعنی متوقع ہے جو واقع ہو چکا اور یوں بھی کہا جاتا ہے ھذا الامر مفعول جب اس کے حصول میں کوئی شک باقی نہ رہا ہو گو وہ فی الواقع وقوع میں نہ آیا ہو +

یہود کی سزا — اس آیت میں یہود کو بتایا ہے کہ وہ اسی طرح پر عداوت اور عنا د و سنگدلی پر اڑے رہیں گے تو ان کا انجام نہایت ہی برا ہوگا اور دو قسم کی سزا بیان کی گئی ہے۔ اول ان کا ذلیل کر دینا اور اقبال کا ان سے ہٹکر اس کی جگہ ادبار وارد کر دینا۔ دوسرے ان پر وہ لعنت وارد کرنا جو اصحاب سبت پر ہوئی تھی۔ اور لعنت کے معنی چونکہ دور کر دینا ہیں اس لئے ایسی سزا جس میں یہ لوگ دربدر پھریں لعنت کے مفہوم میں آتی ہے پس مراد یہ ہے کہ یا ان کو عرب میں ہی ذلیل کر دیں یا یہاں سے نکال دیں۔ اور وہ دربدر ہوتے پھریں چنانچہ یہ دونوں قسم کی سزا ان پر وارد ہوئی +

بندر بننے سے مراد — اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جو سزا اصحاب سبت پر وارد ہوئی وہ بندر بن جانا نہ تھا بلکہ بندروں کی طرح ذلیل ہو کر دربدر

۴۸ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ

یقیناً اللہ نہیں بخشتا کہ اسکے ساتھ شریک بنایا جائے اور جو اسکے علاوہ ہے وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جو شخص اللہ کے

۴۹ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ○ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ

ساتھ شریک کرتا ہے وہ ایک بھاری گناہ افترا کرتا ہے ۶۶۸ کیا تو نے ان لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جو اپنے آپکو پاکیزہ ظاہر کرتے ہیں

ہونا تھا کیونکہ اس سزا کو یہاں لفظ لعنت سے تعبیر کیا ہے اور دوسرے چونکہ ضروری تھا کہ وہی سزا نبی کریم صلعم کے اعدا پر بھی وارد ہو اور نبی کریم کے اعدا بندر نہیں بنے بلکہ بندروں کی طرح تتر بتر ہوئے۔ اس لئے اعتداء فی السبت کرنے والوں کے بندر بننے سے بھی انکا بندر ہونا مراد ہے ۔

شرک کی اقسام

۶۶۸ یہود کے ذکر میں شرک کا ذکر اس مناسبت سے ہے کہ یہودی بھی شرک میں مبتلا ہو گئے تھے یہانتک کہ قریش سے ساز باز کیلئے بتوں تک کو سجدہ کر دینے سے پرہیز نہ کیا جیسا آگے مفصل ذکر آتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ اصل غرض مسلمانوں کو پاکیزگی کی راہیں بتانا تھا تو ان کو سمجھایا ہے کہ شرک سب بدیوں کی جڑ ہے جس طرح توحید سب نیکیوں کی جڑ ہے اس سے سخت اجتناب کریں شرک کیا چیز ہے؟ صرف بتوں یا چاند سورج ستاروں ہواؤں وغیرہ کا پوجنا ہی شرک نہیں بلکہ یہ شرک کی وہ موٹی قسم ہے جس میں بت پرست اور عناصر پرست قومیں گرفتار ہیں۔ اور نہ صرف یہی شرک ہے کہ کسی انسان کو فی الواقع خدا سمجھا جائے جیسے ہندو کرشن یا رامچندر کو یا عیسائی مسیح کو سمجھتے ہیں۔ بلکہ ایک بڑا شرک جو اس وقت مسلمانوں میں پھیل رہا ہے وہ پیر پرستی یا علماء پرستی کا شرک ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ عدی بن حاتم (جو اس واقعہ کے وقت نصرانی تھے) رسول اللہ صلعم کے پاس گئے تو آپ سورۃ توبہ پڑھ رہے تھے جب آپ اس آیت پر پہنچے اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللّٰه تو عدی نے کہا ہم اُن کی عبادت نہیں کرتے۔ آپنے فرمایا کیا یہ ٹھیک نہیں کہ جو چیز خدا نے حلال کی ہو وہ اُسے حرام ٹھہراتے ہیں تو تم بھی حرام ٹھہراتے ہو۔ اور جو چیز خدا نے حرام کی ہو وہ اسے حلال بتاتے ہیں۔ تو تم بھی حلال سمجھتے ہو۔ اس نے کہا ہاں آپنے فرمایا یہی اُن کی عبادت ہے۔ گویا علماء اور پیروں یا سجادہ نشینوں کے اقوال کو جو کتاب اللہ کے خلاف ہوں۔ بغیر سوچے سمجھے قبول کرتے جانا بھی ایک شرک ہے۔ اور یہ جو بعض مرید اپنے پیروں اور سجادہ نشینوں کے متعلق ایسے اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ اُن کے پیر کہتے یا کرتے ہیں بس وہی حق ہے اور کتاب اللہ کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ اس کی پروا بھی نہیں کرتے۔ جیسا کہ اکثر مسلمانوں کی حالت اس زمانہ میں ہے۔ یہ وہی شرک ہے جس کا ذکر اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللّٰه میں ہے۔ اور اس شرک نے مسلمانوں کو بالکل ذلیل کر دیا ہے پھر اپنے پیروں کی دعاؤں پر اعتقاد بھی شرک کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ ہر ایک گروہ اپنے اپنے پیر کے متعلق یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کی دعا سے یا توجہ سے ہماری مصائب ٹل جاتی ہیں اس شرک میں اور اس بت پرست کے اعتقاد میں جو سمجھتا ہے کہ بت کی عبادت سے میری مصیبت ٹل جاتی ہے۔ بہت کم فرق ہے۔ یہ تو ظاہر قسمیں شرک کی ہیں قرآن کریم نے ایک اور قسم کے شرک کا بھی ذکر فرمایا ہے یعنی اپنی خواہشات کی پیروی کو بھی شرک قرار دیا ہے ارأیت من اتخذ الٰھه ھوٰه (الفرقان ۲۵-۴۳) پھر بعض اس سے بھی باریک قسم کے شرک ہیں ۔

شرک کے بخشے گیا

شرک کو کیوں ایسا خطرناک جرم قرار دیا ہے۔ کیا خدا کی شان اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنے میں کچھ کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ ایسا ناراض ہو جاتا ہے کہ بخشتا ہی نہیں؟ اگر ساری دنیا بھی خدا کے ساتھ شریک بنائے تو اس سے اس کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی اور اگر ساری دنیا موحد ہو جائے تو اس سے خدا کی شان بڑھ نہیں جاتی۔ بات یہ ہے کہ خدا کے ساتھ

بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۵۰

بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائیگا ۶۶۹ دیکھو کس طرح اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں

شریک ٹھہرا کر انسان اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا۔ اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ صفات دیں۔ اس کو بتا دیا کہ اس عالم کی ساری طاقتیں اور ساری چیزیں ہم نے تیرے لئے مسخر کر دی ہیں وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعا منہ (الجاثیۃ ۴۵-۱۳) پس اس کو سب مخلوقات سے اشرف بنایا۔ پھر باایں اگر وہ بتوں کے آگے یا عناصر کے آگے یا سورج چاند کے آگے یا خود اپنے بھائی انسان کے آگے عبودیت کی ذلت اختیار کرتا ہے تو وہ خود اپنے آپ کو اس اعلیٰ مرتبہ سے نیچے گرا دیتا ہے پس خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا درحقیقت انسانیت کو ذلیل کرنا اور اس شرف کو چھوڑنا ہے جو خدا نے انسان کو دیا ہے۔ اس لئے یہ سب سے خطرناک جرم ہے +

شرک کی سزا نہ بخشنے سے مراد کیا ہے؟ صرف یہ کہ ضروری ہے کہ انسان اس جرم کی سزا پائے۔ اس کے سوا جتنے گناہ ہیں ان کو خدا چاہے تو بغیر سزا دیئے معاف کر دے لیکن شرک کی سزا ضرور ملتی ہے۔ یہ حکم لگانا کہ شرک کی سزا کتنی بڑی ہوتی ہے۔ ہمارا کام نہیں لیکن چونکہ قرآن کریم سے یہ ثابت ہے کہ سزا کی اصل غرض انسان کو ان آلائشوں سے پاک کرنا ہے جو خود اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے اندر پیدا کر لی ہیں۔ اس لئے ہم یہ مانتے ہیں کہ جب یہ غرض پوری ہو جاتی ہے تو وہ سزا بھی اٹھ جاتی ہے۔ اگر ایک مسلمان کے شرک کی سزا کبھی ختم ہو سکتی ہے تو ایک غیر مسلم کے شرک کی سزا بھی منقطع ہو سکتی ہے صرف مراتب ہیں ایک زیادہ خطرناک شرک میں گرفتار ہے اور اس کا شرک اس کی توحید پر غالب ہے۔ یہ ان لوگوں کی حالت ہے۔ جو خدا کے ساتھ اعتقاداً شریک مانتے ہیں۔ جیسے بت پرست مسیح پرست۔ کیونکہ ان کے عقاید کی بنیاد ہی شرک پر ہے۔ اور ایک وہ ہیں جن کے اعتقاد کی بنا تو توحید الٰہی پر ہے۔ مگر غلطی میں پڑ کر وہ قبروں یا پیروں سے اپنی حاجات مانگتے ہیں یا ان کو ایسا مرتبہ دیتے ہیں۔ کہ عملاً وہ خدا کے احکام کی پروا اپنے پیروں کے احکام کے خلاف نہیں کرتے۔ ان کی چونکہ بنیاد درست ہے اس لئے ان کا شرک اس خطرناک حد تک نہیں پہنچتا جیسے پہلوں کا۔ آریہ سماج کا شرک بھی قسم اول میں ہی آتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی صفات میں دو اور چیزوں کو کامل طور پر شریک مانتے ہیں +

شرک سے توبہ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جو شخص توبہ کرتا ہے وہ چونکہ اپنی اصلاح اسی زندگی میں کر لیتا ہے۔ اس لئے اس کا گناہ خواہ شرک بھی ہو معاف ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی اصلاح کرے۔ اس آیت کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ کسی گناہ پر بغیر توبہ یعنی رجوع کے انسان مر جائے۔ تو اگر وہ گناہ شرک ہے تو اس کی سزا ضرور پائیگا۔ دوسرے گناہوں کو خدا چاہے تو بالکل بخشدے یہی وجہ ہے۔ کہ حدیث میں آیا ہے۔ من قال لا الٰہ الا اللہ فقد دخل الجنۃ اور یہ قرآن کے صحیح الفاظ سے ثابت ہے کہ توبہ سے شرک بھی بخشا جاتا ہے۔ اور شرک کو افترا اسلئے کہا کہ اس کو لوگوں نے انبیاء اور راستبازوں کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ کسی نبی یا کسی راستباز انسان نے کبھی شرک کی تعلیم نہیں دی پس یہ لوگوں کا افترا ہے +

تزکیۃ ۶۶۹ یزکون۔ دیکھو ۶۶ و ۱۲۴ انسان کا اپنے نفس کا تزکیہ دو طور پر ہے۔ ایک فعل کے ساتھ یعنی اچھے کام کر کے انسان اپنے آپ کو برائیوں سے پاک کرے اور یہ وہ تزکیہ ہے جس کے حصول کے لئے قرآن کریم نے بار بار ہدایت فرمائی ہے جیسے قد افلح من زکٰھا میں۔ اور دوسرا قول کے ساتھ یعنی انسان اپنے منہ سے اپنے آپ کو پاک کہے اور اس سے منع کیا ہے کیونکہ اس سے انسان کے نفس کے اندر کبر پیدا ہوتا ہے (غ) +

فتیل فتیلا فتل اصل میں رسے کے بٹنے کو کہتے ہیں۔ اور فتیل وہ ہے جسے تم اپنی انگلیوں میں ملتے ہو جیسے دھاگا یا میل اور بطور

۵۱ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۟ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ

اور یہی کھلا گناہ کافی ہے ۶۷۰ کیا تو نے ان لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جنکو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا وہ سحر اور کاہنوں پر

وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَاۤءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۟

ایمان لاتے ہیں اور انکے بارہ میں جو کافر ہوئے کہتے ہیں یہ ان کی نسبت جو ایمان لائے زیادہ سیدھی راہ پر ہیں ۶۷۱

رکوع ۹ / ۵ — یہود کا میلان کفر اور مسلمانوں کو نصیحت

مثال حقیر شے پر بولا جاتا ہی۔ اور فتیل اس کو بھی کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کی شق میں ہوتا ہی (غ)۔ +

مسلمانوں میں پیر پرستی کی بیماری

اصل ذکر یہود کا تھا۔ اور انہی کو توجہ دلانے کیلئے شرک جیسے ظلم عظیم پر توجہ دلائی تھی مگر چونکہ ان کا شرک خاص قسم کا تھا اس لئے اس کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہی۔ اور وہ شرک وہی تھا جس کا ذکر اوپر بھی ہو چکا کہ وہ اپنے راہبوں اور پیروں کے دعوئے بزرگی پر ایسے فریفتہ ہوتے تھے کہ جو کچھ وہ کہدیں اسی کو خدا کا حکم سمجھ لیتے تھے۔ شرک کے ذکر کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر جو اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور پاک بتاتے ہیں صاف بتاتا ہی کہ یہ ان علما اور پیروں کی طرف اشارہ ہی جو اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور پاک بتاتے ہیں اس لئے کہ وہ اتفاق سے دوسروں کے مرشد بن گئے ہیں پس یہودیوں کی حالت کا نقشہ کھینچکر مسلمانوں کو پیر پرستی کے خطرناک مرض سے ڈرایا ہی۔ اور اگر غور کیا جائے تو اس پیر پرستی کی بیماری نے بت پرستی کی طرح عوام کو کالانعام بنا دیا ہی۔ وہ بیچارے اپنی عقل و فکر سے کام لینے کے قابل ہی نہیں رہے۔ جو کچھ پیر نے کہدیا وہی حق ہی بعض مفسرین نے لکھا ہی کہ یہ آیت تمادح یعنی ایک دوسرے کی مدح کرنے اور ایک دوسرے کو پاک کہنے کے بارے میں نازل ہوئی ہی۔ اور احادیث میں ایسی باتوں سے بہت ڈرایا ہی۔ مگر افسوس کہ یہی آجکل کی پیر پرستی کی بنیاد ہے صحیح مسلم میں مقداد ابن الاسود سے روایت ہی کہ رسول اللہ صلعم نے ہم کو حکم دیا ان نحثوفی وجوہ المداحین التراب کہ ہم مدح کرنے والوں کے منہ پر مٹی پھینکیں۔ اور صحیحین میں ہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دوسرے کی بڑی تعریف کرتے ہوئے سُنا تو آپؐ نے فرمایا ویحك قطعت عنق صاحبك تجھ پر افسوس تو نے اپنے دوست کی گردن کاٹ دی پھر فرمایا اگر اپنے دوست کی تعریف کرنی ہو تو یوں کہا کرو کہ میں اسے ایسا سمجھتا ہوں +

ایک دوسرے کی مدح کرنے کی ممانعت

۶۷۰ کفی به اثما مبینا۔ ان کا یہ دعوٰی کہ ہم پاک اور برگزیدہ ہیں یہی ان کا کافی گناہ ہی اثما مبینا اس لئے کہا کہ ہر ایک شخص جان سکتا ہی کہ ایسا دعوٰی ایک متکبرانہ دعوٰی ہی اور کسی شخص کو سزاوار نہیں کہ ایسا دعوٰی کرے اور کفی به اس لئے فرمایا کہ یہ تو پاک ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر اور کوئی امر ان کے گنہگار ہونے پر شاہد نہ بھی ہوتا تو بھی ان کا یہی گناہ کافی تھا کہ وہ ایسا دعوٰی کرتے ہیں +

جبت۔ جبس

۶۷۱ الجبت۔ جبت۔ اور جبس کے معنی ہیں۔ دھون دھان جس میں کوئی بھلائی نہ ہو اور کہا گیا ہی کہ تا اس میں س سے بدل ہی۔ اور ہر ایک چیز جو اللہ کے سوائے پوجی جائے اسے جبت کہا جاتا ہی اور ساحر اور کاہن کو بھی جبت کہا گیا ہی (غ) اور حدیث میں آتا ہی۔ ان العیافة والطرق والطیرة من الجبت یعنی پرندوں کا زجر اور زمین پر خط لگانا اور فال یہ سب کچھ جبت سے ہے۔ اور حضرت عمرؓ کا قول بخاری میں منقول ہی کہ اَلْجِبْتُ السِّحْرُ۔ یعنی جبت سحر ہے +

طاغوت

طاغوت کے معنی ۳۳۱ میں بیان ہو چکے ہیں۔ جابر بن عبداللہ کے متعلق روایت ہی کہ ان سے طاغوت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ھم کُھّانٌ یَنْزِلُ علیھم الشیطانُ (بخاری) یہ کاہن ہیں جن پر شیطان اُترتے ہیں۔ اور اسی میں یہ بھی ہی کہ ہر ایک قبیلہ میں ایک کاہن تھا جس سے وہ فیصلہ کراتے تھے۔ اور مجاہد کا قول منقول ہی الطاغوت الشیطان فی

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ ۵۳

یہی وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر اللہ لعنت کرے تو تو اس کے لئے کوئی مددگار نہ پائیگا کیا ان کیلئے بادشاہت سے

مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ ۵۴

سے کچھ حصہ ہو تو پھر وہ لوگوں کو تل برابر بھی نہ دینگے ۶۷۲ بلکہ وہ لوگوں سے اس پر حسد کرتے ہیں

صورۃ انسان۔ طاغوت شیطان ہو جو صورت انسان میں ہو جس سے فیصلہ کراتے ہیں۔ اور وہ ان کا حاکم ہو (مث) +

یہودیت پر عرب کی بت پرستی کا اثر

اس رکوع میں یہود کے ہی مزید حالات مسلمانوں کو متنبہ کرنے کیلئے بیان کئے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہو کہ کس طرح حق سے انحراف کرتے کرتے ان کی نوبت یہانتک پہنچی کہ صریح کفر پر مائل ہوگئے۔ چنانچہ اس آیت میں یؤمنون بالجبت والطاغوت لکھکر اسی کی طرف اشارہ کیا ہو۔ معلوم ہوتا ہو کہ ایک مدت عرب میں رہکر عربوں کی بت پرستی اور کہانت پر یہودیوں کا بھی اعتقاد ہو گیا تھا۔ اور یہ حال ہر قوم کا ہوتا ہو جو حق کے پھیلانے پر زور نہیں لگاتی۔ کہ وہ آہستہ آہستہ دوسروں کے اثر کے نیچے آنا شروع ہوتی ہو۔ وہ یہودی جو عرب میں توحید کا پیغام لیکر آئے تھے۔ بجائے اس کے کہ بت پرستوں کو توحید کی طرف لاتے

مسلمانوں پر ہندوؤں کی بت پرستی کا اثر

خود بت پرستی اور کہانت پر گر گئے۔ اس کی مثال مسلمانوں میں بھی ملتی ہو جبتک وہ دوسروں کو توحید کا پیغام پہنچانے پر زور لگاتے تھے ان کے خیالات ہندوؤں میں اثر کرتے چلے گئے۔ مگر جب انہوں نے اس کو ترک کر دیا تو ہندوؤں کے بہت سے خیالات ان میں مروج ہو گئے حتیٰ کہ بعض صوفیوں کے گروہ ایسے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کی دعاؤں اور وظیفوں کو لے لیا ہو۔ اور ہندوؤں کے رسم و رواج تو بہت سے مسلمانوں میں آگئے ہیں یہ پیر پرستی اور قبر پرستی جو مسلمانوں کے اندر پائی جاتی ہو۔ وہ بھی درحقیقت بت پرستی کا ہی ایک رنگ ہو بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہو کہ جب کعب بن اشرف اور حیی بن اخطب قریش کو نبی کریم صلعم کے خلاف اکسانے کیلئے مکہ میں آئے اور خود بھی ان کی مدد کا وعدہ کیا تو قریش نے کہا کہ ہم تم پر اعتبار نہیں کرسکتے جبتک کہ تم ہمارے بتوں کو سجدہ نہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا اور کفار کے ساتھ ملکر مسلمانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرنا بتاتا ہو کہ وہ بت پرستوں کو مسلمان موحدین سے اچھا سمجھتے تھے۔ اور روایات میں صریحًا ان کا ایسا کہنا بھی مذکور ہو +

نقر۔ منقار نقیر

۶۷۲ نقیر۔ نقر کے اصل معنی کریدنا ہیں۔ چنانچہ منقار جانور کی چونچ کو کہتے ہیں جس سے وہ کریدتا ہو۔ اور اس لوہے کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ چکی راہی جاتی ہو۔ اسی سے نقیر کھجور کی گٹھلی میں جو ننھا سا گڑھا ہوتا ہو اس کو کہتے ہیں اور بطور مثل نہایت خفیف شے پر بولا جاتا ہو جیسے ہماری زبان میں تل رائی وغیرہ +

بادشاہت اور نبوت کیلئے وسعت قلب کی ضرورت

اس آیت میں بتایا ہو کہ وہ تو محمد رسول اللہ صلعم پر اس وجہ سے حسد کرتے ہیں کہ وہ بنی اسمٰعیل سے ہو اور کہتے ہیں کہ نبی بنی اسرائیل میں سے ہونا چاہئے۔ مگر ان کے اخلاق تو اس قدر ذلیل ہو چکے ہیں کہ یہ اب بادشاہت کے قابل بھی نہیں رہے نبوت تو بہت بڑا انعام ہو اور اس کے لئے بہت ہی بڑا دل بھی چاہئے اسلئے فرمایا کہ بادشاہت سے انکے پاس کوئی حصہ نہیں ہو۔ اگر انکے پاس ہوتا تو وہ اس قدر بخیل ہیں کہ دوسروں کو اس میں سے کچھ بھی نہ دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بادشاہت کیلئے بھی ایک وسیع دل چاہئے بخل اور بادشاہت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے مگر نبوت کیلئے اس سے بھی وسیع دل چاہئے مسلمانوں کو چونکہ نبی کریم صلعم کا وارث بنایا گیا ہو گویا اب علوم نبوت لتکونوا شھداء علی الناس کے ماتحت اسی سرچشمہ سے ملتے ہیں۔ اس لئے ان کو اپنے اخلاق انبیاء کی طرح وسیع کرنے چاہئیں +

عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝

جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے سو ہم نے آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی ہے اور انکو بڑی بادشاہت دی ہے ۶۷۳

۵۵ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ

پس بعض ان میں سے وہ ہیں جو اسپر ایمان لاتے ہیں اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو اس سے رکتے ہیں اور دوزخ جلانیکو کافی ہے ۶۷۴ جو لوگ

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا

ہماری آیتوں کا انکار کرتے ہیں ہم انکو عنقریب آگ میں داخل کرینگے جب ان کی کھالیں پک جائینگی ہم انکی جگہ انکو اور کھالیں

غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ الربع

دیدینگے تاکہ وہ عذاب چکھیں بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے ۶۷۵

مسلمانوں کیلئے بادشاہت اور نبوت کا وعدہ

۶۷۳ یہاں آل ابراہیم کو یعنی مسلمانوں کو دو چیزیں دینے کا ذکر کیا۔ کتاب اور حکمت۔ اور ملک عظیم کتاب اور حکمت میں تو نبوت کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ یہی دونوں چیزیں غرض و غایت نبوت ہیں اور نبوت کی عظمت کی وجہ سے مقدم اسی کو کیا ہے۔ اور پھر ایک عظیم الشان بادشاہت کے دینے کا ذکر کیا حالانکہ ابھی مسلمانوں کو بادشاہت تو ملی نہ تھی۔ اور اگر تھی بھی تو مدینہ کی دیواروں کے اندر اور وہاں بھی ابھی یہودی مخالف۔ کچھ مشرک موجود اور کچھ منافق پس ملک عظیم میں اسلام کی آیندہ بادشاہت کا وعدہ تھا۔ جو تھوڑے ہی سالوں میں دنیا کے کثیر حصہ میں پھیل گئی۔ اس وعدہ میں اہل کتاب کو یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ تم جس قدر چاہو ان کی مخالفت کر لو ان کو اللہ تعالیٰ اب عظیم الشان بادشاہت دنیا میں دینے والا ہے۔ اور جس طرح وہ کتاب وحکمت جو مسلمانوں کو دی گئی اب ان سے چھن نہیں سکتی۔ کیونکہ ان کا نبی تا قیامت زندہ ہے اسی طرح وہ بادشاہت بھی کبھی مسلمانوں سے چھن نہیں سکتی۔ ہاں اپنی سستی اور غفلت سے عارضی طور پر اس میں کمزوری آسکتی ہے اور یہاں بجائے مسلمانوں کے آل ابراہیم اس لئے کہا کہ یہ وعدہ حضرت ابراہیم کے ساتھ تھا اور یوں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ مسلمان بھی اسی ابراہیم کی آل ہیں جس کی آل بنی اسرائیل تھے +

۶۷۴ اٰمن بہ۔ اس سے مراد محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان ہے۔ جیسا کہ امام مجاہد سے مروی ہے۔ اور صدّ عنہ میں وہ لوگ داخل ہیں جو خود اسلام میں آنے سے رکتے تھے یا دوسروں کو روکتے تھے۔ اگلی آیت اس کو بالکل صاف کر دیتی ہے کہ یہاں ایمان اور انکار محمد رسول اللہ صلعم کا ہی مراد ہے +

نضج

۶۷۵ نضجت۔ نَضِج گوشت کے ہانڈی میں یا کباب کے طور پر پک جانے پر بھی بولا جاتا ہے اور پھل وغیرہ کے پکنے پر بھی اور نضیج الرای اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی رائے محکم ہو +

جلد

جلود۔ جِلْد کی جمع ہے۔ اور بدن کے چھلکے یعنی چمڑے کو جلد کہا جاتا ہے مگر بعض وقت مراد بدن بھی لے لیا جاتا ہے جیسے فرمایا تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربھم جہاں جلود سے مراد ابدان ہیں (غ) +

چمڑوں کے پکنے اور بدلنے سے مراد

چمڑوں کے پک جانے اور انکے بدلنے سے کیا مراد ہے؟ جس طرح تعالےٰ جنت کی حقیقت کو اس دنیا میں کوئی نہیں جان سکتا اسی طرح آلام نار کی حقیقت کو بھی کوئی نہیں جان سکتا لیکن ایسے الفاظ میں قرآن شریف نے ان امور کو بیان کیا ہے جو انسانوں کے ذہن کے قریب ان باتوں کو کر دیں

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۵۷

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے انکو ہم باغوں میں داخل کرینگے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ ۵۸

ہمیشہ انہی میں رہینگے ان کیلئے ان میں پاک ساتھی ہونگے اور ہم انکو بڑی حفاظت کی جگہ میں داخل کرینگے ۶۷۶ اللہ

يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا

تمکو حکم دیتا ہو کہ امانتیں انکے اہل کو ادا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کیا کرو تو انصاف سے فیصلہ

بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝

کیا کرو بیشک یہ بہت ہی عمدہ بات ہو جسکی تمہیں اللہ نصیحت کرتا ہو کیونکہ اللہ سننے والا دیکھنے والا ہو ۶۷۷

انسانی تجربہ میں یہ ہو کہ جب ایک جگہ دُکھ سے پک جاتی ہو تو پھر اس کو کوئی دُکھ محسوس نہیں ہوتا پس یہ سمجھانے کیلئے کہ جو صورت اس دنیا میں ہوسکتی ہو کہ ایک چیز جلکر اس حالت پختگی کو پہنچ جائے کہ پھر اس پر آگ سے کوئی تکلیف وارد نہ ہو وہ صورت وہاں نہ ہوگی۔ یہ محاورہ اختیار کیا ہو۔ بعض نے یہانتک بھی کہدیا ہو المرا دالدوام وعدم الانقطاع والنضج والاحتراق دغق، اور قرآن کریم نے خود اس پکنے اور اس تبدیلی کی غرض لیذ وقوا العذاب بتائی ہو یعنی تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں ایسا نہیں ہوگا کہ اس طرح عذاب کے عادی ہو جائیں کہ وہ عذاب ان کو پھر محسوس ہونے سے رہ جائے ✦

ظِل — ۶۷۶ ظلا ظلیلا۔ مفردات میں ہو کہ ظِلّ ضحٰ یعنی دھوپ کی ضد ہو۔ اور وہ فئے سے عام ہو۔ کیونکہ ظِلُّ اللیل اور ظِل الجنۃ کہا جا سکتا ہو۔ ہر مقام کو جہاں سورج نہ پہنچے ظل کہا جا سکتا ہو اور فئے صرف اسی کو کہا جاتا ہو جس پر سورج پہنچکر ہٹ گیا ہو۔ اور ظل سے مراد عزت اور حفاظت اور آسایش لی جاتی ہو اور ان المتقین فی ظلال (المرسلٰت ۴۱-۷۷) میں ظلال کے معنی عزت اور حفاظت ہیں اُکلها دا ئم وظلها (الرعد ۱۳-۳۵) هم وازواجهم فی ظلال (یٰس ۳۶-۵۶) اور عام محاورہ میں اظلّنی فلانٌ کے معنی دیئے ہیں۔ میری نگہداشت کی اور مجھے اپنے ظل میں اور اپنی عزت (یعنی روک میں) اور اپنی حفاظت میں لے لیا اور یہاں ظلا ظلیلا کی تفسیر میں کہا ہو کہ یہ خوش زندگی سے کنایہ ہو۔ اور لسان العرب میں ہو کہ ظل سورج کی شعاع کی روشنی ہو

ظل اللہ — اس کی شعاع کو الگ کرکے۔ کیونکہ اگر روشنی نہو تو ظل نہیں بلکہ ظلمت کہینگے اور ظلیل ظل سے تاکید کیلئے صفت مشتق ہو۔ اور ظل اللہ حدیث میں بادشاہ کیلئے آیا ہو اور یہاں فی الحقیقت سایہ مراد نہیں ہوسکتا ہو کیونکہ خدا کی ذات اس سے پاک ہو اور ایک حدیث میں آتا ہو سبعة یظلهم الله فی ظله اور دوسری میں اسی جگہ فی ظل العرش ہو اور یہاں بھی سایہ یعنی نہیں ہوسکتے۔ جب آیات اللہ کے انکار کرنے والوں اور ان کی سزا کا ذکر کیا تو اس کے ساتھ ہی جیسا کہ قرآن کریم کی عادت ہو ایمان اور اعمال صالحہ والوں کا ذکر بھی کیا ✦

امانۃ — ۶۷۷ الامانات۔ امانۃ کی جمع ہو۔ اور اَمانۃ اور امان۔ اَمْن سے مصدر ہو۔ اور مفردات میں ہو کہ کبھی تو امان اس حالت کا نام ہوتا ہو جس پر انسان امن میں ہو اور کبھی اس چیز کا نام ہوتا ہے جس پر انسان کو امین بنایا جائے جیسا تخونوا امانا تکم میں امانات سے مراد وہ چیزیں ہیں جن پر تم کو امین بنایا گیا ہو اور انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت (الاحزاب ۳۳-۷۲)

۵۹ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ

اے لوگو جو ایمان لاتے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے

میں حضرت ابن عباس سے امانت کے معنی فرائض مروی ہیں (ل)، اور نہایہ میں ہے کہ امانت کا لفظ طاعت اور عبادت اور ودیعت اور ثقہ اور امان پر بولا جاتا ہے اور ان میں سے ہر معنی میں حدیث آئی ہے +

ادائے امانت سے مراد

اس آیت میں بظاہر ایک نیا مضمون نظر آتا ہے - ابھی یہودیوں کی بے اعتدالیوں کا ذکر تھا - اب امانتوں کے ادا کرنے کا ذکر شروع ہو گیا - اور اسی آیت میں ایک تیسرا مضمون یہ شروع کر دیا گیا کہ لوگوں کے درمیان فیصلے عدل و انصاف سے کیا کرو - مگر فی الحقیقت ان تینوں مضمونوں میں ایک نہایت گہرا تعلق ہے - یہودیوں کی بے اعتدالیوں کے ذکر میں اصل منشا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے مسلمانوں کو متنبہ کرنے کا تھا - یہودیوں کی بے اعتدالیاں کیا تھیں اور کس بات کا نتیجہ تھیں - اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں - اس کی عبادت سے انحراف اس کی ودیعت کی ہوئی طاقتوں کو غیر محل پر استعمال کرنا اور یہ درحقیقت امانت میں خیانت تھی کیونکہ امانت کے اصل معنی طاعت اور عبادت اور ودیعت وغیرہ ہی ہیں - یہود نے خدا کی امانتوں کو ضائع کیا - اس کی نافرمانی کی اس کی بتائی ہوئی راہوں سے الگ ہو گئے اس کی دی ہوئی طاقتوں سے ٹھیک کام نہ لیا - پس مسلمانوں کو یہ حکم دیتے ہیں کہ تم نے امانتوں میں خیانت نہ کرنا - گویا اصل مضمون کی طرف اور یہودیوں کے ذکر کے اصل مقصود کی طرف رجوع کیا ہے پس جو حکم ادائے امانت کا یہاں ہے اس میں اگر امانت مال داخل ہے تو اصلی امانت یعنی اللہ کی اطاعت اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوت کو ٹھیک طور پر لگانا بھی شامل ہے - اور الیٰ اھلھا کا لفظ اس لئے بڑھایا کہ انسان کی نیکی کا اصل معیار دوسرے انسانوں سے تعلقات میں پورا اترنا ہے - جو شخص اس معیار پر پورا نہیں اترتا اس کی نیکی برائے نام نیکی ہے - پس ہر انسان کو اس کا حق دینا اور اپنی ذمہ داری کو اس کے بارہ میں پورا کرنا فی الحقیقت ادائے امانت الیٰ اھلھا ہے - ایسا ہی ہم پیشوا بنائیں - تو ان لوگوں کو جو پیشوا بننے کے اہل ہیں - حاکم بنائیں - تو ان لوگوں کو جو حکومت کے اہل ہیں یہ سب کچھ ادائے امانت ہے - ایک تسبیح خوان زاہد کو اگر فوج کی سپہ سالاری دیدی جائے تو یہ ادائے امانت الیٰ اھلھا نہیں - ایک گوشہ نشین دنیا سے ناواقف کو اگر حاکم بنایا جائے تو یہ ادائے امانت لئے اہلہا نہیں +

حاکم و محکوم کے تعلقات

لیکن انسان کا تعلق انسان سے ایک تو مساوات کی حیثیت میں ہے یعنی ہر انسان بحیثیت ایک انسان ہونیکے دوسرے پر کچھ حقوق اور دوسرے کے متعلق کچھ ذمہ داریاں رکھتا ہے - خاوند اور بی بی - آقا اور نوکر - بھائی اور اجنبی قریبی اور ہمسائے - ایک شہر اور ایک ملک کے رہنے والے ایک قوم کے افراد اور مختلف قوموں کے افراد یہ سب مساوات کی حیثیت میں - ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں - اور یہی تعلقات انسان کی زندگی کا بیشتر حصہ ہیں لیکن ایک اور قسم کے تعلقات بھی تمدن انسانی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہو گئے ہیں - اور وہ ہیں حاکم و محکوم کے تعلقات پس جب ادائے امانت الیٰ اھلھا کا ذکر کیا جس میں بیشتر تعلقات انسانی کا ذکر آ گیا تو ایک خاص صورت حاکم و محکوم کے تعلقات کو بھی بتا دیا - حاکم کا کیا فرض ہے یہاں بتا یا محکوم کا کیا فرض ہے اس سے اگلی آیت میں بتایا - چنانچہ یہاں فرمایا کہ جب تم کو لوگوں پر حاکم مقرر کیا جائے اور تم کو لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے ہوں تو اللہ تعالیٰ کا یہ بھی حکم ہے کہ عدل کے ساتھ فیصلے کرو - یہاں الناس کا لفظ وسیع اختیار فرمایا ہے مسلمان ہوں یا ہندو یا عیسائی فیصلہ میں عدل ملحوظ ہونا چاہئے - اور کسی خاص قوم کی طرف جھکنا نہیں چاہئے +

وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن

صاحب امر لوگوں کی اطاعت کرو پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لیجاؤ اگر

كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۵۹

تم اللہ پر اور آخر کے دن پر ایمان لاتے ہو یہ بہتر اور انجام کار اچھا ہے ۶۷۸

عثمان بن ابی طلحہ اور خانہ کعبہ کی چابی

مفسرین نے عموماً اس آیت کی شان نزول میں عثمان بن ابی طلحہ کا قصہ لکھا ہے جس کے پاس خانہ کعبہ کی چابی تھی یعنی وہ خانہ کعبہ کا حاجب یا محافظ تھا۔ کہ اول اس نے نبی کریم صلعم کو فتح مکہ کے دن چابی دینے سے انکار کیا بعد میں جب اس سے لے لی گئی تو حضرت عباس (یا علی) نے چاہا کہ حاجب کا عہدہ بھی سقایہ (یعنی حاجیوں کو پانی پلانے) کے ساتھ جمع کر دیا جائے اس پر یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلعم نے چابی واپس عثمان کو دی اور اسی کے خاندان میں یہ آجتک ہے۔ لیکن اگر فی الواقع نزول آیت اس موقع پر بھی ہوا ہو تو حکم اس کا پھر بھی عام ہے جیسا کہ مفسرین نے اعتراف کیا ہے۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک عثمان بن ابی طلحہ مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اس سے نبی کریم صلعم کی دریادلی کا اندازہ کرو۔

(۲) اولی الامر سے مراد

۶۷۸ اولی الامر۔ اَمَرَتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اسے مکلف کیا کہ وہ کچھ کرے۔ پس اَمْر بمعنی حکم ہے اور اولی الامر سے مراد بعض کے نزدیک وہ امیر ہیں جو نبی کریم صلعم کے زمانہ میں مقرر کئے گئے اور بعض کہتے ہیں اہل بیت کے ائمہ مراد ہیں اور بعض کہتے ہیں امر بالمعروف کرنے والے۔ اور ابن عباس کا قول ہے کہ فقہاء اور اہل دین مراد ہیں۔ یہ سب اقوال امام راغب نے نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ سب اولی الامر کے اندر داخل ہیں۔ کیونکہ اولی الامر جن کی وجہ سے لوگ رکتے ہیں چار قسم کے ہیں یعنی انبیاء اور ان کا حکم عام اور خاص لوگوں کے ظاہر و باطن پر ہے۔ اور دوسرے والی یعنی بادشاہ اور ان کا حکم سب کے ظاہر پر ہے نہ ان کے باطن پر۔ اور تیسرے اہل حکمت یا فلسفی جن کا حکم خاص لوگوں کے باطن پر ہے اور چوتھے واعظ اور انکا حکم عام لوگوں کے باطن پر ہے نہ انکے ظاہر پر۔

اولی الامر کا حکم کس حد تک مانا جا سکتا ہے

پچھلی آیت میں بتایا تھا کہ باہمی تعلقات میں ایک دوسرے کے حقوق ادا کرو جو حاکم ہیں وہ محکوم کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کریں۔ اب بتایا ہے کہ محکوم کا تعلق حاکم سے کیسا ہونا چاہئے لیکن اس کے بیان کرنے سے پہلے بتایا ہے کہ حقیقی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی ہے یعنی اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کے حکموں کا پابند کر دینا ان دو کے حکم کی فرمانبرداری بلا قید ہے۔ لیکن ان کے ساتھ جو تیسرا حکم ہے کہ اولی الامر کی فرمانبرداری کرو۔ اس کے ساتھ صاف قید لگا دی کہ اگر کسی معاملہ میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ جس سے معلوم ہوا کہ اولوالامر کی فرمانبرداری کا اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی طرح مطلق اور بلا قید حکم نہیں بلکہ یہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ گویا اللہ اور رسول کا حکم ایک ذیل میں ہے۔ اولوالامر کا حکم دوسری ذیل میں۔ اللہ اور رسول حکم دینے میں غلطی نہیں کر سکتے۔ نہ رسول کا حکم اللہ کے حکم کے خلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اولوالامر حکم دینے میں غلطی کر سکتے ہیں اور اولوالامر کا حکم اللہ یا رسول کے حکم کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ پس اللہ اور رسول کے حکم کی ہر حال میں اطاعت کرنی ہوگی۔ اولوالامر کے حکم کی بھی عموماً اطاعت کرنی ہوگی لیکن اگر وہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف ہو تو پھر ان کی اطاعت نہیں کرنی ہوگی۔

مخلوق کی اطاعت باقی نہیں رہتی جب خالق کی معصیت لازم آئے

احادیث اس بارہ میں کثرت سے ہیں۔ بخاری اور دیگر کتب احادیث میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایک لشکر بھیجا اور اس پر ایک انصاری کو امیر مقرر فرمایا۔ راستہ میں امیر کو اپنے ساتھیوں پر کچھ غصہ آیا اور اس نے کہا کہ کیا رسول اللہ صلعم نے تمکو حکم نہیں دیا کہ میری اطاعت کرو۔ انہوں نے کہا بیشک دیا ہے۔ پھر اس نے آگ جلوائی اور کہا میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ اسکے اندر داخل ہو جاؤ

۶۰ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

کیا تو نے ان لوگوں (کی حالت) پر غور نہیں کیا جو جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اُتارا گیا

ع ۹ / ۱۱ / ۷

رسول اللہ کی اطاعت

ایک نوجوان نے کہا ہم تو آگ سے بھاگ کر رسول اللہ صلعم کی طرف آئے ہیں پس جلدی مت کرو یہانتک کہ رسول اللہ صلعم سے ملو۔ چنانچہ جب واپس آئے تو یہ واقعہ آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے فرمایا اگر تم اس میں داخل ہو جاتے تو پھر نہ نکلتے انما الطاعة فی المعروف۔ اطاعت (یعنی اولی الامر کی اطاعت) صرف معروف بات میں ہو یعنی اس بات میں جو خلاف شریعت نہ ہو۔ اور ابو داؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہو کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا السمع والطاعة علی المرء المسلم فیما احب وکرہ ما لم یؤمر بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة۔ مسلمان شخص پر واجب ہو کہ وہ قبول کرے اور فرمانبرداری کرے خواہ ایک بات کو پسند کرے یا اسے ناپسند کرے جبتک کہ اسے (اللہ اور رسول کی) نافرمانی کا حکم نہیں دیا جاتا لیکن اگر (اللہ اور رسول کی) نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر قبول کرنا نہیں اور نہ اطاعت کرنا ہو۔ اور بخاری میں ہو کہ آپ نے فرمایا قبول کرو اور اطاعت کرو خواہ تم پر حبشی غلام کو امیر بنایا جائے۔ اور صحیحین میں ہو کہ جو شخص اپنے امیر کی کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اسے چاہیئے کہ صبر کرے کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر ہٹتا ہو پھر مرتا ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہو +

اولی الامر کی اطاعت جبتک کہ خلاف شریعت حکم نہ ہو ضروری ہے

ان احادیث سے ظاہر ہو کہ اولی الامر کے احکام کی پابندی کی اصل بنیاد اتحاد جماعت ہو کیونکہ جبتک سب اپنے آپکو ایک حکم کے ماتحت نہیں کرتے اس وقت تک اتحاد قایم نہیں رہ سکتا اس لئے اگر امیر کوئی ایسا حکم دے جس کو ایک شخص ناپسند کرتا ہو تو بھی اسے ماننا چاہیئے بشرطیکہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر خلاف ہو تو اس صورت میں امیر کے حکم کی اطاعت نہ کی جائے اولی الامر منکم میں جیسا کہ اوپر دکھایا گیا ہو انبیاء۔ علماء۔ ائمہ دین۔ بادشاہ حکام سب شامل ہیں۔ مگر چونکہ خطاب الذین آمنوا کو ہو اس لئے منکم کی قید سے صاف نظر آتا ہو کہ یہاں مراد مسلمان حکام ہی ہیں۔ ہاں یہ سوال علیحدہ ہو کہ آیا اگر کسی جگہ مسلمان غیر مسلم بادشاہ کے ماتحت ہوں تو اس کے احکام کی اطاعت کریں یا نہ بشرطیکہ وہ احکام خلاف قرآن و حدیث نہ ہوں اسکے لئے نبی کریم صلعم کا اور ان صحابہ کا جو حبش میں گئے نمونہ کافی ہو۔ قرآن کریم سے اجتہاد کے رنگ میں اسی آیت سے ان کا حکم بھی مستنبط ہو سکتا ہو +

یہ امر بھی یہاں یاد رکھنا ضروری ہو کہ کسی تنازعہ میں اصلی اور فیصلہ کن قول یا اللہ تعالیٰ کا کلام ہو سکتا ہو یا نبی کریم صلعم کی حدیث پس جہاں کہیں مسلمانوں میں کوئی تنازعہ ہو اس پر فیصلہ کرنے کیلئے مقدم قرآن شریف اور بعدہ حدیث ہو۔ اور قرآن شریف کا تقدم اس سے بھی ظاہر ہو کہ دوسری جگہ بصورت تنازعہ فحکمہ الی اللہ ہی فرمایا یعنی اس کا حکم اللہ کے اختیار میں ہو اور یہ بھی ظاہر ہو کہ جس طرح پر قرآن محفوظ ہو اس طرح پر حدیث محفوظ نہیں بلکہ حدیث کے الفاظ میں کمی بیشی کا ہو جانا۔ اور بسا اوقات روایت کا بالمعنی ہونا ایک امر مسلم ہو +

اہل قرآن اور رسول اللہ کی اطاعت

ایک اور امر جس کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہو ان لوگوں کا خیال ہو جو اہل قرآن کہلاتے ہیں جن کے نزدیک رسول اللہ صلعم کی اطاعت شرک میں داخل ہو اس کی تردید ص۵۱۶ میں ہو چکی ہو۔ اس موقعہ پر یہ لوگ یوں معنی کرتے ہیں "اے ایمان والو دین اسلام کے بارے میں حکم مانو اللہ تعالیٰ ہی کا یعنی حکم مانو صرف کتاب اللہ ہی کا اور سلطنت کے بارے میں حکم مانو حکام وقت کا جو تم پر حکمراں ہوں پس اگر جھگڑ پڑو تم آپس میں دین اسلام کے کسی امر میں تو اس کو رجوع کرو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کیطرف یعنی خالص کتاب اللہ کے ہی حکم کی طرف" (ترجمۃ القرآن بآیات الفرقان مولفہ مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی) اب قرآن شریف

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا

اور جو تجھ سے پہلے اُتارا گیا وہ چاہتے ہیں کہ شیطان سے فیصلہ کرائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا

اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝

کہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو گمراہی میں دور بہکائے جائے ۶۷۹

کو اپنی رائے کے ماتحت کرنے کیلئے کس قدر باتیں اپنے پاس سے ڈالکر تحریف کا رنگ اختیار کیا ہے +

پھر ایک اور دقت یہ ہوگی کہ اس قدر زوائد کے بڑھانے سے نتیجہ کیا نکلا۔ اول یہ کہ سلطنت کے امور کا کوئی تعلق دین اسلام سے نہیں۔ یہ کیسی لغو اور بے معنی بات ہے۔ وہ دین اسلام جو معاشرت کے بارہ میں احکام دیتا ہے۔ تمدن کے بارہ میں احکام دیتا ہے معمولی انسانی تعلقات کے بارہ میں احکام دیتا ہے۔ کیا وہ سلطنت کے بارہ میں کوئی احکام نہیں دیتا۔ بلکہ سلطنت کے بارہ میں جس قدر احکام ہوں ان کے لئے حکام وقت کو مقرر کر دیتا ہے خواہ ایک بیدین ہی بادشاہ ہو سلطنت کے بارہ میں جو حکم دے وہی ماننا ہوگا۔ یہانتک کہ دین اسلام کے بارہ میں تو تنازع بھی جائز ہو مگر سلطنت کے احکام کے بارہ میں کوئی تنازع جائز نہیں۔ رسول سے اختیار چھینتے چھینتے ایک حصہ دین اسلام میں بادشاہ کو رسول سے بڑھکر مرتبہ دیدیا کہ جس طرح اللہ تعالے کی اطاعت بلا چون وچرا اور بلا تنازع کرنی چاہئے۔ اسی طرح بادشاہ کی اطاعت بلا چون وچرا اور بلا تنازع کرنی چاہئے۔ اور کسی قسم کا اختلاف بادشاہ وقت کے ساتھ گویا حکم الٰہی سے انحراف ہے +

اہل تشیع اور قادیانی احمدی

اس آیت میں اہل تشیع کا بھی جواب ہے جنہوں نے امام معصوم کا وجود مانا ہے اور احمدیوں میں سے قادیانی گروہ کا بھی جواب ہے جنہوں نے حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو نبی اور رسول مانا ہے کیونکہ اگر کوئی امام معصوم ہونا ہوتا جو غلطی کر ہی نہ سکتا یا کوئی نبی اور رسول ہونا ہوتا جس کی اطاعت اسی طرح کرنی ضروری ہوتی جس طرح آنحضرت صلعم کی تو ایسے شخصوں کا ذکر اس آیت میں بھی ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جو کوئی اس اُمت کے اندر ہوگا خواہ وہ کتنا ہی عظیم الشان انسان کیوں نہ ہو وہ اولی الامر میں داخل ہوگا۔ اور اس کے ساتھ تنازع بھی ہو سکتا ہے اور ایسے تنازع کی صورت میں اصلی مرجع اللہ یعنی اس کی کتاب اور رسول یعنی سنت نبوی ہی رہینگے۔ الذین اٰمنوا ایک حکم میں رہینگے اور رسول ایک حکم میں یعنی وہ ہمیشہ مطیع رہینگے اور رسول ہمیشہ مطاع رہے گا۔ یہ سچ ہے کہ ان میں ائمہ اور علماء اور فقہاء اور حکام کی اطاعت ضروری ہوگی مگر کوئی بھی ہو اس کے ساتھ تنازع ہو سکتا ہے اور اسلئے اصل مطاع بھی رسول اللہ صلعم ہی رہے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے ساتھ بھی بعض صحابہ کو اختلاف ہو جاتا تھا اور کتاب اللہ ہی فیصلہ کرتی تھی۔ امام بخاری اور مسلم اور امام ابوحنیفہ اور مالک اور شافعی اور احمد اور ہر صدی کے مجددین اور مسیح موعود کے ساتھ بھی اگر کسی کو اختلاف ہو تو حکم کتاب اللہ اور سنت نبوی ہونگے اور اصل اور صحیح مرجع ساری اُمت کے رسول اللہ صلعم ہی ہونگے۔ اسی لئے خاتمہ پر فرمایا کہ یہ بہتر اور انجام کار اچھا ہے۔ کیونکہ اس میں اُمت کا اتفاق اور اتحاد قائم رہ سکتا ہے اپنے لئے الگ الگ مطاع بنا لئے جائیں تو تفرقہ پیدا ہو کر ایک رسول کے بھیجنے کی جو غرض تھی وہ مفقود ہوتی ہے اور یوں بھی تمام ایک ذیل میں رکھکر جمہوریت کا اعلیٰ درجہ کا اصول دنیا میں قائم کیا ہے +

زعم

۶۷۹ یزعمون۔ زعم اس قول کا بیان کرتا ہے جس پر جھوٹ کا گمان ہو (غ) اس لئے قرآن میں یہ ایسے ہی مقامات پر بولا گیا ہے جہاں اس کے کہنے والے کی مذمت مقصود ہو جیسے زعم الذین کفروا ان لن یبعثوا (التغابن ۶۴-۷) بل زعمتم ان لن نجعل لکم موعدا (الکہف ۱۸-۴۸) کنتم تزعمون (الانعام ۶-۲۲) زعمتم من دونہ (بنی اسرائیل ۱۷-۵۶) +

۶۱ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ

اور جب انکو کہا جاتا ہے کہ اسکی طرف جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف آؤ تو تُو منافقوں کو دیکھے گا کہ وہ تجھ سے رکیسا

۶۲ عَنكَ صُدُودًا ۝ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ

اعراض کرتے ہوئے رکتے ہیں تو پھر کیا حال ہوگا جب انکو اس کی وجہ سے مصیبت پہنچے گی جو انکے اپنے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے

ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ۝

پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آئینگے کہ ہمارا تو سوائے نیک سلوک اور اتفاق کے اور کچھ منشا نہ تھا ۶۸۰

۶۳ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ

یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے پس ان سے اعراض کر اور انکو نصیحت کر

منافقوں کا ذکر

یہودیوں کے حالات سے عبرت دلاکر مسلمانوں کو اخلاص اور ادائے امانت کی نصیحت کرتے ہوئے ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے۔ جو منہ سے ماننے کا دعویٰ کرتے تھے یا ہیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتے۔ مفسرین نے یہاں ایک مسلمان بشر اور ایک یہودی کے تنازع کا قصہ لکھا ہے جس میں مسلمان نے (جو درپردہ منافق تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو نہ مانا۔ لیکن گو آیت کے الفاظ ایک چھوڑ صدہا واقعات پر صادق آسکتے ہیں۔ کسی ایک خاص واقعہ سے اس کو مخصوص کرنا ٹھیک نہیں۔ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اور اس میں عام منافقوں کا ذکر ہے۔ کیونکہ جب اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا تو ان لوگوں کا بھی ذکر کر دیا جو منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے۔ مگر دل سے احکام الٰہی کو نہ مانتے تھے۔ یہ لفظ کہ جو پہلے نازل کیا گیا اس پر بھی ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ ظاہر نہیں کرتے کہ یہ یہود میں سے تھے کیونکہ ہر ایک مسلمان سارے پہلے انبیاء اور ان کی وحی پر ایمان لاتا ہے۔ اور نہ ان کے طاغوت کی طرف اپنے فیصلے لے جانے سے خاص جھگڑوں میں حکم بنانا ہی مقصود ہے بلکہ تمام دینی معاملات میں بجائے اللہ اور رسول کے حکم پر سر تسلیم خم کرنے کے اللہ کے سوا دوسروں کو حکم بناتے۔ اور یتحاکموا الی الطاغوت سے یہ مراد ہونا کہ وہ طاغوت کے پیچھے لگتے اور اس کا کہا مانتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ اس کے مقابل پر فرمایا وقد امروا ان یکفروا بہ۔ طاغوت کے کفر کا یعنی اس کی بات نہ ماننے کا حکم ان کو دیا گیا تھا اس کی مزید وضاحت اگلی آیت سے ہوتی ہے +

حلف

۶۸۰ یحلفون۔ حَلِف اصل میں اس عہد کو کہتے ہیں جو قوم کے درمیان ہو۔ اور چونکہ ایسا عہد قسم پر لیا جاتا تھا اس لئے حلف ایسی قسم کو کہا جانے لگا جس پر عہد لیا جائے اور پھر ہر ایک قسم پر یہ لفظ بولا گیا ہے +

توفیق

توفیق۔ وِفق۔ دو چیزوں کے درمیان مطابقت کا نام ہے اور اسی سے توفیق ہے جو اتفاق کے ہم معنی ہے +

یہاں بتایا کہ یہ منافق عنقریب قسمیں کھائینگے کہ ہم جو دوسرے لوگوں سے تعلقات رکھتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہم تمکو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ بلکہ یہ کہ ان لوگوں کے ساتھ ہم نیکی کریں اور فریقین میں موافقت پیدا ہو انکی ان قسموں کے جھوٹا ہونے کا قرآن شریف میں بارہا ذکر ہے ویحلفون علی الکذب (المجادلۃ ۱۴) اتخذوا ایمانہم جنۃ (المنٰفقون ۲) وغیرہ اور یہاں بھی اگلی آیت میں یہ بتایا ہے۔ دوسری جگہ انکا قول منقول ہے انما نحن مصلحون ہم دونوں فریق میں میل ملاپ کرانا چاہتے ہیں +

وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ○ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ ۶۴

اور انہیں وہ بات کہہ جو انکے دلوں میں موثر ہو ۶۸۱۔ اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے اذن سے

بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ

اسکی اطاعت کی جائے ۶۸۲۔ اور اگر وہ اس وقت جب اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا تیرے پاس آتے پھر اللہ کی بخشش مانگتے

فی انفسہم

۶۸۱۔ فی انفسہم یہاں فی انفسہم کے معنی تین طرح پر ہو سکتے ہیں۔ اول قولاً بلیغاً فی انفسہم یعنی قولاً مؤثراً فی قلوبہم ایسی بات جو ان کے دلوں میں اثر کرنے والی ہو۔ دوم۔ فی شان انفسہم یعنی ان کے اپنے بارہ میں یا وہ بات جو ان کی حالت کو ظاہر کرنے والی ہو۔ سوم۔ خالیا بہم لا یکون معہم احد یعنی ان کو الگ کرکے یا خلوت میں ۔

بلیغ

بلیغاً۔ بلیغ۔ بلغ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک مقصد کی غایت کو پالینا (غ) اور قول بلیغ یا بلاغت والا کلام دو طرح پر ہو سکتا ہے جیسا کہ امام راغبؒ نے کہا ہے۔ ایک یہ کہ بذاتہ بلیغ ہو۔ اور اس کے لئے وہ کہتے ہیں کہ تین اوصاف ضروری ہیں لغت کے لحاظ سے درست ہو۔ جو معنی مقصود ہیں اس کے ساتھ مطابقت ہو اور فی نفسہ بات سچی ہو۔ اور دوسرے یہ کہ کہنے والے کے لحاظ سے اور جس کو بات کہی گئی ہے بلیغ ہو یعنی کہنے والا جو کہنے کا مقصد رکھتا ہو۔ اس کو ایسے طور پر کہے کہ جس کو بات کہی گئی ہے وہ اسے قبول کرے۔ اور یہاں ان دونوں معنوں کی طرف اشارہ ہے ۔

۶۸۲۔ چونکہ اصل مضمون اس رکوع کا یہی تھا کہ رسول اللہ صلعم کی اطاعت کی جائے اور اسی اطاعت نہ کرنے والوں کو ہی جب وہ منہ سے اطاعت کا اقرار بھی کریں منافق بھی کہا گیا ہے۔ اس لئے اب کھول کر فرماتا ہے کہ رسول تو بھیجا ہی اس غرض کیلئے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ لیکن چونکہ اصل حق اطاعت کا اللہ تعالیٰ کیلئے ہے اس لئے ساتھ باذن اللہ فرمایا یعنی یہ کہ اس اجازت کا اعلام اللہ کی طرف سے ہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام رسول کے واسطہ سے ہی پہنچتے ہیں ۔

ہر رسول مطاع ہوتا ہے مطیع نہیں ہوتا

یہ آیت رسولوں کے ایک امتیازی نشان پر فیصلہ کن ہے۔ امام رازی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ کہ یہ آیت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ کوئی رسول نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ایک شریعت ہو اور وہ اس شریعت میں مطاع ہو۔ اور اس کے بارہ میں اسی کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ اگر وہ صرف اپنے سے کسی پہلے رسول کی شریعت کی طرف ہی بلاتا ہے تو فی الحقیقت وہ مطاع نہ ہوا بلکہ مطاع وہ پہلا رسول ہوا جس کی وہ شریعت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر ایک رسول کیلئے لازمی ہے کہ وہ مطاع بھی ہو پس اس آیت میں ایک ایسا حصر ہے کہ اس سے باہر نکلنے کی کوئی گنجایش نہیں۔ ہر ایک رسول کیلئے خود مطاع ہونا لازمی ہے۔ اس لئے چونکہ قرآن نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اس اُمت کے اندر ہمیشہ کیلئے حقیقی مطاع ایک محمد رسول اللہ صلعم ہی ہونگے جیسا کہ فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول سے ظاہر ہے اسلئے آپکے بعد اس اُمت کے اندر کوئی رسول نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی رسول ہوگا تو وہ خود مطاع ہوگا۔ اور اس لئے محمد رسول اللہ صلعم مطاع نہ رہینگے اور یہ خلاف قرآن کے ہے پس ختم نبوت پر یہ آیت فیصلہ کن ہے جب اس کو فان تنازعتم کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔ اور اب تا قیامت کوئی رسول قطعاً نہیں آسکتا نہ کوئی پرانا رسول آسکتا ہے اور نہ نیا۔ کیونکہ جو کوئی بھی رسول ہو کر آئیگا وہ خود مطاع ہوگا۔ اور یہ ہو نہیں سکتا۔

ختم نبوت پر فیصلہ کن دلیل

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد

جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کے منتظر ہیں وہ بھی اس آیت پر غور کریں۔ اور جن لوگوں نے آج تیرہ سو سال بعد ایک رسول کا آنا مان لیا ہے وہ بھی غور کریں۔ اول الذکر سوچیں کہ اگر حضرت عیسیٰ آئیں تو لازماً منصب رسالت کے ساتھ آنے چاہئیں۔ کیونکہ ایک رسول کا منصب رسالت کسی صورت میں چھینا نہیں جا سکتا۔ یہ اللہ اعلم حیث یجعل رسلتہ

۶۵ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ○ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ

اور رسول انکے لئے استغفار کرتا تو یقیناً وہ اللہ کو توبہ قبول کرنیوالا رحم کرنیوالا پاتے ۶۸۳ سو نہیں تیرے رب کی قسم وہ ایمان نہیں لائینگے

حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

جبتک کہ وہ تجھ اسیں حکم (نہ) بنائیں جو انمیں آپسمیں اختلاف ہو پھر اسکے بارہ میں اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں جو تو فیصلہ کرے اور پوری پوری فرمانبرداری کریں ۶۸۴

کے خلاف ہو۔ اور پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نعوذ باللہ کسی ناقابلیت کی وجہ سے ان کا یہ منصب چھینا گیا لیکن اگر منصب رسالت کے ساتھ وہ آئیں تو پھر اس وقت مطاع وہ ہونگے نہ حضرت نبی کریم صلعم۔ گویا آنحضرت کی رسالت کا زمانہ ختم ہو جائیگا۔ اور یہ عقیدہ نہایت فاسد ہے۔ اور وہ لوگ جو حضرت مرزا غلام احمد صاحب کو رسول بناتے ہیں وہ بھی غور کریں کہ وہ شخص جسے وہ رسول بناتے ہیں بار بار بیان کرتا ہے کہ میری گردن پر محمد رسول اللہ صلعم کی اطاعت کا جوا اسی طرح پر ہے جیسے ہر ایک مسلمان کی گردن پر اور میں نے جو کچھ پایا اسی کی پیروی سے اور اسی کی اطاعت سے پایا اُس نے بار بار اپنا مطاع اور سب مسلمانوں کا مطاع رسول اللہ صلعم کو ہی بتایا +

انبیائے بنی اسرائیل

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے بعض انبیاء بھی تو حضرت موسٰی کی شریعت کے پیرو تھے لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گو اُن کو نئی شرائع نہ دی گئی ہوں۔ مگر وہ سابق شریعت میں کمی بیشی تغیر تبدل اپنے زمانہ کی ضرورت کے مطابق کر سکتے تھے۔ اس لئے جو شریعت وہ پیش کرتے تھے وہ اپنی طرف سے پیش کرتے تھے جس بات کو وہ درست کہدیں وہ درست اور جس کو وہ غلط کہدیں وہ غلط ماننی ضروری تھی۔ اس لئے بہرحال مطاع وہ خود ہی تھے۔ گو وحی الٰہی نے اُن کو بھی ہدایت کی ہو کہ وہ موسوی شریعت کی پیروی کریں۔ لیکن اس اُمت کے اندر ایسا کوئی انسان نہیں ہو سکتا جو ایک شوشہ بھی شریعت کا کم و بیش کر سکے۔ اسلئے اس اُمت میں تاقیامت ایک ہی مطاع ہوگا۔ اور وہ محمد رسول اللہ صلعم ہیں +

آنحضرت صلعم کا استغفار

۶۸۳ جب رسول کی اطاعت کے بارہ میں قطعی حکم دیدیا تو فرمایا کہ بعض وقت انسان سے غلطی ہو جاتی ہے سو اگر ان لوگوں سے بھی کوئی غلطی ہوگئی تھی تو اس کا علاج تو یہ تھا کہ استغفار کرتے اور رسول اللہ بھی ان کیلئے استغفار کرتے تو اللہ ان کو معاف کر دیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلعم کا استغفار ساری اُمت کیلئے تھا جس میں منافق تک بھی شامل تھے اور اپنی ذات تک محدود نہ تھا +

استغفر لہم الرسول کے معنی مولوی عبد اللہ صاحب چکڑالوی یوں کرتے ہیں "پھر معافی دیدے بالکل ان کو کتاب اللہ المجید"۔ مگر لطف یہ ہے کہ کتاب اللہ المجید کے معافی دینے کے بعد لوجدوا اللّٰہ توابا رحیما ہے جسکے معنی مولوی صاحب کو بھی یہی کرنے پڑے ہیں "تو وہ ضرور پائینگے اللہ تعالٰی کو بالکل معاف کرنیوالا ہر طرح سے مہربان"۔ تعجب ہے کہ پہلے کتاب اللہ معافی دیدیتی ہے تو پھر اللہ تعالٰی معاف کر دیتا ہے حالانکہ کتاب اللہ کا معافی دینا اور اللہ کا معافی دینا ایک ہی ہے اور پھر استغفار کے معنی معافی دینا کسی لغت میں میری نظر سے نہیں گزرے اور نہ مولوی صاحب نے خود ان معنوں کی کوئی سند دی ہے +

لا

۶۸۴ فلا۔ لا کو یہاں بعض نے تاکید معنی قسم کیلئے صلہ مان کر گویا زائد مانا ہے۔ مگر درحقیقت ایسے مقامات پر لا نافیہ ہی ہوتا ہے۔ اور نفی کسی پہلی چیز کی ہوتی ہے۔ خواہ مفہوم ہی ہو۔ جیسے یہاں مراد ہے لیس الامر کما یزعمون۔ وہ بات نہیں جو گمان کرتے ہیں۔ کیونکہ شروع میں ان کے گمان کا ذکر تھا الم تر الی الذین یزعمون +

و

و ربک۔ واو قسم کے لئے ہے۔ قرآن کریم میں قسموں کا کیا منشا ہے اس کا مفصل ذکر آگے آئیگا۔ جہاں دوسری چیزوں

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ ۶۶

اور اگر ہم ان پر یہ فرض کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ

رب کی قسم سے منشا

کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ یہاں قسم "تیرے رب" کی ہے۔ اس لئے جو اعتراض قسموں پر عموماً کیا گیا ہے وہ یہاں وارد نہیں ہوتا لیکن اس قدر یہاں بھی بتا دینا ضروری ہے کہ الفاظ جیسے انسانوں کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے افعال کا ذکر بھی انہی الفاظ میں ہی ہوگا۔ حالانکہ دونوں استعمالوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ دیکھو ۲۷ اسی طرح قسم میں ہے۔ انسان جب قسم کھاتا ہے تو وہ گویا ایک زبردست شہادت پیش کرتا ہے۔ اس لئے خدا کی قسم کا اصل منشاء ایک زبردست شہادت کا پیش کرنا ہے اور جہاں جہاں اور جس جس چیز کی قسم قرآن کریم میں کھائی گئی ہے وہ ایک شہادت کی طرف اشارہ ہے یہاں وہ شہادت جس کی طرف اشارہ ہے خود لفظ ربك میں ہے یعنی محمد رسول اللہ صلعم کی ربوبیت کرنے والی ہستی۔ وہ خدا جس نے محمد رسول اللہ صلعم کی ربوبیت کر کے آپ کو ایک اعلیٰ مقام پر پہنچایا اس کا رسول کو بھیجنا اس کی اپنے ہاتھ سے تربیت کرنا ایک بے معنی امر نہیں۔ اس نے اس لئے اس کی اپنے ہاتھ سے تربیت کی تا وہ انسانوں کی تربیت کرے اس لئے اگر اس کو مطاع اور حکم نہ مانا جائے تو وہ تربیت بھی نہیں کر سکتا۔ پس اللہ تعالیٰ کے محمد رسول اللہ صلعم کی تربیت کرنے کا یہ تقاضا ہے کہ آپ مطاع ہوں ❖

حرج

حَرَج۔ نہایہ میں ہے کہ حرج کے اصل معنی ضیق یعنی تنگی ہیں۔ اور اسی میں ایک قول ہے کہ حرج اضیق الضیق ہے یعنی خفیف سے خفیف تنگی اور اسی سے گناہ معنی ہو گئے ہیں۔ اور مفردات میں ہے کہ حَرَج اصل میں مجتمع الشئ کو کہتے ہیں اور اس سے ضیق کے معنی نکلے ہیں۔ مجاہد نے حَرَج سے مراد یہاں شک لیا ہے۔ اور بعض مفسرین نے کسی قسم کی کراہت کا شائبہ کہا ہے (ر) ❖

تسلیم

یسلموا تسلیما۔ تسلیم میں انقیاد ظاہر کی طرف اشارہ ہے جیسا لایجدوا فی انفسہم حرجا میں اس طرف اشارہ ہے کہ دل سے اس فیصلہ کو حق جانیں۔ گویا جب یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلعم جو فیصلہ کریں اسے دل سے سچا سمجھو تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ظاہر طور پر بھی اس کے پابند ہو جاؤ۔ بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ بعض وقت انسان ایک بات کو سچ جانتا ہے مگر عناد کی وجہ سے اسے قبول نہیں کرتا۔ میرے نزدیک تسلیم کو بعد میں بطور ترقی اس لئے بیان کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کے فیصلوں کو دل سے سچا ماننے والے تو بہت ہیں مگر ظاہر طور پر ان کی پابندی کرنے والے تھوڑے۔ تو فرمایا کہ صرف یہی کافی نہیں کہ تم کہدو کہ ہم دل سے سچا مانتے ہیں بلکہ اس فیصلہ کے پابند بھی ہو جاؤ ❖

شریعت کی ظاہری پابندی

اس آیت کی ذیل میں بخاری نے ایک حدیث بیان کی ہے جس میں حضرت زبیر اور ایک انصاری کے جھگڑے کا ذکر ہے جو پانی کے متعلق تھا اور جس میں فیصلہ زبیرؓ کے حق میں ہوا۔ اس حدیث کے آخر میں آتا ہے کہ زبیرؓ نے کہا احسب ھذہ الایات الا نزلت فی ذٰلك یعنی میں گمان کرتا ہوں کہ یہ آیات اسی بارہ میں نازل ہوئیں۔ ان الفاظ سے لازماً یہ مراد نہیں۔ کہ یہ جھگڑا واقع ہوا تو اس کے فیصلہ کے متعلق یہ آیتیں نازل ہوئیں بلکہ ان آیات کا اس جھگڑے پر چسپاں ہونا مراد ہو سکتا ہے۔ اور غالباً یہی مراد ہے کیونکہ جس اطاعت کا ذکر یہاں چلتا ہے وہ اطاعت عام معاملات میں ہے نہ خاص قضایا میں چنانچہ اس رکوع کی آخری سے پہلی آیت اس کا قطعی فیصلہ کرتی ہے جہاں فرمایا ومن یطع اللہ والرسول فاولئك مع الذین انعم اللہ علیہم جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کریگا سو یہ لوگ ان کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام کیا ظاہر ہے کہ یہاں اطاعت سے مراد امور دینی میں اطاعت ہے یعنی ان راہوں پر چلنا جو اللہ اور رسول نے بتائی ہیں اور خود اس آیت کے الفاظ بھی یہی بتاتے ہیں کیونکہ یہاں فرمایا جو کوئی اختلاف باہم مسلمانوں میں ہو جس میں حکم رسول اللہ صلعم کو بنایا جائے تب ایک شخص حقیقت ایمان پر قائم ہوتا ہے اور جو شخص کچھ تو نبی کریم صلعم کی پیروی کرتا ہے اور کچھ اپنی خواہشات کی وہ حقیقت ایمان پر قائم نہیں اور پھر نبی کریم صلعم کے فیصلے پر شرح صدر سے راضی ہو جانا کہ

مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

تو ان میں سے سوائے تھوڑے لوگوں کے یہ نہ کرتے اور اگر وہ اس طرح کریں جو انکو نصیحت کی جاتی ہے تو یقیناً ان کیلئے بہتر

وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۙ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ ۶۷

اور بہت زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا ۶۸۵ اور یقیناً تب ہم انکو اپنی جناب سے بڑا اجر دیتے اور یقیناً انکو سیدھے رستہ پر چلاتے۔

اس فیصلے کو قبول کرنے میں کسی قسم کی تنگی بھی سینہ میں نہ آنے پائے اور پوری تسلیم کے ساتھ فرمانبرداری کریں۔ باہمی اختلافات کا اس لئے ذکر کیا کہ جو شخص اختلاف میں اپنے خلاف فیصلہ کو نہ صرف قبول کرلے بلکہ اس فیصلہ پر اس کا شرح صدر ہو جائے ایسا شخص ہر بات میں پوری پیروی کرسکتا ہے۔ اور اگر معمولی جھگڑے بھی یہاں مراد لئے جائیں تو بھی مطلب وہی ہے۔ کیونکہ دنیا کے جھگڑوں میں مدعی مدعا علیہ دونوں کا کسی کے فیصلہ پر شرح صدر ہو جانا سوائے اس کے نہیں ہو سکتا کہ اس شخص کے احکام کی دل میں حد درجہ کی عزت ہو۔ گویا یوں فرمایا کہ دین کے معاملات میں تو تم پر رسول اللہ صلعم کی پیروی لازم ہی ہے مگر اس پیروی کو اس کمال تک پہنچانے کی ضرورت ہے کہ اگر کوئی تمہارا دنیوی جھگڑا بھی ہو تو اس جھگڑے میں جو کچھ فیصلہ نبی کریم صلعم کریں اس کو نہ صرف تم قبول کرو بلکہ یہ خیال بھی تمہارے دل میں نہ آئے کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے فیصلے محض قیاس اور اجتہاد سے نہیں ورنہ ان کے متعلق اس بات کا مطالبہ نہ ہوتا کہ دل میں بھی شرح صدر رہو اور ظاہراً بھی تسلیم کامل ہو اور نہ یہ آیت جائدادوں اور مال کے جھگڑوں کے متعلق ہے۔ بلکہ دینی احکام کے بارہ میں ہے۔ اور یہ بھی صاف ثابت ہے کہ نبی کریم صلعم کا اجتہاد محض انسانی قیاسات کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ضرور ایک وحی کی روشنی تھی (جس کو ہم وحی خفی کہتے ہیں کیونکہ کھلی وحی اس بارہ میں نہ ہوتی تھی) جس کی وجہ سے آپ ان فیصلوں میں قطعاً غلطی نہ کرسکتے تھے۔ ورنہ لایجدوا فی انفسہم حرجا غلط ٹھہرتا ہے۔

اجتہاد نبوی میں وحی خفی

اپنے آپکو قتل کردینے کے حکم سے مراد

۶۸۵ احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہ نے کہا کہ اگر ایسا حکم ہوتا تو ہم اس کی تعمیل کرتے۔ تو نبی کریم صلعم نے فرمایا للایمان اثبت فی قلوب اھلہ من الجبال الرواسی (ث) ایمان اس کے اہل کے دلوں میں مضبوط پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ خود شہادت دیتا ہے کہ تھوڑے ضرور ایسا بھی کرتے اور وقلیل من عبادی الشکور (السبا - ۱۳) سے ثابت ہے کہ تھوڑے ہی اعلیٰ مقامات کو حاصل کیا کرتے ہیں تیسری بات غور طلب یہ ہے کہ یہاں فرمایا ہے کہ اگر ہم یہ فرض کر دیتے کہ اپنے آپکو قتل ہی کردو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ حالانکہ گھروں سے تو صحابہ کو نکلنا پڑا۔ تو پھر ان دونوں حکموں کو ایک حکم میں رکھنے کا کیا مطلب ایک یہ کہ اپنے آپ کو قتل کردو جو کسی نے نہیں کیا۔ اور دوسرا یہ کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ جو تمام مہاجرین نے کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اقتلوا انفسکم سے مراد بھی ایسا امر ہے جو اخرجوا من دیارکم کی طرح ممکن ہے یعنی دین کے لئے اس قدر قربانی کرنا کہ گویا انسان اپنے آپ کو اس راہ میں قتل کردے کیونکہ اشراف علی القتل یا اپنے آپ کو قتل ہونے کیلئے پیش کردینا یا اپنی جانوں کی پرواہ نہ کرنا گویا اپنے آپ کو قتل ہی کردینا ہے۔ اس کا تعلق اوپر کی آیت سے یہ ہے کہ اوپر بھی ایک حکم۔ بظاہر سخت حکم۔ رسول اللہ صلعم کے فیصلوں کو قبول کرنے اور کامل طور پر آپکی اطاعت کرنے کا دیا ہے۔ کہ ہمیشہ کیلئے ان سب انسانوں کا جو محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لائیں یہ فرض ہوگا کہ امور دینی میں آپکے فیصلوں کو قبول کریں اور کسی قسم کا شائبہ کراہت کا ان کے دلوں میں نہ آئے۔ بلکہ شرح صدر سے قبول کریں۔ تو اب فرماتا ہے کہ یہ حکم دراصل سخت نہیں انسان اپنے گھر میں رہکر اپنے کاروبار کو سرانجام دیکر رسول اللہ صلعم کے احکام کی فرمانبرداری بھی کرسکتا ہے۔ اس سے سخت تر مقام یہ ہے کہ انسان دین

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ ۶۹

اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے تو یہ لوگ ان کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام کیا (یعنی) نبیوں

وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝

اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالح لوگوں (کے ساتھ) اور یہ اچھے ساتھی ہیں ۶۸۶

کیلئے ایسے کام کرے کہ اپنی جان کی پروا بھی نہ کرے جو قتل نفس کے قایم مقام ہے۔ مثلاً اعدائے دین کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونا یہ قتل نفس سے کم نہیں۔ اور پھر یہ سخت مقام ہے کہ دین کیلئے اپنے گھروں کو چھوڑ دو جیسا کہ صحابہ کرام نے چھوڑ دکھایا تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ یہ مشکل کام ہم نے ساری اُمت پر ہمیشہ کیلئے فرض نہیں کر دیئے کیونکہ ان کے کرنیکے اہل بھی تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ ہاں سب لوگوں کو ہمیشہ کیلئے ہم یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ دین میں رسول اللہ صلعم کے فیصلوں اور آپ کی حدبندیوں سے باہر قدم نہ رکھیں۔ اپنے کاروبار دنیا کو بھی سرانجام دیں اپنے گھروں میں بھی رہیں۔ اور ساتھ دین کی حدود کو بھی نگاہ رکھیں +

لو انہم فعلوا ما یوعظون بہ میں یہ بتایا ہے کہ اگر وہ اطاعت رسول پورے طور پر کریں تو یہ ان کی دونوں طرح پر بھلائی کا موجب ہوگا۔ دنیا میں بھی ان کی بہتری کا موجب ہوگا اور ایمان میں بھی وہ مضبوط ہونگے اور ثابت قدمی میں بہت ترقی کرینگے۔ یا آخرت میں ان کی بھلائی کا موجب اور دنیا میں ان کی ثابت قدمی کا موجب ہوگا۔ اس سے یہ منشا نہیں کہ حفاظت دین کیلئے اپنے آپ کو قتل تک کیلئے پیش کرنا یا اپنے گھر کو چھوڑ دینا کسی پر بھی فرض نہیں بلکہ اس میں ایک پیشگوئی پائی جاتی ہے کہ وہ حالات دنیا میں پیدا ہو جائینگے کہ ہجرت یعنی وطن کے چھوڑنے اور دین کی حفاظت کیلئے اپنی جان قربان کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ سوائے نادر صورتوں کے جو معدوم کے حکم میں ہیں یہی وجہ ہے کہ حدیث میں بھی آتا ہے لا ھجرۃ بعد الفتح +

صدیق

۶۸۶ صدیقین۔ صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے اسی لئے اس کے اصل معنی ہیں راستی میں کمال کو پہنچا ہوا (دل)، اور امام راغب کہتے ہیں کہ صدیق وہ ہے جس کا صدق کثرت سے ظاہر ہو۔ اور کہا گیا ہے۔ بلکہ صدیق وہ ہے جو کبھی جھوٹ نہ بولے اور کہا گیا ہے بلکہ وہ جس کو اس قدر سچ بولنے کی عادت ہے کہ جھوٹ اس سے کبھی سرزد نہیں ہو سکتا۔ اور بعض نے کہا ہے وہ شخص جو اپنے قول اور اعتقاد دونوں میں سچا ہو اور جس نے اپنے صدق کو اپنے فعل سے سچ ثابت کر دکھایا ہو۔ یہ تو اس کے عام معنی ہیں اور اصطلاح شریعت میں۔ ہر ایک شخص جو ہر ایک اللہ کے حکم کو سچا مانے اور اس میں سے کسی کے بارہ میں اس کے دل میں کوئی شک واقع نہ ہو اور نبی کریم صلعم کی تصدیق کرے وہ صدیق ہے (دل)، پس عام معنی سے یہ انتقال خاص معنی کی طرف یوں ہوا کہ ایک شخص اس قدر سچ بولنے کا عادی ہے کہ نہ صرف اس سے اپنی ذات میں کبھی کوئی جھوٹ سرزد نہیں ہوتا بلکہ جب راستی اس کے سامنے آتی ہے تو اس وجہ سے کہ اسے صدق سے گویا ایک قدرتی تعلق ہے وہ اس راستی کو فوراً پہچان لیتا ہے۔ اور کسی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا۔ اصطلاح شریعت میں یوں کہنا چاہیئے کہ نور ایمانی اس میں اس قدر غالب ہوتا ہے۔ یا ایمان کے لحاظ سے وہ ایسے کمال کو پہنچا ہوا ہوتا ہے کہ راستی سے اس کو ایک قدرتی تعلق ہو جاتا ہے پس صدیقیت کا مرتبہ درحقیقت کمال ایمانی کا مرتبہ ہے +

شہید

شہداء۔ شہید مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی وہ کامل علم رکھنے والا جو اس علم کو بیان کر دے یا ظاہر کر دے گویا شہید کا کمال بلحاظ علم کے ہے جسطرح صدیق کا کمال بلحاظ ایمان کے ہے اسلئے کہا گیا ہے کہ شہید مرتبہ علم میں متقدم اور مرتبہ ایمان میں متاخر ہے اور صدیق مرتبہ ایمان میں متقدم اور مرتبہ علم میں متاخر ہے اور اسی لحاظ سے حضرت ابو بکر صدیق کو مدار صدیقیت قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ کمال ایمانی کے لحاظ سے ان کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہے

۷۰ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِـيْمًا ع

یہ فضل اللہ کی طرف سے ہی اور اللہ کافی جاننے والا ہی

اور حضرت عمرؓ کو شہید کیونکہ کمال علمی کے لحاظ سے ان کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہی +

صالح

صالحین۔ صالح کا مادہ صلح ہی اور صلاح۔ فساد کی ضد ہی۔ کثرت استعمال میں وہ افعال سے مخصوص ہیں (غ) اور قرآن کریم میں بکرّات اٰمنوا وعملوا الصالحات کہکر صلاح کو عمل سے وابستہ کیا ہی۔ بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ صالح کا کمال عمل سے وابستہ ہی اس لئے بعض نے ولایت کو صالحیت کا مقام قرار دیا ہی۔ اور اس کا مدار حضرت علیؓ کو ٹھہرایا ہی +

رفیق

رفیق۔ (رِفق بمعنی نرمی سے)، وہ ہی جو تم سے نرمی کرے۔ بالخصوص وہ شخص جو سفر میں ساتھی ہو (ل) +

رسول کی اطاعت سے منعم علیہم کی رفاقت ملتی ہے!

اس سارے رکوع میں رسول اللہ صلعم کی اطاعت پر ہی زور دیا ہی۔ اطاعت نہ کرنے والوں کو منافق قرار دیا ہی۔ اور آب اطاعت کرنے والوں کے اجر پر اس کا خاتمہ کیا ہی۔ اور فرمایا ہی کہ جو لوگ رسول اللہ صلعم کی اطاعت کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ ہونگے جو بڑے بڑے انعامات کے وارث ہوئے ہیں۔ اور وہ بڑے انعام پانے والے کون لوگ ہیں۔ جو نبوت کے مقام تک پہنچائے گئے ہیں۔ اور کمال ایمانی کو حاصل کر لیتے ہیں اور کمال علمی کو حاصل کر لیتے ہیں اور کمال عملی کو حاصل کر لیتے ہیں تو گویا یوں فرمایا کہ اطاعت رسول سے انسان کو کامل انسانوں کی رفاقت حاصل ہو جاتی ہی گو وہ خود اس کمال کو پہنچے یا نہ پہنچے اور اس میں کیا شک ہی کہ کمال ایمانی اور کمال علمی اور کمال عملی کو حاصل کرنیوالے تھوڑے لوگ ہوتے ہیں۔ اور اکثر لوگ بوجہ طرح طرح کے اشغال اور کدورتوں کے یا دیگر حالات کے کمال کو نہیں پا سکتے بس یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہی کہ ایسے لوگوں کو بھی جنہوں نے حتی الوسع نبی کریم صلعم کی اطاعت کی کوشش کی ہی۔ گو انہوں نے ان کمالات کو حاصل نہ کیا ہو۔ ان کمالات والوں کی رفاقت عطا فرمائی۔ چنانچہ قرآن کریم کے اپنے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔ اول معیت کا ذکر کیا پھر حسن اولٰئك رفیقا کہکر بتایا کہ ان کی رفاقت ان کو ملے گی۔ اور آخر آیت میں فرمایا ذٰلك الفضل من اللہ۔ یہ اللہ کی طرف سے فضل ہی کہ صرف اطاعت پر ہی اتنا بڑا اجر عطا فرمایا۔ اور پچھلی آیت کا مضمون بھی یہی چاہتا ہی +

احادیث کی شہادت

احادیث کو دیکھا جائے تو ان سے بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہی۔ چنانچہ ترمذی نے روایت کی ہی کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء تاجر صادق امین نبیوں صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نبی بن جاتا ہی اور صحیح حدیث میں آتا ہی۔ کہ نبی کریم صلعم سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جو ایک قوم سے محبت کرتا ہی اور ان میں ملا نہیں یعنی ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچا۔ تو آپ نے فرمایا المرء مع من احب آدمی انکے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبت کرتا ہی (ث)، اور انس سے ایک روایت میں ہی انی لاحب رسول اللہ صلعم واحب ابا بکر وعمر رضی اللہ عنہما وارجوا ان اللہ یبعثنی معھم وان لم اعمل کعملھم (ث)، میں رسول اللہ صلعم سے محبت کرتا ہوں اور حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرتا ہوں اور میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان کے ساتھ مبعوث کریگا گو میں نے ان کے سے عمل نہیں کئے۔ اور ایک حدیث میں ہی کہ رسول اللہ صلعم نے جنت کے بعض اعلیٰ منازل کا ذکر کیا تو صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ انبیاء کی منزلیں ہیں جن پر ان کے سوا کوئی نہیں پہنچ سکتا تو آپ نے فرمایا والذی نفسی بیدہٖ رجال اٰمنوا باللہ وصدقوا المرسلین (ث) قسم ہی اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہی وہ لوگ بھی (انکو حاصل کرینگے) جو اللہ پر ایمان لائے۔ اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی اور ایک حدیث میں ہی کہ رسول اللہ صلعم نے ایک شخص کو غمگین دیکھا تو دریافت فرمایا اس نے عرض کیا کہ اب تو ہم صبح شام آپ کے ساتھ ہوتے ہیں آپ کے چہرہ کو دیکھتے ہیں آپ کے ساتھ بیٹھتے ہیں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ ۷۱

رکوع ۱۰ ضرورت جنگ اور مسلمان سپاہی

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنا بچاؤ کا سامان لے لیا کرو

لیکن بعد وفات آپ اعلیٰ مقام پر ہونگے جہاں ہم نہیں پہنچ سکیں گے تو یہ آیت نازل ہوئی ۔

دنیا میں منعم علیہم کی رفاقت

پس یہ تو صاف ظاہر ہو کہ یہاں کاملین کی رفاقت اور معیت کا ذکر ہو۔ رہا یہ سوال کہ آیا یہ رفاقت محض آخرت کیلئے ہو یا دنیا میں بھی اس سے کچھ نہ ماننا ہو۔ سو ظاہر ہو کہ اسلام نے جتنے انعامات کا وعدہ دیا ہو ان کو کسی نہ کسی رنگ میں اس عالم میں بھی پورا کر دیا ہو۔ اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ مومنین کو اس دنیا میں بھی کچھ حظ ان مراتب کمال سے ملجاتا ہو لیکن اس پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہو کہ جس صورت میں مومنین کو ایسا حظ ملجاتا ہو تو کیا وہ منعم علیہم میں داخل ہو کر نبی صدیق۔ شہید اور صالح بن جاتے ہیں یا نہیں؟ صالح کے مرتبہ پر ایک مومن کا پہنچ جانا اس سے تو قرآن شریف بھرا پڑا ہو شہید اور صدیق کے مرتبہ پر پہنچنے پر بھی بہتیری آیات شاہد ہیں۔ جیسے فرمایا لتکونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا (البقرۃ ۔ ۱۴۳) والذين اٰمنوا بالله ورسله اولٰئك هم الصديقون والشهداء عند ربهم (الحدید ۱۵) لیکن بذریعہ ایمان بذریعہ اطاعت بذریعہ اعمال صالحہ کسی کا نبوت کے مرتبہ پر پہنچ جانا اس کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں ملیگا۔ بلکہ رسالت کے متعلق فرمایا الله اعلم حيث يجعل رسٰلته الانعام ۔ ۱۲۵) اللہ خوب بہتر جانتا ہو کہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔ صدیقیت کا مقام شہادت کا مقام۔ صالح کا مقام یہ سب والذين جاهدوا فينا کے ماتحت انسان کی کوشش اور سعی سے مل جاتے ہیں۔ جیسا کہ والذين اٰمنوا بالله ورسله اولٰئك هم الصديقون والشهداء عند ربهم سے صاف ظاہر ہے۔ ایمان جب اپنے کمال کو پہنچتا ہو تو وہی صدیق اور شہید کا مقام ہو۔ ایمان کے لئے اس سے آگے کوئی مرتبہ نہیں۔

اکتساب کا کمال صدیقیت ہے

اکتساب کا کمال انسان کو صدیقیت کے مرتبہ تک ہی پہنچاتا ہو۔ جیسا کہ خود اس لفظ کے معنی میں بھی ہمیں دکھایا ہو کہ یہ کمال ایمان پر دلالت کرتا ہو۔ نبوت اگر کوئی کمال ایمان کا مرتبہ ہوتا تو اس کا ذکر قرآن شریف میں ہونا چاہئے تھا کسی حدیث میں ہونا چاہئے تھا۔ مگر نہ تو قرآن شریف نے کہیں فرمایا کہ مومن جب ایمان میں ترقی کرتا ہو تو اسے نبی بنا دیا جاتا ہو نہ کسی حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہو۔ ہاں قرآن کریم یہ ضرور فرماتا ہو کہ لهم البشرٰى فى الحيٰوة الدنيا (یونس ۔ ۶۴)

اس اُمت میں صرف مبشرات یا نبوت اپنے لغوی معنی میں ہے

مومنوں کو اس دنیا کی زندگی میں بشارتیں دی جاتی ہیں اور یہ بھی فرمایا کہ تتنزل عليهم الملٰئكة (حم السجدۃ ۔ ۳۰) کہ ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ اور صحیح حدیث میں ہو لم يبق من النبوة الا المبشرات نبوت سے کچھ باقی نہیں رہا مگر مبشرات اور دوسری حدیث صحیح میں ہو لقد كان فى من كان قبلكم رجال يكلمون من غير ان يكونوا انبياء فان يكن فى امتى احد فعمر تم سے پہلے لوگوں میں ایسے لوگ ہوتے تھے کہ جن سے اللہ تعالیٰ ہمکلام ہوتا تھا گو وہ نبی نہ ہوتے تھے۔ میری اُمت میں اگر کوئی شخص ایسا ہو تو عمر ہو پس معلوم ہوا کہ نبوت کا ایک جزو۔ نبوت کا ایک رنگ یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے ہمکلام ہونا اس کا وجود اس اُمت میں قرآن و حدیث سے ثابت ہو۔ یہی وجہ ہو کہ اس پر قریبًا قریبًا اُمت کا اتفاق ہو کہ نبوت اپنے لغوی معنی کی رو سے یعنی محض خدا سے ہمکلام ہونے کے معنی میں تو اس اُمت میں جاری ہو مگر نبوت اپنے خاص یا اصطلاحی مفہوم میں مسدود ہو۔ چنانچہ روح المعانی میں ہو ان النبوة عامة وخاصة والتى لا ذوق لهم فيها هى الخاصة اعنى نبوة التشريع وهى مقام خاص فى الولاية واما النبوة العامة فهى مستمرة سارية فى اكابر الرجال غير منقطعة دنيا واخرى یعنی نبوت عام ہو اور خاص۔ اور وہ جس میں اس اُمت کیلئے ذوق نہیں وہ نبوت خاصہ ہو یعنی تشریعی نبوت اور وہ ولایت میں مقام خاص ہو اور رہی نبوت عامہ سو وہ اکابر اُمت میں جاری و ساری ہو اور دنیا و آخرت

فَانۡفِرُوۡا ثُبَاتٍ اَوِ انۡفِرُوۡا جَمِيۡعًا ۝

پھر گروہ گروہ ہو کر نکلو یا اکٹھے نکلو ۶۸۷

میں غیر منقطع ہو۔ گویا نبوت عامہ درحقیقت ولایت کا ہی نام ہو اس لئے اس کو محدثیت کے نام سے بھی پکارا ہو۔ کیونکہ اس میں محض اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کا شرف ہو۔ اور وہ دنیا اور آخرت میں حاصل رہیگا لیکن نبوت خاص یعنی جسے اصطلاح شریعت میں نبوت کہا جاتا ہو یا جس کا نام نبوت تشریعی ہو کیونکہ جو شخص اس منصب پر فائز ہوتا ہو وہ شریعت لاتا ہو یا شریعت میں کمی بیشی یا ترمیم تنسیخ کرنے کا مجاز ہو۔ وہ اس اُمت میں بند ہو کیونکہ شریعت کو نبی کریم صلعم نے کمال تک پہنچا یا +

ولایت یا محدثیت

اب ہم آیت کو چھوڑ کر واقعات کو لیتے ہیں تو صحابہ کی اللہ و رسول کی کامل فرمانبرداری سے قرآن شریف بھرا پڑا ہو یہانتک کہ اُن کیلئے رضی اللّٰہ عنہم و رضوا عنہ کی سند قرآن کریم میں موجود ہو۔ وہ اللہ سے راضی اور اللہ ان سے راضی۔ اس سے بڑھکر کامل اطاعت کا کوئی مرتبہ تصور میں نہیں آسکتا۔ . . . لیکن ایک طرف اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی کامل اطاعت ایسی صفائی سے ثابت ہو تو دوسری طرف یہ بھی صفائی سے ثابت ہو کہ کوئی صحابی نبوت کے منصب پر کھڑا نہیں کیا گیا یعنی نبی نہیں بنایا گیا۔ بلکہ آنحضرت صلعم نے فرمایا لو کان بعدی نبی لکان عمر۔ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا۔ گویا حضرت عمرؓ میں وہ جوہر موجود تھے۔ مگر نبی چونکہ اکتساب سے کوئی نہیں بنتا۔ اور اللہ تعالیٰ کی مصلحت نے نبوت کا دروازہ آنحضرت صلعم کے ساتھ بند کر دیا۔ اس لئے نبوت کسی کو نہیں مل سکتی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تیرہ سو سال تک کوئی نبی اس لئے نہیں بنا۔ کہ کسی نے اللہ اور رسول کی کامل اطاعت نہیں کی۔ وہ دشمن اسلام ہیں اور اسلام کو دنیا میں بدنام کرتے ہیں۔ اگر صحابہ کے گروہ نے کامل اطاعت نہ کی تھی۔ تو کیا خدا نے بھی غلطی سے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی سند ان کو دیدی۔ غرض اگر کامل اطاعت سے کوئی نبی بن سکتا تو صحابہ کا گروہ اس کا حقدار تھا۔ کہ ان میں سیکڑوں نبی ہوتے۔ مگر چونکہ ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے اطاعت سے نبوت کا ملنا ایک غلط خیال ہو جس کی صاف تردید قرآن سے حدیث سے اور واقعات سے ہوتی ہو۔ ہاں ایک رنگ نبوت بیشک اس اُمت کے کاملین کو مل جاتا ہو۔ اور یہ رنگ صحابہ کو بھی ملا۔ اس لئے حدیث میں آتا ہو کہ کسی صحابی کو کسی نبی سے اور کسی کو کسی نبی سے آنحضرت صلعم نے تشبیہ دی حتیٰ کہ ابو ذر غفاری کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مشابہت دی +

صحابہ کی کمال اطاعت

۶۸۷ حِذۡر۔ حَذَر کے معنی ڈرانے والی چیز سے اپنا بچاؤ کرنا ہیں۔ پس حِذۡر سے مراد ہو جس میں بچاؤ کا سامان ہو جیسے ہتھیار وغیرہ (غ)

حذر

انفروا۔ نَفَر کے معنی ہیں کسی چیز سے بھاگنا یا کسی چیز کی طرف بھاگنا (غ) اس لئے نفود۔ نفرت کے معنی میں آتا ہو یعنی ایک چیز سے بھاگنا اور نفر لڑائی میں نکلنے کو بھی کہتے ہیں اور نفر خدا کی راہ میں علم سیکھنے کیلئے نکلنے کو بھی کہتے ہیں۔ جیسے فلولا نفر من کل فرقۃ طائفۃ منھم لیتفقھوا فی الدین (التوبۃ ۹۔ ۱۲۲) +

نفر

ثبات۔ ثُبَۃ کی جمع ہو جس کے معنی ہیں ایک منفرد جماعت یا گروہ باقی سے الگ کیا گیا (غ)۔ اس کا مادہ ثوب ہو جس کے معنی لوٹ کر آنا ہیں اسی مادہ سے مثابۃ کے معنی ہیں تفرقہ کے بعد ان کے اجتماع کا مقام اسی سے ثُبَۃ ہو (ل) +

ثبۃ

مومنوں کو یہ بتا کر رسول اللہ صلعم کی اطاعت میں ان کے لئے کیسی کیسی برکات ہیں اب اس رکوع میں یہ بتایا ہو کہ سخت ترین حکم جس کی اطاعت کیلئے تم کو بلایا جاتا ہو۔ وہ جنگ کا حکم ہو لیکن وہ بھی تمہاری اپنی بہتری کا ہی موجب ہو کیونکہ دشمن تم کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہو۔ اس لئے تم کو ہر طرح پر اپنا بچاؤ کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔ تو سب سے پہلی آیت میں حکم دیا ہو کہ اپنے بچاؤ کا سامان کرو۔ قرآن کریم الفاظ ایسے اختیار فرماتا ہو کہ وہ جنگ اور صلح دونوں حالتوں پر چسپاں ہو سکتے ہیں۔ اس حکم کے نزول کے وقت چونکہ دشمن نے تلوار کے ذریعہ سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا چاہا اس لئے اسلحہ یعنی ہر قسم کے

دشمن کے مقابلہ کیلئے تیاری کی تاکید

وَاِنَّ مِنۡكُمۡ لَمَنۡ لَّيُبَطِّئَنَّ‌ ۚ فَاِنۡ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَىَّ ۷۲

اور تم میں سے وہ بھی ہے جو ضرور پیچھے رہ جاتا ہے پھر اگر تم کو مصیبت پہنچے کہتا ہے اللہ نے مجھ پر انعام کیا

اِذۡ لَمۡ اَكُنۡ مَّعَهُمۡ شَهِيۡدًا ۝ وَلَئِنۡ اَصَابَكُمۡ فَضۡلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوۡلَنَّ كَاَنۡ لَّمۡ ۷۳

کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا ۶۸۸ اور اگر تم کو اللہ کی طرف سے فضل پہنچے تو بول اُٹھتا ہے گویا کہ

تَكُنۡۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيۡتَنِىۡ كُنۡتُ مَعَهُمۡ فَاَفُوۡزَ فَوۡزًا عَظِيۡمًا ۝ فَلۡيُقَاتِلۡ ۷۴

تم میں اور اس میں کوئی دوستی نہ تھی اے کاش میں بھی انکے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا ۶۸۹ سو چاہیئے وہ لوگ

فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ يَشۡرُوۡنَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا بِالۡاٰخِرَةِ‌ ؕ وَمَنۡ يُّقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ

اللہ کے رستے میں جنگ کریں جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچتے ہیں اور جو شخص اللہ کی راہ میں جنگ

اللّٰهِ فَيُقۡتَلۡ اَوۡ يَغۡلِبۡ فَسَوۡفَ نُـؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ۝

کرے پھر قتل کیا جائے یا غالب آجائے تو ہم اس کو جلد بڑا اجر دینگے ۶۹۰

سامان حرب کی تیاری ہی ضروری تھی اور آیندہ بھی ضروری رہے گی لیکن جہاں جیسا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کو قلم یا زبان یا تدابیر سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ تو اس وقت بالمقابل تیاری بھی انہی چیزوں کی چاہئے مقابلہ تو کسی نہ کسی رنگ میں قیامت تک لگا ہی رہے گا پس جیسا مقابلہ ہو ویسی ہی تیاری کی ضرورت ہے۔ اور اسی قسم کی احتیاط بکار ہے۔ اب مذہب پر حملہ ہے تو اسی رنگ میں مسلمانوں کو بھی مقابلہ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں اگر مسلمان سلطنتیں ایک طرف سامان جنگ و فوج کی تیاری سے حد درجہ غافل ہیں۔ تو مسلمان علماء دوسری طرف دین پر حملوں سے لاپروا ہیں +

بطوء ۶۸۸ لیبطئن۔ یبطئ۔ بطوء سے ہے جس کے اصل معنی ہیں چلنے میں جلدی نہ اُٹھنا بلکہ پیچھے رہ جانا (غ) اور اسراع یعنی جلدی چلنے کا نقیض ہے اور بطّأ متعدی بھی ہو سکتا ہے اور لازمی بھی یعنی دوسروں کو پیچھے رکھنا یا خود پیچھے رہ جانا اور چونکہ یہاں مفعول مذکور نہیں اس لئے لازمی ہی لیا جائیگا +

۶۸۹ کان لم تکن بینکم و بینہ مؤدّۃ۔ جملہ معترضہ ہے۔ کیونکہ اس کا یہ کہنا یالیتنی کنت معہم اے کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا۔ گویا ظاہر کرتا ہے کہ اس میں اور تم میں کوئی تعلق محبت نہ تھا۔ یہاں باوجودیکہ مومنوں کو کامیابی ہوئی ہے لیکن اس شخص کے اس قول کو کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا محل اعتراض ٹھہرایا ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ کی نگاہ میں دنیا کا مال حاصل کر لینا کوئی کامیابی نہیں +

مسلمان جنگ کرنیوالے کیسے ہوں ۶۹۰ چونکہ پچھلی دو آیتوں میں کچھ کم ہمتوں کا یا دو دے لوگوں کا ذکر کیا تھا اس لئے اب یہاں ان کا ذکر کرتا ہے جو سب کچھ اللہ کی راہ میں دے چکے ہیں اور اپنا کچھ بھی باقی نہیں رکھا۔ اور بتانا یہ مقصود ہے کہ ان کی غرض دینوی کوئی باقی نہیں رہی حتّٰی کہ جنگ کرنے میں بھی ان کی کوئی غرض دینوی باقی نہیں نہ وہ اپنی فتح کا نقارہ چاہتے ہیں۔ نہ کسی مال غنیمت کے طالب ہیں۔ بلکہ پہلے وہ دنیا کے سارے سامان کو خدا کی راہ میں دے چکے ہیں۔ یہ کتنی کڑی مشکل ہے۔ خدا کی راہ میں

۷۵ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَ

اور تمہیں کیا (عذر) ہے کہ تم اللہ کے رستے میں جنگ نہ کرو اور کمزور مردوں اور عورتوں اور

الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا

بچوں کیلئے جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں

وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۞

اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی ولی بنا اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی مددگار بنا ۶۹۱

جنگ کرنے کیلئے بلایا ہی اسے جاتا ہے جو اپنا سب کچھ خدا کے لئے قربان کر چکا ہو۔ مال غنیمت کے خیال سے جنگ کرنا تو ایک طرف رہا۔ جنگ جیسی خطرناک چیز کو کس قدر نفسانی خیالات سے پاک کیا ہے۔ قرآن کریم کی دیگر آیات سے بھی اس بات کی تصریح ہوتی ہے۔ شلاً احد کی جنگ میں جب تیر اندازوں کے ایک حصہ نے مال غنیمت کی خاطر اپنی جگہ کو چھوڑ دیا۔ تو ان کے ذکر میں فرمایا منکم من یرید الدنیا (آل عمران ۳۔ ۱۵۱) یہ دنیا طلبی تھی جو مسلمانوں کو شایان نہ تھی۔ ایسا ہی احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ابو داؤد کتاب الجہاد میں ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص ہے کہ جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے وھو یبتغی عرضاً من اعراض الدنیا۔ اور وہ کچھ دنیا کی غرض بھی رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا لا اجرلہ اس کے لئے کوئی اجر نہیں ۔

مال غنیمت کا حاصل کرنا غرض جنگ نہ ہو

۶۹۱ مالکم کے معنی تو یہی ہیں کہ تمہیں کیا ہوا یا تمہیں کیا عذر ہے۔ مگر اصل غرض استفہام کی تحریص ہے اور یہ بتانا ہے کہ اب ترک جنگ کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا ۔

المستضعفین ۔ ضعف سے ہے جو خلاف قوت ہے اور کمزور کو ضعیف کہتے ہیں ۔ اور اِسْتَضْعَفْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اس کو کمزور پایا۔ ترکیب میں یا تو مستضعفین مجرور ہے اور مراد ہے فی سبیل المستضعفین یا فی خلاص المستضعفین یعنی کمزوروں کی خاطر یا کمزور کی خلاصی کے لئے ۔ اور یا منصوب علی الاختصاص ہے یعنی بالخصوص کمزور لوگ جو ایسا ایسا کہتے ہیں ۔

مستضعف

الولدان ۔ ولید کی جمع ولدان آتی ہے بعض کے نزدیک ولد کی جمع بھی ہو سکتی ہے ۔ اور ولید اصل معنی کے لحاظ سے نئے پیدا شدہ بچے اور بڑے پر یکساں استعمال ہو سکتا ہے ۔ گو عام طور پر نئے پیدا شدہ پر بولا جاتا ہے (غ) اور ولید لڑکے کو بھی کہا جاتا ہے اور غلام کو بھی ۔ اس لئے بعض نے یہاں ولدان سے غلام اور لونڈیاں مراد لی ہیں مگر لڑکے مراد لینے میں بھی کوئی امر مانع نہیں اس لئے کہ چھوٹے بچوں پر بھی ظلم کیا جاتا تھا ۔ اور دعا کرنے میں چھوٹے بچوں کے شامل ہونے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ۔ یہ صورت حال کا بیان ہے ۔ یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ ان پر دعا کرنا فرض تھا ۔

ولید

هٰذه القریة اشارہ مکہ کی طرف ہے جہاں اب تک مسلمانوں پر ظلم ہو رہے تھے جو وہاں سے بوجہ کمزوری کے ہجرت نہ کر سکتے تھے ۔ کیونکہ کفار مانع تھے ۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ جنگ کرنے کی بڑی بھاری ضرورت کیا ہے ۔ سو اول تو اس کو فی سبیل اللہ کہہ کر

جنگ کی ضرورت

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ ۷۶

جو ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں

الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۧ

جنگ کرتے ہیں پس تم شیطان کے مددگاروں سے جنگ کرو شیطان کی جنگ یقیناً کمزور ہے ۶۹۲

بتایا کہ جنگ کی ضرورت دین الٰہی کی حفاظت ہو کیونکہ مخالف اس کو تلوار سے نیست ونابود کرنا چاہتے تھے اور دوسری ضرورت یہ بتائی کہ کمزور مرد عورتیں بچے اہل مکہ سے دُکھ اُٹھا رہے ہیں اور ان پر مظالم ہو رہے ہیں اور وہ اس قابل نہیں کہ ہجرت کرسکیں۔ حضرت ابن عباس کی روایت بخاری میں ہو کہ میں اور میری ماں مستضعفین میں سے تھے۔ سلمہ بن ہشام۔ ولید بن ولید اور ابوجندل کے نام بھی بعض روایات میں آئے ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر کس قدر ظلم تھا کہ باوجودیکہ ان کا بیشتر حصہ اب مدینہ میں جاچکا تھا مگر پھر بھی جو بعض کمزور لوگ یا عورتیں یا بچے رہ گئے تھے۔ وہ بھی ان کے ظلم کا تختہ مشق ہو رہے تھے۔

ولی اور ناصر

ولی اور نصیر کے الگ الگ لانے میں یہ منشا معلوم ہوتا ہو کہ ولی تو محض حفاظت کے لئے بکار ہوتا ہو۔ اور نصیر وہ ہے جو مدد دے کر ظلم سے ہمیشہ کے لئے چھڑا دے۔ جیسے وانصرنا علی القوم الکافرین سے ظاہر ہے بعض کے نزدیک ولیا سے مراد ولایت اور نصیر سے مراد نصرت ہو۔ اور جناب الٰہی سے ولایت ونصرت مانگنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود ولی وناصر ہو +

مسلمانوں اور کفار کی اغراض جنگ کا مقابلہ

۶۹۲ یہاں مسلمانوں اور کفار کی اغراض جنگ کا قطعی فیصلہ کیا ہو۔ مومن اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں لیکن اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اس لئے جو شخص خدا کی راہ میں جنگ کرے گا وہ بھی جنگ کے ذریعہ سے کسی پر ظلم کرنا روا نہیں رکھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ سب مخلوق کو یکساں رزق دیتا ہو اور یکساں حقوق اس نے سب کو دیئے ہیں اس لئے جو اس کی راہ میں جنگ کرے گا وہ دوسروں کے حقوق کو دبانے کے لئے کبھی جنگ نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا اس لئے خدا کی راہ میں جنگ کرنے والا کسی فساد کی خاطر جنگ نہیں کرسکتا۔ طاغوت کے معنی ہی سرکشی کرنے والا یا حد بندیوں سے نکلنے والا ہیں۔ اس لئے یہاں فی سبیل الشیطان نہیں فرمایا بلکہ فی سبیل الطاغوت فرمایا۔ حالانکہ ساتھ ہی دوسری جگہ فقاتلوا اولیاء الشیطان اور کید الشیطان کے لفظ استعمال فرمائے ہیں۔ گو با مراد طاغوت اور شیطان سے ایک ہی ہو لیکن فی سبیل الطاغوت کہنے میں اشارہ یہ ہو کہ کافر حد بندیوں سے نکلنے کے لئے زیادتی اور ظلم کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ گویا ان کی غرض جنگ سے یہ ہو کہ ان کو کوئی تکلیف پیش نہیں آئی جس کے دور کرنے کے لئے جنگ کرتے ہوں۔ بلکہ ایک امن سے رہنے والی قوم پر ظلم اور زیادتی کرنے کے لئے جنگ کرتے ہیں +

کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی

اس آیت میں یہ پیشگوئی صریح الفاظ میں ہو کہ کفار جنگ میں مغلوب ہونگے۔ کیونکہ آخر پر فرمایا کہ شیطان کی جنگ کمزور ہے کید کے لئے دیکھو ۵۵۳ حالانکہ اس وقت تو کفار کا سخت غلبہ تھا بلکہ سارا ملک ہی مٹھی بھر مسلمانوں کے خلاف تلا ہوا تھا۔ پس یہاں شیطان کی جنگ کو کمزور کہنے سے اس کے انجام کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو۔ یعنی انجام کار کمزور ثابت ہوگی۔ اس میں یہ بھی بتا یا کہ ظلم اور زیادتی اگر غالب بھی ہوں تو چند روز کے لئے ہوتے ہیں +

ع ١١

ضرورت جنگ اور منافقوں کا رویہ

٧٧ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ

کیا تو نے ان کے حال پر غور نہیں کیا جنکو کہا گیا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز کو قایم کرو اور زکوٰۃ دو ٦٩٣ پھر جب ان پر جنگ

عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا

ضروری ٹھہرائی گئی تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرنے لگا جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے بلکہ اس سے بھی بڑھکر اور بولے

رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ

اے ہمارے رب تو نے ہم پر جنگ کرنا کیوں ضروری ٹھہرایا کیوں تھوڑی مدت تک ہم کو ڈھیل نہ دی ٦٩٤

اصلاح نفس جہاد مقدم ہے

٦٩٣ اس رکوع میں یہ ذکر ہے کہ منافق لڑائی میں نکلنے سے ڈرتے ہیں۔ ہاتھوں کو روکنے اور نماز کو قایم کرنے کا حکم تو عام ہے یعنی سب مسلمانوں کو مگر ڈرنے والا اور باتیں بنانے والا گروہ مسلمانوں کا نہیں بلکہ منافقوں کا ہے اور ان کو فریق منھم اس لئے کہا کہ بظاہر منافق مسلمانوں کے اندر ہی ملے ہوئے تھے۔ لوگوں سے اس طرح ڈرنے والے جیسے خدا سے ڈرنا چاہئے۔ متاع دنیا کی آرزو کرنے والے پھر آیت ۸۱ کے راتوں کو مشورہ کرنے والے۔ مومن نہیں ہو سکتے۔ اور یہ جو کہا گیا کہ ہاتھوں کو روک رکھو۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلعم کو یہ حکم تھا کہ جبتک دشمن جنگ میں ابتدا نہ کرے اس وقت تک جنگ نہ کریں۔ اس لئے جبتک دشمن نے پہل نہیں کی آپ کی بھی ہدایت تھی کہ جنگ نہ کی جائے۔ اور اس کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا حکم ملانے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جنگ اسلام کی اصل غرض نہیں بلکہ ضرورت وقتی ہے اور اصل غرض جس کیلئے نبی آتا ہے تکمیل نفس انسانی ہے اس لئے جن باتوں سے تکمیل نفس انسانی ہوتی ہے انہیں اختیار کیا جائے یعنی نماز کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی۔ جنگ سے رُکنے اور نماز و زکوٰۃ کا حکم دینے کا اکٹھا بیان کرکے یہ بتا دیا کہ انسان کیلئے دو جہاد ہیں ایک جہاد اصلاح نفس کیلئے دوسرا حفاظت دین کیلئے۔ ان میں جہاد اصلاح نفس مقدم ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اس وقت دی اور وہ بھی مشروط جب پہلے انکو اصلاح نفس کے جہاد میں کامیاب ثابت کر دیا۔ نماز یا عبادت سے انسان کے اندر فروتنی اور نرمی کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ سے انسانی ہمدردی قوت پکڑتی ہے۔ جو قومیں اپنی تکمیل نفس کے بغیر جنگوں میں پڑ گئی ہیں ان میں صرف اخلاق خشونت ہی پرورش پاتے رہے اور نرمی اور فروتنی کے اخلاق بالکل دب گئے نتیجہ یہ ہوا کہ ظلم خونخواری محکوم کو ذلیل حالت میں رکھنا یہ تمام کی سخت خواہش۔ یہ باتیں ان کے اخلاق میں پیدا ہو گئیں یہی نقشہ آج کل کی بڑی نام مہذب اقوام میں بھی ہم کو نظر آتا ہے جو جہانتک دوسری قوموں سے تعلقات کا سوال ہے حقیقی اخلاق سے محروم ہیں وہ دنیوی فوائد ان سے جس قدر چاہیں اٹھائیں مگر اخلاق میں ان کے معلم نہیں بن سکتے اور نہ محکوم قوموں کے دلوں میں ان کی کوئی عزت ہو سکتی ہے لیکن مسلمانوں کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے اعتدال اور میانہ روی کی حالت پر رکھنا تھا اور ان کو دنیا میں اخلاق کے معلم بنانا تھا اسلئے پہلے ان کے نرمی اور فروتنی کے اخلاق کو کمال کو پہنچایا اور جب مصائب برداشت کرتے کرتے اور خدا تعالیٰ کی عبادت اور انسانوں کی ہمدردی کرتے کرتے ان میں نرمی اور محبت کے اخلاق کمال کو پہنچ گئے تب جنگ کی اجازت دی گئی پس مسلمان سپاہی کو جنگ کیلئے تیار کرنے کے واسطے اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کو ضروری ٹھہرایا آج جو لوگ قوم کو ذلت کی حالت سے نکالنا چاہتے ہیں ان کیلئے ان الفاظ میں صحیح ہدایت موجود ہے اگر وہ غور کریں محض حصول سوراج کے پیچھے پڑ جانا اور اصل غرض کو جو اقامت صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا دینا تھا ایسا پس پشت ڈالنا کہ ان باتوں کا تقریروں اور لیکچروں میں نام بھی نہ آئے اس میں اور جس کی چاہے پیروی ہو قرآن کی پیروی نہیں اسلام کی غرض تکمیل نفس انسانی ہی ہے اسکے دو بڑے عملی ستون ہیں نماز اور زکوٰۃ جو سب سے پہلے انکی تعمیر کا فکر نہیں کرتا اسکا قدم صحیح راہ پر نہیں اور نماز و زکوٰۃ میں غفلت قوم کو عملی منافقت کیجانب سے باہر نہیں نکلنے دیگی

٦٩٤ خَشْيَةِ اللّٰهِ میں مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے یعنی جس طرح ایک مومن خدا سے ڈرتا ہے کہ اگر اس نے بدی کی اس کو ترک کیا

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝

کہو دنیا کا سامان تھوڑا ہے اور آخرت اس کیلئے بہتر ہے جو تقویٰ کرے اور تم پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائیگا ۶۹۵

أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ ۚ ۷۸

جہاں کہیں تم ہو گے موت تمہیں آ لے گی خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہی ہو ۶۹۶

تو انجام ہلاکت ہے اسی طرح یہ منافق لوگوں سے خائف تھے بلکہ اس سے بھی بڑھکر (اوْ بمعنی بَلْ بھی آتا ہے) کیونکہ مومن کے لئے خوف اور رجا دونوں ہیں یعنی اگر وہ ایک طرف بدی کی ہلاکت سے خائف ہے تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت پر بڑی بڑی اُمیدیں بھی رکھتا ہے مگر منافقوں کے لئے سوائے خوف کے کچھ نہ تھا اس لئے وہ ان کا خوف بڑھتا ہی جاتا تھا کہ آج مارے گئے یا کل۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو فرمایا یحسبون کل صیحۃ علیہم (المنافقون ۶۳-۴) +

جب نرم دلی اور محبت کے اخلاق مسلمانوں کے اندر خوب پرورش پاچکے اور مصائب کی چکی میں وہ خوب پس کر ایک کمال انسانی کو حاصل کر چکے تو اب وہ وقت آگیا کہ جنگ ان کیلئے ضروری ٹھہرائی گئی۔ کیونکہ اب کفار نے اسلام کو نیست و نابود کرنے کیلئے تلوار ہاتھ میں اُٹھائی۔ مگر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو دشمن کی قوت کو دیکھ کر اس سے مرعوب تھے اور مرعوب بھی اس قدر کہ وہ سمجھتے تھے کہ اب دشمن ہم کو بالکل تباہ ہی کردے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی قوت کس قدر تھی، اور ایسے حالات میں مال غنیمت کے لالچ سے مسلمانوں کا جنگ کرنا محض ایک کہانی ہے جس کی ذرہ بھی اصلیت نہیں۔ مال غنیمت کیا یہاں تو جان بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی +

۶۹۵ اس حصہ میں بتایا کہ حق کی حفاظت اور حمایت کے لئے لڑتے ہوئے مرجانا اس ذلیل زندگی سے بہتر ہے جس میں صرف یہی غرض ہو کہ دنیا کا کچھ مال کما لیا جائے۔ حفاظت حقوق کے سامنے مال دنیا کی کچھ عزت نہیں۔ اور پھر فرمایا کہ ظلم نہیں ہوگا یعنی جو کچھ دنیوی آرام یا مال یا مفاد حق کی خاطر ترک کرو گے تو وہ قربانی ضائع نہ ہوگی +

بروج

۶۹۶ بروج۔ بُرْج کی جمع ہے اور وہ اصل میں ہر ظاہر مرتفع کو کہا جاتا ہے اور شہر کے بُرج اس کے قلعے ہیں جو شہر کی فصیل پر بنائے جاتے ہیں اور آسمان میں جو بروج کا ذکر ہے والسماء ذات البروج (البروج ۸۵-۱) جعل فی السماء بروجًا (الفرقان ۲۵-۶۱) تو وہ کواکب یعنی ستارے ہیں اور قصر یعنی محل کو بھی بُرج کہا جاتا ہے۔ اسی مادہ سے عورت کا تبرج اپنے محاسن کو ظاہر کرنا ہے۔ یہاں بروج سے مراد قلعے ہیں (ت) +

تبرج

شید۔ مشیدۃ

مشیدۃ۔ شِیْد سے ہے جس کے معنی ہیں ہر ایک چیز جس سے دیوار وغیرہ کی جائے چونہ ہو یا پتھر اور تشیید البناء سے مراد عمارت کا مضبوط کرنا اور بلند کرنا ہے (ل)، دوسری جگہ قصر مشید (الحج ۲۲-۴۵) آتا ہے اور وہ واحد کیلئے ہے (ل) +

فرائض کی ادائگی موت سے خائف نہ ہو

یہاں لولا اخرتنا کا جواب دیا ہے اور وہ عام الفاظ میں ہے یعنی اگر جنگ میں مرنے سے بچ بھی جاؤ تو آخر موت سے تو نہیں بچ سکتے خواہ زندگی کے لئے کتنی ہی حفاظت کے سامان بنالو حتیٰ کہ بڑے بڑے مضبوط اور بلند قلعوں میں پناہ گزین ہو جاؤ۔ اس کا یہ منشا نہیں کہ زندگی کی حفاظت نہیں کرنی چاہئے۔ زندگی خدا کی دی ہوئی ایک نعمت ہے اور اس کی قدر کرنی چاہئے۔ مگر تقویٰ یہ ہے کہ جو فرائض اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذمہ ڈالے ہیں ان کی ادائگی کے لئے بڑی سے بڑی نعمت الٰہی کو بھی قربان کردے فرائض کی ادائگی کے وقت موت سے خائف ہونا کم ہمتی اور نامردی ہے +

وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا

اور اگر ان کو بھلائی پہنچتی ہے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کو دکھ پہنچتا ہے کہتے ہیں

هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ

یہ تیری وجہ سے ہے کہو سب اللہ ہی کی طرف سے ہے پھر ان لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ بات

يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ ۷۹

سمجھتا ہی نہیں چاہتے ؎۶۹۷ (اے انسان!) جو کوئی بھلائی تجھے پہنچتی ہے سو وہ اللہ سے ہے اور جو دکھ تجھے

مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ

پہنچتا ہے سو وہ تیری اپنی وجہ سے ہے ؎۶۹۸ اور (اے رسول!) ہم نے تجھے سب لوگوں کی بھلائی کیلئے رسول بنا کر بھیجا ہے

حسنة ۔ سيئة

۶۹۷ حسنة ہر ایک وہ چیز ہے جو انسان کو خوش کرے اور دنیوی اور دینی بھلائی دونوں پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سیئة اس کی ضد ہے یعنی جو چیز انسان کو غم میں ڈالے امور دنیوی سے ہو یا اخروی سے دیکھو ؎۱۰۵ و ؎۵۰۲۔

بھلائی اور دکھ اللہ کی طرف سے ہونے سے مراد

جب جنگ اُحد میں کچھ تکلیف پہنچی تو منافقوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ نبی کریم صلعم کی سوء تدبیر سے ہے۔ کیوں باہر نکلے؟ حالانکہ اس کی اصل وجہ رسول اللہ صلعم کی نافرمانی تھی۔ یوں انہوں نے آنحضرت صلعم کی نافرمانی کیلئے ایک راہ نکال لی تھی۔ چنانچہ جنگوں میں بھی انکا وتیرہ رہا کہ جہاں دشمن کو قوی اور زبردست دیکھا وہاں پیچھے ہٹ گئے جہاں مقابل پر دشمن کمزور ہوا آپ بھی قدم آگے بڑھا بڑھا کر رکھنے لگے۔ جہاں کامیابی ہوئی اور کچھ مال ہاتھ لگ گیا۔ کہہ دیا یہ اللہ کی طرف سے ہے هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ دوسری جگہ حضرت موسیٰ کے ذکر میں ہے (الاعراف ۔ ۱۳۱) کہ جب نعمت سے متمتع ہوتے ہیں تو کہتے ہیں لنا هٰذه یہ ہمارے لئے ہی ہم اسی کے حقدار ہیں یہی مطلب یہاں ہے اور جہاں کچھ تکلیف پہنچی اسے رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کر دیا جیسا حضرت موسیٰ کے ذکر میں ہے کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں پر جب تکلیف آتی يطيروا بموسىٰ ومن معه (الاعراف ۔ ۱۳۱) فرمایا کہ بھلائی ہو یا کچھ تکلیف ہو سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر سے ہی ہے جیسا حضرت موسیٰ کی صورت میں جواب میں فرمایا انما طائرهم عند الله جس سے مراد ہے کہ یہ ان کے اپنے خیر و شر کی وجہ سے ہے یعنی اپنے اعمال سے۔ کیونکہ جو دکھ انسان کو اپنے اعمال کی وجہ سے پہنچتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر سے ہی ہیں اسی کی زیادہ تصریح اگلی آیت میں فرمائی۔

من الله اور من عند الله

۶۹۸ من اللہ اور من عند اللہ میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ من اللہ ان امور پر بولا جاتا ہے جو اللہ کی رضا اور اسکے حکم سے ہوں۔ اور من عند اللہ عام ہے جو کچھ قضاء و قدر ہے خواہ وہ نتیجہ اللہ کی رضا سے واقع ہو یا اسکی ناراضگی سے اور خواہ خدا نے اس کام کا حکم دیا ہو یا اس سے منع کیا ہو وہ سب من عند اللہ ہے اسلئے پچھلی آیت میں فرمایا تھا کل من عند الله سب کچھ اللہ کی قضاء و قدر سے ہے۔ ہاں سب کچھ اللہ کی رضا کے مطابق نہیں اسلئے یہاں فرمایا ما اصابك من حسنة فمن الله کیونکہ اللہ کی رضا تو یہی ہے کہ انسان کو حسنہ یعنی بھلائی پہنچے۔ اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ انسان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا وما اصابكم من مصيبة فبما كسبت ايديكم (الشوریٰ ۔ ۳۰) اور فرماتا ہے ولا يرضىٰ لعباده الكفر (الزمر ۳۹ ۔ ۷) وہ اپنے بندوں کیلئے کفر پر راضی نہیں ہوتا گو اسکی قضاء و قدر یہ ہے کہ کافر بھی ہوں پس جس راہ پر اللہ تعالیٰ انسان کو چلاتا ہے اسکا مآل حسنہ یعنی بھلائی ہے اس لئے رسول کی اطاعت سے انسان کو کبھی دکھ نہیں پہنچ سکتا وہ تکلیفیں جو انسان ایک غرض کے حصول کے لئے اُٹھاتا ہے یا جو مومن اللہ کی راہ میں خوش دلی سے اُٹھاتا ہے وہ سیئة میں داخل نہیں جیسا ایک طالب العلم کا امتحان میں کامیاب ہونے کیلئے یا ایک شخص کا معاش کیلئے محنت اور مزدوری کرنا سیئة میں داخل نہیں۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ ۸۰

اور اللہ کافی گواہ ہے ۶۹۹ جو شخص رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ یقیناً اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور جو پھر جائے تو ہم نے

اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۖ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ ۸۱

تجھے ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا ۷۰۰ اور کہتے ہیں اطاعت (قبول ہے) پھر جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں ان میں سے

طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۚ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ

ایک گروہ رات کو اسکے خلاف مشورہ کرتا ہے جو تو کہتا ہے اور اللہ ان مشوروں کو محفوظ کر لیتا ہے جو یہ رات کو کرتے ہیں سو ان کا کچھ خیال

عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

نہ کرو اور اللہ پر بھروسہ کرو اور اللہ کافی کارساز ہے ۷۰۱

---

۶۹۹ اسی پہلی بات کی یہاں تائید کی۔ اسی لئے رسول بنا کر بھیجنے کا ذکر کیا تو الی الناس نہیں فرمایا بلکہ للناس فرمایا یعنی لوگوں کی بھلائی کے لئے پس رسول کی اطاعت میں لوگوں کی بھلائی ہے۔ اللہ کافی گواہ ہے یعنی نتیجہ ظاہر کر دے گا کہ واقعی اس کے احکام کی فرمانبرداری میں تمہاری بھلائی ہے +

حفظ

۷۰۰ حفیظ۔ حِفظ نسیان کی ضد ہے اور اس قوت کے استعمال پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے اس لئے اس کے معنی تعہد اور رعایت کے ہو گئے ہیں (غ) اور یہاں رسول کے حفیظ نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس کا کام نہیں کہ لوگوں سے اطاعت کرا بھی لے یا ان کو معاصی یا دکھوں میں پڑنے سے بچا بھی لے +

رسول کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت ہے۔

اس آیت میں بالکل صاف کر کے بتا دیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت خدا کی ہی اطاعت ہے۔ پہلی آیت میں و ارسلنٰک للناس رسولا فرما کر اور یہاں من یطع الرسول کہکر واضح کر دیا کہ رسول سے مراد خود محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور اہل قرآن کی اس تفسیر کے لئے کہ رسول سے مراد رسالت ہو یہاں گنجایش باقی نہیں۔ اور آپ کی اطاعت ضروری ہے اور اسی اطاعت کا ذکر ہی اس رکوع میں ہے اور گو یہاں ذکر جنگ کا ہے جس سے منافق دل چراتے تھے مگر حکم عام ہے رسول کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کہکر بتا دیا کہ جو کچھ حکم نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم دیتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔ خواہ وہ بات اللہ تعالےٰ بذریعہ جبرئیل قلب رسول پر نازل کرے یعنی وحی متلو ہو یا آپ کے دل میں ڈال دے یعنی وحی خفی ہو +

بات۔ بیات

بیّت

۷۰۱ بیّت۔ بات کے معنی ہیں رات کاٹی اور بیّت کے لئے دیکھو ۱۵۷ اور بَیات کے معنی ہیں رات کے وقت دشمنی کا قصد کرنا یأتیھم باسنا بیاتا (الاعراف۔ ۹۷) اور ہر ایک فعل جس کے متعلق رات کو تدبر کیا جائے اس پر بُیّت بولا جاتا ہے (غ)۔ معلوم ہوا کہ یہ ذکر منافقوں کا ہی چلا آتا ہے کیونکہ مومن آنحضرت کے خلاف راتوں کو مشورے نہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ان مشوروں کو محفوظ کر لینے سے مراد یہ ہے کہ ان منصوبہ بازیوں کی سزا ان کو ضرور مل کر رہے گی۔ اور اللہ پر بھروسہ کرنے کی ہدایت میں اشارہ ہے کہ ان کے مشوروں سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا +

۸۲ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ

پھر کیا قرآن میں تدبر نہیں کرتے — اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا — تو اس میں

۸۳ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ

بہت اختلاف پاتے ۷۰۲ اور جب کوئی امن یا خوف کی بات ان کو پہنچتی ہے تو اس کو خوب پھیلاتے ہیں اور اگر

رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ

وہ اسے رسول اور ان لوگوں کی طرف — جو ان میں صاحب امر ہیں لوٹاتے

دُبُر۔ تدبّر

۷۰۲ یتدبرون ۔ دُبُر پیٹھ کو کہتے ہیں اس لئے اِدبار کے معنی پیٹھ پھیرنا آتے ہیں من ادبر و تولیٰ (المعارج ۔ ۱۷) اور تدبر کے معنی ہیں التفکیر فی دُبُرِ الامور (غ) یعنی امور کے نتائج میں فکر کرنا ؛

رسول اللہ صلعم کے حالات میں اختلاف کثیر کے باوجود قرآن میں اختلاف نہ ہونا اسکے منجانب اللہ ہونے پر دلیل ہے۔

یہ جو کچھ منصوبے منافق کرتے تھے اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ آنحضرت صلعم کی نبوت پر ایمان نہ لاتے تھے بلکہ خیال کرتے تھے کہ یہ رسول اللہ صلعم خود ہی باتیں بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں اس لئے ان کو قرآن شریف میں تدبر کرنے کو کہا ہے۔ اور فرمایا کہ اگر قرآن شریف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ رسول اللہ صلعم کو اس قدر مختلف حالات زندگی میں سے گزرنا پڑا کہ ایک منصوبہ باز انسان ان مختلف حالات میں ایک حالت پر نہ رہ سکتا تھا بلکہ آج اگر ایک تجویز اپنی بقا کی سوچتا تو کل دوسری۔ اور آج اگر ایک خیال اس کے دل میں موجزن ہوتا تو کل دوسرا ایک طرح پر منافقوں کو ان کی اپنی حالت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح ان کے اپنے حالات میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اور یہ منصوبہ بازیوں کا لازمی نتیجہ ہے مگر محمد رسول اللہ صلعم کی حالت پر غور کرو کہ کس طرح ایک زمانہ آپ پر وہ ہے کہ آپ اکیلے غار حرا میں مخلوق خدا کی بہتری کیلئے آہ و زاری کرتے ہیں تو دوسرا زمانہ وہ ہے کہ آپ اب مدینہ میں ایک چھوٹی سی ریاست کے بادشاہ ہیں۔ اور ایک زمانہ وہ ہے کہ چاروں طرف آپ کی صداقت اور راستبازی کا شہرہ ہے تو دوسرا زمانہ وہ ہے کہ سب لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور کوئی بات تک نہیں سنتا۔ کبھی چاروں طرف سے دکھوں اور تکلیفوں میں گھرے ہوئے ہیں تو دوسرے وقت چاروں طرف جاں نثار موجود ہیں۔ کبھی دشمن آپ کو نقصان پہنچا جاتے ہیں تو کبھی آپ فاتح اور غالب ہوتے ہیں۔ ایک وقت اگر امام نماز بن کر ساتھیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ منازل روحانی کی سیر کراتے ہیں تو دوسرے وقت جرنیل بن کر مشکل سے مشکل مقامات میں سے اپنی فوج کو نکال کر ان کو میدان جنگ میں فاتح کے مقام پر پہنچاتے ہیں کبھی عدالت کا کام آپ کے سپرد ہے تو کبھی قانون سازی بھی آپ کو خود ہی کرنی پڑتی ہے۔ ابھی بادشاہ کی حیثیت میں اختیار حکومت کو برت رہے ہیں تو دوسرے لمحہ میں دوستوں کے اندر اس قدر انکساری سے بیٹھے ہوتے ہیں کہ آپ کو کوئی پہچان بھی نہیں سکتا۔ ابھی وعظ و نصیحت میں مصروف ہیں تو ابھی گھر میں بی بی کو کسی کام میں مدد دے رہے ہیں اور ان تمام حالات متفرقہ میں قرآن کریم آپ پر نازل ہوتا رہتا ہے منصوبہ باز انسان کی حالت ایسے اوقات میں لازماً بدلتی رہتی ہے اور اس کے خیالات میں بھی اسی طرح تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے مگر قرآن کریم کو اول سے آخر تک پڑھ جاؤ۔ وہ سب کا سب ایک ہی رنگ میں رنگین اور ایک ہی اثر سے متاثر ہے اسکے خیالات میں باوجود اختلاف مضامین کے ایک ہی رو دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے تاریخی بیانات میں کوئی اختلاف واقع نہیں ہوتا۔ اس کے نظم میں کوئی تغیر نظر نہیں آتا۔ اس کے احکام میں کوئی متضاد امر نہیں۔ اس کی فصاحت و بلاغت میں کوئی فرق نہیں آتا ؛

اس آیت میں منافقوں ہی نہیں بلکہ قرآن کریم کے کل مخالفین پر اتمام حجت کیا ہے کیونکہ قرآن کریم میں اختلاف کا نہ ہونا اسکے

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ

تو جو ان میں سے بات کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں وہ اسے جان لیتے ٦٠٣

آنحضرتؐ کا اُمی ہونا اور قرآن کریم میں اختلاف نہ ہونا اسکے اعجاز پر شاہد ہے

منجانب اللہ ہونے پر ایک قطعی دلیل ہے اور یہ اختلاف کا نہ ہونا نہ صرف ان حالات مختلفہ کے لحاظ سے اپنے اندر ایک اعجاز کا رنگ رکھتا ہے جن میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تئیس سال کے عرصہ میں گزرنا پڑا۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمی تھے لیکن دنیا کے سارے مذاہب پر قرآن شریف میں بحث ہے۔ کبھی ان مذاہب کے پیرو آپ کی دوستی کا دم بھرتے ہیں کبھی سخت ترین دشمن ہیں مگر قرآن کریم نے جو پہلو ان کے متعلق ایک دفعہ اختیار کیا وہی آخر تک قایم رکھا۔ پھر آپ نے ان کی کتابوں کو پڑھا نہیں باایں ہمہ مکی اور مدنی دونوں سورتوں میں کثرت کے ساتھ ان کی تاریخ کے حوالجات پائے جاتے ہیں کس قدر کمال ہے کہ ان واقعات میں نہ باہم کوئی اختلاف ہے۔ نہ صحیح تاریخ سے اختلاف ہے۔ مسیح کے حالات کو چار انجیل نویس جو ملہم مانے جاتے ہیں لکھنے بیٹھتے ہیں تو باہم اس قدر اختلاف ہو جاتا ہے کہ مسیح کے نسب نامے تک نہیں ملتے اور صریح متضاد بیانات ان اناجیل میں موجود ہیں یہ لکھے پڑھے ملہمین کی حالت ہے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اُمی ہونے کے باوجود توریت اور انجیل کے بکثرت حوالجات قرآن کریم میں موجود ہیں پھر ان میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ جہاں بائبل اور قرآن کا اختلاف ہے وہاں آج واقعات کی شہادت سے حق قرآن کریم کے ساتھ ثابت ہو رہا ہے جس کی مثالیں اپنے اپنے موقعہ پر ان نوٹوں میں دی جا چکی ہیں اور قرآن کریم کا مشہور جرمن منقد ہرشفلڈ جس نے بڑے غور سے قرآن شریف کو پڑھا ہے توریت و انجیل کے مضامین کے حوالجات کی کثرت کو قرآن کریم میں دیکھکر یہاں تک گھبرایا ہے کہ اس کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے غور سے ان کتابوں کو پڑھکر ان کے مضامین کو ایک نوٹ بک میں لکھ لیا تھا اور بطور اشارہ قرآن کریم میں ان کو لاتے رہے۔ پھر بائبل کے پیغمبروں کے علاوہ دوسرے پیغمبروں کا ذکر بھی قرآن کریم میں آیا ہے مگر وہ بھی اختلاف سے اسی طرح پاک ہے غرض کہ یہ ایک بے نظیر اعجاز قرآن کریم کا ہے۔

قرآن میں اختلاف کا نہ ہونا ناسخ منسوخ کو غلط ٹھہراتا ہے

ساتھ ہی ان الفاظ میں ان مسلمانوں پر بھی اتمام حجت کیا ہے جو قرآن کریم میں نسخ کے قائل ہوئے ہیں اس لئے کہ نسخ کو قبول کرنے کے یہ معنی ہیں کہ قرآن شریف کی بعض آیات کو بعض کے ساتھ تطبیق نہیں دی جا سکتی جس کے یہ معنی ہوئے کہ قرآن کریم میں اختلاف ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس میں اختلاف نہیں پس قرآن کریم میں نسخ کا قبول کرنا قرآن کریم کے اس صریح دعوٰی کے خلاف ہے جو یہاں کیا گیا ہے۔ اور یہاں ایک اور بھی لطیف اشارہ موجود ہے کیونکہ یہاں جب قرآن میں اختلاف نہ ہونے کا دعوٰی کیا تو ساتھ ہی فرمایا کہ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے اگر تدبر کریں تو معلوم ہو گا کہ اختلاف کوئی نہیں۔ اور یہی سچ ہے کیونکہ کوئی بھی آیت جس کی منسوخی کا ایک گروہ قائل ہوا ہو ایسی نہیں جس کی عدم منسوخی کا دوسرا قائل نہ ہو کیونکہ اس دوسرے کے نزدیک تدبر کرنے سے دونوں آیات میں تطبیق ہو گئی پس قرآن کریم کا دعوٰی ثابت شدہ ہے اور جہاں سطحی نظر سے اختلاف معلوم ہوتا ہے وہیں تدبر کرنے سے وہ اختلاف دور ہو جاتا ہے۔

نبط و استنباط

٦٠٣ یستنبطون۔ اِستِنباط کا اصل نبط سے ہے اور نبط البئر کے معنی ہیں کنوئیں کو کھود کر اس کا پانی نکالا اسی سے فقیہ کا استنباط ہے جب وہ اپنے فہم اور اجتہاد سے مخفی معنی کو نکال لیتا ہے۔ اس لئے استنباط کے معنی استخراج ہیں (ت)، یا ایک بات کی تہ تک پہنچکر صحیح نتیجہ نکال لینا یہاں اولی الامر کے ساتھ استنباط کا لفظ لاکر بتا دیا کہ اصطلاح قرآن میں اولی الامر سے مراد صرف صاحب حکومت نہیں بلکہ فقہاء اور ائمہ اور مجتہدین بھی اس میں داخل ہیں۔

پچھلی آیت گویا ایک جملہ معترضہ کے طور پر تھی۔ اب پھر منافقوں کی حالت کو بیان کرتا ہے کہ کوئی بات امن کی ہو یعنی

۸۴ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ فَقَاتِلْ

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتی تو کم حالات کے سوائے تم ضرور شیطان کے پیچھے لگے رہتے ۴۰۴ پس اللہ کی

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ

راہ میں جنگ کر تجھے اپنی ذات کے سوا کسی اور کیلئے مکلف نہیں کیا جاتا اور مومنوں کو بہت ترغیب دو. قریب ہے کہ اللہ انکی

يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝

جنگ کو روک دے جو کافر ہیں اور اللہ طاقت میں سب سے زیادہ قوی اور عبرتناک سزا دینے میں سخت تر ہے ۴۰۵

حالات عامہ کے متعلق یا خوف کے متعلق یعنی دشمن کی چڑھائی وغیرہ کے. تو یہ لوگ اسے بہت پھیلاتے ہیں تاکہ بدامنی پھیلے حالانکہ چاہئے یہ تھا کہ ایسی باتوں کو اولی الامر کی طرف لوٹاتے۔ جو قوت استنباط رکھتے ہیں۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت کے اہل بھی وہی لوگ ہیں جو قوت استنباط کو کام میں لا سکتے ہیں یعنی بعض حالات سے ایک صحیح نتیجہ نکال سکتے ہیں +

استنباط مسائل

اس آیت سے مسائل شرعی میں استنباط کا مسئلہ بھی نکلتا ہے۔ کیونکہ استنباط مسائل یہی ہے کہ ایک مسئلہ کا صحیح حکم موجود نہیں ہوتا یعنی صورت پیش آمدہ میں کچھ حالات مختلفہ جمع ہوتے ہیں ان کو قرآن شریف اور سنت پر پیش کر کے ایک صحیح نتیجہ اخذ کرنا ہوتا ہے +

۴۰۴ اللہ کا فضل اور رحمت محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت ہی ہے۔ یہ اخلاق رذیلہ جن کا نظارہ منافقین میں نظر آتا تھا وہ رہ جاتے اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مکارم اخلاق کے ساتھ مبعوث فرما کر ان کا علاج نہ کیا ہوتا یا منافقین کے انجام کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر بھی فضل کرے گا اور تم میں سے بہتوں کو شیطان کی پیروی سے نکال دے گا۔ ورنہ تم ایسی غلط راہ پر پڑے تھے کہ اس سے نکلنا مشکل تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے تمہاری دستگیری فرما کر تم میں سے اکثر کو اس حالت سے باہر نکال دیگا الا قلیلا کے معنی دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں یوں بھی کہ تھوڑوں کے سوائے تم شیطان کے پیچھے لگے رہتے اور یوں بھی کہ تھوڑی صورتوں کے سوائے تم شیطان کے پیچھے لگے رہتے +

حرض

۴۰۵ حرض۔ حَرَض وہ ہے جو کسی گنتی میں نہ ہو اور جس میں کچھ بھلائی نہ ہو اس لئے جو ہلاکت کے قریب پہنچ جاتے اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے حتی تکون حرضا (یوسف ۱۲۔ ۸۵) اور تحریض کے معنی ہیں ایک چیز کی خوبیوں کو بکثرت بیان کر کے اس پر تحریض دلانا گویا اس میں حرض کا ازالہ ہے (غ) +

تحریض

تنکیل

تنکیل۔ نکل سے ہے جس کے معنی قید ہیں اور تنکیل اور نکال کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ایسی سزا دینا جس سے دوسرے کو ایسا فعل کرنے سے روک دیا جائے یا عبرتناک سزا دیکھو ۹۵ +

جنگ کیلئے آنحضرت اکیلے مکلف تھے

چونکہ منافقوں کے جنگ کے وقت پیچھے رہنے کا ذکر تھا اس لئے فرمایا کہ تمہارا جنگ کرنا تو دین اسلام کی حفاظت کیلئے ہے۔ پس کوئی اور کرے یا نہ کرے تم اکیلے ہی جنگ کرو۔ ہاں مومنوں کو بھی ترغیب دو۔ مگر مکلف تم اپنی ذات کیلئے ہو دوسروں کیلئے تم مکلف نہیں یعنی ان کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ اکیلے جنگ کرنے کا حکم بتاتا ہے کہ نبی کریم صلعم کا بھروسہ تعداد پر نہ تھا بلکہ نصرت الٰہی پر تھا۔ لکھا ہے کہ جنگ اُحد کے بعد جب لوگ بوجہ مصیبت اور تکلیف پیش آنے کے بہت پژمردہ ہو رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ میں اکیلا ہی دشمن کے تعاقب میں نکلوں گا یہ آپ کا عزم تو آپ کی شجاعت پر دلالت کرتا ہے کہ قوت قلبی کس قدر تھی۔ مگر جاں نثاروں کا گروہ آپ کو تنہا کب چھوڑتا تھا۔ یہاں ساتھ ہی یہ پیشگوئی بھی کی ہے کہ کفار اس جنگ کو

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً ۸۵

جو کوئی بھلی بات کی سفارش کرے اس کو اس سے حصہ ملیگا اور جو کوئی بری بات کی سفارش

سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ○ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ ۸۶

کرے اس کو اس سے حصہ ملے گا اور اللہ ہر چیز پر قابو رکھنے والا ہے ۶۰۶ اور جب تم کو کسی دعا کے

النصف بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ○ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ ۸۷

ساتھ دعا دی جائے تو اس سے بہتر کے ساتھ دعا دو یا اسکو لوٹا دو بیشک اللہ ہر چیز کا حساب کرنیوالا ہے ۶۰۷ اللہ اسکے سوا

اِلَّا هُوَ ۗ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۗ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۧ

کوئی معبود نہیں وہ ضرور تم کو قیامت کے دن تک جس میں کوئی شک نہیں جمع کریگا اور اللہ سے بڑھکر بات کا سچا کون ہے۔

جو اسلام کے خلاف انہوں نے کی ہے جاری نہ رکھ سکیں گے اللہ تعالیٰ آخرکار ان کو مغلوب کر کے روک دیگا اور جنگوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔

شفع — ۶۰۶ یشفع ۔ شفع کیلئے اور شفاعت کیلئے دیکھو ۸۱ ۔ یہاں مراد ہے کہ ایک شخص دوسرے کے ساتھ مل جائے اور اس کی اچھی یا بری بات میں مدد کرے (غ) اور ایک اور قول نقل کیا ہے کہ شفاعت سے مراد یہاں یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے کیلئے اچھا یا برا رستہ بنادے جس پر وہ چلے اور یوں اس کا شفیع بن جائے جیسا کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا من سَنَّ سُنَّةً حسنة فله اجرها واجر من عمل بها ومن سَنَّ سُنَّةً سيئة فعليه وزرها و وزر من عمل بها جو کوئی اچھی راہ نکالے اس کے لئے اس کا اجر ہے اور اس کا اجر بھی جو اس پر عمل کرے اور جو کوئی بری راہ نکالے اس پر اس کا بوجھ ہے اور اس کا بوجھ بھی جو اس پر عمل کرے (غ)۔

کفل ۔ کفیل — کِفل اور کفیل کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ایسا حظ جس میں کفایت ہو گویا وہ اس کے امر کا متکفل ہو جاتا ہے یؤتکم کفلین من رحمته (الحدید ۔ ۲۸) مگر امام راغب کہتے ہیں کہ یہاں کفل کے یہ معنی نہیں بلکہ وہ اس کفل سے مستعار ہے جو ردی شے کیلئے استعمال ہوتا ہے اور شدت کے معنی میں متعارف ہو گیا ہے گویا مراد یہ ہے کہ جو برے فعل میں دوسرے کا مددگار ہوتا ہے اور راستہ بناتا ہے وہ بھی اس فعل بد کے برے نتیجہ کی شدت کو پائیگا۔

قوت ۔ مقیت — مقیت ۔ قُوت سے ہے جو انسان کے بقا کا موجب ہے جمع اقوات ہے وقدر فیہا اقواتہا (حم السجدہ ۔ ۱۰) اور مقیت کی مراد ہے جو ہر چیز کو قوت دیتا اور اس کی حفاظت کرتا ہے اس لئے اس کے معنی مقتدر یا حافظ ہیں (غ)۔

جب یہ فرمایا کہ نبی اکیلا ہی جنگ کرنے کا مکلف ہے ۔ اگر دین اسلام کی حفاظت معرض خطر میں ہو تو بتایا کہ یہ ایک نیکی کا قائم کرنا ہے جو لوگ آیندہ اس پر عامل ہونگے وہ خود بھی اس سے فائدہ اٹھائینگے مگر ان کی اس نیکی کے ثواب کے مستحق محمد رسول اللہ صلعم بھی ہونگے ۔ ایسا ہی منافق جو بری راہیں نکالتے ہیں ان کا بوجھ بھی اٹھائیں گے جو بعد میں ان بری راہوں پر چلینگے ۔ گو وہ چلنے والے خود بھی اپنا بوجھ اٹھائیں گے۔

تحیۃ — ۶۰۷ تحیۃ کا مادہ حی یا حیاۃ ہے جس کے معنی زندگی ہیں ۔ اور تحیۃ اصل میں یہ ہے کہ دوسرے کو حیاك الله کہے یعنی زندگی کی دعا دے ۔ پھر ہر ایک دعا پر اس کا استعمال ہوا ہے اور ایک دوسرے کو ملنے پر جو دعا دی جاتی ہے وہ بھی تحیۃ ہے اور اسلام کا تحیۃ السلام علیکم ہے (غ) اور اس میں دعا بھی ہے حضرت عیسیٰ نے بھی حواریوں کو اسی سلام سے خطاب کیا تھا (لوقا ۲۴ : ۳۶) مسلمانوں نے

ع ۱۲ / ۴

مناقوں سے سلوک

۸۸ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ

سو تمہارے لئے کیا وجہ ہے کہ منافقوں کے بارہ میں دو گروہ بنو حالانکہ اللہ نے انکو اسکی وجہ سے اوندھا کر دیا جو انہوں نے کمایا کیا تم چاہتے ہو کہ اسے ہدایت کرو

۸۹ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا

جسے اللہ نے گمراہی میں چھوڑ دیا ہو اور جسکو اللہ گمراہ چھوڑے تو تو اسکے لئے کوئی رستہ نہ پائیگا ۸۰۸ وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے

فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اور یوں برابر ہو جاؤ سو ان میں سے کسی کو ولی نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں ۸۰۹

السلام علیکم کو ترک کر کے جس قدر طریق سلام کے نکالے ہیں وہ سب خلاف قرآن وسنت ہیں +

السلام علیکم کی سنت

پچھلی آیت میں جو اچھی راہ بتانے والے کو ہمیشہ کے ثواب کا مستحق ٹھہرایا تو یہاں دعائے ملاقات باہمی کا ذکر کر کے بتا دیا کہ چھوٹے چھوٹے امور میں بھی ایک انسان دوسرے کیلئے اچھی راہ قایم کرنے کا موجب ہو سکتا ہے پس فرمایا کہ دعائے ملاقات جو باہم میل جول میں دن رات تم کو دینی پڑتی ہے اس میں بھی بھلائی کی راہ اختیار کرو اور اپنے بھائی کی دعا سے بہتر دعا سے لوٹاؤ۔ کوئی السلام علیکم کہے تو جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہو جیسا کہ حدیث میں ہے اور یہ جو حکم ہے کہ چھوٹا بڑے کو پہلے السلام علیکم کہے تو اس میں بھی یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح وہ اپنے سے بڑے کی زیادہ دعا کا مستحق ہوگا اور آخر پر فرمایا کہ اللہ ہر چیز کا حساب کرنیوالا ہے تو مراد یہ ہے۔ کہ چھوٹی سے چھوٹی بھلائی کا بھی حساب رکھتا ہے اور اسے ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اور یوں یہ بھی بتا دیا کہ چھوٹی باتوں سے ہی بڑے بڑے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو حقیر مت سمجھو۔ مسلمانوں میں السلام علیکم باہمی محبت کو بڑھانے کا موجب ہے اور حدیث میں افشائے سلام کا حکم ہے خواہ اپنے مسلمان بھائی کو پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو مگر یہ سنت بھی مسلمانوں کے اندر سے متروک ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کے ترک کرنے میں پرانے اور نئے فیشن کے لوگ یکساں شریک ہیں +

رکس۔ ارکس

۸۰۸ ارکسہم۔ رَکس کے معنی ہیں کسی چیز کا سر کے بل اُلٹا کر دینا یا اس کے اول کا آخر کی طرف اُلٹا دینا پس۔ ارکسہم کے معنی ہیں ان کو ان کے کفر کی طرف لوٹا دیا (غ) +

منافقوں کے مختلف مدارج

بخاری مسلم وغیرہما نے زید بن ثابت سے روایت بیان کی ہے کہ جو لوگ اُحد کی جنگ میں رستہ سے واپس آ گئے تھے یعنی وہ تین سو آدمی جن کو عبد اللہ بن ابی رستہ سے واپس لے آیا تھا یہ آیت ان کے بارہ میں نازل ہوئی کسی نے کہا یہ عرینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے مدینہ کی چراگاہ پر ڈاکہ مارا تھا کسی نے کچھ خیال ظاہر کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ خود مدینہ میں اور مدینہ کے اردگرد منافقین کا ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا تھا جن کے نفاق کے مختلف مدارج تھے ان کا ذکر مجملاً یہاں کر دیا ہے پچھلے رکوع میں یہ ذکر تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ملکر جنگ نہیں کرتے بلکہ ان کے خلاف منصوبے کرتے ہیں۔ یہاں یہ بتایا کہ مسلمانوں کو ان سے کیا سلوک کرنا چاہئے +

منافقوں کا پہلا گروہ

۸۰۹ پہلے اس گروہ کا ذکر کیا جو باطن میں کافر ہیں مگر ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں انکے متعلق صرف یہی حکم دیا کہ ان میں سے کسی کو اپنا ولی نہ بناؤ یعنی ان کے ساتھ قرب ونصرت کا تعلق نہ رکھو۔ ہاں ظاہر میں مسلمانوں والا تعلق ان سے رکھو۔ اللہ کی راہ میں ہجرت سے مراد ایک تو دار الکفر سے نکلنا ہے جہاں فرائض مذہبی ادا نہ کرنے دیتے جاتے ہوں۔ دوسرے بموجب حدیث المہاجر من ھاجر ما نھی اللہ عنہ مہاجر وہ ہے جو ان باتوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔ تیسرے حفاظت دین کیلئے وطن کا ترک کرنا

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا

لیکن اگر وہ پھر جائیں تو ان کو پکڑو اور انکو قتل کرو جہاں کہیں انہیں پاؤ اور ان میں سے کسی کو نہ دلی

وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ ۹۰

اور نہ مددگار بناؤ[۱۰] سوائے ان لوگوں کے جو ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہو[۱۱] یا تمہارے پاس آئیں

حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ

اس حال میں کہ انکے سینے تنگ ہیں کہ تمہارے ساتھ جنگ کریں یا اپنی قوم کیساتھ جنگ کریں اور اگر اللہ چاہتا تو انکو تم پر قابو دے دیتا

فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ

سو وہ تم سے ضرور لڑتے پس اگر وہ تم سے کنارہ کش ہوں پھر تم سے جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی درخواست کریں تو اللہ نے

اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾

تمہارے لئے ان کے خلاف کوئی راہ نہیں رکھی[۱۲]

یا ان حالات کے مطابق جنگ کے لئے نکلنا ہی تیسری قسم کی ہجرت یہاں مراد معلوم ہوتی ہے ✦

دوسرا گروہ — ۱۰؎ یہاں اسی گروہ کی دوسری حالت کا ذکر ہے کہ درپردہ عداوت رکھتا ہوا وہ اب یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ علانیہ دین اسلام سے پھر کر دشمنوں کے ساتھ جا ملا ہے۔ ان کے لئے وہی حکم ہے جو کفار کے لئے حکم ہے۔ ایسے لوگ مدینہ کے اردگرد تھے۔ جو مسلمانوں کا زور غلبہ دیکھکر اظہار اسلام کرتے اور پھر موقعہ پاتے تو علی الاعلان اسلام سے منحرف ہو کر مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے جیسا کہ عرینہ نے کیا جنہوں نے اسلامی چراگاہ پر ڈاکہ مار کر مویشی لوٹ لئے اور محافظوں کو قتل کر دیا پس جو منافق علانیہ دشمنوں کے ساتھ ملکر مسلمانوں سے جنگ کرنے میں شامل ہوئے وہ اب دشمن ہوئے اور میدان جنگ میں مقابل نکل آنے کی وجہ سے قتل کی سزا کے مستحق ہوئے ✦

تیسرا گروہ — ۱۱؎ ان الفاظ میں منافقین کے ایک تیسرے گروہ کا ذکر ہے جو اسلام کے بعد پھر علی الاعلان کافر تو ہو گئے ہیں مگر ایسی قوم کے ساتھ جا ملے ہیں جس کا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ ہے۔ جیسے نبی کریم صلعم نے ہلال بن عویمر اسلمی سے معاہدہ کر لیا تھا کہ نہ وہ آپکے ساتھ ملکر قریش سے جنگ کرینگے اور نہ قریش سے ملکر آنحضرت صلعم کے خلاف جنگ کرینگے پس اگر کوئی شخص ایسی قوم سے جا ملے تو گو بوجہ عہد کی خلاف ورزی کے وہ قتل کرنے کے قابل ہو مگر معاہد قوم میں چلے جانے سے اسکے بھی وہی حقوق پیدا ہو گئے جو اس معاہد قوم کے ہیں ✦

حصر — ۱۲؎ حصرت حصر کے معنی تضیق یا تنگی ہیں۔ اور یہاں مراد ہے کہ ان کے سینے بخل اور بزدلی کی وجہ سے تنگ ہو گئے ہیں ✦

چوتھا گروہ — یہ چوتھے گروہ کا ذکر ہے جو دین اسلام سے پھر کر کسی معاہد قوم کی پناہ میں تو نہیں گئے مگر خود نہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم کے ساتھ یعنی کفار کے ساتھ۔ اور مسلمانوں سے صلح کی درخواست کریں تو ایسے لوگوں سے بھی جنگ جائز نہیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ مرتدین کیساتھ اسی وقت جنگ جائز ہے جب وہ یا مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ جا ملیں یا خود مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں لیکن اگر وہ مسلمانوں کیساتھ جنگ نہ کریں تو گو وہ مسلمانوں کیساتھ ملکر کفار سے بھی جنگ نہ کریں تاہم انکو مانا یا ان سے جنگ کرنا جائز نہیں۔ بنی مدلج کے ساتھ اسی حکم کے ماتحت صلح کی گئی۔ یہ حکم کبھی منسوخ نہیں ہوا ✦

مرتد کب قتل ہو سکتا ہے

۹۱ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ

تم کچھ اور لوگ پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں جب کبھی وہ فتنہ کیطرف لوٹائے جاتے ہیں

اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ

اس میں اوندھے گر جاتے ہیں پس اگر وہ تم سے کنارہ کش نہ ہوں اور (نہ) تم سے صلح کی درخواست کریں اور نہ اپنے ہاتھ روکیں تو ان کو پکڑو

۹۲ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ وَمَا

اور انکو قتل کرو جہاں انہیں پاؤ اور یہ وہ ہیں جنکے خلاف ہم نے تمکو کھلی دلیل دی ہے ۱۳ع اور کسی

كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

مومن کو شایاں نہیں کہ وہ مومن کو مار ڈالے مگر غلطی سے اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد

مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ

کرے اور خونبہا دے جو اسکے وارثوں کے سپرد کیا جائے سوائے اسکے کہ وہ معاف کر دیں ۱۴ع

۱۳ع بلا تحقیق قتل یا مقابلہ نے بچنا چاہئے۔

پانچواں گروہ

۱۳ع اس آیت میں ایک پانچویں گروہ کا ذکر ہے ان کی غرض صرف اسی قدر ہو کہ کبھی اسلام ظاہر کر دیں تا کہ مسلمانوں کے دشمنوں میں نہ گنے جائیں مگر حالت یہ ہے کہ جب کفار ان کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے بلاتے ہیں (فتنہ سے مراد یہاں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا ہی ہو دیکھو روح المعانی جہاں اس سے مراد قتال المسلمین لی گئی ہو) تو اس میں اوندھے منہ گر جاتے ہیں یعنی مسلمانوں کے ساتھ اپنے عہد و پیمان کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ مگر باایں ان کو بھی اس قدر موقعہ دیا ہو کہ اگر وہ پھر بھی مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے کنارہ کشی کریں اور صلح کی درخواست کریں اور عملاً مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے اپنے آپ کو روک دیں۔ تو ان کو کچھ نہ کہا جائے لیکن اگر ان باتوں میں سے کوئی بھی نہ کریں تو پھر بلاشبہ مسلمان حقدار ہیں کہ جہاں ان کو پائیں قتل کر دیں کیونکہ سوائے اس کے اسلام باقی نہیں رہ سکتا تھا اور مسلمان مار دیئے جاتے +

ودی ۔ وادی

دیۃ

۱۴ع دیۃ اس کا اصل وَدِیَ یَدِیُ سے ہو اور وَدْیٌ کے معنی بہنا ہیں اسی مادہ سے وادی ہو یعنی وہ مقام جس میں پانی بہتا ہے اور دیۃ میں واؤ کے عوض ھا لائی گئی ہے (ت) اور دِیَۃ خون کا معاوضہ ہو جو مقتول کے وارثوں کو دیا جاتا ہو +

مسلمان کا مسلمان کو غلطی سے مار دینا۔

جب منافقوں کے متعلق احکام کا ذکر کیا تو اب بعض ملتی جلتی صورتوں کا ذکر فرماتا ہو۔ اور وہ یہ کہ بعض وقت شبہ میں لوگ قتل ہو جاتے ہیں مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں مگر ہو سکتا ہے کہ یہ محض دھوکا دینے کے لئے ہو۔ اور ہو سکتا ہو کہ ایک شخص غلطی سے یہ سمجھ کر کہ ایک دشمن اس کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہو اسے قتل کر دے پس شروع یہاں سے کیا کہ مومن تو مومن کو کبھی قتل کر ہی نہیں سکتا ہاں غلطی سے بعض وقت ایسا ہو جاتا ہو کہ مومن کے ہاتھ سے مومن قتل ہو جاتا ہو مثلاً ایک قوم دشمن تھی اور مسلمانوں کے ساتھ برسر پیکار مگر ایک شخص ان میں سے مسلمان ہو گیا دوسرے نے اسے مسلمان نہیں سمجھا یا کسی اور کو مارنے کا ارادہ تھا غلطی سے وہ فعل اس پر واقع ہو گیا۔ اور بعض وقت اجتہاد میں خطا سے بھی ایسا ہو جاتا ہے کہ مومنوں میں جنگ واقع ہو جاتی ہو ایک شخص نیک نیتی سے حق اپنی طرف سمجھتا ہو دوسرا اپنی طرف جیسا کہ حضرت علی اور معاویہ کے معاملہ

فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ

پھر اگر (مقتول) ایسے لوگوں سے ہو جو تمہارے دشمن ہیں اور وہ مومن ہو تو ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہئے اور اگر ایسے لوگوں سے ہو

بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ

کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہو تو خون بہا دینا چاہئے جو اسکے وارثوں کے سپرد کیا جائے اور ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہئے پھر جو شخص نہ پائے

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَمَنْ ۹۳

تو دو مہینے کے متواتر روزے رکھے (تا کہ) اللہ اس پر رحمت سے متوجہ ہو اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے اور جو

يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَ

جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے تو اسکی سزا دوزخ ہے اسی میں رہیگا اور اللہ اس پر ناخوش ہوگا اور اس پر لعنت کریگا اور

اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا ۹۴

اور اس کے لئے بڑا عذاب تیار کریگا ۱۵ اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم اللہ کی راہ میں نکلو تو تحقیق کر لیا کرو ۱۶

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ

اور جو تمہیں السلام علیکم کہے اسے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں

میں ہوا یہ بھی قتل خطا کا رنگ ہے۔ مگر اس کا مفصل ذکر سورۃ الحجرات میں آئیگا جہاں دو مومن گروہوں کے باہم قتال کا ذکر آتا ہے +

مومن کا قتل عمد

۱۵ اس آیت کی شان نزول میں یہ روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک مومن کو قتل کر دیا پھر کفر کی طرف لوٹ گیا۔ مگر یہاں لفظ عام ہیں اس لئے یہاں یہ بحث ہوئی ہے کہ ایسے شخص کی توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں۔ الفاظ مذکورہ آیت سے عموماً یہ سمجھا گیا ہے کہ توبہ قبول نہیں ہوتی مگر چونکہ صراحت سے یہ بات ان الفاظ میں نہیں پائی جاتی کہ اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ اور قرآن کریم نے اصول یہ قائم کیا ہے کہ ہر امر میں توبہ قبول ہوتی ہے وانی لغفار لمن تاب (طٰہٰ ۲۰۔۸۲) اور قتل نفس کے بارہ میں ہے الا من تاب وآمن (الفرقان ۲۵۔۷۰) اور جن کفار نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا آخر خود نبی کریم صلعم نے ان کو معاف کر دیا اور وہ مسلمان ہوئے اس لئے یہ دعویٰ کہ قاتل کی توبہ قبول نہیں ہوتی قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔ ہاں ان الفاظ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص گویا کافر کے حکم میں ہے اور جس طرح یہاں قرآن شریف نے مومن کو قتل کرنے والے کو کافر کے حکم میں رکھا ہے اسی طرح حدیث نے مومن کو کافر کہنے والے کو کافر کے حکم میں رکھا ہے جیسا کہ بخاری کی اس حدیث میں ہے ایما رجل قال لاخیہ یا کافر فقد باء بہا احدھما یعنی جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہتا ہے تو وہ کفران دونوں میں سے ایک پر ضرور پڑتا ہے +

مومن کو کافر کہنا

خلود

خلود کے معنی ۳۹ میں بیان ہو چکے ہیں۔ اس موقعہ پر مفسرین نے بھی اس کے معنی لبا زمانہ قبول کئے ہیں والمراد بالخلود المکث الطویل (رض)

قتل بہانہ کفر نہیں بر بنائے جنگ ہے

۱۶ یہاں سمجھایا کہ گو چاروں طرف تمہارے دشمن پھیلے ہوتے ہیں تاہم جبتک یہ امر محقق نہ ہو جائے کہ ایک شخص تمہارا دشمن ہے اسے قتل نہ کرو۔ پچھلے رکوع سے ظاہر ہو چکا ہے اور قرآن شریف کے اور مقامات سے بھی ثابت ہے کہ کافر کو صرف اس حالت میں قتل کرنا

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ

تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو؟ سو اللہ کے پاس حصول مقصد کے سامان بہت ہیں تم بھی پہلے ایسے

مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝

ہی تھے پھر اللہ نے تم پر احسان کیا سو تحقیق کر لیا کرو بیشک اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے ۱۷۱

جائز ہے جب وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے والوں میں سے ہو۔ اس لئے عام الفاظ میں کہا کہ تحقیق کر لیا کرو کہ کون دشمن ہے اور کون نہیں اور صرف دشمن کو مارو دوسرے کو نہیں ✦

سلام

۱۷۱ سلام سے مراد تحیہ اسلامی ہے یعنی السلام علیکم کہنا جو ظاہر نشان اسلام کا ہے اور ایک مسلمان اس کے ذریعہ فوراً پہچان سکتا ہے کہ اس کا مخاطب مسلمان ہے یا نہیں ✦

مغنم۔ غنم

مغانم مَغنَم کی جمع ہے۔ ما یُغنَم۔ اور غَنَم اصل میں بکریوں کو کہتے ہیں اس لفظ سے واحد نہیں آتا اور واحد کے طور پر شاۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے (ت)، اور غُنم جو اس سے مصدر ہے اس کے معنی ہیں بکریوں کا پالینا اور فتح کر کے ان کا حاصل کر لینا پھر جو کچھ دشمن کی طرف سے فتح کے ذریعہ سے حاصل ہو اس پر یہ لفظ بولا گیا ہے (غ)، مگر مطلق الفوز بالشیء کے معنی میں بھی غُنم آیا ہے (ح۔ ذ) جہاں اس کی سند میں اشعار نقل کئے ہیں۔ اور حدیث میں ہے الصوم فی الشتاء الغنیمۃ الباردۃ جہاں غنیمۃ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے دوسری حدیث میں غنم بمعنی زیادت آیا ہے (ت)، اور یہاں بھی مغانم وسیع ہے ✦

دشمن قوم میں سے السلام علیکم کہنے والے کا حکم

یہاں اس مشتبہ حالت کا ذکر کیا ہے۔ جب قوم تو دشمن ہو مگر ایک شخص اس میں سے مسلمان ہو چکا ہے تو اس کے مسلمان ہونے کا ثبوت اسی قدر کافی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو السلام علیکم کہے اس صورت میں گو وہ دشمن قوم کا ایک جزو ہو مگر اسے قتل کرنا نہیں چاہئے بعض ایسے واقعات بھی ہوئے اور جب ایک شخص نے نبی کریم صلعم کے سامنے یہ عذر کیا کہ جس شخص نے اظہار اسلام کیا تھا وہ محض اپنی جان بچانے کیلئے تھا تو آپ نے فرمایا ھلا شققت قلبہ تو نے اس کا دل پھاڑ کر دیکھ لیا تھا کذالک کنتم من قبل میں یہ بتایا کہ تم بھی کلمہ شہادت کے اقرار سے اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ جو بات تمہارے لئے کافی تھی وہ دوسروں کے لئے بھی کافی ہے ✦

مال غنیمت کا خیال

دوسری بات جو یہاں فرمائی وہ یہ ہے کہ مال غنیمت کے لالچ سے کسی کو قتل نہ کرو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حصول مقصد کے اور بہتیرے سامان بنا دیئے ہیں۔ مال غنیمت کے خیال کو یہاں دنیا کا سامان کہا ہے۔ اور یوں مسلمانوں کو بتایا ہے کہ جو شخص مال غنیمت کا خیال دل میں لاتا ہے وہ خدا کی راہ میں جنگ نہیں کرتا ✦

السلام علیکم اسلام کا نشان ہے

یہاں قرآن شریف تو فرماتا ہے کہ السلام علیکم کہنے والے کو بھی یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں مگر آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ اگر سارے حالات بھی ایک شخص کے ایک مسلمان کے دیکھتے ہوں تو پھر بھی کفر کا فتویٰ لگانے سے نہیں ٹلتے۔ اور جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے محض السلام علیکم کہنے والے کے متعلق فرمایا تھا کہ تم نے کوئی اسکا دل پھاڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بالکل خلاف جب ایک شخص عقاید اسلامی کا اظہار کرتا ہے تو کہدیتے ہیں کہ یہ باتیں یہ منافقانہ کہتا ہے۔ مسلمان کی شناخت قرآن کریم نے تو اتنی موٹی قرار دی ہے کہ وہ السلام علیکم کہتا ہو اور بس اور آج علماء کی یہ حالت ہے کہ ایک شخص کے اقوال کو لیکر بال کی کھال اُتارتے ہیں اور تب صبر کرتے ہیں جب کا فر بنا لیتے ہیں ✦

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ ۹۵

دونوں برابر نہیں مومنوں میں سے وہ بیٹھے رہنے والے لوگ جنکو کوئی دکھ نہیں اور اپنے مالوں اور جانوں کے

اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى

ساتھ جہاد کرنیوالے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر

الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى

اللہ نے درجہ میں بزرگی دی ہے اور سب سے اللہ نے اچھا وعدہ کیا ہے اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں

الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ۙ دَرَجَاتٍ مِنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۹۶

پر بڑے اجر والی بزرگی بخشی ہے اپنے ہاں مرتبے اور حفاظت اور رحمت (بخشی ہے) اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنیوالا ہے

جہاد کی فضیلت

۱۸۷ جب یہ خطرات ساتھ لگے ہوئے تھے کہ غلطی سے کوئی مومن ہی قتل نہ ہو جائے تو بعض لوگ خیال کر لیتے کہ پھر ایسے حالات میں جہاد کرنے سے بہتر یہی ہے کہ انسان گھر میں ہی بیٹھ رہے۔ اس لئے فرمایا کہ جہاد بڑی افضل چیز ہے اور جہاد کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے نہ جہاد کرنے والوں پر بڑی فضیلت دی ہے۔ یہاں جہاد سے مراد صرف قتال لیکر اہل تشیع نے غلطی کھائی ہے اور کہا ہے کہ حضرت علی چونکہ حضرت ابوبکر کی نسبت زیادہ غزوات میں شامل ہوئے اس لئے وہ افضل ہوئے حالانکہ جہاد وسیع ہے خود نبی کریم صلعم بھی سب جنگوں میں شامل نہیں ہوئے مگر آپ کا کام اس سے بھی بالا تر تھا۔ حضرت ابوبکر کی خدمات دینی حضرت علی سے بہت بڑھکر ہیں اور وہ خدمات دینی عظیم الشان جہاد کا حکم رکھتی ہیں۔

جہاد نہ کرنیوالوں کا حکم

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محض جہاد کا نہ کرنا خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں۔ کیونکہ نہ جہاد کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے حسنےٰ کا وعدہ دیا ہے۔ جماعت اسلامی میں دونوں قسم کے لوگ رہینگے ایک وہ بلند مرتبہ لوگ جو جہاد میں لگے رہتے ہیں گو وہ اپنے دنیا کے کام بھی کرتے ہوں مگر ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی وقت اعلائے کلمۃ اللہ سے غافل نہیں ہوتے۔ ان کے مال اور ان کی جانیں دین اسلام کی خدمت کے لئے وقف ہوتی ہیں ان کا معاش کا سامان بھی خدمت دین کا ہی حصہ ہوتا ہے دوسرے وہ لوگ جو دنیا کے کاموں میں زیادہ منہمک رہتے ہیں ہاں احکام خداوندی کو بھی بجالاتے ہیں اور اپنے مالوں میں سے ضروری حق ادا کرتے رہتے ہیں دونوں کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ ان کا انجام اچھا ہوگا مگر جہاد کرنے والوں کے بلند مراتب سے ان دوسرے لوگوں کو کچھ نسبت نہیں۔ مگر یہ عامہ حالات کا ذکر ہے خاص صورتوں میں بعض وقت ضروریات قومی ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جب ہر ایک متنفس کیلئے جہاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے ان حالات میں قدم پیچھے ہٹانے والا عتاب کے نیچے ہوتا ہے۔ جیسا کہ جنگ تبوک میں جو لوگ بلا وجہ پیچھے رہ گئے تھے ان پر عتاب ہوا کیونکہ انہوں نے رسول اللہ صلعم کے حکم کی پروانہ کی۔ اور یوں اس میں شک نہیں کہ اوپر (۸۴) فرما دیا کہ قتال کیلئے مکلف صرف رسول اللہ صلعم ہیں باقی مومنوں کو صرف تحریض دلانا ہے کہ وہ ان بلند مراتب کو حاصل کرنے کی کوشش کریں جو جہاد سے ملتے ہیں اور ناقص حالت پر راضی نہ ہو جائیں۔

ضرر

غیر اولی الضرر ۔ ضرر سوء حال یا نقصان ہے خواہ انسان کے نفس میں علم یا فضل یا عفت کی کمی سے ہو اور خواہ اسکے بدن میں کسی عضو کے نہ ہونے سے یا کسی اور نقصان بدنی کی وجہ سے ہو اور خواہ حالت ظاہری میں مال اور جاہ کی کمی سے ہو (غ)

رکوع ۱۴ — ہجرت و جہاد نہ کرنیوالے

۹۷ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ

ان لوگوں کو جن کی فرشتے اس حال میں جان قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنیوالے ہیں وہ کہینگے تم کس حال میں تھے کہینگے ہم ملک میں

فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ

بے بس تھے (فرشتے) کہینگے کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے ایسے لوگوں کا ٹھکانا

۹۸ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ

دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے [۱۹] مگر وہ کمزور مرد اور عورتیں اور بچے

۹۹ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ۝ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ

کہ وہ کسی حیلہ کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ وہ راستہ پاسکتے ہیں [۲۰] سو انہیں اُمید ہے کہ اللہ معاف کرے

اولوالضرر سے مراد اور ان کا حکم

یہاں آخری دو قسم کا ضرر مراد ہے یعنی وہ لوگ جو اندھے یا لنگڑے وغیرہ ہونے کی وجہ سے یا اور کسی بدنی نقصان کے سبب سے جہاد میں نکلنے سے معذور ہیں اور وہ لوگ جو سامان نہ رکھنے کی وجہ سے معذور ہیں۔ اور جہاد کو وسیع معنی میں لیکر یعنی اس میں اعلائے کلمۃ اللہ کو شامل کر کے علم کی کمی والے لوگ بھی شامل ہوسکتے ہیں۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اولی الضرر مجاہدوں کے برابر ہیں اس لئے کہ اولی الضرر کی مختلف حالتیں ہیں ایسے لوگ جو جنگوں میں زخمی ہو کر بیکار ہو گئے ہیں یا خدمت دین میں بیمار ہو گئے ہیں۔ وہ خدا کے نزدیک ایسے ہی ہیں گویا کہ ان اعمال کو پھر بھی بجالا رہے ہیں۔ پھر ایسے لوگ جو دل میں تڑپ رکھتے ہیں مگر سامان ان کے پاس موجود نہیں وہ بھی قاعدین سے بہرحال بڑھکر ہیں اور عنداللہ اپنی نیت کے مطابق اجر حاصل کرنے والے ہیں۔ جیسا ایک قوم کا ذکر قرآن شریف میں ہے تولّوا واعینہم تفیض من الدمع حزناً الا یجدوا ما ینفقون (التوبۃ ۹-۹۲) ✦

[۱۹] ظالمی انفسہم یعنی نفس پر ظلم کرنے والے سے مراد وہ لوگ بھی ہوسکتے ہیں جو دل سے صداقت اسلام کے قائل ہو گئے مگر باوجود استطاعت کے ہجرت اختیار کر کے مسلمانوں کے ساتھ نہ ملے اور کفار کے غلبہ کی وجہ سے اظہار اسلام نہ کرسکے اور ایسے منافق بھی مراد ہوسکتے ہیں جو اظہار اسلام بھی کرتے اور پھر کفار کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ بھی کرتے مگر بظاہر مراد قسم اول کے لوگ ہی ہیں ✦

پچھلے رکوع کے آخر پر یہ بتایا تھا کہ خدا کی راہ میں جہاد کرنا بیٹھ رہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس لئے اب ان لوگوں کو سمجھاتا ہے جو کسی کمزوری کی وجہ سے اپنے آپ کو بالکل بے بس سمجھ لیتے ہیں۔ مکہ میں بھی بہتیرے ایسے لوگ تھے اور باہر بھی تھے۔ جو دل سے مسلمان تھے مگر اپنے گھربار کو نہ چھوڑ سکے۔ حالانکہ وہ یہ استطاعت رکھتے تھے کہ ہجرت کر کے دین اسلام کی خدمت بجالائیں۔ اور اس حالت سکون پر راضی ہو گئے۔ ان لوگوں کو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے کہا گیا ہے۔ پھر ان لوگوں کی کیا حالت ہے جو آج دین اسلام کے غلبہ سے مایوس ہو کر سکون پر راضی ہو بیٹھے ہیں اور دین اسلام کے پھیلانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے ✦

حول - حال

[۲۰] حیلۃ حَول سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا تغیر اور اس کا دوسرے سے انفصال اسی سے حال ہے جس میں انسان اپنے آپ کو پاتا ہے بلحاظ تغیرات جسمانی یا تغیرات نفس وغیرہ کے۔ اور یہی ہے حَول بمعنی قوت ہے جیسے لاحول ولاقوۃ میں اور اسی

وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا ۱۰۰

اور اللہ معاف کرنیوالا بخشنے والا ہے   اور جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے وہ زمین میں   بہتیری جگہ اور

كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ

کشایش پائیگا   اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول   کی طرف ہجرت کرتا ہوا اپنے گھر سے نکلے پھر اس کو موت

الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ع

آلے تو اس کا اجر ضرور اللہ کے ذمہ ہو چکا   اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۴۲۱

حال۔حیلة — سے حَالَ بمعنی حَالَ ہونیکے ہے حِیلَ بینھم و بین ما یشتھون (السبا ۳۴-۵۴) اور حیلة بھی اسی سے ہے جہاں واو یا سے بدل گئی ہے۔ اور اس کے معنی ہیں ما یُتَوَصَّلُ بہ الی حالةٍ ما فی خفیة یعنی وہ تدبیر جس سے خفیہ طور پر کسی حالت کو پہنچا جائے (غ) نیز دیکھو ۴۴۳ اور یہاں حیلة کا لفظ اس لئے استعمال فرمایا کہ کفار کے غلبہ اور اذیت کی وجہ سے کھلے طور پر ہجرت نہ کر سکتے تھے +

ہجرت کی استطاعت نہ رکھنے والے — پہلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو استطاعت کے باوجود کفار کے اندر سے نہ نکلے اور اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو فی الواقع نکلنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے نہ ان کو رستہ ملتا تھا یہاں رستہ نہ پانے سے مراد ہجرت کیلئے رستہ پانا ہے اور ولدان سے مراد بچے بھی ہو سکتے ہیں اور غلام لونڈیاں بھی دیکھو ۱۹۱ لکھا ہے کہ اس آیت کا علم مکہ میں ہوا تو جندب بن ضمرہ نے جو بہت بڈھے ہو گئے تھے اپنے بیٹوں سے کہا کہ مجھے اٹھا کر لے چلو کیونکہ میں ان لوگوں سے نہیں جن کو استطاعت نہ ہو سو وہ اس کو چارپائی پر ڈال کر لے چلے مگر ان کا انتقال رستہ میں ہی ہو گیا۔ صحابہ میں احکام الٰہی کی تعمیل کی یہ روح وہ نمونہ ہے جسکی نظیر دنیا کی اور کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی +

رغم — ۴۲۱ مراغم۔ رَغام اور رَغْم کے معنی مٹی یا باریک مٹی ہیں اسی سے محاورہ علیٰ رَغْمِ انفہ ہے جس سے مراد ذلت قبول کرنا ہے جیسے معقل بن یسار کی حدیث میں کہ انہوں نے نزول آیت پر اپنی ہمشیرہ کی شادی اسی خاوند سے جسنے طلاق دیدی تھی قبول کی تو کہا رغم انفی

مراغم — للہ تعالیٰ (ت) یعنی خدا کیلئے ذلت کو قبول کرتا ہوں۔ اور مجازاً مراغمة سے مراد کسی کو چھوڑنا اور ناراض ہونا ہے۔ اور مراغم بھاگنے کی جگہ اور جانے کی جگہ کو کہا جاتا ہے اور یہی یہاں مراد ہے (ت) +

ہجرت — مطلب یہ ہے کہ جب واقعی ہجرت کی ضرورت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ جگہ بھی مہیا کر دیتا ہے جیسے مسلمانوں کو مدینہ میں جگہ ملگئی یا اس سے پیشتر حبش میں جگہ ملگئی پس جب ضرورت ہجرت واقع ہو جائے اور بدون ہجرت چارہ کار نہ ہو تو پھر اس خیال سے ہجرت نہ کرنا کہ جگہ نہیں ملے گی صحیح نہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ اگر رستہ میں ہی مر جائے تو اس کا اجر اللہ پر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کی غرض تو خدمت دین تھی ایک شخص مر گیا خدمت کا موقعہ نہ ملا مگر اللہ تعالیٰ اس کو اس کی نیت کے مطابق اجر دیگا +

حالات موجودہ میں ہجرت۔ — اللہ تعالیٰ کا فرمان ہمیشہ ہی سچا ثابت ہوا ہے اور سچا ثابت ہوگا۔ پس یہ ناممکن ہے کہ واقعی تو ضرورت ہجرت ہو اور ہجرت محض اسلئے ترک کی جائے کہ ہجرت کی جگہ کوئی نہیں۔ یہ خدا کا وعدہ ہے کہ ہجرت کی جگہ ضرور ملجائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ پچھلے ایام میں جو تحریک ہجرت تھی۔ اس کیلئے فی الواقع ضرورت صحیحہ پیش نہ آئی تھی۔ روئے زمین پر چالیس کروڑ مسلمان ہیں اور کم و بیش سب عیسائی طاقتوں کے اثر کے نیچے ہیں۔ اب چالیس کروڑ کیلئے کوئی ہجرت کی جگہ نہیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی مشکلات کا حل یہی نہیں کہ وہ سب کے سب عیسائی طاقتوں کی حکومت سے ہجرت کر کے نکل جائیں اگر علم الٰہی میں یہ علاج ان مشکلات کا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کیلئے سامان بھی پیدا کر دیتا۔ ان سامانوں کا نہ ہونا یقینی شہادت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کی مشکلات کا علاج نہ ہجرت ہے اور نہ قتال جو بدون

۱۵ ع ۱۲

حالت جنگ میں نماز

۱۰۱ وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَوٰةِ ۖ

اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کو کم کرو

إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ۝

اگر تمہیں ڈر ہو کہ جو کافر ہیں وہ تمہیں تکلیف پہنچائینگے بیشک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں ۶۲۲

ہجرت ہو نہیں سکتا۔ بلکہ ان کا علاج اپنی اصلاح ہے جس کی طرف مسلمان متوجہ نہیں ہوتے اور اسلئے قدم قدم پر ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں +

قصر

۶۲۲ تقصروا من الصلوٰۃ۔ قصر کم کرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ تصریح نہیں کی کہ قصر ارکان صلوٰۃ میں ہو یا تعداد رکعات میں۔ مگر

قصر صلوٰۃ سے مراد

سنت صحیحہ سے سفر کی حالت میں قصر رکعات میں ہی ثابت ہے۔ من الصلوٰۃ کہکر بتا دیا کہ یہ قصر بعض نمازوں میں ہے سب میں نہیں چنانچہ ظہر۔ عصر۔ عشا میں ہی چار رکعت کی جگہ دو رکعت سفر میں پڑھی جاتی ہیں قصر صلوٰۃ کی ضرورت اس صورت میں فرمائی ہے جب حالت سفر ہو۔ ضرب فی الارض کے معنی کیلئے دیکھو ۵۳۸ سفر کی حالت کیا ہے اس کیلئے دیکھو ۲۲۵ یہاں گو قصر صلوٰۃ ایک رخصت

سفر میں قصر ضروری ہے

کے رنگ میں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے جب خود اس کو ایک ضرورت کے مقام پر رکھکر رخصت دی ہے تو اس سے فائدہ نہ اُٹھانا بھی درست نہیں اور نبی کریم صلعم سے سفر میں قصر صلوٰۃ پر ہمیشگی اختیار کرنا ثابت ہے اور یہ حدیث کہ آپ قصر بھی کرتے تھے اور پورا بھی کرتے تھے صحیح نہیں جیسا کہ ابن قیم نے لکھا ہے پس سفر میں نماز کو قصر کرنا چاہئیے یعنی صرف فرض ادا کرے اور وہ بھی جن نمازوں میں چار ہیں ان میں صرف دو ادا کرے جب فرض کم ہو گئے تو نوافل خود ساقط ہو گئے۔ فجر کی دو سنتیں جو موکدہ ہیں اور نبی کریم صلعم نے کبھی ترک نہیں کیں اور وتر ادا کرے۔ اور اس آیت کا تعلق ماقبل سے یہ ہے کہ جب جہاد اور ہجرت کی تحریص دلائی اور ان پر زور دیا تو یہ صورتیں سفر کو چاہتی ہیں پس نماز سفر کا حکم اور اس کے ساتھ ہی نماز جنگ کا حکم بیان فرمادیا +

کیا قصر صرف حالت خوف میں ہے

مگر علاوہ سفر کے یہاں قصر کیلئے بظاہر ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ کافروں کے تکلیف پہنچانے کا خوف ہو۔ تو کیا قصر نماز صرف خوف کی حالت میں ہے اور امن کی حالت میں نہیں؟ جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا ہے رسول اللہ صلعم سے ہر قسم کے سفر میں قصر ثابت ہے۔ اور اسی پر اُمت کا تعامل ہے۔ یعلی بن اُمیہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ سے سوال کیا کہ باوجود حالت امن میں ہونے کے آپ قصر کیوں کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ جس بات پر تمہیں تعجب ہوا ہے اس پر مجھے بھی تعجب ہوا اور میں نے رسول اللہ صلعم سے یہی دریافت کیا تو آپ نے فرمایا صدقۃ تصدق اللّٰہ بہا علیکم فاقبلوا صدقتہ یعنی قصر صلوٰۃ ایک صدقہ ہے جو اللہ نے تم پر کیا پس اس کے صدقہ کو قبول کرو۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ قصر صلوٰۃ یعنی چار کی بجائے دو رکعت زمن خوف سے مشروط نہیں۔ پس اس حدیث اور سنت صحیحہ ثابتہ سے معلوم ہوا کہ قصر صلوٰۃ دو طرح پر ہے ایک چار رکعت کی بجائے

قصر دو طرح پر ہے قصر سفر اور قصر خوف

دو رکعت ظہر۔ عصر۔ عشاء میں۔ اور یہ صرف حالت سفر سے مشروط ہے اور دوسرا وہ قصر جس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے۔ جو حالت خوف سے مشروط ہے یعنی دو رکعت کی بجائے ایک رکعت با جماعت ادا کرکے دشمن کے مقابلہ پر چلا جانا۔ اور قرآن کریم کے الفاظ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ کفار کے تکلیف پہنچانے کے خوف کا یوں کوئی ازالہ نہیں ہو سکتا کہ چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھ لی جائیں۔ صرف اتنے وقت کی کمی خوف کا علاج نہیں۔ دشمن اتنی دیر میں کہ دو رکعت ادا کی جائیں حملہ کرکے کام تمام کر دیگا بلکہ خوف کا علاج وہی ہے جو خود اگلی آیت میں بیان فرمایا کہ ایک گروہ دشمن کے مقابل پر رہے اور جب دوسرا گروہ ایک رکعت ادا کرکے دشمن کے مقابل پر چلا جائے تو پہلا گروہ امام کے ساتھ دوسری رکعت با جماعت ادا کرلے تا دشمن نماز پڑھنے والوں پر حملہ ہی نہ کر سکے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بجائے چار کے امام نے بھی صرف دو رکعت ادا کی ہیں اور مقتدیوں نے امام کے ساتھ صرف ایک

وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَوٰةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا ۱۰۲

اور جب تو انکے درمیان ہو پھر ان کیلئے نماز قایم کرے تو چاہیئے کہ ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو اور چاہیئے کہ وہ اپنے

أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا

ہتھیار لئے رہیں۔ پھر جب سجدہ کر چکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں اور چاہیئے کہ ایک دوسرا گروہ جنہوں نے نماز نہیں پڑھی آئے

فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ

پھر وہ تیرے ساتھ نماز پڑھیں اور وہ اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار لئے رہیں کافر چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں

عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ

اور اپنے اسباب سے غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی آپڑیں اور تم پر کوئی

عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰٓ أَن تَضَعُوٓا أَسْلِحَتَكُمْ

گناہ نہیں کہ اگر تمہیں بارش کی وجہ سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو اپنے ہتھیار اُتار رکھو

وَخُذُوا حِذْرَكُمْ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ○

اور اپنا بچاؤ لئے رہو یقیناً اللہ نے کافروں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے [۶۲۳]

ایک رکعت ادا کی ہے۔ پس چار رکعت کی بجائے دو رکعت کا ہونا شرط اول کے ماتحت ہے یعنی سفر کی وجہ سے۔ اور دو رکعت کی بجائے صرف ایک ایک رکعت باجماعت ادا کرنا شرط دوم کی وجہ سے ہے یعنی دشمن کے خوف سے۔ اور دشمن کے خوف کا یہی دوسرا قصر علاج ہے نہ پہلا قصر۔ اگر محض چار رکعت کی جگہ دو رکعت دشمن کے خوف کا علاج ہوتا۔ تو یہ دوسرا علاج نہ بتایا جاتا پس اس سے صاف ثابت ہے کہ قرآن کریم کا منشا یہی تھا جو رسول اللہ صلعم نے سمجھا اور عمل کر دکھایا یعنی سفر کی وجہ سے چار رکعت کی جگہ دو رکعت ادا کرو۔ اور خوف کی وجہ سے دو رکعت کی جگہ باجماعت صرف ایک رکعت ادا کرو۔ اس سے اگر ایک طرف قرآن کا پرحکمت کلام ہونا معلوم ہوتا ہے تو دوسری طرف نبی کریم صلعم کا وحی خفی سے اس کے باریک باریک مطالب پر آگاہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے من الصلوٰۃ کے بعد وقف اسی معنی کا موید ہے۔

عین حالت جنگ اور میدان جنگ میں ہونے کی صورتیں الگ الگ ہیں۔

۶۲۳ حالت جنگ میں جب دشمن کا خوف ہو ایک صورت فان خفتم فرجالا او رکبانا (البقرۃ ۲۔ ۲۳۹) ہے جیسا کہ ۳۰۸ میں دکھایا گیا وہ ایسے خوف کی حالت ہے۔ جب جماعت کا قیام نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری صورت یہاں بیان فرمائی ہے۔ اسی لئے یہاں فرمایا فاقمت لھم الصلوٰۃ یعنی ایسی حالت ہو کہ نماز باجماعت ہو سکتی ہے۔ ہاں دشمن کی طرف سے حملہ کا خوف ہے اور ظاہر ہے کہ میدان جنگ میں دشمن ایسے موقعہ کو ہاتھ سے نہ دے گا جب مسلمان مشغول نماز ہوں پس یہ وہ صورت ہے جب میدان جنگ میں ہونے کی وجہ سے دشمن کے حملہ کا خوف ہے مگر فی الواقع حالت جنگ نہیں کیونکہ اس میں اس قدر اہتمام بھی مشکل ہے۔ اور اسی لئے یہاں بارش وغیرہ کی صورت میں ہتھیاروں کے

۱۰۳ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا

پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرو۔ اور جب

اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ○

مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو (اصلی حالت پر) قائم کرو بیشک نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں فرض کی گئی ہے ۲۴ے

۱۰۴ وَلَا تَهِنُوْا فِى ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ

اور (دشمن) قوم کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو اگر تم دکھ اٹھاتے ہو تو جس طرح تم دکھ اٹھاتے ہو وہ بھی دکھ اٹھاتے ہیں اور

تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ ع

تم اللہ سے وہ امیدیں رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۲۵ے

رکھ دینے کی بھی اجازت ہے +

غزوہ ذات الرقاع میں میدان جنگ میں نماز۔

روایات میں اس بارہ میں اختلاف ہے کہ اس نماز کی کیفیت کیا تھی۔ مگر ترجیح اس روایت کو ہے جسے بخاری اور مسلم اور اصحاب سنن ثلاثہ اور امام احمد نے بیان کیا ہو اور جس کے مطابق حضرت علی۔ ابن عباس۔ ابن مسعود و دیگر صحابہ کا مذہب ہے، یعنی یہ کہ غزوہ ذات الرقاع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں نماز ادا کی کہ ایک گروہ نے آپ کے پیچھے صف باندھی اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابل پر رہا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت ادا کر چکے تو آپ حالت قیام میں رہے یہاں تک کہ جو گروہ آپ کے پیچھے تھا وہ دوسری رکعت ادا کرکے پیچھے ہٹ گیا اور دشمن کے مقابل پر ہو گیا اور دوسرا گروہ جو پہلے دشمن کے مقابل پر رہا تھا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑا ہوا اور آپ نے دوسری رکعت اس کے ساتھ ادا کی اور جب آپ نے سلام پھیرا تو اس گروہ نے اٹھکر بقیہ رکعت پوری کرلی۔ بعض روایات میں صرف ایک ہی رکعت کا ذکر ہے یعنی مقتدیوں نے صرف ایک ہی رکعت باجماعت ادا کرکے نماز ختم کرلی +

۲۴ے یہاں اس حالت کی نماز کو قضائے صلوٰۃ سے تعبیر کیا ہو۔ اور حالت امن کی نماز کو اقامت صلوٰۃ سے تعبیر کیا کیونکہ اقامت میں سب شرائط کا پورا کرنا آتا ہے۔ جو حالت خوف میں نہیں ہو سکتیں جس سے معلوم ہوا کہ نماز سفر بحالت خوف میں اور نماز سفر بحالت امن میں فرق صرف یہ ہے کہ حالت خوف میں سب شرائط پوری نہیں ہو سکتیں اور یہ گویا دوسری قسم کا قصر ہے۔ نہ قصر تعداد رکعات۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے عام لفظ قصر صلوٰۃ ہی اختیار کیا ہے اور تعداد رکعات میں قصر کا ذکر نہیں کیا۔ گویا دو رکعت کی بجائے ایک رکعت جماعت کے ساتھ ادا کرنا بھی ایک رنگ قصر ہے۔ اور اگر ایک ہی رکعت کا ادا کرنا لیا جائے تو یہ قصر ظاہر ہو +

۲۵ے اس آیت کا تعلق ماقبل سے یہ ہو کہ وہاں دشمن سے اپنا بچاؤ کرنے کا ذکر ہے حتّٰی کہ نماز کے وقت بھی اپنا بچاؤ کر لینا چاہئے اور یہاں یہ ذکر ہے کہ دشمن کا پیچھا کرنا ضروری ہو۔ کیونکہ اگر دشمن کا پیچھا کرنے میں ہشیاری دکھائی جائے تو یہ خود اپنے بچاؤ کا سامان ہو اور یہ جو فرمایا کہ تم وہ امید رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے تو یہ ان صریح پیشگوئیوں کی طرف اشارہ ہے جن میں اسلام کے آخری غلبہ کی خبر دی گئی تھی اور جو مسلمانوں کیلئے قوت کا موجب تھیں +

ع ۱۶ — منافقوں کی دغابازی

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ ۱۰۵

یقیناً ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے تاکہ تو لوگوں کے درمیان اسکے مطابق فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے علم دیا ہے

وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ۝ وَٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ ۱۰۶

اور دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ بننا ۷۲۶ اور اللہ کی حفاظت مانگو

رؤیۃ — ۷۲۶ اراك الله ۔ کے معنی یہاں علمك الله ہیں جو اللہ نے تجھے علم دیا ہے (غ)، اور رؤیۃ بھی جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو تو اس کے معنی علم ہوتے ہیں (غ)۔

خیانۃ، خوّان — خائن۔ خیانت کرنے والا۔ اور خیانۃ اور نفاق اصل میں ایک ہیں خیانت باعتبار عہد و امانت کہا جاتا ہے اور نفاق باعتبار دین۔ اور خیانۃ سے مراد ہے حق کی مخالفت جو خفیہ طور پر نقض عہد سے کی جائے (غ)، اور خوّان جو آگے آتا ہے اس کا مبالغہ کا صیغہ ہے۔

خصم خصیم — خصیم۔ خَصْم جھگڑا کرنے کو کہتے ہیں۔ اور خصیم وہ ہے جو کثرت سے مخاصمت کرے (غ)۔

طعمہ بن ابیرق کا واقعہ — منافق جو اسلام کا اظہار کرتے تھے۔ تو وہ سمجھتے تھے کہ ضرورت کے وقت مسلمان کہلانے کی وجہ سے ہماری رعایت ہوگی۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں تو سخت ترین دشمن کے ساتھ اور بڑے سے بڑے دوست کے خلاف بھی عدل کا حکم تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کے بارے میں یہ خاص حکم اپنے نبی پر اتارا۔ تاکہ ان کی یہ جھوٹی اُمیدیں منقطع ہو جائیں ایک خاص واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایک انصاری طعمہ بن ابیرق تھا اس نے ایک دوسرے شخص کے گھر سے ایک زرہ چرائی اور پھر اس کو ایک یہودی کے پاس رکھدیا۔ جب تحقیقات شروع ہوئی اور زرہ کا اثر طعمہ کے گھر تک پہنچا اور آخر وہ یہودی کے گھر سے برآمد ہوئی تو اس نے طعمہ کا پتہ بتایا مگر اس نے انکار کیا اور اس کے ساتھیوں نے بھی رسول اللہ صلعم کے سامنے اس کی بریت کی مگر آپنے فیصلہ اس کے خلاف دیا۔ اور اسی واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

آنحضرت کی فوق العادۃ امانت و دیانت — ان الفاظ سے کہ دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ بننا یہ قیاس کر لینا کہ آپنے کوئی طرفداری کی ہوگی ایک نادانی کا خیال ہے کسی حکم کا جو آپ کو قرآن میں دیا گیا ہے ہرگز یہ منشا نہیں کہ آپ نے اس کی خلاف ورزی کی تھی اس لئے اس حکم کی ضرورت پیش آئی۔ بلکہ اُمت کو تعلیم دینا مقصود ہے۔ ورنہ آپ خود اعلیٰ سے اعلیٰ اصول پر قایم تھے اقم الصلوٰۃ کا حکم بار بار کیوں دیا جاتا تھا کیا اس لئے کہ آپ نے نماز ترک کر دی تھی؟ آپنے جیسا کہ اوپر کی روایت سے ظاہر ہے خائن کی طرف سے جھگڑا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے خلاف فیصلہ کیا تھا پس ان الفاظ کے لانے کا منشا، منافقین کی جھوٹی اُمیدوں کا منقطع کرنا تھا۔ نبی کریم صلعم کی صداقت اور دیانت تو قبل از نبوت بھی عرب میں مسلم تھی۔ اگر آپ میں اس قسم کی طرفداری کا مادہ ہوتا تو عرب ایسی اکھڑ قوم آپکو الامین کا خطاب کیونکر دیتی۔ پس اگر قبل از نبوت بھی آپ کی امانت و دیانت پر کوئی شخص حرف نہ رکھ سکتا تھا تو بعد از نبوت ان باتوں کا قیاس آپکے خلاف کرنا صریح واقعات کا انکار کرنا ہے۔ ہاں بلاشبہ آپ کی زندگی میں ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ ان کے اندر بڑے بڑے لوگوں کا قدم ڈگمگا جاتا۔ مگر آپ کی فوق العادت دیانت اور امانت میں ایسے موقعوں پر کبھی بال برابر بھی فرق نہیں آیا۔ ایسے ہی مواقع پر وحی آلٰہی نے بھی آپ کی دستگیری فرمائی ہے چنانچہ خود طعمہ والے واقعہ سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب یہودیوں کے تعلقات آپکے ساتھ کھلی دشمنی کے ہوچکے ہیں، ادھر اسلام کو اس قدر مصائب اور مشکلات کا سامنا ہے۔ کہ ایک ایک متنفس جو اس کی حمایت کیلئے کھڑا ہو سکتا ہو اس کا وجود از بس غنیمت ہے۔ ادھر بہت سے گواہ شہادت دینے والے موجود ہیں جو طعمہ کو بری ٹھہرا رہے ہیں۔ مگر نبی کریم صلعم کو نہ یہ پروا ہے کہ یہودی ہمارے دشمن ہیں نہ یہ کہ طعمہ کو ملزم قرار دینے

۱۰۷ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ

بیشک اللہ حفاظت کرنیوالا رحم کرنے والا ہے[۶۲۷] اور ان کی طرف سے مت جھگڑ جو اپنے نفسوں کی خیانت کرتے ہیں

۱۰۸ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۝ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ

اللہ بڑے خیانت کرنے والے گنہگار کو ہرگز دوست نہیں رکھتا یہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں اور اللہ سے نہیں

مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا

چھپ سکتے اور وہ انکے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو ایسے مشورے کرتے ہیں جس بات کو وہ پسند نہیں کرتا۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں

۱۰۹ يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ۝ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا قف

اللہ اسکا احاطہ کئے ہوئے ہے دیکھو تم وہ لوگ ہو جو دنیا کی زندگی میں ان کی طرف سے جھگڑتے ہو

۱۱۰ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝ وَمَنْ

پر قیامت کے دن کون ان کی طرف سے اللہ کے ساتھ جھگڑے گا یا کون ان کا وکیل بنے گا[۶۲۸] اور جو شخص

۱۱۱ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَ

بدی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے بخشش چاہے وہ اللہ کو بخشنے والا رحم کرنے والا پائے گا اور

مَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ اپنی جان پر ہی اس کا وبال لیتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

سے اس وقت بہت سے مسلمان اور بھی اس کے ساتھ ہاتھ سے جاتے ہیں۔ آپ عین حق و انصاف کے مطابق یہودی کے حق میں اور مسلمان کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں۔ ایسے عدل و انصاف کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کوئی اور ملتی ہے تو پیش کی جائے۔

۶۲۷ جب ایک طرف اس اصول پر آپ کو قائم کیا کہ کسی خائن دغاباز کی حمایت آپ نہ کرینگے تو مشکلات کا تو اور بھی اضافہ ہوگیا۔ اس لئے فرمایا کہ مشکلات میں اللہ کی حفاظت چاہو۔ استغفار کے ان معنوں کے لئے دیکھو ۲۵۸ و ۳۸۸ خدا کی حفاظت کا کون انسان محتاج نہیں بلکہ جس نے ایک آن کے لئے بھی اپنے آپ کو خدا کی مدد سے مستغنی سمجھا وہ ہلاک ہوگیا یا مراد یہ ہے کہ جو غلطی کرتے ہیں ان کے لئے استغفار کرو اور سیاق اس کو بھی چاہتا ہے۔

۶۲۸ یہ ایسے لوگوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو اپنی کم فہمی سے منافقوں کے دھوکہ میں آکر ان کے حامی بن جاتے تھے جیسا طعمہ والے واقعہ میں طعمہ کے رشتہ داروں نے اس کی حمایت کی تو ایسے لوگوں کو سمجھایا ہے کہ یہ منافق درپردہ دشمن اسلام ہیں اور حق اور راستی سے دور پڑے ہوئے ہیں تم انکے حامی نہ بنو بلکہ حق کے حامی بنو۔ آیت ۱۰۷ میں ولا تجادل میں خطاب عام ہے جیسا کہ آیت ۱۰۹ کے الفاظ ھآنتم ھؤلاء جادلتم عنھم جمع لاکر صاف کردیا۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـــًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا ۱۱۲

اور جو شخص خود قصور یا گناہ کرے پھر ایک بے گناہ پر اس کی تہمت لگائے یقیناً وہ اپنے اوپر بہتان اور کھلے گناہ کا

مُّبِيْنًا ۧ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ ۱۱۳

بوجھ لیتا ہے ۴۲۹ اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ قصد کر ہی چکا تھا کہ تجھے

ع ۱۴ منافقوں کی اسلام وتباہ کرنے کی کوششیں

يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ

ہلاک کر دیں اور وہ اپنی ہی جانوں کو ہلاک کرتے ہیں اور تجھے کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اللہ نے تجھ پر

الثلثة

عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝

کتاب اور حکمت نازل کی اور تجھے وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے ۴۳۰

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىھُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ۭ ۱۱۴

انکے بہت سے خفیہ مشوروں میں کوئی بھلائی نہیں سوائے اسکے کہ کوئی خیرات یا بھلے کام یا لوگوں میں اصلاح کیلئے حکم دے

خطیئۃ اور اثم میں فرق

۴۲۹ خطیئۃ۔ اور اثم کے معنی کے لئے دیکھو ۱۰۵ و ۱۰۸ بلحاظ ان کے اصلی معنی کے فرق یہ ہے کہ خطیئۃ وہ ہے جو بلا عمد سرزد ہو اور اثم وہ ہے جو عمد سے ہو اور یہی فرق ابن جریر نے کیا ہے۔ یا خطیئۃ وہ ہے جس کا اثر انسان کی اپنی ذات تک محدود ہو اور اثم وہ جس کا اثر دوسرے پر پڑے۔

اس قسم کی کمینہ حرکت کو کہ انسان خود برا کام کرے اور دوسرے کے ذمہ لگا دے قرآن کریم نے منافقوں کی طرف منسوب کیا ہے حتی کہ ایک یہودی کے متعلق بھی یہ جائز نہ تھا کہ خود بُرے فعل کا ارتکاب کرکے اس کے سر پر وہ تھوپا جاتا۔ یہ تو وہ اخلاق تھے جو قرآن کریم نے دشمنوں تک کے متعلق سکھائے تھے مگر آج کتنے مسلمان ہیں جو اپنے بھائیوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ اور آج غیر مسلموں کا مال لے لینا تو ایک طرف رہا مسلمان بھائیوں پر کفر کے فتوے لگا کر ان کے مال بھی بالباطل لے لینا جائز قرار دیا جاتا ہے اس سے بڑھکر کیا خیانت ہوگی۔

اضلال

۴۳۰ یضلوک۔ اضلال کے ایک معنی اِھلاک بھی آتے ہیں یعنی ہلاک کرنا اَضَلَّہٗ۔ ضَیَّعَہٗ واھلکہ (ت) یہی معنی یہاں مراد ہیں جس طرح ان المجرمین فی ضلال وسعر (القمر ۵۴: ۴۷) میں ضلال کے معنی ہلاکت ہیں (ت)۔ کیونکہ جب ان کے قصد اضلال کا ذکر کیا تو جواب میں تسلی کے طور پر فرمایا کہ تجھے کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ اور اس سے پہلے اور پیچھے بھی منافقوں کے خفیہ مشوروں اور ان کے منصوبوں کا ہی ذکر ہے پس سیاق وسباق عبارت کے لحاظ سے یہی معنی درست ہیں۔ اور اگر گمراہ کرنا معنی لئے جائیں تو بھی کوئی ہرج نہیں۔

یہاں یہ بتایا کہ منافق صرف اپنی کمزوری ہی نہیں دکھاتے کہ جنگ سے پیچھے ہٹتے ہوں بلکہ وہ اسلام کے چھپے ہوئے دشمن ہیں اور ہمیشہ اسلام کو تباہ کرنے کے منصوبے سوچتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی تسلی دی کہ پیغمبر کو کتاب وحکمت دیکر بھیجا گیا ہے جس کی اس نے دنیا میں تعلیم دینی ہے پس وہ ہلاک نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری جگہ فرمایا وھموا بما لم ینالوا (التوبۃ ۹: ۷۴) جو کچھ

۱۱۵ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَ

اور جو شخص اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ایسا کرے گا اسے ہم بہت بڑا اجر دینگے ۵۳۱ اور

مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ

جو شخص رسول کی مخالفت کرے اسکے بعد کہ اس کیلئے حق کھل چکا اور مومنوں کے راستے کے سوائے اور رستہ

۱۱۶ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ع اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ

ع ۱۸ ۱۱ ۱۵

شرک اور توحید کا مقابلہ

کی پیروی کرے ہم اسکا اسی سے تعلق کر دینگے جس سے وہ تعلق کرتا ہے اور اسے جہنم میں داخل کرینگے اور وہ بُری جگہ ہے ۵۳۲ بیشک اللہ نہیں بخشتا

قصد یہ منافق کرتے ہیں اس مقصد کو کبھی نہیں پا سکینگے +

تناجی ۔ نجوٰی

۵۳۱ نجوٰی ۔ اس کا اصل بھی وہی ہے جو نجاۃ کا اصل ہے ۔ اور تناجیتہ کے معنی ہیں اس سے خفیہ طور پر مشورہ کیا اور اس کی اصل نجوۃ سے ہے جسکے معنی بلند زمین ہیں گویا وہاں اس کے ساتھ تنہا ہوا ۔ اسی سے نجوٰی مصدر ہے یعنی خفیہ مشورہ کرنا +

نیک بات کا مشورہ

یہاں منافقوں کے خفیہ مشوروں کا ذکر کرکے فرمایا کہ ان کے خفیہ مشوروں میں بھلائی کی کوئی بات تو ہوتی نہیں ۔ کیونکہ وہ جب چھپکر مشورہ کرتے ہیں تو نقصان پہنچانے کے لئے ہی کرتے ہیں اسی لئے یہاں کثیر کا لفظ استعمال فرمایا ہے ۔ اور پھر فرمایا کہ بھلائی کا کام تو یہ ہے کہ کوئی شخص دوسروں کو صدقات دینے کے لئے کہے یا نیک بات کی ہدایت کرے یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا کوئی کام کرے مگر یہ جب ملتے ہیں تو ان امور کے خلاف ہی کچھ کرتے ہیں ۔

اصلاح بین الناس

اصلاح بین الناس کی حدیث میں بڑی تعریف آئی ہے یہانتک کہ ایک حدیث میں جس کو ابو داؤد ترمذی احمد نے بیان کیا ہے یہ لفظ آتے ہیں کہ نبی کریم صلعم نے صحابہ کو فرمایا کہ میں تم کو ایسے عمل کی خبر دوں جس کا درجہ نماز اور روزے سے بڑھ کر ہے ۔ صحابہ نے عرض کیا ہاں تو فرمایا کہ لوگوں میں اصلاح کرنا صرف مسلمانوں میں نہیں کہا بلکہ سب لوگوں میں ۔ آج کل مسلمانوں کو اس نصیحت پر عمل کی بہت ضرورت ہے ۔ کیونکہ ترقی کی جڑ اتفاق اور اتحاد ہے آج ان میں تفرقہ ڈلوانے والے بہت ہیں مگر اصلاح کرنیوالوں کا وجود کالعدم ہے +

اس آیت میں بھلائی کی ان سب قسموں کو جو ایک انسان دوسرے کے ساتھ کرسکتا ہے جمع کر دیا ہے ۔ اول صدقہ رکھا یعنی جو مالی امداد کا محتاج ہو اس کو مالی مدد دینا ۔ دوسری قسم کی بھلائی یہ ہے کہ انسان کسی کو اچھی راہ پر ڈال دے یعنی اسے معروف کا حکم دے ۔ اور تیسری یہ کہ فساد کو دور کرکے اصلاح کردے ۔ یہ وہ کام تھا جو محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے ساتھی کر رہے تھے ۔

تولیۃ

اللہ تعالٰی کا انسان سے معاملہ اسکے عمل کے مطابق ہوتا ہے ۔

۵۳۲ نولّہ ما تولّی ۔ تولیۃ ۔ دوسرے کے ساتھ قرب کا تعلق پیدا کرنا ہے ۔ پس نولہ ما تولی کے معنی ہوئے ہم اس کا تعلق اسی کے ساتھ ہونے دیں گے جس کے ساتھ وہ خود تعلق پیدا کرتا ہے اور انسان کے بارے میں اللہ تعالٰی کا قانون قدرت یوں ہی نظر آتا ہے کہ انسان جس سے تعلق پیدا کرنا چاہے اس سے اس کا لگاؤ ہو جاتا ہے ۔ نیکوں کے ساتھ تعلق اور محبت پیدا کرے ان کے ساتھ ہو جاتا ہے ۔ بدوں کے ساتھ کرے تو ان سے پس جب ایک گروہ نے باوجود ہدایت کے کھل جانے کے ۔ دن رات مسلمانوں میں رہنے کے ۔ رسول اللہ صلعم کی دشمنی کے طریق کو اختیار کر لیا تو خدا ان کو مجبور کرکے دوسری راہ پر نہیں ڈالتا بلکہ اس کے قانون قدرت کے مطابق ان کو پھر وہی راہ اچھی لگتی ہے جس کا انجام جہنم ہے یا یہ محاورہ ولیت وجھی کذا سے ہے جسکے معنی ہیں میں اسکی طرف متوجہ ہوا ۔ گویا جدھر انسان توجہ پھیرتا ہے اسی طرف اللہ بھی اسکی توجہ کو پھیر دیتا ہے +

أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا

کہ اسکے ساتھ شریک بنایا جائے اور جو اسکے سوا ہو جسے چاہتا ہو بخشتا ہو اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہو وہ گمراہی میں

بَعِيْدًا ۝ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۝ ۱۱۷

دور نکل گیا ۶۳۳ سے چھوڑ کر وہ سوائے بیجان چیزوں کے اورکسیکو نہیں پکارتے اور وہ سرکش شیطان کے سوا اورکسیکو نہیں پکارتے ۶۳۴

اجماع اُمت امام شافعی سے منقول ہو کہ انہوں نے تین سو مرتبہ قرآن شریف اس غرض کیلئے پڑھا کہ اجماع اُمت کے دلیل شرعی ہونے پر کونسی آیت حجت ہو۔ اور آخران کو یہ آیت ملی۔ اس پر یہ اعتراض ہوا ہو کہ سبیل المومنین کوئی الگ راستہ نہیں بلکہ قال اللہ وقال الرسول پر ایمان ہی سبیل المومنین ہو۔ اور وہ وہی ہدایت ہے جس کا ذکر یہاں موجود ہو پس ان الفاظ سے اجماع اُمت پر کوئی دلیل پیدا نہیں ہوتی۔ اور اگر سیاق و سباق عبارت پر غور کیا جائے تو یہ اعتراض بالکل صحیح ہو۔ یہاں ذکر رسول اللہ صلعم سے دشمنی کا ہے کہ کوئی شخص ایمان اور محبت کی بجائے کفر اور دشمنی کے طریق کو اختیار کرے۔ اور ان میں سے اول الذکر مومنین کا رستہ ہو۔ اس سے بڑھکر مومنین کے رستہ سے کچھ مراد نہیں اور نہ ہی اجماع کے کچھ معنی ہو سکتے ہیں کیونکہ تمام مسلمانوں کا کس طرح ایک بات پر اتفاق ہو سکتا ہو سوائے اس کے کہ وہ بات قرآن یا حدیث میں ہو ✦

۶۳۳ پچھلے رکوع کے آخر پر منافقوں کے ذکر میں فرمایا تھا کہ صحیح رستہ وہی ہو جس پر مومن ہیں۔ اب اس رکوع میں ایک مشرک اور ایک موحد کا مقابلہ کر کے بتایا ہو کہ منافقین نے کونسا طریق اختیار کیا ہو اور کہ یہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ شرک چونکہ سب بدیوں کی جڑ ہو اس لئے اس کا ذکر کیا۔ شرک کے نہ بخشنے پر دیکھو ۶۲۵ اور یہاں بتا بھی دیا کہ شرک کو اللہ تعالیٰ کیوں نہیں بخشتا اس لئے کہ وہ گمراہی میں اس قدر دور نکل جاتا ہو کہ وہاں سے واپس آنا مشکل ہوتا ہے شرک اور بت پرستی کے برابر کسی بیماری کی جڑیں گہری نہیں گئیں

اناث **۶۳۴** اناث۔ انثیٰ کی جمع ہو اور جن سے وہ سوائے خدا کے اپنی حاجت برآری چاہتے ہیں ان کو اناث کہا ہو۔ یا اس لحاظ سے کہ ان کے ہاں اکثر بتوں کے نام مونث تھے۔ جیسے لات اور عزٰی اور منات (غ) اور حسن سے روایت ہو کہ ہر ایک قبیلہ کا ایک بت ہوتا تھا جسے وہ انثیٰ بنی فلاں کہتے تھے یعنی فلاں قبیلہ کی دیوی۔ اور یا اس لحاظ سے کہ ان چیزوں کو جن میں روح نہ ہو اناث کہا جاتا تھا۔ اور یہ بھی حسن سے روایت ہو (ج) امام راغب نے بھی اناث سے مراد جمادات ہی لئے ہیں کیونکہ ان میں صرف قوت منفعلہ ہو یعنی دوسرے کا اثر قبول کرنا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ ان کے معبودوں کیلئے اختیار کر کے ان کو ان کی جہالت پر متنبہ کیا ہو کہ وہ اشیاء جو نہ دیکھتی ہیں نہ سنتی اور نہ کوئی کام کرنے کی طاقت رکھتی ہیں ان کو وہ اپنی مدد کیلئے پکارتے ہیں۔ اسی کی مثل حضرت ابراہیم کا قول ہو یا ابت لم تعبد ما لا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنك شیئا (مریم ۱۹-۴۲) اور دوسری جگہ جو فرمایا۔ وجعلوا الملٰئکۃ الذین ھم عبٰد الرحمٰن اناثا (الزخرف ۴۳-۱۹) تو یہ اس لحاظ سے ہو کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے (غ) ✦

مرد - امرد **مرید - مارد** **اھل الجنۃ مُرْد** **مَرَّد** مرید۔ مرد سے ہو۔ شجر امرد اس درخت کو کہا جاتا ہو جس پر پتے نہ ہوں اور امرد مردوں میں سے وہ ہو جس کے منہ پر ابھی بال نہ نکلے ہوں۔ اس لئے مرید اور مارد (وحفظا من کل شیطان مارد (الصّٰفّٰت ۳۷-۷) جنوں اور انسانوں میں سے وہ ہو جو ہر قسم کی بھلائی سے خالی ہو اور ایک روایت میں ہو اھل الجنۃ مُرْد تو یہ ظاہر پر بھی حمل ہو سکتا ہو اور یہ بھی اس کے معنی کئے گئے ہیں کہ وہ ہر قسم کے نقصوں اور قباحتوں سے خالی ہونگے اور مردوا علی النفاق (التوبۃ ۹-۱۰۱) سے مراد ہو کہ وہ ہر قسم کے محاسن سے خالی نفاق پر ہیں ✦

شیطان کی عبادت سے مراد ان الفاظ کے بڑھانے سے کہ وہ سرکش شیطان کے سوائے اورکسی کو نہیں پکارتے مطلب یہ ہو کہ جن کو وہ خدا کے پکارتے ہیں

۱۱۸ ۱۱۹ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۙ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ — وقف لازم

اسے اللہ نے پھٹکار دیا ہے۔ اور اس نے کہا میں ضرور تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لونگا اور میں انہیں ضرور گمراہ کرونگا

وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ

اور انہیں جھوٹی آرزوئیں دلاؤنگا اور انہیں کہونگا سو وہ جانوروں کے کان چیرینگے ۴۳۵ اور انہیں کہونگا سو وہ اللہ کے بنائے ہوئے

خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا

دین کو بدل دینگے ۴۳۶ اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بناتا ہے وہ یقیناً کھلا نقصان

۱۲۰ مُّبِيْنًا ۭ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ○

اٹھاتا ہے وہ انکو وعدے دیتا ہے اور انکو جھوٹی آرزوئیں دلاتا ہے اور شیطان صرف انکو دھوکا دینے کیلئے وعدہ دیتا ہے ۴۳۷

انہوں نے تو کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا یہ صرف شیطان کے بہکانے سے ان کو اپنا معبود سمجھتے ہیں پس گویا اس کی اطاعت کرکے اسی کی عبادت کرتے ہیں +

۴۳۵ فلیبتکن۔ یُبَتِّکُ کا مادہ بَتْکٌ ہے اور بتک اور بتّ کے معنی ایک ہیں یعنی قطع کرنا اس فرق سے کہ اعضا اور بالوں کے کاٹنے میں بتک کہا جاتا ہے اور فداثع اور رلاپ کے کاٹنے پر بتّ (غ) + — بتک۔ بتّ

ایام جاہلیت میں رسم تھی کہ جب اونٹنی پانچ بچے جن لیتی اور پانچواں نر ہوتا تو اس کے کان چیر کر اس کو چھوڑ دیتے اور نہ اس پر سوار ہوتے نہ اس سے کوئی کام لیتے۔ یہ ایک مشرکانہ رسم تھی یعنی بتوں کے نام پر ایسا کرتے تھے۔ اس کو بحیرہ کہتے جس کا ذکر دوسری جگہ آتا ہے ما جعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ (المائدۃ ۵۔ ۱۰۳) (ج) اور بعض نے کہا ہے کہ بتوں کی پرستش کا یہ ایک حصہ تھا کہ جانوروں کے کان چیر دیتے تھے — کان چیرنے کی رسم

۴۳۶ خلق اللہ سے یہاں کیا مراد ہے۔ خود قرآن کریم نے اس کی تصریح دوسری جگہ فرما دی ہے فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم (الروم ۳۰۔ ۳۰) اللہ کی دی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی پیدائش میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہ مضبوط دین ہے۔ پس خلق اللہ کی تبدیلی سے مراد دین الٰہی کی تبدیلی ہے اور یہی معنی حسن ضحاک مجاہد اور بہت سے ائمہ سے مروی ہیں (ث ج) اور صحیحین کی حدیث میں ہے کل مولود یولد علی الفطرۃ یعنی ہر ایک بچہ اسی فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے گویا ایک طرف اگر بڑی موٹی قسم شرک کی بتا دی یعنی جانوروں کے کانوں کا چیرنا تو دوسری طرف اس کی باریک سے باریک صورت کو بیان کر دیا یعنی الٰہی دین کو بدلنا جس سے مراد اللہ کے حلال کو حرام اور اسکے حرام کو حلال کرنا ہے اسکی تفسیر لعن اللہ الواشمات سے کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس سے خلق اللہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ ورنہ ہر ایک زینت خلق اللہ کی تبدیلی ہو جائیگی۔ اور حدیث کا منشا صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں پر آپ نے لعنت کی ہے جو دیکھنے والوں کو زنا کی طرف بلانے کی غرض سے ہاتھوں وغیرہ پر نیل بھر لیتی ہیں اور تغیر خلق اللہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ مراد اس سے اس غرض کی تبدیلی ہے جس غرض کیلئے اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو پیدا کیا ہے مثلاً حیوانوں کو سواری کیلئے پیدا کیا بحیرہ سائبہ بنا کر ان کی پرستش کرنا تغیر خلق اللہ ہے سورج چاند کو انسان کیلئے مسخر کیا ان کی عبادت تغیر خلق اللہ ہے (ذ) + — خلق اللہ سے مراد دین اللہ — واشمات

۴۳۷ یہ الفاظ بہت قابل غور ہیں نہ صرف شیاطین الجن کے وعدے ہی سراسر جھوٹ اور فریب ہوتے ہیں بلکہ شیاطین الانس جب لوگوں کو غلط راہ پر لگاتے ہیں۔ تو وہ بھی جھوٹے وعدے دیکر ہی ایسا کرتے ہیں۔ جو شخص دوسرے کو بدی کی ترغیب دیتا ہے وہ اسکو — شیطان کے وعدے

أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا ١٢١ ١٢٢

یہی ہیں جنکا ٹھکانا دوزخ ہو اور وہ اس سے کوئی بھاگنے کی جگہ نہ پائینگے اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام

الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۝ وَعْدَ

کرتے رہے ان کو ہم باغوں میں داخل کرینگے جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ انہیں میں رہینگے اللہ کا

اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ۝ لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ ١٢٣

وعدہ سچا ہو اور اللہ سے بڑھکر کون بات کا سچا ہے نہ تمہاری خواہشوں پر ہو اور نہ اہل کتاب کی۔

الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا

خواہشوں پر جو کوئی بدی کریگا اس کا بدلہ اسے دیا جائیگا اور اللہ کو چھوڑکر وہ نہ کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار

نَصِيرًا ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ ١٢٤

پائے گا ۷۳۸ اور جو نیک کام کرے خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یہی لوگ

يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ۝ وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ ١٢٥

جنت میں داخل ہونگے اور ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائیگا ۷۳۹ اور دین میں اس سے اچھا کون ہو جس نے اپنی ساری توجہ کو اللہ کی فرمانبرداری میں لگا دیا

خوب سجاتا ہے اور اکثر لوگ بدوں کی صحبت میں بیٹھ کر اسی لئے تباہ ہوتے ہیں کہ وہ ان کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں ✦

ایمان بلا عمل محض امانی کی پیروی ہو

۷۳۸ کیسا پاک مذہب ہے۔ آرزوؤں اور خواہشات پر اجر نہیں ملتے خواہ مسلمان ہوں خواہ یہود و نصاریٰ۔ جو مسلمان نام کو مسلمان کہلاتے ہیں۔ اور قرآن شریف کو اپنا دستور العمل نہیں بناتے وہ محض امانی کے پیرو ہیں۔ اور قرآن کریم کی یہ آیت فیصلہ کرتی ہے کہ نری آرزوؤں سے کچھ نہیں بنتا جب تک اعمال ساتھ نہ ہوں۔ مسلمان ہو کر بُرا کام کرے گا تو وہ بھی سزا پائے گا غیر مذہب کا آدمی اچھا کام کرے گا تو اس کا اجر پائیگا صحیح اعتقاد عمل سے مستغنی نہیں کرتا بلکہ اعتقاد صحیح کی اصل غرض ہی عمل صحیح پر قائم کرنا ہے ✦

مرد اور عورت میں نتائج اعمال کے لحاظ سے کامل مساوات ہو

۷۳۹ پس جس طرح مرد کے لئے نعمائے جنت ہیں اسی طرح اور وہی نعمائے جنت عورت کیلئے بھی ہیں۔ قرآن کریم نے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ نہ کہیں یہ فرمایا ہے کہ مرد کے لئے عورت کی نسبت زیادہ انعامات ہیں۔ پس اگر عیسائیوں نے اسلام پر یہ جھوٹا الزام دیا ہے کہ ان کے نزدیک عورت کی روح ہی نہیں تو خود مسلمان بھی اس غلط فہمی میں ہیں کہ بہشت میں جو انعامات مرد کے لئے ہیں وہ عورت کے لئے نہیں۔ قرآن کریم نے اعمال کے نتائج کے متعلق مرد و عورت میں مساوات کامل رکھی ہے ✦

۱۲۶ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝ وَلِلّٰهِ

اور وہ احسان کرنیوالا ہو اور راست رو ہو کر ابراہیم کے مذہب کی پیروی کرتا ہو۔ اور اللہ نے ابراہیم کو دا اپنا پیارا بنایا ۵۴۰ اور جو کچھ

۱۲۷ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِيْطًا ۝ ع وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِی

۱۹ ع ۸ ۱۶ — عورتوں کیلئے حسن سلوک کا حکم۔

آسمانوں میں ہو اور جو کچھ زمین میں ہو اللہ کا ہی ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور تجھ سے عورتوں کے متعلق فتوے

النِّسَاۗءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِی الْكِتٰبِ فِیْ يَتٰمَى النِّسَاۗءِ الّٰتِیْ

پوچھتے ہیں کہو اللہ تمکو انکے بارہ میں فتوٰی دیتا ہے اور جو تم پر کتاب میں پڑھا جاتا ہو ان عورتوں کے یتیموں کے بارہ میں جنکو

لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ

تم جو کچھ ان کیلئے اور ناتوان بچوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے نہیں دیتے ہو اور نہیں چاہتے ہو کہ ان کے

الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ۝

نکاح کرو اور یہ کہ یتیموں کے معاملہ میں انصاف پر قایم رہو اور جو کچھ بھلائی تم کرو تو اللہ اسے جاننے والا ہو ۵۴۱

خلة — ۵۴۰ خلیل۔ خُلّة سے ہو جس کے معنی محبت ہیں کیونکہ وہ نفس کے اندر داخل ہو جاتی ہو اور خَلَل اس شگاف کو کہتے ہیں

خلل — جو دو چیزوں کے درمیان ہو یا وسط کو فتری الودق یخرج من خلاله (النور ۲۴-۴۳) فجاسوا خلٰل الدیار (بنی اسرائیل ۱۷-۵)

اللہ کی بندہ محبت — اللہ تعالٰی نے حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا جب بندہ اپنے مالک سے محبت کرتا ہو تو مالک بھی اپنے بندہ سے محبت کرتا ہو لیکن یہاں جو خوشخبری سنائی ہو وہ یہ نہیں کہ حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا بلکہ یہ ہے کہ جو کوئی شخص بھی اس ملت ابراہیمی پر چلتا ہو اپنی توجہ کو اللہ تعالٰی کی کامل فرمانبرداری میں لگا دیتا ہے اور مخلوق خدا کے ساتھ احسان کرتا ہو وہی خلیل اللہ یا اللہ کا پیارا بن جاتا ہو +

اتباع ملت ابراہیم — اتباع ملت ابراہیم سے کیا مراد ہو؟ یہاں ملت ابراہیم صرف حنیفیت کو کہا ہو یعنی ان اصول دین کو جو افراط و تفریط سے پاک ہتے دیکھو ۱۸۵ اور یہاں وہ اصول دین بھی بتا دیئے یعنی اسلم وجهه لله۔ وهو محسن اللہ تعالٰی کی کامل فرمانبرداری اور مخلوق خدا سے احسان پس انہی اصول میں جو اسلام کے بھی اصل الاصول ہیں اتباع مراد ہو۔ اپنی اصلی حالت میں اصول سب مذاہب کا ایک ہی تھا یعنی خدائے واحد کی پرستش اور مخلوق خدا سے احسان کی تعلیم +

افتاء استفتاء — ۵۴۱ یستفتون۔ یفتی۔ فتٰی کے معنی نوجوان۔ اور فتوٰی جواب ہے ایسے احکام سے جو مشکل ہوں (غ) اور استفتاء ایسے سائل میں فتوٰی مانگنا افتونی فی امری (النمل ۲۷-۳۲) فاستفتهم (الصفّٰت ۳۷-۱۱) +

یتامی النساء — یتامی النساء کے معنی دونوں طرح ہو سکتے ہیں۔ عورتوں کے یتیم بچے یعنی بیوہ عورتوں کے۔ اور یتیم عورتیں۔ اور لسان العرب

ایم — میں ہے کہ یتیم اس عورت کو کہا جاتا ہو جس کا خاوند نہ ہو۔ اور دوسری قرأت اس کی بیامی النساء ہو اور بیامی ایم کی جمع ہو یعنی وہ عورت جس کا خاوند نہ ہو۔ اور اس کی جمع ایامٰی قرآن شریف میں آتی ہو وانکحوا الایامٰی (النور ۲۴-۳۲) +

ما کتب لهن۔ جو حصہ ان کے لئے مقرر ہوا ہے اس سے مہر مراد نہیں بلکہ میراث کا حصہ مراد ہو۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہی کمزور بچوں کا بھی ذکر ہے۔ عورتوں اور بچوں کو عرب لوگ میراث نہ دیتے تھے جیسا کہ ۵۱۲ میں ذکر ہو چکا ہو۔ اسلئے جب قرآن شریف

وَاِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ ۱۲۸

اور اگر ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا ڈر ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں

میں عورتوں اور بچوں کے ورثہ پانے کا حکم آیا تو بعض لوگوں کو ناگوار گزرا (ج) +

رغب

ترغبون ان تنکحوھن - رغب کے معنی کیلئے دیکھو ۱۶۵ یہاں صلہ کوئی نہیں اسلئے دونوں معنی ہوسکتے ہیں کہ انکے نکاح میں رغبت کرتے ہو اور یہ کہ انکے نکاح نہیں چاہتے ہو ابن جریر نے دونوں قسم کی روایات بیان کی ہیں مگر کثرت دوسرے معنی کی طرف ہو اور سیاق بھی یہی چاہتا ہو اس لئے کہ مال کا ورثہ لینے کیلئے وہ نہ چاہتے تھے کہ ایسی عورتیں نکاح کریں +

مسئلہ تعدد ازدواج پر مزید روشنی

اس رکوع کا تعلق ابتدائے سورت سے ہو - اور اس میں اسی مضمون تعدد ازدواج کا ذکر ہو جس کا ذکر سورت کے شروع میں کیا تھا - آیت ۱۲۹ اس امر کو بالکل واضح کردیتی ہے - جہاں فرمایا کہ تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کرسکتے - پچھلے رکوع سے اس کا تعلق یہ ہو کہ وہاں منافقوں کے ذکر میں جو شرک کی طرف جارہے تھے مومنوں کا ذکر کرکے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور اس کی مخلوق سے احسان یہی دو ستون مذہب کے ہیں اسلئے اس رکوع میں پھر عورتوں کے حقوق کا ذکر کیا کہ ان سے احسان کرو۔ اس آیت کے شروع میں استفتاء اور افتاء کے الفاظ اختیار فرما کر اشارہ کیا ہو کہ لوگوں کو عورتوں کے مسئلہ میں ابھی کچھ مشکلات نظر آتی ہیں - اور سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک تو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فتوٰی دیتا ہے جو آگے آتا ہو اور دوسرے ما یتلیٰ علیکم فی الکتاب کا حوالہ دیا ہو یعنی جو اس سورت میں پہلے پڑھا جاتا ہو جس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت بعد میں نازل ہوئی - اور جو پہلے پڑھا جاتا ہو اس کے متعلق فرمایا کہ وہ یتامی النساء کے بارہ میں ہو - بخاری میں حضرت عائشہؓ سے ہو کہ اس سے مراد یتیم لڑکی ہو جس کا ولی اس کے مال کو اپنے ساتھ شریک کرلیتا ہو اور نہ خود اس سے نکاح کرنا چاہتا ہو نہ دوسرے سے نکاح کرنا پسند کرتا ہو اس خوف سے کہ اس طرح وہ مال اس کے ہاتھ سے جاتا رہیگا - اور ابن عباس سے ایک روایت میں ہو کہ یہ آیت ام کحہ کے بارہ میں نازل ہوئی جس کے یتیم بچے تھے - حق یہ ہو کہ قرآن کریم عورتوں اور یتیم بچوں کے معاملہ میں زیادہ تاکید اور تصریح فرماتا ہو اور سورت کے اصل مضمون کو یاد دلاتا ہے - عورتوں اور یتامی سے اس قدر بدسلوکی ہوتی تھی کہ پھر اس حکم کے نزول کی ضرورت پیش آئی - اور مطلب یہ ہو کہ وہ حکم جو پہلے دیا جاچکا ہو کہ تم دو دو تین تین چار چار عورتوں سے نکاح کرلو - وہ یتامی النساء کے بارہ میں ہو یعنی ایسی عورتوں کے بارہ میں جو بلا خاوند رہ گئی ہیں - جیسا کہ جنگوں میں بہت سی عورتیں بیوہ ہوگئیں - اور یا اگر یتامی النساء کے دوسرے معنی لئے جائیں یعنی عورتوں کے یتیم بچے تو آیت ۳ کے معنی یوں ہونگے کہ عورتوں کے یتیم بچوں کے بارہ میں انصاف نہ کرسکو تو ان عورتوں سے نکاح کرلو جو انکی مائیں ہیں جس سے تعدد ازدواج کے مسئلہ کی صراحت ہوتی ہو کہ یہ مشکلات پیش آمدہ کے حل کرنے کیلئے تھا جب بہت عورتیں بلا خاوند رہ گئیں یا یتیم بچوں والی عورتیں رہ گئیں جن یتیموں کا کوئی خبرگیر نہ ہوتا تھا - اسلئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایسی عورتوں سے دو دو تین تین چار چار تک نکاح کرلو - اور یہ امر کہ یہاں اسی مسئلہ تعدد ازدواج کی طرف اشارہ ہو اس سے ظاہر ہو کہ اس کے بعد عدل کا ذکر صفائی سے کیا ہو - اور یہ جو فرمایا کہ ان کو تم ان کا مقررہ حصہ نہیں دیتے نہ چھوٹے بچوں کو تو اس میں عرب کے اس پرانے دستور کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عورتوں اور بچوں کو محروم الارث کرتے تھے - اور ترغبون ان تنکحوھن سے معلوم ہوتا ہو کہ بوجہ انکی اولاد کی پرورش کی ذمہ واری کے وہ ان سے نکاح بھی نہ کرنا چاہتے تھے - اس لئے اسلام نے دونوں حکم دیئے کہ عورتوں اور کمزور بچوں کو حق ورثہ بھی دیں اور ایسی عورتوں سے جن کے یتیم بچے رہ گئے ہیں نکاح بھی کرلیں اور اس کے لئے تعدد ازدواج کی بھی اجازت دی کیونکہ اس صورت میں تعدد ازدواج کی اجازت نہ دی جاتی تو قوم تباہ ہوجاتی - اس کے ساتھ ہی آخر پر یہ کہکر کہ یتیموں کے معاملہ میں انصاف پر قائم رہو یہی کی تاکید کی ہو - بیوہ عورتوں کی خبرگیری اور یتیم بچوں کی پرورش دونوں کا تقاضا تھا کہ یہ صورت اختیار کی جاتی +

أَن يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۗ وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ ۚ وَإِن

کہ وہ آپس میں صلح کریں اور صلح اچھی چیز ہے اور طبیعتوں میں بخل ہوتا ہی ہے اور اگر

۱۲۹ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝ وَلَن تَسْتَطِيعُوا

تم احسان کرو اور تقویٰ کرو تو اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے ۴۴۲ اور تم طاقت نہیں رکھتے

أَن تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ۖ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ

کہ عورتوں میں عدل کرسکو خواہ کتنا ہی چاہو پس بالکل ہی نہ جھک جاؤ ہیانتک کہ اسے اَدھر میں لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو

۱۳۰ وَإِن تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ وَإِن يَتَفَرَّقَا

اور اگر تم اصلاح کرو اور تقویٰ کرو تو اللہ بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے ۴۴۳ اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں

شح

۴۴۲ شح۔ اس بخل کو کہتے ہیں جس کے ساتھ حرص جمع ہو ومن یوق شح نفسه (الحشر ۵۹: ۹) اشحة على الخير (الاحزاب ۳۳: ۱۹) (غ)۔

خاوند کا نشوز عورت پر

یہاں اس صورت کا ذکر کیا جب عورت کو خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا خوف ہو جب بیوی کی طرف سے نشوز ہو یا شقاق بینہما کی صورت ہو یعنی میاں بیوی میں جھگڑا ہو۔ تو ان دونوں صورتوں کا حکم پہلے گزر چکا ہے۔ اس خاص صورت کا ذکر کہ عورت کو خاوند کی طرف سے خوف ہو تعدد ازواج کے جھگڑے سے ہی وابستہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی لئے ان دونوں حکموں سے الگ کرکے اس کو یہاں بیان کیا، اور اگلی آیت میں تو واضح طور پر بیویوں میں عدل کا ذکر کرکے اس مضمون کو کھول دیا۔ فرمایا کہ جب خاوند کی دوسری شادی کرنے سے عورت کو یہ خوف ہو کہ وہ اس کی طرف سے بالکل بے رغبت ہو جائیگا۔ یا اس پر زیادتی کریگا تو وہ دونوں کوئی صورت صلح کی اختیار کریں۔ اور وہ صورت یوں بھی ہو سکتی ہے کہ خاوند ہی ازدواج ثانی کے ارادہ کو ترک کر دے یا یہ کہ عورت کا اطمینان کر دے کہ اسکو نقصان نہیں پہنچے گا اور یہ بھی فرمایا کہ صلح بہتر چیز ہے۔ لیکن صلح کے ہونے میں شح مانع ہو جاتا ہے یعنی بخل وحرص۔ بخل تو یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی حق کو چھوڑنا نہیں چاہتا اور حرص یہ کہ کسی دوسرے کا حق چھیننا چاہتا ہے۔ اگر بخل وحرص نہ ہوں اور انسان کچھ اپنے حقوق کو چھوڑ دے اور کچھ دوسرے کے حقوق پر دست درازی کو چھوڑ دے تو صلح آسانی سے ہو سکتی ہے اسی لئے اسکے ساتھ احسان وتقویٰ کی ہدایت فرمائی یعنی دوسروں کے ساتھ نیکی کرو اور انکے حقوق لینے سے بچو اور یہاں بالخصوص مراد عورتوں کے ساتھ معاشرت میں احسان کرنا اور ان کی حق تلفی سے یا ان پر نشوز کرنے یا ان سے اعراض کرنے سے بچنا ہے +

میل

۴۴۳ تمیلوا۔ مَیل وسط سے ایک جانب جھک جانیکا نام ہے اور اس کا استعمال ظلم میں ہوتا ہے۔ اور مِلْتُ علیه کے معنی ہیں اس پر حملہ کیا فیمیلون علیکم میلة واحدة (۱۰۲) اور مال کو مال اسلئے کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ دوسری طرف جھکتا یعنی دوسرے ہاتھوں میں جاتا رہتا ہے۔ آج ایک کے پاس ہے تو کل دوسرے کے (غ) +

مال

علق معلقة

معلقه۔ عَلَق کسی چیز کے ساتھ لٹک جانا یا اس میں پھنس جانا ہے (غ)، اسی سے علقة ہے جس سے بچہ بنتا ہے اور معلقة کے معنی ہیں التی فُقِد زوجها (ل) یعنی جس کا خاوند گم ہو گیا ہو لا أيّم ولا ذات بعل۔ نہ وہ بلا خاوند ہو اور نہ خاوند والی (ل)

عورتوں میں عدل سے مراد

مرد کا عورتوں میں عدل کرنا دو طرح پر ہو سکتا ہے۔ ایک ظاہر حالات میں یعنی خرچ دینے میں باری میں۔ دوسرا محبت میں سورت کے شروع میں فرمایا تھا کہ اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کرسکو گے تو ضرورت کی حالت میں بھی ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرو

يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ ۱۳۱

تو اللہ ہر ایک کو اپنی کشایش سے غنی کر دیگا۔ اور اللہ وسعت والا حکمت والا ہی ۲۴۴ اور اللہ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ

اور جو کچھ زمین میں ہے اور ہم نے انکو جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تم کو بھی یہی حکم دیا کہ اللہ کا

اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا

تقوٰی کرو اور اگر تم انکار کرو تو جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ کا ہی ہے اور اللہ غنی

حَمِيْدًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ اِنْ يَّشَاْ ۱۳۲ ۱۳۳

تعریف کیا گیا ہے اور اللہ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کارساز بس ہے اے لوگو!

يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ۱۳۴

اگر وہ چاہے تو تم کو لے جائے اور اوروں کو لے آئے اور اللہ اس پر قادر ہے جو کوئی دنیا کا

ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ع

ثواب چاہتا ہے تو اللہ کے ہاں دنیا اور آخرت (دونوں) کا ثواب ہے اور اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے ۲۴۵

بلکہ ایک پر ہی اکتفا کرو۔ وہ عدل حالات ظاہری میں ہے۔ یہاں خاوندانہ دلی میں رغبت اور محبت کا ذکر ہے۔ اسلئے ولن تستطیعوا ان تعدلوا میں جس عدل کی عدم استطاعت کا ذکر ہے وہ عدل تعلقات محبت میں ہے اور بتایا ہے کہ یہ انسان کی طاقت میں ہی نہیں کہ اگر دو بیبیاں اسکے گھر میں ہیں تو دونوں سے یکساں محبت کر سکے۔ عدل ظاہری کی نفی یہاں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو انسان کر سکتا ہے۔ یہ خیال کہ تعدد ازواج کی اجازت دیکر پھر اسے ایک محال شرط سے وابستہ کر دیا ہے اور خود ہی شرط کو محال قرار دیدیا ہے صحیح نہیں اس لئے کہ تعدد ازدواج کی اجازت تو ایک خاص مشکل کو حل کرنے کے لئے دی تھی جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اور خدا کے کلام کو یہ شایان نہیں کہ خود ایک ضرورت کو بیان کرے پھر خود ہی اس کے پورا کرنے کو ایک محال شرط سے وابستہ کر دے۔ اگر ضرورت تعدد ازواج کی ہے تو پھر اس کا انکار اس بنا پر نہیں ہو سکتا کہ تم عدل نہیں کر سکتے کیا یہ خود خدا تعالیٰ پر اعتراض نہیں کہ ایک طرف تعدد ازدواج کی ضرورت کو بیان کرتا ہے اور دوسری طرف تعدد ازدواج کو ایک شرط محال سے وابستہ کرتا ہے۔ اس آیت کے معنی صاف ہیں۔ کہ عدل ظاہری کا حکم تو ہم دے چکے ہیں محبت میں مساوات کیلئے ہم تم کو مجبور نہیں کرتے۔ ہاں ایک عورت کیطرف اسقدر بے رغبتی کرنا کہ وہ نہ خاوند والیوں میں داخل ہو نہ بغیر خاوند والیوں میں۔ ادھر میں لٹکی ہوئی ہو اس سے منع فرمایا۔

۲۴۴ اگر بے رغبتی اس حد تک بڑھ جائے یا میل موافقت نہ ہو سکے تو دونوں کا جدا ہو جانا ہی بہتر ہے۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ دونوں کو پہلے سے بہتر حالت میں کر سکتا ہے۔

۲۴۵ خاتمہ کی چار آیات میں تقوٰی کی تاکید فرمائی اور اللہ تعالیٰ کی جبروت و قدرت کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ یہی چیز انسان کو

۱۳۵ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو انصاف کی پوری محافظت کرنے والے اللہ کیلئے گواہی دینے والے رہو گو معاملہ تمہاری اپنی ذات یا

الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا

ماں باپ اور قریبیوں کے خلاف ہو اگر کوئی امیر ہو یا غریب تو اللہ کا دونوں پر تمہاری نسبت زیادہ حق ہے سو تم خواہش کی

الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝

پیروی نہ کرو تاکہ عدل کر سکو اور اگر تم پیچدار بات کرو یا (حق سے) اعراض کرو تو یقیناً جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے [۷۴۶]

رکوع ۲۰ — منافقوں کی عملی کمزوری

تقویٰ پر قایم رکھ سکتی ہے۔ دوسروں کے حقوق کی صحیح رعایت انسان تب ہی کر سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی قدرت و جبروت پر ایمان ہو ورنہ نیکی بھی خود غرضی کا رنگ رکھتی ہے ٭

قیام — قوام

۷۴۶ قوامین۔ قیام کا استعمال دو طرح پر ہے کسی چیز کی مراعاۃ یا نگہداشت اور اس کی حفاظت اور دوسرا کسی چیز کا عزم اور یہاں مراد مراعاۃ ہے (غ)، اور قوام چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس لئے مراد ہے مراعاۃ انصاف کو کمال تک پہنچانے والا۔ اور چونکہ قسط انصاف کا حصہ ہے اسلئے مراد ہر قسم کے حقوق کی ادائگی میں پوری مراعاۃ ہے ٭

شہداء للّٰہ۔ اللہ کیلئے گواہی دینے والے یعنی گواہی میں ایسی حق بات کہنے والے کہ سوائے اللہ کی رضا کے اور کچھ مدنظر نہ ہو

اولیٰ

اولیٰ بہما۔ اَوْلیٰ بمعنی اَحری ہے۔ بڑھکر اہل یا حقدار۔ اور مطلب یہ ہے کہ غنی کی رضا حاصل کرنا یا فقیر پر رحم کرنا حق سے تمہیں نہ پھیر دے کیونکہ غنی کے معاملہ میں اللہ کی رضا اور فقیر کے معاملہ میں اللہ کا رحم اس سے بڑھکر ہے ٭

لوی

تلوٗا۔ لَوَی کے معنی جھوٹ بولنا بھی ہیں اور مائل ہونا بھی۔ چونکہ دو حکم اکٹھے ہیں یعنی انصاف کرنا اور سچی شہادت دینا اس لئے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جس سے دونوں مطلب نکلتے ہیں یعنی شہادت کے معاملہ میں جھوٹ بولو یا عدل سے ایک طرف مائل ہو جاؤ

عدل و انصاف پر قیام کی نصیحت

اصل ذکر تو منافقوں کا تھا اور اسی میں مشرک اور موحد کا مقابلہ کرتے ہوئے عورتوں کے معاملہ میں عدل و انصاف کی طرف توجہ دلائی تھی اس آیت میں اسی کو عام کیا ہے۔ اور دوسری طرف چونکہ ذکر منافق کا تھا۔ اسی لئے فرمایا کہ ایمان والوں کو چاہیے کہ انصاف کے قوام بنیں یعنی اس کو ہمیشہ مضبوطی سے قایم رکھنے والے اور ہر ایک قسم کے حقوق پورے انصاف سے ادا کرنیوالے فیصلہ کرنا صرف ایک حصہ ہے جو بعض انسانوں کو پیش آتا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ تمام قسموں کے حقوق کی ادائگی پر حاوی ہیں گو اس میں شک نہیں کہ فیصلہ کا وقت سب سے زیادہ انسان کیلئے آزمایش کا وقت ہے۔ دوسری جگہ یوں فرمایا کہ لایجرمنکم شناٰن قوم علیٰ ان لا تعدلوا (المائدۃ ۵۔ ۸) کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے تم عدل کے مقام سے نہ ہٹو یہ مشکل سے مشکل مقام عدل کا ہے۔ انسان کی اپنی ذات، یا اقربا کا معاملہ ہو یا کسی قوم سے عداوت ہو تو وہاں عدل قایم رکھنا مشکل ہے ایسا ہی شہادت حقہ کا ادا کرنا ایک مشکل بات ہے۔ بالخصوص جہاں اپنی ذات پر اس کا اثر پڑتا ہو یا ماں باپ یا قریبیوں پر۔ پھر بعض وقت انسان ایک امیر آدمی کے لحاظ سے انصاف اور شہادت حقہ کو چھوڑ دیتا ہے تاکہ اسے خوش کرے اور بعض وقت ایک غریب پر رحم کرکے۔ فرمایا تم دونوں باتوں کی پروا نہ کرو اللہ کا حق ان پر تمہاری نسبت زیادہ ہے اور اللہ کا حق یہی ہے کہ حق ظاہر ہو۔ اور کسی کی رعایت تم عدل کی صفت سے انسان تب ہی متصف ہوتا ہے جب خواہشات کی پیروی ترک کر دے اسلئے بتایا کہ اس مقام پر پہنچنے کا طریق یہی ہے کہ تم خواہشات کی پیروی چھوڑ دو ٭

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ ١٣٦

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ پر ایمان لاؤ اور اسکے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور

وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ

اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اسکی کتابوں اور اسکے رسولوں اور

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ١٣٧

پچھلے دن کا انکار کرتا ہے وہ گمراہی میں دور نکل گیا ۴۴۷ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر

ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ۝ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ ١٣٨

کفر میں بڑھ گئے تو اللہ یہ نہیں کہ انکی مغفرت کرے اور نہ یہ کہ ان کو راہ پر سیدھا چلائے ۴۴۸ منافقوں کو خبر دیدو

بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ١٣٩

کہ انکے لئے دردناک عذاب ہے جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں

اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ ١٤٠

کیا وہ انکے ہاں عزت چاہتے ہیں تو عزت سب اللہ کے لئے ہی ہے اور وہ تم پر کتاب میں

فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا

(یہ حکم) نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جاتا ہے

۴۴۷ پہلے ایمان سے مراد ایمان ظاہر یا اقرار باللسان ہے اور دوسرے ایمان سے مراد تکمیل ایمانی ہے جس میں تصدیق بالقلب اور اس کے مطابق عمل بھی شامل ہیں۔ دیکھو ۱۱ چونکہ اصل ذکر منافقین کا تھا اس لئے فرمایا کہ صرف منہ کا ایمان فائدہ نہیں دیتا جبتک اس کے ساتھ عمل نہ ہو +

۴۴۸ اس سے مراد منافق ہی ہیں چنانچہ اگلی آیت میں تصریح موجود ہے۔ ایمان لانے پھر کافر ہونے پھر ایمان لانے پھر کافر ہونے سے مراد دو دفعہ کی گنتی نہیں۔ بلکہ ان کے تردد کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اور یہ تردد بعض منافقوں کی صورت میں ظاہر میں بھی واقع ہوتا تھا اور بعض کی صورت میں صرف باطن میں تھا ثم ازدادوا کفرا سے مراد یہ ہے کہ آخری حالت ان کی یہ ہے کہ کفر میں ترقی کرتے چلے گئے۔ ایسوں کی حفاظت اور ہدایت اللہ نہیں کرتا۔ اس لئے کہ جب ایک شخص غلط راہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ تو اللہ تعالے اسے مجبور کر کے نیک کام کی طرف نہیں لاتا جیسے نیک کو مجبور کر کے بدی کی طرف نہیں لے جاتا +

وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا

اور ان پر ہنسی کی جاتی ہو تو ان کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ اسکے سوا کسی دوسری بات میں لگ جائیں ضرور تم بھی تو

مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَاۨ ١٤٠ الَّذِيْنَ ١٤١

انہی کی طرح ہو یقیناً اللہ منافقوں اور کافروں　　سب کو جہنم میں اکٹھا کرنے والا ہے ۴۴۹　　وہ جو

يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ڮ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ

تمہارے متعلق انتظار میں ہیں پس اگر تم کو اللہ کی طرف سے فتح ملے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو کچھ

نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ

مل جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم کو چڑھا نہیں لائے اور مومنوں سے تمہاری حفاظت نہیں کی سو اللہ تمہارے درمیان قیامت

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ١٤١ۧ

کے دن فیصلہ کریگا اور اللہ ہرگز کافروں کو مومنوں پر　　(غلبہ کی) راہ نہیں دیگا ۴۵۰

---

۴۴۹ یخوضوا خوض کے معنی پانی میں رستہ بنانا اور اس میں گزرنا ہیں۔ اور معاملات یا باتوں میں داخل ہونے پر استعارۃً بولا جاتا ہے اور اکثر استعمال اس کا ذم کے مقام میں ہے کنا نخوض و نلعب (التوبۃ ۶۵) وخضتم کالذی خاضوا (التوبۃ ۶۹) (غ) یعنی بیہودہ یا جھوٹی باتوں میں پڑنا۔ اور خوض کلام میں وہ ہے جس میں کذب اور باطل ہو (ل)۔　　**خوض**

یہ حکم پہلے سورۃ الانعام میں نازل ہو چکا ہے۔ واذا رایت الذین یخوضون فی اٰیاتنا فاعرض عنھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ (الانعام ۶۸) مکہ میں مشرکین عرب اپنی مجالس میں قرآن کریم پر ہنسی ٹھٹھا کرتے تھے۔ مدینہ میں یہودی اور منافق۔ روکنے کی وجہ یہاں بتادی ہے کہ اس صورت میں تم بھی ان جیسے ہو گے۔ جب انسان ایک چیز کے متعلق استہزا کا طریق اختیار کرتا ہے تو جو شخص اس استہزا کو خوش ہو کر سنتا ہے۔ اسکا قلب بھی اسی رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے یوں کفار کے ساتھ بیٹھنے سے بات چیت کرنے سے منع نہیں کیا مگر اصول دین اور ائمہ دین کی تحقیر اور ان پر استہزا سننے سے روکا بالمقابل مسلمانوں کو یہ بھی تعلیم دی کہ تم ان کے معبودوں کی تحقیر و تذلیل کو ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ (الانعام ۱۰۹) اصل میں منافقین کفار کے ساتھ بیٹھکر اللہ تعالیٰ کے احکام کی ہنسی اڑایا کرتے تھے مسلمانوں کو روکا کہ ان کے دام میں نہ آجائیں۔　　**ہنسی ٹھٹھے کی مجالس**

۴۵۰ یتربصون۔ ربص مادہ ہے۔ اور تربص کسی شے کے انتظار کو کہتے ہیں۔ سامان تجارت ہو تو اس کے مہنگا ہونے یا ارزاں ہونے کا انتظار یا کسی معاملہ میں اس کے حصول یا زوال کا انتظار والمطلقات یتربصن (البقرۃ ۲۲۸) تربصوا فانی معکم من المتربصین (الطور ۳۱)　　**تربص**

نستحوذ حوذ کے معنی ہیں کہ اونٹ کا چلانے والا اسکے چوتڑوں پر مار مار کر اس کو چلائے۔ اور حاذ الابل کے معنی ہیں اونٹوں کو سختی کے ساتھ چلایا۔ اسی سے استحوذ ہے استحوذ علیھم الشیطان (المجادلۃ ۱۹) کے معنی ہیں شیطان نے ان پر غالب آکر ان کو چلایا یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ ہم تم کو بڑی ترغیب دیکر اور بڑا زور دیکر مسلمانوں پر چڑھا کر لائے۔　　**حاذ۔ نستحوذ**

نمنع۔ منع اصل میں عطاء یعنی دینے کی ضد ہے جیسے مناع للخیر (ق ۲۵) یمنعون الماعون (الماعون ۷) اور حمایۃ یعنی حفاظت　　**منع**

۲۱ / ع ۱۱ — ۱۴۲

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ج

منافق اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور وہ ان کو دھوکہ بازی کی سزا دیگا ۱۵۱

منافقوں کا انجام

کے معنی میں بھی آتا ہے یہی معنی یہاں ہیں (غ) ✦

منافقوں کی دورخی چال

یہاں منافقوں کی دورخی چال کا ذکر کیا ہے۔ ایک طرف مومنوں کے ساتھ ملے رہتے ہیں انہیں غلبہ ہوتا ہو تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ تھے۔ دوسری طرف کافروں کے ساتھ۔ جب کسی جنگ میں کچھ فائدہ کافروں کو ہو جاتا ہے تو ان کو جتاتے ہیں کہ ہم ہی تمہارے اس فائدہ کا اصل موجب ہیں کیونکہ ہم ہی تم کو چڑھا کر لائے اور ہم نے پھر مومنوں کا ساتھ چھوڑ کر تمہارا ان سے بچاؤ کر دیا یعنی وہ ہی قابل ضرب ہے کہ تم پر حملہ کر سکتے اور یوں تمہارا بچاؤ ہو گیا پس جو کچھ تم کو حاصل ہوا صرف ہماری وجہ سے ہی حاصل ہوا ہے۔ یہ ان کی شرارتیں ہیں جن کی وجہ سے ان کو اگلے رکوع میں انجام بد سے ڈرایا گیا ہے ✦

ایک نکتہ اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لڑائی کے اُتار چڑھاؤ میں جو مسلمانوں اور کفار کے درمیان ہو رہی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کی کامیابی کیلئے لفظ فتح اختیار فرمایا ہے اور کفار کیلئے لفظ نصیب یعنی کچھ تھوڑا سا حصہ جس سے معلوم ہوا کہ کفار کو مسلمانوں کے مقابل پر فتح کبھی حاصل نہیں ہوئی ہاں کچھ تھوڑی تکلیف مسلمانوں کو پہنچ گئی ✦

خادع

۱۵۱ یخادعون۔ خادع۔ یخادعون یا مخادعۃ سے مراد ہے دھوکا دینا چاہتے ہیں دیکھو ۲:۹ اور خادع اسم فاعل ثلاثی ہے خدع سے جس کے معنی ہیں ختلہ واراد بہ المکروہ من حیث لا یعلم (ت) یعنی اسے چھپکر آ لیا اور اس سے ایسے معاملہ کا ارادہ کیا جسے وہ ناپسند کرتا ہے ایسے طریق سے جسے وہ نہیں جانتا۔ گویا اس کے اصل معنی ہیں چھپکر امر مکروہ کا وارد کرنا۔ پس ہمیں تشریح کو منظر رکھتے ہوئے جو ۲:۹ میں کی گئی ہے کہ جب ایک فعل اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو اس میں صرف اس فعل کا نتیجہ باقی رہ جاتا ہے اور فعلیہ جس سے وہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے مفقود ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف فعل خادع منسوب کرنے کا منشا صرف اس قدر ہے کہ وہ ان پر ایسا امر وارد کریگا جسے وہ ناپسند کرتے ہیں اور یا بر طبق جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا معنی یہ ہیں کہ وہ ان کو ان کے خداع کی سزا دیگا (ل) اور مخادعۃ کے مقابل پر جب خدعتہ کہیں تو مراد ہوتی ہے ظفرت بہ (ل) یعنی میں اس پر غالب آیا اور ان تینوں میں سے کوئی سے معنی لئے جائیں مطلب وہی ہے اور خدع کا استعمال لغت میں وسیع ہے۔ خدعت الضب کے معنی ہیں گوہ چھپگئی اور خدع الریق فی الفم کے معنی ہیں تھوک خشک ہوگئی۔ اور کان فلان الکریم ثم خدع میں خدع کے معنی ہیں امسک یعنی رُک گیا خدع المطر کے معنی ہیں بارش تھوڑی ہوئی اور السنون الخوادع کے معنی ہیں قحط کے سال جن کی خیر کم ہو کیونکہ بارش نہیں ہوتی اور حدیث میں جو آتا ہے الحرب خدعۃ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو جنگ میں دھوکہ کھا گیا تو اس کا قدم پھسل جاتا ہے یعنی دشمن کے مخفی وار سے اپنا بچاؤ کرنا چاہئے اور یا یہ لفظ خُدعۃ ہے اور مراد ہے کہ وہ اپنے اہل کو دھوکہ دینے والی چیز ہے (ل) ✦

خدع کی نسبت اللہ کی طرف

الحرب خدعۃ سے مراد

پچھلے رکوع کے آخر پر منافقوں کی دھوکہ بازی کا ذکر کیا تھا کہ کس طرح مسلمانوں کے دشمنوں کو ان پر چڑھا کر لاتے اور پھر کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں تو فرمایا کہ یہ مومنوں کو اس طرح دھوکہ دیکر گویا خدا کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں مگر وہ دھوکہ دے نہیں سکتے بلکہ آخر کار مغلوب ہو کر خود نقصان اٹھائینگے۔ سورۃ بقرہ کے شروع میں منافقوں کے ذکر میں فرمایا تھا یخدعون اللّٰہ والذین اٰمنوا اور یہاں صرف یخادعون اللّٰہ ہے مگر مطلب ایک ہے وہاں اس کی سزا بیان فرمائی تھی وما یخدعون الا انفسہم خدا کو کیا دھوکہ دینا ہے بلکہ اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں۔ یہاں بجائے ان الفاظ کے فرمایا وھو خادعہم مطلب وہی ہے کہ آخر ان دھوکہ بازی کا بُرا نتیجہ پاکر رہینگے ✦

وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوا كُسَالٰى يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللّٰهَ

اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے

۱۴۳ إِلَّا قَلِيلًا ۝ مُّذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَا إِلٰى هٰٓؤُلَاءِ وَلَا إِلٰى هٰٓؤُلَاءِ ۚ وَمَنْ

مگر بہت کم ۵۵۳ درمیان میں پریشان ہیں نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے اور جس کو

۱۴۴ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ۝ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَاءَ

اللہ گمراہی میں چھوڑ دے تو تو اسکے لئے ہرگز راہ نہ پائیگا ۵۵۳ اے لوگو جو ایمان لائے ہو مومنوں کو چھوڑ کر

مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ أَتُرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِينًا ۝

کافروں کو ولی نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ (کی سزا) کے لئے اپنے خلاف کھلی دلیل دیدو ۵۵۴

کسل — **۵۵۲** کسالی۔ کسلان کی جمع ہے۔ اور کسل کے معنی ہیں کاہلی یا بوجھل ہونا ایسے معاملہ میں جس میں سستی مناسب نہیں (غ)

رئاء — یراؤن۔ رای کے معنی دیکھا اور رئاء یا رئاء دوسروں کو دکھانا اور شائع کرنا (غ)، یعنی ایک کام کا کرنا اس غرض کیلئے کہ دوسرے لوگ دیکھ لیں +

نماز میں کسل اور راحت — جب منافقوں کی مسلمانوں کے ساتھ دھوکہ بازی کا ذکر کیا تو ساتھ ہی بتایا کہ وہ نماز میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف آتے ہیں تو اس کی غرض بھی صرف دھوکہ بازی ہے یعنی لوگ یہ خیال کریں کہ یہ مسلمان ہیں۔ اس لئے نماز میں خوش دلی یا شرح صدر کس طرح پیدا ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جبتک نماز میں انشراح اور خوشی کی کیفیت پیدا نہ ہو وہ نماز صرف دکھاوے کی ہے۔ نماز جو خدا کے حضور حاضر ہونے کا نام اور اس کے سامنے عاجزی کا اظہار ہے اگر اس میں ایسی کشش اور جذب پیدا نہ ہو کہ اس کی طرف انسان کھچا ہوا چلا جائے تو اس کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا اور بوجھ کے طور پر چند رکعت کا ادا کر لینا منافقوں سے مماثلت ہے۔ صحیح ایمان کا نشان یہ ہے کہ نماز میں راحت محسوس ہو۔ اور وہ کیفیت پیدا ہو جس کا ذکر قرۃ عینی فی الصلوٰۃ میں ہے +

ذب۔ مذبذب — **۵۵۳** مذبذب۔ ذب کے معنی دفع کرنا یا روکنا بھی ہیں اور طرد یا دور کرنا بھی (ل)، پس مذبذب وہ ہے جو دونوں طرف سے مطرود ہو (ل)، مگر امام راغب کہتے ہیں کہ مذبذب سے مراد مضطرب ہے کیونکہ ذبذبۃ جو اصل میں ہوا میں لٹکی ہوئی چیز کی آواز

ذباب — پر بولا جاتا ہے۔ ہر ایک اضطراب اور حرکت پر استعارۃً استعمال ہوتا ہے (غ)، اور ذباب (واحد ذبابۃ) اسی مادہ سے ہے اور مکھی کو کہتے ہیں +

یہاں بتایا کہ منافق کوئی صحیح راستہ قایم نہیں کر سکتا کبھی ایک طرف چلا جاتا ہے کبھی دوسری طرف ایمان کو اللہ تعالیٰ نے ثبات سے مثال دی ہے، اور اس سے اطمینان قلب پیدا ہوتا ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد۔ ۲۸) اور کلمہ طیبہ کو اس درخت سے مثال دی ہے جسکی جڑ مضبوط ہے اصلہا ثابت (ابراھیم ۲۴) اور کلمہ خبیثہ کو اس سے جس کو قرار نہیں مالہا من قرار (ابراھیم۔ ۲۶) پس یہی معیار ایمان کا ہے +

۵۵۴ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو ولی بنانے پر دیکھو ۳۹۹۔ منافقوں کے ذکر میں اس آیت کا لانا بتاتا ہے کہ یہ بھی ایک نفاق کی علامت ہے اور منافقوں کے ذکر میں پیچھے آچکا ہے کہ وہ کفار سے تعلقات پیدا کر کے عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں اسلام کے دشمنوں سے عزت کا خواہاں ہونا یہ بھی انکی لا ایت ہے

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۙ إِلَّا الَّذِيْنَ ١٤٥ ١٤٦

منافق آگ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہیں اور تو ان کیلئے کوئی مددگار نہیں پائیگا ۵۵؎ مگر وہ

تَابُوْا وَأَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَأَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ

جو توبہ کریں اور اصلاح کریں اور اللہ کے احکام کو مضبوط پکڑیں اور اپنی فرمانبرداری کو اللہ کیلئے خالص کریں تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں

وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًا ○ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَ ١٤٧

اور عنقریب اللہ مومنوں کو بڑا اجر دے گا اللہ تمہیں عذاب دیکر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور

الجزء السادس

اٰمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ○ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ ١٤٨

ایمان لاؤ اور اللہ قدر کرنے والا جاننے والا ہے ۵۶؎ اللہ بری بات کے مشہور کرنے کو کسی سے پسند نہیں کرتا

إِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ○ إِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوْهُ ١٤٩

سوائے اسکے جس پر ظلم کیا گیا اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۵۷؎ اگر تم بھلی بات کو ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ

درک - درج

۵۵؎ دَرْک اور دَرَج ایک ہی خیال کو ظاہر کرتے ہیں یعنی اس سے بھی مراد درجہ ہی ہے۔ مگر استعمال میں یہ فرق ہے کہ اوپر کی طرف جانے کے لحاظ سے دَرَج بولا جاتا ہے اور پستی کی طرف جانے کے لحاظ سے دَرْک اس لئے جنت کے درجات ہیں اور دوزخ کے دَرَکات اور دَرْک سمندر کی نہایت درجہ کی گہرائی کو بھی کہتے ہیں (غ)۔ اسی مادہ سے ادراک وغیرہ الفاظ ہیں۔

منافق ارتکاب کفر بھی کرتا ہے، در چھپکر اسلام کے ساتھ دشمنی بھی۔ پھر وہ اسلام کی صداقت کے نشان بھی دیکھتا ہے اس لئے سب سے نچلے طبقہ میں ہے۔ ذلیل ترین لوگ دنیا میں بھی وہی ہیں جو منہ سے کچھ کہتے ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ آج مسلمانوں کے اسلام میں کس قدر اخلاص ہے؟ اگلی آیت میں لفظ اخلاص لاکر صاف اس طرف اشارہ کیا ہے۔

عذاب کی غرض اصلاح ہے

۵۶؎ چونکہ منافقوں کا ذکر تھا اور ابھی ان کو یہ کہا گیا تھا کہ ان کے لئے آگ کا سب سے نچلا طبقہ ہے اس لئے اب بتاتا ہے کہ اس قدر شدید وعید کے باوجود بھی اگر یہ لوگ شکر کریں اور ایمان لائیں تو پھر اللہ کو کوئی ضرورت نہیں کہ ان کو عذاب دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عذاب کی اصل غرض انسان کی اصلاح ہے نہ کچھ اور۔ اگر انسان اپنے نفس کی اصلاح خود کرلے تو عذاب بھی ٹل جاتا ہے دوزخ کا عذاب اسی کمی کو پورا کرنے کیلئے ہے جو شکر اور ایمان کے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ شکر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کی جاتی اور ہر ایک طاقت سے اپنے محل اور موقعہ کے مطابق کام لیا جاتا دیکھو ۵۷؎ اور ایمان کا یہ تقاضا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کیا جاتا۔

جہر

۵۷؎ الجہر۔ جہر کسی چیز کے ظہور کو کہا جاتا ہے حاسۂ بینائی کی افراط سے ہو یا شنوائی کی۔ اول کی مثال ہے حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (البقرۃ ۲ - ۵۵) اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (النساء ۴ - ۱۵۳) یہاں شنوائی کے لحاظ سے ہے ایسا ہی مَنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ (الرعد ۱۳ - ۱۰) يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ (الانبیاء ۲۱ - ۱۱۰) وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا (بنی اسرائیل ۱۷ - ۱۱۰) وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ (الحجرات ۴۹ - ۲) اور جہیر الصوت بلند آواز والے کو کہتے ہیں (غ)، مگر یہاں مراد صرف اعلان ہے خواہ آواز سے ہو یا تحریر سے

۱۵۰ اَوۡ تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيۡرًا ○ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡفُرُوۡنَ

یا بدی سے درگزر کرو تو بیشک اللہ معاف کرنے والا قدرت والا ہے ۷۵۸ وہ لوگ جو اللہ اور اس کے

بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يُّفَرِّقُوۡا بَيۡنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ

رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اسکے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر

۱۵۱ بِبَعۡضٍ وَّنَكۡفُرُ بِبَعۡضٍ وَّيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَّخِذُوۡا بَيۡنَ ذٰلِكَ سَبِيۡلًا ○ اُولٰٓئِكَ

ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان راہ نکالیں وہ

۱۵۲ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا ○ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ

سچ مچ کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے رسوا کرنیوالا عذاب تیار کر رکھا ہے ۷۵۹ اور جو لوگ اللہ اور اسکے رسولوں پر

وَرُسُلِهٖ وَلَمۡ يُفَرِّقُوۡا بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ اُولٰٓئِكَ سَوۡفَ يُؤۡتِيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ○

ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے یہی وہ ہیں جن کو اللہ انکے اجر دیگا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے۔

قانون ازالہ حیثیت عرفی کا

یہ آیت قانون ازالہ حیثیت عرفی کی بنیاد ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے کی نسبت کسی بری یعنی ہتک آمیز بات کو شہرت دے سوائے اس کے کہ ایک شخص مظلوم ہو یعنی اس کو نقصان پہنچا ہے تو اس کو حق ہے۔ کہ وہ ظالم کی نسبت ہتک آمیز بات کا اعلان کرے مگر اس سے مراد وہی ہتک آمیز باتیں ہیں جو سچ ہیں ورنہ جھوٹ بات کہنے کا کسی صورت میں بھی حق نہیں۔ منافقوں کے ذکر میں اس آیت کا کیا تعلق ہے؟ بات یہ ہے کہ کئی رکوعوں میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے حالات کو کھول کر بیان فرمایا اور جو کچھ ان کی چھپی ہوئی بدیاں تھیں ان کو ظاہر کیا اب ان کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے یہ سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خفیہ بدیوں کا یوں اعلان نہ کرتا اگر یہ لوگ ظالم نہ ہوتے ان کی شرارتوں کا کھلا ذکر اس لئے کرنا پڑا کہ یہ مسلمانوں پر ظلم کر رہے تھے اور ان کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔ آخر میں صفات سمیع علیم لانے سے مسلمانو کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

۷۵۸ یہاں اسی اپنے قانون کو اور واضح کر کے بیان فرمایا ہے کہ کسی کے متعلق بھلی بات ہو تو اس کو بیشک ظاہر کر دیا جائے یا چھپاؤ اگر کسی نے بدی کی ہو تو اسے حتی الوسع معاف کرو۔ یہ وہ طریق ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ گویا بری بات کی تشہیر سے ہی نہیں روکا اسے معاف کرنے کی بھی ہدایت کی ہے ہاں اگر عفو سے اصلاح نہ ہوتی ہو اور ظلم انتہا کو پہنچ جائے تو پھر بیشک ظاہر کرے۔

۷۵۹ یہود و نصاریٰ اور منافقین کے باہم تعلقات تھے۔ اس لئے منافقوں کے ذکر کو ختم کر کے اب یہود و نصاریٰ کا ذکر اگلے رکوع میں شروع ہوتا ہے مگر ان آخری آیات میں ربط مضمون کو قائم کیا ہے۔ تعلقات کو چھوڑ کر حالت کے لحاظ سے منافقین اور یہود وغیرہ میں یہ تعلق تھا کہ دونوں ایمان اور کفر کے بین بین رستہ اختیار کر رہے تھے جس کی طرف الفاظ یریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا میں اشارہ کیا ہے۔ منافق تو یوں کہ کبھی ایمان لائے کبھی کافر ہو گئے یا ظاہر میں ایمان لائے اندر سے کافر رہے۔ اور یہود و نصاریٰ یوں کہ بعض رسولوں پر ایمان لائے اور بعض کا کفر کیا۔ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق

ع ٢٢

یہود کی زیادتیاں اور مسیح کا قتل وصلب

يَسْـَٔلُكَ أَهْلُ الْكِتٰبِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسٰىٓ أَكْبَرَ مِنْ ١٥٣

اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے ایک کتاب اتارے سو موسیٰ سے انہوں نے اس سے بھی بڑھکر سوال

ذٰلِكَ فَقَالُوٓا أَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ

کیا اور کہا کہ اللہ کو ہمیں کھلا کھلا دکھاؤ سو انکے ظلم کی وجہ سے انکو عذاب نے آپکڑا پھر انہوں نے بچھڑا بنالیا بعد

بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ وَاٰتَيْنَا مُوسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ○ وَرَفَعْنَا ١٥٤

اسکے کہ انکے پاس کھلی دلیلیں آچکی تھیں لیکن ہم نے یہ معاف کردیا اور موسیٰ کو کھلا غلبہ دیا اور ہم نے انکے

فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا

اقرار کے وقت پہاڑ کو ان پر بلند کیا اور ہم نے انکو کہا کہ فرمانبرداری کرتے ہوئے دروازہ میں داخل ہو جاؤ اور ہم نے انکو کہا کہ سبت کے بارے

فِى السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ○ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ ١٥٥

میں حد سے نہ گزر جانیو اور ہم نے ان سے مضبوط وعدہ لیا سو انکے عہد کو توڑ دینے کی وجہ سے اور اللہ کی آیتوں کا انکار

اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ

کرنے اور انکے نبیوں کو ناحق قتل کرنے اور انکے یہ کہنے سے کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں بلکہ اللہ نے انکے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگادی

فَلَا يُؤْمِنُوْنَ إِلَّا قَلِيْلًا ○

سو وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں من٦٦٠

سے مراد صرف یہی نہیں کہ اللہ کو مان لیا اور رسولوں کا انکار کر دیا جیسے برہمو ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہ بعض رسولوں کو مان لیا اور بعض کا انکار کر دیا جیسے تمام اہل کتاب کی حالت ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اللہ کے کسی رسول کا انکار گویا اللہ کا ہی انکار ہے۔

لکھی لکھائی کتاب کے اُتارنے کا سوال اور اس کا جواب

من٦٦٠ ان تمام امور کا ذکر سورۃ بقرہ میں ہو چکا ہے۔ یہاں چونکہ حضرت مسیح کے متعلق ان کے جرم کا ذکر کرنا تھا اس لئے خلاصتہً ان کے پہلے جرموں کو بھی دوہرایا ہے۔ اور کتاب آسمان سے اُتارنے سے مراد یہ ہے کہ کاغذوں پر لکھی لکھائی کتاب آسمان سے اُترے جو گویا خدا نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہو تو فرمایا کہ یہ ایسا ہی سوال ہے جیسا موسیٰ سے کیا تھا کہ خدا کو آنکھوں سے کھلا کھلا دکھیں جس طرح خدا تعالیٰ کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا اسی طرح اس کا کلام بھی اس طرح پر لکھا ہوا نازل نہیں ہوتا جس طرح انسانوں کی بنائی ہوئی کتابیں ہوتی ہیں بلکہ وہ رسول کے قلب پر بتوسط جبرائیل نازل کیا جاتا ہے چنانچہ یہ جواب صفائی سے اگلے رکوع کی پہلی آیت میں دیا ہے انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح .... یعنی تمہاری طرف اسی طرح وحی ہوئی ہے جس طرح پہلے انبیاء کی طرف ہوئی تھی۔

١٥٦ ١٥٧ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى

اور ان کے کفر کے سبب اور انکے مریم پر بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے ۷۶۱ اور انکے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے عیسٰی ابن مریم

ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ط

اللہ کے رسول کو قتل کر دیا ہو اور انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ اسے صلیب پر مارا مگر وہ انکے لئے اس جیسا بنا دیا گیا ۷۶۲

حضرت مریم پر بہتان

۷۶۱ ان کے کفر سے مراد حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نسبت انکار ہو جیسا آگے ذکر آئیگا اور حضرت مریم پر بہتان یہ تھا کہ انکو نعوذ باللہ من ذلک زنا سے متہم کرتے تھے۔ یہودیوں کی روایات سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے ان کو یوسف کے متعلق متہم کیا ہو یعنی شادی سے پہلے یوسف کے ساتھ کسی ناجائز تعلق ہونے پر الزام لگایا ہو بلکہ مسیح کی ایک سوانحعمری یہودی نقطہ خیال سے لکھی ہوئی کچھ عرصہ ہوا طبع ہوئی تھی۔ اس میں ایک یہودی پنیتھر نام کے ساتھ ناجائز تعلق ہونے کا اتہام حضرت مریم صدیقہ پر لگایا گیا ہو۔ قرآن کریم نے اس کو بہتان عظیم قرار دیکر حضرت مریم کا دامن پاک کیا ہو۔ اور یہ حضرت محمد مصطفٰے صلعم کا احسان عیسائیوں پر تھا جس کا معاوضہ اس ناشکر گزار قوم نے یہ دیا ہو کہ اس پاکوں کے سردار محمد صلعم پر طرح طرح کے ناپاک اتہام لگائے۔ مگر سچ ہو پاکوں کے مُنہ سے پاک باتیں ہی نکلتی ہیں اور ناپاکوں کے مُنہ سے ناپاک +

قتل

۷۶۲ قتلوہ۔ قتل کے معنی ہیں کسی شخص پر موت وارد کرنا ضرب سے یا پتھر سے یا زہر سے یا کسی وجہ سے (ل۔ت) یا جسم سے روح کو الگ کرنا (غ)

صلب

صلبوہ۔ صَلَب کے معنی ہیں الصدید الذی یسیل من المیت یعنی رَم یا پیپ جو مردہ جسم سے نکلتی ہو والصّلب ھذہ القتلۃ المعروفۃ مشتق من ذلک لان ودکہ وصدیدہ یسیل (ل)، یعنی صَلْب قتل کرنے کا یہ مشہور طریق ہو جس کی تشریح کی حاجت نہیں، جو اسی سے مشتق ہو کیونکہ اس کی رم اور پیپ نکلتی ہو اور یہی تاج العروس میں ہو پس صَلْب لکڑی پر لٹکانے کا نام نہیں بلکہ قتل کرنے یعنی مارنے یا روح کو جسم سے الگ کرنے کا ایک خاص طریق ہو پس جس طرح کسی شخص کے قتل کی نفی سے مراد یہ ہو کہ اس کی موت بذریعہ قتل وارد نہیں ہوئی نہ یہ کہ اسے کسی نے تلوار بھی نہیں ماری اسی طرح ماصلبوہ میں نفی صرف اس بات کی ہو کہ اس کی

یہودیوں میں طرز صلیب

موت بذریعہ صلیب وارد ہوئی نہ اس بات کی کہ وہ لکڑی پر لٹکایا گیا ہو اور یہودیوں میں صلیب کی یہ طرز تھی کہ ایک ٹی کی شکل کی لکڑی پر یعنی + اس قسم کی لکڑی پر ایک شخص کو لٹکا دیا جاتا تھا اور اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں لگا دی جاتی تھیں۔ بائبل کے انسکلو پیڈیا میں ہو کہ لاش صلیب پر رہتی تھی یہانتک کہ بالکل سوکھ جاتی۔ اور یہودی انسکلو پیڈیا میں لکھا ہو کہ مصلوب کی موت بھوک اور طاقت کے زائل ہو جانے سے واقع ہوتی تھی اور لاش بعض وقت تین دن صلیب پر لٹکی رہتی تھی۔ ہاں موت جلد واقع کرنے کے لئے بعض وقت ٹانگیں توڑ دی جاتی تھیں پس اہل عرب یہود اور بائبل کے محاورہ کی رو سے مصلوب وہی شخص کہلا سکتا تھا جس کی موت اس ذریعہ سے واقع ہو جائے +

مسیح کی نفی قتل وصلیب

یہاں حضرت عیسٰی سے قتل وصلیب ہر دو کی نفی کی گئی ہو اور یہ عطف خاص علی العام ہو۔ گویا یہ بتایا ہو کہ ان دونوں طریقوں میں سے کسی طریق سے حضرت مسیح کی جان ان کے جسم سے جدا نہیں ہوئی نہ بذریعہ قتل۔ نہ بذریعہ صلیب۔ سوال یہ ہو کہ کیا اس سے ثابت ہوتا ہو کہ حضرت مسیح ابتک زندہ ہیں۔ کیا اگر ایک شخص کے متعلق کہا جائے کہ وہ قتل یا صلیب سے نہیں مارا گیا تو اس کی مطلق موت کی نفی ہو جاتی ہو؟ یہ کبھی کسی کے وہم میں بھی نہیں آسکتا۔ مگر تعجب یہ ہو کہ حضرت مسیح کی نفی قتل وصلب سے ان کی موت کی نفی مراد لی جاتی ہو۔ حالانکہ قرآن شریف خود بتاتا ہو کہ اگر حضرت مسیح کی موت بذریعہ قتل وصلب واقع نہیں ہوئی تو کیا ہوا فرمایا ولکن شبہ لھم مگر وہ (یعنی مسیح) ان کے لئے مشابہ بنایا گیا جس کے معنی غلطی سے یوں کئے جاتے ہیں کہ کوئی شخص مسیح کا

وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ

اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے اسکے متعلق اختلاف کیا اسبارہ میں شک میں ہیں۔

مشابہ بنایا گیا۔ یہ صریح غلطی ایک قصہ کو ذہن میں رکھکر کی گئی ہو ورنہ الفاظ قرآنی اس کی ہرگز برداشت نہیں کرتے ضمیر جو شُبّہ میں ہو وہ صرف حضرت مسیح کی طرف جاسکتی ہو جن کا ذکر چل رہا ہو۔ اور کسی ایسے شخص کی طرف ہرگز نہیں جاسکتی جس کا ذکر قرآن شریف میں کہیں بھی نہیں بلکہ کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں جو مسیح کی جگہ قتل وصلیب کی موت سے مرا ہو۔ اور پھر تعجب پر تعجب یہ کہ اگر یہ معنی کئے جائیں تو ما قتلوہ وما صلبوہ کا جواب بھی کوئی نہیں بنتا۔ کیونکہ ان دونوں باتوں میں کیا تعلق ہو کہ مسیح قتل یا صلیب کی موت نہیں مرا۔ بلکہ ایک اور شخص مسیح کی طرح ہوگیا۔ اس دوسرے کے مقتول یا مصلوب ہونے کا یہاں اشارۃً تک نہیں ❖

انجیل کی شہادت کہ مسیح صلیب پر چڑھائے گئے مگر زندہ رہے۔

اب واقعات تاریخی کو لو تو کیسی صفائی سے ثابت ہوتا ہو کہ یہی معنی الفاظ قرآنی کے درست ہیں۔ ذیل کے واقعات بتاتے ہیں کہ مسیح صلیب پر چڑھائے گئے مگر مصلوب نہیں ہوئے بلکہ زندہ اُترے البتہ صلیب پر چڑھنے کی وجہ سے وہ مصلوب یا مقتول سے مشابہ ہوگئے۔ اوّل حضرت مسیح ایک روایت کے مطابق صلیب پر چھ گھنٹے (مرقس ۱۵: ۲۵) اور ایک روایت کے مطابق تین گھنٹے سے بھی کم رہے (یوحنا ۱۹: ۱۴) دوم یوحنا ۱۹: ۳۲ سے ثابت ہو کہ مسیح کے ساتھ جو دو چور صلیب پر لٹکائے گئے جب ان کو اُتارا گیا تو ان کی ٹانگیں توڑی گئیں تب ان کی موت واقع ہوئی مسیح بھی ساتھ ہی چڑھائے اور ساتھ ہی اُتارے گئے مگر ان کی ٹانگیں نہیں توڑی گئیں۔ سوم سپاہیوں میں سے ایک نے مسیح کی پسلی بھالے سے چھیدی تو اس سے لہو اور پانی نکلا۔ یوحنا ۱۹: ۳۴۔ یہ صریح زندگی کی علامت ہو۔ چہارم جب کسی نے پلاطوس کو جاکر کہا کہ مسیح صلیب پر مرگئے تو اس نے متعجب ہوکر شبہ کیا کہ اس قدر جلد کس طرح مرگئے مرقس ۱۵: ۴۴۔ پنجم مسیح کو دفن نہیں کیا گیا بلکہ ایک کھلی جگہ میں رکھکر سامنے ایک پتھر رکھدیا گیا جس سے ہوا اندر جاتی رہی مرقس ۱۵: ۴۶۔ حالانکہ جس کو دفن کیا جاتا ہو اس کے لئے ہوا کے آنے جانے کا راستہ نہیں رکھا جاتا۔ ششم جب تیسرے دن مریم مگدلینی وغیرہ آئیں تو پتھر کو دروازہ سے ہٹا ہوا پایا (مرقس ۱۶: ۴) جس سے معلوم ہوا کہ پتھر کو ہٹا کر مسیح کو اندر سے نکالا گیا۔ ہفتم یوحنا ۲۰: ۱۵ سے ثابت ہوتا ہو کہ مریم مگدلینی نے حضرت مسیح کو دیکھا تو انہیں باغبان سمجھا جس سے معلوم ہوا کہ آپنے بھیس بدلا ہوا تھا۔ ہشتم کئی دن بعد جب حواریوں نے مسیح کو دیکھا تو اس کے ہاتھوں پر کیلوں کے زخموں کے نشان باقی تھے (یوحنا ۲۰: ۲۵ سے ۲۸) نہم لوقا ۲۴: ۳۹-۴۴ سے ثابت ہو کہ واقعہ صلیب کے بعد حواریوں کے ساتھ ملکر آپنے بھنی ہوئی مچھلی اور شہد کھایا۔ دہم جلیل کو پیدل سفر کیا متی ۲۸: ۱۰ ❖

واقعات تاریخی اور اتمام حجت

اب ایک طرف یہ واقعات تاریخی ہیں کہ مسیح صلیب پر چڑھے مصلوب کی طرح ہوئے مگر مصلوب نہیں ہوئے یعنی صلیب پر مرے نہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہو کہ یہ اناجیل کے بیانات ہیں اور وہ محرف ومبدل کتابیں ہیں۔ اس لئے قابل قبول نہیں۔ محرف مبدل کے یہ معنی سمجھ لینا کہ ان میں جو کچھ واقعات تاریخی لکھے ہیں وہ سرتاپا غلط ہیں سخت غلطی ہو۔ تحریف عموماً عقاید کے معاملہ میں ہوتی ہو۔ اور واقعات تاریخی جن پر سب اناجیل کا اتفاق ہو محرف کہکر رد نہیں کئے جاسکتے۔ بھلا اگر یہ اناجیل محرف ہیں تو انجیل برنباس کیلئے کونسی سند قرآن شریف یا حدیث میں ہو کہ وہ غیر محرف ہو اور یہاں اتمام حجت تو یہود اور نصاریٰ پر کرنا مقصود ہو۔ اب عقاید کے معاملہ میں اتمام حجت دلائل سے ہوگا۔ اور واقعات تاریخی میں اتمام حجت کسی قوم کی مسلمہ تاریخ کی بنیاد پر ہو سکتا ہو۔ اب مسلمہ تاریخ وہ ہو جو عیسائیوں کو مسلم ہے۔ ان پر اتمام حجت یوں تو ہو سکتا ہو کہ انکو انکی اپنی کتابوں سے دکھایا جائے کہ یہ واقعات جن کو تم تسلیم کرتے ہو صاف بتاتے ہیں کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا لیکن اگر ان کے سامنے ایک نئی کہانی بنا کر رکھدی جائے کہ مسیح کا ہمشکل مصلوب ہوگیا تھا اور حضرت مسیح آسمان پر چلے گئے تو اس سے کہانی بنانے والا صرف اپنا دل خوش کرسکتا ہو

مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۝

انکو اس کا کوئی علم نہیں صرف گمان کے پیچھے چلتے ہیں اور انہوں نے اس کو یقینی طور پر قتل نہیں کیا۔ ۶۲۳

دوسری قوم پر اس سے کچھ اتمام حجت نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کا کمال تو یہ ہے کہ عیسائیوں پر اتمام حجت انہی کی تاریخ کو پیش کرکے کیا ہے ایک اُمی کا دوسری قوم کی کتابوں کی ایسی باریک باتوں تک پہنچنا بالکل ناممکن تھا۔ یہ خدائے عالم الغیب کا ہی کام تھا +

مسیح کے ہمشکل کا قصہ

دوسری طرف جو روایت پیش کی جاتی ہے نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں نہ انجیل میں نہ کسی تاریخ میں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مسیح کا ہمشکل کسی کو بنا دیا گیا کہ یہودی اسے صلیب دے لیں۔ اس کی ضرورت کیا تھی؟ بھلا اگر کسی کو ہمشکل بنائے بغیر خدا تعالیٰ مسیح کو اُٹھا لیتا تو یہودی اس کو وہاں سے پکڑ لاتے۔ جو خدا نے ایک ہمشکل بنا کر ان کو دھوکہ میں ڈال دیا؟ پھر کیسی متضاد روایات بنائی گئی ہیں۔ ایک میں ہے کہ مسیح کے کہنے پر ان کے ایک حواری نے ہمشکل ہونا قبول کر لیا۔ اور مصلوب ہوا۔ ایک نبی اپنی جان بچا کر اپنے بے گناہ صحابی کو بے ضرورت مروا دے۔ یہ بے معنی ہی نہیں سخت قابل اعتراض ہے۔ اس لئے دوسری روایت یوں بنائی ہے کہ وہ ایک منافق تھا تیسری یوں کہ جو پکڑنے آیا تھا وہ ہمشکل بنا دیا گیا ان دونوں صورتوں میں شخص مذکور نے کچھ واویلا کیا کچھ پتہ نہ بتایا کہ میں کون ہوں؟ یہ پہلے سے بڑھکر تعجب کا مقام ہے اور ایک روایت میں ہے کہ یہودیوں نے جب مسیح کو نہ پایا تو خود ہی ایک یہودی کو پکڑ کر صلیب دیدیا تا کہ لوگوں کو پتہ نہ لگ جائے کہ مسیح آسمان پر چلا گیا ہے۔ اور کسی کو قریب نہ آنے دیا یہ سب اٹکل پچو باتیں ہیں۔ ایک بات پر اعتراض ہوا تو دوسری بنالی دوسری پر اعتراض ہوا تو تیسری بنالی۔ بھلا اگر مسیح حوالات میں نہ ملتے تو نتیجہ یہ نکالا جاتا کہ کہیں بھاگ گئے ہیں یا یہ کہ آسمان پر چلے گئے ہیں؟ آج تک کسی جیلخانہ کے مفرور کی نسبت یہ خیال کسی شخص نے نہیں کیا کہ وہ آسمان پر چلا گیا ہوگا۔ آسمان پر جاتے ہوئے تو ایک شخص نے بھی نہ دیکھا اور یونہی ان کے حوالات سے غائب ہو جانے پر سب لوگ سمجھ لیتے کہ ضرور آسمان پر ہی گئے ہیں یہ کس قدر بعید از قیاس بات ہے +

مسیح کے آسمان پر جانیکا ذکر قرآن میں نہیں

علاوہ ازیں خود قرآن شریف سے ثابت ہے کہ مسیح اگر مقتول مصلوب نہیں ہوا تو کیا ہوا۔ سورۃ آل عمران میں یٰعیسٰی انی متوفیک کا صریح وعدہ موجود ہے یعنی میں تجھ کو طبعی موت سے مارنے والا ہوں اور یہ وعدہ وہاں کیا جہاں اس سے پہلے یہود کی حضرت مسیح کے خلاف تدبیروں کا ذکر ہے۔ اور وہ تدبیریں مصلوب کرنے کی تھیں سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم مصلوب کی موت نہیں مروگے۔ بلکہ میں تم کو طبعی موت سے ماروں گا اور سورۃ مائدہ میں اس وعدہ کے پورا ہو جانے کا ذکر ہے فلما توفیتنی جب تو نے مجھ کو طبعی وفات دی۔ آسمان پر زندہ لیجانیکا نہ کہیں وعدہ ہے نہ زندہ آسمان پر لے جانیکا کہیں ذکر ہے پس نفی قتل اور نفی صلب کرکے اور مقتول و مصلوب کا شبیہ قرار دے کر اور پھر طبعی وفات کا ذکر کرکے سارے معاملہ کو صاف کر دیا ہے +

حضرت مسیح کے مقتول ہونے میں شک

۶۲۳ وما قتلوہ یقینا کے معنی تو صاف ہیں ما قتلوہ قتلا یقینا یعنی انہوں نے حضرت عیسیٰ کو یقینی طور پر قتل نہیں کیا بلکہ شکی طور پر قتل کیا اور تاریخ سے ظاہر ہے کہ خود ان کے اندر شکوک پیدا ہو چکے تھے امام راغب نے یوں معنی کئے ہیں۔ ما علموا کونہ مصلوبا علما یقینا یعنی اس کے مصلوب ہونے کو علم یقینی کے ساتھ نہیں جانا اور یہ معنی بھی سیاق عبارت کے لحاظ سے درست ہیں کیونکہ پیچھے شک کا ذکر ہے۔ اور بعض نے قتلوہ میں ضمیر کو علم کی طرف پھیرا ہے۔ کیونکہ قتلت العلم او قتلت کذا علما کے معنی ہیں وہ اس کا پورا علم حاصل کیا (غ) اور دونوں معنوں کے لحاظ سے مطلب ایک ہی ہے پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے اسے یقینی طور پر قتل نہیں کیا یعنی قتل شکی رہا اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ کہ اس کے قتل ہو جانے کے بارہ میں ان کو یقین نہیں ہوا وہ شک میں رہے کسی دوسرے کے قتل کا کوئی ذکر یہاں نہیں +

شک کا ہونا آسمان پر جانے کو غلط ٹھہراتا ہے

اختلاف کرنے والے لوگ یہود و نصاریٰ دونوں ہیں سو تاریخ سے ثابت ہے کہ فی الواقع دونوں شک میں تھے

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا ۱۵۹

بلکہ اللہ نے اسے اپنا قرب عطا فرمایا اور اللہ غالب حکمت والا ہے ۶۶۴ اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر وہ

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝

اپنی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لاتا ہے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا ۶۶۵

اور کسی کو بھی قتل کا یقین نہیں ہوا تین گھنٹے کے اندر اندر صلیب سے اتر آنا۔ ٹانگیں نہ توڑا جانا۔ پیلاطوس کا شک کرنا۔ پتھر کا ہٹا ہوا پایا جانا۔ حواریوں سے خفیہ ملاقاتیں۔ کیا یہ صحیح امور نہیں جن کا لازمی نتیجہ شک ہونا چاہئے۔ جو دونوں گروہوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ اگر مسیح آسمان پر چلے گئے تھے اور ان کا ہمشکل مصلوب ہوا تھا تو شک کیسا اور علم کا نہ ہونا کیا معنی اور عدم یقین کی کیا وجوہات تھیں؟ یا تو یہودیوں نے مسیح کو آسمان پر جاتے دیکھا ہوگا تو ان کو یقین ہوگا کہ مسیح مصلوب نہیں ہوا اور یا نہیں دیکھا تو ان کو یقین ہوگا کہ مسیح مصلوب ہو گئے دونوں صورتوں میں شک کوئی نہیں۔ رہے عیسائی ان کو تو اس قصہ کی رو سے یقین تھا کیونکہ یہ سارا قصہ حواریوں کے سامنے ہوا کہ ایک مسیح کا ہمشکل ہو گیا پس وہ تو یقین کے ساتھ جانتے ہونگے کہ مسیح مصلوب نہیں ہوا ان کو بھی شک کوئی نہیں ہو سکتا۔ شک کی صورت صرف وہی ایک ہے جو اوپر بیان ہوئی اور جس کا یقینی ثبوت اناجیل سے ملتا ہے۔

بل　**۶۶۴** بل اضراب کے لئے آتا ہے اور اس سے مراد کبھی پہلے خیال کا ابطال ہوتا ہے اور کبھی ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف انتقال۔ پہلے کی مثال ہے وقالوا اتخذ الرحمٰن ولدا سبحانہ بل عباد مکرمون۔ اور دوسرے کی قد افلح من تزکی وذکر اسم ربہ فصلی بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا (مغنی)۔

رفع　رفعہ اللہ الیہ پر دیکھو ۴۲۵ اور ابن جریر نے ابن جریج سے روایت کی ہے فرفعہ ایاہ توفیہ ایاہ وتطہیرہ من الذین کفروا یعنی اللہ تعالیٰ کے مسیح کے رفع کرنے سے مراد ہے ان کو وفات دینا اور کافروں سے ان کی تطہیر کرنا۔

رفع اور عدم مصلوبیت کا تعلق۔　پچھلے واقعات اور رفع مسیح میں کیا تعلق ہے؟ عام طور پر مفسرین نے یہ تعلق قایم کیا ہے کہ حضرت مسیح مقتول مصلوب نہیں ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ مگر یہ معنی رفع کے سراسر خلاف لغت ہیں اور ناقابل قبول۔ اصل بات یہ ہے کہ پیچھے ذکر اس بات کا تھا کہ یہودی ان کو مقتول و مصلوب سمجھتے ہیں مگر یہود و نصاریٰ دونوں کو ان کے مقتول و مصلوب ہونے کا یقین نہیں بلکہ اللہ نے اسے رفع عطا فرمایا یعنی بلندی درجات اب خواہ بل کو پہلے مضمون کے ابطال کیلئے سمجھا جائے اور خواہ انتقال کیلئے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو مصلوب مان کر اسے قرب الٰہی سے دور پھینکتے ہیں مگر اللہ نے اسے قرب عطا فرمایا۔ اب قرب بارگاہ الٰہی اور مصلوبیت ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لئے کہ یہودی جھوٹے مسیحوں کو مصلوب کرتے تھے۔ اور اس لئے بھی کہ استثناء ۲۱ : ۲۳ سے اور پھر گلتیوں ۳ : ۱۳ سے ثابت ہے کہ صلیب کی موت کو لعنتی موت سمجھا جاتا تھا۔ اور لعنت کا مفہوم اللہ تعالیٰ سے دوری ہے پس لعنت کے ابطال کیلئے رفع کا ذکر کیا۔ کیونکہ لعنت دوری ہے اور رفع قرب۔

حضرت ابوہریرہ کا قول متعلق نزول مسیح　**۶۶۵** حضرت ابوہریرہ کی طرف ایک روایت منسوب ہے جس میں نزول ابن مریم کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا فاقرؤا ان شئتم وان من اھل الکتاب یعنی جہاں رسول اللہ صلعم سے یہ روایت کی کہ ابن مریم حکم عدل ہو کر نازل ہوگا کسر صلیب کریگا اور قتل خنزیر کرے گا۔ اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔ تو ساتھ اپنی طرف سے بڑھایا کہ چاہو تو یہ آیت پڑھ لو کہ اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر وہ اپنی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لاتا ہے یا لائے گا اور مراد اس سے یہ لی گئی ہے کہ سب یہودی حضرت عیسیٰ پر

١٦٠ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ

سو ان لوگوں کے ظلم کی وجہ سے جو یہودی ہوئے ہم نے ان پر اچھی چیزیں جو ان کے لئے حلال کی گئی تھیں حرام کر دیں

ان کے دوسرے نزول کے وقت ایمان لے آئینگے۔ جو شخص یہ روایت بیان کرتا ہو۔ کہ نازل ہونے والا ابن مریم تمہارا امام تمہیں میں سے ہوگا وہ یہ عقیدہ نہیں رکھ سکتا کہ حضرت عیسیٰ خود دوبارہ آئینگے۔ پس حضرت ابوہریرہ کا مطلب اس آیت کی طرف توجہ دلانے سے یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت عیسیٰ کے دوسرے نزول میں سب یہودی ایمان لے آئینگے۔ علاوہ ازیں یہاں صاف فرمایا کہ یوم القیامۃ یکون علیہم شہیدا۔ کہ مسیح قیامت کے دن ان پر گواہ ہونگے۔ کن پر؟ یہودی مراد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ دوسری جگہ خود بتا دیا کہ وہ کون لوگ ہیں جن پر حضرت عیسیٰ گواہ ہونگے۔ وکنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم (المائدۃ ۵ - ۱۱۷) یعنی عیسائی لوگ حضرت عیسیٰ کی اپنی اُمت پس یہاں اہل کتاب سے یہودی ہرگز مراد نہیں۔ عیسائی مراد ہیں۔ اور پھر یہودیوں کا حضرت عیسیٰ پر دوبارہ نزول کے وقت ایمان لانا بے معنی ہو۔ اگر دوبارہ نزول فرض بھی کر لیا جائے تو ایمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ لائینگے۔ نہ حضرت عیسیٰ پر۔ اُس وقت حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہوئے کہ اس وقت کے نبی حضرت عیسیٰ ہونگے حالانکہ عام عقیدہ کے مطابق بھی وہ محض مجدد ہو کر آئینگے نہ نبی ہو کر پھر ان پر ایمان لانے کے کیا معنی۔ اور پھر جو حضرت عیسیٰ پر ایمان لائینگے یہاں لکھا ہو کہ حضرت عیسیٰ ان پر قیامت کے دن شہید ہونگے گویا اُمت محمدیہ کے ایک بڑے حصہ پر جو حضرت عیسیٰ کے ذریعہ سے مسلمان ہوگا شہید حضرت محمد مصطفےٰ صلعم نہ ہونگے بلکہ حضرت عیسیٰ ہونگے حالانکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید وجئنا بک علی ھؤلاء شہیدا (۴۱) یعنی ہر اُمت میں اس کا رسول شہید ہوگا اور آپ یعنی محمد مصطفےٰ صلعم ان پر یعنی اُمت محمدیہ پر شہید ہونگے مگر حضرت عیسیٰ کو دوبارہ لانے والے آنحضرت صلعم کو آدھی اُمت محمدیہ پر شہید ٹھہراتے ہیں اور باقی آدھی بلکہ زیادہ پر حضرت عیسیٰ کو شہید بناتے ہیں اور ساتھ ہی حضرت عیسیٰ کو اپنی ساری اُمت پر بھی شہید ٹھہراتے ہیں تلک اذا قسمۃ ضیزی۔ کاش مسلمان غور کرتے تو حضرت عیسیٰ کے نزول ثانی کا مسئلہ کس قدر آسان تھا +

> حضرت عیسیٰ اگر دوبارہ آئیں تو لوگ ایمان ان پر نہیں لائینگے بلکہ آنحضرت صلعم پر لائینگے۔

پھر یہ حصر کر کے سب یہودی ایمان لائینگے اول تو کروڑ ہا یہودی نزول سے پہلے مر چکے وہ کس طرح ایمان لائینگے۔ دوسرے قرآن شریف صاف فرماتا ہو وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ (آل عمران ۳ - ۵۴) پس حضرت عیسیٰ کے منکر بھی قیامت تک رہیں گے۔ اس لئے سب یہودیوں کا ایمان لانا صریح اس آیت کے خلاف ہو +

> ان من اھل الکتاب میں مراد عیسائی ہیں

جیسا کہ اوپر دکھایا گیا۔ یہاں اہل کتاب سے مراد عیسائی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں جب پھر یہودیوں کے ذکر کی طرف عود کیا تو صرف ضمیر پر اکتفا نہیں کیا نہ وہاں اہل کتاب کا لفظ استعمال کیا جیسے پہلے کیا تھا بلکہ صاف فرمایا فبظلم من الذین ھادوا اور مطلب صاف ہو کہ حالانکہ عیسائی خود حضرت عیسیٰ کے صلیب پر مرنے کے معاملہ میں شک میں ہیں اور انکو یقین نہیں مگر ان میں سے ہر ایک اس پر اپنی موت سے پہلے ایمان ضرور لاتا ہو۔ عیسائیت کی بنیاد حضرت مسیح کے مصلوب ہونے پر ہو۔ اگر مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تو نہ انہوں نے لوگوں کے گناہوں کی لعنت اٹھائی نہ وہ کفارہ ہو سکتے ہیں۔ اور موت سے پہلے کا لفظ اس لئے بڑھایا کہ موت سے پہلے ضرور ہو کہ پادری عیسائی عقیدہ کا اقرار کرائے پس مطلب صاف یہ ہے جو عین سیاق عبارت کے مطابق ہو کہ عیسائی خود شک میں ہی ہیں کہ صلیب پر موت واقع ہوئی یا نہیں مگر با ایں اس بات پر اپنی موت سے پہلے ایمان ضرور لاتے ہیں۔ گویا بتایا ہو کہ ان کا ایمان ان کی اپنی تاریخ کے خلاف ہو اور حضرت عیسیٰ قیامت کے دن ان پر گواہ ہونگے یعنی بتائینگے کہ کس طرح انہوں نے ان کی تعلیم کے خلاف اور واقعات کے خلاف ایک عقیدہ قایم کر لیا +

اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابوہریرہ نے صحیح معنی نہ سمجھے تھے۔ تو خود حضرت ابن عباس نے ان معنوں کی تردید

وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا ۝ وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ ۱۶۱

اور ان کے اللہ کی راہ سے بہت روکنے کیوجہ سے اور انکے سود لینے کی وجہ سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور ان کے لوگوں کا

أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ لَٰكِنِ ۱۶۲

مال ناحق کیساتھ کھانے کی وجہ سے اور ہم نے ان میں سے کافروں کیلئے دردناک دُکھ تیار کیا ہے ۶۶۶ لیکن

الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

ان میں سے علم میں پختہ لوگ اور مومن اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف نازل کیا گیا اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا

وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ ۚ وَالْمُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أُولَٰئِكَ

اور نماز کے قایم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور آخر کے دن پر ایمان لانے والے یہی وہ

سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ ۱۶۳

ع ۲۳ / ۳ — آنحضرت کو حق دیکر بھیجا گیا

ہیں جنکو ہم بڑا اجر دینگے ۶۶۷ بیشک ہم نے تیری طرف وحی کی جیسا ہم نے نوح اور اس سے پچھلے نبیوں کی طرف

مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ

وحی کی اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور (اسکی) اولاد

کی ہے۔ کیونکہ ابن جریر میں متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابن عباس اس کے معنی یوں کرتے تھے کہ ہر یہودی اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لاتا ہے کہ وہ خدا کے رسول تھے۔ اور دوسری قرأت قبل موتہم (ث) اس کی موید ہے اور حضرت ابن عباس کا فہم قرآن بہرحال حضرت ابوہریرہ سے بڑھکر ہے +

اور جو معنی میں نے کئے ہیں ان میں مضمون کا انتقال عیسائیوں کی طرف لیا گیا ہے اور یوم القیامۃ یکون علیہم شہیدا سے بہ ظاہر ہے اور اگلے رکوع کے شروع میں بھی اسی لئے عیسائیوں کے عقیدہ باطلہ کا ذکر ہے۔ گویا قرآن کریم نے اگر ایک طرف یہود کی تفریط کا ذکر کیا تو ساتھ ہی عیسائیوں کو بھی ان کے غلو پر ملزم کیا ہے +

طیبات جو یہود پر حرام کی گئیں

۶۶۶ کونسی اچھی چیزیں ان پر حرام کی گئیں اور کس لئے؟ وجہ تو خود بیان فرما دی کہ ان کے ظلم کی وجہ سے۔ اور سود اور ناحق مال کھانے سے۔ سود خوار ہو جانے کی وجہ سے اور لوگوں کا مال ناجائز لیکر ان میں دنیا کی محبت بہت بڑھ گئی ایثار اور قربانی کا مادہ کم ہو گیا۔ دوسری جگہ فرمایا ام لہم نصیب من الملک فاذا لا یؤتون الناس نقیرا (النسآء ۴۔ ۵۳) بادشاہت ان کو مل جے تو لوگوں کو نقیر بھی نہ دیں۔ ایسے بخیلوں کو حکومت نہیں ملا کرتی پس یہی وہ طیبات ہیں جو ان پر حرام کر دی گئیں۔ اور اسکے مقابل پر فرمایا کہ دردناک دکھ ہے سو وہ ذلیل اور دربدر ہونے کا دکھ ہے +

۶۶۷ یعنی یہودیوں اور عیسائیوں میں سے جو راسخ فی العلم ہیں نرے تقلید کے طور پر پیروں کے پیچھے نہیں لگے ہوئے بلکہ خود تحقیق کر لیتے ہیں وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں مقیمین الصلوٰۃ میں نصب علے المدح ہے کیونکہ یہاں پھر حق کی شناخت کا ذکر ہے اور وہ سوائے رجوع الی اللہ کے حاصل نہیں ہو سکتا

وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝

اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی اور ہم نے داؤد کو زبور دی ۶۹۸

وحی کے اقسام

۶۹۸ اوحینا۔ وحی کے اصل معنی الاشارۃ السریعۃ ہیں یعنی تیزی سے اشارہ کرنا۔ اور یہ کبھی محض رمز کے طور پر ہوتا ہو یا جوارح کے اشارہ سے جیسے حضرت زکریا کے ذکر میں فاوحی الیھم (مریم ۱۹-۱۱) اور کلمہ الٰہیہ جو انبیاء اور اولیاء کی طرف ڈالا جاتا ہو وہ بھی وحی کہلاتا ہو۔ اور یہ تین طرح پر ہوتا ہو جیسا کہ ماکان لبشر ان یکلمہ اللّٰہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا (الشوریٰ ۴۲-۵۱) سے ظاہر ہو (ع)۔ اور یہ تین قسم یہ ہیں اول دل میں ایک بات کا ڈالنا جیسے آنحضرت صلعم نے فرمایا ان روح القدس نفث فی روعی دوم من وراء حجاب جیسے رویا کشف الہام اسی میں وہ بشارات آتی ہیں جنکا ذکر حدیث میں ہو کہ اس اُمت میں بعد انقطاع نبوت وہ رہ گئی ہیں اور تیسرا بذریعہ رسول جسکو دیکھا جاتا ہو اور اسکا کلام سُنا جاتا ہو یعنی بذریعہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اور یہ تیسری قسم صرف انبیاء سے مخصوص ہو اور پہلی دو میں اولیاء اللّٰہ بھی شامل ہیں اور یہاں مراد یہی تیسری قسم کی وحی ہو جس سے انبیاء مخصوص ہیں +

آنحضرت صلعم کی وحی دیگر انبیاء کیطرح تھی

پچھلے رکوع کی آخری آیت میں یہ ذکر کیا تھا کہ اہل کتاب میں سے بھی جو محقق ہیں وہ آنحضرتؐ پر ایمان لاتے ہیں جیسے پہلے انبیاء پر ایمان لاتے ہیں۔ اس لئے اب فرماتا ہو کہ آنحضرت کی وحی کوئی الگ وحی نہیں۔ ساتھ ہی اہل کتاب کے اس سوال کا جواب ہو کہ ان پر آسمان سے کوئی کتاب اُتارو۔ جو پچھلے رکوع کے شروع میں ہو۔ اس کا جواب یہ دیا ہو کہ وحی آنحضرت صلعم کو اسی طرح ہوتی ہو جس طرح پہلے انبیاء کو ہوتی یہاں تک کہ موسیٰ کو بھی۔ آسمان سے کتاب نہ نوح پر اُتری اور نہ اسکے بعد کسی نبی پر نہ موسےٰ پر بلکہ جو طریق اللّٰہ تعالیٰ کے وحی کرنے کا ہے اسی طریق پر اب آنحضرتؐ کو بھی وحی ہوتی ہو۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہو کہ جسطرح تمہاری طرف توحید کی وحی ہوئی ہو اسیطرح سب انبیائے سابق کی طرف بھی توحید کی ہی وحی ہوئی تھی +

آنحضرتؐ سب انبیاء کے کمالات کے جامع ہیں

یہاں چند ایک نبیوں کا نام لیا ہے۔ اور اس میں اشارہ یہ ہو کہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان سب کے کمالات کے جامع ہیں سب سے پہلے نوح کا نام لیا کیونکہ وہ پہلے تاریخی نبی مرسل ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم جو آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے جد امجد اور سب قوموں کے نزدیک مسلّم بزرگ ہیں اور ان کی اولاد کا ذکر ہے۔ اور ان کے بعد حضرت عیسیٰ کا جو سلسلہ بنی اسرائیل بلکہ قومی نبیوں کے سلسلہ کے خاتم ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ کے بعد پھر ان سے پہلے نبیوں کا ذکر ہے اور ان کو درمیان میں رکھ کر یہ بتایا ہے کہ سب کی تعلیم ایک ہی تھی یعنی توحید الٰہی۔ اور حضرت عیسیٰ کے بعد حضرت ایوب کا ذکر کیا کہ اگر عیسےٰ نے کچھ تکلیفیں اُٹھائیں اور موت کی حالت تک پہنچے تو ایوب نے جو آپ سے بہت پہلے سلسلہ موسوی میں ہو چکے ان سے بھی بڑھکر تکلیفیں اُٹھائیں اور کمال صبر کا نمونہ دکھایا جس طرح حضرت عیسیٰ نے کمال روحانیت کا نمونہ دکھایا۔ اور یونس میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کی قوم تباہ کرنے والے عذاب سے بچ گئی۔ اور ہارون میں خصوصیت ان کی عبادات کی امامت ہو اور سلیمان اور داؤد میں نبوت کے ساتھ شان وشوکتِ سلطنت ہے اور سلیمان کا نام پہلے اس لئے لیا کہ ان کی شان وشوکت بہت بڑھ کر تھی اور داؤد کا خصوصیت سے الگ ذکر اس لئے کیا کہ آپ کی کتاب میں آنحضرت صلے اللّٰہ علیہ وسلم کا ذکر بہت ہے اور وہ تمام کمالات جو ان انبیاء میں الگ الگ تھے۔ ان سب کے جامع آنحضرت صلے اللّٰہ علیہ وسلم ہوئے +

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللّٰهُ ۱۶۴

اور کچھ رسول ہیں جن کا حال ہم تجھ سے پہلے بیان کر چکے ہیں اور کچھ رسول ہیں جنکا ذکر ہم نے تجھ سے نہیں کیا اور اللہ نے موسیٰ

مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ ۱۶۵

سے بہت باتیں کیں ۷۶۹ رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں کو رسولوں کے بعد اللہ پر

حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ ۱۶۶

کوئی عذر ۷۷۰ نہ رہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے ۷۷۱ لیکن اللہ اسکے ساتھ گواہی دیتا ہے جو اسنے تیری طرف

اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ اِنَّ ۱۶۷

نازل کیا کہ اسے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا اور فرشتے گواہی دیتے ہیں اور اللہ ہی کافی گواہ ہے ۷۷۲ وہ

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝ اِنَّ ۱۶۸

لوگ جنہوں نے انکار کیا اور اللہ کی راہ سے روکا وہ گمراہی میں دور نکل گئے وہ

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝

لوگ جنہوں نے انکار کیا اور ظلم کیا۔ اللہ ایسا نہیں کہ انکو بخش دے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے۔

دوسری قوموں میں نبی

۷۶۹ اس آیت میں ایک تو یہ ذکر کیا ہے کہ ہم نے سب رسولوں کا ذکر قرآن شریف میں نہیں کیا جس سے معلوم ہوا کہ اور قوموں میں بھی خدا کے رسول ہوئے ہیں۔ اور اسکی تفسیر ان من امۃ الا خلا فیھا نذیر (فاطر ۳۵ – ۲۴) میں ہے اور یہاں اس امر کا خاص ذکر کرنے سے یہ مقصود ہے کہ آنحضرت صلعم صرف انہی رسولوں کے کمالات کو اپنے اندر نہیں رکھتے جنکے نام یہاں یا دوسری جگہ لئے گئے ہیں بلکہ کل انبیائے عالم کے کمالات کے جامع ہیں۔ اور دوسرا ذکر حضرت موسیٰ کا الگ کیا اور انکے متعلق فرمایا کلم اللہ موسیٰ تکلیما اللہ نے موسیٰ سے بہت باتیں کیں یہ مطلب نہیں کہ کسی الگ طرز پر باتیں کیں۔ کیونکہ کلام تو سب رسولوں سے ایک ہی طرز پر ہوا یعنی بذریعہ جبرئیل اور بخاری کی روایت بھی اس پر شاہد ہے ھذا الناموس الذی نزل اللہ علی موسیٰ اور زیادہ باتوں کا ذکر اسلئے کیا کہ آنحضرت صلعم کو حضرت موسیٰ سے خاص مماثلت ہے۔ اور انکو بھی مفصل شریعت دی گئی اور انکی پیشگوئیاں آنحضرت صلعم کی نسبت اس کثرت سے ہیں کہ دوسرے کسی نبی کی نہیں۔

حضرت موسیٰ پر نزول جبرائیل

حجۃ

۷۷۰ حجۃ سے مراد یہاں عذر ہے جیسا کہ دوسری جگہ ہے ربنا لولا ارسلت الینا رسولا فنتبع اٰیٰتک (طٰہٰ ۲۰ – ۱۳۴) رسولوں کی تبشیر اور انذار پیغام رسانی سے زائد ایک بات ہے اور پیغام کی تائید ہے تاکہ پورا پورا اتمام حجت ہو جائے۔

صداقت قرآن پر اللہ تعالیٰ کی گواہی

۷۷۱ قرآن کی صداقت پر خود قرآن ہی گواہ ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا علم کامل ظاہر کیا ہے تا آخر دنیا دیکھ لیگی کہ جو کچھ قرآن میں بتایا گیا تھا وہی حق ثابت ہوا۔ یہ اللہ کی گواہی ہے جو اس کے فضل سے ظاہر ہو گی آج کتنی باتیں دین اسلام کی حق ثابت ہو چکی ہیں جن کو ایک زمانہ میں غلط سمجھا گیا تھا۔ تثلیث اور کفارہ کے بطلان کو خود عیسائی قبول کرتے جا رہے ہیں اور توحید اور عمل کا سکہ دنیا پر جمتا جاتا ہے۔

۱۶۹ ۱۷۰ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۞ يٰۤاَيُّهَا

مگر دوزخ کی راہ اس میں ابد تک رہینگے اور یہ اللہ پر آسان ہے ۶۷۲ اے

النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا

لوگو رسول تمہارے رب کی طرف سے حق لیکر تمہارے پاس آیا سو ایمان لاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور اگر تم انکار کرو

۱۷۱ فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۞ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ

تو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے اے اہل کتاب

لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ

اپنے دین میں غلو مت کرو اور اللہ پر جھوٹ نہ باندھو ہاں حق (کہو) ۶۷۳ مسیح عیسیٰ بن مریم

مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ز

صرف اللہ کا رسول اور اسکی پیشگوئی ہے جو اس نے مریم کی طرف القا کی اور اسکی طرف سے روح ہے ۶۷۴

۶۷۲ انکار اور ظلم کا نتیجہ اگر وہی ہو جو ایمان اور احسان کا ہے تو پھر امن ہی اٹھ جاتا ہے۔ فعل ظلم و انکار کا ہو تو اس کا نتیجہ بھی ویسا ہی ہوگا۔ انکار اور ظلم طریق جہنم ہے پس اس پر چل کر جہنم میں ہی پہنچے گا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے صاف اور واضح قانون کا ذکر کیا ہے ؎ گندم از گندم بروید جو ز جو + واز مکافات عمل غافل مشو۔ اسکے لئے دیکھو ۱۵۰۶ +

غلوّ۔ غلا — ۶۷۳ تغلوا۔ مادہ غلا ہے اور غلوّ حد سے تجاوز کو کہتے ہیں۔ اور یہ جب کسی چیز کی قیمت میں ہو تو غلاء کہلاتا ہے اور جب قدر

غلی — و منزلت کے متعلق ہو تو غلوّ۔ اور فعل دونوں سے غلا یغلو آتا ہے اور غلی اور غلیان ہانڈی کے جوش میں آنے پر بولا جاتا ہے اسی سے ہے یغلی فی البطون کغلی الحمیم (الدخان ۴۴۔ ۴۵-۴۶) +

قال علیہ — تقولوا علی اللہ۔ قال علیہ کے معنی ہیں اس پر افترا کیا یا جھوٹ بنایا +

رکوع کی اس آخری آیت میں عیسائیت کی طرف مضمون کو منتقل کیا ہے اور بتا دیا ہے کہ سب انبیاء کی وحی کے ذکر میں یہی مقصود تھا کہ سب کی تعلیم توحید ہی تھی۔ اور یہ بھی کہ سب دنیا میں نبی آئے صرف ایک قوم کی طرف نہیں اور انسان کو خدا بنانے والے تثلیث کی تعلیم کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں یہ ان کا افترا ہے اور صرف بنی اسرائیل میں رسولوں کا آنا مانتے ہیں۔ اور

عیسائیوں کا عقیدہ کہ مسیح ملعون ہوا — یہ بھی بتا دیا کہ اگر یہود تفریط کرکے اور حضرت مسیح کا انکار کرکے غلط راہ پر چلے تو ایک دوسری قوم نے اس مسیح کے حق میں غلو کیا اور کس قدر عجیب بات ہے کہ اگر یہود نے مسیح کو مصلوب مان کر نعوذ باللہ من ذٰلک مفتری اور ملعون قرار دیا تو عیسائیوں نے بھی اسے مصلوب مان کر لعنت کو قبول کیا اور کہا کہ وہ ہمارے لئے ملعون ہوا۔ ایک طرف خدا اور دوسری طرف ملعون نعوذ باللہ من ذٰلک

روح — ۶۷۴ روح منہ۔ رُوح اور ریح ایک ہی مادہ سے ہیں اور روح کا لفظ کئی معنی میں استعمال ہوا ہے نفس یعنی سانس اور وہ جس سے انسان زندہ ہے یعنی جان اور اس کے معنی وحی یا امر نبوت بھی آتے ہیں اور قرآن کو بھی روح کہا گیا ہے اور

حضرت عیسیٰ کے روح ہونے سے مراد — اس کے معنی رحمت بھی ہیں (ل)، اور روح منہ سے مراد ہوتی اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح ہے اور حضرت عیسیٰ کو روح منہ

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ

سو اللہ اور اسکے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو تین ہیں باز آجاؤ تمہارے لئے بہتر ہو اللہ صرف ایک ہی معبود ہو وہ اس سے پاک ہو

اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۠

کہ اسکا بیٹا ہو　جو کچھ آسمانوں میں ہو اور جو کچھ زمین میں ہو اسی کا ہو　اور اللہ ہی کافی کارساز ہو ۶۶۵

کہا گیا ہو جس سے مراد اس کے نزدیک رحمت ہو دل، اور لوگوں نے بھی یہاں رحمت مراد لی ہے کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے ورحمۃ منا (مریم ۱۹-۲۱) اور اگر مراد حیات لی جائے تو جس طرح حضرت آدم کے متعلق فرمایا ونفخت فیہ من روحی۔ (الحجر ۱۵-۲۹) اور جس طرح ہر بشر کے متعلق فرمایا ثم جعل نسلہ من سللۃ من ماء مہین ثم سواہ ونفخ فیہ من روحہ (السجدۃ ۳۲-۸-۹) اسی طرح حضرت مسیح کو روح منہ فرمایا اور وحی اور روح منہ دونوں کا ایک ہی رنگ ہو اور اضافت بربیل تشریف ہے اور خصوصیت سے اس ذکر کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہود حضرت مریم پر زنا کا الزام لگاتے تھے۔ اور زنا کی اولاد کو بوجہ تقدیس ذات باری اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا تو یہ بتایا کہ وہ جائز تعلق سے ہو نا جائز تعلق سے نہیں آدم کے ذکر میں بھی اپنی روح پھونکنے سے یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ عیسائی عقیدہ جو آدم کو فطرتاً گنہگار ٹھہراتا ہو صحیح نہیں کیونکہ اس میں خدائی روح ہے یعنی وہ روح جو فطرتاً پاک ہو پس جس طرح ایک غلط عقیدہ کی تردید کے لئے آدم میں اپنی روح قرار دی اسی طرح ایک ناپاک خیال کی تردید کے لئے مسیح کی روح کو اپنی طرف منسوب کیا +

تثلیث

۶۶۵ یہاں تثلیث کی صاف تردید کی اور خدا کے رسولوں پر ایمان لانے کو ضروری ٹھہرایا یعنی حضرت عیسیٰ کو بھی رسولوں میں سے ایک رسول مانو۔ یہ عیسائیوں کا اسلام پر افترا ہے کہ قرآن نے خدا اور مسیح اور مریم کو عیسائیت کی تثلیث سمجھا ہو۔ قرآن شریف نے مریم کی الوہیت کی تردید کی ہے مگر اس لئے کہ مریم کو خدا ماننے والا اس سے دعائیں مانگنے والا بھی ایک گروہ ہے۔ مریم کو تثلیث کا تیسرا اقنوم کہیں نہیں کہا۔ نہ تثلیث کے ذکر میں مریم کی الوہیت کا ذکر کیا ہو +

انتھوا میں صرف ایک زبردست حکم دیا ہو۔ اس کی تردید کے لئے علیحدہ دلائل نہیں دیئے سوائے اس کے کہ ابنیت سے اللہ تعالیٰ کو پاک بیان فرمایا کیونکہ تثلیث کی بنیاد مسیح کے بیٹا ہونے پر ہے۔ اور تثلیث ایک ایسی بدیہی البطلان چیز ہے۔ کہ اس کی تردید میں دلائل کی ضرورت بھی نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں۔ خدا باپ خدا بیٹا خدا روح القدس تین ہیں مگر تین خدا مت کہو بلکہ خدا ایک ہے۔ یہ تین میں ایک اور ایک میں تین۔ تین بھی ہیں اور ایک بھی۔ ایک ایسا معمہ ہے جو آج تک نہ کسی سے حل ہوا اور نہ ہوگا۔ عیسائیوں سے اس کی دلیل پوچھی جاتی ہو تو جواب ملتا ہو کہ عقل کو مذہب میں دخل نہیں۔ ایسا مذہب انسانوں کے لئے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مذہب کو خدا نے اسی مخلوق کے لئے بنایا ہو جس کو دوسری مخلوق سے عقل کا امتیاز حاصل ہو۔ اسی لئے قرآن شریف نے انتھوا کہکر چھوڑ دیا ہے جیسے بے سمجھ بچہ کو جو بے عقلی کی بات کرے حکم دے کر روکا جاتا ہے۔ ابنیت اور کفارہ کی دلائل دی جاتی ہیں اس لئے قرآن شریف نے بھی ان کا رد دلائل سے کیا ہو۔ تثلیث کی دلائل عیسائی بھی کوئی نہیں دیتے۔ زبردستی اسے منوانا چاہتے ہیں۔ اس لئے قرآن شریف میں بھی ان کو زور سے حکم ہی دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ میں صفات مختلفہ تو تمام خدا پرستوں نے مانی ہیں مگر اقانیم مختلفہ یا تین الگ الگ وجود صرف عیسائیوں کی ایجاد ہو۔ سورج کی کرنوں کی جو مثال وہ بعض وقت دیتے ہیں وہ صفات مختلفہ پر صادق آتی ہے نہ اقانیم متعددہ پر +

ع ٢٤ / ٤

مسیح اور حقانیت اسلام

١٧٢ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ

مسیح اس کو بُرا نہیں مناتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ ہی مقرب فرشتے اور جو کوئی اسکی

١٧٣ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ○ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

بندگی کو بُرا منائے اور تکبر کرے تو وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا کرے گا ٧٧٦ پھر جو ایمان لائے اور انہوں نے

الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا

اچھے کام کئے تو انکو وہ انکے اجر پورے دے گا اور اپنے فضل سے انکو زیادہ دیگا اور جنہوں نے بُرا منایا

١٧٤ وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ

اور تکبر کیا تو ان کو وہ دردناک عذاب دیگا اور وہ اللہ کے سوائے نہ کوئی

١٧٥ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ

دوست اور نہ مددگار پائینگے اے لوگو یقیناً تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ○

روشن دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف واضح کردینے والا نور نازل کیا ہے ٧٧٧

نکف۔ استنکاف

٧٧٦ یستنکف۔ نکف کے معنی علیٰحدہ کرنا ہیں۔ اور استنکاف کسی چیز سے عار رکھنے یا اس کو بُرا منانے کو کہتے ہیں (غ)۔ ✦

مسیح کا اقرار عبودیت

پچھلے رکوع کے آخر میں تثلیث کی غلطی کو رد کیا تھا جسکی بنا مسیح کی ابنیت پر ہے۔ اسلئے یہاں بتایا کہ کیا مسیح کو عبودیت سے کچھ عار تھی وہ اپنے لئے کوئی الگ مقام ابنیت کا تجویز کرتا۔ موجودہ اناجیل بھی اس پر شاہد ہیں کہ مسیح نے عبودیت کو کبھی عار نہیں سمجھا بلکہ اسکو اپنا فخر سمجھا ہے آخر یہ کس کا قول ہے کہ "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس اکیلے کی بندگی کر" (متی ۴: ۱۰) اور یہ کس نے کہا "تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا"۔ یہ دو قول قرآن کریم کی صداقت پر کافی گواہ ہیں اور بتاتے ہیں کہ حضرت مسیح جب زندہ تھے عبودیت کو اپنا فخر سمجھتے تھے لیکن انکے بعد وہ قوم پیدا ہو گئی جنکو جب یہ کہا جاتا ہے کہ مسیح خدا کا بندہ تھا تو کہتے ہیں تم مسیح کی تحقیر کرتے ہو جس بات کو مسیح اپنا فخر سمجھتا تھا یہ اسکو اسکی تحقیر قرار دیتے ہیں۔ مقرب فرشتوں کا ذکر اس لحاظ سے کیا کہ انسان تو انسان ہیں۔ وہ فرشتے جو ہر وقت بارگاہ الٰہی میں حاضر رہتے ہیں وہ بھی عبودیت کو ہی اپنا فخر جانتے ہیں۔ مخلوق کا کمال ہی عبودیت میں ہے اور اس لحاظ سے بھی ملائکہ کا ذکر یہاں کیا ہے کہ جس طرح عیسائی حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا بناتے ہیں عرب کے بت پرست فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے دونوں کی تردید ایک ہی جگہ کردی ✦

بُرا منانے اور تکبر کرنے والوں کی سزا کا ذکر چھوڑ دیا ہے صرف یہ کہکر کہ آخر اس کے حضور آئینگے اور اگلی آیت میں پہلے مومنوں کا ذکر کرکے پھر منکروں کی سزا کا ذکر کیا ✦

٧٧٧ ایک طرف اگر ایسے عقیدہ کا ذکر کیا جس کے ساتھ عقلی دلیل کوئی نہیں تو اس کے بالمقابل اب ایک روشن دلیل اور ایسے نور کا ذکر کیا جو سب چیزوں کو روشن اور واضح کردیتا ہے اور حق کو باطل سے الگ کردیتا ہے جسکے سامنے عقل انسانی کو بیکار نہیں کیا جاتا بلکہ اسکے

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَاعْتَصَمُوْا بِہٖ فَسَیُدْخِلُہُمْ فِیْ رَحْمَۃٍ ۱۷۶

سو وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے اور اسکو مضبوط پکڑا تو ان کو وہ اپنی طرف سے رحمت اور

مِّنْہُ وَفَضْلٍ وَّیَہْدِیْہِمْ اِلَیْہِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ۝ یَسْتَفْتُوْنَکَ ۱۷۷

فضل میں داخل کریگا اور ان کو وہ اپنی طرف سیدھی راہ پر چلائے گا تجھ سے فتوٰی مانگتے ہیں

قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَۃِ اِنِ امْرُؤٌا ہَلَکَ لَیْسَ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَہٗٓ اُخْتٌ

کہو اللہ تم کو کلالہ کے بارہ میں فتوٰی دیتا ہے اگر کوئی شخص مرجائے اسکی اولاد نہ ہو اور اسکی بہن ہو

فَلَہَا نِصْفُ مَا تَرَکَ وَہُوَ یَرِثُہَآ اِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّہَا وَلَدٌ فَاِنْ کَانَتَا اثْنَتَیْنِ فَلَہُمَا

تو اسکے لئے جو اس نے چھوڑا اسکا نصف ہے اور اگر عورت کی کوئی اولاد نہ ہو تو وہ (بھائی) اسکا وارث ہوگا اور اگر دو بہنیں ہوں تو ان دونوں کیلئے

الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَکَ وَاِنْ کَانُوْٓا اِخْوَۃً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ

جو اس نے چھوڑا اسکی دو تہائی ہے اور اگر بہت بہن بھائی مرد اور عورتیں ہوں تو مرد کیلئے دو عورتوں کے حصہ

الْاُنْثَیَیْنِ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

کی مانند ہے اللہ تمہیں کھولکر بتاتا ہے تاکہ تم غلطی میں نہ پڑو اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۶۷۸

جوہر ظاہر ہوتے ہیں اور خود اس پر روشنی پڑتی ہے۔ نور مبین قرآن کریم ہے اور برہان رسول اللہ صلعم کا وجود ہے کیونکہ آپ قرآن کریم کی تعلیم کو اپنے عمل سے اس طرح واضح کردیتے ہیں جس طرح برہان دعوٰی کو روشن کردیتی ہے +

کلالہ کی وراثت ۶۷۸ لفظ کلالہ پر مفصل بحث کیلئے دیکھو ۶۳۱ یہ حکم اور آیت (۱۲) کا حکم چونکہ ملتے جلتے ہیں اسلئے دو صورتوں سے خالی نہیں یا کلالہ کے وہاں اور معنی ہیں یہاں اور یا وہاں بھائی بہنیں اور ہیں یہاں اور۔ صورت اول میں آیت (۱۲) میں اس کلالہ کا ذکر ہے جسکی صرف اولاد نہ ہو اسلئے بھائی بہنوں کو تھوڑا حصہ دیا ہے اور یہاں اس کلالہ کا ذکر ہے جسکے نہ اولاد ہو نہ والدین اسلئے بھائی بہنوں کو پورا وارث کیا ہے یا زیادہ حصہ دیا ہے لیس لہ ولد اسکے مخالف نہیں کیونکہ ایک طرف کا ذکر کرکے دونوں کا مراد لینا عام ہے اور دوسرے اس لفظ میں ایک خاص اشارہ ہے جسکا ذکر آگے آتا ہے صورت دوم میں آیت (۱۲) میں اخیافی بھائی بہنوں کا ذکر ہے یعنی جو ماں کیطرف سے بھائی ہوں بوجہ بعد انکو کم حصہ دیا ہے اور یہاں اعیانی یعنی حقیقی اور علاتی یعنی باپ کیطرف کے بھائی بہنوں کا ذکر ہے اسلئے حصہ زیادہ دیا ہے میرے نزدیک پہلے معنی کو ترجیح ہے گو مروج نہیں

ایک لطیف اشارہ سورت کا خاتمہ ورثہ کی آیت پر کرکے سورت کے اصل مضمون کی طرف پھر توجہ دلائی ہے اور ساتھ ہی اس طرف بھی کہ جس طرح کلالہ کے وارث اس کے بھائی ہوتے ہیں اسی طرح اب بنی اسرائیل حضرت مسیح کی آمد کے بعد جنکا ذکر اوپر ہوچکا ہے ایک کلالہ کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ سلسلہ نبوت عملی طور پر ان میں منقطع ہوچکا۔ اس لئے اب نبوت بنی اسمٰعیل میں منتقل ہوتی ہے جو بنی اسرائیل کے بھائی ہیں اور دونوں خاندانوں کو بابرکت کرنے کا وعدہ ہی حضرت ابراہیم سے تھا۔ یہ ایک نہایت لطیف اشارہ ہے اور اسی لئے یہاں کلالہ کے ساتھ الفاظ لیس لہ ولد بڑھا دیتے ہیں یعنی اب وہ روحانی اولاد ان میں پیدا نہیں ہوتی +

سورۃ المائدۃ مدنیۃ وھی مائۃ وعشرون آیۃ وست عشر رکوعا

نام

نام یہ سورت جس میں ١٦ رکوع اور ١٢٠ آیات ہیں المائدۃ کے نام سے موسوم ہو اور یہ نام مائدہ کے اس ذکر سے لیا گیا ہو جو اس کے پندرھویں رکوع میں ہو مائدۃ کے معنی ہیں وہ خوان جس پر کھانا ہو یا خود وہ کھانا۔ اور ذکر یہ ہو کہ حواریوں نے حضرت مسیح علیہ السلام سے درخواست کی کہ ان کو کھانے کی چیزیں بکثرت ملیں عید المائدہ میں بھی یہ اشارہ ہے کہ مائدہ عید دائمی کا موجب ہوں حضرت عیسیٰ نے انہیں روکا اور فرمایا کہ سرور تقویٰ اللہ سے پیدا ہوتا ہو مگر ان کے اصرار پر نزول مائدہ کی دعا کی چونکہ اس سورت میں عیسائیت کی غلطیوں اور فاسد عقائد اور خیالات کا ذکر ہو۔ اس لئے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا ہو کہ عیسائیوں کی طرح دنیا کی چیزوں کی حد سے زیادہ محبت میں مبتلا نہ ہو جائیں اور نہ دنیوی آسائشوں کی طلب میں منہمک ہو جائیں۔ اور اسی حقیقت کو ظاہر کرنے کیلئے اس کا نام المائدہ رکھا ہو۔ علاوہ ازیں یہ سورت تمدن پر بھی بحث کرتی ہو اور متمدن قوموں کا میلان بھی عموماً دنیوی آسائشوں کی طرف حد افراط تک چلا جاتا ہو۔ پس اس پہلو کے لحاظ سے بھی متنبہ کرنا ضروری تھا کہ متمدن ہو تو مگر روٹی کی فکر میں ہی نہ لگ جاؤ۔

خلاصۂ مضمون

خلاصۂ مضمون جس طرح پچھلی سورت میں معاشرت کا ذکر ہو اور اس کے ساتھ بالخصوص یہودیوں کا اس سورت میں تمدن کا ذکر ہو اور اسکے ساتھ بالخصوص عیسائیوں کا۔ اور دونوں باتوں کی طرف اشارہ کرنے کو اس کی ابتدا اوفوا بالعقود سے کی ہو۔ کیونکہ اگر ایک طرف تمدن کی بنیاد معاہدات پر ہو خواہ وہ معاہدات کھلے الفاظ میں ہوں یا ان کا مفہوم پایا جاتا ہو تو دوسری طرف شریعت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے چند عقود کو ہی کہتے ہیں اور عیسائیت نے چونکہ شریعت کا نہ صرف استخفاف کر کے اسے بالکل غیر ضروری قرار دیا حالانکہ اپنی آسمانی کتاب کا نام بھی نیا عہد نامہ ہی رکھا ہو بلکہ اسے نعوذ باللہ من ذالک ایک لعنت قرار دیا۔ اسلئے عیسائیت کے ذکر کی ابتدا اس حکم سے موزون تھی۔ اور دونوں باتوں کو اکٹھا کر کے اس طرف توجہ دلائی ہو کہ جب نظام عالم جسمانی بدون قوانین و معاہدات ایک دن بھی قایم نہیں رہ سکتا تو مذہب کا نظام بدون اتباع قوانین و بدون ایفائے معاہدات الٰہی کیونکر قائم رہ سکتا ہو۔ اور اس حکم سے ابتدا کر کے پہلے رکوع میں کھانے پینے نکاح کے کچھ احکام کا ذکر کیا یہ بتانے کو کہ خواہشات حیوانی کی تعدیل کیلئے یہ احکام نہایت ضروری ہیں۔ اس رکوع میں تکمیل دین کی خوشخبری بھی ہو گویا بتایا ہو کہ تکمیل دین بغیر تکمیل شریعت نہ ہو سکتی تھی۔ دوسرے رکوع میں پھر ضرورت شریعت کو بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور صفات ملکوتی کی طرف توجہ دلائی ہو۔ اور اول الذکر کیلئے نماز کا ذکر کیا اور اس کی ایک چھوٹی سی فرع طہارت جسمانی کی طرف توجہ دلائی ہو۔ اور اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچے تعلق کی ہدایت فرمائی تو دوسری طرف انسانوں کے تعلقات میں اعلیٰ درجہ کے اصول انصاف کی طرف توجہ دلائی یہاں تک کہ نہ صرف غیر قوموں بلکہ دشمن قوم سے بھی عدل و انصاف پر قایم رہنے کا صریح الفاظ میں حکم دیا ہے تیسرے رکوع میں یہودیوں اور عیسائیوں کی عہد شکنیوں کا ذکر ہو چوتھے میں بنی اسرائیل کی نافرمانی کا۔ پانچویں میں ان اہل کتاب کے جو بوجہ عہد شکنیوں کے حق سے بہت دور جا پڑے تھے منصوبوں کا ذکر ہو جو آنحضرت صلعم کے خلاف وہ کرتے تھے اور حفاظت جان و مال کی ضرورت کو واضح کیا ہو جس کے بغیر تمدن قایم نہیں رہ سکتا چھٹے میں اسی ذکر کو جاری رکھتے ہوئے بتایا ہو کہ اہل کتاب کے باہمی قضایا میں انہی کی شریعت کے مطابق فیصلے کرو۔ ساتویں میں ان دنیوی جھگڑوں کے فیصلوں سے دینی جھگڑوں کے فیصلوں کی طرف رجوع فرمایا اور بتایا کہ دینی اختلافات میں فیصلے قرآن شریف ہی کرتا ہو جو کتب سابقہ پر محافظ ہے۔ آٹھویں رکوع میں یہود و نصاریٰ سے تعلقات کا اور نویں میں ان کی حالت کا ذکر ہو۔ دسویں میں عیسائیت کے حق سے انحراف اور غلو کو واضح کیا گیارھویں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے | بار بار رحم کرنے والے | کے نام سے

میں بتایا کہ بااینہمہ عیسائی دین اسلام سے بہت قریب ہیں اور ان کے حق کو قبول کرنے کی خوشخبری سُنائی بارھویں میں عیسائیوں کی غلطیوں سے مسلمانوں کو متنبہ کیا جنہوں نے ایک طرف تو یہانتک غلو کیا کہ عبادت کی خاطر اللہ تعالیٰ کی حلال چیزوں کو بھی حرام کردیا۔ اور دوسری طرف دنیا میں یہانتک منہمک ہوئے کہ حرام چیزوں جیسے شراب وغیرہ کو بھی شیرِ مادر بنالیا۔ تیرھویں رکوع میں خانہ کعبہ کی حرمت کا ذکر کیا کیونکہ اگرایک دفعہ پہلے عیسائیوں نے اس پاک گھر کو ڈھانے کا ارادہ کیا تھا تو علم الٰہی میں وہ دوسرا وقت بھی آنے والا تھا جب اس پاک گھر کے متعلق عیسائی اقوام کے بدارادے ہونگے۔ چودھویں میں بتایا کہ شریعت گو ضروری ہے۔ مگر ہر امر میں افراط و تفریط سے بچو۔ اور چھوٹے چھوٹے غیرضروری سوالات سے روک کر اہم امور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت بتائی۔ پندرھویں میں حواریوں کے مائدہ طلب کرنے کے ذکر میں عیسائیوں کے لذات دینوی میں انہماک کی طرف توجہ دلائی۔ اور بتایا کہ اس قوم کی توجہ امور روحانی سے بالکل ہٹکر کھانے پینے اور خواہشات نفسانی کی طرف رہ جائیگی اور سولھویں اور آخری رکوع میں بتایا کہ عیسائیت کا اصول باطل ہے مسیح کی خدائی مسیح کی تعلیم نہیں +

پہلی سورت سے تعلق۔ اس سورت کا ربط پہلی سورت یعنی النساء سے یوں ہے کہ اس میں معاشرت کا ذکر تھا اس میں تمدن کا ذکر ہے اور معاشرت اور تمدن کے اصول ایک دوسرے سے وابستہ ہیں دوسرا امر جو اس تعلق کو ظاہر کرتا ہے یہ ہے کہ جس طرح سورۃ بقرہ میں یہودیوں کا ذکر کرکے اسکے بعد آل عمران میں عیسائیوں کا ذکر کیا تھا۔ اسی طرح النساء میں یہودیوں کا ذکر کرکے اس سورت میں عیسائیوں کا ذکر بالتفصیل کیا ہے۔ تاکہ مغضوب اور ضالین کا تقابل جس کی طرف فاتحہ میں توجہ دلائی تھی قایم رہے۔ زیادہ تفصیلی نگاہ ڈالی جائے تو دونوں سورتوں کا ربط اور بھی واضح ہوجاتا ہے پچھلی سورت کے آخری حصہ میں یہودیوں کی شرارتوں کا ذکر کرتے کرتے حضرت مسیح کے خلاف انکی شرارت کا ذکر کیا تھا اور یہاں سے انتقال مضمون عیسائیت کی طرف ہوگیا تھا۔ اور اسلئے وہیں عقیدہ الوہیت مسیح کی بھی تردید کی تھی چونکہ الوہیت مسیح کے عقیدہ سے شریعت کی ہتک لازم آتی تھی اسلئے سورۃ مائدہ کے شروع میں شریعت کی ضرورت پر اور اسکی پیروی پر زور دیا گیا ہے غرض ہر رنگ میں اس سورت کے اس مقام پر رکھنے میں قرآن کریم کے مضامین میں ایک ترتیب ابلغ اور محکم نظر آتی ہے +

زمانہ نزول

تاریخ نزول۔ ان مضامین پر جن کا ذکر اس سورت میں ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور یہی رائے اکثر محققین کی بھی ہے کہ اس سورت کے اکثر حصہ کا نزول پانچویں اور ساتویں سال ہجری کے درمیان ہے خاص خاص آیات کی خاص تاریخیں مقرر کرنا اکثر حالات میں ایک بےسود کوشش ثابت ہوتی ہے مثلاً عیسائی عموماً ان آیات میں جن میں یہودیوں یا عیسائیوں کے خلاف کچھ ہو اس زمانہ کی طرف منسوب کرنیکے عادی ہیں جب ملکی وجوہات کی بناء پر ان لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان مناقشات پیدا ہوگئے تھے۔ یہ معیار صحیح نہیں۔ اسی سورت میں ایک طرف یہودیوں اور عیسائیوں کے خفیہ منصوبوں کا ذکر کرکے انکو دوست بنانے سے روکا ہے تو دوسری طرف عیسائیوں کی نرمی اور انکے اسلام سے قریب ہونیکا بھی ذکر ہے۔ ہاں ایک آیت بالخصوص قابل ذکر ہے یعنی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ جس کے متعلق صحیح بخاری میں روایت موجود ہے کہ یہودیوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ ایک آیت تمہاری کتاب میں ہے وہ ہم پر نازل ہوتی تو ہم اسے عید کا دن بناتے تو حضرت عمرؓ نے انکا اشارہ اسی آیت کی طرف دیکھکر فرمایا کہ ہاں ہم بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ آیت کب اور کہاں اُتری اور اس وقت جب اُتری رسول اللہ صلعم کہاں تھے۔ یہ عرفہ کا دن تھا اور غالباً جمعہ) اور میں بھی اُس وقت عرفہ میں تھا جب یہ آیت نازل ہوئی یعنی حجۃ الوداع میں پس یہ آیت نزول میں بالکل آخری زمانہ کی ہے لیکن ترتیب میں اس کو یہاں لاکر رکھا ہے تاکہ عیسائیت پر اتمام حجت ہو۔ اس سے نہایت صفائی سے معلوم ہوا کہ ترتیب قرآنی خود اللہ تعالیٰ کی وحی سے تھی اور آیات کو سورتوں میں اپنے مقام پر اور سورتوں کو اپنی اپنی جگہ خود نبی کریم صلعم نے رکھا +

ع ۱

ضرورت شریعت اور خواہشات حیوانی کی تعدیل

۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اقراروں کو پورا کرو ۷۹۹ تمہارے لئے چوپائے جانور حلال کئے گئے ہیں سوائے اسکے جو تم

عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ○

پڑھا جاتا ہے نہ شکار کو حلال جاننے والے جب تم حالت احرام میں ہو اللہ جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے ۸۰۰

عقد

۷۹۹ عقود۔ عَقد کی جمع ہے جسکے اصل معنی ہیں ایک چیز کی دو طرفوں کو اکٹھا کرنا (غ) یعنی گرہ دینا۔ اور مراد ہر مضبوط ربط اور پھر معاہدہ یا اقرار ہے۔ اور اس میں ہر قسم کے معاہدات داخل ہیں خواہ وہ انسان کی حیوانی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں اور خواہ اسکی صفات ملکی سے اور خواہ وہ تکالیف شرعی کے رنگ کے ہوں جیسے اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت کا عہد خواہ وہ باہمی معاہدات نکاح یا باہم لین دین یا قوموں کے تعلقات یا دیگر امور کے متعلق ہوں بلکہ ہر قسم کے معاملات اس میں شامل ہیں جو تمدن انسانی سے پیدا ہوتے ہیں اور جن میں گو صراحتاً کوئی معاہدہ نہ ہو مگر سمجھوتہ ہوتا ہے۔ اور بعض مفسرین نے عقود سے یہاں مراد وہ معاہدات لئے ہیں جو جاہلیت میں باہم نصرت وغیرہ کے معاہدات کئے گئے تھے جس سے معلوم ہوا کہ کفار کے ساتھ معاہدات کے بھی پورا کرنے کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔

وفاداری کی تعلیم

اس حکم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامل وفاداری کی تعلیم دی ہے جو منہ سے کہیں، اسے کر دکھائیں مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ وفاداری کا جوہر اپنے اندر پیدا کرے اور اگر ایک طرف یہ ضروری ہے کہ خدا کا بندہ ہونے میں پورا وفادار ہو تو یہ بھی ضروری ہے کہ اولاد ہونے میں ماں باپ ہونے میں خاوند یا بیوی ہونے میں حاکم یا رعیت ہونے میں دوست یا دشمن ہونے میں لین دین میں اور ہر قسم کے معاملات میں وفاداری دکھلائے۔

عہد اور عیسائیت

اس سورت کو پابندی معاہدہ کے حکم سے شروع کرنے میں کئی مصالح ہیں ایک تو یہ کہ تمدن کی بنیاد پابندی معاہدہ پر ہے اور یہ سورت تمدن پر ہے دوسرے یہ کہ پچھلی سورت کے آخر میں عیسائی مذہب کا ذکر کیا تھا اور اس سورت میں خصوصیت سے عیسائی مذہب کا ہی ذکر ہے اور اس مذہب نے چونکہ کفارہ کا مسئلہ سکھا کر ایک حصہ یعنی خدائی عقود یا تکالیف شرعیہ کو تو بالکل ہی جواب دیا اور دوسرے حصہ یعنی انسانوں یا قوموں کے باہمی معاہدات کی بھی، اس مذہب کے پیروؤں نے کم پروائی ہے اسلئے مسلمانوں کو متنبہ کرنا ضروری تھا۔ تیسرے اس سورت میں یہودیوں اور عیسائیوں کی عہد شکنی کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اور پچھلی سورت سے اس کا یہ تعلق ہے کہ اس میں بھی بہت سے عقود کا ذکر ہے گویا ان کو بیان کر کے اور اور عقود کیلئے بطور تمہید فرمایا کہ سب عقود کو پورا کرو۔

بہمۃ - بہیمۃ

۸۰۰ بہیمۃ۔ بُہمۃ سخت پتھر کو اور پھر اس سے تشبیہ کے لحاظ سے شجاع کو کہا جاتا ہے اور بہیمۃ اس کو کہتے ہیں جس میں قوت گویائی نہیں۔ اور عرف میں درندوں اور پرندوں کے سوائے دوسرے حیوانات پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے (غ) یا ہر ایک چارپایہ خشکی میں ہو یا سمندر میں۔

نعمۃ

الانعام۔ نَعَم کی جمع ہے۔ اور نِعْمَۃ حالت حسنہ کا نام ہے اور قلیل و کثیر سب پر بولا جاتا ہے وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا (ابراہیم ۱۴-۳۴) نعمتی التی انعمت علیکم (البقرۃ ۲-۴۰) فانقلبوا بنعمۃ من اللہ (اٰل عمران ۳-۱۷۴) اور اَنعام خصوصیت

انعام

سے اونٹ پر بولا جاتا ہے کیونکہ اونٹ ان کیلئے سب سے بڑی نعمت تھی اور اس میں گائے بھیڑ بکری بھی شامل ہیں (غ) اور بہیمۃ الانعام کی اضافت بیان کیلئے ہے۔ اور بعض نے تشبیہ کے لئے اضافت لی ہے یعنی انعام سے ملتے جلتے جانور۔

حل

مُحِلّی اصل میں مُحِلّین ہے حَلّ کے معنی گرہ کا کھولنا ہیں واحلل عقدۃ من لسانی (طٰہٰ ۲۰-۲۷) اور حلّ کا لفظ جو اترنے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا ٢

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے نشانوں کی بے حرمتی نہ کرو اور نہ حرمت والے مہینہ کی اور نہ قربانیوں کی اور نہ

الْقَلَآئِدَ وَلَاۤ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۭ

ان جانوروں کی جو گانی پہنائے گئے ہوں اور نہ حرمت والے گھر کا قصد کرنیوالوں کی وہ اپنے رب کے فضل اور خوشنودی چاہتے ہیں[۸۱]

پر بولا جاتا ہے تو اس لحاظ سے کہ اترنے کے وقت بوجھ کھولے جاتے ہیں او تحل قریباً من دارھم (الرعد[۱۳] - ۳۱) واحلوا قومھم

محلّة ۔ حلال — دار البوار (ابراھیم[۱۴] - ۲۸) اور مَحَلَّة اصل میں مکان نزول ہے اور کسی چیز کا حلال ہونا حل عقدہ سے لیا گیا ہے (غ) اور کسی شخص کو حلال کہا جاتا ہے جب وہ حالت احرام سے نکل جائے (غ) واذا حللتم فاصطادوا (۲) ✦

صاد ۔ اصطیاد ۔ صید — الصید ۔ صاد ۔ مصدر ہے اور اس کے معنی ہیں جو چیز انسان کیلئے ممتنع ہے اس کو کامیاب ہو کر حاصل کر لینا اور عرف شریعت میں حیوانات کا پالینا جو انسان کے قبضہ میں نہیں جبتک کہ وہ دوسرے کی ملک نہ ہوں اور اسی سے اصطیاد ہے فاصطادوا[۲] اور یہاں صید سے مراد ایسے حیوانات ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے کیونکہ حالت احرام میں سانپ اور بچھو اور دوسرے موذی جانوروں کا مارنا جائز ہے (غ) ✦

حرام ۔ مُحْرِم — حُرُم ۔ حَرام کی جمع ہے اور حَرام اور مُحْرِم کے ایک معنی ہیں اور وہ وہ شخص ہے جو حالت احرام میں ہو (غ) یعنی اس خاص حالت میں جو حاجی اختیار کرتے ہیں ✦

مَا يُتْلٰى عليكم ۔ سوائے اسکے جو تم پر پڑھا جاتا ہے ، اور مردار وغیرہ ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے ✦

جو چیزیں انسان سے احکام الٰہی کی پابندی تڑواتی ہیں وہ اس کی خواہشات ہیں ۔ اور ان خواہشات میں سب سے بڑھکر کھانے پینے کی خواہش ہے اسلئے سب سے پہلے کھانے پینے کی حرمت وحلت کے احکام کو بیان کیا اور اس لئے بھی کہ عیسائیوں نے جن سے اس سورت میں خاص بحث ہے ۔ کھانے پینے کی حلت وحرمت کو بالکل اٹھا دیا ہے اور کھانے پینے کی خواہشات ان پر یہانتک غالب ہوئی ہیں کہ اس بارہ میں انہوں نے ہر ایک قید کو توڑ دیا ہے اور شریعت کی بھی کوئی پروا نہیں کی ✦

شعیرة — [۸۱] شعائر ۔ شعیرة کی جمع ہے یعنی وہ چیز جو علامت یا نشان قرار دی جائے (غ) اور اس سے مراد وہ تمام امور ہیں جن میں انسان شرعاً مکلف کیا گیا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی سب حدود اور فرائض اور امر اور نہی داخل ہیں (ج) اس لئے حسن کا قول ہے کہ شعائر اللہ سے مراد دین اللہ ہے بعض نے خاص شعائر حج سے مخصوص کیا ہے مگر اس کی کوئی وجہ نہیں ✦

الشهر الحرام ۔ جنس کے طور پر نام لے دیا ہے مراد سارے حرمت کے مہینے ہیں ✦

ھدیة ۔ ھدی — ھَدْی ۔ ھَدِیّة کی جمع ہے یعنی وہ چیز جو لے جائی جاتی ہے مگر ھَدْی ان قربانیوں سے مخصوص ہے جو خانہ کعبہ کو لے جائی جاتی ہیں (غ) اور ھَدِیَّة تحفہ سے مخصوص ہے جو ہم ایک دوسرے کی طرف لے جاتے ہیں بل انتم بھدیتکم تفرحون (النمل[۲۷] - ۳۶) (غ)

قلد ۔ قِلادة — قلائد ۔ قِلادة کی جمع ہے قلد کے اصل معنی بٹنا ہیں اور قلادة وہ بٹی ہوئی چیز ہے جو گلے میں پہنی جاتی ہے یعنی ہار (غ) ان جانوروں کو جن کو قربانی کے طور پر لے جاتے تھے اور بطور علامت یا نشان ان کے گلے میں گانی یا ہار پہناتے تھے ۔ قلاید کہتے تھے ۔ اور حج کو جانے یا وہاں سے واپس آنے والے خود بھی ایسے ہار پہن لیتے تھے تاکہ انکو کوئی دکھ نہ پہنچائے ✦

آمین البیت الحرام — آمّین البیت الحرام سے مراد وہ لوگ ہیں جو خانہ کعبہ کا قصد کرتے ہوں امّ کے معنی ہیں قصد کیا ۔ کافر مراد نہیں ہوسکتے اسلئے کہ یبتغون فضلاً من اللہ و رضوانا تو مومنوں کی ہی شان ہے ✦

وَاِذَا حَلَلۡتُمۡ فَاصۡطَادُوۡا ؕ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡكُمۡ عَنِ

اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کرو اور کسی قوم کی دشمنی کہ انہوں نے تم کو حرمت

الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا ۘ وَتَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوۡا (وقف لازم)

والی مسجد سے روکا تم کو اسبات پر آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کرو[۶۸۲] اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔

عَلَى الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ۝ (الربع)

اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ کا تقویٰ کرو بیشک اللہ دیدی کی سزا دینے میں سخت ہے[۶۸۳]

اوفوا بالعقود کی تفسیر میں پہلے شعائر اللہ یعنی حدود اللہ کا ذکر کیا کہ ان کی بے حرمتی نہ کرو یعنی حدود الٰہی کو پورا کرو یہ تو عام سب حدود پر مشتمل ہے۔ اور ان حدود الٰہی میں پھر خصوصیت سے خانہ کعبہ کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیزوں کا ذکر کیا کہ خواہ کیسی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز ہو مگر جب خدا کا حکم اس کے متعلق آگیا تو اس کی عزت کرو مسلمانوں کو حکم ہے دوسری قوموں کو بھی ضمناً سمجھایا ہے کہ خانہ کعبہ سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی بیحرمتی نہ کریں چہ جائیکہ خود خانہ کعبہ کے متعلق کوئی برا ارادہ کریں ✦

جرم۔اجرام

[۶۸۲] یجرمن یجرم کا اصل جَرۡم ہے جس کے معنی ہیں درخت سے پھل کاٹنا اور اَجۡرَم کے معنی ہیں صار ذا جَرۡم اور ہر ایک ناپسندیدہ امر کے اکتساب پر بولا جاتا ہے اسی سے مُجۡرِم ہے اور جَرَمَ بمعنی کسب بھی آتا ہے یعنی کمایا (غ) اور یہاں یجرمنّ کے معنی یحملن بھی کئے گئے ہیں (ت) ✦

شنآن

شنآن کے معنی بغض ہیں اسی سے ہے ان شانئك هو الابتر (الکوثر ۱۰۸-۳) ✦

دشمنوں کے حقوق؛

حدود اللہ کی طرف توجہ دلا کر اب انسانوں کے ایک دوسرے پر حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ دشمن کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرنا یعنی اس کے حقوق اس کو دینا یہ سب سے مشکل کام ہے اسلئے اس کا ذکر کرکے سمجھا دیا کہ جو دشمن نہ ہوں یا جنکے تعلقات محبت یا اتحاد ہوں ان کے حقوق کی نگہداشت کس قدر ضروری ہے۔ اور پھر دشمن کے لفظ کو بھی عام نہیں رکھا کیونکہ بعض وقت محض غیر قومی سے ایک قوم کو دشمن سمجھ لیا جاتا ہے۔ بلکہ ان صدوکم عن المسجد الحرام کہکر بتا دیا کہ وہ دشمن جو تم کو انتہا درجہ کے دکھ پہنچا چکے ہیں تم کو گھروں سے نکال چکے ہیں اور تمہارے مذہبی فریضہ تک کی ادائگی میں حائل ہوئے ہیں ان سے بھی عدل کرو یعنی ان کے حقوق انکو دو پس پابندی معاہدہ سخت ترین دشمن کے ساتھ بھی چاہئے اور نہ صرف پابندی معاہدہ بلکہ حالت تمدن اور معاشرت سے جو حقوق پیدا ہوتے ہیں وہ بھی دینے چاہئیں ✦

قومیت کی بنیاد ایک دوسرے کی اعانت ہے

[۶۸۳] جب اس قدر انصاف کی تعلیم دی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قوم کیونکر بن سکتی ہے۔ جو اپنی قوم کے حقوق ہے کہ ایک دوسرے پر زیادتی نہ ہو وہ تو دشمن قوم کو دیدیئے اسلئے دونوں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمایا کہ دشمنوں کو تو ان کے حقوق دیتے ہو مگر اپنی قوم کے حقوق تو یہ ہیں کہ ایک دوسرے کی اعانت کرو ہاں اعانت صرف نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ہو۔ گناہ اور زیادتی میں اعانت نہ ہو۔ کیسا پاک اصول ہے جو تمدن کی بنیاد کے طور پر قایم کرکے دنیا میں صلح اور آشتی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اور تمام قومی عناد کی جڑ کاٹ دی ہے قوم اور ملک اور رنگ کے تفرقوں سے جو امتیاز لوگوں نے بنا رکھے ہیں اور اس طرح پر بعض قوموں نے دوسری قوموں پر بعض قومیت کے حقوق کی وجہ سے وہ سلوک جائز رکھا ہے جس کو اپنی قوم کے ساتھ ظلم قرار دیا گیا ہے۔ ان تمام کو اسلام نے یکسر مٹا دیا ہے۔ ایک دوسرے کی اعانت کرکے قومیت بناؤ مگر اتلاف حقوق نسل انسانی کا جہاں معاملہ ہو وہاں قومیت کی آڑ نہ تلاش کرو

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ ۳

مردار تم پر حرام کیا گیا ہے اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جس پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا جاوے اور

الْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ

گلا گھٹ کر مرا ہوا اور چوٹ لگ کر مرا ہوا اور سینگ لگ کر مرا ہوا اور وہ جسے درندوں نے کھایا ہو ماں جسے تم ذبح کرو

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ

(وہ حلال ہے) اور وہ بھی (حرام ہے) جو تھانوں پر ذبح کیا گیا ہو اور یہ کہ تم پانسوں سے قسمت معلوم کرو یہ سب نافرمانی ہے ۶۸۵

کیونکہ تو بہت ہیں ایک دوسرے کی اعانت صرف اچھے کاموں میں ہونی چاہیئے +

منخنقۃ موقوذۃ ۶۸۴ منخنقۃ. خنق سے ہے جس کے معنی گلا گھونٹا ہوا یہاں تک کہ مر جائے۔ موقوذۃ۔ وقذ سے ہے جو چوٹ مارنے سے

تردّیۃ مرجائے متردیۃ۔ ردی سے ہے جس کے معنی ہلاک ہیں اور تردّی کے معنی ہیں ہلاکت کیلئے اپنے آپ کو پیش کرنا مایغنی عنہ

متردیۃ نطیحۃ مالہ اذا تردی (اللیل ۹۲-۱۱) او متردیۃ وہ ہے جو گر کر مر گیا ہو۔ نطیحۃ نطح سے ہے جو نطاح یعنی سینگ مارنے سے مرجائے (غ)۔

سبُع سبع۔ سَبُع عدد ہے یعنی سات اور سَبُعْ درندہ ہے گویا یہ نام اسکی قوت کے کمال کے لحاظ سے رکھا گیا ہے کیونکہ سات اعداد تامہ سے ہے (غ)

تزکیۃ ذکیتم۔ ذکا سے ہے جو اصل میں آگ کے جلنے پر بولا جاتا ہے۔ اور ذکیت الشاۃ کے معنی ہیں میں نے بکری کو ذبح کیا گویا حرارت غریزی کا اخراج تذکیہ ہے یعنی خون کے نکل جانے کا۔ اس لئے شریعت میں اسے جانور کو ذبح کرکے مارنے پر بولا گیا ہے (غ)۔

یہاں حرمت کی چیزوں کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور ان جانوروں کو جو صدمات سے مرجائیں جیسے گلا گھٹ کر یا چوٹ سے یا گر کر یا سینگ لگنے سے یا درندوں کے پھاڑ دینے سے مردار میں ہی شامل کیا ہے الا ما ذکیتم یہاں بطور استثنائے منقطع ہے یعنی جس جانور کو ذبح کرو اسے ہی کھاؤ اور اس میں یہ بھی شامل ہے کہ چوٹ سینگ لگا ہوا وغیرہ جانور اگر

ذبح کی غرض ابھی مرا نہ ہو اور ذبح کے قابل ہو تو وہ بھی ذبح کرکے کھایا جا سکتا ہے۔ اور لفظ تذکیہ میں بتا دیا کہ اصل ذبح کی غرض خون نکالنا ہے اس لئے بجائے ذبح کے تذکیۃ کا لفظ اختیار کیا۔ کیونکہ خون میں بہت قسم کی زہریں ہیں۔ اور تذکیہ اسی جانور کا ہو سکتا ہے جس میں زندگی باقی ہو یعنی کچھ حرارت غریزی موجود ہو اس لئے بھی یہی لفظ زیادہ موزون تھا +

نصب ۶۸۵ نُصُب کا واحد نصیب ہے وہ پتھر جو کسی چیز پر گاڑا جائے اور نصب کے اصل معنی وضع یعنی رکھنا ہیں۔ یہ کچھ پتھر تھے جن کی وہ لوگ عبادت کرتے تھے اور ان پر جانور بھی ذبح کرتے تھے (غ)۔ دوسری جگہ جمع انصاب بھی آئی ہے والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان (المآئدۃ ۵-۹۰) یا وہ پتھر مراد ہیں جو کعبہ کے گرد گاڑے ہوئے تھے جن پر جانور ذبح کرکے خون ان پر چھڑکا جاتا تھا (ج)۔ ما ذبح علی النصب سے مراد ایسے جانور ہیں جو بتوں کے نام پر ذبح کئے جائیں +

قسم۔ استقسام تستقسموا۔ استقسام۔ قسم سے ہے۔ اور قِسْمٌ حظ یا نصیب یعنی حصہ کو کہا جاتا ہے (ل)۔ اور استقسام کے معنی ہیں اس کا طلب کرنا جو کسی کے لئے مقدر کیا گیا ہے یعنی ایک امر کو کرے یا نہ کرے (ل)۔ اور بعض وقت یہ صرف قسم یعنی حصہ کے جدا کرنے پر بھی استعمال ہوتا ہے (غ) +

ازلام ازلام۔ زُلَم یا زَلَم کی جمع ہے وہ تیر جس پر پَر نہ لگائے گئے ہوں (جن کی مدد سے تیر ہوا میں اڑتا ہے یعنی صرف تیر کی شکل پر لکڑی ہوتی تھی)۔ اور اہل جاہلیت اس سے قسمت معلوم کرتے تھے (ل)۔ اور قسم کے نیچے لکھا ہے کہ ازلام جیسے تھے

اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ

آج وہ لوگ جو کافر ہیں تمہارے دین سے نا اُمید ہو گئے

جاہلیت میں فال نکالنے کا دستور

تیر نہ تھے جن سے ذبح کردہ اونٹنی کے گوشت کے حصے کئے جاتے تھے بلکہ قسمت معلوم کرنے کے تیر تھے۔ اور حدیث ہجرت میں سراقہ کی روایت میں آتا ہے فاخرجت الازلام یعنی سراقہ کہتا ہے کہ جب میں رسول اللہ صلعم کے تعاقب میں گھوڑا دوڑاتا ہوا آپکے قریب پہنچ گیا اور گھوڑے نے ٹھوکر کھائی تو میں نے تیروں سے فال نکالی (دل)، اور بعض کے نزدیک یہ تین تیر ہوتے تھے جن سے ہر ایک اہم کام کے کرنے میں مثلاً سفر پر جانا۔ یا شادی کرنا یا بیع یا جنگ پر جانا وغیرہ فال لی جاتی تھی کہ یہ کام کرنا چاہئے یا نہیں۔ ایک پر لکھا ہوتا امرنی ربی میرے رب نے اس کام کے کرنے کا مجھے حکم دیا ہے اگر وہ تیر نکل آتا تو کام کر لیا جاتا اور ایک پر نہانی ربی لکھا ہوتا وہ نکلتا تو نہ کیا جاتا۔ اور ایک خالی ہوتا جس کے نکلنے پر فال دوبارہ نکالی جاتی۔ اور بعض کے نزدیک ھبل میں سات تیر تھے جو ہبل کے بت کے پاس جو قریش کا سب سے بڑا بت تھا اور کعبہ میں تھا۔ رکھے ہوئے تھے جن میں سے کسی پر دیت کے کسی پر پانی کی تقسیم کے کسی پر کسی قوم میں سے ہونے یا نہ ہونے کے احکام لکھے ہوئے تھے اور کاہن سے تیر نکلوا کر اسکے مطابق عمل کیا جاتا۔ اور ایسی فال نکلوانے وقت چڑھاوا چڑھایا جاتا جس میں سو درہم اور اونٹنیاں ہوتی تھیں (ج)، اور بعض نے ان سے جوئے کے تیر مراد لئے ہیں جن سے اونٹنی ذبح کر کے اس کے گوشت کے حصے کئے جاتے تھے۔

غیر اللہ کے نام پر جانور کا ذبح کرنا

یہاں ایک تو اس..... گوشت کو حرام کیا جو بتوں وغیرہ پر چڑھاوے چڑھا کر جانور ذبح کئے جاتے یا ان کا خون بتوں پر چھڑکا جاتا گویا اس کو بھی ما اھل لغیر اللہ بہٖ میں داخل کیا جس طرح گلا گھٹکر مرے ہوئے وغیرہ کو میتۃ میں داخل کیا۔ اور جس طرح ما اھل لغیر اللہ بہٖ کو دوسری جگہ فسق یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی قرار دیا اسی طرح یہاں بتوں وغیرہ کے

قبروں کے چڑھاوے

چڑھاووں کو فسق کہا ہے۔ اسی سے قبروں اور مزاروں کے چڑھاووں کا قیاس ہو سکتا ہے مگر اس میں صرف وہی جانور داخل ہونگے جو قبروں پر ذبح کئے جائیں۔

اور دوسری چیز جس کو یہاں حرام کیا ہے گو وہ کھانے کی چیز نہیں وہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے میں فالوں کا نکالنا ہے جو پجاریوں کے ذریعہ سے بھی نکلوائی جاتی تھیں اور لوگ خود بھی نکال لیتے تھے۔ اور چونکہ پجاریوں سے فال نکلوانے میں چڑھاوے بھی چڑھائے جاتے تھے تو شاید اس مناسبت سے اس کا ذکر یہاں کر دیا ہے یا اس لئے کہ حرمت صرف کھانے پینے

فال نکالنے کا حکم

کی چیزوں میں نہیں دوسرے افعال میں بھی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فال نکالنا کیسا ہے۔ قرآن کریم کے اس بیان سے تو فال نکالنے کی صاف حرمت نظر آتی ہے اور یہ عذر نہیں ہو سکتا کہ وہ فال دیوان حافظ یا کسی اور اچھی کتاب سے نکالی جاتی ہے حتی کہ قرآن کریم سے فال نکالنا بھی نعوذ باللہ قرآن کو ازلام کا مقام دینا ہے اور یہ جو نبی کریم صلعم کے فال حسن کا ذکر احادیث میں آتا ہے تو اس سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ نبی کریم صلعم کسی کام کے کرنے سے پہلے فال نکالا کرتے ہوں اور فال نکل آئی تو کام کر لیا ورنہ نہ کیا بلکہ وہ صرف اس قدر ہے کہ کبھی کوئی اچھی چیز یا اچھا نام اتفاق سے سامنے آگیا تو اس سے آپکو خوشی ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کام کا انجام بھی نیک کریگا۔ اور اس میں بھی کسی برے نام سے بدشگونی کبھی نہ لیتے تھے کہ اس کی وجہ سے

استخارہ

کام کرنے سے رک جائیں جس طرح اہل جاہلیت کرتے تھے۔ ایسا ہی احادیث میں جو ذکر استخارہ کا ہے اس سے بھی ہرگز یہ مراد نہیں کہ استخارہ سے فال لی جاتی ہے کہ کوئی اچھا خواب آجائے تو وہ کام کر لیا جائے ورنہ نہ کیا جائے بلکہ دعائے استخارہ میں صرف یہ دعا کی جاتی ہے کہ اے خدا اگر تیرے علم میں یہ امر جو میں کرنا چاہتا ہوں میرے دین و دنیا میں نافع ہے تو میرے لئے اس کے سامان مہیا کر دے اور اگر یہ میرے دین و دنیا کیلئے برا ہے تو اس سے مجھے پھیر دے اور ظاہر ہے کہ یہ صرف استعانت

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ

سو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو ۔ ۴۸۵

قرعہ اندازی باللہ ہے نہ کچھ اور ۔ اور قرعہ اندازی کو بھی فال نکالنے سے کوئی تعلق نہیں ۔ کیونکہ قرعہ اندازی صرف یہ ہو کہ ایک تقسیم میں جب ترجیح کیلئے مرجح نہ ہو تو قرعہ اندازی سے جھگڑے کو ختم کر دیا جائے مثلاً مشترکہ مال کا تقسیم کرنا کہ جب حصے ایک سے ہو گئے تو اب بجائے اس کے کہ کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح دے کر اسے ایک حصہ چننے کا اختیار دیا جائے ۔ قرعہ اندازی سے جو جس کے حصہ میں آیا اسے دیدیا ۔ ایسا ہی حدیث میں ہو کہ ایک شخص نے وصیت میں چھ غلام آزاد کئے اور اس کا کوئی اور مال نہ تھا تو آنحضرت صلعم نے ایک تہائی کی وصیت کو جائز رکھکر دو غلاموں کو بذریعہ قرعہ اندازی آزاد کر دیا ۔ کیونکہ مالک نے خود تعیین نہ کی تھی +

یأس ۴۸۶ یئس ۔ یأس ۔ طمع یا آرزو کا باقی نہ رہنا ہو +

خشیۃ تخشوا ۔ خَشْیَة ۔ وہ خوف ہے جس کے ساتھ تعظیم ملی ہوئی ہو ۔ اور اکثر یہ اس کے علم سے ہوتا ہو جس سے خشیت ہو اسی لئے فرمایا انما یخشی اللہ من عبادہ العلمٰؤا (فاطر ۳۵ ۔ ۲۸) (غ) +

اسلام کے کمال غلبہ کی پیشگوئیاں کافروں کے دین اسلام سے مایوس ہو جانے سے یہ مطلب ہو کہ یہ اُمیدیں جو انکو لگی ہوئی تھیں کہ دین اسلام کو مٹا دینگے یا مسلمانوں کو مجبور کرکے کفر کی طرف لوٹا لیں گے بوجہ غلبۂ اسلام کے منقطع ہو گئیں ۔ اور اس میں ایک پیشگوئی بھی ہو کہ اب کافر دین اسلام کو کبھی بھی مٹا نہ سکینگے ۔ آج بھی کفار اپنی ان تھک کوششوں کے باوجود خوب جانتے ہیں کہ وہ دین اسلام کو اب دنیا سے نہیں مٹا سکتے ۔ اور یہ جو فرمایا کہ ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو تو مطلب یہ ہو کہ اب انکے دوبارہ غلبہ سے مت خوف کرو ہاں احکام الٰہی کی خلاف ورزی اور حدود اللہ کے توڑنے سے بچو اور سچے ڈرو یعنی اگر تم کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اس وجہ سے پہنچے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کروگے ۔ اور اگر تم اپنے عہد پر مضبوط رہو تو کفر کا خوف مت کرو کہ وہ بھی کبھی تم کو کھا سکتا ہے ۔ اس میں بھی اشارہ دین اسلام کے کمال غلبہ اور اسلامی حکومت کے دنیا پر پھیل جانے کی طرف ہو یعنی اسقدر تمہارا غلبہ دنیا میں ہوگا کہ دنیا کی کوئی طاقت تم کو برباد نہ کر سکے گی ۔ لیکن اگر تم احکام الٰہی کی فرمانبرداری نہ کرو تو یہ تمہارا اپنا فعل تمہیں اس بلند مقام سے گرا دیگا +

خشیۃ اللہ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی خشیت جس کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آتا ہے کیا ہے ؟ ایک ڈرنا انسان کا وہ ہوتا ہے کہ وہ ایک چیز سے خائف ہو کر بھاگتا ہے لیکن جیسا کہ امام راغب نے خشیۃ کے معنی میں لکھا ہے اللہ تعالیٰ کے خوف سے مراد وہ خوف ہو جس میں تعظیم ملی ہوئی ہو یعنی اس چیز کی عزت اور محبت دل میں ہو ۔ اب ظاہر ہے کہ محبوب چیز کا خوف یہ نہیں ہوتا کہ انسان اس سے بھاگتا ہے بلکہ اس کی صورت میں خوف یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی بات پیدا نہ ہو جائے کہ انسان اس اپنی محبوب چیز سے دور ہو جائے یا کوئی امر اس کی ناراضگی کا انسان سے سرزد ہو ۔ پس خشیۃ اللہ کے معنی یہی ہیں ۔ کہ حدود اللہ کے توڑنے کا خوف ہو اسی لئے قرآن شریف نے فرمایا کہ خشیۃ اللہ صرف علماء کے قلوب میں پیدا ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ وہ حدود الٰہی کا علم رکھتے ہیں ۔ اور صفات الٰہی سے واقف ہوتے ہیں اور حدود اللہ کے توڑنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکتے ۔ اور اپنے میثاق اور عہد پر قائم رہتے ہیں +

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارا دین اسلام ہونے پر میں راضی ہوا ۵۸۷

کمال

۵۸۷ اکملت کسی چیز کا کمال یہ ہے کہ جو اس سے غرض تھی وہ حاصل ہو جائے اسی لئے جب کسی چیز کے متعلق کہا جائے کہ وہ کامل ہو گئی تو مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ جو غرض اس سے تھی وہ حاصل ہو گئی۔ اور حولین کاملین (البقرة ۲-۲۳۳) میں مراد یہ ہے کہ یہ اس مدت کی غایت ہے جس کا تعلق بچہ کی صلاحیت سے ہے۔ اور لیحملوا اوزارھم کاملة یوم القیمة (النحل ۱۶-۲۵) میں کمال عقوبت مراد ہے (غ)، پس اکملت لکم دینکم سے مراد یہ ہوئی کہ جو غرض دین سے حاصل ہو سکتی ہے وہ بدرجہ کمال تمہارے اس دین سے حاصل ہو گی۔ اب اس کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت نہیں کہ وہ دین کو کامل کرنے کیلئے آئے جیسے پہلے آتے تھے +

تمام

اتممت کسی چیز کا تمام اس کا اس حد تک پہنچ جانا ہے کہ وہ اپنے سے خارج کسی چیز کی محتاج نہ رہے اور وہ چیز جو اپنے سے خارج کسی چیز کی محتاج ہے اسے ناقص کہا جاتا ہے و تمت کلمة ربك (الاعراف ۷-۱۳۷) واللہ متم نورہ (الصف ۶۱-۸)(غ)،

رضا

رضیت۔ بندہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے امر پر عمل کرنے والا اور اپنی نہی سے رکنے والا پائے (غ)

اسلام میں تکمیل دین

یہ آیت حجة الوداع میں عرفہ کے دن (جو جمعہ تھا) میدان عرفات میں بعد از عصر نازل ہوئی جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ یہود نے حضرت عمرؓ کو کہا کہ ایک آیت تمہاری کتاب میں ہے ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بناتے "تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں یہ آیت فلاں وقت فلاں دن نازل ہوئی۔ آنحضرت صلعم سے پہلے جس قدر انبیاء آئے چونکہ وہ خاص خاص قوموں کی طرف خاص خاص زمانوں کیلئے مبعوث ہوئے تھے اس لئے ابھی تکمیل دین کی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ اور نہ وہ کامل دین ابھی آیا تھا جس نے ساری دنیا کو ایک ہی سلسلہ اخوت میں منسلک کرنا تھا۔ چنانچہ اس کی شہادت مخصوص القوم نبیوں میں سے آخری نبی حضرت مسیح کے کلام سے ملتی ہے "میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی روح حق آوے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتا دیگی" (یوحنا ۱۶: ۱۲ و ۱۳) پس معلوم ہوا کہ حضرت مسیح کی تعلیم تک ابھی دنیا پر "ساری سچائی کی راہیں" ظاہر نہ ہوئی تھیں۔ حضرت مسیح کی زبان سے اس اعتراف کا اناجیل میں موجود ہونا اور نبی کریم صلعم پر دین کے کامل کیا جانے کی آیت کا نزول صاف بتاتا ہے کہ اسلام سے پہلے کوئی دین کمال کی حالت کو نہیں پہنچا بلکہ ضروریات وقتی کو پورا کرنے والا تھا مگر اسلام میں مذہب کمال کو پہنچا اور اس لئے ساری دنیا کا مذہب اسلام ہی ہو سکتا ہے نہ عیسائیت اور انہیں دو مذاہب کا اب مقابلہ دنیا میں ہے۔ اس آیت کے اس موقعہ پر رکھنے میں یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سورت میں عیسائیوں سے ہی زیادہ بحث ہے۔ ابتدا بھی انہی کے عقیدوں کی تردید سے کی ہے اور ختم بھی انہی کے عقیدوں کی تردید پر کیا ہے۔ اور پھر اس کو وہاں رکھا ہے جہاں کمال درجہ کی تفصیلات شریعت ہیں یہ ظاہر کرنے کو کہ دین بغیر شریعت کوئی دین نہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کامل دین میں شریعت کی ضروری تفصیلات کو بھی کمال تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے نزول کے بعد آنحضرت صلعم پر کوئی تفصیل شریعت یعنی امر و نہی نازل نہیں ہوا اور آپ اسکے بعد ۸۲ دن زندہ رہے +

تکمیل دین میں کیا امور داخل ہیں

دین اسلام کے کمال میں کیا کیا باتیں داخل ہیں؟ جو جو غرض دین کی ہو سکتی ہے ان سب اغراض کو اسلام نے پورا کر دیا۔ یہ ایک بہت لمبا مضمون ہے۔ نمونہ کے طور پر دیکھ لو کہ کتاب ایسی کامل کہ فیها کتب قیمة سب مضبوط کتابیں اس کے اندر ہیں یعنی پہلی کل صداقتیں جن کا دنیا میں رہنا ضروری تھا اس کے اندر جمع کر دی گئیں۔ بلکہ آیندہ بھی کوئی ایسی صداقت دینی ظاہر نہ ہو گی جو قرآن کریم کے اندر نہ ہو ولا یاتونك بمثل الا جئنك بالحق (الفرقان ۲۵-۳۳) کوئی نادر بات پیش نہیں کر سکتے۔ مگر ہم حق کے ساتھ اسے پہلے ہی تجھے بتا چکے ہیں۔ سب مذاہب پر بحث موجود۔ ہر ایک عقیدۂ حقہ کی تائید

فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

پھر جو شخص بھوک سے مجبور ہو جائے گناہ کی طرف جھکنے والا نہ ہو تو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۶۸۸

یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ۴

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ انکے لئے کیا حلال کیا گیا ہے کہو تمہارے لئے ستھری چیزیں حلال کی گئی ہیں

اور عقیدۂ باطلہ کی تردید موجود تھی کہ ان عقاید کی بھی جو اس وقت اہل عرب کے علم میں نہ تھے۔ پھر سب مذاہب کو خدا کی طرف سے مان کر ان کے اختلافات میں فیصلہ کی ایک نہایت ہی لطیف راہ بتائی۔ پھر ہر ایک دعویٰ بھی خود پیش کیا۔ دلائل بھی خود دیئے۔ کوئی حملہ اس پر ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ اس کے کسی اصول کو غلط ٹھہرا دے جس نیکی اور خُلق کو سکھایا کمال کے رنگ میں سکھایا کہ اس سے آگے اس نیکی یا خلق کا کوئی مرتبہ نہیں جس بدی سے روکا اس کے مبادی سے بھی بچنے کی راہیں ساتھ ہی بتائیں۔ یہاں تک کہ باریک سے باریک باتیں جو کسی بدی کی طرف لے جا سکتی ہیں ان کو بھی واضح کر دیا جو وعدہ دیا اس کو اسی دنیا میں پورا کر کے دکھایا اور صرف آخرت کے انتظار پر نہیں چھوڑا جس مقام پر انسانوں کو پہنچانے کا دعویٰ کیا تھا اس مقام پر پہنچا کر دکھا دیا۔ تعلیم ایسی کامل کہ سب ملکوں سب قوموں سب زمانوں کی ضروریات کیلئے کافی۔ وہ تعلیم جس کا محتاج ایک وحشی سے وحشی انسان اور ادنے درجہ کی تہذیب والی قومیں ہو سکتی ہیں وہ بھی اس میں موجود ہے اور وہ تعلیم جس کا ایک بڑے سے بڑا فلسفی اور سائنسدان اور تہذیب کی چوٹی پر پہنچی ہوئی قومیں محتاج ہو سکتی ہیں وہ بھی اس میں موجود ہے۔ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ (الانعام۔ ۳۸) پھر محمد رسول اللہ صلعم نے اپنی زندگی میں اخلاق کے سارے شعبے اور زندگی کے سارے پہلو عمل میں لا کر دکھا دیئے۔ اگر ہر ایک نبی ایک روشن چراغ تھا جس نے ایک اندھیری رات میں ایک قوم کو روشن کیا تو محمد رسول اللہ صلعم آفتاب عالمتاب تھے جن کی شعاعوں نے سارے عالم کو منور کر دیا۔ دنیا کے اور کسی نبی یا کسی کتاب میں نہ یہ باتیں جمع ہوئیں اور نہ ہی کسی نے تکمیل تک پہنچانے کا دعویٰ کیا +

اتمام نعمت اور کمال اطاعت

اکمال دین کے ساتھ دو باتوں کا اور ذکر کیا۔ ایک اتمام نعمت اور وہ یہ کہ دینی اور دنیوی طور پر اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو کسی چیز میں کسی دوسرے کا محتاج نہ رہنے دیا۔ بلکہ ہر قسم کی نعمتوں سے ان کو یہاں تک حصہ دیا کہ وہ دوسروں کے محتاج نہ رہے بلکہ دوسرے ان کے محتاج ہو گئے۔ یہ اتمام نعمت اکمال دین کا ہی نتیجہ تھا۔ اور دوسری بات فرمائی کہ میں اس پر راضی ہوا کہ تم نے اسلام یعنی میرے امر کی فرمانبرداری اور میری اطاعت کی پابندی کو بطور دین اختیار کیا اور جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی کمال طاعت کا ذکر ہے اور اس ذکر کی یہاں ضرورت اس لئے ہوئی (حالانکہ صحابہ تو شروع سے ہی اطاعت کرتے تھے) کہ یہاں اکمال دین کا ذکر ہے یعنی جس قدر ہدایات دین کی تھیں وہ سب دیدی گئیں تو ساتھ ہی فرمایا کہ ان سب میں تم نے فرمانبرداری کا بھی کمال دکھایا۔ مال و جان خدا کی راہ میں دیدینے کے بارہ میں۔ رسم و رواج کے چھوڑنے کے بارہ میں۔ عبادات کے بجالانے کے بارہ میں۔ ہر ایک قسم کی بدی سے اجتناب میں غرض اللہ تعالیٰ کے ایک ایک حکم کی اطاعت میں جو کمال صحابہ نے دکھایا وہ نہ پہلے کسی قوم نے دکھایا نہ آیندہ دکھائے گی۔ گویا اسی اطاعت سے ہی اتمام نعمت ہوا جب اطاعت چھوڑ دوگے اتمام نعمت بھی نہ رہے گا +

خامص مخمصۃ

۶۸۸ مخمصۃ۔ خامص دُبلے آدمی کو کہا جاتا ہے پس مخمصۃ سے مراد بھوک ہے جس سے پیٹ دُبلا ہو جائے (غ)

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ فَكُلُوا مِمَّآ

اور وہ جو تم شکاری جانوروں کو شکار کی تعلیم دیتے ہوئے سکھاؤ تم انکو سکھاتے ہو اس علم سے جو اللہ نے تمہیں سکھایا سو جسکو وہ

أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ

تمہارے لئے پکڑ رکھیں اس سے کھاؤ اور اس پر اللہ کا نام یاد کرو اور اللہ کا تقویٰ کرو بیشک اللہ جلد حساب

الْحِسَابِ ٥ الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ

لینے والا ہی ۷۸۹ آج تمہارے لئے ستھری چیزیں حلال کی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی تمہارے لئے حلال ہی

وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ

اور تمہارا کھانا ان کیلئے حلال ہی ۷۹۰ اور پاکدامن مومن عورتیں

جارحة

۷۸۹ جوارح۔ جارحۃ کی جمع ہی شکاری جانور کو کہتے ہیں پرندہ ہو یا درندہ یہ نام اسلئے ہے کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے کیونکہ جرح کے معنی زخم ہیں یا اس لئے کہ وہ کچھ کما کر لاتا ہی اور اسی دوسرے معنی کے لحاظ سے انسان کے اعضا کو جوارح کہا جاتا ہی۔ (غ)

کلب۔ مکلب

مکلبین۔ کَلْب کتا ہی اور کَلَب حرص اور کتے کی حرص میں مثال دی جاتی ہی احرص من کَلْب اور مُکَلِّب وہ ہی جو کتے کو تعلیم دے (غ)

شکار کا جواز

یہاں شکار کو جائز قرار دیا ہی۔ اس قسم کے اشغال کو روکنے سے شجاعت کا جوہر انسان میں باقی نہیں رہتا۔ سدھائے ہوئے جانور کا مارا ہوا کھانا جائز ہی۔ بشرطیکہ اسے چھوڑتے وقت تکبیر پڑھ لی جائے اور بدیں شرط کہ وہ اس میں سے نہ کھائے اور بعض نے پرندوں کو اس سے مستثنے کیا ہی اور بعض کے نزدیک ایک تہائی سے کم کھائیں تو وہ بھی امساک میں داخل ہی اسی پر بندوق تیر وغیرہ کے شکار کو قیاس کر لینا چاہئے۔ یعنی بندوق یا تیر وغیرہ سے مارا ہوا جانور بشرطیکہ شکار کے طور پر ہو جائز ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ چلاتے وقت تکبیر کہی ہو۔ اور گو اس صورت میں اگر جانور کو زندہ پا لیا جائے تو اس کا ذبح کرنا ضروری ہے لیکن اگر شکاری جانور کے پکڑنے سے یا بندوق وغیرہ سے شکار مر جائے تو بھی جائز ہی اور یہ استثنا ہی اور اس طریق سے خون بھی عموماً بہ نکلتا ہی ٭

اہل کتاب کا کھانا کھانا اور دعوت کرنا

۷۹۰ ان الفاظ میں مسلمانوں کیلئے ان لوگوں کا کھانا جائز قرار دیا گیا ہی جو کسی مذہب کے پیرو ہیں جس کی بنیاد آسمانی کتاب پر ہو۔ اور ان کیلئے مسلمانوں کا کھانا جائز ہی یعنی ایک مسلمان کیلئے جائز ہی کہ انکو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دے طعامکم حل لہم میں یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ مسلمانوں کا کھانا یا ذبیحہ نہایت پاکیزہ ہونے کی وجہ سے اہل کتاب میں سے کوئی اس کی حلت میں شبہ نہیں کر سکتا ٭

اہل کتاب کا ذبیحہ

ابن عباس سے روایت ہی کہ یہاں طعام سے مراد صرف ذبیحہ ہی۔ کیونکہ اسی میں اختلاف ہو سکتا تھا۔ بہرحال ذبیحہ اس میں شامل ہی اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کہ اگر اہل کتاب اللہ کے نام پر کسی جانور کو ذبح کریں تو اس کا کھانا مسلمانوں کیلئے جائز ہی۔ البتہ اس میں اختلاف ہی کہ اگر اہل کتاب اللہ کے نام پر ذبح نہ کریں تو اس کا کھانا جائز ہی یا نہیں۔ اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ وہ جائز ہی۔ حضرت ابن عمر کے نزدیک جائز نہیں۔ قرآن کریم کے صریح الفاظ حضرت ابن عمر کے قول کے موید ہیں ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ (الانعام۔ ۱۲۲) اور اس سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا جس کی تاویل گروہ اول نے یوں

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ

اور ان میں سے پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی جب تم انکو انکے مہر دیدو

مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ ط

نکاح میں لانیوالے نہ کھلی بدکاری کرنیوالے اور نہ چھپی دوستی رکھنے والے ۶۹۱

کرلی ہو کہ اس سے مراد صرف بتوں کے ذبائح ہیں سہل مذہب پہلا ہی مگر حق یہ ہو کہ اس زمانہ میں جو سب سے زیادہ ضرورت پیش آتی ہو وہ عیسائیوں کے مارے ہوئے جانوروں کے متعلق ہو سو یہ لوگ ذبح کرتے ہیں نہ خدا کا نام لیتے ہیں اسلئے حالت اضطرار کے سوا اس کا کھانا جائز معلوم نہیں ہوتا۔ کوئی چیز جو اصولاً اسلام نے حرام قرار دی ہو وہ اہل کتاب کا طعام ہونے کی وجہ سے حلال نہیں ہوسکتی۔ مراد صرف یہ ہو کہ چیز پاک ہو تو اہل کتاب کے ہاتھ لگانے سے ناپاک نہیں ہوجاتی ٭

اہل کتاب سے مناکحت

۶۹۱ اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے کے احکام کے ساتھ مناکحت کے احکام بھی بیان کردیئے۔ کیونکہ کھانے پینے کی طرح مناکحت بھی انسان کی فطری خواہش ہو پس ظاہری خواہشات فطری کے سارے احکام کو اس رکوع کے اندر جمع کردیا ہے قرآن کریم میں دوسری جگہ مشرکہ عورتوں سے نکاح کو منع کیا ہو۔ اور ایک جگہ لا تمسکوا بعصم الکوافر فرمایا۔ چونکہ اہل کتاب میں سے بعض مشرک ہوسکتے ہیں بعض نہیں۔ بس لئے ان دونوں حکموں میں کہ مشرکہ عورت سے نکاح نہ کرو اور اہل کتاب کی عورت سے نکاح جائز ہو کوئی تضاد نہیں۔ اور وہ جو کافر عورتوں سے مطلق روکا ہو تو وہ حکم خاص مکہ والوں کے متعلق ہو۔ اسلئے کہ وہ سب مشرک تھے۔ اور علاوہ بریں جنگ کی وجہ سے بھی ان تعلقات کا قطع ہونا ضروری تھا۔ اور بعض کے نزدیک چونکہ اہل کتاب کی اصل بنیاد توحید باری پر ہو اس لئے سب اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے خواہ وہ عملاً یا اعتقاداً مشرک بھی ہوں مگر اقرب الی الصواب یہی ہے کہ صرف ان عورتوں سے نکاح جائز ہے جو اعتقاداً مشرک نہ ہوں ٭

پس قرآن کریم نے یہ جائز رکھا ہے کہ ایک مسلمان مرد ایک غیر مسلم بی بی سے نکاح کرے لیکن یہ جائز نہیں رکھا کہ ایک مسلم بی بی کا کسی غیر مسلم سے نکاح ہو۔ کیونکہ غیر مسلم عورت مسلمان کے گھر میں آکر ایک مسلم عورت کے حقوق حاصل کرکے فائدہ اٹھاتی ہے مگر مسلم عورت غیر مسلم کے گھر میں جاکر پہلے حقوق کو بھی کھو بیٹھے گی۔ جو عورتوں کے حقوق کو ہر حال میں تلف ہونے سے بچایا ہے۔ علاوہ ازیں ظاہر ہے کہ اولاد باپ کے مذہب پر ہوگی پس اسبات سے روکا ہے کہ ایک مسلمان بی بی کی اولاد شرک وکفر پر پرورش پائے۔ یہودی شریعت میں غیر یہود سے نکاح بالکل ناجائز تھا۔ "نہ ان سے بیاہ کرنا اس کے بیٹے کو اپنی بیٹی نہ دینا نہ اپنے بیٹے کے لئے اس کی کوئی بیٹی لینا کیونکہ وہ تیرے بیٹے کو میری پیروی سے پھرا دینگے" (استثنا ۷: ۳ و ۴) مگر اسلام کو یہ خوف نہیں۔ اور شریعت کو لعنت قرار دینے والے پولوس کا فتوے یہ ہے "تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوئے میں مت جُتتے جاؤ" (۲۔ قرنطیوں ۶: ۱۴) البتہ جہاں دوسری قومیں اپنی عورتوں کو مسلمانوں کے گھروں میں داخل کرکے ان سے حبائل الشیطان کا کام لینا چاہیں تو وہاں بچنا ہی مناسب ہے ٭

یہودیوں اور عیسائیوں میں غیروں سے نکاح

آخری الفاظ میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض دوسری قوموں میں ایسے ناپاک تعلقات کو یعنی کھلی بدکاری کو یا خفیہ آشنائیوں کو جائز سمجھا جاتا ہو تم ایسی باتوں سے بچو ٭

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

اور جو شخص ایمان سے انکار کرے تو اس کا عمل ضائع ہو گیا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا ۶۹۲

۶ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ

ع ۲ — ضرورت شریعت اور صفات ملکوتی۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم نماز کو اٹھو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ

اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ط

دھو لیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں (دھو لیا کرو) ۶۹۳

ایمان کا انکار — **۶۹۲** ایمان کے انکار سے مراد یہاں اللہ تعالیٰ کی شرائع کا انکار ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔ کیونکہ ایمان میں عمل بالجوارح بھی شامل ہو دیکھو ۱۱۔ پس اس معنی سے ایمان کا انکار خود اعمال صالح کا انکار ہو تو باقی اعمال کا حبط ہونا خود ظاہر ہو کیونکہ اصل غرض اعمال صالح سے ہو لیکن ایک طرف اگر ان شرائع کی طرف اس لفظ ایمان میں اشارہ ہو جن کا ذکر پیچھے ہوا ہے تو دوسری طرف اگلے رکوع کے مضمون کی طرف بھی اسی لفظ میں اشارہ ہو۔ یعنی یہ کہ اگر تمہاری خواہشات بہیمی کے پورا ہونے کا سامان اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہو تو خواہشات ملکوتی کے پورا کرنے کا سامان بھی اس نے پیدا کیا ہو اور یہی ایمان ہو جو فطرت انسانی کے اس حصہ کا انکار کرتا ہے اس کے وہ اعمال جن کا اشتراک بہائم سے ہو بہیمی رہ جاتے ہیں اور آخرت میں کچھ کام نہیں دیتے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ضل سعیہم فی الحیوۃ الدنیا (الکہف ۱۸: ۱۰۴) اور انہی کے متعلق فرمایا اولئک الذین کفروا بایٰت ربہم ولقائہ فحبطت اعمالہم (الکہف ۱۸: ۱۰۵) حبط کے معنی پر دیکھو ۲۷۹۔

قیام — **۶۹۳** قمتم۔ قیام کے ایک معنی عزم علی الشی کے ہیں اور یہاں قمتم الی الصلوۃ سے مراد یہی عزم نماز ہو (غ)۔

رفق۔ مرفق — مرافق۔ مرفق کی جمع ہو۔ رِفق کے معنی لطف اور نرمی ہیں اور مرفق کسی معاملہ کے متعلق ہو تو مراد ہوتی ہو وہ جس سے فائدہ پہنچے ویہیئ لکم من امرکم مرفقا (الکہف ۱۸: ۱۶) اور کہنی کو بھی کہتے ہیں دل، جیسے یہاں۔ کہنی سے انسان ٹیک لگانے کا فائدہ اٹھاتا ہو۔

صفات بہیمی اور صفات ملکوتی — جب پہلے رکوع میں ان عقود یا احکام کا ذکر کیا۔ جو انسان کے کھانے پینے اور مرد اور عورت کے تعلقات کی فطری خواہشات سے تعلق رکھتے ہیں یعنی جن خواہشات میں انسان کا اشتراک بہائم سے ہو۔ اور یوں صفات بہیمیہ کو حد اعتدال کے اندر لانے کی راہ بتائی۔ تو اب اس دوسرے رکوع میں مضمون کا انتقال ان عقود کی طرف کیا جو انسان کی اس اعلیٰ فطری خواہش سے تعلق رکھتے ہیں جو صلوٰۃ یا دعا کے نام سے موسوم ہو گویا اگر رکوع اول میں بہیمی خواہشات کا ذکر ہے تو اس رکوع میں ملکوتی صفات کا ذکر ہے۔ کیونکہ اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی جو فطرت انسانی کا خالق و مالک ہو خواہش بھی انسان کی فطرت میں موجود ہو۔ اس لئے اس رکوع کو نماز کے متعلق بعض احکام سے شروع کیا ہو اور اسی قسم کے تفصیلی احکام سے شروع کیا ہو یعنی وضو سے جیسے غذاؤں کے متعلق تفصیلی احکام دیئے تھے

تفصیل وضو کے ذکر میں حکمت وحی خفی — نماز کی تفصیل کا ذکر تو قرآن شریف میں نہیں کیا۔ لیکن وضو کا کسی قدر تفصیلی ذکر کر دیا ہو۔ حالانکہ وضو اسی طرح پر برابر کئی سال سے نبی کریم صلعم اور مسلمان کرتے چلے آرہے تھے۔ اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو نبی کریم صلعم کی وحی خفی کے منکر ہیں کیونکہ جس طرح نبی کریم نے وضو کا طریق صحابہ کو سکھایا اسی کو سالہا سال بعد قرآن کریم کی وحی متلو میں بیان کیا گیا

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ

اور اگر تم حالت جنابت میں ہو تو نہا لیا کرو۔ اور اگر تم بیمار رہو یا سفر پر ہو یا تم میں سے

اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا

کوئی جائے ضرور سے ہو کر آئے یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو پھر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا

طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ

قصد کرو اور اس سے اپنے منہوں اور ہاتھوں پر مسح کرو۔ اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کسی طرح کی تنگی کرے

وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَاذْكُرُوْا ۷

لیکن وہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو ۶۹۳ا اور اللہ کی

نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؗ

نعمت یاد کرو جو تم پر ہے اور اس کے اس عہد کو بھی جو اس نے تم سے پختہ لیا جب تم نے کہا ہم نے سنا اور ہم اطاعت اختیار کرتے ہیں

اس سے صاف معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلعم نے جب شروع میں وضو کا یہ طریق سکھایا تو وحی الٰہی سے ہی سکھایا تھا گو وہ وحی نہی الفاظ میں آپ پر نہ آئی تھی اسی کو وحی خفی کہتے ہیں +

علاوہ بریں وضو کی جو نماز کے لئے محض ایک تمہیدی فعل ہے اور نماز کا کوئی حصہ نہیں تفصیل بیان کرنے میں یہ بھی بتایا ہے کہ نماز کی وہ تمام تر تفصیلات جو نبی کریم صلعم نے بتائیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں +

موزوں پر مسح

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ وضو کی بھی پوری تفصیل کا یہاں ذکر نہیں کیا پہلے ہاتھوں کا دھونا پھر کلی کرنا پھر ناک صاف کرنا ان کو چھوڑ دیا ہے اور منہ دھونے کے ذکر سے شروع کیا ہے اس لئے کہ منہ کے دھونے سے پہلے خود ہی انسان ہاتھ دھوئے گا۔ اور کلی کرنا یا مسواک کرنا اور ناک صاف کرنا منہ کی ظاہری صفائی کے لازم اجزا ہیں۔ پاؤں کا دھونا ضروری ہے اور خود شیعوں میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ائمہ وضو میں پاؤں دھوتے تھے۔ ہاں حالت وضو میں موزے یعنی جراب پہن لی جائے تو پانچ نمازوں تک اس پر مسح جائز ہے اور وہ اس آیت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی تفصیل ہے جس طرح زخم وغیرہ میں کسی عضو پر مسح کر لینا اس کے خلاف نہیں +

۶۹۳ا ان تمام امور کا مفصل بیان ۶۶۳ میں ہو چکا ہے۔ یہاں ان تفصیلات کو جو نماز کیلئے تمہیدی فعل ہیں دوہرانے کا منشا یہ ہے کہ اس کے متعلق بھی احکام اللہ تعالیٰ نے دے رکھے ہیں اسلئے آخر پر نعمت پوری کرنے کا ذکر ہے گویا شریعت کی ضروری تفصیلات کو بیان کرکے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنی نعمت کو تمام کر دیا اور اب کسی نئی شریعت کی ضرورت نہ رہی۔ اور تطہیر کے لفظ کو بیان کرکے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ باطنی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ اسلام ظاہری پاکیزگی کے قواعد کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی الدین علی النظافۃ۔ دین کی بنیاد نظافت پر رکھی گئی ہے +

۸ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا

اور اللہ کا تقویٰ کرو بیشک اللہ سینوں کی باتوں کو جانتا ہے ۴۹۴ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے

قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ

(حقوق کی) حفاظت کرنیوالے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ ۴۹۵ اور کسی قوم کی دشمنی تمکو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔

اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

انصاف کرو۔ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ کا تقویٰ کرو بیشک اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو ۴۹۶

وثق ۔ مِیْثَاق ۔ میثاق :

۴۹۴ میثاق ۔ واثق ۔ وثقت بہ کے معنی ہیں اس سے سکون پکڑا اور اس پر اعتماد کیا اور اوثق کے معنی اسے مضبوط باندھا۔ اور میثاق وہ عہد ہے جو قسم سے موکد ہو (غ) +

فطری عہد :

سدی کہتے ہیں کہ اس عہد سے مراد اس شریعت کی خوبی ہے جو عقول انسانی میں مرکوز ہے اور مقاتل نے کہا کہ یہ عہد الست بربکم قالوا بلیٰ والا ہے اور بعض نے بیعت تحت الشجرۃ کو یہ عہد قرار دیا ہے (ج)، شریعت کا دینا اور مسلمانوں کا دین اسلام میں داخل ہونا خود ایک عہد ہے مگر یہاں چونکہ اوپر انسان کی اس فطری خواہش کا ذکر ہے جو اس کو کشاں کشاں اللہ تعالیٰ کی طرف لیجاتی ہے۔ اس لئے مراد وہی فطری عہد ہے جو الست بربکم میں لیا گیا ہے اور نعمت اللہ سے مراد قرآن کریم ہے جو ان پر نازل کیا گیا۔ قرآن کے نزول نے جب اس فطری عہد کو یاد دلایا تو مومن سمعنا و اطعنا کہہ اُٹھے +

۴۹۵ انسان کی وہ صفات جو خواہشات سفلی سے بالاتر ہیں جن کی طرف اس رکوع میں توجہ دلائی ہے ان کا خلاصہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں آجاتا ہے۔ ان دونوں کے قیام کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے۔ قوامین للہ میں حقوق اللہ کی طرف اور شہداء بالقسط میں حقوق العباد کی طرف۔ قوام کے لئے دیکھو ۷۴۲ ایک امر کے قیام کیلئے پورا زور لگانے والا۔ مگر یہاں بجائے اس امر کے ذکر کے صرف للہ فرمایا یعنی حقوق اللہ کی حفاظت پر پورا زور لگانے والے ہو۔ النساء ۴: ۱۳۵ میں جہاں صرف حقوق العباد کی طرف توجہ دلائی تھی۔ فرمایا قوامین بالقسط شہداء للہ +

عدل

۴۹۶ اعدلوا۔ عَدْل کے معنی مساوات ہیں۔ اور عَدْل ان معاملات میں کہا جاتا ہے جن کا تعلق بصیرت سے ہے اور عِدْل وزن ناپ وغیرہ میں جن کا تعلق حاسہ سے ہے اور عدل دو طرح پر ہے ایک احسان کے عوض احسان کرنا اور جو تکلیف دور کرے اس کی تکلیف دور کرنا اور دوسرا قصاص سزاؤں وغیرہ کے بارہ میں (غ) +

حقوق العباد کی تاکید

حقوق العباد کی عظمت پر پھر زور دیا ہے۔ پچھلے رکوع میں صرف اس قدر فرمایا تھا کہ کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے تم اس پر زیادتی نہ کرو۔ یہاں انصاف کے لئے حکم دیا ہے۔ اور انصاف حقوق میں یہ ہے کہ ان حقوق کو ادا کیا جائے۔ تقویٰ سے قریب تر کہکر بتا دیا کہ تقویٰ حفاظت حقوق سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ جب دشمنوں کے حقوق کی ادائگی بھی ایسی ضروری ہے تو پھر اپنے عزیزوں اور دوستوں اور مسلمان بھائیوں کے حقوق کی ذمہ داری کس قدر بڑی ہے۔ کہاں ہیں وہ مسلمان جو اس تعلیم میں مخاطب ہیں!

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ ۹-۱۰

اللہ نے ان سے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں وعدہ کیا ہے کہ ان کیلئے مغفرت اور بھاری اجر ہے اور وہ

كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا ۱۱

جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی

نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ

نعمت یاد کرو جو، تم پر ہوئی، جب ایک قوم نے ارادہ کر لیا کہ اپنے ہاتھ تمہاری طرف بڑھائیں تو اس نے تم سے ان کے

عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ۧ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ ۱۲

ع ۳ / ۸

یہودیوں اور عیسائیوں کی عہد شکنی۔

ہاتھوں کو روکا اور اللہ کا تقویٰ کرو اور اللہ پر ہی مومنوں کو چاہیئے کہ بھروسہ کریں ۴۹۷ اور یقیناً اللہ نے

مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ

بنی اسرائیل سے اقرار لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کئے اور اللہ نے کہا میں ضرور تمہارے ساتھ ہوں

لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ

اگر تم نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور انکی مدد کرو

بسط

۴۹۷ یبسطوا۔ بَسْط کے معنی پھیلانا اور توسع ہیں اور بسط اللسان سے مراد گالی دینا اور بسط الید سے مراد کبھی پکڑنا کبھی حملہ کرنا یا مارنا ہوتا ہے (غ)۔

کف

کَفّ۔ کَفّ کے اصل معنی ہتھیلی ہیں اور پھر اس کے معنی ہیں کف سے دوسرے کو پہنچنا اور اس کو دفع کر دینا اور پھر جس طرح بھی کسی کو دفع کیا جائے اس پر بولا جاتا ہے (غ)۔

آنحضرت کا دشمنوں سے بچانا

بعض مفسرین نے اس آیت کی تشریح خاص واقعات سے کرنی چاہی ہے مثلاً اس واقعہ سے کہ نبی کریم صلعم درخت کے نیچے سوئے ہوئے تھے اور تلوار درخت کے ساتھ لٹکائی ہوئی تھی تو ایک دشمن نے تلوار اٹھا کر کہا کہ اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ تو آپ نے جواب دیا کہ خدا جس پر تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی تب آپ نے وہی تلوار اٹھا کر اس سے یہی سوال کیا اور باوجود اس پر قابو پانے کے اسے مارا نہیں۔ یا اس واقعہ سے کہ یہود بنی نضیر نے نبی صلعم پر جب آپ دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے چکی کا پاٹ گرا کر آپ کو ہلاک کرنا چاہا تھا۔ مگر ان دو واقعات پر کیوں ان الفاظ کو محدود کیا جائے جب ہم جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف دشمن ہی دشمن تھے اور کیا قریش اور کیا دیگر مشرک قبائل عرب اور کیا یہودی اور کیا عیسائی اور کیا عرب اور کیا عجم سب آپ کو اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو ہلاک اور تباہ کرنے کے درپے تھے۔ اور اللہ کے فضل نے ہی ان کو بچایا ہوا تھا۔ یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ تمہارے ساتھ ایسی ایسی عداوت کا اظہار تو یہ لوگ کر چکے ہیں مگر جب تم قوت پکڑو اور مسلمانوں پر تم کو بادشاہت عطا ہو تو ان کے ساتھ انصاف ہی کرنا۔

وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّأُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي

اور اچھا عمل اللہ کے سامنے پیش کرو تو میں بالضرور تمہاری بُرائیاں تم سے دور کردونگا اور بالضرور تم کو باغوں میں داخل کرونگا

مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ فَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ مِنكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝ فَبِمَا ۱۳

جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں پس جو کوئی تم میں سے اسکے بعد انکار کریگا وہ بلاشبہ سیدھے رستہ سے بھٹک گیا[۷۹۸] سو انکے

نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً ۖ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ ۙ

اپنا عہد توڑ دینے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دل سخت کر دیئے لفظوں کو انکی جگہ سے پھیرتے ہیں

وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا

اور جو انکو نصیحت کی گئی تھی اسکا ایک بڑا حصہ چھوڑ دیا اور ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوائے تو انکی خیانت پر اطلاع

مِّنْهُمْ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

پاتا رہیگا سو انکو معاف کر اور درگزر کر بیشک اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے[۷۹۹]

نقیب — ۷۹۸ نقیب۔ نَقْب سے ہے جسکے معنی سوراخ کرنا ہیں اور نقیب وہ ہے جو قوم کے حالات کی تحقیق اور تفتیش کرتا ہو (غ)، پس مراد سردار ہے جو قوم کے حالات سے واقف ہو +

تعزیر — عزرتموھم۔ تعزیر اس مدد کو کہتے ہیں جو تعظیم کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ اور تعزیر سزا دینے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ تادیب ہے اور تادیب بھی ایک نصرت ہے۔ کیونکہ انسان کو نقصان دینے والی چیز سے روک دیتی ہے اسی معنی سے نبی کریم صلعم کی

انصر اخاک ظالما — حدیث ہے اُنْصُرْ اخاکَ ظالماً او مظلوماً اپنے بھائی کی مدد کر ظالم ہو یا مظلوم جب دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ ظالم ہونے کی حالت میں اس کی کس طرح مدد کی جائے تو آپ نے فرمایا اس کے ظلم سے اس کو روک دو (غ)، +

یہود کا عہد — اس رکوع میں یہود و نصاریٰ کی خلاف ورزی عہد کا ذکر ہے جب مسلمانوں کو دو قسم کے عہد بتا دیئے تو اب مثال کے طور پر پہلی قوموں کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے عہد شکنی کی۔ مگر یہود کا ذکر پہلی دو آیتوں میں کرکے پھر اس کی تفصیل اگلے رکوع میں کی ہے اور اس رکوع میں عیسائیوں کی خلاف ورزی عہد کا ہی بالخصوص ذکر ہے +

زمین کنعان اور اسرائیلی سردار — جس عہد کا یہاں ذکر ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کا عہد تھا۔ اور بارہ سردار جو مقرر کئے گئے وہ سرزمین کنعان کے حالات کا پتہ لگانے کیلئے تھے۔ اور نہروں والی زمین بھی وہی سرزمین کنعان ہے۔ "پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کرکے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج تاکہ کنعان کی زمین کی جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں جاسوسی کریں"۔ (گنتی ۱۳: ۱ و ۲) اور پھر ۴-۱۵ آیات تک ان بارہ سرداروں کے نام دیئے ہیں اور واپسی پر انکا بیان اس سرزمین کے متعلق یوں دیا ہے۔ "ہم اس زمین تک جہاں تو نے ہمیں بھیجا تھا پہنچے اس میں سچ مچ دودھ اور شہد بہتا ہے۔ اور یہ وہاں کا میوہ ہے"۔ گنتی ۱۳: ۲۷) +

قسوۃ — ۷۹۹ قاسیۃ۔ قسوۃ دل کی سختی کو کہتے ہیں (غ)، دل کی سختی یہ ہے کہ ذکر اللہ اس میں اثر نہیں کرتا جیسا کہ خود دوسری جگہ فرمایا فویل للقسیۃ قلوبھم من ذکر اللہ (الزمر ۳۹-۲۲) +

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۱۴

اور ان لوگوں سے جو کہتے ہیں ہم نصرانی ہیں ہم نے ان سے بھی عہد لیا تھا مگر جو نصیحت انکو کیگئی تھی انہوں نے بھی ہسکا ایک بڑا حصہ بھلا دیا

فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۗ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ

سو ہم نے انکے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا اور عنقریب اللہ انکو اسکی خبر دے گا

بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا ۱۵

جو وہ کرتے تھے ؀ اے اہل کتاب یقیناً ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہو وہ بہت کچھ اس میں سے کھولکر بیان کرتا ہو

كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۗ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ

جو تم کتاب سے چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں کو معاف کرتا ہو یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور

كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ ۱۶

واضح کرنیوالی کتاب آچکی ہے ؀ اسکے ساتھ اللہ اسکو جو اسکی رضا کی پیروی کرتا ہو سلامتی کی راہوں پر چلاتا ہو۔

خائنۃ — خائنۃ۔ یہاں مصدر کے معنی میں ہو یعنی خیانت۔ دوسری جگہ ہو یعلم خائنۃ الاعین (المومن ۱۹) یا مراد خیانت کرنے والی بڑی جماعت ہو (غ) نسیان بمعنی ترک کیلئے دیکھو ۶۷؎

مسلمانوں کو بتا دیا ہو کہ اہل کتاب کی طرف سے ہمیشہ تم خیانت دیکھتے رہو گے۔ باایں حکم دیا ہو کہ معاف بھی کرتے رہو۔ تحریف کیلئے دیکھو ۶۰۱؎

اغرا — ۶۰۵؎ اغرینا۔ غری کے معنی ہیں کسی چیز کے ساتھ لگ جانا یا چمٹ جانا اسلئے اغراء کے معنی ہیں کسی کے ساتھ لگا دینا (غ)

عیسائیوں کو شریعت پر چلنے کا حکم — عیسائیوں کے اخذ میثاق سے مراد انکو احکام دینا ہو۔ انجیل بھی اس پر شاہد ہو جس کی پہاڑی تعلیم میں بھی احکام پائے جاتے ہیں۔ ایسا کرو ایسا نہ کرو سان کو بھی شریعت پر عمل کرنے کا حکم تھا۔ نماز پڑھنے کا روزہ رکھنے کا بھی حکم تھا دوسرے لوگوں سے عدل و انصاف کرنے کا حکم تھا۔

عیسائیوں میں باہم بغض — یہودیوں کی عہد شکنی کی سزا فرمائی تھی لعنت یعنی ان کا دور کر دینا اور در بدر کر دینا۔ عیسائیوں کی عہد شکنی کی سزا بتائی ہو۔ ان میں باہم دشمنی اور بغض کا رہنا۔ یا یہود و نصاریٰ میں قیامت تک دشمنی اور بغض کا رہنا مراد ہو مگر اول کو ترجیح ہے دونوں باتیں آج تک صحیح پائی جاتی ہیں اور قرآن کریم کے الفاظ کی صداقت ہمیشہ ہی ظاہر ہوتی رہے گی۔ چونکہ عیسائی قوموں کی غرض محض مال دنیا کا جمع کرنا ہو اور اخلاق فاضلہ سے عاری ہیں اسلئے ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف منصوبے کرتے رہتے ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عیسائی قیامت کے دن تک رہینگے اور ان میں باہم دشمنی بھی رہے گی بس یہ خیال کہ کسی وقت کل کے کل مسلمان ہو جائینگے اس آیت کی رو سے غلط ٹھہرتا ہو۔

۶۰۶؎ یہاں بتایا کہ یہ رسول اہل کتاب کے لئے بھی ہو۔ اہل کتاب پیشگوئیوں کا بھی اخفا کرتے تھے اور تعلیم کا بھی۔ پس دونوں مراد ہو سکتے ہیں اور نبی کریم صلعم کے معاف کرنے سے مراد انکی بہت سی شرارتوں کا معاف کرنا بھی ہو سکتا ہو جو وہ رسول اللہ صلعم کے خلاف کرتے تھے۔

وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

اور اپنے حکم سے انکو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال لاتا ہے اور انکو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے

۱۷ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ

وہ یقیناً کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے کہو کسکو اللہ کے مقابلہ میں کچھ بھی

شَيْـــًٔـا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ

اختیار ہوا جب اللہ نے مسیح ابن مریم اور اس کی ماں اور ان سب کو جو زمین میں ہیں ہلاک کرنیکا ارادہ کیا

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ

اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور جو انکے درمیان ہے اللہ کیلئے ہی ہے وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز

۱۸ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ

پر قادر ہے ۸۰۲ اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں ہم اللہ کے بیٹے اور اسکے پیارے ہیں

مسیح کی موت ماننے کے سوائے الوہیت مسیح کا ابطال نہیں ہو سکتا۔

۸۰۲ یہاں اول عیسائیوں کا قول نقل کیا ہے کہ مسیح خدا ہے۔ اور ایسا کہنے والوں کو کافر قرار دیا ہے۔ اسکے بعد ابطال الوہیت مسیح پر دلیل دی ہے۔ عام طور پر ان الفاظ کے معنی یوں کئے جاتے ہیں کہ اگر خدا یہ ارادہ کرلے کہ مسیح ابن مریم اور اسکی ماں کو ہلاک کردے تو پھر کون اللہ کے مقابلہ میں کچھ اختیار رکھتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس سے بودی اور کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ ایک طرف تو یہ فرض کریں کہ مسیح ابتک زندہ ہے اور اس سے جب ایک قوم اسکی الوہیت کی دلیل لے۔ تو جواب میں ہم کہیں کہ خدا جب چاہیگا اسے مار دیگا۔ اور تم اسے نہیں بچا سکو گے جب یہ عقیدہ رکھا جائے کہ مسیح دو ہزار سال سے زندہ ہے۔ اور وہ کھانے پینے کا محتاج بھی نہیں اور اسکے جسم میں کوئی تغیر بھی نہیں آتا تو یہ باتیں ظاہراً اسے بشر یا مخلوق کی حالت سے نکالکر صفات الوہیت اسکے اندر قرار دیتی ہیں۔ اس حد تک تو ہم نے عیسائیوں کی بات کو مان لیا۔ کہ بشر سے واقعی اسکو یہ فوقیت ہے کہ بشر کھانے پینے کا محتاج ہے مسیح نہیں اور بشر کے جسم میں تغیر آتا رہتا ہے مسیح کے جسم میں نہیں آتا اور یہ صفات الوہیت کی ہیں۔ تو اب ہم انہیں گویا یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس میں اس وقت تو ضرور بصفات الوہیت ہیں مگر چونکہ جب خدا چاہیگا اسے ماردیگا اسلئے وہ خدا نہیں۔ کیا ایک لمحہ کیلئے بھی کوئی عقلمند انسان اسکو عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت مسیح کے خلاف دلیل سمجھ سکتا ہے؟ پھر علاوہ ازیں اگر مسیح اس وقت تک نہیں مرے تو ان کی ماں بھی اسی ذیل میں آتی ہے کیونکہ اسکے متعلق بھی وہی ان اراد کا لفظ پڑا ہوا ہے۔ اور یہ ارادہ ابھی واقع نہیں ہوا۔ اور سارے لوگ بھی اسی ذیل میں آئے۔ گویا اُس وقت سے جس قدر من فی الارض ہوئے ہیں ان سب کے متعلق ابھی ارادہ الٰہی ہلاک کرنے کا نہیں ہوا نہ مسیح ابتک مرے نہ مسیح کی ماں نہ اُس زمانہ سے اس وقت تک کوئی انسان ہی مرا ہے +

پس جب مسیح کی ہلاکت کو بطور دلیل پیش کیا ہے اور دلیل یہ بن نہیں سکتی۔ اگر نزول قرآن کے وقت مسیح زندہ ہوں تو لازماً ماننا پڑیگا کہ نزول قرآن کے وقت مسیح فوت ہوچکے تھے جس طرح انکی ماں فوت ہوچکیں جس طرح باقی اہل زمین فوت ہوتے ہیں اور چونکہ ہلاکت کا ارادہ فعل محقق الوقوع ہے اسلئے اِنْ یہاں شرطیہ نہیں بلکہ بمعنی اِذْ ہے یعنی جب خدا نے ایسا ارادہ کرلیا۔ جیساکہ لقد خلق

اِنْ بمعنی اِذْ

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ ۖ

کہو پھر تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمہیں کیوں عذاب دیتا ہے بلکہ تم انہیں میں سے بشر ہو جنہیں اس نے پیدا کیا ہے ۸۰۳

المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین (الفتح ۴۸-۲۷) میں اور جیسا کہ اتقوا اللہ ان کنتم مؤمنین (۵: ۵۷) میں اور جیسا کہ آنحضرت صلعم کے اس قول میں وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون۔ کہ فعل کے محقق الوقوع ہونے کی وجہ سے اِنْ بمعنی اِذْ ہے۔ اور یہ قول مغنی میں منقول ہے۔ اور فمن یملک میں مضارع کا اختیار کرنا اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ جہاں فعل میں استمرار ہو وہاں گزشتہ کے متعلق مضارع کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ یحکم بہا النبیون الذین اسلموا (۴۴) میں یا جیسے فریقا کذبوا وفریقا یقتلون (۷۰) یا جیسے وکذلک نری ابراھیم ملکوت السموات والارض (الانعام ۶-۷۶) میں۔ اور یہاں تو چونکہ من فی الارض کے متعلق ارادہ جیسا گزشتہ میں ہوا آیندہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے فمن یملک نہایت ضروری تھا یعنی اب بھی جب کبھی اللہ تعالیٰ اہل زمین کی ہلاکت کا ارادہ کرتا ہے تو کون اس کا مقابلہ کر سکتا ہے یا کون کسی کو بچا سکتا ہے۔ غرض دلیل ابطال الوہیت یوں بنتی ہے کہ جب مسیح کو مارنے کا ارادہ کیا تو اس کو کون بچا سکا جب مریم کو مارنے کا ارادہ کیا تو اس کو کون بچا سکا جب دوسرے اہل ارض کو مارنے کا ارادہ کیا تو ان کو کون بچا سکا۔ اور اب بھی جب وہ اہل ارض کو مارنے کا ارادہ کرتا ہے تو کون بچا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مسیح اور مریم کے ذکر کے ساتھ من فی الارض لا کر یہ بھی بتا دیا کہ اپنے اپنے وقت میں یہ بھی من فی الارض ہی تھے۔ اور دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہی تھے۔ جو زمین پر بھی رہے اور جب خدا نے چاہا تو انہیں مار بھی دیا۔ پس یہ آیت بھی وفات مسیح پر قطعی دلیل ہے۔ اور اگر وفات مسیح پر دلیل نہیں تو ابطال الوہیت پر بھی کوئی دلیل نہیں۔ اور یہ صریحاً باطل ہے +

جب من فی الارض کو ہلاک کرنے کا ذکر کیا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا یخلق ما یشاء جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے یعنی جیسے جیسے مارتا رہتا ہے پیدا بھی کرتا رہتا ہے +

گزشتہ کے متعلق مضارع کا استعمال

یہود و نصاریٰ کا دعویٰ ابنیت

۸۰۳ یہاں فرمایا کہ عیسائی اور یہودی اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور اللہ کے پیارے قرار دیتے ہیں۔ ابن اللہ کا لفظ توریت اور انجیل دونوں میں پایا جاتا ہے چنانچہ خروج ۴: ۲۲ میں ہے "اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا ہے" اور یرمیاہ ۳۱: ۹ میں ہے "میں اسرائیل کا باپ ہوں اور افرائیم میرا پلوٹھا ہے"۔ اور انجیل متی ۵: ۹ میں ہے "مبارک وے جو صلح کرنے والے ہیں کیونکہ وہ خدا کے فرزند کہلائینگے"۔ پس ابناء اللہ کا لفظ تو یہود و نصاریٰ کے لئے توریت و انجیل میں موجود ہے مگر احباؤہ یعنی خدا کا حبیب یا پیارا ہونا یہ گویا بطور نتیجہ تھا یعنی یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ چونکہ ہم خدا کے بیٹے ہیں اور بیٹا باپ کا پیارا ہوتا ہے اس لئے ہم اس کے پیارے بھی ہیں۔ گویا کل مخلوق میں سے اپنی خاص نسبت اول الذکر بوجہ اولاد اسرائیل ہونے کے اور عیسائی بوجہ کفارہ پر ایمان لانے کے اللہ تعالیٰ سے قایم کرتے تھے۔ اس لئے فرمایا کہ تمہارے گناہوں کی سزا تو یہاں بھی اسی طرح تم کو ملتی رہتی ہے جس طرح دوسری مخلوق کو پس خاص تعلق ابنیت اور محبت کا تمہارا کوئی نہیں ہو سکتا۔ ابن اللہ کا لفظ نہ توریت میں اولاد اسرائیل ہونے کی وجہ سے کہا گیا تھا نہ انجیل میں کفارہ پر ایمان کی وجہ سے بلکہ وہ محض اعمال صالحہ اور اعلیٰ درجہ کے اخلاص کی وجہ سے تھا ان کو چھوڑ کر اب تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا عیسائی کہتے ہیں حضرت عیسیٰ کے کفارہ سے آدم کا گناہ دور ہو گیا حالانکہ بائبل میں جو آدم کے گناہ کی سزا لکھی ہے کہ مرد پسینہ سے کمائیگا اور عورت درد سے جنے گی وہ سزا تو اسی طرح عیسائیوں میں باقی ہے آج کل بھی عیسائی اقوام اپنے آپ کو تمام اقوام سے بڑھکر قرار دیتی ہیں گویا دوسرے کبھی اس مقام کو حاصل کر ہی نہیں سکتے جیسے یہ خود اس نے حاصل کیا ہے +

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

وہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور وہ جو ان دونوں

١٩ بَيْنَهُمَا ۫ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى

کے درمیان ہے اللہ کیلئے ہی ہے اور سب کو اسی کی طرف پھر کر جانا ہے۔ اے اہل کتاب یقیناً ہمارا رسول تمہارے پاس آیا ہے وہ رسولوں کے بند ہو جانے

فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ ۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ

پر تمہارے لئے کھول کر بیان کرتا ہے ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا نہیں آیا اور نہ کوئی ڈرانیوالا سو یقیناً تمہارے

ع بنی اسرائیل کی نافرمانی

٢٠ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ

پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانیوالا آگیا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ٨٠٢ اور جب موسےٰ نے اپنی قوم کو کہا

يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ

اے میری قوم اللہ کی نعمت (جو) تم پر ہوئی، یاد کرو جب اس نے تم میں نبی بنائے

فتور — ٨٠٢ فترۃ۔ تیزی کے بعد جو سکون ہو اور شدت کے بعد نرمی اور قوت کے بعد ضعف اسے فتور کہا جاتا ہے (غ)

فترۃ — اور فترۃ کا زمانہ وہ کہلاتا ہے جو دو نبیوں یا رسولوں کے درمیان خالی زمانہ گزرتا تھا۔ کیونکہ اس وقت کوئی داعی نہ ہوتا تھا (ل)، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی فترت کا زمانہ نہیں کیونکہ دعوت الی الحق اُمت محمدیہ کا کام قرار پاگیا اور انقطاع رسالت ہوگیا۔ اس لئے کہ رسالت کی ضرورت کامل طور پر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں پوری ہوگئی +

زمانہ فترت — کوئی چھ سو سال کا زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ایسا گزرا ہے کہ اس میں کوئی نبی دنیا میں ظاہر نہیں ہوا جس پر حدیث لم یکن بینی و بینہ نبی شاہد ہے یعنی میرے اور عیسیٰ کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا۔

حضرت عیسیٰ اور آنحضرت کے درمیان نبی — تاریخ عالم بھی اس پر گواہ ہے۔ اور یہ جو بعض نے لکھا ہے کہ تین انبیاء اسرائیل سے اور ایک خالد بن سنان العبسی عرب سے ہوا سو ان پر نبوت کا نام محض بطور مجاز بولا گیا ہے چنانچہ ان تین کے متعلق جن کا ذکر سورۃ یٰسین میں اذ ارسلنا الیہم اثنین کے نیچے سمجھا گیا ہے صاف طور پر مانا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسےٰ کے رسول تھے۔ اور ان پر رسل کا لفظ بطور مجاز استعمال ہوا ہے

خالد بن سنان — اور خالد بن سنان یا حضرت عیسیٰ سے پہلے کے ہیں (اور اس صورت میں ان کی بیٹی سے جس کے نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر ہے مراد ان کی نسل میں سے کوئی ہے) جیسا کہ بعض محققین نے مانا ہے اور یا یہاں بھی لفظ کا استعمال بطور مجاز ہے اور وہ محض پیشگوئی کرنے والے تھے۔ اور حضرت عیسیٰ قومی نبیوں کے خاتم ہیں۔ اس زمانہ فترت میں تاریکی کل عالم پر محیط ہوگئی۔ اور آنحضرت صلعم نے توحید الٰہی کو دوبارہ دنیا میں قایم کیا اس لئے آپ آدم ثانی ہیں کہ نسل انسانی کی روحانی زندگی کو دنیا میں آپ نے ہی قایم کیا۔ اسی انقطاع کی طرف یہاں عیسائیوں وغیرہ کو توجہ دلائی ہے +

وَجَعَلَكُمْ مُّلُوكًا وَّاٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا ۲۱

اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ کچھ دیا جو قوموں میں سے کسی کو نہیں دیا ۸۰۵ اے میری قوم ارضِ مقدس

الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝

میں داخل ہو جاؤ جسے اللہ نے تمہارے لئے لکھ رکھا ہے ۸۰۶ اور پیٹھ پھیرتے ہوئے واپس نہ ہو آنا ورنہ تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے

یہود کی عہد شکنی کی ایک مثال

۸۰۵ اس رکوع میں بتایا ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ جو خدائی وعدے تھے ان میں بنی اسرائیل کی عہد شکنی کی وجہ سے کس طرح التوا ہو گیا۔ پچھلے رکوع میں ان کی عہد شکنی کا عام ذکر تھا یہاں ایک خاص مثال دی ہے اور یہود کو خاص کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اس رسول کے خلاف جو ان کی اصلاح کیلئے آیا تھا کس طرح اب جنگ و جدال کے درپے ہیں۔ حالانکہ جب انکو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بت پرست قوم کے خلاف جنگ کا حکم ان کے نبی کی معرفت دیا گیا تھا تو اس وقت جنگ کرنے سے انکار کر دیا۔ یوں ان کی عہد شکنی کا بھی ذکر کیا اور ان کی موجودہ منصوبہ بازی کی طرف بھی اشارہ کر دیا جس کا زیادہ صراحت سے ذکر اگلے رکوع میں آئیگا۔

نبی بنانے سے مراد

نبی بنانے، اور بادشاہ بنانے کا ذکر یا بطور وعدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وعدے ایسے ہیں کہ گویا جو کچھ اس نے کہا وہ ہو ہی چکا ہے یا انبیاء سے اشارہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون کی طرف ہے جو اس وقت موجود تھے۔ اور ابن جریر میں جو ایک قول ہے کہ وہ ستر آدمی جو حضرت موسیٰ طور پر ساتھ لے گئے تھے نبی بنانے میں ان کی طرف اشارہ ہے تو یہ صرف اس معنی سے درست ہو سکتا ہے کہ ان کو سچے خوابوں اور الہامات سے مشرف کیا گیا ہو اور اس معنی میں لفظ نبی کا اطلاق بنی اسرائیل میں ہوتا تھا۔ اور

بادشاہ بنانے سے مراد

بادشاہ بنانے سے ان کا حالت غلامی سے نکال کر جس میں وہ مصر میں تھے۔ خود مختار اور اپنی قسمت کا آپ مالک بنا دینا مراد ہے۔ کیونکہ اصل بادشاہت دوسرے کی ماتحتی سے آزادی ہے جب قوم اپنی قسمت کی آپ مالک ہو گئی دوسری قوم کی غلامی سے نکل گئی تو وہ بادشاہ بن گئی اور ابن جریر کی روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل میں جو شخص گھر اور عورت اور خادم کا مالک ہوتا تھا وہ بادشاہ سمجھا جاتا تھا تو اس میں بھی یہی اشارہ پایا جاتا ہے کیونکہ فرعون کی ماتحتی میں وہ بوجہ غلامی کے نہ اپنے گھروں کے مالک تھے۔ اور خدمتگار رکھنے کی بجائے خود ان سے خدمتگاری کا کام لیا جاتا تھا۔ اور نبی بنانے کے متعلق کہا کہ تم میں نبی پیدا کئے مگر بادشاہت کو ساری قوم کی طرف منسوب کیا اس میں بتایا کہ بادشاہت درحقیقت قوم کی ہوتی ہے نہ چند افراد کی۔ اور یہ فضیلت کہ جو کچھ تمہیں دیا وہ دنیا کی اور کسی قوم کو نہیں دیا۔ اس سے مراد یہ ہو کہ اس زمانہ کی اور کسی قوم کو یہ نہیں دیا (دیکھو نوٹ) یعنی نبوت کا سلسلہ ان میں بہت وسیع کیا۔ اور پھر نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی دی +

تقدیس
الارض المقدسۃ

۸۰۶ الارض المقدسۃ۔ تقدیس سے مراد اللہ تعالیٰ کا پاک کرنا ہے یعنی ایسی تطہیر جو نجاست محسوسہ سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس لئے بیت المقدس اور الارض المقدسۃ وہ جگہ ہے جو نجاست شرک سے پاک کی گئی (غ) اور قُدس کے معنی برکت بھی ہیں (ل)، اور الارض المقدسۃ سرزمین شام ہے جس میں بیت المقدس بھی شامل ہے اور فراء کا قول ہے کہ وہ دمشق اور فلسطین اور بعض علاقہ اُردُن ہے (ل۔ ج) اور ابن جریر کہتے ہیں کہ اہل تاویل اور سیرت اور علمائے خبر کا سپر اتفاق ہے کہ ارض مقدسہ عریش مصر اور فرات کے درمیان واقع ہے۔ اور بائبل میں اس کی برکتوں کا یوں ذکر کیا کہ "اس میں سچ مچ دودھ اور شہد بہتا ہے" (گنتی ۱۳: ۲۷) +

کتب اللہ لکم۔ اس میں اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیم سے کی گئی تھی "خداوند نے ابرام سے عہد

۲۲ قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْهَا

انہوں نے کہا اے موسیٰ اس میں قوی ہیکل لوگ ہیں اور ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہونگے جب تک وہ اس میں سے نکل نہ جائیں

۲۳ فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ

ہاں اگر وہ اس میں سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہو جائینگے ۸۰۷ ان میں سے جو ڈرتے تھے دو شخصوں نے جن پر اللہ نے انعام کیا تھا

اللّٰهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ وَعَلَی اللّٰهِ

کہا ان پر دروازے کے رستہ سے داخل ہو جاؤ سو جب تم اس میں داخل ہو جاؤ گے تو یقیناً تم غالب ہو گے اور اللہ پر ہی

۲۴ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا

توکل کرو اگر تم مومن ہو ۸۰۸ انہوں نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز اس میں کبھی داخل نہ ہونگے

کہ کہا کہ میں تیری اولاد کو یہ ملک دوں گا مصر کی ندی سے لیکر بڑی ندی تک جو فرات کی ندی ہے" (پیدائش ۱۵ اور ۱۸:۲۱) اور پیدائش ۱۷:۸ میں ملک کنعان کا نام لیکر یہی وعدہ ہے۔ اور حضرت ابراہیم کے وعدہ میں بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں شامل ہیں۔
حضرت موسیٰ نے ان کو ارض مقدس میں بحیثیت فاتح داخل ہونے کو کہا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ یہ سرزمین تمہیں ملے گی لیکن اس کے لئے جد و جہد ضروری ہے اور لا ترتدوا علیٰ ادبارکم سے مراد یہی ہے کہ دشمن سے ڈر کر پیٹھ نہ پھیر دو +

جبر ‏— الجبار ‏— جبار

۸۰۷ جبارین ۔ جبّار ۔ جبر سے ہے جس کے اصل معنی ہیں کسی قسم کے غلبہ سے کسی چیز کی اصلاح کرنا اور اس لئے کبھی صرف اصلاح، اور کبھی صرف قہر یا غلبہ کے معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے (غ)، اور الجبار جو اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے تو اس کے معنی ہیں العالی فوق خلقه۔ اسلئے انسان کو جبار کہیں گے تو اس سے مراد متمرد عاتی یا متکبر ہوگا (کیونکہ جبار و متکبر ہونا یعنی دوسروں پر علو اور بڑائی اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کو شایاں ہے انسان کو نہیں) اسلئے لم یکن جبارا عصیا (مریم ۱۹-۱۴) اور لم یجعلنی جبارا شقیا (مریم ۱۹-۳۲) میں مراد متکبر ہے جو اللہ تعالیٰ کے آگے سر نہ جھکاتا ہو۔ اور جبار اس کو بھی کہتے ہیں جو دوسرے پر مسلط کیا گیا ہو وما انت علیهم بجبار (ق ۵۰-۴۵) میں یہی مراد ہے۔ اور جبار ناحق قتل کرنے والے کو بھی کہتے ہیں واذا بطشتم بطشتم جبارین (الشعراء ۲۶-۱۳۰) اور ان ترید الا ان تکون جبارا فی الارض (القصص ۲۸-۱۹) میں یہی مراد ہے۔ اور جبار عظیم قوی طویل کو بھی کہتے ہیں اور یہ معنی نَخْلَةٌ جبّارۃ سے لئے گئے ہیں یعنی بلند یا بڑی کھجور جہاں ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ اور یہی معنی فیها قوما جبارین میں ہیں یعنی بڑے قوی ہیکل یا طاقتور یا زبردست لوگ (ل) +
گنتی ۱۳:۳۱ میں ہے "ہمیں مقدور نہیں کہ ان لوگوں پر چڑھیں کیونکہ وے ہم سے زیادہ زور آور ہیں" اور ۳۳ میں ہے "ہم نے وہاں جباروں کو ..." دیکھا ۱۳ اور ۱۴ باب کے شروع میں ذکر ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل ان سے خائف ہوئے اور اس سرزمین میں داخل ہونے سے انکار کیا اور مصر کو واپسی کی ٹھانی یعنی جنگ پر اس حالت غلامی کو ترجیح دی۔ اس سے زیادہ جو قوما جبارین کی تفسیر میں قصے لکھے گئے ہیں وہ صرف قصے ہی ہیں +

۸۰۸ ان دو شخصوں کے نام گنتی ۱۴:۶ میں دیئے ہیں۔ یوشع بن نون اور کالب بن یفنّہ

مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝

جبتک کہ وہ اس میں ہیں پس تو اور تیرا رب جاؤ اور جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں ٨٠٩

النصف

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ ٢٥

موسیٰ نے کہا اے میرے رب میں سوائے اپنے اور اپنے بھائی کے اور کسی پر اختیار نہیں رکھتا سو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں

الْفٰسِقِيْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ ٢٦

میں فیصلہ کر دے ٨١٠ (اللہ نے) کہا اب وہ (زمین) ان پر چالیس سال کیلئے حرام کر دی گئی ہے اسی زمین میں

فِي الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝

سرگردان پھرتے رہینگے سو تو ان نافرمان لوگوں پر افسوس نہ کر ٨١١

---

٨٠٩ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کے حکم کی نافرمانی کی اور دشمن سے خایف ہو کر جنگ کرنے سے قطعی انکار کر دیا فاذهب انت وربك ایسی قوم کے منہ سے نکلنا جو بات بات پر تمرد اور سرکشی دکھاتے تھے کوئی عجیب بات نہیں مطلب یہ ہے کہ تجھے اپنے رب کی مدد پر بھروسہ ہے سو تو اور تیرا رب جا کر جنگ کرو ہم اپنے آپکو ہلاکت میں نہیں ڈالتے۔ اور جنگ میں نہیں جاتے +

اصحاب موسیٰ اور اصحاب محمد صلعم

صحیح احادیث میں یہ ذکر ہے کہ بدر کے دن مقداد ؓ نے نبی کریم صلعم سے عرض کی کہ ہم اصحاب موسیٰ کی طرح یہ نہ کہینگے فاذهب انت وربك بلکہ ہم آپکے ساتھ ہو کر آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں سے لڑینگے لیکن بعض احادیث میں یوم بدر کا لفظ ہے اور بعض میں نہیں۔ بخاری کتاب التفسیر میں بھی یوم بدر کا لفظ ہے اور ابن جریر نے روایت بیان کی ہے کہ یہ لفظ مقداد نے حدیبیہ میں کہے تھے۔ اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ گو سورتوں کا نزول لمبے عرصہ پر ممتد رہتا تھا مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سورۃ مائدہ کا کوئی حصہ جنگ بدر سے پہلے نازل ہو چکا ہو اور حدیبیہ سے پہلے اس کا نازل ہونا قرین قیاس ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کس طرح ان قصوں سے جو پہلی قوموں کے مذکور ہیں عبرت حاصل کرتے تھے +

٨١٠ حضرت موسیٰ کا یہ کہنا کہ میں اپنے نفس پر اور اپنے بھائی پر اختیار رکھتا ہوں اس لحاظ سے ہے کہ ان دونوں کو اللہ تعالےٰ نے نبوت کے مقام پر کھڑا کیا تھا۔ پس ان کا تو تنہا بھی جنگ کرنے کیلئے اگر حکم الٰہی آئے نکلنا ضروری تھا۔ اسی لئے یہاں ان دو کو بھی شامل نہیں کیا جن پر انعام کا ذکر ابھی ہو چکا ہے +

فرق

افرق۔ فَرَقْتُ بین الشیئین کے معنی ہیں دو چیزوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا خواہ وہ ایسی علیحدگی ہو جسکو آنکھ دیکھ سکے (یعنی مکانی طور پر تفریق) اور خواہ ایسی علیحدگی جو بصیرت سے معلوم ہو سکے (یعنی حکم اور فیصلہ میں الگ الگ کر دینا) (غ)۔ اور یہاں معنی اقضی ہی لئے گئے ہیں (ج)۔ اور فاسق یا نافرمان قوم ان کو بلحاظ کثرت کے کہا گیا ورنہ وہ دو جنپر انعام ہوا انہی میں شامل تھے۔

تاہ

٨١١ یتیهون۔ تاہ یتیہ کے معنی ہیں تحیّر یعنی حیران رہا (غ) مطلب یہ کہ کسی مقصد کو حاصل نہ کر سکینگے +

اسوة

اسی

تأس مادہ اسا ہے اور اُسْوَة یا اِسْوَة وہ حالت ہے جس پر انسان دوسرے کی اتباع میں ہو خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری۔ اور اَسی کے معنی حزن یعنی غم ہیں گویا وہ فوت شدہ چیز کا اتباع غم سے کرتا ہے اور اَسِیْتُ علیہ اور اَسِیْتُ لَهٗ دونوں طرح یہ آتا ہے۔ اسی سے تاس ہے (فکیف اٰسی علیٰ قوم کٰفرین (الاعراف-٩٣) +

۲۷ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا

اور ان پر آدم کے دو بیٹوں کی خبر حق کے ساتھ پڑھ دو جب انہوں نے کوئی قربانی پیش کی سو وہ ان دونوں میں سے ایک سے قبول کی گئی

وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝

اور دوسرے سے قبول نہ کی گئی اس نے کہا میں ضرور تجھے قتل کر دونگا اس نے کہا اللہ صرف متقیوں سے قبول کرتا ہے ۸۱۳

رکوع ۵ — اہل کتاب کے منصوبے اور حفاظت جان و مال کی ضرورت — النصف

گنتی ۱۴: ۲۳ میں ہے "وے اس زمین کو جس کی بابت میں نے ان کے باپ دادوں سے قسم کی تھی نہ دیکھنے" اور ۲۹ میں ہے "تمہاری لاشیں اور ان سب کی جو تم میں شمار کئے گئے ان کی کل جمع کے مطابق بیس برس والے سے لیکے اوپر والے تک جنہوں نے میری شکایتیں کیں اس بیابان میں گرینگی" گویا یہ نسل بہیں تباہ ہو جائے گی اور ان کی اولاد فاتح ہو گی۔ قرآن کریم نے چالیس سال کا لفظ اختیار فرما کر اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ اوسط عمر ساٹھ سال ہے پس چالیس سال میں یہ لوگ جو اس وقت نافرمانی کر رہے ہیں اور جنگ کرنے کے قابل ہیں ہلاک ہو جائیں گے ✦

ہابیل اور قابیل کے قصہ کی غرض

۸۱۳ اس رکوع میں ایک مثال بیان کی ہے کہ کس طرح ایک انسان نے دوسرے کو محض اس کی نیکی پر حسد کی وجہ سے قتل کر دیا اصل ذکر اہل کتاب کا تھا اور اس رکوع میں بھی بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے اور اگلے میں بھی ان کی تحریف وغیرہ کا ذکر ہے اور اسکے بعد بھی انہی کا ذکر چلتا ہے پس اصل غرض اس قصہ میں بھی یہی بتانا ہے کہ یہود محض حسد کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف منصوبے کرتے ہیں۔ بلکہ بعض مفسرین نے واتل کو اسی تعلق کی طرف توجہ دلانے کیلئے آیت ۱۱۔ اذھم قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم پر عطف قرار دیا ہے (ج) اور بعض نے اس کو آیت ۱۰ پر عطف کہا ہے جہاں یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں گویا بتایا کہ یہ دعویٰ اور یہ کام۔ اور پھر اس رکوع میں حفاظت جان و مال کی ضرورت کی طرف اسی لحاظ سے توجہ دلائی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کا یوں سد باب نہ کرتا تو پھر دنیا سے امن بالکل اٹھ جاتا پس اس ذکر کو بطور ایک مثال کے یہ سمجھانے کیلئے بیان کیا کہ وہ یہود جو جنگ سے اس قدر خائف تھے کہ باوجود حکم الٰہی کے اس سے انکار کیا۔ اب آنحضرت صلعم سے محض بربنائے حسد برسر پیکار رہتے یہی حالت آج کل عیسائیوں کی ہے کہ ایک طرف دعویٰ صلح اور محبت کا ہے اور یہی انجیل کی تعلیم کا ماحصل بتایا جاتا ہے اور دوسری طرف ذرا ذرا بات پر دنیا کی آزادی سلب کرنے کیلئے اور دوسری قوموں کو محکوم بنانے کیلئے لڑائیاں کرتے ہیں ✦

آدم کے دو بیٹے

آدم کے یہ دو بیٹے اکثر کے نزدیک حضرت آدم کے صلبی بیٹے ہابیل و قابیل تھے حسن اور ضحاک کہتے ہیں بنی اسرائیل کے دو آدمی تھے بمضمون کی حیثیت کلی اسی خیال کی موید ہے کہ یہ کوئی بہت ابتدائی واقعہ ہے کہ کس طرح اول اول انسان کا ہاتھ اپنے ہی بھائی کے مارنے کیلئے اٹھا۔ خواہ وہ حضرت آدم کے صلبی فرزند ہوں یا نہ ہوں۔ کیا قربانی کی تھی اور کس طرح اس کی قبولیت کا پتہ لگا یہ نہیں بتایا۔ اس لئے ان تفصیلات میں پڑنا درست نہیں۔ قربان

قربان اصل میں ہر ایک وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے اور مشہور معنی میں اس کا استعمال عام ہے ۵۷۹ اور قبولیت کے آثار بسا اوقات اس دنیا میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ابو عامر جیسے راہب کی مکاری اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے آثار قبولیت کفار کی نظروں سے بھی مخفی نہ تھے صرف حسد کی وجہ سے آپ کی ترقی سے جلتے تھے اور آپ کو ہلاک کرنا چاہتے تھے ✦

لَئِنْ بَسَطْتَّ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَآ أَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ ۚ ۲۸

اگر تو میری طرف اپنا ہاتھ بڑھائیگا کہ مجھے قتل کرے میں اپنا ہاتھ تیری طرف نہ بڑھاؤنگا کہ تجھے قتل کروں

إِنِّيٓ أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعٰلَمِينَ ○ إِنِّيٓ أُرِيدُ أَن تَبُوٓأَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ ۲۹

یقیناً میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہانوں کا رب ہے[۸۱۳] بیشک میں چاہتا ہوں کہ تو میرے خلاف گناہ اور اپنے گناہ کو لے کر

فَتَكُونَ مِنْ أَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِينَ ○

اور یوں آگ والوں میں سے ہوجائے اور یہی ظالموں کا بدلہ ہے[۸۱۴]

دو مسلمانوں کا جنگ کرنا

۸۱۳؎ بسط ید سے مراد ہاتھ بڑھانا یا حملہ کرنا ہے۔ اس کو معلوم بھی ہوگیا کہ یہ میرا بھائی میرے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تاہم اس نے کہا کہ میں تجھے قتل کرنے کے لئے کبھی ابتدا نہ کروں گا۔ اور حدیث صحیح میں بھی ہے اذا التقی المسلمان بسیفیھما فقتل احدھما صاحبہ فالقاتل والمقتول فی النار یعنی جب دو مسلمان اپنی تلواروں سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوں تو قاتل اور مقتول دونوں آگ میں ہیں اور جب دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلعم مقتول کیوں؟ تو فرمایا کہ وہ اپنے ساتھی کے قتل کرنے پر حریص تھا پس یہ وہ صورت ہے جہاں دونوں ایک دوسرے کو قتل کرنا چاہتے ہیں متقی کا یہ کام نہیں کہ گو اسے یہ بھی معلوم ہو کہ ایک شخص اسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تاہم بطور ابتدا اس پر ہاتھ اُٹھائے ہاں جب حفاظت کا سوال ہو تو بلاشبہ تلوار اُٹھانا جائز ہے۔

اثمی سے مراد میرے خلاف گناہ ہے

۸۱۴؎ اثمی کے معنی ہونگے میرا گناہ مگر حقیقت میں مراد ہے میرے خلاف گناہ کیونکہ اوپر اس کو متقی قرار دیا جا چکا ہے ابن عباس ابن مسعود اور بہت سے صحابہ سے اثمی کے معنی اثم قتلی مروی ہیں (ج) یعنی میرے قتل کا گناہ جو تو اپنے ذمہ لیگا۔ اور اثمک سے مراد اس کے پہلے گناہ ہیں جن کی وجہ سے اس کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔ یہ ادنی تعلق کی اضافت قرآن کریم میں بہت جگہ آجاتی ہے جسکے نہ سمجھنے سے لوگ ٹھوکر کھاتے ہیں۔ اسی قسم کا ادنے تعلق ما تقدم من ذنبک وما تاخر (الفتح ۴۸-۲) میں ہے جہاں ذنبک سے مراد وہ ذنب ہے جو کفار آنحضرت صلعم کی طرف منسوب کرتے تھے۔

ذنبک سے مراد

کسی کے ارادہ قتل کی وجہ سے اسکا قتل کرنا جائز نہیں

اصل نیت اور ارادہ اس کا تو یہی ہے کہ اپنے بھائی کے قتل کیلئے ابتدا نہیں کریگا گو وہ بھائی اسکے قتل کا ارادہ کر چکا ہے۔ یہاں اس کے نتیجہ کو بیان کیا ہے کہ میں ابتدا کر کے تمہارے وجود کو دنیا سے مٹانا تو نہیں چاہتا مگر چونکہ تم ارادہ کر چکے ہو کہ جب موقع پاؤ مجھ کو قتل کر دو اسلئے نتیجہ یہ ہوگا کہ تم دوہرے گناہ کو اُٹھاؤ گے ایک تو پہلے ہی تم قرب الٰہی سے دور پھینکدیئے گئے ہو اسلئے کہ نیکی کی طرف قدم نہیں اُٹھاتے بلکہ بدیوں کا ارتکاب کرتے ہو دوسرے مجھے قتل کر کے ایک اور گناہ سر پر لوگے۔ پس اگر تمہارا پہلا گناہ قابل معافی بھی ہے تو یہ عمداً گناہ ضرور تمہیں آگ میں لے جائیگا۔ یہ بھی درحقیقت اسکو گناہ سے روکنے کیلئے نصیحت تھی کہ اس حد تک تم اپنے آپ کو گناہ میں مبتلا نہ کرو۔

اسلامی تعلیم کا رنگ ہی یہاں ظاہر فرمایا ہے وہاں بھی یہی حکم ہے وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم تم جنگ میں ابتدا مت کرو۔ آج بھی بہتیرے لوگ ہیں جو کھلے طور پر نہیں تو مختلف تجاویز سے آہستہ آہستہ اسلام کا نام مٹانا چاہتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کو یہ اجازت نہیں کہ ان کے ان ارادوں کی وجہ سے پہل کر کے ان کے خلاف ہاتھ اُٹھائیں۔ ہاں اپنی حفاظت کر لینا امر دیگر ہے۔

۳۱ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ فَبَعَثَ اللّٰهُ

سو اس کے نفس نے اسکے بھائی کے قتل پر اسے راضی کر دیا یعنی اسکو قتل کر دیا اور نقصان اٹھانیوالوں میں کے ہو گیا ۸۱۵ تب اللہ نے ایک

غُرَابًا يَّبْحَثُ فِى الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِىْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى

بھیجا جو زمین کریدتا تھا تاکہ اسے دکھائے کہ کس طرح اپنے بھائی کے عیب کو چھپائے کہنے لگا مجھ پر افسوس مجھ سے اتنا

۳۲ اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِىَ سَوْءَةَ اَخِىْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ○ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ

نہ ہو سکا کہ اس کوّے کی مانند ہوتا اور اپنے بھائی کے عیب کو چھپاتا تب وہ پشیمان ہونیوالوں میں سے ہوا ۸۱۶ اسی وجہ سے ۔

ہ ۵ وتعالی لنبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ نزل الذاکرین

طوع ۔ تطویع

۸۱۵ طوّعت طَوّع کے اصل معنی انقیاد یعنی فرمانبرداری ہیں طوعت لہٗ کے معنی ہیں انقادت لہٗ وسہّلت یعنی اسے اس کا فرمانبردار بنا دیا اور سہل کر دیا اور لکھا ہے کہ یہ تابّت عن کذا کے مقابلہ پر ہے یعنی نفس نے اسباب سے انکار کر دیا اور اس کو نہ مانا (غ) اور اس لفظ کے اختیار کرنے میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اول اول طبیعت میں اس کے متعلق روک تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ امر اسے آسان نظر آنے لگا اور آخر کار نفس اس پر راضی ہو گیا اور ایسا ہی ہوتا ہے یعنی ایسے خطرناک گناہ پر بلکہ ہر گناہ پر نفس تدریجاً ہی راضی ہوتا ہے کیونکہ فطرتاً انسان گنہگار نہیں +

بعث

۸۱۶ بعث کے معنی یہاں قیّضہٗ ہیں یعنی مقرر کر دیا (غ) انسان کی تعلیم کیلئے کوّے کا آجانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا +

عزب ۔ عزیب ۔ غراب

غُرابًا ۔ غَرب سورج کے غائب ہونے پر بولا جاتا ہے اور ہر ایک دور ہو جانے والے کو غریب کہا جاتا ہے اور جو چیز اپنی جنس میں نظیر کم رکھتی ہو اسے بھی غریب کہا جاتا ہے اور غُراب کوّے کو اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ وہ بہت دور نکل جاتا ہے (غ) +

بحث

یبحث ۔ بحث کے معنی کشف یعنی ظاہر کرنا اور طلب ہیں اسی سے کسی امر کے متعلق بحث ہے (غ) اور اصل میں بحث کے معنی ہیں کسی چیز کا مٹی میں تلاش کرنا (ل) اسی لئے یہاں زمین کریدنا مراد ہے +

واری ۔ تواری ۔ الوری ۔ وراء

یواری ۔ وری سے ہے ۔ اور واری کے معنی ستر ہیں یعنی چھپایا جیسے یہاں اور لباسًا یُّوَارِىْ سَوْاٰتِكُمْ (الاعراف ۲۶) اور تواری کے معنی چھپ گیا حتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ (صٓ ۳۲) اور الوری کل مخلوق کو کہا جاتا ہے جو زمین پر ہے گویا وہ سطح زمین کو اپنے وجود سے چھپائے ہوئے ہیں اور وَرَاء کے معنی پیچھے ہیں جیسے ومن وراء اسحٰق یعقوب (ھود ۷۱) فلیکونوا من وراءکم (النساء ۱۰۲) یا آگے جیسے وکان وراءھم ملک (الکہف ۷۹) اور فنبذوہ وراء ظہورھم (آل عمران ۱۸۶) میں مراد اس کا عمل اور تدبر نہ کرنا ہے ۔ اور فمن ابتغی وراء ذٰلک (المؤمنون ۷) میں اس سے مراد اس سے زیادہ ہے اور ویکفرون بما وراءہٗ (البقرۃ ۹۱) میں اس کے بعد معنی ہیں (غ) اور ان سب میں ستر یا پیچھے ہونے کا خیال پایا جاتا ہے +

سوأۃ

سَوْاۃ ۔ ساء سے ہے اور سَوْاَۃ ۔ العورۃ اور الفاحشۃ کو کہا جاتا ہے یعنی ستر کی جگہ اور بےحیائی کی بات اور شرمگاہ کو بھی کہتے ہیں اور ہر ایک عیب دار عمل اور امر پر بولا جاتا ہے (ل) اور مغیرہ کی حدیث میں لفظ سوأۃ کا استعمال بوجہ خیانت قتل کر دینے پر ہوا ہے جس کی تشریح میں ہے کہ سَوْاۃ اصل شرمگاہ ہے پھر ہر ایک اس امر پر بولا جاتا ہے جس سے حیا کی جائے قول ہو یا فعل (ل) +

كَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ

ہم نے بنی اسرائیل کیلئے یہ مقرر کردیا کہ جو کوئی کسی جان کو بغیر جان کے (بدلے کے) یا زمین میں فساد کے مار ڈالے

فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ

تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا اور جو کوئی اس کو زندہ رکھے تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ رکھا[۸۱۶]

ویل ۔ ویح

یٰوَیْلَتٰی ۔ وَیْل کے معنی قبح ہیں یعنی بُرائی ۔ اور حسرت اور افسوس کے موقعہ پر بولا جاتا ہے جیسے وَیْحٌ ترحم کے لئے وَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ (البقرۃ ۔ ۷۹) (غ) اور وَیْلَتٰی اور وَیْلَنَا اپنے اوپر اظہار افسوس کیلئے ہیں +

ندم

نٰدِمِیْنَ ۔ نَدَم اور نَدَامَۃ کسی امر پر جو ہاتھ سے جاتا رہا ہے تبدیل رائے کی وجہ سے افسوس کرنا ہے (غ) +

جانوروں سے سبق

ظالم انسان طاقت کے نشہ میں اپنے بھائی کی کچھ پروا نہیں کرتا ۔ بلکہ اسکو اپنی راہ میں روک سمجھ کر نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ حالانکہ وہ پرند چرند سے ہمدردی کا سبق سیکھ سکتا ہے ۔ ایک حالت جہالت کی وہ ہوتی ہے جو ایک ہی قوم کا انسان اسی قوم کے دوسرے انسان کی تباہی کو اپنے لئے بہتری کا موجب سمجھتا ہے پھر اس سے اُتر کر جہالت کی حالت وہ ہے جو ایک قوم دوسری قوم کی تباہی کو اپنی ترقی کا موجب سمجھ لیتی ہے ۔ اور کسی میں ذرا سا عیب دیکھا تو اس کو نیست و نابود کرنے پر تل گئے ۔ کوّے کو مٹی کریدتے دیکھکر کیا سبق اس قاتل نے حاصل کیا ۔ اے کاش میں اپنے بھائی کی سَوْءَۃ کو چھپاتا اگر سَوْءَۃ سے مراد شرمگاہ لی جائے تو اس سے لاش کا چھپانا مراد ہوگا ۔ اور ابتدا میں انسان کا کسی جانور سے سبق حاصل کرلینا کوئی بعید بات نہیں ۔ گو یہاں نہ دوسرے کوّے کا ذکر ہے نہ اس کی لاش کو چھپانے کا ۔ اسلئے ابو مسلم نے کہا ہے کہ کوئی چیز کوّے نے زمین کرید کر چھپائی اور اگر سَوْءَۃ سے مراد امر شائن یا عیب ہے ۔ تو کوّے کا مٹی کریدنا اشارہ ہے کسی بات کے مخفی کرنے کیلئے تو قاتل کو یہ ندامت ہوئی کہ میں نے اپنے بھائی میں کوئی چھوٹا سا عیب دیکھکر بجائے اس کے کہ اس عیب کو چھپاتا اس کیلئے اسے جان سے مار دیا ۔ کوّے کا بھیجنا اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس لئے کہ انسان اس سے ایک مفید سبق حاصل کرتا ہے ۔ کوّے میں دو باتوں کی خصوصیت ہے ایک یہ کہ اپنی جنس کی لاش کو کھلا نہیں رہنے دیتا دوسرے کوّوں کو جس قدر ہمدردی ایک دوسرے سے ہوتی ہے اس کی نظیر دوسرے جانوروں میں نہیں ملتی ایک کی آواز پر ہزاروں جمع ہو جاتے ہیں +

اجل

[۸۱۶] اجل ۔ اَجَل کے اصل معنی کسی شے کا وقت مقرر ہیں م[۳۰۰] اس لئے اَجِل ۔ عاجِل کی ضد ہے یعنی دیر سے ہونے والی بات اور اس لئے اَجْل وہ بُرا فعل ہے جس کے نتیجہ سے ایک وقت کے بعد خوف ہو (غ) +

بنی اسرائیل کو چونکہ اس وقت خاص مخالفت رسول اللہ صلعم سے تھی ۔ اسلئے انکا خاص ذکر کیا کہ یہ اب آنحضرتؐ کے قتل کے درپے ہیں حالانکہ کسی کا قتل کرنا اس وقت جائز ہوتا ہے جب اس نے کوئی خون کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد پھیلایا ہو ان دونوں باتوں میں سے آنحضرت صلعم کی طرف کوئی بھی منسوب نہ ہوسکتی تھی ۔ اور شاید لفظ نفس میں اشارہ بلحاظ عظمت آنحضرت صلعم کی طرف ہو کہ ایسے عظیم معلم نیکی اور مصلح کو جو شخص قتل کردے تو اس نے گویا سب کو ہی قتل کردیا اور جو شخص اسکے بچانے میں حصہ لیتا ہے اس نے گویا سبھی لوگوں کو بچایا ۔ یوں عام معنی کے لحاظ سے بھی درست ہے بیگناہ کو جیسا ایک کو قتل کیا ویسا سب کو کیا اور ایک کی زندگی بچائی تو سب ہی کی بچائی اور یہ اسی کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا تھا وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ (البقرۃ ۔ ۱۷۹) گویا قصاص بھی احیائے نفس ہے کیونکہ اس سے ہلاکت سے نجات ملتی ہے اور یا احیا سے مراد کسی نفس کا رحمت اور

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ

اور یقیناً ہمارے رسول انکے پاس کھلی دلائل لیکر آئے پھر اسکے بعد بھی ان میں سے بہت سے یقیناً ملک میں

لَمُسْرِفُوْنَ ○ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى ٣٣

خطا کار رہیں ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اسکے رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد

الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ

پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں صرف یہی ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا صلیب پر مارے جائیں یا انکے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے

خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى

کاٹے جائیں یا انکو قید کیا جائے یہ انکے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں

الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا ٣٤

انکے لئے بھاری عذاب ہے ٨١٨ سوائے ان کے جو توبہ کریں

شفقت کرکے موت سے بچاتا ہے +

محاربة

٨١٨ یحاربون حَرْب کے معنی لڑائی ہیں ۔ اور یہاں یحاربون سے مراد فی الواقع جنگ کرنے والی قومیں نہیں بلکہ مراد اس سے صرف معصیت ہے (ل) اور یہ اس کی مثل ہے جو سود خوار کے بارہ میں فرمایا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ (البقرة ٢ ٢٧٩) یا منافقوں کے ذکر میں آتا ہے وارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ (التوبة ٩ ١٠٧) کہ دونوں صورتوں میں جنگ نہیں بلکہ مخالفت مراد ہے

نفی

ینفوا من الارض ۔ نَفْی کسی چیز کے الگ ہو جانے پر بولا جاتا ہے اور نَفَیْتُ الرجلَ کے معنی ہیں

نفی من الارض

میں نے اسے نکال دیا اور ینفوا من الارض کے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ ان کا خون ہدر ہوگا اور یہ بھی کہ ان کو ساری عمر کیلئے قید کر دیا جائے اور یہ بھی کہ ان کو جلا وطن کر دیا جائے (ل) اور امام ابوحنیفہ اور احمد کے نزدیک یہاں مراد حبس یعنی قید کرنا ہے

فساد یا ڈاکہ کی سزا

اس آیت میں کن لوگوں کا ذکر ہے اور کیا سزا ہے ۔ اوپر فرمایا تھا کہ قتل کی سزا صرف دو صورتوں میں دی جاسکتی ہے ایک یہ کہ قتل کرے ۔ دوسرے یہ کہ فساد کرے ۔ اسلئے یہاں یحاربون اللہ ورسولہ سے مراد زمین میں فساد کرنیوالے لئے گئے ہیں ۔ اور بالخصوص ڈاکو جو جان سے مارکر یا جان سے مارنے کا خوف دیکر لوگوں کا مال لوٹتے ہیں ۔ اور گو ابن جریر نے بعض روایات ایسی بھی بیان کی ہیں کہ یہ آیات اہل کتاب کے بارہ میں نازل ہوئیں جنہوں نے نبی کریم صلعم سے بدعہدی

عرینہ کی سخت سزا کے وجوہات

کرکے فساد کیا یا مشرکین کے بارہ میں مگر اکثر مفسرین نے اسے عرینہ کے بارہ میں لیا ہے جن کے چند آدمی آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے پھر بیمار ہو گئے تو نبی کریم صلعم نے انہیں وہاں بھیج دیا جہاں مدینہ سے باہر صدقہ کے اونٹ تھے ۔ تاکہ وہ دودھ پئیں اور علاج کریں ۔ انہوں نے تندرست ہوکر چرواہوں کو مار ڈالا اور اونٹ لیگئے اور ابن جریر نے انس سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے ڈاکے بھی مارے اور عورتوں کی آبروریزی کی تو آپ نے ان کے ہاتھ اور پاؤں کٹوا دیئے اور ان کی آنکھیں نکلوا دیں اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ان کی آنکھیں اس لئے نکلوائیں کہ

ع ٦ ٣٥ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

ہل کتاب کے ڈیصلے

اس سے پہلے کہ تم ان پر قابو پالو سو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ٨١٩ اے لوگو جو

اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ کرو اور اس کا قرب چاہو اور اسکی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو ٨٢٠

انہوں نے چرواہوں کی آنکھیں نکال دی تھیں دث، اور پھر اسی حالت میں ان کو دھوپ میں ڈلوا دیا یہانتک کہ وہ مر گئے کیونکہ ان کا جرم خطرناک تھا اور عبرتناک سزا کو چاہتا تھا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں ایسے لوگوں کی سزا خاص کر دی گئی۔ گو قصاص کے رنگ میں وہ زیادہ سزا کے مستحق بھی ہوں +

ڈاکہ کی چار قسم کی سزا

لیکن شان نزول کچھ بھی ہو یہاں حکم عام ہے اور ان لوگوں کے بارہ میں ہی یہ حکم تسلیم کیا گیا ہے جو ڈاکے مار کر بد امنی پھیلاتے ہیں اور چار قسم کی سزا ان کے لئے تجویز کی گئی ہے قتل صلیب۔ ہاتھ پاؤں کا کاٹنا۔ قید۔ ظاہر ہے کہ چار قسم کی سزا جرم کی چار نوعیتوں کے لحاظ سے ہو سکتی ہے۔ اور وہ نوعیتیں ڈاکہ کے جرم کی یہ ہیں کہ مال لینے کے ساتھ قتل بھی کریں۔ یا صرف قتل سے ڈرا کر مال لیں۔ پہلی صورت میں سزا قتل یا صلیب ہے دوسری میں ہاتھ پاؤں کاٹنا یا قید۔ گو بعض روایات میں یہ ہے کہ قید کی سزا اس صورت میں ہے جب صرف ڈراتے ہوں اور مال نہ لیا ہو مگر بغیر مال لینے کے ڈرانا بعنی ہے۔ پھر قتل کی صورت میں دو حالتیں ہیں اول یہ کہ بعض ڈاکو بہت وارداتیں کر کے ایک دھاک بٹھا دیتے ہیں یا قتل کے ساتھ اور جرائم کا بھی ارتکاب کرتے ہیں۔ ایسوں کی سزا قتل کے ساتھ صلیب بھی ہے۔ تاکہ عبرت بھی ہو اور عام طور لوگوں کو پتہ بھی لگ جائے اور اسی طرح جب قتل نہ ہو اور مال لیا جائے تو بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی قسم کا نقصان جسمانی بھی پہنچایا جائے یا دوسرے جرم کا ارتکاب ہو تو اس صورت میں ہاتھ پاؤں کا کاٹنا ہے۔ یا یہ کہ قتل کی حالت کی طرح بہت وارداتیں کی ہوں۔ اور اس کے سوائے صرف قید کی سزا ہے۔ چونکہ ڈاکہ کا جرم ان چار قسم کا ہو سکتا ہے۔ اسلئے قرین قیاس یہی ہے کہ چار قسم کی الگ الگ سزا ان جرموں کی نوعیت پر ہے۔ یہ سچ ہے کہ سزا کا تقرر امام کے اختیار میں ہے مگر امام خود فساد اور جرم کی نوعیت پر سزا دیگا ما حصل ایک ہے اور ابن جریر نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اسکی اسناد میں نظر ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت انسؓ نے عبد الملک بن مروان کو لکھا تھا کہ عربیہ کا گروہ اسلام سے مرتد ہو گئے اور اونٹوں کو لے گئے اور رستوں پر ڈاکے مارنے شروع کئے اور عورتوں کی آبرو ریزی کی۔ تو رسول اللہ صلعم کو جبرائیل نے کہا کہ جو شخص ڈاکہ مار کر مال لیتا ہے اس کا ہاتھ بوجہ مال لینے کے اور پاؤں بوجہ رستوں پر ڈرانے کے کاٹا جائے اور اگر قتل بھی کیا ہو تو اسے قتل کیا جائے۔ اور اگر قتل کے ساتھ رستوں پر ڈراتا اور عورتوں کی آبرو ریزی کرتا ہے تو صلیب دیا جائے (خلاف اطراف سے ہاتھ پاؤں اسلئے کٹوائے کہ چل پھر بھی سکے

توبہ پر معافی سزا

٨١٩ یہ تعلیم صرف اسلام سے خاص ہے کہ جب سچے طور پر ایک شخص توبہ کرے تو اسے معاف کر دیا جائے گو کتنا بھی بڑا جرم ہو اور سچی توبہ کیلئے یہ شرط رکھدی کہ ان پر قابو نہ پایا ہو اور انہوں نے ایسے افعال سے رجوع کر کے دوسری طرز زندگی کی اختیار کرلی ہو۔ جب جرم کی حالت میں پکڑے جائیں تو توبہ بے معنی ہے اور اگر ایک شخص توبہ کر کے پھر ایسا ہی فعل کرے تو اسکے لئے سخت تر سزا بھی موجود ہے +

وسیلۃ

٨٢٠ وسیلۃ کے معنی امام راغب نے رغبت کے ساتھ کسی چیز کی طرف پہنچنا کئے ہیں۔ التَّوَصُّلُ اِلَی الشَّیْءِ بِرَغْبَۃٍ اَوْ

۳۶ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ اَنَّ لَہُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا وَّ مِثۡلَہٗ مَعَہٗ لِیَفۡتَدُوۡا بِہٖ

جو لوگ کافر ہوئے اگر جو کچھ زمین میں ہو سب کا سب ان کی ملک ہو اور اسکی مثل (اور بھی) اسکے ساتھ ہو کہ اسکے ساتھ

مِنۡ عَذَابِ یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَا تُقُبِّلَ مِنۡہُمۡ ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝

قیامت کے دن کے عذاب کا فدیہ دیں ان سے قبول نہ کیا جائے گا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔

آگے لکھا ہو کہ یہ قربۃ کی طرح ہو۔ اور واسل اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کرنے والا ہو۔ لسان العرب میں ہو کہ وسیلۃ مرتبہ اور درجہ اور قربت کا نام ہو اور وَسَّل فلان الی اللہ وسیلۃ کے معنی ہیں ایسا عمل کیا جس کے ساتھ اس کا قرب حاصل کیا۔ اور پھر لکھا ہو کہ وسیلۃ پہنچنے اور قرب کو کہتے ہیں۔ اور حدیث میں دعائے اذان میں آتا ہو آت محمدا الوسیلۃ جہاں مراد ہو القرب من اللہ تعالیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب (ت) اور صحیح مسلم میں حدیث ہو کہ آنحضرت صلعم نے اذان کی دعا سکھا فرمایا کہ وسیلۃ جنت میں اعلیٰ ترین درجہ ہو پس یہی معنی یہاں مراد ہیں ؞

حصول قرب الٰہی

اصل ذکر اہل کتاب کا تھا جنہوں نے دین کو چھوڑ کر اپنی نظر کو صرف دنیا تک محدود کر دیا اور دین میں بجائے توحید کے شرک کے طریق کو اختیار کیا۔ اور پچھلے رکوع کی آخری آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو مسلمان کہلا کر ڈاکے مارتے اور زمین میں فساد پھیلاتے اور اللہ اور رسول کی کھلی مخالفت کرتے تھے۔ اس لئے بتایا۔ کہ مومن کا اصل کام کیا ہو۔ پہلے تقوٰی کی نصیحت فرمائی یعنی رعایت حقوق کی پس کسی کو بھی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچانا چاہئے۔ پھر فرمایا کہ دنیا کے مال پر بست نہ گر جاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ کے قرب کو حاصل کرنے کی تڑپ اپنے اندر پیدا کرو کیونکہ یہی انسان کی زندگی کی اصل غرض ہو مگر یہ غرض حاصل نہیں ہو سکتی جبتک کہ اس کیلئے زور نہ لگایا جائے اس لئے تیسری نصیحت جہاد کیلئے کی تاکہ کامیاب ہو جاؤ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (العنکبوت [29] - ۶۹) اگلی آیت میں کھلے طور پر بتا دیا ہو کہ یہ دنیا کا مال جس پر اہل کتاب گر گئے ہیں اور جس کی خاطر حق اور صداقت کو اور خدا کو چھوڑ دیا ہو یہ صرف اس دنیا کی زندگی میں کچھ کام دیتا ہو آخرت میں یہ کام نہ آئیگا پس اس آیت میں صرف یہ بتایا ہو کہ اپنی زندگی کی اصل غرض کو چھوڑ کر مال دنیا پر بہت نہ جھک جاؤ کہ جائز و ناجائز طریق سے اسے جمع کرنے لگو۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کی تڑپ اپنے اندر پیدا کرو یہی معنی وسیلہ کے ہیں۔ اور اس معنی پر خود قرآن کریم کی بھی شہادت ہو اولئک الذین یدعون یبتغون الی ربھم الوسیلۃ (بنی اسرائیل [17] - ۵۷) یعنی جن کو یہ لوگ یہ سمجھ کر پکارتے ہیں کہ وہ انکے مصائب دور کر دینگے وہ خود قرب الٰہی کو چاہنے والے تھے اور انہوں نے کبھی ایسا دعوٰی نہیں کیا۔ اور ابن جریر نے وابتغوا الیہ الوسیلۃ کے معنی اطلبوا القربۃ الیہ کئے ہیں یعنی اس کا قرب مانگو اور اس معنی پر عنترہ کا شعر پیش کیا ہو ان الرجال لھم الیک وسیلۃ۔ اور حسن سے اور مجاہد سے اور قتادہ سے اس کے معنی قرب ہی روایت کئے ہیں اور اور کوئی معنی نہیں دیئے ؞

دوسروں کو وسیلہ بنانا

اور اگر اس کے معنی مایتوصل بہ یعنی پہنچنے کا ذریعہ بھی لئے جائیں تو بھی اس سے مراد صرف یہی ہو کہ ان راہوں پر چلو جن راہوں سے اللہ کی طرف پہنچ جاؤ یعنی اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اس سے یہ معنی نکالنا کہ جو لوگ مر چکے ہیں ان کو ذریعہ بناؤ ایک نہایت لغو حرکت ہو۔ یوں تو نبی کریم صلعم نے خود حضرت عمرؓ سے کہا تھا لا تنسنا یا اخی من دعائک اے بھائی اپنی دعاؤں میں ہم کو بھول نہ جائیو۔ اس لئے کسی سے دعا کرانا کوئی شرک نہیں۔ مگر جو لوگ وفات پا چکے ہیں ان سے استمداد صریح شرک ہو۔ حتی کہ جو دعا نبی کریم صلعم کے روضہ مبارک پر کی جاتی ہو اس میں بھی لازمی ہو کہ منہ خانہ کعبہ کی طرف کیا

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ وَ ۳۸

چاہینگے کہ آگ سے نکل جائیں اور وہ اس سے نہیں نکل سکینگے اور ان کیلئے قایم رہنے والا عذاب ہے[۸۲۱] اور

السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ

چور مرد اور چور عورت سو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو (یہ) اسکی سزا (ہے) جو انہوں نے کیا اللہ کیطرف سے عبرتناک سزا اور اللہ

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ ۳۹

غالب حکمت والا ہے[۸۲۲] پھر جو شخص اپنے ظلم کے بعد توبہ کرلے اور اصلاح کرے تو اللہ ضرور اس پر (رحمت سے) توجہ کرے گا۔

جائے اور قبر دائیں یا بائیں رہ جائے قبر کو سامنے رکھکر دعا نہ کی جائے بلکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تو اس کی طرف دعا کے وقت پیٹھ کی جائے۔ قرآن کریم میں اس پر نصوص صریحہ ہیں کہ دعا سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے سے جائز نہیں ان تدعوھم لایسمعوا دعاءکم ولو سمعوا ما استجابوا لکم (فاطر ۳۵-۱۴) له دعوة الحق والذین یدعون من دونه لا یستجیبون لهم بشیء الا کباسط کفیه الی الماء (الرعد ۱۳-۱۴)۔

پس اس قدر صراحت کے ہوتے ہوئے بزرگان دین کو وسیلے کہکر ان کے ذریعہ سے قضائے حاجات چاہنا یا ان کی قبروں پر جاکر دعائیں کرنا یا ان کا واسطہ دیکر اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا یہ سب مشرکانہ افعال ہیں اور نیکوں یا بزرگوں کا توسل ان کی زندگی میں بذریعہ ان کی دعا کے ہو جیسا کہ حضرت عمرؓ کا قول منقول ہے جب انہوں نے امساک باراں کے موقعہ پر حضرت عباس کو دعا کیلئے آگے کیا اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ ہم رسول اللہ صلعم سے توسل کرتے تھے یعنی آپ سے دعا کراتے تھے تو تو باران رحمت نازل فرماتا تھا اب ہم تیرے نبی کے چچا سے توسل کرتے ہیں یعنی دعا کیلئے ان کو آگے کرتے ہیں پس تو ہم پر باران رحمت نازل فرما پس توسل بزرگوں کا صرف اسی حد تک جائز ہے کہ ان کی زندگی میں ان سے دعا کرائی جائے۔

دوزخ سے نکلنا

[۸۲۱] بہشت اور دوزخ کے ذکر میں قرآن کریم میں یہ ایک بین فرق نظر آتا ہے کہ جہاں بہشت کا ذکر ہے وہاں فرمایا وما هم منها بمخرجین (الحجر ۱۵-۴۸) یعنی وہ وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔ اور دوزخ کے ذکر میں ہے وما هم بخارجین منها جس کی تفسیر خود دوسری جگہ یوں کردی ہے کلما ارادوا ان یخرجوا منها اعیدوا فیها (السجدۃ ۳۲-۲۰) یعنی جب نکلنا چاہینگے تو اس سے نہیں نکل سکینگے اور جو حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مٹھی بھر ان لوگوں کو نکال دیگا جنہوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی تو یہ اس آیت کے خلاف نہیں کیونکہ وہ اپنے ارادہ سے نہیں نکلینگے بلکہ اللہ تعالیٰ کے رحم کے جوش میں آنے سے نکالے جائینگے۔

[۸۲۲] پچھلے رکوع میں حفظ جان و مال کی ضرورت یہود کے ذکر میں بتائی تھی۔ یہ آیت اسی کا تتمہ ہے درمیان میں صرف مسلمانوں کو کچھ نصیحت ہے۔ اور ڈاکوؤں کے ذکر کے بعد جو بالجبر مال لیتے ہیں چور کا ذکر کیا جو چھپکر مال لیتا ہے اور اس کی سزا قطع ید یعنی

قطع ید سے مراد

ہاتھ کا کاٹنا قرار دی ہے۔ ہاتھ کے کاٹنے سے مجازاً ہاتھ کا روکنا بھی مراد ہو سکتا ہے جیسے تقطعون السبیل میں رستے کے قطع کرنے سے مراد راستہ سے مسافروں کو روکنا ہے ایسا ہی قطع جرح بھی مجازی معنی میں استعمال ہوتا ہے اور قطع لسانه کے معنی ہیں اسے خاموش کردیا حدیث میں ہے کہ ایک شاعر نے شعر سنائے تو آپ نے فرمایا اقطعوا عنی لسانه یعنی اسے کچھ دیکر خاموش کردو دل، پس قطع ید سے مراد بھی مجازاً ہاتھ کا روکنا ہو سکتا ہے اور ظاہر معنی کو لیکر امام شافعی کے نزدیک دینار کا چوتھا حصہ نصاب ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک دس درہم بعض کے نزدیک پانچ درہم یعنی اس سے کم مال کی چوری ہو تو قطع ید نہیں۔ مگر قرین قیاس ہے کہ ہاتھ کاٹنا چور کی

۴۰ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يُعَذِّبُ

بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کے لئے ہی ہے جسے چاہے

۴۱ مَن يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا

عذاب دے اور جسے چاہے بخش دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے اے رسول وہ

يَحْزُنكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ

لوگ تجھے غمناک نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں ان میں سے جو اپنے مونہوں سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور انکے

تُؤْمِن قُلُوبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا ۛ سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّاعُونَ لِقَوْمٍ

دل ایمان نہیں لائے اور ان میں سے جو یہودی ہیں وہ جھوٹ قبول کرنے والے ہیں ایک اور گروہ کی باتیں قبول

آخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِن بَعْدِ مَوَاضِعِهِ ۖ

کرنے والے ہیں جو تیرے پاس نہیں آیا۔ باتوں کو انکی جگہ جاننے کے بعد بدلتے ہیں

مع ۳ عندالمتقدمین

ہاتھ کاٹنا چوری کی انتہائی سزا ہے۔

انتہائی سزا ہے۔ اور امام کو اختیار ہے کہ اس سے کم سزا دے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی جو ڈاکوؤں کی سزا بتائی ہے اس میں امام کے اختیار کو بڑا وسیع کیا ہے قتل و صلیب سے لیکر قید محض تک جو سزا چاہے دے۔ اور جب یہ آیتیں ایک دوسرے کے حکم کی تکمیل کرتی ہیں تو ماننا پڑیگا کہ جس طرح وہاں انتہائی سزا قتل ہے یہاں صرف انتہائی سزا قطع ید بتادی ہے صحابہ کے عمل سے اس معنی پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ کیونکہ ڈاکو جو جبر مال لیتا ہے جب قید کی سزا دینا جائز ہے تو چور کو کیوں نہیں پھر ہاتھ پاؤں کا کاٹنا ڈاکو کی سزا بھی ہے جیسے ہاتھ کا کاٹنا چور کی پھر ڈاکو کی سزا قتل و صلیب ہے جو چور کیلئے نہیں اور یہ ڈاکو کی انتہائی سزا ہے اس سے نیچے اُتر کر ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا ہے جو چور کی انتہائی سزا قرار دی ہے۔ اور اس سے اُتر کر قید کی سزا ہی جو ڈاکو کو دی جاسکتی ہے تو لازماً چور کو بھی دی جاسکتی ہے +

عادی چور کی سزا

علاوہ ازیں ایک اور بات یہاں قابل غور ہے۔ اُبی کی قرات میں بجائے سارق کے سَرّاق اور سارقۃ کے سَرّاقۃ ہے جو مبالغہ کے صیغے ہیں پس قرین قیاس یہ ہے کہ عادی چور کے لئے یہ سزا لازمی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ توبہ کی گنجائش بھی رکھی ہے ورنہ اگر پہلی چوری پر ہی سزائے قطع ید ہو تو توبہ کا کیا فائدہ۔ جب توبہ کی صورت میں ڈاکو کو بھی رعایت دی ہے تو چور کو رعایت کیوں نہ ملنی چاہئے عادی چور کی لازمی سزا قطع ید ہے۔ اور معمولی چور کی انتہائی سزا۔ اور یوں امام کو قید کا اختیار ہے۔ قطع ید کو عبرتناک سزا قرار دینا بھی بتاتا ہے کہ یہ محض انتہائی سزا ہے۔ اور سزا کے دینے میں امام حالات وقتی ملکی یا حالات قومی کو بھی مدنظر رکھ سکتا ہے

سزا بلحاظ حالات

اس لئے بعض حالات میں بلحاظ حالات قومی یا ملکی پہلی چوری پر بھی قطع ید کی سزا دیجاسکتی ہے۔ اس زمانہ میں اگر حالات وقتی کے لحاظ سے عادی چور کی سزا قطع ید ہو اور اس سے ادھر سزائے قید تو ہرج نہیں اور دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ عادی چور کی سزا سوائے ہاتھ کاٹنے کے اور کوئی مفید نہیں ہوسکتی۔ اگر غرض اصلاح ہو تو لمبی قیدیں ایسے حالات میں سوائے اخلاقی حالت پر برا اثر ڈالنے کے اور کوئی فائدہ نہیں پہنچاسکتیں اور ہاتھ کاٹنے سے نہ صرف جرم رک جاتا ہے بلکہ اصلاح کی بھی یہی ایک صورت ہوگی۔

يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِن لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا ۚ وَمَن يُرِدِ

کہتے ہیں اگر تم کو یہ دیا جائے تو اسے لے لو اور اگر یہ نہ دیا جائے تو بچو اور جسے دکھ میں ڈالنا

اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَن تَمْلِكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَن

رہنے کا اللہ ارادہ کرے تو اللہ کے سامنے تو اسکے لئے کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا یہی وہ ہیں کہ اللہ نے ارادہ نہیں کیا کہ

يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

انکے دلوں کو پاک کرے انکے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کیلئے آخرت میں بھاری عذاب ہے ۸۲۳

سمع

۸۲۳ سمّٰعون للکذب کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ ایک جھوٹ قبول کرنے والے۔ کیونکہ سمع کے معنی قبول کرنا بھی آتے ہیں۔ دوسرے جھوٹ بولنے کی خاطر باتیں سننے والے۔ ایسا ہی سمّٰعون لقوم اٰخرین کے معنی بھی دو طرح ہو سکتے ہیں۔ ایک اور قوم کی باتیں قبول کرنیوالے یا ایک اور قوم کی خاطر باتیں سننے والے ❖

منافق یہودی

یہاں پھر کلام کو اصل موضوع کی طرف پھیرا ہے اور یہودیوں کے ساتھ منافقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ منافقوں کی طرح یہودیوں کا ایک گروہ منافقانہ روش اختیار کئے ہوئے تھا۔ ان کا ذکر ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو قبول نہیں کرتے بلکہ مانتے اپنے سرداروں کی بات کو ہی ہیں۔ اور جو کچھ وہ کہدیتے ہیں اس کو پلے باندھا ہوا ہے جس حد تک انہوں نے بات کو ماننے کو کہا مان لی اس سے آگے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آخری فیصلے یہ لوگ رسول اللہ صلعم سے کراتے تھے اور یہ اس معاہدہ کے مطابق تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری پر ہوا تھا ایسے حالات میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان کے فیصلے توریت کے مطابق کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک زانی اور زانیہ یہودی آپکے سامنے لائے

یہودیوں کے فیصلے توریت کے مطابق

گئے تو آپنے سنگسار کرنے کا حکم دیا اور یہی حکم توریت میں تھا۔ مگر جب ان سے دریافت کیا گیا کہ تمہاری کتاب میں کیا حکم ہے تو کہا کہ ان کے منہ کالے کئے جائیں اور انہیں ذلیل کیا جائے تب بعض علمائے یہود سے توریت منگوا کر پڑھوائی گئی تو انہوں نے اس کو قبول کیا کہ زنا کی سزا اصل میں رجم ہے حضرت مسیح کے وقت تک اس حکم کا توریت میں موجود ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ یوحنا ۸: ۴ و ۵ میں ہے کہ فریسیوں نے کہا "اے اُستاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی موسےٰ نے تو توریت میں ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسیوں کو سنگسار کریں پر تو کیا کہتا ہے" حالانکہ موجودہ توریت میں رجم نہیں اس سے تحریف توریت کا فیصلہ ہوتا ہے ❖

ایسے ایسے اور واقعات بھی پیش آتے تھے جس طرح پر علماء عام لوگوں کو کہدیتے تھے اسی حد تک وہ قبول کرتے اس لئے اگلی آیت میں حکم دیا ہے کہ ان حالات میں چاہو تو فیصلہ سے انکار کر دو ❖

یاایہا الرسول سے خطاب

اس جگہ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یا محمد یا یا احمد کہکر قرآن شریف میں کہیں خطاب نہیں کیا گیا حالانکہ دیگر انبیاء و رسل کو نام سے خطاب ہوا ہے جیسے یاآدم۔ یا موسیٰ۔ یا عیسیٰ۔ یا داؤد۔ یا ابراھیم۔ یا نوح آنحضرت صلعم کو خطاب یاایہا الرسول یا یاایہا النبی سے کیا ہے یعنی النبی یا الرسول کے نام سے اس کی وجہ گو آپ کی تشریف بھی ہو مگر اصل حکمت یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی اور رسول ہونیوالا نہ تھا اسلئے النبی اور الرسول کہکر خطاب کیا ہے اور دوسرے چونکہ کمالات نبوت آپ میں جمع ہوئے اسلئے بھی دوسرا کوئی نبی اسکا مستحق نہ تھا کہ اسے النبی اور الرسول کہکر خطاب کیا جا

۴۲ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ
جھوٹ قبول کرنیوالے ہیں حرام کھانے والے ہیں سواگر تیرے پاس آئیں تو ان کے درمیان فیصلہ کر یا ان سے مُنہ

عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ
پھیرے اور اگر تو ان سے مُنہ پھیرے تو تیرا کچھ بھی بگاڑ نہ سکینگے اور اگر تو فیصلہ کرے تو انکے درمیان انصاف سے

۴۳ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ
فیصلہ کر کیونکہ اللہ انصاف کرنیوالوں سے محبت کرتا ہی ۸۲۴ اور کیونکر تجھے فیصلہ کرنیوالا ٹھہرائینگے اور انکے پاس

التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ
توریت ہی اس میں اللہ کا فیصلہ ہی پھر اسکے بعد پھر جاتے ہیں اور یہ

۴۴ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ
مومن نہیں ۸۲۵ ہمیں نے توریت اُتاری اس میں ہدایت اور روشنی ہو ۸۲۶

ع ۱۱
قرآن کتب سابقہ بدمحافظ اور سب سے اختلافات کا فیصلہ کرتا ہی

سحت

۸۲۴ سحت میں اصل میں بیخکنی کرنے یا کچل ڈالنے کا خیال پایا جاتا ہی جیسے فیسحتکم بعذاب (طٰہٰ ۲۰-۶۱) اور سحت (ع) اس حرام مال کو کہتے ہیں جو کمانے والے کیلئے موجب عار ہو کیونکہ وہ دین کا استیصال کرتا ہی۔ رشوت کو بھی سحت کہا جاتا ہی باوجود انکی سب شرارتوں کے پھر بھی آنحضرت صلعم کو حکم یہی ہی کہ جب فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو کیسے اعلیٰ اخلاق پر آپ کو کھڑا کیا گیا +

یہودیوں کا توریت کے فیصلوں کو قبول نہ کرنا

۸۲۵ اسلام میں بہت سی باتوں میں بمقابلہ توریت سہولت اور نرمی تھی۔ اس لئے یہودی سہل فیصلہ کی خاطر رسول اللہ صلعم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس لئے فرمایا کہ یہودی رہکر پھر رسول اللہ کو کس طرح حکم بنا سکتے ہیں۔ انکے لئے توریت میں خدائی فیصلہ موجود ہی اگر اسی کو شریعت حقہ سمجھتے ہیں اور اسلام کو قبول نہیں کرتے تو پھر اس پر فیصلہ کریں۔ یہ کیا کہ نام تو یہود کا رکھیں اور فیصلہ یہودی شریعت کا قبول نہ کریں ما اولٰئك بالمؤمنين میں یہی اشارہ ہی کہ ان کا ایمان نہ توریت پر ہی نہ یہ قرآن شریف کو مانتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا ایک قول منقول ہی کہ اگر میرے لئے حکومت ہو تو اہل توریت کو توریت کے مطابق فتویٰ دوں اور اہل انجیل کو انجیل کے مطابق (دیکھو روح المعانی - فاحکم بینہم بالقسط کے نیچے) کس قدر فرق ہی کہ قرآن کریم اہل توریت کے فیصلے توریت کے مطابق اور اہل انجیل کے فیصلے انجیل کے مطابق کرتا ہی تو وہ لوگ ماننے کو تیار نہیں۔ اور مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کے فیصلے قرآن کریم کے مطابق ہوں تو انہیں یہ میسر نہیں آتا +

توریت میں ہدایت و نور

۸۲۶ پچھلے رکوع میں ان کے تنازعات باہمی کا ذکر تھا جو توریت کے مطابق نبی کریم صلعم کر دیتے تھے۔ اس رکوع میں باہمی تنازعات سے اسلام کے ساتھ ان کے اختلافات کی طرف رجوع کیا بلکہ کل مذاہب کے اسلام سے اختلافات کا ذکر کر کے یہ بتایا ہی کہ ان اختلافوں کا فیصلہ کرنے کیلئے قرآن نازل ہوا ہی۔ توریت ہدایت اور روشنی کو لئے ہوئے نازل ہوئی۔ تحریف سے اس ہدایت اور نور کا کچھ حصہ ضائع کر دیا گیا لیکن بلا شبہ اب بھی اس میں ہدایت اور نور موجود ہی چونکہ

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ

اسی کے مطابق نبی جو فرمانبردار تھے یہودیوں کیلئے فیصلہ کرتے رہے اور مشائخ

وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ

اور علماء بھی اسکے مطابق جو اللہ کی کتاب کی حفاظت کرنیکو انہیں کہا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے ۶۲۷

اس رکوع میں اصل غرض ان کو قرآن شریف پر ایمان کی طرف بلانا ہے جسے سب کتب سابقہ کا محافظ قرار دیا گیا ہے دیکھو آیت ۴۸ اس لئے یہاں ھدی و نور میں بھی اشارہ ان پیشگوئیوں کی طرف ہے جو رسول اللہ صلعم کے ظہور کے متعلق ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں *

۶۲۷ النبیون الذین اسلموا۔ تمام نبی خدا کے کامل فرمانبردار تھے اس لئے ان سب کو مسلم کہا ہے یہاں مراد وہ خاص نبی ہیں جو حضرت موسیٰ کے بعد آئے جیسا کہ آیت ۴۶ سے ظاہر ہے *

حبر

احبار حِبْر یا حَبْر کی جمع ہے اور حِبر کے معنی سیاہی ہیں (ل) یا اثر حسن یعنی خوبصورت نقش (غ) فی روضۃ یحبرون (الروم ۳۰۔ ۱۵) یعنی خوش ہونگے یہاں تک کہ اس کی نعمتوں کا نشان پر ظاہر ہوگا اور تحبیر کے معنی خوبصورت بنانا ہیں اسی سے حِبر بمعنی عالم ہے حسن کا قول ہے کہ ربانی سے مراد علمائے انجیل اور احبار سے مراد علمائے توریت ہیں

حفاظت توریت

استحفظوا۔ استحفظتہ کے معنی ہیں میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ اسے نگہ رکھے یا اس کی حفاظت کرے (ل) اس لفظ کو اختیار کرکے بتایا کہ توریت کی حفاظت ہم نے قرآن کی طرح اپنے ذمہ نہ لی تھی انا لہ لحافظون (الحجر ۱۵۔ ۹) بلکہ مشائخ اور علمائے یہود کو کہا تھا کہ اس کی حفاظت کریں الٰہی حفاظت اور انسان کی حفاظت میں یہ فرق ہے کہ توریت میں تحریف ہوگئی مگر قرآن محفوظ رہا *

اس حصہ میں یہ بتایا کہ توریت کو ہم نے کس قدر عظمت دی تھی کہ اسی کے مطابق انبیاء بھی فیصلے کرتے تھے اور علماء اور مشائخ بھی یعنی یہود کے فیصلے اسی شریعت پر ہوتے تھے۔ کیونکہ وہی بنی اسرائیل میں بطور بنیاد کے تھی۔ غرض یہ ہے کہ اس توریت کو اب تم کس طرح پس پشت پھینک رہے ہو اور اس کی پیشگوئیوں کی پروا نہیں کرتے اس لئے کہ ان سے نبی کریم صلعم کی صداقت ظاہر ہوتی ہے جیسا کہ آیت کے آخری حصہ کے الفاظ میں صاف یہ اشارہ موجود ہے *

کیا ان الفاظ سے توریت کا غیر محرف ہونا یا محفوظ رہنا ثابت ہوتا ہے؟ یہ عیسائیوں کا دعویٰ ہے۔ مگر تعجب ہے کہ جب قرآن کریم صاف الفاظ میں توریت کی تحریف کا ذکر کرچکا ہے یحرفون الکلم من بعد مواضعہ (۴۱) اور متعدد موقعوں پر تحریف کا ذکر ہے بلکہ یہ بھی صاف الفاظ میں ذکر ہے کہ اپنے ہاتھ سے عبارتیں لکھکر کہدیتے ہیں کہ یہ کلام اللہ ہے (البقرۃ ۲۔ ۷۹) اور آج توریت کی تحریف خود عیسائیوں کے نزدیک ایک مسلم امر ہے تو قرآن کریم کے دوسرے موقعوں کے خلاف اور واقعات کے خلاف الفاظ کے معنی کیونکر کئے جاسکتے ہیں۔ الفاظ قرآنی میں تو صرف اس قدر ہے کہ مشائخ اور علماء کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ کتاب اللہ کی حفاظت کریں۔ مگر کہیں ذکر نہیں کہ انہوں نے فی الواقعہ حفاظت بھی کی بلکہ ان الفاظ سے تو صاف مترشح ہوتا ہے کہ توریت میں تحریف بھی ہوئی کیونکہ اس کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ نہ لیا بلکہ انسانوں کو کہا کہ حفاظت کریں۔ اس سے محفوظ ہونے کا نتیجہ نکالنا ایسا ہی ہے جیسا یہ خیال کرلیا جائے کہ یہودیوں نے کبھی شرک نہیں کیا نہ چوری کی نہ خون ناحق کیا۔ اس لئے کہ ان کو حکم تھا کہ شرک نہ کرنا چوری نہ کرنا وغیرہ۔ ہاں وہ حصہ جو تعالٰی

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ

سو لوگوں سے مت ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو اور جو

لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

اسکے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اُتارا تو وہی کافر ہیں۔۸۲۹

میں آگیا وہ محفوظ ہوگیا کیونکہ اس کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ اور پیشگوئیاں بھی ایک حد تک محفوظ رہیں اسلئے کہ ان میں قوم کے لئے ایک حالت منتظرہ باقی تھی۔ اور وہ عام طور پر شہرت پا گئی تھیں۔

انبیائے بنی اسرائیل کا مطابق توریت فیصلہ کرنا الہٰی کتب ملنے کی منافی نہیں

ایک اور سوال یہ ہوا ہے کہ جب نبی بھی شریعت توریت پر ہی فیصلے کرتے تھے تو معلوم ہوا کہ ان کو کوئی الگ کتابیں نہیں دی گئیں اور نہ اس شریعت میں کسی قسم کی کمی بیشی تغیر تبدل ہوا۔ یہ دونوں نتائج غلط ہیں۔ الگ کتابیں ان انبیاء کو ملنے کا صحیح ثبوت تو آیت ۴۶ سے ملتا ہے جہاں انہی میں سے ایک یعنی مسیح کو انجیل دینے کا ذکر ہے۔ اور ایسا ہی داؤد کو زبور دینے کا ذکر ہے۔ اور پھر سب انبیاء کو کتابیں دینے کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے فان کذبوک فقد کذب رسل من قبلک جاؤا بالبینٰت والزبر والکتاب المنیر (اٰل عمران ۳۔ ۱۸۳) جہاں ذکر بنی اسرائیل کے رسولوں کا ہے جیسا کہ اس آیت کے سیاق سے ظاہر ہے جس سے معلوم ہوا کہ وہ سب زبوریں لاتے تھے۔ اور یہ کتابیں آج تک توریت کے ساتھ ملحق ہو کر بائبل کا جزو بنی ہوئی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ توریت میں بیشک ایک شریعت بنی اسرائیل کو دی گئی مگر وقتاً فوقتاً جو انبیاء ظاہر ہوتے رہے وہ اس شریعت کی تکمیل کرتے رہے۔ اور اس کے ساتھ ہی جو کچھ توریت میں تھا اس کے مطابق فیصلے بھی کرتے رہے۔ یہ دونوں امر ایک دوسرے کے نقیض نہیں۔ کیونکہ وقتی ضرورتوں کے مطابق تغیر و تبدل اصل شریعت کو باطل نہیں کرتا جس طرح باوجود تحریف ہو جانے کے فیصلے اس کے مطابق ہوتے تھے۔ اور یہ فرما کر کہ انجیل میں ہدایت و نور ہے آیت ۴۶ جس طرح توریت میں ہدایت و نور تھا۔ یہ بھی بتا دیا کہ توریت و انجیل کی نوعیت ایک ہے۔ ایسا ہی ان جملہ کتب کی جو دیگر انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئیں مگر ایسی کتاب کا قرآن کریم کے بعد آنا محالات سے ہے اور آیت الیوم اکملت لکم دینکم کے خلاف اسی لئے قرآن کریم کے بعد کوئی نبی نہیں کیونکہ جس طرح توریت کے ہوتے ہوئے بنی اسرائیل کو مزید ہدایت و نور کی ضرورت تھی اس طرح قرآن کریم کے بعد کسی ہدایت و نور کی ضرورت نہیں اور نبیوں کی بجائے اصلاح کیلئے مجددین کی ضرورت ہے۔ نیز دیکھو ح ۸۳۰۔

ما انزل اللہ یا بیاۃ

۸۲۹ ان الفاظ میں صاف ان علمائے یہود کو ملزم کیا ہے جنہوں نے دنیا کی ریاست کو مدنظر رکھ کر حق کے قبول کرنے سے انکار کر دیا پہلے توریت میں ہدایت اور نور کی طرف توجہ دلائی تو اب بتایا کہ چند روزہ دنیوی زندگی کے فائدہ کیلئے اور لوگوں سے ڈر کر ان باتوں کو پس پشت نہ ڈالو۔ اور اگر ان پیشگوئیوں کے مطابق فیصلہ کر کے حق کو قبول نہیں کرتے تو پھر تم کافر ہو چنانچہ سورۃ بقرہ میں یہ مضمون نہایت صفائی سے موجود ہے واٰمنوا بما انزلت مصدقا لما معکم ولا تکونوا اول کافر بہ ولا تشتروا باٰیٰتی ثمنا قلیلا وایای فاتقون (البقرۃ ۲۔ ۴۱) یا بما انزل اللہ سے مراد یہاں اور آیت ۴۵ و ۴۷ میں قرآن شریف ہے یعنی جواب اللہ نے اُتارا ہے اب اس پر عملدرآمد ضروری ہے اور یہ پچھلی آیت کے خلاف نہیں۔ کیونکہ اس میں اسلام کی دعوت دی ہے کہ قرآن کریم کے کل فیصلوں کو صحیح تسلیم کریں۔ اور قرآن کو حکم اور مہیمن مذہبی اختلافات میں قرار دیا ہے اور پچھلی آیت میں انکے باہمی تنازعات میں توریت کے مطابق فیصلہ کرنے کا ذکر تھا۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ ۴۵

اور ہم نے اس میں انپر یہ فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک

وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ تَصَدَّقَ

اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں بدلہ ہے پھر جو شخص اسے معاف

بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ ۚ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ

کردے تو وہ اسکے لئے کفارہ ہوگا اور جو اسکے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اُتارا تو وہی ظالم ہیں [۸۲۹]

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۴۶

اور ہم نے انکے قدموں پر عیسیٰ بن مریم کو انکے پیچھے بھیجا اس کی تصدیق کرتا ہوا جو اس سے پہلے توریت میں سے تھا

وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ

اور ہم نے اس کو انجیل دی اس میں ہدایت اور نور ہے اور اسکی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے توریت میں سے تھا

وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ۝ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۴۷

اور متقیوں کیلئے ہدایت اور نصیحت ہے [۸۳۰] اور ہم نے کہا تھا کہ انجیل کے پیرو اسکے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں اتارا

زخموں میں قصاص

۸۲۹ء جان کے بدلے جان کا حکم تو قرآن شریف میں بیان فرما دیا ہو کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ (البقرۃ ۱۷۸) لیکن زخموں میں قصاص یا دانت کا بدلہ دانت وغیرہ کا حکم قرآن شریف میں نہیں پایا جاتا۔ صرف توریت میں ہو۔ اور ان احکام کا ذکر یہاں اسلئے کیا ہو کہ یہ شریعت موسوی کی بنیاد کے طور پر تھے اور یہ بتانا بھی مقصود ہو کہ ہدایت و نور صرف پیشگوئیوں کا نام نہیں۔ آخری الفاظ میں پچھلی آیت کے آخری الفاظ کا اعادہ ہو۔ سوائے اسکے کہ وہاں نہ قبول کرنیوالوں کو کافر کہا ہو اور یہاں ظالم۔ کافر اس لحاظ سے کہ وہ منکر ہوتے ظالم اس لحاظ سے کہ ان پیشگوئیوں کو دوسری جگہ لگاتے ہیں۔ اور ظلم وضع الشئ فی غیر محلہ کا نام ہو +

حضرت عیسیٰ کا پہلے انبیاء کے نقش قدم پر آنا

۸۳۰ء حضرت عیسیٰ کا ذکر اس لئے علیحدہ کیا کہ وہ اس سلسلہ موسوی کے خاتم تھے لیکن یہ صاف بتا دیا کہ حضرت عیسیٰ پہلے انبیاء اسرائیل کے نقش قدم پر آئے۔ اسلئے شریعت موسوی میں جو مقام ان انبیاء کا تھا وہی مقام حضرت عیسیٰ کا تھا پس حضرت عیسیٰ کو انجیل دینے کے یہ معنی ہوتے کہ ان پہلے انبیاء کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے اپنے وقت میں کتابیں دی تھیں چنانچہ دوسری جگہ ان انبیاء کا بینات اور زبر اور کتاب منیر کے ساتھ آنا صاف لکھا ہو (آل عمران ۱۸۳) +

انجیل میں ہدایت و نور سے اشارہ

اور یہ جو فرمایا کہ انجیل کو بھی ہدایت اور نور لئے ہوئے اُتارا تو مطلب یہ ہو کہ یہ بھی اسی نوعیت کی کتاب ہو جیسے توریت کیونکہ جس طرح وہ ایک نبی کی وحی ہو۔ انجیل بھی ایک نبی کی وحی ہے اور ہر ایک نبی کے لئے چونکہ یہ ضروری ہے کہ وہ ہدایت لائے۔ اسلئے انجیل کے ذکر میں وہی لفظ بڑھا دیئے جو توریت کے ذکر میں تھے۔ اور بتا دیا کہ انجیل صرف

۴۸ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ

اور جو اسکے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اُتارا　تو وہی　نافرمان ہیں ۸۳۱ اور ہم نے تیری طرف کتاب حق

بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

کیساتھ اتاری　تصدیق کرتی　ہے جو اس سے پہلی کتاب کی　اور اسپر محافظ ۸۳۲ تو انکے درمیان اسکے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا

پیشگوئیوں کا نام نہیں بلکہ پیشگوئیوں کے نور کے علاوہ اس میں بھی ہدایت موجود ہے - پھر فرمایا کہ وہ متقیوں کیلئے ہدایت و نصیحت تھی یعنی اس میں ہدایت کی کچھ تفصیلات اور وعظ و نصیحت کی طرز بھی اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے +

۸۳۱ ولیحکم　یا تو بطور حکایت ہے یعنی ہم نے اہل انجیل کو انجیل دیکر یہ کہا تھا کہ جو کچھ اس میں اللہ تعالیٰ نے اُتارا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرو اور یا رسول اللہ صلعم کے زمانہ کے نصاریٰ مخاطب ہیں کہ آخر اس انجیل میں آنحضرت صلعم کی صداقت کی پیشگوئیاں ہیں پھر ان کو کیوں رد کرتے ہو - اور رسول اللہ صلعم کی صداقت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے +

آیت کے آخر پر پھر انہی الفاظ کا اعادہ ہے - مگر یہاں کافرون اور ظالمون کی بجائے فاسقون لکھا ہے یعنی ایسے لوگ نافرمان ہیں - اسلئے کہ حضرت مسیح نے فارقلیط کے متعلق کھلی پیشگوئی کی تھی کہ میرے بعد وہ آئیگا اور مانو حکم تھا کہ آپ کی تصدیق کریں پس حکم کی نافرمانی کے لحاظ سے وہ فاسق کہلائے - کافر ظالم فاسق انہی لوگوں کو کہا گیا ہے کافر انکار کے لحاظ سے ظالم پیشگوئیوں کو دوسری جگہ لگانے کی وجہ سے - فاسق حکم کی نافرمانی کی وجہ سے +

گو اوپر کی آیات میں اہل کتاب مخاطب ہیں لیکن تینوں آیتوں کے آخر میں یہ لفظ لا کر کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے کافر ہیں ظالم ہیں فاسق ہیں مسلمانوں کو بھی سمجھایا ہے کہ وہ اگر قرآن کے مطابق اپنا عملدرآمد نہ رکھینگے تو وہ بھی اسی حکم میں ہیں - چنانچہ ابن جریر نے ان روایات کو بیان کیا ہے جنکی رو سے یہ آیات مسلمانوں کے حق میں بھی ثابت ہوتی ہیں - البتہ کفر سے مراد کفر دون کفر لیا ہے اور ایسا ہی ظلم اور فسق سے چنانچہ وہیں ابن عباس کا قول منقول ہے لیس کمن کفر باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ یعنی یہ کفر ایسا کفر نہیں جیسے اللہ کا انکار اور فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں کا +

کفر دون کفر

۸۳۲ الکتاب پہلی کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور دوسری کتاب سے کل کتب سابقہ گویا الکتاب وہاں جنس کے طور پر ہے

الکتاب

مھیمن - بعض کے نزدیک ھیمن اس کا اصل ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز پر نگہبان ہونا اسلئے [illegible] ہیں اور بعض کے نزدیک مادہ امن ہے - اور مھیمن کے معنی امین ہیں (ل) پہلی کتابوں پر محافظ یا امین ہونے سے ایک ہی مراد ہے کہ ان کی ضروری اور صحیح تعلیم کو محفوظ کر لیا ہے +

مھیمن

توریت و انجیل کا ذکر کرنے کے بعد اب قرآن شریف کے نزول کا ذکر فرماتا ہے - اور اس کی دو شانوں کا بیان کیا ہے یعنی ایک تو وہ پہلی کتابوں کا مصدق ہے یعنی ان کا منجانب اللہ ہونا مانتا ہے اور ان کی پیشگوئیوں کو پورا کر کے ان کو سچا ٹھہراتا ہے - اور دوسرے وہ ساری کتب سابقہ کا محافظ ہے - یعنی ان کی اصلی تعلیم کی حفاظت کرتا ہے اور جو ان میں تحریف ہوئی تھی - اس کو غلط ٹھہراتا ہے اور یوں ان کے اختلافات کا بھی فیصلہ کرتا ہے - انجیل کو بھی توریت مصدق کہا ہے مگر اس پر مھیمن قرار نہیں دیا لیکن قرآن کو کل کتب سابقہ پر مھیمن قرار دیا ہے - اس لفظ کے استعمال سے بھی توریت و انجیل وغیرہا کی تحریف کا فیصلہ کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ قرآن کریم میں تحریف نہ ہوگی - اور مھیمن

قرآن کتب سابقہ کا مصدق بھی ہے اور محافظ بھی -

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ

اور اسکو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق سے آیا انکی خواہشوں کی پیروی نکر ۸۳۳ ہم نے تم میں سے ہر ایک کیلئے ایک شریعت اور طریق مقرر کیا تھا ۸۳۴

کہکر شرائع سابقہ کے منسوخ ہونے کا فیصلہ بھی کر دیا ہے۔ کیونکہ اب وہی تعلیم دنیا میں رہے گی جس نے پہلی صحیح تعلیموں کی جن کی ضرورت نسل انسانی کو ہمیشہ کیلئے تھی حفاظت کرکے اپنے اندر لے لیا۔ اور توریت و انجیل کے ذکر کے بعد قرآن کو مھیمن کہنے کے صاف معنی ہیں کہ انجیل میں بھی کوئی تعلیم ہے جو توریت کی طرح محفوظ رکھی جانے کے قابل ہے +

اختلافات مذہبی کا فیصلہ

۸۳۳ جب قرآن کریم کے مہیمن یعنی کتب سابقہ کے ناسخ ہونے اور ان کی صحیح تعلیم کے محافظ ہونے کا ذکر کیا تو اب فرمایا کہ مختلف مذاہب میں صحیح فیصلے اب قرآن شریف ہی کرے گا۔ اسلئے تم اسی کے مطابق ان کے اختلافات کا فیصلہ کرو۔ اس بات پر کہ یہاں ذکر مقدمات کا نہیں بلکہ اختلافات مذہبی کا ہے یہ قطعی شہادت ہے کہ اس کے بعد فوراً یہ ذکر ہے کہ ہم نے تم میں سے سب کے لئے یعنی مختلف قوموں کیلئے ایک شریعت اور ایک طریق مقرر کر دیا تھا اور پھر آیت کے آخر پر صاف فرما دیا کہ جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تم کو ان کی خبر دے گا۔ اور یہ اختلافات مذہبی ہی ہیں نہ مقدمات اور یہاں خطاب بھی صرف یہود سے نہیں بلکہ یہود و نصاریٰ دونوں قوموں سے کھلا خطاب ہے اور ضمناً سب قومیں آ گئیں۔ کیونکہ قرآن شریف کو مہیمن صرف توریت و انجیل پر نہیں کہا بلکہ مابین یدیہ من الکتاب پر یعنی جتنی کتب پہلے نازل ہوئیں سب پر۔ پس سب قوموں کے مذہبی اختلافات کا ذکر ہے جن کا فیصلہ قرآن شریف کرتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ صاف فرمایا وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ (النحل ۱۶-۶۴) اور ہم نے تیری طرف کتاب نازل نہیں کی مگر اس لئے کہ جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے ہیں تو ان کو کھول کر بیان کرے۔ اس فقرہ میں کہ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر بھی یہی اشارہ ہے +

منہاج

شرع۔ شرعۃ

۸۳۴ شرعۃ۔ منہاج۔ نھج طریق واضح یعنی کھلے رستہ کو کہتے ہیں۔ اور اسی سے منہاج ہے۔ اور شَرْع طریق واضح پر چلنا ہے اور کھلے رستہ کو بھی شَرْع اور شِرْع اور شریعۃ کہا جاتا ہے اور طریقہ الٰہیہ پر یعنی جو رستہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بتایا ہے اس پر بطور استعارہ بولا جاتا ہے (غ)۔ امام راغب کہتے ہیں کہ ان دو لفظوں کے اختیار کرنے میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک راہ پر چلنے کیلئے مسخر کیا ہے جس کا تعلق مصالح عباد اور عمارت بلاد سے ہے اور دوسرا وہ جس کا انسان اختیار سے قصد کرتا ہے جس میں شرائع کا اختلاف ہے یعنی جو دین اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے مقرر کیا ہے اور حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ شِرْعَۃ وہ ہے جو قرآن شریف نے بتایا اور منہاج وہ جو سنت نے بتایا اور ابن جریر نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے یعنی سبیل اور سنت اور سنتیں مختلف ہیں ایک شریعت تورات کی ہے ایک شریعت انجیل کی ایک شریعت قرآن کی اس میں اللہ جو چاہتا ہے حلال کرتا ہے جو چاہتا ہے حرام کرتا ہے اور دین ایک ہی ہے یعنی توحید اور اخلاص۔ اور حضرت ابن عباس کا قول ہی اس بارہ میں اصول محکم ہے اسلئے کہ یہاں دین اور طریق کا ذکر ہے اور باتیں دو ہی ہیں جو نبی کے آنے سے تعلق رکھتی ہیں ایک وہ شریعت یا رستہ جو اس کی کتاب بتاتی ہے دوسرا وہ منہاج یا رستہ جو اس کا عمل بتاتا ہے اور دونوں کھلے طریق ہیں اور دونوں پر ہی عمل ضروری ہے اور ضروری رہا ہے اور اسی معنی سے ہر نبی صاحب شریعت ہے گو وہ کوئی نئی شریعت عمل کیلئے لایا ہو یا نہ +

ہر نبی صاحب شریعت ہے

شرائع مختلفہ

ان الفاظ کے معنی یہ بھی لئے گئے ہیں کہ تم میں سے سب کے لئے ہم نے اب ایک شریعت اور منہاج مقرر کیا ہے یعنی اتباع دین محمدی اور یوں بھی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک اُمت کو ہم نے الگ الگ شریعت اور الگ الگ منہاج دیئے

وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ فَاسْتَبِقُوا

اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی گروہ بنا دیتا لیکن (وہ چاہتا ہے) کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اسکے بارہ میں تمہارے کمالات ظاہر کرے سو نیکیوں کو

الْخَیْرٰتِ ؕ اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ ۙ وَاَنِ احْکُمْ ۴۹

آگے بڑھکر لو[۸۳۵] تم سب کو اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے پس جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے وہ تمہیں بتا دیگا[۸۳۶] اور کہ انکے درمیان

بَیْنَہُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَہْوَآءَہُمْ وَاحْذَرْہُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ

اسکے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اُتارا اور انکی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور ان سے احتیاط کرتے رہو مبادا بعض ان باتوں سے ہٹا کر تجھے دکھ میں ڈالدیں[۸۳۷] جو

اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّصِیْبَہُمْ بِبَعْضِ

اللہ نے تیری طرف اُتاریں۔ پھر اگر وہ پھر جائیں تو جان لو کہ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے ان پر

ذُنُوْبِہِمْ ؕ وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝ اَفَحُکْمَ الْجَاہِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ ؕ ۵۰

مصیبت ڈالے اور بہت سے لوگ بلاشبہ نافرمان ہیں[۸۳۸] کیا یہ جاہلیت (کے زمانہ) کا فیصلہ چاہتے ہیں۔

ایک شریعت اور منہاج اہل توریت کا ایک شریعت اور منہاج اہل انجیل کا۔ اور یہی معنی سیاق کے لحاظ سے صحیح ہیں کیونکہ پہلے توریت اور اہل توریت کا ذکر کیا پھر انجیل اور اہل انجیل کا پھر قرآن اور متبعین قرآن کا۔ اور لکلٍ کہکر عام کر دیا کہ ہر اُمت یا قوم کیلئے اسطرح شریعت اور منہاج مقرر کئے جس طرح انکے لئے ہاں اس میں یہ اشارہ بھی ہے کیونکہ ذکر بالخصوص توریت اور انجیل کا ہے کہ اب انکے طریق پر عمل نہیں رہا نہ توریت کی حد درجہ کی سختی پر یہودی عمل کر سکتے ہیں نہ انجیل کی حد درجہ کی نرمی پر پس واقعات شاہد ہیں کہ یہ طریق وقتی تھے اور اب اتباع صرف ایک طریق کا ہی ہو سکتا ہے جو محمد رسول اللہ صلعم کی وساطت سے بتایا گیا ہے۔

حکمت اختلافات مذہبی

۸۳۵ یہاں ان اختلافات کی حکمت کو بیان کیا ہے جو طبائع انسانی میں پائے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب مذہب اسلام ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی صداقت ہے تو کیوں نہ ایسا ہوا کہ سب لوگ فوراً قبول کر لیتے اور اختلاف نہ کرتے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اگر تم کو ایسا بنانا چاہتا کہ تم میں اختلاف طبائع ہی نہ ہوتا تو ایسا بھی کر سکتا تھا کہ سب ایک ہی گروہ بن جاتے لیکن اسکی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ انسانوں میں اختلاف طبائع رکھے۔ اس اختلاف طبائع کی وجہ سے بعض لوگ ایک بات کو قبول کر لیتے ہیں تو بعض رد کر دیتے ہیں مگر یہ اختلاف طبائع جو بعض انسانوں کو قبولیت حق سے محروم کر دیتا ہے ایک بے معنی اختلاف نہیں بلکہ اسکے اندر بڑی حکمت ہے یہ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر قوٰی اور استعدادیں رکھی ہیں وہ یوں نشوونما پائیں اگر اختلاف طبائع نہ ہوتا تو انسان کو کمالات حاصل کرنے کا بھی کوئی موقعہ نہ ہوتا۔ اس لئے نصیحت کے طور پر فرماتا ہے کہ نیکیوں کو آگے بڑھکر لو تاکہ تمہارے کمالات جو تمہارے اندر مخفی ہیں نشوونما پائیں اور ظاہر ہوں۔

۸۳۶ یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ اس رکوع میں اختلافات مذہبی کا جھگڑا ہے۔ کیونکہ مذہبی اختلافات کا فیصلہ قیامت کے دن ہی ہو گا یعنی وہیں پتہ لگے گا کہ کون انسان غلطی پر تھا اور کون حق پر۔

فتن

۸۳۷ یفتنوک۔ فتن کے معنی بیان ہو چکے ہیں[۲۴۳] یہاں بلحاظ اسکے اصل معنی آگ میں ڈالنے کے دُکھ اور تکلیف میں ڈالنا ہی مراد ہے۔

ع
یہود و نصاریٰ سے تعلقات

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا ۵۱

اور ان لوگوں کیلئے جو یقین رکھتے ہیں اللہ سے بہتر فیصلہ دینے والا کون ہے؟ ۸۳۸ اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہودیوں

وقف لازم
وقف منزل
وقف غفران

الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ

اور عیسائیوں کو ولی مت بناؤ وہ ایک دوسرے کے ولی ہیں اور جو کوئی تم میں سے انکو ولی بناتا ہے بلاشبہ

الثلثۃ

مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۵۲

انہی میں سے ہے یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۸۳۹ پس جن کے دلوں میں بیماری ہے تو ان کو دیکھے گا

یُوْقِعُوْنَكَ فِیْ بَلِیَّۃٍ وَشِدَّۃٍ (غ)

اس آیت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ یہاں جس فیصلہ کا ذکر ہے وہ اختلافات مذہبی میں فیصلہ ہے کیونکہ یہاں ان اصول سے ہٹانے کا ذکر ہے جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوئے اور وہ دین اسلام ہی ہے +

اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی

ان الفاظ سے کہ ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور ان سے احتیاط کرتے رہو کہ بعض باتوں سے ہٹا کر مشکل میں نہ ڈالیں یہ نتیجہ نکالنا کہ نبی کریم صلعم نعوذ باللہ ان کی خواہشات کی پیروی کیا کرتے تھے پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ہدایت کی ضرورت نبی کریم صلعم کو تھی؟ جو مشکلات آنحضرت صلعم کو ان لوگوں کے ساتھ معاملات میں پیش آتی تھیں۔ اگر کوئی دوسرا آپ کی جگہ ہوتا تو یقیناً ان مشکلات کا مقابلہ نہ کرسکتا اور اس کا قدم ڈگمگا جاتا پس یہ ہدایت درحقیقت آپکے اس مقام بلند کو ظاہر کرتی ہے کہ حالات تو ایسے ہیں جن کے نیچے ایک بشر قایم نہیں رہ سکتا مگر آپ کو جس مقام پر خدا نے کھڑا کیا ہے اُس لحاظ سے آپ سے ایسا نہ ہونا چاہئے۔ علاوہ بریں اس خطاب میں ساری اُمت شامل ہے اور وہ اس ہدایت کے یقیناً محتاج ہیں۔ آج کس قدر مسلمان ہیں جو اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے اور کس قدر ظاہری کشش کے سامان عیسائیوں کی تہذیب میں ہیں جو مسلمانوں کو حق سے پھیر کر فی الحقیقت ان کو دکھوں میں ڈال رہی ہیں گو وقت پر سمجھ نہ آئے +

۸۳۸ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں یعنی یہ یہود حق و حکمت کی باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمائی ہیں ممکن ہے اس آخری آیت میں پچھلے رکوع کی آخری آیات کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہو تاکہ اس کی طرف پھر توجہ دلائی جائے یعنی جب ان میں جھگڑے ہوتے ہیں تو پھر جاہلیت کے مطابق فیصلہ چاہتے ہیں جس میں قوی کا حق کمزور پر فائق سمجھا جاتا تھا بنی قریظہ اور بنی نضیر میں بھی اسی کے مطابق عمل تھا یعنی بنی نضیر زبردست تھے اور بنی قریظہ کمزور اس لئے بنی نضیر بنی قریظہ سے دو چند دیت لیتے تھے +

اہل کتاب سے موالات

۸۳۹ اولیاء سے کیا مراد ہے دیکھو ۳۳۲ آل عمران ۳ - ۲۷ میں عام طور پر کفار کو اولیاء بنانے سے روکا تھا مگر وہاں شرط تھی کہ ایسی ولایت جو من دون المومنین ہو دیکھو ۳۹۹ یہاں بظاہر لفظ عام ہیں یہود اور نصاریٰ کو ولی مت بناؤ یعنی نہ ان سے مدد لو نہ مدد دو۔ اگلی آیت سے ظاہر ہے کہ منافق یہود اور نصاریٰ کی پناہ تلاش کرتے تھے اس خوف سے کہ اسلام مغلوب ہو جائے تو ساتھ ہی یہ بھی پس نہ جائیں اس لئے ان سے ساز باز رکھتے تھے۔ اور اگلے رکوع میں اسی مضمون کو دہراتے ہوئے ان اہل کتاب کا مخصوص طور پر ذکر کیا ہے جو دین اسلام سے ہنسی کرتے ہیں (۵۷) اور وہیں اہل کتاب کی عداوت کا

يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَن تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَ

کہ ان (کی دوستی) کے لئے جلدی کرتے ہیں کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ ہم پر کوئی گردش نہ آجائے۔ سو قریب ہے کہ اللہ (مسلمانوں کو) فتح

بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنفُسِهِمْ نَادِمِينَ ۝

دے یا اپنی طرف سے کوئی امر (دے) پس ان باتوں پر جن کو اپنے دلوں میں چھپاتے تھے پشیمان ہوں ۹۴۰

ذکر کیا ہے (۵۹) اور پھر ان کے فساد پھیلانے اور مسلمانوں کے خلاف لڑائی کی آگ جلانے کا ذکر کیا ہے (۶۴) پس یہ سیاق آیات قطعی شہادت اس بات پر ہے کہ یہاں انہی یہود و نصاریٰ کی ولایت سے روکا ہے جو اسلام سے عداوت رکھتے ہوئے اسلام کی تباہی کے درپے تھے۔ اور اسلام کے خلاف لوگوں کو اکساتے تھے۔ اور آیت کے شان نزول میں عبادہ بن صامت کا یہود کی موالات سے بیزاری کا اظہار اور عبد اللہ بن ابی منافق کا انکی موالات ترک کرنے سے انکار کا ذکر ہے (ج) اور دوسری روایت میں بنی قریظہ کے نقض عہد کا ذکر اسی آیت کے شان نزول میں ہے (ج) اور خود ابن جریر اس معنی کو ترجیح دیتے ہیں کہ یہ ایسی ولایت سے روکا ہے جو من دون المومنین ہو یعنی مسلمانوں کے خلاف یا جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ روایات شان نزول قطعی طور پر صحیح نہیں اس لئے عموم الفاظ قرآنی کو مدنظر رکھکر یہی معنی ہو سکتے ہیں اسلام میں نہ تو اس قسم کی تنگدلی ہے کہ اپنے متبعین کو دوسروں سے ملنے کی اجازت نہ دیتا ہو یا ان سے کسی قسم کے تعلقات ضروری سے جو مدنی حیثیت میں پیش آتے ہیں روکتا ہو۔ انہی اہل کتاب کی شریف بیبیوں کو زوجیت میں لانے کی اجازت دی ہے۔ اور میاں بی بی میں جو تعلق محبت کا ہوتا ہے وہ خود ظاہر ہے۔ یہی اہل کتاب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایرانیوں کے مقابل جنگ میں شامل تھے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑتے تھے۔ پھر دشمنوں تک کے ساتھ پورا عدل و انصاف مدنظر رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ پھر صاف فرمایا کہ جو لوگ تمہارے خلاف فی الواقع جنگ نہیں کر رہے یا علانیہ دشمن کو مدد نہیں دے رہے ان کے ساتھ بڑا نیکی کا سلوک کرو (الممتحنۃ ۶۰ - ۸) ہاں وہ حکیما مذہب جس بات سے مضرت پیدا ہوتی ہے۔ اس کو سختی سے روکتا بھی ہے گو ایک خواب بین فلاسفر جس نے عملی رنگ میں قوم نہیں بنائی اسکی مصلحت کو نہ سمجھ سکے اور بیسیوں عرض بھی ہوں ان لوگوں میں جو ہمارے مذہب کے دشمن ہیں اور ان میں جو ایسے نہیں اسلام نے فرق کرنا سکھایا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ایسے لوگوں سے ساز باز رکھتا ہے وہ ان کے خیالات سے متاثر بھی ہو گا۔ اور یوں انہی میں سے ہو جائیگا یہی معنی ہیں خانہ منہم کے ہاں اگر ایک طرف یہ معنی درست ہیں کہ جب ایک قوم دشمن اسلام ہو جائے تو تم فرداً فرداً اس سے تعلقات ولایت نہ رکھو تو دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ یہود اور نصاریٰ کو بحیثیت قوم ہم اپنا ولی نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ اسلام دنیا میں پھیلے پھر ان سے نصرت کی توقع رکھنے کے معنی ہی کیا ہوئے اور مسلمان کس طرح بحیثیت قوم اُن سے نصرت کی توقع رکھ سکتے ہیں اور بڑی بات جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے یہی ہے کہ ان سے نصرت حاصل کرنے کا خیال ترک کر دو۔

۹۴۰ دائرۃ۔ دَوْر کے معنی گرد پھرنا یا گھومنا ہیں اور دار گھر کو اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ اس کو دیوار گھیرے ہوئے ہوتی ہے اور پھر دار کے جائے قرار ہونے کے لحاظ سے شہر کو بھی دار کہا جاتا ہے اور دار دنیا اور دار آخرت بھی کہا جاتا ہے اور بہشت کو دار السلام اور دوزخ کو دار البوار یعنی امن کا گھر اور ہلاکت کا گھر کہا ہے اور دائرۃ وہ خط ہے جو گرد گرد پھرتا یا احاطہ کر لیتا ہے اور پھر اس سے مراد حادثات یا آفات لی جاتی ہیں کیونکہ وہ انسان کو گھیر لیتی ہیں علیہم دائرۃ السوء (التوبۃ ۹ - ۹۸)

دور - دار

دائرۃ

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ ٥٣

اور جو ایمان لائے کہینگے کیا یہ وہی ہیں جنہوں نے اللہ کی قسمیں بڑے زور کی قسمیں کھائی تھیں کہ وہ یقیناً

الثلثة

لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ ٥٤

تمہارے ساتھ ہیں انکے عمل ضائع ہوئے سو وہ نقصان اٹھانیوالے ہوگئے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو جو کوئی تم میں سے

مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي

اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ ایک قوم لائیگا وہ ان سے محبت رکھے گا اور وہ اس سے محبت رکھینگے مومنوں کے سامنے

الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ

نرم کافروں کے مقابلہ میں غالب اللہ کی راہ میں زور لگائینگے اور کسی ملامت کرنیوالے کی

لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

ملامت سے نہ ڈرینگے یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے اس کو دے اور اللہ فراخی والا جاننے والا ہو ۵۴۔

اور اس کی جمع دوائر ہو یتربص بکم الدوائر (التوبۃ ۹: ۹۸) اور دائرۃ مکروہ یا ناپسندیدہ امر ہی جیسے نخشی ان تصیبنا دائرۃ (غ)

غلبۂ کفر سے مرعوب نہ ہونا چاہئے۔

مرض سے مراد ایمانی کمزوری یا نفاق ہی ۲۲ و ۲۲۵ منافق جیسا کہ اوپر عبداللہ بن ابی کا ذکر ہوا یہودیوں سے اور کفار سے اس خوف سے خفیہ تعلقات رکھتے تھے کہ مسلمان آخرکار مغلوب ہو جائینگے اور اس طرح ہم بچ جائینگے اس زمانہ میں بہت سے مسلمانوں کی یہ حالت ہو کہ اسلام پر مصائب دیکھکر عیسائیوں کی پناہ ڈھونڈھتے ہیں۔ اگر خدائی وعدوں پر ایمان ہوتا تو خدا پر بھروسہ کرتے اور ان لوگوں سے دوستی نہ گانٹھتے جو اسلام کی بیخکنی کے درپے ہیں یہاں تسلی کے لئے دو باتیں کہی ہیں یا تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے مخالفوں پر فتح دیدے یعنی جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کی کھلی کھلی فتح ہو جیسا کہ نبی کریم صلعم کے زمانہ میں ہوا اور اسی لئے اس کو مقدم کیا ہو اور اس کے بعد یہ ذکر کیا ہو کہ اگر فتح نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے کوئی اور امر پیدا کر دے جو دین اسلام کے غلبہ کا موجب ہو جائے یعنی گو مسلمانوں کو فتح کی بجائے شکست ملے مسلمانوں کو موجودہ شکست میں یہ الفاظ تسلی دینے والے ہیں جن سے بشارت ملتی ہو کہ اللہ تعالیٰ اسلام کا غلبہ کسی اور رنگ میں کر دیگا ۵۴۱۔

ذُل - ذلیل

۵۴۱ اذلۃ - ذلیل کی جمع ہو۔ اور ذُل جس سے یہ مشتق ہو مغلوب ہونے کا نام ہو (غ) مگر اپنے لوگوں کے سامنے ذلیل ہونا یا مغلوب ہونا یہ ہو کہ انسان ان کے سامنے حد درجہ کی نرمی اختیار کرے جیسے مغلوب انسان کرتا ہو چنانچہ والدین کے سامنے جناح الذل نیچا کرنے کو کہا گیا ہے جہاں ذُل سے مراد نرمی ہو۔ یہاں بھی اذلۃ سے مراد نرمی اختیار کرنیوالے ہیں دوسری جگہ اسی خیال کو ان الفاظ میں ادا کیا ہو رحماء بینھم پس اذلۃ علی المؤمنین سے مراد ہو مومنوں کے سامنے ایسے نرم جیسے مغلوب آدمی جھک جاتا ہو اس سے بڑھکر آپس کے تعلقات محبت نہیں ہو سکتے۔

عزۃ

عزیز

اعزۃ - عزیز کی جمع ہو اور عزۃ اس حالت کا نام ہو جب انسان مغلوب نہ ہو۔ اس کی اصل ارض عزاز سے ہو جو سخت زمین کو کہتے ہیں۔ اور عزیز وہ ہو جو غالب آئے اور مغلوب نہ ہو الذی یقھر و لا یقھر (غ) دشمن کے سامنے

۵۵ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ

تمہارے ولی صرف اللہ اور اسکا رسول ہیں

کفار کے سامنے مغلوب نہ ہونے سے مراد

مغلوب نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کا اثر قبول نہ کرے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا اشداء علی الکفار ورنہ یوں تو مسلمانوں کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک کبھی نہ کبھی غیر مسلموں کے ماتحت بھی رہنا پڑا ہے پس اعزة میں جسمانی مغلوبیت کی نفی مراد نہیں۔ بلکہ اخلاقی اور روحانی مغلوبیت کی نفی مراد ہے۔ بلکہ جب حکام غیر مسلم کے ماتحت رہنا پڑے تو اس صفت عزیز کے اظہار کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت الناس علیٰ دین ملوکہم والا معاملہ ہوتا ہے۔ لوگ بادشاہوں کے دین ان کے اوضاع و اطوار کی طرف زیادہ جھکتے ہیں ان سے مرعوب ہو کر راہ حق کو ترک کر دیتے ہیں پس ایسے وقت میں مسلمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ جسمانی طور پر ان سے مغلوب ہونے کے باوجود بھی اخلاقاً ان پر غالب ہو اور اس قسم کی ذلت ان کے سامنے اختیار نہ کرے جس سے اخلاق پہ مذہب پر روحانیت پر بڑا اثر پڑے۔

جب ایسے لوگوں کا ذکر کیا جو دنیا کی چند روزہ آسایش کیلئے اپنے دشمنوں کو اپنا دوست سمجھ لیتے ہیں تو اب یہ بھی ذکر کیا کہ یہ لوگ بعض وقت اس قدر دب جاتے ہیں کہ ان کے اثر کے نیچے آکر دین حق سے ارتداد اختیار کر لیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بشارت دی کہ اگر کوئی مرتد ہوتا ہے تو ہوا اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ایسے ایسے مضبوط قدم لوگ پیدا کریگا کہ وہ کسی قسم کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے اور دین اسلام کی حمایت میں لگے رہیں گے خواہ کیسے بھی حالات پیش آئیں۔ یہ بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک آدمی مرتد ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ ایک صادق الاعتقاد قوم کو اسلام میں لا داخل کرے گا۔

ابتدائی تاریخ اسلام میں واقعات ارتداد

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے تو شاذ و نادر ہی کوئی ارتداد کا واقعہ ہوا ہے۔ یہانتک کہ ابو سفیان کی شہادت حالت کفر میں ہرقل کے سامنے یہ تھی کہ مسلمانوں میں سے کوئی شخص اپنے دین سے بیزار ہو کر ارتداد اختیار نہیں کرتا۔ سب سے بڑا فتنہ ارتداد حضرت ابو بکرؓ کی خلافت میں اُٹھا اور آپ کے ہاتھ سے فرو ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام میں اسود عنسی مسیلمہ کذاب اور طلیحہ نے نبوت کے جھوٹے دعوے کئے اور انکی قومیں یعنی بنو مدلج اور بنو حنیفہ اور بنو اسد ان کی وجہ سے مرتد ہو گئیں۔ ان سب کی سرکوبی حضرت ابو بکر نے کی۔ ان کے علاوہ ذیل کے قبایل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہوئے یعنی فزارہ۔ غطفان۔ بنو سلیم۔ بنو یربوع۔ سجاح کی قوم جس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور مسیلمہ سے شادی کی۔ کندہ۔ بنو بکر بن وائل حضرت ابو بکرؓ کا قدم اس عظیم الشان فتنہ میں انبیاء کی طرح مضبوط رہا اور یہ تمام قومیں پھر اسلام میں داخل ہوئیں۔ پس ابو بکرؓ اور آپ کے ساتھی یحبہم و یحبونہ کے مصداق ہیں یعنی خدا ان سے محبت رکھتا تھا اور وہ خدا سے محبت رکھتے تھے۔ اور قرآن کریم کی یہ شہادت آپ کے حق میں ان تمام زبان درازیوں کا کافی جواب ہے جو اہل تشیع نے کی ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق پر شہادت قرآنی

موجودہ فتنہ ارتداد اور مجدد صد چہارم

اس زمانہ میں یعنی آج سے کوئی پچاس سال پیشتر البتہ ارتداد زیادہ واقع ہوا ہے اور یہ ارتداد اسلام سے عیسائیت کی طرف ہے گو اب اس کی رو بہت کچھ رُک گئی ہے۔ اور اسکے رُکنے کا زمانہ وہی ہے جو مجدد صد چہار دہم اور اس اُمت کے مسیح حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی ماموریت کا زمانہ ہے اور وہی اصول اس فتنۂ ارتداد کو روکنے کا موجب ہوئے ہیں جن کی تعلیم آپکے ذریعہ سے دی گئی۔ کاش مسلمان غور کر کے اس سلسلہ کو قوت دیتے پھر دیکھتے کہ دین اسلام کس طرح دنیا میں غالب ہوتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَهُمْ رٰکِعُوْنَ ۝

اور وہ جو ایمان لائے جو نماز قایم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں ۸۴۲

وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ ۵۶

اور جو اللہ اور اسکے رسول کو اور انکو جو ایمان لائے ولی بناتا ہو تو یقیناً اللہ کی جماعت ہی غالب ہو ۸۴۳

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ ۵۷

ع ۸ — یہود و نصاریٰ کی حالت

اے لوگو جو ایمان لائے ہو ان میں سے جنکو تم سے پہلے کتاب دی گئی ان لوگوں کو ولی نہ بناؤ جو تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل

اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

بناتے ہیں اور دوسرے کافروں کو اور اللہ کا تقویٰ کرو اگر تم مومن ہو ۸۴۴

مومنوں کی موالات کس سے ہو

۸۴۲ یہود و نصاریٰ کی موالات یعنی ان کی مدد پر بھروسہ کرنے سے روکا تو اب یہ بھی بتاتا ہو کہ مسلمان کا بھروسہ کس پر ہو فرمایا کہ اپنا کارساز خدا کو سمجھو اور اپنے دوست رسول اور مومنوں کو بناؤ۔ اسی لئے ولیکم اللہ فرمایا یعنی حقیقی ولی یا ناصر اللہ ہی ہو اولیاءکم اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا نہیں فرمایا۔ گویا رسول اور مومن محض اس لئے ولی ہیں کہ وہ اللہ کے احکام کے فرمانبردار ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے حالت رکوع میں اپنی انگوٹھی ایک سائل کو دیدی تھی اور یہ آیت انہی کیلئے ہو کہ حالت رکوع میں وہ زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اول تو یہ فعل خود کوئی ایسا قابل تعریف فعل نہیں کہ ایک شخص نماز پڑھتے پڑھتے اپنی انگوٹھی سائل کو دیدے اس سے بڑھکر ایثار کے کام وہ ہیں جو حضرت ابوبکرؓ سے ظاہر ہوئے کہ بارہا اپنا سارا مال خدا کی راہ میں لٹا دیا مکہ میں بھی اور مدینہ میں بھی۔ دوسرا لوگ مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے آتے ہیں نہ زکوٰۃ دینے کے لئے تیسرا یہاں تو ہو کہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور حضرت علیؓ کا انگوٹھی دینا زکوٰۃ نہ تھا اور زکوٰۃ بیت المال میں دیجاتی تھی ھم راکعون کے معنی تو صاف یہی ہیں کہ وہ احکام الٰہی کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا چونکہ دو عظیم الشان رکن ہیں فرمانبرداری کے تھے ان کا علیحدہ ذکر کردیا ہو۔ اس سے حضرت علیؓ کی فضیلت اور امامت کی دلیل لینا بہت ہی بودی بات ہے

حزب۔ احزاب

۸۴۳ حزب جمع احزاب وہ جماعت ہو جس میں شدت ہو اور اس کی جمع اَحْزَاب ہو لما رآ المؤمنون الاحزاب (الاحزاب ۳۳ - ۲۲) وغیرہ میں مراد وہ قومیں ہیں جو نبی صلعم کی جنگ کیلئے مجتمع ہوئیں (غ) اور لسان العرب میں ہو کہ احزاب وہ جماعتیں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی جنگ کیلئے اجتماع کریں اور حزب الرجل سے مراد ہو اصحابہٗ وجندہ الذین علیٰ رأیہ (ل) یعنی اس کے دوست اور اس کے لشکر جو اس کی رائے پر ہوں اسی معنی سے کافر منافق حزب الشیطان ہیں اور مومن حزب اللہ ہیں جو اللہ کا اتباع کرتے ہیں +

یہاں یہ خوشخبری دی کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بھروسہ رکھنے والے ناکام نہیں ہوتے بلکہ یقیناً وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہونگے یہ بھی صریح پیشگوئی اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کی ہو +

کن اہل کتاب سے موالات جائز ہے۔

۸۴۴ یہ نص صریح ہے کہ ایسے اہل کتاب جو دین اسلام کو تباہ کرنا نہیں چاہتے اور نہ اس پر استہزا کرتے ہیں ان سے معاہدات نصرت ہو سکتے ہیں اور ان کو مدد دینا اور ان سے مدد لینا جائز ہو اور چونکہ یہاں یہود و نصاریٰ کا نام نہیں لیا

٥٨ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ

اور جب تم نماز کیلئے بلاتے ہو تو اسکو ہنسی اور کھیل بناتے ہیں یہ اسلئے کہ یہ وہ لوگ ہیں

٥٩ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ

جو عقل سے کام نہیں لیتے ٨٤٥ کہو اے اہل کتاب تم ہم پر کسلئے غضبناک ہوتے ہو صرف اسلئے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری

٦٠ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ

طرف اُتارا گیا اور اس پر جو پہلے اُتارا گیا اور تم میں سے اکثر نافرمان ہیں ٨٤٦ کہو میں تم کو بتاؤں

بلکہ اہل کتاب کا نام لیا ہو اور اہل کتاب میں وہ سب قومیں شامل ہوسکتی ہیں جن میں انبیاء آئے اور وہ سب قومیں تنزل میں آئے اسلئے سب قوموں کا قیاس اسی پر ہوسکتا ہو یعنی مسلمان صرف ان لوگوں کو اپنا دوست بناسکتے ہیں جو دین اسلام سے استہزا نہیں کرتے اور الکفار کو یہاں الگ کرنے سے ان خاص کفار کی طرف اشارہ مقصود ہو جو اس وقت اسلام کی بیخکنی کے درپے تھے۔ اور چونکہ اس رکوع میں یہود و نصاریٰ کی حالت کا ذکر کیا ہے تو ان کا دین اسلام سے استہزا کرنا بھی ان کی اندرونی حالت پر شاہد ہو۔ کیونکہ اس میں سوائے نیکی کے اور کسی چیز کی تعلیم نہیں پس اسلام سے استہزا خود نیکی سے استہزا بھی ہے۔ آج عیسائیوں کا یہی شیوہ ہو کہ دین اسلام سے استہزا کرتے ہیں +

لعب — **٨٤٥** لعب اصل اس کا لُعاب یعنی تھوک ہے جو بہتی ہو اس لئے لَعِبَ کے معنی ہوئے ایسا فعل کیا جس سے کوئی صحیح مقصد مدنظر نہ تھا (غ) +

اذان — ندائے صلوٰۃ یعنی اذان کا ذکر کیا کہ اس کی بھی تحقیر کرتے ہیں اور اسے ایک لغو چیز سمجھتے ہیں۔ اذان کو یہاں اس قدر وقعت دی ہو کہ اسے شعار اسلامی میں سے ایک ایسی چیز قرار دیا ہو جس کی تحقیر گویا دین اسلام کی ہی تحقیر ہو اور یہ سچ بھی ہو اس لئے کہ اذان اصول اسلامی کا ایک اعلان ہو۔ اور یہ بات اسلام سے خاص ہو کہ اسکے اصول کی منادی اس قدر زور سے دنیا میں پانچ وقت ہوتی ہو تاکہ سب لوگ اسلام کے اصول سے واقف ہو جائیں۔ اور اس میں مذہب اسلام کی صداقت پر بھی ایک شہادت ہو اس لئے کہ جبتک کسی کے دل میں صداقت کا پورا یقین نہ ہو اسے یہ جرأت نہیں ہوتی کہ اپنی باتوں کا اس قدر زور سے بار بار دنیا میں اعلان کرے۔ یہ بھی ظاہر ہو کہ یہاں اذان کو دین اسلام کے عظیم الشان ارکان میں سے قرار دیا ہے حالانکہ یہ کلمات ایک رویا میں حضرت عمرؓ کو اور ایک اور صحابی کو بتائے گئے تھے مگر ان پر تصدیق نبوی کی مہر نے انہیں دین اسلام کے ارکان میں داخل کردیا +

نقم — **٨٤٦** تنقمون۔ نَقِمَ مِنْہ کے معنی ہیں اسے بُرا سمجھا یا اس پر عیب لگایا زبان سے یا سزا دینے سے (غ)، اسی دوسرے معنی میں ہو فانتقمنا منہم فاغرقنٰہم (الاعراف۔ ١٣٦) اور نہایہ میں ہو اس قدر بُرا سمجھا کہ اس پر غضبناک ہوگیا +

اہل کتاب کا مسلمانوں سے سلوک — ان کے استہزا کا ذکر کرکے اب بتایا کہ یہ استہزا بھی دشمنی کی وجہ سے ہو۔ اس لئے سوال کیا ہو کہ کس وجہ سے تم ہم کو بُرا سمجھتے ہو حالانکہ کفار کو تم ایسا بُرا نہیں سمجھتے لیکن مسلمانوں میں اور کافروں میں اگر فرق ہو تو یہی کہ مسلمان اللہ پر اور اس کی وحی پر ایمان لاتے ہیں۔ اصل وجہ مسلمانوں کو بُرا سمجھنے کی یہ بتائی ہے کہ اہل کتاب خود راستباز اور احکام الٰہی کے بجھکر فرمانبردار نہیں۔ بلکہ حالت یہ ہو کہ ان میں سے اکثر حصہ فاسق ہو۔ آج یورپ کو دیکھ لو کہ باوجود

بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ

کہ اللہ کیطرف سے اس سے بدتر بدلہ پانیوالا کون ہو وہ جس پر اللہ نے پھٹکار کی اور اس پر ناراض ہوا اور ان میں سے

مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ

بندر اور سور بنائے اور وہ جس نے طاغوت کی پرستش کی یہ مرتبہ میں بدتر اور سیدھے راستہ سے بہت دور

سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۞ وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ ٦١

بھٹکے ہوئے ہیں ۹۴۷ اور جب تمہارے پاس آتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور وہ یقیناً کفر کیساتھ آئے اور وہ یقیناً

خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ۞ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ ٦٢

اسکے ساتھ ہی نکل گئے اور اللہ اسکو خوب جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں ۹۴۸ اور تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ وہ

فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞

گناہ اور زیادتی میں اور حرام کھانے میں جلدی کرتے ہیں بیشک جو وہ کرتے ہیں بُرا ہے

سارے فسق و فجور کے اسلام اور مسلمانوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اور دنیا کی کسی دوسری قوم کو دبانے کا اس قدر فکر نہیں جس قدر مسلمانوں کو دبانے کا ہے +

۹۴۷ بشرٍ من ذٰلك۔ ذٰلك سے اشارہ اس . . کی طرف ہے جو وہ مسلمانوں پر عیب لگاتے تھے +

قردۃ وخنازیر

قردۃ سے مراد اصحاب سبت اور خنازیر سے مراد حضرت عیسٰی کے اصحاب مائدہ ہیں یعنی جن کے لئے حضرت عیسٰی نے مائدہ طلب کیا (ر) ظاہر ہے کہ اصحاب السبت نے سبت کے دن جو ان کی عبادت کیلئے مقرر کیا گیا تھا عبادت کو ترک کر دیا اور دنیا میں غرق ہو گئے۔ اسی طرح یہ مائدہ والا گروہ حضرت عیسٰی کے پیروؤں میں سے وہ گروہ ہے جو روٹیوں پر گر گیا۔ اور مذہب کی غرض بھی سوائے حظ جسمانی کے ان کے نزدیک کوئی اور نہ رہی جس طرح بندر بننے سے مراد مسخ قلوب ہے۔ اسی طرح خنزیر بنانے سے مراد خنزیر صفت بنانا بھی ہو سکتا ہے (غ)، دیکھو ۹۴ حدیث میں مسیح موعود کے متعلق آتا ہے یکسر الصلیب ویقتل الخنزیر۔ حالانکہ مراد صرف یہ ہے کہ عیسائیت کے مذہبی غلبہ کو توڑیگا ورنہ یہ کسی مصلح کا کام نہیں ہو سکتا کہ جنگلوں میں جا کر سؤروں کو مارتا پھرے پس مراد غلبہ صلیبی کا دور کرنا اور صفت خنزیریت کی ہلاکت ہے جو ایک خنزیر خور قوم میں ترقی کر گئی ہے +

مسیح موعود اور قتل خنزیر

وعبد الطاغوت کا عطف مَن کے صلہ پر ہے یعنی انہی میں سے وہ لوگ ہوئے جنہوں نے طاغوت کی پرستش کی۔ طاغوت سے مراد سرکش سردار اور پیشوا ہیں۔ عوام الناس ان کے پیچھے ایسے لگ جاتے ہیں کہ ان کی عبادت کرتے ہیں +

۹۴۸ وہی لوگ جنکو اوپر بندر اور سؤر کہا ہے انہی کے یہاں آنے جانے کا ذکر ہے اور ساتھ ہی ان کی منافقانہ روش کا بھی ذکر کر دیا ہے +

۶۳ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ

کیوں ان کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے

۶۴ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ

بیشک جو وہ بناتے ہیں برا ہے ۸۴۹ اور یہودی کہتے ہیں اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے انہی کے ہاتھ باندھے گئے ہیں

وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ — وقف لازم

اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اسکی وجہ سے ان پر پھٹکار پڑ گئی ۸۵۰ بلکہ اسکے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے ۸۵۱ اور جو تیرے رب سے

كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ

تیری طرف اتارا گیا وہ ضرور ان میں سے بہتوں کو سرکشی اور کفر میں بڑھائے گا ۸۵۲

---

۸۴۹ اگلی آیت میں پھر یہود کا نام لیکر ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں یہود و نصاریٰ دونوں کا ذکر ہے اور حسن کا قول ہے کہ ربانی علمائے انجیل ہیں اور احبار علمائے توریت جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ قردۃ میں بنی اسرائیل کے نافرمانوں کی طرف اور خنازیر میں عیسائی شہوت پرستوں کی طرف اشارہ ہے +

۸۵۰ مغلولۃ ۔ غُل کے معنی ہیں قید یعنی باندھا گیا خذوہ فغلوہ (الحاقۃ ۶۹۔ ۳۰) اور اسی سے اغلال (بیڑیاں) ہیں (غل) اور محاورہ میں مغلول الید بخیل کو کہا جاتا ہے اور دوسری جگہ ہے لا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک (غ) یہ یہودیوں کے (مغلول الید) استہزا کی مثال دی ہے۔ عیسائی آج اس سے بھی بڑھکر استہزا کرتے ہیں۔ یہودی تو مسلمانوں کے مالی مصائب پر یوں تمسخر کرتے تھے کہ مسلمانوں کا خدا بخیل ہو گیا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ اگر دین اسلام سچا ہوتا تو سیاسی رنگ میں اس کا زوال کیوں ہوتا۔ اس کا جواب جو غلت ایدیہم سے دیا ہے۔ اس سے مراد پیشگوئی کے طور پر یہ ہے کہ اسلام کی مخالفت میں ان کے ہاتھ ایسے باندھے جائینگے کہ یہ مخالفت نہ کر سکیں گے +

۸۵۱ یداہ مبسوطتان ۔ یَدٌ ہاتھ اسکی جمع اَیْدِیٌ ہے اور استعارۃً بھی ید نعمت کیلئے بولا جاتا ہے اور کبھی حفاظت اور ملک کیلئے (ید) او یعفوا الذی بیدہٖ عقدۃ النکاح (البقرۃ ۲۔ ۲۳۷) میں بھی یہی مراد ہے جیسے کہتے ہیں مالی بہ یدان (غ)، یاجوج ماجوج کی حدیث میں ہے لا یدان لاحد بقتالہم یعنی ان کے ساتھ جنگ کرنے کی کسی کو طاقت نہ ہوگی اور ید اللہ کنایہ ہے حفظ اور دفاع سے اور ید اللہ علی الجماعۃ (ید اللہ) میں مراد یہی ہے کہ اہل اسلام کی جماعت متفقہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوگی (ن) اور یَدٌ مُطْلَقَۃٌ سے مراد ہے نعمتوں کا دینا اور یَدٌ مَغْلُوْلَۃٌ سے مراد ہے بخل اور ہاتھ کا روک رکھنا (غ)، اسی سے ہے اَیَّدَہٗ اس کی تائید کی ایدناہ بروح القدس (غ)، اور بَسط یَدٌ سے مراد بھی وہی ہے (تائید ۔ بسط ید) جو ہمارے محاورہ میں کھلے ہاتھ سے مراد ہے +

جواب تو یہودیوں کے اعتراض کا دیا ہے کہ وہ کہتے تھے اللہ اپنے بندوں کو دیتا نہیں یعنی مسلمان غریب ہیں جسکا جواب یہ دیا ہے کہ اسکے دونوں ہاتھ کھلے ہیں یعنی وہ دونوں قسم کی نعمتیں دینی بھی اور دنیوی بھی اپنی عبادت کرنیوالوں کو دیگا اور یہ پیشگوئی ہے مگر لفظ ایسے اختیار فرمائے ہیں کہ جو کچھ عیسائی کہتے ہیں اسکا بھی جواب آگیا ہے یَدٌ کا لفظ اللہ تعالیٰ کیطرف منسوب کرنا بلحاظ اپنے اصل معنی کے ہے یعنی طاقت کے معنی سے کیونکہ ہاتھ ہی انسان کی طاقت کا موجب ہے

۸۵۲ اسی طرح حضرت نوح کہتے ہیں لم یزدہم دعاءی الا فرارا (نوح ۷۱۔ ۶)، میرے بلانے نے ان کو بھاگنے میں ہی اور بڑھایا مطلب

وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ

اور ہم نے انکے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے جب کبھی وہ لڑائی کیلئے آگ جلاتے ہیں

أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ

اللہ اسکو بجھا دیتا ہے اور وہ زمین میں فساد پھیلاتے دوڑتے ہیں اور اللہ فساد کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا [٨٥٣] اور اگر

أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿﴾

اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے تو ہم ضرور ان سے انکی برائیاں دور کر دیتے اور انکو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ ﴿٦٦﴾

اور اگر وہ توریت اور انجیل کو اور جو انکی طرف ان کے رب سے اُتارا گیا ہے قایم رکھتے تو اپنے اوپر سے اور اپنے

وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ۚ مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿﴾

پاؤں کے نیچے سے کھاتے رہتے ان میں سے ایک گروہ میانہ رو ہے اور بہت سے ان میں سے برے کام کرتے ہیں [٨٥٤]

یہ ہے کہ جوں جوں قرآن اُترتا ہے وہ مخالفت پر زیادہ اڑتے جاتے ہیں +

یہود و نصاریٰ میں عداوت

٨٥٣ بینہم میں ضمیر اہل کتاب کے دونوں گروہوں یہود و نصاریٰ کی طرف جاتی ہے کیونکہ اصل خطاب اہل کتاب کے دونوں گروہوں سے چلا آتا ہے لا تتخذوا الیہود والنصاریٰ اولیاء (٥١) یہاں سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ دونوں کا وجود قیامت تک رہیگا اور ان میں عداوت و بغض بھی قیامت تک رہیگا۔ حضرت عیسیٰ پر سب کا ایمان لانا خلاف قرآن ہے +

نار الحرب

اوقدوا نار الحرب۔ روح المعانی میں ہے کہ عرب میں دستور تھا کہ جب جنگ کا اعلان کرنا ہوتا تو ایک بلند مقام پر یا پہاڑ پر بڑی آگ جلا دیتے اور اس کو نار الحرب کہتے تھے۔ اس آگ کے بجھانے کا مطلب ان کے شر کو دور کرنا ہے۔ اور حرب سے مراد یہاں رسول اللہ صلعم یا دین اسلام کے خلاف جنگ یا شر کا ارادہ ہے +

٨٥٤ ما انزل الیہم من ربہم سے مراد قرآن شریف ہے۔ چنانچہ پچھلی آیت میں بجائے اقامت توریت و انجیل وما انزل کے لو انہم اٰمنوا واتقوا ہے یعنی وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے۔ اور ایمان لانے سے مراد محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لانا ہی ہے ما انزل کے ساتھ توریت و انجیل کی اقامت کا کیوں ذکر کیا اسلئے کہ توریت و انجیل میں صریح پیشگوئیاں آنحضرتؐ کی تشریف آوری کی ہیں۔

لاکلوا من فوقہم و من تحت ارجلہم اوپر کا رزق برکات سماوی ہیں اور نیچے کا رزق برکات ارضی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ صرف رزق تحت ارجل کی طرف جھک گئے ہیں یعنی اس دنیا کی زندگی پر۔ حالانکہ اگر یہ قرآن شریف کو قبول کرتے تو روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی برکات سے متمتع ہوتے +

قصد۔ اقتصاد

منہم امۃ مقتصدۃ۔ مقتصدۃ۔ قَصْد کے معنی رستہ کی استقامت ہیں اور اسی سے اِقْتِصَاد ہے جو دو طرح پر ہے ایک اقتصاد ہر حال میں قابل تعریف ہوتا ہے اور یہ ایسے معاملات میں ہے جس میں افراط و تفریط کی دو طرفیں ہوں گو یا افراط و تفریط سے بچنے والا مقتصد ہے جیسے جود اسراف اور بخل کے درمیان ہے واقصد فی مشیک (لقمٰن ٣١ - ١٩) میں ایسا ہی اقتصاد ہے

۱۰
ع ۱۱
عیسائیت کا موجب
تحریف اور غلو

۶۷ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ

اے رسول - جو کچھ تیرے رب سے تیری طرف اُتارا گیا پہنچا دے - اور اگر تو (ایسا) نہ کرے تو تو نے اسکے پیغام کو نہیں پہنچایا

۶۸ وَ اللّٰهُ یَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡکٰفِرِیۡنَ ۝ قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ

اور اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا کیونکہ اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۸۵۵ کہو اے اہل کتاب

اور دوسرا اقتصاد وہ ہے جو اچھے اور بُرے کے بین بین ایک چیز ہے جیسے عدل اور جَور کے درمیان یا قریب اور بعید کے درمیان ایک کی مثال ہے فمنہم ظالم لنفسہ ومنہم مقتصد (فاطر ۳۵: ۳۲) دوسرے کی وسفراً قاصداً (التوبۃ ۹: ۴۲) یعنی جو بہت لمبا نہ ہو (غ) یہاں مقتصدۃ سے مراد نیک اور بُرے کے بین بین ہے +

یہ وسعت مذہب اسلام میں ہی ہے کہ دوسرے مذاہب میں نیکی کو تسلیم کرتا ہے ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ یہی میانہ رو گروہ کا اکثر حصہ اسلام میں آ گیا - اور اب بھی یہی گروہ ہے جس کا قدم اسلام کی طرف اُٹھتا چلا آرہا ہے +

عصم
عصمت انبیاء سے مراد

۸۵۵ یعصمک - عَصَم کے معنی اِمساک (غ) روک رکھنا یا مَنع (ل) یعنی بچانا ہیں - امام راغب واللہ یعصمک من الناس کی تفسیر میں لکھتے ہیں وعِصمۃ الانبیاء حِفظُہٗ اِیّاھم اوّلاً بما خصّھم بہ من صفاءِ الجوھر ثم بما اَولاھم من الفضائل الجسمیۃ والنفسیۃ ثم بالنصرۃ و بتثبیت اقدامہم ثم بانزال السکینۃ علیہم وبحفظ قلوبہم وبالتوفیق یعنی عصمت انبیاء سے مراد ان کا محفوظ رکھنا ہے - اول تو اس جوہر کے صفا پیدا کرنے سے جس سے انبیاء کو مخصوص کیا گیا ہے یعنی وہ پیدائش سے گناہ سے پاک ہوتے ہیں پھر جسمانی اور روحانی فضائل دینے سے پھر ان کو نصرت اور ثابت قدمی عطا فرمانے سے پھر ان پر سکینت نازل کرنے سے اور ان کے قلوب کی حفاظت سے اور ان کو توفیق عطا فرمانے سے پس یعصمک میں یہ سب باتیں داخل ہیں اور روح المعانی میں ایک قول اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یعصمک سے مراد ہے صدور ذنب سے محفوظ رکھیگا اور اس صورت میں من الناس سے مراد ہے من بین الناس یعنی لوگوں میں سے آپ کو اس پیغام رسانی کی وجہ سے گناہ کے صدور سے محفوظ رکھے گا اور یہ معنی بھی ہیں کہ لوگوں کے حملوں وغیرہ سے آپ کو محفوظ رکھے گا +

تبلیغ اور عصمت کا تعلق

جب یہود و نصاریٰ کی عداوت و استہزا کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ ان میں سے میانہ روی تھوڑوں میں پائی جاتی ہے اور اکثر کی حالت بہت بری ہے تو اب فرماتا ہے کہ تمہارا کام پیغام کا پہنچا دینا ہے - اور اگر کسی قوم کے غلبہ کی وجہ سے یا ان کے دنیوی جاہ و جلال سے ڈر کر ایک پیغام کو نہ پہنچاؤ گے تو تم نے کسی پیغام کو بھی نہیں پہنچایا - رسول میں اسکے پیرو بھی شامل ہیں جو اس کے بعد اس پیغام کو دنیا میں پہنچانے والے قرار پائے - ہاں ایسے حالات میں جب چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہوں تو اس پیغام کا پہنچانا جو سب کی غلطیوں کو دور کرتا ہے سب پر یہ بین ہے سب کو اپنا دشمن بنا لینا ہے - اس لئے ساتھ ہی یہ وعدہ دیا کہ ان دشمنوں سے اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپکے دین کو محفوظ رکھے گا - اور ضمناً اس میں رسول اللہ صلعم کی عصمت کو بھی بیان کر دیا - اور فی الحقیقت اس عصمت کا اور دشمنوں کے شر سے بچانے کا بڑا تعلق بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جب انبیاء کو ایک صفا جوہر سے بناتا ہے تو وہ غرض جس کیلئے وہ ایسا کرتا ہے پوری نہیں ہوتی اگر وہ ان کو دشمنوں کی شرارتوں اور منصوبوں سے محفوظ نہ رکھے یہاں تک کہ وہ اپنا پیغام پورے طور پر دنیا میں پہنچا دیں پس عصمت حقیقی اور عصمت ظاہری ایک دوسرے سے وابستہ ہیں - اور یہاں دونوں مراد ہیں بعض لوگوں نے صرف عصمت ظاہری یعنی دشمنوں سے بچانا مراد لیا ہے اور بعض نے صرف عصمت باطنی یعنی صدور ذنب سے محفوظ رکھنا مگر

لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ

تمہارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں یہانتک کہ توریت اور انجیل کو اور اسکو جو تمہارے رب کیطرف سے تمہاری طرف اتارا گیا قائم رکھو

حق یہ ہے کہ یہ الفاظ دونوں قسم کی عصمت پر حاوی ہیں ۔

اہل تشیع کا خیال

اہل تشیع کا یہ خیال کہ اس آیت میں تبلیغ سے مراد حضرت علیؓ کی خلافت کی تبلیغ ہے۔ الفاظ سے مبنی ہے۔ ما انزل الیک سے مراد گو یا پیغام توحید اور نیکی کی دعوت نہیں بلکہ حضرت علیؓ کو عرب کی بادشاہت کا مل جانا ہے اور یہ کہنا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم علیؓ کی خلافت کا ذکر کرنے سے ڈرتے تھے کہ صحابہؓ مخالف ہوجائیں گے بدترین حملہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا جاسکتا ہے یہ اس کی مثل ہی نہیں اس سے بدتر ہے جو عیسائی لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب سے شرک بت پرستی شراب خواری زنا باہم جنگ و جدل سب کچھ چھڑا لیا مگر خانہ کعبہ کی عظمت کو نہ چھڑا سکتے تھے ۔

علم دین سب کا سب امت کو پہنچا دیا گیا

اس موقع پر جو حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بیان کی جاتی ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو علم محفوظ کئے ایک کو تو میں نے پھیلا دیا اور دوسرے کا نام لوں تو یہ میری گردن کاٹی جاتی ہے تو اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ علم دین کا کوئی حصہ ایسا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کو نہ پہنچایا تھا اور چھپا کر ابوہریرہؓ سے ذکر کر دیا تھا۔ یہ خیال کم فہمی سے پیدا ہوا ہے۔ سارے کا سارا علم دین قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا منشا صرف احادیث فتن سے تھا جو اس زمانہ سے تعلق رکھتی تھیں چنانچہ اس کے مطابق ان کی دوسری حدیث ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں کہ میں ساٹھویں سال اور لڑکوں کی امارت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اور یہی وہ سال تھا جس میں یزید کو بادشاہت ملی اور دین میں فساد اسی سے شروع ہوتا ہے تو چونکہ یہ احادیث دین میں داخل نہ تھیں صرف واقعات کی خبریں تھیں اس لئے حضرت ابوہریرہ ان کو عام طور پر بیان نہ کرتے تھے۔ رہا کتمان ہدایت یعنی دین کے کسی حصہ کا نہ پہنچانا اس پر سخت وعید ہے جو خود قرآن شریف میں موجود ہے ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینٰت والھدیٰ من بعد ما بینّٰہ للناس فی الکتاب۔ اولٰئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللاعنون (البقرۃ ۲۔ ۱۵۹) پس نہ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دین کا کوئی حصہ چھپایا۔ نہ حضرت ابوہریرہؓ نے ۔

وعدۂ حفاظت کی ضرورت کیوں ہوئی

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مدینہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اعدا مکہ کی نسبت بہت زیادہ ہوگئے تھے وہاں صرف قریش تھے۔ یہاں ایک گروہ منافقوں کا۔ ایک یہود کا۔ ایک عیسائیوں کا۔ پھر سب قبائل عرب خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اور قریش نے اب اپنی ساری طاقت کو اکٹھا کر کے مسلمانوں کو تباہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس لئے وعدۂ حفاظت کی خاص ضرورت ہوئی اور اس قدر دشمنوں میں جو شب و روز آپ کی جان کے درپے تھے۔ آپ کا بچ رہنا ایک عظیم الشان معجزہ ہے اور چونکہ اس رکوع میں عیسائیوں کے غلو کا خاص رد ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ مخالفت دین اسلام کی اس قوم کی طرف سے ہونے والی تھی اور یہی سب سے بڑے دشمن عصمت انبیاء کے بن جانے تھے۔ اس لئے ان کے غلو کا ذکر کرنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت کا ذکر کیا تا ان پر اتمام حجت ہو اور تا مسلمان ان کی مخالفت سے گھبرائیں نہیں ۔

قوم کا فر کو ہدایت نہ دینے سے یہاں مراد یہ ہے کہ ان کے منصوبے کارگر نہ ہوں گے ۔

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ

اور جو کچھ تیری طرف تیرے رب کیطرف سے اتارا گیا یقیناً ان میں سے بہتوں کو سرکشی اور انکار میں بڑھائیگا سو تو کافر قوم پر

الْكَافِرِينَ ۝ ۶۹ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ

افسوس نہ کر ۸۵۶ وہ جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور صابی اور عیسائی جو کوئی

۷۰ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ لَقَدْ

اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ پچھتائینگے ۸۵۷ یقیناً

أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا

ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور انکی طرف رسول بھیجے جب کبھی انکے پاس رسول وہ چیز لیکر آیا

لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۝

جس کو انکے دل نہیں چاہتے تھے ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرنے لگے ۸۵۸

عیسائیوں کو انکی اپنی کتب مقدسہ کی شہادت پر الزام۔

۸۵۶ آنحضرت صلعم کی عصمت کا ذکر کرکے اب عیسائیت کے خلاف دلائل کی طرف رُخ کیا ہے۔ اور اس بحث میں سب سے پہلے ان کو اہل کتاب کہکر اصول بحث کی طرف بلایا ہے یعنی یہ کہ توریت و انجیل اور ان کتابوں کو جو تمہارے انبیاء کی وساطت سے تمہاری طرف نازل ہوئیں (ما انزل الیکم من ربکم) ان کو قایم کرو۔ جو کچھ ان میں ہے۔ وہ بطور اصول تم تسلیم کرو۔ اگر اس کو تسلیم نہیں کرتے تو تم نے حق کو بالکل ترک کردیا جب اپنی ہی کتب مقدسہ کی شہادت کو قبول نہ کیا۔ تو پھر واقعی یہ کہنے کا حق ہے کہ تم کسی شے پر نہیں۔ یہاں چونکہ عیسائیت کے ساتھ بحث شروع ہوتی ہے اس لئے انکو بتایا ہے کہ اس بحث میں تمہارے ہاتھ میں کوئی بات نہیں جس کی طرف توجہ کی جائے جبتک کہ اپنی کتب مقدسہ کے اصول کو تسلیم نہ کرو اور ان لوگوں کی وحی کو نہ مانو جن کو تم انبیاء تسلیم کرتے ہو ما انزل الیکم من ربکم سے مراد یہاں توریت و انجیل کے علاوہ انبیائے بنی اسرائیل کی دیگر کتب ہیں جو بائبل میں شامل ہیں (اس لئے جب قرآن شریف کا یہاں ذکر کیا تو ما انزل الیک فرمایا) ان تمام کتابوں کا اصول متفقہ توحید الٰہی اور خدا کی طرف سے شریعت اور ہدایت کا ملنا اور اعمال صالحہ کا بجالانا ہے۔ نہ کہیں تثلیث کا ذکر ہے نہ کفارہ کا یہانتک کہ خود انجیل میں خدائے واحد کے ایک ہونے کی شہادت موجود ہے لیکن عیسائی ان تمام باتوں کو رد کرکے ایک نیا مذہب بناتے ہیں جس کی بنا تثلیث اور کفارہ پر ہے جو تعلیم انبیاء کے سراسر مخالف ہے۔

۸۵۷ قریباً یہی الفاظ پہلے بھی آچکے ہیں جہاں ان پر مفصل بحث گزرچکی ہے۔ دیکھو ۹۲ یہاں اس آیت کے لانے کا منشا یہ ہے کہ تمام قوموں کو اور تمام کتب مقدسہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ یہی تعلیم دی ہے کہ خدا ایک ہے۔ اور اعمال صالحہ کی ضرورت ہے تثلیث اور کفارہ علی الترتیب ان دونوں اصول کو غلط ٹھہراتے ہیں پس ان کے خود غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

۸۵۸ عہد بنی اسرائیل کو یاد دلاکر بھی یہی بتایا ہے کہ اس عہد میں اللہ تعالیٰ کی توحید پر ہی سارا زور ہے۔ اور پھر فرمایا کہ

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا ٧١

اور انہوں نے گمان کیا کہ کوئی دکھ نہیں آئیگا سو وہ اندھے اور بہرے ہوگئے پھر اللہ نے انپر رجوع برحمت کیا پھر ان میں سے بہت سے

كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ ٧٢

اندھے اور بہرے ہوگئے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں ۸۵۹ یقیناً وہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی

الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ

اللہ ہے اور مسیح نے کہا اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے۔

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ

کیونکہ جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے یقیناً اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اسکا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کیلئے

وقف لازم

مِنْ اَنْصَارٍ ○ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ ٧٣

کوئی مددگار نہیں ۸۶۰ یقیناً وہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے اور معبود تو سوائے ایک معبود کے کوئی نہیں

تم لوگ ہمیشہ ہوائے نفس کے پیرو رہے ہو یہانتک کہ انبیاء کو بھی جب انہوں نے تمہارے خلاف منشا کچھ کہا جھٹلا دیا اب بھی تم ہوائے نفس کی وجہ سے آنحضرت صلعم کے قتل کے منصوبے کرتے ہو +

فتنة

ع ۸۵۹ فتنة کے عام معنی مصائب یا دکھ ہیں مگر یہاں حضرت ابن عباس سے شرک معنی مروی ہیں (ج) + اندھے اور بہرے ہونے سے مراد یہی ہے کہ اصول حقہ کو ترک کر کے نئے اصول بنا لئے۔ چنانچہ اس کی تشریح صاف اگلی آیت میں کر دی ہے پہلی مرتبہ اندھے اور بہرے ہونا حضرت عیسیٰ کے بعد کا فتنہ ہے۔ جب عیسائیوں نے توحید اور شریعت کو ترک کر کے تثلیث اور کفارہ کے عقاید ایجاد کر لئے۔ ان پر رجوع برحمت کرنا آنحضرت صلعم کا مبعوث فرمانا ہے مگر پھر بھی یہ راہ راست پر نہ آئے اندھے اور بہرے ہی رہے بلکہ کثرت انہی کی ہو گئی اور موحد گروہ بالکل مٹ گیا۔ مفسرین نے یہاں یہود مراد سمجھے ہیں مگر میرے نزدیک یہ عیسائیوں کا ذکر ہے +

مسیح کی خدائی اور تثلیث

ع ۸۶۰ یہاں صراحت کر دی کہ وہ اندھا اور بہرہ ہونا جس کا ذکر اوپر ہے وہ توحید الٰہی سے انحراف ہی ہے عیسائیوں کے عقیدہ کو یہاں اور آیت ۱۷ میں یوں بیان کیا کہ وہ کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے اور اس سے اگلی آیت میں یعنی آیت ۷۳ میں اور النساء ۱۷۱ میں تین خداؤں کا ماننا ان کا عقیدہ بتایا بعض لوگوں نے اسے اختلاف سمجھ کر یوں توجیہ کی ہے کہ بعض فرقوں کا ایک عقیدہ تھا بعض کا دوسرا۔ مگر اصل یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں درست ہیں اور عیسائی فی الحقیقت ایک ہی ہی مانتے تو یہی ہیں کہ تین اقنوم ہیں باپ بیٹا روح القدس لیکن عملی رنگ میں مسیح ہی مسیح رہ جاتا ہے۔ کیونکہ نجات دہندہ وہی ہے اور سارا تعلق اسی سے ہے۔ سارا زور اسی کی خدائی ثابت کرنے پر صرف کیا جاتا ہے اور اسی کی خدائی کی اشاعت دنیا میں ہوتی ہے پس دونوں باتیں درست ہیں۔ ایک ان کا کتابی عقیدہ ہے اور ایک عملی۔ اس عقیدہ کے بالمقابل مسیح کا قول پیش کیا ہے کہ وہ خود خدا کی عبادت کی طرف بلاتا تھا اگر خدا ہوتا تو خود کیوں خدا کی عبادت کرتا اور اس کی عبادت کی طرف بلاتا آیت ۷۵ میں انکے بالآخر حق

۷۳ وَإِن لَّمْ يَنتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ أَفَلَا يَتُوبُونَ

اور اگر وہ اس سے نہ رکینگے جو کہتے ہیں تو ضرور ان کو جو ان میں سے کافر ہیں دردناک عذاب پہنچے گا تو کیا یہ اللہ کے حضور

۷۴ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ مَّا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ

توبہ نہیں کرتے اور اسکی حفاظت نہیں چاہتے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنیوالا ہو مسیح ابن مریم سوائے رسول کے کچھ نہیں اس سے پہلے

مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ انظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ

بھی رسول گزر چکے اور اسکی ماں صدیقہ تھی وہ دونوں کھانا کھاتے تھے دیکھو کس طرح ہم ان کیلئے باتیں بیان

۷۵ الْآيَاتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝ قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ

کرتے ہیں پھر دیکھو یہ کس طرح اُلٹے پھیرے جاتے ہیں ۸۶۱ کہو کیا تم اللہ کے سوائے اس کی عبادت کرتے ہو جس کو نہ تمہارے

۷۶ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا

نقصان کا اختیار ہو اور نہ نفع کا اور اللہ ہی سننے والا جاننے والا ہو ۸۶۲ کہو اے اہل کتاب اپنے دین میں

فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِن قَبْلُ وَأَضَلُّوا

ناحق کا غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو پہلے گمراہ ہوئے اور بہتوں کو

كَثِيرًا وَضَلُّوا عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ ۝

گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے ۸۶۳

کی طرف رجوع کا ذکر کیا ہو، ورا گلے رکوع میں ان کے اسلام کے قریب ذکر میں اسی کی تائید پائی جاتی ہو +

مسیح کے کھانا کھانے کا ذکر۔

۸۶۱ مسیح کی خدائی کی تردید میں ان کی ماں کا ذکر قرآن شریف نے ہمیشہ کیا ہو یہ تبلانے کو کہ ایک عورت کے فرزند کو خدا بنایا جاتا ہو اور دونوں کے کھانا کھانے کا ذکر اسلئے کیا کہ جو کھانا کھاتا ہو وہ تمام حوائج بشری کا محتاج ہو جب کھانا کھائیگا تو پیشاب پاخانہ بھی کریگا۔ اور وہ خدا نہیں ہو سکتا جو کھانے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک نہایت ہی بیّن دلیل ہو۔ مگر افسوس ہو کہ عیسائی توجہ نہیں کرتے۔ مگر ان پر کیا افسوس ہو جب مسلمانوں کی اپنی ہی یہ حالت ہو کہ ان کھلے الفاظ کے ہوتے ہوئے کہ مسیح کھانے کے محتاج تھے یہ مان رہی ہیں کہ دو ہزار سال سے اسی جسد عنصری کے ہوتے ہوئے کھانیکے محتاج نہیں نہ دیگر حوائج بشری کے۔ اور عیسائی ایسے عقیدہ سے اس کی الوہیت کی دلیل لیکر خود مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں +

۸۶۲ مسیح کوئی نفع نقصان نہیں پہنچاتے تو مسیح کی پرستار قوم کا یہ خیال کہ ہمارا غلبہ مسیح کی پرستاری کی وجہ سے ہو [illegible]

عقیدہ الوہیت و ابنیت مسیح پہلے بت پرستوں کی نقل ہو۔

۸۶۳ یہاں یہ بتایا ہو کہ ایک انسان کو خدا بنانا یہ پہلی گمراہ قوموں کی پیروی ہو۔ یہ الزام جو قرآن کریم نے عیسائیوں پر دیا ہو اسکی صداقت کا اعتراف آج خود عیسائی کہلانیوالے لوگوں کو ہو۔ پہلے بت پرستوں نے بھی اسی قسم کا مذہب بنایا ہوا تھا کہ

ع ١١

عیسائی اسلام کے قریب ہیں۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا ٧٨

جن لوگوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی یہ اسلئے کہ

عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا ٧٩

انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے بڑھ جاتے تھے [٨٦٤] وہ ایک دوسرے کو بری بات سے جسے وہ کرتے روکتے نہ تھے یقیناً جو وہ کرتے تھے

يَفْعَلُوْنَ ○ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ ٨٠

بُرا تھا [٨٦٥] تو ان میں سے بہتوں کو دیکھیگا کہ جنہوں نے کفر کیا انہیں دوست بناتے ہیں یقیناً وہ جو انہوں نے اپنے نفسوں کیلئے آگے بھیجا ہے بُرا ہے

اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ○ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ ٨١

کہ اللہ ان پر ناراض ہوا اور وہ عذاب میں رہنے والے ہونگے اور اگر وہی کا خدا اللہ پر اور نبی پر اور اس پر ایمان

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○

لاتے جو اسکی طرف اُتارا گیا تو ان کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے بہت نافرمان ہیں [٨٦٦]

کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو خدا اور خدا کے بیٹے کہتے تھے۔ اور آج یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ پولوس نے محض یونانی بت پرستی کی تقلید میں یہ مذہب بنایا۔ کیا ایک عرب کا اُمی دنیا کی تاریخ سے ناواقف یہ کہہ سکتا تھا؟ نہیں یہ خدائے عالم الغیب کا کلام تھا جس نے اس حقیقت کو دنیا پر ظاہر کیا۔ اور آج خود یورپ کے محققین نے اس کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر یہ ایک بین شہادت ہے۔

بنی اسرائیل پر داؤد اور عیسیٰ کے بعد عذاب کا آنا

[٨٦٤] حضرت موسیٰ کے بعد حضرت داؤد میں بنی اسرائیل نے جسمانی ترقی کا اور حضرت عیسیٰ میں روحانی ترقی کا کمال حاصل کیا۔ اور ان دونوں نبیوں نے آنحضرت صلعم کی بڑی بھی کی ہے اور آپ کی آمد کا بہت ذکر کیا ہے۔ مگر دونوں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ قوم نہایت سخت دل ہوتی جاتی ہے اور احکام الٰہی کی فرمانبرداری نہیں کرتی اس لئے دونوں نے ان سزاؤں کا بھی جو ان پر آنے والی تھیں ذکر کیا ہے یہی لعنت یعنی دوری ہے۔ حضرت داؤد کے بعد بخت النصر کے ذریعہ سے اس قوم پر تباہی آئی اور حضرت عیسیٰ کے بعد طیطوس رومی کے ذریعہ سے اور ان دونوں تباہیوں سے جنکا اصل باعث ان کی نافرمانی تھی یہ قوم بالکل ذلیل ہوگئی۔ اس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں ہے جہاں پہلے فرمایا لتفسدن فی الارض مرتین (بنی اسرائیل ۔ ۴) اور پھر ان کی شرارت پر جو سزا ان کو دی گئی اس کا ذکر آیت ۵ و آیت ۷ میں کیا۔

ترک امر بالمعروف

[٨٦٥] قوم کی ترقی اسی وقت تک رہتی ہے جب ایک دوسرے کو بُرے کاموں سے روکنے والے ہوں یہی مرض اب مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا ہے کہ بُرے کام ہوتے دیکھتے ہیں خلاف قرآن و حدیث چاروں طرف ہو رہا ہے مگر جو خود شاید بچے بھی ہوں وہ دوسروں کو کچھ نہیں کہتے اور انہی مجلسوں میں شامل ہوتے ہیں غیرت اسلامی ہوتی تو کم از کم الگ ہی رہتے اور چاہئے تو تھا کہ روکتے۔

النبی سے مراد

[٨٦٦] النبی کا لفظ قرآن شریف میں آنحضرت صلعم پر ہی بولا گیا ہے بعض لوگوں نے یہاں حضرت موسیٰ کو مراد لیا ہے یعنی اگر یہود حضرت موسیٰ پر ایمان لاتے تو کافروں کو دوست نہ بناتے۔ مگر مراد اصل میں یہ ہے کہ کافروں اور مشرکوں کو تو ان

٨٢ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ

تو یقیناً ان کے لئے جو ایمان لائے دشمنی میں سب لوگوں سے زیادہ سخت یہودیوں کو پائیگا اور انکو جو مشرک ہیں اور انکے لئے

اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ

جو ایمان لائے دوستی میں سب سے قریب تو ان لوگوں کو پائیگا جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں یہ اس لئے کہ ان میں سے

قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

عالم اور راہب ہیں اور اسلئے کہ وہ تکبر نہیں کرتے ٨٦٧

لوگوں نے دوست بنا رکھا ہے جیسا کہ پچھلی آیت میں کہا اور وہ دوستی ملک عرب میں رہائش کی وجہ سے یا ہمسائیگی کی وجہ سے نہیں کیونکہ اگر وہی لوگ آنحضرت صلعم پر ایمان لے آئیں تو پھر یہ ان کو کبھی دوست نہ بنائیں۔ گویا صرف اسلام کی دشمنی کی وجہ سے ایسا کیا ہے +

قِسّ ۔ قِسِّیس

٨٦٧ قسیس ۔ قِسّ کے اصل معنی رات کے وقت کسی شے کا طلب کرنا اور اس کا تتبع کرنا ہیں اور قِسِّیس نصاریٰ کے علماء کو کہتے ہیں اس لئے کہ یہ لوگ عابد بھی ہوتے تھے (غ) +

رهب ۔ رهبة

رَهْبَانِيَّة

راهب

رهبان ۔ راہب کی جمع ہے اور رُہب اور رَہْبَة کے معنی خوف ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب ملا ہوا ہو۔ اور رَهْبَانِيَّة وہ عبادت ہے جس میں خوف کی وجہ سے غلو کیا جائے (غ)، وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا (الحدید ٥٧ - ٢٧) اور راہب وہ لوگ ہیں جو تعلقات دنیوی سے بالکل الگ ہو کر عبادت میں ہی لگ جائیں۔ اور ایسے لوگ عیسائیت میں بہت تھے +

عیسائیوں کے اسلام کے زیادہ قریب ہونے کی وجہ

اصل منشا اس رکوع میں یہی بتانے کا ہے کہ عیسائی لوگ باوجود اپنے غلو کے دین اسلام کے قریب ہیں۔ اس لئے یہودیوں کی عداوت اور قساوت قلبی کا ذکر کرکے اب اصل مضمون کو بیان کیا ہے کہ ان میں مسلمانوں کے ساتھ محبت زیادہ ہے ۔ کیونکہ ان کے علماء بھی عابد لوگ ہیں اور ان میں راہب بھی ہیں جو دنیا کو ترک کرکے عبادت میں لگے ہوئے ہیں اور عبادت سے دل نرم ہوتا ہے۔ اس وقت یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ فرق بین تھا کہ یہود بالکل دنیا پر گرے ہوئے تھے۔ سود خواری اور مال دنیا کا کمانا اس سے بڑھ کر ان کی کوئی غرض نہ تھی اور عیسائیوں میں عبادت کی طرف زیادہ توجہ تھی اسلئے یہود میں قساوت قلبی زیادہ تھی اور عیسائیوں میں نرمی زیادہ تھی چنانچہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں نجاشی شاہ حبش مسلمان ہوا۔ ہرقل نے بھی چاہا تھا کہ اسلام قبول کرے مگر قوم کی مخالفت سے گھبرا گیا۔ مقوقس شاہ مصر نے آپکے خط کے جواب میں تحائف بھیجے۔ خود نجران کے وفد کو مباہلہ میں نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بالمقابل اس کے یہودیوں نے سخت عداوت کی۔ اور گو

موجودہ عیسائی اور اسلام

لفظ عام ہیں لیکن جو وجہ عیسائیوں کی نرمی کی دی ہے اس نے ان الفاظ کو بھی محدود المعنی کر دیا ہے یہ پہلی حالت عیسائی قوم کی بلاشبہ یہی تھی کہ ان میں علماء بھی عابد تھے اور تارک الدنیا عبادت کرنیوالے بھی تھے مگر آخری حالت یہ ہے جیسا کہ سورۃ کہف میں اس قوم کا نقشہ کھینچا ہے کہ بالکل مال و دنیا پر گر گئی الذین ضل سعیهم فی الحیٰوة الدنیا (الکہف ١٨ - ١٠٤) اور خدا تعالیٰ کی عبادت کی بجائے دولت کے دیوتا اور حکومت کے طاغوت کی پرستش شروع کر دی اسلئے حق سے دور جا پڑے بلکہ حق کی مخالفت پر سارا زور صرف کر دیا لیکن باایں آیت کے الفاظ یہ اُمید دلاتے ہیں کہ یہ لوگ پھر اسلام کی طرف متوجہ ہونگے اور واقعات سے بھی یہی شہادت ملتی ہے کہ ایک چھوٹے سے پیمانہ پر اس قوم میں تبلیغ کا یہ اثر ہوا کہ سیکڑوں کی تعداد میں قابل اور فاضل لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے +

الجزء السابع

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ ٨٣

اور جب اسے سنتے ہیں کہ جو رسول کی طرف اتارا گیا تو تو دیکھے گا کہ انکی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے

الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝ وَمَا لَنَا ٨٤

ہیں اسلئے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا کہتے ہیں ہمارے رب ہم ایمان لائے سو تو ہم کو گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے [٨٦٨] اور ہمارے

لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ

پاس کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہمارے پاس آیا ایمان نہ لائیں اور ہم آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ

الصَّالِحِينَ ۝ فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَ ٨٥

داخل کرے سو اللہ نے انکو ان باتوں کا بدلہ باغ دیئے جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں انہی میں رہینگے اور

ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝ ٨٦

یہ نیکی کرنیوالوں کا بدلہ ہے اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں

نجاشی اور مسلمان مہاجر

[٨٦٨] اسی گروہ میں سے نجاشی شاہ حبش تھا۔ جو مسلمان قریش کی اذیت سے بھاگ کر حبش میں چلے گئے۔ ان کو نجاشی نے پناہ دی۔ ان کے پیچھے قریش بھی پہنچے اور بہت سے تحفے وزرا وغیرہ کو دیکر یہ درخواست کی کہ مسلمانوں کو یہاں امن نہ دیا جائے نجاشی نے اس درخواست کو رد کردیا تو انہوں نے اس کو یہ کہکر اکسانا چاہا کہ یہ لوگ ہمارے مذہب کو ہی برا نہیں کہتے بلکہ تمہارے مذہب کو بھی برا کہتے ہیں۔ نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں بلایا حضرت جعفر نے اصل حال کہہ سنایا کہ ہم کس طرح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ اور گناہوں میں غرق تھے۔ پیغمبر نے ہمیں ضلالت سے نکال کر کس طرح اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ تب اس نے پوچھا کہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو۔ انہوں نے سورۃ مریم کی آیات پڑھکر سنائیں جن سے نجاشی پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ رو پڑا۔ اور شہادت دی کہ جو کچھ قرآن نے عیسیٰ کے بارہ میں بیان کیا ہے اس سے وہ ایک تنکے کے برابر بڑھکر نہیں۔ آخرکار نجاشی مسلمان ہو گیا۔ یہ تو ایک نمونہ ہے اسی طرح کئی لوگ اسلام میں داخل ہوئے گو مقدر یہی تھا کہ عیسائیت جب پورا زور پکڑے تو اس کے بعد پھر اسلام کو اس پر پورے طور پر غالب کیا جائے۔ ہاں ایسے نمونے آج بھی بہتیرے ملتے ہیں لارڈ ہیڈلے کے حالات میں ایک شخص نے لکھا ہے کہ وہ پچھلی رات تہجد کی نماز میں قرآن شریف پڑھکر روتا تھا۔ اور بھی آج کئی ایک یورپین عیسائی ہیں جنکے دل قرآن کریم کے سامنے پگھل جاتے ہیں۔

الحق

الحق جو اس آیت میں اور اگلی آیت میں آتا ہے اس سے اشارہ حضرت عیسیٰ کی اس پیشگوئی کی طرف ہے جو یوحنا کے چودھویں اور سولھویں باب میں ہے جس میں موعود نبی کو روح حق کے نام سے پکارا گیا ہے۔

۸۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو ستھری چیزیں حرام نہ ٹھیراؤ جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو اللہ

ع ۱۲ ۲ — عیسائیوں کی غلطیوں سے مسلمانوں کو تنبیہ

۸۸ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۞ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ

حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں رکھتا ۸۶۹ اور اس سے جو اللہ نے تم کو دیا ہے حلال اور ستھری چیزیں کھاؤ اور اللہ کا تقویٰ کرو جس کے

۸۹ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۞ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ

تم ایمان لاتے ہو اللہ تمہاری بے حقیقت قسموں پر تم پر گرفت نہیں کرتا لیکن اس پر گرفت کرتا ہے

بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا

جس پر تم قسم کو مضبوط کرو سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کا کھانا ہے درمیانہ کھانے سے جو

تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ

تم اپنے اہل کو کھلاتے ہو یا اُن کو لباس دینا یا گردن کا آزاد کرنا اور جو شخص نہ پائے تو تین دن کے روزے

اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ

رکھنا ہے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھالو اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو اس طرح

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۞

اللہ اپنی باتیں تمہارے لئے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر کرو ۸۷۰

اسلام اور رہبانیت

۸۶۹ رکوع سابق میں عیسائیوں کا اسلام کے قریب ہونا بیان کرتے ہوئے ان کے راہبوں وغیرہ کا محل مدح پر ذکر کیا تھا مگر چونکہ اسلام رہبانیت کو جائز نہیں ٹھہراتا اس لئے ساتھ ہی مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ تم نے اس قسم کی غلطیوں میں نہ پڑنا جن میں یہ عیسائی پڑے ہیں کہ انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے محبت نہیں کرتا جبتک کہ وہ خدا کی نعمتوں اور خدا کی طاقتوں کو ترک نہ کرے اسلئے فرمایا کہ جب ستھری چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حلال ٹھہرائی ہیں تو تم انکو حرام نہ کرو۔ مثلاً بیوی بچوں کے تعلقات کھانا پینا وغیرہ۔ جو عبادت میں حد مقررہ سے گزر جاتے ہیں وہ بھی غلو کرتے ہیں مگر اسلام غلو کو جائز نہیں رکھتا اسی لئے رسول اللہ صلعم نے فرمایا ما بال اقوام حرموا النساء والطعام والطیب والنوم ان قوموں کا کیا حال ہوگا جنہوں نے عورتوں کو اور کھانے کو اور خوشبو کو اور نیند کو حرام کر دیا اور اسکے آخر پر فرمایا کہ میری اُمت کی رہبانیت جہاد کرنا ہے۔ اور ایک حدیث میں فرمایا فمن رغب عن سنتی فلیس منی جو شخص میری سنت سے دوسری طرف مائل ہوتا ہے وہ مجھ سے نہیں۔ یہ پہلی آیت میں صاف عیسائی قوم کا نقشہ کھینچ کر مسلمانوں کو تنبیہ کیا ہے۔

عقد

۸۷۰ عقدتم۔ عَقْد کے معنی کسی چیز کی دو طرفوں کو اکٹھا کرنا یا گرہ دینا ہیں اور بہ استعارۃً بیع۔ عہد قسم وغیرہ کے موکد کرنے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ ٩٠

اے لوگو جو ایمان لائے ہو شراب اور جوا اور بت اور پاسے ناپاک کام

مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ ٩١

صرف شیطان کے عمل سے ہیں سو اس سے بچو تاکہ تم کامیاب ہو ؏ شیطان صرف یہ چاہتا ہے

پر عقد عقد۔ عاقد وغیرہ بولا جاتا ہو (غ) سورۃ بقرہ میں عقدتم الایمان کی جگہ جہاں مضمون یہی ہو کسبت قلوبکم فرمایا (البقرۃ ۲ - ۲۲۵) یعنی ٹھان کر یا ارادہ اور عہد سے ایک کام کا کرنا +

کفّارۃ کفّارۃ۔ کُفْر کے معنی چھپانا۔ اور کفّارۃ وہ ہو جو گناہ کو چھپاوے اسی سے قسم کا کفارہ ہو (غ) +

وسط۔ اوسط اوسط۔ وَسَط یا اَوْسَط کے معنی درمیان کی چیز ہیں ابن جریر کہتے ہیں یہاں وسط سے مراد قلت و کثرت میں وسط

مسکین کے کھانے کا اندازہ ہو اور وہ کہتے ہیں کہ کفارہ میں نبی کریم صلعم کی سنت اسی اندازے سے دینا تھا نہ لازمی طور پہ کھانا پکا کر کھلانا اور دیا وہ سے زیادہ اندازہ جو نبی کریم صلعم نے حکم دیا ہو نصف صاع یا دو مُد فی مسکین ہو اور کم سے کم ایک مد جو ؍ چھٹانک ہو +

تحریر رقبۃ تحریر۔ ایک انسان کا آزاد کر دینا رقبۃ کیلئے دیکھو ۲۱۵ چونکہ قیدی جب پکڑا جاتا تھا تو اس کے ہاتھ گردن کیساتھ باندھ دئے جاتے تھے اسلئے رقبۃ جو گردن کے معنی میں ہو غلام پہ بولا جانے لگا (ج) +

حلف حلفتم۔ حَلِفٌ اصل میں وہ قسم تھی جو ایک دوسرے سے عہد کے وقت لی جاتی تھی پھر ہر قسم پہ بولا جانے لگا اسی لئے حلیف وہ ہو جس سے عہد کیا ہو (غ) +

قسم کا کفارہ لغو قسم کے معنی پہلے گزر چکے ہیں دیکھو ۲۲۵ یہاں اس کا ذکر اسلئے کیا کہ بسا اوقات لوگ بلا ارادہ قسم کھا کر ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ خدا کی قسم میں فلاں چیز نہیں کھاؤں گا وغیرہ۔ ہاں جب انسان پختہ طور پر اور پورا عزم کر کے ایک قسم کھائے تو پھر کفارہ دینا چاہئے۔ مگر قسم کے کفارہ کے یہ معنی نہیں کہ انسان ایک جائز عہد کرکے اس پر قسم کھا لیتا ہو تو کفارہ دیکر اس کو بھی توڑ دے اس کا توڑنا تو کسی صورت میں جائز نہیں بلکہ قسم کی حفاظت کرنی ضروری ہو۔ ہاں قسم کھا کر ایک جائز چیز کو اپنے لئے ناجائز کہدیا تو ایسی قسم کا کفارہ دے۔ کیونکہ جائز کا ناجائز کرنا خلاف حکم

حفاظت قسم خداوندی ہو۔ قسموں کی حفاظت سے مراد یہ بھی ہو کہ قسم کو توڑو نہیں۔ اور یہ بھی مراد ہو کہ قسم کم کھاؤ +

رِجس ۸۷ا رجس۔ پلیدی یا ناپاکی۔ جسے انسان کی طبیعت پلید قرار دے یا عقل یا شریعت (غ) خمر اور میسر آخری دو لحاظ سے رجس ہیں۔ ایسا ہی انصاب و ازلام +

شراب اور بت پرستی انصاب اور ازلام کا ذکر پہلے شروع سورت میں بھی آیا ہو۔ انصاب سے مراد وہ پتھر ہیں جن کی عبادت کرتے تھے اور ازلام سے مراد ان تیروں کے ذریعہ سے فال کا نکالنا جن پر لا نعم وغیرہ لکھا ہوتا تھا۔ دیکھو ۳ چنانچہ حدیث کے الفاظ میں شارب الخمر کعابد الوثن اسی طرف اشارہ ہو یعنی شراب کا پینے والا بتوں کے پوجنے والے کی طرح ہو۔ بت پرستی کو شراب کے ساتھ ممنوع ٹھہرا کر بتایا ہو کہ مسلمان کو شراب سے ایسا ہی بچنا لازمی ہو جیسے بت پرستی سے +

عیسائیوں کا حرام کو حلال بنا لینا یہ چیزیں تو پہلے حرام کی جا چکی ہیں یہاں دوبارہ یہ اشارہ کیا ہو کہ وہ عیسائی جنہوں نے ایک وقت رہبانیت اختیار کر کے حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر دیا۔ ایک دوسرا وقت آنے والا ہو کہ اس قدر دنیا میں غرق اور خدا سے دور ہونگے کہ حرام کو بھی حلال کر لینگے اسلئے مسلمانوں کو شراب اور جوئے سے بالخصوص روکا ہو۔ گو بتوں اور فال کے تیروں کا

أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ

کہ تمہارے درمیان شراب اور جوے کی وجہ سے عداوت اور بغض ڈال دے اور تم کو اللہ کے ذکر سے

۹۲ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ○ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ

اور نماز سے روک دے سو تم ضرور ان باتوں سے رک جاؤ گے ۸۷۲ اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور

۹۳ احْذَرُوا فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ○ لَيْسَ عَلَى

محتاط رہو پھر اگر تم پھر جاؤ تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے ان لوگوں پر

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوا وَّآمَنُوا وَعَمِلُوا

جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے کوئی گناہ نہیں اس بارہ میں جو وہ کھائیں جب کہ وہ تقویٰ کریں اور ایمان لائیں اور اچھے

الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوا وَّآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوا وَّأَحْسَنُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ○

عمل کریں پھر تقویٰ کریں اور مان لیں پھر تقویٰ کریں اور احسان کریں اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ۸۷۳

بھی ساتھ ذکر کیا ہے مگر اگلی آیت میں صرف شراب اور جوئے کے نقصانات کو بیان کر کے بتا دیا ہے کہ اصل غرض انہی سے روکنا ہے صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ اس آیت کے نزول پر حرمت شراب کی عام منادی کرائی گئی۔ تو اسی وقت مدینہ کی گلیوں میں تمام کی تمام شراب بہا دی گئی۔ دیکھو ۲۸۱ ۔

۸۷۲ جن قوموں نے شراب اور جوئے میں ترقی کی ہے۔ اللہ کے نام تک کو بھول گئی ہیں ذکر تو ایک طرف رہا اور بظاہر نقصان یہ بھی ہے کہ شراب اور جوئے سے باہم عداوت اور بغض پیدا ہوتا ہے جس کا یورپ آج کھلا نقشہ دکھا رہا ہے۔ اس مقابلہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ وہ سرور جس کو شراب خوار شراب میں تلاش کرتا ہے۔ وہ اللہ کے ذکر میں ہی میسر آ سکتا ہے ۔

۸۷۳ اس آیت سے عموماً مراد یہ لی گئی ہے کہ جو لوگ تحریم خمر سے پہلے وفات پا گئے ان پر کوئی گناہ نہیں مگر بلا ضرورت ہے کیونکہ تو اور بیسیوں احکام ہیں جن کے نازل ہونے سے پہلے بعض مسلمان فوت ہو گئے وہ ان پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے زیر مواخذہ نہ تھے جو اس حکم کی ضرورت پڑتی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تقویٰ کریں تو حرج نہیں کہ اتنی تھوڑی سی شراب پی لیں جس سے عداوت اور بغض پیدا نہ ہو۔ یہ بھی خوب تقویٰ ہے۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت گئی۔ جب شراب کو رجس قرار دیا۔ جب اس کو بت پرستی کے ساتھ ملا کر اس کی حرمت کو بیان کیا۔ جب صاف کہدیا کہ اس سے بچو۔ تو تقویٰ اور شرابخوری ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے ۔

مراد اس آیت سے کیا ہے؟ اوپر حلال چیزوں کو حرام کرنے والوں کا ذکر تھا۔ اسلئے یہاں فرمایا کہ کھانے پینے سے انسان گنہگار نہیں ہوتا جو ان چیزوں کا ترک کرنا بھی تقرب الی اللہ میں داخل ہو۔ چنانچہ سلف میں سے بھی بعض اس طرف گئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی جنہوں نے اپنے لئے گوشت حرام کر لیا تھا اور رہبانہ طریق اختیار کرنا چاہتے تھے۔ سو یہاں ایسے لوگوں کی غلطی کو بھی ظاہر کر دیا۔ ہاں قرب الٰہی کو حاصل کرنے کی راہ بھی ساتھ ہی

ع حرمت خانہ کعبہ

۹۴ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کچھ شکار کے متعلق تمہیں ضرور آزمائے گا جس کو تمہارے ہاتھ اور

رِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ

تمہارے نیزے پہنچ سکتے ہیں تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس کو غیب میں ڈرتا ہے سو جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے اُس کے لئے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ ۹۵

دردناک عذاب ہے[۷۴۳] اے لوگو جو ایمان لائے ہو شکار کو نہ مارو جب تم حالت احرام میں ہو اور جو کوئی تم میں سے

مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ

ہو جان بوجھ کر مارے تو (اس کا) بدلہ چارپایوں سے اس کا مثل ہو جو مارا ہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عدل والے کریں۔

هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ

یہ قربانی کعبہ پہنچنے والی ہو یا کفارہ ہے مسکینوں کا کھانا ۔

تقویٰ کے تین مراتب

بتادی۔ اور اس میں تقویٰ کے تین مراتب بھی بیان کر دیئے۔ پہلا مرتبہ یہ ہو کہ ایمان لائے اور اچھے کام کرے۔ دوسرا مرتبہ تقویٰ کا یہ ہو کہ تمام باتوں کو مان لے اور کسی پر اس کے دل میں خلش پیدا نہ ہو یعنی سب احکام الٰہی کی فرمانبرداری اختیار کرے اور تیسرا مرتبہ تقویٰ کا یہ ہو کہ مخلوق خدا کے ساتھ احسان کرے۔ رہبانیت میں زیادہ سے زیادہ پہلا مرتبہ تقویٰ کا آسکتا ہو کہ ایمان لاکر کچھ اچھے کام کرلئے مگر کل احکام الٰہی کی فرمانبرداری راہب کیونکر کرسکتا ہو۔ پھر اس آخری مرتبہ مخلوق خدا کے ساتھ احسان کو وہ کیونکر پاسکتا ہو۔ مسلم ترمذی نسائی میں ایک حدیث ہو جو اسی معنی کی موید ہو حضرت ابن مسعود سے ہو کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھے کہا گیا ہے کہ تو بھی ان میں سے ہو۔ یعنی یہ تینوں مراتب تقویٰ تم میں پائے جاتے ہیں +

عیسائیت کے ذکر میں حرمت کعبہ کا ذکر

[۷۴۳] اس رکوع میں ذکر خانہ کعبہ کی عزت و حرمت کا ہو۔ اسی کے متعلق یہ احکام شکار بھی ہیں۔ اس مضمون کو بھی عیسائیت کے ذکر سے خاص تعلق ہو نبی کریم صلعم کی پیدایش کے سال میں ایک عیسائی بادشاہ نے خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کا ذکر سورۃ فیل میں ہو۔ پھر آخری زمانہ میں غلبۂ عیسائیت کی صریح پیشگوئیاں قرآن شریف اور حدیث میں موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ عیسائیت کے غلبہ سے خانہ کعبہ کی حفاظت کا سوال پھر پیدا ہوتا ہو اسلئے عیسائی مذہب کے ذکر میں اسکا ذکر کیا ہے خانہ کعبہ کی حرمت کو اس قدر بلند مقام پر رکھا ہو کہ حالت احرام میں شکار کو بھی منع کر دیا ہو۔ علاوہ ازیں ایسے موقعہ پر جب آدمیوں کا اس قدر اجتماع ہو شکار کھیلنا ویسے بھی نقصانِ جان کا موجب ہوسکتا ہو +

ہاتھوں کے پہنچنے سے مراد جال وغیرہ سے شکار کا پکڑنا ہو اور یہ مراد نہیں کہ انسان اپنے ہاتھ سے ہی پکڑے۔ اور نیزے کے شکار سے مراد ایسا شکار ہو جو اسے زخمی کر کے حاصل کیا جائے۔ تیر و بندوق بھی اس میں آجائینگے۔ مجاہد کہتے ہیں پہلے سے مراد چھوٹا شکار دوسرے سے بڑا ہے (ج) +

اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ

یا اس کے برابر روزے رکھنا تاکہ اپنے کام کا برا نتیجہ چکھے۔ جو گذر گیا وہ اللہ نے معاف کر دیا اور جو پھر ایسا کرے

۹۶ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا

تو اللہ اس کو اس کی سزا دیگا اور اللہ غالب سزا دینے والا ہے ۸۶۵ تمہارے لئے دریا کا شکار اور اس کا طعام حلال کیا گیا ہے

لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ

تمہارے لئے اور مسافروں کے لئے سامان ہے ۸۶۶ اور تم پر خشکی کا شکار حرام کیا گیا ہے جب تک کہ تم حالت احرام میں ہو اور اللہ کا تقویٰ کرو جس کی

۹۷ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ

طرف تم اکٹھے کئے جاؤ گے اللہ نے کعبہ عزت والے گھر کو لوگوں کے لئے قائم رہنے اور رکھنے والا بنایا ہے اور حرمت

الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْۤا

والے مہینوں کو اور قربانیوں کو اور گانیوں والے جانوروں کو یہ اس لئے کہ تم جان لو

حالت احرام میں شکار

۸۶۵ یہاں پہلی آیت کے حکم کی تصریح کر دی ہے اور حالت احرام میں شکار کرنا منع کیا ہے۔ درندوں یا موذی جانوروں کو مارنا اس میں شامل نہیں ہے۔ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ایسی صورت میں سزا کیا ہے کسی جانور کی قربانی کعبہ میں جو مقتول جانور کی مثل ہو جس کا فیصلہ دو صاحب عدل کریں۔ صاحب عدل سے مراد ایسے لوگ ہیں جو فقاہت رکھتے ہوں۔ اور حقوق کا موازنہ کر سکتے ہوں۔ خاص حالات میں قربانی ہو یا مساکین کا کھانا یا روزے اور کس قدر یہ سب فیصلہ انہی دو آدمیوں پر چھوڑا ہے۔ قرآن کریم نے عموماً ایسے فیصلوں میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو رکھا ہے۔ یہاں بھی دو کو رکھا ہے۔ اور طلاق کے معاملہ میں بھی دو کو۔ منشا یہ ہے کہ دو آدمی ایک دوسرے سے آراء کا مقابلہ کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ ایک سے غلطی کا احتمال زیادہ ہو سکتا ہے۔ ججوں کے پنچ بٹھانا کوئی نیا خیال نہیں +

طعم۔طعام

۸۶۶ طعام۔ طَعِمَ کے معنی غذا کے طور پر کسی چیز کو لینا ہیں۔ اور طعام وہ چیز ہے جو اس طرح لی جائے (غ) مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ ابن عباسؓ ابن عمرؓ وغیرہم سے مروی ہے کہ صید وہ ہے جس کا شکار کر کے اسے مارا جائے اور طعام وہ ہے جسے دریا خود پھینک دے یا دریا کے پیچھے ہٹ جانے سے رہ جائے (ج) +

سیر۔سیارۃ

سیارۃ۔ سیر سے ہے زمین میں چلنا۔ اور جو جماعت زمین میں چلے اسے سیارۃ کہا جاتا ہے دجاءت سیارۃ (یوسف۔۱۹) +

آبی شکار کو مستثنیٰ کر دیا ہے۔ یعنی اس کا پکڑنا حالت احرام میں جائز ہے۔ دریا وغیرہ کے شکار میں اتلاف جان کا خطرہ نہیں +

أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ؀

کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

کعب ۸۶۶ الکعبۃ۔ کَعْب ٹخنے کو کہتے ہیں یعنی وہ ہڈیاں جو پنڈلی اور قدم کے درمیان اٹھی ہوئی ہیں۔ اور کَعَبَتِ الْجَارِیَۃُ اس لڑکی کے متعلق کہا جاتا ہے جس کے سینہ کا ابھار شروع ہو گیا ہو۔ اسی لحاظ سے کَعْب شرف اور علو کے معنی میں آتا ہے جیسے حدیث میں ہے لَا یَزَالُ کَعْبُكَ عَالِیًا جو دعائے شرف و علو ہے وکُلُّ شَیْءٍ عَلَا وَارْتَفَعَ فَهُوَ کَعْبٌ

کعبۃ یعنی ہر ایک چیز جو بلند اور مرتفع ہو وہ کَعْب ہے (ل) اور کعبۃ کو اس کے ارتفاع اور مربع ہونے کے لحاظ سے کعبہ کہا جاتا ہے (ل)۔ مگر اصل یہی ہے کہ یہ نام صرف اس کے علو اور ارتفاع کی وجہ سے ہے اور علو و ارتفاع سے مراد ظاہری بلندی نہیں بلکہ درجہ میں علو ہے۔ کیونکہ اس گھر کو ابتدا سے علو اور ارتفاع کا مرتبہ حاصل رہا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کعبہ اس کا نام بطور پیشگوئی کے رکھا گیا کہ اس کو دنیا میں علو اور ارتفاع حاصل ہوگا اور مربع ہونا کوئی خصوصیت نہیں جس کی وجہ پر یہ نام رکھا جاتا ۔

قیام قِیَامًا لِّلنَّاسِ۔ کسی چیز کے لئے قیام ہونا اس کی نگہداشت اور حفاظت کرنا ہے (غ) پس قیام للناس کے معنی ہوئے۔ لوگوں کی نگہداشت اور حفاظت کا ذریعہ اصمعی نے اس کے معنی کئے ہیں قائما یعنی خود قایم رہنے والا۔ یا کبھی منسوخ نہ ہونے والا (غ) یعنی نہ کبھی یہ برباد ہوگا اور نہ اس کے بعد کوئی اور دین دنیا میں قایم ہوگا کہ یہ منسوخ ہو جائے ۔

خانہ کعبہ کا دنیا کیلئے قیام ہونا اس آیت میں اصل مضمون کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ کعبہ کو خدا نے قیام بنایا ہے گویا یہ لوگوں کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ یہاں خاص اہل عرب کا ذکر نہیں کیا بلکہ سب لوگوں کیلئے قیام کہا ہے۔ اس لئے صرف اس قدر مراد نہیں ہو سکتی کہ عرب کے لوگوں کیلئے یہ معاش کا ذریعہ ہے۔ اس لئے کہ تجارت کا مرکز ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ جس طرح غذائیں جسمانی قیام کا موجب ہیں۔ اسی طرح خانہ کعبہ لوگوں کے روحانی قیام کا موجب ہے جس کے ذریعہ سے دنیا کے امور دینی کی اصلاح ہوئی اور یہ بالکل سچ ہے کہ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوتے تو توحید اور روحانیت کا نام دنیا سے مٹ جاتا۔ پس یوں خانہ کعبہ دنیا کی روحانی زندگی کا موجب ہو کر دنیا کے لئے قیام کا موجب ہو گیا۔ اور اسی لئے خانہ کعبہ کو بربادی سے بھی ہمیشہ کیلئے بچا پایا گیا۔ کیونکہ اس کو ظاہری نشان اس بات کا ٹھہرایا گیا کہ حق کبھی تباہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قیام اپنے دونوں معنوں کی رو سے خانہ کعبہ پر صادق آتا ہے۔ یہ ہمیشہ قایم رہیگا دنیا کی کوئی طاقت اسے برباد نہ کر سکے گی۔ اور جو روح اس سے پیدا ہوئی ہے وہ بھی کبھی برباد نہ ہوگی بلکہ دنیا کی زندگی کا موجب ثابت ہوگی ۔

حج بیت اللہ کا ہمیشہ قایم رہنا باقی تین چیزوں کا ذکر بھی یہی بتانے کو ہے کہ نہ صرف خانہ کعبہ ہی آخر دنیا تک قایم رہے گا بلکہ وہ چیزیں بھی جن کا اس سے تعلق ہے حرمت والے مہینے جن میں حج کیا جاتا ہے اور ہدی اور قلائد جن کی قربانی کی جاتی ہے پس مراد اس سے یہ ہے کہ اس کا حج بھی ہمیشہ ہوتا رہیگا اور اس کے حج کا بند ہونا لوگوں کی ہلاکت کی نشانی ہوگی۔ یہاں حاجیوں کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ ایام حج اور قربانیوں کا ذکر کر دیا ہے۔ جب ان کی بھی حفاظت ہوگی تو حاجیوں کی خود حفاظت ہوئی چنانچہ عطاء سے یہی معنی مروی ہیں کہ جبتک لوگ اس گھر کا حج کرتے رہینگے ہلاک نہیں ہونگے اور جب حج ترک ہو جائیگا تو ہلاک ہو جائیں گے ۔

کعبہ کے متعلق پیشگوئی اس کو بڑی عظیم الشان پیشگوئی قرار دیا ہے یعنی اس کی صداقت سے معلوم ہو جائیگا کہ اللہ تعالیٰ غیب کا جاننے والا ہے۔ ایسا دعویٰ کسی گھر کے متعلق دنیا میں نہیں کیا گیا۔ اور کیا عجیب بات ہے کہ باوجود ہزارہا قسم کے منصوبوں کے

۹۹ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ؕ﴿۹۸﴾ مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا

جان لو کہ اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے اور کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۸۷۸ پیغمبر پر سوائے پہنچا دینے کے

۱۰۰ الۡبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَ مَا تَکۡتُمُوۡنَ ﴿۹۹﴾ قُلۡ لَّا یَسۡتَوِی الۡخَبِیۡثُ وَ الطَّیِّبُ

کچھ نہیں اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو کہو ناپاک اور ستھرا برابر نہیں۔

وَ لَوۡ اَعۡجَبَکَ کَثۡرَۃُ الۡخَبِیۡثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

گو تمہیں ناپاک کی بہتات تعجب میں ڈالے سوائے عقل والو اللہ کا تقویٰ کرو تا کہ تم کامیاب ہو ۸۷۹

۱۰۱ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡ اَشۡیَآءَ اِنۡ تُبۡدَ لَکُمۡ تَسُؤۡکُمۡ ۚ وَ اِنۡ تَسۡـَٔلُوۡا

ع ۱۴

اے لوگو جو ایمان لائے ہو (بہت) چیزوں کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر تمہارے لئے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں تکلیف دیں اور اگر تم

عَنۡہَا حِیۡنَ یُنَزَّلُ الۡقُرۡاٰنُ تُبۡدَ لَکُمۡ ؕ عَفَا اللّٰہُ عَنۡہَا ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۱۰۱﴾

ایسے وقت میں اُنکے متعلق سوال کرو جب قرآن نازل کیا جا رہا ہے تو تمہارے لئے ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے اسے معاف کر دیا اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے ۸۸۰

اہم امور کی طرف توجہ کی ضرورت

کوئی شخص خانہ کعبہ کو نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ عیسائیوں پر یہ سب سے بڑھکر اتمام حجت ہے کیونکہ سب سے زیادہ طاقت ان کو دی گئی ہے اور سب سے بڑھکر زور بھی انہوں نے ہی لگایا ہے اشاعت مذہب کے ذریعہ سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی اس میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ طور پر تصرف حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس میں ناکام ہونگے۔

۸۷۸ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کعبہ کو نقصان پہنچانا چاہو گے تو اللہ کی طرف سے سخت سزا آئے گی۔ مگر اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے کتنی قصوروں سے درگزر بھی کرتا رہتا ہے +

۸۷۹ ناپاک کی کثرت اب بھی ایک عالم کو تعجب میں ڈالے ہوتے ہے مگر ناپاک اور طیب برابر نہیں۔ اور طیب آخرکار غالب آئیگا۔

چھوٹے چھوٹے سوالات کی ممانعت

۸۸۰ اس ساری سورت میں شریعت پر زور دیا ہے اور اس کی تفصیلات کو بیان کیا ہے۔ مگر قرآن کریم نے ہر جگہ افراط و تفریط کے پہلوؤں کو مدنظر رکھا ہے جس طرح پچھلے سے پچھلے رکوع میں عبادت میں غلو کو روکا اسی طرح یہاں تفصیلات شریعت میں غلو کو روکتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ تم بہت سوال نہ کیا کرو اللہ خود جن احکام کو انسانوں کی رہبری کے لئے ضروری سمجھتا ہے دیدیگا جس طرح شریعت کا نہ ہونا انسان کیلئے موجب تکلیف ہے۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے امور میں احکام شریعت موجب تکلیف ہو جاتے ہیں اسلامی شریعت نے اعتدال کا پہلو اختیار کیا ہے ضروری تفصیلات دے بھی دی ہیں مگر بہت سی باتوں کو چھوڑ بھی دیا ہے تاکہ اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے اور چونکہ احکام قرآنی میں تو تبدیلی ہو نہیں سکتی لیکن اجتہاد حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے اور بلاشبہ بہت سے تفصیلی امور میں تبدیلی حالات کے لحاظ سے تبدیلیٔ حکم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے یہی طریق احسن تھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں احکام قرآنی نہ دیئے جاتے اور ضروریات پیش آمدہ کے مطابق اجتہاد سے کام لیا جاتا۔ حدیثوں میں بھی آیا ہے کہ لوگ رسول اللہ صلعم سے چھوٹے چھوٹے سوالات کیا کرتے تھے جس پر آپ اظہار ناراضگی فرماتے وہ بھی اسی کا موید ہے +

قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ۝ مَا جَعَلَ اللَّهُ مِن بَحِيرَةٍ وَ ۱۰۲ ۱۰۳

تم سے پہلے ایک قوم نے ان (باتوں) کا سوال کیا پھر ان کا انکار کرنے والے ہو گئے ۸۸۱ اللہ نے نہ کوئی بحیرہ بنایا ہے اور

لَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ ۙ وَلَٰكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ

نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام۔ لیکن جو کافر ہوئے وہ اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں۔

وَأَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا ۱۰۴

اور اُن میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے ۸۸۲ اور جب اُن کو کہا جاتا ہے اس کی طرف آؤ جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں

حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا

ہمارے لئے وہ بس ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا کیا گو اُن کے بڑے نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ

يَهْتَدُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ ۱۰۵

ہدایت پر ہوں۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے آپ کی اصلاح کرو جو گمراہ ہوا وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا

عفا اللہ عنہا سے یہ مراد ہے کہ باوجود تمہارے ایسے سوالوں کے اللہ تعالیٰ نے تم پر مشقت نہیں ڈالی +

۸۸۱ پہلی قوم سے جب نام نہ لیا جائے عموماً بنی اسرائیل ہی مراد ہیں ان کی شریعت میں بہت سے چھوٹے چھوٹے امور کا ذکر ہے۔ شاید وہ ایسے سوال بھی کرتے ہوں اور ابن عباسؓ سے روایت ہے جیسے عیسائیوں نے مائدہ کا سوال کیا پھر ناشکری کی (ج)۔ +

بحر۔ بحیرۃ — ۸۸۲ بحیرۃ بحر سے ہے جس کے معنی شق کرنا ہیں جس اونٹنی کا کان چیرا جائے اسے بحیرۃ کہتے تھے۔ یعنی جب اونٹنی دس بچے جنتی اور آخری نر ہوتا تو اونٹنی کا کان چیر کر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا اور اس سے کسی قسم کا کام نہ لیا جاتا +

ساب۔ سائبۃ — سائبۃ۔ ساب سے ہے جس کے معنی ہیں زمین پر چلا۔ وہ اونٹنی جو نذر مان لینے کی وجہ سے یا دس مادہ بچے جننے کی وجہ سے آزاد چھوڑ دی جاتی اور کسی چارہ یا پانی سے اس کو نہ روکا جاتا +

وصل۔ وصیلۃ — وصیلۃ۔ وصل سے ہے جس کے معنی ملانا ہیں۔ اس کی بہت سی تشریحات کی گئی ہیں بعض کے نزدیک وہ بکری ہے جو سات دفعہ دو دو بچے جنے۔ آخری میں اگر ایک نر اور ایک مادہ ہو تو ماں کا دودھ صرف مرد پیتے۔ اور زجاج نے کہا ہے کہ وہ وہ بکری ہے جو نر جنتی تو دیوتاؤں پر چڑھایا جاتا لیکن اگر مادہ کے ساتھ نر ہوتا تو پھر اسے بچا لیا جاتا +

حمی حام — حام۔ حمی سے ہے محفوظ رکھنا۔ وہ نر جس سے سواری کا کام نہ لیا جائے۔ عموماً ایسے نر جن کی نسل کی نسل شروع ہوتی یا دس بچے ایک مادہ سے ہو جاتے ان سے پھر سواری کا کام نہ لیتے تھے +

مشرکانہ رسوم سے بچنے کی تاکید — یہ تمام رسوم شرک سے تعلق رکھتی تھیں۔ گویا بتا دیا کہ گو تفصیلات شریعت میں آزادی بھی بہت دی ہے مگر شرک چونکہ سب بدیوں کی جڑ ہے اس لئے اس کے متعلق ہر قسم کی رسوم جڑ سے کاٹنی ضروری ہیں۔ مسلمان غور کریں کہ مشرکانہ رسوم سے اللہ تعالیٰ نے کس قدر بچنے کی تاکید فرمائی ہے اور ان کے گھروں میں کس طرح مشرکانہ رسوم جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں +

إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ يَا أَيُّهَا ١٠٦

جب تم ہدایت پر ہو۔ تم سب نے اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے سو وہ تم کو اس کی خبر دیگا جو تم کرتے تھے ۸۸۳ اے

الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ

لوگو جو ایمان لائے ہو تمہاری آپس میں گواہی وصیت کے وقت جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آموجود ہو

اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ

دو اپنے میں سے صاحب عدل لوگوں کی ہو یا کوئی اور دو تمہارے غیر میں سے اگر تم زمین میں سفر کر رہے ہو

فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُونَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ

پھر تمکو موت کی مصیبت پہنچے ان دونوں کو تم دعا کے بعد روک لو پس اگر تم کو شک ہو تو وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں

لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَمِنَ الْآثِمِينَ ۝

کہ ہم اسکے عوض کچھ قیمت نہ لیں گے گو وہ قریبی ہو اور ہم اللہ کی شہادت کو نہ چھپائیں گے بیشک اس صورت میں ہم گنہگاروں میں سے ہونگے ۸۸۴

ضال قوم کی کثرت کے وقت علاج

۸۸۳ ابن عمر سے روایت ہے کہ یہ آیت ان قوموں کیلئے ہے جو بعد میں آنیوالی ہیں ابن مسعود کہتے ہیں کہ یہ آخری زمانہ کیلئے ہے (درمنثور) اور یہی بات حق بھی معلوم ہوتی ہے۔ لایضرکم من ضل میں بتا دیا ہے کہ جب ضالین کی کثرت ہو تو یہ ست گمان کرو کہ وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں بشرطیکہ تم خود ہدایت پر قایم ہو۔ اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انکو ہدایت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہدایت پر ہونیکا ایک جزو لازم ہے کہ دوسروں کو ہدایت کی طرف بلاؤ وتواصوا بالحق (العصر ۳) بلکہ ہدایت کیطرف بلانے میں تکلیفیں اٹھانے وتواصوا بالصبر (العصر ۳) پس یہ آیت مسلمانوں کو یہ نہیں بتاتی کہ جب چاروں طرف ضلالت پھیلی ہوئی دیکھو تو تم اپنی ہی فکر کرو دوسروں کو دین کیطرف نہ بلاؤ۔ بلکہ یہ مسلمانوں کی ایک گری ہوئی حالت کا نقشہ کھینچا ہے جب ضالین ان کے چاروں طرف ہونگے اور انکو بتایا ہے کہ تم کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ دوسروں کی وجہ سے نہیں۔ تم اپنی فکر کرو اپنے حالات کو درست کرو۔ خود ہدایت پر قایم ہو جاؤ پھر تم کو کوئی ضال نقصان نہیں پہنچا سکتا کاش آج مسلمان اس پر توجہ کریں اور بجائے دوسروں کا رونا رونیکے پہلے اپنی حالت کی اصلاح کریں نبی کریم صلعم سے جو تفسیر اس آیت کی ایک حدیث میں آئی ہے وہ بھی یہی بتاتی ہے ترمذی میں ہے آپ نے فرمایا مُرُوا بالمعروف وتناهوا عن المنكر حتى اذا رايتم شحا مطاعا وهوى متبعا واعجاب كل ذي راي برايه فعليكم انفسكم لا يضركم ضلال غيركم یعنی نیک باتوں کا حکم کرو اور بری باتوں سے رکو پھر جب تم دیکھو کہ بخل کی اطاعت کیجاتی ہے اور حرص وہوا کی پیروی کی جاتی ہے اور ہر ایک شخص اپنی رائے پر خوش ہے تو تم اپنی جانوں کی فکر کرو غیروں کی ضلالت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی اس حدیث کے آخر میں بھی ایسے الفاظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری زمانہ کیلئے ہے۔ اور مسند احمد میں حضرت ابوبکر سے روایت ہے کہ آپ نے خطبہ میں فرمایا کہ تم اس آیت سے غلط مطلب نکالتے ہو میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے فرماتے تھے کہ جب بری بات کو دیکھکر لوگوں کو اس سے نہیں روکینگے اللہ تعالیٰ ان پر ایسی سزا بھیجے گا جو سب کو شامل ہوگی (درمنثور)۔ ایک معنی یہ بھی کئے گئے ہیں احفظوها والزموا صلاحها یعنی اپنی حفاظت کرو اور اپنی اصلاح کرو یعنی ایک دوسرے کو امر دینی کے احکام سناؤ۔

۸۸۴ کہا جاتا ہے کہ یہ آیت تمیم داری اور اسکے بھائی عدی کے بارہ میں نازل ہوئی مگر لکھنا یوں چاہئے کہ وہ قصہ بھی اس آیت

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ ۱۰۷

پھر اگر اطلاع مل جائے کہ اُن دونوں نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو دو اور اُن دونوں کی جگہ کھڑے ہو جائیں اُن لوگوں میں سے جن کے خلاف وہ پہلے دو گناہ کا استحقاق کر چکے ہیں

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى ۱۰۸

پھر اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی اُن دونوں کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم حد سے نہیں بڑھتے بیشک اس صورت میں ہم ظالموں میں سے ہوں گے ۸۸۵ یہ بہت

اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۭ وَ

قریب طریق ہے کہ وہ شہادت کو سچ سچ ادا کریں یا ڈریں کہ ان کی قسموں کے بعد اور قسمیں لوٹائی جائیں گی اور

اتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

اللہ کا تقویٰ کرو اور سنو اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۸۸۶

کے ماتحت آتا ہے۔ اور آیت عام ہے۔ اس آیت میں وصیت کے متعلق شہادت کا حکم ہے۔ اسکے یہاں لانے کی یہ وجہ ہے کہ جب چھوٹے چھوٹے سوالات سے روکا تو اب خود ہی یہ بھی بتا دیا کہ ضروری احکام کو قرآن شریف نے خود بیان کر دیا ہے ایک طرف شرک کے متعلق ہر قسم کے رواجات کو روکا تو دوسری طرف حفاظت مال کے قوانین کی بھی ضروری تفصیلات کو بیان کر دیا یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وصیت کا حکم جو سورۃ بقرہ میں ہے وہ کبھی منسوخ نہیں ہوا۔ کیونکہ اس آیت کا نزول آیت توریث سے بہت بعد کا ہے۔

غیر مسلم کی گواہی اٰخران من غیرکم میں گواہی اپنوں کی یعنی مسلمانوں کی بھی جائز رکھی ہے۔ اور غیروں کی یعنی غیر مسلموں کی بھی اور یہ جو فرمایا ان انتم ضربتم فی الارض یعنی سفر کی حالت میں ہو تو یہاں صرف ایک سخت ضرورت کی حالت کو بیان کیا ہے۔ یہ شرط نہیں کہ اسکے سوائے گواہ یا وصیت نہ ہوں تحبسونهما میں جو روکنے کا ذکر ہے وہ شہادت لینے کے وقت ہے۔ نماز کے بعد اسلئے کہا کہ نماز میں انسان

صلوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور یہ معاملہ ایک مشکوک شہادت کا ہے حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ صلوٰۃ سے مراد ہر ایک اہل دین کی اپنی اپنی صلوٰۃ ہے یعنی اگر گواہ عیسائی ہوں تو ان کے مذہب کی صلوٰۃ کے بعد بس یہاں مراد صلوٰۃ سے مطلق دعا ہی لینا چاہئے ؛

عثر ۸۸۵ عثر۔ عَثَرَ الرجلُ کے معنی ہیں وہ گر گیا پھر اس کا استعمال اس پر ہوتا ہے جو بغیر طلب کرنیکے کسی امر پر اطلاع پائے (رغ)

استحق استحقا۔ اِسْتَحَقَّ الشیَٔ کے معنی ہیں اِسْتَوْجَبَهٗ یعنی اسے واجب کر لیا (ل) پس استحقا اثما سے مراد ہوئی کہ انہوں نے گناہ کو اپنے اوپر واجب کر لیا ہے یعنی گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور الذین استحق علیہم الاولین میں اولیٰن استحق کا فاعل ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے یعنی اثم جو ابھی آچکا ہے۔ اور علیہم سے مراد ان کے خلاف ہے پس جملہ کے معنی یوں ہوئے کہ دو اور گواہ ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جنکے خلاف پہلے دو نے ارتکاب جرم کیا ہے یعنی وارثان میت سے ؛

یہاں یہ بتایا ہے کہ گواہوں کی گواہی جب اسکے خلاف قرائن ہوں دوسرے گواہوں سے رد کی جا سکتی ہے یہ نہیں کہ جھوٹے گواہوں کی گواہی کا کوئی علاج نہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے گواہوں کے جھوٹ بولنے پر کوئی قرینہ ہے۔ تو وہ لوگ جو مال کے حقدار ہیں ان کے خلاف گواہ پیش کر سکتے ہیں ؛

علیٰ وجہھا ۸۸۶ شہادت کے علیٰ وجہھا ادا کرنے سے مراد اس کا سچ سچ ادا کرنا ہے۔ اس قانون کے ماتحت ہر گواہ کو یہ فکر ہوگی

ع ۱۵ / ۵ — عیسائیوں کا لذات دنیوی میں انہماک

۱۰۹ یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ

جس دن اللہ پیغمبروں کو جمع کریگا اور کہیگا تمہیں کس طرح قبول کیا گیا کہیں گے ہمیں کوئی علم نہیں تو ہی

۱۱۰ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۝ اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَعَلٰی

غیب کی باتوں کا جاننے والا ہی ۸۸۸ جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم میری نعمت کو یاد کر جو میں نے تجھ پر اور تیری

نصف

وَالِدَتِکَ ۘ اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۟ تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَکَهْلًا ۚ

ماں پر کی، جب میں نے روح القدس کے ساتھ تیری تائید کی تو لوگوں سے پنگوڑے میں اور بڑھاپے میں باتیں کرتا تھا

وَاِذْ عَلَّمْتُکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ

اور جب میں نے تجھے کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل سکھائی اور جب تو میرے حکم سے مٹی کو

کَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَکُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَکْمَهَ

پرندکی صورت کی مانند اندازہ کرتا پھر اس میں پھونکتا سو وہ میرے حکم سے اڑنے والا ہو جاتا اور تو شبکور اور برص کو میرے حکم

وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی بِاِذْنِیْ ۚ

سے اچھا کرتا اور جب تو میرے حکم سے مردوں کو نکالتا

کہ اس کی گواہی اگر وہ جھوٹ بولے تو رد بھی ہو سکتی ہو قسموں کے لوٹائے جانے سے مراد قسموں کا دوسروں کی طرف لوٹانا ہو یعنی اور گواہ بلائے جائیں گے ۔

رسولوں سے انکی قبولیت کا سوال اور اس سے مراد

۸۸۷ ماذا اجبتم ۔ اجابت کے معنی قبول کرنا ہیں جیسے اجیبوا داعی اللہ (الاحقاف ۴۶ - ۳۱) پس یہاں معنی ہیں بای اجابة اجبتم کس قسم کی قبولیت سے تمہیں قبول کیا گیا ۔ اور جواب دینا مراد نہیں ورنہ ماذا کی جگہ بماذا ہوتا ۔

اس رکوع میں اصل غرض تو عیسائیوں کا انہماک لذات دنیوی کا بیان کرنا ہی لیکن اس کا آغاز ایک عام بیان سے کیا ہی کہ قیامت کے دن سب رسولوں سے پوچھا جائیگا کہ تمہاری قبولیت جو تمہارے پیروؤں نے کی کس رنگ میں کی تھی یعنی آیا ان کے مدنظر رضائے الٰہی تھی یا دنیا کی طرف جھک گئے اور حق کو چھوڑ دیا اگلے رکوع میں یہی عام سوال خصوصیت سے حضرت عیسیٰ سے کیا ہی ۔ یہاں بھی سوال کی اصل غرض عیسائیوں کی حالت کی طرف توجہ دلانا ہی ۔ جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے جو حضرت عیسیٰ کو قبول تو یہاں تک کرتے ہیں کہ غلو کرکے بشر سے خدا بنا دیا مگر زندگی کی غرض صرف دنیا اور اس کی لذات کا حصول ہی اور سوال مائدہ میں بھی اسی طرف توجہ دلائی ہی ۔ یہی وجہ ہی کہ رسولوں کا جواب ہے کہ ہمیں کوئی علم نہیں ۔ کیونکہ جو کچھ ان کی امتوں نے ان کے بعد کیا اس کا علم صرف علام الغیوب کی ذات کو ہی ہو سکتا ہی اور یہ سوال محض پیغمبروں کی امتوں پر بطور اتمام حجت ہی کہ انبیاء ان میں کس غرض کیلئے آئے تھے اور ان کا قدم کدھر جا رہا ہی ۔ اگلا رکوع اسی کی مزید تشریح کرتا ہی ۔ اور خود اس رکوع کی آیت ۱۱۱ و ۱۱۲ بھی یہی بتاتی ہیں ۔

وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا جب تو ان کے پاس دلائل لیکر آیا تو جو ان میں سے کافر تھے انہوں نے کہا

مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا ١١١

یہ صرف کھلا دھوکا ہے ۸۸۸ اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے

بِىْ وَبِرَسُوْلِىْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ○ الربع.

رسول پر ایمان لاؤ انہوں نے کہا ہم ایمان لائے اور گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہیں ۸۸۹

کف — حضرت عیسیٰ سے دشمنوں کو روکنے کے معنی

۸۸۸ کففت۔ کَفّ کے اصل معنی ہاتھ سے یعنی کف سے روکنا ہیں پھر عام ہوگیا ہے یعنی کسی طرح پر روکنا (غ) اس لفظ کے استعمال سے بھی یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر چلے گئے کیونکہ بنی اسرائیل کو روکنا بتاتا ہے کہ وہ انکو پکڑ نہیں سکے اور نہ ان کو ہاتھ لگا سکے یہ استدلال بہت ہی عجیب ہے گویا سب پیغمبروں کو تو ان کے دشمن ایذائیں پہنچاتے رہے مگر حضرت عیسٰے کچھ ایسے نرالے رسول تھے کہ کسی دشمن کا ہاتھ بھی ان کو نہ چھو سکا یعنی اسرائیل کو روکنے کا منشا تو صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے منصوبہ میں جو حضرت عیسیٰ کے خلاف کیا کامیاب نہ ہو سکے۔ ورنہ جو حالات دشمنوں سے سخت ترین تکلیفیں اٹھانے کے اوروں کو پیش آئے وہ حضرت عیسیٰ کو بھی آئے۔ باوجود وعدہ یعصمک من الناس کے اگر آنحضرت صلعم زخم کھا کر گر جاتے ہیں اور مشہور ہو جاتا ہے کہ محمد صلعم قتل ہوگئے اگر ایک یہودی عورت آپ کو زہر دے سکتی ہے تو کففت میں کوئی نقص واقع نہیں ہو سکتا اگر یہودی مسیح کو پکڑ کر صلیب پے لٹکا دیں مگر اللہ تعالیٰ آپکی جان بچالے۔

انبیاء کو ساحر کہنے کی وجہ

سحر۔ سِحْر کے معنی کے لئے دیکھو ۱۲۹ کفار انبیاء کو ساحر ہی کہتے رہے ہیں حضرت موسیٰ کے متعلق آتا ہے یا یہ الساحر (الزخرف ۴۳-۴۹) اور آنحضرت صلعم کو بھی ساحر کہتے تھے۔ چنانچہ سورۃ یونس کے شروع میں ہے کہ لوگوں کو اس پر کیوں تعجب ہوتا ہے کہ ہم نے ایک شخص کی طرف وحی کی ہے کہ بدکرداروں کو ڈرائے اور نیکوں کو خوشخبری دے اور جب رسول پیغام دیتا ہے تو کافر کہتے ہیں ان هذا لسحر مبین (یونس ۱-۲) امام راغب نے سِحْر کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کبھی کسی فعل کو اس کے حسن کی وجہ سے سحر کہا جاتا ہے جیسے ان من البیان لسحرا ہیں اور کبھی اس کے فعل کی دقت یعنی باریکی کے لحاظ سے ایک چیز کو سحر کہا جاتا ہے جیسے غذا کو اس کی باریک اور لطیف تاثیر کی وجہ سے سِحْر کہدیا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں بھی یہی دو باتیں ہوتی ہیں ایک طرف اس کا حسن اور دلکشی کہ طبائع سلیمہ مجبور ہو کر اس کی طرف کھنچی چلی جاتی ہیں اور ان کا اثر بھی بہت باریک اور لطیف ہوتا ہے پس یہی وجہ ہے کہ کفار انبیاء کو ساحر کہتے رہے اور اسی لئے یہودیوں نے بھی حضرت عیسیٰ کے کاموں کو سحر کہا۔

باقی تمام امور پر مفصل بحث سورۃ آل عمران میں گزر چکی ہے یہاں ان کو اس غرض کیلئے بیان کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کا اصل مقصد تو روحانی مردوں کو زندہ کرنا۔ روحانی بیماروں کو شفا دینا۔ اور مستعد فطرتوں کو زمینی خیالات سے بلند کر کے روحانیات کی بلندیوں میں پرواز کرانا تھا۔ مگر ان لوگوں نے روحانی امور کو بھی جسمانی خیال کیا اور پستی کی طرف جھک گئے۔

غیر نبی کی طرف وحی

۸۸۹ وحی کے معنی کیلئے دیکھو ۶۹ حواریوں کی طرف وحی کرنا صاف بتاتا ہے کہ وحی غیر انبیاء کو بھی ہوتی ہے یہ خیال کہ حواری بھی نبی ہونگے بدیہی البطلان ہے۔ ان کی اصلاح کیلئے تو حضرت عیسیٰ مبعوث ہوئے۔ پھر آگے ان کا سوال کہ ہم پر مائدہ

۱۱۲ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا

جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم کیا تیرا رب طاقت رکھتا ہے کہ ہم پر آسمان سے

۱۱۳ مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ

کھانا نازل کرے (عیسیٰ نے) کہا اللہ کا تقویٰ کرو اگر تم مومن ہو ۸۹۰ انہوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ

نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ

اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل اطمینان پائیں اور ہم جان لیں کہ ضرور تو نے ہم سے سچ کہا ہے اور اس پر

۱۱۴ الشّٰهِدِيْنَ ۝ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ — الربع

گواہ ہو جائیں ۸۹۱ عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے اللہ ہمارے رب

تو ہم کو یقین آئیگا کہ تو ہم سے سچ بولتا ہے۔ صاف بتاتا ہے کہ وہ نبی نہ تھے۔ پس ان کی وحی انبیاء والی وحی نہ تھی اور باوجود اس وحی کے ان کو حضرت عیسیٰ کی صداقت پر یقین کامل نہیں ہوا +

استطاعۃ — ۸۹۰ یستطیع۔ استطاعۃ طاقت رکھنے کو کہتے ہیں لیکن بعض اہل لغت نے یستطیع بمعنی یطیع یا یجیب بھی لکھا ہے یعنی قبول کریگا +

میدـ مائدۃ — مائدۃ۔ مید سے ہے جس کے معنی کھانا دینا بھی آتے ہیں مادنی اَطعمنی (غ)، اور مائدۃ اس خوان کو کہا جاتا ہے جس پر کھانا ہو اور کھانے کو بھی کہا جاتا ہے (غ)، اور یہاں مراد کھانا ہے نہ خوان جیسا کہ عیداً لاولنا وآخرنا بتاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ مائدۃ سے یہاں مراد علم ہے اور علم کو مائدۃ اس لحاظ سے کہا کہ وہ قلوب کی غذا ہے (غ)، مگر یہ خیال حضرت عیسیٰ کے حالات کو مدنظر نہ رکھنے سے پیدا ہوا ہے +

حواریوں کی درخواست مائدۃ — یہ آیت اس رکوع کے اصل مضمون کی طرف توجہ کو پھیرتی ہے۔ باوجودیکہ حواریوں کو الہام بھی ہوا کہ وہ رسول پر ایمان لائیں مگر اس زمانہ کے یہودیوں کی حالت ایسی پست کی تھی کہ دنیوی آسایش کا خیال دل سے نہیں گیا۔ اور

حواریوں کی حالت ظاہری — حواری تھے بھی معمولی درجہ کے لوگ ماہی گیر، اور محصول لینے والے۔ اور ایسے لوگ عموماً بلند خیالات کے مالک نہیں ہوتے اس لئے کھانے کی درخواست کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کا جواب بڑا لطیف ہے۔ دعویٰ تو مومن ہونے کا کرتے ہو اور نبی مومنوں کو تقویٰ کی راہوں پر چلانے آتا ہے نہ جسمانی خواہشات کو پورا کرنے کیلئے پس تم بھی مومن ہو تو تقویٰ کی راہوں پر چلو جو میری بعثت کی غرض ہے +

حواریوں کی حالت روحانی — ۸۹۱ ان الفاظ سے حواریوں کی اصل حالت کا اندازہ لگتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بار بار شکایت کرتے ہیں جیسا کہ اناجیل میں ہے کہ تم میں ایمان نہیں۔ اور اگر تم میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہوتا تو تم یوں کہتے اور وہ ہو جاتا اور کبھی پطرس جیسے مقرب حواری کو شیطان کے نام سے یاد کرتے ہیں تو یہ بلا وجہ نہ تھا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ خواہشات دنیا کا ان پر غلبہ ہے۔ اور گو کچھ ترقی روحانیت میں کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں مگر پھر بھی کھانے پینے کے جسمانی خیالات پیچھا نہیں چھوڑتے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ دونوں کی قوموں کی حالت

اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً

ہم پر آسمان سے کھانا نازل کر وہ ہمارے لئے عید ہو ہمارے پہلوں کے لئے اور ہمارے پچھلوں کے لئے اور

مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ○ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ ۱۱۵

تیری طرف سے نشان ہو اور ہم کو رزق دے اور تو ہی بہتر رزق دینے والا ہی ۸۹۲ اللہ نے کہا میں اس کو تم پر اتارنے والا ہوں

کمزور نظر آتی ہی۔ اور ان کے بالمقابل نبی کریم صلعم کے صحابہ کا کمال روحانی ایک آفتاب کی طرح روشن ہی تعجب ہی کہ باوجود الہام کے ابھی تک ان کو یقین کامل نہیں کہ حضرت عیسیٰ ان سے جو کچھ کہتے ہیں سچ ہی۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہی کہ حضرت عیسیٰ سچ مچ قبروں سے مردے نکال کر زندہ کر دیا کرتے تھے۔ اور مٹی کی شکلیں بنا کر انکو سچ مچ کے پرند بنا دیتے تھے ان کے لئے بھی یہاں سبق ہی کہ اگر ایسے کھلے معجزات ہوئے ہوتے تو حواری حضرت مسیح کو سچا جاننے کیلئے ایک مائدہ کے اُترنے کے کیوں محتاج ہوتے۔ قبروں سے مردوں کا نکل آنا اور مٹی کی شکلوں کا پرند بن جانا تو مائدہ کے اُترنے سے بہت زیادہ کھلے معجزے ہیں۔ جو لوگ یہ دیکھ چکے ہوں وہ مائدہ کے محتاج نہیں ہو سکتے پس کم از کم قرآن کے نزدیک مردوں کے نکالنے وغیرہ معجزات سے ظاہری معنی ہرگز مراد نہیں +

عید ۸۹۲ عید عود سے ہی جس کے معنی لوٹ کر آنا ہیں۔ اور عید وہ ہی جو لوٹ لوٹ کر آئے اور خوشی کے دن کے ساتھ یہ لفظ مخصوص ہو گیا ہی۔ اور شریعت میں یوم الفطر اور یوم النحر سے مخصوص ہی (غ) +

حضرت عیسیٰ کی دعائے مائدہ — ایک مرتبہ نصیحت کر کے آخر حضرت عیسیٰ دعا کرتے ہیں اور اپنی قوم کی خواہش کو پورا کرتے ہیں جس طرح حضرت موسیٰ کو اپنی قوم کی خواہش ارنا اللہ جھرۃ کی وجہ سے یہ دعا کرنی پڑی رب ارنی انظر الیک۔ مگر بجائے مائدہ کے جو صرف حواریوں پر نازل ہو آپ ایسے مائدہ کی درخواست کرتے ہیں جو پہلوں اور پچھلوں کیلئے یکساں موجب سرور ہو۔ اس دعا کی قبولیت میں حالات موجودہ کچھ شک باقی نہیں رہنے دیتے۔ کھانے کے معاملہ میں عیسائیوں کے ہاں عید ہی عید ہی پہلوں اور پچھلوں میں فرق صرف یہ ہی کہ ان کو روٹی کے ساتھ کچھ فکر آخرت کی بھی تھی اب روٹی اور پیٹ کی پوجا ہی باقی رہ گئی ہی + ۔

آنحضرت کی اُمت کی روحانیت کا ذکر — مگر کیا یہ حالت رشک کے قابل ہی؟ ہمارے نبی کریم صلعم نے جو دعا اپنی اُمت کے برگزیدہ لوگوں کیلئے کی ہی وہ یہ ہی کہ اے خدا آل محمد کا رزق کفاف ہو یعنی اس قدر دنیا کے سامان میں انہماک نہ ہو کہ وہ آخرت کو بھول جائیں یہ دنیا کا حقیقی معلم روحانی ہی جس کو اپنی اُمت کی روح کی فکر ہے۔ اس چیز کی فکر ہی جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہی۔ مگر حضرت مسیح پر کچھ الزام نہیں جس قسم کا میلان قومی دیکھا اسی قسم کی دعا کی۔ اور وہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ ابھی روحانیت کو ضروری کمال دنیا میں حاصل نہ ہوا تھا اسلئے انبیاء اپنی اپنی قوم کی حالت کے مطابق ہی تعلیم دیتے تھے

مسیح وقتی تعلیم و معجزات — حضرت مسیح کے معجزات میں بھی کھانے پینے کا بہت ذکر ہی کہیں تھوڑی سی روٹیاں بہت لوگوں کو کفایت کرتی ہیں۔ (یوحنا ۶: ۱-۱۴)، تو کہیں اٹھارہ من پانی کی شراب بن جاتی ہی اور لوگ پی پی کر بدمست ہوتے ہیں (یوحنا ۲: ۱-۱۱)۔ اور اسی معجزہ کا اثر آج یورپ میں نمایاں ہی۔ دعا کرتے ہیں تو وہاں بھی روز کی روٹی کی دعا ہی سب پر مقدم کرتے ہیں" ہماری روزینہ کی روٹی آج ہم کو بخش"۔ (متی ۶: ۱۱) سو عیسائیوں کو روٹی بھی مل گئی اور شراب بھی مسلمان کی زندگی کا مقصد یہ ہی کہ وہ دنیا میں نیکی اور اخلاق کا معلم بنے۔ روٹیاں بھی خدا دیدیتا ہی۔ مگر سچ یہی ہی کہ انسانیت کا نصب العین کھانا پینا نہیں۔ پاکیزگی اور اخلاق ہیں۔ اتقوا اللہ ان کنتم مومنین +

فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝

پھر جو کوئی تم میں سے اس کے بعد ناشکری کرے تو میں یقیناً اسے ایسا عذاب دونگا کہ تمام جہان میں اور کسی کو ایسا عذاب نہیں دونگا ۹۹۳

ع ۱۶ — عیسائیوں کے ہول باطلہ مسیح کی تعلیم نہیں

۱۱۶ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ

اور جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا

اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِیْ

کے سوا دو معبود بنالو ۹۹۴ کہا تو پاک ہے مجھے کہاں شایاں تھا کہ میں وہ کہوں جس کا مجھے

بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا

حق نہیں اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے ضرور اس کا علم ہوتا تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو

فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝

تو مخفی رکھتا ہے۔ کیونکہ تو غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔ ۹۹۵

---

۹۹۳ یعنی دنیوی نعمتیں دی جائیں گی لیکن ان کی ناشکری کا نتیجہ بھی پھر ویسا ہی برا ہوگا عیسائی قوموں کے پاس دنیا کی دولت اور دنیا کی آسائشیں بہت جمع ہوگئی ہیں، اور دنیا کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ حد درجہ کی آسائش کے بعد مصائب کا دور شروع ہوتا ہے +

حضرت عیسیٰ سے عالم برزخ میں سوال

۹۹۴ یہ کلام عالم برزخ کا ہے۔ جو نزول قرآن سے پہلے ہو چکا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں اسی کی تفسیر میں حدیث ہے کہ قیامت کے دن نبی کریم صلعم اپنی اُمت کے بعض لوگوں کو دوزخ کی طرف جاتے دیکھینگے آگے لفظ ہیں فاقول کما قال العبد الصالح میں کہونگا جیسے عبد صالح یعنی عیسےٰ نے کہا۔ جہاں اپنے لئے صیغہ مضارع اور حضرت عیسیٰ کے لئے صیغہ ماضی استعمال کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے +

مریم کی الوہیت

حضرت عیسیٰ کا خدا بنانا تو ظاہر ہے۔ مریم کو بھی عیسائیوں کے بعض فرقوں نے صفات الوہیت دی ہیں چنانچہ رومن کیتھولک اس کے بت بنا کر ان کی پرستش کرتے ہیں "خدا کی ماں" اس کا خطاب ہی بتاتا ہے کہ اس کو کیا مرتبہ دیا گیا ہے اور انسائکلو پیڈیا برٹینیکا میں ہے کہ تھریس عرب وغیرہ مقامات میں بعض عورتیں مریم کو خدا کی طرح پوجتی تھیں۔ اور مریم سے دعاؤں کا مانگنا بھی جائز رکھا گیا ہے۔ گو قرآن شریف نے مریم کو کہیں تثلیث کا اقنوم ثالث کر کے بیان نہیں کیا مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر باپ بیٹے روح القدس کی بجائے تثلیث کے تین اقنوم ماں باپ اور بیٹا تجویز کئے جاتے تو بہت زیادہ موزوں تھا +

۹۹۵ پہلا جواب حضرت عیسیٰ نے یہ دیا ہے کہ میرے لئے یہ کہاں شایان تھا کہ میں ایسا کہتا مگر اس سے بھی پہلے کہا سبحانك یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات تمام عیوب سے پاک ہے اور اسکے ساتھ کوئی خدا یا معبود یا بیٹا بنانا اسکی صفات میں نقص پیدا کرتا ہے۔

ما فی نفسی

ما فی نفسی سے مراد ایسی باتیں ہیں جو انسان مخفی رکھے کیونکہ دل میں جو بات رکھی جائے وہ مخفی ہوتی ہے۔ ظاہر نہیں ہوتی۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ ۱۱۷

میں نے اُن کو کچھ نہیں کہا مگر وہی جس کا تونے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب اور تمہارا رب ہے ۸۹۶ اور میں

عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ

ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں تھا پھر جب تونے مجھے وفات دے دی تو تو ہی اُن پر

عَلَیْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ ۱۱۸

نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے ۸۹۷ اگر تو اُن کو عذاب دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں

اور اسی طرح مافی نفسک سے مراد وہ باتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ مخفی رکھے ان کا علم بندہ کو نہیں ہو سکتا۔

۸۹۶ یہ دوسرا جواب ہے کہ میں نے انہیں کیا کہا۔ وہ وہی تھا جو خدا نے حکم دیا یعنی یہ کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس اکیلے کی بندگی کر" دمتی ۴: ۱۰۔

حضرت عیسیٰ کا اقرار توحید اور تعلیم

۸۹۷ یہ تیسرا جواب ہے کہ نہ صرف میں نے تعلیم توحید کی دی بلکہ جبتک ان میں تھا تو ان پر گواہ بھی تھا یعنی دیکھتا رہا کہ وہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور میری عبادت نہیں کرتے۔ پس یوں تین طرح نفی کی اول یہ کہ یہ نبی کو شایان نہ تھا کہ ایسی تعلیم دیتا۔ دوسرے یہ کہ اس کے خلاف خدائے واحد کی عبادت کی تعلیم دی۔ تیسرے یہ کہ آپ کی زندگی میں وہ لوگ واقعی اس تعلیم پر قایم بھی رہے ہاں ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میری وفات کے بعد ان کی کیا حالت ہوگئی اس کو تو ہی جانتا ہے۔ مراد ظاہر ہے کہ غلط تعلیم میری وفات کے بعد ان میں پھیلی۔ جب تک میں ان میں تھا تب تک وہ صحیح تعلیم پر قایم تھے۔

وفات مسیح پر دلیل

یہ آیت حضرت مسیح کی وفات کو قطعی طور پر ثابت کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں عیسائیوں کا عقیدہ بگڑنے کا زمانہ حضرت مسیح کی وفات کے بعد کا قرار دیا ہے۔ اور چونکہ وہ عقیدہ نزول قرآن سے پہلے بگڑا ہوا تھا اس لئے حضرت عیسیٰ کی وفات بھی نزول قرآن سے پہلے ہو چکی تھی۔ رہے لفظ توفی کے معنی سو اس پر بحث ہو چکی ہے دیکھو ۴۲۲ علاوہ ازیں اس آیت کی جو تفسیر خود نبی صلعم سے مروی ہے۔ وہ بھی اس کا قطعی فیصلہ کرتی ہے۔ حدیث بخاری میں ہے کہ جب قیامت کے دن میری اُمت کے بعض لوگ پکڑ کر دوزخ کی طرف لیجائے جائینگے۔ اور اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ تو نہیں جانتا کہ تیرے بعد انہوں نے کیا کیا فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم۔ یعنی میں وہی بات کہونگا جو عیسےٰ نے کہی تھی اور میں ان پر گواہ تھا جبتک میں ان میں رہا پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو تو ہی ان پر نگہبان تھا۔ نبی کریم صلعم کا انہی الفاظ کو استعمال کرنا صاف بتاتا ہے کہ آپ کے نزدیک حضرت عیسیٰ کی اُمت بھی حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد بگڑی۔ اور اسی طرح آپ کی اُمت آپ کی وفات کے بعد بگڑے گی۔ اس قطعیۃ الدلالت آیت اور اس حدیث صحیح کے ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰ کی وفات کا انکار کرنا نصوص صریحہ کو رد کرنا ہے۔ اور توفیتنی کے معنی سوائے وفات کے کچھ اور کرنا لغت کے خلاف ہے۔ اور بخاری نے ابن عباسؓ کے اثر متوفیک ممیتک کو یہاں بیان کرکے بتا دیا ہے کہ توفیتنی کے معنی سوائے وفات دینے کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔

۱۱۹ وان تغفر لهم فانك انت العزيز الحكيم ۝ قال الله هذا يوم

اور اگر تو اُن کی حفاظت کرے تو بے شک تو غالب حکمت والا ہے ۸۹۸ اللہ نے کہا یہ وہ دن ہے

ينفع الصدقين صدقهم لهم جنت تجري من تحتها الانهر

کہ صادقوں کو ان کی سچائی نفع دے گی اُن کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں

خلدين فيها ابدا رضي الله عنهم ورضوا عنه ذلك الفوز

ہمیشہ انہی میں رہیں گے اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اُس سے راضی ہوئے یہ بھاری

۱۲۰ العظيم ۝ لله ملك السموت والارض وما فيهن وهو على كل شيء قدير ۝

کامیابی ہے ۸۹۹ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور جو کچھ اُن میں ہے اللہ کے لئے ہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۹۰۰

حضرت عیسیٰ کی دعائے مغفرتِ اُمت سے مراد

۸۹۸ یہاں حضرت عیسیٰ شرک کی معافی کے لئے سفارش نہیں کرتے بلکہ چونکہ یہ کلام عالم برزخ کا ہے جو نزول قرآن سے پہلے ہو چکا اس لئے تغفر لہم سے مراد ان کی حفاظت کر دینا ہے اور وہ حفاظت بذریعہ رسول کے ہے جو صحیح پیغام پہنچا کر ان کو ان کی غلطی پر متنبہ کرتا ہے اسی لئے آخری الفاظ انت الغفور الرحیم نہیں۔ حالانکہ سفارش معافی ہوتی تو یہی ہونے چاہیئے تھے۔ بلکہ انت العزیز الحکیم ہیں۔ جو حضرت ابراہیم نے بھی اس موقعہ پر بولے ہیں جہاں ایک رسول کی بعثت کیلئے دعا کی ہے ربنا وابعث فیھم رسولا منھم ..... انک انت العزیز الحکیم (البقرۃ ۲ - ۱۲۹) اور عزت یا غلبہ اور حکمت کی صفات کا ذکر ایسے ہی موقعہ پر موزون ہے جہاں اصلاح کر دی جائے یہی معنی سدی سے مروی ہیں ان تغفر لہم فتخرجھم من النصرانیۃ وتھدیھم الی الاسلام (ج) یعنی تغفر لہم سے مراد یہ ہے کہ ان کو نصرانیت سے نکال کر اسلام کی ہدایت فرماتے +

صادقوں سے صدق کے سوال کا مطلب

۸۹۹ یوم سے مراد وہ یوم ہے جو اس حیات دنیا کے بعد شروع ہوتا ہے اور ینفع الصادقین صدقھم کے معنی اسی طرح پر ہیں جس طرح لیسئل الصادقین عن صدقھم (الاحزاب ۳۳ - ۸) میں یعنی کہ جس نے زبان سے سچائی کا اقرار کیا ہے اس کے عمل کے صدق کا سوال کرے کیونکہ اعتراف حق کافی نہیں جبتک کہ اس پر افعال صادقہ کی مہر نہ ہو (غ) صدق کے معنی میں دونوں باتیں شامل ہیں۔ زبان سے سچ بولنا اور افعال سے سچ کر دکھانا پس یہاں یہ بتایا ہے کہ اس زندگی کے بعد یا اس اُخروی زندگی میں انسان کو نفع پہنچانے والی دو چیزیں ہیں ایک سچائی کا مان لینا۔ دوسرا اس پر عمل کرنا۔ تو وہ لوگ جنھوں نے سچائی کو قبول ہی نہ کیا وہ کیا نفع اُٹھا سکتے ہیں +

۹۰۰ سورت کے آخری الفاظ میں اپنی وسعت سلطنت پر فخر کرنے والی قوم کو بتایا ہے کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ کی ہی ہے۔ انسانوں کا تصرف عارضی ہے حقیقی مالک ایک ہی ہے جو ہمیشہ رہیگا۔ ابن جریر میں ہے کہ مخاطب نصاریٰ ہیں +

سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ مَكِّيَّةٌ

نام۔ اس سورت کا نام الانعام ہے جس کے معنی چارپائے ہیں اور اس میں بیس رکوع اور ایک سو چھیاسٹھ آیات ہیں۔ سورت کا اصل مضمون توحید الٰہی کا بیان کرنا ہو۔ اسی تعلق میں ان مشرکانہ رسوم کا ذکر آتا ہے جو چارپایوں کے متعلق عرب میں مروج تھیں یعنی بعض قسم کے اونٹوں بکریوں وغیرہ کی عزت و احترام جو شرک کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ انکو سانڈھ کے طور پر چھوڑ دیتے تھے۔ نہ ان پر کوئی سواری کرسکتا تھا نہ انکو ذبح کیا جاسکتا تھا نہ ان پر چرنے کے متعلق کوئی حد بندی عاید ہوسکتی تھی۔ اسی طرح کی اور بھی رسوم تھیں۔ اسلام کی اصل غرض نہ صرف توحید کا وعظ تھا کہ چند بڑے بڑے عالی دماغ لوگ خوش ہو جائیں اور ان کے لئے ایک خیالات بلند کی دعوت کا سامان ملجائے بلکہ عوام الناس کی زندگی پر توحید کا عملی طور پر اثر ڈالنا اس کے مدنظر تھا ان کے رسوم و رواج سے شرک سے تعلق رکھنے والی ہر بات کی بیخکنی کرنا اصل مقصود تھا اس لئے توحید کو جس سورت میں بیان کیا اس کا نام ایسا تجویز کیا جس کا تعلق ہر فرد بشر کے گھر سے تھا۔ اور ان رسوم سے تھا جو ہر گھر میں صدیوں سے گھر کی زندگی کا حصہ بنی ہوئی چلی آتی تھیں۔ یہ خیالی بات نہیں بلکہ حقیقت یہی ہو کہ توحید قایم نہیں ہوسکتی جبتک کہ ان رسوم کی بیخکنی نہ ہو جو شرک کے رنگ میں ہر گھر اور ہر انسان کی زندگی کا عملی طور پر جزو بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس ملک ہندوستان کو لے لو۔ یہاں بت پرستی اور انسان پرستی اور نگا رنگ کی من دون اللہ پرستشیں ایک طرف رکھو اور گائے کی مشرکانہ عظمت کو دوسری طرف رکھو ایک شخص کیلئے ان تمام قسم کی پرستشوں کو دور کرنا آسان ہو مگر گائے کی مشرکانہ عظمت کو جس کا تعلق ہر ہندو کے گھر سے اور ہر ہندو کی عملی زندگی سے ہو کوئی شخص دور نہیں کرسکتا سوائے اس کے جو توحید کامل کا زبردست معلم ہو۔ سوامی دیانند جی کیلئے یہ آسان امر تھا کہ ایک سطحی توحید کی تعلیم انہوں نے ہندوؤں کو دی اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو بت پرستی سے چھڑایا مگر گائے کی مشرکانہ عظمت کو وہ دور نہ کرسکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقی توحید سے یہ قوم اسی طرح دور پڑی ہوئی ہو۔ قرآن کریم کا اور رسول اللہ صلعم کا یہ کمال تھا کہ نہ صرف علمی طور پر خطرناک سے خطرناک بت پرستی کو دور کرکے توحید الٰہی کو قایم کیا بلکہ شرک کی جڑوں کو کاٹ کر رکھدیا اور اپنی اصلاح کو مکمل نہ سمجھا جبتک کہ مشرکانہ رسوم کی بیخکنی نہ کردی ❖

خلاصہ مضمون ۔ سورت کا اصل مضمون توحید الٰہی ہو۔ اور اول سے آخر تک اسی ایک مضمون پر زور دیا ہو ہاں ضمناً کہیں رسالت کا ذکر اس تعلق سے آتا ہو کہ اس کے ذریعہ سے ہی یہ توحید قایم ہونی تھی۔ اور اسی ضمن میں مکذبین کی انجام کار ناکامی یا مومنین کی تدریجی اور آخری کامیابی کا ذکر بھی آگیا ہو مگر اصل غرض کو نہیں چھوڑا۔ پہلے رکوع میں شرک فی الذات کی تردید کی یعنی ان لوگوں کے شرک کی جو دو خالق تجویز کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی کچھ ذکر اس پیغام کا اور اس کی تکذیب کرنے والوں کا کیا جو توحید کو قایم کرنے کیلئے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ دوسرے رکوع میں شرک فی العبادت کی تردید کی تیسرے میں بتایا کہ شرک ایک ایسی چیز ہو کہ مشرکوں پر بھی ایک وقت آئیگا کہ وہ خود شرک سے بیزاری کا اظہار کرینگے۔ اس میں فطرت انسانی کی شہادت کی طرف بھی توجہ دلائی ہو۔ چوتھے میں مکذبین کے انجام کا، پانچویں میں عذاب استیصال کا ذکر ہو چھٹے میں توحید کے ماننے والوں پر انعام و احسان کا ذکر ہو ساتویں اور آٹھویں میں محاسبہ اعمال اور اس کی غرض کو بیان کیا نویں میں بتایا کہ اس مذہب توحید پر حضرت ابراہیم ابوالانبیاء بھی قایم تھے اور ان کی اپنی قوم سے بحث کا ذکر کیا دسویں میں بتایا کہ سب انبیاء کا مذہب توحید ہی تھا گیارھویں میں آنحضرت

مشرکانہ رسوم کی بیخکنی اسلام کا اصل کام تھا

گائی کی مشرکانہ عظمت

وھی مائۃ وخمس وستون آیۃ وعشرون رکوعًا

صلعم کی وحی کا ذکر فرمایا بارھویں میں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا ذکر کر کے توحید پر دلیل دی ہے اور ساتھ ہی حق کی تدریجی کامیابی کا ذکر کیا۔ تیرھویں میں شرک کے مختلف پہلوؤں کا ابطال کیا اور اللہ تعالیٰ کا بی بی اور بیٹے سے پاک ہونا بیان کیا۔ چودھویں میں پھر مشرکین کی مخالفت اور پندرھویں میں منصوبہ بازوں کے انجام کا ذکر کیا سولھویں اور سترھویں میں شرک اور مشرکانہ رسوم کا ابطال کیا اٹھارھویں میں ممنوع غذاؤں اور مشرکین کے باطل عذروں کا ذکر کیا انیسویں میں توحید کے عملی پہلو کو بیان کیا کہ غرض صرف ایک اقرار نہیں صرف مشرکانہ رسوم کا ترک کر دینا نہیں بلکہ صحیح اصول زندگی پر عمل پیرا ہونا توحید کا اصل مقصد ہے۔ مال وجان کی حفاظت کے اصول بتائے اور بیسویں میں بتایا کہ توحید کامل کو عملی رنگ میں قرآن کریم نے پیش کیا ہے تو اس کا اعلیٰ نمونہ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم ہیں اور اسی بلند مقام پر پہنچنے کے لئے مسلمانوں کو کوشش کرنی چاہئے اور سورت کا خاتمہ اگر ایک طرف ابطال کفارہ پر کیا تو دوسری طرف آخری الفاظ میں خوشخبری بھی سنائی کہ جب تم توحید کے ان صحیح اصول پر قایم ہو جاؤ تو ہم تمہیں زمین میں بادشاہ بھی بنا دینگے کیونکہ مخلوق کا خیرخواہ گروہ ہی ان پر حکومت کا اہل ہے اور ساتھ ہی ڈرا یا بھی کہ اگر تم نے ان اصول کو ترک کر دیا تو وہ بادشاہت تم سے بھی لی جائے گی +

ترتیب قرآنی میں الانعام کا مقام۔ یہ سورت نزول میں پہلی چار سورتوں سے بہت پہلے کی ہے اور مکی ہے مگر ترتیب میں اس کو بعد میں رکھا ہے۔ حالانکہ اس کا مضمون جو توحید ہے چاہتا تھا کہ اس کو ابتدا میں رکھا جاتا یہ سچ ہے کہ توحید کو قرآن کریم نے بنیاد ٹھہرایا ہے۔ اس لئے قرآن شریف کی ابتدا الحمد للہ رب العلمین سے ہوتی ہے پھر سورۃ بقرہ کی ابتدا بھی ایمان بالغیب سے ہوتی ہے پھر سب سے پہلا حکم جو قرآن شریف میں ہے وہ بھی یا یہا الناس اعبدوا ربکم اور فلا تجعلوا للہ اندادا ہی ہے پھر سورۃ آل عمران کی ابتدا بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے ہوتی ہے لیکن چونکہ مسئلہ توحید ایک علمی مسئلہ ہے اس لئے مسلمانوں کی تعلیم میں ابتدا ایک ایسی سورت سے کی جس میں ان کی فلاح وبہبودی کے طریق ان کو سمجھائے یعنی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران اسی مضمون کی تکمیل کرتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ دونوں میں یہود اور نصاریٰ کے عقاید باطلہ کی تردید کی ہے پھر سورۃ النساء میں معاشرت کے اصول کو بیان کیا اور سورۃ مائدہ میں تمدن کے اور اس ساری عملی تعلیم کے بعد توحید کے مضمون کو بیان کیا تاکہ مسلمان سمجھ لیں کہ ان کی مقدم ضروریات کیا ہیں اور سورۃ مائدہ جس کے بعد یہ رکھی گئی ہے اس سے بھی اس کا خاص تعلق ہے۔ کیونکہ اس سورت میں عقود کے ایفاء کی طرف توجہ دلائی تھی تو سب سے بڑا عقد اللہ تعالیٰ کی توحید کو ماننا ہے اس کا ذکر بالتفصیل یہاں کیا۔ بلکہ سورۃ مائدہ کے آخر کا تعلق بھی الانعام سے خصوصیت سے ہے کیونکہ اس سورت کے آخر میں عیسائی عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید کی جو ایک عظیم الشان شرک تھا تو اب شرک کے تمام دوسرے پہلوؤں کا ذکر کر کے مضمون توحید کو کمال کو پہنچایا یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ سورت توحید پر ہے اس میں عیسائی عقیدہ کا ذکر بالتفصیل نہیں کیا بلکہ نہایت مختصر الفاظ پر بس کی ہے۔ انی یکون لہ ولد ولم تکن لہ صاحبۃ +

تاریخ نزول۔ اس پر اتفاق ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ صورت ساری کی ساری ایک رات میں مکہ میں نازل ہوئی۔ دیگر روایات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورت سب کی سب ایک ہی مرتبہ مکہ میں نازل ہوئی۔ اور اس کی دو یا تین آیات کو جو بعض لوگوں نے مدنی کہا ہے تو یہ غلط فہمی ہے۔ یہود کا ذکر یا بعض تفصیلات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

شریعت کا مکہ میں نازل ہونا ایک مسلم امر ہے غذاؤں کی حلت و حرمت کا حکم سورۃ نحل میں بھی موجود ہے حالانکہ وہ بھی بالاتفاق مکی ہے اور سورۃ انعام سورۃ نحل کے بعد کی ہے اس لئے کہ اس سورت میں سورۃ نحل کے حکم حلت و حرمت غذا کا حوالہ موجود ہے قل لا اجد فی ما اوحی الی محرما (۱۴۶) قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کی مکی زندگی کے آخری سال میں یہ سورت نازل ہوئی۔ ایک اتنی بڑی سورت کا یکمرتبہ نازل ہونا اور اس کا آنحضرت صلعم کو یاد رہجانا قرآن کریم کے عظیم الشان اعجازوں میں سے ایک اعجاز ہے بعض لوگوں کی قوت حافظہ بیشک بڑی زبردست ہوتی ہے بعض اشعار کو ایک ہی دفعہ سُنکر یاد کر لیتے ہیں بعض قصص کو ایک ہی دفعہ سُنکر دوہرا سکتے ہیں لیکن یہ سورت نہ تو اشعار میں سے ہے نہ ہی اس میں کوئی قصص ہیں یہ چیزیں حافظہ کے معاون ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس میں توحید کا علمی اور بظاہر خشک مضمون ہے جس میں بظاہر کوئی ربط نہیں۔ پھر یہ کوئی قصہ اور کہانی نہیں کہ دو چار لفظ اِدھر اُدھر ہو جائیں تو مضائقہ نہیں یا شعر نہیں کہ ایک لفظ کی جگہ دوسرے موزون لفظ سے پر ہو جائے تو ہرج نہیں اس کی ایک زیر زبر میں فرق نہیں ہو سکتا ایک حرف کی کمی بیشی نہیں ہوسکتی اور پھر نزول کے ساتھ یہ لکھ بھی لی جاتی ہے اور اس لکھی ہوئی سے دوسرے لوگ اس کو یاد کرتے ہیں حالانکہ نبی کریم صلعم لکھے ہوئے کو پڑھ نہیں سکتے پھر آپ کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے نمازوں میں پڑھیں ان حالات کے اندر کس قدر سخت حفاظت ہر زیر و زبر کی ہر حرف کی بکار ہے۔ اور یہ سب حفاظت آپ اس حالت میں کرتے ہیں کہ ایک ہی دفعہ آپ نے بیس رکوع اور ۱۶۶ آیات کی اتنی لمبی سورت کو فرشتہ کے مُنہ سے سنا ہے۔ یہ وہ اعجاز تھا جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے سنقرئک فلا تنسیٰ (الاعلیٰ - ۷) یعنی ہمارے پڑھانے کا نشان یہ ہے کہ تم اسے کبھی بھولو گے نہیں۔ کتنا بڑا دعویٰ ہے اور اس کا پورا ہونا جس پر تاریخ شاہد ہے کتنا بڑا اعجاز ہے۔ اور یہ جو اِن آیت میں آتا ہے سنقرئک فلا تنسیٰ الا ما شاء اللہ تو بعض لوگوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ قرآن شریف بھول بھی جایا کرتے تھے نعوذ باللہ من ذالک اس طرح تو آیت کا مطلب ہی خبط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پھر آیت کا یہ مطلب ہوا کہ ہم تجھے پڑھائینگے سو تو نہیں بھولے گا مگر جو اللہ چاہے بھول جایا کریگا۔ تو نہ بھولنا ایک بے معنی بات ہوئی۔ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں یہاں اِلّا استثنائے منقطع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو ہم پڑھائینگے وہ تو ہرگز نہیں بھولے گا مگر یہ اس لئے نہیں کہ تمہارا حافظہ اس قدر زبردست ہے کہ تم کبھی کوئی چیز بھولتے ہی نہیں بلکہ اور باتوں میں جو اللہ چاہے بھول بھی جاتے ہو لیکن جو بات وحی سے تم کو پہنچائی جاتی ہے وہ نہیں بھولتے۔ اور یہی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے پڑھانے میں اعجاز ہے کہ ایک انسان جو اور باتیں بھول بھی جاتا ہے وحی الٰہی کا ایک لفظ تک نہیں بھولتا اور پھر اس اعجاز کا کمال اور بھی بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف اتنی اتنی لمبی سورتیں یکمرتبہ نازل ہوتی ہیں تو دوسری طرف کسی سورت کی کوئی آیت کسی وقت نازل ہوتی ہے اور ان ٹکڑوں کو آپ اسی طرح لکھوا دیتے ہیں اور ساتھ ہی حافظوں کو اس ترتیب سے یاد کرا دیتے ہیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ آپ کے پڑھنے میں نہ کبھی کسی لفظ میں کمی بیشی ہوتی ہے اور نہ ترتیب وحی میں ہی تغیر واقع ہوتا ہے حالانکہ اس ترتیب سے لکھا ہوا قرآن بھی کوئی موجود نہیں۔ یہ بات بجائے خود نبی کریم صلعم کا اتنا بڑا معجزہ ہے کہ جس کی نظیر دوسرے انبیاء میں کوئی نہیں ملتی ٭

ع ۱۰
شرک فی الذات کی تردید

۱ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۬

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیرا اور روشنی بنائے

۲ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ○ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی

پھر بھی جو کافر ہیں اپنے رب کے ساتھ برابر ٹھیراتے ہیں ۹۰۱ وہی ہے جس نے تمکو مٹی سے پیدا کیا پھر ایک

۳ اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ○ وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ

میعاد ٹھیرادی اور ایک (اور) میعاد اسکے ہاں معین ہے پھر بھی تم جھگڑتے ہو ۹۰۲ اور آسمانوں اور زمین

وَفِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ○

میں وہی اللہ ہے وہ تمہاری چھپی اور ظاہر (باتیں) جانتا ہے اور وہ جانتا ہے جو تم کماتے ہو ۹۰۳

عدل

۹۰۱ یعدلون ۔ عدل کے معنی کے لئے دیکھو ۴۹۶ اور بربہم یعدلون میں مراد ہے اس کا عدیل یعنی برابر یا شریک دوسرے کو ٹھہراتے ہیں ، اور عدل عن الحق کے معنی آتے ہیں جار یعنی ظلم کیا (غ) ۔

ثنویہ کا شرک

اس سورت کی اصل غرض توحید الٰہی کو بیان کرنا ہے ۔ اس لئے پہلی آیت میں ہی سب سے موٹی قسم کے شرک یعنی شرک فی الذات کی تردید کی ہے اور وہ شرک ثنویہ کا ہے یعنی جو لوگ دو خدا مانتے ہیں ایک خالق خیر اور ایک خالق شر یا ایک نور کا بنانیوالا اور ایک ظلمت کا ۔ یہ عقیدہ آتش پرستوں میں پایا جاتا ہے ۔ اسلام نے شر یا بدی کا کوئی مستقل وجود نہیں مانا

بدی کیا ہے

بلکہ بدی چونکہ محض ان قوٰی کے غلط استعمال کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں اسلئے خالق ایک ہی ہے یہی وجہ ہے کہ آسمان اور زمین کے ساتھ خلق کا لفظ لگایا اور ظلمت اور نور کے ساتھ جعل کیونکہ جو چیزیں اچھے استعمال کیلئے پیدا کی گئی ہیں

خالق شر الگ نہیں ہو سکتا

انہی کے بُرے استعمال کا نام بدی ہے ہاں جعل کا فاعل اللہ ہے کیونکہ مسبب الاسباب وہی ہے ۔ شر کا خالق الگ ماننے میں یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ شر یعنی بدی کا مقابلہ کر کے انسان اس پر غالب نہیں آسکتا بلکہ ضرور ہے کہ انسان اس میں ہمیشہ کے لئے ملوث رہے ۔ برخلاف اس کے اسلامی توحید کی رو سے بدی کوئی ایسی چیز نہیں جس پر انسان غالب نہ آسکے ۔ بلکہ انسان کی ساری جد و جہد کی اصل غرض یہی ہے اور یہی اس کا نصب العین ہونا چاہیئے کہ بدی پر غالب آئے اور ان لوگوں کے نمونے ہمارے سامنے پیش کئے گئے ہیں جو بدی پر غالب آئے اور جنہوں نے شیطان کو بھی اپنا فرمانبردار بنا لیا ۔

۹۰۲ معلوم ہوا کہ ہر انسان مٹی سے ہی پیدا ہوتا ہے ۔ اسلئے کہ غذائیں جن سے انسان کا قیام ہے وہ مٹی سے ہیں ۔ گویا مٹی کا خلاصہ غذائیں ہیں ۔ اور غذاؤں کا خلاصہ وہ نطفہ جس سے انسان کی پیدایش ہوتی ہے جب آسمان اور زمین کی پیدایش کا ذکر کیا تو انسان کی پیدائش کا بھی ذکر کیا ۔ ایک میعاد ٹھہرانے میں انسان کی زمینی زندگی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک وقت کیلئے ہے یعنی موت تک اور اجل مسمّٰی جو اسکے حضور ہے وہ دوسری زندگی کے متعلق ہے یعنی اس کا کھلا ظہور بھی ایک وقت مقرر کے بعد ہوگا یعنی قیامت کے دن اسلئے اسے مسمی یا معین کہا ہے ۔ یوں مضمون کا انتقال توحید سے بعث بعد الموت کیطرف کیا گیا ہے

اسم اللہ میں کوئی شریک نہیں

۹۰۳ پہلی دو آیتوں میں یہ ذکر کر کے کہ خالق ایک ہی ہے اب فرمایا کہ آسمانوں میں اور زمین میں وہی ایک ہی اللہ ہے یعنی دوسرا کوئی اس کی ذات میں شریک نہیں اور اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی کہ اللہ جو ذات باری کا اسم ذات ہے اس میں ویسے

وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ فَقَدْ ۵

اور کوئی پیغام اپنے رب کے پیغاموں میں سے اُنکے پاس نہیں آتا مگر وہ اُس سے منہ پھیرنے والے ہوجاتے ہیں ۹۰۴ ہاں یقیناً

كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ

انھوں نے حق کو جھٹلا دیا جب وہ انکے پاس آیا سو اُن کے پاس اُس (کے وقوع) کی خبریں آرہیں گی جس پر وہ ہنسی کرتے تھے ۹۰۵

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ ۶

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ کس قدر اُن سے پہلے ہم نے نسلیں ہلاک کردیں جن کو ہم نے زمین میں وہ طاقت دی تھی جو تم

نُمَكِّن لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُم

تم کو نہیں دی اور ہم نے ان پر زور سے مینہ برساتا ہوا بادل بھیجا اور نہریں بنا دیں جو اُن کے نیچے بہتی تھیں پھر اُن کو اُن کے

بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ۝ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ ۷

گناہوں کی وجہ سے ہلاک کردیا اور اُن کے پیچھے دوسری نسل پیدا کردی ۹۰۶ اور اگر ہم تجھ پر کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب اتارتے ۔

بھی کبھی کوئی دوسرا شریک نہیں ہوا یعنی یہ نام کبھی کسی دوسرے معبود پر نہیں بولا گیا۔ حالانکہ اور ناموں میں لوگوں نے اشتراک کر لیا ہے اور پھر اس کی قدرت کا ذکر کرکے جو خلق میں نمودار ہوئی جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوا اس کے علم کا ذکر کرتا ہے اور ساتھ ہی چھپی اور ظاہر باتوں میں اور کمانے میں یہ اشارہ ہے کہ تمہارے اعمال سے ہی دوسری زندگی پیدا ہوتی ہے

۹۰۴ اس راز کو کہ اعمال سے دوسری زندگی پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحی نے ہی انسان پر ظاہر کیا اور حالانکہ یہ بات انسان کی بھلائی کے لئے بتائی تھی مگر لوگ ہمیشہ ہی ایسے پیغام کو سنکر منہ پھیر لیتے رہے ہیں ٭

۹۰۵ جس سے وہ استہزا کرتے تھے وہ عذاب تھا جس سے ان کو ڈرایا جاتا تھا۔ اس کی خبریں آنے سے مراد خود اس عذاب کا آنا ہے۔ دوسری جگہ ہے ولتعلمن نباہ بعد حین (صٓ ۳۸۔ ۸۸) یہاں بھی مراد وقوع ہی ہے ٭

قرن ۹۰۶ قرن ۔ قَرْن یا اِقْتِران کے معنے ہیں دو یا زیادہ چیزوں کا اجتماع کسی رنگ میں اسلئے قرن (جمع قرون) وہ لوگ ہیں جو ایک زمانہ میں جمع ہوں یعنی ایک نسل (غ) ٭

مکّن مکنّاھم۔ نمکن لکم ۔ صلہ لام کے ساتھ اور بغیر صلہ کے دونوں طرح آتا ہے اور اس کا اصل مکان (یا تمکّن) سے ہے اور مکّنہ کے معنی ہیں اس کو مکان یعنی ثبات اور قرار دیا یا مضبوطی اور قوت دی۔ اور مکّن لہ کے معنی بھی یہی کئے گئے ہیں اور یہ بھی کہ ان کو اسباب تصرف اور نعمتیں وغیرہ دیں جیسے کذٰلک مکّنا لیوسف (یوسف ۱۲۔ ۲۱)

دَرّ ۔ مدرار مدرارا اس کا اصل دَرّ ہے جو دودھ یا آنسوؤں کے کثرت سے بہنے پر بولا جاتا ہے اور مطلق دودھ کو بھی کہتے ہیں (ل) اور استعارۃً بارش کی کثرت پر بولا جاتا ہے اور دَرّ اچھے یا برے عمل کو بھی کہا جاتا ہے جس سے للہ درّک عام محاورہ ہے، جو مدح اور ذم دونوں موقعوں پر بولا جاتا ہے (ا) ٭

پہلی نسلوں کی ہلاکت کا ذکر ان کی عبرت کیلئے کیا ہے جن لوگوں کو دنیوی آسائشوں کا حصہ زیادہ مل جاتا ہے وہ آخرت

٨ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ

پھر وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے تو جو کافر ہیں وہ یہی کہتے کہ یہ صرف کھلا دھوکا ہے ٩٠٧ اور کہتے ہیں اس پر فرشتہ

٩ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ

کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر ہم فرشتہ اتاریں تو معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائیگا پھر ان کو ڈھیل نہ دی جائیگی ٩٠٨ اور اگر ہم اسے فرشتہ بناتے تو ہم اسکو ضرور

١٠ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ۝ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ

انسان بناتے اور اُن پر وہی شبہ ڈالتے جو شبہ وہ آپ ڈال رہے ہیں ٩٠٩ اور یقیناً تجھ سے پہلے رسولوں کے ساتھ ہنسی کی گئی سو

بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ ع

جو لوگ ان میں سے تمسخر کرتے ہیں ان کو اسی نے آگھیرا جس کے ساتھ وہ ہنسی کرتے تھے ٩١٠

کیطرف سے غافل ہو جاتے ہیں اور اس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہلاک ہو جاتے ہیں اور کوئی دوسری قوم انکی جگہ کھڑی ہو جاتی ہے۔

لکھی ہوئی کتاب کیوں نہیں اُتری

٩٠٧ روحانیت سے بے بہرہ لوگ امور روحانی کو بھی جسمانی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں اسلئے چاہتے ہیں کہ کتاب لکھی لکھائی اوپر سے آئے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اس لئے اس کا کلام قلب پر نازل ہوتا ہے اگر لکھا لکھایا کلام اوپر سے نازل ہوتا تو قلب انسانی سے اس کا کچھ تعلق نہ ہوتا اور نہ دلوں کے اندر اس سے انقلاب پیدا ہوتا اور جو اصل غرض اس کلام کے آنے کی تھی وہی مفقود ہو جاتی۔ اور یہ جو فرمایا کہ اگر ہم اس طرح بھی اُتاریں تو اسے سحر کہیں گے۔ تو یہ صرف فرض کر لینے کے طور پر نہیں بلکہ آخر کار اسی قرآن کو اللہ تعالیٰ نے کتاباً فی قرطاس بھی بنا دیا۔ مگر پھر بھی نہ مانا +

٩٠٨ یہ دوسرا اعتراض بھی روحانیت سے بے بہرہ لوگوں کا ہے وہ جس طرح کلام الٰہی کو جسمانی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں اسی طرح فرشتوں کو بھی اس کا جواب یہ دیا ہے کہ فرشتے تو سزا دینے کے لئے نازل ہونگے جب انسان نیکی کے محرک ملائکہ کی بات کو قبول نہیں کرتا تو پھر لازماً دوسری قسم کے ملائکہ یعنی سزا دینے والے اس کے لئے آتے ہیں +

لَبْس

٩٠٩ یلبسون۔ لَبْس کے معنی ڈھانکنا جس سے لباس ہے۔ لبس امر سے مراد اس کا مشتبہ کر دینا ہے (غ) +

فرشتہ کیوں رسول بنکر نہیں آتا۔

کبھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بشر کیوں رسول ہوا۔ فرشتہ کو خدا رسول بنا کر بھیجتا تا یقین آجاتا۔ جواب دیا ہے کہ فرشتہ بھی انسانوں کی طرف رسول بن کر آتا تو انسان کی صورت میں ہی آتا کیونکہ رسول کا تو بڑا کام یہ ہے کہ نمونہ بنکر دکھائے اور انسان کیلئے انسان ہی نمونہ کا کام دے سکتا ہے علاوہ ازیں فرشتہ تو غیر مرئی ہستی ہے جبتک وہ تجسم اختیار نہ کرے انسان اسکو دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اور جب ملک مجسم ہو کر آتا تو پھر اعتراض ویسے کا ویسا ہی رہتا +

حاق

٩١٠ حاق کے معنی زجاج نے احاطہ کئے ہیں یعنی گھیر لیا۔ اور بعض نے اسکے معنی لئے ہیں عاد علیہ وبال امرہ اس کے امر کا وبال اس پر لوٹ کر آیا۔ راغب نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک اس کا اصل حقّ ہے +

جب رسول بدی کے بد نتائج سے ڈراتا ہے تو بدکردار لوگ طاقت کے نشہ میں اس پر ہنسی کرتے ہیں مگر وہ بد نتائج آخر کار آگھیرتے ہیں +

ع ۲ ۔ شرکی اشیاء کی تردید

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ قُلْ لِمَنْ ۱۱ ۱۲

کہو زمین کے اندر پھرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا کہو کس کے لئے ہے

مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ قُلْ لِلَّهِ ۚ كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے کہو اللہ کے لئے اُس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے وہ تم کو ضرور قیامت کے دن تک

الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَلَهُ مَا سَكَنَ ۱۳

جمع کریگا اس میں کوئی شک نہیں جنہوں نے اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا وہی ایمان نہیں لاتے ۹۱۱ اور اسی کا ہے جو کچھ

فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ ۱۴

رات اور دن میں بستا ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ۹۱۲ کہو کیا میں اللہ کے سوائے ولی بناؤں جو ابتدا کرنیوالا ہے ۹۱۳

۹۱۱ اس رکوع میں یہ بتایا کہ عبادت اور اطاعت صرف اللہ کیلئے ہی ہے۔ کیونکہ وہی سب کا مالک ہے اور سب پر رحم کرتا ہے

اللہ کی رحمت کی وسعت

کتب علی نفسہ الرحمۃ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت بے پایان کا ذکر کیا ہے اور دوسری جگہ فرمایا ورحمتی وسعت کل شیئ (الاعراف۔۱۵۶) اور حدیث میں ہے ان رحمتی سبقت غضبی میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی اور یوں اپنے بندوں کو تسلی دی ہے اور عیسائیوں کے اس عقیدہ کی بھی تردید کی ہے کہ خدا میں عدل ہے رحم نہیں۔ بتایا ہے کہ رحم تو اس قدر غالب ہے کہ اس کو اس نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ اس کا رحم بے پایاں جس طرح جسمانی دنیا میں کام کر رہا ہے اسی طرح عالم روحانی میں کام کرتا ہے۔ اور یہ جو اس کے بعد فرمایا کہ تمہیں قیامت کے دن کیلئے جمع کرے گا تو اس میں گویا اسی رحمت کی وسعت کا ہی ذکر ہے کیونکہ اس رحمت کا عظیم الشان ظہور اسی عالم میں ہوگا اور جنہوں نے اچھے کام کئے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ اپنے انعامات سے مالا مال کریگا بلکہ بتا دیا کہ سب پر ہی رحمت ہوگی ہاں جنہوں نے خدا کی رحمت کے سامانوں سے اس دنیا میں فائدہ نہیں اُٹھایا وہ کچھ نقصان بھی اُٹھائیں گے مگر آخر کار ان پر بھی رحمت ہوگی رحمت کے غضب پر سبقت لیجانے کے کچھ معنی نہیں اگر یہ مانا جائے کہ کوئی حصہ بلکہ کثیر حصہ اور بڑا حصہ مخلوق کا ہمیشہ کیلئے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہیگا۔ اور عذاب جہنم سے کبھی بھی نجات نہ پائیگا ۔

۹۱۲ سکون کے مقابل پر تحرک ہے یعنی حرکت کرنا اور رات کے مقابل پر دن۔ اور سکون کیلئے رات ہی زیادہ موزون ہے اور مقابل کے لفظ کا ذکر نہیں کیا جیسا کہ اکثر اضداد میں سے ایک کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور غرض یہ ہے کہ جس طرح مکان کے لحاظ سے سب کچھ اسی کا ہے اسی طرح زمانہ کے لحاظ سے بھی سب کچھ اسی کا ہے اور عبادت اسی کی ہو سکتی ہے جو سب کا مالک ہے ۔

فطر۔ فطور۔ فاطر۔ فطرۃ

۹۱۳ فاطر۔ فطر کے معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں اور اس کی جمع فطور ہے ھل ترٰی من فطور (الملک۔۳) اور اللہ کے مخلوق کے فاطر ہونے کے معنی ہیں کہ وہ اس کی ابتدا اور اختراع کرنیوالا اور اسی سے فِطرۃ ہے (دل)، اور فاطر کا لفظ اختیار کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ اس کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ سے ہوئی خواہ ان کی پہلی حالت کیسی بھی ہو اور قرآن شریف میں ہی ہے کانتا رتقا ففتقنٰھما (الانبیاء۔۳۰) یعنی وہ پہلے ایک غیر ممیز حالت میں تھے پھر اللہ تعالیٰ نے یہ سب اجرام الگ الگ کر دئیے پس جو کچھ بھی پہلی حالت فرض کی جائے اس کا بنانیوالا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے ۔

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۗ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ

آسمانوں اور زمین کی ۔۔۔ اور وہ کھانے کو دیتا ہے اور اسے کھانے کو نہیں دیا جاتا کہہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں (ان میں) سب سے پہلا

۱۵ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ

جو فرمانبردار ہوتے اور تو ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو ۹۱۳ کہہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ایک بڑے

۱۶ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ

دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ۹۱۴ جس سے وہ (عذاب) آج پھیر دیا جائے تو اس پر اس نے یقیناً رحم کیا اور یہ

۱۷ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۭ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ

کھلی کامیابی ہے ۹۱۵ اور اگر اللہ تجھے کوئی ضرر پہنچائے تو سوائے اسکے کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تجھے

۱۸ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝

بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے ۹۱۶ اور وہ اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے اور وہ حکمت والا خبردار ہے ۹۱۷

---

۹۱۳ یہاں سب معبودان باطل کا رد کیا ہے۔ رزق کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے نہ کوئی دوسرا معبود کیونکہ وہی خالق اسباب بھی ہے اس لئے فرمانبرداری کا حقیقی مستحق وہی ہے نہ کوئی اور +

۹۱۴ آنحضرت صلعم سے یہ لفظ کہلوانا کہ میں بھی اگر نافرمانی کروں تو عذاب سے ڈرتا ہوں آپ کے پیرووں کو سمجھانے کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے انہیں کس قدر خائف ہونا چاہئے اور کسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے صریح احکام کی نافرمانی کی جرأت ان کو نہیں کرنی چاہئے +

۹۱۵ جس شخص سے عذاب اس دنیا کی زندگی میں ہی پھیر دیا جاتا ہے وہ خدا کی رحمت بے پایان کے نیچے آجاتا ہے عذاب کا اس دنیا میں پھیر دینا یا دور کر دینا راہ راست کی ہدایت دینا ہے۔ یومئذ سے مراد قیامت کا دن بھی ہو سکتا ہے مگر پہلے معنی کو ترجیح ہے +

کشف ۔۔ ۹۱۶ کاشف۔ کشف کے اصل معنی ظاہر کر دینا ہیں جیسے کپڑے کا منہ سے اٹھا دینا۔ اسی سے غم اور تکلیف کے اٹھا دینے پر بولا جاتا ہے (غ) +

یعنی کوئی معبود باطل اس دکھ کو دور نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے ماتحت ملتا ہے بھلائی پہنچانے کے ذکر کے بعد اس کے دور کرنے کا نام نہیں لیا۔ بلکہ فرمایا کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیونکہ اصل منشائے الٰہی تو اسے خیر پہنچانے کا ہی ہے +

قہر ۔۔ ۹۱۷ القاھر۔ قہر کے اصل معنی غلبہ اور دوسرے کو ذلیل کرنا ہیں اور الگ الگ دونوں معنوں میں بھی اس کا استعمال ہے (غ) اسی سے القاھر اور القہار اسمائے الٰہی میں سے ہیں جن میں مراد صرف غلبہ ہے اور اما الیتیم فلا تقھر (الضحیٰ ۹۳ - ۹) میں اور وانا فوقھم قاھرون (الاعراف ۷ - ۱۲۷) میں ذلیل کرنا مراد ہے +

القاھر۔ القہار

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ۟ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ ۱۹

کہو کونسی چیز شہادت میں سب سے بڑی ہے کہو اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے ۹۱۸ اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے

لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ؕ قُلْ

تاکہ میں تمہیں اس کے ساتھ ڈراؤں اور اسے جس کو وہ پہنچے ۹۱۹ کیا تم گواہی دیتے ہو اللہ کے ساتھ اور معبود ہیں کہو میں

لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۘ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ ۲۰

گواہی نہیں دیتا کہو وہ صرف ایک ہی معبود ہے اور میں اس سے بری ہوں جو تم شرک کرتے ہو ۹۲۰ جنہیں ہم نے

وقف لازم

الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۟

کتاب دی وہ اسے پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ وہ جو اپنے آپ کو نقصان میں ڈالتے ہیں وہی ایمان نہیں لاتے ۹۲۱

ع ۹/۱۰ — مشرکوں کی شرک سے بیزاری

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۟ ۲۱

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی باتوں کو جھٹلائے یقیناً ظالم کامیاب نہ ہونگے ۹۲۲

فعلی شہادت

۹۱۸ اللہ کی شہادت اس کے فعل سے ادا ہوتی ہے۔ وہ اسباب دنیا میں پیدا کر دیئے جنہوں نے رسول اللہ صلعم کا حق ہونا ظاہر کر دیا۔ اور یہی سب سے بڑی شہادت ہے جو فعل سے ظاہر ہو +

۹۱۹ یہاں قرآن کریم کے ذریعہ سے انذار کے لئے دو گروہوں کا ذکر کیا۔ ایک وہ جو اسکے براہ راست مخاطب ہیں اور دوسرے من بلغ یعنی جن کو یہ پہنچے۔ ان الفاظ سے قرآن کریم کے انذار کا دامن سب قوموں اور تمام زمانوں پر قیامت تک پھیلا دیا ہے کیونکہ من بلغ سے باہر کوئی نہیں رہ جاتا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن کو قرآن کریم کی تبلیغ نہ پہنچے وہ اس کو نہ ماننے کی وجہ سے مواخذہ کے نیچے نہیں بلکہ فطرت انسانی کے خلاف جو کام وہ کریں اس کی وجہ سے مواخذہ کے نیچے ہونگے۔ گویا ایک تو انسان کی فطرت کی دھیمی روشنی ہے جو طرح طرح کے عوارض کے نیچے دب جاتی ہے اور ایک قرآن کریم کے آفتاب عالمتاب والی روشنی ہے۔ اس دوسری روشنی میں نہ چلنے کی وجہ سے گرفت انہی لوگوں کی ہوگی جن کو یہ روشنی پہنچ گئی ورنہ فطری روشنی کے لحاظ سے ہر انسان مواخذہ کے نیچے ہے +

فطری روشنی اور اس پر مواخذہ

۹۲۰ اس میں اصل غرض کو کھول کر بیان کیا وہ سب چیز کا مالک ہے سب پر رحم کرنے والا ہے سب کا خالق ہے وہی سب پر غالب ہے پس اس کے سوائے دوسرا معبود کسی کو نہ بناؤ۔ پھر یہی وحی الٰہی کی شہادت ہے۔ اور یہی صحیح فطرت انسانی کی شہادت ہے +

۹۲۱ پہلا حصہ آیت کا وہی ہے جو البقرۃ ۲-۱۴۶ میں آچکا۔ وہ مدنی ہے اور یہ مکی۔ گویا جو کچھ مکہ میں فرمایا وہی مدینہ میں حالانکہ اس وقت ابھی یہودیوں کی طرف سے مخالفت کا اظہار نہ ہوا تھا۔ لکھا ہے کہ قریش نے یہودیوں سے دریافت کیا تھا کہ آنحضرت صلعم کی نسبت ان کا کیا خیال ہے +

شرک افتراء علی اللہ ہے

۹۲۲ اللہ پر افتراء ان کا یہ تھا کہ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے اس سورت کے سولھویں رکوع میں نہایت

۲۲ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنتُمْ

اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے تب ہم اُن کو جنہوں نے شرک کیا کہیں گے وہ تمہارے شریک کہاں ہیں جن کے لئے تم

۲۳ ۲۴ تَزْعُمُونَ ۝ ثُمَّ لَمْ تَكُن فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ۝ انظُرْ

جھوٹے دعوے کرتے تھے ۹۲۳ تب اُن کا فتنہ نہ ہوگا مگر یہ کہ وہ کہیں گے کہ اللہ ہمارے رب کی قسم ہم مشرک نہ تھے ۹۲۴ دیکھ

۲۵ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ ۚ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ

کس طرح اپنے اوپر جھوٹ بولتے ہیں اور جو وہ افترا کرتے تھے اُن سے جاتا رہے گا ۹۲۵ اور اُن میں کوئی ہیں جو تیری

إِلَيْكَ ۖ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ

طرف کان لگاتے ہیں اور ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ اسے سمجھیں نہیں اور اُنکے کانوں میں بوجھ (ہے)

صفائی سے ان کے شرک اور مشرکانہ رسوم کو بار بار افترا علی اللہ کہا ہے +

۹۲۳ شرکا کا ذکر میں اضافت ادنیٰ ملابست ہے۔ مراد انکے شریک نہیں بلکہ وہ ہیں جنکو وہ خدا کا شریک بناتے تھے۔ ایک اجتماع تو قیامت کے دن ہوگا مگر نبی کریم صلعم کی تشریف آوری نے بھی ایک نمونہ قیامت صغریٰ کا دکھا دیا اور اس دنیا میں بھی ان مخالفین پر وہ وقت آگیا کہ جب ان سے سوال کیا گیا کہ وہ تمہارے خدائی کے شریک کہاں ہیں اور کیوں اب تمہاری مدد نہیں کرتے +

فتنة — **۹۲۴** فتنتہم فتنة سے مراد یہاں بعض مفسرین نے شرک لیا ہے بعض نے جواب یا عذر اور ان کے عذر کو فتنہ اس لئے قرار دیا کہ وہ جھوٹ ہے۔ مگر فتنہ کے اصل معنی بلا یا عذاب یا دکھ ہیں۔ اس لئے یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ایک تو یہ وقت ہے کہ مسلمانوں کو توحید کی وجہ سے دکھ دیتے ہیں لیکن وہ وقت بھی ان پر آئیگا کہ دکھ دینا تو ایک طرف رہا خود شرک سے اپنی بیزاری ظاہر کرینگے اِلاّ اس صورت میں استثنائے منقطع ہوگا +

شرک نہ کرنے کا عذر — "ہم مشرک نہ تھے" یا تو جھوٹا عذر ہے اور اگلی آیت میں یہ اشارہ ہے اور یا اشارہ انکے اس خیال کی طرف ہے مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (الزمر ۳۹ - ۳) یعنی ہم ان کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ اس ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں۔ اس صورت میں اگلی آیت میں یہ فرمایا کہ جس بات کا اقرار ان کی فطرتیں کرتی ہیں جیسا کہ قیامت کے دن وہ بول اٹھینگے اس کے آج خلاف کر رہے ہیں۔ دوسری جگہ بھی جہاں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کا نقشہ کھینچا ہے یہی دکھایا ہے کہ جب دکھ اور مصیبتیں انتہا کو پہنچ جاتی ہیں تب صرف خدا کو پکارتے ہیں۔ یوں بار بار اس فطرت کی شہادت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کی گواہی انسان کو اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے۔ مگر پھر وہ جھوٹ بولتا ہے۔ یعنی اپنی فطرت کی شہادت کے خلاف عمل کرتا ہے +

۹۲۵ اپنے آپ پر جھوٹ بولنے میں ان کے اس دنیا میں عمل کی طرف اشارہ ہے کہ فطرت کی شہادت کچھ ہے لیکن یہ اپنے ہی خلاف جھوٹ بولکر کبھی تقرب کا عذر کرکے اور کبھی کچھ کہکر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں اور یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن انکار شرک کرکے اپنے ہی خلاف جھوٹ بولتے ہیں +

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا

اور اگر یہ سارے نشان بھی دیکھ لیں تو اُن پر ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ جب تیرے پاس آتے ہیں تجھ سے جھگڑتے ہیں جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْــــَٔـوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ ۲۶

یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں ۹۲۶ اور وہ اس سے روکتے ہیں اور خود بھی دور ہوتے ہیں اور وہ صرف اپنے

اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓي اِذْ وُقِفُوْا عَلَي النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ ۲۷

آپ کو ہی ہلاک کرتے ہیں اور محسوس نہیں کرتے ۹۲۷ اور اگر تو دیکھے جب آگ کے سامنے کھڑے کئے جائینگے تو کہیں گے کہ اے کاش ہم

وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

لوٹائے جائیں اور اپنے رب کی باتوں کو نہ جھٹلائیں اور مومنوں میں سے ہوں ۹۲۸

استماع — ۹۲۶ یستمع۔ استماع کے معنی اصغاء ہیں (غ) یعنی مائل ہونا اور مراد کانوں کا مائل کرنا ہے یعنی کان لگانا +

فقه — یفقھوہ۔ فِقْہ اس علم سے جو موجود ہو علم غائب کی طرف پہنچنا ہے اسلئے یہ عِلْم سے زیادہ خاص ہے لایکادون

تفقه — یفقھون حدیثا (النساء ۴-۷۸) اور تَفَقُّہ کے معنی ہیں فقاہت کو طلب کیا اور اس سے مخصوص ہوا لیتفقھوا فی الدین

فِقه — (التوبة ۹-۱۲۲) اور فِقْہ احکام شریعت کا علم ہے (غ) +

وقرا۔ وقار — وقرا۔ وَقْر کان کے بوجھ کو کہتے ہیں اور گدھے اور خچر کے بوجھ کو بھی وِقْر کہا جاتا ہے اور وقار سکون اور حلم کو کہتے ہیں (غ)

سطر۔ اساطیر — اساطیر۔ اُسْطُوْرَة کی جمع ہے اور یہ سَطْر سے ہے جس کے معنی لکھنا ہیں ن والقلم وما یسطرون (القلم ۶۸-۱)

وکتاب مسطور (الطور ۵۲-۲) کان ذلک فی الکتاب مسطورا (الاحزاب ۳۳-۶) اور اساطیر کہنے سے مراد ہے کہ جھوٹ بنا کر خود لکھ لیا ہے +

دلوں پر پردوں کا ڈالنا — اس امر پر کہ اللہ تعالیٰ ابتدا کے طور پر مہر نہیں لگاتا یا پردے نہیں ڈالتا مفصل لکھا جا چکا ہے دیکھو ۳۱ ایسے الفاظ میں عموماً اس کفر پر اصرار کی حالت کو قرآن کریم بیان کرتا ہے جو کفار خود اپنے ہاتھوں سے اپنے لئے پیدا کر لیتے ہیں۔ اور خود اس آیت اور اس سے اگلی آیت کے الفاظ سے یہی ظاہر ہے۔ کیونکہ یہاں اول فرمایا کہ سارے نشان صدق بھی دیکھ لیں تو ایمان نہ لائیں گویا وہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ کفر کو کبھی نہ چھوڑینگے خواہ کتنا بھی بین ثبوت مل جائے پھر فرمایا کہ جب رسول اللہ صلعم کے پاس آتے ہیں تو ٹھنڈے دل سے باتوں پر غور کرنے کی بجائے جھگڑنے کیلئے آتے ہیں اور اس سے اگلی آیت میں ہے کہ نہ صرف وہ خود حق سے دور جاتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دلوں پر پردوں کا ڈالا جانا عین قوانین الٰہیہ کے مطابق ہے +

نأی — ۹۲۷ ینئون۔ نأی کے معنی اَعْرَضَ یعنی منہ پھیر لیا یا تَبَاعَدَ یعنی دور ہو گیا و نا بجانبه (بنی اسرائیل ۱۷-۸۳) (غ) +

وقف۔ توقف — ۹۲۸ وقفوا۔ وُقُوْف کے معنی ٹھہرانا یا کھڑا کرنا ہیں۔ اسی سے مَوْقِف ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اسی سے وقف کرنا ہے +

آگ کے سامنے لا کر کھڑا کر دینے سے مراد ہے کہ یقینی طور پر انکو عذاب آنے کا مشاہدہ ہو جائیگا اور دوزخ سامنے ہوگا

٢٨ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ

بلکہ اُن کے لئے ظاہر ہو گیا جو پہلے چھپاتے تھے اور اگر لوٹائے جائیں تو پھر وہی کریں جس سے روکے گئے تھے اور وہ یقیناً

٢٩ لَكٰذِبُوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى

جھوٹے ہیں ٩٢٩ اور کہتے ہیں سوائے ہماری دنیا کی زندگی کے اور کچھ نہیں اور ہم نہیں اٹھائے جائینگے ٩٣٠ اور اگر تو دیکھے

اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ

جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائینگے وہ کہے گا کیا یہ سچ نہیں کہیں گے ہاں ہمارے رب کی قسم کہیگا تو عذاب چکھو

ع — جھٹلانے والوں کا انجام

٣١ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَتْهُمُ السَّاعَةُ

اس لئے کہ تم کفر کرتے تھے۔ وہ لوگ ضرور گھاٹے میں رہے جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا یہاں تک کہ جب (مقررہ) گھڑی ان پر

بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰي مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا

یکا یک آ جائیگی کہیں گے اے ہماری حسرت اس پر جو ہم نے اس میں کمی کی۔

افعال بد کے بدنتائج اور ان کا اخفا اور ظہور

٩٢٩ پہلی آیت میں بتایا کہ آگ کے سامنے کھڑے کئے جائینگے تو پھر دوبارہ دنیا میں جانے کی خواہش ظاہر کرینگے اور کہینگے کہ اب ہم خدا کی باتوں کو نہ جھٹلائینگے۔ یہاں جواب دیا ہے کہ ایسا کہنے میں وہ جھوٹے ہیں اور اس کی وجہ یہ دی ہے کہ کوئی نئی بات تو ہوئی نہیں بل بدا لہم ما کانوا یخفون من قبل جو پہلے چھپاتے تھے وہ ظاہر ہو گیا۔ یعنی ان کے افعال بد کے بدنتائج۔ اگر یہ چاہتے تو ان نتائج کو پہلے بھی دیکھ سکتے تھے کیونکہ سچ یہی ہے کہ برے فعل کے بدنتیجہ کو انسان دیکھ سکتا ہے مگر خود ہی اس کی طرف سے آنکھیں بند کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نتیجہ ایک خطرناک رنگ میں ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ قیامت کے دن ہو گا یا جیسا کہ بعض وقت اس دنیا میں بھی ہوتا ہے جب بدی اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اگر عالم دنیا میں دوبارہ جائیں تو پھر وہی کام کرینگے۔ کیونکہ ان کے بدافعال کے نتائج تو پھر اسی رنگ میں ہونگے جیسے اب ہیں۔ اور ان کے اندر اخفا کا رنگ ہو گا۔ وہ کھلا رنگ نہ ہو گا جس کا ظہور قیامت میں ہوتا ہے اس لئے وہ ان کاموں سے رکیں گے بھی نہیں۔ اس دنیا میں بھی انسان کی یہی حالت ہے کہ ایک فعل کے بدنتائج کو دیکھتا ہے مگر ذرا ان سے نجات ہوئی پھر اس بدفعل کا ارتکاب کرتا ہے ✦

آخرت پر یقین کا فائدہ

٩٣٠ بدی کی اصل وجہ یہی ہے کہ انسان زندگی بعد الموت کا انکار کرتا ہے۔ ہر ایک بدفعل کا نتیجہ چونکہ اس دنیا میں نہیں ملتا اس لئے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بدفعل کر لیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ آخرت پر یقین ہی انسان کے اندر اپنے افعال کی ذمہ داری کا پورا پورا احساس پیدا کرتا ہے ان ھی الا حیاتنا الدنیا کہنے سے مراد یہ ہے کہ اپنی زندگی کی غرض کھانے پینے سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتے ✦

وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ ۚ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ○ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۳۲

اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوتے ہونگے دیکھو وہ بوجھ برا ہی جو اُٹھا رہے ہیں ۹۳۱ اور دنیا کی زندگی صرف

إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ ۖ وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○

کھیل اور بے حقیقت شغلہ ہی اور آخرت کا گھر یقیناً اُن لوگوں کے لئے بہتر ہی جو تقویٰ کرتے ہیں پھر کیا تم عقل کو کام نہیں لیتے ۹۳۲

ساعة — ۹۳۱ الساعة. ساعة اصل میں زمانہ کے اجزا میں سے کسی جزو کا نام ہی اور اس سے مراد قیامت بھی لی جاتی ہی اور ساعة بمعنی قیامت تین طرح پر بولا جاتا ہی یعنی محاسبہ کیلئے لوگوں کا اُٹھایا جانا یا ساعت کبری ایک نسل کا یا ایک قوم کا فنا ہو جانا یا ساعت وسطیٰ۔ ایک انسان کی موت یا قیامت صغریٰ جیسا کہ حدیث میں ہی من مات فقد قامت قیامتہٗ دیکھو ۱۰۰۵

بغتة — بغتة. بَغْت کے معنی ہیں کسی چیز کا ناگہاں اس طرف سے آجانا جہاں سے گمان نہ ہو (غ)۔ +

فرط — فرطنا. فَرَطَ کے معنی ہیں قصد کر کے آگے بڑھنا۔ اور فارِط یا فَرَط متقدم یعنی آگے جانے والے یا آگے بڑھنے والے کو کہا جاتا ہی جیسا کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا انا فرطکم علی الحوض یا جیسا چھوٹے بچے کے جنازہ کی دعا میں ہی اللھم اجعلہ

افراط تفریط — لنا فرطاً اور اِفراط یہ ہے کہ آگے بڑھنے میں حد سے تجاوز کرے اور تفریط یہ کہ آگے بڑھنے میں کوتاہی کرے ما فرطت فی جنب اللہ (الزمر ۳۹ - ۵۶) ما فرطتم فی یوسف (یوسف ۱۲ - ۸۰)۔ +

وذر — اوزار. وِذْر کی جمع ہی جس کے معنی بوجھ ہیں اور مراد گناہ ہی اور وَزَر کے معنی جائے پناہ ہیں جو پہاڑ میں ملے (غ)،

لقاء اللہ کا مرتبہ — اللہ کی ملاقات یا لقاء اللہ کا مرتبہ انسان کے اعلیٰ سے اعلیٰ کمال کا مرتبہ ہی اور اس کا جھٹلانا گویا انسان کے کمال کی ترقیات کا جھٹلانا ہی جتنی اعلیٰ غرض انسان اپنے سامنے رکھتا ہی اسی قدر اپنے خداداد قویٰ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتا ہی اور لقاء اللہ سے یا اخلاق اللہ میں رنگین ہونے سے بڑھ کر کوئی مقصد انسانی زندگی کا نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اس مقصد کو چھوڑتا ہی وہ اپنی اغراض کو صرف دنیوی زندگی تک محدود کر لیتا ہی اور اپنے اعلیٰ قویٰ کو بیکار کر دیتا ہی اور جس بوجھ سے وہ بچنا چاہتا ہی یعنی خدا کیلئے جدوجہد اس سے بہت بڑھ کر بوجھ اسے اُٹھانا پڑتا ہی +

لہو — ۹۳۲ لھو وہ چیز ہے جو انسان کو اسبات سے جو اس کیلئے ضروری اور اہم ہی روک کر دوسری طرف مشغول کر دے (غ)،

لہو اور لعب میں فرق — لہو اور لعب دیکھو ۷۳۵ فرق یہ ہی کہ لعب میں خوشی کو فوراً حاصل کرنیکا خیال ہوتا ہی اور لہو صرف اصل مقصد سے روکنے والی چیز ہی گو اس سے فوری خوشی مقصود نہ ہو +

حیوٰة الدنیا سے مراد — حیوٰة الدنیا یا دنیا کی زندگی سے یہاں اور ایسے دوسرے موقعوں پر مراد وہ حصہ ہی جو لقاء اللہ کے اعلیٰ مقصد سے خالی ہے جو صرف کھانے پینے اور سفلی خواہشات کے پورا کرنے تک محدود ہی اسی لئے اس کا مقابلہ آخرت سے کیا ہی ہیں وہ اعمال جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا مدنظر ہے گو وہ کھانے پینے سے بھی تعلق رکھتے ہوں حیوٰة الدنیا کا نہیں بلکہ دار الآخرة کا حصہ ہونگے۔ یہاں یہ توجہ دلائی ہی کہ کھانا پینا اور خواہشات سفلی کا پورا کر لینا ان باتوں کا تو آخرت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو حیوانی زندگی کیساتھ اشتراک ہی پس جہانتک آخرت کی تیاری کا سوال ہی جہانتک لقاء اللہ کے اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھنے کا سوال ہی اس پر کھانے پینے وغیرہ سے کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اس لحاظ سے یہ صرف ایک کھیل اور بے حقیقت بات ہی کیونکہ لھو وہ چیز ہی جو انسان کو اعلیٰ مقصد سے دور رکھتی ہی۔ اگر انسان عقل خداداد سے کام لے تو اسے سمجھ آجائے کہ ایک اعلیٰ مقصد کو ترک کرنا اس کیلئے کس قدر نقصان دہ ہی +

۳۳ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ

ہم خوب جانتے ہیں کہ جو وہ کہتے ہیں وہ تجھے غمگین کرتا ہی پر وہ تجھے نہیں جھٹلاتے لیکن ظالم اللہ کی باتوں کا

۳۴ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا

انکار کرتے ہیں ۹۳۳ اور تجھ سے پہلے رسول یقیناً جھٹلائے گئے سو انہوں نے جھٹلایا جانے پر اور ایذا دیا جانے پر صبر کیا

۳۵ حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِي الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ — النصف

یہاں تک کہ انکو ہماری مدد پہنچی اور اللہ کی باتوں کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں اور تیری پاس پیغمبروں کی کسی قدر خبر پہنچ چکی ہی ۹۳۴ اور اگر

كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ

تجھ پر اُن کا منہ پھیر لینا دشوار گذرتا ہی تو اگر تو طاقت رکھتا ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ تلاش کرے یا آسمان میں کوئی سیڑھی

فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ — النصف

پس اُن کو کوئی نشان لادے۔ اور اگر اللہ چاہے تو اُن کو ہدایت پر جمع کردے سو تو بے خبروں میں سے نہ ہو ۹۳۵

جحود

۹۳۳ یجحدون۔ جحود یہ ہو کہ جس چیز کا دل میں اثبات ہو اسکی نفی کی جائے اور جسکی دل میں نفی ہو اسکا اثبات کیا جائے وجحدوا بہا واستیقنتہا انفسہم (النمل ۲۷-۱۴) (غ)۔

آنحضرت کی صداقت کا اعتراف

یہ آیت اس بات پر صریح دلالت کرتی ہو کہ نبی کریم صلعم کا صدق دشمنوں تک کو مسلم تھا چنانچہ اس قسم کے واقعات جن میں ایسا اعتراف موجود ہو تاریخ میں موجود ہیں۔ حرث نے آپ سے کہا ماکذبتنا قط تو نے ہم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ابوجہل کے لفظ ہیں ان محمدا الصادق وماکذب قط محمد صلی اللہ علیہ وسلم صادق ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اور سب اہل عرب آپکو الامین کے نام سے پکارتے تھے۔ یہاں جب انکے لقاء اللہ کی تکذیب کا ذکر کیا تو ساتھ ہی فرمایا کہ یہ تجھے تو جھوٹا کہہ نہیں سکتے کیونکہ آپ نے کبھی جھوٹ نہ بولا تھا نہ کبھی کسی نے آپ کی طرف جھوٹ منسوب کیا۔ ہاں یہ آیات اللہ کا انکار ہو کیونکہ آپ کی صداقت کا انکار نہیں بلکہ اس پیغام کا انکار ہو جو منجانب اللہ آپکو دیا گیا۔

لا مبدل لکلمات اللہ کا مفہوم

۹۳۴ لا مبدل لکلمات اللہ۔ سیاق وسباق کی پروا نہ کرکے پادریوں نے ان الفاظ سے وہ کام لیا ہی جو ڈوبتا ہوا تنکے سے لیتا ہی۔ ظاہر ہو کہ آپ کی تکذیب پر آپ کو یہاں تسلی دیتے ہوئے یوں فرمایا ہی کہ پہلے رسول بھی جھٹلائے گئے۔ یہانتک کہ نصرت الٰہی آپہنچی۔ ایسا ہی تمہارے ساتھ ہوگا اور لا مبدل لکلمات اللہ کا صاف مفہوم یہی ہی کہ اس پیشگوئی کو کوئی بدل نہیں سکتا یعنی یہ پوری ہو کر رہے گی اور آگے ولقد جاءك من نبای المرسلین موجود ہی یعنی جیسا پہلے رسولوں کے دشمنوں سے ہوا ایسا ہی تمہارے دشمنوں سے ہوگا۔ مگر پادری کہتے ہیں اس سے مراد ہو کہ کتب الٰہی میں کوئی تحریف نہیں کرسکتا حالانکہ قرآن شریف نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر سابقہ کتب الہامی میں تحریف ہونیکا دعوی کیا ہو اور آج واقعات اور علوم نے اسکی تائید کی ہی۔

سُلّم

۹۳۵ سُلّم اس کا مادہ بھی سَلْم یا سلامتی ہو اور مراد اس سے وہ چیز لیجاتی ہو جس سے بلند مکان پر پہنچ سکیں اور اس سے سلامتی کی اُمید رکھی جائے یعنی سیڑھی پھر اس سے مراد ہر وہ چیز ہی جس سے کسی بلند شے کو حاصل کرسکیں جیسے سبب (غ)

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۟ وَقَالُوْا لَوْلَا ٣٦

صرف وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور مردوں کو بھی اللہ اٹھائے گا پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ۹۳۶ اور کہتے ہیں

نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۟

اس پر کوئی (بڑی) نشانی اسکے رب کی طرف سے کیوں نہ اتاری گئی کہو اللہ بے شک اس بات پر قادر ہے کہ وہ نشان اتارے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ۹۳۷ ٣٧

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ ٣٨

اور زمین میں کوئی جاندار نہیں اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے مگر وہ بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں ۹۳۸

جیسے ام لهم سلم يستمعون فيه (الطور ۳۸)۔

یہاں خطاب ہر مخاطب کو ہے لیکن اگر رسول اللہ صلعم کو بھی خطاب مانا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ نبی کریم صلعم کو ان کے ایمان لانے کی بڑی تڑپ تھی۔ تو اس لئے ان کا اعراض بڑا شاق گزرتا تھا اور آپ چاہتے تھے کہ زمین و آسمان سے کوئی ایسے نشان ظاہر ہوں کہ وہ ایمان لائیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نشانوں کا دکھانا پیغمبر کی طاقت میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اس کے ذریعہ سے کوئی معجزہ دکھا دیتا ہے۔

اگر اللہ چاہے تو انکو ہدایت پر جمع کردے پیشگوئی بھی ہو جو پوری ہوئی اور اگر معنی یوں کئے جائیں کہ اللہ چاہتا تو انکو ہدایت پر جمع کر دیتا تو مراد یہ ہے کہ انکو پیدا ہی ایسا کرتا کہ انکو نیک و بد کی تمیز نہ دی جاتی۔ اور نہ وہ عقل سے کام لے سکتے۔ جاہل اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جسکو کسی خاص بات سے ناواقفیت ہو مطلب یہ ہے کہ تم اس پیشگوئی یا اس قانون سے بے خبر نہ ہو۔

بعث سے مراد بعث روحانی

۹۳۶ مردوں کا بعث ایک تو قیامت کے دن محاسبہ کیلئے ہوگا اور ایک بعث روحانی ہے جو نبی کریم صلعم کے ذریعہ ظہور میں آنا تھا۔ کیونکہ یہ بھی ایک موت سے اٹھنا ہے دیکھو ۹۷۵ یہاں یوم قیامت کا ذکر نہیں اسلئے مراد اس سے بعث روحانی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو بالکل مردہ ہیں اور بات کو سنتے نہیں یہ بھی آخر اٹھینگے گو ابھی صرف وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے اعلموا ان الله يحي الارض بعد موتها (الروم ۵۰) اللہ زمین کو مرنے کے بعد پھر زندہ کریگا۔ زمین کی موت اس کے رہنے والوں کی موت روحانی ہے

اٰیۃ سے مراد عذاب استیصال

۹۳۷ یہاں آیت سے مراد عذاب استیصال ہے اور آیت کی تنوین تفخیم کیلئے ہے۔ جب ان کو یہ کہا گیا کہ تم مردوں میں بھی اللہ تعالیٰ پیغمبر کے ذریعہ سے روح نفخ کریگا تو بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کے وہ اعدائے حق کی عادت مستمرہ کے مطابق ہلاکت مانگتے ہیں چنانچہ اس رکوع کی آخری آیات میں صاف اس عذاب کا ذکر ہے۔ یہاں نشانات یا معجزات کے دینے سے انکار نہیں بلکہ یہ کہکر کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے بتا دیا ہے کہ عذاب بھی آخر آرہے گا۔

دابہ و طیر کے انسانوں جیسی امت ہونے سے مراد۔

۹۳۸ چرند و پرند سب تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے یہاں ذکر کفار کا ہے جن کی نظر دنیا سے آگے نہیں جو لقاء اللہ کو جھٹلاتے ہیں اور اسی حیات دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں جن کی نظر کھانے پینے اور خواہشات سفلی سے اوپر نہیں اٹھتی۔ انکو بتایا ہے کہ اس لحاظ سے تو تم میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ دوسری جگہ ایسے ہی لوگوں کا ذکر کرکے فرمایا ان هم الا كالانعام بل هم اضل (الاعراف ۱۷۹) وہ چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ بہت زیادہ گمراہ۔ دوسری توجیہ ان الفاظ کی یوں ہو سکتی ہے کہ سب انسانوں کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ دوسرے جاندار بھی تمہاری طرح ہیں جو فطرت انکو خدا نے دی ہے وہ اسکے مطابق چلتے ہیں مگر تم اپنے فطری نور کی شہادت کو رد کرتے ہو جیسا کہ فرمایا وان من شيء الا يسبح بحمده (بنی اسرائیل ۴۴) تیسری توجیہ یہ ہے کہ انسانوں

۳۹ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ

ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی پھر وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کئے جائیں گے ۹۳۹ اور جنہوں نے ہماری باتوں کو جھٹلایا بہرے اور گونگے

۴۰ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ

اندھیرے میں (رہ) رہیں گے جس کو اللہ چاہے گمراہی میں رہنے دے اور جسے چاہے اسے سیدھی راہ پر رکھے کہو بتاؤ

اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ

اگر اللہ کا عذاب تم پر آجائے یا (مقررہ) گھڑی تم کو آلے کیا تم اللہ کے سوائے (کسی اور کو) پکارو گے اگر تم

۴۱ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝ ع

سچے ہو بلکہ تم اسی کو پکارو گے سو جس کے لئے تم پکارو گے اگر چاہے تو اسے دور کر دیگا اور تم انہیں بھول جاؤ گے جنہیں تم شریک ٹھیراتے ہو

کے دو گروہوں کی طرف یہاں اشارہ کیا ہو ایک جو مثل چارپایوں کے زمین پر جھکے رہتے ہیں دوسرے جو طائر کی طرح عالم روحانیت میں پرواز کرتے ہیں یعنی کافر اور مومن +

۹۳۹ الکتاب سے مراد یہاں قرآن شریف ہی ہو۔ اس میں کوئی کمی نہیں رکھی یعنی خوب کھول کھول کر سمجھایا ہو +

حیوانات کا حشر

ثم الی ربہم یحشرون ۔ حشر کے اصل معنی اکٹھا کرنا ہیں ۔ آیا یہاں حشر سے مراد قیامت کے دن جمع کرنا ہو؟ ابن عباس سے مروی ہو کہ بہایم کا حشر انکی موت ہو (ج) بعض نے کہا کہ قیامت کے دن کا حشر مراد ہو۔ ایک حدیث میں ہو کہ بہایم میں بھی اللہ تعالیٰ عدل کریگا لیکن اس طرح حیوانات کو بھی مکلف ماننا پڑتا ہو۔ پھر اس خیال کی کہ ان میں رسول مبعوث ہوتے ہیں کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی قرآن و حدیث میں نہیں ہو۔ یہانتک کہ بعض لوگوں نے اس خیال کے رکھنے والوں کو ملاحدہ کہا ہو۔ اور انسانی شریعت کے مکلف حیوانات کو ٹھہرانا خلاف قرآن ہو کیونکہ اس میں عقل و فکر سے کام لینے کی تاکید کی ہو جو انکو عطا نہیں ہوا پس یا تو جو معنی حضرت ابن عباس سے مروی ہیں وہی درست ہیں یعنی ان پر موت آجاتی ہو اور یہ ان کی زندگی کا خاتمہ ہو مگر اس سے بھی بہتر توجیہ ان الفاظ کی یہ ہو کہ ربہم اور یحشرون میں ضمیر لوگوں کی طرف پھرتی ہو جنکا ذکر اوپر چلا آیا ہو نہ حیوانات کی طرف جنکا ذکر صرف بطور مثال ہوا ہو بلکہ ربہم میں ضمیر جو ذوی العقول کیلئے ہو اسکی تائید کرتی ہو پس مراد یہ ہو کہ انسانوں کی مثال تو دوسری جاندار مخلوق کیطرح ہو جہانتک اس سفلی زندگی کا سوال ہو جو خورد و نوش سے تعلق رکھتی ہو مگر ان میں ایک بات ان سے بڑھکر یہ ہو کہ ان کا حشر بھی اپنے رب کیطرف ہوگا یعنی اعمال کی جزا و سزا کیلئے دوبارہ اٹھائے جائینگے اگلی آیت میں اس دوسری زندگی کی تکذیب کرنے والوں کو صم بکم کہا ہو یعنی جس طرح چارپایہ نہ آواز کا مفہوم سمجھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہو یہی حالت انکی ہو بما لا یسمع الا دعاء و نداء (البقرۃ ۔ ۱۷۱) +

اریت - ارایتک

۹۴۰ ارأیتکم ۔ (رأی بمعنی علم یا جاننے سے) اَخْبِرْنِيْ کی جگہ پر ہو یعنی اسکے معنی ہیں مجھے بتاؤ اور ارایت پر کاف داخل ہوتا ہو تو ارأیتك ۔ ارأیتکم وغیرہ اس کی صورتیں ہوجاتی ہیں اور ارأیت اور ارأیتم اپنی اصل صورت پر قرآن کریم کی آیات میں جہاں جہاں آیا ہے صرف تنبیہ کے معنے میں آیا ہے (غ)

عذاب و ساعۃ کا مقابلہ

یہاں عذاب اللہ اور ساعۃ کو الگ الگ کرکے بیان کیا ہو۔ کیونکہ ساعۃ سے مراد انکی تباہی یا ان کی قوت

ع ۵ / ۹

عذاب استیصال اور چھوٹے عذاب

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ ۴۲

اور بلا شبہ ہم نے تجھ سے پہلے قوموں کی طرف (رسول) بھیجے تب ہم نے ان کو تکلیف اور دکھ میں مبتلا کیا تاکہ وہ

يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ ۴۳

عاجزی کریں ۹۴۱ تو جب اُن پر ہمارا عذاب آیا کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی لیکن اُن کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے اُن کے

الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۴۴

لئے خوبصورت کر دکھایا جو وہ کرتے تھے ۹۴۲ سو جب انہوں نے اسے چھوڑ دیا جس کی اُن کو نصیحت کی گئی تھی ہم نے اُن پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے

حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝

یہاں تک کہ جب اس پر بہت خوش ہو گئے جو انہیں دیا گیا تھا ہم نے انکو اچانک پکڑ لیا تب وہ مایوس ہو گئے ۹۴۳

شوکت کے جاتے رہنے کی گھڑی ہے جو ان کی ساعۃ وسطیٰ ہے اور عذاب سے مراد اس سے چھوٹا عذاب ہے عذاب یا ساعۃ کے وقت ان کا اللہ تعالیٰ کو پکارنا اور اپنے شرکاء کو چھوڑ دینا تنسون ما تشرکون واقعات میں سے ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ بھی فرمایا دعوا اللہ مخلصین له الدین۔ (یونس ۳-۲۲) اور فیکشف ما تدعون

دعائے اضطرار

الیہ ان شاء میں بتایا کہ جب اضطرار کی حالت میں بندہ اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو بعض تکالیف کو جنہیں چاہے اللہ تعالیٰ دور بھی کر دیتا ہے۔ ان شاء میں بتا دیا کہ بعض وقت اس کی مشیت یہ بھی ہوتی ہے کہ جب عذاب استیصال آجاتا ہے تو پھر وہ دور نہیں کیا جاتا۔ اسی کے متعلق فرمایا ما دعاء الکافرین الا فی ضلل (الرعد ۲-۱۴) اسی لئے اگلے رکوع کی پہلی آیت میں بتایا کہ معمولی عذاب بھیجنے سے ہماری غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کریں +

ضرع۔ تضرع

۹۴۱ یتضرعون۔ ضَرَعَ اور تَضَرَّعَ کے معنی ہیں عاجزی اور پستی کا اظہار کیا (ل) +

عذاب دینے کی غرض

یہاں ایک عام قانون بیان فرمایا ہے کہ دکھوں اور تکلیفوں کے بھیجنے سے اللہ تعالیٰ کی غرض صرف یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور تکبر کو چھوڑ کر خدا کے حضور عاجزی کا اظہار کریں پس دکھ اور تکلیف کے آنے سے انسان کو یہ فائدہ اُٹھانا چاہئے کہ خدا کی طرف جھکے اور دنیوی زندگی کی ظاہری نمایشوں پر فریفتہ نہ رہے۔ یہ وہ دکھ اور تکلیفیں ہیں جو عذاب استیصال سے پہلے آتی ہیں +

بدعملی کو اچھا کر کے دکھانا شیطان کا کام ہے

۹۴۲ یہاں صفائی سے بتا دیا کہ انسان جو عمل بد کرتا ہے تو ان کو مزین کر کے دکھلانے والا شیطان ہوتا ہے نہ خدا۔ یہ آیت ان آیات کے حل کرنے میں اصول محکم کے طور پر ہے جہاں تزئین کے فاعل کا ذکر نہ ہو اور جس فعل کو اچھا کر کے دکھایا گیا ہے وہ فعل بد ہو +

۹۴۳ جب تھوڑی مصیبت سے قوم فائدہ نہیں اُٹھاتی تو پھر بڑی مصیبت کا آنا لازمی امر ہے مگر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تھوڑی تکلیف جب دور ہو جاتی ہے تو پھر ہر قسم کے آسایش کے سامان میسر آجاتے ہیں اور لوگ اس پر خوش ہو کر سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ ایک معمولی بات تھی قالوا قد مس اٰباءنا الضراء والسراء (الاعراف ۱۲-۹۵)

۴۵ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ
یوں اس قوم کی جڑ کاٹ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا اور سب تعریف اللہ کیلئے ہے جو جہانوں کی پرورش کرنے والا ہے ۹۴۴ کہو کیا تم نے

اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰي قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۭ
غور کیا اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں لیجائے اور تمہارے دلوں پر مہر لگادے اللہ کے سوائے کون معبود ہے جو تم کو یہ لادے

۴۶ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ
دیکھو ہم کس طرح باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں پھر بھی یہ پھر جاتے ہیں ۹۴۵ کہو بتاؤ اگر اللہ کا عذاب تم پر

عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝
اچانک یا کھلا کھلا آجائے (تو) کیا سوائے ظالم لوگوں کے کوئی (اور) ہلاک کیا جائیگا ۹۴۶

دبر۔ دابر

۹۴۴ دابر۔ دُبُر کے معنی پیٹھ ہیں اور دَابِر متاخر اور تابع کو کہتے ہیں یعنی جو پیچھے رہ جائے مکان کے اعتبار سے ہو یا زمانہ کے یا مرتبہ کے (غ) اور اصل یا جڑ بھی اس سے مراد لی جاتی ہے (ج) دابر قوم کے کاٹ دینے سے مراد قوم پر عذاب استیصال کا آنا ہے جس سے ان کی شوکت و قوت ٹوٹ جائے یہ ضروری نہیں کہ سب کے سب لوگ مرجائیں اہل مکہ کا عذاب استیصال ان کا مغلوب ہوجانا ہی تھا۔ اور جنگ بدر کے ذکر میں ہے و یرید اللہ ان یحق الحق بکلمٰتہ ویقطع دابر الکٰفرین (الانفال۔ ۷) حالانکہ ان کے چند سردار مارے گئے تھے۔ مگر چونکہ قوم کی قوت ٹوٹ گئی اس لئے اس کو جڑ کاٹنے سے تعبیر کیا ہے۔

دابر قوم کے کاٹ دینے سے مراد

قوم کب ہلاک ہوتی ہے

ظالم قوم کی ہلاکت کے بعد یہ لفظ لاکر الحمد للہ رب العٰلمین یہ بتایا کہ کسی قوم کا استیصال اللہ تعالےٰ عالمین کی ربوبیت کیلئے کرتا ہے یعنی جب قوم کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ ربوبیت عالمین میں حارج ہوتی ہے اور نیکی کی بالکل جڑ کٹنے لگتی ہے تب اس کا استیصال کر دیا جاتا ہے۔

تصاریف

۹۴۵ نصرف الآیات۔ تصریف کے معنی وہی ہیں جو صرف کے ہیں یعنی ایک حالت سے دوسری حالت کیطرف پھیرنا مگر تصریف میں کثرت پائی جاتی ہے (غ)۔

یہ انہی لوگوں کو فرمایا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابل میں سخت دلی اختیار کر رہے ہیں پہلی قوموں کا حال سنا کر اب ان کو تنبیہ کرتا ہے کہ اگر تم اسی طرح مخالفت میں لگے رہو گے تو جانتے ہو نتیجہ کیا ہوگا؟ تمہارے کان ہونگے پر سنو گے نہیں۔ آنکھیں ہوں گی پر دیکھو گے نہیں۔ دل ہوں گے پر سوچو گے نہیں۔ اللہ تعالےٰ کا لے جانا یہی ہے کہ ان کے فائدہ سے محروم کردے گا کیونکہ اس کا قانون یہی ہے کہ جب ایک قوت سے انسان کام نہیں لیتا تو وہ بیکار ہوجاتی ہے۔

۹۴۶ بغتۃ۔ اچانک جس کے نشانات پہلے سے ظاہر نہ ہوں۔ جھرۃ۔ کھلا کھلا جس کے علامات بھی پہلے سے نمایاں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب کبھی ایک رنگ میں ظاہر ہوتا ہے کبھی دوسرے میں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ۴۸

اور ہم پیغمبروں کو نہیں بھیجتے مگر خوشخبری دیتے ہوئے اور ڈراتے ہوئے پس جو کوئی ایمان لائے اور اچھے کام کرے تو ان پر کوئی ڈر نہیں

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○ ۴۹

اور نہ وہ پچھتائیں گے اور جو لوگ ہماری باتوں کو جھٹلاتے ہیں انہیں عذاب پہنچے گا اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ ۵۰

کہو میں تم کو نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم کو کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ○

میں کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا سوائے اسکے جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے کہو کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں سو کیا تم غور نہیں کرتے تھے؟

نیکی کی خاطر نیکی

۹۴۷ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو خزانوں سے مالا مال کر دیا اور بہت سی آئندہ کی خبریں انکو بتا دیں یہاں تک کہ جو جو حالات اس اُمت کو پیش آنے والے تھے وہ سب بتا دیئے۔ اور جب چاروں طرف شرک و بدی کی ظلمت پھیل رہی تھی آپ ایک فرشتہ کی طرح ہر ایک قسم کی آلایش سے پاک رہے۔ لیکن ایمان لانے کیلئے نیکی کرنے کیلئے یہ لالچ نہیں دیتے۔ نیکی کی خاطر نیکی کرنا اعلےٰ سے اعلیٰ رنگ میں اس کی تعلیم اگر کسی نے دی تو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ اس لئے فرمایا کہ ان کو کہدو کہ اللہ کے خزانوں کا مالک میں نہیں وہ جسے چاہے دے۔ غیب کا مالک میں نہیں۔ فرشتہ میں نہیں تمہاری طرح بشر ہوں پس میں تم کو حصول کمال انسانی کیلئے بلاتا ہوں وہی اصل غرض میری دعوت کی ہے مجھے قبول کرو تو اس میں کوئی دنیوی ملونی نہ ہو۔ کوئی نفسانی خواہش نہ ہو۔ فخر نوع انسان صرف کمال انسانی کی طرف بلاتا ہے +

آنحضرت کی عصمت

ان اتبع الا ما یوحی الی میں کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا سوائے اس کے جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک تو رسول اللہ صلعم کی عصمت پر شہادت ہے کہ آپ صرف احکام الٰہی کی پیروی کرتے ہیں نہ کسی خواہش نفس کی نہ کسی دوسرے کی۔ دوسرے آپکے کمال کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ قرآن شریف میں وحی تعلیم کے رنگ میں موجود ہے آپ اس سب کی پیروی کرتے ہیں گویا جن کمالات کا ذکر قرآن شریف نے کیا ہے وہ سب آپ میں موجود ہیں قرآن علم ہے تو آپ عمل ہیں۔ تیسرے آپ کے پیروؤں کو بتایا کہ وہ اگر کمال کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اتباع قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی ان کے لئے ایک راہ ہے اسی لئے آیت کا خاتمہ اس پر کیا ہے کہ اعمیٰ اور بصیر برابر نہیں۔ اعمیٰ وہ ہے جو ان کمالات سے غافل رہا۔ بصیر وہ ہے جس نے ان کو دیکھ لیا اور پھر ان کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گیا +

کمال عمل

ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق عمل امور دینی میں قابل اتباع نہیں منشائے الفاظ کے بالکل برعکس ہے یہاں تو یہ بتایا ہے کہ جو عمل رسول اللہ صلعم سے ثابت ہو وہ آپ کی خواہش نفسانی سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ہے خواہ وہ وحی جلی ہو یا خفی +

۵۱ وَأَنذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُم مِّن دُونِهِ وَلِيٌّ

اور اسکے ساتھ ان کو ڈرا جو خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کئے جائیں گے اُن کے لئے اسکے سوائے نہ کوئی دوست ہوگا

ع ۵ ۱۴ — توحید کو ماننے والے

۵۲ وَلَا شَفِيعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ

اور نہ کوئی سفارش کرنے والا تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں ۹۴۸ اور اُن کو نہ نکال جو صبح اور شام اپنے رب کو پکارتے ہیں

وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ۖ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ

اسکی رضا چاہتے ہیں تجھ پر اُن کے حساب میں سے کچھ (ذمہ واری) نہیں اور نہ اُن پر تیرے حساب میں سے کچھ (ذمہ واری) ہے

۵۳ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهَٰؤُلَاءِ

کہ تو ان کو نکال دے پس ظالموں میں سے ہوجائے ۹۴۹ اور اسی طرح ہم اُن میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ تکلیفوں میں ڈالتے ہیں تاکہ وہ کہیں کیا یہی ہیں جن پر

۵۴ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا ۗ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ ۝ وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ

اللہ نے ہم میں سے احسان کیا ہے کیا اللہ شکر کرنے والوں کو نہیں جانتا ۹۵۰ اور جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں

يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۖ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ

جو ہماری باتوں پر ایمان لاتے ہیں تو کہو تم پر سلامتی ہو تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے

---

۹۴۸ قرآن کریم کا انذار تو سب کے لئے ہے یہاں خصوصیت سے بعض لوگوں کے انذار سے مراد یہ ہے کہ انہی کی صورت میں انذار کی غرض حاصل ہوتی ہے کیونکہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ انذار کی پروا نہیں کرتے اس لئے ان کو انذار کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ یہ انذار جس کا یہاں ذکر ہے اس قبیل سے ہے جیسا فرمایا انما تنذر من اتبع الذکر (یٰس ۳۶-۱۱) یا انما تنذر الذین یخشون ربھم بالغیب (فاطر ۳۵-۱۸)۔

مسلمان غربا کے متعلق کفار قریش کا مطالبہ

۹۴۹ پہلے مسلمان اکثر غربا میں سے تھے بعض حبشی غلام تھے۔ رسول اللہ صلعم ان کے ساتھ مل کر بیٹھتے اور باتیں کرتے تھے۔ قریش اپنے فخر قومی پر نازاں تھے۔ رسول اللہ صلعم کو کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں کو پاس سے اُٹھا دو تو ہم تمہارے پاس بیٹھیں گے مگر اسلام کا تو اصل مقصد ہی یہی تھا کہ انسانیت کے اشتراک کے سامنے تفریق رنگ و قوم تفریق وجاہت و مرتبہ۔ تفریق مال و دولت کو مٹا دے۔ خدا کی رضا کو چاہنے والا ہی بڑا انسان ہے خواہ کسی قوم سے ہو۔ یا کسی رنگ کا ہو۔ اسی کے مطابق یہ آیت نازل ہوئی اس کا ہرگز یہ منشا نہیں نہ کہیں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے انکو نکال دینے کا ارادہ کیا تھا بلکہ یہ کفار کے اس مطالبہ کا جواب ہے۔

فتن

۹۵۰ فتن کے اصل معنی سونے کا آگ میں ڈالنا ہے تاکہ میل دور ہوجائے (غ)۔ اسیطرح جب ایک انسان کو دکھوں میں ڈالا جاتا ہے تو اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جب غرض یہ ہو کہ اس کے کمالات اور خلوص کو ظاہر کیا جائے کیونکہ تکالیف شاقہ میں پڑے بغیر کمالات ظاہر نہیں ہوتے نبی کریم صلعم کے ساتھ غربا و ضعفا تھے انکو کفار نے نہ صرف حقارت کی نظر سے

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ

کہ جو کوئی تم میں سے ناوانی سے برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو وہ بخشنے والا

رَّحِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ قُلْ ۵۵ ۵۶

رحم کرنے والا ہے ۹۵۱ اور اسی طرح ہم باتوں کو کھولکر بیان کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے کہو

اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَاۗءَكُمْ

مجھے روک دیا گیا ہے کہ میں انکی عبادت کروں جنکو تم اللہ کے سوائے پکارتے ہو کہو میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کرونگا

قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّىْ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ۭ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ۵۷

اس صورت میں میں یقیناً گمراہ ہو جاؤنگا اور ہدایت پانے والوں سے نہیں ہونگا ۹۵۲ کہو میں بلا شبہ اپنے رب کی ایک کھلی دلیل پر قائم ہوں اور تم نے اسکو جھٹلایا؟ میرے پاس وہ نہیں جسکی تم جلدی کرتے ہو

ع ۱۳

ماسبق اعمال

چھوٹے کس طرح بڑے بنتے ہیں

دیکھا بلکہ ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیں۔ نتیجہ کیا ہوا لیقولوا میں لام عاقبت کا ہی کہ یہی غریب لوگ جب دکھوں میں ڈالے گئے تو ان کے کمالات دنیا میں ظاہر ہوئے اور آخر کفار کو بھی تعجب ہوا کہ کس طرح اللہ تعالےٰ نے ان لوگوں پر احسان کیا۔ اور ان کو ایسے بلند مقام پر پہنچایا مگر کس لئے؟ اس لئے کہ وہ شاکر تھے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی انہوں نے قدر کی اور ان کو ضائع نہیں کیا۔ اس میں دنیا کی کمزور قوموں کیلئے خوشخبری ہو کہ اگر وہ بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کریں تو انکو بھی اللہ تعالیٰ بڑا بنا دیگا۔

۹۵۱ ناواقفیت سے غلطی ہو جائے تو وہ قابل معافی ہو لیکن عمداً بدیوں پر اصرار کرنا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو جان لینے کے باوجود بری راہ کو چھوڑنے کی کوشش نہ کرنا اس کا نتیجہ ہلاکت ہو۔

نہی

۹۵۲ نہیت۔ نہی کے معنی کسی چیز سے روکنا۔ قول سے ہو یا فعل سے اس میں کوئی فرق نہیں ونہی النفس عن الھویٰ (النزعٰت ۷۹۔ ۴۰) میں یہ مراد نہیں کہ انسان اپنے نفس کو کہتا ہے کہ تو بدی نہ کر بلکہ اس سے مراد ہو عملاً شہوات سے اس کا الگ کر دینا اور جس چیز کی طرف نفس کی خواہش ہو اس سے بچ جانا۔ اسی لئے نہی عن المنکر کبھی ہاتھ سے ہوتی ہے کبھی زبان سے اور کبھی دل سے۔ پھر خدا کی نہی کچھ اس عقل کی وجہ سے ہے جو اس نے ہم میں رکھی ہو اور کچھ اس شریعت کی وجہ سے جو اس نے ہم کو دی ہو (غ)

آنحضرت کا بت پرستی سے بچا رہنا

یہاں فرمایا کہ رسول اللہ صلعم کو غیر اللہ کی عبادت سے روکا گیا ہے تو یہ روکنا قول سے تو بعد نبوت ہو اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فعل سے آپ کو بچپن سے بت پرستی وغیرہ سے روکے رکھا جیسا کہ تاریخ کی اس پر گواہی ہے کہ آپ کبھی مشرک نہیں ہوئے اور اسی طرف عقل اور فطرت سلیم نے آپ کو ہدایت کی۔ یہاں شرک کو ان کی اھواء قرار دے کر بتا دیا کہ فطرت اور عقل جو اللہ تعالےٰ نے انسان کے اندر ودیعت کی ہے۔ وہ توحید کی طرف ہی ہدایت فرماتی ہو۔

۵۸ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ۝ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ

حکم اللہ کا ہی ہے وہ حق بیان کرتا ہو اور وہ فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے ۹۵۳ کہو اگر وہ میرے پاس ہوتا جسکے لئے تم جلدی کرتے

۵۹ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ

تو میرے اور تمہارے درمیان معاملہ کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہو اور اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں

لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا

سوائے اس کے انکو کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہو جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہو اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے۔

وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

اور کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں نہیں اور نہ کوئی ہری چیز اور نہ خشک مگر وہ ایک کھلی کتاب میں ہے ۹۵۴

فصل — **۹۵۳** الفاصلین۔ فَصْل کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری سے الگ کر دینا یہاں تک کہ دونوں میں فرق ہو جائے۔ اس لئے مکان سے الگ ہونے کو بھی کہا جاتا ہو ولما فصلت العیر (یوسف ۱۲۔۹۴) اور یوم الفصل وہ دن ہو جو حق کو باطل سے الگ کر دیتا ہو۔ اسی سے فیصلہ کرنا ہو (غ)+

بینة — مفردات میں ہو کہ بینة کھلی دلیل کو کہتے ہیں عقلی ہو یا محسوس اور یہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے توحید پر قیام اور بت پرستی سے علی بیزاری کو بینة کی وجہ سے بتایا ہو یعنی جس چیز کی طرف وحی و عقل نے ہدایت کی ہو وہ ایک واضح دلیل ہو+

وسعت رحمت الٰہی — محمد رسول اللہ صلعم جیسا وسیع دل انسان کوئی نہیں ہوا۔ اپنے دشمنوں سے جس قدر عملی نرمی اور محبت کا ثبوت آپنے دیا ہو دوسرے کسی انسان کی زندگی میں وہ نہیں ملتا۔ لیکن خدا کا رحم اور محبت بہت بڑھکر وسیع ہیں فرماتا ہو کہ ان کے جرائم اس قدر ہیں کہ اگر انسان کے اختیار میں ان کا سزا دینا ہوتا تو خواہ رسول اللہ صلعم ہی ہوتے ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا جیسا کہ اگلی آیت میں صاف فرمایا مگر خدا بہت بردبار ہو۔ وہ انسان کو بڑی مہلت دیتا ہے۔ آج بھی اس کا وہی قانون کام کرتا ہو۔ لوگ چاہتے ہیں فلاں قوم جلد تباہ ہو جائے مگر وہ جو فیصلہ کرنے والا ہو وہ خوب جانتا ہو کہ کب کس کی تباہی کا وقت ہو+

حکم خدا کے ماتحت حکم — ان الحکم الا للہ سے یہاں مراد صرف دشمنوں کی سزا کا حکم ہو کہ وہ اللہ کے اختیار میں ہو کسی انسان کے نہیں جیسا کہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں اور کوئی حکم دینے والا ہے ہی نہیں۔ کیونکہ یہ خلاف واقعہ ہو۔ اہل قرآن کا اس آیت سے ان احکام دینی کے خلاف استدلال کرنا جو احادیث میں نبی کریم صلعم کی زبان سے مروی ہیں سیاق و سباق عبارت کے خلاف ہو علاوہ ازیں ادنیٰ عقل سے بھی جو شخص کام لے وہ دیکھ لیگا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کسی کا کسی کو حکم دینا خدا کے حکم میں ہی داخل ہو۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہی سب احکام دیئے+

مفاتح — **۹۵۴** مفاتح مَفْتَح کی جمع ہے جس کے معنی خزانہ ہیں مِفْتَح یا مِفْتَاح کی جمع بھی ہو سکتی ہو جس کے معنی کنجی ہیں مگر اول معنی

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ ۶۰

اور وہی ہے جو رات کے وقت تمہاری قبض روح کرتا ہے اور جو کچھ تم دن کو کرتے ہو جانتا ہے پھر وہ تم کو اس میں اٹھاتا ہے

لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ع

تاکہ ایک مقررہ وقت پورا کیا جائے پھر اسی کی طرف تمہارا لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تم کو خبر دیگا جو تم عمل کرتے تھے ۹۵۵

جو سدی سے مروی ہیں یہاں زیادہ موزون ہیں۔ مفردات میں دوسرے معنی یبکریوں توجیہ کی ہے کہ مراد اس سے وہ اسباب ہیں جن سے اس کے اس غیب تک پہنچا جاتا ہے جس کا ذکر فلا یظھر علیٰ غیبه احدا (الجن ۷۲۔ ۲۶) میں ہے +

کتاب کتاب مبین سے یہاں مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے جیسا کہ خود سیاق عبارت سے ظاہر ہے کہ ہر ایک چیز کے علم کا ذکر کر کے آخر پر یہ لفظ لائے ہیں جو اس علم کے قایم مقام ہیں اور مفردات میں ہے کہ کتاب اللہ سے مراد اس کا علم اور اس کا حکم بھی ہوتے ہیں +

دلیل قرآنی کا دوہرا کام اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ اعمال کی جزا و سزا کا تعلق علم سے ہے۔ کوئی عمل ظاہر کرے یا چھپا کر کرے اللہ تعالیٰ اسے یکساں جانتا ہے۔ علاوہ ازیں خشک ہو کر گرنے والے پتے میں اس قوم کی طرف اشارہ بھی ہے جس کا عروج اب جانیوالا ہے۔ زمین کی تاریکیوں میں دانہ جو اب اُگ کر درخت بنے گا خود اسلام ہے مطلب یہ کہ یہ سب کچھ ہونا ہی ہو کر تو رہے گا مگر اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ترقی تدریجاً ہوگی۔ بسا اوقات قرآن کریم کی دلیل دو کام کرتی ہے۔

قوموں کا عروج و زوال ایک طرف اللہ تعالیٰ کے علم کامل کا ذکر کیا جو اس کی توحید کی دلیل ہے دوسری طرف یہ بھی بتایا کہ قوموں کا زوال و عروج کس طرح ہوتا ہے اور کہ زوال قوم کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ خشک پتہ کی طرح خوبیوں سے خالی ہو جاتی ہے اور عروج ایک دانہ کی طرح ہوتا ہے جو زمین میں بویا جاتا ہے اور درخت بن جاتا ہے +

توفّی بمعنی نیند ۹۵۵ یتوفّٰکم۔ توفی کے لئے دیکھو ۴۴۲ مفردات میں ہے قد عُبِّرَ عن الموت والنوم بالتوفی یعنی توفّی سے مراد موت ہوتی ہے یا نیند۔ توفی اصل میں قبض روح کا نام ہے۔ پھر اس کا استعمال دونوں حالتوں پر ہے۔ قبض تام جو موت کے وقت ہوتا ہے۔ اور قبض ناقص جو نیند کے وقت ہوتا ہے۔ مگر یہ لفظ قبض روح کیلئے خاص ہے جسم انسانی کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جانے پر کبھی نہیں بولا جاتا۔

کس چیز کی قبض ہوتی ہے نیند اور موت پر لفظ توفی کے مشترک طور پر بولنے میں یہ اشارہ ہے کہ جو چیز نیند کے وقت قبض کی جاتی ہے وہی موت کے وقت قبض کی جاتی ہے۔ اور وہ تمیز ہے جس پر انسان کے اعمال کا مدار ہے۔ اور جو حیوان اور انسان میں مابہ الامتیاز ہے۔ اسی لئے رات کی توفی کے بعد یہ فرمایا کہ جو دن کو تم کرتے ہو سے جانتا ہے یعنی جب تمہاری تمیز تمہاری طرف لوٹ آتی ہے۔ تب تمہارے اعمال محاسبہ میں آتے ہیں +

جرح جرحتم جَرْح کے معنی ہتھیار کے ساتھ اثر کرنا یا زخم ہیں اور جَرَحَ الشیٔ کے معنی کَسَبَ ہوتے ہیں یعنی کمایا (ل)

جوارح۔ اجتراح اور جوارح انسان کے اعضا ہیں جن سے کماتا ہے اور اِجْتِراح کے معنی اکتساب اثم یا گناہ کا کمانا آتے ہیں (غ) ام حسب الذین اجترحوا السیئات (الجاثیة ۴۵۔ ۲۱) +

پچھلی آیت کیطرح اس آیت میں بھی ایک طرف علم الٰہی کا ذکر کیا جو اس کی توحید پر دلیل ہے اور دوسری طرف بتایا کہ جو کچھ انسان حالت بیداری میں کرتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے اور اس پر وہ نتائج مترتب فرماتا ہے کیسطرح ہوتا ہے اور اس کی غرض کیا ہے اگلے رکوع میں بیان فرمایا +

ع ۱۴

۶۱ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰىٓ اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ

اور وہ غالب ہو اپنے بندوں سے بالا تر ہے اور تم پر حفاظت کرنے والے بھیجتا ہو یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی

محاسبہ اعمال کی غرض

۶۲ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ

موت آتی ہو ہمارے بھیجے ہوئے اس کو قبض کر لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے ۹۵۶ پھر وہ اپنے مولا برحق کی طرف لوٹائے جاتے ہیں

۶۳ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ۝ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

دیکھو حکم اسی کا ہے اور وہ بہت جلد حساب لینا رہتا ہے کہو کون تم کو خشکی اور تری کی مشکلات سے نجات دیتا رہتا ہے

تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝

(جب) تم اس کو عاجزی سے اور چھپ کر پکارتے ہو اگر وہ ہم کو اس سے نجات دے تو ہم یقیناً شکر کرنے والوں میں سے ہونگے ۹۵۷

حفظہ

حفاظت اعمال کا قانون۔

۹۵۶ حفظۃ۔ حافظ کی جمع ہو۔ مراد اعمال انسانی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا وان علیکم لحافظین کراما کاتبین یعلمون ما تفعلون (الانفطار ۸۲: ۱۰-۱۲) اور یقیناً تم پر حفاظت کرنیوالے مقرر ہیں معزز لکھ لینے والے جو تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں اور یہ جو فرمایا له معقبات من بین یدیه ومن خلفه یحفظونه من امر الله۔ (الرعد ۱۳: ۱۱) تو اس سے بھی مراد یہی اعمال کی حفاظت کرنیوالے ملائکہ ہیں اور یحفظونه اسلئے فرمایا کہ یہی چیز انسان میں سے حفاظت کے قابل ہو کیونکہ اسی سے انسان کی دوسری زندگی یا زندگی بعد الموت پیدا ہوتی ہو ایسا ہی فرمایا قد علمنا ما تنقص الارض منهم وعندنا کتاب حفیظ (ق ۵۰: ۴) یعنی جو چیز زمین ان سے کم کرتی ہو اس کو ہم جانتے ہیں اور ہمارے پاس کتاب ہو جو محفوظ رکھ لیتی ہو یعنی جو حفاظت کے قابل چیز ہو وہ محفوظ رکھ لی جاتی ہو اور اجزائے زمینی زمین میں مل جاتے ہیں۔ اس حفاظت اعمال کو بتلانے کی غرض یہ ہو کہ انسان اپنے اعمال کی اصلاح کرے اور جو کام کرے یہ سمجھ کر کرے کہ اس کا ایک نتیجہ بھی پیدا ہوگا جسے وہ دیکھ کر رہے گا۔

توفی میں جسم نہیں لیا جا سکتا۔

توفته رسلنا۔ رسول یا بھیجے ہوئے یہاں وہ ملائکہ ہیں جو ارواح کو قبض کرتے ہیں۔ اگر توفی کے معنی جسم کو لینے کے ہوتے تو یہاں الفاظ چاہتے ہیں کہ وہی معنی لئے جاتے کیونکہ یہاں نہ صرف خدا انسان کو پورا لینے کیلئے اپنے رسولوں کو بھیجتا ہو۔ بلکہ یہ بھی ساتھ کہدیا کہ وہ کوئی کمی نہیں کرتے یعنی کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑتے جو لینے کے قابل ہو۔ پس اگر توفی میں جسم خاکی بھی کبھی لینے کے قابل ہوتا ہو تو سب انسانوں کے جسم خاکی بھی ملک الموت کو ساتھ لیجانے چاہئیں۔ ثم ردوا الی الله (پھر اللہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں)، اگلی آیت میں بھی قابل غور ہو حالانکہ جسم خدا کی طرف نہیں لوٹائے جاتے بلکہ ارواح لوٹائی جاتی ہیں۔

ظلمات

تضرع

۹۵۷ ظلمات سے مراد یہاں شدائد ہیں یعنی مشکلات یوم مظلم اس دن کو کہتے ہیں جس میں بڑی تکالیف پیش آئیں (مفردات)۔
تضرعا۔ حالت عاجزی میں چونکہ انسان بے بس ہو کر گڑگڑاتا ہو اسلئے مراد علی الاعلان پکارنا ہے یعنی بلند آواز سے اور آخرت سے دنیا کے عذاب کی طرف مضمون کو منتقل کر کے سمجھایا ہو کہ اللہ تعالیٰ صرف بندہ کی اصلاح چاہتا ہو چنانچہ جب اس دنیا میں انسان پر دکھ آتا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہو تو اللہ تعالیٰ اسکو اس تکلیف سے نجات عطا فرما دیتا ہو۔

قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ ٦٤ ٦٥

کہو اللہ تم کو اُن سے اور ہر سختی سے نجات دیتا ہے پھر تم شرک کرتے ہو ۹۵۸ کہو وہ اس پر قادر ہے

عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ

کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں گروہ گروہ

شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ

بنا کر خلط ملط کر دے اور تم میں سے بعض کو بعض کی لڑائی (کا مزہ) چکھا دے دیکھو ہم کس طرح باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں تاکہ وہ

يَفْقَهُوْنَ ۝ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝ ؕ ٦٦

سمجھ لیں ۹۵۹ اور تیری قوم نے اسے جھٹلا دیا حالانکہ وہ حق ہے کہو میں تم پر داروغہ نہیں

کرب

۹۵۸ کرب شدید غم کو کرب کہتے ہیں اس کا اصل مفہوم زمین کو کھود کر الٹ پلٹ کرنا ہو پس ایسا غم جو نفس میں اس طرح ہیجان پیدا کرے کرب ہے (غ) ۔

بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا رحم اس قدر بڑا ہو کہ تم شرک کرتے کرتے بھی جب اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہو تو وہ تمہاری مصیبت کو دور کرتا ہو مگر باوجود اس کے پھر جب تکلیف سے نکلتے ہو تو خدا کو چھوڑ دیتے ہو۔ اس مہذب زمانہ میں بھی یہی حال ہو۔ فرق یہ ہے کہ اس وقت کے بت مال و دولت اور سلطنت ہیں انکی پرستش دلوں پر ایسی غالب ہو کہ اس کے سامنے خدا کا نام بھی بھول جاتا ہو۔ ہاں جب تکلیفیں انتہا کو پہنچتی ہیں تو خدا یاد آتا ہو ۔

فوق اور تحت کے عذاب سے مراد

۹۵۹ من فوقکم۔ او من تحت ارجلکم سے ایک مراد تو اوپر اور نیچے سے جیسے ہواؤں آندھیوں یا زلزلوں غرق وغیرہ سے لی گئی ہو۔ مگر زیادہ قرین قیاس ائمۃ السوء یعنی اعلیٰ اور سفلۃ الناس یعنی ادنیٰ طبقہ یعنی امرا یا ضعفاء ہیں (ح) بعض وقت ایک قوم اس لئے ہلاک ہو جاتی ہو کہ ان کا اعلیٰ طبقہ خراب ہو جاتا ہو اور بعض وقت اُس لئے کہ عوام الناس یا ادنیٰ طبقہ خراب ہو جاتا ہو یا وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے ہیں یعنی عوام الناس تو وہ بڑوں کو ہلاک کر دیتے ہیں جیسے بولشوک

لبس

یلبسکم شیعاً۔ لبس کے معنی خلط ملط کر دینا ہیں یعنی باہم فساد ہو جانے ۔

اعدائے اسلام میں باہم جنگ کا عذاب

اس آیت میں نبی کریم صلعم کے مخالفین کا ذکر ہو جو توحید الٰہی کو دنیا میں پھیلنے سے روکتے ہیں۔ مگر قرآن کریم چونکہ ہمیشہ کیلئے ہو اور اس کا پیغام توحید بھی دنیا میں ہمیشہ ہی پہنچتا رہے گا اور لوگ بھی اس کی مخالفت ہمیشہ ہی کرتے رہینگے اس لئے آیندہ زمانہ کے مخالف بھی اس میں شامل ہیں۔ حدیث میں بعض قوموں کا ذکر آتا ہو جو آخری زمانہ میں اسلام کو مٹانا چاہینگے۔ اور ان کے متعلق آتا ہو لا یدان لاحد بقتالھم ان کے ساتھ جنگ کرنے کی مسلمانوں کو طاقت نہیں ہوگی۔ اس لئے ان کیلئے عذاب بھی اسی رنگ کا ہوگا کہ وہ خود باہم جنگ و جدال سے ایک دوسرے کو کمزور کر دیں۔ اور قرآن کریم میں جو عیسائیوں کا ذکر آتا ہو والقینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیامۃ (المائدۃ۔ ٦٤) وہ اسی کا موید ہو یعنی باہم بغض و عداوت ان کے لئے عذاب کا رنگ اختیار کریگا۔ آج اگر ایک طرف جنگ عالمگیر قرآن شریف کی اس پیشگوئی کو سچا ثابت کر رہی ہو تو دوسری طرف بولشوزم کا خطرہ بھی یذیق بعضکم باس بعض کا نظارہ

۶۷ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ

ہر ایک پیشگوئی کے لئے ایک وقت مقرر ہے اور تم جان لوگے ۹۶۰ اور جب تو اُن لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیتوں کے متعلق بیہودہ

اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ

باتیں کرتے ہیں تو اُن سے منہ پھیرے یہاں تک کہ اس کے سوائے کسی دوسری بات میں لگ جائیں اور اگر شیطان تجھے

الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○

بھلادے تو یاد آجانے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ ۹۶۱

ہی پیش نظر رہا ہے۔ ہاں چونکہ قرآن کریم کے ہر بیان میں دوہری غرض ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو بھی ضمناً سمجھایا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف جنگ وجدال نہ کریں ورنہ یہ انکی کمزوری کا موجب ہوجائیگا۔

امت محمدیہ کی ہلاکت باہمی فساد سے۔

حدیث میں آتا ہے کہ اس اُمت کی ہلاکت کا موجب ان کا باہمی فساد ہوگا۔ ابوداؤد میں ہے لا یسلط علیہم عدواً من سوی انفسہم فیستبیح بیضتہم یعنی ان کے اپنے لوگوں کے سوائے دوسرا کوئی دشمن ان پر مسلط نہ کریگا جو ان کو بالکل نیست و نابود کردے بلکہ باہم جنگ وجدال سے ہلاک ہوں گے مسلمانوں کی تاریخ پر جو شخص غور کریگا وہ دیکھیگا کہ مسلمانوں کے باہمی فسادہی ان کی ہلاکت کا موجب ہوئے ہیں اور آج جب سلطنت باقی نہیں رہی تو بھی جدال کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی حدیث میں آتا ہے کہ مجھے دو خزانے دیئے گئے ہیں ایک احمر یعنی سرخ اور ایک ابیض یعنی سپید۔ یہ سپید خزانہ ملنا ابھی باقی ہے آپ کے

آنحضرت کے لئے سرخ وسپید خزانوں کا وعدہ

خزانے آپ کی اُمت ہی ہیں۔ اسلام کی پہلی ترقی مشرقی ممالک کیطرف ہی۔ اب مغربی ممالک میں اس کے ظہور کا وقت آیا ہے اور یہی سپید خزانہ ہے بس عذاب استیصال اللہ تعالیٰ نے اسلام کے پہلے دشمنوں پر بھی اسی رنگ کا بھیجا کہ انکی شوکت ٹوٹکر وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے اور پچھلے مخالفوں کیلئے بھی ایسا ہی مقدر معلوم ہوتا ہے۔

قر — قرار — مستقر

۹۶۰ مستقر۔ قَرَّ کے معنی ہیں ایسا ٹھہر گیا کہ وہاں سے ہلا نہیں کیونکہ قُرّ ٹھنڈک کو کہتے ہیں جو سکون کو چاہتی ہے جیسے حرمی حرکت کو چاہتی ہے اسی سے قُرّۃ عین ہے آنکھ کی ٹھنڈک اور زمین کو قرار اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہ انسان کے لئے استقرار کی جگہ ہے۔ اور مستقر استقرار کی جگہ ہے اور یہاں مراد وقت استقرار و وقوع ہے۔ مراد یہ ہے کہ پیشگوئی تو پوری ہوکر رہے گی مگر اپنے وقت پر۔

مجلس استہزا میں شمولیت سے روکنے کی وجہ غیرت دینی ہے

۹۶۱ خوض کے لئے دیکھو ۴۹؎ یہاں مخاطب رسول اللہ صلعم نہیں ہیں بلکہ ہر ایک مسلمان سامع ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے اس لئے روکا ہے کہ ان کی صحبت کے اثر سے متاثر ہوجائیگا اور دین کی عظمت دل سے نکل جائیگی۔ دیکھو ۴۹؎ جہاں منافقوں کے ذکر میں پھر اس سے روکا ہے۔ قرآن کریم کی ہر ایک تعلیم اعلیٰ درجہ کے اعتدال پر مبنی ہے تنگدل لوگوں کی طرح عام اصول نہیں بنا دیا کہ فلاں قوم چونکہ تمہاری مخالف ہے اسلئے ان کے پاس مت بیٹھو ان سے بات چیت نہ کرو

صحبت بد کا اثر

نہ ہی افراط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ صحبت بد کے اثر کی پرواہی کوئی نہ کی ہو۔ پہلی صورت اول میں دنیا کے کاروبار رک جاتے صورت ثانی میں لوگ اپنے اخلاق اور روحانیت کو تباہ کر بیٹھتے۔ اس لئے فرمایا کہ ملکر بیٹھنے باتیں کرنے کی ضرورتیں تو ناگزیر ہیں مگر ایسا نہ ہو کہ ایسی صحبتوں کو عام کرتے کرتے یہاں تک نوبت پہنچے کہ مذہبی بے غیرتی کو قبول کرلو اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر علانیہ ہنسی ہورہی ہو تو ایسی مجلسوں میں بھی شریک رہو اس خاص بات کا ذکر اسلئے کیا کہ یہ روحانیت کو ایک بدیہی نقصان پہنچانے

وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَلَٰكِن ذِكْرَىٰ لَعَلَّهُمْ ۶۹

اور اُن لوگوں پر جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں انکے حساب میں سے کچھ (ذمہ داری) نہیں لیکن یہ نصیحت ہے تاکہ وہ

يَتَّقُونَ ○ وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ ۷۰

بچیں ۹۶۲ اور اُن لوگوں کو چھوڑ دے جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور بے حقیقت تماشا بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے انکو دھوکے

الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهِ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ

میں ڈالا ہوا ہے اور اس (قرآن) کے ساتھ نصیحت کر کہ کوئی جان اپنی وجہ سے جو اُس نے کمایا محروم (نہ) کی جائے اُسکے لئے اللہ کے سوائے

اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ وَإِن تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا أُولَٰئِكَ ۷۱

کوئی دوست نہیں اور نہ کوئی سفارش کرنے والا اور اگر ہر ایک قسم کا بدلہ دینا چاہے تو اس سے نہ لیا جائیگا یہ وہ ہیں

الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ○ ع

جو اس کی وجہ سے جو انہوں نے کمایا محروم کئے گئے اُنکے لئے کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب ہوگا اس لئے کہ وہ کفر کرتے تھے ۹۶۳

والی چیز ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ جب انسان اپنے اخلاق اور روحانیت کو کھلا نقصان پہنچتا دیکھے تو ایسی صحبت کو ترک کرے آج کل کی بیشتر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مجالس بھی اس نقصان سے خالی نہیں بوجہ ناواقفیت دین کے یہ لوگ بجائے کوئی مفید گفتگو کرنے کے ایسی باتوں میں لگے رہتے ہیں جن کا اثر دین کو نقصان ہے۔ کسی کی غیبت کسی کی عیب جوئی کچھ ہنسی ٹھٹھا ہوتا ہے پھر رات کو بہت دیر تک یہ مجالس گرم رہتی ہیں نماز سے محروم رہتے ہیں صبح دیر سے اُٹھتے ہیں۔ دین و دنیا دونوں کو برباد کرتے ہیں +

۹۶۲ یہاں بتایا کہ ساتھ بیٹھنے سے یہ تو نہیں کہ انسان ان کے افعال کا ذمہ وار ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ ایک نصیحت ہے تاکہ مسلمان خود ان کے اثر بد سے بچتے رہیں۔ یا مراد یہ ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے پاس خاطر سے وہ لوگ بھی دین کے ساتھ استہزا کرنے سے بچ جائینگے +

بسل — ۹۶۳ تُبسَل۔ بَسْل کے معنی کسی چیز کا روک دینا ہیں اور یہاں مراد ثواب سے محروم کر دینا ہیں (غ) حرام اور بسل میں فرق یہ ہے کہ حرام وہ ممنوع ہے جو حکم سے ہو یعنی یہ کہہ دیا جائے کہ یہ چیز ست کھاؤ یا قہر سے کہ اس سے جبراً روک دیا جائے گویا یہ عام ہے اور بَسْل خاص ہے یعنی جس سے قہراً روک دیا جائے (غ)

حمیم — حمیم۔ سخت گرم یا کھولتے ہوئے پانی کو کہتے ہیں اور حمّام مشہور ہے۔ اور حمیم دوست کو کہتے ہیں اس لئے کہ وہ دوستی کی وجہ سے خشمناک ہوتا ہے۔ اور حُمّی بخار کو کہتے ہیں (غ) +

ہم صحبتوں کو نصیحت کی ضرورت — یہاں یہ بتایا کہ یہ کافی نہیں کہ ایسے ہمنشینوں سے ہی بچے جو دین سے استہزا کرتے ہیں بلکہ جن کے پاس بیٹھے ان کو نصیحت بھی کرتا رہے۔ بہ میں ضمیر قرآن شریف کی طرف ہی جاتی ہے اور نصیحت کا پیرایہ یہ بتایا کہ اپنے آپکو ثواب یعنی اعلیٰ مقامات سے محروم کر لینا اچھا نہیں +

ع ۹ / ۱۳ / ۱۵ — مذہب توحید اور حضرت ابراہیم

۷۱ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ

کہو کیا ہم اللہ کے سوائے اسے پکاریں جو ہم کو نفع نہیں دیتا اور نہ ہی ہمکو نقصان پہنچا سکتا ہے اور کیا ہم اپنی ایڑیوں پر لوٹائے جائیں اسکے

هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ

بعد کہ اللہ نے ہمیں سیدھا رستہ دکھا دیا اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے زمین کے اندر حیران بنا کر خواہشات کی پیروی میں لگا دیا اسکے ساتھی ہیں جو

اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۗ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اسکو ہدایت کی طرف بلاتے ہوں کہ ہمارے پاس آجا کہو اللہ کی ہدایت ہی (کامل) ہدایت ہے اور ہمکو حکم دیا گیا ہے کہ ہم جہانوں کے پروردگار کی فرمانبرداری کریں

۷۲ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ۚ وَهُوَ الَّذِىْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِىْ

اور کہ نماز کو قائم کرو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو اور وہی ہے جس کی طرف تم اکٹھے کئے جاؤ گے اور وہی ہے جس نے

۷۳ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۗ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۗ وَلَهُ الْمُلْكُ — الثلثة

آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور جس دن کہے گا کہ ہو تو وہ ہو جائیگا ۹۶۵ اس کا فرمانا حق ہے اور اسی کیلئے بادشاہت

ھوی — ۹۶۴ استہوت ۔ اس کا مادہ ھوی ہے جس کے معنی نفس کا شہوت کی طرف میلان ہے اور ھُوِیّ کے معنی سُقُوط من عُلُوٍّ الی سُفْلٍ ہیں یعنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا (غ) ، گویا شہوت کی طرف میلان بلندی سے پستی کی طرف گرنا ہے

استہوی — استھوتہ کے معنی راغب نے کئے ہیں حَمَلَتْهُ علی اتباع الھَوٰی یعنی اس کو خواہشات کی پیروی پر لگا دیا ۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے بلند مقام سے گرا دینا بھی معنی ہو سکتے ہیں ماحصل ایک ہے ھوی کے دوسرے معنی کے لئے دیکھو ۱۷۵۹ء

حیران — حَیْرَان حَارَ یَحَارُ سے ہے جس کے معنی ہیں متردد ہوا ۔ پس حیران جو متردد ہو یعنی نہ ادھر کا نہ اُدھر کا ۔

خواہش کے اتباع کا نتیجہ — خدا کی فرمانبرداری کے خلاف دوسری حالت خواہشات کی پیروی ہے یہاں بتایا ہے کہ ایک مسلمان اگر اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی اتباع کرے تو اس کی مثال اس شخص کی ہے جو شیاطین کے پیچھے لگ کر ایسا بھٹک جائے کہ پھر اسے رستہ نہ ملتا ہو ۔ اور یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری میں انسان کے قلب کو اطمینان ملتا ہے مگر خواہشات کی پیروی میں ایک تردد اور اضطراب اس کے لاحق حال رہتا ہے کبھی ایک طرف جھکتا ہے کبھی دوسری طرف ۔ اور یوں ایک بلند مقام سے گر کر ذلیل حالت میں آجاتا ہے اور اصحاب جو اسے بلاتے ہیں وہ اس کے پہلے ساتھی ہیں ۔

کن فیکون سے مراد — ۹۶۵ یوم یقول کن فیکون ۔ اس میں اشارہ بعث بعد الموت کی طرف ہے ۔ آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا یعنی کسی غرض کے لئے پس اسی غرض کے لئے جو تکمیل نفس انسانی ہے جو خلاصہ موجودات ہے یہ ضروری ہوا کہ اس عالم کی کمی کو اس عالم میں پورا کیا جائے اور اعمال انسانی سے انسان کو پیدا کرنا اس کیلئے مشکل نہیں جس نے پہلے اتنی مخلوق پیدا کی ۔

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ۭ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ وَاِذْ ۷۵

جس دن صور میں پھونکا جائے گا وہ غیب اور ظاہر کا جاننے والا ہے اور وہ حکمت والا خبردار ہے ع۹۶۶ اور جب

قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

ابراہیم نے اپنے بزرگ آزر کو کہا کیا تو بتوں کو معبود بناتا ہے میں تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں ۹۶۷

صُور ع۹۶۶ صُوْر۔ کے عام معنی قَرن یا سینگ کے ہیں جیسے بگل۔ لیکن لسان العرب میں صُوْر کو صُوْرَۃ کی جمع بھی قرار دیا ہے اور قتادہ اور حسن کی قرأت بجائے صُوْر کے صُوَر ہے جو صُوْرَۃ کی عام جمع ہے۔ اس پر دونوں طرح اعتراض کیا گیا ہے۔ یہ کہ صُوْر قرأت درست نہیں دوسرے یہ کہ صُوْرَۃ کی جمع صُوْر غلطی ہے۔ مگر دوسری قرأت صریحاً منقول ہے۔ اور صُوْر صُوْرَۃ کی جمع لسان العرب میں مسلم ہے۔ اور ابوعبیدہ نے بھی یہ کہا ہے اور جوہری نے کلبی سے یہ کہا ہے۔ ہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ حدیث میں صُوْر کی جگہ قَرْن کا لفظ بھی آتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نفخ فی الصُّور یا نفخ فی القَرن سے

نفخ فی الصور سچ مچ کا سینگ مراد لینا بھی درست نہیں ایسے الفاظ جو قیامت کے متعلق بولے گئے ہیں ان کی صحیح حقیقت کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں صُوْر یا قَرْن میں نفخ کرنے والے ملائکہ ہونگے اور ملائکہ کا قرن بھی کسی اور رنگ کی شے ہی ہوگی نہ وہ سینگ جس کے ذریعہ سے انسان بگل بجاتے ہیں۔ اور اصل یہ ہے کہ مراد تو نفخ فی الصور سے حشر ہے نہ کچھ اور بگل بھی جمع کرنے کیلئے بجایا جاتا ہے پس نفخ فی الصور سے اصل مراد صرف حشر یا اکٹھا کرنا ہی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ حشر جیسا کہ قرآن شریف کے متعدد مقامات سے ظاہر ہوتا ہے۔ ارواح کا صورتوں میں پھونکا جانا ہے۔ پس قرآن کریم نے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جو دونوں مفہوموں پر حاوی ہے۔ اور یہ دوسرے معنی پہلے معنی کی کسی طرح منافی نہیں ٭

اب ۹۶۷ اب ہر شخص کو جو کسی کے وجود میں لانے یا اس کی اصلاح یا اس کے ظہور کا سبب ہو اَبْ کہا جاتا ہے اس لئے اسکے معنی باپ بھی آتے ہیں اور چچا دادا دیگر بزرگوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور معلم پر بھی وجدنا اٰبآءنا علیٰ امۃ میں آباءنا سے مراد علماء لئے گئے ہیں جنہوں نے ان کی علم سے ربوبیت کی کیونکہ دوسری جگہ ہے انا اطعنا سادتنا وکبرآءنا (غ) مذہب توحید کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابراہیم کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ آپ سے موحدین کی ایک عظیم الشان نسل چلتی ہے جو دنیا میں معلم توحید ہوئی ہے اور یہ انبیاء میں آپکا فخر ہے ٭

آزر کون تھا آزر کو ابراہیم کا اب کہا ہے آیا مراد اس سے باپ ہے یا کوئی اور بزرگ۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے خیال اسی طرف جاتا ہے کہ وہ آپکے والد ہوں اس کے خلاف ایک تو یہ امر ہے کہ توریت میں حضرت ابراہیم کے والد کا نام تارخ لکھا ہے اور پھر عرب کے نساب بھی اس پر متفق ہیں اور زرقانی نے بھی تارخ ہی لکھا ہے مگر اس کا جواب تو یہ ہے کہ عربی میں آکر نام کی صورت بدل جاتی ہے۔ اور علاوہ ازیں یوسیبئس ایک یہودی مورخ نے تارخ کو آتھر لکھا ہے جو آزر سے بالکل ملتا ہے لیکن دوسری دقت یہ ہے کہ خود قرآن کریم سے اس کے خلاف شہادت ملتی ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام آزر ہو کیونکہ سورۃ ابراہیم میں یہ صاف ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم نے بڑھاپے میں یہ دعا کی ربنا اغفرلی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب اے ہمارے رب میری حفاظت فرما اور میرے ماں باپ کی اور مومنوں کی جس دن حساب ہو (ابراہیم ۴۱) حالانکہ اس اب کے متعلق ہے وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الا عن موعدۃ وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرأ منہ (التوبۃ ۱۱۴) اور ابراہیم کا اپنے اب کیلئے استغفار صرف ایک وعدہ کے سبب تھا جو اس سے کیا تھا پھر جب

۷۶ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ فَلَمَّا

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت دکھاتے رہے اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو ۹۶۸ جب

جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝

اس پر رات چھا گئی۔ اس نے ستارہ دیکھا کہا کیا یہ میرا رب ہے؟ سو جب وہ ڈوب گیا کہا میں ڈوب جانیوالوں سے محبت نہیں کرتا ۹۶۹

۷۸ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ

پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا کہا کیا یہ میرا رب ہے؟ سو جب وہ ڈوب گیا کہا اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی ہوتی

۷۹ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ

تو میں یقیناً گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا کہا کیا یہ میرا رب ہے، ؟ یہ سب سے بڑا ہے؟

اس پر کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے بریت کی پس اس اب کیلئے بڑھاپے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام مغفرت کی دعا نہ کر سکتے تھے۔ پس آزر حضرت ابراہیم کے والد نہ تھے۔ کوئی اور بزرگ تھے +

انبیاء کیلئے نور عقل کی ہدایت

۹۶۸ یہ بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ابتداء سے ہی شرک وغیرہ معاصی سے پاک ہوتے ہیں۔ اور قبل از وحی قانون قدرت کا مطالعہ بھی ان کو حق کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کی فطرت صحیح ہوتی ہے ان کا نور قلب دھندلا نہیں ہوتا ان کی عقل ٹھوکر نہیں کھاتی ان کا فکر ان کو صحیح نتائج پر پہنچاتا ہے +

۹۶۹ ھذا ربی۔ موقنین میں سے تو ابراہیم پہلے ہی ہو چکے ہیں اور بت پرستی سے شرک سے بیزار بلکہ دوسروں کے شرک پر تعجب کرتے ہیں اتتخذ اصناما الھۃ اس لئے وہ ستارہ کو دیکھ کر کبھی دل میں یہ وہم بھی نہیں لا سکتے کہ وہ ان کا رب ہے۔ اگلی دو آیات کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ان کا اپنی قوم کے ساتھ مباحثہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ جب ان کی قوم کا سب سے بڑا دیوتا سورج بھی ڈوب جاتا ہے تو وہ صاف اس قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ اور پھر آگے صاف آتا ہے وتلک حجتنا اتینھا ابراھیم علی قومہ۔ پس ھذا ربی استفہام انکاری ہے جس میں حرف استفہام محذوف ہے جیسے حضرت موسیٰ کے قول میں فرعون کیلئے وتلک نعمۃ تمنھا علی ان عبدت بنی اسرائیل جس کے معنی ہیں کیا یہ نعمت ہے؟ یا بطور استعجاب ہے +

افول

ستاروں وغیرہ کا قانون میں جکڑے ہوئے ہونا اور معبود نہ ہونا

فلما افل۔ افول اجرام نورانی کے غائب ہونے پر بولا جاتا ہے جیسے چاند ستارہ وغیرہ ستارہ کے ڈوب جانے سے حضرت ابراہیم قوم پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جو چیز کبھی سامنے آ جائے اور کبھی غائب ہو جائے وہ خود انسان کی طرح کسی قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور معبود نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک جسمانی چیز ہے جو کبھی آنکھوں کے سامنے اور کبھی غائب ہے۔ انی لا احب الآفلین میں یہ اشارہ ہے کہ جس چیز سے تم محبت کرتے ہو وہ خود بے اختیار ہے۔ خدا سے محبت کرنے سے تو ایسا تعلق اس ذات پاک سے پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر وہ اس انسان سے الگ نہیں ہوتا مگر ایسی چیز سے محبت کا کیا فائدہ جو خود قانون کے اندر اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ محبت کرنے والا اٹھتا رہ جائے وہ غائب ہو جاتی ہے +

فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ ۸۰

پھر جب وہ ڈوب گیا کہا اے میری قوم میں اس سے بری ہوں جو تم شرک کرتے ہو ۹۷۰ میں نے راستہ روی اختیار کرتے ہوئے اپنی توجہ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ۭ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّىْ ۸۱

اسکی طرف پھیر دیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہی اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں اور اسکی قوم نے اس سے جھگڑا کیا کہا کیا تم مجھ سے اللہ کے

فِى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ۭ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّىْ شَيْئًا ۭ وَسِعَ

بارے میں جھگڑتے ہو اور اس نے مجھے یقیناً ہدایت کی ہی اور میں اس سے نہیں ڈرتا جسکو تم اس کے ساتھ شریک کرتے ہو ہاں یہ کہ میرا رب کچھ چاہے میرا رب

رَبِّىْ كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ ۸۲

علم میں تمام چیزوں پر حاوی ہی پس کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے ۹۷۱ اور میں کس طرح اس سے ڈروں جسکو تم شریک بناتے ہو اور تم نہیں ڈرتے کہ تم نے

اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ۭ فَاَىُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ

اللہ کے ساتھ اسے شریک بنایا ہی جس کے لئے اس نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری پس دونوں گروہوں میں سے کون امن کا زیادہ حقدار ہی اگر تم

وقف لازم

تَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ ۸۳

جانتے ہو ۹۷۲ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ خلط نہیں کیا انہیں کے لئے امن ہی اور وہ ہدایت پانے والے ہیں ۹۷۳

قوم ابراہیم کا بڑا دیوتا سورج تھا

ف ۹۷۰ معلوم ہوا کہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا سورج تھا کیونکہ اس پر لاکر ختم کر دیا ھذا اکبر میں جو ھذا ربی کی طرح استفہام انکاری ہی یہ بتا بھی دیا ہی یہی وجہ ہے کہ البقرۃ ۲۵۸ میں حضرت ابراہیم نے سورج کے مغرب سے نکالنے کا مطالبہ کیا ہی +

ف ۹۷۱ جیسا کہ باطل پرستوں کا قاعدہ ہوتا ہی جب ابراہیم کی دلائل کا کوئی جواب بن نہیں آیا تو معلوم ہوتا ہی اس کو ڈرایا ہی کہ ہمارے دیوتا تمہیں نقصان پہنچائیں گے اسی کا جواب دیا ہی کہ مجھے ان سے کچھ خوف نہیں۔ ہاں مشیت ربی کے تحت کوئی نقصان پہنچے تو پہنچے۔ اس ہی میں گھبراتا بھی نہیں +

ف ۹۷۲ مالم ینزل بہ سلطنا۔ کسی نبی کی تعلیم میں یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے شرک کا حکم دیا ہی۔ یا صرف یہ مراد ہے کہ کوئی عقلی دلیل شرک کی موجود نہیں +

ف ۹۷۳ ظلم کے مختلف معنی میں سے ایک شرک بھی ہیں۔ اور حدیث متفق علیہ سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہاں ظلم کے معنی شرک بیان فرمائے۔ اور قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال فرمایا ان الشرك لظلم عظیم (لقمان ۳۱-۱۳) اور خود اس سورت کا مضمون بھی توحید ہی ہے۔ پس ایمان کے بعد اگر شرک کی ملونی نہ ہو تو انسان امن کو پائیگا ورنہ نہیں +

ع ۱۰ ۵ ۱٦

سب انبیاء کا مذہب توحید تھا۔

۸۴ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝

اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے خلاف دی ہم جسکو چاہتے ہیں مرتبوں میں بلند کرتے ہیں بیشک تیرا رب حکمت والا جاننے والا ہو ٩٧٤

۸۵ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ

اور ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب دیئے ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی اور نوح کو ہم نے پہلے سے ہدایت دی اور اس کی نسل سے داؤد

۸٦ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَ

اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو (ہدایت دی) اور اسی طرح ہم احسان کرنیوالوں کو بدلہ دیتے ہیں ٩٧٥ اور زکریا اور

۸۷ يَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا

یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو (یہ) سب صالحین میں سے تھے اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو اور ان سب کو ہم نے

۸۸ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

جہانوں پر فضیلت دی ٩٧٦ اور انکے باپ دادوں میں سے اور انکی نسل سے اور انکے بھائیوں سے اور ہم نے انکو برگزیدہ کیا اور ہم نے انکو سیدھی راہ کی طرف ہدایت دی

---

٩٧٤ یہ دلیل جس کا بیان ذکر ہو توحید الٰہی پر ہو جیسا کہ اوپر ذکر آچکا اور اسی توحید پر قائم ہونے کو ہی بلندی درجات قرار دیا ہو۔ اور یہ سچ بھی ہو کہ توحید پر مضبوطی سے قایم ہو جانا تمام نیکیوں کی جڑ ہو اور اسی سے مراتب بلند ہوتے ہیں +

٩٧٥ یہاں ہدایت دینے سے مراد توحید الٰہی پر قایم کرنا ہو ذریتہ میں ضمیر حضرت ابراہیم کی طرف بھی جاسکتی ہو مگر اولیٰ حضرت نوح کی طرف پھیرنا ہو اور قریب تر بھی نوح ہی ہیں۔ اور لوط حضرت ابراہیم کی ذریت سے نہیں +

بعض انبیاء کے ناموں کو اکٹھا کرنے کی وجہ اور غیر تاریخی ترتیب میں حکمت

٩٧٦ ان آیات میں اٹھارہ انبیاء کے نام لئے ہیں یعنی اول ابراہیم پھر آپ کا بیٹا اسحاق پھر اسحاق کا بیٹا یعقوب پھر ابراہیم کے جد نوح جن کی ذریت کا آگے ذکر کیا ہو۔ یہانتک تو ایک ترتیب ہو مگر اس سے آگے بلحاظ زمانہ کوئی ترتیب نہیں رکھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے زمانوں کی ترتیب کی خبر نہ تھی کیونکہ اس سے اگلی ہی سورت میں نہایت صفائی سے انبیاء کا ذکر ترتیب تاریخی میں کیا ہو۔ بلکہ یہاں ایک اور رنگ کی ترتیب دی ہو یعنی اول ظاہری شوکت کے لحاظ سے داؤد اور سلیمان کا ذکر کیا جن کو عظیم الشان بادشاہتوں کا مالک بنایا گیا۔ پھر دکھوں اور تکلیفوں میں صبر کے مقام بلند کے لحاظ سے ایوب اور یوسف کا ذکر کیا۔ ان دونوں کو صبر کے بعد اللہ تعالیٰ نے بلند مقام پر پہنچایا پھر قوم کو نہایت ذلت کی حالت سے نکال کر اعلیٰ مقام پر پہنچانے کے لحاظ سے اور قوم کو ایک قانون اور راہ بتانے کے لحاظ سے موسیٰ اور ہارون کا ذکر کیا۔ یہ چھ نبی ایسے ہیں کہ کسی نہ کسی رنگ میں ان کو بادشاہت یا سرداری یا حکومت ملی ہو اس لئے ان کے بعد نجزی المحسنین کے الفاظ آتے ہیں۔ اس کے بعد زکریا یحییٰ عیسیٰ۔ الیاس کا ذکر کر کے ان کو صرف صالحین کہنے پر اکتفا کیا ہو یعنی ان کے صرف ایک پہلو زہد کامل کی طرف توجہ دلائی ہو اسلئے کہ دنیا میں ان کو کوئی حکومت کا رنگ نہیں ملا۔ زکریا یحییٰ عیسیٰ کا ایک ہی زمانہ اور ایک ہی رنگ سادگی۔ زہد۔ عبادت کا ظاہر ہو الیاس کا اسی رنگ میں آنا خود اس سے ظاہر ہو کہ حضرت یحییٰ کی آمد کو الیاس کی آمد ثانی

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا ٨٩

یہ اللہ کی ہدایت ہے اس کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو اُن کے وہ عمل اُن کے

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ ٩٠

کام نہ آتے جو وہ کرتے تھے ٩٧٧ یہ وہ ہیں جن کو ہم نے کتاب حکم اور نبوت دی ٩٧٨ سو اگر یہ لوگ اس کا انکار کریں تو ہم نے

فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ٩١

اس کو ایسے لوگوں کی سپردگی میں دے دیا جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں ٩٧٩ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی

فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ

سو ان کی ہدایت کی پیروی کر کہو میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا

قرار دیا گیا۔ اور اس بات کی شہادت انجیل میں موجود ہے کہ یحییٰ الیاس کے رنگ اور اس کی روح میں آیا (لوقا ۱-۱۷)
پھر اس کے بعد اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کا ذکر کر کے ان کی فضیلت کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ ان چاروں کی تحقیر کی گئی ہے جیسے حضرت اسمٰعیل کی تو نبوت سے ہی انکار کیا گیا ہے اور ان کو کسی ابراہیمی وعدہ کا وارث نہیں سمجھا جاتا۔ اور لوط کی بھی نبوت کا انکار کیا جاتا ہے۔ اور یونس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ خدا کے حضور سے بھاگ گئے تھے۔ ان کی فضیلت کا خصوصیت سے اس لئے ذکر کیا کہ ان کی تحقیر ہوئی ورنہ دوسرے انبیاء کو بھی فضیلت دی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح قرآن شریف ایک الزام کو دور کرنے کیلئے ایک نبی کے متعلق بعض تعریفی الفاظ بیان کرتا ہے اسی اصول کو نہ سمجھنے سے عیسائیوں نے یہ ٹھوکر کھائی ہے کہ حضرت مسیح کے متعلق تعریفی کلمات سے انکی دوسرے انبیاء پر فضیلت ٹھہراتے ہیں حالانکہ مراد صرف الزامات کا دور کرنا تھا اس طرح ظاہر الفاظ پر جائیں تو یہاں سے ان چار انبیاء کی دیگر سب انبیاء پر اور مسیح پر فضیلت مانیں۔

کسی نبی کی فضیلت کا ذکر الزام دور کرنے کے لئے۔

٩٧٧ یہاں ہدایت کا مقابلہ شرک سے کر کے صاف بتا دیا کہ ہدایت دینے سے مراد توحید پر قایم کرنا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی نبی شرک کا مرتکب نہیں ہوا کیونکہ کسی کا حبط عمل نہیں ہوا اور جتنے اس قسم کے قصے بنگئے ہیں وہ سب بائبل میں تحریف ہے۔

٩٧٨ باوجود اسکے کہ بعض کو بادشاہت ملی بعض کو نہیں ایک امر میں ان سب کا اشتراک بیان فرمایا ہے کہ ان سب کو کتاب اور حکم اور نبوت ضرور ملے ہیں۔ کتاب وہ وحی ہے جو نبی پر اسکی اُمت کی ہدایت کیلئے نازل ہوتی ہے حکم وہ اختیار ہے جو نبی کو دیا جاتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کا مطیع نہیں ہوتا بلکہ دوسرے انکو اپنی اطاعت کی طرف بلاتا ہے جو اسکی اُمت کہلاتے ہیں اور نبوت بلحاظ لغت وہ پیشگوئیاں ہیں جو اسکو دین کی تائید کیلئے دیجاتی ہیں اور یا اس سے مراد یہاں سفارت ہے ٩١ اور گو کتاب اور حکم نبوت میں شامل ہیں مگر ان دو خاص باتوں کا ذکر اسلئے کیا تا معلوم ہو جائے کہ منصب نبوت کی یہ ضروری شرائط ہیں یعنی ایک کتاب کا دیا جانا دوسرا حکم یا اختیار کا دیا جانا۔

منصب نبوت کی ضروری شرائط

٩٧٩ ھٰؤلاء میں اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو ان انبیا کے اتباع کہلاتے ہیں جیسے یہود و نصاریٰ۔ دوسری قوم آنحضرت صلعم کے اتباع کی ہے جو سب انبیا پر ایمان لاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ جو انبیا کے پیرو کہلاتے

ع ۱۱

۹۲ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۞ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

وہ صرف جہانوں کے لئے نصیحت ہی ۹۸۰ اور انہوں نے اللہ کو نہیں پہچانا جس طرح اس کو پہچاننے کا حق (تھا) جب یہ کہا کہ اللہ نے انسان

عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ

پر کچھ نہیں اتارا کہو کس نے وہ کتاب اتاری جو موسیٰ لایا لوگوں کے لئے نور اور ہدایت تھی

تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ ۭ

تم اسکو ورق ورق کرتے ہو ان میں سے ایک حصہ کو ظاہر کرتے ہو اور بہت سا چھپاتے ہو اور تمہیں وہ باتیں سکھائی گئیں جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا

آنحضرت صلعم کی وحی

ہیں اور ضرورت نبوت سے واقف ہیں نہ مانیں تو ہم ایک اُمّی قوم کو وہ علوم دے کر کھڑا کر دینگے۔ یہاں سے صاف معلوم ہوا کہ یہاں انبیاء کے ذکر کے بعد اہل کتاب سے خطاب ہی آیت ۹۲ و ۹۳ میں اس خطاب کو واضح کر دیا ہے۔

اقتدہ

۹۸۰ اقتدہ میں ھا سکتہ کے لئے ہی۔ اور اقتدا پیروی کو کہتے ہیں یعنی جس نمونہ پر ایک انسان پہلے چلا ہی اسی پر چلنا۔

آنحضرت کو انبیاء کی ہدایت کے اقتداء کا ارشاد اور اس کی مراد

آنحضرت صلعم کو یہ ارشاد کہ تم ان انبیاء کی ہدایت کی اقتدا کرو اس سے کیا مراد ہی۔ ظاہر ہی کہ اس آیت کے نزول سے پہلے اللہ تعالیٰ وہ ہدایت تو خود آنحضرت صلعم کو دے چکا یعنی اپنی وحی سے دے چکا۔ اور مزید برآں ان انبیاء کی کوئی کتابیں دنیا میں موجود نہ تھیں کہ ان کو پڑھکر عمل کرنے کی ہدایت ہوتی۔ اور جو کچھ ان کی تعلیم باقی رہگئی وہ خود ظنیات میں سے تھی۔ پس ان کی ہدایت کے اقتدا سے مراد صرف ان کے طریق کی موافقت ہے۔ اور مطلب یہ ہی کہ جس طرح توحید کے قایم کرنے میں انہوں نے مشکلات کا مقابلہ کیا اسی طرح تم بھی صبر سے اس کام کو کرو اور اس کے ساتھ ہی یہ الفاظ قل لا اسئلکم علیہ اجرا بتاتے ہیں کہ یہاں مراد پیغام توحید کا پہنچانا ہی ہاں ان الفاظ میں ایک اور اشارہ معلوم ہوتا ہی۔ ہدایت کے معنی منزل مقصود تک پہنچانا ہیں یعنی کمال انسانی کو حاصل کرنا۔ اب اس رکوع کی سب سے پہلی آیت میں توحید الٰہی کو ہر قسم کی بلندی درجات کا اصل موجب ٹھہرایا تھا۔ اور فی الحقیقت مختلف قسم کے کمالات انسانی توحید کے مختلف پہلوؤں سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ پس کسی نبی کی ہدایت اس کا ایک خاص کمال انسانی کو حاصل کرنا ہی۔ کسی کمال انسانی کو ابراہیم اپنے اندر لیتے ہیں تو کسی کو موسیٰ کسی کو ہارون کسی کو داؤد کسی کو سلیمان کسی کو عیسیٰ کسی کو یحییٰ کسی کو ایوب وقس علیٰ ھذا۔ پس فبھدٰھم اقتدہ کے معنی یہ ہوئے کہ جن جن کمالات کو ان انبیاء نے حاصل کیا ان تمام کمالات کو تم اکیلے اپنے اندر جمع کرو۔ وہاں کوئی داؤد ہے کوئی سلیمان کوئی ایوب کوئی عیسیٰ وغیرہ تو جن کمالات انسانی کا اظہار کرنے کے لئے یہ الگ الگ نبی ہوئے ان تمام کمالات کو تم اکیلے اپنے اندر لو۔ یہاں اقتدٰہ سے مراد شرائع کی پیروی لینا بالکل غلط ہی ایسی پیروی کا حکم ہوتا تو پھر پہلے اللہ تعالیٰ ان تمام کی کتابوں کو تحریف سے پاک کر کے آپ کو دیتا۔ اور آنحضرت صلعم کا عمل بھی یہ ثابت کرتا یعنی عملاً آپ پہلی شرائع کی باتوں کو لیکر ان پر اپنے دین کی بنیاد رکھتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا پس یہ معنی نبی کریم صلعم کے عمل کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔ آخری الفاظ میں قرآن شریف کو عالمین کے لئے نصیحت قرار دینا اسی معنی کی تائید کرتا ہی اور یا اولٰئک میں اشارہ اوپر والی قوم کیطرف ہی یعنی صحابہؓ کی طرف اور یہاں خطاب عام ہی یعنی اے مسلمانو تم صحابہ کا اقتدا کرو اور حدیث میں ہی اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جس کا اقتدا کروگے ہدایت پالیگے اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہی کہ اقتدا سے مراد صرف مطابقت ہے

آنحضرت کو تمام انبیاء کے کمالات کا جامع بنایا گیا۔

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ○ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ ٩٢

کہو اللہ نے پھر اُن کو چھوڑ دے اپنی بیہودہ بحث میں کھیلتے رہیں ٩٨١ اور یہ کتاب جسے ہم نے اتارا برکت دی گئی ہے اُس کی تصدیق کرتی

الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

ہوئی جو اس کے پہلے ہے تاکہ تو (اہل) مکہ کو ڈرائے اور اُن کو جو اس کے گرد اگرد ہیں اور جو لوگ آخرت پر

بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ○

ایمان لاتے ہیں اس پر (بھی) ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں ٩٨٢

قدر — ٩٨١ قدروا اللہ۔ قَدْر کے اصل معنی کسی چیز کی مقدار کا واضح کر دینا یا اس کا اندازہ کرنا ہیں اور یہاں مراد پہچاننا یا شناخت کرنا ہے (غ) بعض نے تعظیم کرنا یا وصف بیان کرنا بھی مراد لیا ہے۔ غرض ایک ہی ہے +

قرطاس — قراطیس۔ قرطاس کی جمع ہے جس کے معنی کاغذ ہیں۔ قراطیس بنانے سے مراد ورق ورق کرنا یا ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے +

یہود کا انکار نبوت — پچھلے رکوع میں یہ ذکر تھا کہ سب انبیاء کا مذہب توحید تھا اسی طرح محمد رسول اللہ صلعم کا مذہب ہے بلکہ آپ سب کے کمالات کے جامع ہیں پس ان انبیاء کے پیرو کہلانے والوں کا رسول اللہ صلعم کا انکار کس قدر جائے تعجب ہے مگر انہوں نے یعنی اہل کتاب نے انکار کیا بلکہ سرے سے ہی انکار کر کے کہدیا کہ اب کسی بشر پر کچھ بھی نہیں اُترتا ما انزل اللہ کا مطلب یہ نہیں کہ کبھی کچھ نہیں اُتارا بلکہ یہ کہ اب کچھ نہیں اُتارا۔ کیونکہ وہ دوسری شریعت کا انکار کرتے تھے۔ چنانچہ سدی کا قول ابن جریر میں منقول ہے کہ یہودی کہتے تھے ما انزل اللہ علی محمد من شیء اس کے جواب میں حضرت موسے کی کتاب کیطرف توجہ دلائی جس میں صاف وعدہ ہے کہ ایک نبی موسیٰ کی مانند کھڑا کیا جائیگا مگر ساتھ ہی فرمایا کہ تمہاری جو اس کے پیرو کہلاتے ہو اب یہ حالت ہے کہ تم نے اپنی کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے ایک حصہ کو ظاہر کرتے ہو مگر بہت سی باتوں کو چھپاتے ہو یعنی ان کو عمل میں نہیں لاتے۔ اس کا جواب چونکہ ان کے پاس کوئی نہیں یعنی وجہ انکار کوئی نہیں اس لئے آنحضرت صلعم کو ارشاد ہوا کہ تم کہو وہ اللہ نے ہی اُتاری تھی۔ اور اسی کے وعدہ کے مطابق اب یہ کتاب اُترتی ہے چنانچہ اگلی آیت میں اور تصریح کر دی کہ یہ اسی پہلی کتاب کی تصدیق کرتی ہے پس اس کا انکار کیونکر کر سکتے ہو۔

مکی سورتوں میں اہل کتاب سے خطاب — یہ آیات مدنی نہیں گو خطاب یہود سے ہے جیسا کہ پچھلے رکوع میں بھی ان کا ذکر کیا ہے ان یکفر بہا ھؤلاء۔ جیسا کہ اسی سورت کی آیت ۲۰ میں ذکر ہے کہ اہل کتاب آنحضرت صلعم کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں ان متواتر خطابوں کے ایک ایسی سورت میں ہوتے ہوئے جو بالاتفاق کلیۃً اور جملۃً واحدۃً مکہ میں نازل ہوئی یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوتا ہے کہ مکی سورتوں میں یہود یا اہل کتاب سے خطاب نہیں۔ کیا سورۃ بنی اسرائیل مکی نہیں جس میں یہود سے خطاب ہے یا سورہ مریم مکی نہیں جس میں عیسائیوں سے خطاب ہے +

برک۔ برکۃ / مبارک / بارک — ٩٨٢ مبارک۔ بَرَکَ کے اصل معنی کسی چیز کا لازم ہو جانا ہیں۔ اور بَرَکَۃ کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا مضبوطی سے قائم ہو جانا ہے۔ پس مبارک وہ ہے جس میں ایسی بھلائیاں ہوں (غ) بالفاظ دیگر جس کی خیر لازم ہو جائے اور منقطع نہ ہو۔ اور درود شریف میں جو آتا ہے بارک علی محمد تو اس کے معنی کئے ہیں کہ اے اللہ جو تو نے محمد صلعم

۹۴ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہی جو اللہ پر جھوٹ افترا کرے یا کہے میری طرف وحی کی گئی اور اسکی طرف کچھ وحی نہ کی گیا ۹۸۳

وَمَنْ قَالَ سَأُنْزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ ۗ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ

اور جو کہے میں اس کی مثل اتار سکتا ہوں جو اللہ نے اتارا ۹۸۴ اور اگر تو دیکھے جب ظالم موت کی سختیوں میں ہونگے

وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ ۖ

اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلا رہے ہونگے اپنی جانوں کو نکالو

کو بزرگی اور کرامت عطا فرمائی ہو اسے ثابت اور دایم رکھ (ل)، اور ابن عباس سے بَرَکَۃ کے معنی الکثرۃ فی کل خیر مروی ہیں یعنی ہر بھلائی میں کثرت، اور قرآن کریم کے لئے جو مُبَارَكٌ آتا ہی اسکے معنی کئے ہیں جسکی جانب سے خیر کثیر آتی رہتی ہو (ل)، +

ام القریٰ — اُمّ القریٰ۔ مکہ کا نام ہی اسلئے کہ زمین اس کے نیچے سے بچھائی گئی (غ)، یعنی وہ زمین کا مرکز ہو اور اسکے لفظی معنی بستیوں کی ماں ہیں۔ مگر صرف عرب کی بستیوں کی نہیں۔ ماں اس کو اس لئے کہا کہ ساری دنیا کے لئے روحانی غذا ہیر سے ملتی ہو اور پھر اسے کل اہل دنیا کا قبلہ بھی قرار دیا گیا ہو۔ اور لوگ اس کی طرف اکٹھے ہوتے ہیں جیسے بچے ماں کی طرف۔ اور یوں بھی پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہی اور نئی دنیا اس کے نیچے ہی پس وہ معنی اپنے ظاہر میں بھی درست ہیں جو امام راغبؒ نے کئے ہیں۔ یہاں اُم القریٰ سے مراد اہل اُم القریٰ ہیں +

من حولہا — من حولہا۔ جب مکہ بستیوں کا مرکز ہوا تو ظاہر ہی کہ من حولہا میں کل دنیا آگئی +

قرآن کی فضیلت دیگر کتب پر — یہاں اس کتاب کی مزید فضیلت کا ذکر کیا۔ اول یہ کہ وہ مبارک ہو یعنی اس کی خیر کبھی منقطع نہ ہوگی جس طرح پہلی کتابوں کی خیر منقطع ہوگئی۔ قرآن کریم کو توریت اور انجیل کے مقابل یا پہلی کتابوں کے مقابل پر مبارک کہنے سے منشا یہ ہے کہ اس کی برکات دایم رہیں گی۔ دوسرے وہ مصدق ہی تیسرے کل عالم کی طرف ہی جیساکہ اُم القریٰ و من حولہا سے ظاہر ہے یہ بھی بتا دیا کہ آخرت پر ایمان لانے والے اس کا انکار نہیں کرسکتے۔ انکار صرف وہی کرینگے جو صرف دنیا پر جھکے ہوئے ہیں اور دنیا کی آلایشوں میں اس قدر مبتلا ہیں کہ کمال انسانی کے حصول کی طرف جو آخرت پر ایمان کی اصل غرض ہے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے +

مخالفین کے مختلف اقسام — **۹۸۳** یہ سب نبی صلعم کے مختلف قسم کے مخالف ہیں بعض شرک وغیرہ کے عقاید بناتے تھے۔ یا جیسے عیسائی جو اللہ تعالیٰ کی طرف ایک باطل تعلیم منسوب کرتے تھے اور یہ سب اللہ پر افترا تھا۔ بعض آپ کے مقابل پر جھوٹے مدعیان نبوت یا وحی تھے یا کہانت کرتے تھے۔ یا بعض جیسے نضر بن الحرث یہ کہتے تھے کہ ہم بھی قرآن جیسی وحی بنا سکتے ہیں۔ دوسری

عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح — جگہ ان کا قول مذکور ہے لو نشاء لقلنا مثل ھذا (الانفال۔ ۳۱) اور یہ جو بعض مفسرین نے یہاں عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کا نام لیا ہے کہ اس وحی کو لکھتے لکھتے ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین .... ثم انشأنٰہ خلقاً آخر اس عجیب بیان کو سن کر بول اٹھا فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ اور یہی اگلی وحی کے الفاظ تھے جس پر وہ مرتد ہوگیا تو یہ روایت معتبر نہیں +

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ

آج تم کو رسوائی کا عذاب اس کے بدلہ میں دیا جائیگا جو تم اللہ پر ناحق افترا کرتے تھے اور تم

عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ ۹۵

اس کی باتوں سے تکبر کرتے تھے ۹۸۴ اور یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو جیسے ہم نے تمکو پہلی دفعہ پیدا کیا اور جو کچھ

مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۭ

ہم نے تم کو عطا کیا تھا وہ تم اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے وہ سفارشی نہیں دیکھتے جنکے متعلق تم جھوٹے دعوے کرتے تھے کہ

لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ع اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۭ ۹۶

یقیناً تمہارے تعلقات کٹ گئے اور وہ تم سے جاتا رہا جو تم جھوٹے دعوے کرتے تھے ۹۸۵ بیشک اللہ ہی دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝

زندہ کو مردہ سے نکالتا رہتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے یہی اللہ ہے پھر تم کہاں سے الٹے پھر جاتے ہو ۹۸۶

ع ۱۲/۶ — قدرت کے کاموں میں اور حق کی ہمیشہ کامیابی

غمر۔غمرۃ — ۹۸۴ غمرات۔ غَمْر کے اصل معنی کسی شے کے اثر کو دور کرنا ہیں اور غَمْرۃ بہت پانی کو کہتے ہیں جو اپنی جائے قرار کو ڈھانک لیتا ہے۔ اور اسی سے غمرۃ جہالت کے معنی میں آتا ہے الذین ھم فی غمرۃ ساھون (الذاریات ۱۱) فذرھم فی غمرتھم (المؤمنون ۵۴) اور موت کے شداید کو بھی غمرات کہا جاتا ہے (غ)۔

اخرجوا انفسکم حکم کے طور پر نہیں بلکہ موت کی سختی کا ذکر کیا ہے کیونکہ وہ دنیا سے اس قدر محبت کرتے ہیں اور اپنے وقت کو ضائع کر دینے پر اس قدر متاسف ہوتے ہیں کہ نہیں چاہتے کہ ان کی جان نکلے۔ مسلم کو موت کے وقت یہ دکھ نہیں ہوتا اسلئے کہ وہ لقاء اللہ کا امیدوار ہوتا ہے۔

فردیٰ۔ فراد — ۹۸۵ فرادیٰ۔ فرید اور فرد کی جمع ہے اور فرد وہ ہے جس کے ساتھ اس کا غیر نہ ملے لاتذرنی فردا (الانبیاء ۸۹)۔

خول۔تخویل — خوّلنا۔ خَوَل۔ مال یا مقبوضات کو کہتے ہیں۔ اور تخویل کے معنی ہیں ان چیزوں کا عطا کرنا جنکے تعہد کا انسان محتاج ہے (غ)۔

تقطع بینکم کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں وقع التقطع بینکم یعنی تمہارے درمیان انقطاع واقع ہو گیا اور یوں بھی تقطع وصلکم بینکم تمہارے درمیان جو ملاپ یا تعلق تھا وہ کٹ گیا۔

یہاں سمجھایا ہے کہ آخری ذمہ داری ہر انسان کی فرداً فرداً ہے وہ مال و متاع جس کے بھروسہ پر انسان خدا کو چھوڑتا ہے سب یہیں رہ جاتا ہے۔ اور اس وقت کوئی ساتھی ساتھ نہ ہوگا بڑوں اور چھوٹوں میں جو تعلقات ہیں وہ بھی کٹ جائینگے اور جن کی خاطر برائیاں کی تھیں وہ ساتھ نہ ہونگے۔

فلق — ۹۸۶ فلق۔ فَلْق۔ کسی چیز کا پھاڑ دینا اور اس کے بعض کا بعض سے الگ کر دینا اور فَلَق صبح کو بھی کہتے ہیں (غ)۔

حب۔نوی — الحب والنوی۔ حَبّ اور حَبّۃ گیہوں جَو وغیرہ کے دانہ کو کہا جاتا ہے (غ)، اور نوی۔ نواۃ کی جمع ہے کھجور کی گٹھلی اور نوی کے معنی نیت بھی ہیں (ل)۔

۹۷ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ

وہ صبح کو نمودار کرنے والا ہے اور اس نے رات کو آرام کے لئے بنایا اور سورج اور چاند کو حساب کیلئے یہ غالب علم والے کا

۹۸ الْعَلِيْمِ ○ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

اندازہ ہے ۹۸۷ اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستارے بنائے تاکہ اُن کے ذریعہ سے خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہ پاؤ

افک — تؤفکون ۔ اِفک ہر ایک چیز جو اس حالت سے پھیری گئی ہو جس پر اسے ہونا چاہئے ۔ تؤفکون کے معنی ہوں گے اعتقاد حق سے باطل کی طرف اور سچائی سے جھوٹ کی طرف اور اچھے افعال سے فعل قبیح کی طرف پھیرے جاتے (غ) ، اور لتافکنا عن الھتنا (الاحقاف ۴۶-۲۲) وہ اپنے تعطّ خیال سے کہتے ہیں اور اسی لئے اِفک جھوٹ کو کہا جاتا ہے ان الذین جاؤا بالافک (النور ۲۴-۱۱) اسی سے افاک ہے ۔ افاک اثیم (الشعراء ۲۶-۲۲۲) ✦

افاک

حق کی ابتدائی حالت اور تدریجی کامیابی — اس رکوع میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے نظارے دکھا کر اس کی توحید کا اثبات کیا ہے اور دوسری طرف ساتھ ساتھ ہی یہ بتایا ہے کہ وہ صداقت جو نبی کریم صلعم لائے ہیں ایک دانہ کی طرح نشوونما پاتے پاتے آخر کار دنیا میں غالب ہوگی ۔ ایک ہی ترکیب لفظی میں دونوں خیالات کو ظاہر کرنا کمال بلاغت اور کمال علم پر دلالت کرتا ہے ✦

دانہ اور گٹھلی کو پھاڑ کر اس میں سے پودے اور درخت بنانا کتنی بڑی قدرت کا کام ہے حق بھی مثل ایک دانہ یا گٹھلی کے ہے جس طرح ایک گٹھلی ایک ناواقف کی نظر میں نہیں جچتی اور وہ نہیں جانتا کہ اس سے ایک عظیم الشان درخت بن جائیگا اسی طرح حق کے مخالف اس سے ناواقف ہیں کہ وہ حق جس کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں کس طرح ایک دن دنیا میں مقبول ہوگا ۔ زندہ کو مردہ سے نکالنے کے یہی معنی ہیں کہ ایک کام کے لئے بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتے مگر اللہ تعالیٰ اس کو سرسبز کر دیتا ہے ۔ اور جس طرح ایک گٹھلی زمین میں پھٹکر اپنے موافق غذاؤں کو زمین سے اور ہوا سے حاصل کرکے ایک درخت بن جاتی ہے اسی طرح جو امر حق ہے وہ بھی اپنی قوت کے سامان گرد و پیش سے حاصل کرکے دنیا میں آخر پھیل جاتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنا یہ ہے کہ مخالفت اور مقابلہ کی قوت کو جس میں زندگی کے سارے سامان نظر آتے ہیں توڑ کر بالکل مردہ کر دے ۔ اور یا یہاں اہل کتاب کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ تم کو جو اپنے آپ کو زندہ سمجھتے ہو مردہ کر دیگا اور ایک ایسی قوم کو جسے مردہ سمجھا جاتا ہے کامیاب اور بامراد کر دے گا ۔ جاہلوں میں سے عالم اور عالموں سے جاہل پیدا کر دے گا یخرج میں استمرار ہے اور مخرج بھی اور اگلی آیت میں فالق میں پیشگوئی کا رنگ ہے ✦

قدر ۔ تقدیر — ۹۸۷ تقدیر ۔ قَدَّرَ اور تَقْدِیر کے ایک ہی معنی ہیں ایک چیز کے اندازہ کا واضح کر دینا اور تقدیر کے معنی قدرت عطا کرنا بھی آتے ہیں (غ) ، اور اللہ کی تقدیر اشیاء دو طرح پر ہے ایک ان کو قدرت عطا کرکے اور دوسرے ان کو اقتضائے حکمت کے مطابق ایک خاص اندازہ اور خاص وجہ پر بنانا (غ) ✦

رات کی تاریکی بھی سکون اور آرام کا موجب ہوتی ہے پس اس کی مخلوق میں کوئی چیز بے فائدہ نہیں مگر اس رات کی تاریکی کو پھاڑ کر اب صبح نمودار ہونے والی ہے ۔ سورج اور چاند کو حساب کے لئے کہکر بتا دیا کہ کس طرح یہ سب عالم ایک نظام میں منسلک ہے جس کے بنانے والی بڑی طاقتور ہستی ہے (حساب اور حُسبان کے ایک ہی معنی ہیں)

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۹۹

یقیناً ہم نے باتیں اُن لوگوں کے لئے کھول کر بیان کر دی ہیں جو علم رکھتے ہیں[۹۸۸] اور وہی ہے جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا

فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ ۱۰۰

پھر ایک ٹھیرنے کی جگہ[۹۸۹] اور ایک سونپا جانے کی جگہ یقیناً ہم نے باتیں اُن لوگوں کیلئے کھول کر بیان کر دی ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں اور وہی ہے جس نے

مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ

اوپر سے پانی اُتارا پھر اس کے ساتھ ہم ہر طرح کی روئیدگی نکالتے ہیں پھر اس سے ہم سبز کونپلیں[۹۹۰] نکالتے ہیں اس سے ہم گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں

وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ

اور کھجور سے اس کے گابھ میں سے جھکے ہوئے گچھے اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور

غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

نہ ملتے جلتے اس کے پھل کو دیکھو جب وہ پھل لائے اور اسکے پکنے کو دیکھو، یقیناً اس میں ان لوگوں کیلئے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں[۹۹۱]

---

[۹۸۸] جس خدا نے اس قدر سامان انسان کے فوائد جسمانی کے لئے بنا رکھے ہیں کیا اس نے اس کی اصل تکمیل کی غرض کا ہی کوئی سامان پیدا نہیں کیا! یہ نہیں ہو سکتا۔ پس جس کو یہ علم ہو کہ انسان کا اصل کمال محض کھانے پینے میں نہیں وہ یقیناً جان لیگا کہ تکمیل روحانی کا سامان بھی ضرور خدا تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے حدیث میں آتا ہے اصحابی کالنجوم میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں +

مستقر مستودع — [۹۸۹] مستقر کے اصل معنی جائے قرار مستودع کے معنی جائے سپردگی ہیں مفسرین نے مختلف توجیہات کی ہیں حضرت ابن مسعود نے مستقر زمین میں اور مستودع قبور میں قرار دیا ہے۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ دونوں زندگیوں کے لئے یعنی دنیوی اور اُخروی کیلئے ایک ایک مستقر ہو اور ایک ایک مستودع۔ دنیوی زندگی کیلئے مستقر رحم مادر ہے اور مستودع پیدائش کے بعد موت تک اور اُخروی زندگی کیلئے مستقر قبر ہے اور مستودع قیامت +

خضر — [۹۹۰] خضر۔ خُضرۃ سبز رنگ کو کہتے ہیں یہاں مراد سبز کونپلیں ہیں فتصبح الارض مخضرۃ (الحج ۲۲-۶۳) ثیابا خضرا (الکہف ۱۸)

رکوب متراکب — متراکبا۔ رکُوب کے اصل معنی انسان کا حیوان کی پیٹھ پر ہونا ہیں اور متراکب وہ ہے جسکا بعض بعض پر چڑھا ہوا ہو یعنی تہ بہ تہ۔

طلع — طلع۔ طَلَعَ۔ سورج کے نکلنے پر بولا جاتا ہے طلع الشمس مطلع الشمس مطلع الفجر اور کھجور کے گابھ کو سورج کے طلوع سے مشابہت کے لحاظ سے طَلع کہا جاتا ہے (غ) +

قنو — قنوان۔ قِنوٌ گچھا یا خوشہ کو کہتے ہیں تثنیہ اور جمع قنوان ہے +

دُنوٌ — دانیۃ۔ دُنُوٌّ قرب کو کہتے ہیں ذات سے ہو یا حکم کے لحاظ سے اور مکان اور زمانہ اور مرتبہ میں اس کا استعمال ہوتا ہے (غ)، اور دانیۃ سے مراد جو بوجھ سے جھک کر قریب ہو گئے ہوں +

دانیۃ

جب اور گٹھلی کو پھاڑ کر اللہ تعالیٰ کیا بناتا ہے۔ مردہ دانہ زندہ ہو کر سبز ہوتا ہے کونپلیں نکلتی ہیں اور آخر پھر دانے

۱۰۱ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَ

اور اللہ کے لئے جن شریک بنا رکھے ہیں حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لئے بے علمی سے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کر لئے ہیں وہ پاک اور

۱۰۲ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۧ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ

۱۳ ع ۱۰ ۱۹

شرک کے مختلف پہلوؤں کا ابطال

اس سے بلند ہے جو وہ بیان کرتے ہیں ۹۹۱ آسمانوں اور زمین کا عجیب پیدا کرنے والا اس کا بیٹا کس طرح ہو سکتا ہے جب اس کی کوئی

۱۰۳ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ

بیوی ہی نہیں اور اس نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۹۹۲ یہ اللہ تمہارا رب ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں

بن جاتے ہیں گٹھلی سے باغ۔ کھجور وغیرہ۔ یہ بھی ایک وقت پھل لاتے اور پھر وہ پھل پکتے ہیں اسی طرح حق بھی بڑھے گا پھولیگا اور پھر پھلیگا۔ ایمان والوں کیلئے اس میں نشان اسلئے کہا کہ حق پر ان کا ایمان ہے۔ اس کے بڑھنے پھلنے کو مثال سے سمجھا دیا۔ آج پھر حق ایک دانہ یا گٹھلی کی طرح زمین کی تاریکی میں بظاہر غائب ہوتا نظر آتا ہے۔ مگر وہ اسی طرح درخت بنکر نکلے گا جس طرح پہلے درخت بنا تھا +

جَنّ جِنّ

۹۹۱ الجن۔ جَنّ کے معنی کسی چیز کا حاسہ سے چھپانا ہیں جن علیہ اللیل (۶:۷۷) اور جِنّ روحانی یعنی غیر مرئی ہستیاں ہیں جو حواس سے چھپی ہوئی ہیں اور یہ انس کے مقابلہ پر ہیں۔ اور اس لحاظ سے ملائکہ کو بھی ان میں داخل کیا گیا ہے مگر بعض کے نزدیک جِنّ صرف خاص قسم کی غیر مرئی ہستیاں ہیں یعنی کل غیر مرئی ہستیاں تین قسم ہیں اول اخیار یعنی ملائکہ دوم اشرار یعنی شیاطین سوم درمیانی جن میں اخیار بھی ہیں اور اشرار بھی یعنی جِنّ (غ) +

خرق

خرقوا۔ خَرق کسی چیز کا قطع کرنا ہے فساد کے طور پر بغیر تدبر اور تفکر کے اخرقتہا لتغرق اہلہا (الکہف ۱۸: ۷۱) اور یہ خَلق کی ضد ہے اور خَلق ایک فعل کا کرنا ہے جو اندازہ اور نرمی سے ہو اور خَرق بغیر اندازہ کے ہے (غ) +

دو قسم کا شرک

دو قسم کے شرک کا ذکر کیا ہے۔ ایک جنوں کو شریک بنانے کا دوسرے خدا کیلئے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کرنیکا بیٹا عیسائیوں نے بنایا ہے۔ اور بعض دیگر مذاہب نے۔ بیٹیاں عرب کے بت پرست تجویز کرتے تھے۔ جن کے شریک بنانے میں مجوسیوں کے عقیدہ کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جو اہرمن کو خالق شر قرار دیتے ہیں اور تمام قسم کے شرکا بھی اس میں آجاتے ہیں کیونکہ وہ نظروں سے مستور ہی ہوتے ہیں +

اہرمن

خدا کا بیٹا ہونے کے عقیدہ کی تردید

۹۹۲ شرک کا سب سے زیادہ دھوکا دینے والا پہلو خدا کا بیٹا بنانا ہے۔ اسی کو پہلے لیا ہے۔ اس کی اصل تردید تو بدیع کے لفظ میں ہے دیکھو ۱۴۹ لیکن ایک لفظ پرست قوم کو جس نے صرف ظاہر الفاظ سے دھوکہ کھایا ہے اور حقیقت پر غور نہیں کیا ظاہر کیطرف بھی توجہ دلائی ہے کہ بیٹا اکیلے باپ سے کبھی پیدا نہیں ہوتا جس جنس کا باپ ہے اسی جنس سے ماں تجویز کرو۔ ماں انسان اور باپ خدا! پھر تیسرا جواب دیا کہ سب چیز کا خالق اللہ ہے۔ اگر بیٹا ہے تو چاہیئے تھا کہ کچھ مخلوق وہ بھی پیدا کرتا۔ چوتھا جواب علم میں دیا ہے۔ کیونکہ انجیل میں شہادت موجود ہے کہ بیٹا پورا علم نہ رکھتا تھا۔ نہ اسے غیب کا علم تھا نہ قیامت کا۔ پس صفات میں کوئی اشتراک نہیں تو بیٹا کیسا یوں اشتراک ناقص تو کل مخلوق کو حاصل ہے مگر اس سے اسے الگ کرنے کے لئے کسی بات میں اشتراک کامل بھی دکھانا چاہیئے۔ اور وہ ہے نہیں +

خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۝ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ ۱۰۴

ہر چیز کا پیدا کرنے والا سو اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے ۹۹۳ نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ

يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ۝ قَدْ جَاءَكُم بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ ۱۰۵

نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے اور وہ باریک باتوں کا جاننے والا خبردار ہے ۹۹۴ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیلیں آچکی ہیں سو جو کوئی

وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ۝

دیکھتا ہے تو وہ اپنی جان (کی بھلائی) کیلئے ہے اور جو اندھا ہوا تو اسی پر وبال ہے اور میں تم پر کوئی نگہبان نہیں ہوں ۹۹۵

۹۹۳ یہاں ہر قسم کے شرک فی العبادت کی تردید کی۔ اکثر لوگ اپنے معبودوں کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں اس لئے فرمایا کہ سب کا کارساز وہی ہے۔

درک — ۹۹۴ تدرک۔ دَرْک کے لئے دیکھو ۵۵۲ نیچے جانے کے لحاظ سے دَرْک کہا جاتا ہے جیسے اوپر جانے کے لحاظ سے دَرَج اور اس لئے سمندر کی انتہائی گہرائی کو بھی دَرَک کہا جاتا ہے اور پانی تک پہنچنے کیلئے جب ایک رسہ کے ساتھ دوسرا رسہ ملایا جاتا ہے تو اسے دَرَک کہا جاتا ہے اور انسان کو جو پیچھے آنیوالی چیز سے پہنچتا ہے۔ اسے بھی دَرَک کہتے ہیں لا تخف درکا ولا تخشیٰ (طٰہٰ ۔ ۷۷) اور

ادرک — ادراک کے معنی کسی چیز کی غایت کو پہنچ گیا بلغ اقصی الشیء حتی اذا ادرکہ الغرق (یونس ۔ ۹۰) یہی لفظ یہاں ہے اور ابصار سے مراد بعض نے یہاں آنکھ کو لیا ہے اور بعض نے بصیرت اور اس کے معنی اس کے مطابق ہیں جو حضرت ابو بکر سے روایت ہے یا مَنْ غَایَۃُ مَعْرِفَتِہٖ القُصُوْرُ عَن مَعْرِفَتِہٖ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی غایت معرفت یہی شمار کا جاتا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ کوئی شے اس سے نہیں یعنی اس جنس کی اور نہ اس کی شکل ہے بلکہ وہ ہر چیز کا موجد ہے

تدارک — جہاں تک انسان کی غایت معرفت پہنچ سکتی ہے اور تدارُک فریادرسی اور نعمت میں اکثر آتا ہے لولا ان تدارکہ نعمۃ

اذّارک — من ربہ (القلم ۔ ۴۹) اور اِدّارُک بھی اصل میں تدارک ہی ہے حتی اذا ادارکوا فیہا جمیعا (الاعراف ۔ ۳۸) یعنی ایک دوسرے کو ملنگے۔ اور بل ادّٰرک علمہم فی الاخرۃ (النمل ۔ ۶۶) یعنی آخرت کو پانے میں انکا علم انتہا کو پہنچ گیا سو وہ اس سے جاہل رہ گئے (غ)۔

لطف — اللطیف۔ لَطافۃ اور لُطف کے معنی ہلکی حرکت اور باریک امور کو پانا ہیں اور لطائف ان امور کو کہتے ہیں جن کو

لطیف — حواس نہ پاسکیں اور اللہ تعالیٰ کے لطیف ہونے سے یہ مراد بھی ہوتی ہے کہ وہ دقائق امور سے واقف ہے اور یہی یہاں مراد ہے اور یہ بھی کہ وہ اپنے بندوں کی ہدایت کرنے میں ان سے نرمی کرتا ہے (غ)۔

اللہ تعالیٰ کی رویت — خدا تعالیٰ جسم نہیں کہ نظر انسانی اس کا احاطہ کرے اور نہ ہی عقل انسانی اس کی کنہ تک پہنچ سکتی ہے۔ حالانکہ جس قدر شریک ٹھہرائے جاتے ہیں وہ سب احاطہ نظر انسانی میں آجاتے ہیں اس سے قیامت میں اللہ تعالیٰ کی رویت کی تردید نہیں ہوتی کیونکہ وہاں دوسرے قویٰ دیئے جائینگے اور یہاں ان آنکھوں یا اس عقل کے عجز کا ذکر ہے۔

بصیرۃ — ۹۹۵ بصائر۔ بصیرۃ کی جمع ہے اور قلب کی قوت مدرکہ کو کہتے ہیں (غ)۔ مراد دلائل توحید باری تعالیٰ ہیں میں حفیظ نہیں یعنی تمہارے اعمال کا نگران اور ان پر بدلہ دینے والا میں نہیں ہوں خدا ہے۔

۱۰۶ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ وَلِيَقُوۡلُوۡا دَرَسۡتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۞ اِتَّبِعۡ

اور اسی طرح ہم باتوں کو بار بار کر بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ کہیں تو نے (خوب) پڑھا ہے اور تاکہ ہم اسے اُن لوگوں کیلئے کھول کر بیان کریں جو علم رکھتے ہیں ۹۹۶ اسکی پیروی کر

۱۰۸ مَاۤ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۞ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ

جو تیری طرف تیرے رب سے وحی کیا گیا ہے اسکے سوا کوئی معبود نہیں اور مشرکوں سے اعراض کر اور اگر اللہ چاہتا تو

مَاۤ اَشۡرَكُوۡا ؕ وَمَا جَعَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ حَفِيۡظًا ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِوَكِيۡلٍ ۞

وہ شرک نہ کرتے اور ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان مقرر نہیں کیا اور نہ تو اُن کا کارساز ہے ۹۹۷

درس — **۹۹۶** دَرَسۡتَ۔ دَرَس کے معنی ہیں اثر یا نشان باقی رہا اور چونکہ باقی رہنا مٹ جانے کو بھی چاہتا ہے اسلئے

ددوس — دُرُوس کے معنی مٹ جانا بھی آتے ہیں۔ اور درس العلم کے معنی ہیں حفظ کرکے اس کے نشان کو پالیا (غ) اور درست الکتاب کے معنی ہیں اس کو بار بار پڑھکر مطیع کرلیا یا تنگ کہ اس کا یاد رکھنا آسان ہوگیا (ل)۔

دوہرانے کی غرض — لیقولوا میں لام عاقبت ہے۔ یعنی جب باتوں کو طرح طرح کے پیرائوں میں بیان کیا جاتا ہے کبھی فطرت انسان کی طرف اور کبھی قانون قدرت کی طرف اور کبھی اُمم سابقہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے تو کہدیتے ہیں۔ کہ یہ باتیں پچھلی تعلیم سے لی ہوئی ہیں اور خوب کوشش کرکے ان کو یاد کرلیا ہے۔ مگر صاحب علم لوگ اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں کیونکہ وہ امر حق کو پہچان لیتے ہیں اور یہ جان لیتے ہیں کہ مختلف قسم کے دلائل ایک ہی نتیجہ پر پہنچاتے ہیں یہی اس کی صداقت کا بیّن ثبوت ہے۔

شاء — **۹۹۷** شاء کے معنی کے لئے دیکھو ۳۲ اس کے معنی کسی چیز کی ایجاد اور اسکا پالینا ہیں دوسرے معنی ارادہ کے مرادف ہیں۔ ارادہ میں شے کا وجود میں لانا لازم نہیں گو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہو یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (البقرۃ ۔۱۸۵) اور انسان کا ارادہ ہوسکتا ہے بغیر اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس چیز کے لئے ہو جیسے انسان چاہتا ہے کہ وہ مرے اور یہ ارادہ الٰہی کے خلاف ہے اور مشیت کیلئے پہلے اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ہونا لازمی ہے ما تشاؤن الا ان یشاء اللہ (غ)۔

مشیت الٰہی متعلق شرک — لوشاء اللہ ما اشرکوا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت ایسی ہوتی تو یہ شرک نہ کرتے اور دوسری جگہ کفار کا قول منقول ہے لوشاء اللہ ما اشرکنا (۱۴۹) حالانکہ کفار کے قول کی تردید کی ہے۔ ان دو مقامات میں فرق یہ ہے کہ کفار کے قول کا منشا تو یہ ہے کہ خدا کی مشیت یہی ہے کہ ہم شرک کریں اسلئے ان کو جواب بھی یوں دیا ہے لوشاء لہدٰکم اجمعین (۱۵۰) یعنی اگر مشیت سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور کرنا ہوتا تو ہدایت پر مجبور کرتا نہ شرک پر جیسا کہ دوسری مخلوق کو اپنی فرمانبرداری کے قانون میں جکڑا ہوا ہے اور اس جگہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ایسی ہوتی تو وہ شرک نہ کرتے تو مطلب یہی ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں پیدا ہی ایسا کرتا کہ تم نافرمانی نہ کرسکتے مگر اس کے ساتھ ہی انسان کا سارا شرف دوسری مخلوق پر اُڑ جاتا۔ اسلئے ما جعلنٰک علیہم حفیظا یہاں فرمایا کہ تم انہیں مجبور کرکے شرک نہیں چھڑوا سکتے اگر مجبوری کرنا ہوتا تو اللہ تعالیٰ پیدائش میں ہی انکو مجبور کردیتا مگر اس کی مشیت ایسی نہیں ہوئی اس نے قانون بنا کر راہ دکھادی انسان کا اختیار رہا اس پر چلے یا نہ چلے شاید یہ بھی اشارہ ہو کہ آخر شرک ان میں سے مٹ جائیگا۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا

اور ان کو گالی نہ دو جن کو یہ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں (ایسا نہ ہو) کہ وہ زیادتی کر کے بے علمی سے اللہ کو گالی دیں اسی طرح ہم نے

لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ ۱۱۰

ہر ایک گروہ کے لیے ان کا عمل اچھا کرکے دکھایا ہے پھر انکے رب کی طرف ان کا لوٹ کر آنا ہے سو وہ انہیں اسکی خبر دیگا جو وہ کرتے تھے ۹۹۸ اور وہ بڑے زور کی قسموں کے ساتھ

اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ

قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر اُن کے پاس نشان آئے تو ضرور اس پر ایمان لائینگے کہو نشان صرف اللہ کے پاس ہیں اور تم کو کیا خبر ہے کہ

اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ ۱۱۱

جب وہ (نشان) آئینگے تو بھی ایمان نہیں لائیں گے ۹۹۹ اور ہم اُن کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے۔

دوسرے معبودوں کو گالیاں نہ دینے کی تعلیم

۹۹۸ مخالفین کی باتیں نہایت درجہ دُکھ دینے والی تھیں۔ بُرا کہتے تھے ہنسی اُڑاتے تھے۔ گالیاں دیتے تھے اس لئے مسلمانوں کو اب ایک اصول بتایا کہ ایسا نہ ہو تم بھی ان کے معبودان باطل کو اسی طرح سب وشتم کرنے لگو اور چونکہ یہاں شرک کی بُرائیوں کا ذکر تھا اس لئے ساتھ ہی یہ بتانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسرے کے عقاید میں جو بُرائی ہو اس کی اصلاح کے لئے اس کا بیان کر دینا تو ضروری ہے مگر حد سے تجاوز نہ ہو گالی تک نوبت نہ پہنچے ایک غلطی کا اظہار اور چیز ہے جس کی ضرورت ہمیشہ دنیا میں رہے گی۔ مگر خواہ مخواہ بُرے الفاظ سے دوسرے کے دل کو دُکھ پہنچانا جائز نہیں۔ یوں قرآن کریم ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم بھی دیتا چلا جاتا ہے۔ ایک ایسا عمدہ اصول بیان کر دیا ہے کہ جس سے مذہبی تنافر کی بجائے انسانوں میں باہم محبت پیدا ہو۔ عام طور پر اس اصول کو مد نظر نہ رکھنے سے مذہب کی خاطر انسان ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ہیں حالانکہ مذہب کی غرض یہ تھی کہ تمام انسانوں سے محبت اور آشتی ہو اس زمانہ میں عیسائیوں اور آریوں نے اس اصول کو توڑ کر باہم بغض و تنفر کا خطرناک بیج بو دیا ہے سینکڑوں کتابیں صرف دوسروں کی بُرائیاں بیان کرنے اور ان پر ہنسی کرنے پر شائع ہوتی ہیں۔ اصول سے بحث نہیں۔ کیونکہ وہاں اپنی کمزوری کو جانتے ہیں ٭

تزئین اعمال

عملہم سے مراد ان کا وہ عمل ہے جو ان کو کرنا چاہئے وہ باتیں جو انسان کی بھلائی کا موجب ہیں انکو قرآن کریم نے نہایت خوبصورت بنا کر دکھایا ہے تاکہ لوگ ان پر عمل کریں جیسے یہی اصول کہ جن کی دوسرے لوگ عزت کریں تم انہیں گالی مت دو۔ جو بُرے عمل انسان کرتا ہے وہ بھی اس کو بعض وقت اچھے معلوم ہوتے ہیں ان کا مزین کرنے والا خدا نہیں بلکہ شیطان ہے۔ جیسا کہ صاف فرمایا وزین لہم الشیطان ما کانو یعملون دیکھو آیت ۴۳ ایسا ہی دیکھو آیت ۱۳۸ جہاں بُرے کام کی تزئین شیطان کی طرف منسوب کی ہے ٭

قرآن شریف معجزات کا انکار نہیں کرتا۔

۹۹۹ اس قدر کھلے دلائل کے باوجود پھر وہی نشان مانگتے ہیں دیکھو آیت ۳۵ فرمایا ایسے معجزات بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہیں لیکن جو قوم اس قدر کھلے دلائل کو رد کر رہی ہے وہ ان معجزات سے کیا فائدہ اُٹھائے گی۔ اس آیت سے انکار معجزات نکالنا آیت کے صریح منطوق کے خلاف ہے۔ اذا جاءت کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ جس قسم کے معجزات وہ چاہتے ہیں وہ بھی ان کو مل جائینگے مگر ایمان تو دلائل سے ہی پیدا ہوگا نہ معجزات سے ٭

الجزء الثامن ۱۴

كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۟ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ

جس طرح وہ اس پر پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں بہکا ہوا چھوڑ دیں گے ۱۰۰۰ اور اگر ہم ان پر فرشتے

مشرکین کی مخالفت

اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا

نازل کرتے اور مردے اُن سے باتیں کرتے اور سب چیزوں کو اُن کے سامنے لا اکٹھا کرتے وہ ایمان لانے والے نہ ہوتے

اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ ۱۱۳

سوائے اس کے کہ اللہ چاہے لیکن اُن میں سے اکثر جاہل ہیں ۱۰۰۱ اور اسی طرح ہم نے ہر ایک نبی کے لئے انسانوں

قلب ۔ تقلیب

۱۰۰۰ نقلّب ۔ قَلْب کے معنی ایک رخ سے دوسرے رخ کی طرف پھیرنا ہیں ۔ اور تقلیب ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرتے رہنا تقلیبُ اللہِ القلوب والبصائر کے معنی ہیں صرفہا من رای الی رای ان کا ایک رائے سے دوسری رائے کی طرف پھیرتے رہنا (غ) یعنی کبھی کچھ خیال کرنا کبھی کچھ +

فؤاد

افئدۃ ۔ فؤاد کی جمع ہے ۔ اور فَأْدَ کے معنی ہیں بھونا یا جلایا ۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے دل کو فؤاد کہا جاتا ہے (غ) اور فؤاد بعض کے نزدیک دل کا بیرونی پردہ ہے اور قَلْب اس کا مرکز دل) +

وذر ۔ یذر

نذر ۔ وذر اس کا مادہ ہے مگر اس کی ماضی استعمال میں نہیں آئی ۔ اور یَذَرُ الشیئ کے معنی ہیں ایک چیز کو بے حیثیت سمجھ کر اسے پھینکدیا ونذر ما کان یعبد اٰباؤنا (الاعراف ۔ ۷۰) یذرک والہتک (الاعراف ۔ ۱۲۷) فذرھم و ما یفترون (الانعام ۔ ۱۱۳) وذروا ما بقی من الربٰو (البقرۃ ۔ ۲۷۸) ویذرون ازواجا (البقرۃ ۔ ۲۳۴) (غ) آخری موقعہ پر اس لفظ کے استعمال میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بیوہ عورت کی حیثیت نہایت درجہ کی کس مپرسی کی رہ جاتی ہے اسی لئے اس کی بے کسی کی طرف توجہ دلا کر وہاں اس کے حق میں کچھ وصیت کی سفارش فرمائی ہے +

اللہ کا دلوں کو پھیرنا

اللہ تعالیٰ کی طرف دلوں اور آنکھوں کے پھیرنے کی نسبت ویسی ہی ہے ۔ جیسے اندیا د مرض کی دیکھو ۳۲ افعال انہی کے ہیں مگر نتیجہ دینے والا اللہ تعالیٰ ہے ۔ اور ان کے افعال ہونا خود اس سے ظاہر ہے ۔ کہ لم یؤمنوا بہ اول مرۃ کا نتیجہ اسے بتایا پہلے ایمان نہیں لائے نتیجہ یہ ہے کہ اب کبھی ایک رائے بدلتے ہیں کبھی دوسری اور سرکشی میں بھٹکتے پھرتے ہیں ۔

دلائل اور معجزات

چونکہ پہلے ایمان کی طرف انہیں دلائل سے بلایا تھا اور دلائل کو انہوں نے قبول نہ کیا ۔ پھر معجزات دیئے تو کبھی ساحر کہا کبھی کاہن کہا کبھی کچھ کہا ۔ یہی تقلیب افئدۃ ہے حقیقت کی طرف دلائل رہنمائی کرتی ہیں ۔ معجزات محض تائیدی امور ہیں ان سے وہ شخص کیا فائدہ اٹھائیگا جو دلائل پر غور نہیں کرتا +

قُبُل

۱۰۰۱ قُبُلًا ۔ بعض نے اسے قَابِل کی جمع کہا ہے اور اس کے معنی ہیں ان کے حواس کے مقابل یا سامنے او یاتیہم العذاب قبلا (الکہف ۔ ۵۵) اور بعض نے قَبِیْل کی جسکے معنی جماعت ہیں یعنی جماعت جماعت کرکے سب چیزوں کو لے آتے (غ)

معجزات کے باوجود ایمان نہ لانے والے

پچھلے رکوع میں شرک کے مختلف پہلوؤں کا ابطال کرکے خاتمہ اس آیت پر کیا تھا کہ جن لوگوں نے کھلے کھلے دلائل کو رد کردیا ہے اور معجزات کے طالب ہیں ۔ وہ [illegible] پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے جیسے دلائل سے انہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور قوت متفکرہ سے کام نہ لیا ۔ ایسا ہی معجزات کے وقت ہوگا ۔ حتیٰ کہ اگر وہ موٹے موٹے نشان بھی ظاہر ہوجائیں جو یہ مانگتے رہتے ہیں ۔ تو بھی قساوت قلبی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ جن لوگوں نے مخالفت

عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا

اور جنوں میں سے شیطانوں کو دشمن بنایا وہ دھوکا دینے کے لئے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے ہیں

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ ۱۱۴

اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے سو ان کو چھوڑ دے اور اس کو بھی جو وہ افترا کرتے ہیں اور تاکہ اسکی طرف ان لوگوں کے دل جھکیں

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ۝

جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور تاکہ وہ اس پر راضی ہو جائیں اور تاکہ (وہی) کمائیں جو وہ (سودا) کمانے والے ہیں ۱۰۰۳

کی ٹھان لی ہو وہ کبھی نہ مانینگے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قوائے روحانی بالکل مردہ ہو جاتے ہیں۔ پس معجزات دیکھ بھی لیں تو محض ایک عجوبہ دیکھ لینے سے قوائے روحانی زندہ نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں سب لوگوں کا ذکر نہیں بلکہ صرف اُن لوگوں کا ہی ہو جو مخالفت میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ٹھان لیتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ حق کو قبول نہ کرینگے بلکہ اس کی مخالفت کرینگے چنانچہ اگلی آیت میں ایسے لوگوں کو شیاطین کے نام سے موسوم کیا ہی +

کلام موتے سے مراد — ہاں الا ان یشاء اللّٰہ کے لفظ آخر پر لا کر یہ بھی بتا دیا ہی کہ گو اس قسم کے معجزات سے تو نہیں مگر اور اسباب سے جو اللہ تعالیٰ پیدا کردے گا لوگ مانینگے بھی۔ فرشتے بھی آئے دیکھو ۲۲۹ اور مردوں نے بھی ان سے کلام کیا یعنی بہت سے لوگ جو قوائے روحانی کے لحاظ سے مرچکے تھے ان کو خدا نے زندہ کر کے ایک روشنی عطا کی دیکھو اگلے رکوع کی پہلی آیت کہ ایک شخص مردہ ہو ہم اسے زندہ کردیں اور اس کو نور دیدیں۔ تو وہ اس کی طرح نہیں جو اندھیروں میں ہو اور یا پہلی کتابوں کی شہادت کلام موتے ہی۔ اور ہر چیز کے سامنے آجانے سے ان کی سزا کے سب سامانوں کا اکٹھا ہو جانا مراد ہے +

وحی — ع۱۰۰۲ یوحی۔ وحی سے مراد یہاں اس کے اصل معنی اشارہ سریعہ کے ہیں یا دل میں ڈالنا اور ان کی وسوسہ اندازی کی طرف اشارہ ہی +

زخرف — زخرف زینت کو کہتے ہیں جو ملمع یا نقش و نگار سے ہو اور زخرف القول ملمع کی بات ہوئی یعنی جو اوپر سے اچھی نظر آتی ہو مگر اس کا انجام زیان ہو +

شیاطین الانس والجن — لفظ کذلک ہیں پچھلی آیت کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہی یعنی جس طرح تمہارے مقابل پر یہ دشمن ہیں جو کھلے کھلے نشانوں اور واضح دلائل کو قبول نہیں کرتے ایسا ہی پہلے انبیاء کے مقابل میں بھی ہوتے رہے۔ شیاطین الانس سے مراد انسانوں میں سے سرکش لوگ ہیں جن شیطان وہ ہی جو نظر سے مخفی ہے۔ مگر انسان جب دوسرے کا شیطان بنتا ہی تو جن سے بھی بڑھکر ہوتا ہی۔ کیونکہ جنّ صرف وسوسہ اندازی کرتا ہی۔ اور یہ باتوں سے اور عمل سے ترغیب دیتا ہی ما یفترون میں بتا دیا کہ یہ افترا کرنیوالے یعنی انسان ہی ہیں کیونکہ اصل فعل انہی کا ہے اور دوسری جگہ صرف یوں فرمایا وکذالک جعلنا لکل نبی عدوا من المجرمین (الفرقان ۲۵: ۳۱) پس شیاطین الانس والجن سے یہاں مراد مجرم ہی ہیں دیکھو اگلا نوٹ

صغو — ع۱۰۰۳ تصغی۔ صَغْوٌ سے ہی مائل ہونا صَغَتِ الشَّمْسُ کے معنی ہیں سورج غروب کی طرف مائل ہوا (غ) الیہ میں ضمیر زخرف القول یعنی ملمع کی باتوں کی طرف ہی یا شیاطین کی وحی کی طرف یا عداوت کی طرف +

قرف۔ اقتراف — یقترفوا۔ قَرْفٌ اور اقتراف اصل میں یہ ہی کہ درخت کی چھال اُتار دی جائے استعارۃً اکتساب کے معنی میں آتا ہی اچھا ہو یا برا (غ)

١١٥ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ

تو کیا میں اللہ کے سوائے فیصلہ کرنیوالا تلاش کروں اور وہ وہی ہے جس نے تمہاری طرف واضح کتاب نازل کی اور وہ جن کو ہم نے کتاب

١١٦ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ○ وَتَمَّتْ

دی جانتے ہیں کہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اتاری گئی ہے سو تو جھگڑنے والوں میں سے نہ ہو ١٠٠٤ اور تیرے

كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

رب کی بات سچائی اور انصاف میں کمال کو پہنچ گئی کوئی اس کی باتوں کو بدلنے والا نہیں ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ١٠٠٥

جن شیطان سے مراد

یہ آیت عطف ہے مزودا پر یعنی وہ ملمع کی باتیں جو ایک دوسرے کے دل میں ڈالتے ہیں وہ محض دھوکہ دینے کیلئے ہوتی ہیں اور اس غرض کیلئے کہ عام لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ۔اعمال کی جزا و سزا کو نہیں جانتے ان کے دل ان ملمع کی باتوں کی طرف مائل ہو جائیں اور وہ انکو پسند کرنے لگیں ۔ اور ایسے ہی کام کرنے لگیں ۔جیسے وہ شیطان یعنی ان کے سردار خود کرتے ہیں ۔یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیاطین صرف ان کے سردار ہیں جو پہلے خود حق کے دشمن بنتے ہیں پھر آہستہ آہستہ اپنے پیرووں کو بھی اس پر راضی کر لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ پیرو بھی تمام وہ شرارت کی باتیں کرنے لگتے ہیں جو ان کے سردار کرتے ہیں اور یہاں بالخصوص انبیاء کی مخالفت کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد صرف اعدائے حق انسان ہیں گو ان پر عام نظروں سے مستور ہونے کی وجہ سے جن کا لفظ بھی بولا گیا ہے جیسا کہ مجاز کے رنگ میں ایک شاعر اپنی محبوبہ کو جنّی کے نام سے پکارتا ہے دیکھئے یا جنی اگر سارے مضمون پر ایک یکجائی نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ بھی شبہ نہیں رہتا ۔اس رکوع کے آخر پر آیت ١٢٢ میں پھر شیاطین (یعنی سرداروں) کے اپنے اولیاء کو وحی کرنے کا ذکر ہے اور آیت ١٢٣ میں کذٰلک لفظ لا کر اور انہی لوگوں کو اکابر مجرمیہا کہکر بالکل واضح کر دیا کہ شیاطین ۔ الجن سے مراد مجرموں کے سردار ہیں نہ کچھ اور۔

فصل تفصیل

١٠٠٤ مفصّل ۔فصل کے معنی ہیں دو چیزوں کا ایک دوسرے سے الگ کر دینا (غ) اور تفصیل کے معنی تبیین (ل) یا کھولکر بیان کرنا ہیں ۔اور یہاں مراد ہے کہ جس بارہ میں میرا اور تمہارا جھگڑا ہے اسے کھولکر یہاں بیان کر دیا گیا ہے ۔ (غ) ‌+

مذہبی اختلافات میں کوئی شخص حکم نہیں بنایا جا سکتا۔

چونکہ قرآن کریم بار بار پہلے انبیاء کی شہادت کی طرف توجہ دلاتا تھا اس لئے مشرک یہ حیلہ کرتے تھے کہ یہودی یا عیسائی ہمارے اور تمہارے درمیان حَکَم بن جائیں ۔آج بھی بعض لوگ مسائل دینی میں بحث کرتے ہیں تو کہتے ہیں فلاں شخص کو حکم بنالیں جس کے یہ معنی ہوئے کہ اس شخص کا فیصلہ مبرا عن الخطا ہے اس کا جواب دیا ہے کہ جب کتاب مفصل ہے یعنی اس کے اندر دعاوی بھی ہیں اور دلائل بھی تو پھر دوسرے کو حکم بنانے کی کیا ضرورت ہے اس کے دعاوی اور دلائل پر غور کرکے خود ہی فیصلہ کرلو ۔یہاں مفصل سے مراد یہ نہیں کہ تمام فروعات دین اس کے اندر تفصیل سے موجود ہیں ۔بلکہ اصل مضمون جو اثبات توحید و رسالت پر ہے جس میں جھگڑا ہو رہا ہے اسی کے دعاوی اور دلائل کے کھول کر بیان کرنے کا ذکر ہے اور آخری حصہ میں اہل کتاب کا ذکر کیا کہ وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم کا نزول حق کے ساتھ ہے کیونکہ ان کی کتابوں میں اس کی پیشگوئیاں موجود ہیں ‌+

کتاب مفصل سے مراد

دعاوی اور دلائل کا قرآن میں ہونا

١٠٠٥ پچھلی آیت کے مضمون کو اور واضح کیا ہے ۔وہاں کتاب کو مفصل کہا تھا ۔یہاں بتا دیا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ صدق و عدل میں یہ کتاب اس حد کمال کو پہنچ گئی ہے کہ اپنے سے باہر کسی چیز کی محتاج نہیں رہی اتمام کے اس معنی کیلئے دیکھئے ٨٦

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا ١١٧

اور اگر تو اکثر اُن لوگوں کی بات مانتا چلا جائے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کردیں وہ صرف ظن کی پیروی

الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۞ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ ١١٨

کرتے ہیں اور وہ محض اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں ۱۰۰۶ بیشک تیرا رب اسکو خوب جانتا ہے جو اس کے رستے سے گمراہ ہوتا ہے۔

وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۞ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ ١١٩

اور وہ سیدھی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے سو اس سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اگر تم اس کی باتوں پر

مُؤْمِنِيْنَ ۞ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا ١٢٠

ایمان لانے والے ہو ۱۰۰۷ اور تمہارا کیا عذر ہے کہ تم اس سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اور اس نے تمکو کھول کر بتادیا ہے وہ جو

حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ

تم پر حرام کیا سوائے اسکے جس کے لیے تم مضطر ہو جاؤ اور یقیناً بہت سے اپنی گری ہوئی خواہشات سے لاعلمی کے ساتھ گمراہ کرتے ہیں

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ۞ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ ١٢١

یقیناً تیرا رب حد سے گزرنے والوں کو خوب جانتا ہے اور کھلے اور چھپے گناہ کو چھوڑ دو جو لوگ

يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ۞

گناہ کماتے ہیں ان کو ضرور اس کے موافق بدلہ دیا جائیگا جو وہ کماتے ہیں ۱۰۰۸

صدق میں اشارہ اس کے دعاوی کی سچائی کی طرف ہے اور عدل میں اس کے دلائل کے حق ہونے کی طرف چونکہ احکام
دینی میں فروع دین اس کے اصول سے مستنبط ہوتے ہیں۔ اسلئے سارے فروع کا اسکے اندر تفصیل سے نہ ہونا خلاف اتمام نہیں
ہاں اصول سب ضروری ہے کہ اس کے اندر مفصل ہوں۔ یعنی دعاوی بمعہ اپنے دلائل کے ہوں +

دنیا کی آخری مذہبی کتاب

لا مبدل لکلماتہ میں ذکر انہی کلمات کا ہے جن کا ذکر تمت کلمت ربک میں ہے یعنی مراد اس سے قرآن شریف ہے اور یہ بتانا
مقصود ہے کہ یہ کلام اس کمال کو پہنچ گیا کہ اب اس کو کوئی بدل نہیں سکتا یعنی کوئی شخص اس کلام کی جگہ صدق و عدل کے لحاظ سے
بہتر کلام نہیں لا سکتا اور یہ دنیا کی آخری مذہبی کتاب ہے +

۱۰۰۶ یہاں بتا دیا کہ پیروی علم صحیح کی کرنی چاہئے۔ اٹکل پچو اور ظنی باتیں کرنے والے گو تعداد میں بہت ہوں مگر پیروی انکی نہیں
چاہئے۔ بلکہ علم کی یعنی دلائل کی کرنی چاہئے +

مشرکانہ رسوم

۱۰۰۷ قرآن کریم نے توحید پر یہانتک زور دیا ہے کہ جن غذاؤں کا تعلق مشرکانہ فعال سے ہے انکو بھی حرام کر دیا ہے اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے +

ظاہری اور باطنی گناہ

۱۰۰۸ غذاؤں کی حلت و حرمت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بتا دیا کہ کھلے اور چھپے دونوں گناہوں سے بچو۔ یہ نہ ہو کہ باطنی احکام

١٢٢ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ

اور اس سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اور یہ یقیناً نافرمانی ہے اور بیشک شیطان اپنے دوستوں

١٢٣ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۝ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا

ع ١٥ ٨ ٢

منصوبہ بازوں کا انجام

کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑتے رہیں اور اگر تم انکی بات مانوگے تو یقیناً تم مشرک ہوگے ١٠٠٩ اور کیا وہ جو مردہ ہو

فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِىْ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ

پھر ہم اسے زندہ کردیں اور اس کے لئے روشنی کردیں جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلے اس شخص کی مانند ہو جسکی مثال یہ ہو کہ وہ اندھیرے میں ہو

١٢٤ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ

اس سے نکلتا نہیں اسی طرح کافروں کو وہ کام اچھے معلوم ہوتے ہیں جو وہ کرتے ہیں ١٠١٠ اور اسی طرح

جَعَلْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ

ہم نے ہر ایک بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو بنایا تاکہ وہ اس میں منصوبے کریں۔

عرب اور یورپ

کی طرف متوجہ ہو تو احکام ظاہری کی پرواہ نہ کرو یا کھلے گناہوں سے بچو تو مخفی طور پر ان کا ارتکاب کرلو۔ عرب کے لوگ اسبات کو عیب نہ جانتے تھے کہ چھپ کر کوئی گناہ کرلیا جائے مثلاً چھپکر زنا کرلینے میں کوئی ہرج نہ سمجھتے تھے۔ ہاں ظاہر طور پر اس کے ارتکاب کو بُرا خیال کرتے تھے۔ بعینہ یہی حالت آج یورپ کی ہے۔ اور قرآن کریم کا نزول جس طرح عرب کے لئے ہوا اسی طرح آج یورپ کیلئے یہ نزول ہے ٭

ذبیحہ اہل کتاب

١٠٠٩ یہ آیت اس بات کو بالصراحت بیان کرتی ہے کہ جس چیز پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کا کھانا جائز نہیں۔ پس ذبیحہ اہل کتاب اسی حد تک جائز ہے کہ وہ اس پر خدا کا نام لیں ٭

آخر آیت میں پھر دشمنان دین کی طرف اشارہ کرکے اس رکوع کے اور اگلے رکوع کے اصل مضمون کیطرف اشارہ کیا ہے

میت

١٠١٠ میت۔ موت کے معنی کیلئے دیکھو ٧٩ میْت مَیِّت سے مخفف ہے اور یہاں مردہ ہونے سے مراد جہالت ہے اور انك میت (الزمر ٣٩-٣٠) میں مَیِّت سے مراد بعض کے نزدیک روح کا جسم سے الگ ہونا ہے اور بعض کے نزدیک محض تحلیل اور کمی ہے جو ہر آن واقع ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ انسان جبتک اس دنیا میں ہے ہر آن اس پر ایک موت وارد ہوتی رہتی ہے جیسا شاعر کہتا ہے يَمُوْتُ جُزْءٌ فَجُزْءٌ (غ) حضرت ابن عباس سے یہاں میت کے معنی کافر ضال۔ احیاء سے مراد ہدایت۔ نور سے قرآن مروی ہیں (د) ٭

آنحضرت کا مردوں کو زندہ کرنا

اسلام کے خلاف منصوبہ بازی کرنیوالوں کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے پہلے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کیساتھ ان لوگوں کو جنکے قوائے روحانی مرچکے ہیں کس مقام پر پہنچائیگا۔ وہ نہ صرف انکو زندگی عطا فرمائیگا بلکہ اس سے بڑھکر یہ کہ انکو ایک نور بھی عطا فرمائیگا اور وہ بھی صرف اپنی ذات کیلئے نہ ہوگا بلکہ دوسرے لوگوں میں اسکو لیکر چلیں گے یعنی اور ونکو بھی فائدہ پہنچائیں گے۔ یہ آنحضرت صلعم کی قوت قدسی کا کمال تھا جس نے مردگی کی حالت سے اُٹھا کر ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچایا۔ اسکے بالمقابل ان لوگوں کا ذکر کیا جو تاریکی میں رہتے ہیں اور نور ایمان سے متمتع نہیں ہوتے اور پھر اس تاریکی سے اس قدر پیار کرتے ہیں کہ اس میں سے باہر نہیں نکلتے۔ گویا ان کو اپنے بدعمل ہی

وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ حَتَّىٰ ۱۲۵

اور منصوبے نہیں کرتے مگر اپنی ہی جانوں (کے ضرر) کیلئے اور وہ محسوس نہیں کرتے ۱۰۱۱ اور جب اُن کے پاس کوئی آیت آتی ہے کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک

وقف منزل
وقف لازم

نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۘ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ سَيُصِيبُ الَّذِينَ

کہ ہم کو اسکی مثل دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا اللہ خوب جانتا ہے کہ کہاں اپنی رسالت کو رکھے ۱۰۱۲ ان لوگوں کو جنہوں نے

أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ ۝ فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ ۱۲۶

جرم کئے اللہ کی طرف سے ذلت اور سخت عذاب پہنچ کر رہے گا اس لئے کہ وہ منصوبے کرتے تھے ۱۰۱۳ سو جس کے متعلق اللہ ارادہ کرتا ہے

أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۖ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا

کہ اس کو ہدایت دے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس کے لئے ارادہ کرتا ہے کہ اسکو گمراہی میں چھوڑ دے اس کا سینہ تنگ گھٹا ہوا کر دیتا ہے

كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

گویا وہ اوپر کو چڑھ رہا ہے اسی طرح اللہ اُن لوگوں پر ناپاکی رہنے دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے ۱۰۱۵

بھلے معلوم ہونے لگتے ہیں ◆

کبیر

۱۰۱۱ اکابر۔ کبیر کی جمع ہے جس کے معنی رئیس یا سردار ہیں انہ لکبیرکم الذی علمکم السحر (طٰہٰ ۲۰-۷۱) ◆

یعنی جس طرح انکو اپنے بد عمل بھلے معلوم ہونے لگتے ہیں اسی طرح پھر انکو حق کے خلاف منصوبہ بازی سوجھتی ہے۔ تاریکی سے پیار کرنے والے کبھی روشنی کو پسند نہیں کر سکتے اسلئے جب وہ نور دنیا میں آتا ہے اسکے بجھانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ مگر مآل ان منصوبہ بازیوں کا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے ◆

رسالت موہبت ہے

۱۰۱۲ آیت سے مراد یہاں عام ہے کوئی حکم الٰہی۔ کوئی شریعت یا کوئی رسول آتا ہے تو بجائے اس کے کہ ایک حق بات کو قبول کریں یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ پیغامبری کا منصب ہم کو کیوں نہ ملا۔ دوسری جگہ آتا ہے بل یرید کل امرئ منہم ان یؤتی صحفا منشرۃ (المدثر ۷۴-۵۲) اس کا جواب دیا ہے کہ خدا پیغامبری کے منصب پر ہر کس و ناکس کو ممتاز نہیں فرمایا کرتا۔ تاریکی کے فرزند اگر وہ پیغامبری دیدے تو پھر دنیا کی اصلاح کیا ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا پیغمبر جن لوگوں کو بناتا ہے وہ اس منصب کے لئے خاص اہلیت رکھتے ہیں جس سے دوسرے عاری ہوتے ہیں۔ اسی سے عصمت انبیاء پر بھی دلیل پیدا ہوتی ہے اور ساتھ یہ بھی کہ منصب رسالت کسی کو کوشش سے یا دعا سے نہیں ملتا بلکہ یہ ایک امر وہبی ہے جسے خدا چاہتا ہے دیتا ہے ◆

صغار

۱۰۱۳ صغار سے مراد ذلت ہے عند اللہ اکثر مفسرین کے نزدیک من عند اللہ کے ہم معنی ہے یعنی اللہ کی طرف سے انکو ذلت پہنچے گی اللہ کے ہاں بھی اگر معنی کئے جائیں تو مراد یہی ہے۔ منصوبہ بازیوں اور مخالفتوں کا انجام بتایا ہے کہ ذلیل ہو جائینگے اور قوت و شوکت جسکے بل بوتے پر یہ کچھ کر رہے ہیں جاتی رہیگی یہی اہل مکہ کا انجام ہوا۔ یہی اب مخالفت کا انجام ہوگا ◆

شرح صدر

۱۰۱۴ یشرح صدرہ۔ شرح کے اصل معنی بسط یا پھیلانا ہیں اور شرح صدر کے معنی امام راغب نے کئے ہیں۔ الٰہی نور اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینت اور اطمینان کے ساتھ قلب میں وسعت پیدا ہو جانا ◆

١٢٧ ١٢٨ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ

اور یہ تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے ہم نے باتیں اُن لوگوں کے لئے کھول کر بیان کر دی ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں اُن کے لئے اُن کے رب کے

١٢٩ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ

ہاں سلامتی کا گھر ہے اور وہی ان کا دوست ہے، ان اعمال کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے اور جس دن ان سب کو اکٹھا کریگا اے جنوں کے گروہ تم نے

اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰۗؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّ

انسانوں میں سے بہت سے لے لئے اور انسانوں میں سے اُن کے دوست کہینگے اے ہمارے رب ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا اور

بَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَاۗءَ

ہم اس اپنی میعاد کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لئے مقرر کی تھی کہے گا آگ تمہارا ٹھکانا ہے اسی میں رہو گے مگر جو اللہ

١٣٠ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ع

چاہے بیشک تیرا رب حکمت والا علم والا ہے اور اسی طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیتے ہیں بسبب اسکے جو وہ کماتے ہیں

حرج — یجعل صدرہ ضیقا حرجا۔ حَرَج سخت تنگی کا نام ہے جس کے اندر کوئی جگہ نہیں اور گناہ کو بھی حَرَج کہتے ہیں (غ)

ضیق صدر — ضیق صدر عبارت ہے اس سے کہ اس میں بھلائی کیلئے کوئی رستہ نہیں۔ امام راغب کہتے ہیں اس سے مراد حزن ہے ۔

صعود — یصعد فی السماء سے مراد اوپر کو چڑھنا ہے جس سے دم رکنے لگتا ہے یَصعّد اصل میں یَتَصَعَّدُ ہے اور صُعُود اوپر کی طرف جانے کو کہتے ہیں ۔

کفر سے سینہ تنگ ہوتا ہے — اس کا یہ منشا نہیں کہ خدا نے دو قسم کے انسان پیدا کئے ہیں اور بعض کا سینہ کھلا اور بعض کا تنگ پیدا کیا ہے بلکہ یہ بتانا مراد ہے کہ امر حق کا فر کو ایک پہاڑ کی طرح نظر آتا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت وہی باتیں جن سے اس کے سینہ میں اتنی تنگی پیدا ہوتی ہے سینے کے کھولنے والی ہیں۔ اور ان سے انسان کے اخلاق وسیع ہوتے ہیں۔ کافر کا سینہ بوجہ اپنے کفر کے تنگ ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر تنگی کفر کا نتیجہ ہے۔ کفر تنگی کا نتیجہ نہیں ۔

عشیرۃ — ١٠١٥ مَعْشَرَ کا اصل عَشْر دس سے ہے اور چونکہ دس کو عدد کامل سمجھا گیا ہے اس لئے عشیرۃ ایک شخص کے اقارب کو کہا جاتا ہے جس سے وہ کثرت حاصل کرتا ہے (غ)، اور اس سے معشر ہے جو اسی جماعت کو کہا جاتا ہے جن کا معاملہ ایک ہے

معشر — کل جماعۃ امرھم واحد جیسے معشر المسلمین (ل) ۔

جن — الجن۔ جَنّ کے معنی ڈھانک دینا ہیں۔ اور جن وہ نوع ہے جس کو انسان کی آنکھ دیکھ نہیں سکتی اور وہ اس سے پوشیدہ ہے۔ اسی نوع میں سے قرآن شریف نے ابلیس کو قرار دیا ہے کان من الجن (الکہف ١٨ - ٥٠) اور شیطان بھی دو طرح کے

جن کا استعمال انسان پر — بتائے ہیں شیاطین الانس والجن یعنی ایک انسانوں میں سے اور ایک جن میں سے لیکن تبریزی نے شرح حماسہ میں لکھا ہے کہ عرب کے لوگ، ایسے شخص کو جو معاملات میں تیز اور زود رس ہو جن کہدیتے تھے چنانچہ اسی بنا پر قیانقات جنّی میں جن سے مراد وہ رفیق لئے گئے ہیں جو جن کی طرح تھے، اور لسان العرب میں ایک شعر نقل کیا ہے جس میں شاعر

ع ۱۶

شرک اور مشرکانہ رسوم کا ابطال

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ ۱۳۱

اے جنوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہ آئے تھے جو تمہارے اوپر میری آیات کو بیان کرتے اور اس تمہارے

لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا

دن کی ملاقات سے تم کو ڈراتے تھے کہیں گے ہم اپنی جانوں کے خلاف گواہی دیتے ہیں اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا

اپنی معشوقہ کو جنّی کے نام سے خطاب کرتا ہو جہاں لسان العرب میں اس لفظ کی تشریح یہ کی گئی ہو کہ وہ عورت جو جنیة کی طرح ہو اپنے حسن وجمال میں یا اپنے تلون طبع میں کیونکہ انسان جنوں سے تعشق نہیں کرتا۔ اور اشعار جاہلیت میں ہو تخیل علیہا جنة عبقریة ایسے گھوڑوں پر کہ ان پر عبقری جن سوار تھے۔ اور ایک میں ہے جن انا فزعوا النس اذا امنوا جہاں با وجود جن اور انس کے مقابلہ کے جن سے مراد انسان ہی ہیں (یہ دونوں مصرعے میں نے سرسید احمد خاں کی تفسیر سے نقل کئے ہیں) اس سے معلوم ہوتا ہو کہ عرب کے لوگ جن کو وسیع معنی میں استعمال کر لیتے تھے یعنی خاص قسم کے آدمیوں کو بھی جن کہہ لیتے تھے +

جن سے مراد خاص انسان ہونے پر دلایل

اس جگہ آیا جن سے مراد وہی غیر مرئی ہستیاں ہیں۔ یا مراد خاص قسم کے انسان ہیں ؟ اس کا فیصلہ خود قرآن شریف کی عبارت کرتی ہو۔ اول تو فرمایا استمتع بعضنا ببعض ہم ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے اب انسان تو ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر وہ غیر مرئی ہستیاں انسانوں سے اور انسان ان غیر مرئی ہستیوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ پھر اس آیت میں تو جن وانس کو ایک دوسرے کے اولیاء کہا ہو۔ اور اگلی آیت میں فرمایا۔ کہ اسی طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کے اولیاء بنا دیتے ہیں۔ تیسرے اگلے رکوع کے شروع میں جنوں اور انسانوں کا ایک ہی معشر فرمایا جس کا اصل اطلاق ایک شخص کے اہل پر ہو اگر الگ نوع والے جن یہاں مراد ہوتے تو انسانوں کے ساتھ انہیں ایک معشر قرار نہ دیا جاتا۔ چوتھے وہیں فرمایا کہ جنوں اور انسانوں کے پاس انہی میں سے رسول آئے۔ اب ظاہر ہو کہ وہ غیر مرئی ہستیاں ایک الگ نوع ہیں۔ ان کے پاس انسانوں میں سے رسول نہ آسکتے تھے مگر جہانتک قرآن کریم نے رسولوں کا ذکر کیا ہو وہ سب انسان رسول ہی ہیں۔ اور بنی آدم کے ساتھ ہی وعدہ تھا کہ اما یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم ایاتی۔ اور ان غیر مرئی ہستیوں کو بھی یہ رسول یا ان کے پیرو ہی مسلمان کرتے ہیں جیسا حدیث سے ثابت ہو کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میرا شیطان مسلمان ہوگیا۔ پس یہاں جنوں سے مراد وہ انسان ہیں جو جنوں کی طرح ہیں۔ وہی لوگ جن کو شروع میں اکابر کہا ہو۔ اور بڑے لوگ اس لئے جن کہلا سکتے ہیں کہ وہ عوام الناس کی نظروں سے عموماً چھپے رہتے ہیں۔ اور سلیمان علیہ السلام کے ذکر میں ان قوی ہیکل لوگوں کو جن اور شیاطین کہا ہے جن کو قید کر کے حضرت سلیمان نے ان سے عمارتیں بنوانے اور غوطہ زنی وغیرہ کے کام لئے۔ اور اگر شیاطین کا لفظ ائمہ کفار اور ان کے سرداروں پر بولا جا سکتا ہو جیسا تمام مفسرین کا اتفاق ہو تو جن کا لفظ انہی لوگوں پر بولا جانا کوئی جائے تعجب نہیں +

خلود جہنم سے استثنا

حالانکہ یہاں صاف کفار کا ذکر ہے مگر جہنم میں ان کے رہنے کے ساتھ ایک استثناء بھی موجود ہو الا ماشاء اللہ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس حالت سے انہیں باہر بھی نکال دے +

۱۳۲ وَشَهِدُوا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ

اور وہ اپنی جانوں کے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے ۱۰۱۵ یہ اس لئے کہ تیرا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ ہلاک

۱۳۳ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ

کرنے والا نہ تھا حالانکہ انکے رہنے والے بے خبر ہوں ۱۰۱۶ اور سب کے لئے درجے ہیں اس کے مطابق جو انہوں نے عمل کئے اور تیرا رب اس سے بے خبر

۱۳۴ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ

نہیں جو وہ کرتے ہیں اور تیرا رب غنی صاحب رحمت ہے اگر چاہے تم کو لے جائے اور تمہارے بعد جس کو چاہے تمہارا جانشین بنا دے

۱۰۱۵ اس رکوع میں اصل ذکر بعض رسوم مشرکانہ کا ہے۔ مگر اس مضمون کو شروع کرنے سے پہلے پچھلے رکوع کے مضمون کی تکمیل کی ہے اور بتایا ہے کہ جس بات سے اب انکار ہے آخر اس کا اقرار کرینگے۔ اپنی جانوں کے خلاف گواہی دینے سے مراد اپنے گناہ کا اقرار ہے +

کیا جنوں میں سے رسول آئے

اس آیت کے جنوں کو نوع انسانی کے جن نہ قرار دینے سے مفسرین کو یہ مشکل پیش آئی ہے کہ آیا جنوں میں علیحدہ جن رسول آئے۔ ظاہر ہے کہ یہاں منکم سے مراد یہ نہیں ہو سکتی کہ جنوں میں سے جن اور انسانوں میں سے انسان رسول الخ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جس نوع کیلئے رسول بھیجتا ہے وہ اس نوع میں سے بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان یہ کہتے ہیں کہ ملک یعنی فرشتہ ان کی طرف رسول کیوں نہ بھیجا گیا تو اس کا جواب یہ دیا کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ انکی طرف رسول بھیجا جاتا قل لو كان فی الارض ملٰئكة يمشون مطمئنين لنزلنا عليهم من السماء ملكا رسولا (بنی اسرائیل ۱۷-۹۵) یہ آیت اس بات پر قطعی شہادت ہے کہ ایک نوع دوسری نوع کی طرف رسول نہیں ہو سکتی اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ رسول صرف احکام پہنچانے والا نہیں بلکہ ان احکام پر عمل کرکے دکھانے والا ہے اور ظاہر ہے کہ فرشتہ انسان کیلئے نمونہ نہیں ہو سکتا ایسے ہی انسان جنوں کیلئے نمونہ نہیں ہو سکتا اور جس طرح ملک انسانوں کیلئے رسول کا کام نہیں دے سکتا انسان جنوں کے لئے رسول کا کام نہیں دے سکتا پس جنوں اور انسانوں کو ایک معشر قرار دیکر پھر ان میں سے رسول بھیجنے کا ذکر صاف بتاتا ہے کہ ایک ہی نوع کا یہاں ذکر ہے اور اس دوسری نوع کا ذکر نہیں جو غیر مرئی ہستیاں ہیں +

ہلاکت سے پہلے تنبیہ ہوتی ہے

۱۰۱۶ یعنی رسولوں کے بھیجنے کی غرض یہ تھی کہ بے خبری میں لوگ ہلاک نہ ہوں ان کے ذاتی نقص سے ان کو آگاہ کرنے والا کوئی ہو۔ قرآن شریف میں جنوں کی کسی بستی کی ہلاکت کا ذکر نہیں اگر جنوں کی طرف بھی انسان رسول مبعوث ہوتے تو انکی ہلاکت کا بھی کہیں ذکر ہوتا۔ بظلم کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں یعنی ایک یہ کہ ظلم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو یعنی اللہ ایسا نہ تھا کہ ظلم کرکے بغیر تنبیہ کئے اور رسول بھیجے ایک بستی کو ہلاک کر دے اور دوسرے یہ کہ محض لوگوں کے ظلم یعنی کفر یا شرک کی وجہ سے یا عقاید کی غلطی کی وجہ سے انہیں ہلاک نہیں کیا جب تک پہلے رسول بھیجکر تنبیہ نہیں کر دی۔ اور مطلب یہ ہے کہ گو بوجہ ظلم کے ان لوگوں کی حالت بہت خراب تھی کفر اور شرک کی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم اس قدر ہے کہ جب تک رسول بھیجکر ان پر اتمام حجت نہیں کر دیا اس وقت تک ان پر عذاب بھیجنا بھی پسند نہیں فرمایا اسی کی طرف اشارہ آیت ۱۳۴ کے الفاظ ذو الرحمۃ میں ہے +

فَمَا يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۝ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ ۱۳۵

جیسا تمہیں ایک اور قوم کی نسل سے پیدا کیا ۱۰۱۷ جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے یقیناً آنے والا ہے اور تم اسے

بِمُعْجِزِيْنَ ۝ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ ۱۳۶

عاجز کرنیوالے نہیں ۱۰۱۸ کہو اے میری قوم تم اپنی طاقت کے مطابق عمل کرتے جاؤ میں بھی عمل کرنیوالا ہوں پھر تم کو معلوم ہو ہی جائیگا کہ

تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ ۱۳۷

کس کے لئے اس گھر کا (بہتر) انجام ہو ہاں ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوتے ۱۰۱۹ اور اللہ کے لئے جو کچھ اس نے کھیتی

الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَاۗىِٕنَا ۚ فَمَا كَانَ

اور چار پایوں سے پیدا کیا ہے حصہ ٹھیراتے ہیں اور کہتے ہیں یہ اللہ کیلئے ہے انکے گمان (باطل) میں (ایسا ہے) اور یہ ہمارے شریکوں کیلئے ہے سو جو کچھ

لِشُرَكَاۗىِٕهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰي شُرَكَاۗىِٕهِمْ ۭ

انکے شریکوں کیلئے ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا اور جو اللہ کے لئے ہوتا ہے وہ انکے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے

سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۱۳۸

بُرا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں ۱۰۲۰ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کی اولاد کا

۱۰۱۷ اس میں صاف پیشگوئی ہے کہ اس کافر قوم کی جگہ دوسری قوم لے گی اور وہ مسلمان قوم تھی۔

عجز — ۱۰۱۸ معجزین عَجُزُ انسان کے موخر یعنی پچھلے حصہ کو کہتے ہیں اور اس لئے عَجْزٌ کے معنی کسی شے سے پیچھے رہ جانا ہیں مراد اس سے یہی ہے کہ کام کرنے میں کوتاہی کی جو قدرت کی ضد ہے اور معجزین سے مراد ہے کہ خدا کو عاجز نہیں کر سکتے یعنی اسکی گرفت سے بچ نہیں سکتے (غ)۔

مکانۃ — ۱۰۱۹ مکانۃ۔ یہ ظرف ہونے کے لحاظ سے مکان یا حالت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور مصدر ہونے کے لحاظ سے اس کے معنی استطاعت بھی ہو سکتے ہیں۔

عاقبۃ الدار — عاقبۃ الدار۔ الدار سے مراد دار دنیا ہے۔ اور عاقبۃ سے مراد العاقبۃ الحسنٰی یا اچھا انجام ہے مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہی اعمال کا نتیجہ ظاہر ہو جائیگا۔

نیکی کا نتیجہ اچھا اور بدی کا نتیجہ برا ہونے پر جس قدر یقین اور وثوق نبی کریم صلعم کے قلب مبارک میں تھا اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ایک طرف دشمنوں کی طرف سے تکلیف پر تکلیف پہنچتی ہے۔ اور یہ زمانہ آپ کی انتہائی بیکسی کا ہے۔ مگر کس قدر یقین حق کی آخری کامیابی پر ہے کہ ایک پہاڑ میں جنبش آسکتی ہے مگر اس یقین کو جنبش دینے والی کوئی چیز نہیں۔

آنحضرت نے مشرکانہ رسوم کا استیصال کیا — ۱۰۲۰ مشرکانہ رسوم اس قوم کے روزمرہ کے افعال کے اندر داخل ہو کر قومی خون کے اندر رچ گئی تھیں اور ان

قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَاۗؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ

قتل کرنا انکے شریک اچھا کر دکھاتے ہیں تاکہ وہ انہیں ہلاک کر دیں اور ان کا دین ان پر خلط کر دیں اور اگر اللہ چاہتا تو

مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ڰ لَّا يَطْعَمُهَآ ۱۳۹

ایسا نہ کرتے سو ان کو اور جو وہ افترا کرتے ہیں چھوڑ دے ۱۲۱ اور کہتے ہیں یہ چار پائے اور کھیتی منع ہے اس کو کوئی نہیں کھا سکتا

اِلَّا مَنْ نَّشَاۗءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ

مگر وہ جس کو ہم چاہیں انکے گمان (باطل) میں (ایسا ہی) اور چار پائے ہیں جنکی پیٹھوں (پر چڑھنے) کو حرام کردیا گیا ہے اور چار پائے جن پر اللہ کا نام نہیں

اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَاۗءً عَلَيْهِ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

لیتے اس پر افترا کرتے ہوئے وہ ان کو اس کا بدلہ دیگا اس لئے کہ وہ افترا کرتے تھے

رسوم کا ان سے دور کرنا اور سینکڑوں سالوں کی عادات قومی کو بدل دینا کسی انسان کی طاقت میں نہ تھا یہ کمال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی کو ہی دیا گیا کہ تمام رسوم کو چند سال کے عرصہ میں ایسا دور کیا کہ انکا کہیں نام ونشان بھی نہ رہا۔ خیرات کے لئے جو حصہ الگ کرتے اس میں سے ایک حصہ اللہ کے نام پر رکھتے اور مہمانوں مساکین وغیرہ پر خرچ کرتے اور ایک حصہ بتوں کے لئے جو کاہنوں اور بتوں کے مجاوروں کو دیتے۔ پھر طرح طرح کی تجویز سے اس حصہ کو جو خدا کے لئے ہوتا بتوں پر صرف کر دیتے۔ مثلاً اگر دیکھتے کہ جو حصہ اللہ کیلئے مقرر کیا ہو وہ عمدہ حالت میں ہے تو اسے بھی بتوں کا چڑھاوا بنا دیتے۔ یا کچھ خلط واقع ہو جاتا تو سارا بتوں کا چڑھاوا قرار دیدیتے۔ آج مسلمانوں کے چندے خیراتی کاموں کے لئے اسی رنگ میں رنگین ہیں وعدہ کر لیتے ہیں مگر اپنی ضروریات آئیں تو جو حصہ خدا کے لئے دینا کیا ہو اسے بھی وہیں خرچ کر لیتے ہیں اور یوں کبھی نہیں ہوتا کہ اپنی ضروریات کو کاٹ کر اللہ تعالیٰ کیلئے دیں الا ماشاء اللہ۔

ردی ۱۲۱ یردوا۔ ردیٰ کے معنی ہلاک ہیں وما یغنی عنه ماله اذا تردی (الیل ۹۲-۱۱) تاللہ ان کدت لتردین (والصفت ۳۷-۵۶)۔

قتل اولاد کی رسم قتل اولاد ایک تو بیٹیوں کا زندہ گاڑ دینا تھا۔ اس صورت میں شرکاؤھم سے مراد ان کے اکابر ہونگے جو ایک جھوٹی غیرت کی وجہ سے بیٹیوں کو زندہ نہ رہنے دیتے تھے۔ انہی کا تتبع عوام الناس کرنے لگے۔ اور علاوہ ازیں ان میں یہ بھی رسم تھی کہ جب بیٹوں کی تعداد دس تک پہنچ جائے تو ایک کو بتوں کا چڑھاوا چڑھا دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ عبدالمطلب نے کیا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کو بت پر چڑھاوے کے طور پر ذبح کرنے کے لئے چڑھایا۔ اور آخر ایک سو اونٹ آپ کی جگہ دیا۔ اسی لئے رسول اللہ صلعم نے فرمایا انا ابن الذبیحین میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں یعنی ایک حضرت اسمٰعیل اور دوسرے آپ کے والد عبداللہ۔ اور قتل اولاد سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہو کہ ان کی پرورش ظلم شرک جہالت میں کرتے۔ جیسا کہ امام راغب نے لا تقتلوا اولادکم من املاق (۱۵۲) میں لکھا ہے

اولاد کو جاہل رکھنا بھی قتل کرنا ہے۔

قیل ان ذٰلک نهی عن شغل الاولاد بما یصدهم عن العلم ۔

لبس۔ دین کو خلط کرنے سے مراد ہو کہ اصل دین توحید جو حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کا تھا اسپر نہ رہنے دیا۔

وَقَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ ١٤٠

اور کہتے ہیں جو کچھ ان چارپایوں کے پیٹوں میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام کیا گیا ہے

وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۚ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝

اور اگر وہ (بچہ) مرا ہوا ہو تو وہ سب اس میں شریک ہوتے ہیں وہ ان کو ان کے (جھوٹ) بیان کرنے کا بدلہ دیگا بیشک وہ حکمت والا علم والا ہے ۱۰۲۲

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى ١٤١

بیشک وہ گھاٹے میں ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی سے لاعلمی میں قتل کر دیا اور جو اللہ نے ان کو رزق دیا تھا اسکو اللہ پر افترا کرکے

اللّٰهِ ۚ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ ع وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ ١٤٢

حرام کر دیا بیشک وہ گمراہ ہوئے اور وہ ہدایت پانے والے نہ تھے ۱۰۲۳ اور وہی ہے جس نے باغ پیدا کئے ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور بغیر چڑھائے ہوئے

(ركوع ١٧ — مشرکانہ رسوم کا ابطال)

وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۚ

اور کھجوریں اور کھیتی اسکے پھل مختلف قسم کے ہیں اور زیتون اور انار ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور نہ ملتے جلتے

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

اسکے پھل سے کھاؤ جب وہ پھل لائے اور اسکے کاٹنے کے دن اس کا حق دو اور بیجا خرچ نہ کرو کیونکہ وہ بیجا خرچ کرنیوالوں کو محبت نہیں رکھتا ۱۰۲۴

لو شاء اللہ ما فعلوہ میں پھر پیشگوئی ہے کہ یہ رسوم بدسب انکے درمیان سے دور کر دیجائیں گی +

حجر — **۱۰۲۲** حِجر۔ اصل حَجر سے لیا گیا ہے یعنی پتھر۔ اور اس میں روکنے کے معنی آگئے ہیں جس طرح پتھر بوجہ اپنی صلابت کے روکتا ہے۔ اور اسلئے حِجر کے معنی ہیں تحریم کی وجہ سے ممنوع جیسے یہاں اور حِجر عقل کو بھی کہتے ہیں اس لئے کہ وہ اس چیز سے روکتی ہے جس کی طرف انسان کا نفس اسے بلاتا ہے جیسے قسم لذی حجر (الفجر ۸۹: ۵)

وصف — وصف کسی چیز کا ذکر اس کے حلیہ اور اس کی نعت کے ساتھ کرنا۔ اور وصف حق بھی ہوتا ہے اور باطل بھی لما تصف السنتکم (النحل ۱۶: ۱۱۶) سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون (والصّٰفّٰت ۳۷: ۱۸۰) +

یہ تمام مشرکانہ رسوم عرب میں مروج تھیں مگر اسلام نے ایسا ان رسوم سے ملک کو پاک کیا کہ پھر ان میں سے کسی رسم کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ یوں اسلام نے صرف عقیدتًا توحید نہیں پھیلائی بلکہ ان کی عملی زندگی میں سے ہر ایک قسم کے شرک کو دور کیا +

قتل اولاد سے مراد — **۱۰۲۳** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل اولاد سے مراد ان کی جہالت اور مشرکانہ رسوم میں پرورش کرنا ہے +

عرش، معروش — **۱۰۲۴** معروشات۔ عَرش چھتی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ اور عَرشتُ الکرم کے معنی ہیں اس کیلئے چھت کے طور پر کوئی چیز بنا دی و من الشجر و مما یعرشون (النحل ۱۶: ۶۸)۔ پس معروش کے معنی ٹٹی پر چڑھایا ہوا (غ) اور معروشات سے مراد انگور وغیرہ ہیں جس کو کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور غیر معروشات وہ جو خود اپنے تنہ پر کھڑے ہوتے ہیں (ج)

۱۴۳ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ

اور چارپایوں میں سے بوجھ اٹھانے والے اور زمین کو لگے ہوئے ہیں اس سے کھاؤ جو تم کو اللہ نے رزق دیا ہے اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو بیشک وہ

۱۴۴ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ

تمہارا کھلا دشمن ہے ۱۰۲۵ آٹھ نر اور مادہ دو بھیڑوں میں سے اور دو بکریوں میں سے کہو کیا دونوں نر

حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ

حرام کئے ہیں یا دونوں مادہ یا وہ جو دونوں مادہ کے رحموں میں ہے مجھے علم کے ساتھ خبر دو اگر تم

۱۴۵ صٰدِقِيْنَ ۝ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ — الربع

سچے ہو ۱۰۲۶ اور اونٹوں میں سے دو اور گایوں میں سے دو کہو کیا دونوں نر حرام کئے ہیں

اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ

یا دونوں مادہ یا وہ جو دونوں مادہ کے رحموں میں ہے

اکل — اکل - اَکل کھانا اور اُکل یا اُکُل وہ چیز ہے جو کھائی جائے مگر اُکل حظ یا رزق کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور پھل کو بھی کہتے ہیں (ل) +

سرف، اسراف ۱۰۱۳ — سرف - سرف کسی فعل میں حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے۔ خاص طور پر مال خرچ کرنے میں۔ اور حد سے تجاوز دونوں طرح پر ہے۔ ضرورت سے زیادہ خرچ کرے یا اللہ تعالیٰ کی طاعت سے باہر خرچ کرے خواہ قلیل ہی ہو (غ) رسوم و رواج پر جو خرچ کیا جاتا ہو وہ سب طاعۃ اللہ سے باہر ہونے کی وجہ سے اسراف میں داخل ہو +

اول نباتات میں جو اللہ تعالیٰ کی نعماء ہیں ان کا ذکر کیا ہو اور بتایا ہے کہ اس میں حق صرف خالق کا ہو سکتا ہے اس کے سوا اور کسی کا حق نہیں۔ اور وہ حق زکوٰۃ ہے بمشرک نباتات یعنی کھیتیوں میں اور چارپایوں میں بتوں کے حقوق مقرر کرتے تھے۔ خود کھانے کا ذکر ترتیب طبعی کے لحاظ سے پہلے رکھا ہو +

حمولة — ۱۰۲۵ حمولۃ۔ حَمل سے ہے جس کے معنی اٹھانا ہیں۔ راغبؒ اس کے معنی کئے ہیں مَا یُحمَل جو خود اُٹھایا جائے یعنی چھوٹا +

فرش — فرش - فرش کے معنی بچھانا ہیں اور زمین کو فراش کہا ہے کہ اس پر انسانوں کا استقرار ہو فرش کے معنی مَا یُفرش ہیں اور اس سے مراد مَا یُرکب ہو یعنی جس پر سواری کی جائے (غ) +

گزشتہ رکوع کی مشرکانہ رسوم کا ابطال کیا ہو اور فرمایا ہو کہ ان جانوروں کا پیدا کرنے والا خدا تعالیٰ ہو نہ تمہارے بت پس اللہ تعالیٰ نے جس کام کیلئے انہیں پیدا کیا ہو وہ کام ان سے لو۔ حمولۃ اور فرش کے معنی میں بہت سا اختلاف ہے میں نے امام راغبؒ کے معنوں کو ترجیح دی ہے اس لئے کہ اگلی آیات میں اس ترتیب سے ان جانوروں کا ذکر کیا۔ پہلے چھوٹے اور پھر بڑے +

زوج — ۱۰۲۶ زوج - نر اور مادہ میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے پس آٹھ ازواج سے مراد ایک ایک نر اور ایک

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ

یا تم گواہ تھے جب اللہ نے تم کو یہ حکم دیا پس اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو جو اللہ پر جھوٹ افترا

كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۟

کرتا ہے تاکہ علم کے نہ ہوتے ہوئے لوگوں کو گمراہ کرے بیشک اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا ۱۰۲۷

ع ۱۸ / ۵

ممنوع غذائیں اور مشرکین کے باطل عذر

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً ۱۴۶

کہو میں اس میں جو میری طرف وحی کیا گیا ہو کسی چیز کو جو کوئی کھانے والا کھائے حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ مردار ہو

اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ

یا خون گرایا گیا یا سؤر کا گوشت کیونکہ یہ (سب) ناپاک ہیں یا وہ نافرمانی ہو کہ اس پر اللہ کے سوائے دوسرے کا نام پکارا گیا ہو

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۟

پھر جو کوئی مضطر ہو جائے نہ خواہش کرنے والا نہ حد سے بڑھنے والا تو بیشک تیرا رب بخشنے والا رحم کرنے والا ہو ۱۰۲۸

ایک مادہ لیکر کل تعداد آٹھ ہو۔ جیسا کہ آگے خود تقسیم کر کے بتایا ہو ۔

ضائن یا معز — ضأن ۔ ضائن کی جمع ہے ۔ بھیڑ۔ نر کبش اور مادہ نعجۃ اور معز۔ ماعز کی بکرا۔ نر تیس ہو اور مادہ عنز ۔ بتایا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نہ نر کو حرام کیا ہو نہ مادہ کو نہ ان کے بچوں کو ۔ مشرک بعض وقت نر کو بتوں کا چڑھاوا قرار دے کر ان سے کام لینا حرام سمجھتے تھے ۔ بعض وقت مادہ کو ۔ اور جیسا کہ پچھلے رکوع میں ذکر ہو بعض وقت جو بچہ پیٹ میں ہو اسے مردوں کیلئے حلال اور عورتوں کیلئے حرام قرار دیتے تھے اسلئے نر اور مادہ کا ذکر الگ الگ کیا ۔

ابل — ۱۰۲۷ ابل میں سے دو جمل یعنی نر اور ناقۃ یعنی مادہ ۔

بقر — بقر میں سے دو ۔ نر کو ثور کہتے ہیں مادہ کو بقرۃ جس کی جمع بقر ہو ۔

ان تمام رسوم کو مشرکین اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرف منسوب کرتے تھے اور یہ سب ان کا افترا تھا ۔

غذاؤں میں حرمت کی علت — ۱۰۲۸ جب مشرکانہ رسوم کا ذکر ہوا جن کی رو سے حلال چیزوں کو حرام کیا جاتا تھا ۔ تو یہ بھی بتا دیا کہ وحی الٰہی کس چیز کو حرام ٹھہراتی ہو ۔ لا اجد فیما اوحی الی بتاتا ہو کہ یہاں اشارہ سورۂ نحل کی طرف ہو جو بلحاظ نزول سورۂ انعام سے پہلے کی ہو اور سب سے پہلے اسی میں غذاؤں کی حرمت وحلت کا ذکر آیا ہو ۔ یہاں زاید یہ بیان کر دیا ہو کہ پہلی تین یعنی مردار اور خون جو بہ گیا ہو اور سؤر کا گوشت یہ تینوں اپنی ناپاکی کی وجہ سے حرام کئے گئے ہیں ۔ ان میں وہ مضرت ہیں جو انسان کے جسم پر اور اس کے اخلاق پر برا اثر پیدا کرتے ہیں ۔ اور ما اهل بہ لغیر اللہ کو ان تینوں سے الگ کر کے اسے فسق قرار دیا گیا ہو کیونکہ اس کی ناپاکی اصلی نہیں بلکہ وہ محض خدا کے حکم کی نافرمانی ہو کہ وہ چاہتا ہے کہ غذاؤں تک میں مشرکانہ رسوم کی بیخکنی کر دی جائے ۔

۱۴۷ وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا

اور ان پر جو یہودی ہیں ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کئے تھے اور گائیوں اور بکریوں سے ہم نے ان کی

عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ

ان کی چربی حرام کی تھی سوائے اس کے جو ان کی پیٹھ پر یا انتڑیوں پر لگی ہو یا جو ہڈی کے ساتھ

۱۴۸ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝ فَإِن كَذَّبُوكَ

ملی ہوئی ہو یہ ہم نے اُن کو اُن کی بغاوت کی وجہ سے سزا دی اور یقیناً ہم سچے ہیں ۱۰۲۹ پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں

فَقُل رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ۝

تو کہو تمہارا رب وسیع رحمت والا ہے اور اس کی سزا مجرم قوم سے نہیں ٹلتی

۱۴۹ سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن

جنہوں نے شرک کیا اب وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام

شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِندَكُم

کرتے اسی طرح وہ لوگ جھٹلاتے رہے جو اُن سے پہلے تھے یہاں تک کہ ہماری سزا کا مزا چکھا کہو کیا تمہارے پاس

مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ۝

کوئی علم ہے تو اس کو ہمارے لئے نکالو تم صرف ظن کی پیروی کرتے ہو اور تم نری اٹکلیں دوڑاتے ہو ۱۰۳۰

ذی ظفر — ع۱۰۲۹ ذی ظفر۔ ظُفُر انسان اور اس کے غیر دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اور ذی ظفر سے مراد ذی مخالب ہیں (غ) یعنی پنجہ والے۔ بہائم اور پرندوں میں سے وہ جن کی اُنگلیاں پھٹی ہوئی نہ ہوں جیسے اونٹ اور شترمرغ اور بطخ (ج)۔

حوی۔ حویۃ — حوایا حَوِیّۃ کی جمع ہے انتڑیاں اور حوٰی کے معنی ہیں جمع کیا اور اسے نگاہ رکھا (ل)۔

حرمت بطور سزا — مطلب یہ ہے کہ یہودیوں پر جو ان ممنوعہ غذاؤں یعنی سؤر وغیرہ سے علاوہ کچھ حرام کیا گیا تھا تو یہ انکی شرارتوں کی وجہ سے ایک وقتی سزا تھی۔ یعنی انکے مادۂ سرکشی کو کم کرنے کیلئے بعض چیزوں سے انہیں بطور سزا محروم کر دیا گیا۔

خرص — ع۱۰۳۰ تخرصون۔ خَرْص پھل کے تخمینہ کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اور تخرصون کے معنی ہیں تم جھوٹ بولتے ہو۔ اور قُتِلَ

خرّاص — الخرّاصون (الذّٰریٰت ۵۱ ۔ ۱۰) کے معنی ہیں کذابوں پر لعنت۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک قول جو صرف ظن اور تخمینہ کی بنا پر کہا جائے وہ خَرْص ہے خواہ ایک چیز کے مطابق ہو یا مخالف کیونکہ اس کا کہنے والا وہ بات علم یا غلبہ ظن یا سماع کی بنا پر نہیں کہتا بلکہ صرف گمان اور تخمینہ کی بنا پر اور اس طرح پر بات کہنے والا کاذب سمجھا جائیگا (غ)۔

لو شاء اللہ ما اشرکنا کی تفسیر — جب ہر قسم کے دلائل ابطال شرک کے ہو چکے۔ تو اب انکے آخری عذر کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو ہم

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَاءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاءَكُمُ الَّذِيْنَ ١٥١

کہو تو اللہ کی دلیل ہی فیصلہ کن ہے سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دیتا ۱۰۳۲ کہو اپنے وہ گواہ لاؤ جو

يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ

یہ گواہی دیں کہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہے پھر اگر وہ گواہی دیں تو تو ان کے ساتھ گواہی نہ دے اور ان لوگوں کی خواہشوں

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ع

کی پیروی نہ کر جو ہماری باتوں کو جھٹلاتے ہیں اور ان کی جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور وہ (دوسروں کو) اپنے رب کے برابر ٹھیراتے ہیں ۱۰۳۳

ایسا نہ کرتے۔ مطلب یہ کہ ہمارا شرک بھی مشیت الٰہی سے ہے۔ اس کا جواب کئی طرح پر دیا ہے۔ اول یہ کہ یہ محض تکذیب ہے۔ پہلے لوگ بھی اسی طرح کے بودے عذر بنا کر انبیاء کو جھٹلاتے رہے۔ آخر عذاب کا مزہ چکھا۔ اگر اللہ تعالےٰ کا یہ منشا ہوتا کہ انسان شرک کریں تو پھر وہ شرک کی وجہ سے عذاب کیوں بھیجتا۔ دوسرا جواب اسی کے اندر ہے کہ پھر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کیوں تکذیب کرتے ہو۔ اگر تم ایسے ہی مسلوب الاختیار ہو تو پھر تکذیب کیوں کرتے ہو۔ حق کے قبول کرنے میں مسلوب الاختیار بنتے ہیں اس کی تکذیب کے وقت نہیں بنتے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ کوئی علم پیش کرو۔ اگر الٰہی منشا یہ ہوتا کہ لوگ شرک کیا کریں تو اس کی تعلیم بذریعہ انبیاء بھی ہی ہوتی مگر کسی نبی کی تعلیم شرک کی طرف نہیں بلاتی۔ اور آخر پر بتایا کہ یہ تمہاری باتیں نرے ظن اور اٹکلوں پر مبنی ہیں حالانکہ پیغمبر جو ابطال شرک کرتا ہے وہ یقینی علم کی بنیاد پر کرتا ہے +

جو کچھ یہاں مشرکوں کی حالت بیان کی ہے آج وہی مسلمانوں کے کثیر حصہ پر صادق آرہی ہے۔ ایک کثیر حصہ مسلمانوں کا ایسا ہے جو طرح طرح کے فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر کہہ دیتے ہیں کہ خدا کے منشا کے خلاف تو ہم چل ہی نہیں سکتے۔ بس وہ چاہتا ہی ہے تو ہم ایسا کرتے ہیں اسی طرح مذہب کے معاملہ میں بڑی جرات سے کام لیکر بغیر علم صحیح کے اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہیں اور اس کو یہاں کذب قرار دیا ہے +

بالغة

۱۰۳۱ البالغة۔ بُلُوغ کے معنی غایت مقصد کو پہنچ جانا (غ)۔ پس حجة بالغة وہ دلیل قطعی ہوئی جو مدعا کو ثابت کرے +

جو دلائل اوپر دیئے ہیں ان کو حجت بالغہ یا فیصلہ کن دلیل کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور آخر پر فرمایا کہ ارادہ الٰہی تو ہدایت کے لئے ہی ہے چنانچہ اللہ تعالےٰ وہ سامان بھی پیدا کردے گا جو تم کو شرک سے نکال کر توحید پر قایم کر دیں یا لو شاء لهدٰكم اجمعين کے معنی یہ ہیں کہ اگر اس کی مشیت انسانوں کو مجبور کرنا ہوتی تو وہ ہدایت پر مجبور کرتا +

هلم

۱۰۳۲ هلم کسی چیز کی طرف بلانے پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کی اصل بعض کے نزدیک ھَا لُمَّ ہے اور لُمَّ لَمَمْتُ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کی اصلاح کی اور بعض کے نزدیک ھَلْ اَمَّ یعنی کیا تمہارے لئے اس میں اَمّ یعنی قصد ہے (غ) +

مطلب یہ ہے کہ تم کوئی ایسا شخص پیش نہیں کرسکتے جس نے بربنائے وحی الٰہی یہ کہا ہو کہ یہ مشرکانہ باتیں جائز ہیں +

ع ۱۹ ۶ — توحید پر ایمان صحیح اصول زندگی پر چلنا ہے۔

۱۵۲ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ

کہو آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے حرام کیا ہے تم پر واجب ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ سے

اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ

احسان کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو ہم تم کو رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ

اور بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں اور اس جان کو جسے اللہ نے

الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

حرام ٹھہرایا ہے قتل نہ کرو سوائے اس کے کہ انصاف چاہتا ہو اس کا تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو ۱۰۳۳

۱۰۳۳ احرّم ربکم کے آگے آتا ہے کہ کسی کو شریک نہ کرو۔ مگر شرک نہ کرنے کو حرام نہیں کیا۔ بلکہ بلحاظ تاکید لا بڑھا دیا ہے یا علیکم سے اگلا بیان شروع ہوتا ہے یعنی تم پر واجب ہے کہ شرک نہ کرو سب جو کرنے کی باتیں تھیں وہ بتا دیں ان کے خلاف حرام ہے +

ملق۔ تملق — من املاق ۔ ملق۔ مہربانی اور لطف یا نرمی اور مدارات کو کہا جاتا ہے اس سے تملق بمعنی چاپلوسی ہے اس لئے دعا اور تضرع کو بھی ملق کہا جاتا ہے۔ اور

املاق — املاق فقیر ہو جانے کو کہتے ہیں اور اصل اس کا یہ ہے کہ سارا مال خرچ کر دیا جس سے اس کے پاس کچھ نہ رہا دل، یہاں من املاق فرمایا یعنی مفلسی کی وجہ سے دوسری جگہ ہے خشیۃ املاق یعنی مفلسی کے ڈر سے (بنی اسرائیل ۱۷-۳۱) ہو سکتا ہے کہ دونوں کے ایک معنی ہوں ہو سکتا ہے کہ پہلے سے مراد وہ ہیں جو مفلس ہیں اور دوسرے سے وہ جو مفلس نہیں مگر مفلسی سے ڈرتے ہیں +

توحید کا عملی رنگ — ہر قسم کے شرک کی بلکہ اس کے ساتھ ہی مشرکانہ رسوم کی تردید کر کے اب اس رکوع میں بتایا ہے کہ توحید کو قبول کرنا محض ایک عقیدہ کا مان لینا نہیں بلکہ خاص اصول پر اپنی زندگی کو چلانے کا نام ہے۔ چنانچہ اول خلاصہ کے طور پر ہر قسم کے شرک کا ابطال یوں کیا کہ کسی چیز کو مسیح ہو یا ملائکہ ہوں یا بت ہوں یا اور چیزیں ہوں یا اہرمن ہو خدا کے ساتھ شریک مت ٹھہراؤ اور اس کے ساتھ ہی دوسرے احکام کا ذکر کیا جو انسان کی عملی زندگی کے لئے ہیں گویا بتا دیا کہ شرک سے بچنا یہی ہے کہ صحیح اصول زندگی پر عمل پیرا ہو۔ ان میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کی طرف توجہ

قتل اولاد سے مراد — دلائی پھر اولاد کے قتل اولاد سے یہاں بعض نے مراد عزل وغیرہ سے بیج ضائع کرنا لیا ہے اور بعض نے لڑکیوں کا زندہ گاڑنا مگر سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد جیسا کہ ۱۰۲۱ میں دکھایا جا چکا ہے یہی ہے کہ اولاد کو علم وغیرہ سے محروم مت کرو کیونکہ اکثر لوگ محض اس خیال سے اولاد کو تعلیم نہیں دیتے کہ ہم مفلس ہیں۔ یا مفلس ہو جائیں گے مفلسی کے خوف سے لڑکیوں کو نہ مارتے تھے گویا والدین کے حقوق کے مقابل اولاد کے حقوق یہ بیان کئے کہ ان کو اچھی تعلیم و تربیت دی جائے پھر ہر قسم

حفاظت جان کی ضرورت — کی بے حیائی کی باتوں سے روکا خواہ ان کا اثر دوسرے پر نہ پہنچتا ہو اور بدترین بے حیائی زنا ہے جس سے نسل انسانی کی افزائش پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ پھر بقائے نسل انسانی میں جو سب سے بڑی ضرورت ہے یعنی حفاظت جان اس کی طرف توجہ دلائی ایک رنگ میں چاروں باتوں کا تعلق حفاظت جان سے ہے۔ ماں باپ کے ذریعہ سے جان پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کی

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ ١٥٣

اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ سوائے اس طریق کے جو بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور ماپ اور

الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ

تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو ہم کسی جی کو مکلف نہیں کرتے مگر اس کی وسعت کے مطابق اور جب تم بات کہو تو عدل کرو اگرچہ

ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا ١٥٤

قریبی ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ اس کا تم کو حکم کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو ۱۰۳۴ اور کہ یہ میرا

صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ

راستہ سیدھا ہے سو اس کی پیروی کرو اور (اور اور) رستوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تم کو اس کے رات سے الگ کر دیں گے

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ ١٥٥

اس کا تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم تقویٰ کرو ۱۰۳۵ پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اس پر (نعمت کا) اتمام کرنے کیلئے جو

اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝ع

نیکی کرتا ہے اور ہر ضروری چیز کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں ۱۰۳۶

تربیت ہوتی ہے۔ پھر اولاد کے قتل سے روکا۔ پھر بے حیائی سے جس کی سب سے قبیح صورت زنا ہے جس سے اولاد ضائع ہوتی ہے۔ پھر دوسرے کو قتل کرنے سے روکا ہے۔ آخر پر عقل سے کام لینے کو کہا ہے کہ اس کے بغیر نوع انسان کا بقا نہیں ہو سکتا۔

شدۃ۔ اشد

۱۰۳۴ اشد۔ شِدَّۃ کا استعمال مضبوطی عہد پر بھی ہے اور قوت بدنی پر بھی من اشد منھم قوۃ (حٰم ۴۱ - ۱۵) اور اشد وہ حالت ہے جب انسان کے قوائے جسمانی مضبوط ہو جائیں اور قوائے اخلاقی کی مضبوطی پر بھی بولا جاتا ہے جیسے حتی اذا بلغ اشدہ و بلغ اربعین سنۃ (الاحقاف ۴۶ - ۱۵ (ع)) اور یہاں مراد قوائے بدنی کی مضبوطی ہے۔

حفاظت مال

اس آیت میں حفاظت مال کی طرف توجہ دلائی ہے۔ سب سے پہلے یتیم کے مال کی حفاظت کی پھر ماپ اور تول کو ٹھیک رکھنے کا حکم دیا۔ پھر حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائگی میں انصاف کا حکم دیا۔ اور بالآخر اللہ کے عہد کی طرف توجہ دلا کر تمام احکام شریعت کی طرف توجہ دلائی۔ اس کا خاتمہ نصیحت پر کیا کیونکہ لوگ مال کے معاملہ میں یا شہادت کے ادا کرنے میں خدا کو یاد نہیں رکھتے۔

۱۰۳۵ حقوق اللہ یا اللہ کی توحید کے ساتھ حقوق العباد کو بیان کر کے اس سب کو صراط مستقیم کہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ حقوق العباد کی ادائگی بھی صراط مستقیم میں شامل ہے۔

۱۰۳۶ ثُمَّ۔ یہاں ترتیب کے لئے نہیں۔ بلکہ مراد صرف ایک دوسری چیز کا ذکر ہے۔ دیکھو ۲۲۴

تورات کن معنوں میں اتمام نعمت ہے۔

تمامًا یعنی اتمام نعمت کیلئے۔ اس قوم کے حالات کے مطابق تورات سے ہی ان پر اتمام نعمت ہوا۔ ہاں کل دنیا پر اتمام

۱۵۶ ۱۵۷ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۙ اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ

اور یہ کتاب جسکو ہم نے اتارا ہی برکت دی گئی ہی سو اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۱۰۳۷ ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ

اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۙ

کتاب صرف ہم سے پہلے دو گروہوں پر اتاری گئی اور ہم ان کے پڑھنے سے یقیناً بے خبر تھے ۱۰۳۸

۱۵۸ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ

یا کہو اگر کتاب ہم پر اتاری جاتی تو ہم یقیناً اُن سے زیادہ ہدایت پر ہوتے

ع ۲۰ ۱۱

توحید کا ن کی تعلیم علمی اور عملی رنگ میں

نعمت قرآن سے ہوا ؛

علی الذی احسن ۔ اس سے مراد ہر ایک نیکی کرنے والا ہی ۔ بعض نے مراد حضرت موسیٰ کو لیا ہی کہ انہوں نے تبلیغ میں احسان کیا یا مراد ہی احسن القیام یعنی کتاب کے قایم رکھنے میں نیکی کرے یا تا ًسے مراد اسکے عمل احسان پر خدا کیطرف سے نعمت کی زیادتی ہی ۔

تفصیل کل شئ سے مراد صرف اسی قدر ہی کہ اس قوم کی ضرورت کے مطابق اس میں ہر شے کی تفصیل تھی جیسا کہ ایک ملکہ کے ذکر میں ہی و اوتیت من کل شئ (النمل ۲۷ ۔ ۲۳) مراد صرف اُس زمانہ کی ضروریات ہیں ؛

چونکہ اگلے رکوع میں قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کمال کا ذکر ہی اسلئے اس کا خاتمہ حضرت موسیٰ کے ذکر پر کیا ہی ۔ اور اس لئے بھی کہ موسیٰ کی کتاب قرآن کی صداقت پر گواہ ہی ۔ اور خود اس رکوع سے یہ تعلق ہی کہ جیسے احکام شریعت توحید کے ساتھ اب دیئے ہیں ایسے ہی احکام موسیٰ کو بھی دیئے تھے ؛

محمد رسول اللہ توحید کی عملی تعلیم ہیں

۱۰۳۷ سورت کے خاتمہ پر اس رکوع میں دو باتوں کا ذکر کیا ہی ایک تو یہ کہ توحید کی تعلیم دنیا میں گو پہلے بھی آتی رہی جیسا کہ ابھی حضرت موسیٰ کی کتاب کے ذکر میں فرمایا تھا اور اپنے اپنے وقت میں ہر قوم پر اتمام نعمت وہی تعلیم تھی ۔ لیکن وہ کامل تعلیم جو دنیا میں ہمیشہ رہنے کیلئے بھیجی جاتی ہی وہ اس کتاب میں ہی جو مبارک ہی جس کی خیر دائمی ہی اور کبھی منقطع نہ ہوگی دیکھو ۹۹۲ اور دوسرا اس توحید کا عملی نمونہ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کو پیش کیا ہی اور یوں بتایا ہی کہ توحید کی تعلیم علمی رنگ میں اپنے کمال میں اگر قرآن شریف میں موجود ہے تو عملی رنگ میں وہ محمد رسول اللہ صلعم میں ہی ؛

اہل کتاب و عرب

۱۰۳۸ یہاں مخاطب خصوصیت سے اہل عرب ہیں اور ان تقولوا کا تعلق انزلناہ سے ہی یعنی اگر ہم کتاب نہ اتارتے تو تم ایسا کہہ سکتے تھے اور صرف دو گروہوں کا ذکر اسلئے کیا کہ یہ دو گروہ ملک عرب میں آباد تھے اور انہوں نے عرب کی اصلاح کیلئے کوشش بھی کی تھی ۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہی کہ پہلے یہودیوں اور پھر عیسائیوں نے اپنا پورا زور اہل عرب کو یہودی اور عیسائی بنانے پر لگایا لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی اور ان کی دراست سے بے خبر ہونا اس لحاظ سے کہا کہ یہ کتابیں زبان عربی میں نہ تھیں اور اُن کے ترجمے بھی وہ دوسری زبانوں میں کرنا جائز نہ سمجھتے تھے بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی خیال تھا کہ ان کی مقدس کتابوں کو صرف مذہبی آدمی ہی پڑھ سکتے ہیں ۔ یہودیوں کا تو ابتک یہی خیال ہی اور عیسائیوں میں پراٹسٹنٹ فرقہ کے پیدا ہونے کے بعد ترجمے شروع ہوئے ؛

توریت و انجیل کے ترجمے

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ

سو ضرور تمہارے پاس تمہارے رب سے کھلی دلیل اور ہدایت اور رحمت آگئی پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی آیتوں کو

اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ

جھٹلائے اور ان سے پھر جائے ہم ان لوگوں کو جو ہماری آیات سے پھرتے ہیں برے عذاب کی سزا دیں گے

بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ○ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِىَ رَبُّكَ اَوْ ١٥٩

اس لئے کہ وہ پھر جاتے تھے ١٠٣٩ وہ کسی بات کا انتظار نہیں کرتے مگر یہ کہ انکے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب آئے یا

يَاْتِىَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۗ يَوْمَ يَاْتِىْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ

تیرے رب کے بعض نشان آئیں جس دن تیرے رب کے بعض نشان آئینگے کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہیں دیگا جو پہلے ایمان

مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِىْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ○

نہ لایا تھا یا اپنے ایمان میں کوئی نیکی نہ کمائی تھی کہو انتظار کرو ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں ١٠٤٠

١٠٣٩ اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ لوگ جن پر اب ہم نے یہ کتاب اتاری ہے یہود اور نصاریٰ سے بڑھکر اتباع کریں گے اور جس طرح حضرت موسیٰ کے ساتھیوں اور حضرت عیسیٰ کے حواریوں نے توریت اور انجیل کی پیروی میں کمزوری دکھائی ایسی کمزوری رسول اللہ صلعم کے اصحاب سے وقوع میں نہ آئیگی۔ آخر میں تکذیب کرنے والوں کو ڈرایا ہے +

اشراط ساعۃ

١٠٤٠ اس آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں ایک حدیث مروی ہے جو الفاظ مختلفہ میں اور کئی طریق میں آئی ہے اس میں کہیں تو یہ لفظ ہیں لا تقوم الساعة حتى تطلع الشمس من مغربها فاذا راٰها الناس اٰمن من عليها فذالك حين لا ينفع نفسا ايمانها لم تكن اٰمنت من قبل قیامت نہیں آئیگی جبتک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ کرے پس جب لوگ اسے دیکھینگے تو سب ایمان لے آئینگے اور یہ وہ وقت ہوگا کہ جب کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہیں دیگا جو پہلے ایمان نہ لایا تھا۔ اور کسی میں یہ لفظ ہیں کہ تین باتیں ہیں جب وہ ظاہر ہو جائیں گی تو کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہیں دیگا جو پہلے ایمان نہ لایا تھا یا اپنے ایمان میں خیر نہیں کمائی تھی۔ سورج کا مغرب سے طلوع کرنا اور دجال اور دابۃ الارض اور کسی میں یہ لفظ ہیں کہ قیامت نہیں آنے گی جبتک دس نشان نہ دیکھ لو آفتاب کا مغرب سے طلوع اور دخان اور دابہ اور خروج یاجوج و ماجوج اور ظہور عیسیٰ بن مریم اور ظہور دجال اور تین خسف ایک خسف مشرق میں اور ایک مغرب میں اور ایک جزیرۃ العرب میں اور آگ جو قعر عدن سے نکلے گی۔ اب پہلی بات یہ ہے کہ ان احادیث کو اس آیت سے کچھ تعلق نہیں سوائے اسکے کہ ان میں بھی یہ لفظ آئے ہیں کہ اس وقت کسی شخص کو ایمان نفع نہ دیگا اور آیت میں بھی یہ لفظ آتے ہیں مگر صرف اس بنا پر ان اشراط الساعۃ کو بعض آیات ربک کی تفسیر نہیں کہا جا سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں فرشتوں اور رب کے آنے کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ بعض آیات رب کے آنے کا ذکر ہے اور ان احادیث میں ایسا کوئی ذکر نہیں بلکہ یہ کوئی اور نشانات ہیں۔ فرشتوں اور رب کے آنے سے کیا مراد ہے یہ ح ٢٦٩ میں دکھایا جا چکا ہے اور دوسری وقت یہ ہے کہ ان

۱۶۰ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ

وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور گروہ گروہ ہو گئے تیرا اُن سے کچھ سروکار نہیں ان کا معاملہ اللہ کی طرف ہے پھر

۱۶۱ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَاءَ

وہ اُن کو خبر دیگا جو وہ کرتے تھے ۱۰۴۲ جو کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے لئے دس اس کی مثل ہیں اور جو کوئی

۱۶۲ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ

بدی کرتا ہے تو اس کی مثل ہی اس کو سزا دی جائیگی اور اُن پر ظلم نہ کیا جائیگا ۱۰۴۳ کہو بیشک مجھ کو میرے رب نے سیدھے رستے

صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

کی طرف ہدایت دی ہے دین صحیح ابراہیم راست رو کے مذہب کی طرف اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا

احادیث میں ان اشراط میں صاف طور پر دجال یا مسیح موعود کے آنے کا ذکر ہے۔ اور یہ احادیث سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ دجال کو مسیح موعود ہلاک کریگا اور غیر مسلم مسیح موعود کی وجہ سے ایمان لائینگے۔ اگر ان کا ایمان لانا بے سود تھا تو مسیح کو بھیجے کا فائدہ کیا تھا پس ضرور ہے کہ ان احادیث کا مطلب کچھ اور ہو۔ اور بعض باتیں ان میں استعارہ کے رنگ کی ہوں مگر اس پر بحث کا یہ موقع نہیں۔ یہاں ہم نے صرف یہ دیکھنا ہے کہ بعض آیات ربك سے مراد کیا ہے سو اس تفسیر کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ملائکہ اور اللہ کے آنے کی ۱۰۳۹ میں کی جاچکی ہے یعنی یہ کہ فرشتوں کے آنے سے مراد جنگوں میں عذاب کا آنا ہے۔ اور رب کے آنے سے مراد دشمن کا استیصال قطعی ہے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض آیات ربك کے آنے سے مراد موت کا آنا ہے۔ جو وہی من مات فقد قامت قیامته کے ماتحت قیامت ہی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب موت کے آثار ظاہر ہو جائیں تو پھر کافر کو ایمان لانا کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ ذ ایسے شخص کو ایمان کچھ فائدہ دے سکتا ہے جو پہلے سے ایمان لایا مگر اعمال اس کے مطابق نہ کئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان بغیر اعمال کے کام نہیں دیتا۔ پہلی آیت میں جس عذاب کا ذکر تھا اس کی یہاں زیادہ صراحت کر دی ہے اور یہ سب تکذیب کرنیوالوں کیلئے ہے اور یہی اشارہ فانتظروا کے آخر میں ہے۔

شیاع ۔ شیعة

۱۰۴۱ شیعا۔ شِیاع کے معنی انتشار اور تقویت ہیں اسی سے خبر کا شائع ہونا ہے اور شِیْعَة وہ ہیں جن سے انسان قوت پکڑتا اور جس سے وہ پھیلتے ہیں (غ) اور ہر ایک قوم جو ایک امر پر جمع ہو۔ وہ ایک شیعة ہیں اور ازہری کہتے ہیں وہ بعض بعض کی اتباع کرتے ہیں اور وہ سب متفق نہیں ہوتے اور یہاں مراد ایسے ہی فرقے ہیں جو ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں (ل)

اس سے مراد عموماً یہود و نصاریٰ لئے گئے ہیں مگر ترمذی کی ایک روایت میں یہ ہے کہ اس سے مراد اس اُمت کے اہل بدعت ہیں اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اوپر بیان میں نیکی نہ کمانے والوں کا ذکر تھا۔ اس لئے ساتھ ہی ایسے لوگوں کا بھی ذکر کر دیا ۔

نیکی اور بدی کے بدلہ کا قانون

۱۰۴۲ نیکی اور بدی کی جزا و سزا کا جو قانون یہاں بیان کیا ہے وہ دوسرے مقامات کے خلاف نہیں۔ ہر نیکی کا بدلہ ملتا ہے اور وہ دس گنا ہے یا اس سے بھی زیادہ ہر بدی کا بدلہ ملتا ہے اور وہ اس بدی کی مثل ہوتا ہے یا اس سے بھی کم یہانتک کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے بالکل معاف ہی کر دے ۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ ۱۴۳

کہو میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لئے ہے جو جہانوں کا رب ہے ۱۰۴۳ اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی

اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ ؕ وَلَا تَکْسِبُ ۱۶۵

مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں کہو کیا میں اللہ کے سوائے کوئی رب چاہوں اور وہ ہر چیز کا رب ہے اور کوئی جان

کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْھَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ مَّرْجِعُکُمْ

(بدی) نہیں کماتی مگر اس کا وبال اسی پر ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا پھر تمہارے رب کی طرف تمہارا لوٹ کر آنا ہے

فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

پھر وہ تم کو اس کی خبر دیگا جس میں تم اختلاف کرتے تھے ۱۰۴۴

آنحضرت کے اول المسلمین ہونے کی دلیل

۱۰۴۳ اس آیت میں عملی رنگ میں کمال توحید کو بیان کیا ہے۔ موحد انسان اپنے کمال کو اس وقت پہنچتا ہے جب اس کا ہر فعل خیر عبادت کے رنگ میں ہو یا قربانی کے رنگ میں۔ جب اس کا جینا مرنا اپنے لئے نہ ہو بلکہ صرف اپنے مولا کیلئے ہو۔ رب العالمین کیلئے ہونے میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ عالمین کی ربوبیت میں لگ جاتا ہے اسی طرح موحد کامل بھی عالمین کی ربوبیت میں لگ جاتا ہے۔ پس توحید کا عملی رنگ مخلوق خدا کی ربوبیت ہے۔ اور سب سے بڑی ربوبیت افضل المخلوقات انسان کی ربوبیت روحانی ہے جو انبیاء کے سپرد کی جاتی ہے۔ اور اس ربوبیت روحانی کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہمارے نبی کریم صلعم کو حاصل ہوا کیونکہ جس قدر اصلاح نسل انسانی کی آپ نے کی وہ اور کسی نبی کے حصہ میں نہیں آئی۔ اسلئے آپ اول المسلمین کل مخلوقات میں سے ٹھہرے +

چونکہ اس سورت میں اصل بحث توحید الٰہی پر تھی اس لئے اس کا خاتمہ اس پر کیا کہ محمد رسول اللہ صلعم توحید کے کس مقام کامل پر ہیں۔ اور کہ توحید کا کمال عملی رنگ میں مخلوق خدا کی بھلائی میں لگ جاتا ہے +

ہر مسلم کا نصب العین

اسی طرح اگر غور کیا جائے تو جسقدر انسان کا فعل اغراض نفسانی سے دور ہوتا ہے اسی قدر اس کا پایہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ ایک انسان اپنی ذات کیلئے کچھ کرتا ہے۔ دوسرا اپنے عیال کے لئے۔ تیسرا اپنی قوم کے لئے۔ چوتھا اپنے ملک کیلئے یہ سب تدریجاً ترقی ہے۔ لیکن سب سے بلند پایہ اس انسان کا ہے جو مخلوق خدا کے لئے کچھ کرتا ہے اس اور اس سے اگلی آیت میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی توحید کامل کے عملی نمونہ کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ یوں پیش کرنے میں اصل غرض یہ ہے کہ ہر مسلمان کا نصب العین یہی ہو کہ اپنے آپ کو اس مقام عالی پر پہنچائے یہی وجہ ہے کہ قبل از فاتحہ جو دعا سکھائی گئی ہے اس میں یہی لفظ آتے ہیں ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لاشریک له وبذلك امرت وانا من المسلمین۔ جہاں صرف لفظ اول المسلمین کی جگہ جو آنحضرت صلعم کے لئے خاص ہے عام مسلمانوں کو من المسلمین کہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس دعا کے سکھانے میں غرض یہی ہے کہ ہر مسلمان توحید کامل کے اس عملی مقام پر پہنچنے کی کوشش کرے +

وِزْر - وَزَر

۱۰۴۴ وازرۃ۔ وَزَر پہاڑ میں جائے پناہ کو کہا جاتا ہے کلا لا وزر (القیمۃ - ۱۱) اور وِزْر کے اصل

١٦٦ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ

اور وہی ہے جس نے تم کو زمین کا حاکم بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کیا۔

لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖؗ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۠ (النصف)

تاکہ تم کو اس کے بارہ میں آزمائے جو تم کو دیا ہے بیشک تیرا رب جلدی بدی کی سزا دینے والا ہے اور یقیناً وہ بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے [١٠٤٥]

معنی بوجھ ہیں (غ)، اور امام راغب نے لیحملوا اوزارھم کاملۃ یوم القیامۃ (النحل ١٦-٢٥) کی تشریح میں لکھا ہے کہ یہ اسکی مثل ہے جو فرمایا ولیحملن اثقالھم واثقالا مع اثقالھم (العنکبوت ٢٩-١٣) اور مطلب اس کا اس حدیث کے مطابق ہے من سن سنۃ سیئۃ کان لہ وزرھا ووزر من عمل بہا یعنی وہ ایک بُرے رستہ پڑ ڈالنے کا بوجھ بھی اُٹھائیگا +

(ہر انسان کی اپنی ذمہ داری کفارہ) یہ سنہرا قانون توحید کا ضروری تتمہ تھا۔ ہر ایک انسان اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔ ایک کی ذمہ داری دوسرا نہیں لے سکتا۔ یہی اسلام کا اصل الاصول ہے اور کفارہ کے عقیدہ پر یہ ایسا سخت حربہ ہے جس کا کوئی جواب عیسائیوں کے پاس نہیں۔ ایک عجیب جواب البتہ انہوں نے تراشا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ایک گنہگار دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا بیگناہ دوسرے کا گناہ اُٹھا سکتا ہے یہ منطق تثلیث کی منطق سے کم نہیں۔ جو شخص دوسرے کا بوجھ یا گناہ اُٹھائیگا وہ اُٹھاتے ہی وہ ذرۃ بن جائیگا۔ یہ بھی عجیب بوجھ اُٹھانا ہے کہ دوسرے کا بوجھ بھی لے لیا اور پھر بھی بوجھ کوئی نہیں۔ قرآن کریم کی یہ تعلیم کہ بوجھ اُٹھانیوالا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا اس کے خلاف نہیں جو فرمایا کہ وہ یعنی سردار یا پیشوا دوسروں کے بوجھ بھی اُٹھائینگے جیساکہ اوپر دکھایا جاچکا ہے کیونکہ وہاں مراد یہ ہے کہ ایک طریق بد قایم کرنے کا بوجھ انکے سر پر ہوگا مگر یہ نہیں کہ اس طریق بد پر جو لوگ چلے ہیں وہ اس وجہ سے اس بدی کے بوجھ سے بچ جائینگے۔ بدی کرنے کا بوجھ وہ خود ہی اُٹھائینگے۔ بدراہ بنانے کا بوجھ بدی کرنے سے مزید شے ہے +

(مسلمانوں کی حکومت کمال روحانی کا نتیجہ تھی۔) [١٠٤٥] سورت کا خاتمہ اس پر کیا کہ اللہ تعالیٰ تم کو زمین کا حاکم بناتا ہے۔ جب انسان عملی رنگ میں توحید کے کمال پر پہنچ جاتا ہے۔ تو وہ اس بات کا اہل ہو جاتا ہے کہ مخلوق خدا پر حکمران ہو جس کے مد نظر سوائے دوسروں کی بہتری کے کچھ نہیں اسی کو حکومت شایاں ہے۔ مگر وہ حکومت بھی آزمایش ہوتی ہے۔ جبتک اس کی اہلیت رہتی ہے اسے باقی رکھا جاتا ہے یہی حالت فی الواقع تاریخ اسلام میں نظر آتی ہے۔ گویا یہ آیت تاریخ اسلام کا ایک نہایت ہی مختصر مرقع ہے۔ مسلمانوں کو بادشاہت ان کی قوت اور ان کے سامان حرب کی وجہ سے نہیں ملی بلکہ اس وجہ سے کہ وہ مخلوق خدا کے خیرخواہ تھے۔ جب وہ توحید کامل کے مقام پر کھڑے ہوئے اور سب قوموں سے یکساں سلوک کرنے والے ہوئے اور ان کی زندگیوں کی غرض انسان کی خدمت ہوگئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کے بادشاہ بنا دیا۔ یہ وہ بات ہے جس کا اعتراف خود عیسائیوں نے کیا ہے اور جب اس مقام عالی سے گر گئے اور خواہشات کے بندے بن گئے تو حکومت بھی ان سے لے لی گئی۔ پھر دوسری قوم کھڑی کر دی جاتی ہے۔ بدی کی سزا بھی ملتی ہے۔ مگر غفر و رحم کی صفت سب پر فایق ہے +

